سورج
لاہور

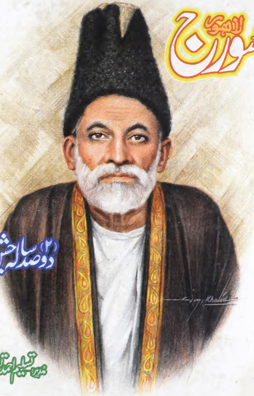

دو صد سالہ جشن غالبؔ (۲)

مدیر: تسلیم احمد تصور

★ مکاتیبِ غالب

غالب کے خطوط، غالبیات کا ایک اہم موضوع جس پر
تحقیق وتنقید کے بے مثال شاہپاروں کو یکجا کر دیا گیا۔

★ غالب کا روزنامچہ غدر

خواجہ حسن نظامیؒ کی نادر ونایاب تالیف
1924 کے بعد دوبارہ منظرِ عام پر

★ نوادراتِ غالب

نادر ونایاب تصویروں اور تحریروں کا
بیش بہا خزانہ ہر خاص وعام کی دسترس میں

★

تلاشِ غالب

تاجدارِ سخن کی ہمہ جہت شخصیت کے
بہت سے اچھوتے گوشوں پر
اہلِ علم و دانش کی مستند تحریریں

★

مرقع غالب

آنجہانی پرتھوی چندر کی مایہ ناز تالیف
زیرِ نظر شمارے میں شامل ہے۔
300 سے زائد صفحات پر مشتمل یہ انمول کتاب بالکل مفت

اُردو ادب کا معیار

سُورج لاہور

غالب کا دو صد سالہ جشنِ ولادت

خصوصی اشاعت (جلد دوم)

تحقیق و تدوین

تسلیم احمد تصور

سورج پبلشنگ بیورو
A-6 نصیر الدین روڈ، اسلام پورہ، لاہور ۔ فون: 7226970

اشاعت 2003ء

تقسیم کار:

القرآن انٹرپرائزز

غزنی سٹریٹ
اُردو بازار : لاہور
فون : 7237500

کرنیں

پہلی کرن — مدیر کے قلم سے — 5

غالب کے خطوط، غالب شناسوں کی نظر میں

سرگزشت غالب

جو غالب کے خطوط سے ترتیب دی گئی — ناصر عابدی — 17

غالب نے اردو میں خط و کتابت کب سے شروع کی؟ — قاضی عبدالودود — 25

غالب خطوط کے آئینے میں — اقرار احمد عباسی — 38

دلی کی سماجی زندگی

خطوط غالب کے آئینے میں — سخی حسن نقوی — 49

جنگ آزادی کی کہانی، مکاتیب غالب کی زبانی — غلام رسول مہر — 59

غالب اور کلکتہ (خطوط کے آئینے میں) — ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی — 65

خطوط غالب میں اشعار غالب — سہیل برکاتی — 70

مرزا تفتہ، خطوط غالب کے آئینے میں — محمد سجاد ساجد — 84

نامہ غالب — ڈاکٹر عبادت بریلوی — 87

غالب کا ایک منظوم خط — مسلم ضیائی — 97

نامہ بر اکثر کھلا — پروفیسر سجاد باقر رضوی — 103

چند بیرنگ خطوط مرزا صاحب کے — ابن انشاء — 106

تفہیم غالب — شوکت تھانوی — 110

مرزا غالب بنام آئی ایم ایف — ضیاء اکرام — 115

غالب کے خطوط کی ادبی اہمیت — ڈاکٹر عبادت بریلوی — 118

غالب کے فارسی مکاتیب۔ایک جائزہ	ڈاکٹر تحسین فراقی	123
غالب کے اردو، فارسی مراسلات۔اجمالی جائزہ	پروفیسر سیف اللہ خالد	143
خطوط غالب کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر خلیق انجم	213

تلاش غالب

پہلا غالب پرست	محمد قاسم صدیقی	313
غالب کی شاعری	مولانا حسرت موہانی	315
غالب پر سرسید کا ایک سو بارہ سال پرانا مضمون		316
غالب کا تنقیدی شعور	آل احمد سرور	318
حضرت غوث علی شاہ قلندرؒ اور غالب	مختار الدین احمد آرزو	319
غالب کا طنز وظرافت	پروفیسر رشید احمد صدیقی	323
غالب کا جہان دیر وکعبہ	پروفیسر احتشام حسین	324
غالب کی داستان محبت	مسلم ضیائی	327
غالب کی ہم عصریت	صدیق کلیم	357
غالب	ڈاکٹر محمد اجمل	363
غالب اور رقیب	مالک رام	366
کلام غالب کے صوتی آہنگ کا ایک پہلو	مسعود حسین خان	367
عرفانیات غالب	شیخ محمد اکرام	371
مرزا غالب کا مذہب	میکش اکبر آبادی	372
غالب کی شخصیت	ڈاکٹر شوکت سبزواری	377
غالب کے سفر	مرزا سجاد علی خان اختر	378

غالب اور طب قدیم	حکیم محمود احمد برکاتی	383
غالب اور اردو غزل	جلیل قدوائی	387
غالب سے ملئے (فیچر)	مالک رام	388
مرزا غالب قید فرنگ میں	ملا واحدی دہلوی	397
غالب کے دیکھنے والے جنہیں میں نے دیکھا	ملا واحدی دہلوی	398
کلام غالب کا انتخاب کس نے کیا	امتیاز علی عرشی	411
غالب کی بہو سے ایک ملاقات	پروفیسر حمید احمد خاں	412
غالب (بچوں کیلئے)	رضیہ سجاد ظہیر	416
غالب کی ایک غیر مطبوعہ تحریر	تحسین سروری	429
نجات کا طالب غالب		
مرزا غالب کے کردار و سیرت کا سرسری مطالعہ	عشرت رحمانی	434
غالب کے انتقال پر پہلا مضمون	سید مسعود حسن رضوی	451
غالب کی آخری آرام گاہ	نادم سیتاپوری	554

غالب ڈرامے

حسرت تعمیر		
غالب کی شخصیت اور آرٹ پر ایک اسٹیج ڈرامہ	ڈاکٹر حامدی کاشمیری	465
ترقی پسند غالب	کنہیالال کپور	495
عہد و سوانح غالب (چار مناظر کی ایک تمثیل)	ڈاکٹر محمد اشرف	503
اچھا کہیں جسے (ٹیلی ویژن ڈرامہ)	الصبار عبدالعلی	526

نقدِ غالب

غالب کی تحقیقات مابعد الطبیاتی پس منظر میں	سید محمد تقی	545
داستان فرہاد اور غالب کا تصور محبت	مولانا غلام رسول مہر	549
غالب اور علم نفسیات	پروفیسر سردار احمد خاں	553
غالب اور علم نجوم	ابراہیم خلیل	566
غالب کی ابتدائی شاعری کا نفسیاتی پس منظر	مسلم ضیائی	576
یورپ میں غالب کا مطالعہ	آغا افتخار حسین	591
بنگلہ شاعری پر غالب کا اثر	رانل برن گنگولی	598
کشمیری شاعری پر غالب کا اثر	غلام نبی خیال	600
مرزا غالب کا علم کلام	مولانا سعید انصاری	606
غالب پر میر کا اثر	نریش کمار شاد	609
محاوراتِ غالب	ضیاء احمد بدایونی	615
کلام غالب میں شعری پیکر تراشی (ایک اشاراتی جائزہ)	فضیل جعفری	626
غالب کی شخصیت	آل احمد سرور	630
غالب کے بغیر	فتح محمد ملک	635
غالب کی بغاوت	مظفر علی سید	642
غالب اور حرم	نور العین نوید	651
غالب ایک جدید شاعر	ڈاکٹر وزیر آغا	662
غالب کے کلام میں تحریف و تصرف	نادم سیتاپوری	673

ماہر غالبیات	وجاہت علی سندیلوی	682
غالب ذوق اور ناسخ	محمد انصار اللہ ناظر	690
غالب ایک مابعدالطبیاتی شاعر	پروفیسر احمد علی	698
فیض اور غالب	پروفیسر جعفر بلوچ	702
غالب اور حافظ کا ایک تقابلی مطالعہ	سعید احمد اکبر آبادی	711
شیخ محمد اکرام اور تنقید غالب	ڈاکٹر انور سدید	720
غالب کی جمالیات	سید علی عباس جلالپوری	738
منفرد شاعر	ڈاکٹر گیان چند	765
دیوان غالب اور اردو غزل	مجنوں گورکھپوری	769
غالب کی شاعرانہ انفرادیت	ڈاکٹر میمونہ انصاری	772
غالب کی مثنوی درد وداغ	محمد عبداللہ قریشی	775
غالب کی فارسی تصانیف	مالک رام	780
فکر تونسوی غالب کے شعر کی شرح کرتے ہیں		785
غالب ایک مکالمہ فیض احمد فیض سے انٹرویو	مختار زمن	789
غالب کی محبوبہ	حمیدہ سلطان	793
تنہائی کی وادی میں (غالب اور اختر شیرانی کے ساتھ)		797
مرزا غالب کا قصیدہ شمس الامراء		
پروفیسر حمید احمد خان کی ایک نایاب تحریر		799

نوادراتِ غالب
805

ادر تحریریں، نایاب تصویریں، جنہیں تلاش بسیار کے بعد یکجا کیا گیا یوں کہ ہر صفحہ عجائبات غالب میں شمار ہونے لگا۔ ابتدائی صفحات مکاتیب غالب کے موضوع پر بلند پایہ قلمکاروں کی نگارشات عالیہ سے مزین ہیں۔ درجہ بالا عنوان کے تحت غالب کے چند خطوط کا عکس ہم پہلی مرتبہ شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

خصوصی پیشکش
837

غالب نمبر جلد اول میں آنجہانی پرتھوی چندر کی مایہ ناز تالیف ''جاگیر غالب'' کا اصل نسخہ شامل کیا گیا تھا۔ اس مرتبہ ''مرقع غالب'' قارئین سورج کی نذر ہے۔ یہ بلند پایہ ضخیم کتاب آنجہانی کی غالب دوستی کا ایک بھرپور اظہار ہے۔

خواجہ حسن نظامی مرحوم کی ایک کتاب ''غالب کا روزنامچہ'' 1924ء میں دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ ایک کم 80 برس بعد یہ نادر و نایاب نسخہ ادارہ سورج دوبارہ منظر عام پر لے آیا۔ کتاب کے عکسی صفحات کی اشاعت زیر نظر شمارے کے ذریعے ہو رہی ہے۔

پہلی کرن

سات برس ہونے کو آئے، غالب نمبر شائع ہوا تھا۔ یہ 1996ء کی بات ہے۔ اگلے برس دسمبر کی ستائیس تو دو سو واں یوم پیدائش تھا غالب کا، دارائے سخن میرزا اسداللہ خاں غالب سیاسی انجھیڑوں اور معاشی بکھیڑوں نے قومی سطح پر ہمیں یوں گھیرا ہے کہ سخن نوازی اور ادب پروری کی سنہری روایات دور اندھیروں میں گم ہو کر رہ گئی ہیں۔ دوصد سالہ جشن غالب کی نوید بھی اس ٹھہرے پانی میں ہلچل پیدا نہ کر سکی۔ کوئی قابل ذکر کام نہ ہوا۔ بس ایک ''سورج'' کا غالب نمبر تھا کہ اہل نظر کو بھا گیا۔ ایک ادنیٰ سی کوشش کو یوں پذیرائی ملی کہ ہم بارِ تشکر سے اس خالق کائنات کے حضور جھکتے چلے گئے۔ جو عزتیں اور مرتبے بخشنے والا ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اک لگن ہے کہ دل کو جا لگی ہے۔ ایک سودا ہے جو سر میں سمایا ہے۔ پاکستان میں بھی غالب نوازی کے پھول کھلتے، غالب شناسی کی خبریں لگتیں۔ پاکستان میں بھی غالبیات پر علمی و تحقیقی کام ہوتا بلکہ یوں کہیے پاکستان ہی میں ہوتا کہ غالب بھی تو اُردو کا ہے۔ اردو بولنے والے پاکستان کا۔ یہی لگن تھی، غالب نمبر کو آخری شکل دیتے ہوئے جلد دوم کی اشاعت کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ ادھر سے اُدھر سے، یہاں سے وہاں سے، یوں جھولی بھرتی گئی اور سات برسوں میں جو جمع کیا تھا۔ جلد دوم کی صورت میں غالب دوستوں کی نذر ہے۔ کیا ہے؟ کیسا ہے؟ یہ تو آپ دیکھتے رہیے۔ البتہ اس قدر کہنا چاہوں گا کہ اس مرتبہ آپ پڑھیں گے ایسے ایسے مستند اور مسلم الثبوت غالب شناسوں کی نگارشات عالیہ اور اکثریت مکتوبات غالب کے موضوع پر حرف آخر، تحقیق اور تنقید کے شہ پارے۔ اس کے علاوہ اردو اور فارسی مراسلات کا مفصل جائزہ، یوں جلد دوم غالبیات کے اس اہم موضوع پر حوالے کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

ہم نے غالب نمبر (جلد اول) میں آنجہانی پرتھوی چندر کی مایہ ناز کتاب ''جاگیر غالب'' کو شامل کیا تھا۔ ان دنوں لاہور کے ایک صاحب اس کا جعلی ایڈیشن اپنے نام سے مارکیٹ میں لا رہے تھے۔ اس لئے ریکارڈ کی درستی کیلئے ضروری سمجھا گیا کہ اصل تالیف اصل مؤلف کے نام سے محفوظ کر دی جائے۔ یوں گرانقدر ضخیم کتب بلا قیمت سورج کے قارئین کی نذر کرنے کی خوبصورت روایت پڑی۔

اس روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے زیر نظر شمارے میں ایک نہیں، دو نادر کتب کی اشاعت خصوصی پیشکش کے

عنوان سے کی جارہی ہے۔ ایک تو ہے'' مرقع غالب'' آنجہانی پرتھوی چندر کی ایک اور بلند پایہ کاوش۔ دیکھئے تو کسی فاضل مؤلف غالب شناسی کی کس بلندی پر ہے؟

دوسرا شہ پارہ ہے خواجہ حسن نظامی کا مرتب کردہ'' غالب کا روزنامچہ''۔ یہ دستاویز قریبا 80 برس سے نایاب تھی۔ اب سورن کے صفحات پر دستیاب ہے۔ یہی نہیں نوادرات غالب کے گوشے میں تحریروں اور تصویروں کا بیش بہا خزانہ ہے جو آپ کا منتظر ہے۔

اسی خزانہ عامرہ سے ایک درِ نایاب ملاحظہ ہو۔ پروفیسر لطیف الزماں خاں کہ چہ غالب کی معروف شخصیت ہیں نے ہمیں فارسی کا ایک غیر مطبوعہ مکتوب غالب مرحمت فرمایا تھا۔ یہ تنہ درویش بھی گوشۂ نوادرات کی زینت ہے۔

اس سے پہلے کہ میں آئندہ صفحات پر بکھری تحریروں کو پڑھنے کی دعوت دوں جو منتخب غالب شناسوں کی خامہ فرسائی کا نتیجہ ہیں۔ ان احباب کی محبتوں اور شفقتوں کو یاد کرنا چاہوں گا جو زیر نظر شمارے کی ترتیب سے طباعت تک کے کٹھن مراحل طے کرنے میں میری معاون رہیں۔ وہ شام میں کیسے بھلا سکتا ہوں شدت طلب اور کلفت نارسائی نے ; بمن پراگندہ اور طبیعت مضمحل کر رکھی تھی۔ ایک روشن دماغ اور کھلے دل کے مالک نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''یارا کام کرتے رہو، ادھورا مت چھوڑ دینا''

اُن ہونٹوں سے یہ الفاظ کیا ادا ہوئے۔ میرے نہاں خانہ دل میں جگنو بکھر گئے۔ ستارے جگمگا اٹھے۔ چراغ روشن ہو گئے۔ اندھیروں کا نشان تک نہ رہا۔ ادب نوازی اور علم پروری کا یہ امین تھا۔ جلیل القدر عالم مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کا فرزندار جمند سعید احسن اصلاحی ۔ اصلاحی صاحب آپ کا بے حد شکریہ۔

میں کام کرتا رہا۔ ادھورا نہیں چھوڑا۔ جلد دوم منظر عام پر آ چکی ہے۔ اور اب تو ایک جنوں ہے کہ بے تاب کئے رکھتا ہے۔ غالبیات کے عنوان سے خوابوں کا ایک آئینہ خانہ ہے جو ہم نے سجالیا ہے۔ ان خوابوں کو تعبیر آشنا کرنے کیلئے ایک ادارے کی ضرورت تھی۔ اسی لئے غالب میموریل ٹرسٹ کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ ٹرسٹ کے اغراض و مقاصد کی تفصیلات اسی شمارے میں دی جارہی ہیں۔ اب آپ غالب نمبر کی جلد دوم کو نقد و نظر کی میزان میں تو لئے اور میں جلد سوم کے سفر پر نکلوں۔ اس کی اشاعت کا اعلان بھی تو کر چکا ہوں۔

مدیر تسلیم احمد تصور اور جناب ابوسعید احسن اصلاحی

خواجہ حسن نظامیؒ

آنجہانی پرتھوی چند

غالب میموریل ٹرسٹ

کے زیر اہتمام

غالب نمبر کی جلد سوم

ترتیب و تدوین کے مراحل میں

غالب میموریل ٹرسٹ کے زیر اہتمام

غالبیات کے باب میں نئے منصوبے

نئی ضروریات

☆ غالب کے کل فارسی کلام کے ترجمے اور شرحیں لکھوائی جائیں گی۔

☆ سہ ماہی جریدے کا اجراء

☆ غالب کے معاصرین، متعلقین اور تلامذہ کی توضیحی فہرست مرتب کی جائے گی۔

☆ عالمی سطح پر ہونیوالے غالب پر کام کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ۔

☆ غالب کے انگریزی تراجم کا لسانی تنقیدی مطالعہ

☆ نوادرات غالب کی جمع آوری۔

☆ پاکستان کی علاقائی زبانوں میں کلام غالب کے تراجم کا اہتمام

☆ غالب کے نثری وشعری متون کی صحت کے ساتھ اشاعت۔

☆ کالج اور یونیورسٹی کے طلباء وطالبات اور غالب سے عموی دلچسپی رکھنے والوں کے لئے کلام غالب کی تسہیل۔

☆ اشارات وتلمیحات غالب کی کئی جلدوں میں تیاری اور فراہمی۔

☆ انٹرنیٹ پر غالب کے فن، کلام، زندگی اور کتب پر ویب سایٹ کا قیام اور غالب ونڈوز پر تمام معلومات کی فراہمی اور اس کی تشہیر، غالبیات پر اہم لیکچرز کی ونڈوز پر فراہمی۔

☆ سی ڈیز پر غالب کے بارے میں پاکستانی اور ہندوستانی فلموں کی منتقلی، تمام ٹی وی اور تھیٹر ڈراموں کی ریکارڈنگ حاصل کرکے سی ڈی پر منتقل کرنا۔

☆ دلچسپی رکھنے والے غالب پسندوں کو غالب پر کمپیوٹرائزڈ مواد کی مناسب نرخوں پر فراہمی اور بین الاقوامی سطح پر مواد کی منتقلی۔

☆ غالب کے حوالے سے اہم دنوں کی روشنی میں ٹی وی پر خصوصی پروگراموں کا اجراء۔

☆ غالب کی نمائندہ غزلوں کو جدید انداز میں ریکارڈ اور عکس بند کرکے تجارتی بنیادوں پر تیار کرنا۔

☆☆☆☆☆☆☆

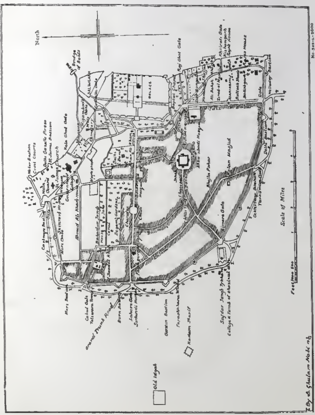

ما بعد دلی کا ایک منظر 1857ء

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

نقوش

غالب کے خطوط، غالب شناسوں کی نظر میں

ناصر عابدی

سرگزشتِ غالب
(غالب کے خطوط سے ترتیب دی گئی)

خاندان ونسب

میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں۔ دادا میرا ماوراءالنہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان میں آیا۔ سلطنت ضعیف ہو چکی تھی صرف پچاس گھوڑے نقارہ نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ اور رسالہ کی تنخواہ میں پایا۔ بعد انتقال اس کے جو طوائف الملوکی کا ہنگامہ گرم تھا وہ علاقہ نہ رہا۔ باپ میرا عبداللہ بیگ خان۔ لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کا نوکر ہوا۔ پھر حیدر آباد میں نواب نظام علی خاں کا ملازم ہوا وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی والد نے گھبرا کر انور کا قصد کیا۔ راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا۔ نصراللہ بیگ خان میرا چچا حقیقی مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبہ دار تھا۔ اس نے مجھے پالا۔ ۱۸۰۶ء میں جب جنرل لیک صاحب نے حکم دیا۔ چار سو سواروں کا بریگیڈیر ہوا۔ ایک ہزار سات سو روپیہ تنخواہ کا اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر میں حیات علاوہ سال بھر مرزبانی کی تھی کہ برگ ناگاہ مرگیا۔ رسالہ برطرف ہو گیا۔ ملک کے عوض نقدی مقرر ہو گئی۔

پیدائش

عالم دو ہیں۔ ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل۔ قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں۔ لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔

لڑکپن اور تعلیم

میرا حقیقی بھائی کل ایک تھا وہ تیس برس دیوانہ رہ کر مرگیا۔ پانچ برس کا تھا جو باپ مرگیا۔ آٹھ برس کا تھا جو چاچا مرگیا۔ مجھ کو مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے چونکہ مجھ کو لوگ بے استاد کہتے تھے ان کا منہ بند کرنے کو ایک فرضی استاد گھڑ لیا ہے۔

حلیہ

میرا قد درازی میں انگشت نما ہے جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا

کرتے تھے۔ اب جب کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے جب داڑھی مونچھ میں بال سفید آ گئے۔ تیسرے چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت گئے نا چار مستی بھی چھوڑی اور داڑھی بھی مگر یہ بھی یاد رکھئے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی عام ہے' ملا' حافظ' بساطی' نیچہ بند' دھوبی' سنے' بھٹیارہ' جولاہہ' کنجڑا' منہ پر داڑھی رکھتا ہے۔ سر پر بال۔ فقیر نے جس دن داڑھی رکھی اسی دن سر منڈایا۔

مذہب

مسائل دیکھنا اور مسائل..... نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے اور عرفاء کے کلام سے حقیقت حقہ وحدت وجود کو اپنے دل نشین کرنا اور ہے مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں' مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو نومسلموں کو ابوالائمہ کا ہمسر مانتے ہیں۔ دوزخ ان لوگوں کے واسطے ہے۔ میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں زبان سے لا الہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ لا موثرنی الوجود اللہ سمجھے ہوئے ہوں۔ انبیاء سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الاطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمتہ اللعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہیں ثم حسین اسی طرح تامہدی موعود علیہ السلام۔

بریں ریسنم ہم بریں بگذرم

ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہو گا بلکہ دوزخ کی آنچ کو تیز کروں گا تاکہ مشرکین اور منکرین نبوت مصطفوی و امامت مرتضوی اس میں جلیں۔

مجھ میں کوئی بات مسلمانی کی نہیں ہے۔ پھر میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی ذلت پر مجھ کو کیوں اس قدر رنج و تاسف ہوتا ہے۔

صوفی صافی ہوں اور حضرات صوفیہ مراتب ملحوظ رکھتے ہیں۔

گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

شاہ محمد اعظم صاحب خلیفہ تھے۔ مولانا فخرالدین صاحب کے اور میں مرید ہوں اس خاندان کا۔

شادی اور اولاد

تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب ۱۲۲۸ء کو میرے واسطے حکم دوام حبس عناد ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔ مگر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد اس جیل خانہ سے بھاگا تین برس بلاد مشرقی میں پھرتا رہا۔ پایان کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اسی مجلس

میں بٹھادیا۔ جب دیکھا قیدی گریز پا ہے۔ دو ہتھکڑیاں اور بڑھادیں۔

کلکتہ کا سفر

میں کلکتہ گیا۔ نواب گورنر جنرل سے ملنے کی درخواست کی دفتر دیکھا گیا۔ میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا۔ ملازمت ہوئی سات پارچے اور جیغہ سرپیچ مالائے مروارید' یہ رقم خلعت ملا۔

دہلی سے رامپور

میں نے دلی کو چھوڑا رامپور چلا۔ پنجشنبہ ۱۹ جنوری ۱۸۶۰ء کو مرادنگر اور جمعہ ۲۰ کو میرٹھ پہنچا۔ شنبہ ۲۱ کو بھائی مصطفیٰ خاں کے کہنے سے قیام کیا۔ شاہجہاں پور گڑھ مکتیشر' مراد آباد ہوتا ہوا رامپور بھی گیا رئیس کی طرف سے بطریق وکیل محکمہ کمشنری میں معین نہیں ہوں جس طرح امراء واسطے فقراء کے وجہ معاش مقرر کر دیتے ہیں۔ اسی طرح میرے واسطے مقرر ہے۔ ہاں فقیر سے دعائے خیر اور مجھ سے اصلاح نظم مطلوب ہے چاہوں دلی ہوں' چاہوں اکبر آباد' چاہوں لوہارو' رامپور میرے واسطے دارالسرور ہے جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے۔ پانی سبحان اللہ شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے اور کوسی اس کا نام ہے بے چشمہ آب حیات کی کوئی سوت اس پر ملی ہے کیر اگر یوں ہے تو آب حیات عمر بڑھاتا ہے لیکن اتنا شیریں کہاں ہوگا۔

شاعری اور تصنیف

خاکسار نے ابتدائے سن تمیز میں اردو زبان میں سخن سرائی کی ہے پھر اوسط عمر میں بادشاہ دہلی کا نوکر ہو کر چند روز اسی روش پر خامہ فرسائی کی ہے۔ نظم و نثر کا عاشق و مائل ہوں۔ ہندوستان میں رہتا ہوں مگر تیغ اصفہانی کا گھائل ہوں۔ جہاں تک زور چل سکا فارسی زبان میں بہت بکا ایک اردو کا دیوان ہزار بارہ سو بیت کا ایک فارسی کا دیوان دس ہزار کئی سو بیت کا تین رسالے نثر کے۔ یہ پانچ نسخے مرتب ہو گئے۔ اب اور کیا کہوں گا۔ مدح کا صلہ نہ ملا غزل کی داد نہ پائی۔ ہرزہ گوئی میں ساری عمر گنوائی۔ گیارہویں مئی ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولائی ۱۸۵۷ء تک کی روداد نثر میں بہ عبارت فارسی نا آمیختہ بعربی لکھی ہے اور وہ (۱۵) سطر کے مسطر سے چار جزو کی کتاب آگرہ کے مفید الاخلاق میں چھپی ہے۔ دستنبو اس کا نام رکھا ہے اور اس میں صرف اپنی سرگزشت اور اپنے مشاہدے کے بیان سے کام رکھا ہے۔

زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہ رہی حرارت غریزی کا زوال ہے اور یہ حالت ہے۔

منضمل ہو گئے قویٰ غالب
اب عناصر میں اعتدال کہاں

عالم شباب

مغل بچے غضب ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔

میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گی اور ایک قصر اور ایک حور میں اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے اس تصور سے جی گھبراتا ہے۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی وہ زمردیں کاخ اور طوبیٰ کی ایک شاخ چشم بد دور وہی ایک حور۔

مالی حالت اور افلاس

نہ جزا نہ سزا۔ نہ نفریں نہ آفریں۔ نہ عدل نہ ظلم۔ نہ لطف نہ قہر۔ پندرہ دن پہلے تک دن کو روٹی رات کو شراب ملتی تھی اب صرف روٹی مل جاتی ہے۔ شراب نہیں کپڑا' ایام تنعم کا بنا ہوا ابھی ہے اس کی کچھ فکر نہیں ہے۔ اس ناداری کے زمانہ میں جس قدر کپڑا اوڑھنا بچھونا گھر میں تھا سب بیچ بیچ کر کھا لیا گیا اور لوگ روٹی کھاتے تھے' اور میں کپڑا کھاتا تھا بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آ گیا ہے۔ رمضان کا مہینہ روزہ کھا کھا کر کاٹا آئندہ خدا رازق ہے۔ کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔ بس جب ایک چیز کھانے کو ہوئی اگرچہ غم ہی ہو تو غم کیا ہے۔

قید ہونے کا واقعہ

کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف۔ فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔ باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے۔ میرے باب میں وہ کوتوال کا یہ محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔ سیشن جج باجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ برتتا تھا' اور اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا اس نے بھی اغماض اور تغافل اختیار کیا۔ صدر میں اپیل کیا گیا مگر کسی نے نہ سنا اور وہی حکم بحال رہا۔ پھر معلوم نہیں کہ کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گزر گئی تو مجسٹریٹ کو رحم آیا اور صدر میں میری رپورٹ کی اور وہاں سے حکم رہائی کا آ گیا اور حکام صدر نے ایسی رپورٹ بھیجنے پر اس کی بہت تعریف کی سنا ہے کہ رحم دل حاکموں نے مجسٹریٹ کو بہت نفریں کی اور میری خاکساری اور آزادہ روی سے اس کو مطلع کیا۔ یہاں تک کہ اس نے خود بخود میری رہائی کی رپورٹ بھیج دی۔ اگرچہ میں ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جا سکتا جو کچھ گزرا اس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گزرنے والا ہے اس پر راضی ہوں مگر آرزو کرنا آئین عبودیت کے خلاف نہیں ہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں۔ روم ہے مصر ہے' ایران ہے' بغداد ہے۔ یہ بھی جانے دو خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ ہے اور آستانہ رحمت اللعالمین دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھئے وہ وقت کب آئے گا' کہ درماندگی کی قید سے جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جاں فرسا ہے۔ نجات پاؤں اور بغیر اس کے کہ کوئی منزل مقصود قرار دوں سر بصحرا نکل جاؤں یہ ہے جو کچھ مجھ پر گزرا ہے' یہ ہے جس کا میں آرزو مند ہوں۔

راز دانا غم رسوائی جاوید بلا است
بہر آزار غم از قید فرنگم نبود
جو را عدارود ازدل بہ رہائی لیکن
طعن احباب کم از زخم خدنگم نبود

غدر اور اس کے بعد کے حالات

مئی ۱۸۵۷ء میں ملک نے یہ فتنہ اٹھایا۔ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو پہر دن چڑھے وہ فوج باغی میرٹھ سے دہلی آئی تھی یا خود قہر الٰہی کا پے در پے نزول ہوا تھا۔ بقدر خصوصیت دلی ممتاز ہے ورنہ سرتاسر قلمرو ہند میں فتنہ دبلا کا دروازہ باز ہے انا للہ وانا الیہ راجعون۔

غدر میں میرا گھر نہیں لٹا مگر میرا کلام میرے پاس کب تھا کہ نہ لٹتا۔ بھائی ضیاء الدین خاں صاحب اور ناظر حسین مرزا صاحب ہندی و فارسی نظم و نثر کے مسودات مجھ سے لے کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے۔ سو ان دونوں گھروں پہ جھاڑو پھر گئی۔ نہ کتاب رہی نہ اسباب رہا۔ پھر اب میں اپنا کلام کہاں سے لاؤں۔ اسی ہنگامہ میں ایک روز کچھ گورے میرے مکان میں گھس آئے تھے مگر انہوں نے اپنی نیک خوئی سے گھر کے اسباب کو بالکل نہیں چھیڑا مگر مجھے اور میرے دونوں بچوں کو اور دو تین نوکروں کو مع چند ہمسایوں کے کرنیل براؤن کے روبرو جو میرے مکان کے قریب حاجی قطب الدین سوداگر کے گھر میں مقیم تھے لے گئے۔ کرنیل براؤن نے بہت نرمی اور انسانیت سے سارا حال پوچھا اور رخصت کر دیا۔ ۱۸۵۷ء میں امن ہوا۔ حکیم احسن اللہ خاں کے مکانات پھر ان کو مل گئے ہیں اور یہ حکم ہے کہ شہر سے باہر نہ جاؤ۔ گھر سے باہر نہ نکلو اپنے گھر میں بیٹھے رہو۔ نواب حامد علی خاں کے مکانات سب ضبط ہو گئے۔ وہ قاضی کے حوض پر کرایہ کے مکانات میں مع بال بچوں کے رہتے ہیں۔ باہر جانے کا حکم ان کو بھی نہیں۔ میرزا الٰہی بخش کو حکم کرانچی بندر جانے کا ہے۔ انہوں نے زمین پکڑ لی ہے۔ سلطانجی میں رہتے ہیں۔ دیکھئے یہ جبر اٹھ جائے یا خود اٹھ جائیں نواب مصطفیٰ خاں بہ معیاد سات برس کی قید ہو گئے تھے سو ان کی تقصیر معاف ہوئی اور ان کو رہائی ملی صرف رہائی کا حکم آیا ہے جہانگیر آباد کی زمینداری اور دلی کی املاک اور پنشن کے باب میں ہنوز کچھ حکم نہیں ہوا۔ ناچار وہ رہا ہو کر میرٹھ ہی میں ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں۔ میں بمجرد اس خبر کی استماع کے ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا۔ ان کو دیکھا۔ چار دن وہاں رہا۔ پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔ تاریخ آنے جانے کی یاد نہیں مگر ہفتہ کو گیا اور منگل کو آیا آج بدھ دوم فروری ہے مجھ کو آئے ہوئے نواں دن ہے۔

مسموع ہوا ہے کہ ایک محکمہ لاہور میں معاوضہ نقصان رعایا کے واسطے تجویز ہوا ہے اور حکم ہوا ہے کہ جو رعیت کا مال کالوں نے لوٹا ہے البتہ اس کا معاوضہ بحساب دہ یک سرکار سے ہو گا۔ یعنی ہزار روپیہ مانگنے والے کو سو روپیہ ملیں گے اور جو گوروں کے وقت کی غارت گری ہے وہ ہدر اور بجل ہے اس کا معاوضہ نہ ہو گا۔

جو احکام کہ دلی میں صادر ہوئے ہیں وہ احکام قضاء قدر میں ان کا مرافعہ کہیں نہیں۔ اب یوں سمجھ لو کہ نہ ہم کبھی کہیں کے رئیس تھے نہ جاہ و حشم رکھتے تھے نہ املاک رکھتے تھے نہ پنشن رکھتے تھے۔

آغا باقر کا امام باڑہ اس سے علاوہ کہ خداوند کا عزا خانہ ہے ایک بنائے قدیم وضع مشہور ہے اس کے انہدام کا غم کس کو نہ ہو گا۔ یہاں دو سڑکیں دوڑی پھرتی ہیں ایک ٹھنڈی سڑک اور ایک آہنی سڑک محل ان کا الگ الگ اس سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ گوروں کا بارگ بھی شہر میں بنے گا' قلعہ کے آگے جہاں لال ڈگی ہے ایک میدان نکالا جائے گا۔ محبوب کی دوکانیں سیلیوں کے گھر نیل خانہ بلاقی بیگم کے کوچہ سے خاص بازار تک یہ سب میدان ہو جائے گا یوں سمجھ لو کہ اموں جان کے دروازے سے قلعہ کی خندق تک سوائے لال ڈگی اور دو چار کنوؤں کے آثار عمارت باقی نہ رہیں گے۔ جاں نثار خاں کے چھتے کے مکان ڈھینے شروع ہو گئے ہیں۔

بس کہ فعال ماریدہے آج
ہر سلح شور انگلستان کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک
آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا
وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوے
سوزش داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم
ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

فیل خانہ ملک پھر لال ڈگی کے محاذی کے مکانات سب گرا دیئے گئے بلاقی بیگم کا کوچہ التواء میں ہے۔ اہل فوج ڈھانا چاہتے ہیں۔ اہل قلم بچاتے ہیں۔ پایان کار دیکھیے کیا ہو۔

گورنر اعظم نے میرٹھ میں دربار کا حکم دیا صاحب کمشنر بہادر دہلی نے سات جاگیرداروں میں سے جو تین بقیۃ الیف تھے ان کو حکم دیا۔ دربار عام سے سوا میرے کوئی باقی نہ تھا یا چند مہاجن۔ مجھ کو حکم نہ پہنچا۔ جب میں نے

استدعا کی تو جواب ملا کہ اب نہیں ہو سکتا۔ جب یہ سرزمین مخیم خیام گورنری ہوئی میں اپنی عادت قدیم کے موافق خیمہ گاہ میں پہنچا مولوی اظہار حسین خاں صاحب بہادر سے ملا۔ چیف سیکرٹری بہادر کو اطلاع کی۔ جواب آیا کہ فرصت نہیں۔ میں سمجھا کہ اس وقت فرصت نہیں۔ دوسرے دن پھر گیا۔ میری اطلاع کے بعد حکم ہوا کہ ایام غدر میں تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے۔ اب گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو۔ اس دن چلا آیا۔ دوسرے دن میں نے انگریزی خط ان کے نام لکھوا کر ان کو بھیجا۔ مضمون یہ کہ باغیوں سے میرا اخلاص مظنہ محض ہے۔ امیدوار ہوں کہ اس کی تحقیقات فرمائی جائے۔ تاکہ میری صفائی اور بیگناہی ثابت ہو۔ یہاں کے مقامات پر جواب مرحمت ہو۔ اب فروری ۱۸۶۰ء میں پنجاب کے ملک سے جواب آیا کہ لارڈ صاحب بہادر فرماتے ہیں ہم تحقیقات کریں گے' بس یوں یہ مقدمہ طے ہوا۔ دربار اور خلعت موقوف پنشن مسدود۔ وجہ لامعلوم لاموجود الا اللہ ولا موثر فی الوجود اللہ۔ میں رگدائے مبرم اس حکم پر ممنوع نہ ہوا جب لارڈ صاحب بہادر کلکتہ پہنچے۔ میں نے قصیدہ حسب معمول قدیم بھیج دیا۔ مع اس حکم کے واپس آیا کہ اب یہ چیزیں ہمارے پاس نہ بھیجا کرو۔ میں مایوس مطلق ہو کر بیٹھ رہا۔ اور حکام شہر سے ملنا ترک کر دیا۔ فروری ۱۸۶۳ء میں نواب لفٹینٹ گورنر دلی آئے۔ اہالی شہر صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر صاحب کمشنر بہادر کے پاس دوڑے اور اپنے نام لکھوا آئے۔ میں تو بیگانہ محض اور مطرود حکام تھا۔ جگہ سے نہ ہلا کسی سے نہ ملا۔ دربار ہوا۔ ہر ایک کامگار ہوا۔ ۸ فروری ۱۸۶۲ء کو آزادانہ منشی پھول سنگھ کے خیمہ میں چلا گیا۔ اپنے نام ٹکٹ صاحب سکرٹر بہادو کے پاس بھیجا۔ بلا لیا مجھ سے بے تکلف ملے دو شنبہ ۲ مارچ ۱۸۶۳ء کو سواد شہر مخیم خیام گورنری ہوا۔ آخر روز میں اپنے شفیق قدیم جناب مولوی اظہار حسین خاں بہادر کے پیا گیا۔ اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ تمہارا دربار اور خلعت بدستور بحال و برقرار ہے۔ تبجرانہ میں نے پوچھا کہ حضرت کیونکر حضرت نے کہا کہ حاکم حال نے ولایت سے آکر تمہارے علاقے کے سب کاغذ انگریزی و فارسی دیکھے اور باجلاس کونسل حکم لکھوایا کہ اسد اللہ خاں کا دربار نمبر اور خلعت بدستور بحال و برقرار رہے۔

کار ساز ما بفکر کارما
فکر ما در کار ما آزار ما

سہ شنبہ ۳ مارچ کو ۱۲ بجے نواب لفٹینٹ گورنر بہادر نے مجھ کو بلایا خلعت عطا کیا اور فرمایا کہ لارڈ صاحب بہادر کے یہاں کاروبار اور خلعت بھی بحال ہے۔

شراب و آم کا شوق

جب دو جرعے پی لیے فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی۔ دل توانا' دماغ روشن ہو گیا۔ چار بوتل شراب تین شیشے گلاب کے توشہ خانہ میں موجود ہیں۔

ایک دن میں پلنگ پر لیٹا ہوں کہ ناگاہ چراغ دودمان علم و یقین سید نصیرالدین تو ایک کوڑا ہاتھ میں اور ایک آدمی ساتھ اس کے سر پر ایک ٹوکرا اس پر گھاس پر بجھی میں نے کہا آہا سلطان العلماء مولانا سرفراز حسین دہلوی دوبارہ رسد۔ بارے معلوم ہوا کہ وہ نہیں ہے یہ کچھ اور ہے فیض عام نہیں ہے لطف عام ہے۔ یعنی شراب

نہیں آم ہے۔ خیر یہ عطیہ بھی بے خلل ہے' بلکہ نعم البدل ہے ایک ایک کو سر مہر گلاس سمجھا۔ لکور سے بھرا مگر وہ کیسی حکمت سے بھرا ہوا ہے کہ ۶۵ گلاس میں سے ایک قطرہ نہیں گرا ہے۔

سخت علالت

میں بیمار ہو گیا۔ بیمار کیا ہوا توقع زیست کی نہ رہی۔ قولنج اور پھر کیسا شدید کہ پانچ پہر مرغ نیم بسمل کی طرح تڑپا کیا آخر عصارہ ریوند اور ارنڈی کا تیل پیا۔ اس وقت تو بچ گیا مگر قصہ قطعی نہ ہوا۔ دس دن میں دو بار آدھی آدھی غذا کھائی گویا دس دن میں ایک بار غذا تناول فرمائی۔ گلاب اور املی کا پتا اور آلو بخارہ کا افسردہ اس پر مدار رہا۔

بڑھاپا اور آخری حالت

سترہ بہترہ اردو میں ترجمہ پیر خرف ہے میری تہتر برس کی عمر ہے پس میں خرف ہوا۔ حافظہ گویا کبھی تھا ہی نہیں۔ سامعہ باطل بہت دن سے تھا' رفتہ رفتہ وہ بھی حافظہ کے مانند معدوم ہو گیا۔ اب یہ حال ہے جو دوست آتے ہیں۔ رسمی پرسش مزاج سے بڑھ کر جو بات ہوتی ہے۔ وہ کاغذ لکھ دیتے ہیں۔ غذا مفقود ہے صبح کو قند اور شیرۂ بادام مقشر دوپہر کو کاشت کا پانی' سر شام تلے ہوئے چار کباب سوتے وقت پانچ روپے بھر شراب میں قدر گاب خرن ہوں پوچ ہوں عاصی ہوں' فاسق ہوں' روسیاہ ہوں شعر میر تقی کا میرے حسب حال ہے۔

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم
القصہ نہ در پے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

آخری عمر کے خیالات دنیا سے بے دلی

میں اب انتہائے عمر ناپائیدار کو پہنچ کر آفتاب لب جام اور امراض جسمانی اور آلام روحانی سے زندہ درگور ہوں کچھ یاد خدا بھی ہے نظم و نثر کے قلمرو کا انتظام ایزد دانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہو چکا۔ اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام و نشان رہے گا۔

غالب بقول حضرت حافظ ز فیض عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

قاضی عبدالودود

غالب نے اردو میں خط و کتابت کب سے شروع کی؟

غالب نے اردو میں خط و کتابت کب سے شروع کی؟ اس سوال کا جواب سب سے پہلے حالی کی یادگار غالب میں تلاش کرنا چاہیے۔ حالی لکھتے ہیں :

"معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے مگر سنہ مذکور میں جب کہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیے گئے اور ہمہ تن مہر نیم روز کے لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ اس وقت بہ ضرورت ان کو اردو میں خط و کتابت کرنی پڑی ہوگی۔ وہ فارسی نثریں اور اکثر فارسی خطوط جن میں قوت متخیلہ کا عمل اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے' نہایت کاوش سے لکھتے تھے۔ پس جب ان کی ہمت مہر نیم روز کی ترتیب و انشاء میں مصروف تھی' ضرور ہے کہ اس وقت ان کو فارسی زبان میں خط و کتابت کرنی اور وہ بھی اپنی طرز خاص میں شاق ہوئی ہوگی۔ اس لیے قیاس چاہتا ہے کہ انہوں نے غالباً ۵۰ء کے بعد سے اردو زبان میں خط لکھنے شروع کیے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہ رہی۔"

حالی نے غالب (۱) کا جو قول نقل کیا وہ غدر کے بعد کا ہے اور اس سے صرف اسی قدر ثابت ہوتا ہے کہ ضعف پیری کی وجہ سے غالب نے فارسی میں خط لکھنا ترک کر دیا تھا۔ اردو میں پہلے پہل کب خط لکھا اور کیوں لکھا اس کے متعلق کسی نتیجے پر پہنچنے میں اس سے مطلق مدد نہیں ملتی۔ حالی کا یہ دعویٰ کہ اردو میں خط لکھنا شروع کیا' جب مہر نیم روز کی تصنیف میں مصروف تھے' محض قیاس پر مبنی ہے اور کوئی ایسی روایت اس کی موید ہو' موجود نہیں۔ اس سے قطع نظریہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب بہ ظاہر مہر نیم روز کی تصنیف اواسط (۲) ۵۰ء سے شروع ہوئی تو حالی نے یہ کیوں لکھا کہ غالب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ۵۰ء تک غالب نے کبھی اردو میں خط لکھا ہی نہیں۔ یا ان کا یہ مطلب ہے کہ عموماً فارسی میں لیکن کبھی کبھی اردو میں بھی لکھا کرتے تھے۔ حالی نے یادگار غالب میں ایک جگہ ہمیشہ کو عموماً (۳) کے معنی میں استعمال کیا ہے لیکن اس سے لازمی طور پر نتیجہ نہیں نکلتا کہ اس موقع پر بھی ان کا یہی مطلب ہے۔ ایک بات اور بھی قابل توجہ ہے۔ اقتباس بالا میں شاید

(۴) ہی کوئی بات حالی نے قطعی طور پر کہی ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ غالبا قیاس چاہتا ہے اور اس قسم کے دوسرے الفاظ جابجا ملتے ہیں۔

غلام رسول صاحب مہر کی رائے (۵) میں "غالب ۱۸۵۰ء سے قبل اردو میں خط و کتابت شروع کر چکے تھے۔ لیکن چونکہ اس زمانہ میں اردو نثر کو اہل علم بلند پایہ نہیں دیتے تھے اس لیے وہ خطوط محفوظ نہ رہ سکے لیکن جیسے جیسے اردو کا رواج بڑھتا گیا اور فارسی کا رواج کم ہوتا گیا' غالب کی خط و کتابت فارسی کے بجائے اردو میں زیادہ ہوتی گئی۔ (غالب طبع اول صفحہ ۳۰۸)۔ انہوں نے اردو کے ایک خط کا بھی ذکر کیا ہے جو ان کے نزدیک یکم دسمبر ۱۸۴۵ء کے کچھ بعد لکھا گیا ہے۔ مہر صاحب حالی کے اس نظریئے کو مہر نیم روز کی تصنیف میں مصروفیت اردو میں خط و کتابت شروع کرنے کا باعث ہوئی' تسلیم نہیں کرتے۔ مہر نیم روز کوئی ضخیم کتاب نہیں اور کئی سال کی مدت میں لکھی گئی ہے۔ غالب کے فارسی خطوط اردو کے خطوط کی طرح تکلفات سے عموماً آزاد ہیں اور ان کے لکھنے میں زیادہ کاوش نہیں کی گئی۔ اس کتاب کی تصنیف غالب سے "قادر الکلام اور مشاق نثر نگار" کو فارسی خط لکھنے سے مانع نہیں ہو سکتی۔ صفحہ ۳۰۷ (۳۰۸)

امتیاز علی خاں صاحب عرشی اسے ناممکن نہیں سمجھتے کہ غالب نے ۵۰ء سے قبل بھی اردو میں مراسلت کی ہو' لیکن وہ اس کے قائل نہیں کہ اس سنہ سے قبل کا کوئی اردو خط موجود ہے۔ یہ امکان بھی محض فلسفیانہ امکان ہے' ورنہ ان کا اصلی خیال (۶) یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے ۵۰ء سے پہلے اردو میں کوئی خط لکھا ہی نہیں۔ مہر نیم روز کے معاملہ میں وہ حالی کے ہمنوا ہیں۔ (دیباچہ مکاتیب غالب طبع ثانی صفحہ ۱۳۸ و ۱۳۵)

مہیش پرشاد صاحب نے کوئی رائے ظاہر نہیں کی لیکن انہوں نے ایک خط کا زمانہ تحریر اگست ۴۹ء متعین کیا ہے۔ (خطوط غالب صفحہ ۲)

سوال زیر بحث کا تسلی بخش جواب حاصل کرنے کے لیے غالب کی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کرنا مناسب ہوگا۔

۱ - تقریباً ۱۸۰۵ء تک

غالب نے دو جگہ (۷) فخریہ یہ لکھ دیا ہے کہ میری زبان فارسی ہے مگر یہ ان کا اصلی خیال نہیں' فارسی سے ان کا تعلق کس قسم کا ہے اس کے بارے میں ان کی حقیقی رائے قاطع برہان میں ملتی ہے :

"نیاز ے آرم و پوزش ے گسترم تا مردم نہ گویند کہ خود ہندوستان زاد بودن و ہندوستان زبان دیگر را ..... مسلم نہ داشت و خود علم پندار زبان دانی افراشتن چہ معنی دارد۔ گویم ے گویم کہ بنیائے من از ماوراء النہر بود و پدرم در دہلی پیکر پذیرفت و من در آگرہ منشور ہستی یافتم' حاشا کہ خود را از اہل زبان گیرم زبان دانی من بہ فروہ سہ فروزنہ خدا آفرید و سہ گوہر ازل آوردست۔" (قاطع طبع ثانی صفحہ ۱۳۱)

فارسی غالب کی مادری زبان نہ تھی۔ اسے انہوں نے استاد ہی سے سیکھا تھا۔ اپنی تعلیم کے ابتدائی زمانے

میں وہ لکھنا پڑھنا جاننے پر بھی فارسی سے ناواقف رہے ہوں گے اور ایسا زمانہ یہی ہوگا جب وہ فارسی اتنی کم جانتے ہوں کہ اس زبان میں خط نہ لکھ سکتے ہوں۔ اس زمانہ کا کوئی خط موجود نہیں اور نہ اس کی شہادت پیش کی جا سکتی ہے کہ کسی کو خط لکھا۔ لیکن قیاس چاہتا ہے کہ خط لکھے ہوں اور وہ اردو میں ہوں۔ غالب نے شعر بھی پہلے اردو میں کہے ہیں، پھر فارسی میں۔

۲۔ اواسط ۱۸۵۰ء تک

اس دور میں غالب نے رفتہ رفتہ فارسی پر قدرت حاصل کی، اور کچھ مدت کی مشق کے بعد صاحب طرز انشا پرداز قرار پائے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس دور کے آخر میں غالب کی عمر ۵۰ سے اوپر تھی اور ان کے قوائے جسمانی کا انحطاط شروع ہو چکا تھا۔ زمانے کی روش کے مطابق غالب نے عموماً فارسی میں خط لکھے ہوں گے۔ لیکن کبھی کبھی اردو میں لکھنے کی بھی ضرورت پیش آئی ہوگی۔ اس کی دو وجہیں ہیں :

(۱) غالب سے سروکار رکھنے والوں میں ایسے لوگ جو لکھنا پڑھنا جاننے کے باوجود فارسی سے بالکل ناواقف ہوں یا اس سے کافی واقفیت نہ رکھتے ہوں، ضرور ہوں گے۔ اور وقتاً فوقتاً ایسے لوگوں سے مراسلت بھی ہوتی ہوگی۔ انہیں فارسی میں خط لکھنے کے معنی یہ ہوئے کہ خواہ مخواہ ترجمہ کرانے کی زحمت دی جائے۔ ناچار اردو ہی میں خط لکھنا پڑا ہوگا۔ اس طرح کبھی کبھی ناخواندہ لوگوں کو بھی خط لکھنے کی ضرورت پڑی ہوگی اور انہیں بھی فارسی کی جگہ اردو میں خط لکھا ہوگا۔ غالب کی زوجہ امراؤ بیگم (۸)، گمان غالب ہے کہ ناخواندہ ہوں، بنارس و کلکتہ سے جو خط غالب نے انہیں بھیجے تھے اور جن کا ذکر پنج آہنگ (۹) کے نام کے خطوط میں ہے، وہ کس زبان میں ہوں گے؟

(۲) پنج آہنگ کے ڈیڑھ دو سو خطوں میں بہت کم خط ایسے ہیں جن میں غالب نے انشا پردازی کا کمال دکھانے کی کوشش نہ کی ہو۔ ایسے خط "محنت پژوہی اور جگر کاوی" کے بغیر نہیں لکھے جا سکتے۔ کم از کم غالب کے لیے یہ ممکن نہ تھا اور اس کا خود انہیں اعتراف ہے۔ (خط بنام شاکر) ان کی زندگی میں ایسے لمحات جب وہ محنت سے گھبراتے ہوں، ضرور ہوں گے۔ ایسی صورت میں اگر مراسلت کی ضرورت پیش آئی ہو تو اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ یا تو "سرسری" اور عامیانہ (۱۰) فارسی میں خط لکھیں یا اردو کو نوازیں۔ پنج آہنگ میں ایسے (۱۱) خط جن میں شاعری کا عنصر کم یا وہی مفقود ہیں ضرور۔ لیکن ایسے خط نہیں جو "قلم سنبھال کر" نہ لکھے گئے ہوں۔ "سرسری" اور عامیانہ فارسی پر غالب کا اردو ترجیح دینا بالکل قرین قیاس ہے اس لیے کہ معمولی فارسی لکھنا ان کے ادبی شکوہ کے منافی تھا اور اردو ایسی زبان ہی نہ تھی جس میں کسی کو یہ امید ہو کہ غالب یا کوئی اور محض انشا پردازی کا کمال دکھا سکے گا۔ غالب حسام الدین حیدر خاں نامی کو لکھتے ہیں :

> "جواب ایں نامہ سرسری باید نہ پہلوی دوری، واگر خواہم کہ روش بہ گردانم ہر آئینہ ناموس سخن دری مرازیاں دارد .... امید کہ ملازمان (؟) بندہ خود را دریں کشاکش نہ پسندند "پنج آہنگ" صفحہ ۱۱۴ و ۱۱۵)

اردو خطوں اور اردو زبان کے متعلق غالب کی رائے "کوئی رقعہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہو" (خطوط غالب صفحہ ۳۰) میں اردو میں اپنا کمال کیا ظاہر کر سکتا ہوں؟ اس میں گنجائش عبارت آرائی کی کہاں ہے؟ (خطوط صفحہ ۳۹۱)

اس دور کے اواخر میں انحطاط قوئی کی وجہ سے اردو خطوں کی تعداد بڑھ گئی ہوگی۔ اس زمانے کے کم از کم دو خط موجود بھی ہیں۔ پہلا خط اردوئے معلی میں ہے مگر اس پر تاریخ ثبت نہیں ہے۔ خطوط صفحہ (۲۰۱) میں مہیش پرشاد صاحب نے داخلی شہادت کی بناء پر اس کا زمانہ تحریر اگست ۱۸۴۹ء بتایا ہے۔ تبصرہ خطوط غالب میں جو معاصرنے شائع کیا تھا میں نے اس کے متعلق لکھا تھا "غالب نے دیوان تفتہ کا دیباچہ تحریر کیا تھا۔ تفتہ کو اپنی تعریف امید سے کم نظر آئی۔ غالب سے شکایت کی تو غالب نے دیباچے کا ایک فقرہ بدل دیا۔ خط میں اسی کی اطلاع ہے۔ اس کا زمانہ مرتب نے اسعد الاخبار آگرہ کے ۲۰ اگست کے پرچے سے متعین کیا ہے۔" اس لیے کہ اس میں غالب کی تقریظ ۱۳) کا ذکر ہے" ذیل میں اسعد الاخبار کے دو اقتباس اور عرشی صاحب کے خط کا ایک ٹکڑا نقل کیا جاتا ہے۔ ان سے جو نتائج نکلتے ہیں ان سے مرتب کے بتائے ہوئے زمانے کی قطعی طور پر تغلیط ہوتی ہے۔

(۱) دیوان (۱۴) تفتہ جو اس مطبع میں چھپا ہے ربع سے زیادہ چھپ چکا ہے' وہ بھی اس موسم سرما میں انشاء اللہ تعالیٰ تمام ہوگا۔ اس کی ضخامت ۴۵ جزو کے قریب ہے اور قیمت چار روپے بعد اختتام کے پانچ ہو جائیں گے۔ اکثر شائقان سخن نے اس کی درخواست مع زر ثمن داخل مطبع کی ہے کیونکہ وہ دیوان عجب فصاحت خیز اور لطف انگیز ہے۔ اکثر اشخاص اس کے طبع ہونے کی خبر سن کر بہت خوش ہوئے ہیں۔ خصوصاً اسد اللہ خاں غالب دہلوی تو اس کے بہت ثناخواں ہیں۔ (اسعد الاخبار ۲۰ اگست ۱۸۴۹ء مطابق ۲۹ رمضان ۱۲۶۵ھ)۔

(۲) ان دنوں میں دیوان تفتہ سکندر آبادی اس مطبع میں چھپنا شروع ہوا ہے اور یہ وہی دیوان ہے جس کا اشتہار اخبار ہذا میں اواخر ۱۸۴۷ء میں دیا گیا تھا۔ بہ سبب عدیم الفرصتی کے اب تک ملتوی رہا۔ اب اس کی تدبیر کی گئی ہے۔ (اسعد الاخبار ۱۸ دسمبر ۱۸۴۸ء مطابق ۲۱ محرم ۱۲۶۵ھ)۔

(۳) تفتہ کے دو دیوان ہیں (۱۵)۔ ان میں سے پہلے کے شروع میں میرزا صاحب کی تقریظ ہے۔ اس کا چھاپا اواخر ۱۲۶۵ھ میں شروع ہوا اور اوائل ۱۲۶۷ھ میں انجام کو پہنچا۔ تقریظ میں تاریخ نہیں دی۔ جس صفحے پر یہ ختم ہوتی ہے اس کی باقیماندہ جگہ میں "حقیر کا قطعہ آغاز طباعت ہے جس سے ۱۲۶۵ھ برآمد ہوتے ہیں۔

ان اقتباسات سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں :

(۱) دیوان اور اس کی تقریظ غالباً اواخر ۴۷ء ہی میں صاحب مطبع کے پاس پہنچ گئی تھی۔ اگر یہ قیاس صحیح ہے تو تقریظ ۴۷ء یا اس سے بھی قبل کی لکھی ہوئی ہے۔

(۲) دیوان تفتہ کا چھاپا اوائل ۱۲۶۵ھ (اواخر ۴۸ء) میں شروع ہو گیا تھا (جناب عرشی (۱۶) نے اواخر سہواً" لکھا ہے)

(۳) ۲۰ اگست ۱۸۴۹ء تک ۱۲ جز کے قریب چھپ چکا تھا۔

(۴) تقریظ آغاز دیوان میں ہے اور اس کے آخری صفحے میں حقیر کا قطعہ تاریخ' اس لیے دیوان کا یہ حصہ سب سے پہلے چھپا' اور اس کا زمانہ انطباع اواخر ۱۸۴۸ء ہے۔

یہ متحقق ہو جانے کے بعد کہ تقریظ کا زمانہ ابطباع اواخر ۱۸۴۸ء ہے۔ یہ قطعی طور پر معلوم ہوگیا کہ غالب نے اسے اواخر ۱۸۴۸ء سے پیشتر لکھا ہوگا۔ اس کے بعد یہ تسلیم کرنا ناممکن ہے کہ خط اگست ۱۸۴۹ء میں تحریر ہوا۔

عرشی صاحب نے دیباچہ مکاتیب غالب طبع ثانی میں (ص ۱۴۱ تا ص ۱۴۳ میرے بیان پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور خط زیر بحث کے زمانہ کتابت کے متعلق بالکل مختلف رائے ظاہر کی ہے۔ عرشی صاحب کی تنقید کا خلاصہ یہ ہے :

(۱) تقریظ سرورق کے دوسرے رخ سے شروع ہوتی ہے اور سرورق پر مہتمم مطبع نے لکھا ہے :

این نسخہ ...... دیوان تفتہ در مطبع اسعد الاخبار ...... بہ اواخر ۱۲۶۵ھ شروع گردیدہ باوصف انواع موانع وعوائق در اوائل ۱۲۶۷ھ بہ اختتام رسید۔

(۲) ۲۰ اگست کے بعد اسعد الاخبار میں بظاہر تقریظ ہی کی طرف اشارہ ہے۔ چونکہ غالب نے پسندیدگی کا ذکر پہلی بار اواسط ۱۸۴۹ء میں ہوا' لازماً" اس کا اظہار اسی زمانہ میں کیا گیا ہوگا۔ (یعنی یہ تقریظ اسی زمانے کی لکھی ہوئی ہے۔

(۳) غالب نے ۱۰ فروری ۱۸۴۹ء اور ۲۰ اگست ۱۸۵۰ء مذکور ہی کی درمیانی مدت میں یہ تقریظ لکھی ہے اس لیے کہ ۱۰ فروری کو فارسی خط میں غالب نے تفتہ کو لکھا ہے :

ازاں دو ہزار بیت کہ نوشتہ اند کہ در اکبر آباد گفتہ ام' ماہم در اوراق اخبار اکبر آبادی شاہدہ کروم ایم' خوش گفتہ اند بہ راہے کہ ماے خواہیم رفتہ اند'

۱۰ فروری تک غالب نے دو ہزار اشعار دیکھے تھے۔ غالب اظہار رائے میں بڑے محتاط تھے۔ تفتہ نے ان اشعار کی اصلاح کے بعد تقریظ کی درخواست کی ہوگی۔

(۴) تقریظ کی ترمیم اواخر ۱۸۵۰ء میں تقریظ کے چھاپے جانے سے کچھ قبل ہوئی۔ غالب اس زمانہ میں زیادہ تر اردو میں خط لکھنے لگے تھے۔ ترمیم کی اطلاع اردو خط کے ذریعہ دی۔

میری گزارش حسب ذیل ہے :

(۱) عرشی صاحب نے دیوان تفتہ کے متعلق جو خط مجھے لکھا تھا اس میں سرورق کا حال نہ تھا۔ ورنہ میں کبھی یہ دعویٰ نہ کرتا کہ تقریظ دیوان سے پہلے اواخر ۱۸۴۸ء میں چھپی تھی۔ سرورق کی عبارت سے صرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تقریظ اواخر ۱۸۵۰ء میں طبع ہوئی اور اس میں ترمیم اس سے قبل ہو چکی تھی۔ کس قدر قبل؟ اس پر یہ عبارت مطلق روشنی نہیں ڈالتی۔

(۲) دیوان تفتہ کا اشتہار اسعد الاخبار میں پہلی بار اواخر ۱۸۴۷ء میں چھپا تھا۔ میری نظر سے ۱۱ دسمبر ۱۸۴۸ء سے قبل کے پرچے نہیں گزرے۔ اس لیے مجھے علم نہیں کہ اشتہار اول میں غالب کے متعلق کچھ تھا یا نہیں۔۔ عرشی صاحب ۲۰ اگست ۱۸۴۹ء پرچہ میں جو اشتہار ہے اس کی بنا پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس سے پہلے تقریظ کی

طرف اشارہ ہوا ہی نہیں۔ مزید تحقیق سے ثابت بھی ہو جائے جب بھی یہ لازم نہیں کہ تقریظ کے دیکھتے ہی صاحب مطبع نے اس کا ذکر کر دیا ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ صاحب مطبع کو تقریظ کا علم ۲۰ اگست ۴۹ء کو یا اس سے پہلے ہو چکا تھا۔ یہ تقریظ اصلی تھی یا ترمیم شدہ' اشتہار اس کے بارے میں ساکت ہے۔ یہ بھی قطعی نہیں کہ تقریظ ہی کی طرف اشارہ ہے مگر قیاس یہی چاہتا ہے۔

(۳) اواخر ۴۷ء میں دیوان کا اشتہار چھپا تھا مگر دیوان اس وقت کس شکل میں تھا اس کا مطلق علم نہیں۔ قیاس چاہتا ہے کہ مکمل ہو اور اس میں زیادہ (۱۷) رد و بدل کی گنجائش نہ ہو۔ اس صورت میں یہ دو ہزار اشعار دیوان دوم میں داخل ہوئے ہوں گے۔ اس کے خلاف بھی ہو تو تقریظ ایسی نہیں کہ اس کے لکھنے سے قبل کل کلام کا مطالعہ ضروری ہو۔ تفتہ غالب کے شاگرد تھے اور غالب اس سے واقف تھے کہ شاعری میں تفتہ کا کیا پایہ ہے۔ تقریظ کے لیے یہ بالکل کافی تھا۔ ذیل میں تقریظ کی وہ عبارت جس کا تعلق کلام تفتہ سے ہے' نقل کی جاتی ہے :

> "رہ رو را بہ رہ گزارے مرغزارے در نظر آوردہ و در بیابانے بہ خیابانے در آوردہ اند کہ دراں تماشا گاہ بہ پویہ نیم گام زند موج سبزہ را بیند تا بہ کمر رسیدہ و ..... گوشہ دستار را نگر واز گرانی بار گل خمیدہ ...... ہمانا رہ گزارے کہ بہ سبزہ زارے انگشت نما شدہ و پیا بانے کہ بہ خیابانے روشناس آمدہ ہمیں غالیہ اندودہ سواد مردمک مرا دو ہمیں ریحاں رقم صحیفہ مشکیں سواد است کہ در نظر داشتہ ایم دنی (؟) بے نوا را بہ دیباچہ نگاری آن گماشتہ یارب ابن سخن پیوندلش مند در فن فرزانگی یگانہ و در آئیں یگانگی فرزانہ آسمان سخن را ماہ دو ہفتہ' منشی ہرگوپال تفتہ کہ ایں فہرست گنج خانہ راز راقم کردہ اوست و ایں مجموعہ سوز و گداز فراہم آوردہ او' چہ ماہ دیدہ و ...... دل باہم آمیختہ باشد تا ایں نقش بدیع انگیختہ باشد۔ سخن عشق و عشق سخن کلام حسن و حسن کلام را بہ یک دگر سرشتہ تا چار آمیغ ہستی شیوا بیانی سرانجام یافت کہ از گرمی نفس و تشنگی جگر کہ در سخن بہ سخن داشت بہ مناسبت برشتگی حسن گفتار تفتہ نام یافت' داد شناساں شناسند و اندازہ داناں دانند کہ باآں کہ خامہ در کف سخن دراز فراوانی آزروزش سخن لاابالی پوئے و بے پروا خرام است' سخن بہ نغزی و خوبی در ذاتی در نفس خویش تمام است ..... لاجرم باچنیں دم گرم کہ ہیچ گہ دلش را از گفتار سرد نہ دارد سیہ مست مے سخن تفتہ از خود رفتہ در سخن ہائے آمدہ ہم آورد نہ دارد زیں پس ..... گزاردن حق ستائش خوبی سخن بہ دیدہ دراں مے گزارم۔" (پنج آہنگ صفحہ ۳۹' ۴۰)

تعریف یا تو بہت عام لفظوں میں ہے یا ایسی ہے کہ تفتہ کا کلام اس کا بالکل مستحق نہیں۔ غالب یہی الفاظ ہر اس شاعر کے لیے جسے وہ ناراض نہ کرنا چاہتے ہوں استعمال کر سکتے تھے۔ اظہار رائے میں بڑے محتاط ہونے سے اگر عرشی صاحب کا یہ مطلب ہے کہ غالب جچی تلی' بے لاگ رائے ظاہر کیا کرتے تھے تو اس سے اختلاف

کی بہت کچھ گنجائش ہے جہاں تک معاصرین کا تعلق ہے ان کی ناقدانہ رائیں زیادہ تر مصلحت وقت کی تابع نظر آتی ہیں۔ مثالیں بہت دی جاسکتی ہیں مگر طوالت کے خوف سے صرف چند پر اکتفا کیا جاتا ہے۔
حیا کے متعلق لکھا ہے:
"سخنش رائے زندگی سیمائے کلام الملوک ملوک الکلام است و کرش را از رخشندگی فروغ جوہر الہام" پنج آہنگ صفحہ ۳۸)
میر حسن خاں تبسل کو خاقانی پایہ کہہ کر مخاطب کیا ہے' پنج آہنگ صفحہ ۹۹ قلق کی شاعری کے متعلق لکھا ہے:
امیر خسرو و سعدی و جامی کی روش کو سرحد کمال کو پہنچایا ہے۔" (خطوط غالب صفحہ ۱۵۲)
شفق' ہاشمی اور عسکری کی شاعری' متاخرین یعنی صائب و کلیم و قدسی کے انداز کو آسمان پر لے گئے ہیں۔ (خطوط غالب صفحہ ۱۵۲)
(۳) عرشی صاحب کی رائے میں تقریظ کی ترمیم اواخر ۵۰ء میں تقریظ کے چھاپے جانے سے کچھ قبل ہوئی ہے اس کے معنی یہ ہوئے کہ تقریظ اگست ۱۹۴۹ء میں یا اس سے بھی کچھ پہلے تفتہ کے پاس پہنچ گئی۔ اور باوجود اس کے کہ وہ اس سے مطمئن نہ تھے' انہوں نے اسے بعض اصحاب کو دکھا بھی دیا۔ لیکن غالب سے ترمیم کی درخواست برس ڈیڑھ برس کے بعد کی' عرشی صاحب کے پاس اس کا ثبوت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ خط جس میں ترمیم کا ذکر ہے' اردو میں ہے۔ یہ رائے کہ غالب ۱۸۵۰ء سے قبل اردو میں خط نہیں لکھتے تھے پہلے ہی قائم کرلی گئی تھی۔ خط زیر بحث کا زمانہ تحریر ۱۸۵۰ء سے قبل قرار نہ دینا ناگزیر تھا۔ ترمیم جیسا کہ خود غالب نے لکھا ہے بہت کم تھی۔ غالب نے صرف ایک فقرہ بدل دیا تھا۔ میرے لیے یہ باور کرنا بہت مشکل ہے کہ تقریظ کی ترمیم اس کی تصنیف کے برس ڈیڑھ برس بعد ہوئی۔ میرے رائے میں تقریظ کی ترمیم اس کی تصنیف کے کچھ ہی بعد ہوئی' اور اس زمانہ میں خط بھی لکھا گیا۔ یہ زمانہ ۲۰ اگست ۴۹ء سے قبل ہے لیکن یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ کس قدر قبل ہے۔ (۱۸)
دوسرا خط جواہر سنگھ جوہر خلف لالہ بیج ل کے نام کا ہے۔ خطوط غالب میں جوہر کے نام سے جو تین خط ہیں ان میں یہ پہلا ہے۔ خط یہ ہے:

> خط تمہارا پہنچا ..... قطعے جو تم کو مطلوب تھے اس (کذا) کے حصول میں جو کوشش ہیرا سنگھ نے کی ہے میں تم سے نہیں کہہ سکتا ..... پانچ پانچ اور چار چار روپے اور دو روپے کو قطعے محل لیے اور بنوائے ..... دوڑتا پھرا۔ کلیم صاحب کے پاس کئی بار جاکر حضور والا کا قطعہ لایا۔ اب دوڑ رہا ہے۔ وبعد بہار کے قطعہ کے واسطے یقین ہے کہ دو چار دن میں وہ بھی ہاتھ آئے اور بعد اس قطعہ کے آنے کے وہ سب کو یکجا کرکے تمہارے پاس بھیج دے گا۔ مدد میں بھی اس کی کر رہا ہوں لیکن اس نے بڑی مشقت کی ہے ..... کیوں صاحب وہ ہماری لنگی اب تک کیوں نہیں آئی؟ بہت دن ہوئے جب تم نے لکھا تھا اسی ہفتے میں بھیجوں گا

مہر صاحب نے غالب کے ایک فارسی خط کی مدد سے اس خط کا زمانہ کتابت ۱۸۴۵ء کے لگ بھگ مقرر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"فارسی مکاتیب میں ایک خط ...... جوہر کے نام ہے جس میں ...... لنگی کی فرمائش کی ہے۔ اس خط کے آخر میں مطبوعہ پنج آہنگ میں یکم دسمبر ۱۸۴۸ء مطابق چہارم محرم ۱۲۵۱ھ ثبت ہے۔ ہجری اور عیسوی تاریخ میں مطابقت نہیں ہوتی ...... کم از کم ایک تاریخ ضرور غلط ہے اگر تاریخ ہجری کو ۱۲۵۱ھ کے بجائے ۱۲۶۱ھ رکھا جائے تو عیسوی تاریخ ۱۸۴۵ء ہونی چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ یہی صحیح ہے۔ ان کے اردوئے معلی کے ایک خط میں بھی ...... لنگی کا تقاضہ موجود ہے ...... یہ دونوں خطوط لازماً" ایک دوسرے سے قریب کے زمانے میں لکھے گئے ہوں۔" (غالب طبع اول صفحہ ۳۰۸)

پنج آہنگ غدر سے قبل دو بار طبع ہوئی تھی لیکن غدر کے بعد کلیات نثر میں شامل کر لی گئی۔ کلیات پہلی بار غالب کی زندگی ہی میں شائع ہوا تھا۔ اس کی پہلی اشاعت میں "آدینہ یکم دسمبر ۱۸۴۸ء چہارم محرم ۱۲۱۵ھ مرقوم ہے۔ ۱۲۱۵ھ دراصل ۱۲۶۵ھ ہے اور اس طرح عیسوی اور ہجری تاریخوں اور سنین میں مطابقت ہو جاتی ہے۔ مہر صاحب نے ۱۲۵۱ھ کلیات کی تیسری اشاعت میں دیکھا ہوگا۔ دونوں سنین کو بدلنے کی مطلق ضرورت نہ تھی۔ ان کا یہ قول کہ فارسی اور اردو خط لازماً" ایک دوسرے سے قریب زمانے میں لکھے گئے ہیں البتہ قابل قبول ہے۔

عرشی صاحب کی رائے میں خط زیر بحث کا زمانہ تحریر کیا ہے' اس کا ٹھیک پتا نہیں ملتا۔ ان کا بیان حسب ذیل ہے :

"پنج آہنگ اور اردوئے معلی میں چھ خط جوہر کے نام پائے جاتے ہیں (اس کے بعد خطوں کی فہرست دی ہے) ...... ان میں سے پہلے اور تیسرے خط میں ساڑھے تین سال چوتھے اور پانچویں میں آٹھ مہینے اور پانچویں اور چھٹے میں دس سال سے زیادہ کا فرق ہی کم تر مدت تیسرے اور چوتھے مکتوب کے درمیان ہے جو تین ماہ ہوتی ہے۔ اب محولہ بالا مکتوب کی اصل عبارت ملاحظہ ہو ...... کیوں صاحب وہ ہماری لنگی اب تک کیوں نہیں آئی؟ بہت دن ہوئے جب تم نے لکھا تھا کہ اس ہفتے بھیجیں گا" اس عبارت کا جملہ "بہت دن ہوئے" غور طلب ہے۔ چونکہ میرزا صاحب کے فارسی خطوط نمبری ۲ اور ۴ میں یہ شکایت کی گئی ہے کہ بہت دنوں سے تمہارا خط نہیں آیا" جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جوہر خطوں کے جواب میں بے حد ست تھے اور ان کے نام کے خطوط کے درمیانی وقفے ہمیں معلوم ہیں۔ لہذا کچھ بعید نہیں کہ انہوں نے لنگی بھیجنے میں ڈیڑھ دو برس گزار دیے ہوں۔ یہاں ایک اور امر قابل بیان ہے کہ جہاں تک میں نے جستجو کی ہے بہ استثنائے نواب فردوس مکان

ایسا کوئی مکتوب الیہ نہیں ہے جس کو میرزا صاحب فارسی میں خط لکھتے ہوں اور پھر فارسی مراسلت کے درمیان میں کوئی اور خط اسے لکھا ہو۔ جب وہ کسی سے اردو میں مراسلت شروع کر دیتے ہیں تو اس کے بعد اس کو فارسی خط نہیں لکھتے۔ جوہر کے نام ۱۸۴۸ء میں ایک اور اس کے بعد ۱۸۵۲ء دو فارسی خط لکھے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ درمیان میں اردو کا خط کیوں تحریر کیا گیا۔

اس خط میں میرزا صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہیرا سنگھ نے بڑی کوشش سے بادشاہ کے ہاتھ کے قطعے مہیا کر لیے ہیں۔ اب ولیعہد کے دستخطی قطعات کی فکر میں ہے۔ میں بھی اس کی مدد کر رہا ہوں۔ میرے نزدیک ولیعہد سے مراد میرزا فتح الملک ہیں جو ۱۸۳۹ء میں دارا بخت کے انتقال کے بعد ولیعہد اور ۱۸۵۴ء میں میرزا صاحب کے شاگرد ہوئے تھے۔ اس لیے ان کے دستخطی قطعوں کی تحصیل میں میرزا صاحب نے مدد دی ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر لنگی کے تقاضے والے اردو خط کو فارسی کے خط مورخہ اگست ۱۸۵۲ء کے بعد کا مانتا ہوں اور ایک دو اور تقاضائی خطوں کو گمشدہ تصور کرتا ہوں۔" (دیباچہ صفحہ ۱۳۸ تا صفحہ ۱۴۰)

میں عرض کر چکا ہوں کہ خط زیر بحث کے زمانہ تحریر کے متعلق عرشی صاحب کی اصلی رائے کا پتا نہیں ملتا۔ اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ ہو :

عرشی صاحب فرماتے ہیں کہ جوہر نے لنگی بھیجنے میں ڈیڑھ دو برس گزار دیے ہوں گے۔ فارسی خط کی تاریخ تحریر یکم دسمبر ۱۸۴۸ء ہے۔ عرشی صاحب کے بتائے ہوئے حساب سے اردو خط کی آخری تاریخ تحریر ۲۱ مئی ۱۸۵۰ء ہو سکتی ہے۔ گو اس کا بھی امکان رہتا ہے کہ اس سے مہینوں قبل لکھا گیا ہو۔ ان کے اس قول سے کہ غالب اردو خط لکھنے کے بعد فارسی خط نہیں لکھتے۔ یہ نتیجہ نکلتا ہے اور خود انہوں نے نکالا بھی ہے کہ اردو خط اگست ۱۸۵۲ء والے فارسی خط کے بعد کا ہے۔ آخر میں انہوں نے بتایا ہے کہ خط اس زمانہ کا ہے جب غالب میرزا فتح الملک کے نوکر ہو چکے تھے۔ یہ مسلم ہے کہ ملازمت کا زمانہ ۱۸۵۴ء تا ۱۸۵۶ء ہے۔ خط کے زمانہ کتابت کے متعلق اس سے جو نتیجہ نکلتا ہے' ظاہر ہے۔ گو خود انہوں نے صراحتاً' لکھا کہ اس حساب سے خط کا زمانہ تحریر کیا ہے۔

خطوں کے درمیانی وقفے اور جوہر کی کاہل قلمی کی نسبت عرشی صاحب نے لکھا ہے کہ اس کے متعلق میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خطوں کے درمیانی وقفے محض مطبوعہ خطوں کی مدد سے ثابت نہیں کیے جا سکتے۔ مطبوعہ مجموعوں میں جو خط ملتے ہیں' وہ ان خطوط کے مقابلے میں جو شائع نہ ہو سکے بہت کم ہیں۔ جوہر کے والد غالب کے دوست' خود جوہر (۱۹) ان کے "عزیز شاگرد" اور مخصوصین میں تھے (یادگار صفحہ ۱۰۷' ۳۱۰) اور مدتوں دلی سے باہر بھی رہے۔ غالب نے انہیں ۶ سے بہت زیادہ خط لکھے ہوں گے۔ ۱۸۳۸ء تا ۱۸۶۳ء کے کل خط ہیں کہاں کہ خطوں کے درمیانی وقفوں کا صحیح علم ہو سکے' اور اس سے کوئی نتیجہ نکالا جا سکے؟ عرشی صاحب کا قول

ہے کہ دو خطوں میں بہت دنوں سے خط نہ آنے کی شکایت ہے۔ ذیل میں دونوں خطوں کی ضروری عبارتیں درج کی جاتی ہیں :

(۱) دیر است کہ مارا یاد نہ کردہ اند و ما جگر تشنہ خود را بہ زلال خیرے کہ از کنار نامہ موسومہ رائے ہیج مل ترادو تسکین ے دہیم (پنج آہنگ صفحہ ۱۲۰)

(۲) نامہ شما دیر است تا بہ من رسیدہ است' پاسخ جونہ بود' ورنہ دریں روز سیاہ نیز بنشستن نامہ دریغ نہ داشتمے (پنج آہنگ صفحہ ۱۲۰'۱۲۱)

پہلے خط میں جوہر کی شکایت ہے لیکن دوسرے میں معاملہ برعکس ہے۔ غالب نے خود جواب نہ دینے کی معذرت پیش کی ہے۔ صرف اس بنا پر کہ ایک خط میں غالب نے دیر سے یاد نہ کرنے کی شکایت کی ہے۔ عرشی صاحب یہ کہنے میں حق بجانب نہیں کہ "جوہر جواب میں بے حد ست تھے" غالب نے اپنے لیے بھی وہی دیر کا لفظ استعمال کیا ہے' کیا یہی حکم غالب پر بھی لگایا جا سکتا ہے؟ غالب اس کے زیادہ مستحق ہیں اس لیے کہ غالب جواب نہ دینے کے معترف ہیں اور جوہر کے بارے میں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ خط لکھنے میں سبقت نہ کی۔ مزید یہ کہ اگر ایک خط میں یاد نہ کرنے کی شکایت ہے تو ایک میں جوہر کے متواتر خطوں کا ذکر ہے :

"نامہ ہائے شما پیہم رسیدہ' پاسخ آں ہا (۲۰) نیز پے ہم بہ پدر بزرگوار شما سپردہ شدۂ ایں نامہ کہ امروزی نگارم دے خواہم کہ بہ سبیل ڈاک رواں دارم بہ پاسخ دو صحیفہ بازپشین است نگاشتہ' ۲۲ نومبرو رقم زدہ ۲۶ نومبر کہ ہردو بہ ہنگام خویش بہ من رسیدہ نخستین چوں شوقیہ بود جواب نہ خواہد دومیں را پاسخ ازیں است (پنج آہنگ صفحہ ۱۲۰)

بہت دن ہوئے چند دنوں کے لیے بھی مستعمل ہو سکتا ہے' چند مہینوں کے لیے بھی۔ اور چند برسوں کے لیے بھی مجروح کے نام ایک خط ہے جس میں غالب نے اپنا اور میرن صاحب کا اصلی یا فرضی مکالمہ نقل کیا ہے' اس میں یہ الفاظ محض چند دنوں کے لیے آئے ہیں" اس کے (مجروح کے) خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ..... ہیں وہ خفا ہوا .وگا جواب لکھنا ضرور ہے" حضرت' وہ آپ کے فرزند ہیں' خفا کیا ہوں گے؟ (خطوط صفحہ ۲۶۹)

۔خط زیر بحث میں کس مدت کے واسطے استعمال ہوا ہے اس کے فیصلے میں وہ خط جس میں لنگی کی فرمائش کی تھی مدد دے سکتا ہے۔ ضروری عبارت یہ ہے :

کلہے از پوست برہ داشتم' حالیا آں را کرم خود سرم بے کلاہ ماند۔ اگرچہ کلہ نہ ے جویم اما لنگ ابریشمی چناں کہ در پشاور و ملتان سازند داعیان آں قلم رو بہ سر ہیچند ...... و غالب کہ دراں دیار ایں چنیں متاع زودو و آساں بہ دست آید بہ جویند و بہم رسانند و سوئے من در ڈاک رواں دارند و قیمت آں برنگارند۔ تا بہانہ خواہند نوشت نہ خوا فرست .... در فرستادن لنگ و رنگ و نگاشتن قیمت تکلف نہ کنند ..... (پنج آہنگ صفحہ ۱۲۰)

غالب کو لنگی کی ضرورت فوری استعمال کے لیے ہے' اسی لیے وہ ایک جگہ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ جلد

مل جائے گی اور دوسری جگہ جلد بھیجنے کی تاکید کرتے ہیں۔ لنگی کوئی نایاب چیز نہیں۔ غالب قیمت ادا کرنے کو تیار بلکہ اس پر مصر' غالب اور جوہر کے تعلقات بزرگانہ اور خودارانہ۔ یقین ہے کہ غالب کا خط ملتے ہی جوہر نے لکھا ہوگا کہ اسی ہفتے بھیجوں گا۔ کسی سبب سے وعدہ ایفا نہ ہوا تو غالب نے یاددہانی کی۔ میرے لیے یہ باور کرنا بہت مشکل ہے کہ فرمائش اور یاد دہانی کے درمیان' برس ڈیڑھ برس کا وقفہ ہے' چند ہفتے بہت ہیں۔

عرشی صاحب کا یہ نظریہ کہ غالب کسی شخص سے اردو میں خط و کتابت شروع کرنے کے بعد اسے فارسی خط نہیں لکھتے تھے' غالب کی طبیعت کو دیکھتے ہوئے قابل قبول نہیں۔ اس قسم کے خود ساختہ قاعدوں کی سختی کے ساتھ پابندی ان سے بعید ہے۔ یوں بھی بے شمار فارسی خط غائب ہیں۔ غالب کے عمل کا پتا کیونکر چلے؟ اس کا اعتراف خود عرشی صاحب کو ہے کہ اس کلیے کا استثنا موجود ہے۔ جہاں ایک مستثنیٰ ہے وہاں ایک اور سہی! غالب جب یوسف علی خاں کو اردو میں خط لکھنے کے بعد فارسی خط لکھ سکتے تھے تو جوہر سے اس طرح مراسلت میں کونسا امر مانع ہو سکتا تھا؟

اب رہا معاملہ قطعوں کا' عرشی صاحب کے پاس کون سا ثبوت اس دعوے کا ہے کہ ولی عہد سے مرزا فتح الملک ہی مراد ہیں۔ دارا بخت دارا بھی خطاط تھے (خم خانہ جاوید جلد ۳ صفحہ ۱۰۱) ممکن ہے کہ انہی کے قطعے کی تلاش ہو۔ مرزا فتح الملک ہوں جب بھی' یہ کیونکر معلوم ہو سکتا ہے کہ قطعے کی تلاش غالب کی نوکری کے بعد کا واقعہ ہے۔ میرے نزدیک تو غالب کی اعانت کو کسی خاص قطعے کی تلاش پر محدود کر دینا ہی صحیح نہیں۔ غالب نے اپنی مدد کا ذکر کیا ہے' اس کی تصریح نہیں کی کہ کسی خاص قطعے کے حصول میں مدد دے رہے ہیں۔

میرے رائے میں جوہر کے نام کا اردو خط ان کے نام کے فارسی خط مورخہ یکم دسمبر ۱۸۴۸ء کے چند ہفتے بعد کا ہے۔ اس کا امکان ہے کہ چند مہینے بعد کا ہو' لیکن میرے لیے یہ باور کرنا کہ لنگی کی فرمائش یا جوہر کے وعدے اور غالب کی یاد دہانی میں پانچ چھ (۲۱) برس کا وقفہ ہے' مشکل نہیں' ناممکن ہے۔

۳ - تیسرا دور بادشاہ کی ملازمت

یعنی جولائی ۵۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ مہر نیمروز کی تصنیف کا آغاز اس کے بعد ہی ہوا ہوگا۔ اس کی عبارت میں "قوت متخیلہ" کا عمل بہت زیادہ ہے اور اس کی تصنیف میں معروفیت ضرور ہے کہ اردو خطوں کی تعداد میں معتد بہ اضافے کا باعث ہوئی ہو۔ رفتہ رفتہ کس طرح فارسی کم اور اردو زیادہ ہوتی گئی اور آخر میں صرف اردو پر انحصار رہ گیا۔ اس کی تفصیلات کے لیے مکاتیب غالب طبع ثانی کا دیباچہ (ص ۱۴۳ تا صفحہ ۱۴۵) ملاحظہ ہو۔ اس مبحث پر اس سے بہتر بیان میری نظر سے نہیں گزرا۔ خلاصہ بحث یہ ہے :

(۱) قیاس چاہتا ہے کہ غالب نے فارسی سے پہلے اردو میں خط لکھے ہوں۔

(۲) غالب جس زمانے میں بالعموم فارسی میں مراسلت کرتے تھے' کبھی کبھی اردو میں بھی خط لکھا کرتے تھے۔

(۳) کم از کم دو خط ۱۸۵۰ء سے قبل کے موجود ہیں۔

حواشی

۱ - غالب کا قول ایک خط سے ماخوذ ہے جو شاکر کے نام عود ہندی میں ہے۔ اس خط پر کوئی تاریخ ثبت نہیں لیکن شاکر غالبا غدر کے بعد غالب کے شاگرد ہوئے ہیں۔ "شدت نسیاں" اور جان کنی کے خیالات کا ذکر ہے۔ یہ باتیں غدر کے بعد کی ہیں۔

۲ - مہرنیم روز۔ کلیات نثر غالب طبع اول صفحہ ۱۳۲)

۳ - ان کے گھر میں کتاب کا کہیں نشان نہ تھا۔ ہمیشہ کرائے کی کتابیں منگوا لیتے تھے اور ان کو دیکھ کر واپس کر دیتے تھے۔ "یادگار غالب" شائع کردہ دائرہ ادبیہ صفحہ ۶۸) اسی کتاب میں صفحہ ۱۹ پر "کبھی کوئی کتاب نہیں خریدتے تھے۔ الا ماشاء اللہ)۔

۴ - نادر خطوط غالب مرتبہ جناب رسا ہمدانی میں مرتب کے پرداداکرامت کے نام کا ایک خط ہے۔ جناب رسا مقدمہ نادر خطوط صفحہ ۱۳ تا ۱۵ میں مدعی ہیں کہ یہ پہلا خط اردو کا ہے (یہ اور کرامت کے نام کے دوسرے خط جعلی ہیں۔ تبصرہ نادر خطوط نوشتہ راقم جنوری ۱۹۴۳ء) کے معاصر "ندیم" میں ملاحظہ ہو) بعد کو اپنے ایک مضمون میں جو اپریل ۴۳ء کے "ندیم" میں چھپا ہے، بغیر کسی ثبوت کے انہوں نے یہ لکھا ہے کہ یہ خط یکم جنوری ۱۸۵۱ء کا ہے۔ حالی کی نظر سے گزرا تھا، اور حالی نے اسی کو دیکھ کر یادگار غالب میں تحریر کیا تھا کہ اردو خط و کتابت ۵۰ء کے بعد سے شروع ہوئی۔

۵ - طبع ثانی میں مہر صاحب نے اپنی رائے میں ترمیم کی ہے۔

۶ - دیباچہ صفحہ ۱۳۵۔ ۱۸۵۰ء تک میرزا صاحب تقریباً اس زبان (یعنی فارسی) میں خامہ فرسائی کرتے رہے= "تقریباً" سے عرشی صاحب کی کیا مراد ہے؟

۷ - تقریظ گلشن بے خار و نامہ غالب۔

۸ - ایسی شریف خواتین جو بالکل پڑھی لکھی نہیں یا صرف قرآن مجید پڑھ سکتی ہیں اب بھی موجود ہیں اور غالب کے زمانے میں آج کل کی بہ نسبت بہت زیادہ ہوں گی۔ غالب رامپور سے غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں "یہ تم کیا لکھتے ہو کہ گھر میں خط جلد جلد لکھا کرو تم کو جو خط لکھتا ہوں گویا تمہاری استانی جی کو لکھتا ہوں۔ کیا تم سے اتنا نہیں ہوتا کہ جاؤ اور پڑھ کر سناؤ (خط نمبر ۱۳) خط پڑھ کر سنا دینے کی ہدایت خط نمبر۱۹) میں بھی ہے' ثاقب کے نام کے خط ۹ میں بھی یہی لکھا ہے۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ غالب کا یہ عام انداز تھا۔ خط ۱۸ بنام غلام نجف خاں میں یہ عبارت ہے "لڑکے بہ خیر و عافیت ہیں۔ اپنی استانی سے کہہ دینا۔ میرزا شہاب الدین خاں کو دعا۔ نواب ضیاء الدین خاں کو سلام۔ میرا رقعہ ان دونوں صاحبوں کو پڑھا دینا۔ "امراؤ بیگم اگر خط پڑھ سکتیں تو ان کے بارے میں بھی یہ ہوتا کہ خط پڑھوا دینا۔ امراؤ بیگم کے خطوط بنام کلب علی خاں خود امراؤ بیگم کے لکھے ہوئے نہیں۔ (عرشی صاحب کا خط بنام راقم)۔

۹ - پنج آہنگ صفحہ ۶۷.....

۱۰ - عود ہندی' الہ آباد۔

۱۱ - شفاء الملک حکیم حبیب الرحمٰن صاحب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس غالب کے چند غیر مطبوعہ فارسی خطوط ہیں جن کی عبارت بالکل معمولی ہے۔

۱۲ - نامی غالب سے فارسی میں ایک خط کا جواب لکھوانا چاہتے تھے۔ غالب کی طبیعت شاعرانہ نثر لکھنے پر اس وقت مائل نہ تھی۔ انہوں نے بہانہ کر دیا کہ خط اس کا مستحق نہیں کہ اس کا جواب "پہلوی و دری میں دیا جائے نثر کے بدلے ۴ رباعیاں بھیجتا ہوں۔ اپنی طرز خاص نثر لکھنے سے رباعیاں لکھنے میں زیادہ سہولت نظر آئی ہوگی۔ (عود ہندی صفحہ ۲۲۳)

۱۳ - خط میں دیباچے کا ذکر ہے اور پنج آہنگ میں بھی دیباچہ لکھا ہے۔ دیوان میں یہ دیباچہ تقریظ کے نام سے چھپا ہے۔ اگر اس طرف اشارہ کر دیا جاتا تو بہتر تھا۔

۱۴ - اقتباس مرتب نے نقل نہیں کیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس میں تقریظ کا ذکر ہی نہیں۔

۱۵ - دو نہیں، تین دیوان ہیں۔

۱۶ - سہو دراصل کار پردازان مطبع کا ہے، رمضان ۶۵ھ تک ایک ربع چھپ چکا تھا۔ یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ اس کا چھاپا اواخر ۶۵ھ میں شروع ہوا؟ تقطیع بڑی تھی، ۴ صفحوں سے زیادہ ایک پتھر میں نہیں آتے ہوں گے۔ ایک ربع ۱۱ جز ہی ہوں تو ۴۴ پتھر کی ضرورت ہوئی ہوگی۔

۱۷ - متفرقات سے بحث نہیں۔

۱۸ - تفتہ کے نام کے خط ۲ (خطوط صفحہ ۳۰۲) کا زمانہ تحریر مہیش پرشاد صاحب نے اگست ۵۰ء لکھا ہے۔ میں نے غالب کے ان الفاظ کی بنا پر کہ "جب تمہارا دیوان چھاپا جائے گا یہ قطعہ بھی چھپ جائے گا" یہ رائے ظاہر کی تھی کہ عجب نہیں یہ خط ۵۰ء سے پہلے کا ہو۔ عرشی صاحب لکھتے ہیں کہ وہ قطعہ جس کا ذکر اس خط میں ہے دیوان تفتہ میں موجود ہے اور ۵۰ء کا لکھا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ مہیش پرشاد صاحب کے قول صحت میں مشتبہ میں نے ظاہر کیا تھا، اس کے لیے کوئی سبب نہیں۔

۱۹ - جوہر اور مے کش کے حق میں غالب کی رباعی کلیات نظم میں ہے، یادگار میں بھی نقل ہوئی ہے :

تا نے کش و جوہر دو سخن ور داریم
شان دگر و شوکت دیگر داریم
در میکدہ پیریم کہ مے کش از ماست
در معرکہ تیغیم کہ جوہر داریم

۲۰ - یہ خط پنج آہنگ میں کہاں ہیں۔

۲۱ - بہ شرط ضرورت معاصرین کی شہادت پیش کی جا سکتی ہے۔

اقرار احمد عباسی

غالب خطوں کے آئینے میں

غالب کے متعلق یہ خیال عام ہوگیا ہے کہ غالب کی قدر و منزلت ان کے دور میں جیسی چاہیے تھی ویسی نہ ہوئی۔ مورخ، سوانح نگار اور نقاد جو غالب پر قلم اٹھاتا ہے اس خیال کی تائید میں دو چار فقرے دوہرانا اپنا فرض منصبی تصور کرتا ہے۔

یہاں پر اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے اس طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ غالب کو ان کے دور میں کافی ہردلعزیزی حاصل تھی۔ ان کی قدر و منزل اگر میں یہ نہ کہہ سکوں کہ جیسی چاہیے تھی اس سے زیادہ ہوئی تو یہ ضرور کہوں گا کہ حالات کے تقاضے اور ماحول کے لحاظ سے کچھ کم بھی نہیں ہوئی۔ کسی شخص نے انہیں داد تحسین دینے اور خراج عقیدت پیش کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ غالب ہمیشہ اپنی ناقدری کا گلا اور شکوہ کرتے رہے جس کا جابجا اظہار ان کے اشعار میں ملتا ہے۔

تھی وطن میں شان کیا جو ہوئے غربت میں قدر بے تکلف ہوں وہ مشت خس کہ گلخن میں نہیں

شاعرانہ تخیل سے قطع نظر اگر اس کو حقیقت بھی فرض کر لیا جائے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ غالب اپنی نازک مزاجی، بلند پروازی اور اعلیٰ دماغی کے سبب جو ان کی بچپن کی رئیسانہ تربیت کا نتیجہ تھی۔ اس قدر و منزلت کو نگاہ میں نہ لائے ہوں۔ لیکن اس تاریخی حقیقت سے بھی کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ بہادر شاہ ظفر والی قلعہ معلی اور نواب یوسف علی خاں اور کلب علی خاں نے جب تک ہو سکا وظائف جاری رکھے اور موقع بہ موقع خلعت و انعامات سے نواز کر ہر طرح ان کی معاونت اور قدر کرتے رہے ذوق کو صرف خاقانی رہند بنایا گیا تو غالب کو نجم الدولہ دبیرالملک اور نظام جنگ کے خطابات سے نوازا گیا۔

قدر و منزلت کا ایک تو یہ تصور ہو سکتا تھا۔ دوسرے ارباب علم میں بھی ان کی کچھ کم قدر و منزلت نہیں ہوئی۔ مولوی فضل حق خیر آبادی اور مفتی صدر الدین آزردہ، غالب کی ہمیشہ ہمت افزائی کرتے رہے اور شیفتہ جیسے سخن فہم، نکتہ سنج اور صاحب نظر ہمیشہ ان کے کلام کی عزت افزائی اور اس پر تصدیق کی مہر ثبت کرتے رہے۔ انفرادی داد تحسین کے علاوہ غالب کی شہرت کا بین ثبوت غالب کے خطوط ہیں۔ اس قدر وسیع حلقہ احباب اور اس قدر معتقد جو شاید کسی دوسرے شاعر یا ادیب کو نصیب نہ ہوئے۔ اس پر یہ کہنا کہ غالب کی زمانے نے قدر نہ کی غلط فہمی پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔

جہاں غالب نے اپنے اشعار اور خطوط میں زمانے کی ناقدر شناسی کا گلہ کیا ہے وہاں قدر شناسی اور شہرت کا اعتراف بھی کیا ہے جس سے اچھا خاصا خیالات میں تضاد معلوم ہوتا ہے۔ آخر غالب کس قسم کی قدر و منزلت اور عظمت و شان کے خواہاں تھے جو ان کو حاصل نہیں ہوئی مرزا تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیئے جاتا ہوں۔ یہ دریا نہیں سراب ہے۔ ہستی نہیں پندار ہے۔ ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں۔ مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور ہوئے۔ ان کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم کو تم کو ہے۔"

بظاہر اس عام لیکن غلط خیال کے دو سبب نظر آتے ہیں۔ ایک تو خود غالب جس نے جابجا اشعار میں اس کا اظہار کیا ہے۔ دوسرے "یادگار غالب" کے دیباچے کا وہ بیان جہاں حالی نے غالب کی عظمت کو اجاگر کرنے کے لیے متضاد خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ اقتباس یہ ہے۔

"اگرچہ زمانے نے اپنی بساط کے موافق مرزا کی کچھ کم قدر نہیں کی۔ ان کا تمام کلام اور فارسی نظم اور نثر ان کے جیتے جی اطراف ہندوستان میں پھیل گیا تھا۔ اور ان کے ماننے والے مداح و ثنا خواں ملک کے ہر گوشے میں پائے جاتے تھے اور اب تک پائے جاتے ہیں۔ مدحیہ قصائد پر ان کو کم و بیش صلہ اور خلعت و انعامات ملتے رہے۔ مرحوم بہادر شاہ نے بھی اپنی حیثیت کے موافق ان کی خاص قدر کی۔ ریاست رامپور سے ان کے لیے آخر دم تک معقول وظیفہ جاری رہا۔ یہ سب کچھ ہوا مگر جب مرزا کے اس اعلیٰ مرتبہ کا جو شاعری اور انشاپردازی میں فی الواقع انہوں نے حاصل کیا تھا ٹھیک اندازہ کیا جاتا ہے تو ناچار یہ کہنا پڑتا ہے کہ زمانے کی یہ قدردانی زیادہ سے زیادہ اس پیرزال کی سی قدر دانی تھی جو ایک سوت کی انٹی لے کر یوسف کی خریداری کو مصر کے بازار میں آئی تھی۔ سچ یہ ہے کہ مرزا کی قدر جیسے کہ چاہیے یا جلال الدین اکبر کرتا یا جہانگیر و شاہ جہاں۔ مگر جس قدر اس اخیر دور میں ان کو مانا گیا اس کو بھی مغتنم سمجھنا چاہیے۔

کے مفت یاں ہم زمانے کے ہاتھوں   پہ دیکھا تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ

یہاں اس اقتباس کے متضاد بیان یا اس کی صداقت سے قطع نظر صرف اس قدر اشارہ کافی ہے کہ جس بڑھیا کا کل سرمایہ ہی ایک سوت کی انٹی ہو اس سے انٹی کے علاوہ کچھ اور زیادہ توقع اپنی حماقت کی دلیل کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہاں سوت کی انٹی قابل غور نہیں بلکہ اس کے جذبات قابل احترام ہیں جو کسی کے واسطے تمام سرمایہ حیات قربان کرنے کے واسطے گھر سے نکلے۔

اب ہم اپنے مقصد کی طرف رجوع کرتے ہوئے غالب کی مقبولیت کے سلسلہ میں صرف ایک دلیل اور پیش کرنا چاہتے ہیں وہ یہ کہ تقریباً 1848ء میں غالب نے اردو میں مکتوب نگاری شروع کی جس کے لیے غالب کو گمان بھی نہ ہوگا کہ یہ بھی کسی وقت شائع ہو کر لوگوں کو دلچسپی کا باعث بن سکیں گے اور آئندہ غالب کو سمجھنے میں

مشعل راہ کا کام دیں گے لیکن 1858ء میں منشی شیونرائن آرام اکبر آبادی نے ان کو شائع کرانے کا قصد کیا جس کے متعلق مرزا سے اجازت چاہی اور انہوں نے یہ کہہ کر کہ ذاتی معاملات دوسروں تک پہنچانے کی کیا ضرورت ہے خطوط کی اشاعت کی اجازت نہ دی لکھتے ہیں:

"اردو کے خطوط جو آپ چھاپنا چاہتے ہیں یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا اور نہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخوری کے شکوہ کے منافی ہے اس سے قطع نظر کیا ضرورت ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ رقعات کا چھاپنا میرے خلاف طبع ہے۔"

انہیں دنوں مرزا تفتہ نے بھی خطوط چھپوانے پر زور دیا۔ ان کو لکھتے ہیں۔

"رقعات کے چھاپنے میں ہماری خوشی نہیں لڑکوں کی ضد نہ کرو۔ اگر تمہاری اس میں خوشی ہے تو صاحب مجھ سے نہ پوچھو تم کو اختیار ہے یہ امر میرے خلاف رائے ہے۔"

ان اقتباسات کے پیش کرنے سے یہاں اتنا اشارہ مقصود ہے کہ غالب کا وہ کارنامہ جو عرصہ دراز تک عدم توجہی کا شکار رہا اور جس کو صرف محض ذاتی چیز سمجھ کر نظرانداز کیا جاتا رہا وہ بھی اس عہد میں اس قدر مقبول تھا کہ باوجود فاضل مکتوب نگار کی مخالفت کے لوگ اس کی اشاعت پر زور دیتے رہے اور آخر کار لڑکوں کی ضد پوری ہو کر رہی۔ خطوط کی اس قدر جلدی اشاعت کا محرک ان کی مقبولیت ہردلعزیزی اور دلچسپی نہ تھی تو اور کیا تھی۔

ہمیں یہاں اس سے غرض نہیں کہ غالب کی خطوط نگاری کا محرک ان کا ضعف اور پیرانہ سری ہو یا فارسی کے انحطاط کے ساتھ اردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور اس کی کشش بہرحال سبب کچھ بھی ہو حالی کی تحقیق کے مطابق 1850ء کے بعد اور غلام رسول مہر کی تحقیق کے مطابق 1848ء میں یعنی تقریباً" چالیس سال کی عمر کے بعد غالب نے اردو میں خطوط نویسی شروع کی۔ یہ وہ دور تھا جب غالب جوانی سے گذر کر باب پیری میں قدم رکھ رہے تھے۔ انسان کی زندگی میں یہ وہ دور ہوتا ہے کہ جب اس کا ذہن کافی پختہ ہو جاتا ہے۔ فکر میں توازن اور بلندی خیالات میں ٹھہراؤ وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہو جاتی ہے۔ جوانی میں خیالات کی کش مکش ہوتی ہے زندگی کو مختلف پہلوؤں سے انسان دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ نظریات میں ایک عجیب ہماہمی اور ٹکراؤ ہوتا ہے مختلف شخصیات اور مختلف نظریات و رجحانات سے انسان متاثر ہوتا ہے ہر پہلو اور ہر رنگ سے تجربہ کر کے خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن جب اس آویزش تذبذب' کش مکش اور تجربات کی دنیا سے گذر کر انسان کسی نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے تو اس کی انفرادیت ایک عجیب جامع کمالات اور تجربات کا مجموعہ ہو جاتی ہے۔ دراصل انسان فطری طور پر مختلف جبلتوں کا مالک' مختلف عادات و خصائل کا حامل اور متضاد صفات' احساسات و جذبات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ لیکن ان متضاد صفات کو ایک وحدت میں ڈھالنے کا نام شخصیت ہے۔ یہی کردار اور شخصیت میں فرق ہے۔ وہی شخصیت اعلیٰ اور عظیم کہلائے گی جو زیادہ سے زیادہ ان متضاد صفات احساسات و خیالات کو ایک وحدت میں ڈھال دے۔ غالب بھی ایک ایسی جامع کمالات شخصیت کے مالک تھے جس کو قدرت نے تنوع مزاج اور جدت پسند طبیعت ودیعت

کی تھی اور جس نے خود آغاز جوانی سے مختلف تجربات کر کے خود کو دوسروں سے بالکل ممتاز اور منفرد بنا لیا تھا۔ غالب کی تنوع مزاجی، انفرادیت پسندی اور جامع کمالات کا بہترین مظہران کے خطوط ہیں۔ جہاں مرزا انتہائی بے تکلف سادہ اور حقیقی انسان نظر آتے ہیں۔ جہاں انہوں نے ذاتی خیالات و جذبات اور ذاتی معاملات کو انتہائی بے تکلفی کے ساتھ سپرد قلم کیا ہے وہاں مرزا اپنی مکمل آب و تاب کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں۔

دراصل فن ایک آسیب ہے جو انسان پر سوار ہوتا ہے اور جب تک وہ کسی پیمانے میں نہ ڈھل جائے۔ فنکار کو اطمینان قلب نہیں ہوتا۔ غالب اپنی شاعری سے مکمل طور پر مطمئن نہ تھے اور اس کو اظہار خیال کے بجائے اخفائے حال سمجھتے تھیں ابہام اور اجمال غزل کے ایسے دو بنیادی عناصر ہیں جو شاعر کے تجربات و مشاہدات اس کے دل کی بھڑاس اور جذبات غرض دل و دماغ کے مظاہرے میں مانع ہوتے ہیں۔ اس لیے غالب نے مکتوب نگاری کو اپنی شخصیت اور جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور یہیں سے فن کی ابتداء ہوتی ہے۔

شاعری کے برعکس خطوط کے ذریعہ شخصیت کے سب گوشے کمزور سے کمزور بھی خود بخود نمایاں ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ غالب کی نثر کے محرکات بھی وہی جذبات درد و الم ہیں جو شاعری کے ہیں لیکن سچے اور بے تکلف جذبات شاعرانہ انداز بیان میں ڈھل کر خلوص و اثر میں ضرور اضافہ کرتے ہیں۔ فلسفہ غم کا ادراک غالب کی ایک مابہ الامتیاز خصوصیت ہے جو شاعری میں فلسفیانہ رنگ اور عمومیت حاصل کرتی ہے اور تجربہ غم کی صورت میں صرف جذبات کا اظہار کرتی ہے لیکن خطوط میں وہی مداوائے غم ہے۔

غالب خطوط میں درد انگیز جذبات کے اظہار سے خود کو تسکین دینے کی کوشش کرتے ہیں جہاں چہرے سے مسرت کی طلب کے آثار نمایاں نظر آتے ہیں لیکن یہ جذبہ شخصی ہونے کے ساتھ شاعری میں ہر جگہ لیکن خطوط میں جہاں کہیں وسیع معنوں میں پیش کر کے اس میں بھی عمومیت پیدا کی ہے۔ "برہنہ صداقت" کا حکم رکھتی ہے۔ یہاں خالص سچائی اور صداقت کی توقع ایک خاص کیفیت پیدا کرتی ہے۔

مرزا عسکری نے مرزا کے خطوط کے متعلق انتہائی جامع رائے پیش کی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

> "خطوط کی عبارت محض عبارت نہیں بلکہ اس سے صاف صاف ایک تصویر نظر آتی ہے
> جیسے کوئی شخص اپنا سینہ چیر کر بلاکم و کاست ہر چیز کا معائنہ کرا رہا ہو اور کوئی راز کسی قسم کا چھپانا
> نہیں چاہتا ایک ایک لفظ میں خلوص ایک ایک فقرے میں محبت کی ایک طویل داستان پنہاں
> ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ غالب کے کمالات ان کی خوبیوں، بلند نظری، اعلیٰ فکر کو واضح کرنے کے لیے ان کا دیوان کافی تھا۔ لیکن ان کی زندگی کے سب گوشے ان کی تمام تر کمزوریاں اور لغزشیں جن پر حالی نے خواہ پاس ادب سے خواہ ماحول کی پابندیوں کے سبب پردہ ڈالنے کی ایک ناکام کوشش کی تھی جن کی طرف صرف دبے الفاظ میں اشارہ کیا تھا پورے نقوش کے ساتھ بھرپور رنگ میں ان کے خطوط میں نظر آتی ہیں یہ الفاظ دگر خطوط میں غالب بحیثیت حقیقی انسان، نیکی و بدی کا مجسمہ یعنی ایک ارضی انسان کی طرح اصل ادب میں بارہ گر ہیں۔

غالب سے قبل اور بعد کو اردو فارسی میں بہت سے خطوط لکھے گئے۔ لیکن ان میں سے بیشتر کی حیثیت یک رخی یا اکہری ہے یعنی جس مقصد خاص کے لیے وہ خطوط لکھے گئے صرف وہی ایک حیثیت ان خطوط کی ہو کر رہ گئی۔ ان میں کسی قسم کا تنوع اور وسعت پیدا نہ ہو سکی۔ مثلاً" علامہ شبلی کے خطوط کی حیثیت علمی حدود سے آگے نہ بڑھ سکی۔ غالب کے خطوط تنوع کے لحاظ سے ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں اور دراصل یہی ان کی دلچسپی کا راز ہے۔ غالب کے خطوط کے مختلف پہلو مختلف قسمیں ایک عجیب کیفیت اور دلچپی پیدا کرتی ہیں۔ یہ ایک ایسی معجون مرکب ہے جس کے مختلف خصائص اور مختلف اوصاف مختلف تاثیر رکھتے ہیں یا ایک ایسا نخلہ ہے جس سے ہمہ وقت مختلف خوشبوئیں پھوٹتی رہتی ہیں۔ غالب کے خطوط علمی و ادبی بھی ہیں اور ذاتی بھی' تاریخی بھی ہیں' ساجی بھی۔ دلی کی تباہی کے مرثیے بھی ہیں اور اس سے ناامیدی بھی' آنے والی حکومت کا خیرمقدم بھی ہے اور اس کی نعمتوں سے امیدیں بھی' الغرض آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔

یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ کوئی ادب غیر شخصی (Impersonal) نہیں ہو سکتا۔ جس وقت کوئی آرٹسٹ کسی چیز کے متعلق کچھ سوچتا ہے اور اس کے متعلق کوئی نظریہ قائم کرتا ہے یا کسی چیز سے متاثر ہو کر ضبط تحریر میں لانے کے لیے اس کا ڈھانچہ ذہن میں مرتب کرتا ہے اسی وقت اس میں شخصی عناصر داخل ہو جاتے ہیں لیکن اس شخصیت کا اظہار موضوع اور صنف ادب کے لحاظ سے مختلف نوعیت رکھتا ہے جس کی ضرورت کہیں کم اور کہیں زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ یہ شخصی رنگ ایک عیب بھی ہے اور ہنر بھی۔ جہاں آرٹسٹ موضوع سے زیادہ خود کو نمایاں کرے وہیں سے ہنر عیب میں تبدیل ہونے لگتا ہے۔ کہیں شخصی رنگ کی کمی اس کے ہنر میں عیب پیدا کر دیتی ہے۔ ناول میں کردار سے زیادہ ناولسٹ کی شخصیت کا اظہار اس کی دلچسپی اور تاثیر کو مجروح کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس فورٹ ولیم کالج کی تمام تخلیقات خصوصاً" باغ و بہار وغیرہ میں شخصی رنگ کی کمی اس کا عیب سمجھی جاتی ہے۔

ناول کے برعکس شخصی مقالات (Personal Essay) میں شخصی عناصر کی کثرت شخصیت کا اظہار اس کا اعلیٰ ترین وصف اور بنیادی خصوصیت ہے۔ دراصل مقالہ نگاری کا مقصد ہی اپنی شخصیت کی زیادہ سے زیادہ نمائندگی ہے۔ شخصی احساسات و جذبات' شخصی تجربات و مشاہدات ذاتی خیالات و نظریات اور معاملات کے اظہار کے مجموعے کا نام مقالہ ہے۔

مقالہ نگاری کی اس تعریف کے ذیل میں غالب کے خطوط مقالات کے دائرے میں آسانی سے داخل کیے جا سکتے ہیں۔ فرق صرف یہ رہ جاتا ہے کہ یہ خطاب کر کے لکھے گئے ہیں۔ مقالات میں کوئی مخاطب نہیں ہوتا۔ ان خطوط سے اگر القاب و آداب اور خاتمے کے اجزاء خارج کر دیے جائیں تو بہترین مقالات کا مجموعہ کہے جا سکتے ہیں۔ خطوط میں جس قدر غالب کی شخصیت نمایاں اور واضح ہوتی ہے اسی قدر ان میں دلچپی اور تاثیر بڑھتی جاتی ہے۔ خطوط میں غالب کی شخصیت کا زیادہ سے زیادہ اظہار اس کا اعلیٰ ترین وصف ہے۔

بقول رشید احمد صدیقی' غالب پورے مغلیہ دور کے نمائندے ہیں اور غالب کے خطوط نہ صرف غالب کی

زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں بلکہ اس کی شخصیت کے آئینہ دار بھی ہیں۔ یہ امر قابل افسوس ہے کہ غالب کے کسی معتقد نے بھی یہ زحمت گوارا نہ کی کہ ان کے خطوط کی اس طرح بھی ترتیب کر دے جس سے غالب کی مربوط زندگی از ابتدا تا انتہا پیش کی جا سکتی' حالانکہ خطوط کے ایسے مجموعے تو شائع ہو چکے ہیں جن میں تاریخ اور سن کا لحاظ رکھا گیا ہے' جیسا کہ غلام رسول مہر نے کیا یا مرزا محمد عسکری نے صرف ادبی خطوط کو یک جا جمع کر دیا۔

یوں تو خطوط غالب پر ایک سرسری نظر مکمل غالب کو آنکھوں کے سامنے کھڑا کر دیتی ہے جہاں اس کی زندگی کا کوئی نقش' کوئی پہلو نظر سے پوشیدہ نہیں رہتا۔ مرزا ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس پر انہیں فخر بھی تھا اور اکثر خطوط میں خود کو ماورالنہری افراسیابی اور سلجوقی کہہ کر اپنی اعلیٰ نسبی کا اظہار کیا۔ ان کی بچپن کی زندگی نہایت عیش و آرام سے گذری گھر کے حالات نہایت اطمینان بخش تھے۔ دوسرے سسرال بھی نہایت مالدار ملی تھی۔ اس بچپن کی بے فکری اور عیاش تربیت نے مرزا کے مزاج بگاڑ دیئے تھے۔ لیکن زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ حالات بگڑتے گئے اور مرزا کی پریشانیوں میں اضافہ ہو تا گیا۔ اس کے بعد اقتصادی اعتبار سے مرزا کو کسی وقت اطمینان نصیب نہیں ہوا۔

لیکن مرزا نے ان پریشانیوں اور مصیبتوں کو ہمیشہ ہنس کر گزارا اور اس کو زندگی کا ایک جزو سمجھ کر گوارا بنالیا۔ فانی کی طرح غالب کے یہاں غم کی تلخی نہیں اور نہ ان کی پوری شخصیت درد انگیز ہے۔

اسی درد و غم سے غالب کی ظرافت کے سرچشمے پھوٹتے ہیں۔ مولانا حالی نے غالب کو حیوان ظریف کہا ہے۔ لیکن غالب کی ظرافت ایک بے فکرے اور لاابالی انسان کی ظرافت نہیں بلکہ ایک گہری بصیرت رکھنے والے انسان کی ظرافت ہے۔ غالب نے طنز کے تیز نشتر سے نہ کبھی تخریب کا کام لیا اور نہ کسی کا مذاق اڑایا۔ غالب کے طنز میں اگر کہیں زہرناکی ہے تو اس کا نشانہ خود غالب ہیں۔ ظرافت کو غالب نے مہر و محبت پیدا کرنے اور زندگی کے درد و الم کو ہنس کر گزارنے کا وسیلہ بنایا۔ غالب کے یہاں نہ خالص غم ہے نہ خالص ظرافت اور لطیفہ بازی۔ اس تمام تر بیان کا خلاصہ غالب کے الفاظ میں اس طرح ملاحظہ فرمائیے:

> "آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے آپ کو اپنا غیر تصور کیا ہے جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں ہے۔ لے اب تو قرض داروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا بڑا کافر مرا۔ ہم از راہ تعظیم جیسا بادشاہوں کو مرنے کے بعد جنت آرام گاہ و عرش نشیمن خطاب دیتے ہیں چونکہ یہ اپنے آپ کو شہنشاہ قلمرو سخن جانتا تھا۔ "سقر مقر" اور "زاویہ ہاویہ" خطاب تجویز کر رکھا ہے۔"
>
> "آئیے نجم الدولہ بہادر" ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ ایک قرض دار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں۔ "اجی حضرت نواب صاحب نواب صاحب کیسے اوغلان صاحب آپ سلجوقی و افراسیابی ہیں یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے۔ کچھ تو بولو کچھ تو اکسو۔ بولے

کیا بے حیا۔ بے غیرت۔ کونٹھی سے شراب' گندھی سے گلاب' بزاز سے کپڑا' میوہ فروش سے آم' صراف سے دام قرض لیے جاتا تھا یہ بھی تو سوچا ہوتا کہ کہاں سے دوں گا۔"

کس قدر موثر اور ڈرامائی انداز میں اپنی پریشانیوں اپنے عیبوں اور ذاتی باتوں کا مرقع کھینچا ہے۔ جس کو پردہ کو مضحکے کے بجائے آغوش کھینچتی ہے۔ یہی وہ انداز ہے جو خط میں اظہار غم کے برعکس نثر میں مداوائے غم کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور یہی وہ دردانگیز سرچشمہ ہے جو ان کی ظرافت کی تہہ میں پوشیدہ ہے۔

مرزا کی یہ سب سے بڑی خوبی ہے کہ وہ خطوط میں مکتوب الیہ کے رتبے اس کی سمجھ اور مذاق کے مطابق شوخیاں کرتے ہیں جس سے ایک طرف تو مکتوب الیہ بلکہ قاری کی دلچسپی کا سامان مہیا ہوتا ہے۔ دوسری طرف اپنی تسکین چنانچہ رنج و الم کا بیان بھی اس قسم کی چھیڑ چھاڑ سے خالی نہیں ہوتا۔ منشی نبی بخش کو لکھتے ہیں :

"بھائی صاحب میں بھی تمہارا ہمدرد ہو گیا یعنی منگل کے دن اٹھارہ ربیع الاول کو شام کے وقت میری وہ پھپھی کہ میں نے بچپن سے آج تک اس کو ماں سمجھا تھا اور وہ بھی مجھ کو بیٹا سمجھتی تھی مر گئی۔ آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے تین پھپھیاں اور تین چچا اور ایک باپ اور ایک دادی اور ایک دادا یعنی اسی مرحومہ کے ہونے سے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں اور اس کے مرنے سے میں نے جانا کہ یہ نو آدمی آج ایک بار مر گئے۔"

مرزا حاتم علی بیگ مہر کو ایک خط میں اس کی محبوبہ معشوقہ کے مرنے پر عجب انداز سے سمجھاتے ہیں جس سے ان کے بھی معاشقہ کا اظہار ہوتا ہے جس کو آج بھی ان کے معتقد غالب علیہ الرحمتہ کی شان اور مرتبے کے منافی سمجھتے ہیں۔

"تمہاری معشوقہ تمہارے گھر میں مری بھی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر میں نے بھی ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو مار رکھا ہے۔"

اس حقیقت سے کس صاحب علم و فضل کو انکار ہو گا جس کا اعتراف خود غالب نے بھی کیا ہے کہ ابتداء میں مرزا اس مشکل طرز سے جہاں عربی کے موٹے موٹے لفظ پیچیدہ ترکیبوں اور شاعرانہ رنگ آمیزی کے طوفان میں اصل مطلب خبط ہو جاتا ہے متاثر تھے۔ مرزا نے نہ صرف اس طرز کی اتباع کی بلکہ ان کی جدت اور انفرادیت پسند طبیعت نے اس کو اور مشکل بنا دیا۔ اس کی گہری چھاپ مرزا کے ابتدائی فارسی نظم و نثر اور اردو کلام پر ہر جگہ نمایاں ہے لیکن ذہن کی پختگی اور فکر میں توازن کے ساتھ اس طرز خاص میں تبدیلی ہوتی گئی بالاخر وہ سلیس و سادہ اور بے تکلف رنگ آ گیا جس نے غالب کو غالب بنا دیا مولوی عبدالرزاق شاکر کو ایک خط میں اس طرف ــــــ اشارہ کرتے ہیں :

"قبلہ ابتدائے فکر سخن میں بیدل' اسیر' شوکت کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا چنانچہ ایک غزل کا مقطع یہ تھا۔

طرز بیدل میں ریختہ کہنا   اسد اللہ خاں قیامت ہے

پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا دس برس میں بڑا دیوان جمع ہوگیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا اوراق یک قلم چاک کر دیئے دس پندرہ شعرہ واسطے نمونے کے دیوان حال میں رہنے دیئے۔"

مرزا کی آخری عمر کی فارسی تصانیف "دستنبو" اور "قاطع برہان" کی زبان بھی کسی قدر صاف ہے اور جو اپنی پوری آب و تاب اور بھرپور رنگ میں اردو خطوط میں جلوہ گر رہی۔

مرزا کو اپنے علم و فضل کا گہرا احساس تھا اور وہ ہندی نژاد فارسی دانوں کو علاوہ امیر خسرو کے قطعاً نگاہ میں نہ لاتے تھے ان لوگوں کی رائے کو مستند سمجھنا تو درکنار ان کو کسی قسم کا قطعی فیصلہ صادر کرنے یا رائے زنی کرنے کے مستحق نہ سمجھتے تھے اس طرح ان لوگوں سے سرزد ہوئی غلطیوں کو وہ کبھی برداشت نہ کر سکتے تھے۔ جس کے نتیجے میں اکثر تلخ اور ناگوار بحثیں چھڑیں اور ایک اچھا خاصا گروہ مرزا کا مخالف جمع ہوگیا لیکن مرزا نے کسی بات کی پروانہ کی نہ وہ کسی سے مرعوب ہوئے اور نہ اپنی رائے میں کسی قسم کی ترمیم کی ضرورت محسوس کی۔ حالانکہ مرزا کی رایوں میں سخت تلخی اور ایک قسم کا تنفر جو ذاتی عناد اور مخالفت کا نتیجہ ہوتا ہے پایا جاتا ہے۔ منشی ہرگوپال تفتہ کو ایک خط میں عبدالواسع اور قتیل کے متعلق ان الفاظ میں اظہار رائے کیا ہے:

"سنو میاں! میرے ہم وطن ہندو لوگ جو وادی فارسی دانی میں دم مارتے ہیں وہ اپنے خیال کو دخل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں جیسا کہ وہ گھاگس الو عبدالواسع ہانسوی لفظا" مراد کو غلط کہتا ہے اور یہ الو کا پٹھا قتیل مفوت کدہ شفقت کدہ و نشترکدہ اور ہمہ عالم اور ہم جا کو غلط کہتا ہے کیا میں بھی ویسا ہی ہوں جو یک "زماں" کو غلط کہوں گا۔"

قاضی عبدالجمیل کے خط میں مولوی غیاث الدین رامپوری کی نسبت اس طرح رائے زنی کرتے ہیں:

"غیاث الدین رامپور میں ایک ملائے مکتب تھا۔ ناقل نا عاقل جس کا ماخذ اور مستند علیہ قتیل کا کلام ہوگا۔ اس کا فن لغت میں کیا فرجام ہوگا۔"

حالانکہ غیاث الدین کے متعلق اس قسم کی رائے کے نتیجے میں نواب کلب علی خاں والی رامپور مرزا سے ناراض ہوگئے۔ گو انہوں نے وظیفہ وغیرہ بند نہیں کیا لیکن دل میں کدورت پیدا ہونے کے سبب سے ان ذاتی تعلقات اور اس لگاؤ میں یوسف علی خاں کے عہد میں ریاست رامپور اور دربار سے وابستہ ہوگئے تھے ضرور کمی آگئی۔

ان لوگوں پر مرزا کا سب سے بڑا اعتراض یہی تھا کہ یہ اپنے خیال کو دخل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں جبکہ مرزا دلیل کو صحیح ثابت کرنے کے لیے علمائے فاضل سے سند پیش کرتے تھے حالانکہ مرزا سے بھی اس سلسلہ میں لغزشیں ہوئی ہیں اور یہی باعث تھا کہ برہان قاطع اور قاطع برہان کا قضیہ ایسا رنگ لایا۔

اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ مرزا کسی کے علم و فضل کی قدر ہی نہیں کرتے تھے یا ہر اہل علم کے متعلق

مرزا کی رائے غیر متوازن تلخ اور ذاتی عناد کا نتیجہ تھی وہ ایک صائب نظر رکھتے تھے اور قابل احترام استادوں کی خواہ ان کے ہمعصر ہی کیوں نہ ہوں۔ ایسی ہی قدرو منزلت کرتے تھے..... جیسی کہ چاہیے مرزا حاتم علی بیگ مرجو ناسخ کے شاگرد تھے لیکن ان کے وفات کے بعد..... مرزا سے اصلاح لینے لگے تھے ان کو ایک خطبہ میں ناسخ کے متعلق لکھتے ہیں۔

"ناسخ مرحوم جو تمہارے استاد تھے میرے بھی دوست صادق الوداد تھے مگر یک فن تھے صرف غزل کہتے تھے۔ قصیدہ اور مثنوی سے ان کو کچھ علاقہ نہ تھا سبحان اللہ تم نے قصیدہ میں وہ رنگ دکھایا کہ انشاء کو رشک آیا مثنوی کے جو اشعار میں نے دیکھے کیا کہوں کیا حظ اٹھایا..... اگر اس انداز پر انجام پائے گی تو یہ مثنوی کارنامہ اردو کہلائے گی۔"

ناسخ کے متعلق کس قدر صحیح رائے ہے۔ انشاء کی قصیدہ نگاری کے اعلیٰ مرتبہ کا احساس ہے۔ اس کے علاوہ شاگردوں کی ہمت افزائی کا طریقہ بھی اعلیٰ ہے۔

دہلی اور لکھنؤ علم و فضل کے مرکز ہونے کے سبب غالب سے پہلے اور غالب کے دور میں ایک دوسرے کے حریف بن چکے تھے لیکن مرزا نے لکھنؤ کی فضیلت کے اعتراف میں قطعاً" بخل اور حسد سے کام نہیں لیا۔ میر مہدی جو دہلی کی زبان پر فخر کرتے تھے اور اس کے مقابلے میں لکھنؤ کو گھٹانے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن مرزا ان سب باتوں کو لغو اور جہل سمجھتے تھے لکھتے ہیں:

"اے میر مہدی تجھے شرم نہیں آئی میاں یہ اہل دلی کی زبان ہے۔ ارے اب انہیں دلی یا اہل ہنود ہیں یا اہل حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے۔ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔"

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں:

"آہ میاں سید زادے آزادے دلی کے عاشق دلدادے ڈھئے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے حسد سے لکھنؤ کو برا کہنے والے نہ دل میں مہر و آزرم نہ آنکھ میں حیا و شرم۔ نظام الدین ممنوں کہاں ذوق کہاں' مومن خاں کہاں ایک آزردہ سو خاموش دوسرا غالب وہ بےخود و مدہوش' نہ سخنوری رہی نہ سخن دانی کس برتے پر تتا پانی ہائے دلی وائے دلی بھاڑ میں جائے دلی۔"

بعض ناقدین نے غالب کی شاعری کو غدر کا مرثیہ کہا ہے لیکن کچھ لوگ اس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ غالب کی بیشتر شاعری غدر سے قبل ختم ہو چکی تھی جو ایک حد تک صحیح بھی ہے۔ بقول مجنوں اگر اس دور کا جو غدر سے پہلے ہی انحطاط پذیر ہو چکا تھا۔ غالب کے کلام کو مرثیہ کہا جائے تو بجا ہے لیکن غدر سے قبل اور غدر سے بعد کی تباہی میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے دراصل غالب کے خطوط اس دور کے انحطاط دلی کی تباہی اور بربادی کے

بہترین مرقع ہیں۔ اس تباہی و بربادی نے مرزا کے ذہن کو کس قدر متاثر کیا ہے ان کے خطوط سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

غزل گو شاعر مجبور ہوتا ہے جو اردگرد سے بے خبر تخیل پر پرواز کرتا ہے لیکن غالب نے دلی کی تباہی اس کے ایک ایک گھر کے گرنے کا ذکر اس درد سے کیا ہے کہ اپنے حقیقی بھائی اور اولاد کے مرنے کا ذکر بھی اس طرح نہیں کیا۔ اس بربادی میں تمام تہذیب کی بربادی اور انحطاط کا مظاہرہ ہے جو استعارہ اور تمثیل میں غالب نے اپنے خطوط میں پیش کیا ہے۔ اس سلسلہ میں چند منتشر اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"کیوں میں دلی کے ہنگامے سے ناخوش نہ ہوں جب اہل شہر ہی نہ رہے۔ شہر کو لے کے کیا چولھے میں ڈالوں۔"

"اے بندۂ خدا اردو بازار نہ رہا اردو کہاں واللہ اب شہر نہیں کیمپ ہے۔"

"مرزا تفتہ تم بڑے بے درد ہو دلی کی تباہی پر تم کو رحم نہیں آیا۔"

"قاسم جان کی گلی خیراتی کے پھاٹک سے فتح اللہ بیگ خاں کے پھاٹک تک بے چراغ ہے۔"

اس عہد میں جب کہ ہر قسم کی حرکت و سکنت شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھی جارہی تھی شکست خوردہ قوم لیکن ایسے زخمی کی مانند جس کا زخم تازہ ہو جس کو اپنی قوت و توانائی پر ابھی اعتماد ہو اور ایک مرتبہ پھر انگڑائی لینے کی جس میں سکت ہو اس کو ہر صورت اور ہر پہلو سے گھائل کر کے بے دم کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ اس کی قوت و توانائی اس کی خوداری اس کے جذبات و احساسات ہمیشہ کے لیے دفن کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش جائز تھی۔ اس عہد میں غالب جیسے مجبور و لاچار اور حکومت انگلشیہ کے دست نگر سے اس سے زیادہ توقعات کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ غالب نے دبے الفاظ استعارہ اور کنائیہ میں دلی کی تباہی کا مکمل نقشہ اپنے خطوط میں کھینچ دیا ہے۔

آخر میں جب مرزا کے اعضاء اور حواس نے جواب دے دیا تھا تو وہ اشعار کی اصلاح سے احتراز کرنے لگے تھے قدر بلگرامی کو لکھتے ہیں:

"حضرت فقیر نے شعر کہنے سے توبہ کی ہے اصلاح دینے سے توبہ کی ہے شعر سنتا تو ممکن ہی نہیں۔ بہرا ہوں شعر دیکھنے سے نفرت ہے۔ پچھتر برس کی عمر پندرہ برس کی عمر سے شعر کہتا ہوں۔ ساٹھ برس بکا نہ مدح کا صلہ ملا نہ غزل کی داد بقول انوری۔

اے دریغانیست ممدوح سزادار مدیح اے دریغانیست معشوق سزاوار غزل

سب شعراء سے اور احباب سے متوقع ہوں کہ مجھے زمرۂ شعراء میں شمار نہ کریں اور اس فن میں مجھ سے کبھی پرسش نہ ہو۔"

ظاہر ہے کہ یہ عمر کا وہ دور ہوتا ہے کہ جب انسان کو کسی قسم کی خواہش باقی نہیں رہتی اور وہ دنیا و مافیہا

سے بے خبر کائنات کے ہنگاموں سے دور کہیں خلوت میں زندگی کے آخری لمحات پر سکون طور پر گذارنا چاہتا ہے پچھتر برس کی عمر میں غالب بھی زندگی کے اس موڑ پر جلوہ گر ہیں۔

دراصل خطوط سے غالب کی شخصیت کے وہ پہلو ابھرتے ہیں جو ان کے افعال و کردار کا نتیجہ ہیں اور جن کے پیچھے سماجی محرکات اپنی پوری قوت و توانائی کے ساتھ کار فرما ہیں۔ مثلاً" ان کے مزاج کی انائی کیفیت' خود پسندی اور اپنے علم و فضل کا گہرا احساس اس دنیا کو دارالمحن سمجھ کر اس کو ہنس کر گزارنے کی کوشش زندگی سے محبت اور اس میں ایک ابدی مسرت کی تلاش۔

مادی زندگی سے محبت اور اس میں راحت و مسرت کی تلاش غالب کی شخصیت کا ایک اہم جزو ہے جس سے ان کے افکار و عقائد بھی متاثر نظر آتے ہیں اس راحت مسرت کی تلاش نے مرزا سے نہ صرف نوابین' امراء اور انگریزوں کی شان میں قصیدے لکھوائے بلکہ انہیں کے الفاظ میں بھیک کے لیے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کیا۔ کلکتہ کے سفر کی صعوبتیں برداشت کرائیں اور ہر اس چیز سے بر سرپیکار ہونے پر آمادہ کیا جو اس راہ میں حائل ہوئی خواہ وہ جائز ہوں یا ناجائز خواہ سماجی رسوم ہوں یا اخلاقی اقدار۔ اس کی وضاحت کے لیے دو مثالیں کافی ہیں ایک تو ولیم فریزر (William Frieser) کے قتل کے سلسلہ میں نواب شمس الدین خاں کے خلاف مخبری میں غالب کا ملوث ہونا۔ دوسرے آزردہ کی بیوہ کی پنشن کے سلسلہ میں نواب رامپور سے اس کی مخالفت اور اس پنشن کی رقم کو خود حاصل کرنے کی کوشش اس بات کے واضح ثبوت ہیں کہ روپیہ حاصل کرنے کے سلسلہ میں مرزا ہر جائز و ناجائز عمل کو روا سمجھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی یہ پہلو بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ مرزا دوسروں کو بھی خوشحال دیکھنا چاہتے تھے اور دنیاوی آسائش ہر انسان کا بنیادی حق سمجھتے تھے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"چاہتا ہوں کہ جس شہر میں رہوں کوئی ننگا بھوکا نہ رہے۔ غالباً" یہی نظریہ مرزا کو باوجود تنگ دستی کے داد و دہش اور جود و سخا پر مجبور کرتا تھا جس کے بے شمار قصے تذکروں اور سوانح عمریوں میں ملتے ہیں۔

یہ ہیں غالب کی شخصیت کے وہ پہلو جن کے نقوش مجموعی طور پر ان کے خطوط میں تلاش کئے جا سکتے ہیں اور جن کے بنانے میں سماجی حالات اور تقاضوں کا گہرا اثر ملتا ہے۔

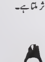

نخی حسن نقوی

دلی کی سماجی زندگی

خطوط غالب کے آئینے میں

مولانا حالی نے سچ کہا ہے کہ مرزا کی عام شہرت ہندوستان میں جس قدر ان کی اردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ہے ویسی نظم اردو اور نظم فارسی اور نثر فارسی سے نہیں ہوئی 1۔ اسی خیال کی وضاحت عہد جدید کے نقاد مرزا محمد عسکری نے کی ہے' جو لکھتے ہیں۔

"یہ عجیب بات ہے کہ مرزا نے فارسی نظم و نثر میں اردو سے مہ چندو چہار چند زیادہ لکھا' مگر اس میں ان کو وہ شہرت و مقبولیت حاصل نہ ہو سکی' جس کے وہ حقمی اور مستحق بھی تھے۔ برخلاف اس کے اردو نظم و نثر کو وہ ہمیشہ دون مرتبہ سمجھتے رہے اور اس کی اشاعت کے بھی وہ زیادہ خواستگار نہ تھے' مگر اس کو قسمت کی ستم ظریفی سمجھنا چاہئے کہ ایک مختصر دیوان اور چند خطوط کی بدولت ان کو وہ شہرت عظیم حاصل ہوئی جو اردو تو اردو کسی فارسی شاعر کو بھی بہ استثناء چند بہ مشکل نصیب ہوئی ہو گی۔2۔

خطوط غالب کی ادبی اہمیت کو تمام ادبی دنیا نے بالاتفاق تسلیم کیا ہے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ مرزا کی نثر پر لوگوں نے توجہ کم کی ہے اور وہ ہنوز تحقیق و تدقیق اور عمیق مطالعہ کی محتاج ہے۔ موجودہ دور میں غالب پر کافی تحقیقی کام ہوا ہے' لیکن خطوط غالب کا تجزیہ اب بھی بہت کم لوگوں نے کیا ہے۔

خطوط غالب دلی کی ہمعصر سماجی زندگی پر بڑی دلچسپ و کارآمد روشنی ڈالتے ہیں۔ ان خطوط میں غالب نے سادہ' سلیس' عام فہم' اور بول چال کی زبان میں دلی کی معاشرت' غدر کے زمانے کا آنکھوں دیکھا حال' اس کا ردعمل' دلی کی منگائی' بدنظمی اور طوائف الملوکی اور بہت سی دیگر سماجی باتوں کا تذکرہ اپنے مخصوص انداز میں کیا ہے۔

غالب کی ہمعصر دلی میں جاگیردارانہ نظام سوسائٹی کے رگ و پے میں رچا ہوا تھا۔ ایک دلی ہی نہیں بلکہ سارا ملک اس وقت ایک عظیم سیاسی اور سماجی انقلاب سے دو چار تھا شہنشاہیت اور نوابیت دم توڑ رہی تھی۔ غالب کے عہد کا ہندوستان اور غالب کی دلی دور انقلاب کے فرانس اور پیرس کا نقشہ پیش کر رہے تھے جس میں امراء نام کے امیر رہ گئے تھے اور اعلا" ان کی ریاست اور امارت ختم ہو چکی تھی۔ رسی جل گئی تھی مگر بل نہیں گئے تھے۔ غالب بھی اسی نظام کے نمائندہ تھے۔

اگرچہ غالب ہمیشہ کرایہ کے مکان میں رہے اور ان کی اکثر و بیشتر زندگی مالی مشکلات میں گذری لیکن وہ نواب بہرحال تھے۔ ان کے خطوط میں ان کی مفلسی اور عسرت کی طرف بے شمار اشارے ملتے ہیں، یہاں تک کہ شراب تو درکنار ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ وہ روٹیوں کے لئے محتاج نظر آتے ہیں۔ 1858ء کے ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

"وہ عزت اور وہ ربط ضبط جو ہم رئیس زادوں کا تھا اب کہاں روٹی کا ٹکڑا ہی مل جائے تو غنیمت ہے۔"3

اسی طرح میر سرفراز حسین کو لکھتے ہیں:

"کتابیں کہاں سے چھپواتا۔ روٹی کھانے کو نہیں، شراب پینے کو نہیں۔ جاڑے آتے ہیں۔ لحاف تو شک کی فکر ہے۔ کتابیں کیا چھپواؤں گا۔" 4۔

لیکن اس کے باوجود اپنے مکان کے مردانے حصے کو وہ "دیوان خانہ" سے تعبیر کرتے ہیں اور زنانے حصے کو محلسرا کا نام دیتے ہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میاں میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محلسرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔ پاخانہ ڈھے گیا ہے۔ چھتیں ٹپک رہی ہیں۔ دیوان خانہ کا حال محلسرا سے بدتر ہے ...... ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے ..... اگر تم سے ہو سکے تو مجھ کو وہ حویلی جس میں میر حسن رہتے ہیں .... میرے رہنے کو دلوا دو۔ برسات گذر جائے گی، مرمت ہو جائے گی پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں آ رہیں گے۔ 5۔

لیکن ان کے نوابی ٹھاٹ باٹ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ نوکروں کی تعداد میں جو کم و بیش ایک درجن تھی، کبھی کوئی کمی نہ آئی۔ وہ ہمیشہ پالکی میں سوار ہو کر شہر میں نکلتے تھے۔ غذا ہمیشہ بہت لذیذ اور قیمتی کھاتے تھے اور قیمتی لباس پہنتے تھے۔ شرابیں ہمیشہ ولایتی پیتے تھے جن میں دو خاص طور پر انہیں مرغوب تھیں۔ "کاسٹے لی ان" اور "ایڈل ٹم" گرچھال کی دیسی شراب سے انہیں نفرت تھی۔ مختصراً "وہ فطرتاً" اور عادتاً "مکمل نواب تھے" اور چاہتے تھے کہ دوسرے لوگ بھی انہیں نواب سمجھیں اور نواب کہہ کر خطاب کریں، اور ان کے نام کے ساتھ "بہادر" کا لفظ ضرور استعمال کریں۔ منشی شیونرائن کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"سنو میری جان، نوابی کا مجھکو خطاب ہے ...... اطراف و جوانب کے امراء سب مجھکو نواب لکھتے ہیں، بلکہ بعض انگریز بھی۔ چنانچہ صاحب کمشنر بہادر نے جو رو بکاری بھیجی ہے تو لفافہ پر نواب اسد اللہ خاں لکھا لیکن یہ یاد رہے نواب کے لفظ کے ساتھ میرزا یا میر نہیں لکھتے۔ یہ خلاف دستور ہے۔ یا نواب اسد اللہ خاں لکھو اور بہادر کا لفظ تو دونوں حال میں واجب اور لازم ہے۔ 6۔

غالب کے خطوط کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان میں کہیں کہیں 57ء کے انقلاب کا آنکھوں دیکھا حال

انہوں نے بیان کیا ہے جو تاریخی نقطہ نظر سے بہت اہم ہے۔ انہوں نے دلی کو تباہ ہوتے اور اجڑتے ہوئے بچشم خود دیکھا تھا۔ اس لئے انہوں نے کہیں کہیں دلی کی تباہی و بربادی کا جو مرثیہ پڑھا ہے وہ تاریخی اعتبار سے نہایت اہم اور قومی نقطہ نظر سے بہت دلچسپ و موثر ہے۔ ایک خط میں چودھری عبدالغفور سرور کو لکھتے ہیں۔

"یہاں کوئی طرح آسائش کی نہیں ہے۔ اہل دہلی عموماً بڑے ٹھہر گئے۔ یہ داغ ان کی جبین حال سے مٹ نہیں سکتا۔ میں اموات میں ہوں۔ مردہ شعر کیا کہے گا۔ غزل کا ڈھنگ بھول گیا۔ معشوق کس کو قرار دوں جو غزل کی روش ضمیر میں آوے۔ رہا قصیدہ، ممدوح کون ہے۔ ہائے انوری میری زبان سے کہتا ہے:

اے دریغانیست ممدوحے سزاوار مدیح
اے دریغانیست معشوقے سزاوار غزل 7۔

ایک خط میں میرمہدی مجروح کو لکھتے ہیں۔

"بھائی کیا پوچھتے ہو، کیا لکھوں، دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتہ سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلی کہاں! ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس کا نام تھا ... اہل اسلام میں سے صرف تین آدمی باقی ہیں۔ میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدرالدین خاں، بلی ماروں میں سگ دنیا موسوم بہ اسد تینوں مردود و مطرود و محروم و مغموم ... تم آتے ہو، چلے آؤ۔ جاں نثار خاں کے چھتے کی، خانچند کے کوچے کی سڑک دیکھ جاؤ۔ بلاقی بیگم کے کوچے کا ڈھینا، جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز میدان کا نکلنا سن جاؤ۔"8۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جامع مسجد کے گرد میدان نکالنے کی خبریں گرم تھیں لیکن اس تحریر کے وقت تک نکالا نہیں جا سکا تھا۔ اور اس کے بعد میرمہدی ہی کو میدان نکلنے کی اطلاع ان الفاظ میں دیتے ہیں۔

"مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازہ تک بے مبالغہ ایک صحراء لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو کا عالم ہو جائے ..... کشمیری دروازہ کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازہ سے کابلی دروازہ تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ، دھوبی واڑہ، رام جی گنج

سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ حویلی، ان میں سے کسی کا پتہ نہیں۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا...... اللہ اللہ دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسن اعتقاد! ارے بندہ خدا اردو بازار نہ رہا، اردو کہاں؟ دلی کہاں! واللہ اب شہر نہیں کنپ ہے، چھاؤنی ہے، نہ قلعہ ہے، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر9۔

57ء کے انقلابی دور میں دلی میں ایک قیامت برپا تھی، نہ کوئی قانون تھا نہ کسی کا حکم، لوگوں کو جان و مال،

عزت و آبرو کوئی چیز محفوظ نہ تھی۔ ایک افراتفری کا عالم تھا۔ شہریوں میں دہشت طاری تھی۔ لوگ جان اور آبرو بچانے کے لئے اپنے مکان اور زمینیں چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ اس کیفیت کا نقشہ غالب نے مولوی عزیز الدین کے نام خط میں اس طرح کھینچا ہے۔

"صاحب کیسی صاحب زادوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ دلی کو ویسا ہی آباد جانتے ہو جیسی آگے تھی۔ قاسم جان کی گلی میر خیراتی کے پھاٹک سے فتح اللہ بیگ خاں کے پھاٹک تک بے چراغ ہے۔ ہاں آباد ہے تو یہ ہے کہ غلام حسین خاں کی حویلی ہسپتال ہے۔ ضیاء الدین خاں کے کمرے میں ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں.... لال کنوئیں کے محلہ میں خاک اڑتی ہے' آدمی کا نام نہیں..... کبھی کی دوکان پر کتے لوٹتے ہیں۔" 10۔

اور اس سے زیادہ پر سوز پر درد وہ منظر ہے جو غالب نے مولوی احمد حسین قنوجی کو یکم ستمبر 1866ء کے خط میں کھینچا ہے۔

"تم دلی کو آباد اور قلعہ کو معمور اور سلطنت کو بدستور سمجھے ہوئے ہو..... اس دفتر راگاڑ خورد گاؤرا قصاب برو و قصاب در راہ مرو۔ بادشاہ کے دم تک یہ باتیں تھیں۔ خود میاں کالے صاحب مغفور کا گھر اس طرح تباہ ہوا کہ جیسے جھاڑو دی' کاغذ کا پرزہ' سونے کا تار' پشمینہ کا بال باقی نہ رہا۔ شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کا مقبرہ اجڑ گیا۔ کیا ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی۔ ان کی اولاد کے لوگ تمام اس موضع میں سکونت پذیر تھے۔ اب ایک جنگل ہے اور میدان میں ایک قبر۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ وہاں کے لوگ اگر کوئی سے بچے ہوں گے تو خدا ہی جانتا ہو گا کہاں ہیں۔" 11۔

57ء کی تحریک آزادی کا ردعمل تمام ملک میں عموماً اور شہر دہلی میں خصوصاً بڑا شدید ہوا۔ خصوصیت کے ساتھ دلی کے مسلمانوں کو اس کی مکافات سب سے زیادہ بھگتنی پڑی اور مسلمانوں کو انگریزی سرکار نے بڑی مشتبہ نگاہوں سے دیکھا۔ شہر میں ان کی نقل و حرکت پر کڑی پابندی لگائی گئی۔ اس پابندی کا تذکرہ غالب نے بڑی حسرت سے کیا ہے۔ انگریزی سرکار نے تمام مسلمان شہریوں کو شہر میں رہنے کے لیے چھپے ہوئے پرمٹ یا اجازت نامے تقسیم کرا دیئے تھے جنہیں غالب نے ٹکٹ کا نام دیا تھا۔ اس ٹکٹ کے بغیر شہر میں سڑک پر نکلنے کی ممانعت تھی۔ تمام تھانوں کو حکم تھا کہ فہرست تیار کریں کہ کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ چنانچہ میر مہدی مجروح نے جب دلی آنے کا ارادہ کیا تو غالب نے انہیں مشورہ دیا کہ بے ٹکٹ ہرگز نہ آئیں۔

بہادر شاہ ظفر' ان کے ساتھیوں اور ہمدردوں پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے گئے۔ بہت سوں کو تہ تیغ کیا گیا یا پھانسیاں دی گئیں' جو بچے ان میں سے کسی کو دیش نکالا دیا گیا' کسی کی جائیداد ضبط کر لی گئی۔ غالب نے ان حالات کو یقیناً بڑی شدت سے محسوس کیا ہو گا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ وہ چپ سادھے رہے۔ جیسے ان کی زبان پر پہرے لگا دیئے گئے ہوں۔ جیسے کسی نے ان کے ہونٹ سی دیئے ہوں۔ مگر حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ غالب "گویم

مشکل وگرنہ گویم مشکل" کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ اس کشمکش کی نشاندہی اس خط سے ہوتی ہے جو انہوں نے 26 دسمبر 1857ء کو حکیم غلام نجف خاں کو لکھا۔ اس میں لکھتے ہیں:

"انصاف کرو لکھوں تو کیا لکھوں۔ کچھ لکھ سکتا ہوں؟ کچھ قابل لکھنے کے ہے؟ تم نے مجھ کو لکھا تو کیا لکھا' اور اب جو میں لکھتا ہوں تو کیا لکھتا ہوں _____ بس اتنا ہی ہے کہ اب تک ہم تم جیتے ہیں۔ زیادہ اس سے نہ تم لکھو گے نہ میں لکھوں گا۔"

آخری فقرے نہایت معنی خیز ہیں اور اس کیفیت کی غمازی کرتے ہیں جو انسان "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل" کی ذہنی کشمکش میں الجھ کر محسوس کرتا ہے۔ اس طرح 3 فروری 1857ء کے خط میں جو میرزا تفتہ کے نام ہے۔ ایک بہت ہی مختصر سا جملہ لکھتے ہیں جس میں بے بسی اور لاچاری کا اتھاہ سمندر چھپا ہوا ہے--- "بھائی بڑی آنی ہے۔ انجام اچھا نظر نہیں آتا قصہ مختصر یہ کہ قصہ تمام ہوا۔" اور پھر 7 دسمبر 1857ء کو میرزا تفتہ ہی کو لکھتے ہیں:

"مبالغہ نہ جاننا۔ امیر غریب سب نکل گئے جو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے۔ جاگیر دار' پنشن دار' دولت مند' اہل حرفہ کوئی بھی نہیں۔ مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس اور دارو گیر میں مبتلا ہیں۔"

اس کے بعد سمجھ میں آنے لگتا ہے کہ غالب نے انگریزی حکومت سے وفاداری ظاہر کرنے اور ملکہ وکٹوریہ اور دوسرے حکام کی شان میں قصیدہ خوانی کی کیوں ضرورت محسوس کی۔ اور اگرچہ وہ ان "سکوں 12۔" کے الزام سے اپنا دامن نہ بچا سکے جو اصلاً" ذوق نے بہادر شاہ ظفر کی تاجپوشی کے موقع پر بادشاہ کی نذر کئے تھے' لیکن انگریزی سرکار نے زبردستی غالب کے سر تھوپ دیئے تھے' پھر بھی وہ اپنی قصیدہ خوانی کے ذریعے انگریزی سرکار کی خوشنودی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ذوق کی طرف سے سکے نذر ہونے کی خبر مولوی باقر دہلوی نے اپنے ہفتہ وار اخبار "دہلی اردو اخبار" میں شائع کی تھی۔ 13۔ لیکن وہ اخبار باوجود کوشش کے غالب کو کہیں پر دستیاب نہ ہو سکا۔ پھر بھی آگے چل کر غدر کے رفع ہونے اور دلی کے فتح ہونے کے بعد ان کی پنشن بحال ہو گئی' چڑھا ہوا روپیہ دام دام مل گیا۔ اور ان کی زندگی جیسے تیسے گزر گئی۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ وہ زندہ بچ گئے لیکن اگر وہ کہیں مارے گئے ہوتے' یا اقتصادی دباؤ سے اپنی موت مرگئے ہوتے تو ہم ایک عظیم شاعر' انشاءنگار' اور ادیب کے فن سے محروم رہ جاتے۔

غالب کے خطوط میں دلی کی سماجی زندگی کی طرف جا بجا اشارے ملتے ہیں جن کے باعث خطوط غالب کی تاریخی اہمیت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے 57ء کے انقلاب کے نتیجہ میں جو اقتصادی بحران دلی پر محیط ہوا' اس کے بڑے مضر اثرات مرتب ہوئے جن سے شرفاء و امراء دلی کی اخلاقی قدروں کو زبردست ٹھیس لگی۔ مقام عبرت ہے کہ "معزول بادشاہ کے ذکور جو تلوار سے بچ رہے وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پانے لگے اور روٹیوں کے لئے محتاج ہو گئے۔ عورتوں میں سے جو بوڑھی تھیں وہ "کٹنیاں" بن گئیں اور جوان "کسبیوں" کا کام کرنے لگیں۔ غالب احباب'

اعزاء اور امرائے دلی کو نام بہ نام یاد کرتے ہیں۔ اور ان کی تباہی اور بربادی کا مرثیہ پڑھتے ہیں جسے سن کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ مرزا علاؤ الدین خاں کو لکھتے ہیں۔

"امرائے اسلام میں سے اموات گنو۔ حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا' سو روپے روز کا پنشن دار' سو روپے مہینہ کا روزینہ دار بن کر مرگیا۔ میر ناصرالدین باپ کی طرف سے پیرزادہ نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے' بیمار پڑا' نہ دوا نہ غذا۔ انجام کار مرگیا۔ تمہارے چچا کی طرف سے تجہیز و تکفین ہوئی۔" 14۔

غالب کی دلی میں معلوم ہوتا ہے "ہندوستانی قوم" بسی ہوئی تھی جو مشترکہ کلچر کا مثالی نمونہ تھی' جس میں ہندو مسلمان کی وہ تفریق نہ تھی جس نے ہمارے دیکھتے دیکھتے سماجی لعنت کی صورت اختیار کر لی۔ غالب کی دلی میں ہندو مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ برادرانہ میل جول اور باہمی اختلاط رکھتے تھے اور مغائرت اور منافرت تو درکنار ایک دوسرے کے ساتھ بڑے خلوص و محبت اور یگانگت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ غالب آپ کثیر الاحباب آدمی تھے جن میں کافی تعداد ہندوؤں کی تھی اور کافی تعداد میں ان کے ہندو شاگرد تھے جو اپنے اردو فارسی کلام پر ان سے اصلاح لیتے تھے۔ خطوط غالب کے مکتوب الیہم جہاں مسلمان ہیں وہاں ہندو بھی ہیں جنہیں غالب اپنے خطوط میں والہانہ پیار و محبت سے مخاطب کرتے ہیں۔ ہر گوپال کو پیار میں انہوں نے میرزا کا لقب اور تفتہ کا تخلص دیا۔ ایک خط میں میرزا تفتہ کو ہر مہینہ کم از کم ایک خط صرف اپنی خیریت کا بھیجنے کی تاکید کرتے ہیں۔ ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ اگر میرا سگا بھائی زندہ ہوتا اور وہ تمہاری برائی کرتا تو میں اس کو جھڑک دیتا اور اس سے آزردہ ہوتا۔

اسی طرح منشی شیو نرائن کو "نور بصر" "لخت جگر" "فرزند دلبند" برخوردار اور "نور چشم" کے پیار بھرے الفاظ سے مخاطب کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ منشی شیو نرائن کے والد منشی بنسی دھر اور غالب ہم سن اور لنگوٹیا یار تھے۔ دونوں ایک محلے میں رہتے تھے' ایک جگہ اٹھتے بیٹھتے اور کھیلتے کودتے تھے۔ ایک ساتھ بیٹھ کر شطرنج کھیلتے اور کوٹھے پر پتنگ اڑاتے تھے منشی شیو نرائن کے خاندان اور غالب کے گھرانے کے دیرینہ مراسم تھے منشی شیو نرائن کے پردادا اور غالب کے نانا گہرے دوست تھے۔ غالب کے نانا نے جب اپنے کسی گاؤں کا مقدمہ لڑا تو پیروی منشی شیو نرائن کے دادا نے کی۔

مختصر یہ کہ غالب کے ہمعصر دور میں دلی کے سماج میں "ہندوستانیت" رچی ہوئی تھی جس کو آگے چل کر تنگ نظری اور تعصب نے بالکل مسخ کر دیا اور اب ہماری یاد میں جس کے از سر نو احیاء کے لئے مہاتما گاندھی آنجہانی نے اپنی زندگی کو وقف کر دیا اور آخر کار اسی کے لئے اپنی جان قربان کر دی۔

غالب کے خطوط سے بہت سی اور باتیں سماجی تاریخ کے طالب علم کو حاصل ہوتی ہیں جن کا ذکر یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ مثلاً نواب غلام بابا خاں 15۔ نے غالب کو تحفہ میں گھڑی بھیجی جس کا مطلب یہ ہے کہ گھڑی

ہندوستان میں رائج تھی مگر اس کا استعمال عام نہیں ہوا تھا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ غالب اپنے خطوط میں جہاں دن اور تاریخ لکھنے کے عادی ہیں۔

وہاں خط لکھنے کا وقت بھی ظاہر کر دیتے ہیں غالب کے زمانے میں عینک استعمال ہوتی تھی۔ خود غالب آخر عمر میں عینک کی مدد سے پڑھتے لکھتے تھے۔ غالب کے خطوط میں چند اشارے ایسے ملتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کے عہد میں شریف گھرانوں کی عورتیں بھی عام طور پر پڑھی لکھی نہ ہوتی تھیں۔ غالب جگہ جگہ لکھتے ہیں۔

"اپنی دادی کو یہ خط پڑھ کر سنا دینا" یا" اپنی استانی 16ء کے پاس جا کر یہ رقعہ سرا سر پڑھ کر سنا دینا۔"

غالب نے ایک خط میں دم دار ستارے کا ذکر کیا ہو بعد غروب آفتاب دلی کی افق غربی پر نظر آتا تھا۔ غالب ہیئت سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اس کے اثرات کے بارے میں غالب کا خیال تھا کہ "یہ صورتیں قرانالی کی ہیں اور ولیس ملک کی تباہی کی" ایک اہم بات غالب کے خطوط سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ چھاپے خانے کا رواج عام ہوتا جا رہا تھا۔ دھڑا دھڑ کتابیں چھپ رہی تھیں اور متعدد اخبارات ملک میں نکل رہے تھے۔ غالب نے اپنے خطوط میں دلی، لکھنؤ، آگرہ اور کلکتہ کے متعدد اخبار گنائے ہیں۔ غالب ان کی اشاعت سے دلچسپی رکھتے تھے اور اخبار کے شوقین تھے۔

غالب کے خطوط سے ایک بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ غالب کے زمانے میں ڈاک کے انتظام میں خاصی باقاعدگی آ گئی تھی۔ غالب کے خطوط کی اتنی کثیر تعداد جو ہم تک پہنچ گئی ہے وہ بجائے خود اس بات کا ثبوت ہے کہ 57ء کی افراتفری اور طوائف الملوکی کے باوجود خط پہنچنے میں کبھی کبھار دیر تو ہو جاتی ہو۔ لیکن خطوط ضائع نہیں ہوتے تھے۔ اور ہرکارے یا پوسٹ مین باقاعدہ گھر پر جا کر دن میں ایک سے زیادہ بار ڈاک تقسیم کرتے تھے اور غالب کے نام خطوط پر اگر پتہ غلط بھی ہوتا تب بھی خطوط ان کو مل جاتے تھے۔ ان کے پتہ میں صرف ان کا نام اور دہلی لکھنا کافی ہوتا تھا۔ ایک دوست کو لکھتے ہیں "میرے نام کا کوئی لفافہ ضائع نہیں ہوتا۔"

مرزا محمد عسکری نے لکھا ہے کہ مرزا کے زمانے میں ڈاک کا انتظام اچھا نہ تھا' اسی وجہ سے وہ اکثر کہتے کہ "ڈاکئے اب ڈاکو ہو گئے ڈاک کیا ہے خاک ہے" لیکن یہ الفاظ مزاج لطیف' رعایت لفظی اور شاعرانہ مبالغہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ حکیم احمد حسن مودودی کو غالب ہی لکھتے ہیں۔

"میرے نام کا لفافہ جس شہر سے چلے' اسی شہر کے ڈاک گھر میں رہ جائے تو رہ جائے ورنہ دلی کے ڈاک خانے میں پہنچ کر کیا امکان کہ تلف ہو" 17ء اور ایک آدھ خط کی حد تک تو آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ضائع ہو جاتا ہے۔

مرزا محمد عسکری نے ڈاک کی بدنظمی کی دوسری دلیل یہ دی ہے کہ "شاید اسی وجہ سے وہ بیرنگ خط بھیجنا پسند کرتے تھے اور دوسروں کو فہمائش کرتے کہ تم بھی بیرنگ خط بھیجو۔" لیکن غالب جو بیرنگ خط بھیجنے کا مشورہ دیتے تھے تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ڈاک کا انتظام خراب تھا' بلکہ یہ تھی کہ غالب کا یہ عقیدہ ہو گیا تھا کہ بیرنگ خط

بمنزلہ رجسٹری ہوتا ہے' ایک خط میں لکھتے ہیں:

"ایک قاعدہ آپ کو بتاتا ہوں۔ اگر اس کو منظور کیجئے گا تو خطوط کے نہ پہنچنے کا احتمال اٹھ جائے گا اور رجسٹری کا درد سر جاتا رہے گا۔ آدھ آنہ نہ سہی ایک آنہ سہی۔ آپ بھی بیرنگ خط بھیجا کیجئے اور میں بھی بیرنگ بھیجا کروں۔ ... اس قاعدہ کا جیسا کہ میں واضع ہوا ہوں' بادی بھی ہوا اور یہ خط بیرنگ بھیجا۔" 18۔

کبھی کبھی غالب جب بالکل تہی دست ہوتے تھے تو پیسے نہ ہونے کی وجہ سے بیرنگ خط بھیجنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ میر سرفراز حسین کو لکھتے ہیں۔ "بھائی نہ کاغذ ہے نہ ٹکٹ ہے۔ اگلے لفافوں میں سے ایک بیرنگ لفافہ پڑا ہے۔ کتاب میں سے یہ کاغذ پھاڑ کر تم کو خط لکھتا ہوں اور بیرنگ لفافہ میں لپیٹ کر بھیجتا ہوں۔" اور مرزا شہاب الدین خاں کو لکھتے ہیں "آج میرے پاس نہ ٹکٹ ہیں نہ دام' معاف رکھنا۔ لیکن جب پیسے پاس ہوتے تو دوسروں کے بیرنگ خط وصول کرنے میں ذرا تکلف نہ کرتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں: ہر مہینہ میں آٹھ بیرنگ خط تک' بلکہ سولہ خط تک نہ گھبراؤں گا۔" بہرحال' بیرنگ خط کی اس تدبیر کو وضع کرنے والے اور بیرنگ خط سے رجسٹری کا فائدہ اٹھانے والے اتالیادنیا میں سب سے پہلے آدمی غالب تھے۔

غالب کے خطوط سے تصویر کشی کی ایک نئی تکنیک کا اندازہ ہوتا ہے جو اس سے پہلے کہیں دیکھنے یا سننے میں نہ آئی تھی۔ ماڈل کو سامنے بٹھا کر تصویر اتارنے کا طریقہ تو کافی پرانا ہے۔ لیکن غالب کے زمانے میں مصوروں نے تصویر کشی کا ایک آسان تر طریقہ یہ ایجاد کیا تھا کہ مصور تصویر کھنچوانے والے کے سامنے آئینہ رکھ کر آئینہ پر اس کا عکس اتار لیتا تھا۔ اور اس کے بعد اس میں حسب منشا نقوش ابھار تا' لائٹ اور شیڈ دیتا یا رنگ بھرتا تھا۔ لیکن اس میں خرابی یہ تھی کہ اس طرح تصویر کھنچوانے والے کو ماڈل بننے کی زحمت تو اٹھانی پڑتی تھی اور اس زحمت کے بعد بھی صرف اس کا بسٹ بن سکتا تھا اور پورے جسم کی تصویر اس میں نہیں اتر سکتی تھی۔ غالب کو یہ بات پسند نہ تھی۔ ایک خط میں نواب غلام بابا خاں عرف چھوٹے صاحب کی تصویر کے بعد میاں داد خاں سیاح کو لکھا گیا تھا' کہتے ہیں:

"خیر (چھوٹے صاحب کا) دیدار تو میسر ہوا' گفتار بھی اگر خدا چاہے گا' سن لیں گے۔ دیکھو منشی صاحب آئینہ کی تصویر کی صنعت کو بہت پسند کرتے ہیں' مگر فقیر اس کا معتقد نہیں اب دیکھو حضرت کی تصویر میں کہنیوں تک ہاتھ کی تصویر ہے۔ آگے پہنچے اور نیچے کا پتہ نہیں۔ مکالمہ ایک طرف' مصافحہ کی بھی حسرت رہ گئی۔ 19۔

غالب نے اپنے خطوط میں جگہ جگہ مہنگائی کا شکوہ کیا ہے اور بعض میں اپنے دوستوں کو دلی میں مختلف اجناس کے رائج الوقت نرخ بتائے ہیں جو ہمارے لئے قابل رشک ہیں اور جن پر ہم اپنی لاکھوں ارزانیاں قربان کر سکتے ہیں۔ غالب نے اپنے زمانے کے جو نرخ لکھے ہیں اور جسے وہ مہنگائی سے تعبیر کرتے ہیں انہیں سن کر بے اختیار جی چاہتا ہے۔ کاش وہ مہنگائی ہمیں مل جائے چودھری عبدالغفور کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"غلہ گراں ہے۔ موت ارزاں ہے۔ میوہ کے مول اناج بکتا ہے۔ ماش کی دال 8 سیر' باجرہ 16 سیر' گیہوں 12 سیر' چنے 16 سیر' گھی ڈیڑھ سیر 20۔"

غالب ایک زندہ دل آدمی تھے۔ وہ کھاؤ' پیو' اور مزے اڑاؤ کے قائل تھے۔ جن پریشانیوں سے وہ زندگی بھر دوچار رہے۔ ان میں اگر کوئی جلا ہوتا تو چیخ اٹھتا۔ وہ شراب دراصل غم غلط کرنے کے لیے پیتے تھے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے

انہوں نے خود کہا ہے۔ لیکن غالب غم حیات اور غم روزگار کے باوجود ہمیشہ مسکراتے رہے اور دوسروں کو اس ہنسی میں شریک کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کی بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی پر جو ان کے خطوط کی جان ہے کبھی کبھی اس طرح سر دھننے کو جی چاہتا ہے۔ جس طرح ان کے اچھے سے اچھے شعر پر۔ لیکن وہ دراصل روتے میں ہنستے تھے اور روتے ہوؤں کو ہنساتے تھے۔ ان قہقہوں میں ان کے دل کی کراہیں چھپی ہوئی ہیں' اور اس میں ان کی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔

ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں ایک وید مقدس دوسری دیوان غالب۔

عبدالرحمٰن بجنوری

مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا تو میں بے تکلف یہ تین نام لوں گا غالب۔ اردو۔ تاج محل۔

رشید احمد صدیقی

حواشی

1۔ مولانا حالی۔ یادگار غالب ص 179۔
2۔ مرزا محمد عسکری ادبی خطوط ص 5
3۔ غالب اردوئے معلی
4۔ غالب: اردوئے معلی
5۔ ایضا"
6۔ ایضا"
7۔ ایضا"
8۔ ایضا"
9۔ غالب: اردوئے معلی
10۔ ایضا"
11۔ ایضا"
12۔ سکہ وہ بیت ہوتی تھی جو شاید کسی قطعہ کے ساتھ کہہ کر جشن تاجپوشی کے موقع پر سکہ پر کندہ کرانے کے لیے بادشاہ کی نذر کرتا تھا۔
13۔ مالک رام نے علی گڑھ میگزین 49ء کے حوالہ سے غالب کا ایک جملہ نقل کیا گیا ہے جسے صاحب کمشنر بہادر سے ملاقات کے دوران اس کی زباں سے نکلا ہوا بتایا گیا ہے اس سے یہ شک گذرتا ہے ک غالب کو معلوم نہ تھا کہ سکے کس نے کہے۔ نیز یہ کہ اخبار نے غلط طور پر ان کا نام لکھ دیا۔ حالانکہ چودھری عبدالغفور کے نام خط میں انہوں نے بڑے اعتماد کے ساتھ اس کی وضاحت کر دی ہے کہ وہ سکے ذوق کے کہے ہوئے تھے اور اخبار نے ذوق کے نام سے شائع کئے تھے۔
14۔ غالب: اردوئے معلی
15۔ سورت کے نواب جس کا عرف چھوٹے صاحب تھا' غالب کے خاص عقید تمندوں میں سے تھے۔
16۔ استاد کی بیوی سے مراد ہے یہ خط شہاب الدین خاں ثاقب کے نام ہے جو مرزا کے سسرال کے رشتے سے بھتیجے بھی تھے اور شاگرد بھی۔ یہاں استانی سے مطلب خود غالب کی اپنی بیگم سے ہے۔ سائل دہلوی مرحوم شہاب الدین مرحوم کے چھوٹے فرزند تھے۔ ایک دوسرے خط میں بھی غالب نے "استانی" سے مراد اپنی بیگم سے لی ہے۔
17۔ غالب: اردو معلی
18۔ غالب: اردوئے معلی
19۔ ایضا"
20۔ ایضا"

غلام رسول مہر

جنگ آزادی کی کہانی

(غالب کے مکاتیب میں)

سرزمین پاک و ہند میں انگریزوں کی حکمرانی کا سنگ بنیاد پلاسی کے میدان میں رکھا گیا۔ بعد ازاں قریباً نوے برس میں یہ اجنبی حکومت پورے ملک پر مسلط ہو گئی۔ اور مزید سو برس تک عنان فرماں روائی اسی کے ہاتھ میں رہی۔ اس عہد کا ایک نہایت اہم واقعہ 1857ء کا وہ ہنگامہ خونیں تھا جسے اہل وطن ابتدا ہی سے "جنگ آزادی" قرار دیتے رہے۔ لیکن خود انگریزوں نے اسے غدر کا نام دیا۔ یہی نام مدت تک تاریخ کی درسی کتابوں میں استعمال ہوتا رہا۔

مرزا غالب نے اپنی فارسی اور اردو تصانیف نظم و نثر میں اس واقعے پر جو کچھ لکھا۔ اگر اسے الگ کتاب کی شکل میں مرتب کیا جائے تو یقین ہے کہ ایک ضخیم مجلہ تیار ہو جائے۔ فارسی نثر کی ایک کتاب جس کا نام "دستنبو" ہے۔ صرف اسی واقعہ سے متعلق ہے لیکن میں جو نقشہ آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ وہ محض مرزا کے مکاتیب سے جستہ جستہ اقتباسات لے کر تیار کیا گیا ہے۔

تمہید کے طور پر عرض کر دینا چاہیے۔ کہ اس ہنگامہ کا آغاز 11 مئی 1857ء پیر کے دن ہوا تھا۔ چار مہینے اور چار دن انگریز شہر سے بے دخل رہے۔ اور ستمبر 1857ء کو وہ دوبارہ دہلی میں داخل ہوئے۔ 18 ستمبر کو شہر مکمل طور پر ان کے قبضے میں آگیا۔ میرزا اس پوری مدت میں ایک دن کے لیے بھی گھر سے باہر نہ نکلے۔ ان کا مکان بلی ماران میں تھا۔ جہاں شریف خانی حکیموں کے مکانات تھے۔ اس خاندان کے بعض افراد سرکار پٹیالہ میں ملازم تھے۔ جب انگریزی فوج دوبارہ دہلی میں داخل ہوئی تو اہل شہر گھر بار چھوڑ کر دہلی دروازے، ترکمان دروازے اور اجمیری دروازے سے باہر نکل گئے بلی ماران کے دروازے پر والی پٹیالہ نے شریف خانی خاندان کی حفاظت کے لیے اپنا پہرہ بٹھا دیا تھا۔ اس طرح مرزا کی حفاظت کا بندوبست ہو گیا اور انہیں گھر بار چھوڑ کر باہر نہ نکلنا پڑا۔

مرزا کے مکاتیب میں اس واقعے کے متعلق سب سے پہلی تحریر نومبر 1857ء کی ہے۔ جبکہ انگریز شہر پر قابض ہو چکے تھے۔ حکیم غلام نجف کو لکھتے ہیں۔

"میاں! حقیقت حال اس سے زیادہ نہیں کہ اب تک جیتا ہوں۔ بھاگ نہیں گیا۔ نکالا

نہیں گیا۔ لٹا نہیں۔ کسی محکمے میں اب تک بلایا نہیں گیا۔ معرض باز پرس میں نہیں آیا۔ آئندہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔"

"پھر 9 جنوری 1858ء کو تحریر فرماتے ہیں:

"جو دم ہے۔ غنیمت ہے۔ اس وقت تک مع عیال و اطفال جیتا ہوں۔ بعد گھڑی بھر کے کیا ہو؟ کچھ معلوم نہیں، قلم ہاتھ میں لینے پر بہت کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر لکھ نہیں سکتا۔ اگر مل بیٹھنا قسمت ہے تو مل لیں گے ورنہ اناللہ وانا الیہ راجعون"

یہ اگرچہ چند فقرے ہیں۔ جن میں کچھ نہیں لکھا گیا۔ لیکن لفظ لفظ بتا رہا ہے کہ اس وقت حالات کتنے نازک تھے۔ اور بے یقینی کس پیمانے پر پہنچی ہوئی تھی۔

یہ ہنگامہ درحقیقت ایک خوفناک زلزلہ تھا۔ جس نے سب کچھ تہ و بالا کر ڈالا۔ جس ماحول میں مرزا نے اپنی زندگی کے ساٹھ برس گذارے تھے۔ اس کی بساط لپیٹی جا چکی تھی۔ اور اس کی جگہ بالکل نیا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ مرزا کے دل پر اس وسیع اور ہمہ گیر انقلاب کا اتنا گہرا اثر تھا کہ وہ 1857ء سے پیشتر کے دور اور بعد کے دور کو دو الگ الگ عالم سمجھنے لگے تھے۔ یا کہنا چاہیے کہ ہندوؤں کے طریق تعبیر کے مطابق ان کے نزدیک ایک جنم ختم ہو گیا تھا۔ اور دوسرا جنم وجود میں آگیا تھا۔ اپنے عزیز ہندو شاگرد ہرگوپال تفتہ کو تحریر فرماتے ہیں:

"صاحب! تم جانتے ہو کہ یہ کیا معاملہ ہے اور کیا واقعہ ہوا؟ وہ ایک جنم تھا جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں، تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے۔ دیوان جمع کیے۔ اس زمانے میں ایک بزرگ تھے۔ اور ہمارے تمہارے دلی دوست تھے۔ منشی نبی بخش انکا نام اور حقیران کا تخلص۔ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات۔ نہ وہ اختلاط نہ۔ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کے ہے، یعنی ایک خط میں نے منشی صاحب کو بھیجا۔ اس کا جواب آیا۔ ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و متخلص بہ تفتہ ہو، آیا۔ اور میں جس شہر میں رہتا ہوں۔ اس کا نام دلی اور اس محلے کا نام بلی ماران کا محلہ۔ لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں سے نہیں پایا جاتا۔"

میں عرض کر چکا ہوں کہ انگریزی فوج کے داخلے کے ساتھ ہی اہل شہر باہر نکل گئے تھے۔ اور پورا شہر بے چراغ ہو چکا تھا۔ انگریزوں نے اس کے بعد عام دار و گیر کا سلسلہ شروع کر دیا مرزا فرماتے ہیں:

"مبالغہ نہ جاننا۔ امیر غریب سب نکل گئے جو رہ گئے وہ نکالے گئے۔ جاگیردار پنشن دار، دولت مند۔ اہل حرفہ کوئی بھی نہیں مفصل لکھتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے۔ باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں۔"

پھر فرماتے ہیں:

"اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا' سوار ہونا اور کہیں جانا تو بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے۔ شہر میں ہے کون' جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پائے جاتے ہیں جرنیلی بندوبست (یعنی مارشل لا) یازدہم مئی سے آج تک یعنی پنجشنبہ پنجم دسمبر 1857ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو نہیں معلوم۔"

مرزا کے ایک شاگرد منشی شیونرائن آرام نے آگرے سے ایک اخبار نکالا تھا۔ مرزا سے استدعا کی کہ اس کے لیے خریدار بہم پہنچایئے۔ جواب میں فرماتے ہیں:

"یہاں آدمی کہاں ہیں کہ اخبار کے خریدار ہوں۔ مہاجن لوگ جو یہاں بستے ہیں۔ وہ یہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ گیہوں کہاں سستے ہیں۔ بہت سخی ہو گئے تو جنس پوری دے دیں گے۔ کاغذ (یعنی اخبار) روپے مہینے کا کیوں مول لیں گے؟"

میری مہدی مجروح نے اس زمانے میں ایک غزل بھیجی جس کے مقطع کا آخری مصرع یہ تھا۔

"میاں یہ اہل دہلی کی زباں ہے"

اس مصرع نے مرزا کے ساز دروں کا ہر تار ہلا دیا۔ فرماتے ہیں:

"اے میر مہدی! تجھے شرم نہیں آتی؟ "میاں یہ اہل دہلی کی زبان ہے۔" ارے اب اہل دہلی ہندو ہیں یا اہل حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں۔ ان میں سے تو کس کی تعریف کرتا ہے؟ اے بندۂ خدا! اردو بازار نہ رہا۔ اردو کہاں؟ دہلی کہاں؟ واللہ اب شہر نہیں ہے۔ کیمپ ہے۔ چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر۔"

نواب علاؤالدین خاں کو لکھتے ہیں:

"میری جان! یہ وہ دلی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے..... ایک کیمپ ہے مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ' باقی سراسر ہنود۔"

جنگ آزادی میں اگرچہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے یکساں حصہ لیا تھا۔ لیکن انگریزوں کی نظروں میں اصل مجرم صرف مسلمان ہیں' چنانچہ وہ زیادہ تر دارو گیر کے ہدف بنے۔ انہیں کو بالعموم پھانسیاں ملیں' انہیں کی جائیدادیں ضبط ہوئیں۔ شہر سے باہر نکلنے میں بھی ہندو اور مسلمان برابر تھے۔ لیکن ہندوؤں کو بہت جلد گھروں میں آباد ہونے کی اجازت مل گئی۔ مسلمان بدستور باہر پڑے رہے یا جن کو کسی دوسرے شہر میں ٹھیک نظر آیا وہاں چلے گئے۔ مرزا لکھتے ہیں:

"واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا کیا امیر کیا غریب' کیا اہل حرفہ' اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں' ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"ابھی دیکھا چاہیے مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں۔"

مدت تک مسلمانوں کو شہر میں آباد ہونے کا حکم نہ ملا تو ان میں سے بعض نے شہر کے باہر ہی جگہ جگہ عارضی مکان بنانے شروع کر دیئے، اس پر حکم ہوا کہ سب مکان ڈھا دیئے جائیں اور اعلان کر دیا جائے کہ آئندہ کوئی مکان نہ بنائے مرزا لکھتے ہیں:

"کل سے یہ حکم نکلا ہے کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان و کان کیوں بناتے ہیں، جو مکان بن چکے ہیں انہیں گرا دو اور آئندہ کو ممانعت کا حکم سنا دو..... آج تک یہ صورت ہے، دیکھئے شہر کے بسنے کی کونسی صورت ہے، جو دیئے ہیں وہ بھی خارج کیے جاتے ہیں یا جو باہر پڑے ہیں وہ شہر میں آئے ہیں۔ الملک للہ والحکم للہ"

جنگ آزادی سے کم و بیش دو برس بعد حکم ہوا کہ کرایہ دار بھی آجائیں لیکن کرایہ مالکان مکان کو نہیں بلکہ سرکار کو ادا کریں۔ مرزا 9 نومبر 1859ء کے ایک خط میں فرماتے ہیں:

"آگے حکم تھا کہ مالکان مکان رہیں، کرایہ دار نہ رہیں۔ پرسوں سے حکم ہوگیا کہ کرایہ دار بھی رہیں کہیں یہ نہ سمجھنا کہ تم یا میں، یا کوئی اور اپنے مکان میں کرایہ دار کو آباد کرے، وہ لوگ جو گھر کا نشان نہیں رکھتے اور ہمیشہ کرائے کے مکانوں میں رہتے تھے وہ بھی آرہے ہیں مگر کرایہ سرکار کو ادا کریں۔"

ابتداء میں کوئی شخص اجازت کے بغیر شہر میں نہیں آسکتا۔ چھپ چھپا کر آجاتا اس کے پانچ بید لگتے یا دو روپے جرمانہ لیا جاتا اور آٹھ دن قید میں رہتا۔ پھر ٹکٹ چھاپے گئے اور اعلان ہوگیا کہ جو مسلمان شہر میں آباد ہونا چاہے۔ وہ ٹکٹ خریدے اور اپنی حیثیت کے مطابق جرمانہ داخل کرے، چنانچہ ٹکٹ پر یہ عبارت درج کر دی گئی تھی "ٹکٹ آبادی درون شہر بہ شرط ادخال جرمانہ" جرمانے یا نذرانے کی رقم حاکم کی رائے پر موقوف تھی، جتنی رقم مقرر کر دیتا ادا کرنی پڑتی تھی۔

مرزا کے نہایت عزیز دوستوں میں سے مولانا فضل حق خیر آبادی پر مقدمہ چلا کالے پانی بھیجے گئے اور وہیں 19 اگست 1861ء کو فوت ہوئے۔ مفتی صدر الدین آزردہ کی ساری جائداد ضبط ہو گئی۔ خاصی تنگ و دو کے بعد انہیں کچھ جائداد ملی جس سے ماہانہ چالیس روپے کرایہ وصول ہوتا تھا۔ اس میں گزارا کرتے رہے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ پر مقدمہ بنا، سات برس قید کی سزا پائی اور جائداد ضبط ہوگئی اپیل میں وہ بری ہوئے، مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خاں اور چلے گئے تھے۔ واں سے پکڑے آئے، گوڑگاؤں میں انہیں گولی سے شہید کر ڈالا گیا۔ ان کے چھوٹے بھائی ذوالفقار الدین حیدر خاں گرفتار ہوئے، ان پر مقدمہ چلا، جائداد ضبط ہوگئی محل سرا اور کوٹھی پر گوروں نے قبضہ کر لیا، دکانیں ڈھا دی گئیں اور ان کا ملبہ فروخت کر کے روپیہ داخل خزانہ سرکار ہوا۔ حامد علی خاں بیچارے نے دار و گیر سے رہائی پائی تو کرائے کے مکان میں رہنے لگے۔ تباہی کی عام حالت مرزا کی زبان سے سنئے فرماتے ہیں:

"امراء اسلام میں سے اموات گنو حسن علی خاں بڑے باپ کا بیٹا سو روپے روز کا پنشن دار' سو روپے مہینے کا روزینہ دار بن کر نامراد نہ مرگیا۔ میر ناصر الدین باپ کی طرف سے پیرزادہ اور نانا کی طرف سے امیرزادہ مظلوم مارا گیا' آغا سلطان' بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے۔ بیمار پڑا' نہ دوا نہ غذا' انجام کار مرگیا۔ تمہارے چچا نواب ضیاء الدین احمد خاں کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی۔ احباد کو پوچھو' ناظر حسین مرزا جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آگیا ہے۔ اس کے پاس ایک پیسہ نہیں' ٹکے کی آمد نہیں' مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے مگر دیکھیے چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے' بڑھے صاحب ساری املاک بیچ نوش جاں کر کے بیک بنی و دوگوش بھرت پور چلے گئے ضیاء الدولہ کے پانسو روپے کے املاک واگزاشت ہو کر پھر قرق ہو گئے۔ تباہ و برباد لاہور گیا ہے وہاں پڑا ہوا ہے دیکھیے کیا ہو' قصہ کو تاہ قلعہ اور جھجھر اور بہادر گڑھ اور بلب گڑھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ روپے کی ریاستیں لٹ گئیں۔ شہر کی امارتیں خاک میں مل گئیں۔"

ایک اور خط میں یوسف مرزا کو لکھتے ہیں:

"میرا خیال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا' آدمی کثرت غم سے سودائی ہو جاتے ہیں' عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس' ہجوم غم میں میری قوت متفکرہ میں فرق آگیا ہے تو کیا عجب ہے بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے' پوچھو کہ کیا غم ہے۔ غم مرگ' غم فراق' غم رزق' غم عزت' میں قلعہ نامبارک سے قطع نظر کر کے اہل شہر کو گنتا ہوں۔ مظفر الدولہ میر ناصر الدین' مرزا عاشور بیگ میرا بھانجا اس کا بیٹا احمد مرزا انیس بیس برس کا بچہ مصطفی خاں' ابن اعظم الدولہ' اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں اور مرتضیٰ خاں' قاضی فیض اللہ کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا اسے لو بھول گیا حکیم رضی الدین خاں' میر احمد حسین میکش اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاؤں' غم فراق حسین مرزا' یوسف میرزا' میر سرفراز حسین' میرن صاحب' خدا ان کو جیتا رکھے۔ کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے خوش ہوتے۔ گھر ان کے بے چراغ' وہ خود آوارہ سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے' ان اموات کے غم اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ ہو تا ہے۔ یہاں اغنیاء و امراء کی اولاد و ازواج بھیگ مانگتے پھریں اور میں دیکھوں۔"

مرزا کی یہ حالت ہو گئی تھی۔ کہ کوئی واقعہ پیش آجاتا تو ان کے دل میں جنگ آزادی کے بعد کا دور مصائب تازہ ہو جاتا۔ ان کے شاگرد مرزا تفتہ نے اپنی کتاب "سُنبستان" چھوڑی ہے۔ اس کی لکھائی چھپائی اچھی نہ تھی۔ مرزا نے اس واقعہ کو بیگمات قلعہ کی مصیبتوں اور بدحالیوں پر آنسو بہانے کا بہانہ بنالیا۔ فرماتے ہیں:

"اجی مرزا تفتہ تم نے اپنا روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈبویا۔

ہائے کیا بری کاپی ہے..... اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ تم یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو چلتے پھرتے دیکھتے صورت ماہ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے' پائینچے لیرلیر جوتی ٹوٹی یہ مبالغہ نہیں۔"

اس وقت کے انگریزوں کی دماغی حالت کا اندازہ صرف اس واقعے سے ہو سکے گا کہ انہوں نے شاہی مسجد کو اپنے قبضہ میں لے لیا تھا۔ اور اس کے دروازوں پر ایک سکھ بٹالین کا پہرہ بٹھا دیا تھا ایک مرتبہ یہ تجویز بھی پیش ہوئی تھی۔ کہ اسے گرجا بنا لیا جائے۔ جنگ آزادی سے تقریباً" پانچ برس بعد مسجد واگزار ہوئی۔

مرزا نے ایک عجیب عبرت افزا واقعہ لکھا ہے:

"جن مسلمانوں کی جائیدادیں ضبط ہوئی تھیں ان میں ایک حافظ محمد بخش بھی تھے۔ جن کا عرف "ممّوں" تھا۔ بعد میں وہ بے قصور ثابت ہوئے اور جائیداد کی بحالی کا حکم مل گیا۔ انہوں نے کچہری میں درخواست دی کہ میری جائیداد پر قبضہ ولایا جائے۔ انگریز حاکم نے نام پوچھا عرض کیا۔ محمد بخش۔ چونکہ درخواست میں عرف بھی درج تھا۔ اس لیے حاکم نے پوچھا "ممّوں" کون ہے۔ عرض کیا کہ نام میرا محمد بخش ہے۔ لوگ مجھے ممّوں ممّوں کہہ کر پکارتے ہیں صاحب نے سن کر فرمایا۔

یہ کچھ بات نہیں۔ حافظ محمد بخش بھی تم اور حافظ ممّوں بھی تم۔ سارا جہاں بھی تم۔ جو دنیا میں ہے وہ بھی تم ہم مکان کس کو دیں۔" مسل داخل دفتر ہوئی' میاں ممّوں اپنے گھر چلے آئے۔"

آخر میں جنگ آزادی کے متعلق مرزا کا ایک قطعہ لکھتا ہوں جو انہوں نے اپنے ایک دوست کو خط ہی میں لکھتا تھا۔ یہ ان کے مکاتیب میں چھپ گیا۔ اور دیوان میں شامل نہ ہو سکا۔

بسکہ فعال مایرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر نمونہ بنا ہے زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک
تشنہ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک
آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا
وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کئے شکوہ
سوزش داغ ہائے پنہاں کا
گاہ روکر کہا کئے باہم
ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے غالب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان لاہور)

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

غالب اور کلکتہ
(خطوط کے آئینے میں)

کلکتہ کا قصد:۔

میں پانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا۔ نو برس کا تھا کہ چچا مرا۔ اس کی جاگیر کے عوض میرے اور میرے شرکائے حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں دس ہزار روپے سال مقرر ہوئے۔ انہوں نے نہ دیئے مگر تین ہزار روپے سال اس میں سے خاص میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپے سال۔ میں نے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاہر کیا۔ کول برک صاحب بہادر ریذیڈنٹ دہلی اور اسٹرلنگ صاحب بہادر سکریٹری گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے میرے حق دلانے پر۔1۔

کلکتہ کا سفر:۔

سر کے درد اور تکلیف کا اثر باندہ ہی سے نہ رہا تھا۔ دو شنبہ کو موڈہ سے روانہ ہوا۔ بیل گاڑی جس کو اس ملک میں لڑیا کہتے ہیں اسباب لے جانے کے لیے لی۔ چونکہ مجھ سے بھی زیادہ کمزور تھی لہٰذا وہ آہستہ خرام بلکہ نخرام بارہ کوس کی راہ طے نہ کر سکی اور موڈہ سے چلہ تارا تک نہ پہنچی۔۔۔۔ سہ شنبہ کو آخر شب روانہ ہوا۔ اور میں دو گھڑی دن چڑھے چلہ تارا کی کاروں سرا پہنچا۔ اسی مقام سے کشتی کرایہ کی لے کر آدمی اور سامان اسی میں بھر کر بسم اللہ مجریہا و مرسہا پڑھ کر جمنا کے دھارے میں ڈال دی۔ ارادہ یہ کہ الٰہ آباد پہنچ کر تھوڑی دیر بنارس ٹھہر سکوں۔2۔ بنارس خوب شہر ہے۔ ایک مثنوی میں نے اس کی تعریف میں لکھی ہے۔ اور چراغ دیو اس کا نام رکھا ہے۔3۔ بنارس کے ناخدا شناس ملاحوں نے کشتی دینے میں تکرار کی۔ کلکتہ تک کا سو روپے سے کم نہیں مانگتے تھے۔ اور پٹنہ تک کے بیس روپے سے زیادہ چاہتے تھے۔ ناچار اسی گھوڑے پر سوار جنگل کا راستہ طے کروں گا۔ چونکہ کشتی کا خیال بھی ہے لہٰذا پٹنہ پہنچ کر تلاش کروں گا۔4۔

کلکتہ پہنچنا:۔

بدھ کے دن چہارم شعبان 5۔ کو کچھ دن نکلا تھا کہ کلکتہ پہنچا۔ خدائے بے ست کی بندہ نوازیوں پر مجھے ناز ہے کہ ایسے شہر میں ایسا مکان ملا جس میں ہر طرح کا آرام ہے۔6۔ میں جس مکان میں اترا ہوں شملہ بازار میں

ہے۔7۔

کلکتہ کی آب و ہوا:۔

خدا کی رحمت ہے کہ کلکتہ کی آب و ہوا میرے موافق ہوئی۔8۔ اس خطے میں ایسے آرام سے ہوں جیسے وطن میں۔

غالب بر پردہ نوائے دارد   ہر گوشہ ازو ہر فضائے دارد
بر چیدبوست ازد ماغم یکسر   بنگالہ شگرف آب و ہوائے دارد9۔

کلکتہ میں ایک ادبی ہنگامہ:۔

اس مقام کے سخنوروں اور نکتہ رسوں نے مجھ خاکسار کی آمد پر ایک بزم سخن آراستہ کی 10۔ ہر انگریزی مہینے میں بروز یک شنبہ بہترین شعرا سرکار کمپنی کے مدرسے میں جمع ہوئے۔ ہندی اور فارسی غزلیں پڑھتے۔ اتفاق سے ایک بزرگ جوہرات سے سفیر ہو کر تشریف لائے تھے' اس انجمن میں آئے اور میرے اشعار سن کر بہ آواز بلند تعریف کی اور اس ملک کے شاعروں کے کلام پر چپکے چپکے مسکراتے رہے۔ چونکہ طبیعتیں خود نمائی پسند کرتی ہیں اس لیے حسد کرتی ہیں۔ بزرگان انجمن و فرزانگان فن نے میری دو بیتوں پر نادرست اعتراض کیے اور ان کو مشہور کیا۔ اس سے پیشتر کہ میں جواب دوں مخدومی و ملاذی نواب علی اکبر خاں و مکری و مطاعی مولوی محمد محسن نے جواب دیئے۔ اور وہ لوگ خاموش ہو بیٹھے۔ چنانچہ ان ہی دو بزرگوں کے کہنے سے میں نے ایک مثنوی کہی اور اپنے اظہار عجز و انکسار کے بعد اس مثنوی میں اعتراض کے جواب دیئے۔ اس مثنوی یعنی باد مخالف کو ایک عالم نے پسند کیا۔11۔

کلکتہ میں ایک قطعہ:۔

وہ جو فعلاتن فعلاتن فعلن یہ بحر ہے اس میں میرا ایک قطعہ ہے کہ میں نے کلکتہ میں کہا تھا۔ تقریب یہ تھی کہ مولوی کرم حسین صاحب ایک میرے دوست تھے۔ انہوں نے ایک مجلس میں ایک چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اور بے ریشہ اپنے کف دست پر رکھ کر مجھ سے کہا کہ اس کی کچھ تشبیہات نظم کیجئے۔ میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ کہہ کر ان کو دیا اور صلے میں وہ ڈلی ان سے لی۔ اب سوچ رہا ہوں کہ جو شعر یاد آتے جاتے ہیں ان کو لکھتا جاتا ہوں۔ قطعہ۔

ہے جو صاحب کے کف دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہئے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے
ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہئے

اختر سوختۂ قیس سے نسبت دیجئے
خال مشکیں رخ دل کش لیلیٰ کہئے
حجرای سود دیوار حرم کیجئے فرض
نافہ آ ہوئے بیابان ختن کا کہئے
صومعہ میں اسے ٹھہرائیے گر مہر نماز
میکدے میں اسے خشت خم صہبا کہئے
مسی آلودہ سر انگشت حسیناں کہئے 12۔
سر پتان پریزاد سے مانا کہئے
غرض بیس بائیس پھبتیاں ہیں۔ اشعار سب کب یاد رہتے ہیں۔ اخیر کی بیت یہ ہے۔۔
اپنے حضرت کے کف دست کو دل کیجئے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہئے 13۔

کلکتہ کا ارمغان:۔

حضرت! وہ شعر بنگالی زبان کا 1829ء میں ضیافت طبع احباب کے واسطے کلکتہ سے ارمغان لایا ہوں۔ صحیح یوں ہے۔

تم کہتے تھے رات میں آئیں گے سو آئے نہیں
قبلہ بندہ رات بھر اس غم سے کچھ کھائے نہیں 14۔

(کلکتہ سے متعلق غالب کا یہ قطعہ بے حد مشہور ہے۔

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
ایک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ ناز نیں بتان خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت ربا وہ ان کا اشارہ کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ
وہ بادہ ہائے ناب و گوارا کہ ہائے ہائے

حواشی

1- منتخبات عود ہندی مرتبہ احسن مارہروی ص 32 احسن مارہروی لکھتے ہیں کہ نصر اللہ بیگ خاں (چچا) کی وفات کے بعد ان کے متعلقوں اور وارثوں کے لیے جن میں مرزا اور ان کے بھائی بھی شریک تھے جو پنشن گورنمنٹ نے ریاست فیروز پور جھرکا پر محول کر دی تھی جب تک مرزا صغیر سن رہے جو کچھ وہاں سے ملتا رہا پاتے رہے- جب سن تمیز کو پہنچے اور شادی ہو گئی عالم شباب اور خانہ داری کی ضرورتیں بڑھ گئیں اور گھر میں جو کچھ اثاثہ تھا وہ بھی خرچ ہو گیا- ناچار فکر معاش دامن گیر ہوئی- اول مرزا کو غلط یا صحیح یہ خیال پیدا ہوا' فیروز پور سے جس قدر پنشن ہمارے خاندان کے لیے گورنمنٹ نے مقرر کرائی تھی اس قدر ہم کو نہیں ملتی- ضرورتوں نے سخت تنگ کر رکھا تھا- قرض خواہوں کے تقاضے سے ناک میں دم آ گیا تھا- ادھر چھوٹے بھائی کو جنون ہو گیا- مرزا جیسے آزاد منش آدمی کے لیے یہ وقت نہایت سخت تھا- اس کشمکش میں ان کو اس کے سوا اور کچھ نہ سوجھا کہ کلکتہ پہنچ کر سپریم کورٹ میں پنشن کی بابت استغاثہ پیش کریں- (عود ہندی مقدمہ ص 14 - 15)

2- پنج آہنگ ص 164

3- اردوی معلی ص 3

4- پنج آہنگ ص 164

5- 19 فروری 1828ء (4 شعبان 1242ھ) کو کلکتہ پہنچے (کلیات نثر ص 166)

6- پنج آہنگ ص 164

7- یہ مکان شملہ بازار میں کارنواس اسکوائر کے تالاب کے سامنے مانک تولہ اسٹریٹ سے شروع ہو کر شمال کی طرف بیڈن اسٹریٹ کی طرف چلا جاتا تھا- اسی کا نام شملہ بازار تھا- یہ بازار اس صدی کے شروع تک موجود تھا- اب اس کے کچھ حصے میں عمارتیں بن چکی ہیں- اور باقی میں بیتھیون رو ہے- میرزا علی سوداگر کا مکان غالباً اس جگہ تھا جہاں اس وقت بیتھیون رو کا مکان نمبر 133 ہے- اس کے صحن کا کنواں 1935ء میں پاٹا گیا تھا- قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ گرو کا تالاب اس جگہ تھا جہاں اب کارنواس اسکوائر کا تالاب ہے- گروے تالاب کے نزدیک میرزا علی سوداگر کی حویلی میں تھا (کلیات نثر ص 159) مکان کھلا اور پر فضا تھا اور اس میں ضرورت کے تمام سامان موجود تھے- گوشہ صحن میں ایک میٹھے پانی کا کنواں تھا اور ان تمام خوبیوں اور سہولتوں کے باوجود کرایہ صرف دس روپیہ ماہانہ تھا (کلیات نثر ص 99) بحوالہ ذکر غالب- از مالک رام ص 43-

8- کلکتہ کی فضا اور ماحول انہیں پسند آ گیا تھا- وہ کہتے ہیں کہ اگر میں عنفوان شباب میں وہاں گیا ہوتا اور شادی و خانہ داری کی ذمہ داریاں میری راہ میں حائل نہ ہوتیں تو مدۃ العمر کے لیے کلکتہ ہی میں رہ جاتا- (کلیات نثر ص 146) بحوالہ ذکر غالب ص 45- یہ خط مولوی سراج الدین احمد کے نام فارسی میں ہے-

9- پنج آہنگ ص 16-

10- ان دنوں کلکتہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مدرسہ عالیہ کے زیر اہتمام ہر انگریزی مہینے کے پہلے اتوار کو ایک بزم سخن منعقد ہوا کرتی

تھی- جب میرزا وہاں پہنچے تو ان کے اعزاز میں ایک خاص مشاعرہ ہوا- (کلیات نثر ص 170)

11۔ پنج آہنگ ص 160 کلیات نثر ص 170- ماثر غالب ص 23- یہ مشاعرہ مدرسہ عالیہ کی موجودہ ولزلی اسٹریٹ والی عمارت میں ہوا تھا- اس سے پہلے مدرسہ بیٹھک خانے میں تھا- ولزلی اسٹریٹ والی عمارت کا سنگ بنیاد 15 جولائی 1824ء کو رکھا گیا اور پوری عمارت تین سال کی مدت میں تیار ہوئی- اور غالب کے کلکتہ پہنچنے سے صرف چند ماہ پہلے اگست 1827ء میں جماعتیں اس نئی جگہ میں منتقل ہوئیں- مشاعرہ میں نشست کا انتظام یوں تھا کہ شعرائے کرام اندر کے معزلی برآمدے میں تشریف فرما تھے- حاضرین کی بڑی تعداد باہر کھلے صحن میں فرش پر بیٹھی تھی- یہ خیال غالب 5 ہزار کا مجمع تھا- (عود ہندی ص 14)- اس میں غالب نے کلام تبریزی کی زمین میں اپنی وہ غزل پڑھی تھی جس کا یہ مقطع بہت مشہور ہے۔

گردہم شرح ستم ہائے عزیزاں غالب
رسم امید ہما نار جہاں برخیزد

اسی غزل کا ایک شعر ہے۔

جزوے از عالم واز ہمہ عالم بیشم
ہچو موئے کہ بتاں راز میاں برخیزد

(ذکر غالب ص 46)

12۔ احسن مارہروی نے "لکھیے" نقل کیا ہے (عود ہندی یا مہر غالب ص 138)

13۔ اردوئے معلی ص 222

14۔ منتخبات عود ہندی ص 157-

سہیل برکاتی

خطوط غالب میں اشعار غالب

مراسلت میں اشعار کے استعمال کا ہمارے یہاں عام رواج ہے۔ اسے مکتوب نگار کے حسن ذوق اور ادبیت کی دلیل سمجھا جاتا ہے، مکتوب الیہ بھی زیادہ متاثر ہوتا ہے کیونکہ اولاً" تو وزن میں خود کشش اور جاذبیت ہے، ثانیاً" شعر خصوصاً غزل کا شعر، مفہوم کو حسین پیرائے اور کم سے کم الفاظ میں ادا کرتا ہے جس سے عبارت کا زور، اثر اور حسن بڑھ جاتا ہے۔ پھر شعر بھی اگر اعلیٰ درجہ کا ہو تو حسن عبارت میں چار چاند لگ جاتے ہیں اسی لیے بالعموم معروف و مقبول شعراء کے مشہور و مقبول اشعار استعمال کیے جاتے ہیں۔

اردو شعراء میں غالب کو خواص میں جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی تفصیل کی محتاج نہیں ہے۔ فلموں، کتابوں اور رسائل و جرائد کے نام، مضامین و مقالات اور فسانوں ڈراموں کے عنوانات، اس کے اشعار اور مصرعوں کے ٹکڑوں یا ترکیبوں سے اخذ کیے گئے ہیں۔ رسائل و جرائد کی لوح پیشانی کے لیے اس کے اشعار منتخب کیے گئے۔ مکاتیب میں اس کے اشعار استعمال کیے گئے۔

ضرورت ہے کہ گزشتہ صدی کے ان کتابوں رسالوں اور مضامین، فسانوں اور ڈراموں کا جائزہ لیا جائے جن کے نام اور عنوان غالب کے مصرعوں یا ترکیبوں سے ماخوذ ہیں۔ ان رسائل و اخبارات کی فہرست مرتب کی جائے جن کی لوح پیشانی پر غالب کا کوئی شعر درج ہوتا تھا اور اس صدی کے مطبوعہ مجموعہ ہائے مکاتیب کو دیکھا جائے کہ ان میں غالب کے کتنے اور کون کون سے اشعار استعمال ہوئے ہیں؟ اور دوسرے اردو شعراء کے شعروں کے مقابلے میں غالب کے ان شعروں کا تناسب کیا ہے؟

فی الحال ہم اس مہم کا آغاز خود غالب کے مکاتیب سے کر رہے ہیں۔ زیر نظر مضمون میں ہم نے غالب کے وہ اشعار جمع کیے ہیں جو خود غالب نے اپنے خطوں میں استعمال کیے ہیں۔ یوں تو غالب کے مکاتیب میں اس کے بہت سے اشعار ملتے ہیں۔ مثلاً غالب نے مکتوب الیہ کو اپنا کوئی شعر قطعہ، قصیدہ یا غزل بھیجی ہے مگر اس کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ ہم نے صرف ان اشعار کو منتخب کیا ہے جن کو غالب نے بحیثیت شاعر تحفتہ" ارسال نہیں کیا بلکہ بحیثیت مکتوب نگار ادائے مطلب یا حسن بیان میں اضافہ اور از دیاد اثر کے لیے اس طرح استعمال کیا ہے کہ وہ چسپاں ہو گئے اور جز و عبارت بن گئے۔ بالکل اسی طرح جس طرح دوسرے لکھنے والے اس کے اشعار کا استعمال کرتے ہیں۔

ان شعروں کا دیوان سے مقابلہ کرنے پر یہ بھی اندازہ ہوا کہ (ا) بعض بعض موقعوں پر اس نے اپنے

شعروں میں ضرورتاً ترمیم و تغیر کر دیا ہے۔ ایسے مقامات پر ہم نے نشاندہی کر دی ہے (۲) ایسے مصرعے اور شعر بھی ملے جو ان کے کسی دیوان میں نہیں پائے جاتے۔ خط لکھتے ہوئے برجستہ موزوں ہو گئے' ان میں سے بعض میں شعریت اور دل کشی ہے اور بعض ہنگامی نوعیت کے یا مزاح کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ ہم نے ان کی بھی صراحت کر دی ہے۔ ہمارے پیش نظر مولانا غلام رسول مہر کا مجموعہ "خطوط غالب" ہے (۱۹۵۱ء لاہور)

۱

(بدھ ۲ فروری ۱۸۵۹ء)

بنام میر مہدی مجروح

"آج تمہارا خط آیا۔ دوپہر کو جواب لکھتا ہوں۔"

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

"میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت ہے۔" (صفحہ ۲۷۳)

مندرجہ بالا شعر غالب کے دیوان میں موجود نہیں۔

(۲)

(۲۸ نومبر ۱۸۶۳ء)

بنام صفیر بلگرامی

آج میں نے لیٹے لیٹے حساب کیا کہ یہ سترواں برس مجھے جاتا ہے۔

سنین عمر کے ستر ہوئے شمار برس
بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس

(صفحہ ۵۹۸)

یہ شعر غالب کے دیوان میں نہیں ہے۔

(۳)

(۱۸۶۳ء)

بنام علاء الدین احمد علائی

ولی عہدی میں شاہی ہو مبارک

عنایات الٰہی ہو مبارک

غالب نے اس شعر سے علائی کے نام خط کی ابتداء کی ہے۔ دیوان غالب میں یہ شعر نہیں ہے۔

(۴)

(۱۹ جولائی ۱۸۶۰ء)

بنام انوار الدولہ شفق

پیر و مرشد معاف کیجئے گا
میں نے جینا کا کچھ نہ حال لکھا

یہاں کبھی کسی نے اس دریا کی کوئی حکایت ایسی نہیں کی کہ جس سے استبعاد اور استعجاب پایا جائے۔ پرسش کے بعد بھی کوئی بات نہیں سنی۔" (صفحہ ۳۶۰)

(۵)

بنام مرزا حاتم علی بیگ مہر

"بھائی جان' کل جو جمعہ روز مبارک و سعید تھا' گویا میرے حق میں روز عید تھا۔ چار گھڑی دن رہے نامہ فرحت فرجام اور چار گھڑی کے بعد وقت شام۔

سات جلدوں کا پارسل پہنچا
واہ کیا خوب برمحل پہنچا

(صفحہ ۲۲۲)

(۶)

(جون ۱۸۶۱ء)

بنام چودہری عبدالغفور سرور

حضرت چودہری صاحب عنایت نامہ سابق۔

تھا تو خط پر نہ تھا جواب طلب
کوئی اس کا جواب کیا لکھتا

آج دوپہر کو یہ' خط پہنچا' آج ہی آخر روز جواب لکھ کر چھوڑتا ہوں" (صفحہ ۴۹۳)

(۷)

(۱۳ دسمبر ۱۸۵۹ء)

بنام میر مہدی مجروح

"مجھے تو دربار و خلعت کے لالے پڑے ہیں تم کو پنشن کی فکر ہے۔ یہاں کے حاکم نے میرا نام فرد میں نہیں لکھا۔ میں نے اس کا اپیل نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کے یہاں کیا ہے۔

- دیکھئے کیا جواب آتا ہے (صفحہ ۳۶۸)

(۸)

(۱۸۶۰ء)

بنام شاہ عالم

"مشفق و مکرمی چودہری عبدالغفور صاحب کو میرا سلام شوق کہئے گا اور یہ پیام پہنچایئے گا کہ حضرت صاحب عالم کی تمنائے دیدار بقید مارہرہ کنایہ اس سے ہے کہ اور کسی کا بھی دیدار مطلوب ہے۔

"خواہش وصل مقدر ہے جو مذکور نہیں" (صفحہ ۵۰۹)

دیوان غالب میں یہ مصرع اس طرح ہے۔

مژدہ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

(۹)

(۱۷ جولائی ۱۸۶۵ء)

بنام میر مہدی مجروح

"قرۃ العین میر مہدی و میر سرفراز حسین مجھ سے ناخوش و گلہ مند ہوں گے اور کہتے ہوں گے کہ دیکھو ہمیں خط نہیں لکھتا۔

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں
کاش پوچھو کہ ماجرا کیا ہے

"ماجرا یہ ہے کہ تمہارا بھی کوئی خط نہیں آیا۔ میں جس کا جواب لکھتا۔" (صفحہ

(۳۱۱
دیوان غالب میں یہ شعر اس طرح ہے۔
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

(۱۰)

(۲۷ نومبر ۱۸۶۲ء)

بنام منشی ہرگوپال تفتہ

"بھائی مجھ میں اب کچھ باقی نہیں ہے۔ برسات کی مصیبت گزر گئی لیکن بڑھاپے کی شدت بڑھ گئی۔ تمام دن پڑا رہتا ہوں۔ بیٹھ نہیں سکتا۔ اکثر لیٹے لیٹے لکھتا ہوں .... تین باتیں جمع ہوئیں۔ میری کاہلی تمہارے کلام کا محتاج بہ اصلاح نہ ہونا، کسی قصیدے سے کسی طرح کے نفع کا تصور نہ ہونا۔ نظران مراتب پر، کاغذ پڑے رہے۔ لالہ بال کند بے صبر کا ایک پارسل آیا ہے کہ جس کو بہت دن ہوئے۔ آج تک سرنامہ بھی نہیں کھولا۔ نواب صاحب کی دس پندرہ غزلیں پڑی ہوئی ہیں۔

ضعف نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

(صفحہ ۱۹۱)

دیوان غالب میں مصرعہ اولی اس طرح ہے ع "عشق نے غالب نکما کر دیا"

(۱۱)

بنام منشی ہرگوپال تفتہ

"...سو گاہ گاہ جب دل الٹنے لگتا ہے تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آ جاتا ہے۔

زندگی اپنی اسی ڈھب سے جو گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

دیوان غالب میں مصرعہ اولی اس طرح ہے

ع زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب

اسی خط میں آگے لکھتے ہیں :

"پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرعہ پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں۔

اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

(۱۲)

(۵ ستمبر ۱۸۶۶ء)

بنام میاں داد خاں سیاح

"بھائی سیف الحق، تمہارا خط پہنچا' قاضی صاحب بڑودہ کو معاف رکھو اگر کوئی وجہ اپنے پر ان کے عتاب کی پاتا تو ان سے عذر کرتا اور اپنا گناہ معاف کرواتا۔ جب سبب ملال کا ظاہر نہیں تو میں کیا کروں۔ تم برا نہ مانو کس واسطے کہ اگر میں برا ہوں تو اس نے سچ کہا اور اگر میں اچھا ہوں اور اس نے برا کہا تو اس کو خدا کے حوالے کرو۔

غالب برا نہ مان جو دشمن برا کہیں
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

(صفحہ ۴۳۵)

دیوان غالب میں مصرع اولیٰ اس طرح ہے۔ "غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے"

(۱۳)

بنام مرزا رحیم بیگ مصنف ساطع برہان

"آگے جو ہمت نہیں ہاری تھی اور غیب سے توقع مددگار تھی تو یہ اپنا شعر اردو میرے ورد زبان اور اس ہنجار سے میں زمزمہ سنج فغاں رہتا تھا۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

"اب جو اصلاح حال و حصول مطالب سے دل مایوس ہے تو طبیعت اسی غزل کی اس بیت کے ترنم سے مانوس ہے۔

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

(صفحہ ۶۱۹)

(۱۴)

(۱۸۶۴ء)

بنام چودہری عبدالغفور

"اب دو باتیں سوچتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ جب تک جیتا ہوں یوں بھی رویا کروں گا' دوسری یہ کہ آخر ایک نہ ایک دن مروں گا۔ یہ صغریٰ و کبریٰ دلنشیں ہے' نتیجہ اس کا تسکین ہے۔ ہیہات۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے

(صفحہ ۳۹۶)

(۱۵)

(۱۸۶۰ء)

بنام نواب انورالدولہ شفق

"سرے سے سنئے آپ کا قصیدہ بعد اصلاح پہنچا' اس کی رسید آئی' کئی کٹے ہوئے شعر الٹے آئے ان کی قباحت پوچھی گئی۔ قباحت بتائی گئی۔ الفاظ قبیح کی جگہ بے عیب الفاظ لکھ دیئے گئے۔ لو صاحب' یہ اشعار بھی قصیدے میں لکھ لو' اس نگارش کا جواب آج تک نہیں۔ شاہ اسرار الحق کے نام کا کاغذ ان کو دیا گیا۔ جواب میں جو کچھ انہوں نے زبانی فرمایا وہ آپ کو لکھا گیا۔ حضرت کی طرف سے اس تحریر کا جواب بھی نہ ملا۔

پر ہوں میں شکوہ سے یوں' راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

(صفحہ ۳۵۶)

(۱۶)

(جولائی ۱۸۶۱ء)

بنام میر مہدی مجروح

"وبا کو کیا پوچھتے ہو' قدر انداز قضا کے ترکش میں یہی ایک تیر باقی تھا۔ قتل ایسا عام' لوٹ ایسی سخت' کال ایسا پڑا وبا کیوں نہ ہو۔ لسان الغیب نے دس برس پہلے فرمایا۔

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگ ناگہانی اور ہے

(صفحہ ۲۹۸)

(۱۷)

(۲ دسمبر سال حال ۱۸۵۹ء)

بنام میر مہدی مجروح

"اہل اسلام میں سے صرف تین آدمی باقی ہیں۔ میرٹھ میں مصطفیٰ خاں' سلطان جی میں مولوی صدرالدین خاں' بلی ماران میں سگِ دنیا موسوم بہ اسد تینوں مردود و مطرود و مرحوم و مغموم۔

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادہ گلفام گر برسا کرے

(صفحہ ۳۸۵)

یہ شعر دیوان میں نہیں ہے۔

(۱۸)

بنام مرزا حاتم علی بیگ مہر

"پس اگر کسی بے درد پہ دل آیا ہے تو شکایت کی کیا گنجائش ہے بلکہ یہ غم تو نصیب دوستاں درخور افزائش ہے۔ بقول غالب علیہ الرحمہ۔

کسی کو دیکے دل کوئی نواسنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

(صفحہ ۲۲۲)

(۱۹)

بنام مرزا حاتم علی بیگ مہر

"اگر اگر خوانخواستہ باشد غم دنیا ہے تو بھائی ہمارے ہمدرو ہو۔ ہم اس بوجھ کو مردانہ وار اٹھا رہے ہیں۔ تم بھی اٹھاؤ اگر مرد ہو۔ بقول غالب مرحوم۔

دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریہ سحری ہے نہ آہ نیم شبی ہے

(صفحہ ۲۲۳)

(۲۰)

بنام مرزا حاتم علی بیگ مہر

"جناب مرزا صاحب دلی کا حال تو یہ ہے۔

گھر میں تھا کیا جو ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

یہاں دھرا کیا ہے جو کوئی لوٹے گا۔" (صفحہ ۲۲۷)

(۲۱)

(۱۸۶۳ء

بنام مولوی عبدالرزاق شاکر

"بندہ نواز' زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری و ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی و جگر کاہی کو قوت مجھ میں نہ رہی۔ حرارت غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے۔

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

(صفحہ ۵۲۹)

(۲۲)

(۲۱ جولائی ۱۸۶۰ء)

بنام مرزا تفتہ

"تمہارے دیکھنے کو دل بہت چاہتا ہے اور دیکھنا تمہارا موقوف اس پر ہے کہ تم یہاں آؤ۔ کاش اپنے والد ماجد کے ساتھ چلے آتے اور مجھ کو دیکھ جاتے۔ اردو کا دیوان رامپور سے لایا ہوں اور وہ آگرہ گیا ہے۔ وہاں منطبع ہو گا۔ ایک نسخہ تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

(صفحہ ۵۶)

(۲۳)

(۱۹ جون ۱۸۶۲ء)

بنام مرزا علاؤالدین خاں علائی

"حق سبحانہ تعالیٰ ان دونوں صاحبوں کو یا ایک کو ان میں سے توفیق دے یا مجھ کو طاقت یا تم کو انصاف کہ میرے نہ آنے کو ولی کی دل بستگی پر محمول نہ کرو۔ مجھ کو رشک ہے۔ جزیرہ نشینوں کے حال پر اور رئیس فرخ آباد پر خصوصاً کہ جہاز سے اتار کر سرزمین عرب میں چھوڑ دیا۔ ہاہاہا۔

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

(صفحہ ۷۳)

(۲۴)

(جنوری ۱۸۶۶ء)

بنام مرزا تفتہ

ترک لباس سے قید ہستی مٹ نہ جائے گی۔ بغیر کھائے پیئے گزارا نہ ہو گا۔ محنت و سستی، رنج و آرام کو ہموار کر دو، جس طرح ہو، اسی صورت سے ہر

صورت گزرنے دو۔

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

(صفحہ ۲۰۶)

(۲۵)

بنام میر مہدی مجروح

"کیسا پنشن اور کہاں اس کا ملنا' یہاں جان کے لالے پڑے ہیں۔

ہے موجزن اک قلزم خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

اگر زندگی ہے اور پھر مل بیٹھیں گے تو کہانی کہی جائے گی۔" (صفحہ ۲۶۶)

(۲۶)

بنام شیخ لطیف احمد بلگرامی

"فخر ایجاد و تکوین مولانا فضل حق ایسا دوست مرجائے' غالب نیم مردہ نیم جان رہ جائے۔

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
نیند آتی ہے پر نہیں آتی

اگر جوان ہوتا اور بیمار تو آپ سے دعائے خیریت چاہتا۔ اسی برس کا بڈھا ہونے آیا ہوں۔ دعائے مغفرت کا امیدوار ہوں۔ شراب کم بخت اب بھی چھوٹتی نہیں' نماز کا اب بھی عادی ہوتا نہیں۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی
کعبہ کس منہ کو جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

غالب کے بعد .....

سائنس، طبّ اور تحقیق کے دشتِ امکاں میں ہائی نون کی
طرف سے دوسرے قدم کی تلاش۔

انسانیت کی صحت، سلامتی اور بہتر زندگی کی علامت!

HIGHNOON LABORATORIES LTD.

for a Healthier Nation

سورج پبلشنگ بیورو

غالب نمبر جلد دوم کی اشاعت کے لیے

درج ذیل اداروں کے تعاون کا ممنون ہے

لیوب گیس (پرائیوٹ) لمیٹڈ لاہور

*

حسیب وقاص شوگر ملز لاہور

*

پاک الیکٹران لمیٹڈ لاہور

*

تھائی ائرویز لاہور

(۲۷)

(۱۶ ستمبر ۱۸۶۲ء)

بنام میر مہدی مجروح

قبائل تمہارے یہیں ہیں۔ اگر وہاں کچھ حاصل ہو رسائی تو خیر ورنہ یہاں کیوں نہ چلے آؤ۔

میں بھولا نہیں تجھ کو اے میری جان
کروں کیا کہ یاں گر رہے ہیں مکان

برسات کا حال نہ پوچھو۔ خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں، عالم بیگ خاں سے کڑہ کی طرف دروازہ گر گیا۔" (صفحہ ۳۰۴)

(۲۸)

(۱۷ جولائی ۱۸۶۵ء)

بنام میر مہدی مجروح

"کیا کہوں کہ کیا حال ہے؟ پیش ازیں اپنا یہ شعر پڑھا کرتا تھا۔

بس ہجوم ناامیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعی بے حاصل میں ہے

(صفحہ ۳۱۲)

(۲۹)

بنام بنام مرزا حاتم علی بیگ مہر

"سبحان اللہ تم نے قصیدے میں وہ رنگ دکھایا ہے کہ انشاء کو رشک آیا۔ مثنوی کے اشعار میں جو میں نے دیکھے، کیا کہوں، کیا حظ اٹھایا۔

خدا سے میں بھی چاہوں از رہ مہر
فروغ میرزا حاتم علی مہر

(صفحہ ۲۲۸)

(۳۰)

تم سلامت رہو قیامت تک
یہ مصرعہ مرزا غالب نے خواجہ غلام غوث بیخبر کے نام دو خطوں کے اختتام پر بطور دعا لکھا ہے۔

غالب کے وہ اشعار جن سے انھوں نے اپنے بعض خطوط کی ابتدا کی ہے :

(۱)

بنام تفتہ
رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے
(صفحہ ۱۳۲ عود ہندی)

(۲)

بنام مرزا حاتم علی بیگ مہر
بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے
غلام ساقی کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے
سخن میں خامہ غالب کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا
ہے
(صفحہ ۲۱۰)

(۳)

بنام منشی غلام غوث خاں بیخبر
میں سادہ دل آزردگی یار سے خوش ہوں
یعنی سبق شوق مکرر نہ ہوا تھا
پیر و مرشد خفا نہیں ہوا کرتے۔ یوں سنا مجھے باور نہ آیا۔ یہاں تک تو میں
مورد عتاب نہیں ہو سکتا۔ (صفحہ ۳۳۱)

(۴)

(۱۶ جون ۱۸۶۷ء)

بنام شہزادہ بشیر الدین

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار٭

(۵)

بنام علاؤالدین احمد خاں علائی

ولیعہدی میں شاہی ہو مبارک
عنایات الٰہی ہو مبارک

(صفحہ ۸۴)

حواشی

۱ - "سنیس عمر کے برس" کی ترکیب ایسی ہی ہے جیسے شب برات کی رات۔
۲ - غالب ہمیشہ پنشن کو پنسن لکھتے تھے۔
۳ - "اپیل" آج کل مونث مستعمل ہے۔
۴ - غالب نے یہی شعر ایک خط بنام صاحب عالم مارہروی ۱۸۵۹ء میں نقل کیا ہے' ص ۴۰۶
۵ - غالب نے یہی ایک خط بنام یوسف مرزا میں بھی نقل کیا ہے۔
۶ - نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں رؤسائے رامپور کے نام غالب نے جو خط لکھے ہیں' ان کے آخر میں بھی اکثر یہ شعر لکھا ہے (مکاتیب غالب' عرشی)۔

محمد سجاد ساجد ؔ ایم اے

مرزا تفتہ ———— خطوط غالب کے آئینے میں

مرزا تفتہ کی شخصیت اردو ادب میں گمنام نہیں۔ اگرچہ بہت ہی کم تذکروں اور تاریخوں میں ان کا نام اور نمونہ کلام ملتا ہے۔ ہاں غالب کے خطوط اگر شائع نہ ہوئے ہوتے تو تفتہ نیز دیگر محسنان اردو کے نام سے ہم نا آشنا ہی رہتے۔ بہرحال غالب کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا نام منشی ہرگوپال تھا اور تفتہ تخلص۔ وہ مرزا غالب کے نہایت ہی خاص شاگردوں میں تھے۔ مرزا غالب ان کو اپنی اولاد سے بڑھ کر عزیز رکھتے تھے اور ان کی ذہانت اور خداداد صلاحیت کی بہت ہی قدر کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو مرزا کے اس قدر قریب کر دیا تھا کہ غالب ان کو "مرزا" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ باوجود اس حقیقت کے کہ وہ "غیر مسلم" تھے۔

یوں بھی مرزا غالب کے تعلقات ہندوؤں سے اچھے خاصے تھے۔ علاوہ مرزا تفتہ کے جواہر سنگھ جوہر اور شیو نرائن شاگرد رشید تھے۔ ہیرا سنگھ معتقد و حاشیہ نشین تھے۔ منشی نول کشور سے اچھے خاصے تعلقات تھے۔ انہوں نے مرزا کا کلیات فارسی چھاپا۔ "قاطع برہان" کے مشہور مقدمے میں دیبی پرشاد نے غالب کے وکالت نامہ پر بطور گواہ دستخط کیے اور عدالت میں چار گواہوں میں سے دو گواہ ماسٹر پیارے لال آشوب اور حکم چند ولد رام دیال ہندو تھے۔

شاید ہی کوئی شاگرد غالب کو اتنا عزیز ہو جتنا کہ تفتہ تھے۔ غالب اپنے دوست کو لکھتے ہیں "واللہ تفتہ کو میں اپنے فرزندوں کی جگہ سمجھتا ہوں اور مجھ کو ناز ہے کہ مجھ کو خدا نے ایسا قابل فرزند عطا کیا ہے۔

مرزا تفتہ کا قیام لوہارو اور آگرہ میں بھی رہا۔ لیکن مسکن سکندر آباد تھا جہاں وہ قانون گو تھے۔ وہ دلی بھی آنا چاہتے تھے لیکن غالب نے روک دیا۔ وہ کھاتے پیتے آدمی تھے۔ آمدنی خاصی تھی۔ کچھ پس ماندہ بھی بنک میں جمع تھا۔ قانون گوئی سے ان کو اتنی دلچسپی نہ تھی جتنی شعر و شاعری سے۔ انکی تحریر جادو مثال ہوا کرتی تھی۔ اس فن میں ان کو بڑا ملکہ تھا۔ غالب کی سحر طرازی پر ساری دنیا سر دھنتی تھی حالانکہ انہوں نے اس فن میں تفتہ کے صاحب کمال ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ وہ اپنے ایک خط مورخہ ۱۸ جون ۱۸۵۴ء میں لکھتے ہیں "کاشانہ دل کے ماہ دو ہفتہ منشی ہرگوپال تفتہ' تحریر میں کیا کیا سحر طرازیاں کرتے ہیں۔ اب ضرور آپڑا ہے کہ ہم بھی جواب اسی انداز سے لکھیں۔"

یہ خط کسی اردو خط ہی کے جواب میں ہوگا جس سے صاف ظاہر ہے کہ فارسی کے علاوہ اردو پر بھی تفتہ کو عبور حاصل تھا۔ تحریر میں نے بذلہ سنجی اور غم زدوں کو ہنسانے والی بات ہوتی تھی۔

غزل میں اتنی مہارت نہ تھی جتنی قصیدہ گوئی میں۔ غالب خود قائل تھے۔ دو شنبہ ۱۹ اگست ۱۸۶۱ء کے خط میں غالب ہدیہ تحسین و خراج اس طرح پیش کرتے ہیں "میاں مرزا تفتہ" ہزار آفرین' کیا اچھا قصیدہ لکھا ہے۔ واہ واہ چشم بددر' تسلسل معنی' سلاست الفاظ' ایک مصرع میں تم کو محمد اسحاق شوکت بخاری سے توارد ہوا ہے۔ یہ بھی محل فخرو شرف ہے جہاں شوکت پہنچا' وہاں تم پہنچے۔" تفتہ نے مثنوی میں بھی طبع آزمائی کی اور مرثیے بھی لکھے۔ وہ بہت زیادہ کہتے تھے۔ ان کی زود نویسی سے کبھی کبھی مرزا اکتا جاتے تھے۔

"صاحب" دیباچہ و تقریظ کا لکھنا ایسا آسان نہیں ہے کہ جیسا تم کو دیوان کا لکھ لینا۔ کیوں روپیہ خراب کرتے ہو اور کیوں چھپواتے ہو؟ اور اگر یونہی جی چاہتا ہے تو ابھی کہے جاؤ۔ آگے چل کر دیکھ لینا۔ اب یہ دیوان چھپوا کر تیسرے دیوان کی فکر میں پڑو گے۔ تم تو دو چار برس میں ایک دیوان اور کہہ لو گے میں کہاں تک دیباچہ لکھا کروں گا۔

غالب کے آخری دور میں تفتہ کی مشق پختہ ہو گئی تھی' رنگ نکھر گیا تھا اور رطب و یابس سے کلام پاک ہو گیا تھا۔ چنانچہ غالب لکھتے ہیں' اور اگر خواہی نخواہی تمہارا عقیدہ یہی ہے کہ اصلاح ضروری ہے تو میری جان میرے بعد کیا کرو گے۔ میں چراغ دم سحر و آفتاب سر کوہ ہوں۔ اناللہ وانا علیہ راجعون۔ ۱۳ رجب' نجات کا طالب غالب"۔

ڈپٹی کلکٹر جناب رٹیگسن صاحب نے ایک تذکرہ شعرائے ہند انگریزی زبان میں لکھنے کا انتظام کیا۔ غالب کے شاگردوں میں مرزا تفتہ کو فارسی اشعار کہنے میں ممتاز درجہ دیا ہے۔ انہوں نے تمام عمر فارسی میں لکھا اور چار دیوان چھوڑے۔ گلستان کی تضمین کی اور ایک مثنوی سنبلستان لکھی۔

مرزا تفتہ اپنے استاد کی خوشنودی کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور نازک مزاج غالب کو مناتا بھی خوب جانتے تھے۔ حق کے لیے عزیز دوستوں سے بھی نکر لے لیتے تھے حالانکہ ایسا کرنے میں ان کو بسا اوقات بلا وجہ زحمت ہوتی باوجودیکہ ہندو تھے مگر تعصب نام کو نہ تھا۔ ان کے دوستوں میں مسلمان زیادہ تھے جن میں منشی نبی بخش حقیر' میر کرم حسین' مرزا حاتم علی مہر اور منشی قمرالدین خان کے نام قابل ذکر ہیں۔

جہاں ہم خطوط غالب کو اس لیے اہمیت دیتے ہیں کہ ان کی وجہ سے اردو ادب میں ایک بہت بڑا خلا پر ہو گیا ہے' وہاں ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ ان کی اشاعت کی تحریک منشی شیو نرائن سے مرزا تفتہ نے بہت زور دے کر کی۔ مرزا غالب نے ۲۱ نومبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں شیو نرائن آرام کی درخواست کو نامنظور کرتے ہوئے لکھا تھا "اردو رقعات بھی جو آپ چھاپا چاہتے ہیں۔ یہ بھی زائد بات ہے کوئی رقعہ ایسا نہ ہوگا' جو میں نے قلم سنبھال کر دل لگا کر لکھا ہوگا۔ ورنہ تحریر سرسری ہے۔ ان کی شہرت میری سخن وری کے شکوہ کے منافی ہے۔ لیکن یہی مرزا غالب تفتہ کی درخواست کو ٹھکرا نہ سکے۔ "رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے۔ لڑکوں کی سی ضد نہ کرو اور اگر تمہاری اسی میں خوشی ہے تو مجھ سے نہ پوچھو' تم کو اختیار ہے" تفتہ کا اردو ادب پر بہت بڑا احسان ہے کیونکہ انہوں نے سب سے زیادہ خطوط اکٹھے کیے۔ اگر ان کے پاس سے خطوط نہ ملتے اور وہ ان کے چھاپے جانے کی سعی نہیں کرتے تو اردو ادب کا کتنا نقصان ہوتا۔

منشی ہرگوپال تفتہ کے باپ کا نام موتی لال تھا۔ تفتہ نے ابتدائی تعلیم گھر پر پائی۔ مدتوں محکمہ بندوبست میں قانون گو رہے۔ کچھ دنوں ریاست جے پور میں ملازمت کی۔ تفتہ ۱۷۹۹ء (۱۲۱۳ھ) میں پیدا ہوئے اور ۱۸۷۹ء (۱۲۹۱ھ) میں انتقال ہوا۔ مولوی ممتاز احمد تھانوی نے تاریخ وفات کہی ہے :

سال نقلش بلبل زار از خرد
من شنیدم "بے سر و پا شعر و سخن" (۱)

---

(۱) "بے سر و پا شعر و سخن" واوین میں ہے "گویا تاریخ ہے۔ اس پورے جملے کے اعداد ۱۵۷۶ بنتے ہیں۔ ان میں سے "بے سر" کے ۲۷۲ نکال دیں تو ۱۲۹۵ رہ جاتے ہیں۔ پھر ان میں ایک کا عدد معلوم نہیں کس لحاظ سے جمع کرکے ۱۲۹۶ تاریخ نکال لی؟ مصرعے کا وزن بھی مطلوبہ بحر سے خارج ہے کیونکہ سخن بروزن فعل ہوتا ہے یعنی خ متحرک ہوتی ہے۔ شاید اس کو ساکن سمجھ کر وزن پورا کر دیا گیا ہے۔ (ادارہ)

پروفیسر ضیاء احمد بدایونی

غالب کی خطوط نگاری

"اردو خطوط نگاری میں جو روش غالب نے اختیار کی ہے' وہ اپنا جواب نہیں رکھتی۔ مانا کہ ان سے پہلے بھی اردو خطوط کے نمونے دستیاب ہوتے ہیں لیکن غالب نے یہ نغمہ اس لے میں چھیڑا کہ اس کے سامنے سب آوازیں دب کر رہ گئیں۔ بعد میں آنے والوں نے بھی ان کی تقلید کرنی چاہی۔ مگر غالب علی کل غالب' حیرت اس پر ہوتی ہے کہ فارسی کے زبردست شاعر اور انشا پرداز ہونے اور اردو شاعری میں مشکل پسندی کے خوگر ہونے کے باوجود انہوں نے اردو خطوط میں وہ طرز برتا جس کو سہل ممتنع کہا جائے تو بے جا نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ سادگی اور شوخی کا ایسا امتزاج اور کہیں نہیں ملتا۔ ان کے خطوط کیا ہیں' انہوں نے زندگی کے صد رنگ جلوؤں کو جیسا دیکھا اور محسوس کیا ہے' اپنی اعلیٰ فن کاری سے ہوبہو ان کی تصویر کھینچ دی ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی

نامہ غالب

نامہ غالب اگرچہ غالب کا ایک طویل خط ہے لیکن اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ خط غالب نے ۱۸۶۵ء میں مرزا رحیم بیگ کے نام لکھا اور دلی کے مطبع محمدی میں اس کے تین سو نسخے اپنے خرچ پر چھپوا کر احباب کو تقسیم کیے۔ یہ "نامہ غالب" کا پہلا اڈیشن تھا۔ اس کے آخر میں مندرجہ ذیل عبارت ملتی ہے۔

"الحمد للہ کہ نجم الدولہ اسد اللہ خاں غالب کا خط موسومہ مرزا رحیم بیگ صاحب کا مطبع محمدی مرزا خاں میں بیچ کمپ دہلی اندرون' کوچہ جلیہ گزر فیض حد چھاؤنی کے زیر اہتمام عبدالرزاق بیگ چھپا۔ ۱۸۶۵ء۔"
(غالب : نامہ غالب پہلا اڈیشن صفحہ ۱۶)

اس اڈیشن میں کل سولہ صفحے تھے۔ اس وقت اس کی اشاعت بھی محدود رہی۔ یہ عام اس وقت ہوا جب ۱۸۶۹ء میں اس کا متن "اودھ اخبار" میں بالاقساط شائع ہوا۔ پہلی قسط ۱۰ اکتوبر ۱۸۶۹ء کے اخبار میں اور دوسری قسط ۱۷ اکتوبر ۱۸۶۹ء کے اخبار میں شائع ہوئی۔ (غلام رسول مہر : خطوط غالب صفحہ ۶۱۳) بعد میں اس کو "عود ہندی" میں شامل کر لیا گیا اور "عود ہندی" ہی میں شامل ہونے کی وجہ سے لوگ اس کو ایک مستقل تصنیف کی حیثیت سے فراموش کر بیٹھے۔ اس مجموعے میں یہ خط دب کر رہ گیا اور اس کی اہمیت سے لوگ بے خبر ہو گئے۔ حالانکہ جہاں تک اس کے موضوع کا تعلق ہے۔ یہ خط اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس سے غالب کی شخصیت کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اور ان کے کچھ خیالات و نظریات کی وضاحت بھی ہوتی ہے۔

دراصل یہ خط "برہان قاطع" اور "قاطع برہان" کے قضیے کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ غالب کی زندگی کے آخری ایام میں اس قضیے نے بڑی اہمیت اختیار کر لی تھی۔ اور اس سلسلے میں کئی کتابیں چھپ کر شائع ہوئی تھیں۔ غالب کا "قاطع برہان" لکھنا گویا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنا تھا۔ یہ کتاب انہوں نے "برہان قاطع" کی رد میں لکھی تھی' اور اس کے مولف محمد حسین دکنی پر اعتراضات کیے تھے۔ اس کا پہلا اڈیشن ۱۸۶۲ء میں مطبع نول کشور سے شائع ہوا تھا۔ اس کے شائع ہونے کے بعد غالب پر مختلف لوگوں نے اعتراضات کیے اور ان کو کتابی صورت میں شائع کیا۔ بقول غالب : قاطع برہان کا لکھنا کیا ہوا گویا باسی کڑھی میں ابال آیا۔ لکھنا کیا تھا سہام ملامت کا ہدف ہوا۔ معتقدان برہان قاطع برچھیاں اور تلواریں پکڑ پکڑ کے اٹھ کھڑے ہوئے

ہیں۔" غرض خاصا ہنگامہ برپا ہوا اور اس کے نتیجے میں کئی کتابیں چھپ کر منظر عام پر آئیں۔ ان میں محرق قاطع برہان' ساطع برہان' موید برہان' قاطع القاطع وغیرہ خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں۔

"محرق قاطع برہان" منشی سعادت علی دہلوی نے لکھی۔ یہ کتاب ۱۸۶۳ء میں مطبع احمدی شاہدرہ میں چھپی۔ "موید برہان" مولوی احمد علی مدرس مدرسہ عالیہ کلکتہ کی تالیف ہے اور یہ کلکتہ کے مظہرالعجائب پریس میں ۱۸۶۶ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔ قاطع القاطع مولوی محمد امین نے لکھی۔ یہ ۱۸۶۹ء میں مطبع مصطفائی میں چھپی تھی۔ اس میں ۲۶۷ صفحات تھے۔ ساطع برہان مرزا رحیم بیگ کی تصنیف تھی جو ۱۸۶۵ء میں مطبع ہاشمی میرٹھ میں چھپ کر شائع ہوئی تھی۔ یہ تمام کتابیں برہان قاطع کی حمایت میں لکھی گئی تھیں۔ اور ان میں غالب کے اعتراضات کے جواب دیئے گئے تھے۔

جب یہ کتابیں شائع ہوئیں تو غالب اور ان کے احباب کی طرف سے بھی ان کا جواب دیا گیا اور اس کے نتیجے میں لطائف غیبی' دافع ہذیان' سوالات عبدالکریم' محرک قاطع برہان' تیغ تیز' شمشیر تیز تر' ہنگامہ دل آشوب' موید برہان اور نامہ غالب وغیرہ منظرعام پر آئیں۔

لطائف غیبی ۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب دہلی کے اکمل المطابع میں ۱۸۶۴ء میں چھپی۔ اس میں منشی سعادت علی کی کتاب محرق قاطع برہان' کے جواب دیئے گئے ہیں۔ یہ کتاب میاں داد خاں سیاح کی تصنیف ہے لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کتاب خود غالب نے لکھی تھی۔ اور میاں داد خاں سیاح کے نام سے اس کو چھپوایا تھا۔ اگر غالب نے یہ کتاب خود نہیں لکھی تو کم از کم ان کے اشارے سے ضرور لکھی گئی ہے اور انہوں نے اس کا مواد بھی مہیا کیا ہے۔ دافع ہذیان مولوی نجف علی کی تصنیف ہے اور ۱۸۶۴ء میں اکمل المطابع سے چھپ کر شائع ہوئی۔ اس میں کل ۲۸ صفحات ہیں۔ سوالات عبدالکریم ایک طالب علم کی تصنیف ہے۔ اس میں سترہ سوالات ہیں جو محرق قاطع برہان کی تردید میں ہیں۔ یہ کتاب ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ تیغ تیز تر مولوی نبی بخش کے مطبع نبوی کلکتہ میں ۱۸۶۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں تیغ تیز کا جواب دیا گیا ہے۔ ضخامت ۱۳۲ صفحات ہے۔ نامہ غالب' خود غالب کی تصنیف ہے' اور جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے' یہ کتاب انہوں نے خود مطبع محمدی میں چھپوائی تھی۔ غالب' میاں داد خاں سیاح کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

"نامہ غالب صاحب مطبع نے اپنی بکری کے واسطے نہیں چھاپی جو میں مول لے کر بھیجوں اور تم سے اس کی رقم مانگ لوں۔ میں نے آپ تین سو جلدیں چھپوائیں۔ دور و نزدیک بانٹ دیں۔ آج یک شنبہ ہے۔ پارسل روانہ نہ ہوگا۔ جتنے یہ نسخے اب میرے پاس باقی ہیں کل تمہیں بھیج دوں گا۔" (غلام رسول مہر : خطوط غالب صفحہ ۳۳۴)

برہان قاطع اور قاطع برہان کے قضیے سے متعلق موافقت اور مخالفت میں جو کتابیں شائع ہوئیں' ان کی تفصیل اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ اس قضیے نے اس وقت کے ادبی ماحول میں اچھا خاصا ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ غالب کو اس ہنگامے سے گہری دلچسپی تھی اور وہ اپنی ضعیفی کے باوجود اس ہنگامے میں پیش پیش تھے۔ ان

کے بعض خطوں سے اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اس قضیے سے کتنی دلچسپی تھی اور وہ ان مطبوعات کو کتنی اہمیت دیتے تھے جو اس کے متعلق شائع ہوئی تھیں۔ لکھتے ہیں :

"صاحب یہ تم نے پانچ روپے کے ٹکٹ کیوں بھیجے؟ میں نہ کتب فروش نہ دلال۔ یہ حرکت مجھے پسند نہ آئی اور تم نے برا کیا حضرت! سولہ جلدیں "لطائف غیبی" کی بھیج کر ان کے پان سات دن کے بعد بیس نامہ غالب کا پارسل ارسال کیا ہے۔ لطائف کی رسید تم نے بھیج دی۔ یقین ہے کہ "نامہ غالب" کا پارسل بھی پہنچ جائے گا۔" (خط بنام میاں داد خاں سیاح : خطوط غالب)۔

"ہاہاہا! محرق قاطع کا تمہارے پاس پہنچنا : کاے کہ خواستم ز خدا شد میسرم
میں اس خرافات کا جواب کیا لکھتا مگر ہاں سخن فہم دوستوں کو غصہ آگیا۔ ایک صاحب نے فارسی عبارت میں اس کے عیوب ظاہر کیے۔ دو طالب علموں نے اردو زبان میں دو رسالے جدا جدا لکھے۔ دانا ہو اور منصف ہو۔ محرق کو دیکھ کر جانو گے کہ مولف اس کا احمق ہے اور جب وہ احمق "دافع ہذیان" و "سوالات عبدالکریم" اور لطائف غیبی" پڑھ کر متنبہ نہ ہوا اور محرق کو دھو نہ ڈالا تو معلوم ہوا کہ بے حیا بھی ہے۔ دافع ہذیان' سوالات' لطائف غیبی تینوں نسخے ایک پارسل میں اس خط کے ساتھ روانہ ہوتے ہیں۔ یقین ہے کہ بہ تقدیم و تاخیر ایک دو روز' نظر انور سے گزریں گے۔ (خط بنام منشی حبیب اللہ خاں : خطوط غالب صفحہ ۴۵۸)۔

"صاحب! میں بعین عنایت الٰہی کثیر الاحباب ہوں۔ ایک دوست نے کلکتہ سے مجھے اطلاع دی ہے کہ مولوی احمد علی مدرس مدرسہ کلکتہ نے ایک رسالہ لکھا ہے۔ نام اس کا موید برہان ہے۔ اس رسالہ میں دفع کیے ہیں تیرے وہ اعتراض جو تو نے دکنی پر کیے ہیں اور تحریر پر کچھ اعتراضات وارد کیے ہیں اور اہل مدرسہ اور شعرائے کلکتہ نے تقریظیں اور تاریخیں بڑی دھوم سے لکھی ہیں۔ بس بھائی! میں نے اتنے علم پر ایک قطعہ لکھ کر چھپوایا اور کئی ورق اس دوست کو' اور دو چار جلدیں' درفش کاویانی' علاوہ اوراق مذکور بھیج دیئے۔ اسی زمانے میں تین چار ورق' خوب یاد ہے کہ "درفش" کی جلد میں رکھ کر تم کو بھیجے ہیں۔ یا تو مجھے غلط یاد ہے یا تم نے "درفش" کو کھول کر دیکھا نہیں۔ وہ اوراق مع درفش' زینت طاق نسیاں ہیں۔ وہ ورق اس لفافے میں مکرر بھیجتا ہوں۔ تم بھی دیکھو اور صاحب زادہ بھی دیکھے۔ اور یہ جانے کہ فی الحال نظم فارسی یہی ہے اور بس!" (خط بنام منشی حبیب اللہ خاں : خطوط غالب صفحہ ۴۶۲ - ۴۶۳)۔

"پیر و مرشد! آداب' غلط نامہ قاطع برہان کو بھیجے ہوئے تین' اور آپ کی خیر و عافیت مولوی حافظ عزیزالدین کی زبانی سنے ہوئے دن دون ہوئے تھے کہ کل آپ کا نوازش نامہ پہنچا۔ قاطع برہان کے پہنچنے سے اطلاع پائی۔ معتقدان "برہان قاطع" برچھیاں اور تلواریں پکڑ پکڑ کے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ ہنوز دو اعتراض مجھ تک پہنچے ہیں۔ ایک تو یہ کہ "قاطع برہان" غلط یعنی ترکیب خلاف قاعدہ ہے۔ کلام قطع کیا جاتا ہے۔ برہان قطع نہیں ہو سکتی ہے۔ لو صاحب! برہان قاطع صحیح اور قاطع برہان غلط مگر برہان قطع کی فاعل ہو سکتی ہے اور

قطع کلام کا فعل آپ نہیں قبول کرتی۔ قاطع برہان میں جو برہان کا لفظ ہے' یہ مخفف برہان قاطع ہے۔ برہان قاطع کے رد کو قطع سمجھ کر قاطع برہان نام رکھا گیا تو کیا گناہ ہوا؟" (خط بنام انور الدولہ شفق : خطوط غالب صفحہ ۳۶۵)۔

ظاہر ہے کہ تصنیے کی نوعیت علمی' ادبی اور لسانی تھی۔ غالب کو ان تینوں پہلوؤں سے گہرا لگاؤ تھا۔ اس لگاؤ نے ان سے "نامہ غالب" لکھوائی۔ ان کی یہ کتاب اگرچہ مختصر ہے لیکن اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس کو پڑھ کر اس ادبی بحث کی ایک تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔

نامہ غالب' جیسا کہ اس سے قبل بھی لکھا جا چکا ہے' مولوی رحیم بیگ کی کتاب "ساطع برہان" کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ مولوی رحیم بیگ کا وطن تو دلی تھا لیکن ان کے والد مرزا پیر بیگ دہلی چھوڑ کر سرد منہ میں آباد ہو گئے تھے۔ مرزا رحیم بیگ کی ولادت سرد منہ میں ہوئی لیکن ان کی تعلیم و تربیت میرٹھ میں ہوئی۔ حکیم بوعلی سے انہوں نے مختلف علوم حاصل کیے۔ شاعری کا شوق تھا۔ مولوی محمد بخش ناداں کے شاگرد ہوئے۔ پہلے شرر تخلص تھا لیکن بعد میں رحیم تخلص اختیار کیا۔

حکیم احسن اللہ خاں کی فرمائش پر انہوں نے قصص الانبیاء کو نظم کا جامہ پہنایا تھا۔ "دعوت حاتم" کے نام سے ایک مثنوی بھی لکھی تھی۔ پیشہ معلمی تھا۔ میرٹھ میں لڑکوں کو پڑھاتے تھے۔ آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔ ساطع برہان لکھ کر "قاطع برہان" کے تصنیے میں انہوں نے بھی شرکت کی۔ (غلام رسول مہر : صفحہ ۳۱۳)۔ غالب نے نامہ غالب میں تو ان کے متعلق سخت لہجہ اختیار کیا نہیں لیکن اپنے ایک خط میں ان کے متعلق سخت الفاظ استعمال کیے ہیں۔ میاں داد خاں سیاح کو ایک خط میاں لکھتے ہیں :

"وہ جو ایک اور کتاب کا تم نے ذکر کیا ہے' وہ ایک لڑکے پڑھانے والے ملائے مکتب دار کا خبط ہے۔ رحیم بیگ اس کا نام' میرٹھ کا رہنے والا' کئی برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ باوجود نابینائی کے احمق بھی ہے۔ اس کی تحریر میں نے دیکھی۔ تم کو بھی بھیجوں گا۔ مگر ایک بڑے مزے کی بات ہے کہ اس میں بیشتروہ باتیں ہیں جن کو لطائف غیبی میں رد کر چکے ہو۔ بہ ہر حال اس کے جواب کی فکر نہ کرنا۔"

غالب کے اس لب و لہجہ سے صاف ظاہر ہے کہ مرزا رحیم بیگ پر ان کو غصہ تھا اور وہ ان سے ناراض تھے۔ اس عبارت سے ایک ایک لفظ سے غصہ ٹپکتا ہے۔

اگرچہ غالب کے خیال کے مطابق مرزا رحیم بیگ کے اعتراضات کے جواب "لطائف غیبی" میں دیئے جا چکے تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے ان کی "ساطع برہان" کے جواب میں نامہ غالب لکھا۔ لیکن اس میں اور لطائف غیبی کے انداز اور لب و لہجہ میں آسمان اور زمین کا فرق ہے۔ لطائف غیبی کے انداز میں سنجیدگی کم ہے بلکہ کہیں کہیں تو اس کی حدیں پھکڑ پن سے جا ملتی ہیں لیکن نامہ غالب کا انداز اور لب و لہجہ شروع سے آخر تک سنجیدہ ہے اور اس میں ایک عالمانہ شان پائی جاتی ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ لطائف غیبی غالب کے ایک شاگرد کے نام سے شائع ہوئی۔ اس لیے ظاہر ہے کہ وہ اس میں غیر سنجیدہ لہجہ اختیار نہیں کر

سکتے تھے۔ بعض لکھنے والوں کا خیال ہے کہ لطائف غیبی غالب نے خود لکھ کر میاں داد خاں سیاح کے نام چھپوائی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں پوری طرح صداقت نہ ہو لیکن اس میں شبہ نہیں کہ انہوں نے اس میں خاصی دلچسپی لی تھی۔ بلکہ چھپنے سے قبل اس کو بغور دیکھا تھا اور چھپنے کے بعد بھی اس کی تصحیح کی تھی۔ میاں داد خاں سیاح کو لکھتے ہیں :

"سعادت و اقبال نشاں، سیف الحق میاں داد خاں سیاح کو فقیر غالب کی دعا پہنچے۔ خط میں آپ نے بہت سے مطالب لکھے مگر تمہیں کتابوں کے دو پارسلوں کی رسید نہیں لکھی۔ یہ ایک پارسل جو بعد دو پارسلوں کے بھیجا گیا ہے، اس میں وہی "لطائف غیبی" ہے جس کو میں نے اپنے مطالعے میں رکھ کر صحیح کیا ہے۔ اس کے بھیجنے سے یہ مدعا ہے کہ تم ان تین رسالوں کو اس کے مطابق صحیح کر لو اور اگر چھوٹے صاحب نے رکھ لیا ہے تو ان سے مستعار لے کر اپنی سب کتابیں صحیح کر لو اور وہ نسخہ ان کی نذر کر دو۔

صاحب! میں نے اپنے صرف زر سے لطائف غیبی کی جلدیں نہیں چھپوائیں۔ مالک مطبع نے اپنی بکری کو چھاپیں۔ بیس میں نے مول لیں، تمہیں تم کو دلوا دیں۔ بیس بھائی ضیاء الدین نے لیں۔ دس مصطفیٰ خاں صاحب نے لیں۔ باقی کا حال مجھے معلوم نہیں۔"

(مہر : خطوط غالب صفحہ ۴۳۹)

بہرحال اگر لطائف غیبی غالب نے نہیں لکھی تو ان کے ایما پر ضرور لکھی گئی اور انہوں نے اس کی تیاری میں خاصا حصہ لیا۔ اس کا انداز و لب و لہجہ مندرجہ ذیل اقتباسات سے صاف ظاہر ہے :

"اہل نظر قاطع و محرق کو جب باہم دیکھیں گے تو قاطع کی عبارتیں موتی کی لڑیاں نظر آئیں گی۔ اور محرق کی نثریں ماش کی بڑیاں نظر آئیں گی۔ ہمارے منشی صاحب از روئے علم و فن منشی نہیں ہیں۔ از روئے پیشہ و حرفت منشی ہیں۔ جیسے منشی بھیروں ناتھ اور منشی گینڈا مل۔"

"اے صاحبان فہم و انصاف! عبارت محرق قاطع برہان کو دیکھنا چاہئے۔ خلط مبحث، اطناب مہمل، سوء ترکیب، تباہی روزمرہ، غلطی فہم۔ اس سے مجھے کچھ کام نہیں۔ بھلا حامیاں مفوج الدین کی نثر اور کیسی ہوگی۔ خالصاً للہ یہ بتاؤ کہ یہ مناظرہ ہے یا پکّڑ۔ صاف معلوم ہوا ہے کہ ایک ہیجڑا تالیاں بجا بجا کر گالیاں دیتا ہے یا ایک سڑی کو کسی نے چھیڑ دیا ہے۔ وہ فحش بک رہا ہے۔"

(لطائف غیبی : علیگڑھ میگزین، غالب نمبر صفحہ ۱۲۳)

"ظاہرا صاحب تپ محرق نے یہ بحث بحران کے دن لکھی ہے کہ بے تکلف و بے مبالغہ سراسر ہذیان ہے۔ منشی جی خود نہ سمجھے ہوں گے کہ میں کیا بک رہا ہوں۔ آیات و احادیث عبارت میں درج کیے ہیں۔ حالانکہ ان کے اندراج کا نہ موقع، نہ محل، نہ فائدہ۔ مع ہذا عبارت بھونڈی، روزمرہ فارسی نصیب اعداء۔ روابط ایسے مفقود جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ ایک فقرے کا مفہوم دوسرے فقرے کے نقیض۔"

(لطائف غیبی : علیگڑھ میگزین، غالب نمبر صفحہ ۱۶۲)

ظاہر ہے کہ اس انداز اور لب و لہجہ میں سنجیدگی نہیں ہے اور اس میں وہ خاص طرز بھی مفقود ہے جو علمی مباحث کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ اسی لیے لطائف غیبی اپنے علمی نکات کے باوجود مجموعی طور پر علمی انداز سے عاری ہے۔

"نامہ غالب" اس کے برخلاف ہر لحاظ سے ایک عالمانہ تصنیف ہے اور اس میں شروع سے آخر تک ایک عالمانہ سنجیدگی کی لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس میں معاندانہ انداز نہیں ہے۔ برخلاف اس کے دوستانہ انداز میں چند نکتوں کی وضاحت ہے۔ چنانچہ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :

"بخدمت مشفق مکرمی مرزا رحیم بیگ صاحب نور اللہ علیہ بالاسرار عینہ بالاانوار س رخنے چند گفتہ ی شود :

نہ در منطق پارسی و دری ہمیں ہندی سادہ و سرسری

جس طرح توحید میں نفی ماسوائے اللہ دستور ہے' مجھ کو تحریر میں حذف زوائد منظور ہے۔ عزم مقابلہ نہیں' قصد مجادلہ نہیں' سرتا سر دوستانہ حکایت ہے' خاتمے میں ایک شکایت ہے۔ شکوہ دردمندانہ منافی شیوہ ادب نہیں۔ مع ہذا درد دل مراد ہے۔ کوئی بات جواب طلب نہیں۔ احسان مند ہوں آپ کا کہ آپ نے منشی سعادت علی کی طرح آدھا نام میرا نہ لکھا۔ ان کے حسن ظن کے مطابق مجھ کو معشوق میرے استاد کا نہ لکھا' اور اگر ایک جگہ یہ الفاظ کہ بقول غالب و باکدام خرس درجوال شدہ ام' بہم کیے یا اور دو چار جگہ کلمہ توہین رقم کیے۔ میں نے اپنے لطف طبع اور حسن عقیدت سے پہلے فقرے کا مفہوم یوں اپنے دلنشین کیا کہ حضرت نے محمد حسین دکنی جامع برہان کو موافق میرے قول کے خرس یقین کیا۔ باد خرس درجوال شدن' عبارت ہے محبت سے۔ خواہی مدافعت کے واسطے ہو خواہی محبت۔ مجھ کو اس کا قرب بہ سبیل آویزش ہے' تم کو اس کا قرب ازروئے آمیزش ہے۔ دوسرے فقرے کے یہ معنی ٹھہرائے بلکہ بے تکلف میرے ضمیر میں آئے کہ خرس کو مدد دینے سے کوفت حاصل ہوئی اور وہ کوفت باعث درد دل ہوئی۔ شدت درد سے آدمی چیختا ہے' چلاتا ہے' ہائے وائے کرتا ہے' غل مچاتا ہے' جیسا کہ سعدی بوستان کی اس حکایت میں فرماتا ہے' جس کا پہلا مصرع یہ ہے :

شبے زیت فکرت ہمی سوختم کہ ناچار فریاد خیزد ز درد

(نامہ غالب' پہلا ایڈیشن صفحہ ۱)

اس عبارت میں تلخی نہیں ہے بلکہ شفقت کے ساتھ شائستگی کے انداز میں اپنی بات کہنے کی کوشش ہے۔ یہاں غالب نے بڑے سلیقے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور بڑے منطقی انداز میں اپنے نظریات کی وضاحت کی ہے۔

اس کے بعد غالب نے اس نکتہ کو واضح کیا ہے کہ دینی معاملات اور ادبی و لسانی مسائل دونوں میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ اور ہونا چاہئے بلکہ یہ اختلاف ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ اس لیے اگر انہوں نے برہان قاطع کی غلطیوں پر قلم اٹھایا تو کون سا گناہ کیا۔ اس خیال کی وضاحت غالب نے کیسے سیدھے سادے لیکن دلکش انداز

میں ہے۔ لکھتے ہیں :

"جناب مرزا صاحب! کیا تم نہیں جانتے؟ بے شبہ جانتے ہو گے کہ اکابر امت کو امور دینی میں کیا منازعتیں باہم واقع ہوئی ہیں کہ نوبت بہ تکفیر یک دگر پہنچی ہے۔ اگر فن لغت میں ایک شخص دوسرے شخص کا معتقد نہ ہوا یہاں تک کہ اس کی تحقیق بھی کی تو اور مدعیان علم و عقل اس مسکین کے جگر تشنہ خوں کیوں ہو جائیں اور جب تک اس کا نقش ہستی صفحہ دہر سے نہ مٹائیں' آرام نہ پائیں۔ ظلم تو یہ ہے کہ جو کچھ میں نے قاطع برہان میں لکھا ہے نہ اس کو سمجھتے ہیں اور جو کچھ آپ لکھتے ہیں نہ اس کے معنی سمجھتے ہیں۔ سوال دیگر جواب دیگر پردار ہے۔ خارج از بحث اقوال کی تکرار ہے۔ برہان قاطع والے کی محبت سے دل بے قرار ہے۔ فرط غیظ و غضب سے بدن رعشہ دار ہے۔ منشی سعادت علی نہ ناظم ہے' نہ ناثر ہے۔ بہ موجب اس مصرع کے : مقتضائے طبیعتش ایں است! ' ناچار تم کو معرض تحریر میں تامل چاہئے۔ نہ سخن پروری و جانب داری میں توغل چاہئے۔ حسب اختلاف طبائع مانو یا نہ مانو مگر پہلے تو یہ جانو کہ غالب سوختہ اختر کا فرہنگ نویسوں کے باب میں عقیدہ کیا ہے۔" (نامہ غالب' پہلا ایڈیشن صفحہ ۲)

اور پھر فارسی کے فرہنگ نویسوں کے بارے میں اپنے خیالات کی وضاحت اس طرح کی ہے :

"اگرچہ قاطع برہان میں جا بجا لکھتا آیا ہوں مگر اب ہندی کی چندی کرکے لکھتا ہوں کہ یہ عقیدہ میرا ہے کہ فرہنگ لکھنے والے جتنے گزرے ہیں سب ہندی نژاد ہیں۔ ہاں علم صرف و نحو عربی میں بقدر تحصیل مسلم اور استاد ہیں۔ علم صرف و نحو عربی کی کتب درسی موجود ہیں۔ جس نے چاہا اس نے استاد سے ان کتب کو پڑھ لیا ہے؟ آخر مقاصد صرف و نحو عربی بھی تو صرف مطالعہ کتب سے نہیں نکالے ہیں۔ پہلے تعلیم و تعلم ہے پھر کتب قواعد کے جا بجا حوالے ہیں۔ قواعد فارسی کا رسالہ اہل زبان میں سے کس نے لکھا ہے اور ان ہوس پیشہ فرہنگ لکھنے والوں نے وہ رسالہ کس فاضل عجم سے پڑھا ہے۔

شیدائے ہندی سیکوٹی نے حاجی محمد جان قدسی علیہ الرحمہ کے ایک شعر پر اعتراض کیا ہے۔ مرزا جلالائے طباطبائی علیہ الرحمہ نے شیدا کو خط لکھا ہے۔ سر آغاز خط کا ایک قطعہ جس میں "صحرا و دریا" قافیہ اور برساند ردیف ہے' شعر خیر کا مصرع ثانی یاد رہ گیا ہے : لیعنی بہ مہا و یو مقوی برساند۔ خلاصہ مضمون خط یہ کہ تو صاحب زبان نہیں ہے' زبان داں ہے' یعنی مقلد اور کاسہ لیس اہل ایران۔ حاجی محمد جان کے کلام کو سند پکڑ۔ تجھے کس نے کہا ہے کہ اس سے لڑ؟ کیا تو نے سنا نہیں جو عرفی اور فیضی میں گفتگو ہوئی ہے اور موتمن الدولہ شیخ ابوالفضل کے روبرو ہوئی ہے۔ لغات فارسی اور ترکیب الفاظ میں کلام تھا۔ مولانا جمال الدین عرفی رحمتہ اللہ علیہ نے کہا کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے' اور نطق آشنا ہوا ہوں' اپنے گھر کی بڑی بوڑھیوں سے لغات فارسی اور ترکیبیں سنتا رہا ہوں' فیضی بولا کہ جو کچھ تم نے اپنے گھر کی بڑھیوں سے سیکھا ہے' وہ ہم نے خاقانی اور انوری سے اخذ کیا ہے۔ حضرت عرفی نے فرمایا کہ "تقصیر معاف" خاقانی اور انوری کا ماخذ بھی تو منطق گھر کی پیر زالوں کا ہے۔ ہائے تمیز کہاں سے لاؤں کہ حال قلمرو ہند کے صاحب کمالوں کا ہے۔ قیاس مع

الفاروق کی بہار دیکھو۔ مجرد تقدم زمانہ کا اعتبار دیکھو۔ مانا کہ عرفی تحصیل علوم عربیہ میں ان سے کمتر ہے۔ صاحب زبان اور ایرانی ہونے میں برابر ہے۔ کیا عرفی کیا انوری کیا خاقانی' ایک شیرازی' ایک خاوری اور شروانی۔ اگر مجھ سے کوئی کہے کہ غالب تیرا بھی مولد ہندوستان ہے۔ میری طرف سے جواب یہ ہے کہ بندہ ہندی اور مولد پارسی زباں ہے :

ہر چہ از دستگہ پارس بہ یغما بروند
تابنالم ہم ازاں جملہ زبانم دادند

زباں دانی فارسی میری ازلی دستگاہ اور یہ عطیہ خاص من جانب اللہ ہے۔ فارسی زبان کا ملکہ مجھ کو خدا نے دیا ہے۔ مشق کا کمال میں نے استاد سے حاصل کیا ہے۔ ہند کے شاعروں میں اچھے اچھے خوشگوار اور معنی یاب ہیں۔ لیکن یہ کون احمق کہے گا کہ یہ لوگ دعوائے زباں دانی کے باب ہیں؟ رہے فرہنگ لکھنے والے۔ خدا ان کے بیچ سے نکالے۔ اشعار قدما آگے دھر لیے اور اپنے قیاس کے مطابق چل دیے۔ وہ بھی نہ کوئی ہم قدم' نہ کوئی ہمراہ بلکہ سو بسو پراگندہ و تباہ۔ رہنما ہو تو راہ بتائے۔ استاذ ہو تو شعر کے معنی سمجھائے۔ نہ آپ شیرازی نہ استاد اصفہانی' زہے رگ گردن' فہے دعوائے زباں دانی۔ میرا یہ قول خاص ہے' نہ عام ہے۔ مجموع فرہنگ نگاروں کے محقق ہونے میں کلام ہے۔ یہ کیا بات ہے کہ جامع برہان کا ماخذ فرہنگ رشیدی و جہانگیری ہے۔ عبدالرشید کی کیا شیخی اور میاں انجو کی کیا پیری ہے؟ قطب شاہ جہانگیر کے عہد میں ہونا اگر منشائے برتری ہے تو بے چارہ جعفر زٹلی بھی فرخ سیری ہے۔"

(نامہ غالب' پہلا ایڈیشن صفحہ ۲ - ۳)

یہاں غالب نے بڑے مدلل اور منطقی انداز میں ادبی مباحث کو واضح کیا ہے اور اس میں عام طور پر مخاصمت جس صورت حال کو پیدا کرتی ہے اس کا شکوہ کیا ہے اور اس طرح اپنے زمانے کے غیر صحت مندانہ رویہ پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے خیال میں قاطع برہان انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کو لوگ سمجھتے نہیں اور بغیر سمجھے ہوئے صرف اس وجہ سے ان پر اعتراضات کی بوچھار کرتے ہیں کہ انھیں قاطع کے مولف محمد حسین دکنی سے جذباتی لگاؤ ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے فرہنگ نگاروں کے بارے میں جو اصولی باتیں کہی ہیں وہ بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان خیالات میں دراصل ایک شاعر اور ایک تخلیقی فنکار کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ غالب نے یہاں اپنا اور اپنی فارسی دانی کا ذکر بھی انتصار کے ساتھ کیا ہے لیکن اس میں تعلی نام کو نہیں۔ بلکہ انہوں نے اس سلسلے میں جو کچھ کہا ہے 'وہ اظہار حقیقت اور اس سے ان کی باتوں میں وزن پیدا ہوتا ہے۔

غالب فرہنگ نویسوں سے بعض بنیادی اختلافات رکھتے ہیں۔ اسی لیے انہوں نے ان کو درخور اعتنا نہیں سمجھا ہے۔ ان کے محقق ہونے میں انھیں کلام ہے کیونکہ وہ اپنے قیاس کے مطابق چلتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قیاس کو تحقیق کی بنیاد نہیں سمجھا جا سکتا۔ خاص طور پر محمد حسین دکنی جامع برہان قاطع کو مرزا رحیم بیگ اور دوسرے لکھنے والوں نے جن دلائل کو پیش کرکے ایک بلند پایہ فرہنگ نویس ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے

انہوں نے اختلاف کیا ہے۔

اس سلسلے میں آگے چل کر غالب نے فرہنگ نویسوں کے بارے میں ایک بڑے مزے کی بات کہی ہے۔ لکھتے ہیں :

"ایک لطیفہ لکھتا ہوں۔ اگر خفا نہ ہو جاؤ گے تو حظ اٹھاؤ گے۔ جتنی فرہنگیں اور فرہنگ طراز ہیں' یہ سب کتابیں اور یہ سب جامع مانند پیاز ہیں۔ تو بتو اور لباس در لباس' وہم در وہم' اور قیاس در قیاس۔ پیاز کے چھلکے جس قدر اتارتے جاؤ گے چھلکوں کا ڈھیر لگ جائے گا' مغز نہ پاؤ گے۔ فرہنگ لکھنے والوں کے پردے کھلتے جاؤ۔ لباس ہی لباس دیکھو گے۔ شخص معدوم۔ فرہنگوں کی ورق گردانی کرتے رہو۔ ورق ہی ورق نظر آئیں گے' معنی موہوم۔" (نامہ غالب' پہلا ایڈیشن صفحہ ۵۰۴)

اس لطیفے کا مقصد دراصل اس خیال کی وضاحت ہے کہ لغت لکھنے والوں کے پاس ایک عام خیال کے مطابق ذہن اور تخیل نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا بھی ہے تو وہ اس سے کام نہیں لیتے۔ بلکہ لغت نویسی کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ وہ اس سے کام لے ہی نہیں سکتے۔ چنانچہ آگے چل کر اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں :

ظرافت پر مدار تحقیق نہیں۔ آپ کے خاطر نشین کرتا ہوں جو میرے دلنشیں ہے۔ فرہنگ نویسوں کا قیاس معنی لغات میں نہ سراسر غلط ہے البتہ کمتر اور بیشتر غلط ہے۔ خصوصاً دکنی تو عجیب جانانہ ہے' لغو ہے' پوچ ہے' پاگل ہے' دیوانہ ہے' وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ یائے اصلی کیا ہے اور یائے زائد کیا ہے۔ حیران ہوں کہ اس کی جانب داری میں فائدہ کیا ہے۔ خدا جانتا ہے کہ میں یک رنگ ہوں۔ مگر دکنی کے جانب داروں کا چور نگ ہوں۔ مجھے جو چاہو سو کہو اوروں سے تم کیوں لڑتے ہو؟" (نامہ غالب' پہلا ایڈیشن)۔

غالب نے یہاں اپنے حریف مولف' برہان قاطع' کے لیے سخت الفاظ ضرور استعمال کیے ہیں لیکن ایسا کر کے انہوں نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کی لغت نویسی دوسرے لغت نویسوں کے مقابلے میں ادنیٰ درجے کی ہے' اور وہ اس کے اس انداز سے اختلاف کرتے ہیں۔ نامہ غالب میں صرف یہی ایک مقام ایسا ہے کہ جہاں غالب اپنے حدود سے باہر نکل گئے ہوں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہیں غصہ آگیا ہے۔ آگے چل کر جہاں الفاظ کی بحث کی ہے اور برہان قاطع کے مولف کی غلطیاں نکالی ہیں وہاں بھی کچھ اسی قسم کا لب و لہجہ پیدا ہوگیا ہے' لیکن اس قسم کے مباحث میں اس صورت حال کا پیدا ہونا ایسا کچھ عجیب نہیں۔

نامہ غالب اس اعتبار سے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں غالب نے اپنی انانیت کے باوجود ایک جگہ اپنے سہو کا اعتراف کیا ہے اور ان سے جو غلطیاں ہوئی ہیں' ان کو تسلیم کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

"سچ ہے غالب آگندہ گوش ہے۔ کسی کی نہیں سنتا۔ اسی آپ کے مقرر کیے ہوئے قاعدے کے مطابق بہ حلف کہتا ہوں کہ تم نے قاطع برہان و دافع ہذیان و لطائف غیبی کو ہرگز نہیں دیکھا۔ "آویزہ" و "افسوس" کے بیان میں مجھ سے وہ سہو ہوا ہے کہ مجھے اس کا اقرار او رمیرا دوست میاں داد خاں سیاح شرمسار ہے۔ جو کچھ اس منصف نے اس باب میں لکھا وہ قول فیصل اور کافی ہے۔ مانیں نہ مانیں' ناظرین کو اختیار ہے۔" (نامہ

(نامہ غالب، پہلا ایڈیشن، صفحہ ۱۰۵)۔

اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ ان تمام اعتراضات اور گلے شکووں کے باوجود آخر میں دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے اور عشق و محبت جو ان کا مسلک ہے، اس کی وضاحت کی ہے۔ چنانچہ اپنی اس تصنیف کو ان جملوں پر ختم کیا ہے:

"میں اب قطع کلام کرتا ہوں، اور آپ کو بہ کمال تعظیم سلام کرتا ہوں۔ پیمبر کی تحقیر کو مسلم رکھتے ہوئے، تم جانو اور سید ابرار۔ خاقانی پر بہتان کرتے ہو۔ تم جانو اور وہ میدان معنی کا شہسوار۔ مجھ کو جس قدر تم نے لکھا ہے یا کوئی اور لکھ رہا ہے اگرچہ وہ سب لغو اور جھوٹ ہے، معقول اور راست نہیں، لیکن واللہ مجھ کو عرصہ محشر میں اس کی بازخواست نہیں!

ز یمن عشق بہ کونین صلح کل کردیم
تو خصم باش و ز ما دوستی تماشا کن

(نامہ غالب، پہلا ایڈیشن، صفحہ ۱۶)

غرض نامہ غالب برہان قاطع اور قاطع برہان کے قضیے سے متعلق غالب کی سب سے اہم تصنیف ہے۔ اختصار کے باوجود یہ ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے۔ غالب نے اس میں بعض اہم ادبی و لسانی مباحث کو چھیڑا ہے۔ اور اس طرح ان موضوعات سے متعلق اپنے بعض بنیادی خیالات و نظریات کی وضاحت کی ہے۔ اس کا انداز اور لب و لہجہ عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ ہم آہنگ ہے لیکن اس کے باوجود غالب کی ذہانت اور ان کی شخصیت کی پہلودار کیفیت نے اس میں جگہ جگہ وہ رنگ و آہنگ بھی پیدا کر دیا ہے جو ایک شمشیر جوہردار میں ہوتا ہے۔

مسلم ضیائی

غالب کا ایک منظوم خط

غالب کی ابتدائی شاعری میں جب وہ اسد تخلص کرتے تھے' ایک شعر ملتا ہے۔

دیر و حرم آئینہ تکرار تمنا
واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

اور اس سے ان کی ذہنی زندگی اور ان کے مذہبی و فکری نقطہ نظر میں ایک بڑی تبدیلی کا پتہ چلتا ہے۔ کیونکہ اس سے قبل جب انہوں نے اپنی محبوبہ کی خاطر یا کسی اور وجہ سے اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر مذہب امامیہ اختیار کیا تو حسب ذیل شعر کہا تھا۔

اس جفا مشرب پہ مرتا ہوں کہ سمجھے ہے اسد
مال سنی کو مباح اور خون صوفی کو حرام

اکثر دیکھا گیا ہے کہ نیا مذہب یا نئے نظریات اختیار کرنے والوں کے جذبات ابتداء" بہت شدید ہوتے ہیں۔ جن کی بڑی شدت سے تبلیغ بھی کی جاتی ہے۔ چنانچہ اس دور میں غالب نے منقبت علیؑ میں جو قصیدے کہے یا غزلوں کے مقطعے کہے ہیں۔ ان سے ان کے جذبات کی شدت اور غلو کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن مطالعہ اور مشاہدہ' کلکتہ کے سفر' فضل حق خیر آبادی جیسے فلسفہ و سیاست کی صحبت اور انگریز افسروں سے تعلقات' نیز ان کا رہن سہن اور گفت و شنید کے طریقوں کو دیکھ کر ان کے مذہبی فکر میں آہستہ آہستہ کمی ہوتی گئی۔ چنانچہ انہوں نے بہت سی متذکرہ غزلوں کے مقطعے خارج کر دیئے اور نئے انداز سے سوچنے لگے جس کا نتیجہ مندرجہ بالا شعر ہے۔

یہی وسعت نظری تھی جس کے باعث غالب کی محفلوں اور غالب کے دوستوں میں ہندو مسلمان اور کالے گورے کے درمیان امتیاز نظر نہیں آتا۔ اس کی محفل میں متعدد شمعیں ہیں جو آئینہ خانہ میں چراغاں کی سی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں۔ اس کے دور میں کئی آفتاب ہیں جن کے چاروں طرف سیارے گردش کرتے ہیں۔ لیکن وہ غالب اب آفتاب ہے جس کے گرد شیفتہ' حالی اور نیر رخشاں جیسے آفتاب بھی ہیں اور رائے چھج مل کھتری اور ان کے دونوں بیٹے منشی جواہر سنگھ جوہر اور منشی ہیرا سنگھ جیسے سیارے بھی۔

رائے چھج مل فخرالدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں رستم جنگ والئی فیروز پور جھرکہ و رئیس لوہارو کے متوسل بلکہ غالباً مختار عام یا وکیل تھے اور چونکہ احمد بخش خاں کی اسکیم کے مطابق غالب کی پنشن انگریزی حکومت سے انہی کے ذریعے ملتی تھی اس لئے غالب اور چھج مل کے درمیان پہلے کاروباری' اور اس کے بعد

دوستانہ بلکہ برادرانہ تعلقات پیدا ہو گئے۔ چنانچہ پنشن کے سلسلہ میں جب غالب کلکتہ گئے تو لکھنؤ، بنارس اور کلکتہ سے ان کے نام دوستانہ خط بھیجتے اور دریافت کرتے رہے رزیڈنسی اور اہل کار ان قدیم و جدید کا کیا حال ہے؟ اور نئے والئی ریاست (شمس الدین احمد خان) اور نئے رزیڈنٹ کے تعلقات کیسے ہیں؟

پھر ہیج مل نے 1277ھ میں وفات پائی تو غالب نے قطعہ تاریخ کہا۔

گو بند رائے ہیج مل شیریں کلام مرد — وریغہ دوست رفت ازیں تنگ نا دریغ
گفتم کے زسال وفاتش نشاں دہد — غالب شنید و گفت چہ گویم بسا دریغ

انہی ہیج مل کے بیٹے منشی جواہر سنگھ جوہر غالب کے شاگرد تھے۔ اور شاید صرف فارسی ہی میں شعر کہتے تھے۔ یہ غالب کے نہ صرف محبوب شاگرد تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ غالب ان دونوں بھائیوں کو اپنے بچوں کی مانند تصور کرتے تھے۔ چنانچہ ایک خط میں حکیم مرزا جان ولد حکیم آغا جان (عیش؟) کی سفارش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ان کے والد ماجد میرے پچاس پچپن برس کے دوست ہیں جن کو میں اپنے بھائی کے برابر جانتا ہوں۔ اس صورت میں حکیم مرزا جان میرے بھتیجے ہیں، اور تمہارے بھائی ہیں۔"

غالب کو اپنے بعض دوسرے ممتاز شاگردوں مثلاً تفتہ وغیرہ کے مانند جواہر سنگھ جوہر پر بھی فخر تھا۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

تا نیکش و جوہر دو سخنور داریم — شان دگرو شوکت دیگر داریم
در میکدہ پیریم کہ یکیش از ماست — در معرکہ تیغیم کہ جوہر داریم

کلیات، نثر فارسی اور اردوئے معلی میں جواہر سنگھ کے نام تین تین خط ہیں اور غالب نے جوہر کو "برخوردار کامگار سعادت و اقبال نشاں۔" کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔

جواہر سنگھ کا کلام نہیں ملتا۔ صرف اردوئے معلی میں ان کے نام خط میں ایک غزل غالب کی اصلاحوں کے ساتھ لکھتے ہیں:۔

"برخوردار تمہارے خطوں کا پہنچنا اور چھاپے کے قصیدے کا پہنچنا اور ہیرا سنگھ کا ادھر روانہ ہونا معلوم ہوا ----- غزل تمہاری ہم کو پسند آئی۔ اصلاح دیکر بھیج دی گئی۔ اس کا تم خیال رکھا کرو کہ کس لفظ کو کس معنی کے ساتھ پیوند ہے مصرع "چرانہ یاس بجان امید وار افتد" ---- یہاں مہمل ہے۔ "یاس بدل افتادن"، و "یاس بجاں افتادن" روزمرہ نہیں۔ اور بھی کئی "افتد" ایسے ہیں۔

سیاہ بختم اگر برسرم گذار افتد — بسا سایہ ہمانیز سوگوار افتد

سوگوار ہونا سایہ کا بہ اعتبار سیاہی رنگ ہے۔ اب یہاں دونوں "افتد" ٹھیک ہیں۔ گزار افتادن روزمرہ اور دوسرا "افتد" بہ معنی واقع شود۔

شنیده ام بجفائے تو جلاست عدو
چرا نہ شور بہ جان امیدوار افتد

"شور افتادن" روزمرہ ہے۔ اور "یاس افتادن" غلط۔

بہ حیرتم کہ ز دوزخ' کسان دوزخ را
کجا برند جو آہم شرارہ بار افتد

یہاں "افتد" معنی واقع شود ٹھیک ---

نہ گبرم و نہ مسلماں بحیرتم کہ مرا
سوائے دوزخ و مینو کجا گذار افتد

یہ شعر تمہارا بہت خوب ہے۔ آفریں۔

قرار در وطن افسرده می کند دل را
خوشا غریب کہ دور از دیار یار افتد

یہاں بھی افتد صحیح و بامعنی۔

نیم رقیب کہ سوائیم خجل نہ کند
خوش است چشم اگر یار پرده دار افتد

یہاں بھی "افتد" معنی واقع شود۔

ترا کہ شیوه دگر گوں کنی بزعم بتاں
خوش است گر ز جفا بر وفا قرار افتد

"افتد" یہاں بھی ٹھیک ہے۔ بات اتنی بھی تھی کہ "بود" گد لا لفظ تھا "کنی" صاف ہے۔

خط رخ تو بذل داده خط آزادی
ستم کہ در شکن زلف تابدار افتد

وہ صورت اچھی نہ تھی۔ یہ طرز خوب ہو گئی۔ معنی کا عیار کامل ہو گیا۔

چکدز خامہ جوہر سخن چنانکہ گہر
بزور موج دراز بحر برکنار افتد

اس غزل کے علاوہ ایک فارسی اور دو اردو قطعات ہیں۔ پہلا درفش کا ویانی مطبوعہ اکمل المطابع دہلی (1865ء) میں' جو اس سے پہلے قاطع برہان میں چھپا تھا۔

دریں کتاب مسمی بہ قاطع برہان — گہر کہ خامہ غالب چہ مایہ گوہر سفت
بیا کہ جوہر رنگیں صفیر بے کم و کاست — "نگار خانہ فرہنگ" سال بعبش گفت

دوسرے دو قطعات اردو میاں داد خاں سیاح کے نام سے چھپی ہوئی' اور غالب کی تصنیف لطائف غیبی مطبوعہ

اکمل المطابع دہلی 1864ء میں بعنوان ذیل ہیں:۔

(1)

بسکہ سیف الحق کی یہ تصنیف ہے فرق دشمن اس سے ہو گا ریز ریز
ہے پئے اظہار سال عیسوی قول جوہر کا "زہے یہ تیغ تیز"

(2)

جب چھپی یہ لطائف غیبی بہر تاریخ اس کی ہاتف غیب
سر امن کو کاٹ کر بولا طبع کو بھائی یہ لطائف غیب

قیاس کہتا ہے کہ لطائف غیبی کے مانند یہ تینوں فارسی اور اردو قطعات بھی غالب ہی کے قلم کی تخلیقات ہیں۔ خصوصاً دوسرے اردو قطعہ کا تیسرا مصرعہ اس حقیقت کی غمازی کرتا معلوم ہوتا ہے۔

بہر حال یہ ہیں جواہر سنگھ جوہر جن سے غالب کے تعلقات بزرگانہ بلکہ پدرانہ تھے۔ ان کی تصدیق اس منظوم خط سے ہوتی ہے جو اس موقع پر پیش کیا جاتا ہے۔

کچھ عرصہ ہوا میری نظر سے کلیات غالب فارسی کے دو قلمی نسخے گذرے۔ ان میں سے ایک نسخے کی جلد کے اندرونی جانب مجھے غالب کا وہ منظوم خط ملا جس کے مکتوب الیہ یہی جواہر سنگھ جوہر ہیں۔

اس نسخہ کے آخری صفحے پر ترقیمہ ہے۔

"دیوان صاحب سرچشمہ معانی و بحر بیکراں سخن دانی اسد اللہ خاں کہ متخلص بہ غالب است بدستخط حقیر فقیر محمد عالم ولایتی۔ برائے خدام والا مقام مولوی صاحب جلیل الشان والا مناقب (سید محمد یا سراج؟ یا کچھ اور) باتمام انجامید۔" تحریر بتاریخ دہم شعبان 1253 ہجری۔

گویا یہ نسخہ کلیات فارسی کی اشاعت اول (سنہ 1874ء) سے تقریباً نو سال پہلے لکھا گیا تھا لیکن چونکہ یہ منظوم خط متن میں نہیں اس لئے اس کی تاریخ کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ آخری شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عارف کی وفات (سنہ 1852ء) سے قبل لکھا گیا تھا۔ خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جواہر سنگھ غالباً اپنے والد سے ناراض تھے جس کے باعث واپس نہیں آئے تھے۔ اور ان کے والد اور خصوصاً والدہ کا غم جدائی سے برا حال تھا۔

غالب نے ایک شفیق بزرگ کے مانند جواہر سنگھ کو اس طرف توجہ دلاتے ہوئے واپس آجانے کے لئے لکھا ہے۔ خط شروع ہونے سے پہلے حسب ذیل عبارت ہے۔

"مرزا اسد اللہ خاں (؟)

بہ لالہ جواہر سنگھ صاحب نوشتہ بودند"

خط

وفا جوہرا از تو غم دورباد
ولت سر خوش بادۂ سورباد

رسید از تو الفت فزا نامہ
رواں تازہ کن (کذا) دلکشا نامہ

نہ خواہم کہ در عرصہ روزگار
شیند ترا بر دل از غم غبار

زرنجوری1ے من مخور غم کہ من
ندارم غم ہستی' خویشتن

نہ جاں از منست ونہ جسم آن من
خود از مردن من چہ نقصان من

حدیثی 2ٌ ست شائستہ و سودمند
زشائستگی بودہ دانا پسند

گرازمن نباشی نکوی شنو
زآنکس کہ فرزند اوی شنو

چنیں دادہ فرماں کہ درساز راہ
نباشی بہ حیلت گری عذر خواہ

عزیزان رہرو گرای کند
بشادی دراں ناحیت ی رسند

بہ شادی بدیں جمع انباز گرو
چوگر وندانیاں توہم باز گرد

الاتانسنجی دریں زاں بہ است
چنیں خواستت آنکہ فرماں وہ است

مشو سخت کوش دمشو سخت گیر
دریں آمدن1ے باش فرماں پذیر

بحکم پدرچوں (ں) گزیدی سفر
بگر واز سفر ہم نہ حکم پدر

دریں رفتن و آمدن شاد باش
بہ تیعت از طعنہ آزادباش

زجر تو مادر بہ تاب اندراست

گزاراں چو شکر در آب اندراست

پدر نیز مشتاق دیدار تست
بصد گونہ خواہش طلبگار تست

ترا خواہد از بسکہ خواہر ترا
نخواہد گراوبس 3۔ کہ خواھد ترا

بیاد دو خونین جگر رابیبں
بما در نشین و پدر رابیبں

دگر من چراغ سحر گاہیم
قدم نہ براہ ہوا خواہیم

بیاتا بہ بینی کہ چوں می تپم
جہاں دیدہ تادل بخوں می تپم

بیاتا تم غرق خوں بنگری
درون مرا از بروں بنگری

بیا دبیا دبیا
سر آمد سخن والد عاو الدعا

بخواں چوں بخوانی ورق رااتمام
زنیر سلام و زعارف سلام

حواشی

1۔ شاید اس زمانے میں غالب بیمار تھے۔
2۔ زندگی؟ آمدن؟
3۔ نخواہد دگربس کہ خواہد نما۔

پروفیسر سجاد باقر رضوی

.........نامہ بر اکثر کھلا

برخوردار سب سے پہلے فقیر غالب علی شاہ کی دعا قبول کرو' پھر میرا شکوہ سنو۔ میاں کیا تم نے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھائی ہے' اتنا تو کہو کیا بات تمہارے جی میں آئی ہے۔ برسوں ہو گئے تمہارا خط نہ آیا۔ اب جو آیا ہے تو "یوم غالب" میں شرکت کی دعوت ساتھ لایا ہے۔ ایک سو تہتر (۱۷۳) برس چار (۴) ماہ عمر عزیز کے گزارے' آنکھوں کی بصارت اور کانوں کی سماعت سے محروم ہوں۔ جس سناٹے میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتہ نہیں' بو علی سینا کے علم اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو تھوڑی سے راحت درکار ہے اور باقی حکمت و سلطنت' اور شاعری اور ساحری سب خرافات ہے۔ بریلی والے میاں عبادت کو میری دعا کہنا اور کہنا کہ میں نے جو لکھا کہ میں اچھا ہوں' اس کو آپ سچ سمجھ کر خدا کا شکر بجا لائے' وہ جو میں نے لکھا تھا کہ شدت مرض کا بیان مبالغہ شاعرانہ ہے' اس کو بھی آپ نے سچ جانا ہوگا۔ حالانکہ یہ دونوں کلمے از راہ طنز تھے۔ ان سے کہیو کہ اے جان غالب میں تیری خیر و عافیت کا طالب ہوں اور انہیں میرا یہ مقطع سنا دیجو :

جان غالب تاب گفتاری گماں داری ہنوز
سخت بے دردی کہ می پرسی ز ما احوال ما

میں برس دن سے بیمار ہوں اور تین مہینہ سے صاحب فراش ہوں۔ اٹھنے بیٹھنے کی طاقت مفقود' ضعف و ناتوانی علاوہ' سوز غمہائے نہانی علاوہ کلو اور اس کا لڑکا نیاز علی یعنی ڈیڑھ آدمی میرے پاس ہیں۔ میری رہی سہی زندگی کی آس ہیں۔ زیر علاج حکیم غلام نجف خاں کے ہوں' یہاں سے نکلوں تو کیسے نکلوں۔ لاغری و ناتوانی سے مجبور ہوں' حوریں دور سے سلام کرتی ہیں۔ غلمان پاس نہیں پھٹکتے۔

عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے۔

مجھے "یوم غالب" سے کیا کام اور "مجلس یادگار غالب" سے کیا سروکار۔ اتنی عمر گزاری سوائے شہرت خشک کے فن شعر کا کچھ پھل نہ پایا۔ فرمانروایان عصر معتقد ہوئے مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ احسنت و مرحبا کا شور سامعہ فرسا ہوا۔ پھر کیا ہوا۔ سنتا ہوں تمہارے شہر لاہور میں کرم آباد والے حمید احمد خاں نے بالآخر نسخہ حمیدیہ کی تالیف کا کام اپنے ذمہ لیا ہے۔ جائے صد شکر ہے کہ اس کام سے میرا کلام اور ان کا نام روشن ہوگا۔ انہیں نسبت میرے کلام سے ہے اور میرے کلام کو نسبت ان کے نام سے ہے۔ حمید احمد خاں صاحب کی خدمت میں

میرا سلام عرض کیجو اور کہیو کہ بندہ پرور میں خوشامدی نہیں جو منہ دیکھی کہوں' میرا شیوہ حفیظ الغیب ہے' غائب کی تعریف کرنی کیا عیب ہے۔ ہاں صاحب آپ وضعدار ہیں اس میں کیا ریب ہے۔ آپ نے چند برس پہلے وعدہ کیا' میں خوش ہوا' اب آپ ایفائے وعدہ کر رہے ہیں' میں خوش میرا خدا خوش۔ لیکن حضرت میں کیوں احسان مانوں۔ اپنے دیوان پر آپ کا نام لکھنا میرا کام' میرا نام روشن کرنا آپ کا کام۔ حساب دوستاں در دل۔

خدا میاں آفتاب کو جہاں تاب کرے کہ تنقید غالب کے عنوان سے ایک کتاب کی طرح ڈال رہے ہیں۔ حیف ہے کہ اسد اللہ خاں کو جسے فن سخن میں غالب کہتے ہیں' صوبہ بہار کا ایک بد ذوق' گھاگس' ہمہداں کڑے مانک پور کے کھتری قتیل کا ہمزبان' مغلوب کرے' سخن ناشناسوں کو زور کج بیانی سے مرعوب کرے۔ چند فاقوں میں چار لفظوں کی تحقیق کرنا اور ہے' عرفا کے کلام سے حقیقت حقہ کا پتہ چلانا اور ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میاں آفتاب سخن ور اور سخن داں ہیں۔ قلمرو پاکستان میں ایسے آدمی اور بھی ہوں گے جو میرے اور مدعی کے رتبہ کو ممیز ہو سکیں گے :

؎ عید است بادہ شد فلک و ساغر آفتاب

شفیق با لتحقیق مولانا مہر کو اس ناچیز کا سلام پہنچائیو۔ حضرت جبریل کی اس خبر سے' کہ کلام فارسی کی تدوین مولانا مہر اور سید گرامی علامہ وزیر الحسن عابدی' کہ فی الحقیقت مملکت شعر و سخن کے وزیر با تدبیر ہیں' مل کر سرانجام دے رہے ہیں۔ جنت الفردوس میں ایک ہلچل ہے۔ اس محبت انگیز اور مسرت خیز خبر نے غم بیکسی بھلایا ہے۔ یہ بھی سنتا ہوں کہ دستنبو کی تدوین میاں شکور احسن الملقب بہ آغائے احسنی کے سپرد ہے۔ واللہ تم نے دستنبو کی مناسبت سے ید بیضا ڈھونڈ نکالا ہے۔ اجی حضرت۔ آہا ہا..... کیا خبر آئی ہے' واللہ میرے دل کو بھائی ہے۔ جناب حامد علی خاں کو' کہ سنا ہے کہ اب مولانا نہیں کہلواتے بعد سلام کہیو۔ حضرت تم نکتہ سنج ہو' ذی فہم ہو' میری روش انکسار کو پا لیا۔ اردو دیوان کو بے رنگ غالب نہ جانا۔ آفرین ہے کہ گنجینہ معنی کے طلسم کو از سر نو دنیا کے سامنے لاتے ہو' غالب کو غالب کرتے ہو۔

برسوں پہلے کی بات ہے جب میں زندگی فانی کی قید میں تھا تو الٰہی بخش خاں نے ایک زمین نکالی۔ میں نے حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل یہ :

پلا دے اوک سے ساقی جو مجھ سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

اور مقطع یہ :

اسد خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

کیا دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس مقطع او راس بیت الغزل کو شامل ان چار اشعار

کے کرکے غزل بنائی ہے اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی الو کے۔ تم یہ بات حمید احمد خاں صاحب کو جتا دیجیو کہ صاحب جب شاعر کی زندگی میں گانے والے شاعر کے کلام کو مسخ کر دیں تو کیا بعید ہے کہ شاعر متوفی کے کلام میں مطربوں نے خلط کر دیا ہو۔ خان صاحب موصوف سے یہ بھی کہیو کہ حضرت سو برس سے کچھ اوپر ہوئے میری پنشن کا قضیہ طے ہونے میں نہیں آتا۔ تم کو اللہ نے مرتبہ بخشا ہے۔ سنتا ہوں کہ سربراہ مملکت خود تمہاری دانش گاہ میں آتا ہے۔ حیف ہے کہ تم نے اس بارے میں کچھ نہ کیا۔ واللہ کہ تم نے غالب کو خوش نہ کیا۔ میاں یہ پنشن اسد اللہ خاں کی ہے۔ حضرت خضر کی نہیں کہ زندگی کے ساتھ پنشن کی آس تا قیامت باقی رہے۔ جنت میں جو وظیفہ مجھے ملتا ہے لاریب کہ وہ میری شان کے شایان نہیں تس پر ہر ماہ حوروں اور غلمانوں کا مقروض رہتا ہوں۔ صاحب وہ زمانہ نہیں کہ ادھر متھرا داس سے قرض لیا ادھر درباری مل کو مارا۔ ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی۔ ہر ایک کے پاس تمسک مہری۔ شہد لگاؤ چاٹو' نہ مول نہ سود' اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ بالکل پھوپھی کے سر' بایں ہمہ کبھی خان نے کچھ دے دیا' کبھی الور سے دلوا دیا' کبھی ماں نے کچھ آگرے سے بھیج دیا۔ اب یہاں جنت کا انکم ٹیکس جدا' حوروں' غلمانوں کے مول میں قسط ماہ بہ ماہ جدا۔ صبح کی تبرید موقوف' چاشت کا گوشت آدھا' رات کی شراب موقوف۔ تاروں نے پوچھا تبرید و شراب کب تک نہ پیو گے۔ کہا گیا جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا نہ پیو گے تو کس طرح جیو گے۔ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے' بارے مہینہ پورا نہ گزرا تھا کہ حضرت رضوان کی طرف سے علاوہ وجہ مقرری اور روپیہ ملا۔ صبح کی تبرید رات کی شراب طہور جاری ہو گئی۔ گوشت پورا آنے لگا۔ قاضی عبدالودود کو بعد سلام کہنا کہ اے محقق تنگ دل! دیکھ' ہم تنگ دستوں کی حاجت یوں پوری کرتے ہیں' عرفا یوں پلاتے ہیں --- اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما!

فقط والسلام
نجات کا طالب
غالب

ابن انشاء

چند بیرنگ خطوط مرزا صاحب کے

(1)

لو مرزا تفتہ ایک بات لطیفے کی سنو۔ کل ہرکارہ آیا تو تمہارے خط کے ساتھ ایک خط کرانچی بندر سے میاں فیض احمد فیض کا بھی لایا جس میں لکھا ہے کہ ہم تمہاری صد سالہ برسی مناتے ہیں۔ جلسہ ہوگا جس میں تمہاری شاعری پر لوگ مضمون پڑھیں گے۔ بحث کریں گے۔ تمہاری زندگی پر کتابیں چھپیں گی۔ ایک مشاعرہ بھی کرنے کا ارادہ ہے۔ تم بھی آؤ اور خرچہ آمد و رفت کا پاؤ۔ دن کی روٹی اور رات کی شراب بھی ملے گی۔ بہت خیال دوڑایا سمجھ میں نہ آیا کہ یہ صاحب کون ہیں۔ ان سے کب اور کہاں ملاقات ہوئی تھی۔ اگر شاعر ہیں تو کس کے شاگرد ہیں۔ بارے منشی ہیرا سنگھ آئے اور دریافت ہوا کہ ادھر لاہور اور ملتان کی عملداری میں ان کا نام مشہور ہے۔ متوطن سیالکوٹ کے ہیں کہ لاہور سے آگے ایک بستی ہے جہاں کھیلوں کا سامان اور شاعر اچھے بنتے ہیں۔ ایسے کہ نہ صرف ملک کے اندر ان کی مانگ ہے بلکہ وساور کو بھی بھیجے جاتے ہیں۔ ان میاں فیض کے متعلق بھی منشی ہیرا سنگھ نے جتایا کہ اکثر یہاں سے وساور بھیجے جاتے ہیں۔ وہاں سے واپس کیے جاتے ہیں لیکن یہ پھر بھیجے جاتے ہیں ادھر جو ماورائے قفقاز روس کی سلطنت ہے۔ وہاں کا والی ان کی بہت قدر کرتا ہے۔ اپنے ہاں بلاتا ہے خلعت دیتا ہے اور پچھلے دنوں ان کی شاعری سے خوش ہو کر تمغہ اور انعام صد ہزاری بھی بخشا ہے کہ لینن انعام کہلاتا ہے اور کسی کسی کو ملتا ہے۔ یہ قصیدہ اچھا ہی کہتے ہوں گے لیکن اپنی اپنی قسمت کی بات ہے۔ دلی کا قلعہ آباد تھا تو بادشاہ کا قصیدہ اور جوان بخت کا سہرا ہم نے بھی لکھا تھا۔ غفران مآب نواب رامپور کی مدح میں بھی اکثر اشعار لکھے اور ملکہ وکٹوریا کا قصیدہ کہہ کر بھی لفٹیننٹ گورنر کے توسط سے گزرانا۔ لیکن کبھی اتنی یافت نہ ہوئی کہ ساہوکار کا قرضہ چکتا کرتے۔ اتنی سرکاریں دیکھیں آمدنی اب بھی وہی ایک سو باسٹھ روپے آٹھ آنے۔ فتوح کا اعتبار نہیں۔ آئے آئے نہ آئے۔ منشی ہیرا سنگھ نے یہ بھی بتایا کہ یہ فیض احمد فیض پنجابی ہوتے ہوئے بھی آدمی نیک اور شستہ ذوق کے ہیں۔ کسی مدرسے میں لڑکے پڑھاتے ہیں۔ لڑکے پڑھانے والوں کے متعلق میری رائے اچھی نہیں وہ مرد مجہول منشی امین الدین قاطع قاطع والے بھی تو پٹیالے میں راجا کے مدرسے میں مدرس تھے۔ لیکن خیر یہ آدمی اچھے ہی ہوں گے۔ خط تو بڑی محبت اور ارادت کا لکھا ہے۔ شروع خط میں چھاپے کے حرفوں میں ادارہ یادگار غالب بھی مرسوم ہے۔

اچھا ایک بات کل کے خط میں لکھنا بھول گیا تھا منشی شیو نرائن سے کہو کہ دیوان کا چھاپا روک دیں کہ ایک سوداگر کتابوں کا بلاد پنجاب سے آیا ہوا ہے۔ شیو نرائن سے ہماری شرط تھی کہ وہ چھاپے تو پچاس نسخے احباب میں تقسیم کرنے اور صاحبان عالیشان کی نذر گذرانے کے لیے بایں تہی دستی و بے زری اس سے قیمتاً لیں گے تاکہ اس پر بار نہ پڑے لیکن یہ

شخص اس شرط پر چھاپنے کو آمادہ ہے کہ ہمیں کچھ نہیں دینا پڑے گا۔ بلکہ وہ پانچ نسخے حق تصنیف میں ہم کو دے گا۔ جب کہ شیونرائن اور دوسرے مطبع والے ایک نسخہ دیتے تھے۔ بہت اخلاق کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ آتے ہوئے دو شیشے شراب انگریزی کے بھی لایا تھا۔ میں نے وعدہ کرلیا ہے۔

ہاں تو وہ صدی والی بات رہی جاتی ہے۔ اسی سے دیکھ لو کہ عناصر میں اعتدال کی کیا حالت ہے۔ سوچتا ہوں کہ جاؤں کہ نہ جاؤں۔ ہنڈی بھیج دیتے تو کوئی بات بھی تھی۔ بعد میں یہ لوگ کرایہ آمد و رفت دیں یا نہ دیں۔ نہیں بابا۔ نہیں جاتا۔ میں نہیں جاتا۔

نجات کا طالب

غالب

(2)

سعادت واقبال نشاں مرزا علاؤالدین خاں بہادر کو فقیر اسداللہ کی دعا پہنچے۔ لو صاحب یہ تمہارا پوتا' فرخ مرزا کا بیٹا مرزا جمیل الدین عالی' انعام اور جاگیریں بانٹنے لگا۔ یہ حال اکمل الاخبار سے کھلا۔ تم نے تو نہ بتایا۔ لوہارو سے میر اشرف علی آئے تو یہ بھی پتہ چلا کہ یہ عزیز لوہارو چھوڑادھر کہیں سندھ میں جانوکر ہوا پہلے سرکار عالی کی پیشی میں تھا۔ اب کسی ساہوکارے کے کارخانے میں منصرم ہے۔ اتنی دور کیوں جانے دیا نوابوں اور رئیسوں کے لڑکے سیٹھوں ساہوکاروں کے متصدی ہوئے۔ ہاں صاحب شاہی لدگئی تو کچھ بھی نہ رہا۔ عالی شاید تخلص ہے شعر کہتا ہوگا۔ اللہ ترقی دے کس سے اصلاح لیتا ہے۔

ہاں تو وہ انعام جاگیر والی بات۔ اکمل الاخبار والے مضمون میں تھا کہ سال بھر میں جو دیوان یا قصے کہانیاں وغیرہ از قسم داستان امیر حمزہ چھپتے ہیں۔ اسی عزیز کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ یہ ان کو جانچتا ہے اور جو کلام یا تصنیف پسندیدہ ٹھہرے اس پر انعام دیتا ہے۔ کسی کو پانچ ہزار کسی کو دس ہزار' کسی کو کم بھی ہزار دو ہزار بھی۔ یجو میرا اردو کا کلام کانپور میں چھاپا ہوا ہے مطبع والے نے بامید انعام بجوایا تھا۔ وہ تو مصر تھا کہ اس کے ساتھ ایک قصیدہ بھی خوشخط لکھوا کر طلائی جدول کے ساتھ بھیجا جائے۔ لیکن میں نے اسے ضروری نہ جانا کہ تعلقات میرے تم لوگوں نے عزیزداری کے کسی سے مخفی نہیں۔ میں تو اس کے بعد ہنڈی کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ الٹا مطبع والوں کے نام لفافہ آیا کہ یہ فارم بھر کے بھیجو۔ چھ جلدیں داخل کرو اور پھر مصنفوں کی کمیٹی کے فیصلے کا انتظار کرو۔ یہ بھی لکھا تھا کہ مرزا جمیل الدین عالی فقط انعام کی رقوم کا امانتدار ہے۔ فیصلے کا کچھ اور صاحبان علم کی رائے پر انحصار ہے۔ مطبع والے نے ان لوگوں کے نام دریافت کیے اس کا بھی کوئی جواب نہ آیا۔ اب اکمل الاخبار کہتا ہے کہ ایک انعام سراج الدین ظفر کو ملا۔ میں سمجھا شاہ نے رنگوں میں کلام چھپوا کر بھیجا ہوگا۔ لیکن بات جی لگتی نہیں تھی کہ وہ سرکار تو انعام دینے والی تھی اب وضاحت ہوئی کہ یہ اور صاحب ان کے ہم نام ہیں لیکن شاعر اچھے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی تھا کہ ایک اور صاحب نے انعام پایا لیکن ناخوش ہو کر لوٹا دیا

کہ مجھے ضرورت نہیں۔ اللہ اللہ کیسے مستغنی لوگ ہیں۔ نام تو کچھ ان کا بھلا سا ہے۔ میں بھول رہا ہوں لیکن رمز یہ معلوم ہوئی کہ رقم تھوڑی تھی۔ ایک ہزار روپے کو انہوں نے اپنے کمال شاعری کے شایان نہ جانا۔

صاحب میں دوبارہ لکھتا ہوں کہ اب وہ زمانہ نہیں کہ ادھر متھرا داس سے قرض لیا' ادھر دربار یمل کو مارا۔ ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جالوٹی' ہر ایک کے پاس تمسک مہری موجود۔ شہد لگاؤ چاٹو' پھر کبھی خان نے کچھ دے دیا۔ کبھی الور سے کچھ دلا دیا۔ میرا مختار کار بنیا سود ماہ بماہ چاہے۔ ادھر سود جدا۔ مول جدا۔ چوکیدار جدا۔ بی بی جدا۔ بچے جدا۔ شاگرد پیشہ جدا۔ آمد وہی کہ تھی۔ اب کے جو یہ بنیا پنشن کے مجتمع دو ہزار لایا۔ اس نے اپنے پاس رکھ لیے کہ پہلے میرا حساب کیجئے سات کم پندرہ سو روپے اس کے ہوئے۔ قرض متفرق گیارہ سو روپے پندرہ اور گیارہ چھبیس سو روپے یعنی دو ہزار مل کر بھی چھ سو روپے گھاٹا۔ یہ جو ایک ہزار روپے ان شاعر مستغنی الاحوال نے اپنے مقام سے فروتر پاکر لوٹا دیئے ہیں۔ غالب غریب کو مل جاتے تو کم از کم اب تک کا قرض صاف ہو جاتا۔ شاعری سے بس یہی تو یافت تھی کہ قصیدہ لکھا' انعام پایا' اب وہ سرکاریں ہی نہ رہیں۔ کتاب چھپواؤ تو مطبع والا مشکل سے راضی ہوتا ہے۔ کہتا ہے اتنی جلدیں خریدو۔ اپنے دوستوں کے پاس بکواؤ تب ہاتھ لگاتا ہوں۔ یہ تصانیف پر انعام و اکرام والا قصہ نیا ہے۔ اگر تم اس عزیز کو دو حرف لکھ دو تو بڑی بات ہو۔ اس بات کا میں برا نہیں مانتا کہ کلام ان کو یا ان کی کمیٹی کو پسند نہیں آیا۔ مروت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ کسی اور سے نہ کہنا۔ مجھ سے واجب جان کر کہہ دیا کہ اتنا خیال کرتے ہو۔ محبت کا دم بھرتے ہو۔

راقم

غالب

(3)

اہاہا۔ میرا پیارا میر مہدی آیا۔ غزلوں کا پشارہ لایا ارے میاں بیٹھو۔ شعر و شاعری کا کیا ذکر ہے۔ یہاں تو مکان کی فکر ہے۔ یہ مکان چار روپے مہینے کا ہر چند کہ ڈھب کا نہ تھا۔ لیکن اچھا تھا۔ شریفوں کا محلہ ہے۔ پہلے مالک نے بیچ دیا۔ نیا مالک اسے خالی کرانا چاہتا ہے۔ مدد لگا دی ہے' باڑ باندھ دی ہے اس دو گز چوڑے صحن میں رات کو سوتا ہوں۔ پاڑ کیا ہے۔ پھانسی کی ٹکٹکی نظر آتی ہے۔ منشی حبیب اللہ ذکا نے ایک کوٹھی کا پتہ دیا تھا جو شہر سے باہر ہے۔ سوار ہوا گیا۔ مکان تو پر فضا تھا۔ احاطہ بھی چمن اور گل بوٹے بھی۔ لیکن حویلی اور محلسرا الگ الگ نہ تھے۔ ڈیوڑھی بھی نہ تھی بس ایک پھاٹک تھا۔ کمرے اور کوٹھڑیاں خاصی۔ کمروں کے ساتھ کولیکوں میں چینی مٹی کے چولھے سے بھی بنے تھے۔ معلوم ہوا بیت الخلاء ہیں۔ صاحبان انگریز ان پر چڑھ کر بیٹھتے ہیں۔ ایک زنجیر کھینچتے ہی پانی کا تریڑا آتا ہے' سب کچھ بہا لے جاتا ہے عجیب کارخانہ ہے۔ میں نے کرایہ پوچھا اور جھٹ کہا پانچ روپے منظور۔ ایک روپیہ زائد کی کچھ ایسی بات نہیں لیکن مالک مکان کا کارندہ ہنسا اور بولا' پانچ روپے نہیں مرزا صاحب! پانچ سو

روپے۔ وہ مردک سر ہلا کر کہنے لگا۔ پانچ سو روپے کرایہ ہے اور دو سال کا پیشگی چاہیے۔ یعنی بارہ ہزار دو اور آن اترو یہاں چتلی قبر کے پاس دھنا سیٹھ نے حویلی ڈھا کر اونچا اونچا ایک مکان بنایا ہے۔ دو' دو تین تین کمرے کے حصے ہیں۔ کلیان کو بھیجا تھا خبر لایا کہ وہ پگڑی مانگتے ہیں۔ میں حیران ہوا۔ تمہیں معلوم ہے میں پگڑی عمامہ کچھ نہیں باندھتا۔ ٹوپی ہے ورنہ ننگے سر۔ لوہادو والوں کے ہاں سے جو پگڑی پار سال ملی تھی۔ وہ نکلوا کے بھجوا دی کہ دیکھ لیں اور اطمینان کر لیں کہ مکان ایک مرد معزز کو مطلوب ہے۔ وہ الٹے پاؤں آیا کہ یہ دستار نہیں چاہیے۔ رقم مانگتے ہیں دس ہزار کرایہ اس کے علاوہ ساٹھ روپے مہینا بڑے بدمعاملہ لوگ ہیں۔ آخر پگڑی پھر صندوق میں رکھوا دی۔ یہ مالک مکان کل آتا ہے۔ دیکھیے کیا کہتا ہے۔

میرن صاحب جب آئیں۔ شوق سے آئیں۔ لیکن یہ گانے بجانے والوں میں نوکری کا خیال ہمیں پسند نہیں۔ میں نے دیکھا نہیں لیکن معلوم ہوا ہے کہ ایک کوٹھی میں مشینیں لگا کر اسکے سامنے لوگ گاتے ناچتے ہیں۔ شعر پڑھتے ہیں تقریریں کرتے ہیں۔ لوگ اپنے گھروں میں ایک ڈبا سامنے رکھ کر سن لیتے ہیں بلکہ اب تو اور ترقی ہوئی ہے۔ ایک نیا ڈبہ انگریز کاریگروں نے نکالا ہے اس میں ایک گھنڈی ہے اسے مروڑنے پر سننے کے علاوہ ان ارباب نشاط کی شکلیں بھی گھر بیٹھے دیکھ سکتے ہیں۔ ایک خط ان میں سے ایک جگہ سے میرے پاس بھی آیا تھا۔ آدمی تو بیبیں کے ہیں لیکن انگریزی میں لکھتے ہیں۔ بہت دنوں رکھا رہا۔ آخر ایک انگریزی خواں سے پڑھوایا۔ مشاعرے کا دعوتنامہ تھا۔ کچھ حق الخدمت کا بھی ذکر تھا۔ میں تو گیا نہیں۔ دوبارہ انہوں نے یاد کیا نہیں۔ چونکہ پیسے دیتے ہیں سرکاروں اور درباروں کی جگہ ان لوگوں نے لے لی ہے جس کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں۔ میرن صاحب مجھے جان سے عزیز لیکن ان لوگوں سے سفارش کیا کہہ کر کروں کہ سید زادہ ہے؟ اردو فارسی کا ذوق رکھتا ہے؟ اسے نوکر رکھو۔ اچھا رکھ بھی لیا تو کاپی نویسوں میں رکھیں گے۔ میر مہدی یہ وہ زمانہ نہیں۔ اب تو انگریزی کی پوچھ ہے یا پھر سفارش چاہیے۔

خط لکھ لیا اب محلسرا میں جاؤں گا۔ ایک روٹی شوربے کے ساتھ کھاؤں گا۔ شہر کا عجب حال ہے۔ باہر نکلنا محال ہے۔ ابھی ہرکارہ آیا تھا خبر لایا کہ ہڑتال ہو رہی ہے۔ ہاٹ بازار سب بند۔ لڑکے جلوس نکال رہے ہیں' نعرے لگا رہے ہیں۔ کبھی کبھی لڑکوں اور برقندازوں میں جھڑپ بھی ہو جاتی ہے۔ میر مہدی معلوم نہیں اس شہر میں کیا ہونے والا ہے۔ میرن کو وہیں روک لو۔ میر سرفراز حسین اور میر نصیرالدین کو دعا۔

نجات کا طالب

غالب

شوکت تھانوی

تفہیم غالب

مرزا غالب کے ایسے مسلم الثبوت استاد نے جو غزل ہفتوں کی کاوش کے بعد کہی ہو گی اس کی شرح یہ خاکسار محض چند منٹوں میں پیش کر رہا ہے اس سے قبل کہ شرح پیش کی جائے' ضرورت اس کی ہے کہ ہم اخلاق و شرافت کے نام پر معذرت خواہی کریں تاکہ حشر کے دن دوسرے گریبان پکڑنے والوں میں مرزا غالب ایسے بزرگ نہ ہوں۔ لہٰذا سب سے پہلے معذرت ضروری ہے' ملاحظہ فرمایئے اور گواہ رہیے کہ ہم معذرت خواہ ہو چکے تھے۔
(شوکت تھانوی)

معذرت

منظور ہے گزارش احوال واقعی
اپنا جان حسن طبیعت نہیں مجھے

کچھ شاعری ذریعہ عزت نہ تھی انہیں
کچھ شرح لکھنا باعث عزت نہیں مجھے

آزاد ہوں میں' مرا مسلک ہے صلح کل
غالب سے کیا کسی سے عداوت نہیں مجھے

میں شرح لکھ رہا ہوں شرف کچھ یہ کم نہیں
مانا' اسد کا مرتبہ' شوکت نہیں مجھے

غالب پہ اور مجھ کو ہو تنقید کا خیال
یہ تاب' یہ مجال' یہ طاقت نہیں مجھے

میرا مزاج آپ ہے جام جہاں نما
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں اور شرح لکھتا' مگر اس سے مدعا
جز ارتکاب ذوق ظرافت نہیں مجھے

یوں ہی سا اک مذاق تھا جو شرح بن گیا
دیکھا کہ چارہ غیر اشاعت نہیں مجھے

اس میں جو آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے ترک عقیدت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں' جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

حرکت تو یہ بری ہے پہ نیت بری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول کا شوکت خدا گواہ
سچ بولتا ہوں گو کہ یہ عادت نہیں مجھے

اس معذرت کے بعد معلوم یہ ہوتا ہے کہ ایک بار سر سے اتر گیا اور اب شرح پیش کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا لہٰذا ملاحظہ فرمایئے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں۔

دھمکی سے مر گیا جو نہ باب نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد تھا

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک رنگ روٹ فوج میں بھرتی ہونے کے لیے پہنچا صاحب نے اس کو فوج کی ملازمت کے نشیب و فراز سمجھا کر اس کی جرات کا امتحان لینا چاہا اور ریوالور اس کے کوٹ کی آستین میں رکھ کر لبلبی دبادی ایک دھماکے کی آواز کے ساتھ گولی کوٹ کی آستین کو پار کر گئی' مگر یہ جوان اٹینشن رہا صاحب نے اس کی یہ جرات دیکھ کر فوراً پروانہ تقرر دے دیا اور ساتھ ہی کچھ روپیہ دیا کہ اس کا کوٹ بنوالو' تمہارا کوٹ خراب ہو گیا ہے۔

رنگروٹ نے کہا۔

"اور حضور پتلون کے دام"

صاحب نے کہا:

"پتلون کیسا؟"

رنگروٹ نے نہایت سادگی سے کہا

"حضور وہ بھی تو خراب ہو گیا۔"

اسی مضمون کو مرزا صاحب نے اپنے اس مطلع میں پیش کیا ہے کہ عشق کی جنگ جوئی کے لیے پتلون کے دام مانگنے والوں کی ضرورت نہیں بلکہ ان مردوں کی ضرورت ہے جو عشق و محبت کی نبرد آزمائی میں جنرل فرانکو ثابت ہوں۔

شعر ملاحظہ ہو۔

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا

اس شعر میں صرف ایک لفظ "کھٹکا" ایسا ہے جس نے شعر کو ذرا پڑھے لکھوں کے سمجھنے کے قابل بنا دیا ہے اگر اسی لفظ کو بدل کر یہ شعر یوں کہہ دیا جاتا تو کسی شرح کی ضرورت نہ تھی۔

تھا زندگی میں موت کا پرزہ لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا

یعنی موت کے بعد انسان کا رنگ زرد ہوتا ہے مگر میں نے زندگی ہی میں موت کا ایسا پرزہ فٹ کرا لیا کہ اس کی وجہ سے زندگی میں رنگ زرد نظر آتا تھا اور مرنے کے بعد تبدیلی رنگ کے جھگڑے سے نجات مل گئی۔ اب اس قسم کے پرزے شاید نہیں ملتے معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اس قسم کے باکمال انجینئر بھی تھے جو ایسے حیرت انگیز پرزے اور کھٹکے بنایا کرتے تھے۔

دوسرا شعر ہوا ہے۔

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعہ خیال ابھی فرد فرد تھا

یہ شعر وہ ہے جس کا ایک عام فہم ایڈیشن کسی لوور پرائمری شاعر نے پیش کیا ہے۔

سنبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر
ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

لیعنی بچے کے پیر پالنے ہی میں نظر آجاتے ہیں میں ابھی کمسن ہی تھا اور خیالات میں کوئی شعور بھی پیدا نہ ہوا تھا کہ مجھ کو وفا کے طریقے سمجھنے اور وفاکیش بننے کا شوق پیدا ہو گیا اور عقل کی خامی کے زمانے میں بلوغ کی یہ علامت پیدا ہو چکی تھی۔ اور سنئے فرماتے ہیں۔

دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب
اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

اس شعر کو سمجھنے کے لیے ممکن ہے آپ اینٹلس دیکھنا شروع کر دیں کہ دنیا کے نقشے میں دریائے خوں کہاں ہے۔ مگر اس جستجو میں آپ کو کامیابی نہ ہوگی بلکہ اس شعر کو سمجھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ دل اور جگر کو اسپین کے دو پرفضا مقامات تصور کر لیجئے اس کے بعد اسپین کی چونکاں اور تباہ کن خانہ جنگی کو پیش نظر رکھ کر اس شعر کا مفہوم سمجھئے کہ اسپین کے ان دو مقامات کے درمیان جہاں آج خون کی موجیں نظر آتی ہیں پہلے وہ دل فریب منظر جلوۂ گل بھی اس کے سامنے ہیچ نظر آتا تھا، شعر سنئے کیا خوب کہا ہے۔

جاتی ہے کوئی کش مکش اندوہ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

اس شعر میں جو مضمون مرزا صاحب نے پیش کیا ہے وہ اب تک پیدا ہونے والے تمام شعراء اپنے اپنے الفاظ میں کہہ چکے ہیں اور آئندہ الفاظ میں ضرور ادا کریں گے خواہ پھر اس کو سرقہ سمجھا جائے یا اخلاق" لوگ اس کو توارد کہہ دیں۔

بہرحال اس شعر کو وہ حضرات بخوبی سمجھ سکتے ہیں جو بھوت پریت اور آسیب وغیرہ کے قائل ہیں۔ شاعر نے یہی کہا ہے کہ عشق وہ بلا ہے جو کبھی پیچھا نہیں چھوڑتی چنانچہ سینہ سے دل تو نکل جاتا ہے مگر دل کا درد بھوت بن کر کراہتا ہے اور وہی اس آسیبی خلل میں مبتلا رکھتا ہے جس کو عرف عام میں عشق کہتے ہیں اس سلسلہ میں کسی متروک شاعر کا ایک شعر یاد آ گیا۔ ملاحظہ ہو۔

یہ محبت بھی کہیں اے بندہ پرور جائے ہے
جائے بھی ہے یہ تو عاشق کو مٹا کر جائے ہے

مگر ہمارا تو خیال یہ ہے کہ پہلے تو محبت کا بھوت عاشق پر سوار رہتا ہے اور جب عاشق بقول شاعر کے مٹ جاتا ہے تو وہ خود بھوت بن کر شاعروں اور افسانہ نگاروں پر سوار ہو جاتا ہے مگر تاریخ شاہد ہے کہ اس قسم کے بھوت مورخین کے سر پر بھی سوار ہوئے ہیں۔ آخری شعر بھی کیا خوب ہے۔

احباب چارہ سازی وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورو تھا

احباب نے دیکھا کہ بیچارہ جنگلوں کی خاک اڑاتا پھرتا ہے دامن گریباں میں ہے اور گریباں دامن کے اشتراک عمل سے لنگوٹی کی قائم مقامی کے لیے تیاریاں کر رہا ہے خط پڑھا ہوا ہے۔ ناخن البتہ جدید فیشن کے مطابق لمبے ہیں۔ پریشاں بالوں پر ایک دوسرا بیابان نشوونما حاصل کر رہا ہے سر کیا ہے جوؤں کی دنیا کا گلوب ہے۔ ڈارون کی بندر والی تھیوری میں انقلاب ہوا ہے اور اب معلوم ہوا ہے کہ انسان خواہ پہلے بندر رہا ہو یا لنگور مگر اس کا مستقبل یہ ہے کہ اگر عشق ہو گیا اور عشق نے جنون کی کیفیت پیدا کی تو وہ ریچھ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

بہرحال دوست کا یہ حال دیکھ کر احباب دوستی یہی کر سکتے تھے' کہ اس کو پکڑ کر جیل بھجوا دیں۔ دوستی کی یہ شان بظاہر دشمنی نظر آتی ہے مگر بعض بیماریاں ایسی ہوتی ہیں جن کا علاج ہی یہ ہے کہ دوا کے بجائے زہر دیا جائے' اسی قسم کے علاج بالمثل میں سے ایک علاج یہ بھی ہے کہ احباب جنگل سے اپنے سر پھرے دوست کو پکڑ لائے اور جیل میں بند کر دیا تاکہ اس کا تحفظ ہو سکے اور وہ جنگلوں کی خاک نہ اڑائے مگر اس کا کیا علاج کہ آپ زنداں میں بیٹھے ہیں۔ اور خیال ہے کہ بیابان کی خاک اڑا رہے ہیں مگر اس خیالی بیاباں نوردی کے مفرت رساں تمام اثرات بھی خیالی ہی ہو سکتے ہیں مگر عالم تصور میں دیکھتے کیا ہیں کہ ایک جھاڑی سے ہم اور دوسری جھاڑی سے ایک شیر نکلا۔ ہم ٹھہرے عاشق اور وہ بھی وحشی ہمارے لیے شیر ہو یا بھیڑ سب برابر ہیں۔ لہٰذا اس کو بھی اپنا محبوب سمجھ کر اس کی دم پر گندھی ہوئی چوٹی کا گمان کر کے جو ذرا چھوا تو اس قاتل نے جفا کاریاں شروع کر دیں اور صرف نگاہوں کے تیر یا ابرو کے شمشیر سے زخمی ہی نہیں کیا بلکہ محض اپنے دست ناز سے پسلیاں چیر کر دل نکال لیا اور کھا گیا عاشق نار کو محض منہ کا مزہ بدلنے کے لیے خیالی بیاباں نوردی کا یہ خیالی واقعہ اگر خیالی نہ ہوتا بلکہ سچ مچ ایسا ہی ہوا ہوتا تو کس قدر افسوس کا مقام تھا۔ یہ صحیح ہے کہ وحشی دوست کو زنداں میں رکھ کر خیالی صحرا نوردی سے باز نہیں رکھا جا سکتا مگر یہی کیا کم ہے کہ اس سلسلے کے تمام افسوسناک واقعات بھی خیالی ہی ہوتے ہیں اب مقطع سنئے اور ایک آہ بھر کر ذرا جھوم تو جائیے یا سر دھنئے یا کم سے کم زانو تو پیٹ ہی لیجیے۔

یہ لاش بے کفن اسد خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

آج کل آزادی کا مفہوم نئی روشنی کے مردوں اور عورتوں سب نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ آفتابی غسل ہوا کریں۔ مغربی ممالک میں تو بحال صحت اور انحطاط غیرت و حمیت کے لیے اس قسم کے بہت سے کلب قائم ہیں جن میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ لباس ایک قطعاً" غیر ضروری اور غیر فطری چیز ہے اور فطری لباس میں آج کا انسان زیادہ خوش زیادہ بشاش زیادہ ہلکا پھلکا۔ زیادہ آزاد اور زیادہ نظر فریب رہنے کے علاوہ اخلاقی طور پر زیادہ مضبوط رہ سکتا ہے۔ اس کے دلائل بے شمار پیش کئے جاتے ہیں اور اگر انسان ان کے جوابی دلائل پر غور کرنے کی فکر تھوڑی دیر بھی کرے تو یقیناً" وہ بھی جامہ سے باہر ہو سکتا ہے خواہ کیسا ہی مقدس اور ستر پوش قسم کا انسان کیوں نہ ہو کہا جاتا ہے کہ لباس اگر کوئی ضروری چیز ہوتا تو انسان ماں کے پیٹ سے سوٹ پہنے ہوئے پیدا ہوتا مگر چونکہ انسان کے لیے

جوئے شیر لانے میں معروف رہا۔ ادھر انداز خسروانہ رنگ لایا اور شیریں اپنے شیریں لبوں سمیت دہلیز غیر پہ جا بیٹھی۔ فرہاد سے بڑھ کے سرگشتہ خمار رسوم و قیود ہوں کہ اب بھی زندہ ہوں۔ اس در کا پتھر بننے کا حوصلہ بھی نہیں ہے اور دربان تو مجھے دیکھتے ہی کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ سرکار کی نوکری کا طوق گلے میں نہ پڑا ہوتا تو اس سے رہ و رسم استوار کرنے کا کچھ سامان کرتے۔ پاۓ مکتوب کی آرزو بھی دم توڑ چکی ہے۔ گویا قطع تعلق کی نوبت آ پہنچی ہے۔

دیار غیر میں مقید ہوں۔ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ تبادلوں سے قدغن اٹھنے پر اس عالم تنہائی سے چھوٹ جاؤں گا۔ بہر تقدیر بعد رہائی تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ مگر میری ڈھٹائی سے تو تم بخوبی واقف ہو۔ میں پھر بھی بعد نجات کوچہ جاناں ہی کو سدھاروں گا۔ زاویہ زنداں میں پڑا ہوں۔ اس کو یاد کرتا ہوں، تصاویر بتاں دیکھتا ہوں اور ہجر میں وصال کے مزے لیتا ہوں۔ یہ تو امر واقعہ ہے کہ ہجر کیسا بھی لذت آمیز کیوں نہ ہو اس نے بڑے بڑوں کے کس بل نکال دیے ہیں۔ زمانے کی دربدری اور انگشت حنائی کے انمٹ خیال نے مجھے بھی بستر سے لگا دیا ہے۔ **طبیبوں** کے بس کی بات ہے نہ مجھ میں ان کی منت کشی کی سکت۔ ابن مریم دوسرے آسمان پہ جا بیٹھا ہے۔ مداوائے غم دل ہو تو بھلا کیونکر ہو۔ اس وقت نہ کھانے کا ہوش ہے، نہ کھانے کو کچھ ہے۔ غم محبوبی کھاتا ہوں، ہجر کے آنسو پیتا ہوں، سو اس طرح جیتا ہوں۔ معلوم نہیں ہجر کے آنسوؤں کی لذت و کثرت ہے یا لوگوں کی نظر کا دھوکہ، جو بھی ہمدم دیرینہ ملتا ہے، بے اختیار کہہ اٹھتا ہے "بڑی زبردست صحت بنا رکھی ہے، بھئی کیا کھاتے ہو؟ کہ چہرے پہ ہریالی براجمان ہو گئی ہے اور بدن کی پامالی بھی رفع ہو چکی ہے۔" اب ان بے خبروں کو دل چیر کے کون دکھائے؟ نادان اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے کہ۔

شیو کرنے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے!

تمہاری درازی زبان کے لیے دعاگو
دید کا مشتاق
اشفاق
صبح چہار شنبہ ۲۷ جمادی الثانی ۱۴۱۳ھ

ضیا اکرام

مرزا غالب بنام آئی ایم ایف

بحضور فیض گنجور - صدر الصدور
عالی جاہ - عالم پناہ - سرکار والا مقام
جناب صدر بین القومی توشہ خانہ مالیات

حضور والا!

بندہ عاجز و ناچیز کہ نام اس کا دار فانی میں اسد اللہ خاں المتخلص بہ "غالب" تھا لیکن زندگی بھر ستم ظریفی حالات سے مغلوب" رہا۔ گاہے اہل علم و فن کی محفلوں میں مطلوب رہا' گاہے کوتوال شہر کے ہاتھوں معتوب رہا۔ الغرض حالات کی صلیب پر مصلوب رہا۔

بعد از انتقال' عالم بالا میں ایک مقام موسومہ بہ "اعراف" قیام پذیر ہے۔ انتظار طویل ہے ولے ناگزیر ہے۔ ہنوز بارگاہ ایزدی سے اس امر کا فیصلہ ہونا باقی ہے کہ اس گناہ گار کے گناہوں سے صرف نظر کیا جاوے اور یہ جنت کے کسی گوشے میں جگہ پاوے۔ خدا نہ کرے کہ دوزخ کا ایندھن بنانے کا حکم صادر ہو۔ ایک بار جل بجھوں تو خیر تھی لیکن دوزخ کی لامحدود زندگی الامان و الحفیظ۔ احباب جانتے ہیں کہ مرنے سے نہیں کتراتا تھا فقدان راحت سے گھبراتا تھا۔ سو یہی عالم آج بھی ہے۔

اپنے تئیں تو رحمت حق سے بے حد پر امید ہوں لیکن اپنی زندگی میں یہ بھی کہہ چکا ہوں۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

بہرحال ابھی انتظار ہی انتظار ہے۔ بنا بریں دل مشکل پسند بے قرار ہے۔

خوبی حالات یہ ہوئی کہ عالم فانی سے نقل مکانی کرکے آنے والے شاعروں کے لیے مقام اعراف پر الگ خیمہ لگا دیا گیا ہے۔ مختلف رنگ و نسل' زبان اور ملک و ملت کے شاعر ہیں کہ جوق در جوق چلے آتے ہیں۔ بہت سوں کی تو زبان بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ چند ایسے بھی ہیں کہ سرے سے شاعر ہی نہیں لیکن شاعر ہونے پر اصرار کیے جاتے ہیں۔ برصغیر ہندوستان جسے اب پاکستان و ہندوستان کہا جاتا ہے کے "تازہ واردان بساط ہوائے دل" کے ذریعے حالات سے آگاہی ہوتی رہتی ہے۔ بندہ کو یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ دنیا سے فرنگی کا راج اور

سرکار انگلشیہ کا اثر و رسوخ ختم ہو چکا اور اب امریکہ بہادر کا رعب و دبدبہ ہے یا پھر ان اداروں کا جن کے سروں پر امریکہ بہادر کا سایہ عاطفت ہے۔ بندہ کو موصولہ تازہ ترین اطلاعات کے بموجب حکومت امریکہ کے بعد والا جناب ورخشاں بیش از آفتاب و ماہتاب' امید آخری و چارہ ساز عمائدین ممالک پسماندہ آپ کا ادارہ ہی راجوں مہاراجوں عمائدین سلطنت اور شاہان وقت کو کٹھ پتلیوں کی طرح نچانے پر قادر و مامور ہے۔ اور سب کے سب اشاروں پر ناچنے پر مجبور ہیں۔

سرکار والا! بندہ معافی کا خواستگار ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں ہمیشہ خطوط میں اختصار کا ڈھنڈورا پیٹا لیکن جب مقطع میں سخن گسترانہ بات آ پڑے۔ عرض مدعا تمہید طولانی کے بغیر ممکن نہ ہو اور داد رسی کی امید عرض حال مکمل و مفصل کے بغیر بر نہ آتی ہو تو تفصیل سے لکھنا پڑتا ہی ہے۔

یہ بندہ عاجز والد اور چچا کے انتقال کے بعد بالخصوص ۱۸۰۶ء سے انتہائی سرعت اور کسمپرسی کی زندگی گزارتا رہا ہے۔ اپنی فکری و ذہنی صلاحیتیں شاعری جیسے فصل لاحاصل پر صرف کیں۔ جسمانی صلاحیتوں کو ملیامیٹ کرنے کے لیے دختِ رز سے دوستی بڑھائی۔ رہی سہی کمائی جوئے میں لٹائی۔ عمر بھر ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارپردازان اور حکومت انگلشیہ کی ہندوستان کو عرضداشتیں پیش کرتا رہا کہ وہ میرے اجداد کو توسل سے مجھے ملنے والی پنشن کے مقدمہ کا جلد فیصلہ کریں لیکن وائے نصیب کبھی کبھار تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ نظرِ عنایت ہوئی کہ ہوئی لیکن معاملہ پھر دفتری موشگافیوں میں الجھا رہا یعنی :

خیال وصل کو اب آرزو جھولا جھلاتی ہے
قریب آنا دل مایوس کے پھر دور ہو جانا

یہاں تک کہ اس بندہ بے مراد کا دنیا میں وقت آخر آن پہنچا۔

مقدمہ کی مکمل مثل دہلی کے ایک عجائب گھر میں شاید دیکھنے والوں کے لیے سامان عبرت بنی ہوئی ہے۔ اس کی نقول پر اصلی یا نقلی ہونے کے جھگڑے ہیں۔ طرح طرح کے دعویدار پیدا ہوتے رہتے ہیں اور وہ بھی کاغذ کے ان پرزوں کے جو شاید ابھی کچھ عرصہ اور مجھے دنیا میں نشانہ عبرت بنانے کے لیے موجود ہیں لیکن مجھ غریب پر کرم کے دروازے مسدود ہیں۔

جناب والا کے وسائل و اختیارات سے ذرا بھی بعید نہیں کہ اس مثل کو طلب فرما دیں اور یہ فوری طور پر خدمت عالیہ میں پیش نہ ہو۔ بصورت دیگر بھی عزیزی تسلیم احمد تصور نے وہ پوری مثل جو "جاگیر غالب" کے نام سے موجود تھی' رسالہ "سورج" کے غالب نمبر کی جلد اول میں شائع کر دی ہے۔ اس میں قلمی عرضداشتوں کے عکس مسودات اور اردو تراجم سبھی موجود ہیں۔

التماس ہے کہ جناب والا برصغیر میں قائم اپنے کسی ذیلی دفتر کی وساطت سے اس مثل یا عزیزی تسلیم احمد تصور سے اس کی نقول منگا لیں۔ بلکہ میں آج ہی تسلیم احمد تصور کو ایک علیحدہ خط کے ذریعے تاکید کیے دیتا ہوں کہ وہ مکمل مثل کی عکسی نقل آپ کی خدمت میں بھیج دیوے۔

تسلیم بھی خوب آدمی ہے۔ زر کثیر صرف کر کے اور نقصان اٹھا کر رسالہ "سورج" کا غالب نمبر شائع کیا۔ ایک جلد آ چکی ہے۔ دوسری جلد کے لیے شاید وسائل کا فقدان ہے لیکن یہ بندہ خدا اس حرکت سے باز آنے والا نہیں۔ ہر چند کہ بڑا مالی بحران ہے۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ نہ میری اس سے رشتہ داری' نہ کوئی قریبی تعلق لیکن شعر و ادب کے حوالے سے قائم ناتا کو یہ شخص کتنی اہمیت دیتا ہے اور میرے فن اور اس پر کیے گئے کام کو محفوظ کرنے کی دھن میں مگن ہے۔

والا جاہ! یہ تو محض جملہ معترضہ تھا۔ مدعائے مقصود یہ ہے کہ آپ خوب جانتے ہیں کہ انگریزی حکومت اب اس قابل نہیں کہ اس مقدمہ کا فیصلہ کر سکے یا مالی طور پر داد رسی کر سکے۔ آپ جو دنیا کے ان داتا بنے بیٹھے ہیں میری مثل اپنے پاس منگا کر میرے بقایا جات واگزار کرنے کا فیصلہ فرما دیں۔ ہر چند کہ میں عالم بالا میں سکہ رائج الوقت دنیا سے بے نیاز ہوں لیکن میرے بقایا جات کا نصف عزیزی تسلیم احمد تصور کو دے دیا جائے تا کہ اس کا وہ نقصان کسی حد تک پورا ہو سکے جو اس نے میری محبت میں غالب نمبر شائع کر کے اٹھایا ہے اور ایک روگ اپنی جان کو لگایا ہے۔

ایک چوتھائی رقم میرے مزار کی حالت بہتر بنانے پر صرف کر دی جائے۔ یہ کام اگر جناب والا کے ادارہ کی نگرانی میں ہی ہونا ہے تو اس پر وہ کڑی شرائط لاگو نہ کی جاویں جن کا غلغلہ عرش معلیٰ تک سنا جاتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کے ادارہ کی شرائط کو پورا کرتے کرتے اس عاجز و مجبور کی قبر مزار کی بجائے ناچ گھر کا منظر دکھائی دے۔ بقایا ایک چوتھائی رقم میرے کلام کے دوسری زبانوں میں تراجم کی اشاعت پر صرف کی جائے تا کہ صورت حال باقی نہ رہے :

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے

بندہ اس لطف و عنایت کے لیے آپ کا ہمیشہ ممنون احسان رہے گا۔

خوشنودی کا طالب
غالب
معرفت داروغہ اعراف
در عرش بریں

ڈاکٹر عبادت بریلوی

غالب کے خطوط کی ادبی اہمیت

غالب ایک عظیم شاعر ہی نہیں تھے ایک نثر نگار کی حیثیت سے بھی ان کی عظمت مسلم ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے نثر کی طرف کسی باقاعدگی کے ساتھ توجہ نہیں کی۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کا بہت کم وقت اس پر صرف کیا۔ لیکن اس کے باوجود نثر کی جو روایت انہوں نے قائم کی' اور جو مخصوص لہجہ اس میں پیدا کیا وہ اپنی جگہ ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں غالب کی شاعری ہی کی طرح دلکشی اور دل آویزی نظر آتی ہے ----- اور دلکشی اور دل آویزی کو پیدا کرنے میں صرف فنی اور جمالیاتی پہلو ہی کا ہاتھ نہیں ----- موضوع اور مواد کا پہلو بھی اس میں برابر کا شریک ہے ---- جس طرح ان کی شاعری میں ان دونوں پہلوؤں کا ایک حسین اور متوازن امتزاج ملتا ہے' اسی طرح ان کی نثر میں بھی یہ دونوں پہلو ایک دوسرے کے ساتھ گلے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں ----- اور یہی صورت حال اس کو دلکش اور دل آویز بناتی ہے۔

اردو نثر میں غالب نے جو سرمایہ چھوڑا ہے وہ صرف ان کے خطوط پر مشتمل ہے ------ یہ خطوط بھی کسی منصوبہ کے ماتحت نہیں لکھے گئے ہیں' اور کوئی واضح ادبی تجربہ بھی ان کی تخلیق کا باعث نہیں بنا ہے ----- وہ تو نجی خطوط ہیں اور ان میں صرف نجی اور ذاتی باتیں دوسروں تک پہنچائی گئی ہیں ----- اس لیے بظاہر ان خطوط میں وہ خصوصیات پیدا نہیں ہو سکتی تھیں' جن کی بدولت نثر میں ایک ادبی اسلوب رونما ہوتا ہے ----- لیکن غالب کی عظیم اور پہلو دار رنگا رنگ اور پرکار شخصیت نے ان نجی خطوط میں ادبی نثر کی وہ شان پیدا کر دی ہے جس کی حیثیت اپنی جگہ منفرد ہے ----- یہ خطوط اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں جگہ جگہ ادبی تجربے کی بہت اچھی مثالیں ملتی ہیں ----- اور اس تجربے کو غالب کے مخصوص مزاج نے پیدا کیا ہے ----- ان کے مزاج کی نمایاں ترین خصوصیت یہ تھی کہ وہ عام زندگی کی معمولی معمولی باتوں کو ادبی تجربے میں ڈھال دیتے تھے۔ بات یہ ہے کہ غالب کی شخصیت صحیح معنوں میں ایک ادبی شخصیت تھی اس لیے ان کا احساس ہمیشہ ایک ادبی تجربہ کا روپ اختیار کر لیتا تھا ----- اس کے لئے انہیں کوئی کاوش نہیں کرنی پڑتی تھی ------ کسی قسم کا منصوبہ نہیں بنانا پڑتا تھا ----- ان کی ذہنی کیفیت ہی کچھ ایسی تھی کہ جو کچھ وہ محسوس کرتے اور سوچتے تھے اس کا اظہار کچھ اس طرح ہوتا تھا کہ اس میں ادبی تجربے کے تمام عناصر کی جھلک نظر آنے لگتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہ خطوط نجی ہونے کے باوجود ایک ادبی رنگ و آہنگ رکھتے ہیں --- غالب کی ادبی شخصیت نے انہیں ادبی تخلیق کا اعلیٰ نمونہ بنا دیا ہے۔

یہ خطوط چونکہ نجی اور ذاتی ہیں اور انہیں اس احساس کے ساتھ نہیں لکھا گیا ہے کہ ان کا شمار ادبی تخلیق کے تحت ہو گا پڑھنے والے انہیں ادبی تخلیق کے معیاروں کو سامنے رکھ کر دیکھیں گے۔ اور ان سے نثر کی روایت میں کوئی اضافہ ہو گا۔ اس لئے ان میں تکلف اور تصنع کا شائبہ تک نہیں ہوتا ----- برخلاف اس کے بڑی بے ساختگی اور برجستگی نظر آتی ہے ----- ان میں تو اس حسن کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں جو زندگی میں بغیر کسی کوشش اور کاوش کے از خود پیدا ہوتا ہے ----- ظاہر ہے کہ اس حسن میں انسان صناعی اور دست کاری شامل نہیں ہوتی ----- بلکہ فطرت کا ہاتھ اسے سنوارتا اور نکھارتا ہے۔ اور زندگی خود اس کی مشاطگی میں پیش پیش رہتی ہے ----- غالب کے یہ خطوط، اسی حسن کی دولت سے مالا مال ہیں ----- ان میں بڑی وسعت اور کشادگی ہے۔ بڑی ہی شگفتگی اور شادابی ہے ----- بڑی ہی سادگی اور صفائی ہے۔ بڑی ہی رنگینی اور پرکاری ہے ----- یہ زندگی سے بھرپور ہیں ----- ان میں بڑی جولانی کا احساس ہوتا ہے ----- اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں صناعی نام کو بھی نہیں ہے ----- ان کی تخلیق میں تو صرف فطرت کا ہاتھ ہے ----- یہ صرف خطوں کی طرح لکھے گئے، لیکن انہوں نے اعلیٰ درجے کی ادبی تخلیق کا روپ اختیار کر لیا ----- اور اس طرح اردو کی ادبی نثر میں بیش بہا اضافے کا باعث ہے۔

ان سے قبل نہ تو اردو میں خطوط ہی لکھے جاتے تھے اور نہ اس میں نثر لکھنے ہی کی کوئی عظیم روایت موجود تھی ----- غالب کے خطوط سے ایک تو اردو میں خطوط نویسی کے فن کا آغاز ہوا اور دوسرے اردو میں باقاعدہ آسان اور سادہ ادبی نثر لکھنے کی ایک روایت قائم ہوئی ----- لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں ان تمام پہلوؤں کا نہایت حسین آئینہ نظر آتا ہے جو ادبی تخلیق کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں ----- موضوع اور مواد، اسلوب اور فن، دونوں اعتبار سے ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے ----- ادبی تخلیق مجموعی طور پر انہیں دونوں پہلوؤں کے امتزاج کا نام ----- انہی دونوں سے اس کی تشکیل ہوتی ہے ----- غالب کے خطوط میں انہی دونوں پہلوؤں نے مل کر ادبی تخلیق کا رنگ و آہنگ پیدا کیا ہے۔

غالب کے ان خطوں کا سب سے اہم موضوع تو غالب کی رنگا رنگ اور پہلو دار شخصیت کے مختلف گوشوں کی ترجمانی اور عکاسی ہے ----- ان خطوں میں غالب نہ صرف چلتے پھرتے اور ہنستے بولتے نظر آتے ہیں بلکہ جو کچھ انہوں نے محسوس کیا ہے، جو کچھ ان پر بیتی ہے، جو کچھ وہ سوچتے رہے ہیں، جن معاملات پر انہوں نے غور کیا ہے، جو نتائج نکالے ہیں، اور جن خیالات و نظریات کی توضیح و تشریح کی ہے ان سب کی تفصیل و جزئیات ان خطوں میں موجود ہے ----- یہ گویا غالب کی انفرادی داخلی زندگی اور ان کے آس پاس کی اجتماعی خارجی زندگی کے نشیب و فراز کے مرقع ہیں ----- غالب نے زندگی کے ان تمام پہلوؤں کو شدت کے ساتھ محسوس کر کے پیش کیا ہے ----- اس لئے ان میں جذبے کی اخلاص مندی نظر آتی ہے، اور ساتھ میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کو دیکھنے اور جاننے کا شعور بھی کار فرما دکھائی دیتا ہے ----- پھر ان میں اس بات کی وضاحت بھی موجود ہے کہ غالب نے زندگی کے ان پہلوؤں کو کس زاویہ نظر سے دیکھا، اور ان پر اس کے کیا اثرات ہوئے ----- اس کے

علاوہ غالب کی جو دلچسپیاں تھیں' ان کا جو مذاق تھا' جو معیار انہیں عزیز تھے' جن قدروں کی ان کے نزدیک اہمیت تھی' ان سب کی تفصیل بھی ان خطوں میں جگہ جگہ مل جاتی ہے ------ غالب نے ان خطوں میں اپنا ذکر کیا ہے ---- اپنے عزیزوں' رشتہ داروں اور دوستوں کی زندگیوں کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی ہے ---- اپنے زمانے کی عام سیاسی اور معاشرتی' معاشی اور اقتصادی اور ثقافتی زندگی کے مختلف معاملات و مسائل کو پیش کیا ہے ------ ان میں انسان اور اس کی جذباتی زندگی کے ان گنت پہلوؤں کی تصویرکشی کی ہے- اس کی مسرتوں اور شادمانیوں' محرومیوں اور ناکامیوں کا بیان بھی جگہ جگہ ملتا ہے ----- ایسے ہی مقامات پر ان خطوط میں آفاقیت کا رنگ و آہنگ پیدا ہو جاتا ہے! اور وہ باتیں جو غالب نے صرف اپنے اور اپنے بعض عزیزوں اور دوستوں کے بارے میں کہی ہیں' ان کا اطلاق تمام انسانوں پر ہو سکتا ہے ------- اسی لیے ان کی یہ باتیں ہر انسان کو اپنی باتیں معلوم ہوتی ہیں' اور وہ اس آئینہ میں اپنی ہی صورت دیکھتا ہے-

ایک خط غالب نے چودھری عبدالغفور کو لکھا ہے جس میں اپنی زندگی کے نشیب و فراز کی وضاحت کی ہے اور اپنی پریشانی اور زبوں حالی کا نقشہ کھینچا ہے لیکن اس میں اس زمانے کی اجتماعی زندگی کی زبوں حالی کی تفصیل نسبتاً" زیادہ نمایاں ہوتی ہے- لکھتے ہیں:---------

"میں پانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا- نو برس کا تھا کہ چچا مرا- اس کی جاگیر کے عوض میرے اور میرے شرکاء کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں دس ہزار روپے سال مقرر ہوئے' انہوں نے نہ دیئے' مگر تین ہزار روپے سال- اس میں سے خاص میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپے سال' میں نے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاہر کیا- کول بروک صاحب بہادر ریذیڈنٹ دہلی اور اسٹرلنگ صاحب بہادر سکریٹر گورنمنٹ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر- ریذیڈنٹ معزول ہوئے- سکریٹر گورنمنٹ ناگاہ مر گئے- بعد ایک زمانے کے بادشاہ دہلی نے پچاس روپے ماہانہ مقرر کیا- ان کے ولی عہد نے چار سو روپے سال دیئے- ولی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مرگئے' واجد علی شاہ کی سرکار سے بہ صلہ مدح گستری پانچ سو روپے سال مقرر ہوئے- وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جئے- یعنی اگرچہ ابھی تک جیتے ہیں مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی- دلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی- ایسے طالع مربی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں- اب جو میں والی دکن کی طرف رجوع کروں' یاد رہے کہ متوسط یا تو مرجائے گا یا معزول ہو جائے گا- اگر یہ دونوں امرواقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع ہو جائے گی- اور والی شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا- اور احیا" اس نے یہ سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی' اور ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے --- اے خداوند بندہ پرور! ------ یہ سب باتیں وقوعی اور واقعی ہیں-"

ایک اور خط میں یوسف مرزا کو اپنا حال لکھا ہے۔ اس سے بھی اس زمانے کی عام معاشی افراتفری پر روشنی پڑتی ہے---- لکھتے ہیں:---

"میری جان! خدا تیرا نگہبان ----- جانتے ہو کہ علی کا بندہ ہوں ----- اس کی قسم کبھی جھوٹی نہیں کھاتا------ اس وقت کلو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں۔ اس کے بعد نہ کہیں سے قرض کی امید ہے اور نہ کوئی چیز رہن و بیع کے قابل ہے ---- اگر رام پور سے کچھ آیا تو خیر' ورنہ اناللہ و انا الیہ راجعون۔"

غالب کے بیشتر خطوط کا یہی انداز ہے ---- بظاہر ان میں انہوں نے اپنا رونا رویا ہے لیکن ان میں سلطنتوں کے مٹنے کا ذکر بھی ہے۔ شاہان وقت کے معزول ہونے کا بیان بھی ہے۔ جاگیروں کے ختم ہونے کی تفصیل بھی ہے ---- ان سب باتوں کو پیش کر کے غالب نے در حقیقت اس زمانے کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی اس تمام افراتفری اور انتشار کو پیش کیا ہے جس کے محرک یہ حالات تھے ------ یہ خطوط صرف غالب ہی کا نہیں' اس پورے دور کا مرثیہ ہیں۔ کیونکہ اس وقت صرف غالب ہی ان حالات سے دوچار نہیں تھے ----- ساری زندگی کا یہی حال تھا---- غالب کے سر سے یہاں جو موج خوں گذرتی ہوتی معلوم ہوتی ہے' وہ ان کے زمانے میں ہر انسان کے سر سے گذر رہی تھی ----- غرض خطوط میں گہرے سماجی شعور کے ساتھ وہ آفاقیت بھی نظر آتی ہے' جس کو ایک انسانی زاویہ نظر ہی پیدا کر سکتا ہے --- غالب انسانی زندگی کے بہت بڑے نباض اور اس کے مختلف پہلوؤں کے بہت بڑے مزاج داں تھے ----- ان کے پاس ایک ذہن تھا----- وہ محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ سوچ بھی سکتے تھے ------- اسی لیے ان خطوط میں ایک ذہن بھی ملتا ہے ----- غالب کی بڑائی اس میں ہے کہ انہوں نے اس ذہنی اور فکری پہلو کو احساس اور جذبے کے ساتھ کچھ اس طرح ہم آہنگ کیا ہے کہ ان میں ادبی موضوع کی شان پیدا ہو گئی ہے۔

یہ خطوط جمالیاتی اور فنی اعتبار سے بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں ----- ان میں نہ صرف خطوط نویسی کے فن کا ایک نیا اور اچھوتا انداز ملتا ہے' بلکہ ادبی نثر کی بھی ان میں ایک نئی صورت شکل نظر آتی ہے---- یہ خطوط سیدھے سادے انداز میں لکھے گئے ہیں' اسی لئے ان میں ایک اچھوتا پن نظر آتا ہے ---- غالب کے سامنے صرف فارسی خطوط نویسی کی روایت تھی' اور اس میں تکلف اور تصنع کا پہلو غالب تھا----- وہ بندھے ٹکے اصولوں کے ماتحت لکھے جاتے تھے۔ ان کے القاب و آداب تک معین تھے ----- خط لکھنے والے کے لئے ان کا توڑنا' یا ان حدود سے باہر نکلنا مشکل تھا------- عبارت آرای کو اس روایت میں حسن سمجھا جاتا تھا----- صناعی کو لوگ اس کا زیور خیال کرتے تھے ۔ اور ایک عام تصور یہ تھا کہ اس سے حسن کو چار چاند لگ جاتے ہیں ------ غالب نے اس روایت سے بغاوت' اور سب سے پہلے سیدھے سادے انداز میں خطوط لکھنے کی داغ بیل ڈالی ----- القاب و آداب تک کو انہوں نے خیرباد کہہ دیا----- عبارت آرائی ختم کر دی ----- اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے خطوط میں سعدی کا حسن پیدا ہو گیا----- یہ حسن تکلف سے بری ہے اور اس قبائے گل

میں گل بوٹہ نہیں ہے ----- لیکن اس سادگی کے خیال نے غالب کے احساس و فکر میں آزادی کا احساس پیدا کیا ہے۔ اور ان کے تخیل کو جولانیاں دکھانے کے مواقع فراہم کیے ہیں۔ اسی لیے ان خطوط میں ایسی گل کاریاں نظر آتی ہیں جن کو احساس اور تخیل کے موقلم نے بنایا ہے ----- ان میں بڑی شگفتگی اور شادابی ہے ---- یہ زندگی سے بھرپور ہیں اور ان میں بڑی ہی رنگینی اور رعنائی کا احساس ہوتا ہے ----- ان میں جگہ جگہ ڈرامائی شان بھی ملتی ہے۔ لیکن یہ ڈرامائی شان صرف مکالمہ نگاری ہی کے ہاتھوں پیدا نہیں ہوتی ---- غالب کا حیاتی مزاج اس پہلو کو ان خطوط میں پیدا کرتا ہے ---- ویسے مکالمہ نگاری بذات خود ان خطوط کی ایک اہم خصوصیت ہے' اور اس پہلو نے انہیں زندگی سے زیادہ قریب کیا ہے' اور ان میں جولانی کی لہر دوڑائی ہے ---- غالب نے ان خطوط میں آسان اور سادہ ادبی نثر لکھنے کا ایک اہم اور قابل قدر تجربہ کیا ہے ----- اس نثر میں سادگی اور صفائی ہے ----- روانی اور بہاؤ ہے ----- اس میں مجموعی طور پر بڑی شگفتگی اور شادابی کا احساس ہوتا ہے ----- اس میں سادگی کا حسن بھی ہے اور حسن کی سادگی بھی ----- لیکن اس کے باوجود یہ رنگین اور پرکار نظر آتی ہے ------ یہ کوشش اور کاوش کی پیداوار نہیں ہے ----- اسی لیے اس میں کاری گری کا پہلو نمایاں نہیں ہوتا ------ اس کی تشکیل تو خیال اور موضوع کے ہاتھوں ہوئی ہے ------- اسی لیے اس میں فطرت کا حسن نظر آتا ہے ---- اور حسن کی فطرت بھی ------!

غالب ایک عظیم ادبی شخصیت کے مالک تھے ----- یہ خطوط ان کی اسی ادبی شخصیت کا آئینہ ہیں' اور ان میں اس شخصیت کے خدوخال اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ بے نقاب نظر آتے ہیں ----- یہی وجہ ہے کہ غالب کی شاعری کی طرح ان کی ادبی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے اور غالب کو ایک عظیم ادبی شخصیت بنانے میں ان کا بھی بڑا ہاتھ ہے!

ڈاکٹر تحسین فراقی

غالب کے فارسی مکاتیب ——— ایک جائزہ

یوں تو لکھنے والے کی ذات اور اس کے زمانے کی تفہیم کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں اور ان میں ایک بہت اہم ذریعہ ادب بھی ہے لیکن خود ادب کی اصناف میں مکتوبات وہ اہم ترین ماخذ ہیں جن سے کسی شخصیت کے تصورات' تعصبات' میلانات' توہمات' تجربات اور اس کے عہد کی فکری' مجلسی اور معاشرتی زندگی وغیرہ کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں مشاہیر کے خطوط کی ایک لمبی فہرست ہے جن کا مطالعہ چشم کشا بھی ہے اور بعض صورتوں میں عبرت انگیز اور حیرت خیز بھی۔ اردو ادب کے حوالے سے مکاتیب غالب نے جو جو شہرت حاصل کی' مکتوبات کا کوئی دوسرا ذخیرہ اس کا ہم پلہ نہیں۔ لیکن جس طرح (غالب کے تمام انتباہات اور اشارات کے باوجود) ان کی فارسی شاعری جلب توجہ میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکی' اسی طرح ان کے فارسی مکاتیب بھی غالب کے طالب علموں کے کامل التفات سے بہت حد تک محروم رہے ہیں۔ حالانکہ یہ خطوط بہت سے حوالوں سے غالبیات کا نہایت قیمتی سرمایہ ہیں اور حیات غالب کا اہم ترین ماخذ۔

جہاں تک غالب کی اردو مکتوب نگاری کا تعلق ہے' اس کا عرصہ بیس بائیس سال پر پھیلا ہے جب کہ ان کے فارسی مکاتیب کا عرصہ ۱۸۲۶ء سے ۱۸۶۸ تک کو محیط ہے۔ گویا ان کی فارسی مکتوب نگاری ان کی اردو مکتوب نگاری پر مقدم ہے اور اس لحاظ سے اس عہد کے واقعات اور سوانح غالب کا موزوں ترین ماخذ ہے۔ پھر اردو مکتوب نگاری پر اسے نہ صرف زمانی تقدم حاصل ہے بلکہ زمانی پھیلاؤ بھی' کیونکہ فارسی مکتوب نگاری کا عرصہ کم و بیش بیالیس سال کا احاطہ کرتا ہے۔ علاوہ ازیں ایک اعتبار سے ان فارسی مکاتیب کے ایک قابل لحاظ حصے کو ان کے مخصوص اردو اسٹائل کا پیشرو اور بنا کار بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ مراسلے کو مکالمہ بنانے کا منشور غالب نے اردو میں مکتوب نگاری کے آغاز سے تقریباً بیس سال پہلے ہی طے کر لیا تھا۔

غالب کے یہ فارسی خطوط ان کی جس تصنیف میں شامل ہیں' وہ ان کی نثر فارسی کی اولیں کتاب ہے۔ میری مراد "پنج آہنگ" سے ہے۔ یہ گویا غالب کی پانچ آوازیں ہیں۔ آہنگ اول میں مکتوب نگاری کے آداب سے بحث ہے۔ دوسرا آہنگ فارسی زبان کے مصادر اور اصطلاحات وغیرہ پر مشتمل ہے۔ حصہ سوم میں میرزا کے دیوان کے منتخب اشعار ہیں۔ آہنگ چہارم تقاریظ و مقدمات پر مشتمل ہے اور آخری اور اہم ترین حصہ ان کے فارسی مکاتیب پر مشتمل ہے۔

یہاں یہ عرض کرتا چلوں کہ پیش نظر مضمون میں مجھے "پنج آہنگ" کا تفصیلی تعارف نہیں کراتا۔ مجھے

استخوان شماری یعنی عددی تحقیق کا کوئی شوق نہیں۔ آپ کو بھی شاید اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی کہ پنج آہنگ کا نسخہ اول ۱۳ سطری مسطر کے متوسط سائز پر تھا یا ۲۳ سطری مسطر کے غیر متوسط سائز پر۔ نہ ہی میں اس کتاب کے تعارف میں وزیر الحسن عابدی یا کسی اور مرحوم غالب شناس کا بارہ بارہ صفحات کا اقتباس درج کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں کیونکہ یہ کام "غالب کا علمی سرمایہ" کھنگالنے والے بس "ممتاز" غالب شناسوں ہی کو زیبا ہے۔ مجھے تو محض "پنج آہنگ" کے آخری حصے کے مکاتیب فارسی کے ذریعے اور "نامہائے فارسی غالب" (مرتبہ ترمذی) کے توسط سے غالب کی شخصیت کے اس نہاں خانے کی چند جھلکیاں آپ کو دکھانی ہیں جو سلسبیل و آتش سے عبارت ہے اور ان کی مجمل سوانح' پسند و ناپسند' سوز و ساز' تصورات و تعصبات اور ان کے عہد کی مجلسی' تمدنی اور کسی قدر تاریخی صورت حال کے چند پہلو دکھانا ہیں اور بس۔ ان اوراق میں بعض ایسے حقائق' تصورات اور بیانات بھی ہیں جنہیں غالب نے اور موقعوں پر بھی نثر یا شعر میں برتا اور بیان کیا ہے۔ میں ایسے چند موقعوں کی نشاندہی بھی کروں گا۔ غالب کے یہ فارسی مکاتیب ان کے تصور زیست' تصور عشق' تصور شعر' ان کی صاف گوئی' خونابہ فشانی' سیاہ روزی' جاہ طلبی' بے تکلفی (کہیں کہیں تکلف و تصنع بھی) وسعت علم' شعور انفرادیت' آزادہ روی' لاابالی پن اور جذبے کی فراوانی کے مظہر ہیں۔ کولن ولسن نے لکھا تھا کہ تم بحران اور حوادث سے صرف نظر کرکے ان سے بچ نہیں سکتے۔ غالب نے اپنی زندگی کے بحرانوں اور حادثوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہیں دیکھا اور ان مکتوبات کے ذریعے ہمیں دکھایا ہے۔ تفصیل آگے آتی ہے۔

غالب نے "پنج آہنگ" میں ایک سے زیادہ موقعوں پر اپنی عالی نسبی کا ذکر کیا ہے۔ مثال کے طور پر "گل رعنا" کی ترتیب کے محرک' کلکتے کے مولوی سراج الدین احمد (۱) کے نام خط میں اپنے نسبی و سوانحی احوال کا ذکر اس طرح کرتے ہیں اور دیکھئے کیسی صاف گوئی سے کرتے ہیں :

> "ترک نژاد ہوں اور میرا سلسلہ نسب افراسیاب اور پشنگ سے ملتا ہے۔ میرے بزرگ سلجوقی خاندان سے تھے اور ان کے عہد میں فوج کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے تھے۔ جب ان پر زوال آیا تو ایک گروہ تو ذوق رہزنی و غارت گری کا شکار ہوا اور دوسرے گروہ نے زراعت کا پیشہ اختیار کیا۔ پھر میرے بزرگ توران کے شہر سمرقند میں بس گئے۔ میرے جد اعلیٰ نے اپنے باپ سے روٹھ کر ہندوستان کا قصد کیا اور لاہور میں معین الملک کے ساتھ رہے۔ جب معین الملک کی بساط دولت الٹ گئی تو وہ دہلی آئے اور ذوالفقار الدولہ میر نجف خاں کے مصاحب بنے۔ میرے والد عبداللہ بیگ خاں شاہجہاں آباد میں پیدا ہوئے۔ اور اس کے بعد اکبر آباد میں سکونت اختیار کی۔ میری عمر پانچ برس کی تھی کہ ان کا سایہ میرے سر سے اٹھ گیا اور ان کے بعد چچا مرزا نصراللہ بیگ خاں بڑے ناز و نعم سے میری پرورش کرنے لگے لیکن بھائی کے مرنے کے پانچ سال بعد وہ بھی چل بسے اور میں اس

بھری دنیا میں تماشہ گیا----- (۲)

اقتباس خاص طویل تھا' میں نے اس کا محض ایک حصہ نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ غالب نے اپنے فارسی اشعار میں بھی اپنے سلجوقی النسل اور تورانی الوطن ہونے کا فخریہ ذکر کیا ہے' مثلاً

غالب از خاک پاک تورانیم — لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی — بسترگان قوم پیوندیم
ایبکیم از قبیلہ اتراک — در تمامی ز ماہ دہ چندیم

لیکن آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس اجمال پر نثر کی تفصیلات اور جزئیات کس قدر فائق ہیں۔

غالب کی دل سوزی اور انسان دوستی سے ہم سب واقف ہیں۔ ان کا تصور سلامت روی' ان کا تصور عشق اور تصور دانش و فرہنگ' سب ان کے تصور زیست کے تابع ہیں۔ انھیں انکبار اور زیردست آزادی سے نفرت ہے۔ رائے بجھمل کھتری سے ایک موقع پر اختلاف کرتے ہوئے وہ دانشوری کی جو تعریف متعین کرتے ہیں وہ عہد جدید کے "دانشوروں" کے لیے ایک لمحہ فکریہ ہے' ایک تازیانہ ہے :

"آپ نے لکھا ہے کہ فلاں شخص کی روش حکیمانہ ہے اور کار دنیا سے آگہی رکھتا ہے۔ مجھے اس پر سخت تعجب اور افسوس ہوا۔ صبا رفتار گھوڑوں پر سوا ہو کر آگے آگے خلق کو دوڑانا' لباس فاخرہ زیب تن کر کے اکڑنا' مرغن غذاؤں سے پیٹ کو بھر لینا' شہوت سے مغلوب ہو کر رہ جانا' گناہوں پر نادم نہ ہونا' کیا یہ حکیمانہ روش ہے۔ دانش ور تو ان کو کہیں گے جو مکروہات دنیا سے منہ موڑ کر اپنے خدا سے لو لگائے رہیں اور بیکسوں کی دستگیری سے دریغ نہ کریں۔" (۳)

یہ بات معلوم ہے اور مشاہدے میں آئی ہے کہ کائنات کا یہ سارا سلسلہ آکل و ماکول کا سلسلہ ہے۔ عقیدہ' عقل' عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں۔ "کون و فساد" کا مرکب عنفی بذات خود اس جدلیاتی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ رومی نے کہا تھا۔

ہر خیالے را خیالے می خورد
فکر ہم بر فکر دیگر می چرد

اور پھر یہ بھی فرمایا۔

ہر بنائے کہنہ کاباداں کنند
اول آں بنیاد را ویراں کنند

یہی ناگزیر اور سنگین حقیقت غالب نے منشی نبی بخش کے نام ایک خط میں اس سلیقے اور حکیمانہ مثالوں سے واضح کی ہے کہ زیست کرنے کا سلیقہ آئینہ ہو جاتا ہے اور حوادث کو سہارنے اور سمجھنے کی ہمت اور حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے" فکر گواہ اور مشاہدہ شاہد ہے کہ آرائش کے لیے تراش خراش اور نمود کے

لیے میقل ضروری ہے۔ سرو کو جب تک چھانٹا نہیں جاتا' سہی قد نہیں ہوتا۔ شراب جب تک بھٹی سے نہیں گزرتی' کیف آگیں نہیں ہوتی۔ قلم تراشنے کے بعد قلم بنتا ہے اور کاغذ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہی خط کی شکل اختیار کرتا ہے۔ بس اس کارگاہ کون و فساد میں کوئی چیز بغیر تعمیر اور کوئی تعمیر بغیر تخریب کے ممکن نہیں۔" (۴)

اس آئین روزگار کو غالب نے زیر نظر مکاتیب میں اور کئی مقامات پر واضح کیا ہے۔ یہی آئین روزگار دراصل خودی اور بے خودی کی بظاہر متعارض مگر باطن واحد متجانس حقیقت کا دوسرا نام ہے۔ اثبات وجود کے لیے غالب امین الدولہ آغا علی خاں کے نام ایک خط میں ذرہ و خورشید' پروانہ و شمع' بلبل و گل اور کاہ و کہربا کی مثالیں دے کر اپنی معنی شناسی اور ادراک کا کھرا ثبوت دیتے ہیں۔

جہاں تک غالب کے تصور عشق کا تعلق ہے' وہ مصری کی مکھی بننے کے قائل ہیں۔ شہد کی مکھی بننے کے نہیں۔ اپنے تحرک اور تازہ جوئی کی مثالیں وہ حسی سطح پر فراہم کرکے اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہیں' شعر میں بھی اور نثر میں بھی' مثلاً

ع شوق است کہ در وصل ہم آرام ندارد
در دہر فرو رفتہ لذت نتواں ماند
بر قند نہ بر شہد نشیند مگس ما

اس شعر کی تفسیر نثر میں دو موقعوں پر غالب کے یہاں ملتی ہے۔ "پنج آہنگ" میں مظفر حسین خاں کو ان کی محبوبہ کی وفات پر خط (فارسی میں) لکھا ہے۔ اس سے مماثل پیرایہ حاتم علی بیگ مہر کے نام اردو خط میں نظر آتا ہے۔ پہلے مظفر حسین خاں کے نام خط کا ایک مختصر ٹکڑا ملاحظہ کریں۔ اس ٹکڑے سے غالب کی حکایت جوانی کا اجمال اور ماتم حسن میں سیہ پوشی کا احوال بھی سامنے آتا ہے اور یہ موقف بھی کہ جب جسم نازنین رہا نہ "زلف خم بہ خم رہی" پھر جان گھلانے سے فائدہ؟

"بہ روزگار جوانی روی از موی سیاہ تر داشتم و شور سودائی پری چہرگاں در سر۔ مرا نیز زہراب ایں بلا بہ ساغر ریختہ اند و بر رہ گزار' جنازہ دوست غبار از نہاد شکیم برانگیختہ۔ روز ہائے روشن بہ ماتم دلدار پلاس نشین و کبود پوش بودہ ام و شبہائے سیاہ بہ خلوت غم' پروانہ شمع خموش بودہ ام۔ ہم خوابہ کہ وقت وداع از رشک بہ خدائیش نتواں سپرد' چہ بیداداست تن نازنیش را بہ خاک سپردن و محبوبہ کہ از بیم چشم زخم نرگس بہ گلگشت چمنش نتواں برد' چہ ستم است نعش او را بہ گورستان بردن --- بایں ہمہ کہ غم مرگ دوست جانگزا است --- خدارا دریں سموم خیز وادی دور نروند و خود را دریں جگر گداز غمزدگی بہ شکیب آموزگار شوند۔" (۵)

اس کے بعد انہیں وہی سبق دیتے ہیں جو حاتم علی بیگ مہر کو خاصے شوخ اسلوب میں

اس طرح دیا تھا : "کیسی اشک فشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی، آزادی کا شکر بجا لاؤ، غم نہ کھاؤ اور اگر ایسی ہی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی منا جان سہی۔"

مظفر حسین خاں کے لیے پیرایہ نصیحت، نسبتاً" سنجیدہ ہے مگر روح کے اعتبار سے کاملاً" ویسا ہی :

"دیکھو بلبل سی عاشق زار ہر کھلنے والے پھول کا منہ چوم کر نغمہ سرا ہوتی ہے۔ پروانے جیسا جاں نثار ہر شمع روشن کا طواف کرتا ہے۔ چمن میں پھول بہت اور انجمن میں شمعیں ہزاروں ہیں۔ پھر ایک پھول کے مرجھا جانے اور ایک شمع کے بجھ جانے کا غم کیوں کرو اور صرف ایک آرزو کے اسیر ہو کر کیوں رہ جاؤ۔ بہارستان رنگ و بو سامنے ہے۔ تماشا کرو۔" (۶)

اب آیئے ان کے تصور شعر کی جانب۔ غالب نے اپنے ایک شعر میں شمع سخن کے فروغ کامل کے لیے دل گداختہ کی شرط لگائی تھی۔ فارسی شاعری میں بھی بعض مقامات پر اپنے کلام کے فروغ میں اس عنصر کی نشاندہی کی ہے۔ "پنج آہنگ" میں مولوی سراج الدین احمد کے نام ایک خط میں بھی اس حقیقت کا اعادہ کیا ہے جس سے تصور شعر کے باب میں ان کے رسوخ کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایسے دو تین مقامات ملاحظہ کریں جن سے ان کے تصور شاعری کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے :

۱ - "تازہ غزل بھیجئے کے بارے میں آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر، مگر دل کی خونابہ فشانی اور فکر کی جگر کاوی کے بغیر غزل موزوں نہیں ہوتی۔" --- بنام سراج الدین احمد صفحہ ۹۳۔

۲ - "اگر ہرزہ سرائی کو اپنا شعار بنا لوں تو دنیائے ادب مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی۔ فن سخن میں جنگ جوئی میرا پیشہ نہیں --- میں جانتا ہوں کہ شعر عالم قدس کی متاع گرانمایہ ہے۔ اس کو اس طرح اس کے بلند مقام سے گرا دینا کسی دانشور کو زیب نہیں دیتا۔ --- بنام مظفر حسین خاں صفحہ ۱۲۸۔

۳ - "مجھے نہ فن تاریخ گوئی سے کوئی دلچسپی اور نہ معمیٰ کو چھوڑ کر محض لفظی صنعت گری میرا شیوہ ہے۔" (۷) (بنام جان جاکوب) صفحہ ۹۰۔

شعر کو عالم قدس کی متاع گرانمایہ قرار دینے کا تصور سراسر روایتی ہے اور افلاطون سے لے کر مشرق کے صائب اور خود غالب سب تک سلسلہ در سلسلہ پہنچا ہے۔ افسوس ہے تو اس کا کہ عالم قدس کی اس متاع گرانمایہ کو خریدار میسر نہ آیا چنانچہ دیگر نثری و شعری مقامات کے ساتھ ساتھ "پنج آہنگ" بھی غالب کے تاسف اور احساس ناقدری کے اظہار سے خالی نہیں۔ کس دل سوزی سے لکھتے ہیں :

"وائے میری سوختہ سامانی --- آزادوں کی طرح درویشانہ زندگی گزار رہا تھا کہ ذوق

سخن نے رہزنی کی اور مجھے یہ سمجھایا کہ آئینے کو چمکا کر صورت معنی کو چمکانا بھی بڑا کام ہے ۔۔۔ مجبوراً میں نے اپنا سفینہ بحر شعر میں ڈال دیا جو بحر نہیں سراب ہے اور قلم میرا علم بن گیا مگر شاید زمانے میں دیدہ وری تھی ہی نہیں یا تھی تو میرے حصے کی نہیں تھی۔ میرے کلام کی ندرت زمانے سے چھپی رہی۔ (۸)

اسی بات کو برنگ دگر اپنے ایک فارسی شعر میں یوں بیان کیا۔

تا ز دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن
ایں مے از قحط خریداری کہن خواہد شدن!

غالب کے ان فارسی مکاتیب سے جہاں ایک طرف غالب کے میلان و مزاج کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے وہیں ان کے معاصرین و مشاہیر کے حالات سے بھی آگہی ہوتی ہے اور اس عہد کے مخصوص رجحانات اور واقعات کا بھی بخوبی پتہ چلتا ہے۔ اردو مکاتیب کی طرح ان کے ان فارسی مکاتیب سے بھی ان کی سوختہ سامانی اور سیاہ روزی کا اندازہ ہوتا ہے' جس نے ان کی شخصیت میں آخر آخر شدید احساس فنا پیدا کر دیا تھا۔ جس مومن نے خود اپنے بارے میں کبھی کہا تھا کہ۔

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس
آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

انہی سے کج رفتاری چرخ اور نیرنگی فلک کا شکوہ اس طرح کرتے ہیں :

"آپ کا طالع گفتار روشن رہے۔ کل فکر جنوں پیشہ ستاروں سے بر سرپیکار تھی اور میں اپنی قسمت کو برا بھلا کہہ رہا تھا کہ یہ چار مصرعے تیغ دو دم کی طرح صورت زبان پر آئے جنہیں میں نے گردش آسمان کی نذر کر دیا۔

آنم کہ بہ پیمانہ من ساقی دہر ریزد ہمہ درد دروو تلخابہ زہر
گبزر ز سعادت و نحوست کہ مرا ناہید بہ غمزہ کشت و مریخ بہ قہر

ذرا سادگی دیکھئے کہ ابھی احساس کی یہ تلخی مٹی نہیں ہے کہ دل کا تقاضا ہوا کہ اگر سال کی تقویم پوری لکھی جا چکی ہو تو اک نظر اس کو بھی دیکھئے اور اپنے خورشید کی تابانی پر ناز کیجئے۔ دل بھی کیا نادان ہے کہ اس سیہ روزی کے باوجود ستاروں سے خوش بختی کی آس لگائے بیٹھا ہے۔ اس کی مثال اس کمسن بھولی بھالی کنیز کی سی ہے جو عید سے پہلے ہی ترنگ میں آ کر گانے لگی کہ عید آئی' عید آئی۔ اس پر کسی نے کہا کہ نیک بخت اگر عید رمضان ہی میں آ گئی ہے تو تیرے حصے کی ادھ جلی روٹی تو کہیں نہیں گئی۔" (۹)

غالب کے شعری و نثری کارناموں کے غائر مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ سیر و سفر کے سلسلے میں ان کے یہاں کشش و گریز دونوں طرح کے میلان پائے جاتے ہیں۔ ایک طرف "جادہ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو" کہہ کر وہ ہوس سیر و تماشا کی نفی کا اعلان کرتے ہیں اور دوسری جانب منشی نبی بخش حقیر کے نام اپنے ایک اردو مکتوب

میں جو ترپن برس کی عمر میں لکھا گیا' وہ جو کچھ لکھتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عشق ہی میں نہیں اقامت میں بھی شد کی کمی بنا پسند نہیں کرتے تھے۔

"کیا کروں عجب طرح سے زندگی بسر کر رہا ہوں۔ میرے حالات سراسر میرے خلاف طبیعت ہیں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ چلتا پھرتا رہوں۔ مہینہ بھر وہاں اور دو مہینے وہاں اور صورت یہ کہ گویا مشکیں بندھا ہوا پڑا ہوں کہ ہرگز جنبش نہیں کر سکتا۔" (۱۰)

غالب کے یہاں ایک دفعہ تو یہ "حلقہ اسیری" موئے آتش دیدہ" ثابت ہوا اور وہ بلاد کانپور' لکھنؤ' باندہ' الہ آباد اور بنارس سے ہوتے ہوئے وارد کلکتہ ہوئے اور متصل ڈیڑھ پونے دو سال تک وہاں قیام کیا۔ مثنوی "چراغ دیر" اور "آشتی نامہ" (باد مخالف) اس سفر کی یادگاریں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس متصل بے چینی اور سیماب پائی کے اسباب کیا ہیں۔ ڈاکٹر اجمل نے اپنے ایک قابل قدر مضمون "غالب کا ذوق سفر" میں شہر کو مادر عظمیٰ کی علامت قرار دے کر اور پھر اس سے فرار حاصل کرنے کو مادر عظمیٰ کے سلبی پہلو سے فرار قرار دے کر ایک گہری نفسیاتی صداقت بیان کی ہے۔ ان کے نزدیک یہ فرار دراصل اپنی شخصیت کے بنیادی عین سے فرار ہے۔ مادر عظمیٰ سے یہ فرار خانہ بدوشی کی وہ کیفیت پیدا کرتا ہے جس میں انسان ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھ سکتا۔ میرا خیال ہے کہ اس ضمن میں غالب کے نسلی اثرات سے بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل غالب کے سے ماوراالنہری ترک ایک کے خمیر میں تحرک' تازہ جوئی اور سیماب پائی کا عنصر شامل تھا اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ

خون آبائی رگ تن سے نکل سکتا نہیں

غالب دہلی میں تھے تو اسے زنداں قرار دے کر بیڑی زاویہ زنداں میں چھوڑ کر بلاد شرقیہ کو سدھارے تھے۔ یہ سفر بقول ڈاکٹر اجمل مادر سلبی سے بھاگ کر مادر ایجابی تک رسائی حاصل کرنے کے مترادف تھا۔ مگر جب واہمہ شکنی ہوئی تو غالب کو دیار کلکتہ میں دلی کی یاد ستانے لگی۔ شاید یہ متصل بے قراری روح انسانی کا مقدر ہے۔ رومی نے لکھا ہے کہ بہار کے موسم میں افراد کا بنوں اور باغوں کی جانب لپکنا دراصل اس باغ بہشت سے محرومی کی ایک لاشعوری تلافی کے مترادف ہے جس سے روح انسانی شعور کی اولیں کرن کے پھوٹنے کے نتیجے میں جدا ہوئی تھی۔ نفسیاتی اصطلاح میں اس باغ بہشت کو مادر عظمیٰ کہہ لیجئے۔ بہرحال غالب کے قارئین سے مخفی نہیں کہ پنشن کے قضیے نے مسلسل پندرہ برس تک انہیں مبتلائے عذاب رکھا۔ حتیٰ کہ ملکہ عالیہ انگلستان کے حضور درخواست گزاری کا بھی کچھ فائدہ نہ ہوا۔ غالب کا سفر کلکتہ بظاہر اسی مسئلے کے حل کے لیے اختیار کیا گیا تھا۔ اس کاوش' قضیے اور سفر و حضر کی جملہ اہم تفصیلات غالب کے فارسی اور اردو مکاتیب میں ملتی ہیں۔ "پنج آہنگ" میں یہ تفصیلات مولوی سراج الدین احمد' شیخ امیر اللہ سرور' ناخ اور میر سید علی خاں بہادر عرف میاں حضرت جی کے نام خطوں میں ملتی ہیں۔ میرے خیال میں اگر کوئی باہمت غالب دوست چاہے تو اردو مکاتیب کے علاوہ "پنج آہنگ" اور نامہائے فارسی غالب (ترمذی) وغیرہ کی مدد سے بلاد

مشرق میں سفر غالب کے حوالے سے بعض نہایت دلچسپ جزئیات پر مبنی ایک عمدہ سفر نامہ مرتب کر سکتا ہے۔ "نامہائے فارسی غالب" کے ایک مکتوب سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں الہ آباد ہرگز پسند نہیں آیا تھا۔ وہ اسے خرابہ قرار دے کر اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔ اس شہر سے نالاں اس لیے ہیں کہ "نہ درو دوائے و در خور بیمار وہ نہ متاعی شائستہ مردم"۔ بزم مرد و زنش ناپیدا و مرد آزرم از طبع پیرو جوانش گم۔" (۱۱)

الہ آباد کی ہجو کہنے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ سن کر کہ بدوں کو نیکوں کے طفیل بخش دیتے ہیں' یہ شہر ہزار امید واری بلکہ صد ہزار خواری کے ساتھ بنارس کے پہلو میں مقیم ہے۔ اور اس نے گنگا کو بہ طریق شفاعت اس کی طرف بھیجا ہے۔ اس روسیہ کی طرف دیکھنا بنارس کی طبع نازک پر گراں ہے مگر گنگا سفارشی ہے۔

خیرحال اگلے دن غالب اس "دیو لاخ کو چھوڑ کر ساحل گنگا پر پہنچے اور وہاں سے سوئے بنارس روانہ ہوئے۔ اب شہر بنارس کا قصیدہ مدحیہ شروع ہوتا ہے۔ قاضی عبدالودود نے قیاس کیا ہے کہ غالب کی بنارس میں طویل اقامت کا سبب کسی "بالا بلندے' مژگاں درازے" سے تعلق خاطر رہا ہوگا۔ مالک رام کا بھی ایسا ہی خیال ہے اور انہوں نے ثبوت میں غالب کا ایک شعر بھی پیش کر دیا ہے جس میں ایک بت کاشی کی توجہ طلبی کی حسرت صاف جھلکتی ہے۔

کاش کاں بت کاشی در پذیردم غالب
"بندہ تو ام" گویم گویدم ز ناز "آری"

غالب اس شہر کو "ارم آباد" قرار دیتے ہیں اور بتان کاشی کے حسن و جمال اور ان کی رنگینی و عنائی کا ایک ایسا دلپذیر اور جاذب نظر نقشہ کھینچتے ہیں کہ ان کا قلم وجد کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس نثری تفصیل کے ساتھ اگر بنارس پر کہی گئی مثنوی "چراغ دیر" کو آمیخت کر لیا جائے تو حسن دو آتشہ ہو جاتا ہے۔ اصل فارسی اقتباس ملاحظہ ہو :

"خوشا سواد بنارس کہ اگر از فرط دلنشینی سویدای عالمش خوانم بجاست و حبذا اطراف آں معمورہ کہ اگر از جوش سبزہ و گل بہشت روئی زمینش دانم رواست ---- گنگ اگر سر بہ پایش نہ سودی' در نظرہا اینقدر گرامی نبودی' و خورشید اگر بر دیوار و درش نہ گزشتی (بدیں گونہ فروزاں) و تابناک نہ گشتی۔" (۱۲)

تماشا گاہ بنارس انہیں اس قدر مرغوب خاطر ہوئی کہ غربت کا غم فراموش ہو گیا۔ سفر بنارس کا یہ سب سے بڑا فیضان ہے کہ اس نے فارسی شعر کو "چراغ دیر" جیسی زندہ اور لافانی مثنوی کا تحفہ دیا۔ (۱۳)

تعالی اللہ بنارس چشم بددور بہشت خرم و فردوس معمور
سروش پائے تخت بت پرستاں سراپائش زیارت گاہ مستاں
بخوش پرکاری طرز وجودش ز دہلی ی رسد ہر دم درودش
بیا اے غافل از کیفیت ناز نگاہے بر پری زادانش انداز
ہمہ جانہائے بے تن کن تماشا نہ دارد آب و خاک ایں جلوہ حاشا
نہاد شاں چوں بوئے گل گراں نیست ہمہ جانند' جسمے درمیاں نیست
تبسم بسکہ دروہا طبیعی است دہن ہا رشک گلہائے ربیعی است
ز رنگیں جلوہ ہا غارت گر ہوش بہار بستر و نوروز آغوش (۱۴)

نیاز فتح پوری نے غالب کی فارسی مثنویات میں تھا اس مثنوی کو ان کے "اعادہ شباب" کی برہان قرار دیا ہے۔ مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ یہ مثنوی ان کے اعادہ شباب کی نہیں' عین شباب کی برہان ہے۔ غالب کی عمر اس وقت ۲۹ تیس برس سے زیادہ نہ تھی۔

بنارس سے براہ عظیم آباد غالب بالآخر کلکتہ پہنچے۔ انہیں زیادہ تردد کیے بغیر رہنے کے لیے دس روپے کرائے پر ایک مکان مل گیا جس میں میٹھے پانی کا کنواں بھی تھا۔ کلکتے میں غالب نے کم و بیش ڈیڑھ دو سال قیام کیا۔ وہ اپنا دل اور آنکھیں اسی شہر سرور و رعنائی میں چھوڑ آئے تھے۔ کلکتے کی دلکشی اور جمال کا ذکر غالب کے اردو فارسی اشعار میں بھی ملتا ہے اور "پنج آہنگ" اور "نامہائے فارسی غالب" میں بھی۔ اس سفر نے ان کے زاویہ نگاہ کو مزید وسعت سے ہمکنار کیا۔ غالب کے جن نقادوں نے سفرو قیام کلکتہ کو غالب کی زندگی کا ایک نہایت اہم موڑ قرار دیا ہے وہ بجا اور درست کہتے ہیں۔ ہرمن ہیسے نے لکھا ہے کہ اپنی کائنات کو محدود کرنے کے بجائے جملہ کائناتوں کو اپنی روح میں اتارنا اصل کام ہے۔ ان کائناتوں کو اپنی روح کا حصہ بنانے میں سیرو سیاحت بھی ایک مفید اور نتیجہ خیز ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے۔

ع حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو

مختصر یہ کہ کلکتے کی رواں دواں' سراپا حرکت جدید تہذیب نے غالب کو کس کس سطح پر متاثر کیا' اس کا احوال' ان کے خطوط بنام مرزا علی بخش خاں بہادر' محمد علی خاں اور بنام مولوی سراج الدین احمد میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ مرزا علی بخش خان بہادر کے نام لکھتے ہیں :

"کلکتہ کیا ہے' ایک پوری دنیا ہے جس میں سوائے علاج مرگ کے ہر چیز میسر ہے۔ اس کے ہنروروں کے آگے ہر کام سہل ہے۔ اس کے بازاروں میں سوائے جنس قسمت کے ہر شے فراواں ہے۔ میری قیام گاہ شملہ بازار میں ہے۔" (۱۵)

کلکتے کی آب و ہوا اور اس کے شیریں پھلوں کا ذکر کرتے ہوئے مولوی سراج الدین احمد کے نام لکھتے ہیں :

"کلکتہ کو غنیمت جانئے۔ اس جیسا شہر دنیا میں اور کہاں ہوگا۔ اس شہر کی خاک نشینی دوسری جگہ کی اورنگ آرائی سے بہتر ہے۔ بخدا اگر گھربار کی یہ ذمہ داریاں میرے سر نہ ہوتیں تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس جنت ارضی میں جا بستا۔ کلکتے کی خوش گوار آب و ہوا اور اس کے لطیف و شیریں، نیم رس پھلوں کا کیا کہنا۔

ہمہ گر میوہ فردوس بخوانت باشد
غالب آں انبہ بنگالہ فراموش مباد (۱۶)

شعر کے پیرائے میں یہ تاثر کتنا تیکھا اور دلنشیں ہو گیا ہے۔ بس نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مست طرب کی سی کیفیت ہے۔

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں | اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب | وہ نازنیں بتان خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر | طاقت ربا وہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے

دلچسپ بات یہ ہے کہ اٹھارہویں صدی کے اختتام کے قریب ایک فارسی شاعر نے کلکتہ کا جو نقشہ پیش کیا تھا، وہ غالب کے پیش کردہ نقشے سے بالکل مختلف ہے اور انگریزوں نے بھی اسی کی تائید کی ہے۔ اس شاعر نے آب شور اور زمین شور کو "فرمانروائے کلکتہ" قرار دیتے ہوئے کہا تھا۔

پارہ از زمین دوزخ بود | کہ براں شد بنائے کلکتہ
خارش و داد و پیچش و اسہال | ایں ہمہ تحفہ ہائے کلکتہ

کلکتہ سے اس قدر شیفتگی کا ایک سبب ایس اے آئی ترمذی مرتب "نامہائے فارسی غالب" کے خیال میں احباب کی جانب سے ان کا گرمجوشی سے کیا گیا استقبال بھی رہا ہوگا۔ علی اکبر خاں اور بیگم قاضی سراج الدین علی خاں کی میزبانی اور مسافر نوازی نے کلکتہ کی محبت ان کے دل میں دو چند کر دی تھی۔ یہاں انہیں مخلص اور بے غایت دوستوں مثلاً مولوی سراج الدین احمد، مولوی عبدالکریم، منشی عاشق علی خاں، آغا محمد حسین، مرزا احمد بیگ خاں تپاں اور کتنے ہی دیگر احباب کی صحبتیں میسر آئیں۔ یہ لوگ خاصے حکام رس بھی تھے اور ان کے توسط سے غالب کو کلکتہ کے اشراف سے ملنے کے مواقع میسر رہے ہوں گے۔ علاوہ ازیں انگلستان کے صنعتی انقلاب کے مظاہر بھی غالب کے لیے کشش کا باعث تھے جن کا برعظیم میں اولین ظہور اسی شہر کلکتہ میں ہوا تھا۔

غالبیات کے طالب علم اس بات سے آگاہ ہیں کہ قیام کلکتہ ہی کے دوران غالب اور حامیان قتیل کے درمیان وہ علمی معرکہ پیش آیا جس کے نتیجے میں بالآخر غالب کو "باد مخالف" نامی مثنوی لکھ کر صلح کی نیم دلانہ کوشش کرنا پڑی۔ اس معرکے کے اسباب میں جہاں غالب کی سربلند انا اور ان کے فارسی دانی کے صحیح اور کامل شعور کے توانا احساس کا دخل تھا وہیں ایک سبب ایک مجلس مشاعرہ میں غالب کی فارسی دانی اور بے مثال شعری صلاحیت کی برملا تعریف بھی تھا۔ اس کا حال خود غالب سے سنئے۔ یہ خط محمد علی خاں کے نام لکھا گیا تھا۔

اس خط میں جس ایرانی فاضل کا ذکر کیا گیا ہے' خواجہ احمد فاروقی نے اس کا نام مرزا کوچک بتایا ہے۔ (۱۸)

"ناگاہ سفیری از طرف بادشاہ ہرات حرسہا اللہ تعالیٰ عن الافات رسیدہ است' در آں انجمن حاضر گردید و اشعار پارسی گویان ایں گرامی بجمہ شنید' مرا بہ بانگ بلند بہ ستود و گفت' قدر ایں کلام را در ہندوستان کہ خواہد دانست۔ آنچہ تو می گوئی در خور آن است کہ فصحائے ایران بشنوند و حظ بردارند دیگر رو بہ جماعت کردہ گفت۔ یاران ایں شخص درمیان شما مغتنم است و قطع نظر از شعر و شاعری عالم زبان پارسی است' چون طبائع بالذات مفتون خود نمائی است' حسد بروند و کلانان انجمن و گراں مایگاں (بر دو بیت من) اعتراض نا درست برآوردہ' آن را بہ نام بعضے از سفہاء شہرت دادند۔ جوابہا یا خند و سر بزانوئے خموشی نشستند۔" (۱۹)

غالب کے خلاف اس مہم میں مرزا افضل بیگ پیش پیش تھا۔ اس نے کلکتہ کے اہل علم کو غالب کے خلاف اکسانا چاہا۔ اس نے سنیوں میں غالب کو رافضی مشہور کیا اور اہل تشیع میں انہیں بے دین کہہ کر بدنام کرنا چاہا۔ اس نے کلکتہ کے شعراء کو باور کرا دیا کہ غالب انہیں ہیچ پوچ سمجھتے ہیں اور قتیل کے مخالف ہیں۔ تفصیل کے لیے "نامہائے فارسی غالب" کا صفحہ ۴۰ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

اس میں قطعاً شک نہیں کہ غالب سخن وران کلکتہ اور قتیل کے ہرگز قائل نہ تھے۔ اس ضمن میں غالب کے فارسی مکاتیب کے علاوہ ان کے اردو خطوط بھی شاہد ہیں۔ وہ قتیل و واقف کو محض موزوں طبع گردانتے تھے۔ ان کے خیال میں نہ تو ان کے یہاں صحیح فارسی تراکیب ملتی ہیں نہ معانی نازک۔ ان کے الفاظ فرسودہ اور عامیانہ ہوتے ہیں۔ عبدالغفور سرور کے نام خط میں فارسی کے صحیح شعور کے ضمن میں اساتذہ شعر و فن کا تتبع لازمی گردانتے ہوئے لکھتے ہیں :

"جب رودکی' عنصری و خاقانی و رشید وطواط اور ان کے امثال و نظائر کا کلام بالاستیعاب دیکھا جائے اور ان کی ترکیبوں سے آشنائی بہم پہنچے اور ذہن اعوجاج کی طرف نہ جائے تب آدمی جانتا ہے کہ ہاں یہ فارسی ہے۔" (۲۰)

اساتذہ کے کلام کے نظائر کو پیش رکھنے کا یہی مشورہ نواب علی بہادر کو دے کر گویا اپنے موقف کو تواتر سے بیان کرتے ہیں :

"اگر رموز فن سے آگہی مقصود ہو تو ریختہ کہنے والوں میں میر' میرزا اور فارسی گویوں میں صائب' عرفی' نظیری اور حزیں کا کلام نظر میں رکھیے۔ نظر میں رکھنے سے مراد یہ ہے کہ جوہر لفظ اور فروغ معنی پر غور کر کے خوب و ناخوب میں تمیز کرنی چاہیے۔" (۲۱)

قتیل کے خلاف تو غالب ادھار کھائے بیٹھے معلوم ہوتے ہیں۔ جہاں قتیل کا ذکر آیا ان کی مٹھیاں بھنچ گئیں اور منہ سے گویا کف جاری ہو گیا۔ کہیں اسے کھتری بچہ کہہ کر اس کی تحقیر کرتے ہیں' کہیں اسے الو کا پٹھہ

قتیل کہتے ہیں۔ کہیں کہتے ہیں :

"ایک گاؤ بچہ بزور سحر کچھ باتیں کرنے لگا۔ بنی اسرائیل اسے خدا سمجھے" --- بحوالہ "عود ہندی"۔

قتیل و واقف جیسے ہندی نژاد فارسی گوؤں کے برعکس وہ خود ہندی نژاد ہونے کے باوجود کو فارسی کے رموز و اسرار کا عالم سمجھتے تھے اور یہ بات بہت حد تک درست بھی تھی۔ وہ ملا عبدالصمد کے شاگرد رہے ہوں یا محض تلمیذ الرحمٰن' انہیں دعویٰ تھا کہ فارسی زبان کے رموز اسی طرح ان کے وجدان کا حصہ بن چکے ہیں جس طرح فولاد میں جوہر۔

آنچہ در مبدا فیاض بود آن من است
گل جدا نا شدہ از شاخ بدامان من است

محض دعویٰ نہیں بلکہ نرا کھرا اعلان صداقت ہے۔ محمد آغا حسین ناخدائے شیرازی کے نام ایک خط میں اپنے خلاف کھڑے ہونے والے طوفان کا سبب صرف یہ بتاتے ہیں کہ چونکہ میں فرزانگان پارس کا زبان دان ہوں اس لیے مجھے دشنام کی سان پر رکھا جا رہا ہے۔ اگرچہ "دساتیر" جیسی مجہول کتاب کو ساسان پنجم سے منسوب کرکے انہوں نے بلاشبہ اپنے موقف کو کمزور ثابت کیا ہے کیونکہ یہ بات اب متحقق ہو چکی ہے کہ یہ مابعد اسلام کی تصنیف ہے۔ پوری صداقت غالب کے ساتھ نہ سہی' اس کا غالب حصہ یقیناً انہی کے ساتھ ہے۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ غالب کے فارسی مکتوبات کے ان کے اور ان کے عہد کے افراد و وقائع کا ایک نہایت گراں قدر ماخذ ہیں۔ انا اور انفرادیت کے بے حد بالیدہ احساس' زمانے کی ناقدریوں' خانگی اور خاندانی مسائل اور محرومیوں اور سماجی اور تہذیبی شکست و ریخت نے غالب کو بے حد حساس بنا دیا تھا۔ یہ بات معلوم ہے کہ ان کا چھوٹا بھائی یوسف مرزا دیوانہ تھا۔ "نامہائے فارسی غالب" سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دیوانگی بقول غالب کالے جادو کا نتیجہ تھی۔ اس دیوانے بھائی سے غالب کس قدر ٹوٹ کر محبت کرتے تھے اور اس میں فرزانگی کی ایک کرن دیکھ کر ان پر کس طرح گریہ شادی کی کیفیت طاری ہو گئی تھی' اس کا احوال خود غالب کی زبانی سنیے :

"میرزا یوسف کی حالت یہ تھی کہ سرتاپا برہنہ رہتا اور اہل قطرب (۲۲) کی طرح ہمہ وقت بے چین رہتا۔ ماں کو ماں نہیں سمجھتا تھا۔ ۲۷ رمضان کو دلی سے مجھے ایک خط ملا۔ جب خط کھولا تو معلوم ہوا کہ میرے اس بھائی کا خط ہے۔ جب غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ خود اس نے اپنے ہاتھ سے اور تمام القاب و آداب کو ملحوظ رکھ کر لکھا ہے اور ہوشمندی ضابطہ نظر آئی۔ میں خوشی سے اچھلا اور رقص کرنے لگا۔ گریہ خوشی نے مجھ پر ہجوم کیا اور میں زار زار رویا۔ جب کچھ سنبھلا تو خانگی خط کو غور سے پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا کہ تمہارے جانے کے بعد جیسا کہ ہم سب کو اندیشہ تھا میرزا یوسف نے شور و

غوغا' نالہ و فریاد اور مار پیٹ سے ہمارے شب و روز کا سکون غارت کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ سرکار شاہی کا ایک فیلبان اس صورت حال کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے آثار سحری کا پتا دیا اور نشانیاں بتائیں۔ شہر کی فصیل سے باہر ایک درخت کی جڑوں تک کھودنے اور وہاں موجود ایک کنوئیں کی جستجو کا حکم ہوا۔ جب شگاف ڈالا گیا تو جو کچھ بتایا گیا تھا' وہی کچھ پایا گیا۔ چنانچہ پانچ ماہ کے علاج سے دو حصے افاقہ ہوا ہے۔ اب اس نے لباس پہننا' سر ڈھانپنا' بول و براز سے احتراز کرنا' دستر خوان پر بیٹھ کر کھانا کھانا اور ماؤں بہوؤں بیٹیوں کو ماں' بہو' بیٹی سمجھنا شروع کر دیا ہے --- واللہ میں نے اس کی بحالی صحت کو اپنے والد کے دوبارہ زندہ ہو جانے سے گراں تر جانا۔" (۲۳)

افسوس کہ یہ صورت حال عارضی ثابت ہوئی اور یہ دیوانگی پھر عود کر آئی۔

صرف پاسبان اور پنشن ہی نے نہیں احباب اور متعلقین کی اموات اور دیگر پریشانیوں نے بھی غالب کی زندگی تلخ کر دی تھی۔ سراج الدین احمد کے نام دو خطوں کے اقتباس ملاحظہ کیجئے۔ ایک خط اسٹرلنگ کی موت پر ہے اور دوسرا مرزا احمد بیگ خاں تپاں کی موت پر۔ اسٹرلنگ نے غالب کے قضیہ پنشن میں ان کی بہت مدد کی تھی لیکن اس کی مرگ ناگہانی نے انہیں اندر سے ہلا کر رکھ دیا۔ لکھتے ہیں :

"۱۵ ذی الحج کو خبر آئی کہ مکارم اخلاق کے مجموعے کا شیرازہ درہم برہم ہو گیا۔ ایوان سروری کی شمع روشن بجھ گئی۔ آگہی کا باغ اجڑ گیا۔ درماندوں کی آرزوؤں کا خون ہو گیا اور وہ ناخن بھی ٹوٹ گیا جس سے گرہ کشائی کی امید تھی۔" (۲۴)

بے اختیار اکبر کا شعر یاد آتا ہے۔

مایوس ہوں باغ عالم سے امید سے یاری چھوٹ گئی
جس پیڑ کو سینچا سوکھ گیا' جس شاخ کو باندھا ٹوٹ گئی

تپاں کی موت پر خط کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے' دل تا جگر ایک دریائے خوں مواج نظر آتا ہے۔ لکھتے ہیں :

"آپ کے خط سے مرزا احمد بیگ کے فراق دائمی کی خبر ملی۔ میں بھی کیا سنگ دل اور کتنا سخت جان ہوں کہ دوست کی تعزیت کا خط لکھ رہا ہوں اور جی رہا ہوں۔ مجھ سے کہتا تھا کہ دلی آتا ہوں مگر وعدہ فراموش راستہ بھول کر کسی اور منزل کی طرف چلا گیا۔ مانا کہ دوستوں کی خاطر اسے عزیز نہ تھی لیکن کم سن بچوں کو بھی بے سایہ کر گیا---

مرا باشد از درد طفلاں خبر
کہ در طفلی از سر برفتم پدر (۲۵)

درج بالا اقتباس کی آخری سطر غالب کے اس مرثیے کی یاد دلاتی ہے جو انہوں نے عارف کی موت پر لکھا

تھا۔

مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

"پنج آہنگ" میں ان صدموں پر مستزاد ایک اور افسوس ناک خبر یہ بھی مندرج ہے کہ غالب کے خلاف کے ان کے دو قرض خواہوں نے قرض کی عدم ادائیگی کی وجہ سے ڈگری جاری کرا دی تھی۔ غالب خستہ اس صورت حال کے باعث خانہ نشین ہو گئے تھے۔ صرف رات کو کسی وقت گھر سے چوری چھپے نکلتے تھے۔ اور دو ایک گھڑی بعد گھر لوٹ آتے تھے۔ نواب شمس الدین کی گرفتاری اور ممدوح غالب مسٹر فریزر کے قتل کے الزام میں ان کی پھانسی کی تفصیلات بھی انہی اوراق میں فراہم ہیں۔ تاتخ کے نام غالب کے فارسی مکتوب سے بخوبی اندازہ ہو تا ہے کہ محبت کی طرح غالب کی نفرت بھی کتنی شدید تھی۔ نواب شمس الدین سے ان کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ وہ انہیں کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے اور کچھ نہیں تو ہمیشہ دست بدعا ضرور رہتے تھے۔ اور انہیں ان دعاؤں کے مستجاب ہونے کا پورا یقین تھا۔ بہرحال غالب نے منافقت سے کام لیے بغیر شمس الدین سے اپنی نفرت کا کھل کر اظہار کر دیا ہے۔ جیسا کہ ایک دوسرے موقع پر مجمل کھتری کے نام ایک خط میں اپنے کسی وقت کے ممدوح اور حال مخالف آغا میر کو "گدا طبع سلطان صورت انسان" کہہ کر اپنا حساب چکا دیا ہے۔

درد و اندوہ اور ناتمامیوں نارسائیوں نے غالب کے وجود کا کس قدر احاطہ کر رکھا تھا۔ اس کا کچھ اندازہ "پنج آہنگ" میں موجود ان کے میر اعظم علی مدرس کے نام خط سے کیا جا سکتا ہے۔ اس کا خلاصہ غالب کے اپنے ایک مصرعے میں یوں سمیٹا جا سکتا ہے۔ "میتواں گفت کہ این بندہ خداوند نداشت" کہتے ہیں :

> یاد آیا کہ اس خواب آباد میں کبھی میرا بھی ایک وطن تھا اور مہربانوں کی ایک انجمن آباد تھی۔ اس نشتر پرسش کے قربان جایئے کہ برسوں کے زخم تازہ کر دیئے ---- بھائی کی دیوانگی کا غم ایک طرف اور قرض خواہوں کے تقاضے دوسری طرف۔ لبوں پر مہر سکوت اور آنکھ نگاہ سے محروم۔ اسی شکستگی کے عالم میں بیداد روزگار سے تنگ آ کر کلکتہ جا پہنچا۔ بارے کشائش کار کی صورت نظر آنے لگی --- دو سال یہیں ٹھہرا رہا۔ جب معلوم ہوا کہ گورنر جنرل دہلی تشریف لے جا رہے ہیں تو آگے آگے دوڑا گیا اور دہلی پہنچا گر قسمت پھر برگشتہ ہو گئی اور بنا بنایا کام بگڑ گیا۔ اب چھ برس ہو چکے ہیں کہ سب کچھ کھو کر گوشہ تنہائی میں پڑا ہوا ہوں اور مرگ ناگہاں کا منتظر ہوں --- اس اندوہ و الم کے عالم میں اگر میں نے بزرگان وطن سے مراسلت میں کوتاہی کی ہے تو یقیناً قابل معافی ہوں لیکن میرے دوستوں نے بھی اس ساری مدت میں پلٹ کر یہ نہ پوچھا کہ دوست ابھی جی رہا ہے یا مر چکا ہے۔

کس از اہل وطن غمخوار من نیست
مرا در دہر پنداری وطن نیست

یہ اندوہناک صورت حال غالب ہی کا ایک اور شعر یاد ولاتی ہے۔

گر وہم شرح ستم ہائے عزیزاں غالب
رسم امید ہمانا ز جہاں بر خیزد

غالب کے زیر نظر فارسی مکاتیب میں درد و اندوہ کے ان گمبیر سایوں کے دوش بدوش زندگی کی چمک دمک' شوخی اور لہراپن بھی نظر آتا ہے۔ غالب کی مجلسی اور خور و نوش کی زندگی کی بھرنواز جھلکیاں بھی نظر پڑتی ہیں۔ مثلاً یہ بات معلوم ہے کہ غالب شیرینی کے شیدائی تھے۔ پھوڑوں سے ان کے جسم کے "سرو چراغاں" ہو جانے کے اور اسباب کے علاوہ ایک سبب یہی شیرینی پسندی بھی رہا ہوگا۔

"پنج آہنگ" سے یہاں تین چھوٹے چھوٹے مگر کمال دلچسپ اور بے ساختہ اقتباس ملاحظہ کریں جن کے لفظ لفظ سے غالب کی انبہ پسندی(۲۶) اور "مصری نوازی" کا اندازہ ہوتا ہے۔

نواب سید علی اکبر خاں کے نام خط میں ان سے ہوگلی کے آموں کا تقاضا کرتے ہیں مگر ایسے لطیف پیرائے ہیں کہ جس میں آم کے ساتھ دام کو بھی نہیں بھولتے۔ کہتے ہیں :

۱۔ "پیٹ کا بندہ ہوں اور قدرے ناتواں مگر کم بخت دل ہے کہ دسترخوان کی رونق اور آرائش جاں دونوں کا خواہش مند ہے ---- کلکتہ والوں کا کہنا ہے کہ ہوگلی آموں کی گری ہے۔ شوق کا تقاضا ہے کہ فصل کے ختم ہونے تک ہوگلی سے آم اور جناب کے گلشن ایثار سے پھول آتے رہیں" اور اب نواب مصطفیٰ خاں کے نام آموں کی رسید بصورت قصیدہ نثریہ ملاحظہ ہو۔

۲۔ --- آموں کے آٹھ ٹوکرے وصول ہوئے۔ سبحان اللہ کیا آم ہیں۔ باہر دودھ سے دھلے ہوئے' اندر شکر میں گھلے ہوئے جن کو چشمہ خضر سے پانی اور نفس مسیح سے تازگی ملی ہے جو "شیرینی" میں شکر سے بازی لے گئے اور جنہوں نے خود خسرو کا دل موہ لیا۔"

لگے ہاتھوں مصری کا قصیدہ بھی ملاحظہ کیجئے اور غالب کے بالیدہ تخیل کی داو دیجئے :

"مصری کے پینتالیس کوزے وصول ہوئے۔ اس مصری کی حلاوت کا کیا کہنا کہ جان سے زیادہ شیریں ہے۔ اس میں ایسی مٹھاس گھلی ہوئی ہے کہ اس کے مقابلے میں شکر کی شیرینی برائے نام معلوم ہوتی ہے۔ اگر شاہد ارمنی (شیریں) کو اس کی حلاوت کا اندازہ ہوتا تو اپنی ساری شیرینی بھول جاتی اور فرہاد کی کوشش اور جنبش تیشہ کے بغیر جوئے شیر موجزن ہو جاتی۔ یہ مصری نہیں فردوس کی نہرانگبیں کا حباب ہے بلکہ یوں کہئے کہ جنت کی شہد کی نہر کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔" --- (سعد الدین خاں شفق کے نام' صفحہ ۱۰۹)۔

"پنج آہنگ" میں بعض مقامات پر بظاہر معمولی باتیں درج ملتی ہیں لیکن ان جزئیات سے غالب کی تعمیر سوانح میں بڑا کام لیا جا سکتا ہے اور ایک حد تک لیا بھی گیا ہے۔ مثلاً اپنے شاگرد جواہر سنگھ جوہر سے ریشمی لنگی کی فرمائش کرتے ہیں اور اس کی نوعیت کی تفصیل سے آگاہ کرکے اپنے ذوق کی نشاندہی کرتے ہیں جس میں سادگی کا نقش گہرا ہے۔ خاص رنگوں کی طرف غالب کا یہ میلان بذات خود تحلیل نفسی کرنے والوں کا اہم موضوع بن سکتا ہے۔ لکھتے ہیں :

> "تمہیں یاد ہوگا میرے پاس ایک قزاقی ٹوپی تھی۔ اسے کیڑا کھا گیا۔ اب مجھے ٹوپی نہیں ریشمی لنگی چاہئے جو پشاور اور ملتان میں بنتی ہے جسے وہاں کے معززین سر پر لپیٹتے ہیں۔ لنگی کا رنگ شوخ اور حاشیہ سرخ نہ ہو اور اس پر سونے چاندی کے تاروں سے بندھے ہوئے نقش نگار بھی نہ ہوں۔ ایسی لنگی درکار ہے جو سیاہ' سبز' نیلے اور پیلے ریشم سے بنی ہوتی ہو --- اسے خرید کر ڈاک کے ذریعے مجھے بھیج دو اور قیمت بھی لکھ بھیجو۔ یہ میری فرمائش ہے اس لیے تمہیں اس کی قیمت مجھ سے لینی ہوگی۔" صفحہ ۱۸۱۔

معلوم نہیں غالب کو یہ لنگی میسر آئی یا نہیں' تصور کیجئے بھتی رنگ کا یہ خوبصورت پیر شصت سال چہار رنگی لنگی سر پر لپیٹ کر کلاہ چار ترک کو چشم نمائی نہ کرتا ہوگا؟

غالب کے فارسی خطوط اس اعتبار سے بھی اہم ہیں کہ ان میں کہیں کہیں دلی اور کلکتہ کی مجلسی زندگی اور مشاعروں کا بھی نہایت زندہ اور متحرک و دلچسپ احوال ملتا ہے۔ قلعہ معلی کے ایک مشاعرے کی محاکات ملاحظہ ہو جس میں مرزا حیدر شکوہ' مرزا انورالدین اور مرزا عالی بخت نے طرحی غزلیں سنائیں اور خود غالب نے بھی دس شعر طرح میں پڑھے۔ بعد کا احوال خود غالب کی زبانی سنئے :

> "محوی نامی ایک لڑکے نے جو خم کدہ صہبائی کے نے آشاموں میں تھا۔ نشید مستانہ بلند کی۔ مرزا حاجی شہرت نے کم و بیش ستر شعر کی غزل پڑھی۔ میں آنا کر پیشاب کے بہانے نکل آیا۔ اس وقت تک شہر کی دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ چراغ روشن تھے۔ ابھی آدھی رات نہیں گزری تھیں' میں گھر آکر دیر تک اپنی اکتاہٹ کو شراب میں ڈبوتا رہا۔" (۲۷)

غالب نے فارسی میں چند بہت اچھی مثنویات بھی لکھیں۔ ان میں ایک مثنوی کا نام "درد و داغ" ہے جس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ نصیب یاوری نہ کرے تو اسباب بھی کچھ مدد نہیں کرتے۔ اس مثنوی میں اولاً ایک شعر یوں کہا گیا تھا۔

خوک شد و پنجہ زون ساز کرد
با سرو رو عربدہ آغاز کرد

غالب کے ایک دوست ناطق مکرانی نے انہیں انتباہ کیا کہ "خوک سم دارد نہ پنجہ" (۲۸) غالب نے اس کے جواب میں ناطق کو جو مکتوب لکھا اس میں شگفتہ بیانی کے تیور قابل ملاحظہ ہیں :

"میرے شعر پر آپ کا تامل اور تنقید درست ہے --- دم ذوالفقار کی تیزی اور حیدر کرار کے فروغ گوہر کی سوگند اگرچہ میں نے اس جانور کو خرابوں اور ویرانوں میں بہت دیکھا ہے لیکن اس کے پاؤں کبھی غور سے نہیں دیکھے۔ میرا گمان تھا کہ اس کے پاؤں بھی کتے بلی کی طرح ہوتے ہوں گے۔ اب آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ سور کے سم ہوتے ہیں۔ اگر کلیات کے چھپنے سے پہلے آپ کا خط مجھے مل جاتا تو مصرع بدل کر "پنجہ زدن ساز کرد" کی جگہ "بدنفسی ساز کرد" لکھ دیتا (۲۹)۔ بعد میں غالب نے ایسا کر دیا اور شعر کی صورت یہ ہو گئی۔

خوک شد و بدنفسی ساز کرد
با سر و رو عربدہ آغاز کرد

"پنج آہنگ" کے اوراق میں کہیں کہیں آگرہ کی حسرت ناک اور درد انگیز یادیں ہیں --- وہ ابتدائی یادیں جو دلوں اور روحوں پر گہرے نقش بنا دیتی ہیں۔ کہیں کہیں ناتمامی اور نارسائی کا گہرا کرب نکھرا ہے جس میں غالب کی روح لپٹی اور سمٹی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ کہیں زوال عمر کا دلگداز پیرائے میں ذکر موجود ہے اور کہیں شعر و سخن گوئی کی قوت کے انحطاط آمادہ ہونے پر تاسف کا اظہار ملتا ہے بس سے خود غالب ہی کے شعر ذہن میں گونجنے لگتے ہیں۔

تھی وہ اک شخص کے تصور سے اب وہ رعنائی خیال کہاں
مضمحل ہو گئے قویٰ غالب اب عناصر میں اعتدال کہاں

یا پھر یہ کہ۔

تن از سایہ خود بہ بیم اندروں
دل از غم بہ پہلو دونیم اندروں

اس سے پہلے کہ غالب کی فارسی مکتوب نگاری کے اسلوب اور ان کے تصور مکتوب نگاری کا اجمالاً ذکر کر کے اس مضمون کو آخری موڑ دیا جائے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "پنج آہنگ" کا ایک مکتوب قارئین کی نذر کیا جائے جو مسلم ملت کی آج کی صورت حال پر اس قدر حیرت انگیز طور پر چسپاں ہوتا ہے کہ لگتا ہے کہ حالات آج بھی وہی ہیں جو آج سے کم و بیش ڈیڑھ سو برس قبل تھے۔ کیا مسلم تاریخ و تہذیب کی غلام گردش میں وقت کئی صدیوں سے ایک ہی نقطے پر آ کر ٹھہر نہیں گیا؟ کیا کوئی اس قافلے میں قافلہ سالار بھی ہے؟ اقتباس دیکھئے :

"اب صورت یہ ہے کہ سفلوں اور کم ظرفوں کی بن آئی ہے۔ داد گاہ کا حال داد خواہوں سے زیادہ تباہ اور ان کے دن چشم بے دقیاں سے سیاہ تر ہیں۔ جب سے یہاں آیا ہوں دن رات یہی کچھ دیکھ رہا ہوں۔ نہ کسی میں مروت ہے نہ خلوص' حاکم خود بین و خود

پسند۔ ہر طرف زوال کے آثار ہیں۔ ایک عالم اس تباہی سے نالاں ہے لیکن اس کے اسباب پر کسی کی نظر نہیں۔" (۳۰)

جہاں تک غالب کے فارسی مکاتیب کے اسلوب کا تعلق ہے یہ حقیقت ہے کہ یہ سوانحی اور زمانی معلومات کے اعتبار سے اردو مکاتیب پر فائق تر ہونے کے باوجود اس سلاست' بے ساختہ پن' غیر معمولی ظرافت اور حسن بیان سے مزین نہیں جو ان کے اردو مکاتیب کا حصہ ہے۔ پھر بھی ان میں کہیں کہیں سلاست' روانی اور برجستگی کا وہ رنگ نظر آتا ہے جو غالب کا اسلوب خاص ہے۔ مراسلے کو مکالمہ بنانے کا جو دعویٰ غالب اردو مکاتیب میں کرتے ہیں اس کی اولیں نمود مع اعلان ان کے بعض فارسی مکاتیب ہی میں ہوئی ہے اور مراسلے کو مکالمہ بنانے کا فن درحقیقت ان کے ذوق حضوری کے وفور کا نتیجہ ہے۔ فارسی زبان پر ان کا حاکمانہ عبور حیرت انگیز ہے اور ان کا یہ دعویٰ درست معلوم ہوتا ہے کہ جب تک قدماء و متاخرین صائب' کلیم' اسیر' حزیں کے کلام میں کوئی لفظیا ترکیب دیکھ نہیں لیتا' اس کو نظم اور نثر میں نہیں لکھتا۔ گویا اساتذہ کے کلام کے مطالعے سے انہیں وہ چیز حاصل ہو گئی تھی جسے وہ توغل کہتے ہیں۔ اور وہ بلاشبہ نظیری' عرفی' طالب و صائب جیسے شعراء کا خلاصہ ہوتے ہوئے بھی اپنا منفرد شعری آہنگ رکھتے تھے۔ یہی منفرد آہنگ ان کی فارسی نثر کا طغرائے امتیاز کہا جا سکتا ہے۔ ان کی نگارش گزارش سے دور تر نہیں جاتی اور بنشستن کو "رنگ گمنن" عطا کرکے انہوں نے اپنے انہی اصولوں کی بحث حد تک پیروی کی جو انہوں نے "پنج آہنگ" کے شروع میں بیان کیے تھے۔ فارسی ادبیات کے ممتاز محقق ڈاکٹر نذیر احمد نے جہاں ان کی فارسی نثر نگاری میں مکالماتی طرز' شاعرانہ پیرایہ بیان اور مسجع عبارت آرائی کے عناصر کی نشاندہی کی ہے وہیں ان کی اس کاوش کی بھی داد دی ہے جسے اصطلاحاً "فارسی سرہ" کہتے ہیں۔ علاوہ ازیں غالب کے یہاں تراکیب' تشبیہات اور استعاروں کی ندرت بھی کچھ کم قابل داد نہیں۔ انہوں نے فارسی محاورات کو بھی کثرت سے برتا ہے اور یہ دراصل نتیجہ ہے غیر شعوری طور پر صدیوں پر پھیلے اجتماعی لسانی تجربے میں مشارکت کا۔ ان کے فارسی اسلوب نثر پر "سہ نثر ظہوری" اور "انشائے ابوالفضل" کے اثرات بھی بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں۔ خود غالب نے بھی تو کہا تھا۔

بہ نظم و نثر مولانا ظہوری زندہ ام غالب

غالب نے ایک موقع پر شعر کو عالم قدس کی متاع گرانمایہ قرار دیا تھا۔ غالب کی غیر معمولی' ہمہ گیر اور ہمہ پہلو شخصیت نے اپنے فارسی مکاتیب کو بھی متاع گرانمایہ کا درجہ دے دیا ہے۔ اساتذہ فن کی لسانی رہنمائی میں مسلسل قدم زنی کرتے کرتے ان کا کلک رقاص چال میں کبک بنا اور راگ میں موسیقار' فارسی نثران کے افادات' اجتہادات اور احسانات کے حضور ہمیشہ خمیدہ سر رہے گی۔

حواشی

۱ ۔ یہ سراج الدین احمد وہی ہیں جن کی تحریک پر "گل رعنا" نامی انتخاب عمل میں آیا۔ انھی سراج الدین احمد کے لیے غالب نے کہا تھا ۔

با سراج الدین احمد چارہ جز تسلیم نیست
ورنہ غالب ی گزد ذوق غزل خوانی مرا

۲ ۔ پنج آہنگ' (مترجم محمد عمر مہاجر) صفحہ ۶۷' ۶۸۔
۳ ۔ ایضاً" صفحہ ۷۵۔
۴ ۔ ایضاً" صفحہ ۱۴۰' ۱۴۱۔
۵ ۔ پنج آہنگ (مرتبہ وزیر الحسن عابدی) صفحہ ۴۸۸' ۸۹۔
۶ ۔ پنج آہنگ (محمد عمر مہاجر) صفحہ ۱۱۷۔
۷ ۔ اسی موقف کو پیرایہ دیگر میں یوں دہرایا ہے : غالب نبود شیوہ ما قافیہ بندی۔
۸ ۔ پنج آہنگ صفحہ ۱۵۰' ۱۵۱۔
۹ ۔ پنج آہنگ صفحہ ۳۲' ۳۳۔ غالب کا ایک بے محل شعر یاد آتا ہے۔

فلک سے ہم کو عیش رفتہ کے کیا کیا تقاضے ہیں
متاع بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

۱۰ ۔ غالب کے خطوط جلد سوم (مرتبہ خلیق انجم) صفحہ ۱۱۱۱۔
۱۱ ۔ نامہائے فارسی غالب۔ صفحہ ۲۰' ۲۱۔
۱۲ ۔ ایضاً" صفحہ ۲۱' ۲۲۔
۱۳ ۔ "چراغ دیر" پر راقم کے تفصیلی مضمون کے لیے ملاحظہ ہو : "سورج" غالب نمبر' اپریل' مئی ۱۹۹۶ء صفحہ ۱۰۹۱ ۔ ۱۱۰۷۔
۱۴ ۔ قصائد و مثنویات فارسی (عابدی) صفحہ ۲۱۔
۱۵ ۔ پنج آہنگ (مترجم محمد عمر مہاجر) صفحہ ۴۔
۱۶ ۔ پنج آہنگ (مترجم محمد عمر مہاجر) صفحہ ۵۸۔
۱۷ ۔ بحوالہ نقش آزاد (مولانا غلام رسول مہر) صفحہ ۲۷۴۔
۱۸ ۔ ملاحظہ ہو' "احوال غالب" (مختار الدین احمد) صفحہ ۱۹۳۔
۱۹ ۔ نامہائے فارسی غالب' صفحہ ۵۷' ۵۸۔
۲۰ ۔ غالب کے خطوط' جلد دوم (خلیق انجم) صفحہ ۵۸۰۔
۲۱ ۔ پنج آہنگ (مترجم محمد عمر مہاجر) صفحہ ۱۵۸۔

۲۲ ۔ دیوانے کے لیے یہ تشبیہ حد درجہ موزوں ہے اور غالب کی دقت مشاہدہ کو ظاہر کرتی ہے۔ قطرب لمبے لمبے پاؤں والے کیڑے (حشرے) کو کہتے ہیں جو روئے آب پر ہمیشہ متحرک رہتا ہے۔

۲۳ ۔ نامہائے فارسی غالب، صفحہ ۳۲، ۳۳۔

۲۴ ۔ پنج آہنگ (مترجم محمد عمر مہاجر) صفحہ ۵۰۔

۲۵ ۔ ایضاً صفحہ ۵۱۔

۲۶ ۔ اس ضمن میں ان کی مشہور "مثنوی در صفت انبہ" بھی لائق توجہ ہے۔

۲۷ ۔ پنج آہنگ، (مترجم محمد عمر مہاجر) صفحہ ۱۶۶۔

۲۸ ۔ متفرقات غالب (مسعود حسن رضوی ادیب) صفحہ ۱۶۱۔

۲۹ ۔ پنج آہنگ، صفحہ ۱۷۵، ۷۶۔

۳۰ ۔ ایضاً صفحہ ۵۷۔

غالب زندگی بھر آتش بجاں اور سرگرم نالہ ہائے شرر بار رہے۔ اس صورت حال نے آگ اور اس کے تعلقات کو ان کے مزاج میں کچھ اس طرح داخل کیا کہ وہ غیر شعوری طور پر ان سب کی پرستش کرنے لگے اور آتش پرستی ان کی شخصیت کا ایک بنیادی جز بن کر ان کے فن کا بھی ایک حصہ بن گئی۔ چنانچہ اپنی ذہنی کیفیت کے بیان اور زندگی کے مختلف معاملات و مسائل کی ترجمانی میں انہوں نے آگ اور آتش وغیرہ کے اشاروں سے بڑا کام لیا ہے اور ان اشاروں اور علامتوں نے اظہار و ابلاغ میں ان کی بڑی مدد کی ہے۔ ان کی شاعری میں ان اشاروں اور علامتوں کی حیثیت مستقل پیکروں کی ہے اور انہوں نے مجموعی طور پر ان کے فن میں ایک نیا رنگ و آہنگ پیدا کر کے اس کو انفرادی شان سے ہمکنار کیا ہے۔

——— ڈاکٹر عبادت بریلوی

☆☆☆

پروفیسر سیف اللہ خالد

غالب کے اردو، فارسی مُراسلات ـــــ اجمالی جائزہ

خطوطِ غالب ـــــ اردو

۱۸۶۶ء سے ۱۹۹۳ء تک خطوطِ غالب --- اردو کے متعدد مجموعے شائع ہوئے جن میں کسی نہ کسی زاویے سے لائقِ مطالعہ کام ہوا۔ خطوطِ غالب کی بازیافت کا سلسلہ ہنوز جاری ہے اور اس نابغۂ ادب کی دیو قامت شخصیت کی مختلف جہتوں کی نقاب کشائی ہو رہی ہے ---- ذیل میں خطوطِ غالب کے مجموعوں کا اجمالی تذکرہ کیا جاتا ہے :

۱ - انتخابِ غالب :

نظم و نثر کا یہ گلدستہ ۱۸۶۶ء میں طبع ہوا۔ اسے غالب نے (غالباً) انگریز افسروں اور فوجیوں کو اردو سکھانے کے لیے مُرتّب کیا تھا۔ اس کا دیباچہ بھی غالب نے خود لکھا۔ مطبوعہ مواد کے دو حصے ہیں :

(الف) پہلے حصے میں "گلزارِ سرور" (مرزا رجب علی بیگ سرور) اور "حدائق الانظار" (خواجہ بدرالدین) پر غالب کے دیباچے، میر مہدی مجروح کے نام غالب کے بارہ خط، دو نقلیں اور ایک لطیفہ شامل ہے۔

(ب) دوسرا حصہ ۳۹ اردو اشعار اور غالب کی نثری تحریر سے مُزیّن ہے۔

(تیس صفحات پر مشتمل اس قلمی نسخے کی فوٹو سٹیٹ کاپی غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی میں محفوظ ہے۔)

۲ - عُودِ ہندی :

خطوطِ غالب کا یہ مجموعہ غلام غوث بے خبر اور منشی ممتاز علی (رئیسِ میرٹھ) نے ترتیب دیا جو ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو مطبع مجتبائی (میرٹھ) سے چھپا۔ اس کا دیباچہ منشی ممتاز علی نے لکھا۔ ۱۸۸ صفحات پر مشتمل اس مجموعے کی دو فصلیں ہیں :

(الف) پہلی فصل چودھری عبدالغفور سرور کے دیباچے اور ان کے مرتبہ پچیس خطوط کے مجموعے المُوسُوم "مہرِ غالب" پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ ۱۸۶۱ء، ۱۸۶۲ء میں مرتب ہو گیا تھا مگر غالب نے اس کی اشاعت کی حوصلہ افزائی نہ کی۔

(ب) دوسری فصل میں منشی ممتاز علی کے مُرتّب کردہ ۱۳۸ خطوط ہیں۔

(ج) ۱۹۶۷ء میں سید مرتضیٰ حسین فاضل نے عودِ ہندی کا جامع ایڈیشن، اشاریے اور حواشی سمیت شائع کیا۔ یہ فی الواقع نہایت قابلِ قدر کام ہے مگر متعدد اغلاط کے باعث اس کی افادیت کا بھرپور اعتراف کرنا ممکن نہیں۔

۳ - اردوئے معلیٰ :

(الف) ۴۶۴ صفحات پر مشتمل ۴۷۰ خطوط کا یہ مجموعہ حکیم غلام رضا خاں، مالک اکمل المطابع دہلی نے چھاپا۔ میر

مہدی مجروح نے دیباچہ اور قربان علی سالک نے اختتامیہ لکھا۔ غالب کی وفات کے ۱۹ دن بعد ۶ مارچ ۱۸۶۹ء کو رونما ہونے والے اس مجموعے کے دو حصے ہیں --- پہلے حصے میں طلبا کے لیے صاف' سادہ اور عام فہم زبان میں لکھے ہوئے خطوط ہیں۔ دوسرے حصے میں وہ خطوط شامل ہیں جو مشکل علمی و ادبی موضوعات پر لکھے گئے۔

(ب) مطبع نامی مجتبائی' دہلی سے شائع ہونے والے اردوئے معلّٰی کے ایڈیشن (اپریل ۱۸۹۹ء) مرتبہ محمد عبدالاحد کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ تو اصل اردوئے معلّٰی کا ہے۔ دوسرے حصے میں مولانا الطاف حسین حالی کے عطا کردہ "رقعاتِ غالب" (شعری اصلاحیں' ہدایات' کتابوں کے دیباچے' ریویو) اور ۵۳ خطوط شامل ہیں۔

(ج) ستمبر ۱۹۲۳ء میں شیخ مبارک علی' تاجر کتب لاہور نے مطبع کریمی سے ۳۲۰ صفحات پر مشتمل اردوئے معلّٰی کا جو ایڈیشن شائع کیا' اس میں قدر بلگرامی کے نام غالب کے بائیس خطوط اور شیخ لطیف احمد بلگرامی کے نام ایک خط کو بھی شامل کیا۔ (یہ تیئیس خطوط مولانا حسرت موہانی نے مجلہ اردوئے معلّٰی' علی گڑھ --- دسمبر ۱۹۰۷ء میں شائع کیے تھے۔)

(د) ۱۹۶۹ء میں جشنِ غالب کی رعایت سے سید مرتضیٰ حسین فاضل نے اشاریے اور حواشی سے مزیّن اردوئے معلّٰی کا جامع ایڈیشن شائع کیا مگر یہ سعی اس لحاظ سے خاطر خواہ پذیرائی حاصل نہ کر سکی کہ اس میں تنقیدی جاں فشانی سے کام نہیں لیا گیا اور ان گنت غلطیاں راہ پا گئیں۔

۴ - ادبی خطوطِ غالب :

۳۰۴ صفحات پر مشتمل' ۱۹۳۹ء میں نظامی پریس لکھنؤ سے شائع ہونے والے اس مجموعے میں مرزا محمد عسکری نے ایسے خطوط کا انتخاب کیا جن میں غالب نے ادبی موضوعات و نکات کو زیر بحث لا کر سخن وروں کے شعری مقام پر رائے زنی کی ہے اور اشعار کے مطالب واضح کیے ہیں۔ اس مجموعے کے آخر میں تینتیس مکتوب الیہم کے احوال پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

۵ - مکاتیبِ غالب :

مرزا غالب' نوابانِ ریاست رام پور (نواب یوسف علی خاں اور ان کے صاحبزادے نواب کلب علی خاں) کے استاد تھے۔ وہ دربارِ رام پور سے سو روپیہ ماہوار تنخواہ بھی پاتے تھے۔ فریقین کے مابین عرصۂ دراز تک مراسلت کا سلسلہ جاری رہا اور غالب کے خطوط کا خاصا بڑا حصہ "محکمۂ عالیہ دارالانشا رام پور" میں محفوظ ہو گیا۔ ۱۹۳۶ء میں ریاست کے وزیرِ اعلیٰ کرنل بشیر حسین زیدی نے مولانا امتیاز علی عرشی کو ان خطوط کی تدوین کا کام سونپا۔ چنانچہ ۱۹۳۷ء میں ۱۱۷ خطوط (۱۱۳ اردو اور ۴ فارسی) پر مشتمل مکاتیبِ غالب مطبع قیمہ' بمبئی سے شائع ہوئے جنہیں جدید اصولِ تحقیق کی روشنی میں تعارف' اشاریے اور حواشی سے آراستہ کیا گیا تھا۔

۶ - خطوطِ غالب :

مہیش پرشاد کی دیرینہ آرزو تھی کہ تمام خطوطِ غالب کو یک جا کیا جائے چنانچہ انہوں نے بڑی جستجو کے بعد (مطبوعہ و غیر مطبوعہ) خطوط کی پہلی جلد' ۱۹۴۱ء میں ہندوستانی اکیڈمی' الہ آباد سے شائع کی۔ بدقسمتی سے یہ پراجیکٹ دو سانحات کا شکار ہو گیا --- ایک تو مہیش پرشاد کا انتقال ہو گیا' دوسرے ان کی مرتّبہ دوسری جلد کا مسودہ انجمن ترقیٔ اردو' ہند کے دفتر سے گم ہو گیا۔ ۱۹۶۲ء میں مالک رام کی نظرِ ثانی کے بعد انجمن نے پہلی جلد کا دوسرا

ایڈیشن شائع کیا جس میں منشی نبی بخش حقیر اور ان کے فرزند منشی عبداللطیف کے نام غالب کے خطوط کا اضافہ کیا گیا۔

۷ - نادراتِ غالب :

منشی نبی بخش حقیر کے نام غالب کے ۳۷۷ خطوط اور ان کے صاحبزادے منشی عبداللطیف کے نام ایک خط پر مشتمل یہ مجموعہ، غالب کے نامور شاگرد میرن صاحب کا مرتبہ تھا جسے ان کے نواسے آفاق حسین آفاق نے ۱۹۴۹ء میں ادارۂ نادرات کراچی سے شائع کیا۔

۸ - خطوطِ غالب :

غلام رسول مہر نے ۱۹۵۱ء میں کتاب منزل لاہور سے خطوطِ غالب کا جامع مجموعہ شائع کیا مگر انہوں نے "مکاتیبِ غالب" اور "نادراتِ غالب" کے مواد سے صرفِ نظر کیا۔ یوں غالب کے تمام خطوط یکجا شائع نہ ہو سکے۔ نیز کئی اغلاط کے باعث اس مجموعے کا تحقیقی مقام ثقاہت سے محروم ہو کر رہ گیا۔

۹ - غالب کی نادر تحریریں :

خلیق انجم کا مرتبہ یہ مجموعہ ۱۹۶۱ء میں مکتبہ شاہراہ دہلی سے شائع ہوا جس میں مختلف لوگوں کے نام غالب کے ایسے ۴۹ خطوط شامل ہیں جو "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلّیٰ" میں شائع نہیں ہو سکے تھے۔ علاوہ ازیں ۱۹ مختلف تحریریں بھی اس کتاب کی زینت ہیں تاہم رواروی میں کیا ہوا یہ کام کوئی خاص ادبی وقعت نہیں رکھتا۔

۱۰ - غالب کے خطوط :

غالب کے تمام خطوط کو یکجا کرنے کا خواب، مہیش پرشاد نے دیکھا تھا اور ۱۹۴۱ء میں اس کی جُزوی تعبیر (جلد اول) بھی سامنے آگئی تھی مگر ان کی ناگہانی وفات سے یہ کام کھٹائی میں پڑ گیا۔ ۱۹۵۱ء میں غلام رسول مہر نے "خطوطِ غالب" کی شکل میں اس سلسلے کو آگے بڑھایا مگر عدمِ توجہی اور اغلاط کے باعث ان کی ریاضت بے ثمر رہی۔ آخر نامور محقق و نقاد ڈاکٹر خلیق انجم، معتمد انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) نے خطوطِ غالب کا تنقیدی ایڈیشن تیار کرنے کا ڈول ڈالا اور غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کے پلیٹ فارم سے غالب کے تمام دستیاب خطوط چار جلدوں (اول ۱۹۸۴ء، دوم ۱۹۸۵ء، سوم ۱۹۸۷ اور چہارم ۱۹۹۳ء) میں شائع کر دیے۔ اس تنقیدی ایڈیشن کو جدید اصولِ تحقیق کے مطابق ترتیب دیا گیا ہے نیز رموزِ اوقاف، خطوط کی تاریخ وار ترتیب، دستیاب خطوط کے ۱۲۸ عکسوں اور عہدِ رواں کی مانوس املا کے ذریعے ان خطوط کو قارئین کے لیے مفید تر بنایا گیا ہے۔

بات یہ ہے کہ کام کتنا ہی وقیع کیوں نہ ہو، بشری کوتاہیوں سے مُبرّا نہیں ہوتا۔ چنانچہ ڈاکٹر خلیق انجم کے مرتبہ "غالب کے خطوط" میں بھی کہیں کہیں ایسے تسامحات موجود ہیں جن کی نشاندہی ضروری ہے :

(i) ڈاکٹر خلیق انجم نے جلد اول (کراچی ایڈیشن ۱۹۸۹ء، انجمن ترقیٔ اردو پاکستان) میں "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلّیٰ" (مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل) کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے صفحہ ۵۵ پر لکھا ہے :

> "پھر ان مجموعوں میں خطوط تاریخ وار مُرتّب نہیں کیے گئے۔ "اردوئے معلّیٰ" کے پہلے ایڈیشن میں سب سے پہلے میر غلام بابا خاں بہادر کے نام خطوط ترتیب دیے گئے ہیں اور یہ ترتیب اس طرح ہے کہ پہلا خط ۲۲ مارچ ۱۸۶۶ء کا، دوسرا ۶ ستمبر ۱۸۶۳ کا، تیسرا ۳ اپریل

۱۸۶۷ء کا‘ چوتھا ۶ اپریل ۱۸۶۴ء کا اور پانچواں ۹ اگست ۱۸۶۶ء کا۔ باقی تمام خطوط کی ترتیب اسی طرح ہے۔ ظاہر ہے کہ ترتیب کا یہ طریقہ بہت غلط ہے۔"

مگر یہی غلط طریقہ "غالب کے خطوط" میں بھی اختیار کیا گیا ہے :

○ جلدِ اول : علاء الدین علائی کے نام خط ۱۴ کے آخر میں صفحہ ۳۸۱ پر --- "دو شنبہ نہم رجب ۱۲۸۰ھ‘ ۲۱ دسمبر ۱۸۶۳ء" کی تاریخ درج ہے مگر پندرھویں خط سے پچیسویں خط تک ۱۸۶۲ء کی مختلف تاریخیں اور چھبیسویں خط سے پینتیسویں خط تک ۱۸۶۳ء کی مختلف تاریخیں دی گئی ہیں۔ پینتیسویں خط کے آخر میں ۱۳ دسمبر ۱۸۶۳ء تحریر ہے۔ چنانچہ خط نمبر ۱۴ (محررہ ۲۱ دسمبر ۱۸۶۳ء) کو چھتیسویں خط کی حیثیت سے آنا چاہیے۔

○ جلد دوم :

(الف) میر مہدی مجروح کے نام خط ۲۹‘ ۳۰ بالترتیب ۹ جنوری ۱۸۶۱ء اور ۱۱ جنوری ۱۸۶۱ء کو لکھے گئے ہیں لیکن خط ۳۱ پر ۱۸۶۰ء مرقوم ہے۔ تاریخی ترتیب کے اعتبار سے اسے خط ۲۸ محررہ ۱۸ دسمبر ۱۸۶۰ء کے بعد خط ۲۹ کی حیثیت سے آنا چاہیے۔

(ب) بابو ہرگوبند سہائے نشاط کے نام دو خطوط ہیں۔ پہلا خط ۲۹ دسمبر ۱۸۵۸ء کا ہے جب کہ دوسرے پر جنوری ۱۸۵۸ء رقم ہے۔ یہ ترتیب الٹ گئی ہے۔ دوسرے خط کو پہلا اور پہلے کو دوسرا ہونا چاہیے۔

○ جلد سوم :

(الف) منشی شیو نارائن آرام کے نام خط ۶ پر ستمبر ۱۸۵۸ء کی تاریخ دی گئی ہے۔ مگر خط ۵ کے آخر میں صفحہ ۱۰۵۵ پر ۱۹ اکتوبر ۱۸۵۸ء درج ہے۔ اسے خط ۶ اور خط ۶ کو ۵ ہونا چاہیے۔

(ب) منشی نبی بخش حقیر کے نام خط ۶۷ صفحہ ۱۱۷۴ پر ۲۰ اگست ۱۸۵۶ء مرقُوم ہے جب کہ خط ۶۸ کو جو ۵ اگست ۱۸۵۶ء کو لکھا گیا تھا‘ بعد میں لایا گیا ہے۔ ترتیب کے لحاظ سے اسے پہلے آنا چاہیے۔

تبھی ڈاکٹر خلیق انجم کا یہ دعویٰ مبنی بر صحت قرار دیا جا سکتا ہے کہ --- "میں نے بھی تمام خطوط تاریخ وار ترتیب دیے ہیں۔" (جلد اول صفحہ ۱۷)

(ii) جلد اول صفحہ ۲۲ پر "مکتوب الیہ کے حالات" کے ضمن میں ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں :

"میں نے مکتوب الیہم کے حالات خاصے تفصیل سے لکھے تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میرے عزیز دوست کاظم علی خاں نے تمام مکتوب الیہم کے حالات بڑی محنت سے لکھ لیے ہیں اور کتابی صورت میں شائع کر رہے ہیں اس لیے میں نے یہ حالات بہت مختصر کر دیے۔"

مگر یہ "مختصر حالات" ہیں کہاں؟ --- چاروں جلدیں کھنگال جایئے‘ مکتوب الیہم کے احوال کا کہیں ذکر تک نہیں البتہ --- "غالب کے خطوں میں جن شخصیتوں‘ جن رسالوں‘ کتابوں‘ اخباروں اور جن مختلف مقامات کا ذکر آیا ہے‘ ان پر "جہانِ غالب" کے نام سے حواشی لکھے گئے ہیں۔" یہ نہایت مستحسن تحقیقی کارنامہ ہے۔ مگر اس کارنامے کو دیکھ کر قاری پر --- لب و چشم تشنہ‘ دل و روح تشنہ ---- کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کیونکہ حواشی فقط جلد اول کے ہیں جنہیں جلد چہارم میں صفحہ ۱۶۴۷ سے ۱۷۳۹ تک پھیلا دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی یہ اعلان کیا گیا ہے :

"یہ حواشی تقریباً تیار ہیں اور ان کے بڑے حصے کی کتابت بھی ہو چکی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ

"جہانِ غالب" کا حجم اتنا ہو گیا ہے کہ خود اس کے لیے دو جلدیں درکار ہیں۔ خطوط غالب کی پہلے ہی چار جلدیں ہو چکی ہیں۔ اس مجموعے کے ساتھ اب اس مواد کو شائع کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں ہے"۔ (جلد چہارم : حرف آغاز : صفحہ ۱۴۰۸)

غالب پرستوں کو اس دن کا انتظار ہے جب "جہانِ غالب" کا کتابت شدہ مواد مکتوب الیہم کے احوال و کوائف سمیت مطبوعہ شکل میں ان کے وجدان کو روشن روشن کر ڈالے گا۔

(iii) جلد دوم صفحہ ۷۶۰ پر "سندِ جانشینی بنام نواب علاء الدین احمد خاں علائی" کا عکس دیا گیا ہے۔

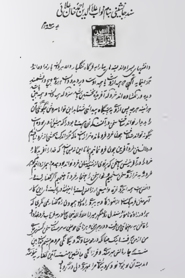
سندِ جانشینی بنام نواب علاء الدین احمد خان علائی

یہ سند کشورِ سخن کے تاجدار غالب نے علائی کی متنوع علمی صلاحیتوں کی تحسین کے طور پر عطا کی۔ علائی فارسی، ترکی اور عربی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ نیز اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اس سندِ جانشینی کے حوالے سے دو نکات بحث طلب ہیں :

(الف) اصولی اعتبار سے اس سندِ جانشینی کو غالب کے خطوط (جلد اول) میں علائی کے نام خط ۱۲ کے ساتھ آنا چاہیے جس میں اس کے عطا کیے جانے کا تذکرہ ہے :

"میری جان، کیا کہتے ہو؟ کیا چاہتے ہو؟ ہوا ٹھنڈی ہو گئی، پانی ٹھنڈا ہو گیا۔ فصل اچھی ہو گئی، اناج بہت پیدا ہو گیا۔ توقیع جانشینی مجھ سے تم کو پہنچا۔ خرقہ پہنچا۔ سجدہ و سجادہ کا یہاں پتا نہیں، ورنہ وہ بھی عزیز نہ رکھتا۔ (۵ اکتوبر ۱۸۶۱ء)"

شاید یہ دستاویز (جو خط کی تعریف پر پوری نہیں اترتی) جلد اول کی تدوین کے بعد دستیاب ہوئی۔ اس صورت میں بہتر نہ تھا کہ اسے جلد دوم کے "حرفِ آغاز" یا "حواشی" میں تعارفی نوٹ کے ساتھ شائع کیا جاتا؟ اردو خطوط (اور وہ بھی غیر متعلق) کے درمیان محض خالی جگہ پر کرنے کے لیے اس فارسی دستاویز کی عکس نمائی کا کوئی جواز نہیں۔

(ب) اس خط سے یہ بات حتمی طور پر واضح ہو رہی ہے کہ توقیع جانشینی ۵ اکتوبر ۱۸۶۱ء سے پہلے علائی تک پہنچ چکا ہے جب کہ سندِ جانشینی کی پیشانی پر ۱۸۶۳ء لکھا گیا ہے۔ تو پھر یہ اختلاف کیسا ہے؟ --- ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سندِ جانشینی پر یہ سن بعد میں کسی ذاتِ شریف نے محض انکل سے لکھ دیا گیا ہوگا۔

(iv) جلد دوم (دہلی ایڈیشن ۱۹۸۵ء) کے صفحہ ۷۹۷ پر محمد زکریا خاں زکی دہلوی کے نام خط کا حوالہ متن کے ماخذ میں صفحہ ۸۷۷ پر ہے لیکن صفحہ ۸۷۹ پر بھی محمد زکریا خاں زکی اور خط کے متن کے حوالے کا اعادہ کیا گیا ہے حالانکہ یہاں ---

میر محمد زکی زکی

یہ سگ دنیا کہ اسد کہلاتا ہے اور تخلص اپنا غالب بتاتا ہے ------ ۱۲۶۷ھ

آنا چاہیے۔ (دیکھئے صفحہ ۸۲۱ - ۸۲۳))

(v) جلد دوم صفحہ ۸۳۳٬۸۳۲ پر بابو ہرگوبند سہائے نشاط کے نام دو خط موجود ہیں مگر مکتوب الیہم کی فہرست میں اس کا اندراج نہیں ہو سکا۔ اسے فہرست کے صفحہ ۲ پر ۴۷ نمبر کے تحت لکھا جانا چاہیے۔ یوں فہرست میں مکتوب الیہم ۴۸ ہو جائیں گے۔

(vi) (دہلی ایڈیشن ۱۹۸۵ء) کے حرفِ آغاز میں ڈاکٹر خلیق انجم نے "غالب کے خطوط" کی طباعتی کوتاہیوں کی

طرف توجہ مبذول کرانے والے اصحاب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ نوید سنائی تھی کہ ---- "چوتھی جلد میں "استدراک" کے عنوان کے تحت ان حضرات ہی کے حوالے سے تسامحات کی نشاندہی کی جائے گی" --- چوتھی جلد میں غالب کے اردو خطوط کی مجموعی تعداد کے ضمن میں صفحہ ۱۳۱۲ کے آخر میں بھی "استدراک" کا اشارہ ملتا ہے --- "یہ خط دراصل حکیم غلام نجف خاں کے نام ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے "استدراک" --- اب آپ ساری چوتھی جلد (بلکہ باقی تینوں جلدوں) کی چھان پھٹک کر جائیے" "استدراک" کے عنوان سے کہیں کوئی مواد نہیں ملے گا۔

(vii) جلد سوم میں کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر :

(الف) نواب انورالدولہ سعد الدین خاں بہادر شفق کے نام غالب کے خط کے آخر میں صفحہ ۹۸۳ پر "ہژدہم اکتوبر ۱۸۵۵ء" لکھا ہے مگر متن کے مآخذ میں صفحہ ۱۳۱۰ پر خط ۳ کے تحت "ہردہم" کتابت ہو گیا ہے۔

(ب) صفحہ ۱۰۳۵ء پر خط ۸ بنام سید احمد حسن مودودی کی محررہ تاریخ ۲۵ دسمبر ۱۸۶۶ء نہیں' ۲۵ ستمبر ۱۸۶۶ء ہے۔ اس کی تصدیق "متن کے مآخذ" میں صفحہ ۱۳۱۶ پر دی ہوئی محوّلہ تاریخ سے ہوتی ہے۔

((ج) صفحہ ۱۰۸۴ء پر منشی شیو نرائن کے خط ۳۴ کے آخر میں ۳ جولائی ۱۹۶۰ء مرقوم ہے جب کہ یہ سن ۱۸۶۰ء ہونا چاہیے۔

(د) منشی نبی بخش حقیر کے نام خط ۵۷ کو ۲۷ لکھ دیا گیا ہے۔ (صفحہ ۱۱۲۴)

(ہ) نواب یوسف علی خاں ناظم کے نام خط ۹ کے آخر میں ۱۸ اپریل ۱۸۵۹ء لکھا ہے۔ مگر متن کے مآخذ میں صفحہ ۱۳۳۰ پر ۱۰ اپریل نظر آتا ہے۔

(viii) جلد چہارم (دہلی ایڈیشن ۱۹۹۳ء) میں --- غالب کے اردو خطوط کی مجموعی تعداد" --- میں کئی فروگذاشتیں راہ پا گئی ہیں :

(الف) صفحہ ۱۳۱۱ پر "بجناب" سید محمد عباس علی خاں" کے ۲ خطوط جلد چہارم میں ہیں جب کہ یہاں جلد ۲ لکھا گیا ہے۔

(ب) صفحہ ۱۳۱۲ پر "ظہیرالدین کی طرف سے انکے چچا کے نام" خط کو جلد چہارم میں شامل دکھایا گیا ہے حالانکہ یہ خط جلد سوم میں صفحہ ۱۰۴۰ پر موجود ہے۔

(ج) محمد حسین خاں (مدیر "دبدبۂ سکندری") کے نام خطوط جلد ۳ میں نہیں بلکہ ۴ میں ہیں۔ (جلد چہارم صفحہ 1585 تا 1588)۔

(د) صفحہ ۱۳۱۳ پر "مدہوش مفتی سخاوت حسین انصاری" تحریر ہے حالانکہ یہ مکتوب الیہ منشی سخاوت حسین انصاری ہیں جن کے نام غالب کا خط جلد سوم کے صفحہ ۱۰۳۷ پر موجود ہے۔ "منشی" اور "مفتی" کے الفاظ اشتباہ پیدا کرتے ہیں۔

(ہ) صفحہ ۱۳۱۴ پر غالب کے اردو خطوط کی مجموعی تعداد ۸۸۶ درج ہے۔ اس جدول کے مطابق تو یہ تعداد صحیح ہے مگر اس کے اندراجات درست نہیں :

- ذکا' محمد حبیب اللہ کے نام خطوط ۱۷ کی بجائے ۱۶ ہیں (جلد چہارم صفحہ ۱۵۲۰ تا ۱۵۳۷)
- ذکی' میر محمد ذکی کے نام ۲ نہیں' صرف ایک خط لکھا گیا تھا۔ (جلد دوم' صفحہ ۸۲۱ تا ۸۲۳)

ان تصحیحات کے بعد کل خطوط کی تعداد ۸۸۶ نہیں بلکہ ۸۸۳ بنتی ہے۔

○ "غالب کے اردو خطوط کی مجموعی تعداد" میں ان چھ مکتوب الیہم کا اندراج ہی نہیں ہو سکا :

کل خطوط صفحہ نمبر		جلد	مکتوب الیہم
۱۵۹۸	۱	۴	۱ ۔ ظہیرالدین دہلوی، حکیم
۷۴۰ - ۷۳۹	۱	۲	۲ ۔ محب علی حکیم
۱۴۷۳	۱	۴	۳ ۔ محمد حسین خاں
۸۱۰ - ۸۰۹	۱	۳	۴ ۔ محمد محسن (صدر الصدور)
۷۳۶ - ۷۳۵	۱	۲	۵ ۔ محمود مرزا
۱۵۶۷ - ۱۵۶۶	۱	۴	۶ ۔ مظہر علی اور عبداللہ

○ یہ مکتوب الیہم "غالب کے اردو خطوط کی مجموعی تعداد" میں نظر نہیں آتے۔ ان کی شمولیت سے کل خطوط کی تعداد ۸۹۰ (۸۸۳ + ۶) بنتی ہے۔

○ ڈاکٹر خلیق انجم نے جلد چہارم صفحہ ۱۳۰۸ پر لکھا ہے --- "میرے مُرتّبہ مجموعے میں مکتوب الیہم کی مجموعی تعداد بانوے ہے" --- یہ اطلاع محلِ نظر ہے کیونکہ اس فہرست کے مطابق مکتوب الیہم ۹۱ بنتے ہیں۔ علاوہ ازیں چاروں جلدوں میں شامل مکتوب الیہم (ڈاکٹر خلیق انجم کی تیار کردہ فہرست کے ۹۱ اور حذف شدہ ۶) کی کل تعداد ۹۷ قرار پاتی ہے۔ یوں ان کے اس دعوے میں ترامیم کی گنجائش موجود ہے کہ ---- "میرے مُرتّبہ مجموعے میں مکتوب الیہم کی مجموعی تعداد بانوے ہے' جن میں پانچ مکتوب الیہم نامعلوم ہیں لیکن خطوں کی مجموعی تعداد ۸۸۶ ہے۔"

(و) صفحہ ۱۵۹۳ پر عبدالرحمٰن تحسین کے نام خط ۶ کے ابتدائی شعر کے دوسرے مصرع کی ردیف --- "دل ماریخت" میں سے "دل" غائب ہو گیا ہے۔ صحیح مصرع یوں ہے --- صد توده معنی بہ دماغ دل ما ریخت۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن --- غالبیات اور خطوط غالب

"غالب کے خطوط" (مُرتّبہ : ڈاکٹر خلیق انجم) کی جلد اول میں اس کارِ گراں کے منظر اور پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے جمیل الدین عالی' معتمد اعزازی' انجمن ترقیٔ اردو' پاکستان نے لکھا تھا --

> "یقیناً غالب کے چھپے ہوئے خطوط اتنے ہو چکے ہیں کہ اب دو' چار' دس' بارہ نئے خطوط سے بھی ان کے ماحول' فکر' حیات و معاملات کے ضمن میں کسی قابل ذکر اضافے کا امکان بہت کم رہ گیا ہے۔ اس کے علاوہ اہم ترین بات یہ کہ خطوط غالب کی اول اور سب سے بڑی خوبی ان کی ادبی حیثیت تھی اور ہے۔ مزید خطوط اس لحاظ سے کوئی نئی روشنی نہیں دکھا سکیں گے۔" --- (حرفے چند : صفحہ ی)

مگر غالبیات کے شناور ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے نئی روشنی دکھاتے ہوئے منشی نبی بخش حقیر کے نام غالب کے پانچ خطوط کا مستند متن شائع کر دیا۔ اس بازیافت کی داستان بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن لکھتے ہیں :

"میرے ذخیرۂ غالبیات میں میر افضل حسین (اصل نام، افضل علی) عرف میرن صاحب (متوفی ۲۹ جنوری ۱۹۱۴ء) کی قلمی بیاض موجود ہے جس میں میرن صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی غالب اور مجروح کے کچھ خطوط کی نقلیں محفوظ ہیں۔ منشی نبی بخش حقیر کے نام غالب کے ان پانچ نادر خطوں کے لیے میرا ماخذ میرن صاحب کی یہی قلمی بیاض ہے۔ حقیر کے نام تین خط (نمبرا، ۲ اور ۴) "نادراتِ غالب" مُرتّبہ آفاق حسین آفاق، طبع اول، کراچی ۱۹۴۹ میں شامل ہیں۔ دو خط (نمبر ۳ اور نمبر ۵) "نادراتِ غالب" طبعِ دوم، کراچی ۱۹۹۲ء میں پہلی بار شامل ہوئے۔" (نقوشِ غالب : الوقار پبلی کیشنز ۵ لوئر مال لاہور، مطبوعہ ۱۹۹۵ء صفحہ ۱۹۷ء)

ان خطوط کی استنادی حیثیت اس اعتبار سے مُسَلّم ہے کہ یہ غالب کے لاڈلے شاگرد میر افضل علی، میرن کے قلم سے لکھے ہوئے ہیں جو غالب کو اپنا پیشوا اور مرشد کا درجہ دیتے تھے۔ ان کے لیے غالب کا حرف حرف تبرّک سے کم نہ تھا لہٰذا انہوں نے ان خطوط کی نقل یقیناً انتہائی احتیاط و عقیدت سے کی ہوگی۔ اسی بنا پر خطوطِ غالب کی ان اولین نقول کو انمول مخطوطات اور غالبیات کے معتبر مآخذ کا درجہ حاصل ہے۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے ان خطوط کو ان کے زمانۂ تحریر کے لحاظ سے ترتیب دیا ہے :

پہلا خط	مؤرّخہ ۱۰ مارچ ۱۸۴۸ء
دوسرا خط	مؤرّخہ ۴ جون ۱۸۴۸ء
تیسرا خط	مؤرّخہ ۲۷ جنوری ۱۸۵۱ء
چوتھا خط	مؤرّخہ ۲۱ مئی ۱۸۵۲ء
پانچواں خط	مؤرّخہ ۳۱ دسمبر ۱۸۵۲ء

○ ان خطوط میں سے تیسرا اور پانچواں خط غالب کے خطوط (مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم) میں موجود نہیں کیونکہ یہ دونوں خطوط "نادراتِ غالب" (طبعِ اول ۱۹۴۹ء) میں شامل نہیں کیے گئے تھے بلکہ طبعِ دوم ۱۹۹۲ء میں پہلی بار غالب دنیا کے سامنے آئے۔ اس وقت تک ڈاکٹر خلیق انجم "غالب کے خطوط" کی تدوین کر چکے تھے۔۔۔

"غالب کے خطوط کی ترتیب کا کام ۱۹۷۲ء میں شروع کیا گیا تھا اور یہ کام اب ۱۹۹۱ء میں ختم ہو رہا ہے۔ گویا یہ کام ۱۷ سال کی طویل مدت میں پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے۔ سترہ برس کی اس طویل مدت کا فائدہ یہ ہوا کہ اب غالب کا شاید ہی کوئی ایسا اردو خط ہو جو اس مجموعے میں شامل نہ ہوا ہو۔ اس میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی مرحوم کے مُرتّبہ "مکاتیبِ غالب"، آفاق حسین آفاق کے مُرتّبہ "نادراتِ غالب" اور خلیق انجم کی مُرتّبہ "غالب کی نادر تحریریں" کے تمام خطوط شامل کر لیے گئے ہیں"۔ (حرفِ آغاز : جلد چہارم، صفحہ ۱۴۰۸)

○ باقی تینوں خطوط، غالب کے خطوط --- جلد سوم میں اس ترتیب سے موجود ہیں :

۱ - صاحب بندہ! میاں نسیم اللہ یہاں آئے ---	۹ مارچ ۱۸۴۸ء	صفحہ ۱۰۸۷
۲ - بندہ پرور! بہت دنوں سے میرا دھیان آپ میں لگا ہوا تھا ---	۴ جون ۱۸۴۸ء	صفحہ ۱۰۸۷ء
۱۶ - بھائی صاحب! آگے اس سے دو خط تم کو بھیج چکا ہوں ---	۲۱ مئی ۱۸۵۲ء	صفحہ ۱۱۰۹

منشی نبی بخش حقیر کے نام دو خطوط
جو "غالب کے خطوط" (مُرَتّبَہ ڈاکٹر خلیق انجم) میں شامل نہیں :

تیسرا خط

بھائی صاحب و قبلہ کو بندگی پہنچے۔ ایک خط آپ کا آگے آیا تھا اور ایک پرسوں آیا۔ لڑکوں کی تندرستی کی طرف سے خاطر جمع ہوئی۔ پروردگار ان کو بڑی بڑی عمریں اور تندرستیاں اور دولت مندیاں عطا کرے!

اپنا احوال تم، میں خوب جانتا ہوں کہ بہت مختصر لکھتے ہو۔ سر میں تمہارے کیا ہے؟ کوئی جراحت کوئی خراش --- کچھ نہ کچھ تو ہے۔ کیا کروں بھائی سوائے دعا کے کچھ مقدور نہیں۔ بندہ عاجز ہے۔ آفرید گار تم پر رحم کرے۔ میری اندوہناکی کا خیال نہ کرو۔ اپنا حال جو کچھ ہو لکھ بھیجا کرو۔ میں غم کا مچلا ہوں، مجھ کو غم سے ضرر نہیں۔ یہ غضب ہے کہ مجھ کو حال نہ معلوم ہو۔ اس کی تاب نہیں لا سکتا، غم کی تاب لا سکتا ہوں۔

اب میرا حال سنو --- جب بادشاہ کا نوکر ہوا تو میں نے سنگی نہیں کی۔ خرچ نہ بڑھایا۔ وہ ہی تین آدمی بدستور رہے۔ کہار نوکر نہیں رکھے۔ لباس میں تکلف نہیں کیا۔ وہ ہی فقیرانہ لباس رکھا مگر کیا ہوا کہ قریب سو روپے کے خلعت و خطاب کے نذرانے میں صرف ہوا۔ اور دوسرے یہ ہوا کہ مجھ پا شکستہ گوشہ نشین کو چوتھے پانچویں قلعے جانا پڑا --- دس سواریاں مہینے کی ہوئیں تو پانچ اور بارہ ہوئیں تو چھ روپیہ مہینہ دینا پڑا۔ کاغذ اور قلم سیاہی کا کچھ صرف سمجھ لیجئے۔ عیدین کی، نوروز کی نذریں بیگم صاحبہ کی، ولی عہد کی، اس کو سمجھ لیجئے --- بادشاہ کی نذر تو اپنا کلیجہ کھرچا اور قصیدہ دے دیا مگر آٹھ روپے ان دونوں صاحبوں کے ضرور۔ اولش آیا، خاصہ آیا اس کا انعام، پھولوں کا ہار آیا اس کا انعام، یہ جزویات علاحدہ۔

انگریزی تنخواہ کا حال سنیے --- اکسٹھ روپے آٹھ آنے : اس میں سے ایک روپیہ مختار کار کا اور ۳۳ محل کے، ۳۴ گئے --- ۲۷ روپے آٹھ آنے بچے۔ اس میں فقیر کے تکیے کا خرچ --- سقاو دھوبی، حجام، خدمت گار، تماکو، کوئلے، کپڑا، قرض کی اقساط، جو جو کچھ تصور کیجئے، وہ اس میں۔

جولائی ۱۸۵۰ء کے مہینے سے بادشاہ کا نوکر ہوا۔ پندرہ روپے، مہینا ایک دوست سے ہر مہینے قرض لیا۔ اب دسمبر ۱۸۵۰ء تک میری شش ماہی پوری ہوئی۔ جنوری ۱۸۵۱ء کی اٹھارہویں تاریخ تین سو مجھ کو ملے۔ نوے تو وہ کٹ گئے۔ دو سو دس آئے۔ سو گھر میں دیے۔ ایک سو دس روپیہ کیوں کر بنا لوں۔

قرض داران متفرق مجھ کو کھا گئے --- مثلاً بیس روپے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تین سو آئے، ہمارے بیس نہیں دیے۔ علیٰ ہذا القیاس دس والا اور سو والا اور پانچ والا یہی کہتا ہے اور حق بجانب ان کے ہے۔ ران کا گھاؤ ران جانے یا راؤ (ن) --- وہ کیا جانیں کہ تین سو کیا ہوئے؟ بہرحال ان دنوں میں

عوارضِ جسمانی سے بالکل فارغ اور آلامِ روحانی میں اس طرح گرفتار ہوں کہ سانس لینا دشوار ہے --- یہ قصہ تو ختم ہوا۔

اب آپ میرے سوالات کا جواب لکھیئے۔ میاں تفتہ جو اجمیر گئے ہیں، کیوں گئے ہیں؟ کہیں سے مجھ کو اس بندہ خدا نے خط نہیں بھیجا۔ اگر تم کو کوئی خط آیا ہو تو مجھ کو اطلاع دو۔ فقط جانی بانکے رائے نے جو اوراق تواریخ منگوائے ہیں، بے واسطہ غیر تم سے منگوائے ہیں یا بتوسط منشی ہرگوپال تفتہ --- آیا تمہاری بھی جانی بانکے رائے سے ملاقات ہے یا نہیں؟ مجھ سے اس سے ایک دن جارج جوزف صاحب، ایک میرا دوست ہے، اس کے ہاں ملاقات ہوئی تھی۔ ایک ملاقات میں کیا حال معلوم ہو۔ آیا وہ شخص کچھ سخن فہم بھی ہے یا یوں ہی بطریق ہوس وہ نثر منگائی ہے۔ اب جانی بانکے رائے کہاں ہے؟ آگرہ میں یا بھرت پور میں، ان سب باتوں کا جواب لکھیئے۔ جو معلوم (نہ) ہو اس کو کہیں سے معلوم کرکے لکھیئے اور جلد لکھیئے۔ لڑکوں کو دعا پہنچے۔

بھائی، دن بھر مجھ کو ہجوم تقاضائیان بازاری سے فرصت نہیں۔ خط تم کو رات کو لکھا ہے، سراسیمہ وار --- ہائے ہائے داد دینا کہ کس حال میں ہوں اور کیا نثر لکھ رہا ہوں۔ سچ تو یوں ہے کہ بڑا بے حیا ہوں۔ ہمایوں کا حال جو، اب دیکھو گے تو پچھلی نثروں کو بھول جاؤ گے۔ حالانکہ ان نثروں نے "پنج آہنگ" کی نثریں بھلا دی ہوں گی۔

در جنوں بیکار نتواں زیستن
آتشم تیز است و دامان میزنم

والسلام

نگاشتہ شب دو شنبہ و فرستادہ صبح دو شنبہ ۲۷ جنوری ۱۸۵۱ء

پانچواں خط

بھائی صاحب!

تم غزل کی تعریف کرتے ہو اور میں شرماتا ہوں۔ یہ غزلیں کاہے کو ہیں، پیٹ پالنے کی باتیں ہیں سو بھی روٹیاں نہیں، دال سالن --- یعنی میرے فارسی کے وہ قصیدے کہ جن پر مجھ کو ناز ہے، کوئی ان کا لطف نہیں اٹھاتا مگر بطریق اذعان کہ یہ شخص فارسی خوب کہتا ہے --- دادِ سخن کہاں اور ادراکِ پایۂ معنی کہاں۔

تاریخ تمریہ پان سات جزو جو آپ کے پاس بھیجے ہیں، میری خاطر نہ کیجئے، انصاف سے کہئے کہ یہ نثر کیسی اور ہے؟ اور پھر اس نثر کا کوئی مشتاق نہ ہو اور کوئی مجھ سے خواہش نہ کرے ---- ہرچند مجھ کو اس میں آسائش ہے اور قالب نثر میں ریختہ گری نہیں کرنی پڑتی مگر متاع کے حسن کی داد نہ ملے، یہی تو غضب ہے۔

خیر اب قدردانی منحصر کس بات پر ہے کہ گاہ گاہ حضرت ظلِّ سبحانی فرما بیٹھتے ہیں کہ بھئی تم بہت دن

سے کوئی سوغات نہیں لائے' یعنی ریختہ نیا --- ناچار کبھی کبھی یہ اتفاق ہوتا ہے کہ کوئی غزل کہہ کر لے جاتا ہوں ۔

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

یہی رنگ اب والی جے پور کا ہے کہ اس نے اخبار میں دیکھ کر اور لوگوں سے سن کر یہ جان لیا ہے کہ غالب بڑا شاعر ہے۔ بسبیل اذعان وہ بھی میرے کلام کے خواہاں ہوئے۔ میں تو بازار میں ایک دکان بے رونق لیے بیٹھا ہی ہوں۔ لنھیے' نیئو' نین سکھ کا ایک گٹھا باندھ کر ان کے پاس بھیج دیا۔ اگر انہوں نے خریداری کی تو اونے پونے سودا ہو جائے گا۔ صرف ایک ارسال ارمغان ابھی کیا ہے۔ اگر وہ میری عرضداشت کا جواب لکھیں گے اور میرے ارمغان کی تلافی کریں گے تو قصیدہ بھی ارسال کروں گا۔

اب یہاں بات میں سے بات نکلتی ہے کہ اس کا ظاہر کرنا منشی ہرگوپال صاحب پر واجب ہے۔ آپ یہ خط ان کو ضرور دکھایئے گا۔ وہ بات یہ ہے کہ میں نے دیوان ریختہ بہت تکلف سے بصرف زر کثیر لکھوایا ہے اور جلد انگریزی بہت قیمتی بنوائی اور جزودان بھی تکلف درست کیا اور چار پانچ لفافے مہری نواب گورنر جنرل کے' سکرٹر اعظم کے اور حضور والا کے شقے اور کالپی کی مصری اور ٹونک کے نواب کی اس میں رکھ کر بعد ادائے محصول بابو صاحب کی خدمت میں اجمیر روانہ کیا اور از روئے مزید احتیاط ایک خط جداگانہ بابو صاحب کو اس مراد سے لکھا کہ میری جان اس کتاب اور ان لفافوں میں الجھی ہوئی ہے ---- جس دن یہ خط اور یہ پارسل پہنچے' آپ اس کی رسید اسی دن مجھ کو لکھئے گا اور یہ انتظار نہ کیجئے گا کہ جب کوئی اس کے گزرنے کی راہ نکل آوے تب مجھ کو لکھیے --- اور بھائی یہ پارسل اور یہ خط جمعہ کے دن ۱۷ دسمبر کو روانہ کیا گیا ہے۔ اتفاق یہ کہ اسی دن ایک خط بھائی نفصل حسین خاں صاحب وکیل وزیر الدولہ بہادر کو بھی بھیجا گیا ہے۔ اس کے جواب آئے کو آج ساتواں دن ہے اور بابو صاحب نے اب تک پارسل کی رسید نہیں لکھی ---

آج اکتیسویں دسمبر کی' وہی جمعے کا دن ہے۔ حیران ہوں کہ میر نفصل حسین خاں کے نام کا خط اجمیر پہنچ بھی گیا اور اس کا جواب آ بھی گیا اور بابو صاحب کے نام کا نہ پارسل پہنچا نہ خط۔ یہ کیا اتفاق ہے' ڈرتا ہوں کہ کہیں ڈاک میں تلف نہ ہوا ہو۔ پھر یہ سوچتا ہوں کہ دوسرا خط اور یہ خط اور یہ پارسل ایک ہی ڈاک میں گئے ہیں۔ ایک پہنچے ایک نہ پہنچے اس کے کیا معنی؟

پھر یہ خیال کرتا ہوں کہ بابو صاحب اجمیر میں نہ ہوں گے' بھرتپور گئے ہوں گے' پارسل ان کی غیبت میں نوکروں نے ان کے' لے کر کہیں بے احتیاطی سے ڈال رکھا ہوگا --- ان افکار و اوہام کا فیصلہ جناب تفتہ کے کیے ہوگا --- یعنی بابو صاحب کا اجمیر میں ہونا ان کو معلوم ہوگا۔ اگر وہ اجمیر میں ہیں اور پارسل پہنچا تو کیا بعید ہے کہ انہوں نے کمالِ عنایت سے یہ چاہا کہ جب اس کی کوئی راہ نکال لوں' تب سائل کو جواب دوں --- مگر ہاں منشی صاحب کو بطریقِ اطلاع لکھ بھیجوں۔ اس صورت میں

احتمال ہے کہ انہوں نے تفتہ صاحب کو اطلاع دی ہو۔ کل بحشنبہ کا دن تھا۔ آخر وقت ڈاک کا ہرکارہ آیا' میں نے جانا اجمیر کا خط لایا ہے' اس نے تمہارا خط دیا۔ دل تو خوش ہوا اگر تشویش بنی رہی۔

آج میں نے تم کو یہ خط لکھا ہے' خود پڑھ لو اور منشی جی کو پڑھوا کر کہ اگر ان کو کچھ اجمیر سے لکھا آیا ہے تو وہ دریافت کر کر مجھ کو لکھو اور اگر' جیسا میرا گمان ہے' بابو صاحب اجمیر میں نہیں تو وہ مجھ کو لکھو اور اگر دونوں باتوں میں سے کوئی نہیں تو تفتہ صاحب کو یہ لازم ہے کہ اپنی طرف سے بابو صاحب کو لکھیں اور پارسل کے پہنچنے' نہ پہنچنے کا حال معلوم کریں۔

ہاں حضرت! پاکھل کا مربہ مجھ کو یاد ہے۔ حکیم نسیم اللہ صاحب میرے ہاں آئے تھے اور یقین ہے کہ پھر بھی آویں۔ خدا چاہتا ہے تو پاکھل کا مربہ ان کے ہاتھ پہنچتا ہے۔ میرے شیخ اکرام الدین اور اپنے عبدالسلام کو تم نے مخدوم جہانیاں جہاں گرد بنا رکھا ہے۔ کہیں تاج گنج' کہیں مرسان --- خط لکھتے وقت مجھ کو کول میں اس کا آنا یاد نہ رہا ہوگا' ورنہ کیوں کر اس کو دعا نہ لکھتا۔ بیٹے سے پوتا زیادہ عزیز ہوا کرتا ہے۔ اب سب سے پہلے اس کو دعا پہنچے پھر اس کے والد ماجد کو اور پھر میاں نصیر الدین کو اور اس کے بعد میری پیاری بھتیجی ذکیہ بیگم کو --- لو صاحب! اب تو آپ راضی رہے کہ جناب شیخ عبدالسلام صاحب کو سب سے پہلے یاد کیا---

بھائی صاحب! تم کو میرے سر کی قسم جس وقت یہ خط پہنچے' اسی وقت منشی ہرگوپال تفتہ پاس بھیج دینا اور ان کو تفہیم لکھ بھیجنا کہ اس کا جواب اسی دن یا دوسرے دن مجھ کو لکھیں۔

والسلام از اسد اللہ
نگاشتہ و رواں داشتہ جمعہ سی و یکم دسمبر پایان ۱۸۵۲ء
ضروری جواب طلب

خطوطِ غالب (اردو) کی مجموعی تعداد

ڈاکٹر خلیق انجم نے "غالب کے خطوط" کی پہلی اور چوتھی جلد میں خطوط کی مجموعی تعداد کی فہرستیں دی تھیں۔ پہلی جلد کی فہرست کو انہوں نے چوتھی جلد میں کالعدم قرار دے دیا۔ تاہم دوسری فہرست میں بھی کئی فروگذاشتیں ہو گئیں۔ (جن کی تصیح ہم viii - ہ میں کر آئے ہیں) ذیل میں ۱۹۹۵ء تک دستیاب ہونے والے تمام خطوط کی جامع فہرست دی جاتی ہے جس میں ۸۹۲ خطوط (ڈاکٹر خلیق انجم کے مرتبہ ۸۹۰ اور ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے متعارفہ ۲ خطوط بنام منشی نبی بخش حقیر) شامل ہیں۔

نمبر شمار	مکتوب الیہم	جلد	کل خطوط
۱	آرام' منشی شیو نرائن	۳	۳۶
۲	آزاد' مولانا محمد نعیم الحق	۲	۲
۳	آشوب' ماسٹر پیارے لال	۲	۵
۴	احمد حسن مودودی' سید	۳	۱۱

۵	احمد رام پوری، خلیفہ احمد علی	۴	۱
۶	افضل علی میرن، میر	۲	۳
۷	امین الدین احمد خاں، نواب	۲	۸
۸	مرزا میر (عرف) میر بندہ علی خاں	۲	۱
۹	بیتاب، سید محمد عباس علی خاں	۴	۲
۱۰	بے خبر، خواجہ غلام غوث خاں	۲	۲۵
۱۱	تحسین، عبدالرحمن	۴	۹
۱۲	تفتہ، منشی مرزا ہرگوپال	۱	۱۲۳
۱۳	تفضل حسین خاں	۳	۱
۱۴	توفیق، شہزادہ بشیرالدین	۲	۴
۱۵	ثاقب، مرزا شہاب الدین احمد خاں	۲	۱۰
۱۶	جنون بریلوی، قاضی عبدالجمیل	۴	۳۰
۱۷	جوہر، منشی جواہر سنگھ	۴	۳
۱۸	حسین مرزا (عرف) ذوالفقار الدین حیدر خاں	۲	۶
۱۹	حقیر، منشی نبی بخش	۳	۴۷
۲۰	خلیل و فوق، منشی محمد ابراہیم	۳	۱
۲۱	درد، منشی ہیرا سنگھ	۲	۲
۲۲	ذکا، محمد حبیب اللہ	۴	۱۶
۲۳	رحیم بیگ، مرزا	۴	۱
۲۴	رضوان، مرزا شمشاد علی بیگ	۲	۲
۲۵	رعنا، مردان علی خاں	۲	۲
۲۶	رفعت شروانی، محمد عباس	۲	۲
۲۷	زکی، دہلوی سید محمد زکریا خاں	۲	۱
۲۸	زکی، میر محمد زکی	۲	۱
۲۹	زین العابدین خاں (عرف) کلن میاں	۴	۲
۳۰	سالک، مرزا قربان علی بیگ خاں	۲	۲
۳۱	سجاد، سید معین الرحمن حیدر (عرف) سید سجاد مرزا	۲	۲
۳۲	سردار سنگھ، مہاراجا	۲	۱
۳۳	سرفراز حسین، میر	۲	۲
۳۴	سرور، چودھری عبدالغفور	۲	۲۷

۳۵	سیاح، میاں داد خاں	۲	۳۵
۳۶	سیل چند، منشی	۴	۷
۳۷	شائق، شاہ عالم مارہروی	۳	۳
۳۸	شاکر، مولوی عبدالرزاق	۲	۱۰
۳۹	شفق، انورالدولہ سعد الدین خان بہادر	۳	۲۰
۴۰	شیفتہ، نواب مصطفیٰ خاں بہادر	۲	۱
۴۱	صاحب عالم مارہروی	۳	۶
۴۲	صوفی منیری، شاہ فرزند علی (عرف) سید ابو محمد جلیل الدین حسین	۴	۱
۴۳	صفیر بلگرامی، سید فرزند احمد	۴	۶
۴۴	ضیا، مولوی ضیاء الدین احمد	۲	۳
۴۵	ظہیرالدین احمد خاں	۲	۲
۴۶	ظہیرالدین کی طرف سے ان کے چچا کے نام	۴	۱
۴۷	ظہیرالدین دہلوی، حکیم	۴	۱
۴۸	عباس بیگ، مرزا	۲	۱
۴۹	عبدالحق (یہ خط دراصل حکیم غلام نجف خاں کے نام ہے)	۲	۱
۵۰	عبداللطیف، منشی	۳	۲
۵۱	عرشی قنوجی، احمد حسن	۲	۲
۵۲	عزیز و صادق، عزیز الدین	۴	۱
۵۳	عزیز، مرزا یوسف علی خاں	۲	۳
۵۴	علائی، نواب علاء الدین احمد خاں	۱	۵۸
۵۵	غلام نجف خاں	۲	۲۳
		۴	۲
۵۶	غلام مرتضیٰ خاں، حکیم	۲	۱
۵۷	غلام رضا خاں حکیم	۴	۱
۵۸	غلام بسم اللہ، منشی	۲	۱
۵۹	غلام بابا خاں، میر	۳	۱۰
۶۰	فائق رضوی، قاضی محمد نورالدین حسین خاں	۴	۱
۶۱	فرخ مرزا، مرزا امیرالدین احمد خاں	۴	۱
۶۲	فرقانی میرٹھی	۲	۱
۶۳	قدر بلگرامی، سید غلام حسین	۴	۲۲

۶۴	کاشف' سید بدرالدین (عرف) فقیر	۳	۵
۶۵	کامل' مرزا باقر علی خاں	۲	۳
۶۶	کرامت علی' مولوی	۴۰	۱
۶۷	کلب علی خاں' نواب بہادر	۳	۷۶
۶۸	لطیف احمد بلگرامی' شیخ	۲	۱
۶۹	مجروح' میر مہدی حسین	۲	۵۰
۷۰	محب علی' حکیم	۲	۱
۷۱	محمد حسین خاں (مدیر دبدبہ سکندری)	۴	۴
۷۲	محمد حسین خاں	۴	۱
۷۳	محمد عباس' مفتی	۴	۱
۷۴	محمد محسن (صدرالصدور)	۲	۱
۷۵	محمود مرزا	۲	۱
۷۶	مدہوش' منشی سخاوت حسین انصاری	۳	۱
۷۷	مشتاق' بہاری لال	۳	۲
۷۸	مظہر علی اور عبداللہ	۴	۱
۷۹	مہر' مرزا حاتم علی	۲	۱۹
۸۰	میکش' میر احمد حسین	۲	۲
۸۱	مینا مرزا پوری' احمد حسین	۲	۲
۸۲	ناظم' نواب یوسف علی خاں	۳	۴۰
۸۳	نساخ' مولوی عبدالغفور خاں	۴	۱
۸۴	نشاط' بابو ہرگوبند سہائے	۲	۲
۸۵	نعمان احمد' مولوی	۴	۴
۸۶	نول کشور' منشی	۴	۲
۸۷	نیر' رخشاں' ضیاء الدین احمد خاں	۲	۱
۸۸	وفا' میر ابراہیم خاں نواب	۳	۵
۸۹	ولایت علی' میر	۴	۲
۹۰	ولایت و عزیز صفی پوری' ولایت علی خاں	۴	۲
۹۱	ہشیار' منشی کیول رام	۲	۱
۹۲	یوسف مرزا' نواب	۲	۱۲

۹۳	نامعلوم	۲	۱
۹۴	نامعلوم	۲	۱
۹۵	نامعلوم	۴	۱
۹۶	نامعلوم	۳	۱
۹۷	نامعلوم	۳	۱
	کل خطوط		۸۹۲

غالب کی فارسی نامہ نگاری

غالب کے اردو خطوط' بلاشبہ ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہی نہیں' غالب شناسی کے لیے منارۂ نور ہیں تاہم اس کثیر التحریر نابغۂ عصر کی تخلیقات کا گراں قدر حصہ اس کی نجی و سرکاری فارسی نامہ نگاری بھی ہے جس کا سلسلہ ۱۸۲۶ء سے ۱۸۶۸ء تک پھیلا ہوا ہے اور زمانی اعتبار سے اسے اردو خط کتابت پر تقدیم بھی حاصل ہے۔ یہ فارسی مراسلت اگرچہ پنج آہنگ (غالب)' نامہ ہائے فارسیٔ غالب (سید اکبر علی ترمذی : غالب اکیڈمی نئی دہلی : Persian Letters of Ghalib)' غالب کا مُقدّمۂ پنشن (انیس ناگی) اور نوادرات کے ضمن میں بعض عکسوں اور نقول کی صورت میں سامنے آ چکی ہے مگر غالب کے بہت سے فارسی خطوط جو ان کے اَعِزّہ' نوابانِ ریاست لوہارو یا ان کے شاگرد' نوابانِ رام پور کے نام لکھے گئے' غالب دنیا کی بدقسمتی سے تاحال پردۂ اخفا میں ہیں۔ اس المیے پر بحث کرتے ہوئے جمیل الدین عالی لکھتے ہیں ---

"راقم کا تعلق خانوادۂ لوہارو سے ہے۔ اس خاندان سے غالب کی سببی' علمی اور محبتانہ نسبت معروف ہے۔ ۱۹۴۲ء میں عمر تقریباً سترہ برس تھی (سیکنڈ ایئر ختم کر رہا تھا) گرمیوں کی تعطیلات گزارنے شملے جانا تھا' کچھ رقم کی ضرورت پڑی' مدد لینے نواب صاحب لوہارو (امین الدین احمد خاں ثانی) کے پاس گیا' چند روز وہاں گزارے' ایک دن لوہارو کے کتب خانے میں .... راقم نے غالب کے کوئی ایک سو بیس' بہرحال ایک سو سے زیادہ خطوط فارسی اور اردو' چھوٹی چھوٹی بوریوں میں بند پائے ..... کتب خانہ بہت چھوٹا تھا' اس کی صفائی ہو رہی تھی' میں سب خط نہ پڑھ سکا .... اردو' فارسی کے کئی خطوط علاء الدین خاں علائی' میرے دادا کے نام بھی تھے ..... میں نے اوبا" نواب صاحب مرحوم کی توجہ اس طرف دلائی .... انہوں نے سرسری طور پر فرمایا : "جی ہاں مجھے علم ہے کہ ان خطوط میں کیا ہے۔ ان کی اشاعت ہمارے خاندانی وقار کے خلاف ہے۔ پچھلے زمانے میں بھی جو خطوط آپ کے (میرے) والد اور دادا نے دے دیے' دیکھ بھال کر دینے چاہییے تھے۔ مرزا مرحوم سے ہمارے قبیلے کی ایک خاتون کیا بیاہی' ان کی تمام خصوصیات میں ہمارا خاندان ضرور ملوّث ہوتا ہے۔ آپ رہنے دیجئے' میں سوچوں گا" .... میں نے ان سے مزید گفتگو کی نہ ضرورت سمجھی' نہ جرأت کی۔ پھر ریاست (۱۹۴۷ء میں) ختم ہو گئی۔ وہ جے پور چلے گئے ..... ۱۹۵۷ء میں

(پہلی بار) ہندوستان گیا' اجمیر شریف کی زیارت کرنے اور ان سے ملنے جے پور پہنچا---- ان خطوط کی یاد دلائی' فرمایا : سارا کتب خانہ رام پور کتب خانہ میں چلا گیا ہے۔ وہاں زیادہ محفوظ رہے گا۔ لوہارو' نہ کوئی آتا ہے' نہ جاتا ہے۔ قلعہ بند' محلات تباہ' کتب خانہ تھا ہی کیا' تباہ بھی ہوا اور قلعہ وغیرہ حکومت ہند کی تحویل میں آگیا۔ اب آپ ان خطوط کو یاد دلا رہے ہیں تو میں خود رامپور لکھ کر دیکھوں گا۔ کیا بنا' کیا ہوا --- ۱۹۸۲ء میں مخدوی مالک رام سے کہا' انہوں نے بڑی دلچسپی لی۔ فرمایا کہ اب میں جستجو کروں گا۔ خود نواب صاحب کو یاد دلایا۔ وہ اس وقت پنجاب (ہند) کے گورنر تھے۔ انہیں یاد ہی نہیں رہا تھا---- پھر میں نے عرشی زادہ صاحب کو لکھا' ان کا جواب بھی وہی آیا کہ دستیاب نہیں .... گویا وہ خط ضائع ہو گئے۔ ضائع نہ ہو گئے ہوتے تو اب تک کسی نہ کسی کو مل جاتے ---- چند ایسے فارسی خطوط غالب کی اشاعت بھی نہیں ہوئی جو دربار رام پور کو لکھے گئے تھے۔ ابھی جناب کالی داس گپتا صاحب (بمبئی ۱۹۸۸ء) کا مرتبہ اردو دیوان غالب کامل (تاریخی ترتیب سے) دستیاب ہوا تو اس کے صفحہ ۹۱ سے توثیق ہوئی کہ سیاسی مصالح کی بنا پر بعض فارسی خطوط اشاعت سے روک لیے گئے بلکہ تلف کر دیے گئے۔ آج کے تناظر میں یہ "سیاسی" مصالح کیا ہوں گے؟ کچھ بھی نہیں۔ ریاست رام پور اس وقت بھی انگریز کے تحت تھی۔ راقم کا قیاس ہے کہ یہ وہ خطوط ہوں گے جن میں غالب نے والی رام پور کو توسیع ریاست یا اضافہ مناصب کے سلسلے میں کچھ "ماہرانہ" مشورے دیے ہوں گے۔ (نواب کلب علی خاں سے خط و کتابت کا ایک حصہ اس قیاس کی تائید کرتا ہے)"

(خلیق انجم : غالب کے خطوط' جلد اول - صفحہ ک' ل' م' ن' ع' ف)

غالب کی فارسی مراسلت کا ایک اہم حصہ ان عرضداشتوں اور خطوط پر مشتمل ہے جنہیں وہ اپنے حقیقی چچا مرحوم نصراللہ بیگ کی پنشن کے سلسلے میں حیطۂ تحریر میں لائے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر خلیق انجم رقم طراز ہیں :

"غالب اگرچہ انگریزی نہیں جانتے تھے لیکن انگریزی مکتوب نگاری کے اصول و ضوابط سے پوری طرح واقف تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پنشن کے سلسلے میں برطانوی حکومت سے ان کی خط و کتابت تھی۔ غالب کو حکومت کے خط انگریزی میں ملتے تھے اور غالب حکومت کے افسران کو انگریزی اور فارسی دونوں زبانوں میں خط لکھتے تھے۔ غالب' خط کا مُسَوَّدَہ فارسی یا اردو میں تیار کرتے تھے اور ایسے لوگوں سے ترجمہ کرواتے تھے جو انگریزی اور انگریزی مکتوب نگاری کے فن سے بخوبی واقف تھے۔ نیشنل آرکائوز نئی دہلی میں غالب کے وہ خطوط محفوظ ہیں جو انہوں نے برطانوی حکومت کے اعلیٰ افسران کو پنشن کے سلسلے میں لکھے تھے۔ ان خطوط میں مطلب کی بات بیان کی گئی ہے۔ ایک فقرہ بھی زائد نہیں ہے۔ حد تو یہ ہے کہ خیر و عافیت اور دعائیہ کلمے وغیرہ بھی نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے مکتوب لکھنے کا انداز غالب نے انگریزوں اور انگریزی داں ہندوستانیوں سے سیکھا ہوگا۔ (غالب کے خطوط : جلد اول صفحہ

(۱۱۱٬۱۱۰

مگر ڈاکٹر انیس ناگی نے اس بیان سے اختلاف کرتے ہوئے ایک جداگانہ موقف اختیار کیا ہے :

"غالب نے یہ درخواستیں فارسی میں تحریر کیں جن کا ترجمہ دہلی میں موجود مدراسی پیٹیشن رائٹرز اور مترجمین نے انگریزی میں کیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ غالب ان کو اپنا درخواست کا متن بتا دیتے ہوں اور وہ الٹی سیدھی انگریزی میں ان کا ترجمہ کر دیتے۔ غالب کی درخواستوں کا انگریزی ورشن بے حد ناقص ہے۔ اکثر جگہوں پر نظام اوقاف' جملوں کی ساخت اور الفاظ کا استعمال بھی غلط ہے۔ ایک ہی نام کو مختلف جگہوں میں تحریر کیا گیا ہے۔ درخواست نویسی کے القابات کو بھی مضحکہ خیز طریقے سے استعمال کیا ہے۔ ان درخواستوں کو عرائض نویس شکستہ انگریزی میں لکھتے اور ان کے آخر میں غالب کا نام اسد اللہ خاں' محمد اسد اللہ خاں' یا مرزا نوشہ آف دہلی لکھا ہوتا اور ان کے نیچے غالب کے نام کی مہر ثبت ہوتی۔ اس زمانے میں غالباً درخواستوں پر دستخطوں کی بجائے درخواست دہندہ کی مہر ثبت کی جاتی تھی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق غالب نے پچاس کے قریب درخواستیں کمپنی کے حکام کے پاس دائر کیں۔ ان میں سے ۳۰ ر ۳۵ درخواستیں ہندوستان کے آرکائیوز دہلی میں محفوظ ہیں' ۱۰ درخواستیں پنجاب آرکائیوز لاہور میں اور بقایا انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہیں۔ ان تمام درخواستوں کو یکجا کرنے کی ضرورت ہے کہ غالب کی پنشن کی مقدمہ کی کہانی مربوط ہو سکے۔" (غالب کا مقدمہ پنشن : اشاعت اول' مئی ۱۹۹۶ء' القمر انٹر پرائز لاہور صفحہ ۱۰٬۱۱)

ان اقتباسات کے مطالعے سے جہاں غالب کے فکری و عملی رجحانات کی عکاسی ہوتی ہے' وہاں غالب شناسوں کے اذہان رسا کی کرشمہ سازیاں بھی سامنے آتی ہیں۔ ایک ہی مخمس پر دو متضاد آرا قاری کو حیران کر دینے کے لیے کافی ہیں۔

از جسم بہ جاں نقاب تا کے
این گنج دریں خراب تا کے

فارسی خطوط اور عرضداشتوں کے ماخذ

۱ ۔ پنج آہنگ : غالب کے نامہ ہائے فارسی کے اولین مجموعے کے آہنگ پنجم میں ۱۷ مکتوب الیہم کے نام ۱۶۹ خطوط دیے گئے ہیں۔ ان کا اردو ترجمہ محمد عمر مہاجر نے کیا جسے غالب کی صد سالہ برسی پر ادارہ یادگار غالب نے ۱۹۶۹ء میں شائع کیا۔ "پنج آہنگ" ۱۸۴۹ء میں مطبع سلطانی قلعۂ دہلی سے پہلی بار طبع ہوئی تھی۔

۲ ۔ نامہ ہائے فارسیٔ غالب : (Persian letters of Ghalib) سید اکبر علی ترمذی کی دریافت کردہ دستاویزات جو ۳۳ خطوط اور ایک عرضداشت پر مشتمل ہیں۔ یہ کتاب ترمذی صاحب کے انگریزی حواشی کے ساتھ ۱۹۶۹ء میں یونین پرنٹنگ پریس' دہلی سے طبع ہوئی' جسے ایشیا پبلشنگ ہاؤس بمبئی نے غالب اکیڈمی کے

حوالے سے شائع کیا۔ یہ خزانہ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا (دہلی) میں محفوظ ہے۔ "نامہ ہائے فارسیٔ غالب" ۳۱ خطوط اور پانچ ضمیموں پر مشتمل ہے' جن میں ایک خط اور ایک عرضداشت شامل ہے۔ خطوط کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں سید اکبر علی ترمذی لکھتے ہیں :

....Some of tbe letters bear no date at all' and' if they do' the years are not given. Moreover' only one of the letters bears the name of tbe adddressee. How were they then to be classified? The only guidance in such cases is the internal evidence. By adopting this method I have succeeded to a large extent in establishing the identities of all except two of the addressees and in arranging the letters in a chronological order (Preface' page vii-c)

....I closely examined the text and on tbe basis of strong internal evidence arrived at tbe conclusion that of the remaining 31 letters 27 were addressed to Maulawi Mubammad Ali Khan of Banda' one to Nawwab Sayyid Ali Akbar Khan Tabatabai of Hugli while the identity of the adddressee or addressees of the remaining two letters could not be established. (Introduction Page' xiii' xiv)

یہ عبارات محققین کے لیے خاصی دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ ۳۱ خطوط میں سے اگر ستائیس مولوی محمد علی خاں کے نام ہوں اور ایک نواب سید علی اکبر خاں طباطبائی کے نام ہو تو باقی دو کیسے بچے؟ --- یہ خطوط دراصل تین ہیں جن کے مکتوب الیہم نامعلوم ہیں۔ علاوہ ازیں ضمیمہ ۱ کا خط بھی "بنام نامعلوم" کے زمرے میں آتا ہے۔" ضمیمہ ۳ خاندانی پنشن سے متعلق وہ عرضداشت ہے جو مسٹر سائمن فریزر (Simon Fraser) (Secretary to Government' Political Department) کو پیش کی گئی۔ مولوی محمد علی خاں اور نواب سید علی اکبر خاں کے نام کچھ خطوط ایسے بھی ہیں جو "پنج آہنگ" میں بعض متنی اختلافات کے ساتھ موجود ہیں۔ مثلاً نواب علی اکبر خاں کے نام خط ۳۱ ----

..."This letter with sligbt modification' appears in the very beginning of the "Panj Ahang" which gives seven more letters that are also found in the collection under study. Tbough the readings of these seven letters slightly different' the "Panj Ahang" gives tbe name of their addressee as Maulawi Muhammad Ali Khan of Banda. (Introduction Page xiii)

مگر یہ تکثیر و تخفیف یا ترمیم و تحریف اس اعتبار سے انتقادیات کے خوشگوار بحث ہے کہ اس سے مطالعۂ غالبیات کے تازہ دریچے کھلتے ہیں۔ غالب کے حوالے سے ایک حرف ایک ایک لفظ اور ایک ایک سطر کو بجائے خود یادگار کا درجہ حاصل ہے' خواہ وہ نوشتۂ غالب ہو یا ان کی ذات و صفات سے منسوب کوئی اور مواد۔

۳ - نوادرِ غالب : ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کا مقالہ مطبوعہ "سورج" --- لاہور' جلد اول' دو صد سالہ جشن غالب ۱۹۹۶ء) جس میں ریاست ٹونک کے نواب محمد وزیر خاں (جنہیں مغل بادشاہ اکبر شاہ ثانی نے وزیر الملک کا خطاب دیا تھا) کے نام غالب کے تین خطوط اور ایک قطعۂ تہنیت شامل ہے۔ یہ سرمایہ جسے مولانا محمد عمران خان

ٹونکی نے دریافت کیا' ریاست ٹونک کے "منشی خانے" میں محفوظ تھا جو اب راجستھان اسٹیٹ آرکائیوز میں ضم ہو چکا ہے۔

۴ ۔ غالب کا مُقدّمۂ پنشن : ڈاکٹر انیس ناگی کی یہ کتاب (مطبوعہ مئی ۱۹۹۶ء : القمر انٹرپرائزز لاہور) غالب کے حقیقی چچا نصر اللہ بیگ کی پنشن سے متعلق ان دستاویزات کی انگریزی اور فارسی نقول کا مجموعہ ہے جو انہیں حکومت پنجاب آرکائیوز' لاہور' دہلی ریذیڈنسی اور ایجنسی ریکارڈ سے دستیاب ہوئیں (انیس ناگی نے انگریزی دستاویزات کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے) قبل ازیں "جاگیرِ غالب" (پرتھوی چندر) "نامہ ہائے فارسئ غالب" (سید اکبر علی ترمذی) اور "حیاتِ غالب کا ایک باب" (ڈاکٹر ملک حسن اختر) میں بھی اس موضوع پر کام ہو چکا ہے۔ "جاگیرِ غالب" مطبوعہ ۱۹۶۹ء (دہلی) میں اس کیس کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ' منضبط طور سے پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے اور پنشن کے اس خاندانی تنازعے سے متعلق پچاس سے زائد دستاویزات کی عکسی نقول شائع کی گئی ہیں۔ ان میں سے تیئس عرضداشتیں غالب کی ہیں جن میں سے سولہ پر غالب نے انگریزی مواد کے آخر میں اپنے نام کی مہریں ثبت کی ہیں۔ چودہ پر مہر کے ساتھ ساتھ اردو یا فارسی میں اپنے قلم سے کچھ فقرے لکھے ہیں۔ ان میں سے گیارہ پر تاریخ بھی رقم کی ہے --- "غالب کا مقدمۂ پنشن" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ان فارسی دستاویزات کے متعلق ڈاکٹر انیس ناگی لکھتے ہیں :

> "بہرکیف غالب کے شائقین کے مطالعے کے لیے غالب کی دو فارسی درخواستیں' غالب کے حریف افضل خاں اور نواب شمس الدین کی درخواستیں بھی تتمّہ کے طور پر شامل کی گئی ہیں۔ (غالب کی پنشن کا تنازعہ : صفحہ ۱۲)

مگر اس کتاب میں غالب کی فارسی درخواستیں ۲ نہیں بلکہ ۵ ہیں۔ ان میں سے صفحہ ٦٦ سے شروع ہونے والی درخواست جو اندریو استرلنگ کے نام ہے' غلط پیسٹنگ کے باعث دو حصوں میں منقسم ہو گئی ہے اور اس کا آدھا مواد صفحہ ٦۷ پر چلا گیا ہے۔ ڈاکٹر انیس ناگی مزید لکھتے ہیں :

> "زیرِ نظر کتاب میں غالب کی پنشن سے متعلق وہ دستاویزات شائع کی جا رہی ہیں جو پہلے منظرِ عام پر نہیں آئی تھیں۔" (پیش لفظ صفحہ ۵)

موصوف کا یہ دعویٰ صحیح نہیں کیونکہ انہوں نے صفحہ ٦۳ پر "فریزر" (Fraser) کے نام جو درخواست (محررہ ۲۸ اپریل ۱۸۲۸ء) نقل کی ہے' وہ "غالب کا مقدمۂ پنشن" کی اشاعت سے ۲۸ سال پہلے منظرِ عام پر آ چکی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ "نامہ ہائے فارسئ غالب" (مطبوعہ ۱۹٦۹ء غالب اکیڈمی' دہلی) ان کی نظر سے نہیں گزرے کیونکہ اس کتاب میں مذکورہ درخواست' ضمیمہ ۳ صفحہ ۱۱٦' ۱۱۷ پر غالب کے ہاتھ سے لکھی ہوئی اصل عرضداشت کے عکس سمیت موجود ہے۔ یوں جناب انیس ناگی کی دریافت کردہ' غالب کی فارسی درخواستیں ۵ کی بجائے ۴ ٹھہرتی ہیں۔

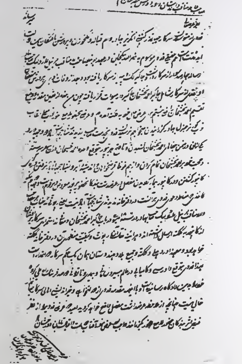

Ghalib's Petition to Mr. Fraser

اردو مکاتیب غالب کی فہرست

۱ ۔ مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام

صاحب! دوسرا پارسل جس کو تم نے بہ تکلف خط بنا کر بھیجا ہے، پہنچا---	۱۸۴۷ء یا اس سے قبل
مہاراج! آپ کا مہربانی نامہ پہنچا، دل میرا اگرچہ خوش نہ ہوا----	مئی ۱۸۴۸ء
بھائی! یہ مصرع جو تم کو بہم پہنچا ہے، فن تاریخ گوئی میں اس کو کرامت اور اعجاز کہتے ہیں---	اگست ۱۸۵۰ء
کیوں مہاراج؟ کول میں آنا اور جناب منشی نبی بخش صاحب کے ساتھ غزل خوانی---	۴ جنوری ۱۸۵۲ء
شفیق با تحقیق منشی ہرگوپال تفتہ ہمیشہ سلامت رہیں---	۲۱ فروری ۱۸۵۲ء
بندہ پرور! "بیش از بیش و کم از کم" یہ ترکیب بہت فصیح ہے---	۲۲ مارچ ۱۸۵۲ء
کاشانہ دل کے ماہ دو ہفتہ، منشی ہرگوپال تفتہ تحریر میں کیا کیا سحر طرازیاں کرتے ہیں---	۱۸ جون ۱۸۵۲ء
کل تمہارا خط آیا، راز نہانی مجھ پر آشکارا ہوا---	۱۰ دسمبر ۱۸۵۲ء
صاحب! دیکھو پھر تم دنگا کرتے ہو، وہی "بیش و بیشتر" کا قصہ نکلا---	۱۸۵۲ء
واہ کیا خوبی قسمت ہے، میری! بہت دن سے دھیان لگا ہوا تھا---	دسمبر ۱۸۵۲ء
بھائی! پرسوں شام کو ڈاک کا ہرکارہ آیا، اور ایک خط تمہارا اور ایک خط جانی جی کا لایا---	۲۵ فروری ۱۸۵۳ء
بھائی! آج مجھ کو بڑی تشویش ہے، اور یہ خط تم کو کمال سراسیمگی میں لکھتا ہوں---	۲۸ مارچ ۱۸۵۳ء
پرسوں تمہارا خط آیا، حال جو معلوم تھا، وہ پھر معلوم ہوا---	مارچ ۱۸۵۳ء
آج منگل کے دن پانچویں اپریل کو تین گھڑی دن رہے، ڈاک کا ہرکارہ آیا---	۱۶ اپریل ۱۸۵۳ء
بھائی! ہاں، میں نے زبدۃ الاخبار میں دیکھا کہ رانی صاحب مر گئیں---	مئی ۱۸۵۳ء
بھائی! تم نے مجھے کون سا دو چار سو روپے کا نوکر یا محسن دار قرار دیا ہے---	۳۰ مئی ۱۸۵۳ء
عجب تماشا ہے! بابو صاحب لکھ چکے ہیں کہ ہردیو سنگھ آ گیا---	۵ جون ۱۸۵۳ء
تمہاری خیر و عافیت معلوم ہوئی، غزل نے محنت کم لی---	۹ جون ۱۸۵۳ء
بھائی! جس دن تم کو خط بھیجا، تیسرے دن ہردیو سنگھ کی عرضی اور پچیس کی رسید اور پانسو کی ہنڈوی پہنچی---	۱۴ جون ۱۸۵۳ء
بھائی میں نے مانا تمہاری شاعری کو---	۲۱ اگست ۱۸۵۳ء
میں تم کو خط بھیج چکا ہوں، پہنچا ہوگا---	اکتوبر ۱۸۵۳ء
"دید مست" یہ لفظ نیا بنایا ہے---	۱۳ جنوری ۱۸۵۴ء
بندہ پرور! ایک مہربانی نامہ سکندر آباد سے اور ایک علی گڑھ سے پہنچا---	۲۳ فروری ۱۸۵۴ء
منشی صاحب! تمہارا خط اس دن یعنی کل بدھ کے دن پہنچا---	۲ مارچ ۱۸۵۴ء

۲۵	شفیق میرے لالہ ہرگوپال تفتہ میرا قصور معاف کریں---	جون ۱۸۵۴ء
۲۶	میرا اسلام پہنچے۔ خط اور کاغذ اشعار پہنچا' سابق و حال ابھی سب یونہی دھرے رہیں گے---	جولائی ۱۸۵۴ء
۲۷	صاحب! دیباچہ و تقریظ کا لکھنا ایسا آسان نہیں ہے کہ جیسا تم کو دیوان کا لکھ لینا---	اپریل رمئی ۱۸۵۵ء
۲۸	تمہارا خط پہنچا' مجھ کو بہت رنج ہوا' واقعی ان چھوٹے لڑکوں کا پالنا بہت دشوار ہو گا---	قبل ۱۸۵۵ء
۲۹	صاحب! تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا---	۵ دسمبر ۱۸۵۷ء
۳۰	آج سنیچر یار کو دوپہر کے وقت ڈاک کا ہرکارہ آیا---	۳۰ جنوری ۱۸۵۸ء
۳۱	از عمر و دولت برخوردار باشند' بدھ کا دن' تیسری تاریخ فروری کی---	۳ فروری ۱۸۵۸ء
۳۲	صاحب! تم نے لکھا تھا کہ میں جلد آگرے جاؤں گا---	۵ مارچ ۱۸۵۸ء
۳۳	جان من و جانان من! کل میں نے تم کو سکندر آباد میں سمجھ کر خط بھیجا---	۶ مارچ ۱۸۵۸ء
۳۴	صاحب! تمہاری سعادت مندی کو ہزار ہزار آفریں---	۱۲ مارچ ۱۸۵۸ء
۳۵	صاحب! کیوں مجھے یاد کیا؟ کیوں خط لکھنے کی تکلیف اٹھائی؟---	۱۲ اپریل ۱۸۵۸ء
۳۶	مرزا تفتہ! عجب اتفاق ہوا' پنج شنبے کے دن بائیس اپریل کو کلیان خط ڈاک میں ڈال کر آیا---	۲۵ اپریل ۱۸۵۸ء
۳۷	صاحب! چھبیس اپریل کو ایک خط اور ایک پارسل ڈاک میں ارسال کر چکا ہوں---	۳۰ اپریل ۱۸۵۸ء
۳۸	بھائی! وہ خط پہلا تم کو بھیج چکا تھا کہ بیمار ہو گیا---	۲۴ مئی ۱۸۵۸ء
۳۹	کیوں صاحب! مجھ سے کیوں خفا ہو؟---	۱۹ جون ۱۸۵۸ء
۴۰	جیتے رہو اور خوش رہو! اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی---	۲۶ جون ۱۸۵۸ء
۴۱	مرزا تفتہ کو دعا پہنچے' بہت دن سے خط کیوں نہیں لکھا؟---	۱۸ جولائی ۱۸۵۸ء
۴۲	مرزا تفتہ! کل قریب دوپہر کے ڈاک کا ہرکارہ' وہ جو خط بانٹا کرتا ہے' آیا---	۲۸ جولائی ۱۸۵۸ء
۴۳	رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے---	جون یا جولائی ۱۸۵۸ء
۴۴	مرزا تفتہ! تمہارے اوراق مثنوی کا پمفلٹ پاکٹ پرسوں پندرہ اگست کو---	۱۷ اگست ۱۸۵۸ء
۴۵	صاحب! عجب اتفاق ہے' آج صبح کو ایک خط تم کو---	۲۳ اگست ۱۸۵۸ء
۴۶	نور نظر و لخت جگر مرزا تفتہ! تم کو معلوم رہے کہ رائے صاحب مکرم و معظم رائے امید سنگھ بہادر---	۲۸ اگست ۱۸۵۸ء
۴۷	بھائی! تمہارا وہ خط جس میں اوراق مثنوی ملفوف تھے' پہنچا---	اگست ۱۸۵۸ء
۴۸	صاحب! عجب تماشا ہے' تمہارے کہے سے منشی شیو نرائن صاحب کو خط لکھا تھا---	یکم ستمبر ۱۸۵۸ء
۴۹	للہ الشکر' تمہارا خط آیا اور دل سودا زدہ نے آرام پایا---	۳ ستمبر ۱۸۵۸ء
۵۰	مرزا تفتہ کو دعا پہنچے' دونوں فقرے جس محل پر بتائے ہیں' حاشیے پر لکھ دیے ہوں گے---	۳-۷ ستمبر ۱۸۵۸ء
۵۱	مشفق میرے' کرم فرما میرے! تمہارا خط اور تین دو ورقے چھاپے کے پہنچے---	۷ ستمبر ۱۸۵۸ء
۵۲	اچھا میرا بھائی! "نہیب" والے دو ورقے چار سو ہوں' پانسو ہوں' سب بدلوا ڈالنا---	۱۶ ستمبر ۱۸۵۸ء
۵۳	بھائی! مجھ میں تم میں نامہ نگاری کاہے کو ہے' مکالمہ ہے---	۱۷ ستمبر ۱۸۵۸ء
۵۴	بھائی! آج صبح کو بہ سبب حکیم صاحب کے تقاضے کے' شکوہ آمیز خط جناب مرزا صاحب کی خدمت میں---	۲۰ ستمبر ۱۸۵۸ء

۵۵	صاحب! قصیدے کے چھاپے جانے کی بشارت صاحب مطبع نے بھی مجھ کو دی ہے---	۳۰ ستمبر ۱۸۵۸ء
۵۶	کیوں صاحب! اس کا کیا سبب ہے کہ بہت دن سے ہماری آپ کی ملاقات نہیں ہوئی؟---	۱۶ اکتوبر ۱۸۵۸ء
۵۷	اللہ اللہ! ہم تو کول سے تمہارے خط کے آنے کے منتظر تھے---	۳ نومبر ۱۸۵۸ء
۵۸	کیوں صاحب! کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندر آباد کے رہنے والے دلی کے خاک نشینوں کو---	۱۳ نومبر ۱۸۵۸ء
۵۹	آج پنج شنبے کے دن اٹھارہ نومبر کو تمہارا خط آیا---	۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء
۶۰	برخوردار! تمہارا خط پہنچا' اصلاحی غزلوں کی رسید معلوم ہوئی---	۲۰ نومبر ۱۸۵۸ء
۶۱	مرزا تفتہ! تمہارا خط آیا' فقیر کو حقیر کا حال معلوم ہوا---	۲۷ نومبر ۱۸۵۸ء
۶۲	صاحب! تمہارا خط آیا' میں نے اپنے سب مطالب کا جواب پایا---	۱۹ دسمبر ۱۸۵۸ء
۶۳	کیوں صاحب! روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی؟---	۲۷ دسمبر ۱۸۵۸ء
۶۴	دیکھو صاحب! یہ باتیں ہم کو پسند نہیں' ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو---	۳ جنوری ۱۸۵۹ء
۶۵	صاحب! تمہارا خط مع رقعہ مرد سخن فہم پہنچا---	۲۶ جنوری ۱۸۵۹ء
۶۶	صاحب! میرٹھ سے آکر تم کو خط لکھ چکا ہوں---	۳۰ جنوری ۱۸۵۹ء
۶۷	صاحب! تم تو اچھے خاصے عارف ہو اور تمہارا کشف سچا ہے---	۱۹ فروری ۱۸۵۹ء
۶۸	صاحب! تمہارا خط آیا' دل خوش ہوا---	۲۷ فروری ۱۸۵۹ء
۶۹	کیوں مرزا تفتہ! تم بے وفا یا میں گناہگار؟---	۲۷ مارچ ۱۸۵۹ء
۷۰	صاحب! آج تمہارا خط صبح کو آیا' میں دوپہر کو جواب لکھتا ہوں---	۵ جون ۱۸۵۹ء
۷۱	صاحب! ہم تمہارے اخبار نویس ہیں اور تم کو خبر دیتے ہیں---	۱۷ جون ۱۸۵۹ء
۷۲	صاحب! ایک خط تمہارا پرسوں آیا اور اس میں مندرج کہ میں میرٹھ جاؤں گا---	۲۹ جون ۱۸۵۹ء
۷۳	بھائی تمہارے ذہن نے خوب انتقال کیا---	۱۸ اکتوبر ۱۸۵۹ء
۷۴	صاحب! تمہارا خط آیا' حال معلوم ہوا---	۵ نومبر ۱۸۵۹ء
۷۵	میری جان! کیا سمجھتے ہو' سب تلوقات تفتہ و غالب کیوں کر بن جائیں---	۲۳ دسمبر ۱۸۵۹ء
۷۶	بھائی! میں نے دلی کو چھوڑا اور رام پور کو چلا---	۲۱ جنوری ۱۸۶۰ء
۷۷	صاحب! تمہارے یہ اوراق سکندر آباد سے دلی اور دلی سے رام پور پہنچے---	اوائل فروری ۱۸۶۰ء
۷۸	میری جان! آخر لڑکے ہو' بات کو نہ سمجھے---	۱۴ فروری ۱۸۶۰ء
۷۹	برخوردار سعادت آثار منشی ہرگوپال سلمہ اللہ تعالیٰ---	یکم مارچ ۱۸۶۰ء
۸۰	مرزا تفتہ! اس غمزدگی میں مجھ کو ہنسانا تمہارا ہی کام ہے---	۳۱ مارچ ۱۸۶۰ء
۸۱	مرزا تفتہ! ایک امر عجیب تم کو لکھتا ہوں' اور وہ امر بعد تعجب مفرط کے موجب نشاط مفرط ہو گا---	۱۶ اپریل ۱۸۶۰ء
۸۲	بھائی! آج اس وقت تمہارا خط پہنچا---	۶ مئی ۱۸۶۰ء
۸۳	برخوردار مرزا تفتہ! دوسرا مسودہ بھی کل پہنچا---	۲۰ جولائی ۱۸۶۰ء
۸۴	مرزا تفتہ! تمہارا خط مع کاغذ اشعار آیا---	۱۹ نومبر ۱۸۶۰ء

۸۵	صاحب! تمہارا خط میرٹھ سے آیا۔ "مرآۃ الصحائف" کا تماشا دیکھا---	۲۰ جنوری ۱۸۶۱ء
۸۶	اجی مرزا تفتہ! تم نے روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈبویا---	۹ اپریل ۱۸۶۱ء
۸۷	میاں مرزا تفتہ! ہزار آفریں' کیا اچھا قصیدہ لکھا ہے---	۱۹ اگست ۱۸۶۱ء
۸۸	مرزا تفتہ صاحب! اس قصیدے کے باب میں بہت باتیں آپ کی خدمت میں عرض کرنی ہیں---	۹ ستمبر ۱۸۶۱ء
۸۹	صاحب! "گوہر را" ' "خاور را" یہ قصیدہ بہت اصلاح طلب تھا---	۱۲ ستمبر ۱۸۶۱ء
۹۰	"انگشتری" اور "خاتم" دونوں ایک ہیں---	ستمبر ۱۸۶۱ء
۹۱	صاحب! قصیدے پر قصیدہ لکھا اور خوب لکھا' آفریں ہے---	۴ اکتوبر ۱۸۶۱ء
۹۲	صاحب! یہ قصیدہ تم نے بہت خوب لکھا ہے---	اکتوبر یا نومبر ۱۸۶۱ء
۹۳	تم کو معلوم رہے کہ ایک ممدوح تمہارے یہاں آئے ہیں---	اکتوبر یا نومبر ۱۸۶۱ء
۹۴	صاحب! دو زبانوں سے مرکب ہے یہ فارسی متعارف ایک فارسی' ایک عربی---	۲۷ اگست ۱۸۶۲ء
۹۵	بھائی! "ریمیا" و "ہیمیا" خرافات ہے---	اگست ۱۸۶۲ء
۹۶	مرزا تفتہ! جو کچھ تم نے لکھا' یہ بے دردی ہے اور بدگمانی---	۲۷ نومبر ۱۸۶۲ء
۹۷	صاحب بندہ! میں نے بکس کا ایک ایک خانہ دیکھا---	۴ مارچ ۱۸۶۳ء
۹۸	لو صاحب! ہم نے لفٹنٹ گورنر کی ملازمت اور خلعت پر قناعت کر کے انبالے کا جانا موقوف کیا---	اپریل ۱۸۶۳ء
۹۹	حضرت! آپ کے سب خط پہنچے' سب قصیدے پہنچے---	۳ جولائی ۱۸۶۳ء
۱۰۰	حضرت! پرسوں صبح کو تمہارے سب کاغذ ایک لفافے میں بند کر کے ڈاک گھر بھجوا دیے---	۵ جولائی ۱۸۶۳ء
۱۰۱	مرزا تفتہ! یہ غلطی تمہارے کلام میں کبھی نہیں دیکھی تھی کہ شعر ناموزوں ہو---	۱۶ جولائی ۱۸۶۳ء
۱۰۲	سچ ہے اگر آپ استاد کا مصرع نہ لکھتے تو میں "بروے استادن رنگ" کو کہاں سے سمجھتا؟---	۲۳ جولائی ۱۸۶۳ء
۱۰۳	صاحب! "کشیدن" کی جگہ "درکشیدن" و "برکشیدن"---	مارچ' ستمبر ۱۸۶۳ء
۱۰۴	نور چشم غالب از خود رفتہ' مرزا تفتہ---	۲۴ نومبر ۱۸۶۳ء
۱۰۵	صاحب! کل پارسل اشعار کا ایک آنے کا ٹکٹ لگا کر---	۶ ستمبر ۱۸۶۴ء
۱۰۶	بھائی! تم سچ کہتے ہو کہ بہت مسودے اصلاح کے واسطے فراہم ہوئے ہیں---	۱۴ اکتوبر ۱۸۶۴ء
۱۰۷	منشی صاحب! میں سال گذشتہ بیمار تھا---	۹ دسمبر ۱۸۶۴ء
۱۰۸	آؤ مرزا تفتہ' میرے گلے لگ جاؤ---	۱۴ دسمبر ۱۸۶۴ء
۱۰۹	منشی صاحب! سعادت و اقبال نشان منشی ہرگوپال صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ---	۱۲ فروری ۱۸۶۵ء
۱۱۰	میرزا تفتہ' کہ پیوستہ بدل جا دارد ہر کجا ہست' خدایا. سلامت دارش	فروری ۱۸۶۵ء
۱۱۱	مرزا تفتہ! پیر شو و بیاموز---	۱۴ مئی ۱۸۶۵ء
۱۱۲	صاحب! تم نے "تن تن" کا ذکر کیوں لیا؟---	آخر مئی ۱۸۶۵ء
۱۱۳	میرے مہربان' میری جان' مرزا تفتہ سخن دان!---	۲۸ نومبر ۱۸۶۵ء
۱۱۴	لو صاحب! کھچڑی کھائی' دن بہلائے کپڑے پھاڑے گھر کو آئے	جنوری ۱۸۶۶ء

مرزا تفتہ صاحب! پرسوں تمہارا دوسرا خط پہنچا، تم سے پردہ کیا ہے؟--- ۱۸۶۷ء
لاحول ولاقوۃ، کس ملعون نے بہ سبب ذوق شعر، اشعار کی اصلاح منظور رکھی---
میاں تمہارے انتقالات ذہن نے مارا، میں نے کب کہا تھا کہ تمہارا کلام اچھا نہیں؟---
صاحب! واقعی "سداب" کا ذکر کتب طبی میں بھی ہے اور عرفی کے ہاں بھی ہے---
حضرت! اس قصیدے کی جتنی تعریف کروں، کم ہے، کیا کیا شعر نکالے ہیں---
مرزا تفتہ! کیا کہتا ہے! نہ ظہیر کا پانہ غالب کا۔ مداح شائستہ صد ہزار آفریں---
میاں! سنو، اس قصیدے کا ممدوح شعر کے فن سے ایسا بیگانہ ہے، جیسے ہم تم---
دل بے داغدار بود و نماند   ہر نظرہا بہار بود نماند
حضرت! اس غزل میں "پروانہ" و "پیمانہ" و "بت خانہ" تین قافیے اصلی ہیں---

۲ ۔ نواب کلب علی خاں بہادر کے نام

حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض باد، نوازش نامہ مع ہنڈوی--- ۶ مئی ۱۸۶۵ء
حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے، تہنیت نامہ ارسال کر چکا ہوں--- ۲۷ مئی ۱۸۶۵ء
حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے، حق تعالیٰ جل جلالہ و عم نوالہ--- ۱۴ جون ۱۸۶۵ء
حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے، نوازش نامہ مع سو روپے--- ۱۵ جون ۱۸۶۵ء
حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے، روز پنجشنبہ پندرہ جون--- ۱۸ جون ۱۸۶۵ء
حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے، منشور عطوفت کے ورود--- ۱۰ جولائی ۱۸۶۵ء
حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے، میری عرضداشت کا جواب--- ۲۳ جولائی ۱۸۶۵ء
حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض کہ آں منشور عطوفت عز ورود لایا--- ۱۱ اگست ۱۸۶۵ء
حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے، کل برخوردار نواب مرزا داغ کی تحریر--- ۱۳ اگست ۱۸۶۵ء
حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے، "داستان حمزہ" قصہ موضوعی ہے--- ۲۱ اگست ۱۸۶۵ء
حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض یہ ہے، فقیر تکیہ دار، روزینہ خوار، --- ۲۲ اگست ۱۸۶۵ء
حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے۔ میں طبیب نہیں، مگر تجربہ کار ہوں--- اگست ۱۸۶۵ء
حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے۔ شرف افزا عطوفت نامہ عز ورود لایا--- ۱۱ ستمبر ۱۸۶۵ء
حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے، چاہتا ہوں کہ کچھ لکھوں--- ۱۸ ستمبر ۱۸۶۵ء
حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے، ہرچند آبدار خانے--- ۸ نومبر ۱۸۶۵ء
حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے، مراد آباد پہنچا--- ۱۰ جنوری ۱۸۶۶ء
حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے، عنایت نامہ والا کے مشاہدے نے--- ۲۱ جنوری ۱۸۶۶ء
حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے، توقیع وقیع مع سو روپے کی ہنڈوی--- ۱۵ فروری ۱۸۶۶ء
حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے، توقیع وقیع کے ورود نے--- ۱۵ مارچ ۱۸۶۶ء

۲۰	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'اپنا حال اس سے زیادہ کیا لکھوں؟---	۲۹ مارچ ۱۸۶۶ء
۲۱	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'منشور مکرمت ظہور مع ہنڈوی---	۱۳ مئی ۱۸۶۶ء
۲۲	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'جب بادشاہ دہلی نے---	۹ جون ۱۸۶۶ء
۲۳	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'کل ایک عرضداشت مع ایک غزل کے---	۱۰ جون ۱۸۶۶ء
۲۴	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'توقیع وقیع عزورود لایا---	۲۸ جون ۱۸۶۶ء
۲۵	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ آج شنبہ دس ماہ اگست ۱۸۶۶ء---	۱۰ اگست ۱۸۶۶ء
۲۶	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'پہلے اپنا حال عرض کرلوں---	۱۳ اگست ۱۸۶۶ء
۲۷	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! مد ظلہ العالی۔ بعد تسلیم معروض ہے 'توقیع وقیع مع دیباچہ---	یکم ستمبر ۱۸۶۶ء
۲۸	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'منشور مکرمت ظہور عزورود لایا---	۱۰ ستمبر ۱۸۶۶ء
۲۹	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'خاطر اقدس میں نہ گزرے---	۱۸ ستمبر ۱۸۶۶ء
۳۰	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'اردو دیوان کا انتخاب بھیج چکا ہوں---	۲۴ ستمبر ۱۸۶۶ء
۳۱	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'منشور مکرمت ظہور---	۱ اکتوبر ۱۸۶۶ء
۳۲	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'اس عنایت نامے میں ایک فقرہ---	۷ اکتوبر ۱۸۶۶ء
۳۳	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'آج سہ شنبہ سولہ ماہ اکتوبر کی---	۱۶ اکتوبر ۱۸۶۶ء
۳۴	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'ورود توقیع و نوید عفو نے---	۵ نومبر ۱۸۶۶ء
۳۵	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'حضور کے لشکر نصرت اثر---	۱۸ نومبر ۱۸۶۶ء
۳۶	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'توقیع وقیع مع ہنڈوی---	۸ دسمبر ۱۸۶۶ء
۳۷	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'ایک عرضداشت بھیج چکا ہوں---	۱۸ دسمبر ۱۸۶۶ء
۳۸	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'نوازش نامہ مع ہنڈوی---	۳-۷ جنوری ۱۸۶۶ء
۳۹	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'حضرت کا رونق افزائے کلکتہ ہونا---	۸ جنوری ۱۸۶۷ء
۴۰	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'کل حضرت کے اقبال سے---	۲۶ جنوری ۱۸۶۷ء
۴۱	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'بہت دن تک متردد رہا---	۱۴ فروری ۱۸۶۷ء
۴۲	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'کل صبح کو میں نے خط---	۱۵ فروری ۱۸۶۷ء
۴۳	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'توقیع عطوفت عزورود لایا---	۱۳ مارچ ۱۸۶۷ء
۴۴	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'کل صبح کو دو گھڑی دن چڑھے---	۲۰ مارچ ۱۸۶۷ء
۴۵	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم و تعظیم معروض ہے 'ہنڈوی ملفوفہ نوازش نامے---	۶ اپریل ۱۸۶۷ء
۴۶	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'نمائش گاہ سراسر سور رام پور کا ذکر---	۱۴ اپریل ۱۸۶۷ء
۴۷	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'توقیع وقیع عزورود لایا---	۱۴ مئی ۱۸۶۷ء
۴۸	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد ادائے مدارج تسلیم سوچتا ہوں کہ کیا لکھوں---	۱۴ مئی ۱۸۶۷ء
۴۹	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'ورود توقیع وقیع سے فیض پایا---	۱۱ جون ۱۸۶۷ء

۵۰	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے کہ توقیع وقیع عزّ ورود لایا---	۱۵ جولائی ۱۸۶۷ء
۵۱	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'بہ موجب تحریر مرزا رحیم الدین بہادر حیا---	۲۲ جولائی ۱۸۶۷ء
۵۲	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تقدیم مدارج تسلیم نوازشنامے کے ورود کا شکر---	۱۳ اگست ۱۸۶۷ء
۵۳	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'آپ کے غلام زر خرید---	۱۹ اگست ۱۸۶۷ء
۵۴	آں کیست کہ جسم ملک را جاں باشد آں کیست کہ ہمسر سلیماں باشد	۵ ستمبر ۱۸۶۷ء
۵۵	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'عنایت نامہ عزّ ورود لایا---	۲۳ ستمبر ۱۸۶۷ء
۵۶	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'فرمان والا مع ہنڈوی تنخواہ---	۱۰ اکتوبر ۱۸۶۷ء
۵۷	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے '"دبدبہ سکندری" میں---	۱۸ اکتوبر ۱۸۶۷ء
۵۸	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'ایک قطعہ پندرہ شعر کا بھیجتا ہوں---	۲ نومبر ۱۸۶۷ء
۵۹	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ آج روز جمعہ سترہ رجب ۱۲۸۴ھ---	۱۵ نومبر ۱۸۶۷ء
۶۰	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ کل ۱۶ دسمبر کو نومبر کی تنخواہ کی ہنڈوی پہنچی---	۱۷ دسمبر ۱۸۶۷ء
۶۱	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'آج روز شنبہ یکم ماہ رمضان المبارک---	۲۷ دسمبر ۱۸۶۷ء
۶۲	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'منشور رافت عزّ ورود لایا---	۱۴ جنوری ۱۸۶۸ء
۶۳	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ داد و دہش تو روزن افزون بادا---	۲۳ جنوری ۱۸۶۸ء
۶۴	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'منشور عطوفت ظہور عزّ ورود لایا---	۱۳ فروری ۱۸۶۸ء
۶۵	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ عرض مدارج عجز و نیاز کے بعد نوازش نامے کے پہنچنے کا---	۹ مارچ ۱۸۶۸ء
۶۶	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'منشور عطوفت ظہور عزّ ورود لایا---	۱۱ مئی ۱۸۶۸ء
۶۷	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'شوق قدم بوس نے تنگ کیا---	۲۷ مئی ۱۸۶۸ء
۶۸	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'آج چوتھا دن ہے---	۱۵ جون ۱۸۶۸ء
۶۹	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'آج شہر میں شہرت ہے---	۲۷ جولائی ۱۸۶۸ء
۷۰	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'کل منشور عطوفت عزّ صدور لایا---	۱۳ اگست ۱۸۶۸ء
۷۱	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تقدیم مدارج تسلیم معروض ہے---	۷ ستمبر ۱۸۶۸ء
۷۲	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'عنایت نامہ مع سو روپیہ کی ہنڈوی کے---	۱۳ اکتوبر ۱۸۶۸ء
۷۳	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'توقیع رافت شرف ورود لایا---	۱۱ نومبر ۱۸۶۸ء
۷۴	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'کل عریضہ مشعر رسید تنخواہ نومبر---	۱۶ نومبر ۱۸۶۸ء
۷۵	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'بہت دن ہوئے---	۱۷ دسمبر ۱۸۶۸ء
۷۶	حضرت ولی نعمت، آیہ رحمت! سلامت۔ بعد تسلیم معروض ہے 'عنایت نامہ اور اس میں تنخواہ دسمبر---	۱۰ جنوری ۱۸۶۹ء

۳ - منشی نبی بخش حقیر کے نام

۱	صاحب بندہ! میاں نسیم اللہ یہاں آئے---	۹ مارچ ۱۸۴۸ء

۲	بندہ پرور! بہت دنوں سے میرا دھیان آپ میں لگا ہوا تھا---	۴جون ۱۸۴۸ء
۳	شفیق میرے مشفق میرے! اکرم فرما میرے! عنایت گستر میرے!---	۱۰جنوری ۱۸۵۰ء
۴	بھائی صاحب! بندہ 'گنہگار حاضر ہوا ہے اور بندگی عرض کرتا ہے---	اگست تا اکتوبر ۱۸۵۰ء
۵	اپنے بھائی صاحب قبلہ کی خدمت میں بندگی عرض کرتا ہوں---	۲جنوری ۱۸۵۱ء
۶	بھائی صاحب و قبلہ کو بندگی پہنچے۔ ایک خط آپ کا آگے آیا تھا اور ایک پرسوں آیا---	۲۷جنوری ۱۸۵۱ء
		(متعارفہ ڈاکٹر سید معین الرحمن)
۷	بھائی صاحب کو بندگی پہنچے۔ ان دنوں میں حضور والا خواجہ صاحب کی درگاہ گئے ہوئے تھے---	۲مارچ ۱۸۵۱ء
۸	بھائی صاحب کو سلام پہنچے۔ بھائی علی بخش خاں اور بھائی طرہ باز خاں---	۲۸مارچ ۱۸۵۱ء
۹	بھائی صاحب! یہ عنایت نامہ بھی پایا اور جس کی مجھے فکر تھی' وہ بھی آیا---	اپریل' مئی ۱۸۵۱ء
۱۰	بھائی صاحب! تم کو مبارک ہو' نصیرالدین کا بیاہ اور عبدالسلام کا ختنہ---	اپریل تا جولائی ۱۸۵۱ء
۱۱	بھائی صاحب کو سلام اور منشی عبداللطیف اور نصیرالدین اور پیاری زکیہ کو دعا پہنچے---	اپریل تا جولائی ۱۸۵۱ء
۱۲	آداب بجالاتا ہوں۔ بہت دن سے آپ کا خط نہیں آیا---	جولائی ۱۸۵۱ء
۱۳	بھائی صاحب! آپ کا خط بہت دن کے بعد آیا---	۴اگست ۱۸۵۱ء
۱۴	بھائی صاحب قبلہ! زکیہ اور عبدالسلام کا آنا مبارک ہو---	۶ ستمبر ۱۸۵۱ء
۱۵	بھائی صاحب! آپ کا خط پہنچا' حضرت آپ نے مولوی قمرالدین خاں کو اتنا تنگ ناحق کیا---	ستمبر ۱۸۵۱ء تا مارچ ۱۸۵۲ء
۱۶	بھائی صاحب! آج ہفتے کا دن' پندرھویں مئی کی' صبح کا وقت ہے---	۱۵ مئی ۱۸۵۲ء
۱۷	بھائی صاحب! آگے اس سے دو خط تم کو بھیج چکا ہوں---	۲۱ مئی ۱۸۵۲ء
۱۸	بھائی صاحب! آپ کا خط آیا۔ پاکھل کے مربے کا پہنچنا معلوم ہوا---	اگست' ستمبر ۱۸۵۲ء
۱۹	بھائی صاحب! آپ کے دو خط آئے---	۱۹نومبر ۱۸۵۲ء
۲۰	بھائی صاحب! تم غزل کی تعریف کرتے ہو اور میں شرماتا ہوں---	۳۱دسمبر ۱۸۵۲ء
		(متعارفہ ڈاکٹر سید معین الرحمن)
۲۱	بھائی! مجھ کو تم سے بڑا تعجب ہے کہ اس بیت کے معنی میں تم کو تامل رہا---	۸جنوری ۱۸۵۳ء
۲۲	بھائی صاحب! کئی دن ہوئے کہ آپ کا عطوفت نامہ پہنچا---	جنوری ۱۸۵۳ء
۲۳	قبلہ! معاف رکھیے گا۔ کئی دن کے بعد آپ کو خط لکھتا ہوں---	۹مارچ ۱۸۵۳ء
۲۴	لو بھائی' اب تو بی زکیہ ہمارے تمہارے برابر ہو گئیں---	۱۷مارچ ۱۸۵۳ء
۲۵	حضرت! عجب تماشا ہے۔ منشی ہرگوبند سنگھ کا اظہار تو یہ ہے---	۴اپریل ۱۸۵۳ء
۲۶	بھائی صاحب! کیسی تاریخ اور کیسی نقل' کیا فرماتے ہو'---	۱۰اپریل ۱۸۵۳ء
۲۷	بھائی! یہاں بادشاہ نے قلعے میں مشاعرہ مقرر کیا ہے---	۱۰ - ۲۳اپریل ۱۸۵۳ء
۲۸	بھائی صاحب! بڑا تعجب ہے تم اس شعر کے معنی پوچھتے ہو---	۲۳اپریل ۱۸۵۳ء
۲۹	بھائی صاحب! آپ کا عنایت نامہ مقام ہاترس سے پہنچا---	۲۹مئی ۱۸۵۳ء

۳۰	بھائی صاحب کا عنایت نامہ پہنچا۔ آپ کا ہاتر س سے کول آجانا ہم کو معلوم ہو گیا تھا---	۲۲جون ۱۸۵۳ء
۳۱	پیر و مرشد! غلام کی کیا طاقت کہ آپ سے خفا ہو---	۲۱اگست ۱۸۵۳ء
۳۲	بھائی صاحب! یہ شعر کس کا ہے---- بڑھ گئی تعظیم میری امتناع دخل سے---	۳ ستمبر ۱۸۵۳ء
۳۳	بھائی صاحب! تمہارا خط آیا اور حال جیت سنگھ کا معلوم ہوا---	۲اکتوبر ۱۸۵۳ء
۳۴	بھائی صاحب! یہ نئی طرز و روش ہے کہ خط کی رسید تو نہیں لکھتے---	۱۶اکتوبر ۱۸۵۳ء
۳۵	بھائی صاحب! یہ آپ کے دل میں کس نے شبہ ڈال دیا---	۷ نومبر ۱۸۵۳ء
۳۶	بھائی صاحب! میں بھی تمہارا ہمدرد ہو گیا---	۲۲دسمبر ۱۸۵۳ء
۳۷	بھائی جان! تمہارا وہ خط کہ جو شیخ رحمت اللہ صاحب کے ذریعہ کے خط کے جواب میں تھا' پہنچا---	۲۳جنوری ۱۸۵۴ء
۳۸	بھائی صاحب! میں نہیں جانتا تھا کہ تم کہاں ہو---	۲۳فروری ۱۸۵۴ء
۳۹	بھائی صاحب! آپ کا خط آیا۔ حال لڑکے بالوں کا اور تمہارا معلوم ہوا---	۲۷مارچ ۱۸۵۴ء
۴۰	بھائی صاحب! الحمد للہ کہ اور تو سب طرح خیر و عافیت ہے مگر گرمی کی وہ شدت ہے---	۴جون ۱۸۵۴ء
۴۱	بھائی صاحب! کیا کہوں کہ کتنا ہنسا ہوں تمہاری اس بات پر---	۱۹جون ۱۹۵۴ء
۴۲	بھائی صاحب! قصیدہ مدحیہ حضرت ولی عہد بہادر میں شین کی ضمیر مطلع سے لے کر---	مئی' جون ۱۸۵۴ء
۴۳	بھائی صاحب! یہ جو آپ نے لکھا کہ تیرے وہ اشعار سنے جاتے ہیں---	جولائی ۱۸۵۴ء
۴۴	بھائی صاحب! آپ کے عنایت نامے سے بھائی صاحبہ کے مزاج کی ناسازی---	۱۱اگست ۱۸۵۴ء
۴۵	بھائی صاحب! پرسوں شام کو مرزا یوسف علی خاں شہر میں پہنچے---	۱۵اگست ۱۸۵۴ء
۴۶	بھائی صاحب کو بندگی پہنچے' یہاں کی عید کا ماجرا عرض کروں گا---	۱۵ ستمبر ۱۸۵۴ء
۴۷	بھائی صاحب! جی چاہتا ہے باتیں کرنے کو۔ حق تعالیٰ عبد السلام کی ماں کو شفا دے---	۱۳اکتوبر ۱۸۵۴ء
۴۸	ہائے ہائے وہ نیک بخت نہ بچی۔ واقعی یہ کہ تم پر اور اسکی ساس پر کیا گذری ہوگی---	۱۶اکتوبر ۱۸۵۴ء
۴۹	بھائی صاحب! آپ کا خط آیا اور منشی عبد اللطیف کی دختر بلند اختر کا---	۱۵اکتوبر ۱۸۵۴ء
۵۰	آداب بجالاتا ہوں اور جاجم کا سلام کرتا ہوں---	۵نومبر ۱۸۵۴ء
۵۱	بھائی صاحب! حق تعالیٰ تم کو اور تمہارے بچوں کو سلامت رکھے---	۲۳نومبر ۱۸۵۴ء
۵۲	بھائی صاحب! خدا کے واسطے ماجرا کیا ہے---	۸دسمبر ۱۸۵۴ء
۵۳	بھائی! خدا کے واسطے' رسول کے واسطے منشی عبد اللطیف کی خیر و عافیت لکھو---	۳۱دسمبر ۱۸۵۴ء
۵۴	بھائی صاحب کا عنایت نامہ پہنچا۔ میرا خط نہ لکھنا تغافل و تساہل سے نہ تھا---	۸مارچ ۱۸۵۵ء
۵۵	پیر و مرشد! مجھ پر عتاب کیوں ہے۔ نہ میں تم تک آسکتا ہوں' نہ تم تشریف لا سکتے ہو---	۱۹مئی ۱۸۵۵ء
۵۶	بھائی صاحب! کہیے کیا گرمی پڑتی ہے اور کیوں کر گزرتی ہے---	۲۵مئی ۱۸۵۵ء
۵۷	لو صاحب' اور تماشا سنو۔ آپ مجھ کو سمجھاتے ہیں کہ تفتہ کو آزردہ نہ کرو---	۳جون ۱۸۵۵ء
۵۸	الحمد للہ کہ حرارت صوری اور حرارت یوی باہم رفع ہو گئیں---	۲۳جون ۱۸۵۵ء
۵۹	بھائی جان! منشی عبد اللطیف کی شادی پہلے اس پر---	۵جولائی ۱۸۵۵ء

۶۰	بھائی صاحب مینہ کا یہ عالم ہے کہ جدھر دیکھیے' اودھر دریا ہے---	۲۶ جولائی ۱۸۵۵ء
۶۱	عیاذاً" باللہ۔ یہ سخت ماجرا ہے۔ منشی عبداللطیف کہاں اور میرٹھ کہاں---	۴ اگست ۱۸۵۵ء
۶۲	حضرت! بہت دن سے حال تمہارا اور بچوں کا اور خصوصاً منشی عبداللطیف کا معلوم نہیں---	۱۶ ستمبر ۱۸۵۵ء
۶۳	پیر و مرشد! بات کو سمجھتے ہو یا یوں ہی شکوہ کرنے کو موجود ہو جاتے ہو---	۲۴ ستمبر ۱۸۵۵ء
۶۴	بھائی! تمہارا غصہ میرے سر آنکھوں پر' واللہ یہ نہیں ہے جو تم سمجھتے ہو---	۳ اکتوبر ۱۸۵۵ء
۶۵	بھائی صاحب! کئی خط اس عرصے میں تم کو لکھے' مگر جو لکھنا تھا' وہ بھول گیا---	۱۹ اکتوبر ۱۸۵۵ء
۶۶	یاالٰہی! کس کس پر رشک کروں۔ مال و دولت' جاہ و شوکت پر---	۱۸۵۵ء
۶۷	بندگی عرض کرتا ہوں۔ یہاں آج بدھ کا دن تیسری جون کی' شہر کے حساب سے انتیس رمضان کی ہے---	۴ جون ۱۸۵۶ء
۶۸	بھائی صاحب! شکر ہے خدا کا کہ تمہاری خیر و عافیت معلوم ہوئی---	۲۷ جولائی ۱۸۵۶ء
۶۹	بھائی صاحب! یکشنبے کا لکھا ہوا خط پرسوں دوشنبے کو یہاں پہنچا---	۵ اگست ۱۸۵۶ء
۷۰	بھائی صاحب! خط کے نہ پہنچنے کی شکایت کے کیا معنی---	۲۰ اگست ۱۸۵۶ء
۷۱	بھائی صاحب کو سلام اور حسن اتمام شادی کی اور مع الخیر معاودت کی مبارک باد---	۹ دسمبر ۱۸۵۶ء
۷۲	بھائی صاحب! آپ کا عنایت نامہ پہنچا' حال معلوم ہوا۔ میاں کا عذر مقبول و مسموع---	۲۲ ستمبر ۱۸۵۸ء

۴ ۔ نواب علاء الدین احمد خاں علائی کے نام

۱	مرزا سیمی کو دعا پہنچے۔ آنکھ کی گہاجنی جب خود پک کر پھوٹ گئی تھی---	۱۸۵۸ء
۲	آج بدھ کے دن' ۲۷ رمضان کو پہر دن چڑھے---	۱۱ مئی ۱۸۵۸ء
۳	خاک نمناکم و تو باد بہار نہ توانی مراز جا بردار---	۲۳ اگست ۱۸۵۸ء
۴	سبحان اللہ' ہزار برس تک نہ پیام بھیجنا' نہ خط لکھنا---	۲ جولائی ۱۸۶۰ء
۵	صاحب! میری داستان سنیے۔ پنسن بے کم و کاست جاری ہوا---	۸ جولائی ۱۸۶۰ء
۶	مولانا سیمی کیوں خفا ہوتے ہو۔ ہمیشہ سے اسلاف و اخلاف ہوتے چلے آئے ہیں---	۴ اپریل ۱۸۶۱ء
۷	میری جان! تخلص تمہارا بہت پاکیزہ اور میرے پسند ہے---	۱۳ مئی ۱۸۶۱ء
۸	میری جان' علائی ہمہ دان! اس دفع دخل مقدر کا کیا کہنا ہے---	یکم جون ۱۸۶۱ء
۹	جان غالب! یاد آتا ہے کہ تمہارے عم نامدار سے سنا ہے---	جون ۱۸۶۱ء
۱۰	علائی مولائی! اس وقت تمہارا خط پہنچا۔ ادھر پڑھا' ادھر جواب لکھا---	۲۵ ستمبر ۱۸۶۱ء
۱۱	صاحب! آگ برستی ہے' کیوں کر آگ میں گر پڑوں؟---	۳۰ ستمبر ۱۸۶۱ء
۱۲	میری جان! کیا کہتے ہو؟ کیا چاہتے ہو؟ ہوا ٹھنڈی ہو گئی---	۱۵ اکتوبر ۱۸۶۱ء
۱۳	آج جس وقت کہ میں روٹی کھانے کو گھر جاتا تھا---	۱۲ نومبر ۱۸۶۱ء
۱۴	صاحب! صبح جمعے کو میں نے تمہیں خط لکھا' اسی وقت بھیج دیا---	۹ فروری ۱۸۶۲ء
۱۵	نیر اصغر سپہر سخن سرائی' مولانا علائی کے خاطر نشاں دل نشین ہو---	۱۵ فروری ۱۸۶۲ء

۱۶	صاحب کل تمہارے خط کا جواب بھیج چکا ہوں' پہنچا ہو گا---	۱۶ فروری ۱۸۶۲ء
۱۷	صاحب! پرسوں تمہارا خط آیا۔ کل جمعے کے دن نواب کا مسہل تھا---	یکم مارچ ۱۸۶۲ء
۱۸	صاحب! میرا برادر عالی قدر اور تمہارا والد ماجد اب اچھا ہے---	۷ مارچ ۱۸۶۲ء
۱۹	یار بھتیجے! گویا بھائی' مولانا علائی! خدا کی دہائی' نہ میں ویسا ہوں گا---	۱۹ جون ۱۸۶۲ء
۲۰	جان غالب! دو خط تمہارے متواتر پہنچے' مغربی عرفا میں سے ہے---	۱۸ جولائی ۱۸۶۲ء
۲۱	لو صاحب' پرسوں تمہارا خط آیا اور کل دوپہر کو استاد میرجان آئے---	۱۸ جولائی ۱۸۶۲ء
۲۲	میری جان! سن' پنجشنبہ آٹھ' جمع نو' ہفتہ دس' اتوار گیارہ---	۲۷ جولائی ۱۸۶۲ء
۲۳	مولانا علائی! نہ مجھے خوف مرگ' نہ دعوی صبر ہے---	۶ اگست ۱۸۶۲ء
۲۴	جان غالب' مگر جسم سے نکلی ہوئی جان' قیامت کو دوبارہ ملنے کی توقع ہے---	۹ ستمبر ۱۸۶۲ء
۲۵	میاں! تم میرے ساتھ وہ معاملے کرتے ہو جو احیا سے مرسوم و معمول ہیں---	اوائل مارچ ۱۸۶۳ء
۲۶	اقبال نشانا! بخیر و عافیت و فتح و نصرت لوہارو پہنچنا مبارک ہو---	اپریل' مئی ۱۸۶۳ء
۲۷	ولی عہدی میں شاہی ہو مبارک عنایات الٰہی ہو مبارک---	اپریل' مئی ۱۸۶۳ء
۲۸	لا موجود الا اللہ - اس خدا کی قسم جس کو میں نے ایسا مانا ہے---	۳۰ مئی ۱۸۶۳ء
۲۹	بداست مرگ' ولے بد تر از گمان تو نیست---	۱۱ جون ۱۸۶۳ء
۳۰	میری جان! مرزا علی حسین خاں آئے اور مجھ سے ملے---	۲۱ جون ۱۸۶۳ء
۳۱	صاحب! میں از کار رفتہ و درماندہ ہوں---	۳ جولائی ۱۸۶۳ء
۳۲	جانا عالی شانا! پہلے خط اور پھر بہ توسط برخوردار علی حسین خاں---	۲۰ ستمبر ۱۸۶۳ء
۳۳	اقبال نشان مرزا علاء الدین خاں بہادر کو غالب گوشہ نشین کی دعا پہنچے---	۳ دسمبر ۱۸۶۳ء
۳۴	مولانا علائی! واللہ' علی حسین خاں کا بیان بہ مقتضائے محبت تھا---	۱۳ دسمبر ۱۸۶۳ء
۳۵	مرزا علائی! پہلے استاد میرجان صاحب کے قہر و غضب سے مجھ کو بچاؤ---	۲۱ دسمبر ۱۸۶۳ء
۳۶	علائی مولائی کو غالب طالب کی دعا۔ بے چارے مرزا کا معاملہ علی حسین خاں کی معرفت طے ہو گیا---	یکم جنوری ۱۸۶۴ء
۳۷	میری جان! غالب کثیر المطالب کی کہانی سن' میں اگلے زمانے کا آدمی ہوں---	۱۸ مئی ۱۸۶۴ء
۳۸	اے میری جان! مثنوی "ابر گہربار" کون سی فکر تازہ تھی کہ میں تجھ کو بھیجتا---	۳۰ مئی ۱۸۶۴ء
۳۹	علائی مولائی! غالب کو اپنا دعاگو اور خیر خواہ تصور کریں---	۱۰ جولائی ۱۸۶۴ء
۴۰	اجی مولانا علائی! نواب صاحب دو مہینے تک کی اجازت دے چکے---	۱۷ ستمبر ۱۸۶۴ء
۴۱	مرزا علائی مولائی! نہ لاہور سے خط لکھا نہ لوہارو سے---	۳ نومبر ۱۸۶۴ء
۴۲	میری جان! تمہارا خط بھی آیا اور علی حسین خاں نجم الدین بھی تشریف لایا---	۹ دسمبر ۱۸۶۴ء
۴۳	لو صاحب! وہ مرزا رجب بیگ مرے' ان کی تعزیت آپ نے نہ کی---	۵ جنوری ۱۸۶۴ء
۴۴	میری جان! ناسازی روزگار و بے ربطی اطوار و بہ طریق داغ بالائے داغ آرزوئے دیدار---	جنوری ۱۸۶۵ء
۴۵	میری جان! نئے مہمان کا قدم تم پر مبارک ہو---	۱۳ فروری ۱۸۶۵ء

۴۶	صاحب! کل تمہارا خط پہنچا' آج اس کا جواب لکھ کر روانہ کرتا ہوں ---	۲۲ فروری ۱۸۶۵ء
۴۷	شکر ایزد کہ ترا با پدرت صلح فتاد حوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زدند ---	یکم اکتوبر ۱۸۶۵ء
۴۸	جانا عالی شانا! خط پہنچا' حظ اٹھا۔ تمہاری آشفتہ حالی میں ہرگز شک نہیں ---	۶ دسمبر ۱۸۶۵ء
۴۹	مرزا روبرو بہ' از پہلو' آؤ میرے سامنے بیٹھو ---	۲۲ دسمبر ۱۸۶۵ء
۵۰	صاحب! تمہارا خط پہنچا۔ مطالب دل نشیں ہوئے۔ غوغائے خلق سے مجھ کو غرض نہیں ---	۲۲ دسمبر - ۲۶ دسمبر ۱۸۶۵ء
۵۱	جانا جانا! ایک خط میرا' تمہارے دو خطوں کے جواب میں تم کو پہنچا ہو گا ---	۲۶ دسمبر ۱۸۶۵ء
۵۲	میاں! چلتے وقت تمہارے چچا نے غلیل کی فرمائش کی تھی ---	۱۳ جنوری ۱۸۶۶ء
۵۳	میاں! مدعا اصلی ان سطور کی تحریر سے یہ ہے ---	۲۸ جولائی ۱۸۶۵ء کے بعد
۵۴	خوشی ہے یہ آنے کی برسات کے پئیں بادہ ناب اور آم کھائیں ---	۱۸۶۵ء - ۱۸۶۷ء
۵۵	اقبال نشان والا شان' صدرہ عزیز تر از جان ---	۲۱ جون ۱۸۶۸ء
۵۶	سعادت و اقبال نشان مرزا علاء الدین خان بہادر کو فقیر اسد اللہ کی دعا پہنچے ---	
۵۷	میاں! میں تمہارے باپ کا تابع' تمہارا مطیع' فرخ مرزا کا فرماں بردار ---	
۵۸	صاحب! بہت دن سے تمہارا خط نہیں آیا۔ آپ کا وکیل بڑا چرب زبان ہے ---	

۵ - میر مہدی مجروح کے نام

۱	میاں! آج یک شنبے کا دن' ساتویں فروری کی ---	۷ فروری ۱۸۵۸ء
۲	صاحب! دو خط تمہارے بہ سبیل ڈاک آئے ---	۲۱ اپریل ۱۸۵۸ء
۳	کیوں یار' کیا کہتے ہو؟ ہم کچھ آدمی کام کے ہیں یا نہیں؟ ---	اپریل ۱۸۵۸ء
۴	خوبی دین و دنیا روزی باد۔ میر اشرف علی صاحب نے تمہارا خط دیا ---	۱۸ اگست ۱۸۵۸ء
۵	بھائی تم تو لڑکوں کی سی باتیں کرتے ہو ---	اگست ۱۸۵۸ء
۶	میاں! تم کو پنسن کی کیا جلدی ہے؟ ---	۷ اکتوبر ۱۸۵۸ء
۷	سید صاحب! تمہارے خط کے آنے سے وہ خوشی ہوئی ---	اکتوبر ۱۸۵۸ء
۸	بھائی! ایک خط تمہارا پہلے پہنچا اور ایک خط کل آیا ---	نومبر ۱۸۵۸ء
۹	واہ واہ' سید صاحب - تم تو بڑی عبارت آرائیاں کرنے لگے ---	۲۲ دسمبر ۱۸۵۸ء
۱۰	سید صاحب! نہ تم مجرم نہ میں گنہگار - تم مجبور' میں ناچار ---	۲ فروری ۱۸۵۹ء
۱۱	میری جان! خدا تجھ کو ایک سو بیس برس کی عمر دے ---	فروری ۱۸۵۹ء
۱۲	میاں! کیوں تعجب کرتے ہو' یوسف مرزا کے خطوط کے نہ آنے سے؟ ---	فروری ۱۸۵۹ء
۱۳	میری جان! سنو داستان' صاحب کمشنر بہادر دہلی یعنی جناب سانڈرس صاحب بہادر ---	مارچ ۱۸۵۹ء
۱۴	میر مہدی! جیتے رہو' آفریں صد ہزار آفریں ---	۷ مارچ ۱۸۵۹ء
۱۵	سید! خدا کی پناہ! عبارت لکھنے کا ڈھنگ ہاتھ لیا آیا ہے ---	۲۷ مارچ ۱۸۵۹ء

۱۶	مار ڈالا' یار تیری جواب طلبی نے - اس چرخ کج رفتار کا برا ہو ---	اپریل ۱۸۵۹ء
۱۷	برخوردار کامگار میر مہدی! قطعہ تم نے دیکھا؟ سچ سچ میرا حلیہ ہے ---	۶ جولائی ۱۸۵۹ء
۱۸	میری جان! تم کو تو بے کاری میں خط لکھنے کا ایک شغل ہے ---	۱۵ اکتوبر ۱۸۵۹ء
۱۹	بھائی! نہ کاغذ ہے نہ ٹکٹ ہے - اگلے لفافوں میں سے ایک بیرنگ لفافہ پڑا ہے ---	۸ نومبر ۱۸۵۹ء
۲۰	میری جان! تو کیا کہ رہا ہے؟ بنیے سے سیانا سو دیوانہ ---	نومبر ۱۸۵۹ء
۲۱	بھائی! کیا پوچھتے ہو؟ کیا لکھوں؟ دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی ---	۲ دسمبر ۱۸۵۹ء
۲۲	بے ے بکند در کف من غامہ روائی سرداست ہوا' آتش بے دود کجائی	۱۳ دسمبر ۱۸۵۹ء
۲۳	میاں لڑکے! کہاں پھر رہے ہو؟ ادھر آؤ' خبریں سنو ---	یکم جنوری ۱۸۶۰ء
۲۴	اہاہا! میرا پیارا مہدی آیا - آؤ بھائی' مزاج تو اچھا ہے؟ ---	فروری ۱۸۶۰ء
۲۵	میر مہدی! تم میرے عادات کو بھول گئے؟ ماہ مبارک رمضان میں کبھی مسجد جامع کی تراویح ناغہ ہوئی ہے ---	۱۶ اپریل ۱۸۶۰ء
۲۶	میاں! کیوں ناسپاسی و ناحق شناسی کرتے ہو؟ چشم بیمار ایسی چیز ہے ---	اوائل مئی ۱۸۶۰ء
۲۷	جان غالب! اب کے ایسا بیمار ہو گیا تھا کہ مجھ کو خود افسوس تھا ---	۶ جون ۱۸۶۰ء
۲۸	میاں! تمہارے خط کا جواب منحصر تین باتوں پر ہے ---	۱۸ دسمبر ۱۸۶۰ء
۲۹	جان غالب! تمہارا خط پہنچا- غزل اصلاح کے بعد پہنچتی ہے ---	۱۸۶۰ء
۳۰	میاں تمہاری تحریر کا جواب یہ ہے کہ وہ تصویر جو میں نے میاں محمد افضل کو دی تھی ---	۹ جنوری ۱۸۶۱ء
۳۱	لو صاحب! یہ تماشا دیکھو - میں تو تم سے پوچھتا ہوں ---	۱۱ جنوری ۱۸۶۱ء
۳۲	او میاں سید زادہ آزادہ' دلی کے عاشق دلدادہ ---	۲۳ مئی ۱۸۶۱ء
۳۳	اے جناب میرن صاحب! السلام علیکم- حضرت! آداب ---	مئی ۱۸۶۱ء
۳۴	میاں! کس حال میں ہو؟ کس خیال میں ہو؟ ---	مئی ۱۸۶۱ء
۳۵	برخوردار! تمہارا خط آیا - حال معلوم ہوا ---	۱۸۶۱ء
۳۶	سید صاحب! کل پہر دن رہے تمہارا خط پہنچا ---	۲۶ جولائی ۱۸۶۱ء
۳۷	بھائی! تم سچ کہتے ہو : برسر فرزند آدم ہرچہ آید بگزرد ---	۸ اگست ۱۸۶۱ء
۳۸	ہاں صاحب! تم کیا چاہتے ہو؟ مجتہد العصر کے مسودے کو اصلاح دے کر بھیج دیا ---	۲۲ ستمبر ۱۸۶۱ء
۳۹	صاحب! آج تمہارا خط دوپہر کو آیا - اس میں میں نے مسودہ تاریخ کا پایا ---	۱۶ مئی ۱۸۶۲ء
۴۰	سید صاحب! اچھا ڈھکوسلا نکالا ہے' بعد القاب کے شکوہ شروع کر دینا ---	۲۹ جولائی ۱۸۶۲ء
۴۱	واہ حضرت! کیا خط لکھا ہے؟ اس خرافات کے لکھنے کا فائدہ ---	۲۶ ستمبر ۱۸۶۲ء
۴۲	میری جان! خط نہ بھیجو اور میرے خط کا انتظار کرو ---	۲۰ نومبر ۱۸۶۲ء
۴۳	جویائے حال دہلی والور سلام لو --- مسجد جامع واگزاشت ہو گئی ---	۱۶ دسمبر ۱۸۶۲ء
۴۴	برخوردار! تمہارا خط پہنچا' مگر یہ غضب ہے کہ میں اس کا جواب نہیں لکھ سکتا ---	جنوری ۱۸۶۳ء
۴۵	نور چشم' میر مہدی کو بعد دعا کے معلوم ہو کہ کلیات فارسی کا پہنچنا مجھ کو معلوم ہوا ---	۲۲ اگست ۱۸۶۳ء

۴۶	آیئے جناب میر مہدی صاحب دہلوی' بہت دنوں میں آئے۔ کہاں تھے؟---	۸ دسمبر ۱۸۶۳ء
۴۷	قرۃ العینین' میر مہدی و میر سرفراز حسین' مجھ سے ناخوش اور گلہ مند ہوں گے---	۱۷ جنوری ۱۸۶۵ء
۴۸	برخوردار نور چشم میر مہدی کو بعد دعائے حیات و صحت کے معلوم ہوا---	
۴۹	برخوردار کامگار' میر مہدی دہلوی' اردو بازار کے مولوی---	
۵۰	میری جان! وہ پارسی قدیم جو ہوشنگ و جمشید و کیخسرو کے عہد میں مروج تھی---	

۶ ۔ نواب سید یوسف علی خاں بہادر ناظم کے نام

۱	حضرت ولی نعمت آیہ رحمت! سلامت ۔ آداب بجالاتا ہوں---	۱۵ فروری ۱۸۵۷ء
۲	جناب عالی! کچھ کم مہینا ہوا کہ میں نے حضور کی غزلوں کو دیکھ کر خدمت میں روانہ کیا ہے---	۲۳ اپریل ۱۸۵۷ء
۳	جناب عالی! آداب بجالاتا ہوں اور عرض کرتا ہوں کہ اجورہ دار پہنچا---	۲۷ جولائی ۱۸۵۷ء
۴	حضرت ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت ۔ منشور عطوفت کے دیکھنے سے زندگی کی صورت نظر آئی---	۷ نومبر ۱۸۵۸ء
۵	خداوند نعمت' سلامت ۔ جو آپ بن مانگے دیں' اس کے لینے سے مجھے انکار نہیں---	۱۷ نومبر ۱۸۵۸ء
۶	حضرت ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت ۔ بعد آداب بجالانے کے عرض کرتا ہوں---	۳ دسمبر ۱۸۵۸ء
۷	حضرت ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت ۔ میں اس دولت ابد مدت کا از راہ مودت خیر خواہ ہوں---	۲۷ مارچ ۱۸۵۹ء
۸	حضرت ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت ۔ ایک خط مشتمل اپنے حال پر---	۱۷ اپریل ۱۸۵۹ء
۹	حضرت ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت ۔ بعد تسلیم عرض کرتا ہوں---	۱۸ اپریل ۱۸۵۹ء
۱۰	حضرت ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت ۔ نوازش نامے کے ورود مسعود کی اطلاع دیتا ہوں---	یکم اکتوبر ۱۸۵۹ء
۱۱	حضرت ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت ۔ بعد تقدیم تسلیم گزارش کرتا ہوں---	۵ نومبر ۱۸۵۹ء
۱۲	حضرت ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت ۔ بعد بجالانے آداب نیاز کے' عرض کرتا ہوں---	۷ نومبر ۱۸۵۹ء
۱۳	حضرت ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت ۔ بعد بجالانے آداب نیاز کے' عرض کرتا ہوں---	۲۷ نومبر ۱۸۵۹ء
۱۴	حضرت ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت ۔ آداب نیاز بجالا کر عرض کرتا ہوں---	۸ دسمبر ۱۸۵۹ء
۱۵	حضرت ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت ۔ آداب نیاز بجالاتا ہوں اور مزاج اقدس کی خبر پوچھتا ہوں---	۷ فروری ۱۸۶۰ء
۱۶	حضرت ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت ۔ تقدیم مراسم تسلیم مقدمہ اس گزارش کا ہے---	۱۲ اپریل ۱۸۶۰ء
۱۷	حضور ۱۸۵۸ء میں یہ قصیدہ کہ گویا نامہ منظوم ہے' میں نے حضور میں بھیجا تھا---	اپریل' مئی ۱۸۶۰ء
۱۸	حضرت ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت ۔ شکر بندہ پروری بجالا کر عرض کرتا ہوں---	۱۳ جولائی ۱۸۶۰ء
۱۹	حضور ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت ۔ بعد تسلیم معروض ہے---	۷ اپریل ۱۸۶۱ء
۲۰	حضور ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت ۔ بعد تسلیم تورے اور خلعت کے عطیے کا آداب بجالاتا ہوں---	۴ جولائی ۱۸۶۱ء
۲۱	حضور ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت ۔ بعد تسلیم معروض ہے' آٹھ سات برس سے مصدر خدمت---	۲۲ جولائی ۱۸۶۱ء
۲۲	حضور ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت ۔ بعد تسلیم کے عرض کرتا ہوں اور طلوع ستارہ اقبال کی مبارک باد---	۱۱ نومبر ۱۸۶۱ء
۲۳	حضرت ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت ۔ بعد تسلیم معروض ہے۔ کل ایک شعر ظہوری مغفور کا---	۱۵ ستمبر ۱۸۶۲ء

۲۴ حضرت ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت - بعد تسلیم معروض ہے۔ نوازش نامہ مع سو روپے کی ہنڈوی --- ۱۵ ستمبر ۱۸۶۴ء

۲۵ حضرت ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت - بعد تسلیم معروض ہے۔ نوازش نامہ مع ہنڈوی سو روپیہ کے --- ۱۰ اکتوبر ۱۸۶۲ء

۲۶ حضرت ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت - بعد تسلیم معروض ہے۔ نوازش نامہ ربوبیت طراز --- ۱۶ مارچ ۱۸۶۳ء

۲۷ حضرت ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت - بعد تسلیم معروض ہے۔ جب انبالے میرا جانا نہ ہوا --- ۴ اگست ۱۸۶۳ء

۲۸ حضرت ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت - بعد تسلیم معروض ہے۔ نوازش نامہ اور اس کے ساتھ دو ہنگیاں --- ۵ جولائی ۱۸۶۴ء

۲۹ حضرت ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت - بعد تسلیم معروض ہے۔ منشور عطوفت مع قطعہ ہنڈوی --- ۱۱ اگست ۱۸۶۴ء

۳۰ حضرت ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت - بعد تسلیم معروض ہے۔ نوازش نامہ مع ہنڈوی --- ۹ ستمبر ۱۸۶۴ء

۳۱ حضرت ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت - بعد تسلیم معروض ہے۔ صدور والا نامہ سے میں نے عزت پائی --- ۱۰ اکتوبر ۱۸۶۴ء

۳۲ حضرت ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت - بعد تسلیم و نیاز معروض ہے --- ۸ نومبر ۱۸۶۴ء

۳۳ حضرت ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت - بعد تسلیم معروض ہے۔ ابتدائی کیم نومبر سے --- ۱۳ نومبر ۱۸۶۴ء

۳۴ حضرت ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت - بعد تسلیم معروض ہے۔ عنایت نامہ مع ہنڈوی --- ۱۳ نومبر ۱۸۶۴ء

۳۵ حضرت ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت - بعد تسلیم معروض ہے۔ کس زبان سے کہوں --- ۲۷ نومبر ۱۸۶۴ء

۳۶ حضرت ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت - بعد تسلیم معروض ہے۔ نوازش نامہ 'عز ورود لایا --- ۱۲ دسمبر ۱۸۶۴ء

۳۷ حضرت ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت - بعد تسلیم معروض ہے۔ حضرت کے قدموں کی قسم --- ۲۶ دسمبر ۱۸۶۴ء

۳۸ حضرت ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت - بعد تسلیم معروض ہے۔ نوازش نامے کے ورود سے --- ۱۴ جنوری ۱۸۶۵ء

۳۹ حضرت ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت - بعد تسلیم معروض ہے۔ توقیع وقیع عز ورود لایا --- ۸ فروری ۱۸۶۵ء

۴۰ حضرت ولی نعمت' آیہ رحمت! سلامت - بعد تسلیم معروض ہے۔ منشور کرمت ظہور کے ورود مسعود نے --- ۱۱ مارچ ۱۸۶۵ء

۷ - منشی شیو نارائن آرام کے نام

۱ گمان زیست بود بر منت ز بے دردی   بد است مرگ ولے بد تر از گمان تو نیست --- ۱۸ جولائی ۱۸۵۸ء

۲ صاحب! خط پہنچا' اخبار کا لفافہ پہنچا' لفافوں کی خبر پہنچی' آپ نے کیوں تکلیف کی؟ --- ۱۸۵۸ء

۳ شفیق میرے' مکرم میرے' منشی شیو نرائن صاحب! تم ہزاروں برس سلامت رہو --- ۳۱ اگست ۱۸۵۸ء

۴ مہاراج! سخت حیرت میں ہوں کہ منشی ہرگوپال صاحب نے مجھ کو خط لکھنا کیوں چھوڑا --- ۳ ستمبر ۱۸۵۸ء

۵ نور بصیرت' لخت جگر منشی شیو نرائن کو دعا پہنچے۔ خط اور رپورٹ کا لفافہ پہنچا --- ستمبر ۱۸۵۸ء

۶ برخوردار نور چشم منشی شیو نرائن کو معلوم ہو کہ میں کیا جانتا تھا کہ تم کون ہو --- ۱۹ اکتوبر ۱۸۵۸ء

۷ برخوردار اقبال نشان منشی شیو نرائن کو بعد دعا کے معلوم ہو' تمہارے دو خط متواتر پہنچے --- ۲۳ اکتوبر ۱۸۵۸ء

۸ برخوردار کامگار کو بعد دعا کے معلوم ہو کہ "دستنبو" کے آغاز کی عبارت از روئے احتیاط دوبارہ ارسال کی --- اکتوبر ۱۸۵۸ء

۹ میاں! تمہارے کمال کا حال معلوم کر کے بہت خوش ہوا' --- ۹ نومبر ۱۸۵۸ء

۱۰	برخوردار کامگار منشی شیو نرائن! طال عمرہ وزاد قدرہ۔ کل جمعے کے دن بارہ نومبر کو بتیس کتابیں آ گئیں ---	۱۳ نومبر ۱۸۵۸ء
۱۱	صاحب! تمہارا خط آیا، دل خوش ہوا، دیکھیے مرزا مہر کب روانہ کرتے ہیں ---	۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء
۱۲	برخوردار اقبال نشان کو دعا پہنچے۔ کل جمعے کے دن انیس نومبر ۱۸۵۸ء کو سات کتابوں کے دو پارسل پہنچے ---	۲۰ نومبر ۱۸۵۸ء
۱۳	صاحب! تم کندھولی سے کب آئے؟ اور جب آئے تو وہ میرا خط بیرنگ کہ جس میں سات روپے کی ہنڈوی ---	۳۰ نومبر ۱۸۵۸ء
۱۴	صاحب! تم خط کے جواب نہ بھیجنے سے گھبرا رہے ہو گے۔ حال یہ ہے کہ قلم بنانے میں میرا ہاتھ ---	۱۱ دسمبر ۱۸۵۸ء
۱۵	بھائی! یہ بات تو کچھ نہیں کہ تم خط کا جواب نہیں لکھتے۔ خیر، دیر سے لکھو، اگر شتاب نہیں لکھتے ---	۱۵ دسمبر ۱۸۵۸ء
۱۶	برخوردار! آج اس وقت تمہارا خط مع لفافوں کے لفافے کے آیا، دل خوش ہوا ---	۱۸ دسمبر ۱۸۵۹ء
۱۷	اب ایک امر خاص کو سمجھو۔ دو جلدیں "دستنبو" کی مجھ کو لکھنؤ بھیجنی ہیں ---	۴ جنوری ۱۸۵۹ء
۱۸	پرسوں اور کل، دو ملاقاتیں جناب آرنلڈ صاحب بہادر سے ہوئیں ---	۱۵ جنوری ۱۸۵۹ء
۱۹	بھائی! میں تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ آج میرے پاس لکھنؤ کے ایک پارسل کی رسید آ گئی ---	۱۷ جنوری ۱۸۵۹ء
۲۰	صاحب! میں ہندی غزلیں بھیجوں کہاں سے؟ اردو کے دیوان چھاپے کے ناقص ہیں ---	۱۹ اپریل ۱۸۵۹ء
۲۱	بھائی! حاشا ثم حاشا، اگر یہ غزل میری ہو "اسد اور لینے کے دینے پڑے" ---	۲۶ اپریل ۱۸۵۹ء
۲۲	برخوردار منشی شیو نرائن کو دعا پہنچے۔ خط تمہارا مع اشتہار کے پہنچا ---	۱۲ جون ۱۸۵۹ء
۲۳	برخوردار نور چشم منشی شیو نرائن کو دعا پہنچے۔ صاحب! میں تو منتظر تمہارے آنے کا تھا ---	۲۰ جولائی ۱۸۵۹ء
۲۴	برخوردار کو بعد دعا کے معلوم ہو، تمہارا خط پہنچا اور خط سے کئی دن پہلے رسالہ "بغاوت ہند" پہنچا ---	۲۳ جولائی ۱۸۵۹ء
۲۵	میاں! یہ کیا معاملہ ہے؟ ایک خط اپنی رسید کا بھیج کر پھر تم چپکے ہو رہے ---	۱۷ اگست ۱۸۵۹ء
۲۶	کیوں میری جان، تم نے خط لکھنے کی قسم کھائی ہے یا لکھنا ہی بھول گئے ہو؟ ---	۲۲ ستمبر ۱۸۵۹ء
۲۷	میری جان! دو جلدیں "بغاوت ہند" کی پرسوں میرے پاس پہنچیں ---	۲۰ اکتوبر ۱۸۵۹ء
۲۸	برخوردار منشی شیو نرائن کو بعد دعا کے معلوم ہو۔ کیا میرے خط نہیں پہنچے ---	۲ نومبر ۱۸۵۹ء
۲۹	برخوردار! دو خط آئے اور آج یکشنبہ ۱۳ نومبر کو لفافہ اخبار آیا ---	۱۳ نومبر ۱۸۵۹ء
۳۰	برخوردار منشی شیو نرائن کو دعائے دوام دولت پہنچے۔ کل تمہارا خط پہنچا، دل خوش ہوا ---	۱۳ مارچ ۱۸۶۰ء
۳۱	برخوردار اقبال آثار منشی شیو نرائن کو بعد دعا کے معلوم ہو کہ ایک نسخہ "بغاوت ہند" کا ---	۱۴ مارچ ۱۸۶۰ء
۳۲	میاں! دیوان کے میرٹھ میں چھاپے جانے کی حقیقت سن لو، تب کچھ کلام کرو ---	اپریل ۱۸۶۰ء
۳۳	صاحب! میں تمہارا گناہگار ہوں۔ تمہاری کتاب میں نے دبا رکھی ہے ---	۲۵ جون ۱۸۶۰ء
۳۴	میاں تمہاری باتوں پر ہنسی آتی ہے۔ یہ دیوان میں نے تم کو بھیجا ہے، اتم و اکمل ہے ---	۳ جولائی ۱۸۶۰ء
۳۵	میاں! میں جانتا ہوں کہ مولوی میر نیاز علی صاحب نے وکالت اچھی نہیں کی ---	۱۰ جنوری ۱۸۶۲ء
۳۶	برخوردار منشی شیو نرائن کو دعا کے بعد معلوم ہو، تصویر پہنچی، تحریر پہنچی ---	۳ مئی ۱۸۶۳ء

۸ - میاں داد خاں سیاح کے نام

برخوردار کامگار، سعادت نشاں، منشی میاں داد خاں سیاح طال عمرہ - درویش گوشہ نشیں غالب حزیں --- ۱۱ جون ۱۸۶۰ء

۲	برخوردار! تمہارا خط پہنچا' لکھنؤ کا کیا کہنا ہے! وہ ہندوستان کا بغداد تھا۔ اللہ اللہ ---	۳۰ جون ۱۸۶۰ء
۳	بھائی تمہاری جان کی اور اپنے ایمان کی قسم' کہ میں فن تاریخ گوئی و معما سے بیگانہ محض ہوں ---	۳۱ جولائی ۱۸۶۰ء
۴	سعادت و اقبال نشاں' منشی میاں داد خاں سے میں بہت شرمندہ ہوں ---	۳۱ دسمبر ۱۸۶۰ء
۵	منشی صاحب! تمہارے خط پہنچنے کی تم کو اطلاع دیتا ہوں ---	۱۲ فروری ۱۸۶۱ء
۶	منشی صاحب! سعادت و اقبال نشاں' سیف الحق میاں داد خاں سیاح کو دعا ---	جنوری یا فروری ۱۸۶۱ء
۷	بھائی! ہم نے تم کو یہ نہیں کہا کہ تم مرزا رجب علی بیگ کے شاگرد ہو جاؤ ---	۲۷ فروری ۱۸۶۱ء
۸	صاحب! کل آپ کا خط آیا' میرا دھیان لگا ہوا تھا کہ آیا میاں سیاح کہاں ہیں ---	۴ اکتوبر ۱۸۶۱ء
۹	صاحب! آج تمہارے کئی خطوں کا جواب لکھتا ہوں ---	۲۰ نومبر ۱۸۶۱ء
۱۰	جناب منشی صاحب! آپ کا خط مع خط مہری لفٹنٹ گورنر آگرہ کہ وہ میرا بھیجا ہوا تھا' پہنچا ---	۱۰ فروری ۱۸۶۲ء
۱۱	آیئے بیٹھیے' مولانا سیاح' سلام علیکم۔ مزاج مبارک ---	۲۰ مئی ۱۸۶۲ء
۱۲	صاحب! میرا سلام۔ تمہارا خط پہنچا۔ دونوں غزلیں دیکھیں ---	۱۷ جون ۱۸۶۲ء
۱۳	صاحب! میں تم سے شرمندہ ہوں۔ پہلا خط تمہارا مع قصیدہ پہنچا ---	۱۸ نومبر ۱۸۶۲ء
۱۴	منشی صاحب! سعادت و اقبال نشان۔ شکوہ تمہارا میرے سر آنکھوں پر ---	۱۶ اگست ۱۸۶۳ء
۱۵	خاں صاحب! سعادت و اقبال نشان' میاں داد خاں سیاح کو ---	یکم مارچ ۱۸۶۴ء
۱۶	صاحب! یہ سر پیٹنے کی جگہ ہے کہ تمہارا کوئی خط ڈاک میں ضائع نہیں ہوتا ---	۱۷ ستمبر ۱۸۶۴ء
۱۷	منشی صاحب! یہ کیا اتفاق ہے کہ میری بات کوئی نہیں سمجھتا ---	۳ دسمبر ۱۸۶۴ء
۱۸	سعادت و اقبال نشان سیف الحق منشی میاں داد خاں سیاح کو فقیر غالب کی دعا پہنچے ---	۳ جنوری ۱۸۶۵ء
۱۹	منشی صاحب! سعادت و اقبال نشان سیف الحق میاں داد خاں سلمکم اللہ تعالیٰ ---	۱۳ اپریل ۱۸۶۵ء
۲۰	صاحب! تمہارا مہربانی نامہ کہ گویا الفاظ اس کے سراسر نواب میر غلام بابا خاں صاحب کی زبانی تھے ---	۳۰ جولائی ۱۸۶۵ء
۲۱	منشی صاحب! سعادت و اقبال نشاں' منشی میاں داد خاں سیاح سیف الحق سلمکم اللہ تعالیٰ ---	۱۱ ستمبر ۱۸۶۵ء
۲۲	منشی صاحب! سعادت و اقبال نشاں' سیف الحق میاں داد خاں' تم سلامت رہو ---	۱۷ ستمبر ۱۸۶۵ء
۲۳	صاحب! میں خدا کا شکر بجا لاتا ہوں کہ تم اپنے وطن گئے ---	۲۳ جنوری ۱۸۶۶ء
۲۴	منشی صاحب! سعادت و اقبال نشاں' سیف الحق میاں داد خاں کو فقیر اسد اللہ کا سلام ---	۲۱ فروری ۱۸۶۶ء
۲۵	اقبال نشاں' سیف الحق کو دعا پہنچے۔ پانچ اشتہار اخبار کی خریداری کے ---	۲۲ مارچ ۱۸۶۶ء
۲۶	مولانا سیف الحق! اب تو کوئی خط تمہارا نوٹ اور ہنڈوی اور ٹکٹ سے خالی نہیں ہوتا ---	۲۳ اپریل ۱۸۶۶ء
۲۷	بھائی سیف الحق! تمہارا خط پہنچا' قاضی صاحب بڑودہ کو معاف رکھو ---	۵ ستمبر ۱۸۶۶ء
۲۸	منشی صاحب! وہی جہاں' وہی زمین' وہی آسمان' وہی سورت بمبئی' وہی دلی ---	۳ جنوری ۱۸۶۷ء
۲۹	صاحب! تمہارے خط کے پہنچنے سے کمال خوشی ہوئی۔ ٹوپیاں اگرچہ تمہارے سر پر ٹھیک نہ آئیں ---	۲۵ جنوری ۱۸۶۷ء
۳۰	منشی صاحب شفیق' بدل مہرباں' عزیز تر از جاں' سیف الحق میاں داد خاں ---	۱۲ فروری ۱۸۶۷ء
۳۱	بھائی! تم جیتے رہو اور مراتب عالی کو پہنچو۔ لو ایک ہنسی کی بات سنو ---	۳۱ مارچ ۱۸۶۷ء

۳۲ منشی صاحب! سعادت و اقبال نشاں' عزیز تر از جاں' سیف الحق میاں داد خاں --- ۲۳ اپریل ۱۸۶۷ء

۳۳ بھائی تمہارا خط کل پہنچا۔ آج جواب لکھتا ہوں --- ۲۹ اپریل ۱۸۶۷ء

۳۴ منشی صاحب! سعادت و اقبال نشاں' سیف الحق منشی میاں داد خاں سیاح کو غالب ناتواں نیم جاں کی دعا --- ۱۱ جون ۱۸۶۷ء

۳۵ نور چشم' اقبال نشاں' سیف الحق میاں داد خاں سیاح کو غالب نیم جاں کی دعا پہنچے --- ۲۵ اگست ۱۸۶۷ء

۹ ۔ قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی کے نام

۱ مخدوم مکرم و معظم جناب مولوی عبدالجمیل صاحب کی خدمت میں بعد ابلاغ سلام مسنون الاسلام --- ۱۸۵۴ء

۲ قبلہ! آپ کو خط کے پہنچنے میں تردد کیوں ہوتا ہے؟ ہر روز دو چار خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں --- ۲۰ نومبر ۱۸۵۵ء

۳ پیرو مرشد! فقیر ہمیشہ آپ کی خدمت گزاری میں حاضر اور غیر قاصر رہا ہے --- ۲۹ اپریل ۱۸۵۹ء

۴ حضرت! کیا ارشاد ہوتا ہے؟ آگے اس سے جو آپ کے اشعار آئے تھے --- ۲۸ اگست ۱۸۵۹ء

۵ صاحب! وہ خط جس میں اشعار سید مظلوم کے تھے' مجھ کو پہنچا --- ۸ ستمبر ۱۸۵۹ء

۶ حضرت! بہت دنوں میں آپ نے مجھ کو یاد کیا۔ سال گزشتہ ان دنوں میں' میں رام پور میں تھا --- فروری' مارچ ۱۸۶۱ء

۷ جناب قاضی صاحب کو بندگی پہنچے۔ عنایت نامے کے ورود نے شادماں کیا --- ۳۰ جون ۱۸۶۱ء

۸ سلامت۔ یہ عہدہ آپ کو مبارک ہو اور مجھ کو اسی طرح صدر الصدوری کے منصب کی مبارک باد ---

۹ جناب مخدوم مکرم کو میری بندگی - نعمقد نامہ مرقومہ ۲۱ ستمبر میں نے پایا --- ۲۹ ستمبر ۱۸۶۱ء

۱۰ از اسد بندگی برسد۔ حضرت' یہ غزل قطعہ بند ہے' پس خطاب مطلع میں چاہئے ---

۱۱ "اے مشفق من" نامربوط اور قبیح ٹکسال بارہ۔ اس شعر کو دور کرو ---

۱۲ آداب عرض کرتا ہوں اور چاروں غزلیں دیکھ کر جا بہ جا حک و اصلاح کر کر بھیجتا ہوں ---

۱۳ "خستہ کام و اندیشہ کام" دونوں لفظ ٹکسال باہر ہیں ---

۱۴ "تڑپھنا" ترجمہ تپیدن کا املا یوں ہے' نہ "تڑپنا" ---

۱۵ "زبیرون خانہ" کا لفظ خلاف روزمرہ ---

۱۶ جناب مولوی صاحب! آپ کے دونوں خط پہنچے۔ میں زندہ ہوں لیکن نیم مردہ --- ۱۹ جون ۱۸۶۳ء

۱۷ جناب قاضی صاحب کو میری بندگی پہنچے۔ مکرمی مولی غلام غوث بہادر میر منشی کا قول سچ ہے --- ۳۰ نومبر ۱۸۶۳ء

۱۸ قبلہ! مجھے کیوں شرمندہ کیا؟ میں اس ثنا و دعا کے قابل نہیں --- ۱۵ دسمبر ۱۸۶۳ء

۱۹ جناب قاضی صاحب کو سلام اور قصیدے کی بندگی --- ۷ جنوری ۱۸۶۴ء

۲۰ پیرو مرشد! ماہ شوال کو خنجر و شمشیر سے کیا علاقہ؟ --- ۷ فروری ۱۸۶۴ء

۲۱ دشمنی پر جب کہ ہم سے یار ہے   پھر بھلا کیا شکوہ اغیار ہے --- ۱۹ مارچ ۱۸۶۴ء

۲۲ سہسوان کے صاحب اگر "قاطع برہان" کا جواب لکھتے ہیں --- ۴ اپریل ۱۸۶۴ء

۲۳ حضرت سلامت! میاں قدرت اللہ صاحب کا تردد بجا۔ پیش از صبح صادق "نماز کیسی؟ --- ۸ مئی ۱۸۶۴ء

۲۴ قبلہ! ایک سو بیس آم پہنچے - خدا حضرت کو سلامت رکھے --- ۲۸ جون ۱۸۶۴ء

۲۵	جناب عالی! وہ غزل جو کہار لایا تھا' وہاں پہنچی' جہاں اب میں جانے والا ہوں یعنی عدم ---	۳۰ جون ۱۸۶۴ء
۲۶	کیا مخصوص بہر بود و باش یار جب اس کو ---	۷ نومبر ۱۸۶۵ء
۲۷	آداب بجالاتا ہوں۔ آپ کا نوازش نامہ پہنچا۔ غزلیں دیکھی گئیں۔	
۲۸	سبحان اللہ! سر آغاز فصل میں ایسے ثمرہائے پیش رس کا پہنچنا نوید ہزار گونہ ---	
۲۹	غزل کے بھیجنے میں دیر لگی۔ قصور معاف ہو' جو میرے عزیز بریلی میں وارد ہیں ---	
۳۰	جناب مولوی صاحب کو فقیر اسد اللہ کا سلام ---	۳۱ اکتوبر ۱۸۶۶ء

۱۰ - چودھری عبدالغفور سرور کے نام

۱	میرے کرم فرما' میرے شفیق! شعر : شرط اسلام بود ورزش ایماں' بالغیب ---	قبل مارچ ۱۸۵۸ء
۲	چودھری صاحب شفیق مکرم کی خدمت میں بعد ارسال سلام مسنون' عرض کرتا ہوں ---	مارچ یا اپریل ۱۸۵۸ء
۳	بندہ پرور! مہربانی نامہ آیا۔ سر پر رکھا' آنکھوں سے لگایا ---	اپریل یا مئی ۱۸۵۸ء
۴	بندہ پرور! آپ کا تفقدنامہ محررہ پندرہ نومبر آج' پنجشنبہ کے دن ---	۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء
۵	جناب چودھری صاحب! آپ کا عنایت نامہ اس وقت پہنچا اور یہ وقت صبح کا ہے ---	یکم دسمبر ۱۸۵۸ء
۶	جناب چودھری صاحب کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہوں ---	مارچ ۱۸۵۹ء
۷	جناب چودھری صاحب آپ کو بعد ابلاغ سلام آپ کے خط کے پہنچنے سے آگہی دیتا ہوں ---	مارچ ۱۸۵۹ء
۸	چودہری صاحب مشفق مکرم کو میرا سلام ---	مارچ یا اپریل ۱۸۵۹ء
۹	جناب چودھری صاحب کی یاد آوری اور مہر گستری کا شکر بجالاتا ہوں ---	مئی یا جون ۱۸۵۹ء
۱۰	شفیق مکرم' مظہر لطف و کرم' جناب چودہری صاحب ---	جون ۱۸۵۹ء
۱۱	شفیق میرے' عنایت فرما میرے! تمہاری مہربانی کا شکر بجالاتا ہوں ---	جولائی یا اگست ۱۸۵۹ء
۱۲	میرے شفیق دلی چودہری عبدالغفور صاحب کو خدا سلامت رکھے ---	جولائی یا اگست ۱۸۵۹ء
۱۳	میرے مشفق کو میرا سلام پہنچے - دونوں مخمس بعد اصلاح پہنچتے ہیں ---	اگست یا ستمبر ۱۸۵۹ء
۱۴	میرے شفیق دلی کو میرا سلام پہنچے۔ کل "انشا" کا پارسل پہنچا اور آج خط ---	اکتوبر یا نومبر ۱۸۵۹ء
۱۵	جناب عالی! آج آپ کا تفقدنامہ' مرقومہ یازدہم شعبان مطابق پنجم مارچ بہ قید روز دوشنبہ پہنچا ---	اپریل ۱۸۶۰ء
۱۶	میرے مشفق! آپ کا خط آیا اور اس کے آنے نے تمہاری رنجش کا وسوسہ میرے دل سے مٹایا ---	ستمبر ۱۸۶۰ء
۱۷	میرے مشفق چودہری عبدالغفور صاحب! اپنے خط اور قصیدہ بھیجنے کا مجھ کو شکر گزار ---	نومبر ۱۸۶۰ء
۱۸	جناب چودھری صاحب! عنایت نامہ سابق - بیت - تھا تو خط پر نہ تھا جواب طلب ---	جون ۱۸۶۲ء
۱۹	بندہ پرور! پرسوں تمہارا خط آیا۔ آخر جواب لکھ رکھتا ہوں' کل ڈاک میں بجھوا دوں گا ---	جولائی ۱۸۶۳ء
۲۰	ایک عبارت لکھتا ہوں چونکہ لفافہ جناب چودہری عبدالغفور صاحب کے نام کا ہو گا ---	دسمبر ۱۸۶۳ء
۲۱	آہا! جناب منشی ممتاز علی خاں صاحب مارہرہ پہنچے ---	دسمبر ۱۸۶۳ء
۲۲	جناب چودھری صاحب! میں تو خدمت بجالایا مگر اس کے صلے میں تین باتیں چاہتا ہوں ---	۲۵ ستمبر ۱۸۶۶ء

۲۳ جناب چودھری صاحب کو سلام پہنچے۔ آپ نے اپنے مزاج کی ناسازی کا حال کچھ نہ لکھا---

۲۴ جناب چودھری صاحب! آپ کے تلطف نامے کے ورود کی مسرت اور پارسل کے نہ پہنچنے کی حیرت---

۲۵ بندہ پرور! بہت دن کے بعد پرسوں آپ کا خط آیا---

۲۶ جناب چودھری صاحب! سیاہی پھیکی کاغذ پتلا' پیرو مرشد کی عبارت ایک طرف---

۲۷ جناب عالی! "چھاچھا" ترجمہ ہندی ہے۔ ایک بار "چھا" کفایت کرتا ہے "انواع انواع"---

۱۱ - خواجہ غلام غوث خاں بے خبر کے نام

۱	پیرو مرشد! یہ خط ہے' کرامت ہے؟ صاف صفائے ضمیر و کشف حجب کی علامت ہے---	۲ دسمبر ۱۸۵۸ء
۲	قبلہ! اس نامہ مختصر نے وہ کیا جو پارہ ابر کشت خشک سے کرے---	اوائل دسمبر ۱۸۵۸ء
۳	قبلہ حاجات! عطوفت نامے کے آنے سے آپ کا بھی شکر گزار ہوا---	اواخر دسمبر ۱۸۵۸ء
۴	جناب عالی! آج دو شنبہ' ۳ جنوری ۱۸۵۹ء کی ہے۔ پہر دن چڑھا ہو گا---	۳ جنوری ۱۸۵۹ء
۵	قبلہ! کبھی آپ کو یہ بھی خیال آتا ہے کہ کوئی ہمارا دوست جو غالب کہلاتا ہے' وہ کیا کھاتا پیتا ہے---	۳۰ جنوری ۱۸۵۹ء
۶	قبلہ حاجات! قطعے میں جو حضرت نے الہام درج کیا ہے' وہ تو ایک لطیفہ بہ سبیل دعا ہے---	فروری ۱۸۵۹ء
۷	حضور! پہلے خدا کا شکر' پھر آپ کا شکر بجالاتا ہوں کہ آپ نے خط لکھا---	اواخر مارچ ۱۸۶۰ء
۸	حضرت پیرو مرشد! اس سے آگے آپ کو لکھ چکا ہوں---	۱۸۶۲ء
۹	بندہ پرور! اگر ایک بندہ قدیم کہ عمر بھر فرمان پذیر رہا ہو' بڑھاپے میں ایک حکم نہ بجالاوے---	۱۸۶۲ء
۱۰	قبلہ! کل خط آیا۔ آج جواب لکھتا ہوں۔ پہلے آپ کا ایک فقرہ لکھ کر اتراتا ہوں---	۱۸۶۲ء
۱۱	قبلہ! آج تیسرا دن ہے کہ "بنا بہ آب رسیدن" و "بہ آب رساندن" کی حقیقت بہ استناد اساتذہ لکھ کر---	۱۸۶۲ء
۱۲	قبلہ! دیکھئے ہم عارف ہیں۔ ورود نامے سے پہلے جواب نامہ لکھتے ہیں---	۱۸۶۲ء
۱۳	پیرو مرشد! "سہل ممتنع" میں کسرہ لام توصیفی ہے۔ سہل موصوف اور ممتنع صفت---	۱۸۶۲ء
۱۴	در نومیدی بسے امید است پایان شب سیہ سپید است---	اواخر مارچ ۱۸۶۳ء
۱۵	جناب عالی! کل میرے شفیق مکرم منشی نواب جان کلبہ احزاں میں تشریف لائے---	۱۸۶۳ء
۱۶	جناب عالی! ایک شعر استاد کا مدت سے تحویل حافظہ میں چلا آتا ہے---	۷ مارچ ۱۸۶۴ء
۱۷	قبلہ! میرا ایک شعر ہے--- خود پیش خود کفیل گرفتاری منست ہردم بہ پرسش دل مایوس میرسد	اکتوبر' نومبر ۱۸۶۴ء
۱۸	میں سادہ دل آزارگی یار سے خوش ہوں یعنی سبق شوق مکرر نہ ہوا تھا	اکتوبر' نومبر ۱۸۶۴ء
۱۹	پیرو مرشد! کوئی صاحب ڈپٹی کلکٹر ہیں کلکتے میں' مولوی عبدالغفور خاں ان کا نام اور نساخ تخلص ہے---	۱۸۶۴ء
۲۰	قبلہ! آپ کا خط پہلا آیا' اور میں اس کا جواب لکھنا بھول گیا۔ کل دوسرا خط آیا مگر شام کو---	۷ جولائی ۱۸۶۵ء
۲۱	بندہ گنہگار شرمسار عرض کرتا ہے کہ پرسوں غازی آباد کا اٹھا ہوا گیارہ بجے اپنے گھر---	۱۰ جنوری ۱۸۶۶ء
۲۲	مولانا! بندگی۔ آج صبح کے وقت شوق دیدار میں بے اختیار' نہ ریل نہ ڈاک' توسن ہمت پر سوار---	جنوری ۱۸۶۶ء

۲۳	قبلہ! آپ بے شک ولی صاحب کرامت ہیں۔ کم و بیش ایک ہفتہ گزرا ہو گا---	۲۲ جولائی ۱۸۶۶ء
۲۴	قبلہ! پیری و صد عیب۔ ساتویں دہا کے کے مہینے گن رہا ہوں۔ قولنج آگے دوری تھا---	۱۸۶۶ء
۲۵	قبلہ! میں نہیں جانتا کہ ان روزوں میں بہ قول ہندی اختر شناسوں کے کون سی کھوٹی گرہ آئی۔	

۱۲ - حکیم غلام نجف خاں کے نام

۱	میاں! حقیقت حال اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اب تک جیتا ہوں---	۲۱ دسمبر ۱۸۵۷ء
۲	میاں! تمہارا خط پہنچا' آج میں نے اس کو اپنے خط میں ملفوف کر کے آگرے روانہ کیا---	۲۶ دسمبر ۱۸۵۷ء
۳	سعادت و اقبال نشاں حکیم غلام نجف خاں طال بقائہ' تمہارا رقعہ پہنچا---	۱۹ جنوری ۱۸۵۸ء
۴	بھائی! ہوش میں آؤ۔ میں نے تم کو خط کب بھیجا---	۱۸۵۸ء
۵	میاں! تم کو مبارک ہو کہ حکیم صاحب پر سے وہ سپاہی جوان کے اوپر متعین تھا' اٹھ گیا---	یکم اپریل ۱۸۵۸ء
۶	بھائی! میرا دکھ سنو' ہر شخص کو غم موافق اس کی طبیعت کے ہوتا ہے---	۱۸۵۸ء
۷	بھائی! تمہارے رقعے کا جواب پہلے تم کو شیر زماں خاں نے دیا ہو گا---	فروری' مارچ ۱۸۵۸ء
۸	بھائی! ہاں غلام فخرالدین خاں کی رہائی' زندگی دوبارہ ہے---	اگست ۱۸۵۸ء
۹	قبلہ! یہ تو معلوم ہوا کہ بعد قتل ہونے اس آدمی کے' کہ وہ اس میں عزیز بھی تھے---	ستمبر ۱۸۵۸ء
۱۰	میاں! میں تم سے رخصت ہو کر اس دن مراد نگر میں رہا---	۲۱ جنوری ۱۸۶۰ء
۱۱	برخوردار سعادت و اقبال نشاں' حکیم غلام نجف خاں کو میری دعا پہنچے---	۳ فروری ۱۸۶۰ء
۱۲	میاں! تم نے برا کیا کہ لفافہ کھول کر نہ پڑھ لیا---	۱۴ فروری ۱۸۶۰ء
۱۳	صاحب! کل آخر روز تمہارا خط آیا۔ میں نے پڑھا' آنکھوں سے لگایا---	۱۱ جنوری ۱۸۶۳ء
۱۴	میاں! تمہارا گلہ میرے سر و چشم پر' لیکن میرا حال سن لو!---	یکم اپریل ۱۸۶۵ء
۱۵	بھائی! میں تم کو کیا بتاؤں کہ میں کیسا ہوں؟ طاقت یک قلم جاتی رہی ہے---	ستمبر ۱۸۶۵ء
۱۶	برخوردار حکیم غلام نجف خاں کو فقیر غالب علی شاہ کی دعا پہنچے---	۱۱ اکتوبر ۱۸۶۵ء
۱۷	اقبال نشاں' عضد الدولہ حکیم غلام نجف خاں کو غالب علی شاہ کی دعا پہنچے---	۲۱ اکتوبر ۱۸۶۵ء
۱۸	صاحب! تم سچ کہتے ہو' بھائی فضل اللہ خاں کی غم خواری اور مددگاری کا کیا کہنا ہے---	۲۴ اکتوبر ۱۸۶۵ء
۱۹	صاحب! تمہارے دو خط متواتر آئے۔ ظہیرالدین کا آگرے جانا---	۲۱ نومبر ۱۸۶۵ء
۲۰	حکیم غلام نجف خاں سنو! اگر تم نے مجھے بنایا ہے' یعنی استاد اور باپ کہتے ہو---	
۲۱	میاں! آج صبح کو تم آئے تھے۔ میں اس ٹکٹ کے قصے میں ایسا الجھا کہ تم سے کہنا بھول گیا---	
۲۲	میاں! پہلے ظہیرالدین کا حال لکھو' پھر حکیم صاحب کی حقیقت لکھو!---	
۲۳	میاں! چانول برے' بڑھتے نہیں' لمبے نہیں' پتلے نہیں' اب زیادہ قصہ نہ کرو---	
۲۴	لو صاحب! یہ پندرہ جیتیں ہیں۔ تقسیم اس کی اسی طرح رکھنا---	
۲۵	نہ بھائی' یہ نہ سمجھو! "سلطان" بہ معنی مصدر آتا ہے---	

۱۳ - سید غلام حسنین قدر بلگرامی کے نام

۱	بندہ پرور! آپ کے عنایت نامے کے آنے سے تین طرح کی خوشی مجھ کو حاصل ہوئی---	۲۳ فروری ۱۸۵۷ء
۲	حضرت! میں نے چاہا کہ حکم بجالاؤں اور عبارت کو اصلاح دوں، مگر میں کیا کروں---	قبل ۱۸۵۷ء
۳	مشفق میرے! میں بعد آپ کے جانے کے دلی سے رام پور آیا---	جنوری، مارچ ۱۸۶۰ء
۴	سید صاحب! تمہارا مہربانی نامہ مع دو غزلوں کے پہنچا۔ جواب کے لکھنے میں اگر دیر ہوئی---	۱۳ مارچ ۱۸۶۰ء
۵	سعادت و اقبال نشان میر غلام حسنین کو غالب گوشہ نشیں کی دعا پہنچے---	۱۸۶۱ء
۶	بندہ پرور! آپ کا خط لکھنؤ سے آیا۔ حالات معلوم ہوئے---	۱۸۶۱ء
۷	سید صاحب! سعادت و اقبال نشان میر غلام حسنین صاحب کو غالب کی دعا پہنچے---	۴ مئی ۱۸۶۲ء
۸	سید صاحب! آپ کا خط جس میں قبلہ و کعبہ کا مہری و دستخطی توقیع ملفوف تھا، پہنچا---	۲۴ مئی ۱۸۶۲ء
۹	سید صاحب! آپ نے خوب کیا کہ مفتی میر عباس کا ہدیہ غیر کو نہ دیا۔ اپنے پاس امانت رکھیے---	جون ۱۸۶۲ء
۱۰	صاحب! تم سے پہلے یہ پوچھا جاتا ہے کہ جب تم جانتے ہو کہ مرزا عباس میری حقیقی بہن کا بیٹا ہے---	۱۸۶۳ء
۱۱	میر صاحب! ماجرا یہ ہے کہ میں ہمیشہ نواب گورنر جنرل بہادر کے دربار میں سیدھی صف میں دسواں نمبر---	مارچ ۱۸۶۳ء
۱۲	صاحب! میں برس دن سے بیمار تھا۔ ایک پھوڑا اچھا ہوا، دوسرا پیدا ہوا---	۲۲ اگست ۱۸۶۳ء
۱۳	سید صاحب! تم نے جو خط میں برخوردار کامگار مرزا عباس بیگ خاں بہادر کی رعایت---	۲۴ نومبر ۱۸۶۳ء
۱۴	قرۃ العین میر غلام حسنین سلمکم اللہ تعالیٰ۔ تمہارا خط پہنچا، دل خوش ہوا---	۱۸۶۵ء
۱۵	(سوال) یار سے چھیڑ چلی جائے اسد گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی	
۱۶	قدر : کاٹ کر غیروں کے سر لائے جو میری نذر کو---	
۱۷	"تئیں" کا لفظ متروک اور مردود، قبیح، غیر فصیح - یہ پنجاب کی بولی ہے---	
۱۸	حضرت! آپ کے خط کا کاغذ باریک اور ایک طرف سے سراسر سیاہ---	
۱۹	حضرت! کیا فرماتے ہو؟ "ہوا بھی ہو" ، "قضا بھی ہو" اس ردیف کے ساتھ قافیہ معمولی آ نہیں سکتا۔	
۲۰	صاحب! واللہ، سوائے اس خط کے تمہارا کوئی خط نہیں آیا۔ کیسے چار خط تم نے بھیجے؟---	
۲۱	سید صاحب! تم "قدر" اور نور چشم مرزا عباس قدردان۔ خاطر جمع رکھو---	
۲۲	حضرت! فقیر نے شعر کہنے سے توبہ کی ہے۔ اصلاح دینے سے توبہ کی ہے---	

۱۴ - نواب انور الدولہ سعد الدین خاں بہادر شفق کے نام

۱	قبلہ حاجات! قصیدہ دوبارہ پہنچا۔ چوں کہ پیشانی پر دستخط کی جگہ نہ تھی---	۱۸۵۳ء
۲	کیوں کر کہوں کہ میں دیوانہ نہیں ہوں، ہاں اتنے ہوش باقی ہیں کہ اپنے کو دیوانہ سمجھتا ہوں---	۴ اکتوبر ۱۸۵۵ء
۳	للہ شکر کہ پیر و مرشد کا مزاج اقدس بہ خیر و عافیت ہے---	۱۸ اکتوبر ۱۸۵۵ء
۴	پیر و مرشد! یہ خط لکھنا نہیں ہے، باتیں کرنی ہیں---	۲۹ جون ۱۸۵۶ء
۵	قبلہ و کعبہ! وہ عنایت نامہ، جس میں حضرت نے مزاج کی شکایت لکھی تھی---	۱۰ نومبر ۱۸۵۶ء

۶ حضرت پیر و مرشد! اگر آج میرے سب دوست و عزیز یہاں فراہم ہوتے --- اگست تا نومبر ۱۸۵۸ء

۷ پیر و مرشد! ایک نوازش نامہ آیا اور "دستنبو" کے پہنچنے کا مژدہ پایا --- ۵ نومبر ۱۸۵۸ء

۸ پیر و مرشد! بارہ بجے تھے' میں ننگا اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا حقہ پی رہا تھا --- ۱۸۶۰ء

۹ پیر و مرشد 'معاف کیجے گا' میں نے جمنا کا کچھ نہ لکھا حال --- ۱۸ جولائی ۱۸۶۰ء

۱۰ پیر و مرشد! شب رفتہ کو مینہ خوب برسا۔ ہوا میں فرط برودت سے گزند پیدا ہو گیا --- جولائی ۱۸۶۰ء

۱۱ پیر و مرشد! کورنش۔ مزاج اقدس؟ --- الحمدللہ --- جولائی ۱۸۶۰ء

۱۲ خداوند نعمت! شرف افزا نامہ پہنچا۔ شاہ اسرار الحق کے نام کا مکتوب --- ۲۴ اگست ۱۸۶۰ء

۱۳ پیر و مرشد! میں آپ کا بندہ فرماں پذیر اور آپ کا حکم بہ طیب خاطر بجالانے والا ہوں --- ۲ جون ۱۸۶۱ء

۱۴ قبلہ و کعبہ! کیا لکھوں؟ امور نفسانی میں اضداد کا جمع ہونا محالات عادیہ میں سے ہے --- ۲۲ اکتوبر ۱۸۶۱ء

۱۵ ناوک بیداد کا ہدف' پیر خرف' یعنی غالب آداب بجالاتا ہے --- ۱۹ جون ۱۸۶۲ء

۱۶ پیر و مرشد! آداب۔ تتمہ غلط نامہ "قاطع برہان" کو بھیجے ہوئے تین دن --- ۱۱ اگست ۱۸۶۲ء

۱۷ ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما --- ۱۵ فروری ۱۸۶۴ء

۱۸ پیر و مرشد! اگر میں نے "امید گاہ" پر کاف عربی از راہ شکوہ لکھا تو کیا گناہ؟ ---

۱۹ پیر و مرشد! آداب۔ مزاج مقدس؟ میرا جو حال آپ نے پوچھا؟ اس پرسش کا شکر بجالاتا ہوں ---

۲۰ پیر و مرشد! حضور کا توقیع خاص اور آپ کا نوازش نامہ' یہ دونوں حرز بازو ---

۱۵ - مرزا حاتم علی مہر کے نام

۱ بہت سہی غم گیتی' شراب کم کیا ہے غلام ساقی کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے --- اوائل جولائی ۱۸۵۸ء

۲ خود شکوہ دلیل رفع آزار بس است آید بزبان ہر آنچہ از دل برود ---

۳ بھائی صاحب! از روئے تحریر مرزا تفتہ' آپ کا چھپے کتابوں کی تزئین کی طرف متوجہ ہونا --- ۲۰ ستمبر ۱۸۵۸ء

۴ مرا بہ سادہ دلیہائے من تواں بخشید خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم --- ۲۱ ستمبر ۱۸۵۸ء

۵ بھائی صاحب! خدا تم کو دولت و اقبال روز افزوں عطا کرے --- ۲۹ ستمبر ۱۸۵۸ء

۶ بندہ پرور۔ آپ کا مہربانی نامہ آیا' آپ کی مہر انگیز اور محبت خیز باتوں نے غم بے کسی بھلایا --- ستمبر ۱۸۵۸ء

۷ بھائی صاحب! آپ کے خامہ مشکبار کی صریر نے کتابوں کی لوح طلائی کا آوازہ یہاں تک پہنچا --- اکتوبر ۱۸۵۸ء

۸ بھائی صاحب! مطبع میں سے سادہ کتابیں یقین ہے کہ آج کل پہنچ جائیں --- اوائل نومبر ۱۸۵۸ء

۹ مرزا صاحب! میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے --- اوائل نومبر ۱۸۵۸ء

۱۰ بھائی صاحب! تینتیس کتابیں بھیجی ہوئی برخوردار منشی شیو نرائن کی --- ۱۳ نومبر ۱۸۵۸ء

۱۱ بھائی صاحب! کل جو جمعہ روز مبارک و سعید تھا' گویا میرے حق میں روز عید تھا --- ۲۰ نومبر ۱۸۵۸ء

۱۲ بندہ پرور! آپ کا خط کل پہنچا۔ آج جواب لکھتا ہوں --- اواخر نومبر ۱۸۵۸ء

۱۳ خدا کا شکر بجالاتا ہوں کہ آپ کو اپنی طرف متوجہ پاتا ہوں --- ۲۰ دسمبر ۱۸۵۸ء

۱۴ بھائی صاحب! تمہارا خط اور قصیدہ پہنچا --- اپریل ۱۸۵۹ء

۱۵ شرط اسلام بود ورزش ایماں بالغیب   اے تو غائب زنظر مہر تو ایمان من است --- اواخر اپریل ۱۸۵۹ء
۱۶ جناب مرزا صاحب! دلی کا حال تو یہ ہے   شعر : گھر میں تھا کیا جو ترا غم اسے غارت کرتا--- اپریل ۱۸۵۹ء
۱۷ مرزا صاحب! ہم کو یہ باتیں پسند نہیں - پینسٹھ برس کی عمر ہے--- جون ۱۸۶۰ء
۱۸ جناب مرزا صاحب - آپ کا غم افزا نامہ پہنچا - میں نے پڑھا--- جون ۱۸۶۰ء
۱۹ صاحب میرے! عہدہ وکالت مبارک ہو - موکلوں سے کام لیا کیجئے--- جنوری ۱۸۶۱ء

۱۶ - منشی محمد حبیب اللہ ذکا کے نام

۱ صاحب! میں تم کو اخوان الصفا میں گنتا ہوں - اپنا نور نظر و لخت جگر جانتا ہوں--- ۳۰ جون ۱۸۶۳ء
۲ حضرت مولوی صاحب! میں برس دن سے بیمار اور تین مہینے سے صاحب فراش ہوں--- ۲۶ اگست ۱۸۶۳ء
۳ مولانا! ایک نعقد نامہ پہلے بھیجا تھا--- ۲۵ ستمبر ۱۸۶۳ء
۴ بندہ پرور! آج تمہارا عنایت نامہ آیا--- ۱۹ اکتوبر ۱۸۶۳ء
۵ صاحب! پہلے مطلع میں لطف نہیں - ہاں مضمون لطیف ہے--- ۱۴ نومبر ۱۸۶۳ء
۶ بندہ پرور! پرسوں مولوی صاحب کا خط آیا--- ۲۸ نومبر ۱۸۶۳ء
۷ بندہ پرور! تمہارے دونوں خط پہنچے - غالب گستہ دم 'کوتہ قلم نہ لکھے تو یہ اور بات ہے--- ۲۸ نومبر ۱۸۶۳ء
۸ اے عنایت بہ عنایت ہم شکل - آپ کا خط حاوی حل شبہات جس دن پہنچا--- ۲۹ اپریل ۱۸۶۵ء
۹ میرے مشفق - میرے شفیق! مجھ سے ہیچ و پوچ کے ماننے والے؟ مجھ سے برے کو اچھا جاننے والے--- ۱۲ مئی ۱۸۶۶ء
۱۰ دوست روحانی و برادر بہ ایمانی مولوی حبیب اللہ خاں میر منشی کو فقیر غالب کا سلام--- ۴ دسمبر ۱۸۶۶ء
۱۱ جانان بلکہ جان ' مولوی منشی حبیب اللہ کو غالب خستہ دل کا سلام--- ۲۴ دسمبر ۱۸۶۶ء
۱۲ بھائی! میں نہیں جانتا کہ تم کو مجھ سے اتنی ارادت اور مجھ کو تم سے اتنی محبت کیوں ہے؟--- ۱۵ فروری ۱۸۶۷ء
۱۳ جان غالب! تم نے بہت دن سے مجھ کو یاد نہیں کیا--- ۱۴ مارچ ۱۸۶۷ء
۱۴ بندہ پرور! آپ کا مہربانی نامہ پہنچا - تمہاری اور صاحبزادے کی خیر و عافیت معلوم ہونے سے دل خوش ہوا--- ۱۸ مارچ ۱۸۶۷ء
۱۵ منشی صاحب! الطاف نشان ' سعادت و اقبال توامان منشی حبیب اللہ خاں--- ۲۷ جنوری ۱۸۶۸ء
۱۶ بندہ پرور! کل آپ کا تعقد نامہ پہنچا ' آج میں پاسخ طراز ہوا---

۱۷ - نواب یوسف مرزا کے نام

۱ کوئی ہے؟ ذرا یوسف مرزا کو بلائیو - لو صاحب وہ آئے--- اواخر اپریل ۱۸۵۶ء
۲ اے میری جان ' اے میری آنکھیں : زہجران طفلے کہ در خاک رفت--- جون ' جولائی ۱۸۵۹ء
۳ میری جان ' خدا تیرا نگہبان ' میں نے "گرز پھینک" کو دام میں پھنسایا--- ۱۵ جولائی ۱۸۵۹ء
۴ میاں ' پرسوں قریب شام مرزا آغاجانی صاحب آئے--- ۲۸ جولائی ۱۸۵۹ء
۵ حق تعالیٰ تمہیں عمر و دولت و اقبال و عزت دے--- ۱۸ اگست ۱۸۵۹ء
۶ میری جان! شکوہ کرنا سیکھو - یہ باب میں نے تم کو ابھی پڑھایا نہیں--- ۵ نومبر ۱۸۵۹ء

۷	یوسف مرزا! میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا---	۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء
۸	میاں! کل صبح کو تمہارے نام کا خط روانہ کیا' شام کو تمہارا ایک خط اور آیا---	۲۹ نومبر ۱۸۵۹ء
۹	میاں! تمہارا خط رام پور پہنچا اور رام پور سے دلی آیا---	۲ اپریل ۱۸۶۰ء
۱۰	آؤ صاحب! میرے پاس بیٹھ جاؤ' آج یک شنبے کا دن ہے---	۲۹ اپریل ۱۸۶۰ء
۱۱	یوسف مرزا کو بعد دعا کے معلوم ہو کہ تمہارا خط کل منگل کو پہنچا---	۹ مئی ۱۸۶۰ء
۱۲	یوسف مرزا! کیوں کر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مرگیا---	۱۹ مئی ۱۸۶۰ء

۱۸ - حکیم سید احمد حسن مودودی کے نام

۱	حضرت قبلہ! پہلے التماس یہ ہے کہ آپ سید صحیح النسب' تمام امت مرحومہ محمد علیہ السلام کے قبلہ و کعبہ---	۲۸ جون ۱۸۶۱ء
۲	حضرت پیر و مرشد! غزل بعد اصلاح کے پہنچتی ہے۔ غزل سہو سے لکھ گیا ہوں---	۱۹ جنوری ۱۸۶۲ء
۳	پیر و مرشد! تین برس عوارض احتراق خون میں ایسا جلا رہا ہوں---	۲۴ جولائی ۱۸۶۵ء
۴	حضرت پیر و مرشد! ان دنوں میں اگر فقیر کے عرائض نہ پہنچے ہوں---	۱۷ جنوری ۱۸۶۶ء
۵	پیر و مرشد! آپ کو میرے حال کی بھی خبر ہے؟ ضعف نہایت کو پہنچ گیا۔ رعشہ پیدا ہو گیا---	۱۸ اپریل ۱۸۶۶ء
۶	پیر و مرشد! یکم محرم کا خط کل اٹھارہ محرم کو پہنچا۔ آج انیس کو جواب لکھتا ہوں---	جون ۱۸۶۶ء
۷	سید صاحب و قبلہ! عنایت نامہ مع قصیدہ پہنچا---	یکم ستمبر ۱۸۶۶ء
۸	قبلہ! کل ڈاک کے ہرکارے نے کل دو خط ایک بار پہنچائے---	۲۵ ستمبر ۱۸۶۶ء
۹	حضرت! یہ آپ کے جد امجد کا غلام تو مرلیا۔ کثرت احکام 'تواتر ورود اشعار'---	۱۸ اکتوبر ۱۸۶۶ء
۱۰	سید صاحب و قبلہ حکیم سید احمد حسن صاحب کو غالب نیم جاں کا سلام پہنچے---	۳ جولائی ۱۸۶۷ء
۱۱	جناب سید صاحب و قبلہ سید احمد حسن صاحب کو غالب نیم جاں کی بندگی مقبول ہو---	۱۷ جولائی ۱۸۶۸ء

۱۹ - مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب کے نام

۱	بھائی تمہارا خط حکیم محمود خاں صاحب کے آدمی کے ہاتھ پہنچا۔ خیر و عافیت معلوم ہوئی---	۸ فروری ۱۸۵۸ء
۲	بھائی شہاب الدین خاں' واسطے خدا کے یہ تم نے اور حکیم غلام نجف خاں نے---	مارچ ۱۸۵۸ء
۳	بھائی! تمہارا خط پہنچا۔ کوئی مطلب جواب طلب نہیں تھا کہ میں اس کا جواب لکھتا---	۱۲ اپریل ۱۸۵۸ء
۴	نور چشم شہاب الدین خاں کو دعا کے بعد معلوم ہو' یہ جو رقعہ لے کر پہنچے ہیں---	۲۴ ستمبر ۱۸۶۱ء
۵	میاں ثاقب صاحب! کہاں پارسل بناتا پھروں۔ کہاں ڈاک میں بھجواتا پھروں---	۳۰ ستمبر ۱۸۶۱ء
۶	تمہارے بھائی کا خط تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ "کلیات اردو" جو تم نے خریدے ہیں---	
۷	میاں مرزا شہاب الدین خاں! اچھی طرح ہو؟ غازی آباد کا حال شمشاد علی سے سنا ہو گا---	۸ اکتوبر ۱۸۶۵ء
۸	میاں! وہ قاضی تو مسخرہ چوتیا ہے۔ ان کا خط دیکھ لیا---	ستمبر ۱۸۶۶ء
۹	رقعہ کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے ثاقب حرکت یہ کی ہے بے جا تم نے---	
۱۰	اے روشنی دیدہ شہاب الدین خاں کٹتا ہے بتاؤ کس طرح سے رمضاں---	

۲۰ ـ مولوی محمد عبدالرزاق شاکر کے نام

۱	مخدوم مکرم، مظہر لطف و کرم جناب مولوی محمد عبدالرزاق صاحب اشرف الوکلاء---	تمل ۱۸۶۵ء
۲	قبلہ و کعبہ! فقیر پا در رکاب ہے۔ سہ شنبہ، چار شنبہ ان دونوں دنوں میں سے ایک دن عازم رام پور ہو گا---	اوائل اکتوبر ۱۸۶۵ء
۳	قبلہ! پہلے معنی ابیات بے معنی سنیے "نقش فریادی" الخ ایران میں رسم ہے---	اکتوبر، دسمبر ۱۸۶۵ء
۴	حضرت! تین دوستوں نے مولف محرق پر، جس کا نام صاحب تپ محرق رکھا گیا ہے، جوتی پیزار کی ہے---	۱۸۶۵ء
۵	قبلہ! یہ تو آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ ۸ جنوری کو فقیر دلی پہنچا---	جنوری ۱۸۶۶ء
۶	قبلہ! اس عنایت نامے کا، جو مارچ گزشتہ میں پایا ہے، آج یکم اپریل کو جواب لکھتا ہوں---	یکم اپریل ۱۸۶۶ء
۷	جناب مولوی صاحب مخدوم مولوی محمد عبدالرزاق صاحب شاکر کی خدمت میں بعد سلام یہ التماس ہے---	
۸	حضرت! مطالب علمی و شعری کا لکھنا موقوف سوال پر ہے---	
۹	پیر و مرشد! اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے---	
۱۰	فقیر اسد اللہ نے اس کاغذ کے لفافے پر مرسلہ محمد عبدالرزاق جعفری الحیدری اور ٹکٹ پر شاکر دیکھ کر---	

۲۱ ـ نواب میر غلام بابا خان کے نام

۱	سبحان اللہ تعالیٰ شانہ ما اعظم برہانہ - جناب مستطاب نواب میر غلام بابا خاں بہادر---	۶ ستمبر ۱۸۶۳ء
۲	بہ جناب نواب صاحب، جمیل المناقب، عمیم الاحسان، سلمہ اللہ تعالیٰ---	۳ دسمبر ۱۸۶۴ء
۳	نواب صاحب، جمیل المناقب، عمیم الاحسان امید گاہ درویشان، زاد افضالکم---	۱۷ ستمبر ۱۸۶۵ء
۴	نواب صاحب، جمیل المناقب، عمیم الاحسان، سلامت، فقیر اسد اللہ عرض کرتا ہے---	۲۲ مارچ ۱۸۶۶ء
۵	بہ خدمت نواب صاحب، جمیل المناقب، عمیم الاحسان، نواب میر غلام بابا خاں بہادر، زاد مجدہ---	۹ اگست ۱۸۶۶ء
۶	ستودہ بہ ہر زبان و نامور بہ ہر دیار، نواب صاحب، شفیق کرم گستر، مرتضوی تبار---	۱۴ نومبر ۱۸۶۶ء
۷	نواب صاحب، جمیل المناقب، عمیم الاحسان، عالی شان، والا دودمان زاد مجدکم---	اپریل ۱۸۶۷ء
۸	نواب صاحب جمیل المناقب، عمیم الاحسان، عنایت فرمائے مخلصاں زاد مجدہ،---	۳ اپریل ۱۸۶۷ء
۹	جناب نواب صاحب! میں آپ کے اخلاق کا شاکر اور آپ کی یاد آوری کا ممنون---	۳۱ مئی ۱۸۶۷ء
۱۰	جناب سید صاحب و قبلہ! بعد بندگی عرض کرتا ہوں کہ عنایت نامہ آپ کا پہنچا---	۶ مئی ۱۸۶۸ء

۲۲ ـ عبدالرحمٰن تحسین کے نام

۱	کمال سوزش پروانہ آخر ز شمع آموخت طرز سوختن را مصدر غزل بھر میں ایک جگہ قافیہ ہو---	۲۲ دسمبر ۱۸۶۱ء
۲	صاحب! پہلے تم کو اصلاح دی جاتی ہے۔ اسٹامپ کے ٹکٹ بھیجنے کے باب میں، میں نرا ملا نہیں---	۸ جنوری ۱۸۶۲ء
۳	صاحب! یہ شخص جامع غیاث اللغات رام پور میں ایک ملائے مکتب دار تھا---	۱۶ جون ۱۸۶۳ء
۴	وحشتی دارد دلم بندم بہ زلف پر خمش---	
۵	صاحب! پہلے تو بتاؤ کہ تم گڑگانویں میں کیوں رہ گئے، نوح کیوں نہ گئے---	
۶	دردی ز جنوں تا بہ ایاغ دل ماریخت صد تودہ مستی بہ دماغ دل ماریخت	

۷ حضرت! میرا حال کیا پوچھتے ہو --- چو ہفتاد آمد اعصار رفت از کار
۸ کونین کہ حیرت زدہ شوکت آنی گردے است کہ از بام فراغ دل ما ریخت
۹ حوادث بہ معنی مصائب عظیمہ جائز --- نثر و نظم معا" یا فردا" فردا" جب چاہو، تب بھیج دیا کرو ---

۲۳ ـ نواب امین الدین احمد خاں کے نام

۱ اخ مکرم کے خدام کرام کی خدمت میں بعد ادائے سلام مسنون، ملتمس ہوں --- ۲۳ جون ۱۸۶۴ء
۲ برادر صاحب جمیل المناقب، عمیم الاحسان! سلامت، تمہاری تفریح طبع کے واسطے ایک غزل --- ۲۶ مئی ۱۸۶۵ء
۳ برادر صاحب جمیل المناقب، عمیم الاحسان! سلامت - بعد سلام مسنون و دعائے بقائے دولت روز افزوں --- ۲۲ جون ۱۸۶۵ء
۴ برادر صاحب جمیل المناقب، عمیم الاحسان! سلامت - بعد سلام مسنون و دعائے بقائے دولت روز افزوں --- ۲۶ جولائی ۱۸۶۵ء
۵ بھائی صاحب! آج تک سوچتا رہا کہ بیگم صاحب قبلہ کے انتقال کے باب میں تم کو کیا لکھوں --- ۱۵ نومبر ۱۸۶۶ء
۶ اے میری جان! کس وقت میں مجھ سے غزل مانگی ---
۷ بھائی صاحب! ساٹھ ساٹھ برس سے ہمارے تمہارے بزرگوں میں قرابتیں بہم پہنچیں ---
۸ بھائی سے دو سوال ہیں - ایک تو یہ کہ مجموعہ نثر کے خاتمے کو کیا کروں ---

۲۴ ـ منشی سیل چند کے نام

۱ منشی صاحب! سعادت و اقبال نشان منشی سیل چند صاحب، میر منشی سلمہ اللہ تعالیٰ --- ۲۵ دسمبر ۱۸۶۴ء
۲ منشی صاحب! سعادت و اقبال نشاں منشی سیل چند صاحب میر منشی کو خدا سلامت رکھے --- ۱۹ جنوری ۱۸۶۵ء
۳ منشی صاحب! عجیب اتفاق ہے کہ حضور اپنے خط میں اپنے مزاج مبارک کا حال کچھ نہیں لکھتے --- ۱۴ مارچ ۱۸۶۵ء
۴ منشی صاحب! سعادت و اقبال نشاں منشی سیل چند صاحب میر منشی کو فقیر غالب کی دعا پہنچے --- مارچ یا اپریل ۱۸۶۵ء
۵ منشی صاحب سعادت و اقبال نشان، منشی سیل چند! طال عمرہ --- ۱۵ یا ۱۶ دسمبر ۱۸۶۵ء
۶ منشی صاحب، سعادت و اقبال نشاں عزیز تر از جان! منشی سیل چند کو فقیر غالب کی دعا پہنچے --- ۱۱ جون ۱۸۶۷ء
۷ برخوردار نور چشم منشی سیل چند میر منشی کو بعد دعا کے یہ معلوم ہو --- ۱۸ ستمبر ۱۸۶۸ء

۲۵ ـ نواب حسین مرزا (ذوالفقار الدین حیدر) کے نام

۱ جناب نواب صاحب! شکوہ کرنا سہل ہے - سبز سیاہی کہیں سے مفت کی ہاتھ آگئی --- ۱۸ جون ۱۸۵۹ء
۲ یا حسین ابن حیدر، روحی فداک - یہاں تک لکھ چکا ہوں کہ محمد قلی خاں کے نام کا خط --- ۲۸ جولائی ۱۸۵۹ء
۳ بھائی! تمہارے خطوں کا اور یوسف مرزا کے خطوں کا جواب بھیج چکا ہوں --- ۲۹ اکتوبر ۱۸۵۹ء
۴ جناب عالی! کل آپ کا خط لکھا ہوا سہ شنبہ، یکم نومبر کا پہنچا --- ۹ نومبر ۱۸۵۹ء
۵ نواب صاحب! آج تیسرا دن ہے کہ تم کو حال لکھ چکا ہوں --- ۱۶ دسمبر ۱۸۵۹ء
۶ نواب صاحب! پرسوں صبح کو تمہارا خط پہنچا - پہر دن چڑھے لارڈ صاحب کا لشکر آیا --- ۳۱ دسمبر ۱۸۵۹ء

۲۶ ـ صاحب عالم مارہروی کے نام

۱ ے کسم عرض گو مکرر باشد۔ پیر و مرشد۔ آج ہی ایک خط چودھری عبدالغفور صاحب کے نام کا--- اپریل ۱۸۵۹ء

۲ پیر و مرشد! اس مطلع و حسن مطلع کو کیا سمجھوں اور اس کا شکر کیوں کر بجالاؤں؟--- جولائی، اگست ۱۸۶۱ء

۳ بعد حمد خداوند نعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' پہلے قبلہ روح رواں جناب صاحب عالم کو؟--- ۱۸۶۰ء اور ۱۸۶۲ء کے درمیان

۴ حضرت صاحب قبلہ و کعبہ جناب صاحب عالم کو فقیر اسد اللہ کی بندگی--- ۲۶ اگست ۱۸۶۶ء

۵ ایک شعر میں نے بہت دنوں سے کہ رکھا ہے۔ اس خیال سے کہ میرے بعد کوئی میرا دوست میرا مرثیہ لکھے --- دسمبر ۱۸۶۶ء

۶ دیگر از خویشم خبر نبود تکلف بر طرف   ایں قدر دانم کہ غالب نام یارے داشتم--- ۱۸۶۶ء-۱۸۶۷ء

۲۷ - سید فرزند احمد صفیر بلگرامی کے نام

۱ مخدوم و مکرم سید فرزند احمد صاحب کو سلام پہنچے۔ مجھ کو حضرت بر جیس فطرت--- ۱۲ مئی ۱۸۶۴ء

۲ مخدوم زادہ مرتضوی دودمان' سعادت و اقبال توامان مولوی سید فرزند احمد صاحب--- ۲۶ مئی - ۲ جون ۱۸۶۴ء

۳ نور نظر' لخت جگر' زبدہ اولاد پیغمبر' حضرت مولوی سید فرزند احمد زاد مجدہ--- ۱۴ اپریل ۱۸۶۵ء

۴ بہ علاقہ مہر و محبت نور چشم و سرور دل اور بہ رعایت سیادت مخدوم و مطاع--- ۲۲ اپریل ۱۸۶۵ء

۵ نور الابصار' ممتاز روزگار' زکی و ارشد مولوی سید فرزند احمد---

۶ نور چشم و سرور دل' فرزانہ مرتضوی گہر مولوی سید فرزند احمد صاحب زاد مجدہ--- ۳ مئی ۱۸۶۵ء

۲۸ - ماسٹر پیارے لال آشوب کے نام

۱ جناب بابو صاحب' جمیل المناقب عمیم الاحسان' سلامت - نیاز مہر کیشانہ --- اوائل اگست ۱۸۶۵ء

۲ شفیق مکرم! بابو پیارے لال صاحب کو سلام--- ۱۳ اپریل ۱۸۶۶ء

۳ فرزند ارجمند اقبال بلند بابو ماسٹر پیارے لال کو غالب ناتواں نیم جاں کی دعا--- ۳۰ جنوری ۱۸۶۸ء

۴ یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز   چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

۵ کیوں صاحب! ہم سے ایسے خفا ہو گئے کہ ملنا بھی چھوڑا---

۲۹ - سید بدر الدین احمد کاشف المعروف بہ فقیر کے نام

۱ مخدوم و مکرم جناب فقیر صاحب کی خدمت عالی میں عرض کیا جاتا ہے--- ۱۸۵۳ء

۲ حضرت مخدوم و مکرم و معظم جناب فقیر صاحب دامت برکاتہم۔ بعد بندگی عرض کیا جاتا ہے--- ۳ جنوری ۱۸۵۵ء

۳ حضرت! آپ کے خط کے جواب لکھنے میں درنگ اس راہ سے ہوئی کہ میں منتظر رہا--- ۱۳ مئی ۱۸۶۳ء

۴ سید صاحب جمیل المناقب عالی خاندان سعادت و اقبال توامان!--- ۲۵ مئی ۱۸۶۳ء

۵ پیر و مرشد! آج نواں دن ہے حسین مرزا صاحب کو الور گئے--- جون ۱۸۶۳ء

۳۰ - نواب میر ابراہیم خاں وفا کے نام

۱ پیر و مرشد جناب سید ابراہیم علی خاں صاحب کو بندگی - غزل پہنچتی ہے--- ۲۱ جولائی ۱۸۶۶ء

۲ بہ خدمت قبلہ سید احمد حسن صاحب مودودی تسلیم' و بہ جناب میر ابراہیم علی خاں بہادر--- ۱۷ اگست ۱۸۶۶ء

ولی نعمت کو غالب کی بندگی - بہ سبب ضعف پیری کے خدمت گزاری میں درنگ واقع ہو جائے --- ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۶ء
سید صاحب قبلہ نواب میر ابراہیم علی خاں بہادر کو غالب علی شاہ کا سلام --- ۵ دسمبر ۱۸۶۶ء
جناب تقدس انتساب سید صاحب و قبلہ والا مناقب عالی شان --- جولائی ' اگست ۱۸۶۸ء

۳۱ - شہزادہ بشیر الدین توفیق کے نام

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار --- ۱۶ جون ۱۸۶۷ء
در پرستش سستم و در کامجوئی استوار بادشہ را بندہ کم خدمت پر خوار است --- ۱۱ اپریل ۱۸۶۸ء
پیر و مرشد! سلامت - اعضا فرسودہ اور بودے ہو گئے - روح ان میں دوڑتی نہیں پھرتی ---
حضرت پیر و مرشد ' سلامت - تقصیر معاف ' میں مدعی اور آپ مدعا علیہ بھی اور حاکم بھی ---

۳۲ - محمد حسین خاں (مدیر دبدبۂ سکندری) کے نام

مشفقی و مکرمی جناب محمد حسین خاں صاحب کو فقیر غالب کا سلام پہنچے --- ۱۱ اپریل ۱۸۶۷ء
خاں صاحب! مشفق مکرم محمد حسین خاں صاحب کو غالب کا سلام پہنچے --- ۲۵ اپریل ۱۸۶۷ء
شفیق مکرم محمد حسین خاں صاحب فقیر اسد اللہ کا سلام --- ۱۰ مئی ۱۸۶۷ء
مشفق اور مکرمی محمد حسین خاں صاحب کو غالب آزردہ دل کا سلام پہنچے --- ۲۵ فروری ۱۸۶۸ء

۳۳ - مولوی نعمان احمد کے نام

جاں بر سر مکتوب تو از ذوق فشاندن از عہدہ تحریر جواہم بدر آور --- ۵ ستمبر ۱۸۶۶ء
مولانا و بالفضل اولینا! فقیر میں جہاں اور عیب ہیں ' ایک یہ بھی عیب ہے کہ جھوٹ نہیں بولتا --- اکتوبر ۱۸۶۶ء
حضرت! آپ کو اپنے حال پر متوجہ پا کر اور مائل تحقیق جان کر --- ۱۹ اکتوبر ۱۸۶۶ء
قبلہ! آج خیال آیا کہ نامہ مرقومہ اکتیس اکتوبر کے بعد کوئی خط میرے حضرت کا نہیں آیا --- ۱۷ دسمبر ۱۸۶۶ء

۳۴ - میر افضل علی میرن کے نام

سعادت و اقبال نشاں ' میر افضل علی صاحب المعروف بہ میرن صاحب! --- ۹ نومبر ۱۸۵۸ء
برخوردار کامگار میر افضل علی عرف میرن صاحب طال عمرہ --- ۶ جولائی ۱۸۵۹ء
میری جان! تمہارا رقعہ پہنچا - نہ کھلا کہ میر سرفراز حسین جے پور کیوں جاتے ہیں ؟ --- ۲۱ جولائی ۱۸۶۴ء

۳۵ - منشی جواہر سنگھ جوہر کے نام

برخوردار منشی جواہر سنگھ کو بعد دعائے دوام عمر و دولت معلوم ہو --- ۱۸۴۸ء
برخوردار! تمہارے خطوں سے تمہارا پہنچنا اور چھاپے کے قصیدے کا پہنچنا --- ۱۹ اپریل ۱۸۵۳ء
برخوردار کامگار سعادت و اقبال نشان منشی جواہر سنگھ جوہر کو بلب گڑھ کی تحصیل داری مبارک ہو --- ۲ فروری ۱۸۶۴ء

۳۶ - شاہ عالم شائق مارہروی کے نام

۱ مخدوم زادہ والاتبار' حضرت شاہ عالم سلام و دعاے درویشانہ قبول فرمادیں--- مئی ۱۸۶۰ء
۲ مخدوم زادہ عالی شان' مقدس دودمان' حضرت شاہ عالم--- ۲۶ اگست ۱۸۶۰ء
۳ مخدوم زادہ مرتضوی نژاد کو فقیر غالب علی شاہ کی دعا پہنچے--- . ۶ نومبر ۱۸۶۵ء

۳۷ - مولوی ضیاء الدین احمد خاں ضیا دہلوی کے نام

۱ بہ خدمت مولوی صاحب معظم - مسلم علماے عرب و عجم--- ۱۸۶۴ء
۲ مولوی صاحب' جمیل المناقب' مولوی ضیاء الدین خاں صاحب کی خدمت میں بعد سلام--- جنوری ۱۸۶۶ء
۳ جناب مولوی صاحب! کرم از شاد کی ازما۔ اچھوں کے ساتھ سب بھلائی کرتے ہیں--- ۲۷ فروری ۱۸۶۶ء

۳۸ - مرزا یوسف علی خاں عزیز کے نام

۱ بھائی! تم کیا فرماتے ہو؟ جان بوجھ کر انجان بنے جاتے ہو--- ۱۸۵۹ء
۲ میاں! کل زین العابدین فوق کا خط' مع اشعار کے' ٹکٹ دار لفافے کے اندر رکھ کر---
۳ سعادت و اقبال نشاں مرزا یوسف علی خاں کو بعد دعا کے دل نشیں ہو---

۳۹ - مرزا باقر علی خاں کامل کے نام

۱ اقبال نشاں باقر علی خاں کو غالب نیم جاں کی دعا پہنچے--- ۱۶ نومبر ۱۸۶۷ء
۲ نور چشم و راحت جاں مرزا باقر علی خاں کو فقیر غالب کی دعا پہنچے--- ۷ دسمبر ۱۸۶۷ء
۳ اقبال نشاں مرزا باقر علی خاں کو غالب نیم جاں کی دعا پہنچے--- ۱۸۶۷ء

۴۰ - مولانا محمد نعیم الحق آزاد کے نام

۱ پیرو مرشد! کیا حکم ہوتا ہے' احمق بن کر چپ ہو رہوں---
۲ بندہ پرور! آج میں نے وہ انگریزی عرضی روانہ کر دی---

۴۱ - سید محمد عباس علی خاں بیتاب کے نام

۱ قبلہ! جس شعر پر صاد ہے' وہ بہت خوب ہے اور جس کو کاٹ دیا' وہ معیوب ہے---
۲ قبلہ! قصائد و غزلیات و رباعیات کو بہ قدر اپنی فہم و فراست کے درست کرکے گزرانتا ہوں---

۴۲ - منشی ہیرا سنگھ درد کے نام

۱ نور چشم غالب غم دیدہ' منشی ہیرا سنگھ کو دعا پہنچے۔ تمہارا خط محررہ گیارہ جنوری پہنچا--- ۱۴ جنوری ۱۸۶۸ء
۲ فرزند دل بند سعادت مند منشی ہیرا سنگھ کے حق میں میری دعائیں قبول ہوں---

۴۳ - مرزا شمشاد علی بیگ رضوان کے نام

۱ فرزند دلبند شمشاد علی بیگ خاں کو' اگر خفا نہ ہوں تو دعا اور اگر آزاد ہوں تو بندگی--- ۴ نومبر ۱۸۶۵ء

۲ مرزا! رسم تحریر خطوط بہ سبب ضعف ترک ہوتی جاتی ہے--- اگست ۱۸۶۶ء

۴۴ - مولانا محمد عباس رفعت شروانی کے نام

۱ حضرت! قصیدہ عربی کا کیا کہنا ہے۔ میں اس لسان کے غوامض اور قواعد سے اچھی طرح آشنا نہیں--- ۲ اگست ۱۸۶۱ء

۲ صاحب میرے! کرم فرما میرے، قدردان میرے، میں قابل کسی ستائش کے نہیں ہوں--- ۴ نومبر ۱۸۶۱ء

۴۵ - نواب زین العابدین خاں عرف کلن میاں کے نام

۱ بندہ پرور! مہربانی نامہ پہنچا۔ میں تو سمجھتا تھا، آپ مجھ کو بھول گئے--- ۲۴ مارچ ۱۸۵۸ء

۲ نواب صاحب والاقدر عظیم الشان، سلکم اللہ تعالیٰ۔ بعد سلام مسنون مشہود خاطر عاطر ہو--- ۱۴ مارچ ۱۸۶۵ء

۴۶ - مرزا قربان علی بیگ خاں سالک کے نام

۱ وللرحمٰن الطاف خفیہ۔ خیر و عافیت تمہاری معلوم ہوئی۔ دم غنیمت ہے--- ۱۱ جولائی ۱۸۶۴ء

۲ میری جان کن اوہام میں گرفتار ہے؟ جہاں باپ کو پیٹ چکا، اب چچا کو بھی رو---

۴۷ - سید معین الرحمٰن حیدر عرف سید سجاد مرزا کے نام

۱ قرۃ العین سجاد ابن حسین سلمہ اللہ تعالیٰ! خوبی دین و دنیا تم کو ارزانی--- ۱۵ مارچ ۱۸۶۵ء

۲ زبدہ آل رسول، سجاد مرزا خاں کو فقیر غالب علی شاہ کی دعا۔ دلنواز نامہ پہنچا--- اکتوبر، دسمبر ۱۸۶۵ء

۴۸ - میر سرفراز حسین کے نام

۱ میری جان کے چین، مجتہد العصر میر سرفراز حسین--- ۲۷ مارچ ۱۸۶۳ء

۲ نور چشم، راحت جان، میر سرفراز حسین! جیتے رہو اور خوش رہو---

۴۹ - حکیم ظہیرالدین احمد خاں کے نام

۱ اقبال نشان حکیم ظہیرالدین احمد خاں کو فقیر غالب علی شاہ کی دعا پہنچے--- ۱۲ نومبر ۱۸۶۵ء

۲ لو میاں ظہیرالدین، ہم نے مسودہ لکھ کر بھیج دیا ہے۔ تم اس کو اپنے ابا سے پڑھ لو---

۵۰ - منشی عبداللطیف کے نام

۱ برخوردار! نور چشم عبداللطیف سلمہ اللہ تعالیٰ! بعد دعائے دولت و طول عمر معلوم کریں--- ۱۰ مارچ ۱۸۵۱ء

۲ صاحب! آگے تمہارا ایک خط، پھر بارہ کتابوں اور ایک جنتری کا پارسل پہنچا--- ۶ دسمبر ۱۸۵۸ء

۵۱ - مولوی احمد حسن عرشی قنوجی کے نام

۱ یارب یہ ایک خط جو مجھ کو بڑودہ، گجرات سے آیا ہے، کاتب نے اپنے آپ کو احمد حسن قنوجی بتایا ہے--- ۱۸۶۰ء

۲ مخدوم و مکرم مولوی احمد حسن خاں صاحب باور کریں کہ یہ درویش گوشہ نشین تمہارا دوست--- ۳۱ دسمبر ۱۸۶۰ء

۵۲ - منشی بہاری لال مشتاق کے نام

۱ سعادت مند باکمال، منشی بہاری لال کو بہ یمن تاثیر دعائے غالب خستہ حال--- ۲۶ فروری ۱۸۶۸ء
۲ برخوردار بہاری لال! مجھ کو تم سے جو محبت ہے، اس کے دو سبب ہیں--- ۷ جون ۱۸۶۸ء

۵۳ - میر احمد حسین میکش کے نام

۱ بھائی میکش! آفریں، ہزار آفریں۔ تاریخ نے مزا دیا۔ خدا جانے وہ خرمے کس مزے کے ہوں گے---
۲ میاں! عجب اتفاق ہے، نہ میں تمہارے دیکھنے کو آسکتا ہوں، نہ تم میرے دیکھنے کو قدم رنجہ فرما سکتے ہو---

۵۴ - مولانا احمد حسین مینا مرزا پوری کے نام

۱ بندہ پرور! کل دوپہر کو آپ کے عنایت نامے کے ساتھ ہی جناب اخگر کا مہربانی نامہ مع غزل پہنچا--- ۱۸۶۷ء
۲ جان غالب! کل تمہاری دونوں غزلیں بعد اصلاح، ٹکٹ دار لفافے کے اندر رکھ کر بھجوا دی ہیں--- ۱۳ جولائی ۱۸۶۷ء

۵۵ - مردان علی خاں رعنا کے نام

۱ خاں صاحب شفیق عالی شان کو میرا سلام پہنچے۔ کل تمہارا عنایت نامہ پہنچا--- دسمبر ۱۸۶۳ء
۲ خاں صاحب عالی شان مردان علی خاں صاحب کو فقیر غالب کا سلام---

۵۶ - بابو ہرگوبند سہائے نشاط کے نام

۱ صاحب! تم کو دعا کہتا ہوں اور دعا دیتا بھی ہوں۔ شراب کی قیمت کے دو خط بھیجیے--- جنوری ۱۸۵۸ء
۲ برخوردار! بہت دن ہوئے کہ میں نے تم کو خط لکھا ہے۔ اب اس خط کا جواب ضرور لکھو--- ۲۹ دسمبر ۱۸۵۸ء

۵۷ - منشی نول کشور کے نام

۱ منشی صاحب جمیل المناقب جناب منشی نول کشور صاحب کو دولت و اقبال و جاہ و جلال--- اوائل مارچ ۱۸۶۳ء
۲ جناب صاحب مہتمم اودھ اخبار زاد مجدہم! آپ کے اخبار ۲۷ ستمبر میں کالم ۶۲۱ پر خبر الور--- ستمبر ۱۸۶۳ء

۵۸ - میر ولایت علی کے نام

شفیق مکرم میر ولایت علی صاحب کو خدائے جہاں آفریں..... سلامت رکھے--- ۳ اپریل ۱۸۶۵ء
۲ جناب میر ولایت علی صاحب! واسطے اپنے جد کے، میری تقصیر معاف کیجے--- ۵ اپریل ۱۸۶۵ء

۵۹ - ولایت علی خاں ولایت و عزیز صفی پوری کے نام

۱ خان صاحب عنایت مظہر، سلامت! آپ کا مہربانی نامہ آیا۔ اوراق "پنج رقعہ" نظر افروز ہوئے---
۲ سخن شناس نہ مشتا، خطا ایں جاست---

۶۰ - خلیفہ احمد علی احمد رام پوری کے نام

جناب مولوی صاحب مخدوم مولوی احمد علی صاحب کی خدمت میں بعد سلام مسنون الاسلام عرض یہ ہے---

۶۱ - میر بندہ علی خاں عرف مرزا میر کے نام

میر صاحب شفیق مکرم و معظم، میر بندہ علی خاں، عرف مرزا میر صاحب کو غالب بے برگ و نوا کا سلام پہنچے --- ۱۸ جنوری ۱۸۶۴ء

۶۲ - تفضل حسین خاں کے نام

کیوں صاحب، یہ چچا بھتیجا ہونا اور شاگردی و استادی، سب پر پانی پھر گیا؟

۶۳ - منشی محمد ابراہیم خلیل وفوق کے نام

غالب کمینہ، بازاری، فرومایہ کا سلام۔ خط کی پشت پر جواب لکھنے سے غرض یہ ہے --- ۴ جنوری ۱۸۶۱ء

۶۴ - مرزا رحیم بیگ کے نام

بخدمت مشفقی، مکرمی، مرزا رحیم بیگ صاحب نور اللہ قلبہ بالاسرار و عینہ بالانوار ---

۶۵ - محمد زکریا خاں زکی دہلوی کے نام

بندہ پرور! آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ آپ از روئے شرافت نسبی و لیاقت حسبی آفتاب و مہتاب ہیں --- ۲۹ جنوری ۱۸۶۸ء

۶۶ - مہاراجہ سردار سنگھ، والی بیکانیر کے نام

بحضور والا فرا لسرور جناب سری مہاراجا صاحب! والا مناقب عالی شان۔ قلزم فیض و احسان --- ۵ جنوری ۱۸۵۹ء

۶۷ - نواب مصطفیٰ خاں بہادر شیفتہ کے نام

جناب بھائی صاحب و قبلہ الیقین ہے کہ آپ مع الخیر اپنے دار الریاست میں پہنچ گئے ہوں --- ۷ فروری ۱۸۶۵ء

۶۸ - (سید ابو محمد جلیل الدین حسین) شاہ فرزند علی صوفی منیری کے نام

زبدہ اولاد حضرت خیر الانام، قبلہ و کعبہ مجموع اہل اسلام، حضرت پیر و مرشد عالی مقام --- ۱۸۶۷ء

۶۹ - حکیم ظہیر الدین دہلوی کے نام

میاں ظہیر الدین! چنبیلی کے پھول کو فارسی میں کیا لکھتے ہیں؟ میرے خیال میں گل یاسمین ---

۷۰ - ظہیر الدین کی طرف سے ان کے چچا کے نام

جناب فیض مآب چچا صاحب قبلہ و کعبہ دوجہاں کے حضور میں کورنش و تسلیم پہنچاتا ہوں ---

۷۱ - محمود مرزا کے نام

برخوردار، اقبال نشان محمود مرزا کو دعا پہنچے۔ بھائی میں تمہارا خط دیکھ کر بہت خوش ہوا --- ۱۳ مئی ۱۸۶۳ء

۷۲ - مرزا عباس بیگ کے نام

بھائی مرزا عباس بہادر! میں حیران ہوں کہ تم سرکار کے کام کو کیوں کر انجام دیتے ہو --- ۱۲ مئی ۱۸۶۳ء

۷۳ - عبدالحق کے نام

جناب عالی! یہ خط فتح پور سے آپ کے نام کا آیا ہے، میں اس وقت حاضر نہ ہو سکا--- مئی - مارچ ۱۸۵۲ء

۷۴ - عزیز الدین عزیز و صادق کے نام

صاحب! ایسی صاحبزادوں کی سی باتیں کرتے ہو- دلی کو ویسا ہی آباد جانتے ہو، جیسے آگے تھی--- ۱۸۵۸ء

۷۵ - حکیم غلام مرتضیٰ خاں کے نام

خان صاحب جمیل المناقب حکیم غلام مرتضیٰ خاں صاحب کو غالب دردمند کا سلام--- ۱۲ مارچ ۱۸۶۵ء

۷۶ - حکیم غلام رضا خاں کے نام

نور دیدہ و سرور دل و راحت جاں، اقبال نشاں، حکیم غلام رضا خاں کو غالب نیم جاں کی دعا پہنچے--- ۱۲ اکتوبر - ۲۸ دسمبر ۱۸۶۵ء

۷۷ - منشی غلام بسم اللہ کے نام

منشی صاحب شفیق مکرم، مظہر لطف و کرم، منشی غلام بسم اللہ صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ مفتوح باد!---

۷۸ - قاضی محمد نور الدین حسین خاں رضوی فائق کے نام

مخدوم و مکرم حضرت قاضی محمد نور الدین حسین خاں بہادر کی خدمت میں عرض ہے --- جولائی ۱۸۶۲ء

۷۹ - مرزا امیر الدین احمد خاں المدعو بہ فرخ مرزا کے نام

اے مردم چشم جہاں بین غالب! پہلے القاب کے معنی سمجھ لو---

۸۰ - فرقانی میرٹھی کے نام

واقعی فخر گرگانی نے لکھا ہے اور اس کا قول سند مکمل ہے---

۸۱ - مولوی کرامت علی کے نام

فقیر اسد اللہ جناب مخدومی مولوی کرامت علی صاحب کی خدمت میں عرض کرتا ہے---

۸۲ - شیخ لطیف احمد بلگرامی کے نام

میاں لطیف! مزاج شریف؟ غالب گوشہ نشین کی دعا- تمہارا مسودہ آیا---

۸۳ - محمد محسن (صدر الصدور) کے نام

قبلہ آپ سے رخصت ہو کر بھیگتا بھاگتا، بھوکا، جاڑا کھاتا، پرسوں گیارہ بجے دن کو اپنے گھر پہنچا--- ۱۱ جنوری ۱۸۶۶ء

۸۴ - مفتی محمد عباس کے نام

قبلہ! حضرت کا نوازش نامہ آیا- میں نے اس کو حرز بازو بنایا--- ۱۶ اگست ۱۸۶۲ء

۸۵ - منشی سخاوت حسین انصاری کے نام

مشفق مکرّی منشی سخاوت حسین صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ! سبحان اللہ! آپ کے خط کا جواب نہ لکھوں--- ۴ فروری ۱۸۶۱ء

۸۶ ۔ مولوی عبدالغفور خاں نساخ کے نام

جناب مولوی صاحب قبلہ! یہ درویش گوشہ نشیں، جو موسوم بہ اسد اللہ اور متخلص بہ غالب ہے--- ۱۸۶۴ء

۸۷ ۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کے نام

جناب قبلہ و کعبہ! آپ کو دیوان کے دینے میں تامل کیوں ہے۔ روز آپ کے مطالعے میں نہیں رہتا--- ۱۸۶۲ء

۸۸ ۔ منشی کیول رام ہشیار کے نام

غالب خاکسار کہتا ہے کہ شعرائے ایران کلہم اجمعین مسلم الثبوت ہیں---

۸۹ ۔ میر محمد زکی زکی کے نام

یہ سگ دنیا کہ اسد کہلاتا ہے اور تخلص اپنا غالب بتاتا ہے۔ قول المامور معذور کا پاس کرتا ہے---

۹۰ ۔ محمد حسین خاں کے نام

جناب محمد حسین خاں کو میرا اسلام پہنچے۔ دو رات دن کی محنت میں، میں نے اس نسخے کو صحیح کیا ہے---

۹۱ ۔ مظہر علی اور عبداللہ کے نام

اسد اللہ بے گناہ جس کا تخلص غالب اور خود اہل ہند کا مغلوب ہے'--- اکتوبر ۱۸۶۸ء

۹۲ ۔ حکیم محب علی کے نام

بندہ پرور! آپ کی تحریر سے مستنبط ہوتا ہے کہ آپ مجھ سے میرٹھ میں ملے تھے--- ۱۸ جنوری

بنام نامعلوم

۹۳ حضرت، میرا حال کیا پوچھتے ہو : چو ہفتاد آمد - اعضا رفت از کار--- ۱۸۶۵ء

۹۴ میاں! وہ عرضی کا کاغذ 'افشاں کیا ہوا' اور عرضی کا مسودہ---

۹۵ جناب عالی! نامہ وداد پیام عز صدور لایا۔ حضرت کو اب تو یقین آیا--- ۹ فروری ۱۸۶۰ء

۹۶ جناب! میں کل تمہارا مسہل سمجھے ہوئے تھا۔ اس وقت میر غالب علی سے معلوم ہوا---

۹۷ خاں صاحب، جمیل المناقب عمیم الاحسان، سعادت و اقبال توامان سلمہ اللہ تعالیٰ--- ۱۴ فروری ۱۸۶۴ء

فہرست نامہ ہائے فارسئ غالب

پنج آہنگ (آہنگ پنجم) میں مشمُولَہ خطوط

۱ - بنام نواب سید علی اکبر خاں بہادر طباطبائی' متولّی امام باڑہ ہوگلی بندر

۱ قبلہ خدا پرستان سلامت' ممدوح از ستایش مستغنی و مادح در بیان نارسا --- ۱۸۳۰ء

۲ اسد اللہ نامہ سیاہ کہ از رحمت گستہ امید و درین دو روزہ پندار پیدای ابر رحمت جاوید است --- ستمبر ۱۸۳۲ء

۲ - بنام منشی محمد حسن

۱ حضرت' سلامت می دانید کہ غالب صافی مشرب راچون دیگران دلے بساختگی آشنا --- قبل از ۱۳ ستمبر ۱۸۲۶ء

۲ امید گاہا' شبا ہنگام است و من بادل نژند پیش چراغے کہ نورش از حجرہ بہ ایوان نمیرسد --- ۱۳ ستمبر ۱۸۲۶ء

۳ قبلہ حاجات' غالب کہ نو آموز شیوہ گدائی است یک چند بہ حکم حیا بہ خموشی ساخت --- بعد از ۱۳ ستمبر ۱۸۲۶ء

۳ - بنام میرزا علی بخش خان بہادر

۱ فرد : کار برادر بہ برادر نکوست بہ ز برادر نتواں یافت دوست --- قبل از اگست ۱۸۲۶ء

۲ برادر صاحب مہربان گرای تر از جان سلامت' مداری خان می رسد و نامہ را می رساند --- قبل از اگست ۱۸۲۶ء

۳ والا برادر نجستہ اختر کہ با ایں ہمہ دوری چشم دلش بسوی من نگران است دریابد --- بعد از ۱۹ فروری ۱۸۲۸ء

۴ جان برادر' سخن را از فراوانی برروے ہم افتادن است و گرہ در گرہ گردیدن --- بعد از ۱۹ فروری ۱۸۲۸ء

۴ - بنام مولوی محمد صدرالدین خان بہادر --- صدرُ الصّدُور

۱ قبلہ حاجات' امروز پس از گرشتن نیم روز کہ ہنگام گزاردن فریضہ ظہر فراز آمدہ بود --- قبل از جون ۱۸۳۵ء

۲ قبلہ حاجات' اگر این بندہ اندک شنو بسیار گوئی زود گستاخ و پریشیماں --- قبل از ۱۸۳۵ء

۵ - بنام نواب مصطفیٰ خاں بہادر شیفتہ

۱ سبحان اللہ' صیادان عنقا شکار کہ عارف حقیقت ذات اند آگہی را --- قبل از ۱۸۳۵ء

۲ حضرت سلامت' من کہ مرا زبان در ستایش بے قرار است و اندیشہ در سگالش گستاخ --- ۱۸۳۵ء

۳ مخلص نوازا و والا نامہ سرفراز کرد و آنہمہ سربزرگی و کوچک دلی شرمسارم ساخت --- ۱۸۳۵ء

۴ فرد : مردم ز فرط ذوق و تسلی نمیشوم یارب کجا برم لب خنجر ستائی را --- قبل از ۱۸۳۸ء

۵ فرد : میر بحد از تحمل ما بر جفائے خویش ہاں شکوہ کہ خاطر دلدار نازک است --- قبل از ۱۸۳۸ء

۶ فرد : بے تو گر زیستہ ام تختی ایں درد بسنج بگذر از مرگ کہ وابستہ بہ ہنگامے ہست --- قبل از ۱۸۳۸ء

۷ جناب عالی دو سہ روز است کہ ذوق ہمزبانی را بکر تشنہ نامہ نگاری --- ستمبر' اکتوبر' سال ندارد

۸	ولی نعمت طوطیان شکر خا سلامت، ہنوز گل افشانی گلبن التفات شش جہت ---	اپریل، مئی، سال ندارد
۹	فرد : اے شمع بزم ماتم قاتل چگونہ غم را نشان گرمی محفل چگونہ ---	دوم ماہ رمضان سال ندارد
۱۰	فرد : ترسم رہم بہ کعبہ اسلامیان فتد گم کردہ ام بہ وادی شوق تو راہ را ---	بعد از ۱۵ فروری ۱۸۳۱ء
۱۱	خواجہ ناوشتہ خوان، ناگفتہ دان را از بندہ سادہ، دل بوفا نمادہ بے میانجیگری کلک و زبان ---	قبل از ۱۱ ستمبر ۱۸۲۸ء
۱۲	جان را از تن سپاس و خواجہ را از بندہ نیایش۔ روز آدینہ چون شب شد، بزم سخن آرا ستہ ---	۲۳ مارچ ۱۸۳۳ء
۱۳	شادم کہ رسیدن نامہ بہ رسیدن چامہ آگہم کرد و گرمی ہنگامہ افزود ---	۲۵ مارچ ۱۸۳۳ء
۱۴	امید گاہا، دی آدینہ روز بود و نوید بزم سخن سامعہ افروز ---	یکم اپریل ۱۸۳۳ء
۱۵	رشک طالب و فخر غالب سلامت 'قصیدہ گریستن' باآنکہ از ولم بہ زبان رسیدہ ---	۸ اپریل ۱۸۳۳ء
۱۶	ہان خواجہ بے پروا من بندہ کہ غمناکم ---	تاریخ و سال ندارد
۱۷	فرد : بودش از شکوہ خطر، ورنہ سرے داشت بہ من بہ مزارم اگر از مہر بیاید، چہ عجب ---	بعد از ۱۸۲۱ء

۶ - بنام میر اعظم علی، مدرّس مدرسہ اکبر آباد

رباعی : امروز شرارہ بہ داغم زدہ اند نشتر بہ رگ صبر و فراغم زدہ اند ---	۱۸۳۴ء

۷ - بنام مولوی کرم حسین خان، سفیرِ شاہِ اودھ

قبلہ حاجات، نوید قبول کہ برادر صاحب مشفق فخر الدولہ نواب امین الدین احمد خان بہادر ---	۱۸۳۴ء

۸ - بنام سبحان علی خاں

۱	رباعی : اے آنکہ ہما اسیر دامت باشد صاف می خسروی بجامت باشد ---	۱۸۳۴ء
۲	بنامیزد بدین نازش کہ نامہ بسوی کہ ی فرستم و درین میانہ روی سخنہ باکیست ---	۱۸۲۶ء
۳	قبلہ حاجات سخن وراں و کعبہ آمال شاگران سلامت، دیر است کہ قصیدہ و عرضداشت ---	۱۸۲۶ء

۹ - بنام شیخ امام بخش ناسخ

۱	مکرما مطاعا، از نیاز و تسلیم آنچہ بنقدیہ می رسد ہمان قدر است کہ نامہ و خامہ آنرا برتابد ---	۱۱ اکتوبر ۱۸۳۳ء
۲	قبلہ و کعبہ، درین ہنگام کہ فرماندگی از اندازہ گزشتہ و دل بہ افسردگی خوی گرفتہ است ---	۱۸۳۷ء
۳	حضرت سلامت، قدسی صحیفہ نعقد رقم بہ جنبش نسیم ورود بوی یکدلی و ہمدردی بہ مشام آگہی زد ---	۱۵ جون ۱۸۳۵ء
۴	قبلہ حاجات، درنگے کہ در نگارش ضراعت نامہ روی دادہ برافسردگی شوق محمول نشود ---	بعد از ۸ اکتوبر ۱۸۳۵ء

۱۰ - بنام صاحب عالم میرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر

بہ موقف عرض ایستادگان حضور فیض گنجور حضرت صاحب عالم و عالمیان، شاہزادہ کیوان ایوان ---	تاریخ و سال ندارد

۱۱ - بنام حکیم احسن اللہ خاں

درمند نوازا نسیم درود مشکین رقم نامہ غنچہ این راز را پردہ کشای و شمیم این نوید را غالیہ سای آمد --- بعد از ۱۸۳۳ء

۱۲ - بنام الف بیگ

مہربان روی مہربانی خوی سلامت-بار آوردن نہال امید در پیرانہ سری باخجستگی و فرخندگی --- بعد از جولائی ۱۸۳۸ء

۱۳ - بنام مولوی نور الحسن

فرد : جان بر سر مکتوب تو از شوق فشاندن از عہدہ تحریر جوابم بدر آورد --- قبل از ستمبر ۱۸۳۷ء

۱۴ - بنام مولوی حافظ محمد فضل حق

۱ قبلہ و کعبہ' اگر نہ این بودے کہ لالہ ہیرا لال را ہوای دیدن عنقا و رسرونا گاہ شامگاہے --- ۲۱ جولائی ۱۸۳۵ء
۲ سبحان اللہ باآنکہ از فرامش گشتگانم و دانم کہ دوست مرا بہ دو جو بلکہ بہ نیم خس برنگیرد --- بعد از جولائی ۱۸۳۸ء

۱۵ - بحضور شاہ اودھ از جانب مبارز الدولہ نواب حسام الدین حیدر خاں بہادر

۱ بہ موقف عرض حضرت قدر قدرت سلطان سپہر آستان فرشتہ پاسبان' ستارہ سپاہ' ثریا بارگاہ --- قبل از ۱۸۴۰ء
۲ بہ موقف عرض حاضران بارگاہ ارم کارگاہ حضرت قدر قدرت' فرشتہ پاسبان' خسرو انجم انجمن --- قبل از ۱۸۴۰ء

۱۶ - بنام مولوی سراج الدین احمد

۱ مخلص نوازا' خستگان بند غم دوری اگر دم زنند' بہ ساختگی نام بر آوردہ و بہ توانائی انگشت نما--- بعد از اکتوبر ۱۸۳۵ء
۲ مخلص نوازا' خجستگی این روزگار را ستایم و خود را بدین پیش آمدن اقبال چشم روشنی گویم --- قبل از ۱۸۳۵ء
۳ صاحب من' زمانے دراز گزشت کہ دیدہ بہ سواد گوہرین نامہ توتیائی نگشت --- ۱۲ جنوری ۱۸۳۰ء
۴ قبلہ دیدہ و دل سلامت' حیرتے دلستم کہ بہ مرگ ناگاہ در گزشتن امیر جوان دولت جوان سال --- قبل از ۱۸۳۵ء
۵ والی من و مولای من' ہفتدہم رمضان بود کہ برادر ریا پیشہ کج اندیشہ افضل بیگ --- مارچ ۱۸۳۱ء
۶ مولای من' چہ گویم کہ از بخت چہ قدر گلہ مند و از ہجوم اندوہ چہ مایہ نژندم --- قبل از ۲۷ جنوری ۱۸۳۱ء
۷ جائے کہ الطاف اجزای آن بہ تحلیل رفتہ و کدورتے چون درد از بادہ --- درمیان فروری ۱۸۲۸ - نومبر ۱۸۲۹ء
۸ قبلہ من' رسیدن دلکشا نامہ روان را بہ نوید تازگی بنواخت و درون را بہ نور آگہی برافروخت --- بعد از نومبر ۱۸۲۹ء
۹ این نیایش نامہ ایست از غمدیدہ اسد بہ جناب مولوی سراج الدین احمد --- بعد از ۴ مئی ۱۸۳۰ء
۱۰ مطاع غالب و مخدوم غالب و قبلہ غالب اگر نہ اندوہ سترگ بند بردلم نہادہ بودے --- ستمبر ۱۸۳۴ء
۱۱ فرد : رسیدن ہای منقار ہما براستخوان غالب پس از عمرے بیادم داد رسم و راہ پیکان را --- اکتوبر ۱۸۳۴ء
۱۲ صاحب من' دیدہ بمشاہدہ آئینہ سکندری فروغانی گردید --- . ۴ ستمبر ۱۸۳۱ء

۱۳	جناب عالی، امروز کہ آدینہ روز سیزدہم از اپریل است، فرصت نامہ نگاری یافتہ ام ---	۱۳ اپریل ۱۸۳۲ء
۱۴	سرت گردم، بدخواہی گفت کہ اسد اللہ داد خواہ مرا از دیوانگی ستوہ آوردہ است ---	۵ جنوری ۱۸۳۳ء
۱۵	قبلہ حاجات، گوہر آگین نامہ دلنواز پس از روزگارے دراز رسید	۱۸۳۵ء
۱۶	قبلہ حاجات، داغم از نارسائی بخت کہ نیروی سرانجام پویہ کہ از دیر باز گرد دل میگردد ---	۲۸ دسمبر ۱۸۳۳ء
۱۷	عمر من و جان من، پس از رسیدن گرای نامہ در بند آن بودم کہ پاسخ گذار شوم	۲۴ مئی ۱۸۳۰ء
۱۸	قبلہ و کعبہ، والا نامہ رسید و نوید فراق دائمی مرزا احمد بیگ رسانید ---	جون ۱۸۳۳ء
۱۹	ہان و ہان این نامہ ایست، از اسداللہ دردمند بسوی آن یار خود پسند ---	قبل از ۲۷ جنوری ۱۸۳۱ء
۲۰	قبلہ حاجات، ہرچند ورود نای نامہ روان در تنم دمید ---	بعد از جون ۱۸۳۳ء
۲۱	زینہار، اے مولوی سراج الدین بترس از خدای جہان آفرین کہ چوں قیامت قائم گردد ---	ستمبر ۱۸۳۴ء
۲۲	دیروز کہ یازدہم اکتوبر و چارم جمادی الاولیٰ بود قدسی صحیفہ نگاشتہ بست و نہم ستمبر ---	۱۲ اکتوبر ۱۸۳۳ء
۲۳	والی من، مولای من، یکشنبہ، دوم جمادی الثانی بختی سعی آوارگی در زاویہ دہلی ---	بعد از ۲ نومبر ۱۸۳۰ء
۲۴	قبلہ حاجات، دلنواز نامہ پس از عمرے رسید و عمرے دیگر بخشید ---	قبل از جون ۱۸۳۳ء
۲۵	امروز کہ روز سی و یکم است از جنوری و ناف ہفتہ یعنی سہ شنبہ ہنگام نیمروز ---	۳۱ جنوری ۱۸۳۲ء
۲۶	مخلص نوازا، عمرہاست کہ بہ ورود دلنواز نامہ جانے تازہ نیافتہ ام ---	بعد از ۲۲ جون ۱۸۳۲ء
۲۷	چار ماہ است کہ از نارسیدن فروغانی نامہ روزم سیاہ است۔ کافر باشم، اگر گمان بے اتفاقی رود ---	قبل از جون ۱۸۳۳ء
۲۸	از اسد اللہ نامہ سیاہ بہ والا خدمت مخدوم معظم حضرت مولوی سراج الدین احمد سلامے ---	بعد از جون ۱۸۳۳ء
۲۹	مولای من دریں روزہا کہ غم روزگار بر من سخت تر از آنست کہ اگر خواہم لختے ازاں بر نگارم ---	بعد از ۱۸۴۰ء
۳۰	فرد : ہر نسیمے کہ ز کوی تو بہ خاکم گزرد یادم از ولولہ عمر بکتاز دہد ---	۱۸۴۱ء

۱۷ - بنام رائے چھجمل کھتری

۱	جناب من، ہرچند میخواہم کہ بہ نالہ زحمت صداع یاراں نپسندم ---	قبل از اگست ۱۸۲۶ء
۲	کرم فرمای من، مطلب بیشمار و مدعا بسیار و حوصلہ وقت تنگ و ظرف گفتگو تنگ ---	۳۱ مئی ۱۸۲۷ء
۳	بر رای مہر اقتضای رائے صاحب رافت گرای پنہاں مباد ---	۲۴ جون ۱۸۲۷ء
۴	رائے صاحب مشفق شفیق غمزدار واماندگان و یاد آور آوارگان سلامت ---	جولائی ۱۸۲۷ء
۵	رائے صاحب مشفق و مکرم مظہر بے اتفاقی ہای فراوان سلامت ---	وسط مارچ ۱۸۲۸ء
۶	نپندارم کہ ہمچو پابستگان رسم و راہ دہرست بہ نامہ نگاری ی آلایم ---	درمیان فروری ۱۸۲۸ - نومبر ۱۸۲۹ء

۱۸ - بنام مولوی ولایت حسین خاں

۱	فرد : شبگیر مرا روشنی اختر من بس در راہ ادب حسن طلب رہبر من بس ---	یکم جنوری ۱۸۳۸ء
۲	بیکسان امید گاہا، غربت زدگاں ملاذا، والا نامہ نعقد رقم مع سہ قطعہ نوٹ دو صد روپیہ ---	درمیان ۱۸۲۸ - ۱۸۲۹ء

قبلہ حاجات' ہر چند دشوار است بجران ریسش و دانم کہ بے دوست نتوان ریسش --- بعد از ۱۸۴۰ء

۱۹ - بنام شیخ امیر اللہ سرور

حضرت سلامت' رسیدن دلنواز نامہ دل را تو مند و شاخ آرزو را برومند ساخت --- ۱۸۳۲ء

۲۰ - بنام حکیم مومن خاں مومن

فروغ طالع گفتار' سلامت' روش اندیشہ دیوانگی پیشہ باروشنان سپہر سرنشتہ --- قبل از ۱۸۳۵ء

۲۱ - بنام مولوی سید محمد علی خاں صدر امین باندا بوند یلکھنڈ

۱ قبلہ خدا پرستان و کعبہ حق پژوہان' سلامت' خود را فراپاد خاطر خطیر دادن --- قبل از ۲۸ دسمبر ۱۸۲۷ء
۲ قبلہ جان و دل' سلامت' آداب و کورنش بجا آوردہ بہ عرض حال میگراید --- قبل از ۲۸ دسمبر ۱۸۲۷ء
۳ بجناب مولوی صاحب قبلہ و کعبہ دو جہاں مدظلہ العالی' بعد گزارش آداب و تسلیم --- ۲۸ دسمبر ۱۸۲۷ء
۴ جناب مولوی صاحب قبلہ و کعبہ' مدظلہ العالی' روزگاریست کہ نفس از سوز فراق آن قبلہ --- ۲۳ فروری ۱۸۲۸ء
۵ قبلہ گاہا بیکساں پناہا' شگرفی آثار رحمت الٰہی ست کہ آب و ہوای کلکتہ بامن نیک درساخت --- مارچ ۱۸۲۸ء
۶ از جگر تشنہ بہ دریا سرود ... وز تن بیجاں بہ مسیحا درود --- اگست ۱۸۲۸ء
۷ قبلہ گاہا' آنچہ پس از عرض تسلیمات بہ عرض بیان تواند آمد ایست --- ۱۸۲۸ء
۸ حضرت قبلہ گاہی دل نعمتی را' مدظلہ العالی' گرد سرمیگردم --- ۱۱ فروری ۱۸۲۹ء

۲۲ - بنام نواب محمد علی خاں بہادر (عرف) میرزا حیدر

فرد : صبح سرمستانہ پیر خانقہ را در زدم ... او سخن سر کرد از حق من دم از حیدر زدم --- ۱۸۵۰ء

۲۳ - بنام میجر جان جاکوب

۱ قطعہ : ای نشانہای خرد از تو ہویدا تر از آن ... کہ سرود از لب و آب از گہر و تاب ز مہر--- قبل از ۱۸۳۵ء
۲ امیدگاہ مخلصان را از من کہ بندہ محبت و خانہ زاد و قایم بہ مقابلہ یکبارہ یاد آوری صدرہ سپاس --- ۲۸ فروری ۱۸۳۳ء
۳ فرد : حق نہ آنست کہ از رفتن باطل برود ... نرود مہر تو از دل خود اگر دل برود --- ۱۸۳۰ - ۱۸۳۹ء
۴ رباعی : ایں نامہ کہ راحت دل ریش آورد ... سرمایہ آبروی درویش آورد --- قبل از ۱۸۳۵ء
۵ فرد : اے کہ برنامہ نام تو ز دیوان ازل ... بستہ انداز اثر دولت جاوید طراز --- درمیان ۱۷ ستمبر' ۱۷ اکتوبر ۱۸۳۱ء

۲۴ - بنام میاں نوروز علی خاں بہادر

۱ فرد : اے بہ دل نزدیک و دور از دیدہ گفتارم بہ تست ... از قوام بارل بود گفتار و پندارم نہ تست --- ۱۷ ستمبر ۱۸۳۱ء
۲ مشتاقان امید گاہا' مخلصان پناہا' کاشانہ دل را کہ گنج خانہ رازست از چشم و گوش دو در بہ روی --- اواخر ۱۸۳۱ء

۲۵ - بنام امین الدولہ آغا علی خان

نواب عالی جناب القاب را بہ تازگی تماشا نوید کہ جگر پارہ ہای از رگ کلک فرو ریختہ --- ۱۸۳۱ء

۲۶ - بنام میر سید علی خان بہادر، غمگین (عرف) حضرت جی

فرد : در دل بہ تمنای قدم بوس تو شورے ست   شوقت چہ نمک دادہ مذاق ادہم را   مئی ۱۸۳۹ء

۲۷ - بنام مبارزالدولہ ممتاز الملک حسام الدین حیدر خان بہادر

۱ حضرت قبلہ حاجات، مدظلہ العالی، برادرم حسین مرزا شنخے چند از زبان من گزاردہ باشد --- قبل از ۱۸۳۹ء

۲ حضرت نواب صاحب، قبلہ و کعبہ دو جہان مدظلہ العالی، لالہ ہری چند صاحب --- قبل از ۱۸۳۹ء

۳ قبلہ حاجات مدظلہ العالی، چون بندگان کم خدمت کہ از شرمساری سر پیش ا فگنند بخود فرو ی روم --- قبل از ۱۸۵۳ء

۴ قبلہ و کعبہ دو جہان سلامت، دوبار بدرالدین رسید و از جانب ملازمان دو غزل از من طلبید --- قبل از ۱۸۵۳ء

۵ خداوند نعمت سلامت، جوہری عرض جوہر بہ ارزی گردد - آبروی عہد وفا برد --- قبل از ۱۸۵۳ء

۶ جناب نواب صاحب قبلہ و کعبہ دو جہان مدظلہ العالی، آداب کورنش بجا آوردہ معرض میدارد --- قبل از ۱۸۵۳ء

۲۸ - بنام ذوالفقار الدین حیدر خان (عرف) حسین میرزا

عنایت فرمای من، دوست ہم عمرو ہم سبق شا رقعہ مختصرے بہ نام شا فرستادہ است --- قبل از ۱۸۳۹ء

۲۹ - بنام یوسف میرزا

نور دیدہ غالب آشفتہ نوا یوسف میرزا کہ چہ گویم از رفتنش برمن چہ رفت فرا رسیدہ باشد --- قبل از ۱۸۵۳ء

۳۰ - بنام منشی التفات حسین خاں

اسد اللہ آسیمہ سر آشفتہ رای کہ منشش از گفتن نداند بہ والا خدمت مخدوم معظم --- ۱۸۲۸ء

۳۱ - بنام میاں محمد نجف خاں

از واماندگی بہ رسیدن دروے و از دل بہ شنیدن - سرودے از غبار بہ دامن نمایشے --- درمیان ۱۸۳۵ء ۱۸۳۹ء

۳۲ - بنام نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر

۱ فرد : غرقہ بحریم مارا در دیار ماپرس   نقد کام نہنگیم از مزار ما مپرس --- درمیان ۱۸۳۵ء، ۱۸۳۹ء

۲ برادر، اشک و آہ غالب نامراد یعنی آب و ہوای اکبر آباد بہ شا سازگار باد --- قبل از ۱۸۳۹ء

۳۳ - بنام جیمس طامسین (James Thomason) سکرٹر بہادر نواب گورنر، اکبر آباد

۱ بہ جناب شوکت نصاب صاحب عالی مناقب والا شان امید گاہ خیراندیشان --- بعد از مئی ۱۸۳۷ء
۲ بہ خدمت کثیر البرکت صاحب والا گہر عالی نظر بندہ پرور عیار افزای سخن وراں --- درمیان ۱۸۴۱ء ۲۱ دسمبر ۱۸۴۳
۳ بحضور وافر السرور نواب عالی جناب داور فریدون فر سلطان شوکت شاہ نشان --- بعد از ۲۲ دسمبر ۱۸۴۳ء

۳۴ - بنام شمس الامراء نواب محمد رفیع الدین خان بہادر، نائب والی حیدر آباد

رباعی : والا نظرا، سرا، گرای گہرا کز فیض تو یافت رونق این کہنہ سرا --- ۱۸۳۸ء

۳۵ - بنام نواب مختار الملک، نائب والی حیدر آباد

بہ عز عرض حضرت فلک رفعت نواب معلی القاب آن ارسطوی اسکندر مرتبہ --- قبل از ۱۸۵۳ء

۳۶ - بنام منشی فضل اللہ خاں برادر منشی امین اللہ خاں، دیوانِ راجہ الور

۱ فرد : تنگ است دلم حوصلہ راز ندارد آہ ازنی تیر تو کہ آواز ندارد --- قبل از ۱۸۳۸ء
۲ فرد : شادم کہ گر دلے بہ سزا کرد روزگار بے بادہ کام عیش روا کرد روزگار --- قبل از ۱۸۳۸ء

۳۷ - بنام مظفر حسین خان

۱ نظم : اے کہ گفتی کہ در سخن باشد حاصل جنبش زبان گفتن --- قبل از جولائی ۱۸۳۸ء
۲ یارب، درود فرزانہ فرخ فرہنگ فرخندہ نشان بہ دیار رشک فرخار کلکتہ --- قبل از جولائی ۱۸۳۸ء

۳۸ - بنام مولوی محمد خلیل الدین بہادر

فرخ گہرا فرخندہ نگاہا کہتران را مہین امید گاہا، ہر چند روز روشن بہ شب تار رسیدہ --- اواسط ۱۸۴۲ء

۳۹ - بنام مہاراؤ راجہ بنے سنگھ بہادر - فرمانروائی الور

بر ضمیر منیر دراى رافت اقتضای مہاراجہ فریدون فر سکندر جاہ بعد از شرح مدارج سپاس یاد آوری ---

۴۰ - بنام امیر حسن خاں

۱ فرد : داغم ز سوز غم کہ تجل داردم ز خلق بوئے کہ تن ز سوختن استخواں دہد --- بعد از ۱۸۴۱ء
۲ خاقانی پایہ صاحبا و خسروی سرمایہ مطاعا، نامہ نامی نام آور چوں دولت دلخواہ کہ ناگاہ رسد --- ۲۲ جولائی ۱۸۴۴ء

۴۱ - بنام نواب تجمل حسین خاں، حشمت جنگ بہادر

یزدان فیروزی آفرین فیروز گر حضرت نواب جم جاہ انجم سپاہ سلطان شوکت سلیمان --- قبل از ۱۰ نومبر ۱۸۴۶ء

۴۲ - بنام مجتہد العلماء مولوی سید محمد

۱ به عز عرض حضرت ولی نعمت آیہ رحمت خداوند داد پسند فریاد رس می رساند --- ۱۸۳۲ء
۲ عرضداشت اسد اللہ نامہ سیاہ بہ نظر گا سرو شان گزرگاہ خداوند خرد مند دین پرور --- ۱۸۵۳ء

۴۳ - بنام نواب امداد حسین خاں بہادر وزیر شاہ اودھ

به والا حضرت فلک رفعت جناب مستطاب ہمایوں القاب صاحب السیف والقلم قبلہ عالم --- دسمبر ۱۸۴۸ء

۴۴ - بنام انور الدولہ نواب محمد سعد الدین خان بہادر شفق

۱ سبحان اللہ ہر پردہ آنچہ ازو نوائے دارد و ہر سرازو ہوائے، ہم خامہ را بہ رفتار آورد --- قبل از جولائی ۱۸۳۸ء
۲ بنامیزد بے نیازی ہای یزدان بے مانند و ہمتا را نازم کہ ارنی گوئے طور --- بعد از ۱۸۴۵ء
۳ فرد : اگر نہ بہر من از بہر خود عزیزم را کہ بندہ خوبی او خوبی خداوند است --- ۱۱ اکتوبر ۱۸۵۳ء
۴ ازاں سرمایہ خوبی بہ وصلم کام دل جستن بداں ماند کہ مورے خرمنے را در کمیں باشد --- بعد از دسمبر ۱۸۴۱ء
۵ فرد : باخیل موری رسی از رہ خوش است فال قاصد بگو کزان لب نوشیں پیام چیست --- ۱۸۴۵ء

۴۵ - بنام منشی ہرگوپال تفتہ

فرد : میرسد گر بہ حویشتن نازد غالب از خویش خاکسار تراست --- ۱۰ فروری ۱۸۴۹ء

۴۶ - بنام منشی نبی بخش حقیر، سررشتہ دار فوجداری ضلع علی گڑھ (کول)

فرد : گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت میتواں گفت کہ این بندہ خداوند نداشت --- ۲۱ فروری ۱۸۴۸ء

۴۷ - بنام میر احمد حسین میکش

بر ضمیر منیر خرد مند ستودہ خوی میر احمد حسین میکش کہ ہر آئنہ آئینہ رازہای نہانست --- ۱۸۳۸ء

۴۸ - بنام شیخ بخش الدین مارہروی

یزدان کہ از راز دل ہر ذرہ آگاہ است، بہ راستی گفتار من کہ از ذرہ کمترم گواہ ---

۴۹ - بنام نواب عبداللہ خاں بہادر، صَدرُ الصُّدُور میرٹھ

بہ والا خدمت فلک رفعت نواب ہمایوں خطاب فرخندہ القاب کہ قبلہ حاجات خیراندیشان اند --- بعد از جنوری ۱۸۳۸ء

۵۰ - بنام میرزا اسفند یار بیگ خان' دیوان مہاراجہ الور

فرد : لوحش اللہ گہرافشانی نال قلمم یارب آ.شخور این ابر کدامی دریاست --- مارچ' اپریل ۱۸۵۰ء

۵۱ - بنام منشی رحمت اللہ خاں

سرآغاز نامہ بہ نام ایزد فرہنگ آفرین فرزانہ برگزین ---

۵۲ - بنام آغا بزرگ شیرازی دفا

رباعی : صبح شد خیز کہ روداد اثر بنمایم چہرہ آغشتہ بہ خوناب جگر بنمایم--- ۱۸۵۲ء

۵۳ - بنام مولوی رجب علی خاں بہادر

۱ ولی نعمت سلامت' بہ رسیدن این پرند و پروین پرن مانند کہ شعار مہرو پرتو ماہ بہم تافتہ اند --- ۲۳ دسمبر ۱۸۴۸ء

۲ خدای دادگر را سپاس و بخت خداداو را آفرین کہ خواجہ ماخستہ نواز --- مارچ ۱۸۵۲ء

۵۴ - بنام عابد علی خاں

خان آگاہ دل ہمہ دان نام آور بلند دلنشین نشان --- ۷ اپریل ۱۸۵۳ء

۵۵ - بنام قاضی عبدالجمیل بریلوی

فرزانہ شیوا شیوہ روشن روش برگزیدہ رب جلیل حضرت مولوی عبدالجمیل --- ۲۳ جنوری ۱۸۴۹ء

۵۶ - بنام خواجہ ظہیرالدین

یزدان را سپاس کہ خواجہ رہی پرور است و از آن رو کہ بندہ را خواجہ پرست آفریدہ اند --- اواخر اکتوبر ۱۸۵۳ء

۵۷ - بنام نواب علی بہادر --- مسند نشین باندہ

بہ حضور موفور السرور جناب ہمایون القاب نواب صاحب جمیل المناقب عظیم الشان قلزم فیض --- بعد از ۱۸۴۹ء

۵۸ - بنام روح اللہ خاں

بنا میزد درین ورق کہ چون سواد آنرا بنگرند و نوردرازہم کشایند دریابند ---

۵۹ - بنام میرواجد علی خان بلگرامی

مصطفوی' گہرا' درپردہ سلامے کہ می فرستم خود بہ ہمایون انجمن می رسم ---

۶۰ - بنام میر مہدی مجروح

۱ نور چشم جہان بین من کہ جہان را بہ رویش دیدہ ام از من بہ آفرین خوشنود باد --- دسمبر ۱۸۵۲ء
۲ نزدیکان را نشاط و دوران را بشارت کہ شاہ فرمان داد --- ۲۸ فروری ۱۸۵۳ء

۶۱ - بنام مولوی عبدالوہاب لکھنوی

بخدمت خدام پس از پذیرفتن سپاس یاد آوری سخن در آن می رود --- ۶۰ - ۱۸۵۹ء

۶۲ - بنام سلطان زادہ بشیرالدین میسوری

رباعی : عشق است ز خس سرخ گل و نسرین را از تیرگی سامہ و پروین را --- درمیان نومبر ۱۸۵۸ - ۱۸۶۳ء

۶۳ - بنام گل محمد خان ناطق مکرانی

از غالب ہرزہ سرا بہ ناطق رنگین نوا سلام - ہمانا از خمار بہ نشہ و از سراب بہ دجلہ --- اواخر مئی ۱۸۴۸ء

۶۴ - بنام مولانا محمد عباس بھوپالی

والا یزدان ہست و بود آفرین کہ گماشتن و خشور و فرستادن منشور از آلای اوست --- ۱۲ اکتوبر ۱۸۵۸ء

۶۵ - بنام مولوی محمد حبیب اللہ (ذکا حیدر آبادی) منشی نواب مختار الملک، نائب والی حیدر آباد

یزدان را بہ بخشندگی سپاس و بخت را بہ فرخی آفرین و آرزو را بہ روائی نوید ---

۶۶ - بنام اعلیٰ حضرت سلطان محمد بہادر، اشرف شاہزادگانِ میسوریہ

رباعی : سبحان اللہ، شان اعلیٰ حضرت باشد فلک آستان اعلیٰ حضرت --- ۱۸۶۷ء

۶۷ - بنام منشی جواہر سنگھ جوہر

۱ امروز خوگری مہرے را کہ از دل رستہ و بہ اناءل پیوستہ است می جنباند --- یکم دسمبر ۱۸۴۸ء
۲ چشم و چراغ دودہ مردی و مردم دیدہ من منشی جواہر سنگھ جوہر را روز افزونی دولت روزی باد --- ۱۱ جون ۱۸۵۲ء
۳ جان من، نامہ شما دیر است تا بہ من رسیدہ است --- ۱۹ جولائی ۱۸۵۴ء

۶۸ - بنام دو تن از فرزانگانِ پنجاب

آن یکے چہر مردی راہ مہر و آن دیگرے ماہ یعنی ہمایوں پایہ مرزا محمد خان و --- ۱۷ اپریل ۱۸۶۵ء

۶۹ - بنام آغا محمد حسین ناخدای شیرازی

مخلبسد حدیقہ تحقیق آبیار گل و نہال گیاہ --- ۱۸۶۵ء

۷۰ - بنام میر غلام بابا خان بہادر

عالیجاہا والا پایگاہا، ورود قدسی صحیفہ دل را توان و تن را روان افزود --- ۷ مئی ۱۸۶۴ء

۷۱ - بنام منشی نو لکشور، مالک مطبع اودھ اخبار

بنامیزد امروز سخن بیگویم باکسے کہ دیدہ رویش نادیدہ است و دل بہ مہراش گرویدہ --- ۱۸ جولائی ۱۸۶۰ء

نوادرِ غالب : مولانا محمد عمران خاں ٹونکی کے دریافت کردہ خطوط غالب

بنام نواب وزیر الدولہ (محمد وزیر خاں) نواب ریاست ٹونک

۱ بہ موقف عرض بار یافتگان بزم حضور موفور السرور نواب قدسی القاب، عظیم الشان، رفیع المکان --- ۴ ذی الحجہ ۱۲۶۴ھ

۲ عرضداشت ہوا خواہ اسد اللہ بحضور فیض گنجور جناب مستطاب ہمایوں القاب، قبلہ دین و دنیا --- بیستم ذی قعدہ ۱۲۶۹ھ

۳ عرضداشت ہوا خواہ اسد اللہ بحضور کرمت گنجور جناب مستطاب نواب صاحب قبلہ و کعبہ --- یکم محرم ۱۲۷۱ھ

نامہ ہائے فارسیٔ غالب --- مُرتّبہٗ سید علی اکبر ترمذی

۱ - بنام مولوی محمد علی خاں --- صدر امین (سول جج) باندہ

۱ فرمانروای کشور آگہی ملاذ و مطاع رہی سلامت! بعد تقدیم ستایش و تسلیم نیایش معروض اینکہ ---

۲ قبلہ قبلہ پرستان و کعبہ حق پژوہان، سلامت! خود را فرایاد خاطر خطیر دادن از لوازم حصول وجود سعادت انگاشتہ، ---

۳ قبلہ جان و دل، سلامت! آداب کورنش بجا، آوردہ، بہ عرض حال خود، می گراید - الحمد للہ ---

۴ مشتمل بر ہجو الہ آباد و صفت بنارس : یک شکایت نامہ آوارگی ہای من است قصہ درد جدائی ہا جدا خواہم نوشت

۵ جناب فیض ماب، قبلہ و کعبہ نشاتین، مدظلہ العالی! روزگاری کہ نفس از سوز فراق آں قبلہ راستاں شعلہ خیز ---

۶ قبلہ و قبلہ گاہ من سلامت! تکلفات رسمیہ از عالم آداب و کورنش و تسلیم بہ مذاق صرافت عبودیت گوارا نہ دیدہ ---

۷ قبلہ گاہا، بی کساں پناہا! دہ روزہ بر دو ماہ فزون گزشتہ کہ سواد والا نامہ منظر نہ گشتہ، عرضداشت و عریضہ محررہ ---

۸ قبلہ گاہا! بتاریخ بست و نہم ذی قعدہ روز آدینہ، پاسی از روز برآمدہ بود کہ ورود ربوبیت نامہ فرقم را ور سایہ بال ہما نخست

۹ حضرت قبلہ گاہی ولی نعمتی مدظلہ العالی! اگر سپاس منعم گزاردمی، طاقت کجا، واگر شکوہ بخت سرایمی، زہرہ کو ---

۱۰ .... خدا کہ ہنگام تحریر عبودیت نامہ ہا بسکہ ذوق حضور از ضمیرم می جوشد، ہرگز رعایت القاب و آداب .... بسا باشد ---

۱۱ حضرت قبلہ گاہی ولی نعمتی مدظلہ العالی! بعد تمہید مراتب تسلیم کہ سعادت دو گیتی در گرو آن است، ---

۱۲ قبلہ گاہا! انچہ پس از عرض تسلیمات، بہ معرض بیان باید آورد، نخست این است کہ روزگاری گزشتہ کہ ہمای والا نامہ ---

۱۳ .... دو سہ روز گزشتہ باشد، کہ کتابتی، از غم کدہ راقم رسیدہ بود و طرازی از نقش خط و خال شاہد مدعا داشت ---

۱۴ قبلہ گاہا! روزہا گزشتہ و روزگار ہا سپری گردیدہ کہ سواد والا نامہ' توتیائی چشم مشتاق نمی رساند ---
۱۵ قبلہ گاہا' شگرفی چند دست بہم دادہ کہ اگر بہ خامہ نہ سپردہ آید دل از خار خار نیاساید بالجملہ در ---
۱۶ حضرت قبلہ گاہی' ولی نعمی' مدظلہ العالی! گرد سری گردد' و جان بہ خاک آں کف پای افشاند ---
۱۷ حضرت قبلہ گاہی' ولی نعمی' مدظلہ العالی! کورنش بجا آرد' و عرضہ ی دارد کہ پیش ازیں عرائض ---
۱۸ حضرت قبلہ گاہی' ولی نعمی مدظلہ العالی! بعد کورنش معروض است کہ عبودیت ناجات' بیم رسیدہ' آئینہ دار وقائع' ---
۱۹ حضرت قبلہ گاہی' ولی نعمی مدظلہ العالی! چون مرا سودای آن در سراست کہ در غیبت از حاضران بہ شمار آیم ---
۲۰ حضرت ولی نعمی مدظلہ العالی! بعد تسلیم و کورنش عرضہ می دارد' قطعہ ہنڈوی چون بعد تفتیش شاہ جوگ بر آمد ---
۲۱ حضرت قبلہ گاہی و ولی نعمی مدظلہ العالی! جبینی بہ خیال آن آستان سجدہ ریز ---
۲۲ حضرت قبلہ گاہی' ولی نعمی مدظلہ العالی! پس از گرد سر گردیدن' چشم از خجلت بہ پشت پا می دوزد ---
۲۳ قبلہ خوانم یا پیمبر یا خدا یا کعبہ ات اصطلاح شوق بسیارست و من دیوانہ ام ---
۲۴ قبلہ گاہا! بسا فتنہ کہ سر از کمین برزد و بسا عقدہ کہ در کار افتاد' باخرد روشن (عرفت ربی) جمیع العوائم وا رسید ---
۲۵ مربی بیکسان سلامت' بعد تسلیم معروض اینکہ بہم نہ رسیدن آدم از مقتضیات بیکسی ہای غالب ست ---
۲۶ حضرت قبلہ گاہی مدظلہ العالی' مکتوبی برای روانگی کلکتہ ی رسد - یکی از خواجہ تاشان من فرمان رود ---
۲۷ قبلہ گاہا' بیکسان پناہا! صبح در ہنگامہ و نیمروز بہ فرسودن خامہ گزشت۔ حیف' کہ دیدہ روشناس آن کف پا نہ گشت ---

۲ - بنام نواب سید علی اکبر خان بہادر طباطبائی --- کلکٹر ہگلی

قبلہ محرمان سلامت! ممدوح از ستایش مستغنی و مادح در بیان نارسا (غلو در) عرض نیاز فضولی' ---

۳ - عرضداشت بنام فریزر (Fraser) --- پولیٹیکل سیکرٹری

صاحب والا مناقب والا شان' داور دادرس' فیض رساند ام شوکتہ'! بہ عرض عالی --- می رساند --- ۲۸ اپریل ۱۸۲۸ء

۴ - بنام مردمانِ نامُعیّن

۱ اعلیٰ حضرت نواب صاحب قبلہ و کعبہ کونین مدظلہ العالی! جبین را بہ ہوای آستان سجدہ ریز ---
۲ جوہرجان گرای فدای خاک پای حضرت قبلہ گاہی ولی نعمی باد مدظلہ العالی! یکم جمادی الثانی روز یک شنبہ' ---
۳ حضرت قبلہ گاہی ولی نعمی مدظلہ العالی! چوں مضامین ادای آداب نیاز' و تقدیم مراسم تسلیم ---
۴ قبلہ سی ستم رسیدگان سلامت' پس از اظہار التزام شیوہ جانفشانی معروض آن کہ ہرچند گفتگوی کہ در باب تفرقہ ---

فارسی عرضداشتیں مشمولہ "غالب کا مقدمۂ پنشن" --- ڈاکٹر انیس ناگی

۱ - بنام ولیم بنٹنک (William Bentick) گورنر جنرل انڈیا

خداوند نعمت فیاض زمان دستگیر بیکسان قدر افزای متوسلان دام اقبالہ! جز عرض عالی --- فروری ۱۸۲۹ء

۲ - بنام اندریو اسٹرلنگ (Andrew Stirling Persian Secretary to Government)

۱ جناب فیض مآب خداوند خدایگان داور فریدون فر سنجر نشان دام اقبالہ' وزاد افضالہ --- ۱۱ اگست ۱۸۲۹ء

۲ جنابِ مستطاب خداوند خدایگان فیض بخش فیض رسان' دستگیر بے کسان دام اقبالہ' .جز عرض عالی متعالی ---

۳ - بنام مردِ نامُعَیَّن

غریب پرور سلامت! دعوی فدوی در باب خواجہ ایسست حاجی مستحق آن نیست --- ۱۵ جولائی ۱۸۲۹ء

غالب کی پانچ مہروں کے عکس

ڈاکٹر خلیق انجم

خطوط غالب کا تنقیدی مطالعہ

غالب کا پہلا دستیاب اردو خط

یہ کہنا مشکل بلکہ نا ممکن ہے کہ غالب نے اردو میں مکتوب نگاری کا آغاز کب کیا اور ان کا پہلا اردو خط کون سا ہے۔ غالب کے عہد میں خط و کتابت کی زبان فارسی تھی اور ان کی آخری عمر میں اردو نے فارسی کی جگہ لینی شروع کر دی تھی۔ اس لیے زندگی کے بڑے حصے تک غالب فارسی ہی میں خط و کتابت کرتے رہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اس دوران میں غالب نے اردو میں کوئی خط لکھا ہی نہ ہو گا۔ کچھ خطوط ضرور لکھے ہوں گے۔ ان کو کچھ ایسے لوگوں کو بھی خط لکھنے پڑے ہوں گے جو صرف اردو ہی لکھ پڑھ سکتے تھے۔ غالب کے ایسے بیشتر خطوط محفوظ نہیں رہے جو انہوں نے شاعروں' ادیبوں اور عالموں کو لکھے تھے اور جو غالب کے خطوط کی ادبی اہمیت سے پوری طرح واقف تھے تو پھر ہم ان لوگوں سے خطوط کو محفوظ رکھنے کی کیسے توقع کر سکتے ہیں جو ان کی ادبی اہمیت سے قطعی واقف نہیں تھے۔ قاضی عبدالودود کا یہ خیال بالکل درست ہے:

> "غالب سے سروکار رکھنے والوں میں ایسے لوگ' جو لکھنا پڑھنا جانتے کے باوجود فارسی سے بالکل ناواقف ہوں یا اس سے کافی واقفیت نہ رکھتے ہوں' ضرور ہوں گے اور وقتاً فوقتاً ایسے لوگوں سے مراسلت بھی ہوئی ہو گی۔ انھیں فارسی میں خط لکھنے کے معنی یہ ہوتے کہ خواہ مخواہ ترجمہ کرانے کی زحمت دی جائے۔ ناچار اردو ہی میں خط لکھنا پڑا ہو گا۔ اسی طرح کبھی کبھی ناخواندہ لوگوں کو بھی خط لکھنے کی ضرورت پڑی ہو گی اور انھیں بھی فارسی کی جگہ اردو میں خط لکھا ہو گا۔ غالب کی زوجہ امراؤ بیگم' گمان غالب ہے کہ ناخواندہ ہوں۔ بنارس و کلکتہ سے جو خط غالب نے انھیں بھیجے تھے اور جن کا ذکر منجھو مل کے نام کے خطوط میں ہے' وہ کس زبان میں ہوں گے۔"

(العلم: کراچی۔ جنوری تا مارچ ۱۹۶۹ء)

غالب نے فارسی میں مراسلت ترک کرنے اور اردو میں باقاعدہ مکتوب نگاری شروع کرنے سے قبل یقیناً اردو میں خطوط لکھے ہوں گے' چاہے ان کی تعداد کتنی ہی کم کیوں نہ ہو۔ اس لیے غالب کے پہلے اردو خط کی نشان دہی کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔ البتہ غالب کے اس پہلے اردو کی نشان دہی کی جا سکتی ہے' جو ہمیں دستیاب ہوا ہے۔ اور ہم اس زمانے کا تعین کر سکتے ہیں' جب غالب نے فارسی کے مقابلے میں اردو میں زیادہ خطوط لکھنے شروع کیے

اور اس زمانے کا اندازہ لگا سکتے ہیں جب غالب کی اردو مکتوب نگاری میں باقاعدگی پیدا ہوئی۔

غالب کی اردو مکتوب نگاری کے آغاز کے بارے میں پہلا بیان مولانا الطاف حسین حالی کا ہے جو انھوں نے یادگار غالب میں لکھا ہے:

"معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے مگر سنہ مذکور میں جب کہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیے گئے اور ہمہ تن "مہرنیمروز" کے لکھنے میں مصروف ہو گئے' اس وقت بہ ضرورت ان کو اردو میں خط و کتابت کرنی پڑی ہو گی۔ وہ فارسی نثریں اور اکثر فارسی خطوط' جن میں قوت متخیلہ کا عمل اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے' نہایت کاوش سے لکھتے تھے۔ پس جب ان کی ہمت مہرنیمروز کی ترتیب و انشا میں مصروف تھی' ضرور ہے کہ اس وقت ان کو فارسی زبان میں خط و کتابت کرنی اور وہ بھی اپنی طرز خاص میں' شاق معلوم ہوئی ہو گی۔ اس لیے قیاس چاہتا ہے کہ انھوں نے غالباً ۵۰ء کے بعد سے اردو زبان میں خط لکھنے شروع کیے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے:

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
اب عناصر میں اعتدال کہاں

یہ تو ممکن ہے کہ جولائی ۱۸۵۰ء کے بعد غالب نے فارسی کے مقابلے میں اردو میں زیادہ خطوط لکھنے شروع کر دیے ہوں۔ جس طرح یہ ممکن نہیں کہ اس تاریخ سے پہلے انھوں نے اردو میں خط نہ لکھا ہو' اس کا بھی امکان نہیں کہ اس تاریخ کے بعد غالب نے فارسی میں بالکل خط نہ لکھے ہوں۔ بعض ناقدوں نے حالی کے اس بیان کی روشنی میں یہ لکھنا شروع کر دیا کہ غالب نے اردو مکتوب نگاری کا آغاز جولائی ۱۸۵۰ء میں کیا تھا۔ یہ درست نہیں۔ حالی کا قول ہے کہ: "اس وقت بہ ضرورت ان کو اردو میں خط و کتابت کرنی پڑی ہو گی۔" اس کا غالباً" مفہوم یہ ہے کہ "مہرنیمروز" کا مواد اکٹھا کرنے کے لیے غالب نے بعض لوگوں کو جو خطوط لکھے' وہ اردو میں تھے ممکن ہے حالی کا یہ مطلب نہ ہو لیکن ہمارے بعض نقادوں نے اس عبارت کا یہی مفہوم سمجھا ہے۔ یہ کسی طرح بھی درست نہیں۔ غالب نے "مہرنیمروز" کا مواد خود اکٹھا کیا نہ اس کا مسودہ تیار کیا۔ انھوں نے ۱۹ نومبر ۱۸۵۲ء اور ۱۰ اپریل ۱۸۵۳ء کو جو خطوط منشی نبی بخش حقیر کو لکھے ہیں' ان سے معلوم ہوتا ہے کہ "کار پردازان شاہی" اردو میں مسودہ تیار کر کے بھیج دیا کرتے تھے۔ غالب کا کام صرف اس اردو مسودے کا فارسی میں ترجمہ کرنا تھا۔ اگرچہ کوئی قطعی ثبوت نہیں لیکن اس کا امکان ہے کہ یہ مسودہ حکیم احسن اللہ خاں کی نگرانی میں تیار ہوتا ہو یا مسودہ تیار ہونے کے بعد حکیم صاحب اس پر ایک نظر ڈال لیتے ہوں۔ بہرحال "مہرنیمروز" ۱۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ

غالب نے جولائی ۱۸۵۰ء میں شروع کیا اور اگست ۱۸۵۴ء کو یعنی چار سال اور ایک مہینے میں یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اتنی بڑی مدت میں ۱۱۶ صفحات کا ترجمہ' غالب کو اتنا معروف نہیں رکھ سکتا تھا کہ غالب کو فارسی میں خطوط لکھنے کی بھی فرصت نہ ملے۔

غلام رسول مہر کے خیال میں غالب کے دستیاب شدہ خطوط میں سب سے قدیم خط وہ ہے' جو غالب نے جواہر سنگھ جوہر کو لکھا تھا اور جس میں لنگی کی فرمائش کی تھی۔ اس خط پر تاریخ تحریر یکم دسمبر ۱۸۴۸ء ہے۔ اردو میں جواہر سنگھ جوہر کے نام تین خط ہیں۔ پہلے خط کے آخر میں غالب لکھتے ہیں:

"کیوں صاحب' وہ لنگی اب تک کیوں نہیں آئی۔ بہت دن ہوئے جب تم نے لکھا تھا کہ اسی ہفتے میں بھیجوں گا۔"

امکان یہی ہے کہ یہ خط دسمبر ۱۸۴۸ء کے آخر میں یا ۱۸۴۹ء کے اوائل میں لکھا گیا۔ اس لیے غلام رسول مہر کے خیال میں اب تک غالب کے جو اردو خطوط ملے ہیں' ان میں یہ قدیم ترین ہے۔

مولوی مہیش پرشاد کے مرتبہ خطوط غالب کی جلد اول میں (جوہر کے نام اردو خط اس جلد میں شامل نہیں ہیں اور دوسری جلد شائع نہ ہو سکی) غالب کا قدیم ترین خط وہ ہے جو غالب نے مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام لکھا تھا۔ اس خط پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ مہیش پرشاد نے اس خط کی تاریخ تحریر اگست ۱۸۴۹ء متعین کی ہے۔ اگرچہ مولوی صاحب نے اپنے دلائل پیش نہیں کیے' لیکن انہوں نے اس تاریخ کا تعین غالباً' اس بنیاد پر کیا ہے کہ اس خط میں غالب نے' تفتہ کے دیوان اول پر جو تقریظ لکھی تھی اس کا ذکر کیا ہے۔ ۲۰ اگست ۱۸۴۹ء کے "اسعد الاخبار" میں دیوان تفتہ کے بارے میں یہ اطلاع شائع ہوئی تھی:

"دیوان تفتہ جو اس مطبع میں چھپا ہے' ربع سے زیادہ چھپ چکا ہے۔ وہ بھی اس موسم سرما میں انشاء اللہ تعالیٰ تمام ہو گا۔ اس کی ضخامت ۳۵ جز کے قریب ہے اور قیمت چار روپے۔ بعد اختتام کے پانچ ہو جائیں گے۔۔۔۔۔ خصوصاً' اسد اللہ غالب دہلوی تو اس کے بہت ثنا خواں ہیں۔"

اس اقتباس کے آخری فقرے میں غالباً' اس تقریظ کا حوالہ ہے جو غالب نے لکھی تھی۔ اس لیے مولوی مہیش پرشاد کا یہ قیاس درست معلوم ہوتا ہے کہ تفتہ کے نام غالب کا زیر بحث خط اگست ۱۸۴۹ء میں لکھا گیا۔ گویا اب دو قدیم ترین خط ہو گئے۔ ایک تو جواہر سنگھ جوہر کے نام جو دسمبر ۱۸۴۸ء کے آخر میں یا ۱۸۴۹ء کے اوائل اور غالباً' جنوری ۱۸۴۹ء میں لکھا گیا۔ اور دوسرا خط تفتہ کے نام' جو اگست ۱۸۴۹ء میں لکھا گیا۔

غالب کے ایک اور خط کا پتا چلتا ہے' جو ان دونوں خطوں سے پہلے کا ہے' وہ خط بھی مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام ہے۔ مولوی مہیش پرشاد نے تفتہ کے نام غالب کے اس خط کی تاریخ تحریر تو متعین نہیں کی' لیکن اسے ۱۲ اگست ۱۸۳۵ء اور ۱۳ جنوری ۱۸۵۴ء کے خطوط کے درمیان مرتب کیا ہے۔ اس خط میں غالب نے تفتہ کے دو فارسی اشعار پر اصلاح دی ہے اور تفتہ کا ایک مصرع نقل کیا ہے۔:

زاہدا، ایں سخت ہرزہ کہ گفتی، چہ شدی
حق غفورست، گنا ہے شدہ ام تاچہ شود

بازآر دل خود از چنیں کار
آزار چہ ی کنی دلم را

اس خط میں تفتہ کا ایک مصرع اور نقل کیا گیا ہے:

ع خارہادر راہش افشانم کہ چوں خواہد شدن

یہ دونوں شعر دیوان اول میں موجود ہیں۔ چوں کہ میرے پیش نظر تفتہ کا جو دیوان اول ہے، وہ ناقص الاخر ہے اور صرف م کی ردیف تک ہے اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ تیسرا شعر جس غزل کا ہے وہ بھی دیوان اول میں ہے یا نہیں۔

۱۸ دسمبر ۱۸۴۸ء کے اسعد الاخبار میں یہ اطلاع چھپی تھی کہ:

"ان دنوں دیوان تفتہ سکندر آبادی اس مطبع میں چھپنا شروع ہوا ہے۔ اور یہ وہی دیوان ہے، جس کا اشتہار اخبار ہذا میں اواخر ۱۸۴۷ء میں دیا گیا تھا۔ بہ سبب عدیم الفرصتی کے، اب اس کی تدبیر کی گئی۔

دیوان تفتہ کے بارے میں اس اشتہار پر تبصرہ کرتے ہوئے قاضی عبدالودود لکھتے ہیں: "اواخر ۴۷ء دیوان کا اشتہار چھپا تھا: مگر دیوان اس وقت کس شکل میں تھا اس کا مطلق علم نہیں، قیاس چاہتا ہے کہ مکمل ہو" مجھے قاضی صاحب کے اس خیال سے اتفاق ہے کہ اواخر ۱۸۴۷ء میں دیوان تفتہ مرتب ہو چکا ہو گا۔ اس کا مطلب ہے کہ تفتہ کے نام غالب کا زیر بحث خط اوائل ۱۸۴۷ء میں لکھا گیا ہو گا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ تفتہ نے غالب کی اصلاح کو نہیں مانا اور دونوں اشعار دیوان میں شامل کر لیے۔ اس کا امکان ہے کہ دیوان میں غزلیں شامل کرنے کے بعد غالب کو اصلاح کے لیے بھیجی گئیں اور غالب نے خط کا جواب اتنی تاخیر سے دیا کہ دیوان کا وہ حصہ چھپ چکا تھا جس میں یہ اشعار تھے۔ میرے خیال سے ایسا نہیں ہے، اس سلسلے میں میری دلیل یہ ہے کہ تفتہ کے دیوان اول کا جو نسخہ اس وقت میرے پیش نظر ہے، وہ تفتہ کی ملکیت رہ چکا ہے، کیوں کہ بہت سی غزلوں پر لکھا ہوا ہے۔ "ایں غزل بعد نظر ثانی در دیوان دوم نوشتہ شد" بعض اشعار اور بعض مصرعے قلمزد کر کے دوسرے لکھے گئے ہیں۔ اگر دیوان اول کی طباعت کے بعد غالب کی اصلاح تفتہ کو ملتی تو دیوان اول کے اس مطبوعہ نسخے پر تفتہ ان اشعار کو قلمزد کر کے اصلاح شدہ اشعار لکھ دیتے۔

اس پوری بحث کا خلاصہ یہ کہ اب تک غالب کے جتنے اردو خطوط کی بازیافت ہوئی ہے، ان میں قدیم ترین خط وہی ہے، جو تفتہ کے نام ۱۸۴۷ء میں لکھا گیا۔

جلال الدین صاحب کو ۱۹۷۵ء میں غالب کے سولہ فارسی اور پانچ اردو غیر مطبوعہ خطوط ایک قدیم مخطوطے

میں ملے تھے۔ جلال الدین صاحب نے ان خطوط کا تعارف "ہماری زبان" نئی دہلی کی ۱۵ نومبر ۱۹۷۵ء کی اشاعت میں کرایا ہے۔ بہ قول ان کے یہ خطوط فرخ آباد کے نواب تجمل حسین' علی حسین خاں' ناظم' امانت علی خاں بلیغ' امداد علی خاں صاحبزادہ عرف چھوٹے خاں فرخ آبادی اور حکیم امام الدین خان دہلوی کے نام ہیں۔ اور یہ سب خطوط بہ قول جلال الدین صاحب ۲۵ اپریل ۱۸۳۶ء اور ۱۳ نومبر ۱۸۳۶ء کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ ان خطوط کا تعارف کراتے ہوئے سات سال گزر چکے ہیں۔ لیکن جلال الدین صاحب نے ابھی تک یہ خطوط شائع نہیں کیے۔ اس لیے مجھے شبہ ہوتا ہے کہ یہ خطوط جعلی ہیں۔ اگر جلال صاحب انہیں چھاپ کر میرا شبہ غلط ثابت کر دیں تو اردو میں غالب کا پہلا دستیاب خط ۲۵ اپریل ۱۸۳۶ء کا قرار پائے گا۔

شگفتن گل ہائے ناز

کسی بھی فن کار کی تخلیقی قوتیں عام طور پر پچاس برس کی عمر کے سلب ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد یہ تو ممکن ہے کہ فنی سطح پر ہیئت اور اسلوب میں کچھ اور زیادہ پختگی اور نکھار پیدا ہو جائے لیکن جہاں تک اس کے تخلیقی عمل کا تعلق ہے' جس میں فکر' احساس اور جذبہ شامل ہے' فنکار زیادہ تر خود کو دہرانے لگتا ہے۔ اس کی اصل وجہ کیا ہے' اس پر تو ماہرین نفسیات ہی بہتر طریقے سے روشنی ڈال سکتے ہیں لیکن عام خیال یہی ہے کہ پچاس کے بعد چوں کہ فنکار کے قویٰ مضمحل ہونے لگتے ہیں' اس لیے جذبے اور احساس میں وہ شدت باقی نہیں رہتی اور فکر کے سوتے خشک ہونے لگتے ہیں۔ تاہم اس عمر میں عقلیت اور قوت استدلال بڑھ جاتی ہے۔ فکر و خیال میں منطقی پہلو زیادہ اجاگر ہونے لگتا ہے' جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فنکار جوش اور ولولے سے محروم ہو جاتا ہے۔ غالب نے اپنی کیفیت کا اظہار نظم اور نثر دونوں میں کیا ہے:

سخن میں خامہ غالب کی آتش افشانی　　یقیں ہے ہم کو بھی' لیکن اب اس میں دم کیا ہے

یہاں بات نثری پیرائے میں ایک خط میں غالب نے ان الفاظ میں کہی ہے:

"صناعت شعر اعضاء و جوارح کا کام نہیں' دل چاہیے' دماغ چاہیے' ذوق چاہیے' امنگ چاہیے۔ یہ سامان کہاں سے لاؤں جو شعر کہوں۔ چونسٹھ برس کی عمر' ولولہ شباب کہاں؟ رعایت فن' اس کے اسباب کہاں انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

بنام چودھری عبدالغفور سرور

شاعری اور خاص طور سے غزل کا حسن ایجاز و اختصار' رمز و کنایہ' اشاریت' اجمال اور آہنگ میں ہے۔ شاعری عام طور سے عقلیت اور منطقی استدلال کی متحمل نہیں ہوتی' جب کہ نثر مطالبہ کرتی ہے' عقلیت کا' فکری اور منطقی استدلال کا اور تفصیل و جزئیات اور قطعیت اور معروضیت کا۔ شاعری آرائش گفتار کے بغیر ممکن نہیں' اور آرائش گفتار کے لیے جس یک سوئی' جوش و ولولہ' ذہنی و جسمانی طاقت و صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے' غالب عمر کے آخری حصے میں اس سے محروم ہو چکے تھے۔ اسی لیے وہ شاعری اور خاص طور سے فارسی شاعری اور فارسی نثر نگاری سے دامن بچانے لگے تھے۔ حال آں کہ غالب کی زندگی کا بڑا حصہ وہ ہے' جس میں ذہنی پریشانیوں

نے بھی انہیں شعر گوئی سے باز رکھا۔ غالب کے قویٰ مضمحل ضرور ہو چکے تھے' لیکن ان کے دماغ کی آگ روشن تھی بلکہ کائنات کے شعور اور ذات کی آگہی نے اس آگ کو روشن تر کر دیا تھا۔ تجربوں اور مشاہدوں نے فکر میں زیادہ پختگی و بالیدگی' احساس میں زیادہ گہرائی اور گیرائی اور جذبات میں ٹھہراؤ پیدا کر دیا تھا۔

غالب نے اردو میں خطوط ضرور تا" لکھنا شروع کیے تھے۔ لیکن خطوط نویسی میں اظہار کے امکانات نے بہت جلد ان کے اندر چھپے ہوئے اس فنکار کو جگا دیا جو ردیف و قافیہ کی مشقت سے تھک کر سو گیا تھا۔ پچاس برس کے بعد فنکار کے ذہن' جذبے اور فکر میں ہونے والی وہ تبدیلیاں جو تخلیقی عمل کے راستے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں' نثر کے اس نئے وسیع اور کشادہ میدان میں غالب کے لیے بہت بڑا اثاثہ ثابت ہوئیں۔

غالب کی نثر نگاری کا آغاز فارسی کی "پنج آہنگ" سے ہوا۔ یہ کتاب 1825ء میں مرتب ہوئی تھی لیکن اس کے شائع ہونے کی نوبت 1849ء میں آئی۔ "پنج آہنگ" کے ابتدائی دو آہنگوں میں سے غالب نے پہلے آہنگ میں القاب و آداب لکھنے کے طریقوں سے بحث کی اور دوسرے آہنگ میں بعض مصادر' مصطلحات اور فارسی الفاظ کے معنی وغیرہ بیان کیے ہیں۔ باقی تین آہنگوں میں غالب کے اشعار' تقاریظ اور عبارات متفرقہ اور فارسی خطوط کا انتخاب شامل ہیں۔ غالب کی دوسری فارسی کتاب "مہرنیم روز" ہے۔ یہ خاندان تیموریہ کی تاریخ کی پہلی جلد ہے۔ دوسری جلد مکمل کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اس کا اردو مسودہ غالب کو ملتا تھا اور غالب اس کا فارسی میں ترجمہ کر دیا کرتے تھے۔ 1857ء تک غالب کا نثری سرمایہ فارسی میں یہ دو کتابیں اور خاصی تعداد میں فارسی اور اردو خطوط تھا۔

1857ء کے انقلاب کی وجہ سے غالب تنہائی اور گوشہ گیری کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ کہیں سے مولوی محمد حسین تبریزی کی مشہور لغت "برہان قاطع" اور "دساتیر" ہاتھ آگئیں۔ زندگی کے تلخ حقائق سے فرار حاصل کرنے اور ذہنی اعتبار سے خود کو مصروف رکھنے کے لیے غالب نے خود کو ان کتابوں کے مطالعے میں غرق کر دیا۔ "برہان قاطع" کے مطالعے کے دوران انہیں محمد حسین تبریزی سے اختلاف ہوا۔ ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ آگیا انہوں نے حاشیے پر اختلافات درج کر دیے۔ اس طرح گویا غالب کے علمی کام کا آغاز ہوا۔ ابھی غالب "برہان قاطع" کا مطالعہ کر ہی رہے تھے کہ انہیں روزنامچے کے انداز میں ایک کتاب "دستنبو" لکھنے کا خیال آیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ "دستنبو" لکھنے کے لیے انہوں نے "برہان قاطع" کا مطالعہ شروع کیا ہو۔ الفاظ کی اصل اور ان کے معنی پر غور کرتے ہوئے غالب کو خیال آیا کہ "دستنبو" ایسی فارسی میں لکھی جائے جس میں ایک لفظ بھی عربی کا نہ آئے۔ "دستنبو" کی تالیف کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ غالب پر برطانوی حکومت پر اپنی بے گناہی ثابت کریں لیکن انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ لگے ہاتھوں انگریزوں پر اپنی فارسی دانی کا سکہ بھی بٹھا دیا جائے۔ بہرحال' بے کاری میں ایک اور مشغلہ ہاتھ آیا۔ کچھ وقت "دستنبو" کے لکھنے میں لگا اور کچھ اس کی طباعت کے اہتمام میں۔ کچھ عرصے بعد "برہان قاطع" پر اعتراضات ترتیب دے کر "قاطع برہان" کے نام سے شائع کیے۔ کتاب کا چھپنا تھا کہ خود غالب پر اعتراضات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ بعض اہل علم "برچھیاں اور بھالے لے کر غالب کی طرف دوڑے۔ پھر تو ایک

مستقل مشغلہ ہاتھ آ گیا۔ اس معرکے میں غالب نے "نامہ غالب" اور "تیغ تیز" دو رسالے اپنے نام سے شائع کیے اور دو رسالے "لطائف غیبی" میاں داد خان سیاح کے نام سے اور "سوالات عبدالکریم" عبدالکریم کے نام سے شائع کیے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ غالب نے یہ علمی کام زندگی کے اس حصے میں کیا' جب انہیں سب سے زیادہ ذہنی پریشانیوں کا سامنا تھا۔ صحت جواب دے چکی تھی' اور بہ قول ان کے "دست وپا" ہو چکے تھے۔ یہ سب وقت گزارنے کے مشغلے تھے۔ اس سلسلے کا سب سے اہم مشغلہ تھا خطوط نویسی۔ علمی مشاغل میں معروف رہ کر غالب کچھ دیر کے لیے خود کو بھول جانے میں کامیاب ہو جاتے تھے لیکن خطوط کے سہارے تو انھوں نے ایک بزم سجا رکھی تھی جس میں ان کے عزیز' دوست' معتقد' مداح' ممدوح اور شاگرد سب ہی شریک تھے۔ اس بزم کی فضا اکثر شگفتہ اور تصنع و تکلف سے پاک رہتی۔ غالب اہل بزم کو اپنے دکھ درد میں شریک کرتے۔ اپنی ناکامیوں کا ماتم کرتے اور کامیابیوں پر خوشی اور مسرت کا اظہار کرتے۔ یہی نہیں بلکہ غالب اس بزم میں شریک ہونے والوں کی خوشی اور غم میں خود بھی برابر کے شریک رہتے۔

غالب کے خطوط کی نثر میں صرف منطقی استدلال ہی نہیں بلکہ اس میں ٹھہرا ہوا جذبہ اور ایک منفرد طرز فکر و احساس ہے جو موج تہ نشیں کی طرح جاری و ساری نظر آتا ہے۔ ان خطوط میں غالب کی خلاقانہ صلاحیت' اور نثر کے ہم آہنگ متوازن شاعرانہ مناعی بھرپور امکانات کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ان میں تجربات اور احساسات کی رنگا رنگی ہے۔ اجتماعی تجربے بھی ہیں اور ذاتی واردات بھی۔ ایک فرد کی آواز بھی ہے اور پورے عہد کی گونج بھی۔ خطوط غالب اس عہد کے ہندوستان کی تاریخ میں رونما ہونے والی اہم ترین سیاسی' سماجی اور تہذیبی' فکری اور جذباتی تبدیلیوں کا ردعمل بھی ہیں اور ایک فرد کی مایوسیوں' شکستوں اور ناکامیوں کی داستان بھی۔ غرض انسان کی روز مرہ زندگی اور اس کے مسائل کی گونج بھرپور طریقے پر اردو اثر میں پہلی بار خطوط غالب ہی میں سنائی دیتی ہے۔

وہ غالب' جو شاعری میں پوری کائنات سے مبارزہ طلب ہے اور ہر بڑی طاقت سے نبرد آزما ہے' خطوط میں اپنی معمولی ضرورتوں اور احتیاجوں کے حصار میں گرفتار نظر آتا ہے' وہ اہل ثروت کے سامنے کاسہ گدائی لیے کھڑا ہے۔ نواب کلب علی خاں کے دربار میں گڑگڑا کر دعائیں دے رہا ہے۔ کبھی کہتا ہے "خدا حضرت کو سلامت رکھے' مجھ سے اپاہج نکمے کو بہ عوض خدمت تنخواہ دیتے ہو۔" اور کبھی عرض کرتا ہے "مختصر یہ کہ اب میری جان اور آبرو آپ کے ہاتھ ہے مگر حضور' جو عطا فرماتا ہے' جلد ارشاد ہو:

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم   الٹے پھر آئے' در کعبہ اگر وا نہ ہوا

شاعری میں خود بینی و خود داری کا یہ عظیم تصور پیش کرنے والا انسان انگریزوں کے ہندوستانی منشی کی خوشامد میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتا ہے۔ غلام غوث خاں بے خبر دوسرے بلکہ تیسرے درجے کے شاعر ہیں۔ چوں کہ صوبہ غرب و شمال کے لفٹنٹ گورنر کے میر منشی ہیں' غالب انہیں لکھتے ہیں:

"اودھ اخبار میں حضرت کی غزل نظر فروز ہوئی۔ کیا کہنا ہے۔ ابداع اس کو کہتے ہیں' جدت

طرز اس کا نام ہے۔ جو ڈھنگ تازہ نوایان ایران کے خیال میں نہ گزرا تھا' وہ تم بروئے کار لائے۔"

"امیر خسرو کے علاوہ غالب ہندوستان کے کسی اور فارسی کو تسلیم نہیں کرتے تھے' لیکن اپنے ایک شاگرد اور تیسرے درجے کے شاعر نواب انور الدولہ سعد الدین خاں بہادر شفق کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"خوشامد میرا شیوہ نہیں ہے۔ جو ان غزلوں کی حقیقت میری نظر میں ہے' وہ مجھ سے سن لیجئے اور میرے داد دینے کی داد دیجئے۔ مولانا قلق نے متقدمین یعنی امیر خسرو و سعدی و جامی کی روش کو سرحد کمال کو پہنچایا ہے اور میرے قبلہ و کعبہ مولانا شفق اور مولانا ہاشمی اور مولانا عسکری متاخرین یعنی صائب و کلیم و قدسی کے انداز کو آسمان پر لے گئے ہیں۔"

غالب نے شاعری میں اپنی ایک تخیلی اور مثالی شخصیت کا بت تراش رکھا تھا۔ لیکن خطوط میں ہمیں جو شخصیت نظر آتی ہے' اس میں انسانی کردار کی بلندی بھی ہے اور پستی بھی۔ خودداری اور خودنگری بھی ہے اور خوشامد' تملق اور دریوزہ گری بھی۔ حق و صداقت بھی ہے اور دروغ گوئی و مصلحت کوشی بھی۔

دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

کی تفسیر بھی ان خطوط میں نظر آتی ہے۔

تہی دستی' مفلسی' ناقدری' بے عزتی اور ناکامی غالب کی حسرت تعمیر کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکی۔ زندگی کے آخری لمحوں تک وہ زندہ رہنے کے لیے جہاد کرتے رہے۔ اگر غالب میں غیر معمولی قوت ارادی اور زندہ رہنے کا سلیقہ نہ ہوتا تو وہ مرنے سے بہت پہلے مر گئے ہوتے۔

ان خطوط میں زندگی اپنی تمام رعنائیوں' دلکشیوں' بلندیوں' پستیوں اور پیچیدگیوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ شاعری میں غالب کی آواز ہمیں کافی دور سے سنائی دیتی ہے' لیکن خطوط میں وہ ہمارے ساتھ بیٹھ کر ہم سے محو گفتگو ہیں۔ شاعری میں وہ ہمارے دکھ درد اور ہماری نفسیاتی الجھنوں کا مداوا ایک مفکر' فلسفی' صوفی اور ایک اخلاقی مصلح کی حیثیت سے کرتے ہیں لیکن خطوط میں وہ ایک حقیقت پسند اور عملی انسان کی حیثیت سے ہمارے دکھ درد اور خوشی و غم میں شریک ہوتے ہیں۔ ان خطوط میں ہمیں ایک منطقی دماغ کا نہیں بلکہ ایک حساس اور دھڑکتے ہوئے دل اور سانس لیتی زندگی کے وجود کا احساس ہوتا ہے۔

ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کی دنیا بہت وسیع ہے۔ اگر صرف ان انگریز عہدیداروں کے حالات کا جائزہ لیا جائے جن سے غالب کے تعلقات تھے یا جن سے پنشن کے سلسلے میں غالب نے رابطہ قائم کیا تھا تو انیسویں صدی کے نصف اول کے ہندوستان میں برطانوی حکومت کی تاریخ کا بہت بڑا حصہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اگر فارسی شاعری اور لغت نویسوں کا تذکرہ مرتب کیا جائے' جن کا ذکر غالب کے خطوط میں آیا ہے تو فارسی ادب کی ایک ایسی تاریخ مرتب ہو جائے گی' جس میں فارسی کے اہم ترین ایرانی اور ہندوستانی شعراء کا ذکر ہوگا۔ اسی طرح اردو شاعروں اور ادیبوں کا بھی نسبتاً" ایک مختصر سا تذکرہ ان خطوط کی بنیاد پر مرتب کیا جاسکتا ہے۔ اگر ہم

صرف "دستنبو" اور غالب کے خطوط کے حوالے سے 1857ء کی بغاوت کا مطالعہ کریں تو اس سے متعلق بیشتر اہم واقعات اور شخصیتیں ہماری نظر میں آ جاتی ہیں۔ اس لیے غالب کے عہد کی سماجی' تہذیبی اور سیاسی زندگی کے مطالعے کے لیے بھی خطوط غالب اہم ترین ماخذ ہیں۔

غالب کے عہد کی بعض ریاستوں مثلاً" رام پور' بیکانیر' الور' بھرت پور' فیروزپور' لوہارو' حیدر آباد' اودھ' جے پور' باندہ وغیرہ کے حالات پر بھی غالب کے خطوط سے کچھ نہ کچھ روشنی پڑتی ہے۔

غالب کی گفتگو میں جو خود اعتمادی اور ان کی شخصیت میں جو تاب و توانائی ہے' اس کے لیے شخصیت کا منفرد ہونا ضروری ہے اور منفرد شخصیت اسی کی بنتی ہے' جس نے اپنی انا کی نگہ داری کی ہو۔ خطوط غالب کے جلوۂ صد رنگ میں سب سے زیادہ تیکھا اور شوخ رنگ غالب کی انا اور انفرادیت کا ہی ہے۔ انفرادیت تو ہر انسان کی ہوتی ہے۔ لیکن عام انسانوں کی انفرادیت کی لو اتنی مدہم ہوتی ہے کہ مخصوص سماجی گروہ یا طبقے کی اجتماعی انفرادیت کی تیز روشنی میں گم ہو کر رہ جاتی ہے اور صرف انسانی نفسیات کے ماہرین نفسیات ہی اس دبی ہوئی اور کمزور انفرادیت کو تلاش کر پاتے ہیں۔ انفرادیت کو فروغ انا سے حاصل ہوتا ہے۔ جس انسان کی انا میں جتنی زیادہ قوت ہوگی اتنی ہی اس کی انفرادیت بلند ہوگی۔ انا کے سرچشمے مختلف ہیں۔ خاندانی وقار' علم و فن' سیاسی اقتدار اور دولت وغیرہ۔ انا سے انفرادیت حاصل ہوتی ہے اور انفرادیت سے شہرت اور عزت۔ شہرت فرد کے سماجی گروہ تک محدود رہے گی یا پورے ملک میں پھیلے گی یا زماں و مکاں کی قیود سے آزاد ہوگی' اس کا انحصار انفرادیت کی قوت پر ہوتا ہے۔ فرد میں انفرادیت کی لے جتنی زیادہ تیز ہوگی' اتنی ہی اس کی شہرت ہوگی۔ غالب کی انا میں زبردست توانائی ہے اور اس انا کے سرچشمے تین ہیں۔ خاندانی وقار' مہارت فن اور فارسی دانی۔ جاگیرداری نظام میں خاندانی برتری کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا فرد کی قدر و قیمت اس کی اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر نہیں بلکہ اس کے حسب نسب پر ہوتی ہے۔

غالب کو اپنی انفرادیت قائم رکھنے کے لیے خاندان کے سلسلے میں دروغ گوئی سے بھی کام لینا پڑا۔ بہ قول قاضی عبدالودود:

> "غالب نے پہلے اپنے کو ترک ایبک افراسیابی النسل کہا اور بغیر اس کے کہ اس کی تردید کریں' سلجوقیوں کو مگوز کا دعوے کیا' اس کے بعد اپنے کو سلجوقی کہا اور بالآخر سنجر برکیارق کی اولاد ہونے کے مدعی ہوئے..... ڈاکٹر یوسف حسین کے اس خیال سے مجھے اتفاق ہے کہ غالب اوزبک تھے۔ ہند میں اس کے ساتھ خوشگوار تصورات وابستہ نہیں' ذہن ایبک کی طرف گیا' جو اور کچھ نہیں تو اس کا قافیہ ہو سکتا تھا۔"

فارسی دانی کا لوہا منوانے کے لیے غالب نے "قاطع برہان" کا قضیہ کھڑا کر دیا۔ یہ غالب کی ضعیفی کا زمانہ تھا اور غالب پر بہت زیادہ حملے ہو رہے تھے' لیکن غالب نے ہمت نہیں ہاری۔ یہ معرکہ ادبی مباحث سے گزر کر گالی گلوچ تک پہنچا اور نوبت یہاں تک آئی کہ غالب کو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔ اگرچہ "برہان قاطع" پر غالب کے

کافی اعتراضات بے بنیاد تھے۔ لیکن یہ ادبی معرکہ غالب کی حد سے بڑھی ہوئی انفرادیت کا بہت بڑا ثبوت ہے۔
فارسی پر غیر معمولی قدرت ثابت کرنے کے لیے غالب کو کبھی کبھی اپنے مزاج کے خلاف پینترے بازیوں سے بھی کام لینا پڑا ہے۔ مثلاً" انہوں نے "دستنبو" بہ قول ان کے خالص فارسی قدیم میں لکھی ہے۔ اس کے بارے میں مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں نے آغاز یاز دہم مئی 1857ء سے سی وکیم جولائی 1858ء تک روداد شہر اور اپنی سرگذشت یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے اور التزام اس کا کیا ہے کہ "دساتیر" کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے۔" ——— ہفدہم اگست 1858
پوری احتیاط کے باوجود عربی کے کچھ الفاظ "دستنبو" میں شامل ہو ہی گئے۔

فارسی زبان پر اپنی غیر معمولی قدرت ثابت کرنے کے لیے اگر غالب نے "دستنبو" اور "قاطع برہان" جیسی کتابیں لکھیں یا دوستوں اور شاگردوں کے نام خطوط میں ہندوستانی فرہنگ نویسوں اور شاعروں کو برا بھلا کہا اور گالیاں دیں' تو چلیے کوئی بات نہیں۔ ستم یہ ہے کہ غالب نواب کلب علی خاں سے الجھ گئے اور یہ نہ سوچا کہ اگر نواب صاحب نے ناراض ہو کر تنخواہ بند کر دی تو دن میں تارے نظر آنے لگیں گے۔ ہوا یہ کہ غالب اور نواب صاحب میں کچھ فارسی الفاظ پر بحث ہو گئی۔ نواب صاحب نے ایک خط میں غالب کو لکھا کہ "ارنگ وارژنگ" متحد المعنی ہیں اور "آشیاں ساختن و بستن و چیدن" گھونسلا بنانے کے معنی میں آتا ہے۔
غالب نے نواب صاحب کو اس کے جواب میں لکھا:

"فقیر اشعار قدما کا معتقد' ان لوگوں کے کلام کا عاشق۔ مگر جو لغات ان کے کلام میں ہیں' ان کے معنی تو اہل ہندنے اپنے قیاس سے نکالے ہیں' میں ان کے قیاس پر کیوں کر تکیہ کروں۔
اب جو پیرو مرشد نے لکھا کہ "ارنگ وارژنگ" متحد المعنی اور "آشیاں ساختن و بستن و چیدن" گھونسلا بنانے کے معنی پر ہے' تو میں نے بے تکلف مان لیا' لیکن نہ ان صاحبوں کے قیاس کے بہ موجب' بلکہ اپنے خداوند نعمت کے حکم کے مطابق۔"

ظاہر ہے کہ اس خط کا نواب صاحب پر برا اثر ہوا۔ انہوں نے غالب کی تنخواہ تو بند نہیں کی لیکن پھر اپنی نثر اصلاح کے لیے غالب کو کبھی نہیں بھیجی۔
غالب وبائے عام میں نہیں مرنا چاہتے۔ وہ جب ڈاڑھی منڈواتے ہیں تو سر پر بھی استرا پھروا لیتے ہیں۔ انہیں اپنی وہ ہیئت و حالت قطعی پسند نہیں تھی' جو عام الناس کی ہو۔
خط کے لفافوں کے انتخاب میں بھی ان کی انفرادیت جلوہ گر نظر آتی ہے۔ انہیں منشی شیو نرائن آرام کے بھیجے ہوئے لفافے صرف اس لیے پسند نہیں کہ ان پر عام انداز میں "بہ مقام" اور "در مقام" اور "ماہ و تاریخ" چھپا ہوا ہے۔
یہ غالب کی انا ہی تھی جو انہیں دوستوں کو بار بار یہ لکھنے پر مجبور کرتی تھی کہ خط کے پتے پر صرف ان کا

نام اور دلی لکھا جائے۔ اگر کوئی پتا ذرا تفصیل سے لکھتا تو ناراض ہو جاتے۔ بعض اوقات اپنی ناراضگی کا اظہار بہت دلچسپ انداز میں کرتے ہیں۔ ایک دفعہ علائی کی جو شامت آئی تو غالب سے ان کا پتا پوچھ لیا۔ غالب تو بھڑک اٹھے۔ علائی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"سنو صاحب! حسن پرستوں کا ایک قاعدہ ہے کہ وہ امرد کو دو چار برس گھٹا کر دیکھتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ جوان ہے لیکن بچہ سمجھتے ہیں۔ یہ حال تمہاری قوم کا ہے۔ قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے کہ اس کی عزت اور نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت اور متحقق ہے اور تم صاحب بھی جانتے ہو مگر جب تک اس سے قطع نظر نہ کرو اور اس مسخرے کو گمنام و ذلیل نہ سمجھ لو تو تم کو چین نہ آئے گا۔ پچاس برس سے دلی میں رہتا ہوں' ہزار ہا خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ نہیں لکھتے۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ سابق کا نام لکھ دیتے ہیں۔ حکام کے خط فارسی اور انگریزی' یہاں تک کہ ولایت کے آئے ہوئے' صرف شہر کا نام اور میرا نام۔ یہ سب مراتب تم جانتے ہو اور ان خطوط کو تم دیکھ چکے ہو اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو کہ اپنا مسکن بتا۔ اگر میں تمہارے نزدیک امیر نہیں' نہ سہی' اہل حرفہ میں سے بھی نہیں ہوں کہ جب تک محلہ اور تھانہ نہ لکھا جائے' ہرکارہ میرا پتا نہ پائے۔ آپ صرف "دہلی" لکھ کر میرا نام لکھ دیا کیجئے۔ خط کے پہنچنے کا میں ضامن۔"

نواب انور الدولہ نے غالب کا پتا ذرا تفصیل سے لکھ دیا۔ دیکھیے گل افشانی گفتار:

"خط کا عنوان دیکھ کر میں سمجھا کہ شاید شہر کے محلات کی کوئی فہرست یا پڑوسیوں کے جمع و خرچ کا حساب ہے۔"——(فارسی سے ترجمہ)

غالب کی یہی انا ان کے خطوط میں بے شمار روپ دھارے نظر آتی ہے۔ یہی انفرادیت ایک طرف حسین نگار خانوں کی تخلیق کرتی ہے تو دوسری طرف اردو کو ایک نئے آب و رنگ اور نئے تب و تاب سے آشنا کرتی ہے۔

القاب و آداب

غالب نے نواب انور الدولہ شفق کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

"پیر و مرشد! یہ خط لکھنا نہیں ہے' باتیں کرنی ہیں اور یہی سبب ہے کہ میں القاب و آداب نہیں لکھتا۔"

ہمارے بعض ناقدوں نے غالب کے اس بیان سے یہ نتیجہ نکال لیا کہ غالب نے خطوط میں القاب و آداب لکھنا ترک کر دیا تھا۔ خطوط غالب کے مطالعے سے یہ بات غلط ثابت ہوتی ہے۔ مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام غالب نے ایک سو تیس خطوط میں سے صرف بیس خطوط میں القاب نہیں لکھے۔ نواب علاء الدین خاں علائی کے نام اکہتر خطوط ہیں جن میں سے صرف چھ خطوط ایسے ہیں' جن میں القاب نہیں لکھے گئے۔ میاں داد خاں سیاح کے نام

پینتیس خطوط میں ایک خط بھی ایسا نہیں جس میں القاب نہ ہو۔ میر مہدی مجروح کے نام پچاس میں سے صرف چھ' چودھری عبدالغفور سرور کے نام ستائیس میں سے دو' خواجہ غلام غوث خاں بے خبر کے نام پچیس میں سے تین اور نواب انور الدولہ شفق کے نام بیس میں سے صرف دو خطوط ایسے ہیں جو القاب سے عاری ہیں۔ گویا غالب کے القاب اور آداب کے استعمال کے بارے میں جو کچھ ہمارے نقاد کہتے رہے ہیں' وہ درست نہیں۔ دراصل غالب نے شفق کے نام خط میں جو کچھ لکھا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انہوں نے القاب لکھنا بالکل بند کر دیا بلکہ وہ کہنا چاہتے ہیں کہ لمبے لمبے' پر تکلف اور پر تصنع القاب کا استعمال انہوں نے بند کر دیا ہے۔ غالب نے "پنج آہنگ" کے آہنگ اول میں اپنا یہ موقف اس طرح بیان کیا ہے:

"مکتوب الیہ کو اس کی حیثیت کے مطابق پکارتا ہوں (یعنی القاب لکھتا ہوں) القاب اور آداب اور عافیت حشو زائد ہے۔" (فارسی سے ترجمہ)

اردو خطوط میں القاب لکھتے ہوئے غالب کا بالکل یہی رویہ ہے۔ وہ مخاطب کی حیثیت کے مطابق چھوٹا سا القاب لکھ کر' مطلب کی بات بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے خطوط کی تعداد بہت کم ہے' جن میں القاب نہیں لکھے گئے۔ عام طور سے صرف القاب پڑھ کر ہمیں مکتوب الیہ سے غالب کے ذہنی رشتے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان القابوں میں بے تکلفی' بے ساختگی اور گفتگو کا انداز ہے۔ کبھی کبھی یہ القاب خط کے مضمون کے مطابق ہوتے ہیں۔ غالب نے علائی کے نام خطوط میں حسب ذیل القاب لکھے ہیں:

"اجی مولانا علائی۔ مرزا علائی مولائی۔ میری جان۔ صاحب۔ جانا عالیشانا۔ مرزا۔ میاں۔ سعادت و اقبال نشان۔ یار بھتیجے گویا بھائی مولانا علائی وغیرہ۔"

تفتہ کے نام خطوط کے القاب ملاحظہ ہوں:

"مہاراج۔ بندہ پرور۔ کاشانہ دل کے ماہ دو ہفتہ' منشی ہرگوپال تفتہ۔ نور نظر و لخت جگر۔ اجی مرزا تفتہ۔ برخوردار۔ میرے مہربان۔"

میری مہدی مجروح کے نام ایک خط میں جو القاب لکھا ہے' اس سے خط کے مضمون کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ غالب لکھتے ہیں: "جویائے حال دہلی والور سلام لو۔" اور یہ صرف القاب ہی نہیں بلکہ ایک موضوع مصرع بھی ہے۔

غالب اپنے چھوٹوں کو مہاراج۔ سید صاحب۔ میاں۔ صاحب۔ سید فرزند دلبند۔ مرزا۔ میری جان۔ برخوردار۔ بھائی' نور چشم۔ راحت جاں۔ اقبال نشان۔ جان من۔ سعادت و اقبال نشان۔ سعادت نشانا وغیرہ جیسے القاب لکھتے ہیں۔

جب غالب اپنے ہم عمروں اور ایسے لوگوں کو خط لکھتے' جن کا کچھ سماجی وقار تھا' خواہ وہ غالب کے شاگرد ہی کیوں نہ ہوں' تو غالب القاب میں بے تکلفی سے کام نہ لیتے۔ خواجہ غلام غوث خاں بے خبر' نواب انور الدولہ شفق اور شہزادہ بشیر الدین جیسے لوگوں کو پیرو مرشد۔ بندہ پرور۔ جناب عالی۔ قبلہ و کعبہ۔ قبلہ حاجات اور خداوند نعمت جیسے القاب لکھتے ہیں:

بعض لوگ ایسے بھی تھے، جن کی سماجی حیثیت سے مرعوب ہو کر غالب طویل اور پر تصنع القاب بھی لکھتے تھے۔ نواب میر غلام بابا خاں کے نام خطوط میں غالب نے اسی طرح کے القاب لکھے ہیں:

"سبحان اللہ تعالیٰ شانہ ما اعظم برہان، جناب مستطاب، نواب میر غلام بابا خاں۔"

"ستودہ بہرزبان و نامور بہر دیار، نواب صاحب، شفیق کرم گستر، مرتضوی تبار، نواب میر غلام بابا خان بہادر۔"

"نواب صاحب، جمیل المناقب، عمیم الاحسان، عالی شان، والا دودمان، زاد مجدکم۔"

1857ء سے وفات کے وقت تک غالب کو نوابان رام پور کے نام سو روپے کی وصولیابی کی اطلاع کے لیے مہینے میں کم سے کم ایک خط لکھنا ضروری تھا۔ وہ خطوط الگ ہیں، جو غالب نے مزید روپے طلب کرنے یا کلام پر اصلاح یا دوسرے معاملات کے سلسلے میں لکھے ہیں۔ اتنے خطوط میں ہمیشہ ایک نیا القاب لکھنا غالب کے لیے بہت مشکل تھا۔ انہوں نے اس مسئلے کا حل یہ نکالا ہے کہ نواب یوسف علی خاں ناظم اور ان کی وفات کے بعد نواب کلب علی خاں کو اکثر خطوط میں "حضرت ولی نعمت آیہ رحمت سلامت" لکھا۔ صرف تین چار خطوط میں "جناب عالی"، "حضور" یا "ولی نعمت آیہ رحمت" (بغیر حضرت کے) لکھ کر اپنی قائم کردہ روایت سے انحراف کیا ہے۔

کبھی کبھی غالب القاب کو مقفیٰ کر کے شروع ہی سے پڑھنے والے کی خط میں دلچسپی قائم کر دیتے ہیں۔ نواب یوسف مرزا کو لکھتے ہیں "میری جان۔ خدا تیرا نگہبان"۔ شیخ عبداللطیف بلگرامی کو القاب لکھتے ہیں "میاں لطیف۔ مزاج شریف۔" میر سرفراز حسین کے نام خط کا آغاز ان الفاظ سے کرتے ہیں "میری جان کے چین۔ مجتمد العصر میر سرفراز حسین۔" میاں داد خاں سیاح کو ایک خط میں القاب لکھتے ہیں۔ "سعادت و اقبال نشان۔ منشی میاں داد خاں۔"

اردو خطوط نویسی کو غالب کی دین یہ نہیں ہے کہ انہوں نے القاب اور آداب لکھنے بند کر دیے بلکہ ان کی دین یہ ہے کہ ایک تو القاب کو مختصر کیا اور دوسرے القاب کو مکتوب الیہ سے اپنے ذہنی رشتے کے اظہار کا ذریعہ بنایا جس کی وجہ سے القاب میں تصنع اور تکلف کے بجائے ایک فطری انداز پیدا ہو گیا۔ اور "یہاں سب خیریت ہے اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہے۔" جیسی چیزوں سے اردو خطوط کو نجات دلائی۔

غالب کا آئین نامہ نگاری

غالب نے 20 نومبر 1855ء کے ایک خط میں قاضی عبدالجمیل جنون کو لکھا ہے:

"دوسرا سبب یہ کہ شوق خطوط کا جواب کہاں تک لکھوں اور کیا لکھوں" میں نے آئین نامہ نگاری چھوڑ کر مطلب نویسی پر مدار رکھا ہے جب مطلب ضروری التحریر نہ ہو تو کیا لکھوں۔"

یہ بات بالکل درست ہے کہ غالب کے خطوط کی بنیاد زیادہ تر مطلب نویسی پر ہے۔ غالب کوشش کرتے ہیں کہ سیدھی سادی اور مختصر زبان میں اس طرح بات کہیں کہ پڑھنے والا فوراً" ان کا مافی الضمیر سمجھ لے۔ بہ حیثیت شاعر غالب بہت مشکل پسند اور خاصے پیچیدہ ہیں۔ وہ اردو کے واحد شاعر ہیں جن کے کلام کی اتنی شرحیں

لکھی گئیں اور بہت سے اشعار کی شرح لکھتے ہوئے ان کے شارحین کے درمیان خاصا اختلاف بھی رہا۔ پھر خطوط میں غالب اتنی سادگی اور صفائی کیوں برتنا چاہتے ہیں' اس کا جواب غالب نے خود اپنے ایک فارسی خط میں دیا ہے مرزا علی بخش خاں کو لکھتے سے لکھتے ہیں:

"مطالب بہت زیادہ ہیں اور پیچیدہ ہیں۔ چاہتا ہوں کہ کم سے کم لفظوں میں اپنی بات کہہ دوں اور تحریر کو تقریر کا آئینہ بنا دوں۔ غور کیجئے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میرا مقصود کیا ہے اور آپ کو اس سلسلے میں کیا کرنا ہے۔" (فارسی سے ترجمہ)

غالب نے ایک اور فارسی خط میں مرزا علی بخش خاں کو لکھا ہے:

"جان برادر! بات کو خواہ مخواہ طول دینے سے اثر بھی کم رہ جاتا ہے' اور پیچیدگیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں' اس لیے چاہتا ہوں کہ بات کو مختصر کر کے موثر بناؤں اور سننے والا بھی بات کی تہہ تک جلد پہنچ جائے۔ محض کار برآری پر آمادہ کرنا کوئی مقصد نہیں ہے مگر ایسی صورت میں جب کہ کہنے والا یہ کوشش کرے کہ تحریر تکلم سے اتنی اجنبی نہ ہو کہ تحریر و تکلم میں باہم دگر نسبت اور یوستگی باقی نہ رہے اور ایک کا عکس دوسرے کے چہرے پر نہ پڑ سکے۔" (فارسی سے ترجمہ)

اگر کوئی دوست یا شاگرد غالب کو ایسا خط لکھتا جس میں ژولیدہ بیانی ہوتی اور مطلب کی باتوں کے بجائے ادھر اودھر کی بے مقصد باتیں کی گئی ہوتیں تو غالب ناراض ہو جاتے۔ میری مہدی مجروح نے ایک خط میں نہ جانے کون سے ایسے واقعات اور کون سی ایسی باتیں لکھ دیں' جن میں غالب کو دلچسپی نہیں تھی۔ خط پڑھ کر غالب کتنے بے مزہ ہوئے' اس کا اندازہ مجروح کے نام خط کی اس دلچسپ عبارت سے لگایئے:

"واہ حضرت! کیا خط لکھا ہے۔ اس خرافات کے لکھنے کا فائدہ؟ بات اتنی ہی ہے کہ میرا پلنگ مجھ کو ملا۔ میرا بچھونا مجھ کو ملا۔ میرا حمام مجھ کو ملا۔ میرا بیت الخلاء مجھ کو ملا۔ رات کا وہ شور' کوئی آئیو' کوئی آئیو' فرد ہو گیا۔ میری جان بچی۔ میرے آدمیوں کی جان بچی۔"

بنام میر مہدی مجروح

غالب خطوط نویسی میں سادگی بیان پر بہت زور دیتے۔ انھیں خطوط میں پرتصنع اور پرتکلف عبارت ہرگز پسند نہیں تھی۔ غالب نے میر مہدی مجروح کو خط لکھا' جس میں سیدھی سادی زبان میں مطلب کی باتیں لکھ دیں۔ خط غالباً مختصر تھا۔ مجروح نے خط کے مختصر ہونے کی شکایت لکھی۔ غالب نے بہت دلچسپ انداز میں اس شکایت کا جواب ان الفاظ میں لکھا:

"ہاں صاحب! تم کیا چاہتے ہو؟ مجتہد العصر کے مسودے کو اصلاح دے کر بھیج دیا' اب اور کیا لکھوں؟ تم میرے ہم عمر نہیں' جو سلام لکھوں۔ میں فقیر نہیں جو دعا لکھوں' تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ لفافے کو کریدا کرو۔ مسودے کو بار بار دیکھا کرو۔ پاؤ گے کیا؟ یعنی تم کو وہ محمد شاہی

روشیں پسند ہیں۔ یہاں خیریت ہے' وہاں کی عافیت مطلوب ہے۔ خط تمہارا بہت دن کے بعد پہنچا۔ جی خوش ہوا۔ مسودہ بعد اصلاح کے بھیجا جاتا ہے۔ برخوردار میر سرفراز حسین کو دینا اور دعا کہنا اور ہاں حکیم میر اشرف علی اور میر افضل علی کو بھی دعا کہنا۔ لازمہ سعادت مندی یہ ہے کہ ہمیشہ اسی طرح خط بھیجتے رہو۔"

"کیوں پچ کہو' اگلوں کے خطوط کی تحریر کی یہی طرز تھی یا اور۔ ہائے' کیا اچھا شیوہ ہے۔ جب تک یوں نہ لکھو' وہ خط ہی نہیں ہے۔ چاہ بے آب ہے' ابر بے باراں ہے۔ نخل بے میوہ ہے۔ خانہ بے چراغ ہے۔ چراغ بے نور ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تم زندہ ہو۔ تم جانتے ہو کہ ہم زندہ ہیں۔ امر ضروری کو لکھ لیا۔ زوائد کو اور وقت پر موقوف رکھا اور اگر تمہاری خوشنودی اسی طرح کی نگارش پر منحصر ہے تو بھائی ساڑھے تین سطریں ویسی بھی میں نے لکھ دیں۔ کیا نماز قضا نہیں پڑھتے اور وہ مقبول نہیں ہوتی؟ خیر ہم نے بھی وہ عبارت جو مسودے کے ساتھ نہیں لکھی تھی' اب لکھ بھیجی۔ قصور معاف کرو' خفا نہ ہو۔"

بنام میر مہدی مجروح

مرزا حاتم علی مہر نے غالب کو خط لکھا اور اس میں محمد شاہی روشوں سے کام لیا۔ غالب نے ان کے خط کا جواب دیا ہے' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مہر کے خط میں پر شکوہ الفاظ اور پر تصنع عبارت تو تھی لیکن کوئی ایسی بات نہیں تھی جو غالب کے لیے دلچسپی کا باعث ہو۔ جس پر غالب نے برافروختہ ہو کر لیکن بہت دلچسپ انداز میں اس خط کا جواب دیا۔ لکھتے ہیں:

"اگر تم مناسب جانو' تو ایک بات میری مانو' رقعات عالم گیری یا انشائے خلیفہ اپنے سامنے رکھ لیا کرو۔ جو عبارت اس میں سے پسند آیا کرے' وہ خط میں لکھ دیا کرو۔ خط مفت میں تمام ہو جایا کرے گا اور تمہارے خط کے آنے کا نام ہو جایا کرے گا۔"

بنام مرزا حاتم علی مہر

اب تک غالب کے خطوط کے جو اقتباسات پیش کیے گئے' ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید غالب "شوقیہ خطوط" لکھنے کے خلاف تھے اور انہوں نے اپنے عہد کے مروجہ آئین نامہ نگاری کو ترک کر کے صرف مطلب نویسی پر ہی اپنے خطوط کی بنیاد رکھی تھی۔ لیکن یہ بات سوفیصدی درست نہیں۔ غالب نے بہت بڑی تعداد میں "شوقیہ خطوط" بھی لکھے ہیں اور اپنے شاگردوں اور دوستوں سے' ایسے خطوط کا مطالبہ بھی کیا ہے۔ دراصل غالب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ضروری نہیں کہ مکتوب نگار خط میں صرف "مطلب نویسی" کرے' یعنی "اپنے مقصد بر آری" کے لیے خط لکھے اور باتیں بھی لکھے لیکن صرف ایسی باتیں کہ جن میں مکتوب الیہ کو دلچسپی ہو۔ غالب ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ دوسرے لوگ غالب کو صرف مطلب کی باتوں کے علاوہ اور کچھ نہ لکھیں۔ انہوں نے تفتہ اور دوسرے لوگوں کو بار بار تاکید کی ہے کہ اپنی خیریت کے خطوط بار بار بھیجتے رہا کریں۔ تفتہ کو لکھتے ہیں:

"سنو صاحب! اپنے پر لازم کرلو' ہر مہینے میں ایک خط مجھ کو لکھنا۔ اگر کچھ کام آ پڑا' دو خط' تین خط' ورنہ صرف خیرو عافیت لکھی اور ہر مہینے میں ایک بار بھیج دی۔"

مرزا ہرگوپال تفتہ

ظاہر ہے کہ جب آدمی اپنی خیریت و عافیت کی اطلاع دینے کے لیے خط لکھے گا تو اس میں صرف مطلب نویسی اور مقصد نویسی کہاں سے آئے گی۔

خطوط میں مکالمہ نویسی

1857ء کے نام انقلاب کا غالب کی زندگی پر سب سے برا اثر یہ پڑا کہ وہ تنہا رہ گئے۔ دوست' عزیز' شاگرد اور دوسرے ملنے والوں میں بے بیشتر مارے گئے' باقی فرار ہوگئے۔ اپنی اس تنہائی کا غالب نے کیسے درد انگیز انداز میں ذکر کیا ہے۔

"وہی بالا خانہ۔ اور وہی میں ہوں۔ سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے' وہ میر سرفراز حسین آئے' وہ یوسف مرزا آئے' وہ میرن آئے' وہ یوسف علی خاں آئے۔ مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا۔ بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ کہتے ہیں۔ اللہ اللہ ہزاروں کا ماتم وار ہوں' میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا۔"

میر سرفراز حسین:

"مجھ سے کیوں خفا ہو؟ آج مہینا بھر ہوگیا ہوگا' یا بعد دو چار دن کے ہو جائے گا کہ آپ کا خط نہیں آیا۔ انصاف کرو کتنا کثیر الاحباب آدمی تھا۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں۔ اب یاروں میں ایک شیو جی رام برہمن اور بال مکند اس کا بیٹا' یہ دو شخص ہیں کہ گاہ گاہ آتے ہیں۔"

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ

غالب نے خطوط کے ذریعے اپنی خلوت میں جلوت اور اپنی تنہائی میں انجمن کی سی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ دن کا بڑا حصہ خط پڑھنے' ان کا جواب لکھنے اور لفافے بنانے میں صرف ہو جاتا۔ غالب اپنی اس مصروفیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میں اس تنہائی میں صرف خطوط کے بھروسے پر جیتا ہوں۔ یعنی جس کا خط آیا' میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا..... دن ان (خطوط) کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے۔"

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ

غالب خطوط نویسی کو گفتگو کا بدل سمجھتے ہیں اردو میں باقاعدہ خطوط نویسی سے بہت قبل غالب کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ خط میں تحریر کو تقریر کا آئینہ ہونا چاہیے۔ (غالب نے علی بخش خاں کے نام جس فارسی خط میں یہ بات کہی تھی اس کا اقتباس پہلے نقل کیا جا چکا ہے) اور اردو خطوط میں تو غالب نے بارہا اس بات کو دہرایا ہے۔

"اسی وقت تمہارا ایک خط اور یوسف مرزا کا ایک خط آیا۔ مجھ کو جو باتیں کرنے کا مزہ ملا تو دونوں کا جواب لکھ کر روانہ کیا۔"

بنام میر مہدی مجروح

"میں نے آسان راستہ اختیار کر لیا ہے۔ جو بھی لکھتا ہوں' اردو میں لکھتا ہوں۔ نہ سخن آرائی نہ خود نمائی تحریر کو گفتگو بنالیا ہے۔" (فارسی سے ترجمہ)

بنام منشی نول کشور

خطوط کے ذریعے اس گفتگو کو غالب "مکالمہ" کہتے ہیں۔ مرزا تفتہ کا بہت دن سے خط نہیں آیا۔ غالب ایک خط میں اس کی شکایت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"میں تمہارے اور بھائی منشی نبی بخش صاحب اور جناب مرزا حاتم علی صاحب کے خطوط کے آنے کو' تمہارا اور ان کا آنا سمجھتا ہوں۔ تحریر گویا وہ مکالمہ ہے' جو باہم ہوا کرتا ہے۔ پھر تم کو' مکالمہ کیوں موقوف ہے۔"

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ

اب خطوط غالب کے کچھ اور اقتباسات ملاحظہ ہوں' جن میں غالب نے مراسلے کو مکالمہ کہا ہے:

"بھائی! مجھ کو اس معیت میں کیا ہنسی آتی ہے کہ ہم تم اور مرزا تفتہ میں مراسلت و مکالمت ہوگئی ہے۔ روز باتیں کرتے ہیں۔ اللہ اللہ یہ دن بھی یاد آئیں گے۔"

بنام مرزا حاتم علی مہر

"مرزا صاحب! میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بہ زبان قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔"

بنام مرزا حاتم علی مہر

"بھائی! مجھ میں تم میں نامہ نگاری کاہے کو ہے' مکالمہ ہے۔"

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ

"یہ میں باتیں کر رہا ہوں۔ خط نہیں لکھتا۔ مگر افسوس کہ اس گفتگو میں وہ لطف نہیں' جو مکالمہ زبانی میں ہوتا ہے۔ یعنی میں ہی بک رہا ہوں۔ تم کچھ نہیں کہتے۔"

بنام منشی نبی بخش حقیر

یہ چار اقتباسات اس لیے نقل کیے گئے ہیں کہ خطوط میں غالب نے جو "مکالمہ" کا لفظ استعمال کیا ہے' اسے بعض نقادوں نے ڈرامے کے ڈائیلاگ کے مفہوم میں سمجھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ غالب نے خطوط نویسی و مکالمہ یعنی ڈائیلاگ بنا دیا ہے۔ ایسا نہیں ہے' مکالمے سے غالب کی مراد محض "گفتگو" ہے۔ جیسا کہ ان چاروں اقتباسات سے ثابت ہوتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ غالب نے خطوط میں باقاعدہ مکالمے بھی لکھے ہیں مگر سینکڑوں خطوط

میں سے صرف چار یا پانچ میں غالب نے اپنی بات مکالمے کے انداز میں بہت خوبصورت طریقے سے کہی ہے۔ اگر یہی باتیں بیانیہ انداز میں کہی جاتیں تو شاید ان میں وہ لطف نہ پیدا ہوتا۔ پیرجی سے غالب کی جو گفتگو ہوئی تھی اسے کس خوبصورت پیرائے میں بیان کرتے ہیں:

"پیرجی سے جب پوچھتا ہوں کہ تم خوب شخص ہو اور وہ کہتے ہیں "کیا کہتا ہے" اور میں پوچھتا ہوں "کس کا؟" تو وہ فرماتے ہیں "مرزا شمشاد علی بیگ کا"۔

ایں' اور کسی کا نام تم کیوں نہیں لیتے؟ دیکھو یوسف علی خاں بیٹھے ہیں۔ ہیرا سنگھ موجود ہے۔

واہ صاحب' میں کیا خوشامدی ہوں' جو منہ دیکھی کہوں۔ میرا شیوہ حفظ الغیب ہے۔ غائب کی تعریف کرنی کیا عیب ہے۔

ہاں صاحب! آپ ایسے ہی وضع دار ہیں اس میں کیا ریب ہے۔

بنام نواب علاء الدین خاں علائی

ایک خط میں صرف تین مکالمے ہیں۔ باقی بات کہی گئی ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ محمد علی بیگ آئے تو میں نے ان سے لوہارو کی سواریوں کے بارے میں پوچھا:

"بھئی محمد علی بیگ' لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں؟

حضرت! ابھی نہیں۔

کیا آج نہ جائیں گی؟

آج ضرور جائیں گی' تیاری ہو رہی ہے۔"

بنام نواب علاء الدین خاں علائی

ان مکالموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کی تحریروں میں شعوری کوششوں کو دخل نہیں ہے۔ خط لکھتے لکھتے مکالموں کا انداز سمجھ میں آیا اور برجستہ لکھ دیے۔ لیکن میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں غالب نے طویل مکالمہ لکھا ہے۔ اس مکالمے کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے "اے جناب میرن صاحب' السلام علیکم" اس مکالمے میں چوں کہ شعوری کوشش کا دخل ہے اس لیے اس میں تصنع آگیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ غالب نے اس طرح کے مکالمے اور نہیں لکھے۔

غالب کا ہے انداز بیاں اور

اسلوب' زبان کے اس غیر روایتی اور غیر رسمی استعمال کا نام ہے جو زبان کے عام اور مخصوص معیار سے مختلف ہو۔ مثال کے طور پر اگر یہ کہا جائے کہ "ان کا انتقال ہو گیا۔" تو گویا یہ زبان کا روایتی اور رسمی استعمال ہے۔ اس میں کسی کی وفات کی اطلاع دینے کے لیے مخصوص معیاری الفاظ سے فقرے کی ساخت ہوئی ہے۔ یہی بات جب غالب ان الفاظ میں لکھتے ہیں: "ہائے ہائے وہ نہ بچی۔"

تو اس میں غالب کا اپنا اسلوب بھی شامل ہو گیا۔ اب یہ محض اطلاع نہیں رہی بلکہ اس میں غالب کی نفسیاتی' سماجی

اور ادبی شخصیت بھی شامل ہے۔ مرنے والے سے غالب کا ذہنی رشتہ' منشی نبی بخش حقیر (جن کے نام خط میں یہ فقرہ لکھا گیا) سے غالب کے تعلقات' غالب کے احساس اور جذبہ' اس موقع پر استعمال ہونے والی مخصوص معیاری زبان سے انحراف' لفظ "ہائے" کا استعمال اور پھر "ہائے" کی تکرار' "اس کا انتقال ہو گیا" کے بجائے "وہ نہ بچی" لکھنا۔ غرض ان سب چیزوں نے مل کر اس چھوٹے سے فقرے کو ایک اسلوب دیا ہے۔

یہاں زبان کے ان تمام اجزاء کا جائزہ لینا ممکن نہیں' جن سے اسلوب بنتا ہے۔ مختصر یہ کہ زبان کی مخصوص صرفی و نحوی ترتیب مفہوم کی ادائیگی کے لیے مخصوص الفاظ کا استعمال جو متروک ہو گئے ہوں' یا زبان میں کم استعمال ہوتے ہوں یا تحریر میں نہیں' صرف گفتگو میں مستعمل ہوں۔ کسی دوسری زبان کے الفاظ کا استعمال' الفاظ کی تکرار' بعض کلیدی الفاظ کا بہ کثرت استعمال اور ضائع و بدائع سے مل کر کسی شاعر یا ادیب کا اسلوب بنتا ہے۔

اسلوب تحریر میں بھی ہوتا ہے اور تقریر میں بھی اور دونوں کی خصوصیات ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتی ہیں۔ گفتگو میں قواعد زبان اور صرف و نحو کی پابندی اس طرح نہیں کی جاتی جس طرح تحریر میں کی جاتی ہے گفتگو میں عام طور سے فقروں کی صرفی و نحوی ساخت بہت زیادہ بدل جاتی ہے' کیوں کہ بولنے والا آنکھوں اور ہاتھوں کے اشاروں اور چہرے کے اتار چڑھاؤ سے بھی اپنے مقصد کے اظہار میں مدد لیتا ہے۔ گفتگو یا تقریر میں بولنے والا کسی ایک فرد یا ایک گروہ سے مخاطب ہوتا ہے' اس لیے وہ اس فرد یا گروہ کی ذہنی صلاحیتوں اور فہم و ادراک کی قوتوں کے پیش نظر الفاظ کا استعمال کرتا ہے۔ گفتگو میں جملے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں اور ان میں صیغہ امر' استفہامیہ اور فجائیہ جملوں اور ندائیہ الفاظ کی کثرت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس تحریری اسلوب میں عام طور سے طویل' توضیحی اور مرکب جملے ہوتے ہیں۔

تحریر میں سوچنے' دماغ پر زور ڈالنے' الفاظ کا انتخاب کرنے' ایک فقرے یا لفظ کو قلم زد کر کے اس کا متبادل لکھنے کے مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ جب کہ تقریر یا گفتگو میں فقروں کی ساخت الفاظ کا انتخاب' تشبیہات و استعارات وغیرہ کا استعمال برجستہ فی البدیہہ اور کچھ حد تک غیر شعوری ہوتا ہے۔ تحریر میں ذہنی مشقت کی ضرورت ہوتی ہے' جب کہ تقریر میں محنت کی ضرورت نہیں۔ بے تکلف مکتوب نگاری تحریر اور تقریر کے درمیان کی چیز ہے۔ درمیان کی چیز اس لیے کہ ایک تو خط لکھتے وقت مکتوب نگار کو اتنی ذہنی مشقت اور محنت نہیں کرنی پڑتی جتنی کہ عام نثر لکھنے میں کرنی پڑتی ہے اور دوسرے اس میں عام گفتگو کے مقابلے میں سطح کچھ بلند ہوتی ہے۔ گفتگو میں سوچ سوچ کر بولنے کا موقع نہیں ہوتا جب کہ خط لکھتے ہوئے مکتوب نگار ٹھہر ٹھہر کر اور سوچ سوچ کر لکھ سکتا ہے۔

اردو مکتوب نگاری کے دور میں غالب اوسطاً دو صفحے روز خطوط کی شکل میں لکھتے تھے' لیکن اردو نثر میں دیباچے اور تقریظیں لکھتے ہوئے بہت گھبراتے تھے۔ کیوں کہ بہ قول ان کے' ان میں "ذہنی مشقت" کی استعداد نہیں رہی تھی۔ اگرچہ ابتداء میں غالب پسند نہیں کرتے تھے کہ ان کے اردو خطوط شائع کیے جائیں لیکن کچھ عرصے بعد وہ کوشش کر رہے تھے کہ ان کے خطوط کا مجموعہ جلد چھپ جائے۔ ان حالات میں بھی جب خواجہ غلام غوث خاں بے خبر نے خطوط غالب پر دیباچہ لکھنے کی فرمائش کی تو غالب نے اپنی بیماری کا بہانہ کر کے ٹال دیا۔

کچھ دن بعد بے خبرنے پھر تقاضا کیا تو غالب جواب دیتے ہیں:

"اگر ایک بندۂ قدیم' کہ عمر بھر فرماں پذیر رہا ہو' بڑھاپے میں ایک حکم بجانہ لاوے' تو مجرم نہیں ہو جاتا۔ مجموعہ نثر اردو کا انطباع اگر میرے لکھے ہوئے دیباچہ پر موقوف ہے' تو اس مجموعے کا چھپ جانا بالفتح میں نہیں چاہتا بلکہ چھپ جانا بالضم چاہتا ہوں۔"

غالب خطوط لکھنے میں غیر معمولی دلچسپی لیتے تھے۔ لیکن اردو اور فارسی نثر لکھنے سے اتنا کتراتے تھے کہ کبھی کبھی اپنے عزیز شاگردوں کو سخت سست بھی کہہ دیا کرتے تھے۔ مرزا ہرگوپال تفتہ نے جب اپنے دوسرے دیوان کی تقریظ کی فرمائش کی تو غالب اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں:

"دیباچہ و تقریظ کا لکھنا ایسا آسان نہیں ہے کہ جیسا تم کو دیوان کا لکھ لینا کیوں روپیہ خراب کرتے ہو اور کیوں چھپواتے ہو..... اب یہ دیوان چھپوا کر اور تیسرے دیوان کی فکر میں پڑو گے۔ تم تو دو چار برس میں ایک دیوان کہہ لوگے' میں کہاں تک دیباچہ لکھا کروں گا۔"

مکتوب نگاری غالب کو اتنی پسند تھی کہ بہ قول ان کے بیشتر وقت خط لکھنے اور پڑھنے میں صرف ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خطوط کے ذریعے بہت سے لوگوں سے رابطہ بنا رہتا اور ذہنی مشقت بھی نہ کرنی پڑتی۔ ان خطوط میں غالب کی تخلیقی قوتوں کو بہت وسیع میدان مل گیا تھا۔ ایسا میدان جس میں غالب اپنی شعری صلاحیتوں کا اظہار کر کے نثر میں جادو جگا سکتے تھے۔ روز مرہ کے مسائل پر گفتگو کر سکتے تھے۔ سیاسی اور سماجی حالات پر تبصرہ کر سکتے تھے' اور مرقع کشی و کردار نگاری کے فن کا مظاہرہ کر سکتے تھے۔

اگرچہ فورٹ ولیم کالج میں اردو نثر سادہ اور سلیس ہونی شروع ہو گئی تھی لیکن نثر کی سادگی کا حسن غالب ہی کے ہاتھوں نکھرا۔ غالب چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی سے بڑی بات کہنے پر قادر ہیں۔ ان جملوں کی ساخت سے اثر آفرینی میں اضافہ ہوتا ہے۔ غالب جو بات کہنا چاہتے ہیں' وہ مخاطب کے ذہنشین ہو جاتی ہے۔ مرزا علاء الدین خاں علائی کے نام ایک خط کا یہ حصہ ملاحظہ ہو۔ اس خط میں غالب نے کیسی خوبصورت مرقع کشی کے سہارے اپنی مصیبت بیان کی ہے۔ جملے چھوٹے چھوٹے ہیں۔ جہاں حروف عطف کے سہارے دو جملوں کو ملایا ہے وہاں بھی عبارت میں پیچیدگی پیدا ہونے نہیں دی:

"میاں! میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔ پاخانہ ڈھ گیا' چھتیں ٹپک رہی ہیں۔ تمہاری پھوپھی کہتی ہیں' ہائے دبی! ہائے مری دیوان خانے کا حال محل سرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا' فقدان راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہے' ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیوں کر کرے؟ مینہ کھلے تو سب کچھ ہو' اور پھر اثنائے مرمت میں بیٹھا کس طرح رہوں۔ اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک' بھائی سے مجھ کو وہ حویلی' جس میں میر حسن رہتے تھے' اپنی پھوپھی کے رہنے کو اور کوٹھی میں سے وہ بالا خانہ مع دالان زیریں جو الٰہی بخش خاں مرحوم کا مسکن تھا' میرے

رہنے کو دلوا دو۔ برسات گزر جائے گی، مرمت ہو جائے گی، پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں آ رہیں گے۔"

غالب کے چھوٹے جملے عام طور سے چار لفظوں سے لے کر سات لفظوں تک کے ہوتے ہیں۔ وہ جملہ طویل ہوتا ہے، جس میں وضاحت کے طور پر فقرے شامل ہوتے ہیں۔ اس اقتباس میں جس جملے کی ابتدا "اگر تم سے ہو سکے" سے ہوتی ہے، طویل ہے۔ اس میں حویلی اور بالا خانے کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس سے کم لفظوں میں یہ وضاحت ممکن نہیں تھی اور پھر بات اس طرح کہی گئی ہے کہ مخاطب کے ذہن میں کسی طرح کی پیچیدگی پیدا نہیں ہوتی۔

غالب کے بیشتر خطوط تقریر اور تحریر کے درمیان کی چیز ہیں۔ ندائیہ الفاظ، بیانیہ اور خطیبانہ انداز اختیار کر کے غالب اپنے خطوط کو تقریر اور گفتگو سے اتنا قریب کر دیتے ہیں کہ مجلسی اور اجتماعی فضا پیدا ہو جاتی ہے اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ غالب مکتوب الیہ ہی کو نہیں بلکہ بہت سے افراد کو مخاطب کر رہے ہیں۔ ایسے خطوط کی تعداد بھی خاصی ہے جنہیں پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ غالب انیسویں صدی کے مجروح، علائی یا تفتہ وغیرہ سے نہیں بلکہ براہ راست ہم سے مخاطب ہیں۔ ان خطوط میں غالب روز مرہ، محاوروں، کہاوتوں، تشبیہوں، استعاروں، فارسی ترکیبوں اور اردو و فارسی شعروں کا استعمال اس لیے نہیں کرتے کہ انہیں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار مقصود ہے بلکہ اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اپنی بات زیادہ سے زیادہ وضاحت کے ساتھ اور موثر طریقے سے مکتوب الیہ تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ اسی کوشش نے خطوط غالب کے ادبی حسن کو چمکایا ہے اور ان کی آواز میں وہ انفرادیت پیدا کی ہے کہ آج بھی ہزاروں آوازوں میں ان کی آواز اپنی شناخت قائم کی ہوئی ہے۔

اب نواب علاؤ الدین خاں علائی کے نام غالب کے خط کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"کل تمہارے خط میں دوبارہ یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلی بڑا شہر ہے، ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ اے میری جان! یہ وہ دلی نہیں ہے، جس میں تم پیدا ہوئے ہو۔ وہ دلی نہیں ہے، جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے۔ وہ دلی نہیں ہے، جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے۔ وہ دلی نہیں ہے، جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں۔ وہ دلی نہیں ہے، جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک کیمپ ہے: مسلمان: اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ۔ باقی سراسر ہنود۔ معزول بادشاہ کے ذکور، جو بقیۃ السیف ہیں، وہ پانچ پانچ روپیہ مہینا پاتے ہیں۔ اناث میں سے جو پیرزن ہیں، وہ کٹنیاں اور جوانیں کسیاں امرائے اسلام میں اے اموات گنو۔ حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا سو روپے روز کا پنسن دار، سو روپے مہینے کا روزینہ دار بن کر نامرادانہ مرگیا۔ میر نصیر الدین، باپ کی طرف سے پیرزادہ، نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان، بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا تھا، بیمار پڑا۔ نہ دوا، نہ غذا، انجام کار مرگیا۔ تمہارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین

ہوئی۔ احیاء کو پوچھو' ناظر حسین مرزا' جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا' اس کے پاس ایک پیسا نہیں' ٹکے کی آمد نہیں۔ مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے' مگر دیکھیے چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڑھے صاحب' ساری املاک بیچ کر' نوش جان کر کے' بیک بینی و دوگوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدولہ کی پانسو روپے کرایے کی املاک واگذاشت ہو کر پھر قرق ہو گئی تباہ' خراب لاہور گیا' وہاں پڑا ہوا ہے۔ دیکھئے' کیا ہوتا ہے؟ قصہ کوتاہ' قلعہ اور جھجر اور بہادر گڑھ اور بلب گڑھ اور فرخ نگر' کم و بیش تیس لاکھ روپے کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر کی امارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہنرمند آدمی یہاں کیوں پایا جاوے۔" ____ بنام نواب علاؤ الدین خاں علائی

اس خط میں "اے میری جان" کے خطابیہ الفاظ اور پھر" وہ دلی نہیں ہے" کی پانچ بار تکرار سے گفتگو اور تقریر اور براہ راست مخاطب کرنے کا انداز پیدا ہوگیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں ایسے واقعات بیان کیے گئے ہیں' جن کے لیے سینکڑوں صفحے درکار ہیں۔ حسن علی خاں' میر نصیر الدین' آغا سلطان کی وفات کی خبر مختصر لفظوں میں دی ہے۔ اس اختصار میں مرنے والے کا تعارف' اس کی سماجی حیثیت اور موت کی وجہ' غرض سب ہی کچھ شامل ہے۔ مثال کے طور پر اس اقتباس کا یہ جملہ لیجئے "میر نصیر الدین' باپ کی طرف سے پیرزادہ' نانا اور نانی کی طرف سے امیر زادہ' مظلوم مارا گیا۔" اس فقرے میں غالب نے میر نصیر الدین کا تعارف کراتے ہوئے بتایا ہے کہ وہ صاحب طریقت بھی تھا اور دولت مند بھی۔ "مظلوم مارا گیا۔" ان تین فقروں میں غالب نے بتایا ہے کہ ہنگامہ 1857ء میں میر نصیر الدین بے قصور تھا۔ پھر بھی خاکیوں کی گولی کا نشانہ بنا۔ "مظلوم" کے لفظ کے استعمال سے اپنے جذبات اور احساسات اور میر نصیر الدین سے اپنی ہمدردی کا بالواسطہ طور پر کیسے موثر انداز میں اظہار کیا ہے۔ اس اقتباس کا ایک فقرہ اور لیجیے۔ "(بادشاہ کے) اناث میں سے جو پیرزن ہیں' وہ کٹنیاں اور جوانیں کسبیاں۔" فروری 1862ء کی اجڑی ہوئی دلی' خاندان تیموریہ کی معاشی بدحالی' برطانوی سامراج کے ظلم و ستم کی داستان کو اس سے زیادہ مختصر' درد انگیز اور موثر انداز میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔ غالب نے پورے خط میں ہندوستانیوں سے اپنی ہمدردی اور برطانوی سامراج کے خلاف براہ راست ایک لفظ بھی نہیں کہا لیکن واقعات کے بیان کے لیے ایسے الفاظ کا انتخاب کیا ہے کہ غالب کے ذہنی اور روحانی کرب کو مکمل طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہی وہ تمام خصوصیات ہیں جنہوں نے غالب کے اسلوب کو انفرادیت بخشی ہے۔

مقفی عبارتیں

جب کوئی نثر نگار خوبصورت لفظوں' ترکیبوں اور محاوروں' تشبیہوں اور استعاروں سے نثر کو رنگین اور دلکش بنانے کی کوشش کرتا ہے یا اسے مقفی اور مسجع کر کے اس میں شعریت کا جادو جگانا چاہتا ہے تو عام طور سے عبارت کا مفہوم الفاظ کے اس انبار میں گم ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ مقفی یا پرتکلف عبارت لکھتے وقت الفاظ' لکھنے والے کے بس میں اتنے نہیں ہوتے جتنا خود لکھنے والا الفاظ کے بس میں ہوتا ہے۔ خوبصورت اور دلکش الفاظ بھی

کبھی لکھنے والے کے ذہن اور اس کے قلم کو بہکا کر کہیں کا کہیں لے جاتے ہیں۔ اس معاملے میں غالب بہت محتاط ہیں' انہیں چوں کہ نظم و نثر دونوں میں اظہار پر پوری قدرت حاصل ہے' اس لیے وہ اپنے ذہن کی باگ ڈور کبھی الفاظ کے ہاتھ میں نہیں دیتے۔ غالب کے ایسے اردو خطوط کی تعداد بہت کم ہے جو پورے کے پورے مقفیٰ ہوں' عام طور سے خط میں دو تین فقرے ہی مقفیٰ ہوتے ہیں اور یہ مقفیٰ فقرے ایسی برجستگی اور بے ساختگی کے ساتھ آتے ہیں کہ ان سے نثر کے حسن میں اضافہ اور اظہار میں زور ہی پیدا ہوتا ہے۔ غالب نے صرف وہی خطوط مکمل طور پر مقفیٰ عبارت میں لکھے ہیں جن میں ان کے پاس کہنے کے لیے کوئی خاص بات نہیں ہے اور خط لکھنا ضروری ہے۔ ان خطوط میں بھی غالب یہ خیال رکھتے ہیں کہ ایسے الفاظ اور فقروں کی تعداد کم سے کم ہو' جو عبارت کو مقفیٰ کرنے کی وجہ سے مجبوراً لکھنے پڑتے ہیں۔

چودھری عبدالغفور سرور کے نام غالب نے ایک مقفیٰ خط لکھا ہے۔ اس کا پہلا پیراگراف ملاحظہ ہو:

"بہت دن کے بعد پرسوں آپ کا خط آیا۔ سرنامے پر دستخط اور کے اور نام آپ کا پایا۔ دستخط دیکھ کر مفہوم ہوا' خط کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ تمہارے دشمن بہ عارضہ تپ و لرزہ رنجور ہیں۔ الله الله' ضعف کی یہ شدت کہ خط کے لکھنے سے معذور ہیں۔ خدا وہ دن دکھائے کہ تمہارے خط تمہارے دستخطی آئے' سرنامہ دیکھ کر دل کو فرحت ہو' خط پڑھ کر دونی مسرت ہو۔ جب تک ایسا خط نہ آئے گا' دل سودا زدہ آرام نہ پائے گا۔ قاصد ڈاک کی راہ دیکھتا رہوں گا۔ جناب ایزدی میں سرگرم دعا رہوں گا۔"

غالب مقفیٰ عبارت لکھتے ہوئے بھی پورا خیال رکھتے ہیں کہ اصل مقصد فوت نہ ہو جائے' اس لیے ان کی اکثر مقفیٰ عبارتیں ایسی ہیں کہ کچھ فقرے مقفیٰ ہیں اور کچھ غیر مقفیٰ۔ اس طرح عبارت بھی خوبصورت ہو گئی اور مفہوم الفاظ کی نذر بھی نہیں ہوا۔ ایک خط کا یہ حصہ ملاحظہ ہو:

"پیرو مرشد کو میری بندگی اور صاحبزادوں کو دعا۔ خداوند مجھے مارہرہ بلاتے ہیں اور میرا قصد مجھے یاد دلاتے ہیں۔ ان دنوں میں کہ دل بھی تھا اور طاقت بھی تھی' شیخ محسن الدین مرحوم سے یہ طریق تمنا کہا گیا تھا کہ جی یوں چاہتا ہے کہ برسات میں مارہرہ جاؤں اور دل کھول کر اور پیٹ بھر کر آم کھاؤں۔ اب وہ دل کہاں سے لاؤں' طاقت کہاں سے پاؤں' نہ آموں کی طرف وہ رغبت' نہ معدے میں اتنے آموں کی گنجائش۔ نہار منہ میں آم نہ کھاتا تھا۔ کھانے کے بعد میں آم نہ کھاتا تھا۔ رات کو کچھ کھاتا ہی نہیں' جو کہوں بین العشائین ہاں' آخر روز بعد ہضم معدے' آم کھانے بیٹھ جاتا تھا۔ بے تکلف عرض کرتا ہوں اتنے آم کھاتا تھا' پیٹ اپھر جاتا تھا اور دام پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ اب بھی اسی وقت کھاتا ہوں مگر دس بارہ اگر پیوندی آم بڑے ہوئے تو پانچ سات۔"

بنام چودھری عبدالغفور سرور

غالب جس بات پر زور دینا چاہتے ہیں' اسے کبھی کبھی مقفی کر کے مکتوب الیہ کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کراتے ہیں۔ غالب "دستنبو" کی طباعت کے لیے بہت پریشان تھے۔ خاص طور سے ان چھ سات جلدوں کی تیاری میں انہوں نے اپنا خون پسینہ ایک کر رکھا تھا جو وہ ملکہ معظمہ اور حکام اعلیٰ کو مطلب برآری کے لیے بھیجنا چاہتے تھے۔ بار بار ان جلدوں کے بارے میں مرزا ہرگوپال تفتہ اور مرزا حاتم علی مہر کو لکھ رہے تھے۔ غالب کو خیال آیا کہ یہ تکرار ان حضرات کو ناگوار گزر رہی ہوگی۔ لیکن ان جلدوں کے بارے میں وہ پھر بھی بات کرنا چاہتے تھے۔ وہ انسانی نفسیات سے بہ خوبی واقف تھے۔ چنانچہ نہایت خوبصورت اور دل نشین انداز میں مزاح اور قافیہ آرائی کا سہارا لے کر بات اس طرح کہی کہ تفتہ کو تکرار بری بھی نہ لگے اور وہ اپنی بات بھی کہہ دیں:

"رات سے ایک بات اور خیال میں آئی ہے مگر چوں کہ تحکم و کار فرمائی ہے' کہتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ڈرتے ڈرتے عرض کرتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ دو جلدیں طلائی لوح کی ولایت کے واسطے تیار ہوں گی اور وہ چار جلدیں جو یہاں کے حکام کے واسطے درکار ہوں گی"......

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ

دو جانے میں کسی کی شادی تھی۔ نواب علاء الدین خاں علائی نے غالب کو لکھا کہ دو جانے میں شادی کے موقع پر آپ کا انتظار تھا۔ غالب کی صحت جواب دے چکی تھی اس لیے سفر کی زحمت نہیں اٹھا سکتے تھے۔ اور یوں بھی کچھ خاندانی معاملات ہوں گے' ناراض ہو گئے اور جھلا کر ایسے دلکش انداز میں اپنی ناراضگی کا اظہار کیا کہ اس میں حقیقت حال بھی ہے' مزاح بھی' غصہ بھی اور عبارت آرائی بھی۔ ملاحظہ ہو:

"دو جانے میں میرا انتظار اور میرے آنے کا تقریب شادی پر مدار۔ یہ بھی شعبہ ہے انہیں فنون کا جس سے تمہارے چچا (نواب ضیاء الدین خان نیر رخشاں) کو گمان ہے مجھ پر جنون کا۔ جاگیردار میں نہ تھا کہ ایک جاگیردار مجھ کو بلاتا۔ گویا میں نے تھا کہ اپنا ساز و سامان لے کر چلا جاتا۔ دو جانے جا کر شادی کماؤں اور پھر اس فصل میں کہ دنیا کرۂ نار ہو۔ لوہارو بھائی (نواب امین الدین خاں) کے دیکھنے کو نہ جاؤں اور پھر اس موسم میں کہ جاڑے کی گرمی بازار ہو۔"

بنام علاء الدین خاں علائی

مقفی عبارت کا ایک اور خط ملاحظہ ہو۔ پورے خط میں کام کی بات کی گئی ہے۔ عبارت مقفی ہے لیکن فقرہ تو کیا کوئی لفظ تک زائد نہیں ہے۔ قافیوں نے عبارت میں غیر معمولی اثر پیدا کر دیا ہے:

"جے پور کا امر محض اتفاقی ہے' بے قصد و بے فکر در پیش آیا ہے۔ ہوسنا کانہ ادھر متوجہ ہوا ہوں' بوڑھا ہو گیا ہوں' بہرا ہو گیا ہوں' سرکار انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا' رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا' پورا خلعت پاتا تھا۔ اب بدنام ہو گیا ہوں اور ایک بہت بڑا دھبا لگ گیا ہے۔ کسی ریاست میں دخل کر نہیں سکتا تھا مگر ہاں' استاد یا پیر یا مداح بن کر راہ و رسم پیدا کروں' کچھ آپ فائدہ اٹھاؤں' کچھ اپنے کسی عزیز کو وہاں داخل کر دوں' دیکھو کیا صورت پیدا ہوتی ہے۔

تانہال دوستی کے بردبد — عالیار نعیم و تحمے کا شمیم

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ

غالب عام طور سے سادہ نثر لکھتے لکھتے دو فقروں کو مقفی کر دیتے ہیں۔ یہ فقرے شعوری کوشش سے نہیں بلکہ بے ساختہ اور برجستہ قلم سے نکل جاتے ہیں' اسی لیے ان فقروں سے عبارت زیادہ بامعنی اور زیادہ موثر ہو جاتی ہے۔ ایسے چند فقرے ملاحظہ ہوں۔

"میرا حال بہ دستور ہے۔ دیکھئے خدا کو کیا منظور ہے۔"

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ

"بڑا پرانا قصہ تم نے یاد دلایا۔ داغ کہنہ حسرت کو چمکایا۔"

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ

"تم تو بڑی عبارت آرائیاں کرنے لگے' نثر میں خود نمائیاں کرنے لگے۔"

بنام میر مہدی مجروح

"یعنی اگر کاپی کا قصہ تمام ہو جائے تو آپ کو آرام ہو جائے۔"

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ

"شاہانہ آرائش ہے' آفتاب کی سی نمائش ہے"

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ

"جناب مرزا صاحب کو میرا سلام کہیے اور یہ پیغام کہیے۔"

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ

"او میاں سید زادہ آزادہ' دلی کے عاشق دل دادہ"

بنام میر مہدی مجروح

چند اور مقفی فقرے ملاحظہ ہوں:

"غلہ گراں ہے' موت ارزاں ہے۔"

"جو تمہارا ڈھنگ ہے' وہی میرا رنگ ہے۔"

کافر نعمت ہو جاؤں' اگر یہ آداب نہ بجالاؤں۔"

☆☆☆

خطوط غالب کے مختلف اڈیشن اور ری پرنٹ

پچھلے سو سال میں جن کتابوں کے سب سے زیادہ ری پرنٹ اور اڈیشن شائع ہوئے ہیں، ان میں غالب کی "اردوئے معلی" اور "عود ہندی" سرفہرست ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اردو میں غالب کے خطوں کو غیر معمولی مقبولیت حاصل رہی ہے اور دوسرے غالب کے خطوط ہمیشہ اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل رہے۔ اس لیے بعض پبلشر تو ہر سال دو سال بعد "اردوئے معلی" یا "عود ہندی" کے ری پرنٹ شائع کرتے رہے۔ غالب کے خطوط کے اب تک جتنے ری پرنٹ اور اڈیشن شائع ہوئے ہیں، ان سب کا فراہم کرنا ممکن نہیں ہے' البتہ اہم اڈیشن اور ری پرنٹ لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ یہاں کچھ قدیم ری پرنٹ اور بعض اہم اڈیشنوں کا جائزہ لینا مقصود ہے۔

مہر غالب

ابتدا میں غالب کو پسند نہیں تھا کہ ان کے خطوط مرتب کرکے کتابی صورت میں شائع کیے جائیں۔ جب مرزا ہرگوپال تفتہ اور منشی شیونرائن نے غالب سے ان کے خطوط مرتب کرکے شائع کرنے کی اجازت مانگی تو غالب نے ان دونوں کو اس انداز سے منع کیا کہ ان کے حوصلے ہمیشہ کے لیے پست ہو گئے۔ تقریباً" دو سال بعد چودھری عبدالغفور سرور اور منشی ممتاز علی خاں نے ان خطوط کو شائع کرنے کا ارادہ کیا جو غالب نے سرور کو لکھے تھے۔ ان لوگوں نے غالب سے اجازت لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ سرور نے اس مجموعے پر ایک دیباچہ لکھا اور اس کا نام "مہر غالب" رکھا جو تاریخی نام ہے۔ اس نام سے ۱۲۷۸ھ (مطابق ۱۸۶۱ء-۱۸۶۲ء) برآمد ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ خطوط کا یہ مجموعہ ۱۸۶۱ء یا ۱۸۶۲ء میں مرتب ہو گیا تھا۔ کچھ عرصے بعد منشی ممتاز علی کو خیال آیا کہ اس مجموعے میں کچھ اور لوگوں کے نام کے خطوط بھی شامل کیے جائیں' انھوں نے مزید خطوط حاصل کرنے کی کوشش شروع کردیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس مجموعے کی طباعت معرض التوا میں پڑ گئی۔

انتخاب غالب

غالب نے ڈاکٹر مولوی ضیاء الدین خاں کی فرمائش پر غالبا" انگریز افسروں اور فوجیوں کو اردو پڑھانے کے لیے اپنی اردو نظم و نثر کا ایک مختصر سا انتخاب کیا تھا۔ یہ انتخاب ۱۸۶۶ء میں شائع ہوا۔ گویا "عود ہندی" اور

"اردوئے معلیٰ" سے پہلے یہ شائع ہو چکا تھا۔ غالب نے جو نسخہ مولوی ضیاء الدین خاں کے لیے لکھوایا تھا' وہ محمد عبدالرزاق راشد کو دستیاب ہو گیا۔ انہوں نے یہ انتخاب مرتب کرکے ۱۹۲۶ء میں چشتیہ پریس' حیدر آباد سے شائع کر دیا۔ اس کا دوسرا اڈیشن ۱۹۴۳ء میں دین محمدی پریس' لاہور سے شائع ہوا۔

اس انتخاب کا ایک قلمی نسخہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی ملکیت تھا۔ جس کی فوٹو سٹیٹ کاپی غالب انسٹی ٹیوٹ' نئی دہلی میں محفوظ ہے۔ مالک رام صاحب کا کہنا ہے کہ یہ انتخاب چالیس صفحات پر مشتمل ہے' جبکہ اس قلمی نسخے میں کل تیس صفحات ہیں۔ ابتدا میں اس انتخاب پر غالب کا دیباچہ ہے۔ اس کے بعد مرزا رجب علی بیگ سرور کی "گلزار سرور" اور خواجہ بدر الدین خاں کی "حدائق الانظار" پر لکھے گئے غالب کے وہ دیباچے ہیں' جو "اردوئے معلیٰ" میں شامل ہیں۔ پھر میر مہدی مجروح کے نام غالب کے بارہ خط ہیں۔ اس کے بعد دو نقلیں اور ایک لطیفہ۔ دوسرے حصے میں ۳۹ اردو اشعار ہیں۔ آخر میں اس کتاب سے متعلق غالب کی لکھی ہوئی ایک مختصر سی نثر ہے۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری میں محفوظ اس مجموعے کی فوٹو اسٹیٹ کاپی کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی اور نسخے سے نقل کیا گیا ہے۔ تمام خطوط کے آغاز کے حاشیے میں "مقابلہ نمودہ" لکھا گیا ہے۔ متن میں ترمیمات کی گئی ہیں جس سے گمان ہوتا ہے کہ یہ نسخہ غالب کی نظر سے گزرا ہے۔

عود ہندی: پہلا اڈیشن

غلام غوث خاں بے خبر' غالب سے اجازت لے کر ان کے خطوط کا مجموعہ مرتب کر رہے تھے۔ غالب نے نہ صرف یہ خوشی اجازت دی بلکہ خود بھی خطوط کی نقلیں فراہم کیں۔ بے خبر نے خطوط جمع کرنے کا کام ۱۸۶۱ء میں شروع کیا تھا لیکن ۱۸۶۵ء تک اس مجموعے کی طباعت کے آثار نظر نہیں آئے تو بے خبر نے اپنا مرتب کیا ہوا مجموعہ منشی ممتاز علی خاں کو بھیج دیا۔ منشی صاحب نے "مہر غالب" اور اس مجموعے کو ملا کر اس کا نام "عود ہندی" رکھا اور خود بھی اس مجموعے پر دیباچہ لکھا۔ مجموعے میں دو فصلیں ہیں۔ پہلی فصل کی ابتدا چودھری عبدالغفور سرور کے دیباچے سے ہوتی ہے۔ اور پھر وہ چھتیس خط ہیں جو سرور نے مرتب کیے تھے۔ دوسری فصل میں حسب ذیل حضرات کے نام خطوط ہیں۔ صاحب عالم مارہروی (۲ خط) شاہ عالم مارہروی (۲ خط) انورالدولہ شفق (۲۰ خط) مرزا یوسف علی خاں عزیز (۲ خط) مرزا ہرگوپال تفتہ (۱ خط) مرزا حاتم علی مہر (۱۸ خط) غلام غوث خاں بے خبر (۲۵ خط) عبدالغفور نساخ (۱ خط) ظہیرالدین خاں کی طرف سے ان کے چچا کے نام (۱ خط) نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے نام (۱ خط) مردان علی خاں رعنا (۲ خط) مرزا رحیم بیگ (۱ خط) عبدالرزاق شاکر (۱۰ خط) قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی (۱۷ خط) مولوی عزیزالدین (۱ خط) سید محمد عباس (۱ خط) منشی غلام بسم اللہ (۱ خط) مجروح (۳۱ خط) میر سرفراز حسین (۱ خط)

خطوط کا یہ مجموعہ ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ مطابق ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو شائع ہوا۔

عود ہندی کے بارے میں ایک اہم انکشاف

بہت عرصہ ہوا میں نے غالب کے وہ خطوط مرتب کر لیے تھے جن کے متن کی بنیاد "عود ہندی" اور "اردوئے معلیٰ" کے پہلے اڈیشنوں پر تھی۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کا جنرل سیکرٹری ہو جانے کے بعد میری مصروفیات کچھ اس طرح کی ہو گئیں کہ کافی عرصے تک اس کام کی طرف توجہ نہیں کر سکا۔ اس دوران میں میرے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا۔ ہوا یہ کہ میری دس پندرہ بہت قیمتی کتابیں ایک ساتھ چوری ہو گئیں۔ ان میں "عود ہندی" کا وہ پہلا اڈیشن بھی تھا' جو میں نے پرانی کتابوں کے ایک تاجر سے خریدا تھا۔ اس وقت میں چور کو بہت کوستا تھا لیکن اب دعائیں دیتا ہوں کہ اگر وہ میری کتابیں چوری نہ کرتا تو "عود ہندی" کے بارے میں ایک اہم ترین انکشاف میں اور نہ جانے کتنا زمانہ لگتا۔

جب میں نے کام دوبارہ شروع کیا تو انجمن ترقی اردو کی لائبریری سے "عود ہندی" کا پہلا اڈیشن لے لیا۔ مرتب کیے ہوئے خطوط کا جب "عود ہندی" سے موازنہ کیا تو بہت زیادہ اختلافات نسخ نکلے۔ دس پندرہ صفحات کا موازنہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ "عود ہندی" کا وہ پہلا اڈیشن جو میری ملکیت تھا اور چوری ہو گیا تھا' انجمن کے اس اڈیشن سے مختلف تھا۔ میں نے اپنے نوٹس کھنگالے تو ایک کاغذ پر گم شدہ "عود ہندی" کے بارے میں نوٹ کی ہوئی تفصیلات مل گئیں۔ یہ اڈیشن مطبع مجتبائی میرٹھ میں ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ کو شائع ہوا تھا۔ انجمن کے اڈیشن کو دیکھا تو وہ بھی مطبع مجتبائی میرٹھ میں اسی تاریخ کو چھپا تھا۔ پھر سوال یہ تھا کہ میں نے جو متن تیار کیا تھا' اس میں "عود ہندی" اور "اردوئے معلیٰ" کے پہلے اڈیشنوں کو بنیادی نسخوں کے طور پر استعمال کیا تھا اور تمام اختلافات نسخ کی نشان دہی کی تھی' پھر اب وہ اتنا مختلف کیوں ہے؟ میں یہ تو مان سکتا تھا کہ "عود ہندی" میں کوئی لفظ حذف ہو گیا ہو اور میری نظر چوک گئی ہو لیکن اگر کسی عبارت میں "اردوئے معلیٰ" کے مقابلے میں "عود ہندی" میں کوئی لفظ زائد ہو تو یہ لفظ میں کہاں سے لایا۔ اور اس کی نشان دہی کیسے کی۔ پھر میں نے اپنے متن کا موازنہ "اردوئے معلیٰ" سے کیا تو معلوم ہوا کہ میں نے جن اختلافات نسخ کی نشان دہی کی ہے' وہ بالکل درست ہیں۔

انوارالدولہ سعدالدین خاں بہادر شفق کے نام غالب کے ایک خط کے اختلافات نسخ ملاحظہ ہوں۔ اس سے اندازہ ہو گا کہ میرا پریشان ہونا کہاں تک جائز تھا۔

میرا تیار کیا ہوا متن	عود ہندی پہلا اڈیشن (انجمن)
قصیدہ (میں نے اس لفظ کے بارے میں حاشیے میں لکھا تھا کہ "قصیدہ" سہو کا تب ہے۔ یہ لفظ "قصیدہ" ہے)	قصیدہ
ہرزہ	ہرذرہ

آوردہ (میں نے لکھا تھا کہ طباعت	اور وہ
کی غلطی ہے' اصل لفظ "اور وہ" ہے۔)	
ہمشیر	باہمشیر
سفر	اس نسخے میں یہ لفظ ندارد
حضور والا	حضور والد

ایک ہی خط میں اتنے اختلافات نسخ دیکھ کر میں نے سوچا کہ میرا سب کام بے کار ہو گیا۔

میں نے اپنے متن کا موازنہ "عود ہندی" کے اس اڈیشن سے کیا جو مولانا سید مرتضیٰ حسین فاضل نے مرتب کر کے مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع کرایا تھا۔ اس کا متن تقریباً' وہی' جو میں نے تیار کیا تھا۔ ان تمام شواہد کی روشنی میں' میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میرا گم شدہ "عود ہندی" کا اڈیشن انجمن کے اڈیشن سے بالکل مختلف تھا۔

اتفاق سے انجمن کی لائبریری میں "عود ہندی" کا ایک اور پہلا اڈیشن نکل آیا۔ میں نے دونوں اڈیشنوں کے سرورق اور ترقیمے کی عبارتوں کا موازنہ کیا تو ایک حیرت انگیز اور دلچسپ انکشاف ہوا۔ معلوم ہوا کہ میں نے "عود ہندی" کے جس اڈیشن کو بنیادی نسخے کے طور پر استعمال کیا تھا' وہ یہی ہے جو دوسری دفعہ میں نے انجمن سے حاصل کیا۔ اگرچہ ترقیمے میں تاریخ اشاعت دونوں میں ایک ہی یعنی ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ دی ہے۔ لیکن سرورق کی عبارت میں معمولی سا فرق ہے۔ ایک اڈیشن کے سرورق کی عبارت یہ ہے :

خداوند بے نسبت بندگی۔ نہ پری درونہ پراگندگی

بفضل واہب العطیات خالق الخیر والحسنات

انشاء اردو لاجواب موسوم بہ

عود ہندی

من تصنیف جناب استاد زماں علامہ عصر اسد اللہ خاں المتخلص بغالب

حسب فرمائش مجمع خوبی ہا جہاں میاں محمد ممتاز علی خاں رئیس میرٹھ

در مطبع مجتبائی واقع میرٹھ طبع گردید

دوسرے اڈیشن میں دوسری سطر میں "انشاء اردو" کے بجائے "انشاء اور وو" اور آخری سطر اس طرح ہے : "در مطبع مجتبائی واقع میرٹھ باہتمام محمد ممتاز علی طبع شد"

دونوں اڈیشنوں کے سرورق کی عبارت میں اختلاف کا صاف مطلب ہے کہ دونوں الگ الگ اڈیشن ہیں۔

دونوں اڈیشنوں کی مماثلتیں

۱ - دونوں اڈیشنوں کی کتابت کا بہ غور مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں کے کاتب مختلف ہیں لیکن دوسرے کاتب نے پہلے کاتب کی نقل انتہائی کامیاب طریقے سے کی ہے۔
۲ - ایک اڈیشن میں ہر صفحہ جس لفظ پر ختم ہوتا ہے دوسرے اڈیشن میں بھی اسی لفظ پر ختم ہوتا ہے۔
۳ - دونوں اڈیشنوں کا سائز ایک ہی ہے۔
۴ - دونوں اڈیشنوں میں انیس سطری مسطر استعمال کیا گیا ہے۔
۵ - دونوں اڈیشنوں کے آخری چار صفحوں میں ایک لفظ کا بھی اختلاف نہیں۔

اختلافات

۱ - دونوں اڈیشنوں میں بے شمار اختلافات نسخ ہیں۔
۲ - دونوں کے صفحات تو ایک ہی لفظ پر ختم ہوتے ہیں۔ لیکن سطریں عام طور سے مختلف الفاظ پر ختم ہوتی ہیں۔
۳ - دونوں کے سرورق کی عبارت میں بھی اختلاف ہے۔ جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔
۴ - مخطوطات میں اور انیسویں صدی کے نصف آخر تک کی مطبوعات میں عام قاعدہ تھا کہ جس لفظ پر جفت صفحہ ختم ہوتا تھا' اسے دوسرے طاق صفحے کے شروع میں پھر لکھتے تھے۔ ایسا غالباً اس لیے کیا جاتا تھا کہ اگر صفحات آپس میں مل جائیں تو انھیں ترتیب دیا جاسکے۔ "عود ہندی" کے ایک اڈیشن میں اس قاعدے کی پابندی کی گئی ہے جبکہ دوسرے میں بالکل نہیں کی گئی۔

"عود ہندی" کی ترتیب مکمل ہونے میں تقریباً" پانچ سال لگے تھے' اور اس کی طباعت میں مزید دو سال لگ گئے۔ بالآخر اکتوبر ۱۸۶۸ء میں "عود ہندی" شائع ہو گئی۔ یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ تعداد اشاعت کیا تھی۔

"عود ہندی" اور اردوئے معلی" دونوں کے شائع ہونے سے پہلے ہی ان کی بہت شہرت ہو چکی تھی' اس لیے یہ امکان ہے کہ اردو والوں کو ان مجموعوں کا بہت انتظار رہا ہو۔ خواجہ غلام غوث خاں بے خبرنے ایک خط میں غالب کو لکھا تھا :

"منشی ممتاز علی خاں صاحب کے بھانجے نے آپ کی اردو انشا مجھے دکھائی' سب چھپ گئی' ایک صفحہ اخیر کا باقی ہے۔ خان صاحب نے قطعہ تاریخ کے انتظار میں کہ کوئی کہ دے' اسے پھینک رکھا ہے' مراد آباد میں اخبار "جلوہ طور" کا مہتمم بھی وارد تھا' وہ کہتا تھا کہ میں نے ویسے ہی ناتمام پچیس جلدیں لیں اور لوگوں کو دیں"۔

اس کا مطلب ہے کہ "عود ہندی" کی شہرت بہت ہو گئی تھی۔ ابھی اس کا آخری صفحہ چھپا بھی نہیں تھا کہ لوگ خریدنے لگے۔ "عود ہندی" جب شائع ہوئی ہے تو غالب ہندوستان گیر شہرت کے مالک تھے۔ ان کے شاگرد اور مداح تقریباً" تمام ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس سے تقریباً" دس سال پہلے جب ان کی "دستنبو" شائع

ہوئی تو تقریباً چھ مہینے میں ساری فروخت ہو گئی۔ جس پر غالب نے منشی شیونرائن آرام کو لکھا :

کتب "دستنبو" کے بک جانے سے میں خوش ہوا .... دیکھو صاحب تم گھبراتے تھے ' آخر یہ جنس پڑی نہ رہی اور بک گئی ۔

۱۹ اپریل ۱۸۵۹ء کیمسن نامی ایک انگریز مدارس غرب و شمال کے محکمے میں کسی عہدے پر فائز تھا ۔ اس نے غالب سے ان کی اردو نظم و نثر کی فرمائش کی تھی ۔ غالباً یہ فرمائش طالب علموں کی ضرورت کے پیش نظر کی گئی تھی ۔ ہنری اسٹوارٹ محکمہ صوبجات متحدہ کے محکمہ تعلیم میں ڈائریکٹر تھے ۔ انھوں نے غالب سے اردو نثر میں ایک کتاب لکھنے کی فرمائش کی تھی ۔ جسے وہ غالباً اسکول کے نصاب میں شامل کرنا چاہتے تھے ۔ اس فرمائش کے سلسلے میں غالب نے منشی شیونرائن آرام کو لکھا تھا :

"جناب ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب کو ابھی میں خط نہیں لکھ سکتا ۔ ان کی فرمائش ہے اردو کی نثر' وہ انجام پائے تو اس کے ساتھ ان کو خط لکھوں۔"

اس کا مطلب ہے کہ اس زمانے میں اردو نثر کی ایسی کتابوں کی ضرورت تھی جنھیں نصاب میں شامل کیا جا سکے ۔ اس لیے پورا امکان ہے کہ "عود ہندی" نصاب میں شامل کر لی گئی ہو یا لائبریریوں کے لیے کافی تعداد میں خریدی گئی ہو۔ امکان یہ بھی ہے کہ طباعت کے دوران میں کافی آرڈر آ گئے ہوں ۔ اس لیے بہت جلد دوسرے اڈیشن کی ضرورت پڑ گئی ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب دوسرا اڈیشن چھاپا گیا تو پہلے اڈیشن کی ایسی نقل کیوں کی گئی کہ آخری صفحے پر تاریخ طباعت میں بھی کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ۔

اب ری پرنٹ کی طباعت کی کئی صورتیں ہیں ۔

خود منشی ممتاز علی خاں نے دوسرا اڈیشن شائع کیا ۔ اگر ایسا تھا تو منشی ممتاز علی خاں "عود ہندی" میں فخر سے اس کا اعلان کرتے کہ پہلا اڈیشن ختم ہو گیا اور اب دوسرا اڈیشن چھاپا جا رہا ہے ۔ اگر منشی ممتاز علی خاں دوسرا اڈیشن شائع کرتے تو اسے چھپانے کی بہ ظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی ۔ اس زمانے میں مصنف کو معاوضہ دینے کا رواج نہیں تھا' بلکہ الٹا معاملہ ہوتا تھا' مصنف کچھ کتابیں خریدنے کی پیش کش کرتا تھا ۔ غالب نے "دستنبو" کی پچاس جلدیں خریدنے کا وعدہ کیا اور اپنے ایک مداح راے امید سنگھ سے ان پچاس جلدوں کی قیمت منشی شیونرائن آرام کو دلوائی تو انھوں نے "دستنبو" چھاپی' اس لیے منشی ممتاز علی خاں کے پاس کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ اس طرح چھپا کر دوسرا اڈیشن چھاپتے ۔ دوسری صورت یہ ممکن ہے کہ "عود ہندی" کی مقبولیت دیکھ کر کسی نے جعلی اڈیشن شائع کر دیا ۔ مگر یہ بھی قرین قیاس نہیں کیوں کہ "عود ہندی" کی اشاعت کے حقوق کسی کے نام محفوظ نہیں کیے گئے تھے اور پھر غالب کی وفات ہو چکی تھی اس لیے کوئی بھی دوسرا اڈیشن شائع کر سکتا تھا اور پھر دونوں اڈیشنوں کے آخری چار صفحے بالکل ایک ہیں' اور ایک ساتھ چھپے ہیں ۔

تیسری صورت جو قرین قیاس ہے وہ یہ ہے کہ "عود ہندی" کے ۱۸۲ صفحات چھپ چکے تھے' قطعہ تاریخ طباعت کے انتظار میں چار صفحے کی آخری کاپی نہیں چھپی تھی ۔ جب آخری کاپی چھپنے کی نوبت آئی تو منشی ممتاز

علی خاں کو خیال آیا کہ "عود ہندی" کی مانگ بہت زیادہ ہے اور انھوں نے جتنی کتابیں چھپوائی ہیں' وہ ناکافی ہیں - ۱۸۳ صفحے چھپے ہوئے کافی دن ہو گئے تھے اس لیے پریس میں ان کے پتھر بھی صاف کر دیے گئے تھے - مجبوراً ۱۸۳ صفحات کی کتابت کرا کے انھیں چھاپا گیا - آخری چار صفحے اتنی تعداد میں شائع کیے گئے کہ وہ پوری کتاب کے لیے کافی ہوں - یہی وجہ ہے کہ ۱۸۳ صفحات کے متن میں تو بہت زیادہ اختلافات ہیں لیکن آخری چار صفحوں میں ایک لفظ کا بھی اختلاف نہیں -

متنی نقاد کے لیے ایک اہم سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں سے پہلا اڈیشن کس کو مانے اور ری پرنٹ کسے تسلیم کرے؟ یقینی طور پر تو نہیں کہا جا سکتا ہے لیکن میرا قیاس ہے کہ جس کتاب کے سرورق پر "باہتمام محمد ممتاز علی خاں" لکھا ہوا ہے' یہ وہ اڈیشن ہے جو پہلے چھپا تھا - کیوں کہ (۱) اس اڈیشن پر محمد ممتاز علی خاں کا نام ہے (۲) اس اڈیشن کا کاتب دوسرے اڈیشن کے مقابلے میں زیادہ بہتر اور پختہ کار معلوم ہوتا ہے (۳) پہلے اڈیشن کا کاغذ زیادہ بہتر ہے جبکہ دوسرے اڈیشن کا کاغذ تجارتی انداز کا ہے -

"عود ہندی" کے جتنے اڈیشن چھپے ہیں' ان سب کے ساتھ یہ ہوا کہ کسی نے ایک اڈیشن کو بنیاد بنایا' اور کسی نے دوسرے کو - ۱۸۶۸ء میں مطبع نرائنی' دہلی سے "عود ہندی" کا جو اڈیشن تھا' اس کی بنیاد ری پرنٹ پر ہے - مولوی مہیش پرشاد کو بھی چوں کہ ری پرنٹ کا علم نہیں تھا اس لیے انھوں نے بھی صرف ایک ہی کو بنیاد بنایا ہے جس کی وجہ سے ان کے بتائے ہوئے اختلافات نسخ بے معنی ہو گئے ہیں -

ہمیں اس کا یقین نہیں کہ ری پرنٹ کون سا ہے اور پہلا اڈیشن کون سا' اور اگر فرض کیجئے' کسی طرح یہ ثابت بھی ہو جائے کہ پہلا اڈیشن کون سا ہے تو ہمیں اس کا علم نہیں کہ دوسرے اڈیشن کی کتابت پہلے اڈیشن سے ہوئی تھی یا اصل مسودے سے - حال آں کہ امکان یہی ہے کہ مسودے سے ہوئی ہو گی کیوں کہ مسودہ ہوتے ہوئے پبلشر ایک کتاب خراب کرنے پر تیار نہیں ہوتا - اس لیے متنی نقاد کے سامنے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ دونوں اڈیشنوں کو بنیادی نسخوں کی حیثیت سے استعمال کرے - میں نے "غالب کے خطوط" کے تنقیدی اڈیشن کی تیاری میں ایسا ہی کیا ہے -

اردوئے معلی : پہلا اڈیشن

"عود ہندی" کی طباعت میں غیر معمولی تاخیر ہو رہی تھی اور غالب کے چاہنے والوں کا مطالبہ بڑھتا جا رہا تھا - دہلی میں حکیم غلام رضا خاں مالک "اکمل المطابع" نے غالب کے خطوط چھاپنے کا پروگرام بنایا - غالب نے بعض دوستوں کو خط لکھ کر اپنے خطوط یا ان کی نقلیں فراہم کیں - یہ ممکن ہے کہ طباعت کی نگرانی بھی خود غالب نے کی ہو کیوں کہ "عود ہندی" کے مقابلے میں اس مجموعے میں کتابت کی غلطیاں کم ہیں - میر مہدی مجروح نے اس کا دیباچہ اور قربان علی بیگ سالک نے خاتمہ لکھا اور کتاب دو حصوں میں ترتیب دی گئی - پہلے حصے میں وہ خطوط شامل کیے گئے جو آسان اور صاف زبان میں تھے اور جن میں ادبی مسائل پر گفتگو نہیں کی

گئی، یہ حصہ طالب علموں کے لیے تھا۔ دوسرے حصے میں وہ خطوط شامل کیے گئے، جن میں مشکل مطالب بیان کیے گئے تھے۔ عرشی صاحب کا خیال ہے کہ : "غالباً" پہلی بار صرف حصہ اول شائع ہوسکا، اس لیے کہ کتب خانہ عالیہ رام پور میں جو نسخہ موجود ہے وہ مکمل ہوتے ہوئے صرف حصہ اول پر مشتمل ہے۔ "اس کا بھی امکان ہے کہ پہلے حصے کو باقاعدہ کتاب بنا کر، طالب علموں کے لیے اس کے کچھ زائد نسخے چھپوائے گئے ہوں۔

کتاب کے آخر میں غالب کی ایک تحریر شامل ہے۔ جس میں غالب نے لکھا ہے کہ : "میں نے ازراہ فرط محبت، اپنا حق تالیف نور چشم اقبال نشاں، حکیم غلام رضا خاں کو بخش دیا ہے"۔ اس مجموعے میں خطوں کی مجموعی تعداد ۴۷۰ ہے اور حسب ذیل حضرات کے نام کے خطوط اس میں شامل کیے گئے ہیں۔

نواب میر غلام بابا خاں بہادر (۱۰ خط) میاں داد خاں سیاح (۲۹ خط) منشی حبیب اللہ ذکا (۱۰ خط) مرزا ہرگوپال تفتہ (۸۹ خط) شہزادہ بشیر الدین (۳ خط) سید بدرالدین المعروف بہ فقیر (۵ خط) چودھری عبدالغفور سرور (۱۶ خط) میر سرفراز حسین (۲ خط) میر مہدی مجروح (۴۳ خط) شاہ عالم (۲ خط) صاحب عالم (۲ خط) عبدالغفور نساخ (۱ خط) قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی (۱۱ خط) مردان علی خاں رعنا مراد آبادی (۲ خط) عبدالرزاق شاکر (۲ خط) مولوی عزیز الدین (۱ خط) مفتی سید عباس (۱ خط) حکیم غلام نجف خاں (۲۳ خط) نجم الدین حیدر خاں (۱ خط) نواب ابراہیم علی خاں وفا (۵ خط) مولوی احمد حسن قنوجی (۲ خط) حکیم سید احمد حسن مودودی (۱۱ خط) تفضل حسین خاں (۱ خط) مرزا حاتم علی مہر (۱۸ خط) منشی نبی بخش (۲ خط) منشی عبداللطیف (۱ خط) خواجہ غلام غوث خاں بے خبر (۱۴ خط) نواب ضیاء الدین خاں نیر (۱ خط) مرزا شہاب الدین خاں (۷ خط) نواب انورالدولہ شفق (۱۹ خط) میرن صاحب (۳ خط) قربان علی بیگ خاں سالک (۲ خط) شمشاد علی بیگ خاں رضوان (۲ خط) باکر علی خاں کامل (۲ خط) حسین مرزا (۳ خط) نواب یوسف مرزا (۱۲ خط) منشی شیو نرائن (۳۳ خط) بابو ہرگوبند سہائے (۲ خط) نواب امین الدین خاں بہادر (۶ خط) نواب علاء الدین خاں علائی (۵۶ خط) فرخ مرزا (۱ خط) احمد حسین میکش (۲ خط) حکیم مرتضیٰ خاں (۱ خط) حکیم غلام رضا خاں (۱ خط) ماسٹر پیارے لال (۳ خط) جواہر سنگھ جوہر (۲ خط) منشی ہیرا سنگھ (۱ خط) اور بہاری لال مشتاق (۲ خط) ظہیرالدین احمد خاں (۱ خط) یوسف علی خاں عزیز (۱ خط)

۲۶۴ صفحات پر مشتمل خطوط کا یہ مجموعہ ۲۱ ذی قعد ۱۲۸۵ھ (مطابق مارچ ۱۸۶۹ء) کو شائع ہوا، گویا غالب کی وفات کے ۱۹ دن بعد۔

عود ہندی : ری پرنٹ

ستمبر ۱۸۸۱ء میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے "عود ہندی" کا ایک ری پرنٹ شائع ہوا۔ اس کے خاتمے کی عبارت میں لکھا گیا ہے کہ : "پہلے شائقین کی تلاش سے مدون ہو کر مطبع مجتبائی میرٹھ میں طبع ہوا تھا، باقی نہیں رہا۔ لہٰذا فی الحال حسب اصرار اہل شوق مطبع نامی سرچشمہ فتوت جناب منشی نول کشور صاحب دام اقبالہٗ

میں --- روکش مرقع مانی ہوا"۔
یہ مجموعہ ۱۶۶ صفحات پر مشتمل، ۱/۲-۶" x ۱/۲-۹" کے سائز پر شائع ہوا تھا۔

اردوئے معلی : ری پرنٹ

یہ ری پرنٹ نسخ ٹائپ میں، ۵.۷ صفحات پر مشتمل، مارچ ۱۸۸۳ء میں مطبع اردو گائیڈ، کلکتہ سے ۱۸ x ۲۲ /۸ کے سائز پر شائع ہوا تھا۔ اس کے سرورق پر جو عبارت لکھی گئی ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ بحکم سرکار، باہتمام سکریٹری بورڈ آف ایگزامینشن، بذریعہ صمد کبیر الدین احمد شائع ہوا۔ یہ کتاب نسخ ٹائپ میں شائع ہوئی۔ اس ری پرنٹ میں میر مہدی مجروح کے دیباچے اور قربان علی بیگ خاں سالک کی تقریظ شامل نہیں کی گئی۔ خطوط میں سے ایسے فقرے بھی نکال دیے گئے، جو حکومت کے نقطہ نظر سے پسندیدہ نہیں تھے۔

اردوئے معلی : ری پرنٹ

"اکمل المطابع" سے "اردوئے معلی" کا دوسرا ری پرنٹ ۱۰ فروری ۱۸۹۱ء کو شائع ہوا۔ ۳۸۴ صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ ۱/۴-۶" x ۱/۲-۹" کے سائز پر شائع ہوا۔ کتاب کے آخری ورق پر اجازت نامے کے عنوان سے حکیم غلام رضا خاں کا یہ اعلان شائع ہوا کہ : "میں صرف ایک ہی دفعہ کے لیے ایک ہزار کاپی (کاپی) "اردوے معلی" کی اجازت (جس کا کاپی رائٹ میرے پاس محفوظ ہے) سید فخرالدین صاحب مہتمم مطبع اور محمد اجمل خاں کو دیتا ہوں۔ آئندہ یہ بغیر میری اجازت کے بار دگر نہیں چھاپ سکتے"۔

اردوئے معلی : حصہ اول، حصہ دوم

"اردوئے معلی" کا یہ اڈیشن مطبع نامی مجتبائی دہلی سے اپریل ۱۸۹۹ء میں شائع ہوا۔ اس کا پہلا حصہ ۳۸۴ اور دوسرا حصہ ۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا سائز "۱/۴-۶ x ۱/۲-۹" ہے۔ دوسرے حصے پر محمد عبدالاحد نے مختصر دیباچہ لکھا ہے۔ اس مجموعے کے حصہ اول کے خطوط وہی ہیں، جو "اردوئے معلی" کے پہلے اڈیشن میں شائع ہوئے تھے۔ حصہ دوم کی ابتدا میں اطلاع دی گئی ہے کہ : "حمد و صلوٰۃ کے بعد احقرالعباد محمد عبدالاحد عفاعنہ الصمد شائقین تمکین کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ جب "اردوئے معلی" مرزا غالب، ہندوستان کے سعدی مولانا حالی کی اجازت سے مطبع میں چھپی تو مولانا موصوف نے ایک قلمی مسودہ مرزا غالب کے رقعات کا، اپنے پاس سے بھی عنایت فرمایا، جس کو احقر نے حصہ دوم "اردوے معلی" کے نام سے نامزد کرکے اسی کے آخر میں شامل کردیا۔ اس حصے میں خاص کر وہ رقعات ہیں، جن میں انھوں نے لوگوں کو اصلاحیں دی ہیں یا شاعری کے متعلق کوئی ہدایت کی ہے یا کوئی نکتہ بتایا ہے اور بعض کتابوں کے دیباچے اور ریویو بھی ہیں"۔ اس حصے میں مفتی سید رحمت علی خاں کی "سراج المعرفت" خوجہ بدرالدین خاں عرف خواجہ امان کی "حدائق انظار" پر غالب کے لکھے ہوئے دیباچے۔ بہادر شاہ ظفر کی ایک کتاب اور مرزا رجب علی بیگ

سرور کی "گلزار سرور" پر تقریظیں۔ منشی حبیب اللہ ذکا کے دیوان اور سید فرزند احمد صفیر بلگرامی کے رسالہ تذکیر و تانیث پر دیباچے ہیں۔ رسالہ "تذکیر و تانیث" سے پہلے کلب حسین نادر کے مجموعہ قصائد پر دیباچہ ہے۔ اس کے بعد یہ خطوط ہیں۔

مرزا ہرگوپال تفتہ	۳۴
ماسٹر پیارے لال	۱
حبیب اللہ ذکا	۵
میاں داد خاں سیاح	۵
شہزادہ بشیر الدین	۲
منشی کیول رام	۱
مولوی کرامت علی	۱
جواہر سنگھ جوہر	۱
منشی ہیرا سنگھ	۱
میر مہدی مجروح	۲

اردوئے معلی: حصہ اول و دوم۔ دوسرا ری پرنٹ

مطبع مجتبائی دہلی سے اپریل ۱۸۹۹ء میں "اردوئے معلی" حصہ اول و دوم جو شائع ہوا تھا' اس کا تعارف کرایا جا چکا ہے۔ عزیز دوست کاظم علی خاں کی عنایت سے مجھے معلوم ہوا کہ "اردوئے معلی" کے اس اڈیشن کے ساتھ بھی تقریباً وہی معاملہ ہے' جو "عود ہندی" کے پہلے اڈیشن کے ساتھ ہے۔ یعنی اس کا بھی ایک ایسا ری پرنٹ شائع ہوا تھا' جس کی تاریخ طباعت وہی شائع کی گئی' جو پہلے اڈیشن پر تھی۔ میں نے جس نسخے سے استفادہ کیا ہے' وہ تو وہی ہے جو پہلے اڈیشن کے طور پر شائع ہوا تھا۔ یہ اڈیشن انجمن ترقی اردو (ہند) کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ کاظم علی خاں صاحب کے اطلاع دینے پر میں نے اس نسخے کی تلاش شروع کی تو ہر دیال لائبریری میں یہ نسخہ مجھے مل گیا۔ اس ری پرنٹ کے آخر میں تاریخ طباعت اس طرح دی گئی ہے :

"العبد۔ محمد عبدالاحد عفی عنہ پروپرائٹر مطبع مجتبائی دہلی ماہ اپریل ۱۸۹۹ء"

اس سے دعوکا ہوتا ہے کہ یہ پہلا اڈیشن ہے۔ جب کہ ایسا نہیں ہے۔ پہلے اڈیشن کے پہلے اور دوسرے حصے کے آخر میں محمد عبدالاحد کے نام کے ساتھ "عفی عنہ" لکھا گیا ہے' جب کہ ری پرنٹ میں دوسرے حصے کے آخر میں تو نام کے ساتھ "عفی عنہ" ہی چھپا ہے' لیکن پہلے حصے کے آخر میں محمد عبدالاحد کے ساتھ "مرحوم و مغفور" چھپا ہے۔ پہلے اڈیشن کے پہلے حصے کے ۳۸۴ اور دوسرے حصے کے ۶۳ صفحات ہیں۔ اس کے برعکس ری پرنٹ کے پہلے حصے کے ۳۳۶ اور دوسرے حصے کے ۵۶ صفحات ہیں۔ کتابت کی غلطیوں کی وجہ

سے ان دونوں کتابوں کے متن میں خاصے اختلافات ہو گئے ہیں۔ یہ راز میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ری پرنٹ پر تاریخ طباعت وہی کیوں چھاپی گئی جو پہلے اڈیشن پر تھی۔ کتاب شائع کرنے والوں کی غیر ذمہ داری کے سوا اور کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

اردوئے معلی : حصہ اول

"اردوئے معلی" کا یہ ری پرنٹ مطبع فاروقی' دہلی سے ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا۔ ۳۸۴ صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ ۱/۴-۶" x ۱/۲-۹" کے سائز پر شائع ہوا۔ کتاب کے آخر میں سید عبدالسلام ابن سید محمد معظم پروپرائٹر مطبع فاروقی کی طرف سے اعلان ہے کہ : "کاپی رائٹ محفوظ ہے"۔

مکمل اردوئے معلی : مشتمل بر ہر دو حصہ

"اردوئے معلی" کا یہ اڈیشن ماہ ذی حجہ ۱۳۴۰ھ مطابق جولائی ۱۹۲۲ء مطبع مجیدی کانپور سے' ۳۸۴ صفحات پر مشتمل' ۱/۲-۶" x ۳/۴-۹" کے سائز پر شائع ہوا۔

اب تک "اردوئے معلی" کے تمام مجموعوں میں مکتوب الیہم کی فہرست نہیں ہوتی تھی اور ایک ہی مکتوب الیہ کے نام کے خطوط یکجا ہونے کے بجائے مجموعے میں بکھرے ہوتے تھے۔ غالباً یہ پہلا مجموعہ ہے' جس میں محمد منیر نے ترتیب متن کا ابتدائی کام کیا ہے۔ سب سے پہلے غالب کے مختصر سوانح دیے گئے ہیں۔ ہر مکتوب الیہ کے نام کے خطوط ایک جگہ کر دیے گئے ہیں۔ خطوط کی فہرست میں ہر مکتوب الیہ کے نام کے سامنے اس کے نام کے کل خطوط کی تعداد بھی لکھی گئی ہے۔

کتاب کے آخر میں یہ نوٹ دیا گیا ہے : "چوں کہ یہ مجموعہ یہ ترتیب نو بہ صرف زر کثیر تیار کرایا گیا ہے' لہٰذا حق ترتیب بحق مطبع ہذا محفوظ ہے۔ کوئی صاحب بلا اجازت مالک مطبع اس ترتیب سے نہ چھاپیں"۔

اردوئے معلی مکمل : ہر حصہ مع ضمیمہ

غالب کے خطوط کا یہ مجموعہ شیخ مبارک علی تاجر کتب' لاہور نے مطبع کریمی سے ستمبر ۱۹۲۲ء میں شائع کیا۔ ۴۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱/۲-۶" x ۱/۲-۹" کے سائز پر چھاپا گیا ہے۔ شروع میں ادیب کا لکھا ہوا پندرہ صفحات پر مشتمل' مرزا غالب دہلوی کے عنوان سے ایک دیباچہ ہے۔ اس دیباچے میں غالب کی زندگی کے کچھ اہم واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

مولانا حسرت موہانی نے اردو معلی (علی گڑھ' دسمبر ۱۹۰۷ء) غالب کے قدر بلگرامی کے نام بائیس خط اور ایک خط شیخ لطیف احمد بلگرامی کے نام شائع کیے تھے۔ ان خطوط کو بھی اس مجموعے میں ضمیمے کے تحت شامل کر لیا گیا ہے۔ ضمیمے کے شروع میں شیر محمد سرخوش کی ۶ صفحات پر مشتمل پر ایک تحریر ہے' جس میں خطوط غالب کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔

اس مجموعے کے ری پرنٹ میرے پیش نظر ہیں۔ پہلا ری پرنٹ ستمبر ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا ۱۹۲۶ء میں اور تیسرا ۱۹۳۰ء میں چھپا تھا۔ ممکن ہے اس کے بعد بھی کوئی اور ری پرنٹ شائع ہوا ہو۔

عود ہندی : ری پرنٹ

رام نرائن لال ' الہ آباد سے " عود ہندی " کا یہ ری پرنٹ ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا تھا - یہ ری پرنٹ ۳۱۸ صفحات پر مشتمل اور ۱/۲ - ۴ × ۶ کے سائز پر ہے - اس کی خصوصیت صرف یہ ہے کہ اس کے آخر میں ۶۴ صفحات پر مشتمل الفاظ کی فرہنگ شامل کی گئی ہے -

ادبی خطوط غالب مرتبہ مرزا محمد عسکری

غالب کے خطوط کا اپنی نوعیت کا یہ پہلا مجموعہ ہے - اس مجموعے میں ایسے خطوط کا انتخاب کیا گیا ہے ' جن میں غالب نے " نکات ادبیہ حل کیے ہیں ' اشعار کے معنی سمجھائے ہیں اور شعرا کے متعلق رائے زنی کی ہے " ترپن صفحات کے دیباچے میں غالب کے خطوط کی خصوصیات تفصیل سے بیان کی گئی ہیں - اس موضوع پر شاید یہ پہلی جامع تحریر ہے - پھر خطوط کا انتخاب دیا گیا ہے - آخر میں غالب کے تینتیس مکتوب الیہم کے حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں - اس انداز کا کام اردو میں پہلی بار ہوا ہے -
یہ کتاب ۳۰۴ صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۹۲۹ء میں نظامی پریس ' لکھنؤ سے شائع ہوئی -

مکاتیب غالب مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی

رام پور کے نواب یوسف علی خاں ناظم اور ان کے صاحب زادے نواب کلب علی خاں ' غالب کے شاگرد تھے - غالب کو دربار رام پور سے جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی - جو مرتے دم تک انھیں ملتی رہی ' اس لیے غالب اور نوابان رام پور میں سلسلہ مراسلت تھا - اہل اردو کی خوش نصیبی ہے کہ غالب کے خطوط کا بڑا حصہ محکمہ عالیہ دار الانشاء رام پور میں محفوظ تھا - ۱۹۳۶ء میں ریاست کے چیف منسٹر کرنل بشیر حسین زیدی نے ان خطوط کو مرتب کرا کے شائع کرنے کا منصوبہ تیار کیا - اس کام کے لیے ان کی نظر انتخاب مولانا امتیاز علی خاں عرشی جیسے عالم پر پڑی - عرشی صاحب نے غالب کے ۱۱۷ خطوط کا تنقیدی متن تیار کیا - ان خطوط کے مکتوب الیہم کی تفصیل یہ ہے :

یوسف علی خاں ناظم	۴۲ (۳۸ اردو اور ۴ فارسی)
نواب کلب علی خاں	۶۵
نواب زین العابدین خاں بہادر عرف کلن میاں	۲
خلیفہ احمد علی رام پوری	۱
منشی سیل چند	۶

مولوی محمد حسن

مکاتیب غالب کا پہلا اڈیشن ۱۹۳۷ء میں مطبع قیمہ بمبئی سے شائع ہوا - اڈیشن ٹائپ کے ذریعہ چھاپا گیا تھا اور طباعت کا بہترین نمونہ تھا - اس کے چھے ری پرنٹ شائع ہوئے۔ آخری اور چھٹا ری پرنٹ ۱۹۴۹ء میں رام پور سے شائع ہوا۔ مولانا عرشی نے مکاتیب غالب میں ایک سو اسی صفحات پر مشتمل ایک مبسوط مقدمہ لکھا - جس میں سرگذشت غالب ' تصانیف ' لوازمات امارت ' انگریزی تعلقات ' بہادر شاہ ظفر سے تعلقات ' تعلقات رام پور ' انشائے غالب ' متعلقات انشا اور طباعت خطوط کے عنوانات کی تحت غالب کے سوانح لکھے ہیں اور غالب کی خطوط نگاری کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ اس کے بعد خطوط کا متن دیا گیا ہے۔ متن کے بعد اشخاص و قبائل ' مقامات اور کتب و اخبارات کے تین مکمل اشاریے دیے گئے ہیں - اس سے پہلے کسی نے خطوط غالب کے اشاریے تیار نہیں کیے تھے۔ عرشی صاحب نے پہلی بار یہ کام کیا ہے -

مولانا عرشی نے ان خطوط کا تنقیدی اڈیشن انتہائی سائنٹیفک انداز میں اور غیر معمولی احتیاط سے تیار کیا ہے - پورے متن میں مشکل ہی سے کوئی غلطی نکلے گی - خطوط پر بڑی محنت اور عالمانہ انداز سے حواشی لکھے گئے ہیں - کسی بھی خط میں شاید ہی کوئی ایسا واقعہ ہو ' جو تشریح طلب ہو ' اور عرشی صاحب نے اس پر حاشیہ نہ لکھا ہو -

خطوط غالب : مرتبہ مہیش پرشاد

اگرچہ " عود ہندی " اور " اردوئے معلی " کے مختلف ری پرنٹ اور اڈیشن شائع ہوتے رہے لیکن غالب کے تمام خطوط کو یکجا کر کے ان کا تنقیدی اڈیشن تیار کرنے کا خیال پہلی بار مولوی مہیش پرشاد کو آیا - انھوں نے ہر ممکن ذریعے سے غالب کے خطوط جمع کیے - بڑی محنت اور جستجو سے بعض ایسے اصل خطوط بھی تلاش کیے جو غالب کے خطوط کے مجموعوں میں شامل ہو چکے تھے - ان خطوط کی بنیاد پر نئے اڈیشن کا متن قائم کیا گیا - وہ خطوط بھی یکجا کیے گئے جو مجموعوں میں شامل نہیں ہو سکے تھے - کچھ ایسے غیر مطبوعہ خطوط بھی حاصل کیے گئے جو غالب کے مکتوب الیہم کے وارثوں کی ملکیت تھے۔ مولوی صاحب نے " مکاتیب غالب " مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی میں شامل نواب یوسف علی خاں ناظم کے نام سینتیس خطوط بھی اس اڈیشن میں شامل کیے - "عود ہندی " کے پہلے اڈیشن اور "اردوئے معلی" کے پہلے تین اڈیشنوں اور "مکاتیب غالب" اور غالب کے جو اصل خطوط یا ان کے عکس فراہم ہوئے تھے ' انھیں بنیادی نسخوں کے طور پر استعمال کیا گیا۔
متن کی نظر ثانی اور طباعت کی نگرانی ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم نے کی -

مولانا عرشی کے " مکاتیب غالب " کے بعد غالب کے خطوط کا یہ پہلا مجموعہ تھا ' جس کی ترتیب اور طباعت میں اتنا اہتمام کیا گیا - یہ اڈیشن دو جلدوں میں شائع کرنے کا پروگرام بنایا گیا - پہلی جلد ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سے ۱۹۴۱ء میں ٹائپ میں شائع ہوئی - مولوی صاحب دوسری جلد مرتب کر ہی رہے تھے کہ موت نے

انھیں ہم سے چھن لیا - اور یہ کام ادھورا رہ گیا - انجمن ترقی اردو (ہند) نے مرحوم کے وارثوں سے دوسری جلد کا مسودہ اور خطوط غالب سے متعلق اکٹھا کیا ہوا تمام مواد خرید لیا - افسوس ہے کہ انجمن میں دوسری جلد کا مسودہ گم ہو گیا -

پہلی جلد میں مرزا تفتہ - جواہر سنگھ جوہر - بدرالدین فقیر - عبدالجمیل جنون - انورالدولہ شفق - سید یوسف مرزا - یوسف علی خاں عزیز - احمد حسین میکش - غلام حسنین قدر بلگرامی - نواب یوسف علی خاں ناظم - حکیم غلام نجف خاں - میر مہدی مجروح - شہاب الدین احمد خاں ثاقب - مرزا حاتم علی مہر - صاجزادہ زین العابدین - علاء الدین احمد خاں علائی - شیو نرائن آرام - اور دو ایسے خطوط جن کے مکتوب الیہم کے نام معلوم نہیں ہو سکے ؛ شامل ہیں -

کسی بھی کا تنقیدی اڈیشن تیار کرنے میں اہم مرحلہ املا کا ہوتا ہے - بعض متنی نقادوں کا خیال ہے کہ املا وہی ہونا چاہیے ؛ جو مصنف کی تھی اور بعض کا خیال ہے کہ قدیم متن کو جدید املا میں لکھا جانا چاہیے - طریقہ کوئی بھی اختیار کیا جائے ؛ ضروری یہ ہے کہ شروع سے آخر تک ایک ہی طریقہ برتا جائے - "خطوط غالب" میں ایسا نہیں کیا گیا - جس کی دو وجوہ ہیں - ایک تو یہ کہ مولوی مہیش پرشاد کو غالب کی املا کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں تھیں ؛ اور دوسرے اس سلسلے میں انھوں نے کوئی باقاعدہ اصول نہیں بنایا -

مولوی مہیش نے "خطوط غالب" کے دیباچے میں اطلاع دی ہے کہ انھیں کافی تعداد میں غالب کے اصل خطوط دستیاب ہو گئے ہیں - لیکن مقدمے میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے غالب کی اردو املا کے بارے میں جو کچھ کہا ہے ؛ اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کی املا پر انحصار خیال کرتے ہوئے ان کے پیش نظر بہت کم اصل خطوط تھے اور ان خطوط میں غالب کی املا کی جو روش ہے ؛ اسے ہی "خطوط غالب" کے متن کی املا بنا لیا گیا ہے ؛ جو کسی طرح بھی درست نہیں - "خطوط غالب" کے مقدمے میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی لکھتے ہیں کہ "خطوط غالب" کے متن کے قائم کرنے میں ان تمام اصول کا لحاظ رکھا گیا ہے ؛ جنھیں غالب مانتے تھے اور جو صحیح ہیں ؛ البتہ ان کی طرز کتابت کی پیروی میں "ہات" "رت" اور بعضے اور اردو لفظ اسی طرح لکھے گئے جس طرح غالب لکھا کرتے تھے - "اردوئے معلی" کے پہلے اڈیشن پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ : "یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نسخے کے کاتب نے غالب کی طرز کتابت یا املا کو اکثر جگہ برقرار رکھا ہے - گو بعضی باتوں میں اس کی پابندی نہیں بھی کی ہے ...اس لیے "خطوط غالب" کا متن سوا اس قلمی مواد کے جو میرے سامنے تھا ؛ اس نسخے پر قائم کیا گیا" - ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال درست نہیں - کیوں کہ غالب کے جو اصل خطوط دستیاب ہوئے ہیں ؛ ان کی اور "اردوئے معلی" طبع اول کے متن کی املا میں زمین آسمان کا فرق ہے - جو ظاہر ہے غالب کی املا سے بہت مختلف ہے اور غالب کی املا کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے جو بیانات دیئے ہیں ؛ ان میں سے بعض درست نہیں - ڈاکٹر عبدالستار صدیقی لکھتے ہیں : "ہاتھ" غالب نے جب لکھا "ہات" لکھا" - یہ درست نہیں ؛ کیوں کہ غالب کے خطوط میں اس لفظ کی املا تین طرح ملتی ہے : "ہاتھ" ؛

"ہاتھ" اور "ہات" اور بھی کئی لفظ ہیں جن کی املا غالب نے ایک سے زیادہ طریقے سے کی ہے۔ مثلاً "روانا" روانہ" ۔ "خط" خط" ۔ "میرزا" مرزا" ۔ "بجہ" بجہ" ۔ "نواب" نواب" ۔ "روپے" روپیئے" وغیرہ ۔ مولوی مہیش نے "ہات" ، "روانا" ۔ "خط" کبھی "میرزا" اور کبھی "مرزا" ، "روپے" اور "نواب" وغیرہ کی املا کو اپنایا ہے ۔

مولوی مہیش نے "خطوط غالب" کا متن تیار کرنے میں کئی طریقے اپنائے ہیں ۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ غالب جن الفاظ کی املا ایک سے زیادہ طریقے سے کرتے تھے ، ان میں سے ایک کو قبول کر لیا ہے ۔ مثلاً "روانا" ، "ہات" ، "ہاتی" وغیرہ اور اس ترجیح کی وجہ نہیں بتائی ۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مولوی صاحب نے بھی ایک لفظ کی املا دو طرح کی ہے ۔ مثلاً "مرزا" ، "میرزا" اور "نواب" وغیرہ۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ غالب کی غلط املا کو اپنالیا گیا ہے ۔ مثلاً غالب تمام فارسی الفاظ "ز" سے لکھتے تھے ، کیوں کہ ان کو غلط فہمی تھی کہ فارسی میں "ذ" نہیں ہے ۔ مولوی صاحب نے بھی تمام فارسی الفاظ غالب کی منشا کے مطابق "ز" سے لکھے ہیں ۔

چوتھا طریقہ یہ ہے کہ اگر غالب نے بعض الفاظ کی املا غلط کی ہے ، تو ان کو درست املا میں لکھا گیا ہے ۔ مثلاً غالب "باالفعل" اور "باالکل" لکھتے تھے ۔ ان الفاظ کو مولوی صاحب نے درست املا میں لکھا ہے ۔

پانچواں طریقہ انگریزی الفاظ کی املا میں اپنایا گیا ہے ۔ عام طور سے غالب انگریزی الفاظ کی املا جدید املا سے مختلف کرتے تھے ۔ مثلاً غالب "گورمنٹ" ، "سارتی فکٹ" اور "لاڈو" لکھتے تھے۔ ان الفاظ کو مولوی صاحب نے "گورنمنٹ" ، "سارٹی فکٹ" اور "لارڈ" لکھا ہے ۔ اس کے برعکس بعض انگریزی الفاظ کی املا وہی کی گئی ہے جو غالب کرتے تھے ۔ مثلاً "پنسن" وغیرہ۔ مختلف طریقے اپنانے کی وجہ سے "خطوط غالب" کے متن کی املا ایسی ہو گئی ہے جو نہ جدید ہے اور نہ غالب کی ہے ۔

"عود ہندی" اور "اردوئے معلیٰ" میں کسی طرح کی کوئی ترتیب نہیں تھی ۔ ایک مکتوب الیہ کے نام کے خطوط بھی یکجا نہیں کیے گئے تھے ۔ غالباً پہلی بار "اردوئے معلیٰ" کے اس اڈیشن میں ترتیب قائم کی گئی جو مطبع مجیدی کانپور سے ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا ۔ اس اڈیشن میں ایک مکتوب الیہ کے نام کے تمام خطوط یکجا کیے گئے ۔ لیکن ابھی صورت حال یہ تھی کہ ایک مکتوب الیہ کے نام کے بعض خطوط "عود ہندی" میں تھے اور بعض "اردوئے معلیٰ" میں اس کے علاوہ اب تک خطوط کی تاریخ وار ترتیب کسی مجموعے میں نہیں تھی ۔ مولوی مہیش نے پہلی بار ایک مکتوب الیہ کے نام تمام دستیاب خطوط کو یکجا کر کے انھیں تاریخ وار ترتیب دیا ۔

"عود ہندی" میں بہت کم خطوں پر تاریخ تحریر ہے ۔ غالباً مرتبین نے تاریخیں شائع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی ۔ اس کے برعکس "اردوئے معلیٰ" کے کافی خطوط پر تاریخیں ہیں ۔ تاریخ تحریر کے لحاظ سے غالب کے خطوط کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ ایک تو وہ خطوط جن پر مکمل تاریخ تحریر ہے ۔

دوسرے وہ خطوط جن پر تاریخ یا مہینا یا دونوں ہیں لیکن سنہ نہیں ہے ' اور تیسرے وہ جن پر تاریخ تحریر بالکل نہیں - مولوی صاحب نے پہلی بار ان خطوط کی تاریخ تحریر متعین کرنے کی کوشش کی ' جن پر تاریخ نہیں تھی بعض خطوں پر تو قوسین میں متعین کی ہوئی تاریخ دے دی ہے - جن خطوں کی تاریخ تحریر کا تعین نہیں ہو سکا لیکن زمانہ تحریر کا اندازہ ہوگیا ہے - تو ان کی ترتیب اس طرح کی ہے کہ پڑھنے والے کو زمانہ تحریر کا اندازہ ہو جاتا ہے - مثلاً اگر ایک ایسا خط ہے جس پر تاریخ تحریر نہیں ہے اور مولوی صاحب کو اندازہ ہوا ہے کہ یہ اگست ۱۸۶۳ء میں لکھا گیا ہو گا تو اس خط کو جولائی ۱۸۶۳ء اور ستمبر ۱۸۶۳ء کے درمیان ترتیب دے دیا ہے - کافی خطوط ایسے ہیں جن کی تاریخ تحریر کا تعین مولوی صاحب نے کیا ہے - لیکن انھوں نے کسی تاریخ کے بارے میں اپنے دلائل پیش نہیں کیے اور بہ قول قاضی عبدالودود "متعدد خطوط کے زمانہ کتابت کی نسبت جو اطلاعات دی گئی ہیں ' وہ غیر صحیح اور ناکافی ہیں " - یہ حقیقت ہے کہ مولوی صاحب کی متعین کی ہوئی اکثر تاریخیں غلط ہیں - چوں کہ مولوی صاحب کی مرتبہ "خطوط غالب" کو مستند ترین نسخہ تسلیم کیا جاتا ہے اس لیے غالب کے سوانح نگاروں اور نقادوں نے ان خطوط کی تاریخ تحریر کی بنیاد پر بعض ایسے نتائج نکالے جو درست نہیں تھے - ان ناقدوں کا قصور یہ نہیں تھا کہ انھوں نے بعض بے بنیاد باتیں کہیں ' ان کا قصور یہ تھا کہ انھوں نے مولوی صاحب کی متعین کی ہوئی تاریخوں پر بھروسا کیا - ان تاریخوں کے بارے میں چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

تفتہ کے نام ایک خط پر تاریخ تحریر نہیں ہے لیکن خط میں غالب نے لکھا ہے : "آج پنجشنبہ ۱۲ ستمبر کو ڈاک میں بھجوا دیا" - مولوی صاحب کو نہ جانے کن وجوہ کی بنا پر خیال ہوا کہ یہ خط ۱۸۶۳ء میں لکھا گیا - لیکن مشکل یہ آپڑی کہ ۱۸۶۳ء میں پنجشنبے کے دن ستمبر کی ۱۰ تاریخ تھی ۱۲ نہیں - مولوی صاحب نے فقرے کو اس طرح کر دیا " آج پنجشنبہ ۱۰ ستمبر (۱۸۶۳ء) کو ڈاک میں بھجوا دیا " قوسین سے اندازہ ہوتا ہے کہ ' قوسین میں اضافہ مولوی صاحب کا ہے - باقی تمام الفاظ غالب کے ہیں - حال آں کہ مولوی صاحب نے "۱۲ ستمبر" کو بدل کر "۱۰ ستمبر" کر دیا ہے - اور اس تبدیلی کی کوئی اطلاع نہیں دی - خطوط کے اندرونی شواہد اس حق میں ہیں کہ یہ تاریخ " ۱۲ ستمبر " بالکل درست ہے - سنہ کے تعین میں مولوی صاحب سے غلطی ہوئی ہے "سنہ ۱۸۶۳ء نہیں "۱۸۶۱ء" ہے - اب دوسری طرح کی مثالیں لیجیے - " اردوئے معلیٰ" کے پہلے ایڈیشن میں علائی کے نام ایک خط ہے جس پر تاریخ تحریر "یکشنبہ ۲۷ جولائی ۱۸۶۳ء" ہے - تقویم کی رو سے اور خط کی اندرونی شہادتوں کی بنیاد پر یہ "۱۸۶۲ء" ہونا چاہیے - مولوی صاحب نے " ۱۸۶۳ء " کو بدل کر ۱۸۶۲ء کر دیا ہے لیکن اس کی کوئی اطلاع نہیں دی - اس طرح تفتہ کے نام ایک خط پر تاریخ تحریر " ۷ دسمبر ۱۸۵۸ء " درج تھی ' جو غلط تھی - مولوی صاحب نے اسے درست کر کے " ۲۷ دسمبر " کر دیا ہے - لیکن اس تصحیح کی طرف بھی کوئی اشارہ نہیں کیا۔

متنی تنقید کا ایک اہم ترین اصول یہ ہے کہ آپ متن کی ترتیب کے لیے جو بھی اصول اپنائیں ' ان کی

پابندی شروع سے آخر تک کریں - مولوی صاحب نے ایسا نہیں کیا - ایسا لگتا ہے کہ جب بھی کسی قرات کا مسئلہ سامنے آیا' انھوں نے اس قرات کی بنیاد پر فیصلہ کر لیا' کسی سوچے سمجھے اصول کی بنیاد پر نہیں - مولوی صاحب نے بے شمار قراتیں بدلی ہیں اور اکثر اس کی اطلاع نہیں دی' جس سے یقینا پڑھنے والے کو یہ تاثر ہوتا ہے کہ غالب کے اصل خط یا پہلے اڈیشن میں یہی قرات تھی - حال آں کہ ایسا نہیں ہے - ایسے مقامات بہت کم ہیں جہاں مولوی صاحب نے قیاسی تصحیح کی نشان دہی کی ہے۔

متن کی ترتیب میں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ ہم اس متن کا تنقیدی اڈیشن تیار کر رہے ہیں جو مصنف کے ذہن میں تھا نہ کہ اس متن کا جو کاغذ پر منتقل ہوا - یعنی اگر مصنف سے عبارت میں کسی لفظ کا اضافہ ہو گیا ہے یا کوئی لفظ چھوٹ گیا ہے یا کوئی لفظ مکرر لکھا گیا یا کسی لفظ کی املا غلط لکھی گئی تو ان میں سے کوئی چیز مصنف کی منشا کے مطابق نہیں - جو متن مصنف کے ذہن میں تھا اسے کاغذ پر منتقل کرتے ہوئے سہو ہوا - اس لیے ہمارے لیے ضروری ہے کہ تحریر کی غلطیوں کو درست کر کے حواشی میں ان کی نشان دہی ضرور کر دیں - مولوی صاحب نے یہاں بھی کسی ایک طریقے کی پابندی نہیں کی -

مثلاً " خطوط غالب " میں پہلی تصحیح کی نشان دہی ص ۷ پر کی گئی ہے۔ غالب کے اپنے قلم سے (اصل خط کا عکس "خطوط غالب" میں شامل ہے)۔ ایک لفظ "سہرت" لکھا ہے ظاہر ہے کہ یہ غالب کا سہو قلم ہے ورنہ یہ لفظ "سورٹھ" ہے۔ متن میں غلط قرات رہنے دی گئی اور حاشیے میں صحیح قرات دی گئی ہے۔

دوسری تصحیح کی نشان دہی ص ۱۴ پر کی گئی ہے۔ متن میں قرات ہے"۔ وہ لکھتا ہے کہ راجا مرا' رانی مری"۔ اصل قرات یہ ہونی چاہیے "وہ لکھتا ہے کہ راجا مرا' رانی نہیں مری"۔ مولوی صاحب نے متن میں قوسین میں "نہیں" کا اضافہ کر دیا۔ اور غلط قرات حاشیے میں دے دی - یہ گویا تصحیح کا دوسرا طریقہ اپنایا گیا۔

ایک تصحیح کی نشان دہی ص ۱۵ پر کی ہے۔ متن میں "انیس روپیے کئی آنے" خط کی اندرونی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے "انتیس روپیے کئی آنے" ہونا چاہیے - مولوی صاحب نے متن کو درست کر دیا اور اس کی نشان دہی حاشیے میں کر دی - یہاں تصحیح متن کا تیسرا طریقہ اپنایا گیا ہے -

ان تین مثالوں کے ذریعے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ مولوی صاحب نے متنی تنقید کے کسی اصول کی پابندی نہیں کی - جہاں جو مناسب سمجھا ویسا کر لیا -

" خطوط غالب " میں متن کی خاصی غلطیاں ہیں - تفتہ کے نام غالب کے ایک اصل خط کا عکس بھی مولوی صاحب نے " خطوط غالب " میں شامل کیا ہے - مولوی صاحب نے عکس کے ساتھ جو متن شائع کیا ہے' اس میں ایک غلطی ہے۔ اس طرح علائی کے نام بھی ایک خط کا عکس شائع کیا گیا ہے۔ مولوی صاحب نے اس گیارہ سطری خط کا جو متن شائع کیا ہے' اس میں پانچ الفاظ ہیں۔ تمام خطوں میں غلطیوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں ہے مگر پھر بھی متن کی غلطیاں ہیں کافی تعداد میں۔

متنی تنقید کا ایک اہم ترین اصول یہ بھی ہے کہ متنی نقاد یہ اطلاع دے کہ اس نے کس نسخے کو بنیادی نسخہ

بتایا ہے اور کیوں بتایا ہے؟ مولوی صاحب نے دیباچے میں اطلاع دی ہے کہ غالب کے کون کون سے اصل خطوط مل گئے تھے جن سے انھوں نے مطبوعہ خطوں کا موازنہ کیا ہے ان اصل خطوط کے بارے میں اطلاع دیتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے :

"....انورالدولہ شفق کے نام گیارہ خط اعظم گڑھ میں کسی صاحب کے پاس ہیں - پنڈت رامیشر دیال ' ڈپٹی کلکٹر کا احسان مند ہوں کہ ان کی وساطت سے ان خطوں سے مطبوعہ خطوں کا مقابلہ کیا جا سکا ...... نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی ' ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب ' خاں بہادر سید ابو محمد صاحب ممبر پبلک سروس کمیشن صوبہ متحدہ ' پنڈت گوپی ناتھ کنزروصاحب ایڈوکیٹ الہ آباد ' آغا محمد اشرف صاحب دہلوی ' کرائسٹ کالج ' کیمبرج ' سید فرخ حیدر صاحب رئیس شمس آباد (فتح گڑھ) ' پروفیسر حافظ محمود شیرانی صاحب ' منشی اقبال حسین بیگ صاحب ' اودے پور ' سید بشرالدین حیدر صاحب موسوی نے مختلف خطوط یا نقل مقابلے کے لیے عنایت فرمائے جن سے کتاب کی ترتیب و تکمیل میں بڑی مدد ملی -"

مولوی صاحب کے ان بیانات نے خاصی دشواری پیدا کر دی ہے - انورالدولہ شفق کے نام غالب کے اکیس خطوط ہیں۔ ان میں سے گیارہ خط اصل شکل میں مولوی صاحب کو مل گئے تھے مگر ہمیں یہ پتا نہیں چلتا کہ وہ گیارہ خط کون سے تھے ؟ شفق کے نام خطوط کے متن میں خاصے اختلافات نسخ ہیں۔ اگر مولوی صاحب ان خطوط کی نشان دہی کر دیتے تو ظاہر ہے کہ ان کی قراتوں کو مطبوعہ خطوں کی قراتوں پر ترجیح دی جاتی۔ مولوی صاحب نے جن لوگوں سے خطوط یا نقلیں حاصل کی ہیں' ان کا شکریہ ادا کیا ہے۔ ان حضرات کی تعداد کافی ہے لیکن وہ کون سے خطوط ہیں جن کی اصل یا نقل ان حضرات سے دستیاب ہوئی تھی' اس کی کوئی اطلاع نہیں دی گئی - اگرچہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے "مقدمہ" میں لکھا ہے کہ :

"خطوط غالب" کی دوسری جلد کے آخر میں کچھ ضمیمے اور اشاریے ہوں گے۔ انہی میں ایک فہرست خطوں کی ہوگی اور اس میں ہر خط کے متعلق یہ بتایا جائے گا کہ وہ کہاں سے لیا گیا ہے"۔ یہ ضمیمے اور اشارے "خطوط غالب" کی اس دوسری جلد میں شامل تھے' جس کا مسودہ مولوی مہیش کے انتقال کے بعد انجمن ترقی اردو (ہند) نے خرید لیا تھا اور جو انجمن کے دفتر سے گم ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ مولوی مہیش نے غالب کے کئی اصل خط اور کئی خطوں کے عکس بھی فراہم کیے تھے جنھیں مرحوم دوسری جلد میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ بدنصیبی ہے کہ ان میں سے بیشتر ضائع ہو گئے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) میں مہدی مجروح کے نام غالب کا اصل خط ' کچھ لفافوں پر غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے پتے اور خطوط غالب کے کچھ عکس موجود ہیں۔ انجمن کو یہ سب چیزیں مولوی مہیش کے کاغذات میں سے ملی تھیں۔ ان تمام کوتاہیوں کے باوجود ہمیں یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ مولوی صاحب نے پہلی بار غالب کے خطوط کو تاریخ وار ترتیب دیا تھا۔ انھوں نے خطوں کے تنقیدی اڈیشن کی تیاری میں جس محنت اور دیدہ ریزی سے کام لیا' وہ قابل قدر ہے۔ اگر مرحوم متنی تنقید کے اہم اصولوں کی پابندی کرتے اور متن کی درستی کا خاص خیال کرتے تو یہ کام بہت معیاری ہوتا۔

نادرات غالب مرتبہ آفاق حسین آفاق

میرن دہلوی نے منشی نبی بخش حقیر کے نام غالب کے ۳۷ خطوط اور منشی عبداللطیف کے نام ایک خط فراہم کرکے مرتب کیے تھے ۔ خطوں کا یہ مجموعہ مسودے کی شکل میں میرن صاحب کے نواسے آفاق حسین آفاق کو ملا۔ انھوں نے یہ تمام خطوط "نادرات غالب" کے نام سے مرتب کیے۔ "نادرات غالب" ۱۹۴۹ء میں ادارہ نادرات' کراچی سے شائع ہوئی۔ آفاق صاحب نے مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی مرتبہ "مکاتیب غالب" کو اپنا نمونہ بنایا۔ شاید اسی لیے یہ کام خاصا اچھا ہوا۔ ۱۳۵ صفحات پر مشتمل مقدمہ ہے' جس میں مختلف عنوانات کے تحت منشی نبی بخش حقیر اور غالب کے حالات اور غالب کی تصنیفات پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ غالباً" پہلی بار غالب کے ۹۳ شاگردوں کے مختصر حالات بیان کیے گئے ہیں۔ آخر میں متن کے حواشی درج ہیں۔ کتابت کی غلطیاں بہت زیادہ ہیں۔

خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر

غلام رسول مہر نے غالب کے تمام خطوط یکجا کر کے " خطوط غالب " کے نام سے ۱۹۵۱ء میں کتاب منزل ' لاہور سے شائع کرائے ۔ اس مجموعے میں " مکاتیب غالب " اور " نادرات غالب " کے خطوط شامل نہیں کیے گئے ۔ غالب کے خطوط کا ایسا مجموعہ جس میں تقریباً سب خطوط شامل کر لیے گئے ہوں ' پہلی بار شائع ہوا ۔

"خطوط غالب" کے اب تک کم سے کم تین ری پرنٹ شائع ہو چکے ہیں ۔ اس کا ایک ری پرنٹ جو غالباً" تیسرا ہے ' نسخ ٹائپ میں پنجاب یونی ورسٹی ' لاہور سے بھی شائع ہوا۔ طباعت کے اعتبار سے یہ ری پرنٹ بہت صاف ستھرا اور خوبصورت چھپا ہے۔ مہر صاحب نے اس مجموعے میں ہر مکتوب الیہ کے نام کے تمام خطوط تاریخ وار ترتیب دیے ہیں۔ مکتوب الیہم کے حالات بھی ہیں لیکن ماخذ کے حوالے کہیں نہیں دیے گئے ۔ خطوط میں بہت سے ایسے واقعات کا ذکر ہے جنھیں عام قاری نہیں سمجھ سکتا تھا' مہر صاحب نے حاشیے میں ایسے بہت سے واقعات کی تفصیل بیان کر دی ہے۔

جن لوگوں نے مولانا مہر کی دوسری تصنیفات کا مطالعہ کیا ہے' وہ میرے اس بیان کی تصدیق کریں گے کہ مولانا ایک جید عالم تھے لیکن نہ جانے کیوں غالب کے خطوط کی ترتیب میں انھوں نے بہت لاپروائی بلکہ غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا۔ مولانا نے متنی تنقید کے کسی اصول کی پابندی نہیں کی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے خطوط غالب کے عام نسخے لے کر کاتب کو دے دیئے اور کتابت پڑھنے کا کام دوسروں سے لیا۔ میں پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ آج تک غالب کے خطوط کا کوئی مجموعہ اتنا غلط نہیں چھپا' جتنا کہ "خطوط غالب" ہے۔ متن کی حالت یہ ہے کہ کوئی صفحہ ایسا نہیں ہے' جس میں متن کی آٹھ دس سے کم غلطیاں ہوں۔ صرف ایک مثال دیتا ہوں ۔ نواب حسین مرزا کے نام غالب کے چار خط "اردوئے معلی" میں شامل تھے۔ دو مزید

خطوں کے عکس بعد میں شائع ہوئے۔ مولانا نے "عکسوں" خط اپنے مجموعے میں شامل کر لیے۔ جن خطوط کے عکس ان کے پیش نظر تھے، ان میں سے ایک کے متن میں تیس اور دوسرے کے متن میں نو غلطیاں ہیں۔ اس لیے اس مجموعے پر مزید تبصرے کی گنجائش نہیں ہے۔

غالب کی نادر تحریریں مرتبہ خلیق انجم

غالب کے خطوط کا یہ مجموعہ اس نوعیت سے دوسرے مجموعوں سے مختلف ہے کہ اس میں صرف وہ خطوط شامل کیے گئے ہیں جو "عود ہندی" اور "اردوئے معلی" میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے اور بعد میں مختلف رسالوں میں شائع ہوئے۔ یہ مجموعہ ۱۹۶۱ء میں مکتبہ شاہراہ دہلی سے شائع ہوا۔ اس میں مختلف لوگوں کے نام غالب کے ۳۹ خطوط اور ۱۹ مختلف تحریریں ہیں۔ اس مجموعے میں متنی تنقید کے کسی بنیادی اصول کی پابندی نہیں کی گئی، متن کی ترتیب میں بہت لا پروائی سے کام لیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ متن میں بے شمار غلطیاں راہ پا گئیں اور ایک اچھا کام نا تجربہ کاری کی نذر ہو گیا۔

خطوط غالب مرتبہ مہیش پرشاد بہ نظر ثانی مالک رام

مہیش پرشاد کے انتقال کے بعد ان کے مسودات اور ادبی کاغذات انجمن ترقی اردو (ہند) نے خرید لیے۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے مشورے سے انجمن نے خطوط غالب کا دوسرا اڈیشن تیار کرنے کا کام مالک رام صاحب کو سونپا۔ یہ کام دو جلدوں میں ہونا تھا۔ پہلی جلد تو وہی جو چھپ چکی تھی اور دوسری جلد کا مسودہ انجمن نے حاصل کر لیا تھا۔ بدقسمتی سے دوسری جلد کا مسودہ انجمن سے گم ہو گیا۔

"خطوط غالب" کا دوسرا اڈیشن انجمن ترقی اردو سے ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ اس وقت مالک رام صاحب ہندوستان سے باہر تھے، انجمن کی غلطی سے اس کتاب پر مرتب کی حیثیت سے مالک رام صاحب کا نام چھپ گیا۔ مالک رام صاحب نے دوسرے اڈیشن میں منشی نبی بخش حقیر اور ان کے صاحبزادے منشی عبداللطیف کے نام کے خطوط کا اضافہ کیا ہے۔ مالک رام صاحب نے مولوی مہیش پرشاد کی متعین کی ہوئی بعض تاریخوں سے اختلاف کیا ہے اور کچھ ایسے خطوں کی تاریخ تحریر کا تعین کیا ہے جن پر تاریخ نہیں تھی۔

عود ہندی اور اردوئے معلی مرتبہ سید مرتضی حسین فاضل

۱۹۶۹ء میں ہندوستان اور پاکستان، دونوں ملکوں میں غالب کا جشن منایا گیا۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ غالب پر خاصی تعداد میں کتابیں اور مضامین شائع ہوئے۔ اکثر رسالوں نے غالب نمبر مرتب کیے۔ اس طرح غالب کے سوانح، شخصیت و سیرت اور غالب کے معاصروں، شاگردوں، دوستوں اور رشتہ داروں پر کافی مواد سامنے آ گیا۔ لیکن اس جشن کا ایک نقصان بھی ہوا، اور وہ یہ کہ جشن سے کچھ عرصہ پہلے ہی غالب پر کتابیں لکھنے یا غالب کی کتابیں مرتب کرنے کے پروگرام بنائے گئے۔ چوں کہ وقت کم تھا اور ہر حال میں ایک محدود

مدت میں کام پورا کرنا تھا' اس لیے جشن غالب کے موقع پر چھپنے والی بعض کتابوں کا معیار غیر اطمینان بخش اور بعض کا بہت پست رہا۔ فاضل صاحب کی مرتب کی ہوئی "عود ہندی" اور "اردوئے معلی" کا شمار بھی انہیں کتابوں میں ہے۔ اگرچہ ان کی مرتبہ "عود ہندی" ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی تھی۔

فاضل صاحب کے ان دونوں کتابوں کے یہ غور مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عجلت کی وجہ سے انھوں نے (۱) پہلے سے اپنے کام کا خاکہ نہیں بنایا (۲) تنقیدی اڈیشن تیار کرنے کے لیے باقاعدہ اصول نہیں بنائے (۳) متن کی املا پہلے سے طے نہیں کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہی لفظ کی املا دو دو طرح ملتی ہے (۴) متن کی ترتیب میں خاصی غیر ذمہ داری سے کام لیا اور (۵) اشاریے دوسرے لوگوں سے بنوائے۔

پہلی بات تو یہ سمجھ میں نہیں آئی کہ فاضل صاحب نے "عود ہندی" اور "اردوئے معلی" کو الگ الگ کیوں مرتب کیا۔ خطوط کے یہ مجموعے ایک صدی قبل یعنی اس زمانے میں ترتیب دیے گئے تھے۔ جب ترتیب متن کا اردو میں کوئی شعور نہیں تھا۔ ان مجموعوں میں ایک مکتوب الیہ کے نام کے خطوط یکجا نہیں کیے گئے' بلکہ پورے مجموعے میں بکھرے ہوئے ہیں۔ پھر ان مجموعوں میں خطوط' تاریخ وار مرتب نہیں کیے گئے۔ "اردوئے معلی" کے پہلے اڈیشن میں سب سے پہلے میر غلام بابا خاں بہادر کے نام کے خطوط ترتیب دیے گئے ہیں اور یہ ترتیب اس طرح ہے کہ پہلا خط ۲۲ مارچ ۱۸۶۶ء کا' دوسرا ۶ ستمبر ۱۸۶۳ء کا تیسرا ۳ اپریل ۱۸۶۷ء کا چوتھا ۶ اپریل ۱۸۶۳ء کا اور پانچواں ۹ اگست ۱۸۶۶ء کا ہے۔ باقی تمام خطوط کی ترتیب اسی طرح ہے۔ ظاہر ہے کہ ترتیب کا یہ طریقہ بہت غلط ہے۔ ہم "اردوئے معلی" اور "عود ہندی" کے پہلے اڈیشنوں کے مرتبین کو قصور وار نہیں ٹھہرا سکتے لیکن موجودہ زمانے میں اور خاص طور سے عرشی صاحب کے "مکاتیب غالب" کی اشاعت کے بعد اگر کوئی تن نقاد اسی ترتیب کو قائم رکھے تو اسے معاف نہیں کیا جاسکتا۔ غرض یہ ہے کہ "عود ہندی" اور "اردوئے معلی" کو الگ الگ شائع کرنے اور ان کی ترتیب میں کوئی تبدیلی نہ کرنے کا مالی منفعت کے علاوہ اور کوئی جواز سمجھ میں نہیں آتا۔

دونوں مجموعوں کو الگ الگ مرتب کرنے سے جو خامیاں پیدا ہوئیں' اس کی پہلی مثال یہ ہے کہ شاہ عالم کے نام کا خط "عود ہندی" اور "اردوئے معلی" دونوں مجموعوں میں شامل ہے۔ میں نے فاضل صاحب کے مرتبہ "اردوئے معلی" اور "عود ہندی" میں اس خط کے متن کا مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ دونوں مجموعوں کے متن میں صرف ایک قرات کو "اردوئے معلی" کے متن کے حوالے سے درست کیا گیا۔ باقی قراتوں کے اختلاف کی کسی مجموعے میں کوئی اطلاع نہیں دی گئی۔ دونوں مجموعوں میں اس خط کے متن میں سترہ تنی اختلافات ہیں۔ اور دونوں مجموعوں میں اس خط کی علامات اوقاف میں بھی کافی فرق ہے۔ "عود ہندی" کے متن میں چار وضاحتی حاشیے دیے گئے۔ اسی طرح بغل گیر ہونا' تموز' مقتضی جیسے لفظوں کے معنی "عود ہندی" کے حاشیوں میں دیے گئے ہیں "اردوئے معلی" میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ "اردوئے معلی" کے متن کے بارے میں حاشیے میں بتایا گیا ہے کہ "اردوئے معلی" کے پہلے اڈیشن میں یہ خط کس صفحے پر ہے اور یہ

بھی اطلاع دی گئی ہے کہ مختلف مطبوعہ میں یہ خط کس کس صفحے پر ہے "عود ہندی" کے حاشیے میں اس طرح کی کوئی اطلاع نہیں۔ میں نے یہاں صرف شاہ عالم کے نام غالب کے خط کا جائزہ لیا ہے' ورنہ تمام خطوط کا کم و بیش یہی حال ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں شاہ عالم کے نام کے کس متن پر بھروسہ کروں' اس متن پر جو فاضل صاحب نے "عود ہندی" میں مرتب کیا ہے' یا اس متن پر جسے "اردوئے معلی" میں ترتیب دیا ہے۔ متن کے اختلافات کی وجہ عجلت کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ایک ہی خط کے متن کو دو جگہ مرتب کیا گیا ہے۔ اور دونوں جگہ غیرذمے داری سے کام لیا گیا ہے۔

فاضل صاحب کے مرتبہ مجموعوں میں متن کی غلطیاں ہیں' لیکن مولانا غلام رسول مہر کے مرتبہ "خطوط غالب" کے مقابلے میں خاصی کم۔ بعض خطوط ایسے بھی ہیں جن کی ہر سطر میں متن کی غلطی ہے۔ مثلاً" مولوی ضیاء الدین خاں ضیا کے نام کے خط کا عکس' ڈاکٹر مختار الدین نے علی گڑھ میگزین' غالب نمبر' ۴۹-۱۹۴۸ء میں شائع کیا تھا۔ فاضل صاحب نے یہ خط "اردوئے معلی" کی جلد دوم کے حصہ سوم میں شامل کیا ہے۔ میں نے ایک ضرورت سے خط کے عکس کا فاضل صاحب کے مرتبہ متن سے مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ فاضل صاحب کے متن میں پندرہ غلطیاں ہیں۔ ایک خط کے متن میں پندرہ غلطیاں پوری کتاب کو ناقابل اعتبار بنانے کے لیے کافی ہیں۔

فاضل صاحب نے "عود ہندی" اور "اردوئے معلی" دونوں میں مختلف طریقے اختیار کیے ہیں۔ مثلاً" "عود ہندی" میں حاشیے میں یہ نہیں بتایا کہ متعلقہ خط "عود ہندی" کے کس کس اڈیشن کے کس صفحے پر ہے۔ جب کہ "اردوئے معلی" میں ہر خط کے بارے میں یہ اطلاع دی گئی ہے۔ "عود ہندی" کے حاشیوں میں احیاناً" پایاں' رحیل 'متوسط' مغشوش' توام اور زمرہ جیسے آسان لفظوں کے معنی دیے گئے ہیں۔ "اردوئے معلی" میں بہت ہی کم الفاظ کے معنی دینے کی ضرورت کی گئی ہے۔ "عود ہندی" کے ان حاشیوں کو دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ بے وجہ ضخامت بڑھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

غالب کے اکثر خطوط پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ فاضل صاحب نے کوشش کی ہے کہ ہر خط پر تاریخ ضرور دیں۔ اپنی اس کوشش میں تاریخ یا سنہ لکھ کر اس طرح کے بیانات دینے پڑے۔ "میرے خیال میں ۱۸۵۸ء کے وسط یا بعد کا ہے"۔ یہ نہیں بتایا گیا کہ اس خیال کی بنیاد کن دلائل پر ہے۔ ایک خط پر تاریخ تحریر دی ہے اکتوبر ۱۸۵۸ء اور اس کے بارے میں لکھا ہے "تقریباً وسط اکتوبر یا اس سے پہلے" اس خیال کی کوئی وجہ بیان نہیں کی گئی اور یہ بھی نہیں بتایا کہ سنہ کا تعین کس بنیاد پر کیا گیا ہے۔ ذکا کے نام ایک خط پر "اردوئے معلی" میں تاریخ تحریر صرف "۲۷ فروری" ہے۔ فاضل صاحب نے اسے ۱۸۶۷ء کا بتایا ہے اور اس پر حاشیہ لکھا ہے کہ "اردوئے معلی" میں تاریخ موجود نہیں ہے" یہ نہیں بتایا کہ ۱۸۶۷ء کہاں سے آیا۔ کیول رام ہشیار کے نام کے خط کو ۱۸۶۰ء کا بتایا گیا ہے اور لکھا ہے کہ "صرف ایک تخمینہ ہے" منشی ہیرا سنگھ کے نام کا

خط فاضل صاحب ۱۸۶۷ء کا بتاتے ہیں اور اس کے بارے میں حاشیے میں لکھتے ہیں "پہلے حصے میں ایک خط ہے جو ۱۳ جنوری ۱۸۶۸ء کو لکھا گیا ہے" غالباً" یہ اس کے کچھ ماہ بعد کا خط ہے"۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس طرح کی تاریخیں دینے سے ہمارے نقاد اور غالب پر کام کرنے والے محقق گمراہ ہو جاتے ہیں۔ وہ تاریخ تحریر پر بھروسہ کرکے بعض اہم نتائج اخذ کر لیتے ہیں اور حاشیہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ جب تک ہمارے پاس معقول دلائل نہ ہوں' تاریخ تحریر ہرگز نہیں دینی چاہیے۔

ممکن نہیں ہے کہ فاضل صاحب کو یہ اندازہ نہ ہو گیا ہو کہ غلام رسول مہر کا مرتب کیا ہوا متن غلط ترین ہے' پھر بھی اکثر مہر کے متن کی قراتیں' اختلافات نسخ کے طور پر پیش کی گئی ہیں۔ ان قراتوں کا انتخاب کس بنیاد پر کیا گیا ہے' یہ نہیں بتایا گیا۔ کیوں کہ اگر مہر کے متن کے تمام اختلافات نسخ پیش کیے جاتے تو یقیناً" ایک صفحے کی تین چار سطروں میں فاضل صاحب کا مرتبہ متن ہوتا اور باقی صفحے پر مہر صاحب کے متن کے اختلافات نسخ۔ فاضل صاحب نے غالب کے تمام خطوں کے اشاریے مرتب کر کے غالب پر کام کرنے والوں کی مشکل حل کرنے کی کوشش کی تھی مگر افسوس ہے کہ انھوں نے یہ کام ایسے لوگوں سے کرایا جو غالب کے دوستوں' شاگردوں اور عزیزوں سے قطعی واقف نہیں ہیں اور جن کا مبلغ علم بھی بہت کم معلوم ہوتا ہے۔

اکثر ایک ہی نام کے مختلف لوگوں کو یکجا کر دیا گیا ہے' مثلاً" :

محمد علی خاں ۳۵۵-۵۰۰-۷۹۶-۸۸۹

ص ۸۰۰ پر جن محمد علی خاں کا ذکر ہے وہ مرزا حاتم علی مہر کے دوست ہیں۔

ص ۳۵۵ کے محمد علی خاں' نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے لڑکے ہیں۔

ص ۷۹۶ کے محمد علی خاں دہلی کے رہنے والے ہیں اور

ص ۸۸۹ محمد علی خاں کو مثال کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ تفتہ کے نام اس خط میں غالب نے یہ بتایا ہے کہ نام کے ساتھ خطابات کس طرح لکھے جاتے ہیں اور محمد علی خاں کو مثال کے طور پر لیا ہے۔ اس لیے یہ نام اشاریے میں نہیں آسکتا۔ جانی بہاری لال رند کو اشاریہ میں چار ناموں سے الگ الگ فہرست کیا گیا ہے۔ بابو صاحب' جانی بانکے لال رند' جانی جی' اور رند' جانی بانکے لال۔ یہ کام وہی کر سکتا ہے جس نے خطوط غالب کا مطالعہ نہ کیا ہو۔ اس لیے ظاہر ہے کہ فاضل صاحب نے یہ کام کسی اور سے کرایا ہے۔

اشاریے میں اس طرح کی غلطیاں اتنی کثرت سے ہیں کہ پورا اشاریہ گمراہ کن ہو گیا ہے۔

"عود ہندی" کے دیباچے میں فاضل صاحب نے خود اپنے کام کی داد دیتے ہوئے لکھا ہے :

"مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ "عود ہندی" کے اس نسخے سے پہلے کوئی اڈیشن اس اہتمام سے مرتب و شائع نہیں ہوا۔ حال آں کہ اس کی افادیت کے پیش نظر اتنی بڑی غفلت حیرت انگیز ہے"۔

پورے بیان سے تو نہیں' البتہ اس کے آخری فقرے سے متفق ہوں' اس لیے میں اس فقرے کو دہرانا

چاہتا ہوں : "اس کی افادیت کے پیش نظر اتنی بڑی غفلت حیرت انگیز ہے"۔

غالب کی اردو املا کی خصوصیات

دنیا میں کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس کے تمام الفاظ ٹھیک اسی طرح لکھے جاتے ہوں جس طرح ان کا تلفظ ادا کیا جاتا ہے' اس کی ایک بڑی وجہ تو یہ ہے کہ کسی بھی زبان کا رسم الخط اتنا مکمل نہیں ہوتا کہ اس زبان کے صوتی نظام کو پوری طرح تحریری روپ دے سکے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ زندہ زبان میں ہر سطح پر تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ چنانچہ تلفظ اور املا کے مقابلے میں تلفظ کی تبدیلی کی رفتار زیادہ تیز ہوتی ہے' اس لیے اکثر الفاظ کے تلفظ اور املا میں مطابقت نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرین لسانیات جب کسی زبان کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ صرف بولی جانے والی زبان کو اپنی بنیاد بناتے ہیں' اس کے تحریری روپ کو نہیں۔

تلفظ اور املا کے اس طرح کے اختلافات کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ ایک ہی زمانے میں مختلف لوگ ایک لفظ کا تلفظ مختلف طریقے سے کرتے ہیں لیکن لکھتے ایک ہی طرح ہیں اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک لفظ کو مختلف لوگ مختلف طریقے سے لکھتے ہیں لیکن ان کا تلفظ ایک ہی کرتے ہیں۔

اردو دنیا کی ان زبانوں میں سے ایک ہے جن میں املا اور تلفظ میں عدم مطابقت کچھ زیادہ ہی ہے۔ اس کے کئی لسانی اور تاریخی اسباب ہیں۔ پہلا سبب تو یہی ہے کہ اردو کے صوتی نظام اور رسم الخط کا ارتقا ایک ساتھ نہیں ہوا۔ کھڑی بولی نے مکمل زبان بننے کے بعد فارسی رسم الخط کو اپنایا۔ اس لیے اردو کا صوتی نظام اور رسم الخط ایک دوسرے سے مکمل طور سے ہم آہنگ نہیں ہو سکے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ اردو اور فارسی دونوں آریائی خاندان کی زبانیں ہیں' لیکن دونوں کا صوتی نظام خاصا مختلف ہے۔ فارسی کی مخصوص آوازوں کو اردو میں لکھنا مشکل نہیں تھا کیوں کہ اردو نے فارسی رسم الخط کو اپنالیا تھا لیکن اردو کی کچھ مخصوص آوازیں ایسی ہیں' جو فارسی میں نہیں ہیں' وہ ہیں ہاکار اور معکوس آوازیں۔

جن لوگوں کو پہلی بار اردو کو تحریری روپ دینے کی ضرورت پڑی وہ عام طور سے صرف فارسی رسم الخط سے واقف تھے۔ اس لیے انھوں نے اردو کے لیے فارسی رسم الخط کو اپنایا۔ کیوں کہ ان کے سامنے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ اردو کی ہاکار اور معکوس آوازوں کو فارسی رسم الخط میں تحریری روپ دینے میں خاصی پریشانی ہوئی۔ ان آوازوں کے لیے ایسی تحریری علامتیں ایجاد کی گئیں جو صدیوں تک ارتقا کی منزل سے گزرتی رہیں۔

تقریباً" سولھویں صدی سے اردو نظم و نثر کی صورت میں کتابیں لکھی جارہی ہیں۔ لیکن ابتدائی تین صدی تک اردو املا کے ارتقا کی رفتار بہت سست رہی۔ انیسویں صدی کے شروع کے ساٹھ ستر برسوں میں یعنی عہد غالب میں اردو املا کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کیا جانے لگا۔ اور اردو املا میں سب سے زیادہ تبدیلیاں اسی عہد میں رونما ہوئیں۔ اس کی وجہ غالبا" یہ تھی کہ ہندوستان میں پریس قائم ہونے کی وجہ سے اردو کتابوں کی

طباعت کی رفتار خاصی تیز ہو گئی۔ فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج کی مطبوعات نے اس رفتار کو اور بھی تیز کر دیا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں برطانوی حکومت کی انتظامیہ اور تعلیمی پالیسی کی وجہ سے اردو کو ہمارے تعلیمی نظام میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گئی' اس لیے اردو پڑھنے والوں کا حلقہ بہت وسیع ہوگیا۔ اب اردو محض شعر و شاعری کی نہیں بلکہ روز مرہ کے استعمال کی زبان بن گئی۔ زبان کا چلن بڑھنے کی وجہ سے' اس کی املا پر بھی زیادہ غور کیا گیا۔ انتظامی امور کے سلسلے میں جب انگریزوں نے اردو کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی تو اردو املا کی معیار بندی کی ضرورت کو پہلے سے زیادہ محسوس کیا گیا ہو گا۔

غالب کے آخری زمانے میں اردو املا میں بعض اہم بنیادی تبدیلیاں ہوئیں۔ مثلاً" معکوسی اور ہا کار آوازوں کی علامتوں میں باقاعدگی پیدا کی گئی۔ جس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔ اسی زمانے میں یائے مجہول اور یائے معروف میں باقاعدہ تفریق قائم کی گئی۔ غالب ہی کے زمانے میں امیر مینائی نے اپنی کتابوں میں املا کا ایسا اہتمام کیا کہ ان کتابوں پر ایک نظر ڈالنے ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اردو املا کی معیار بندی کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں مولانا احسن مارہروی نے املا کے مسائل پر غالباً" پہلی بار باقاعدہ مضامین لکھے۔

اردو املا کی معیار بندی کے سلسلے میں پہلی منظم کوشش' انجمن ترقی اردو (ہند) نے کی۔ انجمن نے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی سربراہی میں ایک املا کمیٹی تشکیل دی۔ اس کمیٹی نے بہت سی سفارشیں پیش کیں۔ جن میں سے کچھ چلن میں آگئیں اور کچھ اہل اردو کے لیے قابل قبول نہ ہوئیں۔ چند سال پہلے ترقی اردو بورڈ نے ایک املا کمیٹی بنائی ۔ڈاکٹر عابد حسین اس کے صدر مقرر ہوئے۔ اس کمیٹی کی سفارشات ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے مرتب کرکے شائع کیں۔ پچھلے پچاس برسوں میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی' مولانا امتیاز علی خاں عرشی' ڈاکٹر نذیر احمد' قاضی عبدالودود' ڈاکٹر مسعود حسین خاں' ڈاکٹر گیان چند جین' ڈاکٹر شوکت سبزواری' حیات اللہ انصاری وغیرہ نے اردو املا پر خاصی تعداد میں مضامین لکھے۔ پاکستان میں ڈاکٹر فرمان فتحوری نے "اردو املا اور رسم الخط" کے نام سے اردو املا پر اور ہندوستان میں رشید حسن خاں نے "اردو املا" کے نام سے کتابیں لکھیں۔

غالب کی اردو تحریروں میں پرانی املا بھی ملتی ہے اور وہ تبدیلیاں بھی نظر آتی ہیں جو اس عہد کی املا میں ہو رہی تھیں۔ غالب نے اپنے بعض شاگردوں کے نام خطوط میں املا کے بارے میں ہدایتیں دی ہیں جنھیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کی کوشش تھی کہ ان کے شاگرد صحیح املا لکھیں۔ وہ منشی بہاری لال مشتاق کو لکھتے ہیں : "چوں کہ تم کو مشاہدہ اخبار اطراف اور خود اپنے مطبع کے اخبار کی عبارت کا شغل تحریر ہمیشہ رہتا ہے۔ بہ تقلید اور انشا پردازوں کے تمھاری عبارت میں بھی املا کی غلطیاں ہوتی ہیں۔ میں تم کو جا بہ جا آگاہ کرتا رہتا ہوں"۔ ۷ جون ۱۸۶۸ء

غالب کے خطوط میں اردو املا کے بارے میں ہدایتیں پڑھ کر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ غالب اردو املا پر بہت

توجہ دیتے تھے ' لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ غالب خود اس سلسلے میں خاصے غیر محتاط تھے۔

غالب کی املا پر تبصرہ کرنے سے پہلے میں املا کا یہ بنیادی اصول بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر ایک لفظ کی املا مخصوص طریقے سے رائج ہے اور کوئی شخص اس کے خلاف لکھے تو وہ غلط املا ہے۔ مثلاً "کرسی" کو "کرصی" لکھا جائے اور "سرور و نشاط" کو "صرور و نشات" تو یہ غلط املا ہے۔ لیکن اگر کچھ لوگ ایک لفظ کی املا ایک طرح اور کچھ لوگ دوسری طرح کرتے ہیں۔ مثلاً کچھ لوگ "کئے"۔ "دیئے"۔ جئے" لکھتے ہیں اور کچھ لوگ "کیے"۔ "دیے"۔ "جیے" تو ہم ایک کو صحیح اور دوسرے کو غلط نہیں کہ سکتے ۔ ہمیں کہنا چاہیے کہ املائیں مختلف ہیں۔

پرتھوی چندر مرحوم نے "مرقع غالب" میں غالب کے ایک سو تین اصل خطوط کے عکس شائع کیے ہیں۔ اس کے علاوہ خاصی تعداد میں غالب کے اصل خطوط کے عکس مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ تمام عکس اس مجموعے میں شامل کردیے گئے ہیں۔ غالب کی املا کا مطالعہ ان تمام عکسوں کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔

یائے مجہول اور یائے معروف

اردو کی قدیم املا میں یائے مجہول اور یائے معروف میں اس طرح فرق نہیں کیا جاتا تھا جیسا کہ جدید املا میں کیا جاتا ہے ۔ دراصل لکھنے والا اس معاملے میں لفظ کی املا سے زیادہ فن خوش خطی کا خیال رکھتا تھا ۔ اسی لیے یائے مجہول کی جگہ یائے معروف اور یائے معروف کی جگہ یائے مجہول لکھنا عام تھا ۔ اس کا ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ اکثراوقات اردو کے قدیم متنوں میں یہ نہیں معلوم ہو پاتا کہ مصنف بعض الفاظ کا تلفظ کس طرح کرتا تھا اور کبھی کبھی ہمیں اس کا بھی علم نہیں ہو پاتا کہ مصنف کسی مخصوص لفظ کو مذکر لکھتا ہے یا مونث ۔

غالب کے ہاتھ کی جتنی تحریریں ملی ہیں ' ان میں یائے مجہول اور یائے معروف میں بالکل فرق نہیں کیا گیا ۔ غالب کے زمانے میں ان دونوں میں تفریق شروع ہو چکی تھی لیکن کچھ لوگ اس کی پابندی کرتے تھے اور کچھ لوگ نہیں۔ "عود ہندی" اور "اردوئے معلی" کے پہلے اڈیشن تقریباً ایک ہی زمانے میں شائع ہوئے ہیں "عود ہندی" میں یائے مجہول اور یائے معروف میں کوئی فرق نہیں کیا گیا۔ جب کہ "اردوئے معلی" میں اس فرق کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔

الفاظ کو ملا کر لکھنے کا رجحان

قدیم املا میں الفاظ کو ملا کر لکھنے کا عام رجحان تھا۔ جب کہ جدید املا میں کوشش کی جاتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ الفاظ کو الگ الگ لکھا جائے۔ غالب املا کی قدیم روش سے متاثر ہیں۔ ان کے ہاں الفاظ کو ملا کر لکھنے کا رجحان بہت زیادہ ہے۔ چند الفاظ ملاحظہ ہوں :

نوابصاحب ۔ بیگمصاحبہ ۔ فصلربیع ۔ ہنڈویکا ۔ نکروں ۔ نگیا ۔ جوا۔ میں ۔ غزلوںکو وغیرہ۔ قدیم املا میں "ان

نے" اور اس سے "بھی ملا کر "انے" اور اسے" لکھتے تھے۔ غالب نے ان الفاظ کو الگ الگ لکھا ہے۔

اعراب بالحروف

ترکی رسم الخط میں اعراب بالحروف کا قاعدہ ہے' یعنی اگر لفظ کے پہلے صوتی رکن میں ضمہ ہے تو اسے واؤ سے بدل دیا جاتا ہے۔ قدیم اردو املا میں بھی یہی طریقہ رائج تھا جو ممکن ہے ترکی رسم الخط سے لیا گیا ہو۔ غالب کے زمانے میں واؤ کے بدلے فارسی پیش کا استعمال کر کے "اوس" اور "اون" وغیرہ کو "اس" اور "ان" لکھا جانے لگا تھا۔ غالب نے اس نئے طریقے کو نہیں اپنایا۔ ان کے ہاں اعراب بالحروف کی یہ شکلیں ملتی ہیں۔

اوس - اون - اونھوں - اوترنا - اوٹھنا - پونچھنا (غالب نے اکثر پنچنا لکھا ہے لیکن ایک دو دفعہ پونہنچا بھی لکھا ہے) اودھر - اونتا - اوتنی وغیرہ

پیش کا استعمال

غالب واؤ معروف' واؤ مجہول' پیش معروف اور پیش مجہول پر التزاما" فارسی پیش لگاتے ہیں مثلاً" :

تم - طرفہ - دو - سر - کھل - تو - جرم - چکا - رہو اور جو وغیرہ

ہاکار آوازوں کی لکھاوٹ

اردو کی ہاکار آوازیں خالص ہند آریائی ہیں اور تعداد میں گیارہ ہیں۔ یہ آوازیں ہیں :

پھ - تھ - ٹھ - چھ - کھ - بھ - دھ - ڈھ - جھ - گھ - اور ڑھ۔

فارسی میں ہاکار آوازیں نہیں ہیں۔ اس لیے جب ان آوازوں والے الفاظ کو فارسی رسم الخط میں لکھا گیا تو خاصی دقت ہوئی۔ ابتدا میں ہاکار آوازوں کے تحریری اظہار کے لیے ہائے ملفوظ کا استعمال کیا گیا۔ غالب کے عہد ہی میں ان آوازوں کے لیے ہائے مخلوط "دو چشمی ھ" ایجاد کی گئی۔ غالب کے ہاں "دو چشمی ھ" کا استعمال بہت ہی کم ہوا ہے۔ ان کی املا میں ہاکار آوازوں کی مختلف شکلیں ملتی ہیں۔

اگر ہائے مخلوط لفظ کے شروع میں آئے تو غالب اس طرح املا کرتے ہیں :

بہوکا (بھوکا) بہاری (بھاری) کہانا (کھانا) گہر (گھر) تہوڑا (تھوڑا)

اگر ہائے مخلوط لفظ کے درمیان میں ہو :

رکہی (رکھی) اکہاڑ (اکھاڑ) بوڑہا (بوڑھا) پڑہا (پڑھا) آنکہیں (آنکھیں) ہاتی (ہاتھی) یہاں ہاکار آواز کو بندشی آواز "ت" سے بدل دیا ہے اگر ہاکار آواز لفظ کے آخر میں آئے تو اس کی مختلف شکلیں ملتی ہیں :

اوده (اودھ) پڑه (پڑھ) بانده (باندھ) بڑه (بڑھ) چڑه (چڑھ)

کبھی ہائے ملفوظ اور ہائے مختفی دونوں کا استعمال کیا ہے :

دیکہ (دیکھ) ہاتہ (ہاتھ) مجہ (مجھ) ساتہ (ساتھ) سجہ (سجھ) بکہہ (کہہ (

بعض لفظوں کی املا اس طرح بھی کی ہے کہ لفظ کے آخر میں انے والی ہائے مخلوط کو سادہ بندشی آوازوں سے بدل کر اس میں ہائے مختفی کا اضافہ کر دیا ہے - مثلاً" مجہ (مجھ) تجہ (تجھ) سجہ (سجھ)

اور کبھی لفظ کے آخر میں آنے والی ہائے مخلوط کو صرف سادہ بندشی آوازوں سے بدل دیتے ہیں مثلا

ہات (ہاتھ) میرٹ (میرٹھ) رت (رتھ)

لفظ کے آخر میں الف یا ہائے مختفی

فارسی میں ایسے الفاظ کی تعداد خاصی ہے' جن کے آخر میں تلفظ الف (a) کا ہے ' لیکن انھیں ہائے مختفی سے لکھتے ہیں - ممکن ہے ایران میں ہائے مختفی اور الف کے تلفظ میں فرق رہا ہو لیکن ہندوستان میں کوئی فرق نہیں رہا - اس لیے اردو میں فارسی کے کچھ ایسے الفاظ جن کے آخر میں اصلاً" ہائے مختفی یا ہائے ملفوظ تھی' الف سے لکھے جانے لگے اور بعض اردو الفاظ جنھیں الف سے لکھنا چاہیے تھا' ہائے مختفی سے لکھے جانے لگے - اگر ہر اردو لکھنے والا اس طریقے کو اپنا لیتا تو پھر یہی املا رائج ہو جاتی - ہوا یہ کہ کچھ لوگ تو ہائے مختفی پر ختم ہونے والے فارسی الفاظ کو ہائے مختفی سے لکھتے رہے اور کچھ نے الف سے لکھنا شروع کر دیا - اس طرح کچھ لوگوں نے بعض اردو الفاظ کو فارسی رسم الخط کے انداز پر ہائے مختفی سے لکھنا شروع کر دیا- غالب کے ہاں ایسے الفاظ کی املا کی مختلف صورتیں ملتی ہیں - غالب اردو کے بعض الفاظ کو الف ہی سے لکھتے ہیں مثلاً" :

پتا - مینا - بھروسا - کمرا- لیکن بعض اردو الفاظ کو ہائے مختفی یا ہائے ملفوظ سے لکھتے ہیں' مثلاً" :

لالہ - پودینہ - راہ - کلکتہ - پرچہ - تھانہ - چبوترہ اور کیوڑہ

بعض فارسی الفاظ کو فارسی رسم الخط میں ان کی املا کے بر خلاف غالب الف سے لکھتے ہیں مثلاً :

چھاپے خانا - خاکا - نقشا وغیرہ -

ہائے مختفی یا الف پر ختم ہونے والے الفاظ واحد محرف یا جمع قائم کی صورت میں

اردو میں ہائے مختفی اور الف پر ختم ہونے والے الفاظ کا تلفظ فارسی اور عربی کے اس طرح کے الفاظ سے مختلف ہے۔ فارسی میں قاعدہ یہ ہے کہ لفظ کسی بھی زبان کا ہو' جب وہ واحد محرف یا جمع قائم کی صورت میں ہو تو لفظ کے آخر کا الف یا ہائے مُختفی یائے مجہول سے بدل جاتے ہیں۔ مثلاً" اگر "قصیدہ" واحد کی صورت میں آئے تو یوں لکھا جائے گا : "میں نے قصیدہ لکھا" لیکن اگر جمع کی صورت میں آئے تو اس کا تلفظ اور املا دونوں بدل جاتے ہیں اور اس طرح لکھا جاتا ہے : "میں نے قصیدے لکھے"۔ اسی طرح واحد محرف حالت میں "کلکتہ" کو "کلکتے" لکھیں گے۔ مثلاً "میں کلکتے گیا"۔

غالب کی تحریروں میں ان الفاظ کی املا ان طریقوں سے ملتی ہے :

۱- واحد محرف کی حالت میں ہائے مختفی پر ختم ہونے والے الفاظ

جمعہ کے دن

اس رقعہ کو

ابر رحمت کے شکریہ میں

میرے مشاہدہ میں

غالب نے اس حالت میں انبالے' کلکتے اور "قصیدے" بھی لکھا ہے' مگر بہت کم۔

۲- واحد محرف کی حالت میں "الف" پر ختم ہونے والے الفاظ غالب نے ہمیشہ یائے مجہول سے لکھے ہیں۔ مثلاً"

کتاب پر وجہے آ گئے۔

اب بڑھاپے میں کیا کروں۔

چھجے پر بیٹھا تھا۔

گزارے کو کچھ تو چاہیے۔

۳- جمع قائم کی حالت میں ہائے مختفی یا ہائے ملفوظ پر ختم ہونے والے الفاظ

میں نے صفحے گنے۔

میں نے قصیدے بھیجے۔

سو روپے وصول پائے۔

(غالب نے اس حالت میں اکثر "روپیہ" اور کم تر "روپے" لکھا ہے۔)

۴- جمع قائم کی حالت میں الف پر ختم ہونے والے الفاظ

چار مہینے ہوئے۔

تم نے کئی پتے لکھے۔

چھاپے کی کتاب۔

اکیلے کیسے جاؤں۔

اس تجزیے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جن لفظوں کے آخر میں ہائے مختفی یا ہائے ملفوظ یا الف ہوتا ہے' جمع قائم کی حالت میں غالب انھیں یائے مجہول سے لکھتے ہیں اور الف پر ختم ہونے والے الفاظ جب واحد محرف کی حالت میں آتے ہیں' تب بھی غالب انھیں یائے مجہول سے لکھتے ہیں۔ لیکن ہائے مختفی پر ختم ہونے والے الفاظ جب واحد محرف کی حالت میں ہوں تو غالب عام طور سے "ہ" سے لکھتے ہیں۔

نون غنہ اور نون ساکن

غالب کے زمانے تک عام رواج تھا کہ جن الفاظ کے آخر میں "ن" آتا ہو' چاہے وہ نون غنہ ہو' چاہے نون ساکن' دونوں صورتوں میں نون غنہ سے لکھتے تھے۔ غالب نے بھی ایسے تمام الفاظ نون غنہ سے لکھے ہیں۔ مثلاً : ہوں۔میں۔وہاں۔آؤں۔نہیں۔شادیاں۔نگراں۔کریں۔لوگوں۔فرمائیں۔اٹھائیں وغیرہ

بعض حروف کو ملا کر لکھنے کا رجحان

غالب ایک ہی لفظ کے بعض ایسے حروف کو ملا کر لکھتے تھے' جنھیں جدید املا میں لازمی طور پر الگ الگ لکھا جاتا ہے مثلاً :

(دو "د" اور "و" ملا کر

(بہادر) "ا" اور "د" ملا کر

"و" اور "د" ملا کر

(زیادہ) "ا" "د" اور "ہ" ملا کر

(حال) "ا" اور "ل" ملا کر

"ذ" اور "ز"

غالب کا دعویٰ تھا کہ فارسی میں "ذ" نہیں ہے۔ اس لیے وہ تمام فارسی الفاظ "ز" سے لکھتے تھے۔ گزشتن۔ گزاشتن۔ گزاردن اور پزیرفتن اور ان کے مشتقات مثلاً "گزشتہ" سرگزشت' "گزرگاہ' درگزر وغیرہ کو غالب "ز" ہی سے لکھتے تھے۔ غالب "ذرہ" کو' جو عربی لفظ ہے' "ز" ہی سے لکھتے تھے۔

پانو اور گانو

تلفظ کے اعتبار سے "پاؤں" اور گاؤں" کی صحیح املا "پانو" اور گانو" ہے۔غالب ہمیشہ "پانو" اور "گانو" لکھا کرتے تھے۔ قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی نے "پاؤں" لکھ دیا تو ۲۲ فروری ۱۸۶۱ء کے خط میں غالب انھیں تنبیہ کرتے ہیں : "پاؤں کی یہ املا غلط۔ پانو' گانو' چھانو --- درست ہے"۔"جدید املا میں ان الفاظ کی املا پاؤں۔ گاؤں اور چھاؤں ہی عام ہے۔

معکوسی آوازیں

چوں کہ فارسی میں معکوسی آوازیں نہیں ہیں اس لیے فارسی رسم الخط میں ان آوازوں کو تحریری روپ دینے میں خاصی پریشانی ہوئی۔ قدیم اردو املا میں تمام معکوسی آوازوں کے لیے قریب المخرج آوازوں کے مصمتے پر تین نقطے بنادیا کرتے تھے۔ مثلاً"

ٹ (ٹ) (ٹھ)

د (ڈ) ڈھ (ڈھ)

ڈ (ڑ) ڈھ (ڈھ)

پروفیسر محمود شیرانی نے "پنجاب میں اردو" میں لکھا ہے کہ گجرات میں بارھویں صدی ہجری کی ابتدا میں معکوسی آوازوں پر ضرب کی علامت "x" بنا دیتے تھے۔ مثلاً :

(ٹ) (ڈ) وغیرہ

تین نقطے لگانے سے "ٹ" اور "ث" میں التباس ہوتا تھا۔ کیوں کہ دونوں پر تین نقطے ہوتے تھے۔ اس لیے غالباً نقطوں کی تعداد تین سے بڑھا کر چار کر دی گئی۔ غالب کی املا میں چار نقطے ملتے ہیں۔ لیکن غالب کچھ معکوسی آوازوں پر چار نقطے لگاتے ہیں اور کچھ پر "ط" لکھتے ہیں۔ مثلاً "ٹ" اور "ٹھ" پر چار نقطے لگاتے ہیں۔ لیکن "ڈ"۔ڈھ"۔"ڑ"اور "ڈھ" پر "ط" بناتے ہیں۔

یائے تحتانی اور ہمزہ

غالب نے مرزا ہرگوپال تفتہ کی ایک فارسی غزل پر اصلاح دیتے ہوئے لکھا ہے :

یاد رکھو' یائے تحتانی تین طرح پر ہے :

جزو کلمہ :

(مصرع) ہمائے بر سر مرغان از آن شرف دارد

(مصرع) اے سر نامہ نام تو عقل گرہ کشائے را

یہ ساری غزل اور مثل اس کے جہاں یائے تحتانی ہے' جزو کلمہ ہے۔ اس پر ہمزہ لکھنا' گویا عقل کو گالی دینا ہے۔

دوسری تحتانی مضاف ہے۔ صرف اضافت کا کسرہ ہے۔ ہمزہ وہاں بھی مخل ہے :

جیسے "آسیائے چرخ" یا "آشنائے قدیم"۔ توصیفی' اضافی' بیانی' کسی طرح کا کسرہ ہو' ہمزہ نہیں چاہتا "فدائے تو شوم" "رہنمائے تو شوم" یہ بھی اسی قبیل سے ہے۔

تیسری دو طرح پر ہے : یائے مصدری' اور وہ معروف ہوگی۔ دوسری طرح : توحید و تنکیر' وہ مجہول ہوگی۔ مثلاً مصدری : "آشنائی"۔ یہاں ہمزہ ضرور' بلکہ ہمزہ نہ لکھنا عقل کا قصور۔ توحیدی "آشنائے" یعنی ایک آشنا۔ یہاں جب تک ہمزہ نہ لکھو گے' دانا نہ کہاؤ گے۔ اردو املا میں بھی غالب اس اصول کا پورا خیال رکھتے ہیں۔

چاہیے۔ لیے۔ دیے۔ کیجیے

ہمارے زمانے میں عام طور سے لوگ ان الفاظ کو ہمزہ سے لکھتے ہیں لیکن بعض لوگ ان الفاظ کو "ی" سے بھی لکھتے ہیں۔ غالب نے ان الفاظ میں "ہمزہ اور "ی" دونوں ہی استعمال کیے ہیں۔ وہ اس طرح لکھتے ہیں:

چاہیے۔کیے۔لیے۔ سیے۔ روییے۔وغیرہ

اس طرح کے فارسی الفاظ میں بھی غالب نے "ہمزہ" اور "ی" دونوں کا استعمال کیا ہے۔ مثلاً:
آئندہ ۔ فائدہ ۔ پائدہ ۔ فزائندہ ۔ طائر اور جائز وغیرہ

فرمائیے

اس لفظ میں غالب نے "ہمزہ" اور "ی" استعمال کیا ہے اور تشدید لگا کر اس طرح لکھا ہے: فرمائیے۔
آئے۔ پائے۔ جائے۔ ہوئے۔
ان چاروں لفظوں کو غالب نے کبھی "ہمزہ" سے اور کبھی بغیر "ہمزہ" کے لکھا ہے۔ اور اگر "آئے گا" اور "جائے گا" کو ملا کر لکھا ہے تو ہمزہ کے بجائے "ی" سے اس طرح لکھا ہے: آیگا۔ جایگا۔

موید اور رؤسا: غالب نے ان دونوں الفاظ کو بغیر "ہمزہ" کے لکھا ہے۔

ایسے الفاظ جن کی املا غالب نے دو طرح کی ہے:

روانہ اور روانا
زمانہ اور زمانا
تکیہ اور تکیا
مولانا اور مولنا
یہ اور یہ

ایک لفظ ایسا بھی ہے جس کی املا غالب نے تین طرح کی ہے۔ وہ لفظ ہے "ہاتھ"۔ غالب نے "ہات"۔ ہاتہ" اور "ہاتھ" تین طرح لکھا ہے۔

بعض الفاظ کی املا اور ان کا تلفظ

کسی بھی متن کی بنیاد پر اس کے مصنف کے تلفظ کا اندازہ لگانا ممکن نہیں ہے۔ کیوں کہ جیسا کہ شروع میں کہا گیا کہ ضروری نہیں الفاظ کے تلفظ اور ان کی املا میں مطابقت ہو۔ غالب کی تحریروں میں بعض لفظوں کی املا اس طرح کی گئی ہے کہ جن پر شبہہ ہوتا ہے کہ غالب ان کا تلفظ بھی اس طرح کرتے تھے۔ اگرچہ اس معاملے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

بوڑھا اور گاڑی

غالب کی تحریروں میں یہ الفاظ اور خاص طور سے لفظ "بوڑھا" کثرت سے آیا ہے اور عام طور سے ان دونوں الفاظ کی املا "بوڑھا" اور "گاڑی" کی گئی ہے لیکن کبھی کبھی "بوڈھا" اور "گاڈی" بھی ملتے ہیں۔ ممکن ہے کہ غالب ان الفاظ کا تلفظ اسی طرح کرتے ہوں۔

گڑھ پکھ

غالب نے "گڑپنکھ" لکھا ہے۔ چوں کہ یہ لفظ خطوط غالب میں صرف ایک بار ملتا ہے۔ اس لیے کہنا مشکل ہے کہ یہ سہو قلم ہے یا غالب اسی طرح تلفظ کرتے تھے۔

تڑپنا

قدیم اردو میں اس لفظ کا تلفظ "ترپھنا" ہے۔ غالب بھی اسی تلفظ کو ترجیح دیتے تھے۔ قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی کے نام ایک خط میں غالب نے لکھا ہے: "ترپھنا" ترجمہ "تپیدن" کا املا یوں ہے، نہ "تڑپنا" بائے فارسی اور نون کے درمیان ہائے مخلوط التلفظ ضرور ہے"۔

ڈھونڈنا

قدیم اردو میں اس لفظ کا تلفظ "ڈھونڈھنا" ہے اور غالب کی تحریروں میں اس لفظ کی املا "ڈھونڈھنا" ملتی ہے۔ ممکن ہے وہ اس لفظ کا تلفظ اسی طرح کرتے ہوں۔

سونچ

دہلی میں بعض مصوتوں کو انفیانے کا رجحان عام تھا آج بھی دلی کی کرخنداری بولی میں "گھانس" "چانول" "بینچنا" عام ہیں۔ غالب نے ہر جگہ سونچ لکھا ہے۔ اگر کہیں "سوچ" لکھا ہے تو وہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ ایک جگہ غالب نے "بوٹے" کے بجائے "بونٹے" بھی لکھا ہے۔ ایک مطبوعہ خط میں "چانول" ملتا ہے۔

غالب نے بعض الفاظ کی املا اپنے عہد کی رائج املا سے اس طرح مختلف کی ہے کہ ہم اسے غلط املا کہنے پر مجبور ہیں۔ الفاظ کی اس غلط املا کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو وہ الفاظ جو غالب کی اب تک کی دستیاب تحریروں میں غالباً صرف ایک بار آتے ہیں، مثلاً :

سرٹ (سورٹھ)

موہیں جامہ (موہی جامہ) وغیرہ

دوسرے ان الفاظ کی املا جو میرے خیال سے سہو قلم ہیں۔ مثلاً :

پانچ ساتھ (پانچ سات)

خورم (خرم)

دلمی (دلجمی)

گنھائیں (گنجائیں)

تیسرے وہ الفاظ جو غالب نے ایک سے زیادہ بار لکھے ہیں، اور جن کے بارے میں وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ غالب کے ذہن میں ان الفاظ کی املا غلط تھی۔ مثلاً :

بالکل (بالکل)
بالفعل (بالفعل)
باللہ (باللہ)

غالب کی زبان پر فارسی اثرات ○ انگریزی الفاظ کا استعمال

یہ بات واضح ہے کہ اردو نثر فارسی کے زیر سایہ پروان چڑھی۔ اس لیے ابتدائی اردو نثر پر فارسی کے بہت گہرے اثرات ہیں۔ فورٹ ولیم کالج میں پہلی بار اردو نثر کو انفرادیت کے ساتھ باقاعدہ طور پر اپنی حیثیت کو منوانے اور اپنی شناخت کرانے کا موقع ملا تھا۔ ابتدا میں فورٹ ولیم کالج کے نثر نگاروں کا اردو نثر پر زیادہ اثر نہیں ہوا۔ لیکن بعض سیاسی اور سماجی حالات کی وجہ سے جوں جوں اردو نثر کا استعمال بڑھتا گیا' یہ فارسی کے اثر سے آزاد ہوتی گئی۔ پچاس ساٹھ سال کی مدت میں سرسید' مولانا محمد حسین آزاد' مولوی ذکاء اللہ' مولانا الطاف حسین حالی اور ڈپٹی نذیر احمد کے ہاتھوں نثری اعتبار سے بھی اردو نے ایک آزاد اور مکمل زبان کی حیثیت حاصل کر لی۔

غالب کا زمانہ ان لوگوں سے کچھ پہلے کا ہے۔ جب غالب عمر کے آخری حصے میں تھے تو یہ سب لوگ نوجوان تھے۔ غالب بنیادی طور پر فارسی کے ادیب اور شاعر تھے۔ دوسرے لفظوں میں غالب کی پہلی تخلیقی زبان فارسی تھی۔ اگرچہ غالب کی روزمرہ گفتگو کی زبان اردو تھی لیکن جب وہ اردو میں شعر کہتے یا اردو نثر لکھتے تو ان کے ذہن پر فارسی کا تھوڑا بہت غلبہ ضرور رہتا۔ انہوں نے اردو میں دیباچے اور تقریظیں وغیرہ لکھیں' ان پر فارسی کے خاصے گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔ لیکن اردو خطوط میں غالب کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ روزمرہ کی زبان میں باتیں کریں' اس لیے ان کے خطوں کی زبان بہت صاف' سادہ اور سلیس ہے۔ خطوط غالب کی نثر پر فارسی کے اثرات ہیں لیکن کم' غالب اردو دیباچوں اور تقریظوں کے مقابلے میں اردو خطوط میں فارسی محاوروں یا ان کے اردو ترجموں اور فارسی و عربی کے ان الفاظ کا استعمال بہت کم کرتے ہیں' جن کا اردو میں چلن نہیں ہوا۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ غالب کے اردو خطوط میں جو فارسی محاورے اور نسبتاً اجنبی فارسی و عربی لفظ استعمال ہوئے ہیں' یہ پہلی بار غالب نے ہی استعمال کیے ہیں یا ان کے عہد کی اردو نثر میں بھی رائج تھے اور بعد میں متروک ہو گئے۔ ممکن ہے کہ کچھ الفاظ اور محاورے رائج ہوں اور کچھ غالب نے پہلی بار استعمال کیے ہوں۔ بہرحال اس معاملے میں کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے خطوط غالب اور عہد غالب کی اردو نثر کا لسانی تجزیہ ضروری ہے' جو ظاہر ہے کہ آسان کام نہیں ہے۔

محمد حسین آزاد اپنے عہد کی گروہ بندی کے شکار ہیں۔ وہ غالب کے نہیں' ذوق کے طرف دار ہیں۔ آب حیات میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غالب بنیادی طور پر فارسی کے شاعر اور ادیب تھے۔

آزاد لکھتے ہیں :

"مرزا صاحب کو اصلی شوق فارسی کی نظم و نثر کا تھا اور اس کمال کو اپنا فخر سمجھتے تھے۔ لیکن چوں کہ تصانیف ان کی اردو میں بھی چھپی ہیں اور جس طرح امرائے رؤسائے اکبر آباد میں علو خاندان سے نامی اور مرزائے فارسی ہیں' اس طرح اردوئے معلی کے مالک ہیں۔

آزاد اپنے انداز میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ غالب تو فارسی کے شاعر اور ادیب ہیں اس لیے اردو کے شاعروں (یعنی ذوق) سے ان کا مقابلہ بے سود ہے۔ یہ یقیناً آزاد کی زیادتی ہے۔ اب غالب کے اردو خطوط کے بارے میں آزاد کی رائے ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں :

"" ان (اردو) خطوط کی عبارت ایسی ہے کہ گویا آپ سامنے بیٹھے گل افشانی کر رہے ہیں مگر کیا کریں کہ ان کی باتیں بھی خاص فارسی کی خوش نما تراشوں اور عمدہ ترکیبوں سے مرصع ہوتی تھیں۔ بعض فقرے کم استعداد ہندوستانیوں کے کانوں کو نئے معلوم ہوں تو وہ جانیں۔ یہ علم کی کم رواجی کا سبب ہے۔"

یہ ٹھیک ہے کہ غالب کے اردو خطوط میں فارسی لفظوں' فارسی ترکیبوں اور محاوروں کا استعمال ہوا ہے لیکن یہ استعمال اس طرح ہرگز نہیں ہوا کہ بعض فقرے بہ قول مولانا محمد حسین آزاد "کم استعداد اور ہندوستانیوں کے کانوں کو نئے معلوم ہوں۔" غالب نے فارسی لفظوں اور ترکیبوں کا استعمال ایسی برجستگی کے ساتھ کیا ہے کہ ان سے نثر زیادہ موثر اور زیادہ معنی خیز ہو گئی ہے۔

یہاں ایسے فارسی لفظوں' ترکیبوں اور محاوروں کی نشان دہی کی جاتی ہے جوغالب نے استعمال کیے ہیں لیکن جو ہمارے عہد کی ادبی نثر میں استعمال نہیں ہوتے۔ اگرچہ مذہبی تحریروں میں اس طرح کے الفاظ اب بھی مستعمل ہیں۔

اردو نے بہت سے اسم فارسی اور عربی سے مستعار لیے ہیں لیکن ان کے ساتھ افعال اردو کے استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً "کتاب پڑھی" "قلم بنایا" "کاغذ پھاڑا" وغیرہ۔

غالب نے ایسے بعض فارسی اور عربی الفاظ کے ساتھ خود فارسی افعال کا ہی اردو میں ترجمہ کر دیا ہے۔ اسی طرح بعض ایسے فارسی محاورے اور ترکیبیں بھی استعمال کی ہیں جو جدید اردو میں مستعمل نہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

"منشی نبی بخش تمہارے خط نہ لکھنے کا بہت گلہ رکھتے ہیں" گلہ رکھتے ہیں" گلہ داشتن کا ترجمہ۔

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ

"منشی نبی بخش کے ساتھ غزل خوانی کرنا اور ہم کو "یاد نہ لانا"۔" یاد نہ لانا" "یاد نہ آوردن" کا ترجمہ ہے۔ (بنام مرزا ہرگوپال تفتہ)

"میں مشقت کھینچ کر جو کچھ کہ اب لکھا ہے' وہ لکھ کر تم کو بھیج دیتا" "مشقت کھینچنا" "مشقت کشیدن" کا

ترجمہ۔ (بنام منشی نبی بخش حقیر)

"دو میم آ پڑے ہیں۔ ایک میم محض بے کار ہے۔" آ پڑے ہیں" "افتادہ اند" کا ترجمہ۔

(بنام انور الدولہ شفق)

"اگرچہ باور نہیں آیا' لیکن عجب آیا' "عجب آنا" "عجب آمدن" کا ترجمہ۔

(بنام منشی غلام غوث خاں بے خبر)

"اوچھی پونجی والے گم نام اپنی شہرت کے لیے مجھ سے لڑتے ہیں۔ واہ واہ اپنے نامور بنانے کو ناحق احمق بگڑتے ہیں۔ "نامور بنانا" "نامور ساختن" کا ترجمہ۔ (بنام نواب میر غلام بابا خاں)

"روپیہ وصول میں آیا۔ "وصول میں آنا" "بہ معرض وصول آمدن" کا ترجمہ۔

(نوابان رام پور کے نام خطوط میں متعدد بار)

"مجھ کو مفید پڑا" یہ فقرہ "بہ من مفید افتاد" کا ترجمہ۔ (بنام منشی نبی بخش حقیر)

"کوئی بے وفائی بھی سرزد نہیں ہوئی' جو دستور قدیم کو برہم مارے" "برہم مارنا" "برہم زدن" کا ترجمہ۔

"یہ امر جلد صورت پکڑ جائیں۔ "صورت پکڑنا" "صورت گرفتن" کا ترجمہ۔

("بابو صاحب کے واسطے میرا دل بہت جلا۔ "میرا دل بہت جلا" "دلم سوخت" کا ترجمہ۔

(بنام سید بدر الدین احمد فقیر)

"عظیم الدین کون ہے اور کیا پیشہ رکھتا ہے۔ "پیشہ رکھنا" "پیشہ داشتن" کا ترجمہ۔

(بنام منشی شیو نرائن آرام)

اگر زمانہ میری خواہش کے موافق نقش قبول کرتا ہے تو میں مارہرہ کو آتا ہوں۔ "نقش قبول کرنا" "نقش قبول کردن" کا ترجمہ۔ (بنام چودھری عبدالغفور سرور)

"تمہارے تنہا اور بے مربی رہ جانے کا میں نے بہت غم کھایا۔ "غم کھانا" "غم خوردن" کا ترجمہ۔

(بنام بہاری لال مشتاق)

"اب تم کو بھی لازم آ پڑا ہے "لازم آ پڑنا" "لازم آمدن" کا ترجمہ۔ (بنام مرزا ہرگوپال تفتہ)

اب کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں جہاں غالب نے فارسی الفاظ کو فارسی مفہوم میں ہی استعمال کیا ہے۔

فرصت : فارسی میں "موقع" "فراغت" "مہلت" "چھٹکارا" "نجات" اور "خلاصی" کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ غالب نے یہ لفظ کثرت سے بیماری سے نجات پانے کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً :

"میاں تفتہ نے کچھ حال آپ کے آشوب چشم کا لکھا تھا' پھر ان کے خط سے یہ بھی دریافت ہوا کہ کچھ فرصت ہے۔ (بنام نبی بخش حقیر)

منشا : فارسی میں یہ لفظ "سبب" اور "مقصد" دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن اردو میں صرف "مقصد" کے مفہوم میں مستعمل ہے۔ غالب نے یہ لفظ "سبب" کے مفہوم میں بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً :

"منشا تشویش و اضطراب کا یہ ہے"۔ (بنام مرزا ہرگوپال تفتہ)

تحقیق : فارسی میں یہ لفظ "تصدیق" "یقین" "چھان بین" اور "دریافت" وغیرہ کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں یہ لفظ صرف آخری معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ غالب نے اسے فارسی میں بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً : "یقین ہے کہ تم کو تحقیق حال معلوم ہوگا۔" (بنام مرزا ہرگوپال تفتہ)

یعنی تم کو صحیح حال معلوم ہوگا۔

جریدہ : فارسی میں اس لفظ کا مطلب "تنہا" اور "اکیلا" اور "رسالہ"۔ غالب نے یہ لفظ "تنہا" کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً : "جریدہ بہ سبیل ڈاک آئیں گے۔" (بنام حسین مرزا)

وحشت : فارسی میں رمیدگی، خوف سے بھاگنا، کنارہ کشی اختیار کرنا، اور "سودا" اور "دیوانگی" کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں صرف "دیوانگی" کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ غالب نے یہ لفظ "کنارہ کشی" کے مفہوم میں بھی استعمال کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

"پھر وحشت کی کیا وجہ، اگر کہا جائے کہ وحشت نہیں ہے تو اس کتاب اور مثنوی کی رسید نہ لکھنے کی وجہ کیا۔" (بنام تفتہ)

رنجور : فارسی میں یہ لفظ "بیمار" اور "غمزدہ" دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ غالب نے بیمار کے مفہوم میں یہ لفظ اس طرح استعمال کیا ہے :

"ایسا نہ ہو کہ گرمی کی تاب نہ لائیں اور روزہ رکھ کر رنجور ہو جائیں۔ (بنام منشی نبی بخش حقیر)

توقف : فارسی میں "دیر" "وقفہ" اور "صبر و تحمل" "رکنا" کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں یہ لفظ صرف "دیر" اور "وقفہ" کے معنوں میں استعمال ہے۔ غالب نے صبر و تحمل کے مضمون میں بھی استعمال کیا ہے۔ غالب نے لکھا ہے : "آدمی کو یہاں اتنا توقف نہیں کہ وہاں سے دیوان منگوا کر، نقل اتروا کر بھیج دوں۔" (بنام سید بدرالدین احمد کاشف)

سیاست : فارسی میں "ملکی انتظام" اور "سزا" دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں صرف "ملکی انتظام" کے مفہوم میں مستعمل ہے۔ غالب نے یہ لفظ "سزا" کے معنی میں اس طرح استعمال کیا ہے۔

"مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔"

مسترد : فارسی میں یہ لفظ "واپس کرنا" اور "رد کرنا" دونوں معنوں میں مستعمل ہے۔ اردو میں صرف "رد کرنا" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ غالب اسے واپس کرنے کے مفہوم میں اس طرح استعمال کرتے ہیں۔

"میں نے اصلاح دینے سے انکار کیا اور اشعار مسترد کر دیے۔" (بنام منشی سیل چند)

ہمدرد : غالب نے یہ لفظ ان معنوں میں استعمال کیا ہے کہ "جو غم تم کو ہے وہی غم مجھے بھی ہے۔" فارسی میں یہ لفظ "غم خوار" اور دکھ درد کے ساتھ دینے والے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ اردو میں دوسرے معنوں میں مستعمل ہے۔

غالب کی ایک پھوپھی کا انتقال ہو گیا۔ اس سے کچھ عرصے پہلے منشی نبی بخش حقیر کے بھی کسی رشتہ دار کا انتقال ہوا تھا۔ غالب نے حقیر کو اپنی پھوپھی کی وفات کی اطلاع ان الفاظ میں دی :

"میں بھی تمہارا ہمدرد ہو گیا یعنی منگل کے دن ۱۸ ربیع الاول کو شام کے وقت وہ پھوپھی کہ میں نے بچپن سے آج تک اس کو ماں سمجھا تھا...... مرگئی۔" بنام منشی نبی بخش حقیر

قباحت : فارسی میں اس لفظ کے کئی معنی ہیں : "برائی" "خرابی" "وقت" اور "مشکل" کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ غالب نے اسے فارسی کے اس مفہوم میں بھی استعمال کیا ہے جو اردو میں مستعمل نہیں ہے۔ لکھتے ہیں : "ایک شعر کی قباحت تم پر ظاہر کرتے ہیں۔" (بنام مرزا ہرگوپال تفتہ)

ہرزہ : ورنہ خط ہرزہ پھرا کرتے۔" (بنام مرزا ہرگوپال تفتہ)

بے سر و پا : غالب نے یہ لفظ "بے ساز و سامان" اور "تباہ حال" کے مفہوم میں اس طرح استعمال کیا :

"جو بے سروپا وہاں پہنچا، امیر بن گیا"۔ (بنام سیاح)

مگر : اردو میں لیکن کے مفہوم میں مستعمل ہے۔ غالب نے یہ لفظ شعر اور نثر دونوں میں شاید کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ غالب کا مشہور شعر ہے :

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

نثر میں غالب لکھتے ہیں :

"حضور نے یہ کیا تحریر فرمایا ہے کہ ان بارہ غزلوں کی اصلاح میں کلام خوش مطلوب ہے۔ اگلی غزلوں کی طرح نہ ہوں۔ مگر اگلی غزلوں کی اصلاح پسند نہیں آئی۔"

(بنام یوسف علی خاں ناظم)

احیا : اردو میں "دوبارہ زندہ کرنے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔فارسی میں "حی" کی جمع "احیا" زندہ لوگوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ غالب نے دوسرے مفہوم میں بھی استعمال کیا ہے۔

"دعا مانگتا ہوں کہ اب ان احیا میں سے کوئی میرے سامنے نہ مرے۔" (بنام حکیم غلام نجف خاں)

علاقہ : یہ لفظ اردو میں دلی لگاؤ، ذہنی اور جغرافیائی حوالے وغیرہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ فارسی میں یہ لفظ نوکری اور ملازمت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ غالب نے اس مفہوم میں بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً :

"مجھ کو فکر جانی کی ہے کہ اسی علاقے میں تم بھی شامل ہو۔" (بنام مرزا ہرگوپال تفتہ)

غالب نے اردو میں فارسی اور عربی کے ایسے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں جو اردو میں مستعمل نہیں ہیں۔ مثلاً :

اذعانی" بہ معنی "یقینی"
اذعانی ہے یہ امر کہ وہ بھی قافلے کے ساتھ ہو گا۔" (بنام حکیم غلام نجف خاں)
گزاف : بہ معنی یاوہ گوئی۔
"خط کے پہنچنے سے اظہار منت پذیری اگر گزاف نہیں تو کیا ہے۔" (بنام عبدالرزاق شاکر)
جدید اردو میں "لاف وگزاف" مستعمل ہے۔
ریب : بہ معنی شک۔
"اس میں کیا ریب ہے۔" (بنام علاء الدین خاں علائی)
درنگ : بہ معنی "تاخیر" غالب نے اس لفظ کا استعمال بہت کیا ہے۔
"آپ کے خط کا جواب لکھنے میں درنگ اس راہ سے ہوئی"۔ (بنام سید بدرالدین احمد کاشف)
ایمن : بہ معنی "محفوظ"
"بہ ایں ہمہ ایمن میں بھی نہیں ہوں"۔ (بنام میر مہدی مجروح)
بحل : بہ معنی "معاف کرنا"
ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا مگر میں نے اس کو بحل کیا۔
(بنام میر مہدی مجروح)
کون : بہ معنی "تعمیر" وجود میں آنا۔
"لکھنؤ کی ویرانی پر دل جلتا ہے۔ مگر تم کو یاد رہے کہ وہاں بعد اس فساد کے ایک کون ہو گا یعنی راہیں وسیع ہو جائیں گی"۔ (بنام میاں داد خاں سیاح)
انفراد : بہ معنی "تنہا" "اکیلی"۔
"یہاں جنا بہ انفراد بہ رہی ہے۔" (بنام انور الدولہ شفق)
استعلاج : بہ معنی "علاج"
"بی بی بیمار ہے۔ اس کا استعلاج منظور ہے۔" (بنام علاء الدین خاں علائی)
مجموع : بہ معنی "تمام"
ایک بہن اس کی مجموع اولاد وہاں۔" (بنام قدر بلگرامی)
زلت : بہ معنی "غلطی"
ہر موقع پر خطا اور زلت مولف کا اشارہ کر دوں گا۔" (بنام میر غلام حسنین قدر بلگرامی)
مبطل : بہ معنی "باطل کرنے والا" غلط ثابت کرنے والا۔
اور الف نون حالیہ کے وجود کا مبطل تو نہیں ہوا۔" (بنام مولوی ضیاء الدین خاں ضیا)
مظنون : بہ معنی "شبہہ ہونا"

"آگرے سے کتابوں کا منگوانا بے ارسال قیمت مظنون ہے۔" (بنام مرزا ہرگوپال تفتہ)
غالب کبھی آدھے اور کبھی پورے فقرے فارسی کے لکھ جاتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :
"سر آغاز فصل میں ایسے ثمرہائے پیش رس کا پہنچنا نوید ہزار گونہ میمنت اور شادمانی ہے۔"
(بنام قاضی عبدالجمیل جنون)
"اتحاد اسمی دلیل موودت روحانی ہے۔" (بنام عبدالرزاق شاکر)
اور وہ امر بعد تعجب مفرط کے موجب نشاط مفرط ہوگا۔" (بنام مرزا ہرگوپال تفتہ)
صریر قلم ماتمیوں کے شیون کا خروش ہے۔" (بنام میر غلام بابا خاں)
بہ سبب استعمال ادویہ حارہ کہ اس مرض میں اس سے گریز نہیں۔" (بنام منشی نبی بخش حقیر)
جس کے جی میں آئی' وہ متصدی تحریر قواعد انشا ہوگیا۔" (بنام مولوی ضیاء الدین خاں ضیا دہلوی)
غالب کبھی کبھی فارسی کی پوری ترکیب استعمال کرتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :
"ایک مژہ برہم زدن" نہیں تھما" (بنام علاء الدین خاں علائی)
"آفتاب سرکوہ ہیں" (بنام جواہر سنگھ جوہر)
"میں خود اس مثنوی کے واسطے خون در جگر ہوں۔" (بنام چودھری عبدالغفور سرور)
"کیا جگر خون کن اتفاق ہے۔" (بنام نواب میر غلام بابا خاں)
"نشتر کیوں کھایا۔ گریہ کہ بہ طریق خوشامد طبیب سے رجوع کی۔" (بنام علاء الدین خاں علائی)
"فرط خجلت سے سر در پیش ہو کر قصیدے کو اس لفافے میں بھیجتا ہوں۔" (بنام انور الدولہ شفق)
"اپنے اپنے عزیزان بہ سفر رفتہ کو لکھا۔" (بنام انور الدولہ شفق)

انگریزی الفاظ کا تلفظ' املا اور اردو ترجمہ

ہندوستان پر انگریزوں کے سیاسی اقتدار کی وجہ سے ہندوستانیوں کے لیے انگریزی اجنبی زبان نہیں رہی تھی۔ دہلی کالج میں انگریزی ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جا رہی تھی جس کی وجہ سے ہندوستانیوں میں انگریزی داں طبقہ پیدا ہو چکا تھا۔ ثقافتی سطح پر انگریزی سے الفاظ مستعار لینے کا عمل بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ انتظامیہ اور اردو اخباروں میں انگریزی الفاظ اور اصطلاحوں کا استعمال عام تھا۔ انگریزی الفاظ کا اردو میں ترجمہ کر لیا گیا تھا لیکن بیشتر انگریزی الفاظ اردو میں لے لیے گئے۔ ان مستعار الفاظ میں صوتی سطح پر بہت سی تبدیلیاں بھی وجود میں آئیں۔

غالب کے انگریزوں سے بہت گہرے مراسم تھے۔ انگریزوں میں غالب کے شاگرد' معتقد' دوست' مداح اور ممدوح سب ہی طرح کے لوگ تھے۔ پنشن کے مقدمے کی وجہ سے زندگی بھر غالب کی برطانوی حکومت سے مراسلت رہی۔ ان خطوط کا مسودہ عام طور سے غالب فارسی میں لکھتے اور انگریزی میں ترجمہ کرا کے بھیجتے۔

غالب نے فارسی اور اردو نظم نثر دونوں میں خاصی بڑی تعداد میں انگریزی الفاظ اور بعض انگریزی الفاظ کے اردو ترجموں کا بے تکلف استعمال کیا ہے۔ یہ بتانا تو ممکن نہیں کہ غالب انگریزی الفاظ کا تلفظ کس طرح کرتے تھے۔ ہاں ان الفاظ کی املا غالب جس طرح کرتے تھے اس سے تلفظ کا تھوڑا بہت اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

پہلے تو انگریزی الفاظ کے وہ اردو ترجمے ملاحظہ ہوں' جو غالب نے استعمال کیے ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ ترجمے خود غالب نے کیے تھے یا اس عہد میں رائج تھے :

تار برقی' تار بجلی	Telegram
دخانی جہاز	Steamer
انگریزی دیا سلائی	Match
جرنیلی بندوبست	Martial Law
حاکم اکبر	Governor-General
ڈبل خط پوسٹ پیڈ	Reply Post Card
آئینہ کی تصویر' عکس کی تصویر	Photograph
بڑا پوسٹ ماسٹر	Post-master-General
کمشنری	Division
رجسٹری اور خط	Registered Letter

غالب نے بعض انگریزی الفاظ کی املا اس طرح کی ہے' جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب ان الفاظ کا تلفظ مروجہ تلفظ سے بہت مختلف کرتے تھے :

لاڈو	Lord
ٹان ڈیوٹی	Town Duty
سکرتر یا سکرتری	Secretary
گورمنٹ	Government
لیکور	Liquor
برگڈیر	Brigadier
بارک	Barrack
پنسن	Pension
کمپ	Camp
ٹپن	Tiffin
رپورٹ	Report

باہمی مشورہ Council

بعض الفاظ میں جو صوتی تبدیلی نظر آتی ہے، وہ آج تک برقرار ہے، مثلاً :

کلکٹری Collectorate

رجسٹری Registered

بکس Box

اسپتال Hospital

لیکن بعض انگریزی الفاظ کی جو املا غالب نے کی ہے، وہ اردو کے لیے قابل قبول نہیں رہی، مثلاً :

اجنٹ Agent

لمبر Number

اسٹامپ Stamp

چک Cheque

سارتی تکٹ Certificate

اسٹیشن Station

ریسڈنٹ Resident

اب وہ انگریزی الفاظ ملاحظہ ہوں جن کی املا آج بھی تقریباً وہی ہے جو غالب کی تحریروں میں ملتی ہے :

ٹکٹ Ticket

ڈاکٹر Doctor

اگریمنٹ (غالب نے گریمنٹ بھی لکھا ہے) Agreement

انکم ٹیکس Income Tax

پارسل Parcel

ڈپٹی Deputy

پوسٹ پیڈ Post Pad

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

غالب بنیادی طور پر شاعر تھے اور شاعری میں زبان کے استعمال پر انہیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ اس لیے لفظ ان کے ہاں "گنجینہ معنی" کا طلسم ہے۔ غالب کی فکر، احساس اور جذباتی کیفیتیں ان کے ہم عصروں کے مقابلے میں زیادہ گہری اور پیچیدہ ہیں، غالب کے عہد کی مروجہ تخلیقی زبان ان کا ساتھ نہیں دے پائی اس لیے ان کی ڈکشن پر فارسی کے گہرے اثرات ہیں۔ اپنی بات کو موثر طریقے کہنے کے لیے شاعری میں

غالب تمثیلوں، علامتوں، تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال میں غیر معمولی جدت سے کام لیتے ہیں۔ ان کی اسی شاعرانہ ادا نے ان کے اردو خطوط کی نثر کو بھی پر لطف بنا دیا ہے۔ اردو میں خط لکھتے ہوئے اگرچہ غالب عام بول چال اور روزمرہ کی زبان استعمال کرتے ہیں لیکن اپنی بات کہنے کے لیے وہ ایسی تشبیہوں اور استعاروں کو بھی کام میں لاتے ہیں، جن کے استعمال سے ان کا اظہار زیادہ موثر، معنی خیز، تہہ دار اور شگفتہ ہو جاتا ہے۔ ان تشبیہوں اور استعاروں میں سے اکثر خود غالب کی جدت پسند طبیعت کی اپج کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

غالب ایک خط میں تفتہ کو لکھنا چاہتے ہیں کہ ان کی صحت اتنا جواب دے چکی ہے کہ اصلاح شعر کا کام اب ان کے بس کا نہیں رہا۔ اس خط میں غالب نے ایک ترکیب "سک نمبر" استعمال کی ہے۔ یہ دراصل (sick number) ہے۔ "سک نمبر" اس فوجی کو کہتے ہیں جو اتنا بیمار ہو جائے کہ اسے ہسپتال میں داخل کرنا پڑے یا اسے اس کے گھر بھیج دیا جائے۔ تنخواہ اسے پوری ملتی ہے۔ اب غالب کے خط میں اس ترکیب کا بطور استعارہ استعمال ملاحظہ ہو:

"رئیس رام پور سو روپیہ مہینا دیتے ہیں۔ سال گزشتہ ان کو لکھ بھیجا کہ اصلاح نظم جو اس کا کام ہے اور میں اپنے حواس نہیں پاتا۔ متوقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں۔ جو کچھ مجھے آپ کی سرکار سے ملتا ہے، عوض خدمات سابقہ میں شمار کیجئے تو میں "سک نمبر" سہی ورنہ خیرات خوار سہی" (بنام مرزا ہرگوپال تفتہ)

اس خط میں "سک نمبر" کے استعارے کے استعمال سے غالب نے اپنی سابقہ خدمات، نواب رام پور سے اپنے تعلقات اور صحت کی خرابی، غرض سب کچھ ہی کچھ بیان کر دیا ہے۔ اپنی پیرانہ سالی اور خرابی صحت کو دیکھتے ہوئے غالب کو یقین تھا کہ موت ان سے بہت قریب آ گئی ہے۔ تفتہ کے نام اسی خط کے آخر میں غالب نے "چراغ" اور "آفتاب" کے استعاروں کے ذریعے اپنی حالت کا کیسا موثر اظہار کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

میں تو چراغ دم صبح و آفتاب سرکوہ ہوں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون" (بنام مرزا ہرگوپال تفتہ)

غالب کی اردو نثر میں استعاروں کا بڑا برجستہ استعمال ملتا ہے۔ غالب استعارے کی مدد سے پورا واقعہ اور اس سے متعلق اپنی ذہنی اور جذباتی کیفیت بھی بیان کر دیتے ہیں۔ ان استعاروں سے ان کی نثر میں اختصار بھی پیدا ہو جاتا ہے اور اس تفصیل کی جانب بھی پڑھنے والے کا ذہن منتقل ہو جاتا ہے جو غالب بیان کرنا چاہتے ہیں۔ نواب انور الدولہ شفق کو لکھتے ہیں:

"نہ تم میری خبر لے سکتے ہو، نہ میں تم کو مدد دے سکتا ہوں۔ اللہ، اللہ، اللہ۔ دریا سارا تیر چکا ہوں، ساحل نزدیک ہے، دو ہاتھ لگائے اور بیڑا پار ہے۔"

زندگی کے لیے "دریا" کا استعارہ کیا خوب ہے۔ اس سے ان کی بات میں جدت بھی پیدا ہو گئی اور ایجاز بھی۔ آخری عمر میں غالب بیماری اور ضعف سے تنگ آ گئے تھے۔ خطوں میں بارہا انہوں نے موت کی تمنا کا اظہار

کیا ہے۔اس عبارت میں اپنی اس دلی تمنا کا اظہار "دو ہاتھ لگائے اور بیڑا پار ہے" کہہ کر' کیسے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔

غالب جس مکان میں رہتے تھے' اس کی حالت بہت خستہ تھی۔ایک بار ایسی بارش ہوئی کہ تھمنے کا نام نہیں لیتی تھی۔اس بارش کی وجہ سے غالب کو جو پریشانیاں اٹھانی پڑیں' وہ ان کی زبانی ملاحظہ ہوں :

> "جولائی سے مینہ شروع ہوا' شہر میں سینکڑوں مکان گرے اور مینہ کی نئی صورت : دن رات میں دو چار بار برسے اور ہر بار اس زور سے کہ ندی نالے بہہ نکلیں۔ بالا خانے کا جو دالان میرے بیٹھنے اٹھنے' سونے جاگنے' جینے مرنے کا محل ہے' اگرچہ گرا نہیں لیکن چھت چھلنی ہو گئی۔ کہیں لگن' کہیں چلمچی' کہیں اگال دان رکھ دیا۔ قلمدان' کتابیں اٹھاکر توشہ خانے کی کوٹھڑی میں رکھ دیے۔ مالک مرمت کی طرف متوجہ نہیں۔ کشتی نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔" (بنام مرزا ہرگوپال تفتہ)

برسات کے دنوں میں پرانے گھروں کا جو حال ہوتا ہے' اس کی صحیح کیفیت کا اندازہ یا تو نظم میں میر کی مثنوی' درہجو خانہ خود' سے لگایا جا سکتا ہے یا پھر نثر میں غالب کے اس خط سے۔ ذرا "کشتی نوح" میں رہنے والے اس شخص کی ذہنی اور جسمانی اذیت کا اندازہ کیجئے جو خود نوح نہیں ہے۔

مرزا ہرگوپال تفتہ کی "سنبلستان" چھپ کر آئی۔ غالب کو اس کی طباعت بہت بری لگی۔ دیکھیے کیسے سادہ اور پرکار انداز میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں :

> "اجی مرزا تفتہ! تم نے روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈبویا۔ ہائے کیا بری کاپی ہے۔ اپنے اشعار اور اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ تم یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے۔ صورت ماہ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے' پائچے لیریز' جوتی ٹوٹی۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ بے تکلف "سنبلستان" ایک معشوق خوبرو ہے' بدلباس ہے" (بنام مرزا ہرگوپال تفتہ)

"سنبلستان" کے پسندیدہ اشعار کو بیگمات قلعہ اور اس کی ساقط المعیار طباعت کو "بدلباس معشوق خوبرو" سے تعبیر کرنا غالب ہی کا حصہ ہے۔

نواب کلب علی خاں نے غالب کو دو سو روپے بھیجے۔ غالب نے اس رقم سے قرض کا بوجھ اتار دیا اور اس واقعے کو یوں قلم بند کیا :

> "ان دنوں میں متفرقات کے قرض دار سرگرم تقاضا' بلکہ آمادہ شور و غوغا تھے۔ دو سو روپے کی ہنڈوی صراحی آب حیات ہو گئی۔ دام مرگ سے نجات ہو گئی۔"
>
> (بنام نواب کلب علی خاں)

آخر کے دو مقفیٰ جملوں میں ہنڈوی کے لیے "صراحی آب حیات" کا استعارہ اور "دام مرگ" پیدا ہونے

والا اعجاز یہ سب کیا کسی اچھے شعر سے کم ہیں۔

غالب سماعت بہت پہلے ہی کھو چکے تھے ' رفتہ رفتہ بصارت میں بھی فرق آنے لگا۔ مسلسل بیماریوں نے اتنا نحیف و نزار کر دیا کہ اٹھنے بیٹھنے کی بھی طاقت نہ رہی۔ رام پور جانا چاہتے ہیں مگر جائیں کیسے ' بالا خانے سے نیچے اترنا' کسی طرح بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ اس نقاہت کا حال اپنے مخصوص استعاراتی انداز میں یوں کرتے ہیں :

"بالا خانے پر رہتا ہوں' اتر نہیں سکتا۔ مانا کہ آدمیوں نے گود میں لے کر اتارا اور پالکی رکھ دی۔ پالکی قفس اور میں طائر اسیر' وہ بھی بے پروبال۔ نہ چل سکوں' نہ پھر سکوں۔"

(بنام نواب کلب علی خاں)

غالب اپنی مصیبت کا بیان بھی کبھی کبھی مزے لے لے کر کرتے تھے۔ ایک بار ان کے بدن پر اتنے پھوڑے ہوئے کہ چلنا پھرنا دوبھر ہوگیا۔ ان پھوڑوں نے انہیں اتنا نحیف و نزار کر دیا کہ مرتے دم تک ان کی جسم میں طاقت نہ آسکی۔ میاں داد خاں سیاح کو اس بیماری کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اشعار کی اصلاح سے میں نے ہاتھ اٹھایا۔ اسی برس سے عوارض فساد خون میں مبتلا ہوں۔ بدن پھوڑوں کی کثرت سے سرو چراغاں ہوگیا ہے۔" (بنام میاں داد خاں سیاح)

عوارض فساد خوں "اور پھوڑوں کی کثرت کا ذکر کے بعد اچانک " سرو چراغاں " جیسی ترکیب غالب کی شگفتہ مزاجی اور زندہ دلی کا ثبوت ہے۔

غالب اپنی اردو نثر میں استعارے کا جس قدر استعمال کرتے ہیں' اس سے کہیں زیادہ تشبیہہ کا استعمال ان کے ہاں ملتا ہے۔ ان کے خطوط سے تشبیہات کی کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں :

"ایک مدت سے میرا پاؤں پھل رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے دانے الطریق دائرہ کف پا کے محیط تھے۔ ناگاہ جیسے ایک قوم میں سے ایک شخص امیر ہو جائے' ایک دانہ ان دانوں میں سے بڑھ گیا اور پک گیا اور پھوڑا ہوگیا۔" (بنام منشی نبی بخش حقیر)

"بے درد (مالک مکان) نے مجھ کو عاجز کیا اور مدد لگا دی۔ وہ صحن بالا خانے کا' جس کا دو گز کا عرض اور دس گز کا طول' اس میں پاڑ بندھ گئی۔ رات کو وہیں سونا' گرمی کی شدت پاڑ کا قرب۔ گماں یہ گزرتا تھا کہ یہ کٹگھر ہے اور صبح کو مجھ کو پھانسی ملے گی۔"

(بنام مرزا ہرگوپال تفتہ)

"اب اگرچہ تندرست ہوں لیکن ناتواں اور ست ہوں۔ حواس کھو بیٹھا' حافظے کو رو بیٹھا۔ اگر اٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں اٹھتا ہوں کہ جتنی دیر میں قد آدم دیوار اٹھے۔"

(بنام نواب سعد الدین خاں بہادر شفق)

"لا حول ولا قوة' کسی ملعون نے بہ سبب ذوق شعر' اشعار کی اصلاح منظور رکھی۔ اگر

میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار۔ میں نے توبہ بہ طریق قرو درویش بہ جان درویش لکھا تھا۔ جیسے اچھی جورو برے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے' میرا تمہارے ساتھ وہ معاملہ ہے۔" (بنام مرزا ہرگوپال تفتہ)

"آپ کی محبت دل و جان میں اس قدر سماگئی ہے' جیسا اہل اسلام میں ملکہ ایمان کا۔"

(بنام میر غلام بابا خاں)

"ایک امیر کے ہاں جا لگا۔ دوڑا ہوا گیا' کچھی موجود پائی۔ لیکن کیا کچھی' جیسے نجف خاں کے عہد کے تورانیوں میں ہماری تمہاری ہڈی۔" (بنام نواب علاء الدین خاں علائی)

"اس قصیدے کا ممدوح شعر کے فن سے ایسا بیگانہ ہے جیسے ہم تم اپنے اپنے مسائل دینی سے۔" (بنام مرزا ہرگوپال تفتہ)

"لیکن واللہ تمہارا حال اس ریگستان میں بعینہ ایسا ہے جیسا مسلم ابن عقیل کا حال کوفے میں تھا۔" (بنام علاء الدین خاں علائی)

"اس نامہ مختصر نے وہ کیا جو پارہ اور کشت خشک سے کرے۔" (بنام میر مہدی مجروح)

"تمہارے دستخطی خط نے میرے ساتھ وہ کیا جو بوئے پیرہن نے یعقوب کے ساتھ کیا تھا۔"

(بنام میر سرفراز حسین)

"میں شاعر سخن سنج اب نہیں رہا۔ صرف سخن فہم رہ گیا ہوں۔ بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے کی گوں ہوں۔" (بنام مرزا ہرگوپال تفتہ)

"عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بعد ہے' جو ایمان سے کفر کو۔" (بنام علاء الدین خاں علائی)

خطوط غالب میں استعمال ہونے والی کچھ تشبیہات اوپر نقل کی گئی ہیں۔ یہ تشبیہات اکہری بھی ہیں' طویل اور تو ضیحی بھی۔ غالب عام طور سے کسی واقعے سے متعلق اپنے جذباتی رد عمل اور ذہنی کیفیت کی اظہار کے لیے تشبیہ کا استعمال کرتے ہیں۔ ایسی تشبیہات کی تعداد خاصی ہے' جو غالب نے اپنے گرد و پیش کی سماجی اور سیاسی زندگی سے اخذ کی ہیں۔ انہوں نے تشبیہات کا استعمال محض آرائش نثر کے لیے نہیں کیا بلکہ وہ تشبیہات کی مدد سے اظہار میں زیادہ معنویت اور اثر پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

غالب کی ذہنی تربیت شعری اسلوب میں ہوئی تھی۔ اس لیے جب وہ نثر لکھتے ہیں تو اس میں اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو بھرپور لیکن متوازن انداز سے کام میں لاتے ہیں۔ شعر میں بات کم سے کم الفاظ میں ایجاز و اختصار کے ساتھ کہی جاتی ہے۔ شعر کی نحوی ساخت بھی عام طور سے نثر سے قدرے مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً کبھی کبھی ایک ہی فعل کو اس طرح استعمال کیا جاتا ہے کہ اس سے ایک ساتھ دو مختلف فقروں کی تکمیل ہوتی ہے۔ غالب اردو نثر میں بھی افعال کا استعمال اس طرح کر کے اپنی نثر کو پر لطف اور دلکش بنا دیتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

"اب وہ تصویر کھینچا کریں اور تم انتظار۔" (بنام میر مہدی مجروح)
"تونگر غرور سے' مفلس سردی سے اکڑ رہا ہے۔"
"ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔" (بنام حاتم علی مہر)
ایک فقرے میں فعل کے تکرار سے کیسا لطف پیدا کیا ہے۔
"دیکھئے یہ جراثھ جائے یا یہ خود اٹھ جائیں۔" (بنام نواب حسین مرزا)
ایک اور فقرے میں ایک فعل کی دو مختلف صورتیں ملاحظہ ہوں :
"دوسری کتاب دیکھئے مجھ کو کیا دکھائے۔" (بنام منشی غلام غوث خاں بے خبر)

کبھی کبھی غالب دو فقروں میں دو مختلف باتیں کہتے ہیں اور حرف عطف "اور" کے ذریعے دونوں فقروں کو ملا کر ایک فقرہ بنا دیتے ہیں جس سے بیان میں شگفتگی اور اس کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے فقروں کو اگر "اور" سے نہ جوڑا جائے تو شاید لطف نہ پیدا ہو۔ خواجہ غلام غوث بے خبر کی فارسی غزل کی داد دیتے ہوئے غالب لکھتے ہیں :

"جو ڈھنگ تازہ نوایان ایران کے خیال میں نہ گزرا تھا' وہ تم بروئے کار لائے۔ خدا تم کو سلامت رکھے اور میرا اور وکیل جامع "برہان قاطع" کے جھگڑے میں یہ خلاف اور فارسی دانوں کو توفیق انصاف عطا کرے۔" (بنام خواجہ غلام غوث بے خبر)

غالب کی اس تحریر کا پس منظر یہ ہے کہ کسی نے غالب کو اطلاع دی تھی کہ بے خبر غالب کی "قاطع برہان" کی تردید میں ایک رسالہ لکھ رہے ہیں اور غالب کو یہ بات ناگوار گزری تھی۔

مرزا ہرگوپال تفتہ کو اپنا کلام چھپوانے کی بہت فکر رہتی تھی۔ غالب کو یہ بات شاید اس لیے پسند نہیں تھی کہ اگر شاعر اپنا سارا کلام چھپواتا رہے تو رطب و یابس چھپ جاتا ہے' جس سے شاعر کے ادبی وقار کو نقصان پہنچتا ہے۔ غالب نے کئی خطوط میں تفتہ کو لکھا ہے کہ کلام چھپوانے کی جلدی نہ کرو لیکن تفتہ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی۔ جب تفتہ نے "سنبلستان" کی طباعت کی اطلاع دی تو غالب جواب میں لکھتے ہیں :

"سنبلستان کا چھاپا خدا تم کو مبارک کرے اور خدا ہی تمہاری آبرو کا نگہبان رہے۔"

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ

غالب کے خطوط میں محاوروں اور کہاوتوں کا استعمال بہت کم ہوا ہے۔ کیوں کہ اس معاملے میں غالب نے ڈپٹی نذیر احمد کی طرح زبردستی ٹھونس نہیں کی ہے۔ انہوں نے اپنی اردو نثر میں محاورے یا کہاوت کا استعمال ہمیشہ بے ساختہ اور برجستہ طور پر کیا ہے' جس سے ان کے نثری اسلوب میں نہ صرف شگفتگی' سلاست اور بے تکلفی پیدا ہوئی ہے بلکہ اس کی معنویت میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ کوئی صاحب تھے' جن سے مرزا ہرگوپال تفتہ اور غالب دونوں کو غالباً کسی ادبی معاملے میں اختلاف تھا۔ غالب نے اس سلسلے میں ان صاحب کو خط لکھا اور پھر تفتہ کے نام اپنے ایک خط میں اس خط کا ذکر کرتے ہوئے اردو کا ایک محاورہ کیا بے تکلف انداز

میں استعمال کیا ہے۔ملاحظہ ہو :

"بہ ہر حال' وہ جو میں نے خاقانی کا شعر لکھ کر اس کو بھیجا' اس کی ماں مرے' اگر میرے اس خط کا جواب لکھا ہو۔"

"اس کی ماں مرے" لکھ کر غالب نے اپنی فتح اور ان "صاحب" کی شکست دونوں کا اعلان بڑی خوبصورتی کے ساتھ کر دیا ہے۔

کچھ اور محاوروں کا استعمال ملاحظہ ہو :

"دیکھا اس پنسن قدیم کا حال ؟ میں تو اس سے ہاتھ دھوئے بیٹھا ہوں ' لیکن جب تک جواب نہ پاؤں کہیں اور کیوں کر چلا جاؤں۔ حاکم اکبر کے آنے کی خبر گرم ہے۔ دیکھئے کب آئے ۔ آئے تو مجھے بھی دربار میں بلائے یا نہ بلائے ۔ خلعت ملے یا نہ ملے ۔ اس بیچ میں ایک اور بیچ آ پڑا ہے۔" (بنام میر مہدی مجروح)

"لیکن ان ملاؤں اور عزائم خانوں نے تہہ توڑ دی ہے۔کچھ نہیں جانتے اور باتیں بگھارتے ہیں۔"
(بنام علاء الدین خاں علائی)

"یہ تمہارا دعا گو اگرچہ اور امور میں پایہ عالی نہیں رکھتا' مگر احتیاج میں اس کا پایہ بہت عالی ہے۔ یعنی بہت محتاج ہوں ۔ سو دو سو میں میری پیاس نہیں بجھتی۔" (بنام مرزا ہرگوپال تفتہ)

"مجھے دربار و خلعت کے لالے پڑے ہیں' تم کو پنسن کی فکر ہے۔" (بنام میر مہدی مجروح)

"خزانے سے روپیہ آگیا ہے۔ میں نے آنکھ سے دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹیں۔" (بنام میر مہدی مجروح)

"حضرت کی تحریر کا ایک لفظ' سوائے "سعادت توام شاہ عالم" کے اگر پڑھا گیا ہو تو دیدے پھوٹیں ' ایمان نصیب نہ ہو۔" (بنام چودھری عبد الغفور سرور)

"اب جو کبھی مجھ کو وہ رنگ یاد آتا ہے' تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔" (بنام مرزا حاتم علی بیگ مہر)

شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

نثر میں کبھی کبھی اشعار کا استعمال مفہوم کا زیادہ واضح اور اظہار کو زیادہ موثر بنا دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بعض اوقات شعر کے استعمال سے بیان کے حسن میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ غالب نے اپنے خطوط میں اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے اشعار کا استعمال کیا ہے۔ انہوں نے اپنے خطوط کی عبارتوں میں خود اپنے اشعار بھی استعمال کیے ہیں اور دوسرے شاعروں کے بھی بعض اشعار کو کئی بار استعمال کیا ہے۔ کہیں کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ انہوں نے موقع اور محل کی مناسبت سے کوئی شعر یا مصرع موزوں کر دیا ہے۔ بعض مصرعے اس روانی کے ساتھ آئے ہیں کہ گمان ہوتا ہے کہ غالب کے قلم سے برجستہ نکل گئے ہیں ' جس کا احساس شاید خود غالب کو بھی لکھنے کے بعد ہوا ہو ۔ مفہوم کی ادائیگی کے لیے کہے گئے یہ فی البدیہہ شعر عام طور سے جذبے کی آنچ

شعریت اور تاثیر سے محروم ہیں۔ یہاں غالب اور دوسرے شاعروں کے ان تمام اردو فارسی اشعار یا مصرعوں کا ذکر تو ممکن نہیں جو غالب کے اردو خطوط کی عبارتوں میں جابجا آئے ہیں۔ اس لیے محض چند اشعار مثال کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ پہلے فارسی اشعار کو لیجیے۔ انوری کا ایک شعر ہے :

اے دریغا! نیست ممدوحے سزاوار مدیح
اے دریغا! نیست معشوقے سزاوار غزل

غالب نے یہ شعر تین جگہ نقل کیا ہے اور تینوں جگہ مختلف مفہوم کی وضاحت کے لیے۔ چودھری عبد الغفور سرور کے نام خط میں غالب نے ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت میں دہلی کی بربادی کا ذکر کرتے ہوئے یہ شعر نقل کیا۔ لکھتے ہیں :

"رفع فتنہ و فساد اور بلاد میں مسلم' یہاں کوئی طرح آسائش کی نہیں ہے۔ اہل دہلی عموماً برے ٹھہر گئے' یہ سدا ان کی جبین حال سے مٹ نہیں سکتا' میں اموات میں ہوں' مردہ شعر کیا کہے گا؟ غزل کا ڈھنگ بھول گیا' معشوق کس کو قرار دوں جو غزل کی روش ضمیر میں آوے؟ رہا قصیدہ' ممدوح کون ہے؟ ہائے انوری گویا میری زبان سے کہتا ہے :

اے دریغا! نیست ممدوحے سزاوار مدیح
اے دریغا! نیست معشوقے سزاوار غزل

غلام جیلانی قدر بلگرامی کے نام ایک خط میں غالب نے زمانے کی قدر ناشناسی کا شکوہ کیا ہے۔ شعر گوئی ترک کرنے کا سبب بیان کرتے ہوئے انوری کے اس شعر کا استعمال اس طرح کیا ہے :

"فقیر نے شعر کہنے سے توبہ کی ہے' اصلاح دینے سے توبہ کی ہے۔ شعر سننا تو ممکن ہی نہیں۔ بہرا ہوں' شعر دیکھنے سے نفرت ہے۔ پچہتر برس کی عمر' پندرہ برس کی عمر سے شعر کہتا ہوں۔ ساٹھ برس بکا۔ نہ مدح کا صلہ ملا' نہ غزل کی داد' بہ قول انوری :

اے دریغا! نیست ممدوحے سزاوار مدیح
اے دریغا! نیست معشوقے سزاوار غزل

سب شعرا سے اور احباب سے متوقع ہوں کہ مجھے زمرہ شعرا میں شمار نہ کریں اور اس فن میں مجھ سے کبھی پرسش نہ ہو۔"

مرزا ہرگوپال تفتہ نے کسی ایسے شخص کی مدح میں قصیدہ لکھ کر غالب کو بھیجا جو شعر کے فن سے بیگانہ تھا اور بہ قول غالب "یہ لوگ اس قابل بھی نہیں کہ ان کا نام لیجیے چہ جائے آں کہ مدح کیجیے"۔ غالب نے تفتہ کو لکھا :

"میاں سنو! اس قصیدے کا ممدوح شعر کے فن سے ایسا بیگانہ ہے' جیسے ہم تم اپنے اپنے مسائل دینی سے' بلکہ ہم تم' باوجود عدم واقفیت امور دین سے نفور نہیں اور وہ

شخص اس فن سے بیزار ہے۔ علاوہ اس کے وہ اتالیق کہاں؟ وہاں سے نکالے گئے۔ دلی میں اپنے گھر بیٹھے ہوئے ہیں۔ جب سے آئے ہیں ایک بار میرے پاس نہیں آئے' نہ میں ان کے پاس گیا۔ یہ لوگ اس لائق بھی نہیں کہ ان کا نام لیجیے۔ چہ جائے آں کہ مدح کیجیے۔ ہائے نوری :

اے دریغا! نیست ممدوحے سزاوار مدیح

اے دریغا! نیست معشوقے سزاوار غزل"

شیخ لطیف احمد بلگرامی نے اصلاح کے لیے ایک قصیدہ بھیجا۔ غالب قصیدے پر تبصرہ کرتے ہوئے انہیں سمجھانا چاہتے ہیں کہ شاہِ کونین اور دنیاوی لوگوں کی مدح ایک ہی انداز میں نہیں کرنی چاہئے۔ دونوں میں فرق کرنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں ایک لفظ بھی نثر میں نہیں لکھا۔ صرف ایک شعر لکھ کر اپنی پوری بات سمجھا دی۔ لکھتے ہیں :

"تمہارا مسودہ آیا۔ کم تر جگہ اصلاح کی پائی۔ روشِ تحریر بھی مجھے پسند آئی' دل خوش ہوا' لیکن :

بشمار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن

نعت شہ کونین' و مدیح کے و جم را"

غالب کا ایک شعر ہے :

درکشاکش ضعفم نگسلد رواں از تن

ایں کہ من نمی میرم' ہم زناتوانیہا است

غالب نے یہ شعر اپنے ضعف اور ناتوانی کا ذکر کرتے ہوئے کم سے کم تین بار نقل کیا ہے۔ نواب انور الدولہ سعد الدین خاں شفق کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

"آپ کی پرسش کے کیوں نہ قربان جاؤں کہ جب تک میرا مرنا نہ سنا' میری خبر نہ لی۔ میرے مرگ کی مخبر کی تقریر اور مثلہ میری یہ تحریر' آدمی سچ اور آدمی جھوٹ۔ در صورت مرگ' نیم مردہ اور درحالت حیات' نیم زندہ ہوں :

درکشاکش ضعفم نگسلد رواں از تن

ایں کہ من نمی میرم' ہم زناتوانیہا است"

۱۵ فروری ۱۸۶۳ء

چودھری عبد الغفور سرور کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

"در کشاکش ضعفم نگسلد رواں از تن

ایں کہ من نمی میرم' ہم زناتوانیہا است"

حضرت نے میری گرفتاری کا نیا رنگ نکالا۔ "بوستان خیال" کے دیکھنے کا دانہ ڈالا۔ مجھ میں

اتنی طاقت پرواز کہاں کہ بلا سے اگر پھنس جاؤں، دام پر گر کے دانہ زمین پر سے اٹھاؤں۔
حضرت بچ تو یوں ہے کہ غم ہائے روزگار نے مجھ کو گھیر لیا ہے"
ابر گھرا ہوا ہے، ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور غالب کا یہ حال ہے کہ بہ قول سودا "بہار ہے سر جام و یار گزرے ہے" یعنی غالب کے پاس پینے کو شراب نہیں ہے۔ اس کیفیت کا موثر اظہار اپنے ایک فارسی شعر کی مدد سے یوں کرتے ہیں :
"پہرون چڑھا ہو گا کہ ابر گھر رہا ہے، ترشح ہو رہا ہے، ہوا سرد چل رہی ہے، پینے کو کچھ میسر نہیں، ناچار روٹی کھائی ہے :

افق ہا پر از ابر بہمن مہی
سفالینہ جام من از مے تہی"

(بنام خواجہ غلام غوث خاں بے خبر)
میر مہدی مجروح نے غالب کو اطلاع دی کہ میرن صاحب دلی آ رہے ہیں۔ غالب جو دوستوں کی ملاقات کو ترسے ہوئے تھے، خط کے جواب کی ابتدا ان الفاظ سے کرتے ہیں :
"کیوں یار کیا کہتے ہو؟ ہم کچھ آدمی کام کے ہیں یا نہیں۔ تمہارا خط پڑھ کر دو بار یہ شعر پڑھا :

وعدہ وصل چوں شود نزدیک
آتش شوق تیز تر گردد"

غالب کا کوئی شاگرد ان سے اپنے اشعار پر اصلاح کی درخواست کرتا یا کوئی دوست تازہ کلام کی فرمائش کرتا اور غالب کی صحت ٹھیک نہ ہوتی تو کبھی کبھی اپنی ذہنی اور جسمانی کمزوری کا عذر پیش کر کے معذرت چاہ لیتے۔ اس طرح کے کم سے کم چار موقعوں پر غالب نے اپنا یہ فارسی شعر استعمال کیا ہے :

گمان زیست بود بر منت ز بیدردی
بدست مرگ ولے بد تر از گمان تو نیست

غالب کو بیماریوں نے گھیر رکھا ہے۔ نقاہت اور کمزوری انتہا پر ہے۔ مالی دشواریوں کا سامنا ہے۔ "قحط سالی" کے عالم میں "عشق" کو فراموش کیے اور شعر و شاعری کو ترک کیے عرصہ ہو چکا ہے۔ ایسی حالت میں جب حکیم محب علی تازہ کلام یا نثر کی فرمائش کرتے ہیں تو غالب اپنی بے بسی اور لاچاری پر تڑپ اٹھتے ہیں۔ لکھتے ہیں :

"گمان زیست بود برمنت ز بیدردی
بدست مرگ ولے بدتر از گمان تو نیست

"ہے ہے! تم اب تک یہ جانتے ہو کہ غالب شعر کہتا ہے یا کہہ سکتا ہے؟ ایک پاؤں رکاب میں، ایک ہاتھ باگ پر۔ اس صورت میں کیا کہوں گا اور کیا لکھوں گا؟ اخ کرم و معظم

نواب مصطفٰے خاں گواہ ہیں کہ اب شعر نہیں کہتا۔"

غالب ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

"گمان زیست بود بر سنت ز بیدروی
بہ زیست مرگ ولے بدتر از گمان تو نیست

مجھے زندہ سمجھتے ہو' جو نثر فارسی کی فرمائش کرتے ہو؟ غنیمت نہیں جانتے کہ مردہ کچھ لکھ کر بھیجتا ہے۔"

(بنام منشی شیو نرائن آرام ۱۸ جولائی ۱۸۵۸ء)

مرزا ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں :

"سبحان اللہ! تم جانتے ہو کہ میں اب دو مصرعے موزوں کرنے پر قادر ہوں ' جو مجھ سے مطلع مانگتے ہو؟

گمان زیست بود بر منت ز بیدروی
بدست مرگ ولے بدتر از گمان تو نیست

غالب کی "قاطع برہان" کی جواب میں مرزا رحیم بیگ نے "ساطع برہان" نام سے ایک کتاب لکھی۔ غالب نے ایک طویل خط کی شکل میں "ساطع برہان" کا جواب دیا۔ جو بہت موثر طریقے سے ایک فارسی شعر پر اس طرح اختتام پذیر ہوتا ہے :

"میں اب قطع کلام کرتا ہوں اور آپ کو بہ کمال تعظیم سلام کرتا ہوں۔ پیغبر کی تحقیر کو مسلم رکھتے ہو۔ تم جانو اور سید ابرار۔ خاقانی پر بہتان کرتے ہو' تم جانو اور وہ میدان معنی کا شہ سوار۔ مجھ کو جس قدر تم نے لکھا ہے یا کوئی اور لکھ رہا ہے' اگرچہ وہ سب لغو اور جھوٹ ہے' معقول اور راست نہیں 'لیکن واللہ ' مجھ کو عرصہ محشر میں اس کی بازخواست نہیں؟ :

زمین عشق' بہ کونین صلح کل کردیم
تو خصم باش' وزما دوستی تماشا کن"

صاحب عالم سے کسی ادبی معاملے میں اختلاف ہو گیا۔ غالباً' انہوں نے غالب کا کسی ہندوستانی فارسی شاعر سے موازنہ کر دیا یا کسی معاملے میں اسے غالب پر ترجیح دے دی۔ غالب کو یہ بات ناگوار گزری۔ چوں کہ صاحب عالم کا احترام کرتے تھے' اس لیے بہت دلچسپ انداز میں صاحب عالم سے ان کے اس رویے کی شکایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"پہلے اپنا ایک شعر کمال گستاخی کو کار فرما کر لکھتا ہوں اور یہ نہیں لکھتا کہ یہ شعر میں نے کیوں لکھا ہے۔ شعر یہ ہے :

مرا بہ غیر زیک جنس در شمار آورد
فغاں! کہ نیست ز پروانہ فرق تا کمش"

بنام چودھری عبد الغفور سرور

کچھ کتابیں اور کچھ شراب کی بوتلیں غالب کے ہاتھ آگئی ہیں۔ چنانچہ جمشید اور سکندر بنے ہوئے عیش کر رہے ہیں۔ اپنی اس کیفیت کا بیان میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں اس طرح کرتے ہیں :

"مولانا غالب علیہ الرحمہ ان دنوں میں بہت خوش ہیں۔ پچاس ساٹھ جز کی کتاب "امیر حمزہ کی داستان" کی اور اسی قدر حجم کی ایک جلد "بوستان خیال" کی آگئی ہے' سترہ بوتلیں بادہ ناب کی توشک خانے میں موجود ہیں۔ دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں' رات بھر شراب پیا کرتے ہیں :

کسے کیں مراوش میسر بود
اگر جم نہ باشد' سکندر بود"

اردو اور فارسی کے کچھ شعر ایسے ہیں' جنہیں غالب نے بار بار نقل کیا ہے۔ یہ وہ اشعار ہیں' جن کی مدد سے غالب اپنے ضعف' نقاہت' بے بسی اور موت کی تمنا کے اظہار کو زیادہ موثر طریقے سے بیان کرتے ہیں۔ فارسی کے ایسے دو شعروں کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اردو میں خود غالب ہی کا ایک شعر ہے :

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

یہ شعر غالب نے کم سے کم چار دفعہ خود اپنی موت کے سلسلے میں استعمال کیا ہے۔ چودھری عبد الغفور سرور کو ایک خط میں غالب لکھتے ہیں :

"میں تو اب روز شب اسی فکر میں ہوں کہ زندگی تو یوں گزری' اب دیکھیے موت کیسی ہو :

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

میرا ہی شعر ہے اور میرے ہی حسب حال ہے۔"

نواب انور الدولہ سعد الدین خاں شفق کو لکھتے ہیں :

نہ تم میری خبر لے سکتے ہو' نہ میں تم کو مدد دے سکتا ہوں۔ اللہ' اللہ! دریا سارا تیر چکا ہوں' ساحل نزدیک ہے' دو ہاتھ لگائے اور بیڑا پار ہے :

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

غلام حسنین قدر بلگرامی نے خط لکھ کر غالب کے حلقہ تلمذ میں داخل ہونے کی درخواست کی۔ غالب نے

قدر بلگرامی کی یہ درخواست بہ خوشی قبول کی لیکن خط میں یہ بھی لکھا :

"باسٹھ برس کی عمر ہوئی، پچاس برس اس شیوے کی ورزش میں گزرے۔ اب جسم و جاں میں تاب و تواں نہیں۔ نثر فارسی لکھنی یک قلم موقوف، اردو، سو اس میں عبارت آرائی متروک، جو زبان پر آوے، وہ قلم سے نکلے۔ پاؤں رکاب میں ہے اور اور ہاتھ باگ پر، کیا لکھوں اور کیا کروں؟ یہ شعر اپنا پڑھا کرتا ہوں :

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

موت سے کچھ عرصے پہلے غالب نے صوفی منیری کو جو خط لکھا تھا، اس میں اپنی ضعیفی اور صحت کی خرابی کا ذکر قدرے تفصیل سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اکہتر برس کی عمر، پاؤں سے اپاہج، کانوں سے بہرا، دن رات پڑا رہتا ہوں۔ دو سطریں لکھیں، بدن تھرایا، حرف سوجھنے سے رہا، قوتیں ساقط، حواس مختل، غذا قلیل بلکہ اقل :

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

غالب نے اپنی ضعیفی، کمزوری اور بیماریوں کا ذکر اکثر شاعرانہ انداز میں کیا ہے۔ وہ اس موقع پر بہت خوبصورت اور برجستہ استعارے اور تشبیہیں استعمال کرتے ہیں۔ اپنے ایک شاگرد منشی میاں داد خاں سیاح کے نام خط میں اپنی صحت کی خرابی کا ذکر بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ اور آخر میں ذوق کا شعر نقل کر کے اپنی بات اور ذوق کے شعر دونوں کو موثر بنا دیا ہے :

"ناتوانی زور پر ہے، بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے۔ ضعف، سستی، کاہلی، گراں جانی، گرانی، رکاب میں پاؤں ہے، باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور دراز در پیش ہے۔ زاد راہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر، اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے۔ دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے :

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ایک خط میں طول عمر سے پیدا ہونے والی اپنی بیماریوں کا ذکر کر کے، میر تقی میر کا شعر بڑے برجستہ طور پر استعمال کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

"خرف ہوں، پوچ ہوں، ہیچ ہوں، عاصی ہوں، فاسق ہوں، روسیاہ ہوں، یہ شعر میر تقی میر کا میرے حسب حال ہے :

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم

القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

(بنام منشی حبیب اللہ خاں ذکا)

جون ۱۸۵۸ء میں حکومت نے طے کیا کہ پنشن داروں کو پنشن ماہ بہ ماہ ملنے کے بجائے سال میں دو بار ملا کرے گی۔ اخراجات کے مقابلے میں غالب کی آمدنی یوں بھی محدود تھی۔ اس حکم نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ غالب حکومت کے اس فیصلے کی اطلاع تفتہ کو بڑی دلچسپ انداز میں دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اب میری کہانی سنو۔ آخر جون میں صدر پنجاب سے حکم آگیا کہ پنسن داران قدیم ماہ بہ ماہ نہ پائیں' سال میں دو بار بہ طریق شش ماہہ فصل بہ فصل پایا کریں۔ ناچار' ساہو کار سے سود کاٹ کر روپیہ لیا گیا تا رام پور کی آمد میں مل کر صرف ہو۔ یہ سود جھے مہینے تک اسی طرح کٹواں دینا پڑے گا۔ ایک معقول رقم گھاٹے میں جائے گی :

رسم ہے مردے کی چھماہی ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بہ قید حیات
اور چھماہی ہو سال میں دو بار"

(بنام مرزا ہرگوپال تفتہ)

غالب نے زندگی کے تمام نشیب و فراز دیکھے۔ ہر ممکن مصائب و آلام کا سامنا کیا لیکن انتہائی ناکامی اور مایوسی میں بھی انہوں نے حالات سے شکست نہیں کھائی۔ مرزا ہرگوپال تفتہ مالی دشواریوں سے تنگ آکر گوشہ نشینی اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے غالب کو اپنے اس ارادے سے آگاہ کیا تو ہر حال میں زندہ رہنے کا سلیقہ رکھنے والے غالب جواب دیتے ہیں :

"کیوں ترک لباس کرتے ہو؟ پہننے کو تمہارے پاس ہے کیا جس کو اتار کر پھینکو گے۔ ترک لباس سے قید ہستی مٹ نہ جائے گی۔ بغیر کھائے بے گزارا نہ ہو گا۔ سختی و سستی' رنج و آلام کو ہموار کر دو۔ جس طرح ہو' اسی صورت سے' بہ ہر صورت گزرنے دو :

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

چودھری عبدالغفور سرور کے نام ایک خط میں صاحب عالم سے خطاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"حضرت! سچ تو یوں ہے کہ غم ہائے روزگار نے مجھ کو گھیر لیا ہے' سانس نہیں لے سکتا' اتنا تنگ کر دیا ہے۔ ہر بات سو طرح سے خیال میں آئی' پر دل نے کسی طرح تسلی نہ پائی۔ اب دو باتیں سوچتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ جب تک جیتا ہوں' یوں ہی رویا کروں گا' دوسری یہ' آخر ایک نہ ایک دن مروں گا۔ یہ صغریٰ و کبریٰ دل نشین ہے' نتیجہ اس کا تسکین

ہے۔ بہمات :

مُنحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے"

اس جگہ غالب کہنا چاہتے ہیں کہ ہم لوگ لاکھ برے سہی' پھر بھی اس زمانے میں غنیمت ہیں۔ مصحفی کے شاگرد مضطر کا ایک شعر نقل کر کے بڑے دلکش انداز میں یہ بات کہی ہے۔ لکھتے ہیں :

"میاں! یہ ہم تم بوڑھے ہیں یا جوان ہیں۔ توانا ہیں یا ناتواں ہیں' بڑے بیش قیمت ہیں'
لیعنی یہ ہر حال غنیمت ہیں۔ کوئی جلا بھنا کہتا ہے :

یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ
یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ

(بنام میر سرفراز حسین)

تصور کیجئے' ۱۸۵۷ء کا ناکام انقلاب اپنی خوں آشامیوں کے ساتھ غالب کی نگاہوں کے سامنے سے گزر چکا ہے۔ بے شمار عزیز' دوست اور آشنا موت کی نذر ہو چکے ہیں۔ حالات ابھی تک معمول پر نہیں آئے ہیں۔ ہر چیز غیر یقینی دکھائی دیتی ہے۔ مستقبل کا کوئی نقشہ آنکھوں کے سامنے نہیں ہے۔ غالب نے خود اپنے ایک شعر سے اس کیفیت کا کیسا موثر اظہار کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

"تمہاری والدہ کا مرنا سن کر مجھ کو بڑا غم ہوا۔ خدا تم کو صبر دے اور اس عفیفہ کو بخشے۔
میرا حقیقی بھائی مرزا یوسف خاں دیوانہ بھی مرگیا۔ کیسا پنسن اور کہاں اس کا ملنا۔ یہاں
جان کے لالے پڑے ہیں :

ہے موج زن اک قلزم خوں' کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے' کیا کیا مرے آگے"

مرقع نگاری

اگرچہ خطوط غالب میں مرقع نگاری کے نمونے بہت کم ہیں' لیکن جو دو چار نمونے ملتے ہیں' وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ اردو میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش بھی خطوط غالب ہی میں ملتے ہیں۔ غالب مختصر الفاظ سے ایسا مرقع پیش کرتے ہیں کہ پوری تصویر اور صاحب تصویر کا کردار ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ غالب جب رام پور میں تھے تو نواب کلب علی خاں کی شخصیت نے انہیں بہت متاثر کیا۔ علائی کو اپنے تاثرات ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :

"رئیس کی تصویر کھینچتا ہوں : قد' رنگ' شکل' شمائل' بعینہٖ بھائی ضیاء الدین خاں۔ عمر کا
فرق' اور کچھ کچھ چہرہ اور لحیہ متفاوت۔ حلیم و خلیق' باذل' کریم' متواضع' متشرع' متورع'

شعر فہم، سینکڑوں شعر یاد۔ نظم کی طرف توجہ نہیں، نثر لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ جلا لائے طباطبائی کی طرز برتتے ہیں۔ شگفتہ جبیں ایسے کہ ان کے دیکھنے سے غم کوسوں بھاگ جائے۔ فصیح بیان ایسے کہ ان کی تقریر سن کر ایک اور نئی روح قالب میں آئے۔

اللھم دام اقبالہ و زاد اجلالہ" (بنام علاء الدین خاں علائی)

اس مختصری تحریر میں غالب نے نواب کلب علی خاں کی پوری شخصیت : چہرہ مہرہ و اخلاق، شعر فہمی، نثر نگاری اور تقریر غرض ہر چیز اس طرح بیان کی ہے کہ نواب صاحب کی پوری شخصیت اور ان کا کردار ہمارے سامنے آگیا ہے۔

میر مہدی مجروح کے ایک دوست حکیم میر اشرف علی پہلی بار غالب سے ملاقات کو آئے۔ غالب کو حکیم صاحب بہت پسند آئے۔ ان سے اپنی ملاقات کا حال جس دلکش انداز میں بیان کیا ہے، اسے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

"کل دوپہر ڈھلے، ایک صاحب اجنبی، سانولے سلونے، داڑھی منڈے، بڑی بڑی آنکھوں والے تشریف لائے۔ تمہارا خط دیا، صرف ان کی ملاقات کی تقریب میں تھا۔ بارے، ان سے اسم شریف پوچھا گیا، فرمایا، اشرف علی، قومیت کا استفسار ہوا، معلوم ہوا سید ہیں۔ حکیم نکلے۔ یعنی حکیم میر اشرف علی۔ میں ان سے مل کر بہت خوش ہوا۔ خوب آدمی ہیں اور کام کے آدمی ہیں۔" (بنام میر مہدی مجروح)

غالب کی ایک ملازمہ تھیں بی وفادار۔ بہت دلچسپ شخصیت کی مالک۔ علائی کے نام ایک خط میں غالب نے ان کی شخصیت کا بہت دلکش خاکہ کھینچا ہے۔ لکھتے ہیں :

"بی وفادار، جن کو تم کچھ اور بھائی خوب جانتے ہیں، اب تمہاری پھوپھی نے انہیں "وفادار بیگ" بنا دیا ہے۔ باہر نکلتی ہیں، سودا تو کیا لائیں گی مگر خلیق اور ملنسار ہیں، رستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں۔ جب وہ محل سے نکلیں گی، ممکن نہیں کہ اطراف نہر کی سیر نہ کریں گی، ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی کو لے جاکر نہ دکھائیں اور نہ کہیں کہ "یہ پھول تائی چچا کے بیٹے کی کائی کی ایں"۔ شرح : تمہارے چچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں۔" (بنام نواب علاء الدین خاں علائی)

اک ذرا چھیڑیے، پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے!

غالب کے مصائب و آلام کی داستان اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب کہ وہ ابھی نوجوان تھے۔ عمر کے ساتھ ساتھ ان کی مصیبتوں میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ پنشن کے مقدمے میں ان کی شکست، دو دفعہ کا حادثہ اسیری، ۱۸۵۷ء کا ناکام انقلاب اور اس میں بے شمار دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں کا قتل، جو باقی بچے تھے، ان کی

مفارقت' زندگی بھر کی تنگدستی اور بڑھاپے کی مسلسل بیماریاں غالب جیسے حساس انسان کو پاگل کر دینے یا کم سے کم انہیں دنیا سے متنفر کر دینے اور قنوطی بنانے کے لیے کافی تھیں۔ لیکن زندگی کے آخر دنوں تک غالب کے ہوش و حواس اس لیے قائم رہے کہ ان میں غیر معمولی قوت ارادی تھی جس کی وجہ سے انہوں نے زندگی کے ساتھ مکمل مفاہمت کر لی تھی۔ یہ صرف ان کا خیال ہی نہیں بلکہ عقیدہ تھا کہ زندگی کا پودا حقیقی معنوں میں غم اور خوشی کی دھوپ چھاؤں میں ہی پروان چڑھتا ہے اور ان میں بھی دھوپ یعنی غم کو ہی خوشی پر فوقیت اور برتری حاصل ہے۔ غالب کا ایک شعر ہے :

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

شعر میں محض شاعرانہ مضمون نہیں باندھا گیا بلکہ یہ غالب کی زندگی کی تفسیر ہے۔ غالب زندگی اور اس کے مسائل کو ایک باشعور اور دانشور انسان کی حیثیت سے دیکھتے ہیں' اسی لیے مسلسل مایوسیوں اور ناکامیوں سے تنگ آکر انہوں نے زندگی سے فرار حاصل نہیں کیا۔ زندگی کے مصائب و آلام نے ان کی فکر میں بالیدگی پیدا کی اور ان میں زندہ رہنے کا عزم اور حوصلہ جگایا اور وہ صبر و تحمل اور استقلال پیدا کیا جو ہر کڑی سے کڑی مصیبت کو ہنس کر جھیلنا سکھاتا ہے۔ ایسا ہی آدمی یہ شعر کہہ بھی سکتا تھا :

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

غالب نے "جان عزیز" کے لیے آرزو اور شکست آرزو' خوشی اور غم' کامیابی اور ناکامی کے درمیان زندہ رہنے کا سلیقہ سیکھ لیا تھا۔ اسی لیے تو وہ اپنے آپ کو "حرف ستم ہائے روزگار نہیں بلکہ " رہین ستم ہائے روزگار" کہتے ہیں۔ اس "ستم ہائے روزگار" سے ان کی زندہ دلی اور بذلہ سنجی اور ان کی حس مزاح ماند نہیں پڑی بلکہ اور نکھرتی چلی گئی۔ ایک حقیقی مزاح نگار کی طرح غالب زندگی کی ان تمام ناہمواریوں اور کھردری پن پر سے ہنستے ہوئے برہنہ پا گزر جاتے ہیں' جن پر چلتے ہوئے پاؤں لہولہان ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے تضادات کا احساس اور عرفان ہی ان تضادات کی تشریحت بھی ہے اور اس تشریحت کا اندازہ غالب نے ہمیں اپنی تحریروں میں خوب خوب کرایا ہے۔ غالب کے مزاج میں پھکڑپن نہیں بلکہ زندگی کی بصیرتوں کا اور اس کی تلخ اور شیریں حقیقتوں کا' تلخ زیادہ اور شیریں کم' حوصلہ مندانہ اور برملا اظہار ہے۔ غالب کی ظرافت اور ان کی شوخی طبع دونوں کا سرچشمہ زندگی کی محرومیاں اور غم و آلام ہیں۔ اسی لیے ان کا مزاج توانا اور جاندار ہے۔

غالب خط لکھتے ہوئے کوشش کرتے ہیں کہ اپنی مصیبتوں کے بیان سے دوسروں کو بے وجہ پریشان نہ کریں۔ وہ اپنے دکھڑے بڑے چسکے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ میر سرفراز حسین کے نام خط میں اپنی تنہائی کا ماتم کرتے ہیں' ان دوستوں کا ذکر کرتے ہیں' جنہیں انقلاب زمانہ نے ان سے جدا کر دیا۔ پھر ایک دم بات کا رخ بدلتے ہوئے لکھتے ہیں :

اللہ ' اللہ ' ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں' میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا۔
سنو غالب! رونا پیٹنا کیا' کچھ اختلاط کی باتیں کرو۔"

غالب کی ساری زندگی اپنی انا کی نگہداری میں گزری۔ لیکن عملی زندگی میں جب غالب کی انا باد حوادث کے تھپیڑے کھاتی ہے تو غالب اپنا مذاق اڑانے سے بھی باز نہیں آتے۔ مرزا قربان علی بیگ خان سالک کو اپنے بارے میں لکھتے ہیں :

"یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں' مخلوق کا کیا ذکر' کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں' رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں' یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے۔ کہتا ہوں کہ لو' غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں' آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے ' اب تو قرض داروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا' بڑا ملحد مرا' بڑا کافر مرا۔ ہم نے از راہ تعظیم' جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے "جنت آرام گاہ" و "عرش نشین" خطاب دیتے ہیں' چوں کہ یہ اپنے کو "شاہ قلمرو سخن" جانتا تھا' "سقر مقر" اور "ہاویہ زاویہ" خطاب تجویز کر رکھا ہے۔

آیئے' نجم الدولہ بہادر ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ ' ایک قرض دار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں۔ اجی' حضرت نواب صاحب کیسے' اوغلان صاحب! آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں' یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے' کچھ تو اکسو' کچھ تو بولو۔ بولے کیا بے حیا' بے غیرت' کوٹھی سے شراب' گندھی سے گلاب' بزاز سے کپڑا' میوہ فروش سے آم' صراف سے دام قرض لیے جاتا ہے۔ یہ بھی تو سونچا ہوتا' کہاں سے دوں گا۔"

خط میں غالب کی انا کے شیش محل کے چکنا چور ہونے کی جھنکار صاف سنائی دے رہی ہے۔ بہ ظاہر غالب نے اپنی کمزوریوں' معاشی بدحالیوں اور محرومیوں کا مضحکہ اڑایا ہے' لیکن اس بذلہ سنجی اور شوخی بیان کی تہہ میں ناقابل بیان ذہنی کرب اور محرومی کا شدید احساس ہے۔ یہ صرف غالب کی داستان نہیں بلکہ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد کے اس پورے طبقے کی داستان ہے' جو کبھی مسند اقتدار پر جلوہ افروز تھا' جسے سلجوقی اور افراسیابی ہونے پر ناز تھا' جسے اپنی ذہنی صلاحیتوں پر گھمنڈ تھا اور جو اب قرض پر زندگی بسر کر رہا تھا۔ کامیاب ترین ظرافت وہی ہے جس کا شکار طنز نگار کی اپنی ذات ہو۔ کوئی دوسرا شخص ایسی بے رحمی سے غالب کا مذاق نہیں اڑا سکتا تھا جیسا کہ اس خط میں خود غالب نے اپنا مذاق اڑایا ہے۔ غالب نے نواب علاء الدین خاں علائی کے نام ایک خط میں اپنی غربت اور معاشی بدحالی کا اس طرح مضحکہ اڑایا ہے :

"بھائی کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں کہ ادھر متھرا داس سے قرض لیا' ادھر درباری مل کو مارا' ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی۔ ہر ایک پاس تمسک مہری

موجود۔ شہد لگاؤ، چاٹو۔ نہ مول نہ سود۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ بالکل پھوپھی کے سر۔ بااین ہمہ کبھی خان نے کچھ دے دیا، کبھی الور سے کچھ دلوا دیا کبھی ماں نے کچھ آگرے سے بھیج دیا۔ اب میں اور باسٹھ روپیے آٹھ آنے ککڑی کے، سو روپیے رام پور کے۔ قرض دینے والا ایک میرا مختار کار۔ وہ سود ماہ بہ ماہ لیا چاہے۔ مول میں قسط اس کو دینی پڑے۔ انکم ٹیکس جدا، چوکی دار جدا، سود جدا، مول جدا، بی بی جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمد وہی ایک سو باسٹھ۔ تنگ آگیا۔ گزارا مشکل ہو گیا۔ روز مرہ کا کام بند رہنے لگا۔ سونچا کہ کیا کروں، کہاں سے گنجائش نکالوں؟ قہر درویش بہ جان درویش، صبح کی تبرید؟ متروک، چاشت کا گوشت آدھا، رات کی شراب وگلاب موقوف۔ بیس بائیس روپیہ مہینا بچا۔ روز مرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا، تبرید و شراب کب تک نہ پیو گے؟ کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا، کہ نہ پیو گے تو کس طرح جیو گے؟ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے۔ بارے، مہینا پورا نہیں گزرا تھا کہ رام پور سے علاوہ وجہ مقرری اور روپیہ آگیا، قرض مقسط ادا ہو گیا۔ متفرق رہا، خیر رہو۔ صبح کی تبرید، رات کی شراب جاری ہو گئی، گوشت پورا آنے لگا۔"

مزے لے لے کر اپنی پریشانیوں اور مصیبتوں کا ذکر کرنے کے لیے بہت بڑا کلیجا چاہیے لیکن اپنی بات میں تاثیر محض کلیجے کے زخم بیان کر دینے سے نہیں پیدا ہو جاتی۔ اس کے لیے کلیجا چیر کر دکھانا پڑتا ہے اور غالب ہم کو اپنا "طرف دار" بنانے کے لیے یہی تو کرتے ہیں۔

غالب کی صرف بڑھاپے کی تصویریں ہم تک پہنچی ہیں۔ ان تصویروں سے اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ جوانی میں وہ بہت وجیہہ اور خوبصورت آدمی رہے ہوں گے۔ غالب کی جوانی کا حلیہ انھی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو :

"میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے .... جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کرتے تھے۔ اب جو کبھی وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔" (بنام مرزا حاتم علی مہر)

بڑھاپے کا آغاز ہوا، نوجوانی کے ساتھ ساتھ چہرے اور جسم کا حسن بھی رخصت ہونے لگا، ڈاڑھی اور مونچھ میں بھی سفید بال آنے لگے، دانت ٹوٹنے شروع ہو گئے، غالب نے مرزا حاتم علی مہر کے نام خط میں بدلتے ہوئے حلیے کا نہ صرف مضحکہ اڑایا ہے بلکہ اپنی شخصیت کی انفرادیت کا بھی اظہار کیا ہے، غالب لکھتے ہیں :

"جب ڈاڑھی مونچھ میں سفید بال آ گئے، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے، اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے، ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور

ڈاڑھی بھی' مگر یہ یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام' ملا' حافظ' بساطی' نیچہ بند' دھوبی' سقا' بھٹیارہ' جولاہا' کنجڑا' منہ پر ڈاڑھی' سر پر بال' فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی' اسی دن سر منڈوایا۔" (بنام مرزا حاتم علی مہر)

ظرافت اور مکالمہ آرائی نے غالب نے پورے واقعے کی بڑی دلچسپ تصویر کھینچ دی ہے۔ اس واقعے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزوں کے ظلم و ستم صرف ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب تک محدود نہیں رہے بلکہ بعد میں بھی وہ بہانے بنا کر ہندوستانیوں پر ظلم کرتے رہے۔ "مسل داخل دفتر ہوئی' میاں مو اپنے گھر چلے آئے" ان دو چھوٹے چھوٹے فقروں میں ہندوستانیوں کی بے بسی اور لاچاری کا کیا خوبصورت اظہار کیا گیا ہے۔ ناانصافیوں کی اس داستان کو لطیفہ بنا کر پیش کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس خط کے آغاز میں غالب نے مرزا یوسف کے لڑکے کی موت پر تعزیتی کلمات لکھے تھے۔ پھر غالب نے یوسف مرزا کے ماموں سید یوسف الدین حیدر کے حکم دوام حبس کا ذکر کیا تھا۔ غالب پر ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے دوران بہادر شاہ ظفر کا سکہ کہنے کا الزام تھا۔ غالب نے خط میں اس الزام کا بھی ذکر کیا تھا۔ ان تینوں واقعات کے بیان سے یہ خط بہت غم انگیز ہو گیا تھا۔ ان واقعات کا اثر کم کرنے کے لیے غالب نے حافظ مو کا واقعہ بیان کرنے میں شوخی اور ظرافت سے کام لیا۔ اس لطیفے کے بعد اس خط میں غالب ایک اور واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ آدمی ہنسے بغیر نہ رہ سکے۔ خواجہ بخش درزی بہت موٹے آدمی تھے۔ ان کے لیے ہاتھی کا استعارہ کیسا برجستہ ہے' لکھتے ہیں :

"ہاں صاحب' خواجہ درزی کل سہ پہر کو میرے پاس آیا' میں نے جانا ایک ہاتھی کوٹھے پر چڑھ آیا۔" (بنام یوسف مرزا)

غالب کے خطوط میں کہیں کہیں معمولی اور سطحی قسم کی ظرافت بھی ملتی ہے جس کا مقصد محض ہنسنا ہنسانا ہے۔ مثال کے طور پر غالب ایک خط میں لکھتے ہیں :

"روزہ رکھتا ہوں مگر روزے کو بہلائے رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا' کبھی حقہ پی لیا' کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم اور طرفہ روش رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ بہلاتا رہتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔" (بنام منشی نبی بخش حقیر)

علاء الدین خاں علائی کے نام ایک خط میں مہینوں کے نام سے فائدہ اٹھا کر مزاح پیدا کیا ہے' لکھتے ہیں :

"لو صاحب' وہ مرزا رجب بیگ مرے' ان کی تعزیت آپ نے کی' شعبان بیگ پیدا ہو گئے' کل ان کی چھٹی ہو گئی' آپ شریک نہ ہوئے۔" (بنام علاء الدین خاں علائی)

مرزا ہرگوپال تفتہ نے بہت دن سے خط نہیں لکھا' غالب ان سے ظریفانہ انداز میں خط نہ لکھنے کی شکایت اس طرح کرتے ہیں :

"کیوں صاحب! کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندر آباد کے رہنے والے دلی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں۔ بھلا اگر یہ حکم ہوا ہو تا تو یہاں بھی تو اشتہار ہو جاتا کہ زنہار کوئی خط سکندر آباد کو یہاں کی ڈاک میں نہ جاوے۔" (بنام مرزا ہرگوپال تفتہ)

تفتہ کو خط لکھا تو غالب کو شاید خیال ہوا کہ خط کا وزن زیادہ ہو گیا ہے' کہیں بیرنگ نہ ہو جائے' لفافے پر دگنے ٹکٹ لگا دیے اور خط میں اس کا اظہار اس طرح کیا :

"کیوں صاحب! یہ ڈبل خط پوسٹ پیڈ بھیجتا اور وہ بھی دلی سے سکندر آباد کو' آیا حاتم کے سوا اور میرے سوا کسی نے کیا ہوگا۔" (بنام مرزا ہرگوپال تفتہ)

غالب اور مجروح کے ایک دوست حکیم میر اشرف علی نے سرمنڈوا ڈالا۔ غالب کو ان کی شکل دیکھ کر ہنسی آگئی۔ مجروح کو لکھتے ہیں :

"کل حکیم اشرف علی آئے تھے۔ سرمنڈوا ڈالا ہے۔ محلقین رؤسکم" پر عمل کیا ہے۔ میں نے کہا کہ سر منڈوایا ہے تو ڈاڑھی رکھو۔ کہنے لگے' دامن از کجا آرم کہ جامہ ندارم۔ واللہ ان کی صورت قابل دیکھنے کے ہے۔" (بنام میر مہدی مجروح)

غالب کو شاید بیکانیر کی مصری بہت پسند تھی۔ علائی سے مصری کی فرمائش کرتے ہیں :

"خصی بکروں کے گوشت کے قلیے' دو پیازے' پلاؤ' کباب جو کچھ تم کھا رہے ہو' مجھ کو خدا کی قسم اگر اس کا کچھ خیال بھی آتا ہو' خدا کرے بیکانیر کی مصری کا کوئی ٹکڑا تم کو میسر نہ آیا ہو' کبھی یہ تصور کرتا ہوں کہ میرجان صاحب اس مصری کے ٹکڑے چبا رہے ہوں گے تو یہاں میں رشک سے اپنا کلیجا چابنے لگتا ہوں۔" (بنام نواب علاء الدین خاں علائی)

میراحمد حسین میکش سے خرموں کی فرمائش کیسے دلچسپ اور پرلطف انداز میں کرتے ہیں :

"بھائی میکش آفریں! ہزار آفریں! تاریخ نے مزا دیا' خدا جانے وہ خرمے کس مزے کے ہوں گے' جن کی تاریخ ایسی ہے' دیکھو صاحب :

قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید

تاریخ دیکھی' اس کی تعریف کے خرمے کھائیں گے' اس کی تعریف کریں گے' کہیں یہ تمہارے خیال میں نہ آوے کہ یہ حسن طلب ہے کہ ناحق تم دین محمد غریب کو دوبارہ تکلیف دو' ابھی رقعہ لے کر آیا ہے' ابھی خرمے لے کر آوے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ اگر بہ فرض محال تم یوں ہی عمل میں لاؤ گے اور میاں دین محمد صاحب کے ہاتھ خرمے بھجواؤ گے' تم ہم بھی کہیں گے' تازہ شے بہتر بارہ سے بہتر۔"

غالب کی ظرافت زندگی سے مفاہمت کے جذبے کے تحت پیدا ہوئی ہے۔ وہ اپنی تمناؤں اور امیدوں کی ناکامی پر قہقہے لگانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ وہ نہ صرف اپنی کمزوریوں اور صعوبتوں کا بے باکانہ اظہار کرتے ہیں

بلکہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان پر ہنستے ہیں اور ہمیں ہنسنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ شاعری میں "عرش سے پرے ایک مکان" کا متمنی خطوں میں ایک عام انسان نظر آتا ہے۔ ایک ایسا انسان جس کے پیر زمین پر مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں اور جو مصائب و آلام کی تاریکیوں میں زندہ دلی اور شگفتگی کی پھلجھڑیاں چھوڑتا دکھائی دیتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب میں غالب کا سب کچھ لٹ گیا۔ وہ اس بھری دنیا میں تنہا رہ گئے۔ اس تباہی اور بربادی نے ان کے پورے وجود کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اپنی زندہ دلی اور شوخی طبع کو ہتھیار بنا کر وہ ان حالات کا مقابلہ کرتے ہیں۔ مجروح کے نام ایک خط میں اپنی بربادی اور زبوں حالی کا ذکر کرتے کرتے اچانک رگ ظرافت پھڑک اٹھی ہے اور وہ ایسی بات لکھتے ہیں کہ جس سے مکتوب الیہ کے ذہن کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ مجروح کو لکھتے ہیں :

"خلاصہ میری فکر کا یہ ہے کہ بچھڑے ہوئے یار کہیں قیامت ہی کو جمع ہوں' سو وہاں کیا خاک جمع ہوں گے؟ سنی الگ' شیعہ الگ' نیک جدا' بد جدا۔" (بنام میر مہدی مجروح)

"یہ میرا حال سنو کہ بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آگیا ہے۔ اس طرف سے خاطر جمع رکھنا' رمضان کا مہینا روزہ کھا کھا کر کاٹا۔ آئندہ خدا رزاق ہے' کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔ بس صاحب' جب ایک چیز کھانے کو ہوئی' اگرچہ غم ہی ہو' تو پھر کیا غم ہے؟"

(بنام میر مہدی مجروح)

غالب اپنی کمزوریوں کا' اپنی بدحالی کا بے باکانہ اظہار ہی نہیں کرتے' بلکہ ان کا مذاق بھی اڑاتے ہیں اور ہمیں بھی ہنساتے ہیں۔ ایک صاحب ہیں پیر جی' غالب ان سے ہنسی مذاق کرتے رہتے ہیں۔ ایک دن ان سے جو گفتگو ہوئی' اسے غالب نے علائی کے نام ایک خط میں اس طرح لکھا ہے :

"پیر جی سے جب پوچھتا ہوں کہ تم خوب شخص ہو اور وہ کہتے ہیں' کیا کہنا ہے! اور میں پوچھتا ہوں' کس کا؟ تو وہ فرماتے ہیں' مرزا شمشاد علی بیگ کا۔ ہیں اور کس کا نام تم کیوں نہیں لیتے؟ دیکھو یوسف علی خاں بیٹھے ہیں' ہیرا سنگھ موجود ہے۔ واہ صاحب میں کیا خوشامدی ہوں۔ جو منہ دیکھی کہوں؟ میرا شیوہ حفظ الغیب ہے' غائب کی تعریف کرنی کیا عیب ہے؟ ہاں صاحب' آپ ایسے ہی وضع دار ہیں' اس میں کیا ریب ہے؟"

(بنام علاء الدین خاں علائی)

غالب کبھی کبھی پرلطف قصوں اور لطیفوں سے بھی اپنے خطوط کو دلچسپ بناتے ہیں۔ وہ عام طور پر فحش لطیفے اور قصے نہیں لکھتے۔ ہاں دو تین بار "قاطع برہان" اور قتیل کے سلسلے میں ان کے قلم سے کچھ غیر مہذب الفاظ نکل گئے ہیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔

غالب نے مجروح اور میرن صاحب کے تعلقات کے بارے میں ایسے مزاحیہ انداز میں گفتگو کی ہے کہ کہیں کہیں اس میں ذم کا پہلو بھی پیدا ہو گیا ہے لیکن غالب کا اس قسم کے مذاق کا رشتہ اپنے شاگردوں میں صرف

میر مہدی مجروح سے ہے۔ غالب کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجروح بھی میرن صاحب کا ذکر مزے لے لے کر کرتے تھے۔ ایک دفعہ میرن صاحب کے چہرے پر مہاسا نکل آیا۔ مجروح نے غالب کے نام خط میں اس مہاسے کے بارے میں انشا پردازی کی ہوگی۔ غالب جواباً لکھتے ہیں :

"ایک غریب سید مظلوم کے چہرہ نورانی پر مہاسا نکلا ہے' تم کو سرمایہ آرائش گفتار بہم پہنچا ہے۔" (بنام میر مہدی مجروح)

مجروح نے میرن صاحب کے بارے میں غالب کو کچھ لکھا' غالب کا موڈ ٹھیک نہیں تھا' ناراض ہو کر لکھتے ہیں :

"میرن صاحب کی تمہاری چوما چاٹی کے لکھنے کا مجھ میں دم نہیں۔ تم جانو وہ جانیں۔"
(بنام میر مہدی مجروح)

دہلی میں میرن صاحب کی سسرال تھی۔ ان کی بیوی دلی میں آئی ہوئی تھیں۔ غالب میرن صاحب کی بیوی کے بارے میں لکھتے ہیں :

"اجی وہ یوسف ہند نہ سہی' یوسف دہر سہی' یوسف عصر سہی' یوسف کشور سہی' ان کی زلیخا نے ستم برپا کر رکھا ہے۔" (بنام میر مہدی مجروح)

ایک دفعہ غالب نے لکھا :

"میر مہدی نہیں کہ میرن پر مرتا ہوں۔" (بنام میر مہدی مجروح)

ایک دفعہ میرن صاحب کی آنکھیں دکھنے پر آگئیں۔ مجروح نے غالب کو اس کی اطلاع دی۔ غالب کے ہاتھ دل لگی کا ایک موقع آ گیا' لکھتے ہیں :

"میاں کیوں ناسپاسی و ناحق شناسی کرتے ہو۔ چشم بیمار ایسی چیز ہے کہ جس کی کوئی شکایت کرے' تمہارا منہ چشم بیمار کے لائق کہاں؟ چشم بیمار میرن صاحب کی آنکھ کو کہتے ہیں' جس کو اچھے اچھے عارف دیکھتے رہتے ہیں۔ تم گنوار' چشم بیمار کو کیا جانو۔" (بنام میر مہدی مجروح)

غالب نے ایک دفعہ میرن صاحب کو خط لکھا' انہوں نے جواب دیا' غالب نے مجروح کے نام خط میں جواب کا تقاضا کیا۔ غالباً مجروح یہ بات میرن صاحب سے کہنا بھول گئے۔ غالب نے مجروح کے نام لکھا اور اس بھول جانے کی شکایت اس چھیڑ چھاڑ کے ساتھ کی :

"حسن بھی کیا چیز ہے' نادر کا اتنا خوف نہیں' جتنا حسین آدمی کا ڈر ہوتا ہے۔ تم ان سے خواہش وصال کرتے ہوئے ڈرو' میرے خط کے جواب کے باب میں کیوں نہیں کہتے۔"
(بنام میر مہدی مجروح)

صرف ایک بار غالب نے اپنے خط میں مجروح کو میرن صاحب کے بارے میں ایک غیر شائستہ بات لکھی :

"بھائی! تم نے بخار کو کیوں آنے دیا۔ تپ کو کیوں چڑھنے دیا؟ کیا بخار میرن صاحب کی

صورت میں آیا تھا جو تم مانع نہ آئے؟ کیا تپ ابن بن کر آئی تھی' جو اس کو روکتے ہوئے شرمائے۔" (بنام میر مہدی مجروح)

غالب انسانی رشتوں کا بہت احترام کرتے تھے۔ انہیں ہمیشہ یہ خیال رہتا تھا کہ ان سے کوئی ایسی بات نہ ہو' جس سے کسی کی دل آزاری ہو۔ اس طرح اگر کوئی ایسی بات کرتا جس سے غالب کو ذہنی تکلیف ہوتی تو وہ طنز و ظرافت کے پردے میں اپنی ناراضگی یا ناپسندیدگی کا اظہار کر دیتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ غالب غصے میں کسی پر برس پڑے ہیں لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے۔ مرزا ہرگوپال تفتہ نے "بروے استادان رنگ" کی مثال میں کسی استاد کا مصرع لکھ دیا : غالب کو یہ بات ناگوار گزری اور انہوں نے اپنے طنز کے تیر کا نشانہ تفتہ کو اس طرح بنایا :

"سچ ہے اگر آپ استاد کا مصرع نہ لکھتے تو میں "بروے استادان رنگ" کو کہاں سے سمجھتا۔" (بنام مرزا ہرگوپال تفتہ)

نواب انورالدولہ شفق کو کسی نے غالب کی وفات کی غلط خبر دے دی۔ شفق نے بہت دن سے غالب کو خط نہیں لکھا تھا۔ جب یہ خبر غلط ثابت ہو گئی تو غالب کو خط لکھا اور اس میں اس افواہ کا ذکر کر دیا۔ اس واقعے پر غالب کا حسن اظہار ملاحظہ کیجئے :

"آپ کی پرسش کے کیوں نہ قربان جاؤں کہ جب تک میرا مرنا نہ سنا' میری خبر نہ لی۔"
(بنام نواب انورالدولہ شفق)

علیگڑھ کے صدر امین شیخ مومن علی دہلی آئے ہوئے تھے اور غالب سے ملے بغیر واپس چلے گئے۔ غالب کی انا کو اس سے ٹھیس پہنچی۔ منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں :

"اگر آپ سے (شیخ مومن علی کی) ملاقات ہو تو فرمایئے گا کہ اسد اللہ روسیاہ بعد سلام عرض کرتا ہے کہ وہ رتبہ تو میرا کہاں کہ میں آپ سے شکوہ کروں کہ مجھ سے مل کر آپ نہ گئے' مگر ہاں افسوس کرتا ہوں کہ مجھ کو خبر کیوں نہ ہوئی ورنہ تو ویچ کو پہنچتا۔"

(بنام نبی بخش حقیر)

ماتم یک شہر آرزو

ہندوستان کے ہزاروں سال پرانے جاگیرداری نظام میں ایسا بارہا ہوا کہ حکومتیں بدلی ہیں۔ کسی ایک فرد نے اپنی ذہانت' شجاعت اور جوڑ توڑ سے اقتدار حاصل کرنا شروع کیا' اور کچھ ہی عرصے میں حکومت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ آ گئی۔ کچھ عرصے تک حکومت اس کے خاندان میں رہی اور جب حکومت خاندان کے ان لوگوں کے ہاتھ میں آئی جنہوں نے اقتدار اپنے قوت بازو کے بل پر حاصل نہیں کیا تھا بلکہ جنہیں یہ ورثے میں ملا تھا تو وہ دولت اور طاقت کے نشے کو زیادہ دن برداشت نہ کر سکے اور رفتہ رفتہ حکومت کسی اور خاندان میں

منتقل ہو گئی۔ پھر کچھ عرصے بعد اس خاندان کا بھی یہی حشر ہوا۔ غرض صدیوں تک یہ کہانی اس طرح دہرائی جاتی رہی۔ اس کہانی کے کرداروں میں ہندوستانی نژاد بھی تھے اور وہ حملہ آور بھی جو بعد میں بڑی طاقت بن کر ہندوستان آئے تھے۔ حکومتوں کی اس تبدیلی کا اثر عام ہندوستانیوں پر بہت کم ہوتا تھا۔ صرف حملوں کے وقت ایک سیلاب خون آتا اور گزر جاتا۔ اور پھر سب کچھ اسی طرح معمول پر آ جاتا۔ حکومتوں کی تبدیلیوں کا اثر ہندوستان کے تمدن اور معاشرت پر خاطر خواہ اس وقت پڑتا جب فاتح قوم مستقل طور پر ہندوستان ہی میں سکونت اختیار کر لیتی۔ اس طرح کے حکمرانوں کے ساتھ جو علم اور جو فکر اور فلسفہ ہندوستان میں آیا ہے' وہ ہندوستانی فکر میں کچھ اضافے اور تبدیلیاں تو ضرور کرتا رہا لیکن وہ بنیادی خصوصیت جسے ہم ہندوستانیت کہہ سکتے ہیں' بہ ہر حال برقرار رہی --- انگریز ابتدا میں ہندوستان میں صرف تجارت کی غرض سے آئے تھے۔ ہندوستان پر حکومت کرنے کا خیال قدرے بعد میں آیا۔ انگریز اپنے ساتھ صنعتی نظام کی برکتیں لے کر آئے تھے اس لیے انہوں نے غیر محسوس طریقے پر معاشرت' تہذیب' افکار و نظریات کی سطح پر ہندوستانی زندگی کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔ انگریزوں کے ساتھ وہ جدید علوم بھی تھے جو نشاۃ ثانیہ میں مغرب نے حاصل کیے تھے' انہیں علوم پر ترقی یافتہ صنعتی نظام کی بنیاد تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے ساتھ ساتھ مغربی فکر کے اثرات بھی ہندوستانی ذہن پر بڑھتے گئے۔

غالب نے جب ہوش سنبھالا تو مشرق اور مغرب' فکر یعنی نئی اور پرانی اقدار میں کشمکش اور تصادم شروع ہو چکا تھا۔ کلکتہ میں ایسے تعلیمی ادارے قائم ہو چکے تھے' جہاں مغربی علوم کے ذریعے مشرقی نظام فکر کی بنیادیں ہلائی جا رہی تھیں اور جدید ایجادات کا مظاہرہ کر کے ہندوستانی ذہن کو حیرت اور احساس کمتری میں مبتلا کیا جا رہا تھا۔ سرسید کی مرتبہ "آئین اکبری" پر غالب کی تقریظ مغرب سے متاثر ہونے والے اس ذہن کی نشان دہی کرتی ہے۔

غالب کے دیکھتے ہی دیکھتے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک زبردست اور طاقت ور برطانوی حکومت کی شکل اختیار کر لی۔ اس نئی حکومت کے سامنے ہندوستانی فکر نے ہتھیار ڈال دیے۔ ہندوستان کا آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر محض نام کا بادشاہ رہ گیا تھا جو دراصل انگریزوں کا پنشن خوار تھا۔ اہل علم طبقہ زندگی کے مثبت فلسفوں اور تصورات کی تازگی اور توانائی سے محروم ہو چکا تھا۔ سماج پر ایک مکمل تعطل اور جمود کا عالم تھا۔ برطانوی سامراج کے بڑھتے ہوئے اقتدار نے ہندوستان کے باشعور طبقے کو یقین دلا دیا تھا کہ وہ وقت دور نہیں جب برائے نام مغل حکومت کا چراغ بھی گل ہو جائے گا۔ غالب اپنے ایک شاگرد قاضی عبدالجمیل جنون کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

"مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا' قلعے میں شہزادگان تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزل خوانی کر لیتے ہیں۔ وہاں کے مصرع طرح کو کیا کہیے گا' اور اس پر غزل لکھ کر کہاں پڑھیے گا' میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے' اس کو

دوام کہاں؟ کیا معلوم ہے' کیا اب کے ہی نہ ہو' اب کے ہو تو آئندہ نہ ہو؟"

یہ گویا اس عہد کے ہر باشعور' حساس اور ذہین لیکن مجبور اور بے بس انسان کے دل کی آواز ہے' گویا صرف غالب کی نہیں بلکہ پورے سماج اور پورے عہد کی آواز ہے۔ غالب ایک طرف مغربی علوم' مغربی فکر اور سائنسی ایجادوں کا کھلے دل سے استقبال کرتے ہیں اور دوسری طرف ہندوستان میں برطانوی سامراج کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے خائف اور افسردہ بھی ہیں۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے اودھ پر قبضہ کیا تو غالب کو دلی صدمہ ہوا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :

"تباہی ریاست اودھ نے' باآنکہ بیگانہ محض ہوں' مجھ کو اور بھی افسردہ دل کر دیا بلکہ میں کہتا ہوں کہ سخت ناانصاف ہوں گے وہ اہل ہند جو افسردہ دل نہ ہوئے ہوں گے۔ اللہ ہی اللہ ہے۔" (بنام قدر بلگرامی)

غالب کی فارسی اور اردو ادب پر گہری نظر تھی۔ انہوں نے اپنے عہد کے مروجہ علوم مثلاً مذہب' اخلاقیات' تصوف' منطق' ہیئت' اور طب کا باقاعدہ نہ سہی لیکن تھوڑا بہت مطالعہ ضرور کیا تھا۔ اگر وہ تمام مشرقی علوم پر پوری قدرت حاصل کر لیتے' تب بھی نئے حالات کا صحیح اور مکمل تجزیہ کرنے میں کامیاب نہ ہوتے' کیوں کہ نئے صنعتی نظام اور اس کے سہارے بڑھتے ہوئے برطانوی سامراج کے اقتدار اور اس کے دور رس اثرات کو سمجھنے کے لیے یہ علوم کافی نہیں تھے۔ غالب مشرقی تہذیب کے مداح اور اس کے زوال کے ماتم گذار ہیں چونکہ تازہ ہوا کے لیے انہوں نے اپنے ذہنی دریچوں کو کھلا رکھا ہے اس لیے وہ مشرقی اقدار پر تنقید بھی کرتے ہیں اور نئے نظام کا استقبال بھی۔ غالب اس راز سے واقف تھے کہ مغل شہنشاہیت کی تلواریں زنگ آلود اور اس کے دست و بازو شل ہو چکے ہیں اور اب کوئی طاقت اس عظمت پارینہ کو واپس نہیں لا سکتی۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی آشنا تھے کہ زوال کی آخری حدود کو چھونے والی مغل حکومت یا چھوٹی چھوٹی خود مختار صوبائی حکومتیں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو روک نہیں سکتیں۔ غالب انحطاط پذیر طاقتوں سے مایوس ہو چکے تھے' اس لیے کبھی کبھی وہ اس نئے نظام سے اپنی امیدیں وابستہ کر لیتے اور اسی لیے ان کی وفاداری بھی منقسم تھی۔ وہ ایک طرف تو بادشاہ سے قربت حاصل کرنے کے لیے تمام ذرائع استعمال کرتے نظر آتے ہیں اور دوسری طرف قصیدے لکھ لکھ کر انگریز افسروں کو بھی خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب سے قبل غالب نے کوشش کی تھی کہ ملکہ معظمہ سے براہ راست رابطہ قائم کریں۔ انہوں نے ۹ نومبر ۱۸۵۵ء کو ایک قصیدہ لارڈ الن برا کو بھیجا تھا تاکہ ملکہ معظمہ کی خدمت میں پیش کیا جا سکے۔ قصیدے کے ساتھ غالب نے درخواست کی تھی کہ انہیں ملکہ کی طرف سے خطاب عطا ہو اور ان کے موجودہ خلعت اور پنشن میں اضافہ کیا جائے۔ ابھی خط و کتابت جاری تھی کہ ۱۸۵۷ء کا انقلاب رونما ہو گیا۔ جب تک ہندوستان کا پلہ بھاری رہا' غالب قطعے جاتے رہے اور جب ہندوستانیوں کی شکست ہو گئی تو غالب انگریزوں کے ساتھ ہو گئے۔

غالب نے "دستنبو" میں انقلابیوں کو بہت برا بھلا کہا ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ اس وقت ہر شخص اپنی جان اور آبرو بچانے کی فکر میں تھا۔ غالب نے بھی وہی کیا لیکن انقلاب کے بعد غالب تقریباً بارہ برس اور زندہ رہے اور ان بارہ برسوں میں انہوں نے اپنے دوستوں' عزیزوں اور شاگردوں کو بہت بڑی تعداد میں خطوط لکھے' لیکن کسی بھی خط میں مغل حکومت کے زوال پر اظہار افسوس نہیں کیا۔ مغل حکومت کے آخری تاجدار اور غالب کے مربی اور محسن بہادر شاہ ظفر کا انتقال ہوا تو غالب نے مجروح کو لکھا :

"۷ نومبر ۱۴ جمادی الاول سال حال جمعے کے دن ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ و قید جسم سے رہا ہوئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔" (بنام میر مہدی مجروح)

غالب کا یہ بیان کسی بھی جذبے اور احساس سے عاری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کو مغل حکومت کے خاتمے اور بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری کا کچھ زیادہ غم نہیں تھا۔ انہیں بہ قول ان کے غم یہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب میں "جان و مال و ناموس و مکان و آسمان و زمین و آثار ہستی سراسر لٹ گئے"۔ غالب کو دراصل دلی' اہل دلی اور خود اپنی تباہی کا غم تھا۔ ۱۸۵۷ء کا ناکام انقلاب قلزم خوں سے کم نہیں تھا اور غالب اس کے شناور رہے تھے۔ اب غالب کی زبانی اس قلزم خوں کی داستاں سنیے :

"میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرت غم سے سودائی ہو جاتے ہیں' عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجوم غم میں میری قوت متفکرہ میں فرق آگیا ہو تو کیا عجب ہے بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ غم کیا ہے' غم مرگ' غم فراق' غم رزق' غم عزت' غم مرگ۔ میں قلعہ نامبارک سے قطع نظر کرکے اہل شہر کو گنتا ہوں۔ مظفرالدولہ' میر ناصرالدین' مرزا عاشور بیگ میرا بھانجا' اس کا بیٹا احمد مرزا' انیس برس کا بچہ' مصطفیٰ خاں ابن اعظم الدولہ' اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں اور مرتضیٰ خاں' قاضی فیض اللہ کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا۔ اے لو بھول گیا' حکیم رضی الدین خاں' میر احمد حسین میکش' اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاؤں۔ غم فراق حسین مرزا' یوسف مرزا' میر مہدی' میر سرفراز حسین' میرن صاحب' خدا ان کو جیتا رکھے! کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے' وہاں خوش ہوتے۔ گھر ان کے بے چراغ' وہ خود آوارہ۔ سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں' کلیجا ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے مگر میں علی کو گواہ کرکے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔" (بنام یوسف مرزا)

عزیزوں' دوستوں اور شاگردوں کے قتل نے غالب کے دل و دماغ کو اتنا متاثر کیا تھا کہ وہ غیر معمولی قوت ارادی کے انسان نہ ہوتے تو پاگل ہو گئے ہوتے' انہیں اپنی بربادی کا غم تو تھا ہی لیکن دوستوں اور عزیزوں کے قتل اور تباہی نے بھی ان کے دل و دماغ کو متاثر کیا تھا۔ مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں غالب لکھتے

ہیں :

"یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو دکھ مجھ کو ہے' اس کا بیان تو معلوم مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریز کی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ اس میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز' کچھ دوست' کچھ شاگرد' کچھ معشوق' سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے! جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو' اس کو زیست کیوں کر نہ دشوار ہو' اتنے یار مرے کہ جو اب میں مروں گا' تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔" (بنام ہرگوپال تفتہ)

انگریز فاتح دلی کی عظیم الشان عمارتیں ڈھا رہے تھے۔ یہ کدال پھاوڑے عمارتوں پر نہیں' غالب کے دل و دماغ پر چل رہے تھے۔ ان عمارتوں کے ڈھائے جانے پر غالب تڑپ رہے تھے۔ لیکن محض تماشائی بنے رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ جامع مسجد سے راج گھاٹ تک کی حالت غالب کی زبانی سنیے :

"پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع ہوتا ہوا راج گھاٹ دروازے کو چلا' مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں' وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو کا مکاں ہو جائے۔ یاد کرو' مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہوگیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں' باقی سب اٹ گیا۔ کشمیر دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو' اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ' دھوبی واڑہ' رام جی گنج' سعادت خاں کا کٹرہ' جرنیل کی بی بی کی حویلی' رام جی داس کا پتا نہیں ملتا۔ قصہ مختصر' شہر صحرا ہو گیا تھا۔ اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ' دلی نہ رہی اور دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔" (بنام میر مہدی مجروح)

"جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا۔ دکانیں' حویلیاں' ڈھائی جائیں گی۔ "دارالبقا" فنا ہو جائے گی' رہے نام اللہ کا۔ خان چند کا کوچہ' شاہ بولا کے بڑ تک ڈھے گا۔ دونوں طرف سے پھاوڑا چل رہا ہے۔ باقی خیر و عافیت ہے۔" (بنام میر مہدی مجروح)

اگرچہ اس خط میں غالب نے محض واقعات بیان کیے ہیں لیکن "رہے نام اللہ کا!" اور "باقی خیر و عافیت

ہے۔" لکھ کر غالب نے اپنے ذہنی کرب کا بھی اظہار کر دیا ہے۔ ایک اور خط میں غالب نے دلی کی ادبی اور تہذیبی زندگی کی بربادی کا ذکر ایسے الفاظ میں کیا ہے کہ وہ خط نثری مرثیہ بن گیا ہے۔ مختصر سے خط میں غالب نے اپنا کلیجا نکال کر رکھ دیا ہے۔ لکھتے ہیں :

"او میاں سید زادہ آزادہ' دلی کے عاشق دل داوہ' ڈھئے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے' حسد سے لکھنؤ کو برا کہنے والے' نہ دل میں مہرو آزرم نہ آنکھ میں حیا و شرم' نظام الدین ممنون کہاں' ذوق کہاں' مومن خاں کہاں' ایک آزردہ سو خاموش' دوسرا غالب۔ وہ بے خود و مدہوش' نہ سخن وری رہی نہ سخن دانی' کس برتے پر تتا پانی؟ ہائے دلی! وائے دلی! بھاڑ میں جائے دلی!" (بنام میر مہدی مجروح)

عمر بھر کا تو نے پیمان وفا باندھا تو کیا؟

غالب کو نظم اور نثر دونوں میں اپنے اظہار پر یوں تو پوری قدرت حاصل تھی لیکن اگر کبھی کسی کی وفات پر تعزیتی خط لکھنا ہو تو انہیں خاصی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ غالب موت کے ذکر سے بہت گھبراتے تھے۔ اور شاید اسی لیے تعزیت کے لیے انہیں مناسب الفاظ نہیں مل پاتے۔ اکثر غالب بہت سرسری انداز میں تعزیت کرتے ہیں' اگر کسی دوست یا شاگرد کو کسی کی موت کی خبر دیتے ہیں تو کم سے کم الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ پس ماندگان کو تعزیتی خط لکھتے ہیں تو صبر و تحمل کی تلقین کرکے پیچھا چھڑا لیتے ہیں' اس طرح کے خطوں میں ایک آدھ بات ایسی ضرور لکھ دیتے ہیں جس سے متعلقین کے دل کا بوجھ ہلکا ہو سکے۔ غالب کبھی کبھی ایسے خط میں بھی مزاح سے کام لیتے ہوئے نظر آتے ہیں جو انہوں نے یا تو تعزیت کے طور پر لکھا ہے یا جس میں کسی کی موت کی کسی کو اطلاع دی ہے۔ ایسے تعزیتی خط چند ہی ہیں جو غالب نے دل جمعی کے ساتھ لکھے ہیں۔

غالب نے خاصی طویل عمر پائی تھی اس لیے ان کے بیشتر دوست اور عزیز ان کی زندگی ہی میں وفات پا گئے۔ پھر ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب میں ان کے بہت سے دوست' آشنا اور رشتہ دار قتل ہوئے یا پھانسی کے تختے پر لٹکا دیے گئے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ غالب موت کے ذکر سے گھبرانے لگے تھے۔ ہاں اپنی موت کی خواہش کا اظہار بار بار کیا ہے' بلکہ مزے لے لے کر کیا ہے۔ ایک خط میں اس خواہش کا اظہار خاصے دلچسپ انداز میں اس طرح کرتے ہیں :

"زندگی میری کب تک؟ سات مہینے یہ اور بارہ مہینے سال آئندہ کے' اسی مہینے میں اپنے آقا کے پاس جا پہنچتا ہوں۔ وہاں نہ روٹی کی فکر نہ پانی کی پیاس' نہ جاڑے کی شدت' نہ گرمی کی حدت' نہ حاکم کا خوف نہ مخبر کا خطر۔ نہ مکان کا کرایہ دینا پڑے اور نہ کپڑا خریدنا پڑے۔ نہ گوشت' گھی منگاؤں نہ روٹی پکواؤں۔ عالم نور اور سراسر سرور :

یار ایں آرزوئے من چہ خوش است
تو بدیں آرزو مرا برساں"

انسانی نفسیات کچھ اس طرح کی ہے کہ فن کار تو اپنی موت کا ذکر تو بڑی انشا پردازی کے ساتھ کرتا ہے لیکن جب دوسروں کو فی الحقیقت مرتا ہوا دیکھتا ہے تو خاصا خائف نظر آتا ہے۔ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں :

"کثیر الاحباب شخص ہوں۔ سیکڑوں بلکہ ہزاروں دوست اس باسٹھ برس میں مرگئے' خصوصاً اس فتنہ و آشوب میں تو شاید کوئی میرا جاننے والا نہ بچا ہوگا۔ اس راہ سے مجھ کو' جو دوست اب باقی ہیں' بہت عزیز ہیں۔ واللہ دعا مانگتا ہوں کہ اب ان احیا میں سے کوئی میرے سامنے نہ مرے۔ کیا معنی کہ جو میں مروں تو کوئی میرا یاد کرنے والا اور مجھ پر رونے والا بھی تو دنیا میں ہو۔" (بنام حکیم غلام نجف خاں)

اسی لیے غالب تعزیت نامہ لکھنے سے کتراتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنے جذبات کی صحیح عکاسی نواب کلب علی خاں کے نام ایک خط میں کی ہے۔ لکھتے ہیں :

"چاہتا ہوں کہ کچھ لکھوں' مگر نہیں جانتا کہ کیا لکھوں۔ لازم تھا کہ تعزیت نامہ بہ زبان فارسی و عبارت بلیغ لکھوں۔ آپ کے قدموں کی قسم دل نے قبول نہ کیا۔ آرائشِ گفتار' نظماً" و نثراً" واسطے تہنیت کے ہے کہ دل کثرت نشاط سے گل کی طرح کھل رہا ہے۔ طبیعت راہ دیتی ہے۔ الفاظ ڈھونڈے جاتے ہیں۔ معنی پیدا کیے جاتے ہیں۔ اب نیم مردہ' دل پژمردہ' خاطر افسردہ' جس باب میں لفظ و معنی فراہم کیا چاہوں' وہ سراسر طبع کے خلاف ہیں۔ جس بات کا تصور ناگوار ہو' اس کے تذکرے سے جی کیوں نہ بے قرار ہو۔"

(بنام نواب کلب علی خاں)

یہ حقیقت ہے کہ غالب کو دوسروں کی موت کا ذکر بہت ناگوار گزرتا تھا اسی لیے وہ عام طور سے تعزیتی کلمات مختصر لکھتے ہیں۔ یہ مختصر کلمات کبھی کبھی محض رسمی الفاظ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر مرزا قربان علی بیگ خاں سالک کے چچا کا انتقال ہوتا ہے تو غالب ان الفاظ میں تعزیت کرتے ہیں :

"میری جان! کن اوہام میں گرفتار رہے۔ جہاں باپ کو پیٹ چکا' اب چچا کو بھی رو۔ تجھ کو خدا جیتا رکھے اور تیرے خیالات و احتمالات کو صورت وقوعی دے۔"

مرزا ہرگوپال تفتہ' غالب کے عزیز ترین شاگرد تھے لیکن جب تفتہ کی بیوی کا انتقال ہوا تو غالب نے سرسری انداز میں اس طرح تعزیت کی :

"تمہارا خط پہنچا' مجھ کو بہت رنج ہوا۔ واقعی ان چھوٹے لڑکوں کا پالنا بہت دشوار ہوگا۔ دیکھو میں بھی اسی آفت میں گرفتار ہوں۔ صبر کرو اور صبر نہ کرو گے تو کیا کرو گے۔ کچھ بن نہیں آتی۔ میں مسہل میں ہوں۔ یہ سمجھنا کہ بیمار ہوں۔"

اسی طرح نجف خاں کی نواسی کے انتقال پر غالب لکھتے ہیں :

"حق تعالیٰ اس کی ماں کو صبر دے اور زندہ رکھے۔ میں یوں سمجھتا ہوں کہ یہ چھوکری قسمت والی اور حرمت والی تھی۔" (بنام حکیم نجف خاں)

میاں داد خاں سیاح کے ہاں لڑکا پیدا ہوتے ہی مرگیا۔ اس خبر سے بظاہر خود غالب کے زخم ہرے ہو گئے۔ غالب کے ہاں سات بچے پیدا ہوئے لیکن پندرہ مہینے سے زیادہ کوئی نہ جیا۔ غالب لکھتے ہیں :

"تمہارے ہاں لڑکے کا پیدا ہونا اور اس کا مرجانا معلوم ہو کر مجھ کو بڑا غم ہوا۔ اس داغ کی حقیقت مجھ سے پوچھو کہ اکتر برس کی عمر تک سات بچے پیدا ہوئے۔ لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہیں ہوئی۔ تم ابھی جوان ہو' حق تعالیٰ تمہیں صبر اور نعم البدل دے۔" (بنام میاں داد خاں سیاح)

تاہم غالب کے ہاں اس قسم کے خطوں کی بعض ایسی مثالیں بھی ہیں' جن میں غالب نے بہت مختصر لفظوں میں تعزیت کی ہے۔ یا کسی کی موت کی اطلاع دی ہے لیکن اپنے مخصوص اسلوب سے اظہار کو غیر معمولی حد تک موثر بنا دیا ہے۔ منشی نبی بخش حقیر کی بہو بیمار پڑیں تو غالب کو خاصی تشویش ہوئی۔ کئی خطوں میں ان کی صحت کے بارے میں دریافت کیا۔ ایک دن خبر ملی کہ وہ اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ یہ خاتون غالب کے عزیز ترین دوست منشی نبی بخش حقیر کے صاحبزادے منشی عبداللطیف کی بیوی تھیں۔ حقیر کے رشتے سے غالب کو منشی عبداللطیف اور ان کی بیوی دونوں کا بہت خیال رہتا تھا۔ ان خاتون کی بیماری کے دوران غالب' حقیر سے ان کی خیریت معلوم کرتے رہتے تھے۔ ایک دن جب ان کی وفات کی خبر سنی تو غالب کو دلی صدمہ ہوا۔ چنانچہ انتہائی مختصر مگر رقت آمیز انداز میں اس طرح تعزیت کرتے ہیں :

"ہائے ہائے وہ نیک بخت نہ بچی۔ واقعی یہ کہ تم پر اور اس کی ساس پر کیا گزری ہوگی۔ لڑکی تو جانتی ہی نہ ہوگی کہ مجھ پر کیا گزری۔ لڑکا شاید یاد کرے گا اور پوچھے گا کہ اماں کہاں ہیں۔ یہ اس کا پوچھنا اور تم کو رلائے گا۔ بہ ہر حال چارہ جز صبر نہیں ہے۔ غم کرو' ماتم رکھو' رؤد پیٹو' آخر خون جگر کھا کے چپ رہنا پڑے گا۔ حق تعالیٰ عبداللطیف کو اور تم کو اور تیموں کی دادی اور پھپھیوں کو سلامت رکھے اور تمہارے دامن عطوفت و آغوش رافت میں ان کو پالے۔" (بنام منشی نبی بخش حقیر)

غالب کے ایک دوست میر تفضل حسین خاں کا انتقال ہو گیا۔ غالب کو بہت صدمہ ہوا۔ ایک خط میں ان کی وفات کا ذکر صرف ایک جملے اور ایک شعر کے ساتھ کیا ہے لیکن بے حد موثر انداز میں :

ہائے ہائے میر تفضل حسین خاں ہائے ہائے :

رفتی و مرا خبر نہ کردی
بر بیکسی ام نظر نہ کردی

(بنام مرزا ہرگوپال تفتہ)

مرزا ہرگوپال تفتہ کے جواں عمر اور لاڈلے بیٹے پتمبر سنگھ کی موت کی خبر غالب منشی نبی بخش حقیر کو اس طرح دیتے ہیں :

"یہ تو سب کچھ ہے' مگر تم کو تفتہ کی بھی کچھ خبر ہے' پتمبر سنگھ' اس کا لاڈلا بیٹا مرگیا۔ ہائے اس غریب کے دل پر کیا گزری ہوگی :

چہ کند بندہ کہ گردن نہ نہد فرماں را
چہ کند گوی کہ تن در ندہد چوگاں را

(بنام منشی نبی بخش حقیر)

تعزیت ناموں میں عام طور پر جن رسمی الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے' غالب نے ان الفاظ سے حتی الامکان گریز کرکے کے نیا انداز اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ نواب امین الدین احمد خاں کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ نواب صاحب' غالب کے رشتے دار بھی تھے اور دوست بھی - سرسری تعزیت نامے سے بات نہیں بن سکتی تھی۔ اس لیے غالب ایک انوکھا انداز اختیار کرتے ہیں اور انتہائی جدت سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں :

"بھائی صاحب! آج تک سوچتا رہا کہ بیگم صاحبہ قبلہ کے انتقال کے باب میں تم کو کیا لکھوں' تعزیت کے واسطے تین باتیں ہیں : اظہار غم' تلقین صبر' دعاے مغفرت۔ سو بھائی' اظہار غم تکلف محض ہے۔ جو غم تم کو ہوا ہے' ممکن نہیں کہ دوسرے کو ہوا ہو۔ تلقین صبر' بے دردی ہے۔ یہ سانحہ عظیم ایسا ہے' جس نے غم رحلت نواب مغفور کو تازہ کیا۔ پس' ایسے موقع پر صبر کی تلقین کیا کی جائے' رہی دعائے مغفرت' میں کیا اور میری دعا کیا؟ مگر چوں کہ وہ میری مربیہ اور محسنہ تھیں' دل سے دعا نکلتی ہے۔"

(بنام نواب امین الدین احمد خاں)

یوسف مرزا کے نام غالب کے کل بارہ خطوط ملتے ہیں۔ ان چند خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کو یوسف مرزا سے بہت محبت تھی۔ پہلے ان کے بیٹے کی وفات ہوئی اور کچھ عرصے بعد والد کا انتقال ہوگیا۔ غالب کو دوسرے حادثے کا دلی صدمہ ہوا۔ انہوں نے اس موقع پر یوسف مرزا کو جو تعزیت نامہ لکھا ہے' اس سے بہتر تعزیت نامہ ابھی تک اردو میں نہیں چھپا۔ اس تعزیت نامے میں اظہار ہمدردی بھی ہے اور صبر و تحمل کی تلقین بھی اور فکر و اسلوب کی جدت بھی۔ لکھتے ہیں :

"یوسف مرزا! کیوں کر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مرگیا۔ اور اگر لکھوں تو پھر آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو مگر صبر؟ یہ ایک شیوہ فرسودہ ابنائے روزگار کا ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے! ایک کا کلیجا کٹ گیا ہے' اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیوں کر نہ تڑپے گا؟ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی' دعا کو

دخل نہیں' دوا کا لگاؤ نہیں' پہلے بیٹا مرا' پھر باپ مرا' مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سرو پا
کس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا' یوسف مرزا کو۔" (بنام یوسف مرزا)

نواب یوسف علی خاں ناظم کی والدہ فتح النسا بیگم کا انتقال ہوا تو غالب کے لیے ضروری تھا کہ رسمی تعزیت نامہ لکھیں۔ مگر یہ ان کے بس کی بات کہاں تھی۔ دیکھیے کیسے مختصر لفظوں میں اپنا کام نکالتے ہیں :

"کل اس (مرزا داغ) نے از روے خط آمد رام پور' حضرت جناب عالیہ کے انتقال کی خبر سنائی۔ کیا کہوں' کیا غم و اندوہ کا ہجوم ہوا۔ حضرت کے غمگین ہونے کا تصور کر کر اور زیادہ مغموم ہوا۔ بیدرد نہیں ہوں کہ ایسے مقام میں بہ طریق انشا پردازی عبارت آرائی کروں۔ نادان نہیں ہوں کہ آپ جیسے دانا دل دیدہ ور کو تلقین صبرو شکیبائی کروں :

از دست گدائے بے نوا ناید ہیچ
جز آں کہ بہ صدق دل دعائے بکند

(بنام یوسف علی خاں ناظم)

اس خط میں غالب نے تعزیت نامے کے تمام رسمی الفاظ سے گریز کیا ہے۔ پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی توفیق عطا فرمانے کی دعا مانگی' نہ مرحومہ کے اوصاف جمیلہ بیان کیے اور نہ ان کے غریق رحمت ہونے کا تذکرہ کیا۔ یہ غالب کا خاص انداز تھا کہ جب رسمی تعزیت نامہ قدرے طویل ہوتا تو اس میں باتیں ایسی ہوتیں' جو تعزیت نامے کا حصہ بن جانے کے باوجود براہ راست تعزیت سے تعلق نہ رکھتیں۔ نواب یوسف علی خاں ناظم کے نام خط میں ان کی والدہ کی وفات کے بارے میں چند الفاظ ہیں' باقی باتیں ادھر ادھر کی ہیں۔

شاید ہی دنیا میں ایسے خطوط لکھے گئے ہوں جو تعزیت نامے ہوں یا جن میں کسی کی موت کی اطلاع دی گئی ہو اور ان میں طنز و مزاح سے کام لیا گیا ہو۔ غالب جب اس طرح کے خطوط لکھتے ہیں تو کبھی کبھی ان کی شوخی اور بذلہ سنجی برقرار رہتی ہے۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ "غم آگیں مضامین" سے ان کے خطوط زیادہ بوجھل نہ ہو جائیں۔ علی بخش خاں' غالب کے سسرالی رشتے دار اور عزیز دوست تھے' ممکن نہیں کہ غالب کو ان کی وفات کا صدمہ نہ ہوا ہو۔ علائی کے نام خط میں ان کی وفات کا ذکر ایک فقرے میں کرتے ہیں اور پھر اس صدمے کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے مرحوم کا ایک ایسا دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہیں' جسے پڑھ کر مکتوب الیہ ہنسے بغیر نہ رہ سکے۔ لکھتے ہیں :

"علی بخش خاں مرحوم مجھ سے چار برس چھوٹا تھا۔ میں ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوا ہوں۔ اب کے رجب کے مہینے سے انہتّرواں برس شروع ہوا ہے۔ اس نے چھیاسٹھ برس کی عمر پائی۔ نئی تقریر و تحریر کا آدمی تھا۔ اکبر آباد میں میور صاحب سے ملے۔ اثنائے مکالمت میں کہنے لگے کہ میں چچا جان کے ساتھ جنرل لارڈ لیک صاحب کے لشکر میں موجود تھا اور ہو کر سے جو محاربات ہوئے ہیں' اس میں شامل رہا ہوں۔ بے ادبی ہوتی ہے ورنہ اگر قبا و پیرہن اتار

کر دکھلاؤں تو سارا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہے' جا بہ جا تلوار اور برچھی کے زخم ہیں۔ وہ ایک بیدار مغز اور دیدہ ور آدمی' ان کو دیکھ دیکھ کر کہنے لگا کہ نواب صاحب' ہم ایسا جانتے ہیں کہ تم جرنیل صاحب کے وقت میں چار یا پانچ برس کے ہوگے۔ یہ سن کر آپ نے کہا کہ درست' بجا ارشاد ہوتا ہے کہ خدا ایش بیا مرزاد و بدین دروغ ہائے بے نمک گیراد۔"

(بنام نواب علاء الدین خاں علائی)

مرزا حاتم علی مہر کی محبوبہ کا انتقال ہوگیا۔ غالب نے تعزیت نامہ ایسے دلچسپ انداز میں لکھا کہ اس میں غم و اندوہ کا اظہار بھی ہوگیا اور کچھ چھیڑ چھاڑ بھی۔ مقصد غالب کا یہ کہ مہر کا غم کچھ ہلکا ہو اور ان میں صبر و ضبط کا حوصلہ پیدا ہو۔ غالب لکھتے ہیں :

"ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے' پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی' ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی ہے کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں' ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو' کھاؤ' مزے اڑاؤ' مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو' شہد کی مکھی نہ بنو' سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک فشانی؟ کہاں کی مرثیہ خوانی؟ آزادی کا شکر بجا لاؤ' غم نہ کھاؤ' اور اگر ایسی ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو' چنا جان نہ سہی' منا جان سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی' اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے' اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجا منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے! وہ حور اجیرن ہو جائے گی' طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی' وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ' چشم بددور' وہی ایک حور۔ بھائی' ہوش میں آؤ' کہیں اور دل لگاؤ۔" (بنام مرزا حاتم علی بیگ مہر)

سوچ
تلاش غالب

محمد قاسم صدیقی

پہلا غالب پرست

مولانا حالی نے یادگار غالب لکھ کر غالب کو زندۂ جاوید بنانے کی کوشش کی تھی اور وہ اس میں کسی حد تک کامیاب بھی رہے۔ اس لیے کہ مولانا حالی سے لے کر آج تک "یادگار غالب" سے جامع کتاب غالب کے حالات زندگی پر نہیں لکھی گئی۔ لیکن مولانا حالی کے اسلوب نگارش میں وہ بات نہ تھی کہ کسی کو چونکا دیتی۔ اس لیے آہستہ آہستہ غالب کی یاد پر ایک پردہ سا پڑ تا گیا۔ پھر غالب کا ایک سودائی اٹھا جو خود بھی ایک مصور تھا اور اس نے غالب کی یاد پر جمی ہوئی دھول کو صاف کیا۔ غالب کی تصویر کو ایک نئے ڈھنگ سے دیکھا۔ اس مصور کا نام عبدالرحمٰن بجنوری تھا۔

غالب کو غالب بنانے میں جتنا ہاتھ مولانا حالی کا تھا' عبدالرحمٰن بجنوری کا اس سے کم نہ تھا بلکہ اگر یچ پوچھا جائے تو غالب کو نیا قالب دینا بجنوری کا کارنامہ تھا۔ غالب نے جو کچھ کہا تھا اس میں بجنوری کا کوئی اضافہ کرنے کا سوال تو تھا نہیں بلکہ سوال اسے سمجھنے اور سمجھانے کا تھا اور انہوں نے اسے بالکل نئے ڈھنگ سے سمجھنے کی ضرور کوشش کی' بقول رشید احمد صدیقی۔ "اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالب کو نفسیاتی اسلوب تنقید کی روشنی میں پہلے پہل بجنوری مرحوم ہی نے پیش کیا۔ یہ بجنوری مرحوم کے مقابلے کا تصرف ہے کہ آجکل کے پڑھے لکھوں میں غالب سے شیفتگی پیدا ہوئی اور ارباب ذوق و فکر نے غالب ہی نہیں بلکہ دوسرے شعراء کو بھی بجنوری مرحوم ہی کے انداز تنقید سے جانچنا اور پرکھنا شروع کیا۔"

"محاسن کلام غالب" کے پہلے جملے سے ہی غالب پرستی کا اعلان ہو جاتا ہے۔

"ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ مقدس وید' اور دیوان غالب" بجنوری نے دیوان غالب کو الہامی کتاب مان کر غالب کے مصرع کی تردید کردی۔

"تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا!"

بجنوری کو بادہ خواری کے باوجود غالب کی ولایت میں شبہ نہ تھا۔ انہوں نے اپنے لیے ایک الگ راہ اختیار کی تھی۔ یہ انداز فکر خود چونکا دینے والا۔ خواہان کے نقطہ نظر سے اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن ان کے خلوص سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ قاضی عبدالغفار نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"محاسن کلام غالب کے متعلق عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم نے اپنا جو نقطہ نظر پیش کیا ہے اگر اس سے بعض

نقاد فن اختلاف بھی کریں' تب بھی وہ بجنوری کی وسعت نظراور عالمانہ انداز تنقید کا وزن ضرور محسوس کریں گے۔"

بجنوری نے اگر دیوان غالب کو الہامی کتاب مانا تو بے جا نہیں۔ اس لیے کہ ان کا خیال تھا اور صحیح تھا کہ "کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں۔ کون سا نغمہ ہے جو اس زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں۔"اور اسی لیے انہوں نے غالب کو ایک "رب النوع" تسلیم کیا ہے۔

غالب پران کا یہ دیباچہ جو بعد کو "محاسن کلام غالب" کے نام سے شائع ہوا' غالب کے سلسلہ میں سب سے اہم دستاویز ہے۔ جسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ مگر آج جب کہ غالب کی صد سالہ برسی منائی جا رہی ہے'اس پہلے غالب پرست کو نظرانداز کیا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری 1882ء میں سیوہ ہارہ (ضلع بجنور) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد خان بہادر نوراسلام کوئٹہ میں انجینئر تھے۔ اس لیے ان کی پرورش کوئٹہ ہی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم بھی کوئٹہ ہی میں ہوئی۔ پرورش انگریزی ماحول میں ہوئی' اور بنیادی مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی بھی پڑھائی گئی۔ لیکن اصل تعلیم علی گڑھ میں شروع ہوئی۔ جہاں اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ "علی گڑھ" میں پوری پوری دلچسپی لی۔ شعیب قریشی' عبدالرحمٰن سندھی اور ڈاکٹر سید محمود ان کے ساتھی تھے اور ان کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ علی گڑھ سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد بیرسٹری کے لیے انگلستان روانہ ہو گئے بجنوری کو شروع سے انگریزوں سے منافرت تھی۔ بیرسٹری کا امتحان شان دار کامیابی کے ساتھ پاس کرنے کے بعد وہیں انگلستان میں انگریزوں کے خلاف کام شروع کر دیا۔ چنانچہ ان کے خلاف ایک سازش کی گئی لیکن ان کے پاس ایک ملازم یہودی تھا۔ اسے اس شازش کی کچھ بھنک پڑگئی'اس لیے وہ اس سے آگاہ ہو گئے اور فوراً" فرانس چلے گئے۔ فرانس میں رہ کر آپ نے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کے لیے مقالہ لکھا۔ یہ مقالہ جرمنی زبان میں لکھا گیا اور وہیں چھپا۔ یہ مقالہ فقہ پر ہے۔

جرمنی سے ڈگری لینے کے بعد وطن واپس آگئے اور مراد آباد میں وکالت شروع کر دی۔ اسی زمانے میں کلام پاک کا جرمنی زبان میں ترجمہ کیا۔ آپ ایک مرتبہ ترکی بھی گئے لیکن وہاں آپ پر جاسوسی کا الزام لگا دیا گیا اور چھ ماہ وہاں کی جیل میں بند رہے۔

ہندوستان کی آزادی اور دوسرے مسائل پر مہاتما گاندھی سے آپ کی تفصیلی بات ہوئی تھی۔ آپ کو مادر درسگاہ علی گڑھ سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ اور آپ کا خیال تھا کہ اس قسم کی کئی یونیورسٹیاں قائم کی جائیں'اسی لیے جب یونیورسٹی کا قانون بنا تو ڈاکٹر بجنوری نے دہرہ دون میں ایک اسکیم بنائی اور اپنے دوستوں'خاص طور سے شعیب قریشی' عبدالرحمٰن سندھی'ڈاکٹر سید محمود کو شریک کیا۔ پھر یونیورسٹی کے ڈھانچے کو تبدیل کرنے کے لیے جب ایک کمیٹی بنائی گئی تو اس کے سلسلہ میں مشاورتی جلسہ ڈاکٹر بجنوری نے امروہہ میں طلب کیا۔

آپ کی غیر معمولی لیاقت کو دیکھتے ہوئے انگریزوں نے آپ کو نوکری دینی چاہی۔ اس سے ان کی مراد یہ بھی تھی کہ وہ انگریزوں کے خلاف اپنی آواز کو بند کر دیں۔ لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ نظام حیدر آباد نے

بھی خواہش ظاہر کی کہ وہ وہاں آجائیں۔ لیکن آخر نواب حمید اللہ خاں (بھوپال) نے اپنا صلح کار بنالیا۔ نواب صاحب بھوپال آپ کے کلاس فیلو تھے اور ان کی پیش کش آپ نہ ٹھکرا سکے۔ اور بھوپال میں رہنے لگے۔ وہیں دیوان غالب نظر سے گذرا۔ یہ نسخہ بھوپال کے فوجدار خاں کو نذر کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً اس کو پھر سے طبع کرانے کے انتظامات کیے، لیکن وہ نسخہ "نسخہ حمیدیہ" کے نام سے ان کے انتقال کے بعد چھپا۔

ڈاکٹر بجنوری کے خطوط کے مجموعے "باقیات بجنوری" اور "یادگار بجنوری" کے نام سے چھپے ہیں۔ جن سے اس دور پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ان دونوں مجموعوں میں مضامین بھی شامل ہیں۔ جو ان کی جدت طرازی کا نقش ہیں۔

"محاسن کلام غالب" میں دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے اور آج بھی غالب پر اتنا کام ہونے کے باوجود اس پائے کا مقالہ نہیں لکھا جا سکا۔

☆☆☆

مولانا حسرت موہانی

غالب کی شاعری

مرزا کا کلام شاعری کے عام محاسن کے اعتبار سے ہی ممتاز نظر آتا ہے۔

استعاروں کی ندرت تشبیہوں کی تازگی اور اشاروں کی نزاکت و لطافت کی مثالوں سے مرزا کا دیوان بھرا پڑا ہے۔ عامیانہ مذاق اور مبتذل بازاری الفاظ نیز فحش اور ہجو سے مرزا کا کلام بالکل پاک ہے مرزا کی شاعری عاشقانہ ضرور ہے۔ لیکن انہوں نے عشق کے معنی داغ دہلوی یا رند لکھنوی کی مانند بوالہوسی کے نہیں لئے ہیں اور اس لئے ان کے خیالات میں دناءت اور پستی کے بجائے متانت اور شائستگی کی ایسی شان پائی جاتی ہے جس کی مثال شوائے لکھنؤ کے کلام میں ناپید ہے اور متاخرین شوائے دہلی کے کلام میں کمیاب۔

غالب پر سرسید کا
ایک سو بارہ سال پرانا مضمون

ہمائے اوج مفاخر و معالی جاگزین سدرۃ المنتہیٰ، مراتب بلند و مدارج عالی، موسس اساس شیوا بیانی بانی پائے الفاظ و معانی عندلیب بہارستان سخن گستری، طوطی شکرستان معنی پروری، اوج سمائے برتری و والا تباری مہر سپہر بلند اختری دگردوں اقتداری، شاگرد رحمان، استاد سحبان المعی زمان نودعی بیان، فرزدق دہر و لبید آوان، سمی وصی رسول اللہ جناب مستطاب مرزا اسد اللہ غالب تخلص، دیوان حافظ ان کی لسان الغیبی کے عہد میں دلوں سے فراموش۔ زبان خلاق المعانی ان کے معنی ایجاد کے زمانے میں خاموش، چراغ انوری انہیں کے شعلہ فکر سے روشن اور سینہ آذری انہیں کی آتش حسرت سے گلخن عنصری، ان کے رشک افکار سے ایسا جل گیا کہ گویا اس کا پیکر فقط عنصر آتش سے متکون ہوا تھا اور سحبان ان کی حسرت کمال سے ایسا رویا کہ مگر اس کی بینائی چشم فقط عنصر آب سے بنی تھی۔ زلالی ان کے چشمہ ہنر کا تشنہ لب، اور ابواسحاق اطعمہ ان سے خوان استعداد سے نعمت طلب، خاقانی اس خرد معنی کی کم وسعت اور خسرو اس بادشاہ سخن کے آگے سرگرم خدمت، ملاحت کلام سعدی ان کے خوان فیض کی نمک خوار اور شیرنی زبان حافظ انکی نعمت مقال سے روزینہ دار، رنگینی معنی سے صفحے کو گل رنگ اور طراحی فکر سے کاغذ کو ارژنگ کرنا خاصہ اسی چمن طراز سخن وری اور نقاش صحیفہ ہنر پروری کا ہے۔ اگر الفاظ ثقیل سے گرانی اٹھائے تو کوہ کاہ کا حکم پیدا کرے اور اگر سخن میں متانت صرف کرے تو ورق بیاض صدمہ صرصر سے جگہ سے نہ ہلے، قلم ان کا معنی روشن کی تراوش سے فوارہ نور اور عبادت پاکیزہ ان کی لطف کیفیت سے شراب انگور۔ اگر اس سخن طراز کے کمال استعداد کو جو طرف حصر و شمار سے افزوں ہے۔ خامہ دو زباں بیان کرے۔ اول چاہیے کہ ملکہ عقل فعال سے عاریت مانگے اور زبان قلم تقدیر سے مستعار لے۔ میں ارادہ کرتا ہوں کہ اس حضرت کے اوصاف حمیدہ اور محامد پسندیدہ کو دفتر کتاب میں درج کروں اور عقل فریاد کرتی ہے کہ ہر گاہ میں نے اس تقدس جوہر امداد مبداء فیاض کے ساتھ جب اس امر کا قصد کیا، کارکنان بارگاہ ہلال سے کمی استعداد کا طعنہ سنا اور سوء ادب کی سرزنش کی تو بایں ہمہ نقصان عقل و ہوش کس شمار میں ہے۔ فی الحقیقت اگر لنگ لنگان اپنے تئیں جادہ مقصود میں ڈال دیا ہو تو ہوس حق السعی یعنی شاباش کی متوقع ہوئی اور حال یہ ہے کہ دشوار پسندان بلند فکر بلکہ دقیقہ یابان انصاف طینت کے آگے حصول صلہ آفرین تو کیا خجلت نارسائی اور طعنہ ناعاقبت بینی سے سر اٹھانے کو جگہ نہ

رہے گی۔ ظہوری نے سچ کہا ہے "کسی کہ عہدہ ثنائے کسی بیروں نیاید' چرا اول بجز اعتراف نماید۔" بہتر یہ ہے کہ فکر کو اس اندیشہ محال سے باز رکھے اور اپنی نارسائی کا پردہ فاش نہ کرے——بیت:

بامی است بصد بلند و پستی   ہاں پایۂ نہ لغزوت زمستی

نام نامی اور اسم سامی ان کے والد ماجد کا عبداللہ بیگ فان تھا۔ آپ اتراک سے ہیں اور سلسلہ آپ کے نسب کا افراسیاب و پشنگ تک پہنچتا ہے۔ آپ کے بزرگ سلجوقیوں کے عہد میں بسبب اس کے کہ ان کے ہم جنس وہم گہر تھے فرمان روائی رکھتے تھے۔ جب سلجوقیوں کے عہد سلطنت کا دورہ تمام ہوا ان کے آباو اجداد نے سمرقند میں توطن اختیار کیا۔ اس حضرت کے جدامجد اپنے پدر مشفق سے ایک امر سہل پر قدرے شکر رنج بہم پہنچا کر ہند میں تشریف لائے اور لاہور میں معین الملک کے رفیق ہوئے اور اس کے تباہ ہونے کے بعد وارد دہلی ہو کر سلطان عہد کی سرکار میں سررشتہ ملازمت کو ہاتھ میں لاکر سلسلہ چاکری کو استحکام دیا۔ حضرت ممدوح کے والد ماجد دہلی میں متولد ہوئے اور یہیں نشوونما حاصل کی۔ پھر کسی سبب سے بود و باش اکبر آباد میں اختیار کی اور حضرت ممدوح کو والدہ مشفقہ کے کنار شفقت اور آغوش عاطفت میں پانچ برس کا چھوڑ کر جناب نعیم کے گلگشت کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ کے چچا حقیقی نصراللہ بیگ خاں کہ اس عہد میں میرٹھ کی طرف سے اکبر آباد کے صوبہ دار تھے' آپ کی پرورش اور تربیت میں مصروف ہوئے' جب ہندوستان میں تصرف حکام انگریز کا ہوا۔ نصراللہ بیگ خاں لارڈ لیک بہادر کے رفیق ہو کر چار سو سوار کے رسالے سے اعادی بادیہا کے ساتھ سرگرم جنگ رہے۔ جرنیل لیک صاحب بہادر نے اس کار نمایاں کے صلہ میں دو پرگنہ مضافات اکبر آباد سے ان کی عین حیات تک جاگیر میں عطا کیے' پھر ان کے سانحہ ناگریز کے بعد جو 1801ء میں پیش آیا اور جاگیر موافق قرارداد کے ضبط ہوئی اور جاگیر کے عوض میں اس حضرت کے واسطے نقدی مقرر ہوگئی۔ پھر وہاں سے بسبب انس طبیعت اور میل خاطر کے شاہ جہاں آباد میں تشریف لائے۔ اور اس معاش پر قناعت کر کے گوشہ نشینی اختیار کی ہے اور بہترین شغل آپ کا اس عالم تنہائی میں سخن سنجی اور معنی پروری ہے۔ حق یہ ہے کہ جان سخن پر منت اور سر معنی پر بار احسان رکھتے ہیں' ہر دائرہ الفاظ وہن شکر اور ہر حرف زباں سپاس ہے ان کی نعمت تربیت کا راقم آثم کو جو اعتقاد ان کی خدمت میں ہے اس کا بیان نہ قدرت تقریر میں ہے اور نہ احاطہ تحریر میں آسکتا ہے۔ اور چونکہ دلہا راہد لہا راہ باشد" آں حضرت کو بھی وہ شفقت راقم کے حال پر ہے کہ شاید اپنے بزرگوں کی طرف سے کوئی مرتبہ اس کا مشاہدہ کیا ہوگا۔ میں اپنے اعتقاد میں ان کے ایک حرف کو بہتر ایک کتاب سے اور ان کے ایک گل کو بہتر ایک گلزار سے جانتا ہوں اور اگر دیکھا جائے تو حق بھی یہی ہے۔ خوشاحال ان لوگوں کا جو آپ کی خدمت بابرکت سے مستفید ہوتے ہیں اور جو ہر گراں مایہ کہ آپ سے حاصل کرتے ہیں' اس کو مغتنم جان کر بھی جزودان حافظہ میں محفوظ اور بھی صندوق بیاض میں امانت رکھتے ہیں۔ اس طرح کے مضامین عطائی پر مستفید کے پاس خردار خردار فراہم آگئے ہیں اور چونکہ مثل مبداء فیاض کے آپ کی طبیعت فیض موہبت نسبت بخل سے مبرا ہے۔ آپ کو ان جواہر بے بہا کے اعطاء میں کچھ دریغ نہیں۔ آرے:

نقش کہ بدست جان توانا! چوں بادہ خرد فزائے دانا!

آپ کا جوہر خانہ نفائس سخن حد شمار سے افزوں اور ظرف حصر سے بیروں ہے۔ ایک دیوان قصائد و غزلیات کا تیس جزو سے زیادہ مرتب اور منطبع ہوا ہے اور اسی طرح سے نثر اور ایک کتاب پنج آہنگ نام نہایت فوائد جلیلہ پر مشتمل قریب چودہ پندرہ جزو کے آپ کے نتائج فکر سے ہے کہ متبیان معنی رس کے واسطے مغتنمات عظمی سے ہے اور ایک مثنوی مشتمل اوپر غزوات حضرت رسالت دست گاہی ختمی پناہی صلی اللہ علیہ وسلم کی اگرچہ ہنوز ناتمام ہے لیکن پھر بھی قریب پندرہ سولہ جزو کے ہو چکی ہے' انشاء اللہ تعالیٰ جس وقت اتمام کو پہنچے گی گلدستہ بزم احباب ہوگی۔

☆ ☆

پروفیسر آل احمد سرور

غالب کا تنقیدی شعور

غالب کے یہاں ہمیں حیرت انگیز تنقیدی شعور ملتا ہے یہاں میرا یہ مطلب نہیں کہ غالب نے اپنے خطوط میں یا باتوں میں شاعری اور شاعروں کے متعلق گہرافشانی کی ہے یا نثر کے اقسام اور انشاء پردازی کے آداب بتائے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ غالب کے یہاں شاعری ایک مقدس دیوانگی نہیں ہے مہذب سنجیدگی ہے۔ غالب نے بہت کچھ کہا' مگر اردو میں اپنی زندگی میں' دوستوں کے مشورے کے بعد' ایک انتخاب شائع کیا' انہوں نے اپنی ابتدائی بے راہ روی کی صرف چند یادگاریں چھوڑ دیں۔ ان کے یہاں تخیل کی بے اعتدالیاں شروع میں ملتی ہیں مگر جلد وہ ان سے خبردار ہو جاتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی عمر کے آخری دس سال میں شعر بہت کم کہے۔ ان کی شاعری کا چشم خشک ہونے لگا تو وہ اس رمز سے آگاہ ہو گئے کہ دنیا میں کوئی چیز اتنی مضحکہ خیز نہیں جتنی بڑھاپے کی جواں غزلیں' ڈرائڈن کی طرح غالب نے بھی آخر عمر میں نثر کی طرف زیادہ توجہ کی اور شعری پیکروں کے بجائے نثر میں مرقع نگاری کی' غالب کے ان سادہ نقوش میں نثر کی روشنی اور وضاحت ہے مگر شعر کی دلنشیں اور تاثیر بھی' ان کی ظرافت سے ان کے پھوڑے پھنسیوں کو بھی "سرو چراغاں" بنا دیا۔

مختارالدین احمد آرزو

حضرت غوث علی شاہ قلندرؒ اور غالب

حضرت سید غوث علی شاہ قلندر (ولادت در قصبہ استھواں' بہار 1219ھ وفات در پانی پت 1297ھ) تیرھویں صدی ہجری میں سلسلہ قادریہ کے بڑے مشہور بزرگ گزرے ہیں' ان کے حالات و ملفوظات ان کے " خادم طریق ووصی باتحقیق" شاہ گل حسن نے مرتب کر کے شائع کیے ہیں اردو اور فارسی میں جس قدر ملفوظات دیکھنے کا اتفاق ہوا' بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس قدر دل چسپ اور عام فہم کتاب کوئی اور دیکھنے میں نہیں آئی یہ بڑے جہانیاں جہاں گشت تھے' ملفوظات میں پچاسوں ان مقامات کا نام آتا ہے جہاں جہاں کی سیاحت کی تھی' اور بیسوں ان بزرگوں کے اسماء ملتے ہیں' جن سے انھیں ملنے کے مواقع حاصل ہوئے تھے۔ ان لوگوں میں مولانا فضل حق :123'245' مفتی صدر الدین 124 اسمٰعیل میرٹھی کے سماء قابل ذکر ہیں۔ مرزا غالب سے بھی ملاقاتیں ہوئی تھیں' یہ اس زمانے کی بات ہے جب شاہ صاحب دہلی گئے ہوئے تھے اور زینت المساجد' میں فردکش تھے' ان کا قیام دہلی میں کب تھا یہ معلوم نہ ہو سکا ورنہ مرزا سے ان کی ملاقات کے زمانہ کی تعیین ہو جاتی' صرف یہ معلوم ہے کہ ان کا قیام چھ ماہ دہلی میں رہا اور مرزا سے ہمیشہ ملاقاتیں رہیں' راقم کا قیاس ہے کہ یہ سن ستاون سے پہلے کی بات ہوگی' اس قیاس کی تائید دو باتوں سے ہوتی ہے' مرزا نے دہلی میں مختلف مکان بدلے' لیکن وہ ہمیشہ 'بلی ماران' اور آس پاس کے دائرے ہی میں قدم رکھتے ہیں۔ پھر وہ مالی پریشانیوں اور ہجوم افکار کا زمانہ تھا' اس وقت ہر دو دن کے بعد ایک خوان سجا کر شاہ صاحب کے لیے لے جانا ویسے بھی مستبعد معلوم ہوتا ہے' پھر یہ امر غور طلب ہے کہ اس وقت تک رجب علی بیگ سرور سے نہ ان کے تعلقات تھے نہ ملاقات' اسی زمانے میں مرزا کی انکی ملاقات ہوئی اور تعلقات قائم ہوئے' مرزا نے ان کی کتاب' گلزار سرور' پر ایک تقریظ بھی لکھی ہے جو اس کتاب کے علاوہ عود ہندی میں بھی موجود ہے۔

غوث علی شاہ پہلی مرتبہ خود ہی مرزا سے ملنے گئے' پھر بعد میں چھ ماہ تک مرزا سے ہمیشہ ملاقات رہی اور ان ملاقاتوں کا بڑا اچھا اثر شاہ صاحب پر پڑا ان کے ملفوظات میں دو مقام پر مرزا غالب کا ذکر ہے اور جس انداز میں انھوں نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے اور غالب کے اخلاق و عادات کی تصویر جس طرح کھینچی ہے اس سے غالب ہی نہیں خود شاہ صاحب کے اعلیٰ اخلاق پر روشنی پڑتی ہے' ورنہ ان دونوں کا کیا میل۔ مرزا ایک رند مشرب آدمی اور شاہ صاحب اپنے وقت کے بڑے اہل دل بزرگ۔

ان کے ملفوظات میں مرزا غالب کے اشعار بھی ملتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں مرزا سے کتنی محبت تھی۔ کچھ شعر یہ ہیں:

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے — رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے
بے خودی بے سبب نہیں غالب — کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے
نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا — ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے آگے — اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

اب ان کی مرزا غالب سے ملاقات کا حال انہیں کی زبانی سنئے:

ایک روز ہم مرزا نوشہ کے مکان پر گئے' نہایت حسن اخلاق سے ملے لب فرش تک آن کر لے گئے' تمام حال دریافت کیا' ہم نے کہا کہ مرزا صاحب ہم کو آپ کی ایک غزل بہت ہی پسند ہے علی الخصوص یہ شعر:

تو نہ قاتل ہو کوئی اور ہی ہو — تیرے کوچے کی شہادت ہی سہی

کہا صاحب' یہ شعر تو میرا نہیں کسی استاد کا ہے فی الحقیقت نہایت اچھا ہے۔ غزل مرزا نوشہ:

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں
نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلک نا انصاف

آہ فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسد
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

اس دن سے مرزا صاحب نے دستور کر لیا کہ تیسرے دن زینت المساجد' میں ہم سے ملنے کو آتے اور ایک خوان کھانے کا ساتھ لاتے' ہرچند ہم نے عذر کیا کہ یہ تکلف نہ کیجئے مگر وہ کب مانتے تھے ہم نے ساتھ کھانے کے لیے کہا تو کہنے لگے کہ میں اس قابل نہیں ہوں' یے خوار و سیاہ گنہ گار مجھ کو آپ کے ساتھ کھاتے ہوئے شرم آتی ہے البتہ اولش کا مضائقہ نہیں ہم نے بہت اصرار کیا تو الگ طشتری میں لے کر کھایا ان کے مزاج میں کمال کی کسر نفسی اور فروتنی تھی۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ مرزا رجب علی سرور مصنف فسانہ عجائب لکھنؤ سے آئے۔ مرزا نوشہ سے ملے اثنائے گفتگو میں پوچھا کہ مرزا صاحب اردو زبان کس کتاب کی عمدہ ہے کہا چہار درویش کی' میاں رجب علی بولے اور فسانہ' عجائب' کیسی ہے مرزا بے ساختہ کہہ اٹھے اجی لاحول ولاقوۃ اس میں لطف زبان کہاں' ایک تک بندی اور بھٹیار خانہ جمع ہے اس وقت تک مرزا نوشہ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہی میاں سرور ہیں' جب چلے گئے تو حال معلوم ہوا' بہت افسوس کیا اور کہا ظالموں پہلے سے کیوں نہ کہا۔ دوسرے دن مرزا نوشہ ہمارے پاس آئے۔ یہ قصہ سنایا اور کہا کہ حضرت یہ امر مجھ سے غیر دانستگی میں ہو گیا آیئے آج ان کے مکان پر چلیں اور کل کی مکافات کر آئیں' ہم ان کے ہمراہ ہو لیے اور میاں سرور کی فرودگاہ پر پہنچے۔ مزاج پرسی کے بعد مرزا صاحب نے عبارت آرائی کا ذکر چھیڑا اور ہماری طرف مخاطب ہو کر بولے کہ جناب مولوی صاحب رات میں نے جو فسانہ عجائب کو جو بہ غور دیکھا تو اسکی خوبی عبارت اور رنگینی کا کیا بیان کروں' نہایت ہی فصیح و بلیغ عبارت ہے۔ میرے قیاس میں تو ایسی عمدہ نثر نہ پہلے ہوئی نہ آگے ہو گی اور کیوں کر ہو' اس کا مصنف اپنا جواب نہیں رکھتا' غرض اس قسم کی بہت سی باتیں بنائیں اپنی خاکساری اور ان کی تعریف کر کے میاں سرور کو نہایت مسرور کیا' دوسرے دن انکی دعوت بھی کی اور ہم کو بلایا۔ اس وقت بھی میاں سرور کی بہت تعریف کی' مرزا صاحب کا مذہب یہ تھا کہ دل آزاری بڑا گناہ ہے اور درحقیقت یہ خیال بہت درست تھا۔ المومن من سلم من یدہ و لسانہ مباش درپئے آزار و ہرچہ خواہی کن

کہ در طریقت ما غیر ازیں گناہے نیست

ایک دن ہم نے مرزا غالب سے پوچھا کہ تم کو کسی سے محبت بھی ہے' کہا کہ ہاں حضرت علیؓ مرتضیٰ سے۔ پھر ہم سے پوچھا کہ آپ کو! ہم نے کہا واہ صاحب آپ تو مغل بچہ ہو کر علی مرتضیٰؓ کی محبت کا دم بھریں' ہم ان کی اولاد کہلائیں اور محبت نہ رکھیں' کیا یہ بات آپ کے قیاس میں آسکتی ہے۔

ایک روز راقم خدمت میں حاضر تھا کہ کسی شخص نے مرزا نوشہ صاحب کے انتقال کی خبر سنائی آپ نے فرمایا: اناللہ وانا الیہ راجعون

نہایت خوب آدمی تھے' عجز و انکسار بہت تھا فقیر دوست بدرجہ غایت اور خلیق ازحد تھے' ایک روز ہم ان کے پاس گئے تو انہوں نے اپنے یہ دو قطعے پڑھے تھے:

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار | ساقی و مغنی و شرابے و سرورے
زنہار ازاں قوم نہ باشی کہ فریبند | حق رابہ سجودے ونبی رابہ درودے
بروز حشر الٰہی چو نامہ عملم | کنند باز کہ آں روز باز خواہ من است
بکن مقابلہ آں رازسر نوشت ازل | اگر زیادہ و کم باشد آں گناہ من است

رند مشرب' بے شر' رحم دل تھے اور فن شاعری میں تو اپنا جواب نہ رکھتے تھے لیکن افسوس یہ ہمارے محب بھی چل دیے۔

شاہ صاحب نے یہ نہیں لکھا کہ "وحشت ہی سہی" والی غزل غالب نے انہیں سنائی لیکن فحوائے کلام سے یہی مترشح ہوتا ہے۔ مرزا نے کہا ہوگا کہ جو شعر آپ سنا رہے ہیں وہ تو میرا نہیں۔ لیکن اس زمین میں نے غزل لکھی ہے اور وہ یہ ہے۔

زینت المساجد' عالمگیر کی صاحب زادی زینت النساء بیگم کی یادگار ہے جس کی تعمیر دریا گنج میں 1119ء میں انہوں نے کرائی تفصیل کے لیے دیکھیے واقعات دارالحکومت 127/2 آثار الصنادید' مفتاح التواریخ بیل: 297

رجب علی بیگ سرور کی انشاء پردازی کے متعلق غالب کی رائے اس تقریظ میں ملے گی جو انہوں نے گلزار سرور (ترجمہ حدائق العشاق): پر لکھی تھی اور عود ہندی اور اردوئے معلّٰی' دونوں میں موجود ہے۔ ذیل کی سطریں دیکھیے اس میں فسانہ عجائب کا بھی ذکر آگیا ہے۔

ہاں اے صاحبان فہم و ادراک' سرور سحر بیاں کا اردو کی نثر میں کیا پایہ ہے اور اس بزرگوار کا کلام شاہد معنی کے واسطے کیسا گراں بہا پیرایہ ہے:

رزم کی داستاں اگر سنئے | ہے زباں ایک تیغ جوہر دار
بزم کا التزام کریجئے | ہے قلم ایک ابر گوہر بار

مجھ کو دعویٰ تھا کہ انداز بیان کی خوبی میں فسانہ عجائب بے نظیر ہے' جس نے میرے دعویٰ کو اور فسانہ عجائب کی یکتائی کو مٹایا وہ یہ تحریر ہے' کیا ہوا کہ ایک طرح اور ایک قماش کی ہیں یہ دونوں دل فریب نقش ایک ہی نقاش کے ہیں' مانا کہ ایک نقش دوسرے کا ثانی ہے' یہ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ نقاش لاثانی ہے' مانی نقاش بے معنی صورتیں بنا کر دعوتی پیمبری کا کرے کیا عقل کی کمی ہے' یہ بندۂ خدا معنی کی تصویر کھینچ کر دعویٰ خدائی نہ کرے کس حوصلہ کا آدمی ہے۔" (عود ہندی طبع اول: 181' اردوئے معلّٰی حصہ دوم طبع سرور 351)

مرزا غالب نے جو دو فارسی قطعے' شاہ صاحب کو سنائے تھے ان میں پہلا تو بہت مشہور ہے اور کلیات

فارسی میں موجود (طبع 1863: 14) لیکن دوسرا قطعہ نہ تو ان کے دیوان میں ہے نہ سبد چیں کی اشاعت اول میں اور نہ غالب کی کسی اور تحریر میں اس کا ذکر ملتا ہے اس لیے بے حد اہم ہے۔

☆ ☆

پروفیسر رشید احمد صدیقی

غالب کی طنز و ظرافت

اردو شعر و ادب ہی نہیں طنز و ظرافت کی محفل میں بھی غالب اس طرح داخل ہوئے ہیں جیسے فلمی گانوں کے درمیان پکے گانے کا کوئی استاد وارد ہو جائے۔ تقریباً ہر صدی میں دو ایک بار ایسا اتفاق ہوتا ہے۔ غالب انہیں دل چسپ لیکن ناگزیر اتفاقات میں سے ہیں ان کو کسی خاص دور میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ خود ایک دور ایک عہد یا ایک مزاج ہیں' اسی طرح جیسے ان سے پہلے سودا اور ان کے بعد اکبر کی حیثیت دیکھ اور سمجھ لیں تو اردو طنزیات و مضحکات کا پورا سواد تار تار ہو کر ہمارے پیش نظر ہو جائے گا اور ہمیں وہ تمام مثبت اور منفی قدریں مل جائیں گی جن کو مختلف صورتوں میں ایک دوسرے سے ربط دے کر تمام دوسرے طنزیں اور مزاح نگاروں کا خمیر تیار کیا جا سکتا ہے۔ اور ان کے فن اور کارنامے دونوں کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ عہد و زمانہ کے لحاظ سے بھی غالب' سودا اور اکبر کے درمیان آئے ہیں اس طرح ان کی حیثیت "برزخ" کی سی ہو گی جس میں ایک طرف سودا اور ان کی دریات اور دوسری طرف اکبر اور ان کے لواحقین ہیں' گویا اس عمل یا سفر میں غالب کی حیثیت اپنے کو اس طرح ڈھالتی بنواتی ہے کہ اکبر تک پہنچتے پہنچتے جنت و جہنم (برعایت برزخ) کی تفریق مٹتی نظر آتی ہے اور یہ احساس ہوتا ہے کہ جنت اور جہنم بھی بس "اک انداز بیان" ہے۔

پروفیسر احتشام حسین

غالب کا جہان دیر و کعبہ

ان کے خیالوں کا دائرہ بہت وسیع ہے

ہر زبان اور قوم کی شاعری میں وہ قدیم ہو یا جدید تشبیہوں اور استعاروں' علامتوں اور تمثالوں تلمیحوں اور تمثیلوں سے کام لیا گیا ہے۔ ایک حیثیت سے یہ اظہار کے فکری سہارے اور ساز کے چھپے ہوئے پردے ہیں جن سے شاعر اپنے پیرایہ بیان میں معنی کی بجلیاں پیدا کرتا ہے۔ ہر شاعر اپنے شعور اور رسائی ذہن کے مطابق انہیں تاریخ' تہذیب' رسم و رواج' مذہبی عقائد قصص و حکایات اور تخیلی مفروضات سے حاصل کرتا ہے۔ اور اپنے تجربات کے اظہار کا وسیلہ بناتا ہے۔ فارسی اور اردو شاعری شیخ و برہمن'' کعبہ و کلیسا' بادہ و ساغر' قفس و آشیاں' دشنہ و خنجر' زمین و فلک' دشت و صحرا' گل و بلبل' آئینہ و رنگ عشق و جنوں' زنجیر و موج کے تذکروں سے بھری ہوئی ہے اور شاعروں نے انہیں سے اپنی بزم فکر سجائی ہے اور انہیں کو نئے نئے رنگ دے کر اپنے تجربات کی دنیا آباد کی ہے۔ مرزا غالب کی معنی آفرینی بھی بہت کچھ انہیں علامتوں اور تمثیلوں کی رہین منت ہے۔ ان کے افکار کی دنیا میں داخل ہونے کے لیے ان سے نہ صرف واقفیت ضروری ہے بلکہ غالب کے طرز فکر اور احساس فن سے انہیں مربوط کرنے کی بھی ضرورت ہے ورنہ ان کی انفرادیت کے خط و خال واضح نہ ہو سکیں گے۔

مرزا غالب کے خیال کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ زمین اور آسمان دنوں کی خبر رکھتے ہیں یاد رکھنا چاہتے ہیں اور دونوں کے متعلق سوچتے ہیں وہ زمین سے نکلنے والے لالہ و گل کی ماہیت پر بھی غور کرتے ہیں اور آسمان میں بچھے ہوئے تاروں کے جال کا راز بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ان سب کے اندرونی روابط کیا ہیں اسی سے وہ فکری عنصر پیدا ہوتا ہے جو انسان اور کائنات کی غرض و غایت کو سمجھنے پر اکساتا ہے اور مذہب کی حقیقت جاننے کا شوق پیدا کرتا ہے دیر و کعبہ' کلیسا اور صنم کدہ شیخ و برہمن سے دلچسپی اسی ذوق جستجو کا نتیجہ ہے۔ شاعر اور فنکار کی حیثیت سے ان کے سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز فلسفیوں سے مختلف ہے لیکن اس کی تہہ میں یہی کرید چھپی ہوئی ہے کہ یہ دنیا کیا ہے۔ کہاں سے آئی ہے۔

اس میں انسان کی حیثیت کیا ہے' یہ مختلف مذہبوں میں بٹا ہوا کیوں ہے۔ اگر بٹ بھی گیا ہے تو ان میں فرق کیا ہے کیا یہ سب ایک ہی قسم کی روحانی آسودگی کی تلاش میں نہیں ہیں۔ اگر سب ایک ہیں تو پھر آپس میں منافرت

اور دوری کا سبب کیا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جنہوں نے وید اور اپنشد' قرآن اور انجیل اوستا اور تالود کے ماننے والوں کو بھی الجھائے رکھا ہے اور ان فلسفیوں کو بھی جو زندگی کے مظاہر کا راز تلاش کرنے کے درپے ہیں۔ مرزا غالب نے اپنی نثر و نظم میں کبھی علامتوں اور استعاروں کے پردے میں اور کبھی صاف الفاظ میں کبھی محض ایک تشکیک آمیز سوال کی شکل میں اور کبھی پیغمبرانہ لب و لہجہ میں ان سوالات کو چھوا ہے۔ ان کی اردو شاعری میں دیر و حرم کعبہ و بت خانہ کلیا و کنشت کفر اور دین کی علامتیں بار بار آئی ہیں۔ لیکن ان سے باقاعدہ مذاہب کے اختلافات ان کی خصوصیات اور عقائدی پہلو پر زور دینا مقصود نہیں۔ نہ کسی مذہب کو بڑا نہ کسی کو چھوٹا کر کے رکھنا ہے بلکہ ہر جگہ ان کی مدد سے اس انسانی حقیقت کا سمجھنا ہے کہ اگر سب انسان ہیں تو مذہب کے تفرقے انہیں کس طرح الگ کر سکتے ہیں۔ یہ کہنا تو بہت مشکل ہے کہ انہوں نے مذاہب کا مطالعہ کتنی گہری نظر سے کیا تھا لیکن ان کی تحروں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے ہندو مت' اسلام درویشی عقائد اور صوفیانہ خیالات کو سمجھنے کی کوشش کی تھی اور ان میں بعض بنیادی مشترک پہلوؤں پر غور کیا تھا اور سوچ سمجھ کر اس مابعد الطبیعاتی نقطہ نظر کو اپنایا تھا جسے عام طور سے وحدت الوجود کہا جاتا ہے جس کی رو سے حقیقت ایک ہوتی ہے اس کے مظاہر سیکڑوں خیالوں کا ظاہری فرق دیر و کعبہ و کلیسا اور بت خانے میں دیوار یں کھڑی کرتا ہے۔ اصل ایک ہی ہوتی ہے۔

جو لوگ غالب کے طرز فکر اور انداز بیاں سے واقف ہیں' انہیں اندازہ ہو گا کہ یہ اشعار محض شگفتہ مزاجی رندانہ مشربی یا اظہار آزادہ روی کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ ان کے پیچھے انسانیت پرستی کا ایک عظیم الشان تصور کام کر رہا ہے۔ یہ تصور تعصب فرقہ پرستی تنگ نظری جماعتی برتری' نسلی یا قومی اختلاف اور انسان دشمنی کے جذبات پر کاری ضرب لگاتا ہے اور جب غالب جیسے فنکار کے نغموں میں ڈھل جاتا ہے تو زمین و آسمان کی حدیں مل جاتی ہیں اور ان سے وحدت انسانی اور آفاقیت کے سر نکلتے ہیں۔

ہے سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیے یعنی بہ حسب گردش پیمانہ صفات
عارف ہمیشہ مست مئے ذات چاہیے

غالب مذہب کے معاملے میں آزاد خیال تھے اور بڑے لطیف انداز میں مذاہب کے ظاہری رسوم پر طنز کرتے تھے لیکن جہاں تک منزل اور مرکز کا تعلق ہے اس سے غافل نہ تھے۔ ان کے بعض اشعار اور خیالات سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقیقت کی جستجو کو انسان کے لیے فطری سمجھتے تھے لیکن مذاہب کو آخری منزل قرار دینے کو تھک کر بیٹھ جانا خیال کرتے تھے ان کا مشہور شعر ہے۔

دیر و حرم آئینہ تکرار تمنا واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

اس کی حسین تفسیر ہے انسان مسلسل تگ و دو کرتا رہے کہ تحقیق اور منشائے تحقیق کے راز دریافت کرے یہ شوق جہاں تھک کر پناہ لیتا ہے اس کا نام مذہب رکھ دیا گیا ہے اور چونکہ ایسا بارہا ہوتا رہا ہے اس لیے دنیا میں بہت سے مذاہب وجود میں آگئے ہیں چونکہ ان سب کے پیچھے تلاش کا ایک ہی جذبہ کام کر رہا ہے۔ اس لیے ان کے ماننے والوں میں کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہے۔ اصل قدر تو اس جذبے کی کرنا چاہیے جو ثابت قدمی کے ساتھ اس

جستجو میں سرگرداں ہے۔ اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو مومن اور کافر مندر کے پجاری اور حرم کے پاسبان برہمن اور شیخ میں کوئی فرق نہیں رہتا انہیں علامتوں سے کام لے کر غالب نے ایک ایسا نظریہ پیش کیا ہے جو مذاہب کے درمیان رواداری جذ آباتی ہم آہنگی اور اتحاد باہمی کا منشور بن سکتا ہے کہتے ہیں۔

وفاداری بہ شرط استواری اصل ایماں ہے مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

اگر کسی شخص نے سچائی اور ایمانداری سے ایک مذہب اختیار کیا اور دوسرے نے کوئی دوسرا تو اس میں جھگڑے کی بات کہاں ہے دونوں سچے ہیں اور دونوں کو ایک ہی برتاؤ کا مستحق قرار دینا چاہیے مسجد اور مندر قبرستان اور شمشان کے لیے لڑکر جان دینے والے اگر مذہب کے فرق کو اس نظر سے دیکھیں تو سارے جھگڑے ختم ہو جائیں مذہبوں کے ظاہری فرق کی تہہ میں جو اکیلی سچائی ہے اس کی طرف غالب نے اس طرح اشارہ کیا ہے۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

مرزا غالب نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ اصل چیز کسی مذہب میں پیدا ہونا یا اس سے بے سوچے سمجھے وابستہ ہونا نہیں ہے بلکہ اس کو سچا سمجھ کر اس سے وفاداری برتنا ہے۔ عزت اسی کی ہوتی ہے جو مذہب کو سچ سمجھ کر اختیار کرتا ہے۔ اور کسی لالچ یا ڈر سے اس کے قدم ڈگمگا نہیں جاتے ایک جگہ کہتے ہیں۔

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گہرائی وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

کوئی شخص ہر وقت ہاتھ میں تسبیح لیے ہو یا ہر وقت جینئو میں لپٹا ہوا ہو تو وہ اس سے پاکباز اور ایماندار نہیں ہو جاتا یہ دونوں عمل ظاہری ہیں۔ نہ تسبیح والا شیخ شیخ ہے اور نہ جینئو والا برہمن، شیخ اور برہمن کی سچائی کا امتحان اس وقت ہوگا جب انہیں اپنے عمل میں یقین کی جھلک بھی نظر آئے اس ڈر سے عبادت کرنا کہ اگر اس میں کمی ہوئی تو جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ یا اس لالچ میں نمازیں پڑھنا کہ خدا خوش ہو جائے اور جنت بخش دے گا۔ عبادت کی روح کے منافی ہے یہ عبادت ڈر اور لالچ کی پیداوار ہے۔ ان سے بچ کر جو عبادت کر سکے وہ قابل عزت ہے۔ مرزا غالب نے اپنے ایک لاجواب شعر میں اس حقیقت کو یوں پیش کیا ہے۔

طاعت میں تار ہے نہ مے و انگبیں کی لاگ دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

مسلم ضیائی

غالب کی داستان محبت

یار در عہد شبابم بہ کنار آمد و رفت ہچو عیدی کہ در ایام بہار آمد و رفت

مرزا غالب کے ہزاروں دوستوں میں ایک دوست، مولوی تفضل حسین خاں بھی تھے۔ ان کو ایک غم انگیز اور جانگزا حادثہ پیش آیا۔ غالب اور تفضل حسین خاں کے ایک مشترک دوست اعتقاد الدولہ نوروز علی خاں تھے۔ انہوں نے غالب کو اپنے نام تفضل حسین خاں کا نامہ غم دکھا کر چاہا کہ غالب خط لکھ کر تفضل حسین خاں کا غم غلط کریں۔

غالب نے اپنے خط میں تعزیت اور اظہار ہمدردی کے ساتھ اپنی داستان محبت کی اس طرح نقاب کشائی کی ہے:

"بروزگار جوانی ...... مرا نیز زہراب ایں بلا (مرگ دوست) ساغر ریختہ اند و برگذار جنازۂ دوست غبار از نہاد شکیبم برانگیختہ۔ روز ہائے روشن بماتم ولدار پلاس نشین و کبود پوش بودہ ام و شبہائی سیاہ بخلوت غم پروانہ، شمع خموش بودہ ام۔ ہم خوابہ کہ وقت وداع از رشک نجدائیش نتواں سپرد، چہ بیداد است، تن نازنیش (رابخاک سپردن و محبوبہ کہ از بیم چشم زخم نرگس بہ گلگشت چمن نتوان برد، چہ ستم است نعش او را بگورستان بردن۔

خاک خون باد کہ در معرض آثار وجود زلف رخ در کشد و سنبل و گل بار دہد

صیاد دام گستہ، صید از بند بدرجستہ را، باسودگی چہ پیوند؟ و گلچین گل از دست دادہ، گلبن از پاافتادہ را، بخری چہ آمیزش؟ تن دادن شاہد بعہدی عاشق، اگرچہ پس از یک عمر جانفشانی است، دل دادگان دانند کہ چہ پایہ مہرورزی و مہربانی است۔ خوشا معشوقہ وفاسگال کہ تلافی را از بایست پایہ تر نہادہ باشد و از ہر کہ غمزۂ دل بردہ ہم بمہرش جان دادہ باشد!

"بایں این ہمہ کہ غم مرگ دوست جانگذاشت و اندوہ جدائی جاوید جگرپالان ......"[1]

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ تفضل حسین خاں کو خط لکھتے ہوئے غالب کو اپنی جوانی کا افسانہ غم یاد آ گیا تھا جب انہوں نے محبت کی تھی اور ان کی محبوبہ دلنواز کی وفات نے ان کی زندگی کو تاریک اور ویران کر دیا تھا۔ یہ محبوبہ غالب سے والہانہ محبت کرتی تھی۔

ایک اور خط میں حاتم علی مہر کو ان کی محبوبہ چنا جان کے مرنے پر تعزیت نامہ لکھتے ہوئے اپنی داستان محبت کی اس طرح پردہ کشائی کرتے ہیں:

بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں' جس پر مرتے ہیں' اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں' عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم دونوں کو بھی' کہ زخم مرگ دوست کھائے ہوئے ہیں' مغفرت کرے۔

چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے۔ باآنکہ یہ کوچہ چھٹ گیا۔ اس فن سے بیگانہ محض ہو گیا ہوں' پھر بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔ جانتا ہوں کہ تمہارے دل پر کیا گزرتی ہو گی۔ 2۔

یہ خط جون 1860 (ذی قعدہ 1276ھ) میں لکھا گیا کیونکہ چنا جان کی وفات 9 ذی قعد 1276 (29 مئی 1860) کو ہوئی تھی۔ 3۔ اگر ہم اس میں سے بیالیس سال منہا کریں تو (1276-42 = 1234ھ م 1818ء) غالب کی محبوبہ کا سال وفات قرار پاتا ہے جب غالب کی عمر 21' 22 سال تھی 4۔ قیاس کہتا ہے کہ اس ستم پیشہ ڈومنی سے غالب کے معاشقے کی عمر زیادہ طویل نہ تھی' بس ایک دو سال یعنی غالب نے اس ستم پیشہ ڈومنی سے انیس بیس سال کی عمر میں عشق کیا تھا۔ لیکن یہ ستم پیشہ ڈومنی کون تھی؟ غالب نے اس کے بارے میں کیا اور کس طرح لکھا ہے؟ ہمیں سرور کے عمدۂ منتخبہ سے اسد تخلص کے تحت غالب کے بارے میں صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ:

..... جوان قابل و یار باش و درد مند۔ ہمیشہ بہ خوش معاشی بسر بردہ ذوق ریختہ گوئی در خاطر متمکن' خوکردۂ غم ہائے عشق مجاز' تربیت یافتہ شمکدۂ نیاز در فن سخن سنجی تتبع محاورات میرزا عبدالقادر بیدل علیہ الرحمتہ و ریختہ ور محاورات فارسی موزوں می کند۔ بالجملہ موجد طرز خود است و باراقم رابطہ یک جہتی مستحکم دارد۔ 5۔

چونکہ سرور سے رابطہ یک جہتی مستحکم تھا اس لیے وہ یقیناً غالب کے غم ہائے عشق "مجاز" سے واقف تھے۔ اگرچہ ان کی تحریر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت غالب طرز بیدل چھوڑ کر "موجد طرز خود" ہو چکے تھے اور ابھی تک خوش معاشی سے زندگی بسر کر رہے تھے' لیکن افسوس سرور نے اجمال سے کام لیتے ہوئے غالب کے غم ہائے عشق مجاز پر روشنی نہیں ڈالی۔ آیئے ہم غالب ہی کی تحریروں سے اس داستان عشق کی مختلف کڑیوں کو جوڑنے کی کوشش کریں۔

ہماری زبان میں ڈومنی کا لفظ اچھے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا لیکن "ستم پیشہ ڈومنی" لکھتے وقت غالب کے ذہن میں کیا تھا؟ اس کی تفصیل غالب ہی کی زبانی سنئے۔ اپنے دوست' منشی نبی بخش حقیر کو "مغاں شیوہ بانواں" 6۔ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

بانو بادشاہ کی بیوی کو کہتے ہیں اور الف جمع کا ہے یعنی بیبیاں۔ مغاں شیوہ کی وہ ترکیب ہے جو گل رخسار اور ماہ جبین کی ترکیب ہے یعنی وہ شخص جس کا رخسار مانند گل کے ہے اور پیشانی چاند کی سی ہے اور شیوہ مغاں کا سا ہے۔ 7۔ مغ آتش کدے کا کارفرما اور چونکہ بادشاہان پارس آتش پرست تھے تو وہ خدمت آتش کدوں کی عمائد و اکابر و اشراف و علماء کو دیتے تھے اور شراب بھی (چونکہ وہ بہت عمدہ چیز اور پاک اور متبرک جانتے تھے اور ہر سفلہ اور فرومایہ کو نہیں پینے دیتے تھے) مغوں کی تحویل میں رہتی تھی تاکہ وہ جس کو لائق سمجھیں اور اہل جانیں' اس

کو بقدر مناسب دیں۔ بہر حال وہ لوگ یعنی مغ بہت خوبصورت اور خوش سیرت' عالم فاضل طرحدار' بذلہ گو' حریف ظریف ہوا کرتے تھے۔

اس راہ سے پارسیوں نے مغاں شیوہ' مدح معشوقوں کی ٹھہرائی ہے یعنی چالاک اور خوش بیان اور طرحدار اور ترچھا اور بانکا مانند مغوں کے۔ اور اس کا نظیر ہندوستان میں یہ ہے کہ جیسے کسو بیگم یا عمدہ عورت کو کہیں کہ فلانی بیگم یا فلانی عورت میں کتنا ڈومنی پن نکلتا ہے۔

قصہ مختصر' مغاں شیوہ اس محبوب کو کہتے ہیں جو بہت گرم اور شوخ اور شیریں حرکات اور چالاک ہو۔

مغاں شیوہ بانواں' مغاں شیوہ دلبراں' مغاں شیوہ شاہداں' خواہی بہ مجمع' خواہی بہ انفراد' ترکیب مقلوب ہے یعنی بانواں مغاں شیوہ۔ قس علی ہذا اور الفاظ ....."8۔

غالب کی مندرجہ بالا تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط لکھتے ہوئے ان کے ذہن میں یہی مغاں شیوہ' ستم پیشہ ڈومنی تھی جو کوئی شاہد بازاری نہ تھی بلکہ گرم' شوخ' شیریں حرکات' چالاک' خوش بیان' طرحدار' بانکی ترچھی سرو قامت حسینہ تھی (جس کا سراپا غالب نے اپنی اردو اور فارسی شاعری میں کئی جگہ لکھا ہے) جس کے بدن پر اس کی قبائے تنگ' کلی کی طرح کھلی جاتی تھی۔ یہ وہی مطربہ ہے جس کے بارے میں غالب نے اپنی غزلوں میں بار بار لکھا' جس کی شیریں حرکاتی کا مثنوی ابر گہربار میں ذکر کیا9۔ اور جسے زندگی بھر یاد کرتے رہے۔

کار با مطربہ زہرہ نہاوی دارم
گر لبم نالہ بہنجار سراید چہ عجب
شیوهٔ وارد و من معتقد خوی ویم
شوقم از رنجش او گر بفزاید چہ عجب

پھر اسی "رہزن تمکین و ہوش" مطربہ زہرہ نہاد اور بت "چمن سامان" کے بارے میں کہتے ہیں:

چمن سامان بتی دارم کہ دارد وقت گل چیدن
خرامی کز ادائے خویش پر گل کردہ دامان را
چو غنچہ جوش صفائی تنش ز بالیدن
دریدہ برتن نازک قبائے تنگش را

نسخہ فوجدار (ف) نوشتہ صفر 1237 کے یہ اشعار بھی لائق توجہ ہیں:

اگر وہ سرو جان بخش خرام ناز آ جاوے
کف ہر خاک گلشن شکل قمری نالہ فرسا ہو
بہ یاد قامت اگر ہو بلند آتش غم
ہر ایک داغ جگر آفتاب محشر ہو
صدف کی ہے ترے نقش قدم میں کیفیت

سرشک چشم اسد کیوں نہ اس میں گوہر ہو
جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم
میں معتقد فتنہ محشر نہ ہوا تھا

یہی وہ سرو قامت محبوبہ ہے جسے حوران بہشت اور خوبان روزگار پر ترجیح دیتے ہیں:

نخواہم از صف حوران زصد ہزار یکی
مرا بس است زخوبان روزگار یکی

اسی محبوبہ دل نواز کا سراپا لکھتے ہوئے، اس کی کافرادای، بالا بلندی، کوتہ قبای، مینو لقای، غافل نوازی، عاشق ستای، زردشت کیشی، آتش پرستی اور زمزمہ سرای کا ذکر کرتے ہوئے اس کا حسن، اس کی موسیقی، اس کا مزاج، اس کی تابش تن اور اس کی دائیں بیان کرتے ہیں۔ یہ اس عورت کا جسمانی اور ذہنی سراپا ہے جس کی زلف پر خم کے غالب اسیر ہوئے تھے۔ ملاحظہ ہو:

تابم ز دل برد کافر ادائے — بالا بلندے کوتہ قبائے
از خوے ناخوش دوزخ نہیبے — وز روے دل کش مینو لقائے
درد دیر گیری غافل نوازے — در زود میری، عاشق ستائے
زردشت کیشے، آتش پرستے — برسم گذارے، زمزم سرائے
چون مرگ ناگہ بسیار تلخے — چون جان شیرین اندک وفائے
درکام بخشی ممسک امیرے — در دلستانی میرم گدائے
گستاخ سازے پوزش پذیرے — طاقت گدازے صبر آزمائے
در کینہ درزی تفسیدہ دشتے — در مہربانی بستان سرائے
از زلف پرخم مشکین نقابے — از تابش تن زرین ردائے
در عرض دعوئ لیلی نکو ہے — بر رغم غالب مجنوں ستائے

ایک اور غزل میں اس مغاں شیوہ محبوبہ سے اپنے آغاز عشق کی داستان سناتے ہیں جب اس مغنی آتش نفس "شوخ اور شیریں حرکات" مطربہ سے محبت کرتے تھے اور ابھی خود اس کے محبوب نہ ہوئے تھے۔ اس "نادان صنم" کا حال انہی کی زبان سے سنئے:

نادان صنم من روش کار نداند — بر ہر کہ کند رحم، سر از بار نداند
بی دشنہ و خنجر. نبود معتقد زخم — دلہاے عزیزاں، بہ غم افگار نداند
برتشنہ لب بادیہ سوزد دلش از مہر — اندوہ جگر تشنہ دیدار نداند
گویم سخن از رنج و براحت کندش طرح — روز سیہ از سایہ دیوار نداند
دل رانجم آتش کدہ راز نہ سنجد — دم را بہ تف نالہ شرر بار نداند

عنوان ہوا داری احباب نہ بیند — پایان ہو سناکی اغلار نداند
دشوار بود مردن و دشوار تراز مرگ — آنست کہ من میرم و دشوار نداند
دانم کہ ندانست و ندانم کہ غم من — خود کم تر از آنست کہ بسیار نداند
از ناکسی خویش چہ مقدار عزیزم — در مردہ خوارم کند و خوار نداند

پھر اس نادان محبوبہ کو راست مخاطب کرتے ہوئے کبھی اس کے نقش۔ کف پا کی تعریف کرتے ہیں اور کبھی اس کے گریبان کو رونق صبح بہار کہتے ہیں:

اے گل! از نقش کف پاے تو دامان ترا
گلفشان کردہ قبا سرو خرامان ترا
تاز خون کہ ازیں پردہ شفق باز دمد
رونق صبح بہار است گریبان ترا

کبھی آئینہ خانے میں اسکا جلوہ وہ نقشہ پیدا کرتا ہے جو شبستان میں آفتاب نکلنے پر نظر آتا ہے۔ کبھی اپنی "ناہید" کی تمثال کا سیمابی جلوہ دیکھتے ہیں تو سینکڑوں ذرے دیدہ ہائے خاک کے مانند' پر افشاں نظر آتے ہیں۔ کبھی اس کے نقش قدم میں "خیاباں خیاباں ارم" اور سرو قامت میں قیامت کا فتنہ' مگر ایک قد آدم کمی کے ساتھ نظر آتا ہے اور کبھی اس "محو آئینہ داری" کو بڑی تمناؤں سے دیکھتے ہوئے اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں: 10۔

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جولے نے
کرے جو پرتو خورشید عالم شبنمستاں کا
یہ کس ناہید کی تمثال کا ہے جلوہ سیمابی
کہ مثل دیدہ ہائے خاک' آئینے پر افشاں ہیں

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں — خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں
ترے سرو قامت سے اک قد آدم — قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
تماشا کر اے محو آئینہ داری! — تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

ساتھ ہی اس کی آرایش کو دیکھ کر دل میں اندیشہ ہائے دور و دراز بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اپنی گرفتاری کا بھی احساس ہے اور قوت پرواز کا بھی اندازہ ہے۔ حسرت ناز کے بجائے "ناز کھینچنے" کی بھی آرزو ہے۔

تو اور آرایش خم کاکل — میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز
لاف تمکیں فریب سادہ دلی — ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز
ہوں گرفتار الفت صیاد — ورنہ باقی ہے طاقت پرواز
وہ بھی دن ہوں کہ اس ستم گر سے — ناز کھینچوں بجائے حسرت ناز
نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں — جس کے مژگاں ہوئی نہ ہو گل باز

اے ترا غمزہ یک قلم انگیز! اے ترا ظلم سر بسر انداز!
تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو ریزش سجدہ ہائے اہل نیاز
نگہ التفات سوے اسد میں غریب اور تو غریب نواز

اس محبت کے دور میں' آغاز الفت کے زمانے میں اپنی محبوبہ کو ایک منظوم خط لکھتے میں جس میں تعریف بھی ہے اور شکایت بھی:

زہے باغ و بہار جان فشانان! غمت چشم و چراغ راز دانان
بصورت اوستاد دل فریبان بمعنی قبلہ نا مہربانان
چمن کوے ترا از رہ نشینان ختن موے ترا از باد خوانان
بلایت چہرہ با مشکینہ مویان ادایت چہرہ بر نازک میانان
غمت را بختیاں زنار بندان گلت را عندلیبان بید خوانان
وصالت جان توانا ساز پیران خیالت خاطر آشوب جوانان
دل دانش فریبت را بگردن وبال رونق جادو بیانان
غم دوزخ نیست را بدامن گداز زہرۂ آتش زبانان
میانت پاے لغز موشگافان دہانت چشم بند نکتہ دانان
دل از داغت بساط گل فروشان تن از زحمت رواے باغبانان
سگ کوی ترا از کاسہ لیسی لب پر دعوی شیریں دہانان
سر راہ ترا در خاک روبی نسیم پرچم گیتی ستانان
بہ پشتی بانی لطف تو امید قوی ہمچون نہاد سخت جانان
ببالا دستی' عفو تو عصیان زبوں ہمچوں نشست نا توانان
زناحق کشتگان راضی بجانت کہ غالب ہم یکی باشد ازانان

اس غزل میں اپنی مغاں شیوہ محبوبہ کے انداز دلربایانہ اور اوصاف معشوقانہ بیان کرتے ہوئے اس کے مزاج کے تضادات بھی بیان کیے ہیں۔ وہ باغ و بہار جانفشاناں ہے اور اس کا غم چشم و چراغ راز داناں۔ دیکھنے میں تو اوستاد دل فریباں ہے لیکن حقیقت میں قبلہ نا مہرباناں۔ اس کا کوچہ رہ نشینوں کے لیے چمن ہے اور موے سیاہ ختن کے مانند معطر۔ سیاہ زلفوں والی حسینائیں اسے دیکھ کر جلتی اور عنادل اس کے گل رخسار پر زمزمہ سنجی کرتی ہیں۔ وہ ایسی حسینہ ہے جس کا وصل "توانا ساز پیران" ہے اور جس کا خیال جوانوں کے لیے "خاطر آشوب"۔ اس کے سامنے جادو بیانوں کی دانش مندی ختم ہو جاتی ہے اور آتش زبانوں کے پتے پانی ہو جاتے ہیں۔ اس کی کمر "موشگافوں" کے پیروں میں لغزش پیدا کر دیتی ہے اور اس کی گفتگو بڑے بڑے نکتہ دانوں کو چپ کرا دیتی ہے۔ کتنے ہی لوگ ہیں جن کے داغ دار دل' بساط گل فروش بنے ہوئے ہیں اور جن کے زخمی دل' باغبانوں کی پھولوں سے

بھری ہوئی چادر نظر آتے ہیں۔ بادشاہوں کے پرچموں سے نکلی ہوئی نسیم' اس کی گلی میں خاک روبی کرتی ہے اور اس کی مہربانی سے امید' سخت جانوں کے دلوں کے لیے قوی اور مضبوط ہو جاتی ہے۔ آخر میں کہتے ہیں کہ ان "ناحق کشتگاں" میں جو تیرے لیے خوشی سے جان دیتے ہیں' ایک شخص اور بھی ہے' جسے غالب کہتے ہیں۔ وہ بھی تجھ سے محبت کرتا اور تیرا ہی مارا ہوا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ایک طرف "عیسی مہربان" کے مانند محبوبہ تھی اور دوسری طرف "طبع الم خیز" درد آفرینی میں مشغول تھی۔ زندگی کش مکش کے ایک عجیب و غریب دور سے گذر رہی تھی:

عیسی مہربان ہے شفاء ریز یک طرف
درو آفرین ہے طبع الم خیز یک طرف
مفت دل و جگر خلش غمزہ ہائے ناز
کاوش فروشی مژۂ تیز یک طرف
ہر موبدن پہ شہپر پرواز ہے مجھے
بے تابی دل تپش انگیز یک طرف
یک جانب اے اسد غم فرقت کا نیم ہے
دام ہوس ہے زلف دل آویز یک طرف

یہ وہ زمانہ ہے جب غالب ہی نہیں غالب کا عشق بھی شباب پر ہے اور اب وہی نہیں ان کی محبوبہ بھی ان سے محبت کرنے لگی ہے۔ اس زمانے کی داستان شوق اس طرح سناتے ہیں۔

شدم سپاس گذار خود از شکایت شوق ۔۔۔ زہے زمن بدل بیغمش سرایت شوق
ببرم بادہ گریباں کشودنش نگرید ۔۔۔ خوشا بہانہ مستی' خوشا رعایت شوق
ہر آں غزل کہ مرا خود بخاطر است ہنوز ۔۔۔ بیانگ چنگ ادا ی کند بغایت شوق
دخاں ز آتش یاقوت' گردمد عجب ست ۔۔۔ عجب تراست ازیں بر لبش حکایت شوق
غلط کند رہ و آید بہ کلبہ ام ناگاہ ۔۔۔ صنم فریب بود' شیوۂ ہدایت شوق
متاع کاسد اہل ہوس بہم ہر زن ۔۔۔ کنوں کہ خود شدۂ شحنہ ولایت شوق
بخود مناز و بہ آموز گار ہم بپزیر ۔۔۔ من و نہایت عشق و تو و ہدایت شوق

وہ اپنی محبوبہ کی طرف سے شکایت شوق پر سپاس گذار ہیں کیونکہ اب ان کی محبوبہ کے دل میں ان کی محبت نے گھر کرلیا ہے۔ وہ محبت کے جذبہ سے سرشار ہو کر بزم شراب میں مستی و مدہوشی کا بہانہ کر کے آتی اور بندوق کا وار کر دیتی ہے۔ اپنے چنگ پر وہ غزل سناتی ہے جو ابھی شاعر (غالب) کے ذہن ہی میں ہے اور لکھی نہیں گئی یعنی خود عاشق ہو کر عاشق کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔ یہ محبت کا جذبہ ہی تو ہے جس نے یہ کیفیت پیدا کر دی ہے۔ غالب یہ کیفیت دیکھ کر حیران رہ جاتے اور کہتے ہیں کہ اگر آتش یاقوت سے دھواں روشن ہو جائے تو

حیرت نہ کرو۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ میری محبوبہ کے ہونٹوں پر میری محبت کی داستان ہے۔ وہ اچانک میرے جھونپڑے میں "راستہ بھول" کر آتی ہے۔ عشق کی رہنمائی کو دیکھو کس قدر صنم فریب ہے! اے میری محبوب! اب چونکہ تو خود "شحنۂ ولایت شوق" ہے اس لیے اہل ہوس کی متاع کاسد کو تباہ کر دے۔

لیکن اے میری محبوب! غرور نہ کر۔ میں جو کہتا ہوں' اسے مان لے کیونکہ میرا عشق انتہا کو پہنچا ہوا ہے اور تیری محبت کی فقط ابتداء ہے۔

اور اب دو نوجوان دلوں میں محبت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ غالب خود اپنے دل کی کیفیت اس طرح بیان کرتے ہیں:

سینہ بکشودیم و خلقے دید کاینجا آتش است
بعد ازین گویند' آتش را کہ گویا آتش است

انتظار جلوۂ ساقی کبابم می کند
مے بساغر آب حیوان و بہ مینا آتش است

گریہ ات' در عشق از تاثیر دود آہ ماست
اشک در چشم تو آب و در دل ما آتش است

ای کہ می گوی تجلی گاہ نازش دور نیست
صبر مشتی از خس و ذوق تماشا آتش است

دوسری طرف محبوبہ کے دل میں محبت کی آگ جل رہی ہے۔ دود آہ کے باعث اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ یہ آنسو محبوبہ کی آنکھوں میں پانی کے قطرے ہیں لیکن غالب کے دل میں آگ لگا دیتے ہیں۔ اس لیے وہ کسی ہمدرد اور غم گسار دوست کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ تم کہتے ہو کہ اس کی تجلی گاہ شوق دور نہیں۔ مانا۔ مگر یہ بھی تو سمجھ لو صبر مشت خس ہوتا ہے۔ اور ذوق تماشا آگ' جو ایک لمحہ میں صبر و سکون کا سرمایہ غارت کر دیتی ہے۔

یہ دور غالب کی زندگی میں انتہائی ہیجانی دور ہے۔ راتوں میں کبھی آہیں ہیں' کبھی خاموشی' انتظار ہے' اضطراب ہے' بے چینی ہے اور تڑپ ہے' کسی پہلو چین نہیں' کسی پہلو آرام نہیں' ایک ایسی ہی رات کا ذکر ہے:

جنون محمل بہ صحرائے تحیر راندہ است امشب
نگہ در چشم و آہم در جگر واماندہ است امشب

بہ ذوق وعدہ' سامان نشاطے کردہ' پندارم
ز فرش گل' بروے آتشم' بنشاندہ است امشب

بقدر شام ہجرانش' درازی باد عمرش را
فلک نیز از کواکب سبحہ ہا گردانده است امشب

بخواہم ی رسد بند قبا وا کرده از مستی
ندانم شوق من بروے چہ افسون خوانده است امشب

خوش است افسانہ درد جدای مختصر غالب
بہ محشری توان گفت آنچہ در دل مانده است امشب

غالب کو اپنی محبوبہ کے آنے کا انتظار ہے' اس نے وعدہ کیا ہے' آنے کا۔ وہ سامان نشاط فراہم کرتے اور پھولوں کی سیج آراستہ کرتے ہیں لیکن اس کی غیر موجودگی میں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پھولوں کی سیج پر نہیں' آگ پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ جنون محبت نے عالم تحیر میں پہنچا دیا ہے۔ نگہ آنکھوں میں اور آہ جگر میں ٹھہر گئی ہے۔ اپنی محبوبہ کو دعائیں دیتے ہیں کہ اس کی عمر کو درازی شب ہجراں نصیب ہو۔ آسمان بھی ستاروں کی تسبیح لیے سبحہ گردانی میں مشغول ہے۔ ایسی حالت میں (عالم تصور میں) محبوبہ بند قبا وا کیے ہوئے آتی ہے اور غالب حیران ہو کر سوچنے لگتے ہیں کہ آخر میری محبت نے ایسا کون سا فسوں پڑھ دیا' جس کے باعث میری محبوبہ بند قبا وا کیے ہوئے میرے پاس چلی آئی ہے۔ آخر میں کہتے ہیں۔ یہ افسانہ درد جدائی مزے دار بھی ہے اور طویل بھی۔ میں نے اسے "مختصرا" بیان کیا ہے۔ آج میں اسے بیان نہیں کرتا۔ قیامت کے روز خدا سے کہوں گا کہ آخر تو نے فراق محبوب کو اتنا طول کیوں دیا تھا۔

اس کے بعد ایک اور فراقیہ غزل میں کبھی موج گل کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی بے قراری اور محبت کا اظہار کرتے ہیں کبھی "طرف جویبار چمن" کبھی داغ لالہ' کبھی آنکھوں اور کبھی رات سے کہتے ہیں:

اے موج گل نوید تماشائے کیستی؟
انگارۂ مثال سراپائے کیستی؟

بیہودہ نیست سعی صبا در کنار ما
اے بوے گل! پیام تمنائے کیستی؟

خون گشتم از تو' باغ و بہار کہ بوده ای
کشتی مرا بغمزہ' مسیحائے کیستی؟

یادش بہ خیر تاچہ قدر سبز بودہ ای
اے طرف جوئبار چمن جاے کیستی؟

از خاک غرقہ کف خونی دمیدۂ ای
اے داغ لالہ! نقش سوید اے کیستی؟

نشنیدہ لذت تو ، فروی رود بدل
اے حرف محو لعل شکر خاے کیستی؟

بانو بہار ایں ہمہ سامان ناز نیست
فہرست کارخانہ یغمائے کیستی؟

از ہیچ غیر نقش نکوئی ندیدہ ای
اے دیدہ! محو چہرہ زیباے کیستی؟

با ہیچ کافر' ایں ہمہ سختی نمی رود
اے شب! برگ من کہ تو فرداے کیستی؟

غالب نواے کلک تو دل ی برد ز دست
تا ، پردہ سنج شیوہ انشائے کیستی؟

محبت کے اس طوفانی دور میں عشق بھی تھا حجاب میں' حسن بھی تھا حجاب میں۔ قدم قدم پر کھٹکے تھے' قدم قدم پر اندیشے تھے۔ کبھی بیم رقیب تھا' کبھی خوف عزیزاں' رسوائیاں تھیں اور بدنامیاں۔ دن تو بہر حال کٹ جاتے تھے لیکن راتیں اپنے ساتھ قیامتیں لاتی تھیں۔ جب فراق کی تاریکیاں محبت کی روشنی کو اندیشوں کے اندھیروں میں چھپا دیتی ہیں۔ اپنی محبوبہ' اپنی جان سے زیادہ عزیز ہستی کے بارے میں شبہات پیدا ہوتے ہیں جن سے بے تابیوں' اضطراب اور وحشت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور پھر جب فراق کی ہر ایک ہی نہیں کئی راتیں ہوں تو کبھی "زبان سوزد" کا معاملہ ہوتا ہے اور کبھی "مغزاستخواں سوزد" کا۔ ان کربناک اور وحشت انگیز راتوں میں سے ایک رات کی داستان یوں بیان کرتے ہیں کہ:

"کل میں تجھے اپنی سیہ بختی کی داستان سنا رہا تھا۔ نظریں آسمان کی طرف تھیں لیکن روئے سخن تیری ہی

طرف تھا۔ کیا تجھے معلوم ہے کہ رات کو تیری وجہ سے محفل خوبان میں لوگوں پر کیا گذری؟ خصوصاً صدر مجلس پر جو تیری ہم پہلو تھی؟ تو نے شمع پر گمان کیا اور غضب ناک ہو کر چلی گئی۔ اس میں شمع کا کوئی قصور نہ تھا۔ یہ تو میری آہ گرم تھی جس نے تیرے مزاج کی پردہ کشائی کی تھی۔ میں اپنی آہ آتشناک سے جنت کو جلا کر خاکستر کر رہا ہوں تاکہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ یہ تیرے کوچے کی ہم سری کا دعویٰ کر رہی تھی۔ باد بہاری کی روش سے یہ گمان ہوتا ہے کہ باغ کے سارے پھول اور کلیاں تیری ہی خوشبوؤں کے قافلے کے پیچھے چل رہی ہیں۔ خدا کرے مرنے کے بعد غالب کی قبر کے اردگرد لالہ و گل کھلتے رہیں تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو سکے کہ اس کے دل میں تجھے دیکھتے رہنے کی کس قدر خواہش تھی:

دوش کز گردش بختم گلہ بر روے تو بود
چشم سوے فلک و روے سخن سوے تو بود

آنچہ شب شمع گمان کردی و رفتی بعتاب
نفسم پردہ کشای اثر خوے تو بود

شب چہ دانی ز تو در مجلس خوباں چہ گذشت
خاصہ بر صدر نشینے کہ بہ پہلوے تو بود

خلد را از نفس شعلہ فشان می سوزم
تا ندانند حریفان کہ سر کوے تو بود

روش باد بہاری بہ گمانم افگند
کاین گل و غنچہ پے قافلہ بوے تو بود

لالہ و گل دمد از طرف مزارش پس مرگ
تا چہا در دل غالب ہوس روے تو بود

لیکن بات صرف اتنی نہ تھی' غالب کی یہ فراقیہ راتیں اور ان میں اس کے دل کی دھڑکنوں کو شاعر نے مستقبل کے لیے اپنی غزلوں میں محفوظ کر دیا ہے ملاحظہ ہو:

نالہ دل میں شب انداز اثر نایاب تھا
تھا سپند بزم وصل غیر جو بے تاب تھا

دیکھتے تھے ہم بچشم خود وہ طوفان بلا
آسمان سفلہ جس میں یک کف سیلاب تھا

اور یہ ایک برسات کی رات تھی' اندھیری رات جس میں شاعر کی بے چینیوں اور اندیشوں کے بادلوں کا ہجوم تھا۔ دل باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن طبیعت پر عجیب دحشت سی چھائی ہوئی تھی:

وان کرم کو عذر بارش تھا عناں گیر خرام

گریہ سے یاں پنبہ بالش کف سیلاب تھا
لے زمیں سے آسماں تک فرش تھیں بے تابیاں
شوخی بارش سے مہ فوارۂ سیماب تھا

جوش یاد نغمہ وساز مطرب سے اسد
ناخن غم یاں سر تار نفس مضراب تھا

اور اب اسی زمانے کی ایک اور بھیگی ہوئی رات کا منظر دیکھئے جس میں شاعر نے اپنی افسردگی و بیتابی اور اندیشہ ہائے دور و دراز کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

شب کہ برق سوز دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلہ جوالہ ہر اک حلقہ گرداب تھا

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجوم اشک سے تار نگہ نایاب تھا

جلوہ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو
یاں رواں مژگان چشم تر سے خون ناب تھا

یاں سر پر شور' بے تابی سے تھا دیوار جو
واں وہ فرق ناز محو بالش کم خواب تھا

یاں نفس کرتا تھا روشن شمع بزم بے خودی
جلوہ گل واں بساط صحبت احباب تھا

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موج رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

ناگہاں اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا
دل کہ ذوق کاوش ناخن سے لذت یاب تھا

واں ہجوم نغمہ ہائے ساز عشرت تھا اسد
ناخن غم یاں سر تار نفس مضراب تھا11۔

اس زمانے میں غالب نے ایک غزل لکھی جس کی ردیف "دوست" ہے۔ یہ غزل نسخہ فوجدار محمد خاں میں ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

برق خرمن زار گوہر ہے نگاہ تیز یاں
اشک ہو جاتے ہیں خشک از گرمی رفتار دوست

ہے سوا نیزے پہ اس کی قامت نو خیز سے

آفتاب صبح محشر ہے گل دستار دوست
اے عدوے مصلحت! چندے بہ ضبط افسردہ رہ
کردنی ہے جمع تاب شوخی دیدار دوست
لغزش مستانہ و جوش تماشا ہے اسد
آتش مے سے بہار گرمی بازار دوست

نسخہ شیرانی میں یہی غزل تھوڑی سی ترمیم اور چند اشعار کے اضافوں کے ساتھ اس طرح ملتی ہے:

عشق میں بیداد رشک غیر نے مارا مجھے
کشتہ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمار دوست
چشم ما روشن کہ اس بے درد کا دل شاد ہے
دیدۂ پر خوں ہمارا ساغر سرشار دوست

(ق)

غیر یوں کرتا ہے میری پرسش اس کے ہجر میں
بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غم خوار دوست
تاکہ میں جانوں کہ ہے اس کی رسائی واں تلک
مجھ کو دیتا ہے پیام وعدۂ دیدار دوست
جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعف دماغ
سر کرے ہے وہ حدیث زلف عنبر بار دوست
چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیان شوخی گفتار دوست
مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجیے
یاں بیان کیجیے سپاس لذت آزار دوست
یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے اب
ہے ردیف شعر میں غالب زبس تکرار دوست12۔

اس میں لفظ "اب" خاص طور سے توجہ کا مستحق ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقطع محبوبہ کی وفات کے کچھ ہی عرصہ بعد لکھا گیا' جب مرزا اسد تخلص چھوڑ کر غالب تخلص اختیار کر چکے تھے لیکن جیسا کہ اس سے قبل بتایا جا چکا ہے محبوبہ غالب کی محبوبیت مرنے سے پہلے غالب کے عشق میں بدل گئی تھی۔ یہ برق تمثال محبوبہ' یہ مطربہ دل نواز' غالب کے ماتم خانے کو اپنی شمع حسن سے منور کرنے گی تھی اور اب شاعر کی اندھیری راتوں میں صبح تک روشنی رہتی تھی۔

ایک ایسی ہی صبح مسرت کی داستان غالب کی زبان سے سنئے جب وہ اپنی دل نواز محبوبہ کو مخاطب کرتے ہیں۔ انداز تخاطب کی نرمی اور لطافت خاص طور سے توجہ کی مستحق ہے:

سحر دمیدہ و گل درد میدنست مخسپ — جہاں جہاں گل نظارہ چیدنست مخسپ
مشام را بہ شیم گلے نوازش کن — نسیم غالیہ سادر وزیدن ست مخسپ
زخویش حسن طلب بین در صبوحی کوش — مے شبانہ زلب در چکیدنست مخسپ
ستارۂ سحری مژدہ سنج دیداریست — بہ بیں کہ چشم فلک در پریدنست مخسپ
تو محو خواب و سحر در تاسف از انجم — بہ پشت دست بدنداں گزیدنست مخسپ
نشاط گوش بر آواز قلقل ست بپا — پیالہ چشم براہ کشیدنست مخسپ
بذکر مرگ شبی زندہ داشتن ذوقیست — گرت فسانہ غالب شنیدنست مخسپ

دیکھا آپ نے؟ غالب نے کس قدر حسین منظر کھینچا ہے اور کس طرح اپنی مست خواب محبوبہ کو جگا رہے ہیں۔ میری محبوب! نہ سو، صبح ہو گئی ہے، کلیاں کھل رہی ہیں، ہر طرف حسین نظاروں کے پھول بکھرے ہوئے ہیں، یہ پھول چن لینے کے قابل ہیں۔ اپنی مشام جاں کو خوشبوؤں سے معطر کر لو، نسیم عطر بیزی کر رہی ہے۔ ذرا اپنی طرف سے حسن طلب تو دیکھو۔ رات کی شراب ہونٹوں سے ٹپک رہی ہے۔ اور صبوحی طلب ہے، دیکھو چشم فلک یعنی ستارۂ سحری "مژدہ سنج دیدار" ہے۔ اب وہ رخصت ہو رہا ہے۔ سنو! میری محبوب سنو! تم اپنے خواب ناز میں مست ہو اور سحر ڈوبتے ستاروں پر افسوس کر رہی ہے۔ مسرت قلقل مینا پر گوش بر آواز ہے اور پیالہ چشم براہ۔ اسے اپنے ہونٹوں سے لگا لو۔ اور اگر تمہیں غالب سے اس کا افسانہ محبت سننا ہے تو اٹھو گذری ہوئی رات کا دلکش افسانہ سنو۔

دیکھئے اس غزل میں، اس بھگوری میں، کتنی تازگی ہے، کتنی آسودگی ہے اور کتنی کیف انگریزی! شاید ایسی ہی کس صبح کی کیفیت اپنی اردو غزل کے اس شعر میں بھی بیان کی ہے۔ کہتے ہیں:

گل کھلے، غنچے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی
سر خوش خواب ہے وہ نرگس مخمور ہنوز

اور اب غالب کی زندگی میں وہ دور آگیا جب وہ مغنی آتش نفس، وہ مطربہ رہزن تمکین و ہوش، وہ بت غالیہ مو اور وہ بانوے مغاں شیوہ خود غالب سے والہانہ اور مجنونانہ محبت کرنے لگی اور بقول غالب انہیں اپنی بے کسی کی داد مل گئی:

دل لگا کر لگ گیا ان کو بھی تنہا بیٹھنا
بارے اپنی بے کسی کی ہم نے پائی داد یہاں

لیکن یہ والہانہ شیفتگی دیکھ کر خود غالب حیران ہیں اور جب اس کی طرف سے بے تابانہ اظہار عشق ہونے لگا تو خود ہی سوال کرتے ہیں:

ظالم! تو وشکایت عشق؟ این چہ ماجراست!
بارے ممن مگو' کہ ولت داد خواہ کیست؟

نیرنگ عشق' شوکت رعنائی تو برد
در طالع تو گروش چشم سیاہ کیست؟

با این ہمہ شکست درستی اداے اوست
رنگ رخت' نمونہ طرف کلاہ کیست؟

با تو' بہ پند' حرف بہ تلخی گناہ من
با من عشق غلبہ دعوئی گناہ کیست؟

غالب کنون کہ قبلہ او کوے دلبر است
کے ی رسد بدین کہ دلش سجدہ گاہ کیست؟

انہیں حیرت ہے کہ جس محبوبہ' جس ظالم کے فراق میں راتیں تڑپ تڑپ کر گذارتے تھے اب وہی ان کے لیے بے چین ہے۔ جس سے اظہار محبت کرتے تھے اب اسی کی طرف سے اظہار محبت ہو رہا ہے۔ وہ تجاہل سے کام لیتے ہوئے سوال کرتے ہیں کہ آخر وہ کون ظالم ہے جس سے تجھے عشق ہو گیا ہے اور وہ کون خوش نصیب ہستی ہے جس سے داد خواہی چاہی جا رہی ہے؟ بھئی! یہ عشق کا جادو بھی خوب ہے' جو حسن سے اس کی ساری شان و شوکت چھین لے گیا اور اب اس کے پاس ناز کے بجائے صرف نیاز رہ گیا ہے۔ وہ پوچھتے ہیں کہ آخر وہ کس حسین کی چشم سیاہ ہے جس نے تجھے شکار کر لیا ہے۔ میں نے نصیحت کی اس قدر بے تابی کا اظہار نہ کرو سب کے سامنے اظہار محبت نہ کرو ہماری محبت کا راز غیروں پر کھل جائے گا' ہنگامے برپا ہوں گے۔ میں نے مانا میری باتوں میں تلخی تھی' مانا کہ اس میں میرا قصور تھا لیکن یہ بھی تو کہو میرے ساتھ اس قدر شدت سے محبت کرنے میں کس کا قصور ہے میرا یا تمہارا؟ لیکن اس پروانہ وار محبت کرنے والی محبوبہ کے پاس' جواب میں "یک نگہ' یک خندۂ دزدیدہ یک تابندہ اشک" کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ دیوانہ وار آتی' پروانہ وار اپنی شمع کے گرد گھومتی ہے اور آخر کار اپنی جان قربان کر دیتی ہے۔

ایک بڑی حسین غزل میں غالب نے اپنی اور اس کی حالت کو بڑے کیف انگیز پیرائے میں بیان کیا ہے جس کا لفظ لفظ محبت اور مسرت کی غمازی کرتا ہے:

گفتم' زشادی نبوم گنجیدن آسان در بغل
تنگم کشید از سادگی در وصل جانان در بغل

نازم خطر ورزیدنش وان ہرزہ دل لرزیدنش
چینے بہازی بر جبین وستی بدستان در بغل

آہ از تنک پیراہنی کافزون شدش تر دامنی

تاخوی برون داد از حیا گردید عریان در بغل

دانش مے در باختہ' خود را زمن شناختہ
رخ در کنارم ساختہ از شرم پنہاں در بغل

تا پاس دارد خویش رائے در گریبان ریختی
ختی چو رنجی زان میش گل از گریبان در بغل

گاہم بہ پہلو خفتہ خوش' بستی لب از حرف و سخن
گاہم بیازو ماندہ سر' سودی زنخدان در بغل

ناخواند آمد صبح گہ بند قبایش بے گرہ
واندر طلب منشور شہ نکشودہ عنوان در بغل

مے خوردہ در بستان سرا' مستانہ گشتی سو بسو
خود سایہ او را ازو صد باغ و بستان در بغل

چون غنچہ دیدی در چمن گفتی بہ گلبان کت زمن
چون رفتہ ناوک از جگر چون ماندہ پیکان در بغل

ہاں غالب خلوت نشین بیکے چنان عیشے چنین
جاسوس سلطان در کمین مطلوب سلطان در بغل

کہتے ہیں میں نے اپنی محبوبہ سے کہا کہ میں اس قدر خوش ہوں کہ مسرت کے باعث کسی کے پہلو میں نہیں سما سکتا۔ یہ سن کر میری بھولی محبوبہ نے انتہائی بھولے پن سے مجھے خوب بھینچ کر اپنی آغوش میں لے لیا۔ مجھے فخر ہے کہ وہ خطرات کی پروا نہیں کرتی اگرچہ اس کا دل لرزتا رہتا ہے۔ وہ مجھے چھیڑنے کے لیے شرارت سے تیوریوں پر بل ڈالتی ہے اور حیلہ جوی سے بغلوں میں ہاتھ چھپالیتی ہے۔ آہ وہ اس کا نازک اور باریک لباس جس کے باعث تردامنی میں اضافہ ہو جاتا ہے جب وہ پہلو میں عریاں ہوئی تو شرم سے پسینہ میں شرابور ہو گئی۔ میری محبوبہ جب میرے پاس آئی تو نشے میں چور تھی' ہوش و حواس گم تھے۔ اس وقت وہ مجھ میں اور اپنے آپ میں امتیاز نہ کر سکتی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ شرم سے میری آغوش میں چھپا لیا۔ اس کی عجیب حالت تھی۔ کبھی ہوشیار رہنے کے لیے گریبان میں شراب انڈیل لیتی اور کبھی نشے سے مدہوش ہو کر اس کی حالت ایسی ہو جاتی تھی جیسے مسلے جانے پر پھول کی حالت ہو جاتی ہے۔

کبھی وہ انتہائی مستی اور سرور کے عالم میں مطمئن اور آسودہ' میرے پہلو میں لپٹ جاتی اور زبان سے ایک حرف نہ نکالتی' کبھی میرے بازو پر سر رکھتی اور کبھی اپنے زنخدان کو میری بغل میں ملتی تھی۔

اور اب غالب ایک عجیب و غریب واقعہ کا انکشاف کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی محبوبہ' ستم پیشہ ڈومنی' بت مغاں شیوہ' رہزن تمکین و ہوش مطربہ کی رسائی شاہی محفلوں تک تھی۔ کہتے ہیں کہ ایک روز

صبح صبح میری محبوبہ میرے پاس آئی۔ اس کی قبا کے بند کھلے ہوئے تھے۔ بغل میں بادشاہ کی طرف سے طلبی نامہ تھا لیکن ان کھلا۔ غالب اسے دیکھ کر حیران ہو جاتے ہیں "جاسوس سلطان" کا خیال آتا ہے' بدنامی کا اندیشہ ہے' بادشاہ کے عتاب کا خوف ہے' مطلوب سلطان یعنی اپنی محبوبہ کا بھی خیال ہے۔ "بیم چناں عشق چنیں" سے دو متضاد کیفیات کا اظہار ہوتا ہے جس میں خوف کے ساتھ احساس فخر بھی ہے اور مسرت بھی کہ اس نے مجھے بادشاہ پر ترجیح دی ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ بادشاہ کون تھا جس کی مطلوب یہ ستم پیشہ ڈومنی اور مطربہ دل نواز تھی جس کے لیے شاہی جاسوس لگے رہتے تھے؟

دہلی کے تخت پر 1806/1221 سے 1837/1253 تک ابوالنصر معین الدین اکبر شاہ (ثانی) متمکن رہے۔ 12۔ غالب کی محبت اسی دور میں پروان چڑھی۔ بادشاہ کی عمر اس وقت ساٹھ سال کے قریب تھی۔ دربار پر ڈوم ڈھاری اور خواجہ سرا قابض ہو چکے تھے۔ شمشیر و سناں کے بجائے طاؤس و رباب کا ہنگامہ برپا رہتا تھا جس میں غالبًا اس نوجوان مطربہ شیریں ادا کو بھی طلب کیا جاتا تھا۔

بہرحال غالب کی زندگی کا یہ بہترین دور تھا جب ان کی محبوبہ ان کے ہمسائے میں رہتی تھی۔ جب ان کی کامرانی اور شادمانی کا دور تھا اور جب انہیں بقول ان کے فکر دنیا میں سر نہیں کھپانا پڑتا تھا اور بقول ان کے یہ وہ زمانہ تھا جب:

ادھر متھرا داس سے قرض لیا' ادھر درباری مل کو جا مارا' ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی۔ ہر ایک کے پاس تمسک مہری موجود' شہد لگاؤ چاٹو' نہ مول نہ سود۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ روٹی کا خرچ پھوپی کے سر۔ بااینہمہ کبھی خان (احمد بخش) نے کچھ دے دیا' کبھی الور سے کچھ دلوا دیا' کبھی ماں نے آگرے سے کچھ بھیج دیا۔" 13۔

دن عید اور رات شب برات تھی' ایک والہانہ محبت اور مسرت کا دور۔ عیش بافراغت کے مزے تھے لیکن مسرت کی لافانی ساعتیں بھی غم جدائی اور الم فراق میں بدل جاتی ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ مغنی آتش نفس' یہ عشق پیشہ محبوبہ' اپنے محبوب (غالب) سے مل نہیں سکتی راستہ میں رکاوٹیں ہی رکاوٹیں ہیں۔ غالب شادی شدہ ہیں ایک "معزز" گھرانے میں ان کی شادی ہوئی ہے۔ (حالانکہ اس دور میں اس طبقہ کی ہوس کاریاں عام تھیں)۔ محبوبہ "مطلوب سلطان" ہے' کوتوال شہر کا بھی خوف ہے اور "جاسوس سلطان" کا بھی۔ کھل کر ملاقات نہیں ہو سکتی' چوری چھپے ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ غالب اپنی محبوبہ کی اس قلبی حالت کو یوں بیان کرتے ہیں:

کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے بسوز دل
درد جدائی اسد اللہ خان نہ پوچھ

آپ فعل کی تذکیر کے بارے میں نہ سوچئے۔ یہ تو غزل کی روایتی زبان ہے' جس میں غالب ایک واقعہ بیان کر رہے ہیں جس سے ان کی محبوبہ کی دلی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ محبت کے دن اور محبت کی راتیں اس طرح

مسرت اور الم کے درمیان گذر رہی تھیں۔ اس محبت کے چرچے ہونے لگے تھے کہ ایک رات' معلوم نہیں کیا واقعات پیش آئے' کون سے انکشافات ہوئے' کیسے ہنگامے برپا ہوئے' کن مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا' لوگوں نے کیا کہا اور کیا کیا کہ "یہ مہتاب شب جمعہ ماہ رمضان" یہ محبوبہ غالب نواز' "شرم رسوائی" اور الفت کی پردہ داری کرنے کے لیے نقاب خاک میں جا کر چھپ گئی اور غالب کی نظر میں دنیا تاریک ہو گئی' زندگی بے معنی ہو گئی' آنکھوں سے جوے خون بہنے لگی جس میں قلم ڈبو کر غالب نے ایک مرثیہ لکھا۔

آج غالب کی محبوبہ اور اس کے بعد وہ خود بھی دنیا سے رخصت ہو کر پیوند زمین ہو چکے ہیں لیکن یہ درد ناک داستان محبت ابھی تک ان کی کلیات میں محفوظ ہے:

سر چشمہ خون است ز دل تا بہ زبان ہاے
دارم سخنی با تو و گفتن نتوان ہاے

سیرم نتوان کرد ز دیدار نکویان
نظارہ بود شبنم و دل ریگ روان ہاے

ذو قیست درین مویہ کہ بر نعش مشتی
با دل شدۂ ہیچ مگوے ہمہ دان ہاے

در خلوت تابوت نرفتست ز یادم
بر تختہ در دوختہ چشم نگران ہاے

اے فتوی ناکامی مستان کہ تو باشی
مہتاب شب جمعہ ماہ رمضان ہاۓ

باد آور ناگفتہ شنو رفت حوالت
دردے کہ بگفتن نہ پزیرفت گران ہاے

از جنت و از چشمہ کوثر چہ کشاید
خون گشتہ دل و دیدۂ خون نابہ فشان ہاے

در زمزمہ از پردۂ و ہنجار گزشتیم
رامشگری شوق بہ آہنگ فغان ہاے

سیماب تنی کز رم برق ست نہادش
گردیدۂ مرا مایہ آرامش جان ہاے

غالب بدل آویز کہ در کارگہ شوق
نقشی ست درین پردہ بصد پردہ نہان ہاے

لیکن یہ داستان محبت' محبوبہ کا یہ مرثیہ' غالب نے فارسی ہی میں نہیں اردو میں بھی ہمارے لیے محفوظ کر

دیا ہے۔ چنانچہ اسے نسخہ فوجدار محمد خاں شیرانی سے نقل کیا جاتا ہے۔ دیکھئے تو اس سے کیسے کیسے رازوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس خفیہ محبت کا راز آشکارا ہو گیا تھا۔ شاہی سزا کا خطرہ اس کے لیے بھی تھا اور اس کے محبوب غالب کے لیے بھی۔ اس لیے عشق نے حسن کے لیے قربانی دی اور غالب کی محبوبہ نقاب خاک میں پناہ لے کر اپنی محبت کے انمٹ نشان چھوڑ گئی۔ ملاحظہ ہو غالب نے اس کی وفات پر اپنے احساسات کس طرح پیش کیے ہیں:

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے!
کیا ہوی ظالم! تری غفلت شعاری ہائے ہائے!

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوب غم کا حوصلہ
تم نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری ہائے ہائے!

کیوں مری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال
دشمنی اپنی تھی، میری دوست داری ہائے ہائے!

عمر بھر کا تو نے پیان وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے!

شرم رسوائی سے جا چھپنا نقاب خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے!

گلفشانیہاے ناز جلوہ کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تری لالہ کاری ہائے ہائے!

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہواے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اسے ناساز گاری ہائے ہائے!

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخم کاری ہائے ہائے!

خاک میں ناموس پیان محبت مل گئی
اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسم یاری ہائے ہائے!

کس طرح کاٹے کوئی شبہاے تار برشگال
ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہاے ہاے!

گوش مہجور پیام و چشم محروم جمال
ایک دل تسپر یہ نا امید داری ہائے ہائے!

گر مصیبت تھی تو غربت میں اٹھا لیتے اسد

میری دلی ہی میں ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے!

حاتم علی مہر کو اسی محبوبہ عشق پرور کے بارے میں "چنا جان نہ سہی مناجان سہی" 14۔ لکھ کر تفریحی پیرائے میں مہر کا غم غلط کرنا اور غم دوست کو فراموش کرانا مقصود تھا۔ ورنہ اس نظم کا ایک لفظ اس درد کی ترجمانی کر رہا ہے جو غالب کے دل کو تڑپا رہا تھا اور جس کے باعث ان کا جی اس زمانے میں زندگی سے بھی بیزار ہو گیا تھا۔ چنانچہ کہتے ہیں:

مجھ سے مت کر' تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی
زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے

غالب کی داستان محبت کے سلسلہ میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ غالب نے اپنی غزلوں میں کہیں تو اپنے جذبات کی ترجمانی کی ہے اور کہیں اپنی محبوبہ کے جذبات کی' اسی قسم کی ایک غزل میں محبوبہ سے اس کی درد بھری داستان سنیئے۔

بیا و جوش تمنائے دیدنم' بنگر — چو اشک' از سر مژگان چکیدنم بنگر
زمن بجرم تپیدن کنارہ ی کردی — بیا بہ خاک من و آرمیدنم بنگر
گذشتہ کار من از رشک غیر شرمت باد — بہ بزم امن تو خود راندیدنم بنگر
دمید دانہ و بالید و آشیان گہ شد — در انتظار ہما دام چیدنم بنگر
نیاز مندی حسرت کشان نمی دانی — نگاہ من شو و دزدیدہ دیدنم بنگر
اگر ہوائے تماشائے گلستان داری — بیا و عالم در خون تپیدن بنگر
بداد من نہ رسیدی ز زرد جان دادم — بداد طرز تغافل رسیدنم بنگر

اے میرے محبوب! آ اور دیکھ کہ تجھے دیکھنے کی مجھے کس قدر تمنا ہے اور میرے تیرے فراق میں کس طرح آنسو بہا رہی ہوں۔

ہاں میں تیرے فراق میں تڑپتی تھی۔ یہی میرا جرم تھا جس کے باعث تو نے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ آ میری قبر پر آ اور دیکھ کہ میں کس طرح آرام کر رہی ہوں۔

اب میرے دل میں تیرے لئے کسی سے رشک کی گنجائش نہیں رہی۔ میں تیری بزم عیش سے کنارہ کش ہو چکی ہوں' اب کوئی ہنگامہ نہیں۔ امن ہی امن ہے تجھے شرم آنی چاہیے۔

ذرا ایک نظر ادھر بھی تو دیکھ۔ دانا اگا' بڑھا اور آشیانہ بھی تیار ہو گیا۔ دیکھ میں نے ہما کے انتظار میں کس طرح جال بچھا رکھا ہے۔

غالبا تو حسرت کشوں کی نیاز مندی سے واقف نہیں۔ ذرا میری نگاہ بن کر چور نظروں سے دیکھنا سیکھ اور یہ

معلوم کر کہ میں تیری طرف کس طرح دیکھتی رہتی ہوں۔ اگر تجھے تماشائے گلستان دیکھنے کی ہوس ہے تو آ اور میرے خون میں تڑپنے کا نظارہ کر۔

میں نے تیری محبت کے درد سے جان دے دی اور تو میری فریاد کو نہ پہنچا۔ آ اور ذرا اسے بھی دیکھ لے کہ میں نے تیرے طرز تغافل کی داد کس طرح دی ہے۔

اپنی یہ کیفیت اپنے محبوب غالب کو دکھانے کے بعد ایک بار اپنے محبوب کو "بیتے ہوئے دن عیش کے" یاد دلاتی ہے۔ ابتدائے عشق کا وہ زمانہ جب وہ غالب سے دیوانہ وار محبت کرنے لگی تھی، جب غالب کو زبان خلق کا خوف تھا اور اسے پروائے ننگ و نام نہ رہی تھی۔

اس کی موت پر شہر میں اور شہر کے لوگوں پر کیا گذری۔ اسی کی زبان سے سنئے۔

برگ من کہ پس از من زمرگ من یاد آر
بکوے خویشتن آن نعش بے کفن یاد آر

من آن نیم کہ زمرگم جہان بہم نہ خورد
فغان زاہد و فریاد برہمن یاد آر

ہبام و درز ہجوم جوان و پیر بگوی
بکوی و برزن اندوہ مرد و زن یاد آر

بہ ساز نالۂ گروہی ز اہل دل دریاب
بہ بند مرثیہ جمعی ز اہل فن یاد آر

ملال خلق و نشاط رقیب در ہمہ حال
غرور خویش بہ تحسین تیغ زن یاد آر

بخود شمار وفا ہائے من، زمردم پرس
بمن جساب جفا ہائے خویشتن یاد آر

چو دید جان من از چشم پر خمار بگوی
چو رفت بر سرم از زلف پر شکن یاد آر

خروش و زاری من در سیاہی شب زلف
بگم فتادن دل در' چہ ذقن یاد آر

بسنج ناز تو برمن دران محل چہ گذشت
نخواندہ آمدن من در انجمن یاد آر

زمن پس از دوسہ تسلیم یک نگہ وانگہ
زخود پس از دوسہ دشنام یک سخن یاد آر

اے میرے محبوب! میری جان کی قسم! اگر میرے مرنے کے بعد تو مجھے یاد کرے تو اپنی گلی میں میری نعش بے کفن کا خیال کرنا
میں ان لوگوں میں سے نہیں جن کی موت پر دنیا میں کوئی ہنگامہ نہ برپا ہو۔ اس لیے یاد کر کہ میرے مرنے پر شیخ و برہمن نے کس طرح آہ و زاری کی تھی۔
بام و در پر نوجوانوں اور بوڑھوں کے ہجوم کا تصور کر اور گلی کوچوں میں عورتوں اور مردوں کا اندوہ یاد کر۔ جو میری موت کی خبر سن کر نکل آئے تھے۔
پھر اس منظر کو بھی یاد کر جب اہل دل آہ و زاری کر رہے تھے اور اہل فن مرثیے سنا رہے تھے۔
خلق غمگین تھی، دشمن خوش تھے اور ہاں تیغ زن کی شمشیر زنی پر اپنا نعرۂ تحسین بلند کرنا بھی یاد کر۔
اپنے ساتھ میری وفاؤں کا شمار کر، اس کے بعد لوگوں سے پوچھ اور اس کے ساتھ ہی ذرا اپنی جفاؤں کا بھی تو شمار کرلے۔
میری روح نے تیری مخمور آنکھوں میں کیا دیکھا اور مجھ پر تیری زلف پر شکن نے کیا قیامت ڈھائی؟ ذرا اسے بھی تو یاد کرلے، جب میرا دل تیری محبت میں گرفتار ہوا تھا۔
اور ہاں! راتوں میں ذرا میری آہ و زاری بھی تو یاد کر اور یہ بھی یاد کر کہ تیرے فراق میں مجھ پر کیا گذرتی تھی۔
اور یہ بھی تو یاد کر کہ ایک مرتبہ میں تیری محفل میں بے بلائے آگیا تھا تو تو نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا تھا، تو نے میرے دو تین بار سلام کرنے پر ایک مرتبہ اچٹتی نگاہ سے دیکھا تھا اور دو تین بار برا بھلا کہنے کے بعد ایک بات کی تھی۔
اس غزل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حسینہ کی موت معمولی لوگوں کی سی موت نہ تھی، شہر میں اس کی موت سے ہنگامہ برپا ہو گیا تھا، شیخ و برہمن سب ہی کو صدمہ پہنچا تھا کیونکہ یہ ایسی حسینہ کی موت تھی جو خود حسن پرست تھی۔
معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جنازہ غالب کی گلی سے گذرا تھا جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس کا مکان غالب کی قیام گاہ سے بہت زیادہ دور نہ تھا15۔
اس شکایت نامے کے بعد غالب کی وہ غزل بھی ملاحظہ ہو جو محبوبہ کی زبان سے اس کی وفات کے بعد کہلوائی گئی ہے اور جس میں محبوبہ کہتی ہے کہ اب میرے بعد حسن کا کوئی قدردان نہ رہا۔ ساقی بار بار "کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق" کی صدائیں مختلف لہجوں میں دیتا ہے لیکن ہاں کہنے اور میری طرح عشق کا ساغر کش بننے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں۔ غزل میں روایتی انداز ہونے کے باوجود ذرا اس کا لہجہ اور اس کی روح ملاحظہ ہوں:

حسن غمزے کی کشا کش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد
منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیٔ انداز و ادا میرے بعد
شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
خوں ہے دل خاک میں احوال بتاں پر، یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاج حنا میرے بعد
در خور عرض نہیں جوہر بیداد کو جا
نگہ ناز ہے سرمے سے خفا میرے بعد
ہے جنوں اہل جنوں کے لیے آغوش وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد
کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد
غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد
تھا میں گلدستۂ احباب کی بندش کی گیاہ16۔
متفرق ہوئے میرے رفقا میرے بعد
تھی نگہ میری نہاں خانۂ دل کی نقاب
بے خطر جیتے ہیں ارباب ریا میرے بعد
آئے ہے بے کسیٔ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد 17۔

شاید حسب ذیل شعر بھی اسی حادثے کی ترجمانی کرتا ہے:

اس رنگ سے اٹھائی کل اس نے اسد کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

قیاس کہتا ہے کہ شعر میں محبوبہ کے نام کے بجائے اسد تخلص داخل کر دیا گیا ہے اور یوں بھی عشق کی موت میں حسن کی موت بھی تو پنہاں ہوتی ہے۔ اس کی موت کے بعد یوں بھی اب خود ہی محبوبہ کی طرف سے شکایت کرتا اور خود ہی جواب دیتا تھا، افسوس کرتا تھا، شرمندہ ہوتا اور یاد کرتا تھا۔ چنانچہ کئی سال بعد کلکتہ جاتے

ہوئے ایک غزل میں جو باندے سے دہلی بھیجی گئی تھی کبھی کہتے ہیں کہ "رونق ہستی ہے عشق خانہ ویران ساز سے" اور کبھی "انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں" کا نعرہ لگاتے ہیں:

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویران ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

بلکہ ہیں ہم اک بہار ناز کے مارے ہوئے
جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

اور کبھی اپنی حالت اس طرح بیان کرتے ہیں:

اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغ ناتمامی

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے۔

ڈھونڈے ہے اس "مغنی آتش نفس" کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برق فنا مجھے

بیاد گرمئی صحبت برنگ شعلہ دہکے ہے
چھپاؤں کیونکر غالب سوزشیں داغ نمایاں کی

یا پھر پکار اٹھتے ہیں:

وہ فراق اور وہ وصال کہاں! وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں!
تھی وہ "اک شخص" کے تصور سے اب وہ رعنائی خیال کہاں!

کبھی آسمان کی طرف نظر اٹھتی ہے تو وہی مطربہ شیریں ادا، وہی مغنی آتش نفس اور وہی رہزن تمکین و ہوش اور اس کا دیکھتے دیکھتے نظروں سے چھپ جانا یاد آتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

اور کبھی عام خیال میں اسے یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تجھ سے قسمت میں میری صورت قفل ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

ذہن پر گذرے ہوئے مسرت انگیز لمحوں کی تصویریں ابھر آتی ہیں۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگتی ہے کبھی انتظار کی بے تاب گھڑیاں یاد آتی ہیں اور کبھی محبوبہ کی عشوہ طرازیاں، کبھی آنے کی خبر پاکر مسرت سے پھول کی طرح کھل جانا یاد آتا ہے اور کبھی خود اپنی طرف سے شرارتیں اور جھگڑے یاد آتے ہیں۔ ان

دلکش، طرب انگیز اور الم خیز لمحوں کو یاد کر کے شاعر بے ساختہ پکار اٹھتا ہے:

رفت آنکہ کسب بوے تو از باد کردمی
کل دیدمی و روئے ترا یاد کردمی

رفت آنکہ گر براہ تو جاں دادمی ز ذوق
از موج گرد رہ نفس ایجاد کردمی

رفت آنکہ گربت نہ بہ نفریں نواختی
رنجیدمی و عربدہ آغاز کردمی

رفت آنکہ قیس را بسترگی ستودمی
در چابکی ستایش فرہاد کردمی

رفت آنکہ جانب رخ و قدت گرفتمی
در جلوہ بحث باگل و شمشاد کردمی

رفت آنکہ در اداے سپاس پیام تو
ہر گونہ مرغ صد قفس آزاد کردمی

اکنوں خود از وفائے تو آزار می کشم
رفت آنکہ از جفائے تو فریاد کردمی

بندم منہ زطرہ کہ تابم نماندہ است
رفت آنکہ خویش رابہ بلا شاد کردمی

آخر بداد گاہ دگر اوفتاد کار
رفت آنکہ از تو شکوۂ بیداد کردمی

غالب ہواے کعبہ بسر جا گرفتہ است
رفت آنکہ عزم، خلخ و نوشاد کردمی 18ے

ہائے وہ زمانہ جب ہواؤں میں تیری خوشبو سونگھتا اور پھولوں کو دیکھ کر تیری صورت یاد کرتا تھا۔

ہائے وہ زمانہ جب ذوق و شوق کے عالم میں اگر تیری راہ میں جان دیتا تو گرد راہ کی موجیں نئی زندگی بخشتی تھیں!

ہائے وہ زمانہ جب تو مجھے برا بھلا نہ کہتی تو تجھ پر ناراض ہوتا اور جھگڑتا تھا کہ آج تو خاموش کیوں ہے، آج مجھ پر خفگی کیوں نہیں؟

ہائے وہ زمانہ جب میں اپنے مقابلے میں قیس کی تنومندی کی تعریف اور فرہاد کی چابک دستی پر اس کی ستایش کرتا تھا۔

ہائے وہ زمانہ جب تیرا روئے زیبا اور قد و قامت دیکھ کر گل و شمشاد کے بارے میں بحثیں کرتا اور انہیں بے حقیقت قرار دیتا۔

ہائے وہ زمانہ کہ تیرا پیغام آتا تو اس خوشی میں پنجروں میں بند سینکڑوں پرندوں کو رہا کر دیتا تھا۔

لیکن آہ آج زمانہ بدلا ہوا ہے' آج تو تیری وفائیں یاد کر کے دکھ ہوتا ہے۔ ہائے وہ زمانہ! جب میں تیری جفاؤں پر فریاد کرتا تھا۔

مجھے اب اپنے طرہ کی ڈوریوں سے نہ باندھ کہ اب مجھ میں تاب و تواں باقی نہیں رہی۔ ہائے اب وہ زمانہ نہیں جب مجھے تکلیفیں اٹھانے میں بھی لطف آتا تھا۔

ہائے وہ زمانہ جب میں تیرے ظلم و ستم کے شکوے کرتا تھا' اب میرا معاملہ دوسرے ہی دادگر (خدا) سے ہے جس سے تیری جدائی کی شکایت کرتا اور اسی سے انصاف طلب کرتا ہوں۔

آخر میں کہتے ہیں اے غالب! اب میرا جی اس دنیا ہی سے بیزار ہو گیا ہے۔ بے عشق زندگی بیکار ہے۔ دل چاہتا ہے کعبے کو چلا جاؤں اور وہاں خدا کے گھر میں خدا سے فریاد کروں۔ ہائے وہ زمانہ جب میرا جی چاہتا تھا کہ خلخ اور نوشاد کے حسینوں سے تیرے حسن کا مقابلہ کروں۔

غالب کی یہ دلکش' حسین اور غم انگیز یادیں اسے ہمیشہ تڑپاتی رہیں۔ اپنی محبوبہ کی وفائیں اور والہانہ محبت کی یاد اسے ہمیشہ ستاتی رہی اور وہ زندگی بھر اپنی قلبی کیفیتوں کو مختلف طریقوں سے بیان کرتا رہا:

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا دل جگر تشنہ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز پھر ترا وقت سفر یاد آیا
سادگی ہائے تمنا' یعنی پھر وہ نیرنگ نظر یاد آیا
پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال دل گم گشتہ مگر یاد آیا
زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی کیوں ترا رہگذر یاد آیا

کبھی عرض نیاز عشق کے بارے میں سوچتے ہیں اور اپنی محبوبہ کی کمی محسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اب میرے پاس وہ دل ہی نہیں جس پر مجھے ناز تھا اور جس کے باعث میں اپنی محبوبہ کی خدمت میں عرض نیاز عشق کر سکتا تھا:

عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

ہر چند ہوں میں طوطی شیریں سخن ولے
آئینہ آہ میرے مقابل نہیں رہا

جاتا ہوں داغ حسرت ہستی لیے ہوئے
ہوں شمع کشتہ' در خور محفل نہیں رہا

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

ہوں قطرہ زن بوادی وحشت شبانہ روز
جز تار اشک جادۂ منزل نہیں رہا

وا کر دیے ہیں شوق نے بند نقاب حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

دل سے ہوائے کشت وفا مٹ گئی کہ واں
حاصل سوائے حسرت حاصل نہیں رہا

بیداد عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسد
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

محبوبہ کی زندگی میں انتظار کی راتیں تھیں' وصل کی راتیں تھیں' اضطراب کی راتیں تھیں' مسرت کی راتیں تھیں' لیکن اب صرف یادوں کی راتیں رہ گئی تھیں جن میں ہجر کا سا اضطراب تھا' لیکن وصل کی امید باقی نہ رہی تھی۔ ایسی ہی ایک رات کی کیفیت غالب نے دو غزلوں میں بیان کی ہے:

(1)

رات' دل' گرم' خیال' جلوۂ جانانہ تھا
رنگ روے شمع' برق خرمن پروانہ تھا

شب کہ تھی کیفیت محفل بیاد روے یار
ہر نظر' داغ ے خال لب پیمانہ تھا

درد کو آج اس کے ماتم میں سیہ پوشی ہوئی
وہ دل سوزاں کہ کل تک شمع ماتم خانہ تھا

دیکھ اس کے ساعد سیمین و روے پر نگار
شاخ گل جلتی تھی' مثل شمع گل پروانہ تھا

اے اسد رویا جو دشت غم میں میں حیرت زدہ
آئینہ خانہ ہجوم اشک سے پروانہ تھا

(2)

بسکہ جوش گریہ سے زیر و زبر ویرانہ تھا
چاک موج سیل تا پیراہن دیوانہ تھا

شب تری تاثیر سحر شعلہ آواز سے
تار شمع آہنگ مضراب پر پروانہ تھا

انتظار جلوۂ کا کل میں، ہر شمشاد باغ
صورت مژگان عاشق، صرف عرض شانہ تھا

جوش بے کیفیتی ہے اضطراب آرا اسد
ورنہ لبسمل کا تڑپنا لغزش مستانہ تھا

ایسی ہی ایک رات کی داستان ایک اور غزل میں ملاحظہ ہو جس سے محبوبہ کی وفات کے بعد غالب کی اس ذہنی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے جس سے وہ اس وقت گذر رہے تھے:

شب کہ وہ مجلس فروز خلوت ناموس تھا
رشتہ ہر شمع خار کسوت فانوس تھا

حاصل الفت نہ دیکھا جز شکست آرزو
دل بدل پیوستہ گویا اک لب افسوس تھا

پوچھ مت بیماری غم کی فراغت کا بیان
جو کہ کھایا خون دل بے منت کیموس تھا

مشہد عاشق سے کوسوں تک جو آگتی ہے حنا
کس قدر یا رب ہلاک حسرت پابوس تھا

کل اسد کو ہم نے دیکھا گوشہ غم خانہ میں
دست برسر، سر بزانوے دل مایوس تھا

زمانہ ایک مسکن مرہم ہے، وقت گذرنے کے ساتھ زخم مندمل ہونے لگتے ہیں۔ سوزش میں شدت نہیں رہتی لیکن "احباب چارہ سازی وحشت" نہیں کر سکتے۔ دل کا درد نہیں جاتا۔ کبھی نہ کبھی ٹیس سی اٹھتی ہی رہتی ہیں۔ بھلانے کی کوشش کرنے پر بھی بعض صورتیں بھلائی نہیں جا سکتیں۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا' سننا بولنا اور نہ جانے کیا کچھ یاد آتا رہتا ہے۔ چنانچہ مدتوں بعد 1852ء میں پچپن سال کی عمر میں' غالب نے ایک غزل لکھی۔ اس میں بھی اسی محبوبہ اور اس کے ساتھ گزارے ہوئے وہ دن' درباری شاعری اور روایتی پردوں کے باوجود' نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔ جب غالب ایک مسرت انگیز دور سے گذر رہے تھے۔ ملاحظہ ہو:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار۔ طاق۔ نسیاں ہو گئیں

جوئے خون آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ دو شمعیں فروزاں ہو گئیں

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

بسکہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیہ چاک گریباں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ غزل لکھتے وقت غالب کے ذہن میں اپنی معاشی اور سماجی پریشانیوں کے باوجود اپنی بت مغاں شیوہ' اپنی مطربہ شیریں ادا' رہزن تمکین و ہوش اور ستم پیشہ محبوبہ نہ تھی؟ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ رنگا رنگ بزم آرائیاں' جو اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو چکی تھیں' وہی بزم آرائیاں نہ تھیں جو اپنی محبوبہ کے ساتھ گذری تھیں؟ کون کہہ سکتا ہے کہ شام فراق میں اس کی آنکھوں سے جوئے خون نہ بہی تھی اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اسی محبوبہ کی سیاہ زلفیں نہ تھیں جو غالب کے شانوں پر پریشان ہو کر غالب کے مشام جاں کو معطر کر کے اسے سکون بخش نیند عطا کرتی تھیں اور اندھیری راتوں کو حسین' دلکش اور مسرت انگیز راتوں میں تبدیل کر دیتی تھیں؟

لیکن انسان زندگی بھر آنسو نہیں بہا سکتا' عشق فعل دماغ ہی سہی لیکن زندگی بھر آنسو بہانا ایک جسمانی بیماری ہے۔ زندگی کے ہم ہے بڑے سے بڑے غموں پر بھی بھول کے دبیز پردے ڈال دیتے ہیں۔ دوست' ہمدرد اور عزیز نصیحتیں کرتے ہیں اور صحت مند انسان اگرچہ بیتے ہوئے دنوں کی حسین یادوں کو فراموش نہیں کرتا لیکن آنسو بہانا بند ہو جاتے ہیں' سو د آہیں عام بات چیت میں بدل جاتی ہیں۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

ایک مرشد کامل نے ہم کو نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں' ہم مانع فسق و فجور نہیں' پیو' کھاؤ' مزے اڑاؤ' مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو' شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نے مرے۔ کیسی اشک افشانی کہاں کی مرثیہ خوانی' آزادی کا شکر بجا لاؤ۔ غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی منا جان سہی ...."

غالباً اس مرشد کامل ہی کی نصیحت سے متاثر ہو کر غالب نے یہ شعر کہا تھا:

بلبل کے کاروبار پہ ہے خندہ ہائے گل
کہتے ہیں عشق جس کو خلل ہے دماغ کا

نسخہ فوجدار محمد خاں کی ایک غزل کے حسب ذیل شعر شاعر کی اس ذہنی کیفیت کی غمازی کرتے ہیں جو "مرشد کامل" کی نصیحت کے بعد ہوئی۔ اس غزل کے اشعار خود محبوبہ کی زبان سے کہلوائے گئے ہیں:

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی

امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

خار خار الم حسرت دیدار تو ہے
شوق گلچین گلستان تسلی نہ سہی

مے پرستاں خم مے منہ سے لگا لو یعنی
ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

نفس قیس کہ ہے چشم و چراغ صحرا
گر نہیں شمع سیہ خانہ لیلیٰ نہ سہی

عشرت صحبت خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالب اگر عمر طبیعی نہ سہی

غالب نے خم مے منہ سے لگایا' غم کو غلط کیا' اک گونہ بے خودی چاہی۔ نہ صرف اپنے غم کو غلط کیا بلکہ مظفر حسین خاں وغیرہ کے غموں کو بھی اور "چناجان نہ سہی مناجان سہی" کہ کر حاتم علی مہر کے غم کو بھی غلط کرنے کی کوشش کی ورنہ صاف ظاہر ہے کہ اتنی مدت گذر جانے کے بعد بھی ان کے دل میں محبت کی کسک باقی تھی اور ان کی محبت ہنگامی نہ تھی۔ لیکن یہ مرشد کامل کون تھے؟ میاں کالے؟ حسام الدین حیدر خاں نامی 19۔ اور خود غالب کی صحت مند فکر؟ اس محبوبہ کا نام کیا تھا؟ اختر؟ ناہید؟ یا کوئی اور؟

غالب کی داستان حیات اور اس کی پروانہ وار محبت کرنے والی محبوبہ کے بارے میں تو کوئی شبہ نہیں لیکن ٹھوس دلائل فراہم ہونے تک "مرشد کامل" اور محبوبہ کے نام سے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا 20۔ قیاس کے گھوڑے اگرچہ بعض شواہد کی بناء پر ضرور دوڑائے جا سکتے ہیں لیکن قیاس کے گھوڑے ہمیشہ منزل تک نہیں پہنچاتے:

کچھ اور چاہیے اثبات ادعا کے لیے

صدیق کلیم

غالب کی ہم عصریت

غالب ابھی پانچ سال ہی کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور ابھی دس سال ہی کی عمر ہوئی تھی کہ ان کے چچا بھی جو انہیں ناز و نعم سے پالنا چاہتے تھے اس دنیا سے چل بسے۔ اس کے متعلق خود انہوں نے ایک موقع پر لکھا ہے:

"مرادریں خرابہ جاتماگذاشت وایں حادثہ کہ مرانشانہ جاں گدازی وگردوں راکینہ بازی بود۔"

مرزا اس صورت سے دل میں وسیع تمنائیں لئے زندگی کی ماہا ہی میں داخل ہوئے۔ انہوں نے جو تعلیم حاصل کی وہ بیشتر اپنے ذوق، تجسس اور محنت کے بل بوتے پر تھی۔ وہ فارسی کے بہت بڑے عالم تھے اور فلسفہ، منطق اور دیگر علوم زمانہ میں بھی خاصی دسترس رکھتے تھے۔ ہندوستان کے شعروں میں وہ فقط امیر خسرو کے قائل تھے۔ اور اپنے فارسی کلام ہی کو اپنے لئے وجہ ناز سمجھتے تھے۔ شروع میں بلکہ کافی دیر تک وہ بیدل کے طرزی کو عزیز جانتے تھے اور اسی میں شعر کہنا مناسب سمجھتے تھے۔ ان کی شاعری کا آغاز ریختہ سے ہوا، مگر 25 سال کی عمر کے بعد 25 / 30 سال تک وہ فارسی ہی میں لکھتے رہے اور اپنے آپ کو فارسی نگار کی حیثیت سے پیش کرتے رہے۔ 1850ء میں جب قلعہ معلی سے تعلق پیدا ہوا تو ان کی ریختہ گوئی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ غدر کے بعد دلی پر آلام و مصائب کا جو پہاڑ ٹوٹا تو محفل یکسر برہم ہو گئی۔ مرزا اتنے رنجیدہ خاطر ہوئے کہ انہوں نے شعر و شاعری کو خیرباد کہہ دیا۔

ایک شاعر کا امتحان دو عوامل پر منحصر ہے۔ ایک تو اس کا کلام اور اس کے متعلق علمی تحقیق اور دوسرے اس عہد کا ادبی مذاق جس میں کہ اس شاعری کا تجزیہ کیا جا رہا ہے۔ غالب کا شاعرانہ مقام ایک عرصے سے متعین ہو چکا ہے لیکن ہمارے لئے اہم تنقیدی سوال یہ ہے کہ آج غالب کا کلام ہمیں کس نوعیت کا تجربہ پیش کرتا ہے اس لحاظ سے مرے نزدیک غالب کی ہم عصریت مسلم ہے۔

جدید ادبی تنقید نے بعض شاعرانہ صفات ___ ابہام، ذومعنویت اور طنز ___ کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ ان صنائع کا رمزیہ تصاویر سے گہرا تعلق ہے کہ یہی ایک نظم کی ساخت کو بروئے کار لاتی ہیں بلکہ ایک ہی نظم کے مختلف پہلوؤں کو بھی معنوی وحدت میں سموتی ہیں۔ یہ طریقہ شعر گوئی نہ صرف ظاہر و باطن کے فرق کو سامنے لاتا ہے بلکہ تجربے کی مختلف سطحوں کو بھی اور خود شعری تجربے کے وزن اور گمبھیر تا کو بھی۔ اردو شاعری کی اس روایت (جو اس حالت میں موجود نہیں تھی جو اس بیان سے ظاہر ہوتی) سے غالب نے مکمل طور پر استفادہ کیا ہے بلکہ اپنی تخلیقی صلاحیت کے سبب اسے روایت کا درجہ دیا ہے۔ اپنے شعری تجربے میں غالب نے اکثر دو متضاد حقیقتوں کا ہی نہیں بلکہ ایک ہی

حقیقت کے مختلف اور متضاد پہلوؤں کو آپس میں مدغم کیا ہے۔ وہ اکثر رمزیہ تصاویر کا وظائفی استعمال کرتے ہیں نہ کہ تزئینی۔ اور اکثر ان کے معانی تک رسائی اسی راستے سے ہوتی ہے اور اسی طرح ہم ان کے تجربے کے سانچوں کا علمی تجزیہ کرسکتے ہیں اور ان کا فکری نظام تشکیل کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ بعض نقادوں نے غالب کا انگریزی شاعر ڈن (Donne) سے موازنہ کیا ہے۔ ان کی شعری تکنیک کسی حد تک ایک ہی طرح کی ہے۔ اگر ہم ان کی رمزیہ تصاویر کا اس جدید طرز تنقید کی روشنی میں تجزیہ کریں تو شاید ہم غالب کی شاعری پر مزید روشنی ڈال سکیں۔

غالب کی رمزیہ تصاویر کا ان کی زبان اور بحروں سے گہرا تعلق ہے۔ غالب نے بالعموم مشکل انداز میں بات کی ہے۔ ان کے جملوں کے ٹکڑے اور ترکیبیں فارسی ہیں لیکن اپنے فکری سانچوں اور ان کے متعلقات کی ادائیگی کے لئے شاید یہ اسلوب ہی موزوں تھا۔ غالب نے دراصل دو قسم کے اسلوب میں لکھا ہے۔ ایک تو سراسر مفرس اور دوسرے اردو' نہ کہ مشکل اور سادہ زبان میں۔ شروع کے دور میں مشکل زبان شعر پر حاوی ہے اور آخری دور میں سادگی اظہار۔ مگر غالب کے کلام کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے شروع میں مفرس اردو استعمال کی ہے اور بعد میں فقط اردو (جو فارسی کی گہری چھاپ کے باوجود فارسی معلوم نہیں ہوتی) سادہ اسلوب یا سہل متمنع تیسرا اسلوب قرار دیا جاسکتا ہے جہاں ابہام یکسر غائب ہے۔ دوسرے اسلوب میں ابہام تکنیک کی خوبی ہے مگر پہلے یعنی فارسی زدہ اسلوب میں ابہام ایک رکاوٹ معلوم ہوتی ہے۔

مرزا کے اس کلام میں جو بیدل کے طرز میں نہیں بلکہ ان کے اپنے مخصوص اردو اسلوب میں ہے۔ کئی عوام شعری یکجا جمع ہو گئے ہیں۔ ان اشعار میں جذبات کی گہرائی اور شدت ہے' خیالات کی وسعت اور بلندی ہے۔ وہ محبت اور روزمرہ زندگی کے تجربات سے متاثر ہو کر اور حقائق کو پہچان کر حقیقت کے دل تک اتر جاتے ہیں۔ تخیل کی پرواز اور ذہن کی رسائی سے ان میں چھپے ہوئے رشتے اور معانی ڈھونڈتے ہیں۔ زبان کے تمام پہلوؤں پر انہیں کامل قدرت حاصل ہے۔ تشبیہ و استعارہ کو معانی میں سمو دیتے ہیں۔ غیر ضروری صنعت کاری سے پرہیز کرتے ہیں۔ وہ اکثر ایسے الفاظ اور اس قسم کی رمزیت استعمال کرتے ہیں جس کے ساتھ تاریخی اور ثقافتی روایات وابستہ ہیں جو ان کے تجربات کو عمومیت اور گمبھیرتا بخشتی ہیں:

شوق ہر رنگ رقیب سروساماں نکلا — قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
بوئے گل' نالہ دل' دود چراغ محفل — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

مرزا اپنے کرب کو نظم و ضبط کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں اور اس کے باوصف ان کے اشعار میں ایک طرح کی شان و شوکت پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے مصرعوں کے بحور بار بار درباری راگ کا ترنم پیدا کرتے ہیں۔ ان میں مغلیہ ثقافت کی وہ گمبھیرتا' وہ وقار پیدا ہوتا ہے کہ ان کا دکھ' ان کی ابتلا! گراں نہیں گذرتی بلکہ نئے معانی اختیار کرلیتی ہے:

سادگی و پرکاری' بے خودی و ہشیاری — حسن کو تغافل میں جرات آزما پایا
غنچہ پھر لگا کھلنے' آج ہم نے اپنا دل — خون کیا ہوا دیکھا' گم کیا ہوا پایا

یہاں بات میں الجھاؤ معلوم نہیں ہوتا اگرچہ یہ اشعار ان تمام تکنیکی صفات سے متصف ہیں جن کا میں

نے اوپر ذکر کیا ہے- یہ سہل ممتنع کے قریب ہے- اگرچہ یہ اپنے اندر کئی کروٹیں اور آہٹیں لئے ہے- اس طرز میں وہ بعض مواقع پر بات کو اس نزاکت سے کہہ جاتے ہیں کہ سامع یا تو چونک اٹھتا ہے یا اسے سوچنا پڑتا ہے:

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا جسے غم سمجھ رہے ہو' یہ اگر شرار ہوتا

بعض دفعہ وہ ایک طنزیہ انداز میں' یا ظرافت کے پہلو میں یا تبسم پنہاں کے ساتھ حرف مطلب بیان کرتے ہیں- یہ تبسم زیر لب کی کیفیت نہایت خوشگوار اثر پیدا کرتی ہے- نہایت دکھ بھری بات کو وہ ہلکی شوخ لے میں کہہ جاتے ہیں:

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد سر گشتہ خمار رسوم و قیود تھا

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

علاوہ ازیں ان میں رندی و سرشاری کا بھی ایک پہلو تھا جوان کی شوخی اور نازک بیانی سے مل کر انہیں زندگی کے مصائب کا مقابلہ کرنے کی ہمت دیتا تھا یہاں ان کی رند مشربی اور روایتی اخلاق سے انحراف انہیں زندگی سے یک گونہ لطف حاصل کرنے میں مدد دیتا ہے:

نیند اس کی ہے' دماغ اس کا ہے' راتیں اس کی ہیں تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

غالب کے اسالیب کا یہ ارتقاء اس سبب سے ہے کہ وہ ایک منزل پر پہنچ کر اپنے آپ کو فارسی شعری کی دنیا سے منقطع کر لیتے ہیں- اور اس کی طرف متشکک انداز اختیار کرتے ہیں- پہلا دقیق اسلوب ایک ایسے ذہن کی پیداوار ہے جو ایک ثقافت کی عظمت اور گمبھیرتا کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے- یہ مغلیہ ثقافت کی عظمت کی نشان دہی ہے کہ وہ فارسی شعر کو عظیم ادبی قدر سمجھتے ہیں اور اپنی شعر گوئی کے لئے فارسی ہی کو موزوں ذریعہ اظہار قرار دیتے ہیں- غالب کے اکثر پیش روؤں اور ہم عصروں کو یہ مسئلہ در پیش نہیں تھا- وہ اردو شعر لکھنے میں مصروف تھے- اور اردو زبان کو بیک وقت اس کے ہندی اور فارسی لوازمات سے آزاد کر رہے تھے- غالب نے ہندوستان میں مغلیہ ثقافت کی اقدار اور گمبھیرتا کو اپنے میں سمو لیا تھا مگر انہیں جب تغیر کا احساس ہوتا ہے تو متشکک انداز ابھر آتا ہے جو اپنے ساتھ طنز اور ذومعنویت لاتا ہے' اس لئے وہ اپنے نئے شعری تجربے کے لئے نیا اسلوب تخلیق کرتے ہیں- مغلیہ ثقافت میں سرشاری جو اب غیر شعوری ہے' اور روز افزوں متشکک جواب شعوری ہے' مدغم ہو کر ایک نیا تجربہ تخلیق کرتے ہیں- اس لئے طنز' ابہام اور ذومعنویت کا استعمال ان کی شاعری کو تازگی عطا کرتے ہیں اور ایک نیا مزاج بھی- اس شاعری کی بحریں بھی باوقار اور گمبھیر ہیں- یہ شاعری تکلیف کی روایت کے نیچے دبی ہوئی معلوم نہیں ہوتی- یہ عظیم شاعری ہے-

غالب کی شاعری میں دو تین علامات مستقل حیثیت اختیار کر گئی ہیں- جن کا ذکر یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے"

موجِ گل" "موجِ خیال" "گذر گاہِ خیال" یہ جہاں بھی استعمال ہوئی ہیں ان کی ذہنی حالت کا پتہ دیتی ہیں۔ "دل گذر گاہ خیال مے و ساغر ہی سہی___" مے و ساغر کی طلب' اس کی وقتی نا حصولی اور گذشتہ شیرینی و تلخی سب ایک ساتھ مل کر اور دل کی گذر گاہ سے ہو کر تخیلی تجربہ بن جاتی ہیں۔ ان کے شعر کی عام طور سے جذباتی کیفیت یہی ہے۔ انتہاء کرب کے ساتھ رنگینی کی ایک ہلکی سی لہر اور اس کے ساتھ زندگی کرنے کا پروقار فن۔ میرے نزدیک غالب کے شعر کی روح اسی میں مضمر ہے:

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب — اس رہ گذر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

موجِ گل سے چراغاں ہے گذر گاہِ خیال — ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

ان علامات کے علاوہ "شمع" ان کے کلام میں مستقل علامت ہے جو زندگی اس کے اندھیرے اور روشنی کو اپنے دامن میں سمیٹے ہے۔

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

غالب کی شاعری کا بنیادی موضوع حسن و عشق ہے مگر جیسے میں نے اوپر کہا۔ یہ تقریباً دو سو سال کی ثقافت کو عصری ابتلا سے گوندھ کر ایسے نغمے کی صورت میں پیش ہوئی ہے جس میں درد بھی ہے اور متانت بھی۔ ان کی غزلیاتی شاعری کی کئی سطحیں ہیں۔ غالب نے کہا تھا:

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں — طاقت بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

غالب کی غزل کی ایک سطح اور کیفیت ان غزلوں میں ملتی ہے جن کی نمائندہ وہ غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں — روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

یہ اس سماج کی یاد دلاتی ہے جہاں دونوں جنسوں کی ملاقات محال تھی۔ جہاں خود شاعر کا ذہن یا دونوں کا ذہن درمیانی رکاوٹیں پیدا کرتا تھا۔ مرزا کے کلام میں اس لحاظ سے روحانی یا افلاطونی عشق کی کوئی جھلک نہیں لیکن وہ ترکیب ذہنی ضرور ہے' جو اس کی تخلیق ہے یعنی محبوب کو تخیل ہی میں پیار کرنا' اس لئے:

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے — عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

دوسرے موڑ کی وہ غزلیں ہیں جن میں سرخوشی اور رندی زیادہ اور کرب کم ہے جس کی نمائندہ یہ غزل ہو سکتی ہے:

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے — جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

تیسرے اہم موڑ کی تخلیق وہ تمام غزلیں ہیں جن میں یہ دونوں پہلو بہم دگر مل گئے ہیں۔ جہاں حقیقت شناسی نہایت اعلیٰ سطح پر پہنچ گئی ہے جہاں ایک مصرع جانے محسوسات کی کتنی کروٹوں اور جذبات کے کتنے گوشوں اور خیالات کے کتنے شابوں کو جمع کر دیتا ہے۔ یہی وہ کلام ہے جسے انہوں نے خود "نوائے سروش" کا نام دیا تھا۔ مثلاً وہ غزلیں جن کے مطالعے یہ ہیں:

(1)
تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے حوران خلد میں تری صورت اگر ملے
(2)
آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
(3)
پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا دل جگر تشنہ فریاد آیا
(4)
نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

چوتھے موڑ کی وہ تمام غزلیں ہیں جو ذاتی تلخیوں اور محرومیوں کے ساتھ ساتھ اس وقت کے ادبار اور ابتلا کو بھی شامل کرتی ہیں اور جہاں نوا نہایت تلخ ہو جاتی ہے اور جہاں منفی نفسیاتی کیفیات حاوی ہو جاتی ہیں۔ مثلاً یہ غزلیں:

(1)
بے اعتدالیوں سے سبک سب سے ہم ہوئے جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے
(2)
فریاد کی کوئی لے نہیں ہے نالہ پابند نے نہیں ہے
(3)
ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے

اس بحث سے یہ نمایاں ہوتا ہے کہ غالب کا شعری تجربہ کن مختلف اور متضاد عناصر سے وجود میں آتا ہے۔ یہ تجربہ مثالیت کی ہلکی سی فضا بھی تعمیر کرتا ہے جو اس عظیم ثقافت کی روح سے ابھرتی ہے جو اس تجربے کی بنیاد ہے اور یہ ایک ایسے اسلوب کی تخلیق کرتی ہے کہ شعری تجربے کے فلسفیانہ ہونے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے غالب کے تجربے میں خود اعتمادی' غرور و تمکنت اور رجائیت ایسے انداز سے ابھرتے ہیں مگر اس عظیم پیکر کی شکستگی اس بنیادی سانچے میں داخل ہو کر اسے جلا دیتی ہے اور یکسر ایک نئے تجربے میں ڈھال دیتی ہے۔ اس لحاظ سے غالب کے تجربے سے اندھیرا' انتشار اور قنوطیت ایسے انداز سے ابھرتے ہیں اور سب سے بڑھ کر تشکک' یہ صورت حال پرانی اقدار کی شکست و ریخت سے پیدا ہوتی ہے اور آج ہم لوگ جو ایسے ہی معاشرے میں زندگی بسر کر رہے ہیں' اس سے روحانی طور پر اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ یہ صورت حال ہمیں میتھو آرنلڈ کی شاعری کی یاد دلاتی ہے:

"دو دنیاؤں کے درمیان گھوم رہا ہوں ایک مردہ اور دوسری ابھی جنم نہیں لے سکی۔"

لیکن غالب اور آرنلڈ کی شاعری کا مقام اتصال فقط یہی ہے۔ آرنلڈ عظیم شاعری کی سطح سے دور ہے۔ میرے خیال میں غالب کی شاعری کا مزاج اور ماحول شیکسپیر اور البسن کی تصانیف کی روح سے مماثل ہے جو ایسے ہی تاریخی ادوار میں پیدا ہوئے اور جہاں ایسی کشمکش اور الجھن تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لائی جو کہ غالب کو در پیش تھی۔

جدید ادبی معنویت کی تحریک بھی غالب کی اہمیت کا احساس دلاتی ہے۔ جب زندگی کا ارتقا سمت سے محروم ہو جائے تو انتشار اور پراگندگی کی سی کیفیات پیدا ہوتی ہیں لیکن یہ کہنا غلط ہو گا کہ غالب پر بے معنویت چھائی ہوئی ہے' البتہ تشکک کسی حد تک ضرور غالب ہے۔ مگر زندگی کرنے اور اس سے لطف حاصل کرنے کی خواہش کبھی بھی مدھم نہیں پڑتی بعض نقاد اس سبب سے غالب کو رجائی کہتے ہیں۔ میرے خیال سے یہ وجودیاتی (Existential) نقطہ نظر ہے اور جدید ذہن کے لئے اس کی قدر و قیمت مسلم ہے۔ ایسے نقطہ نظر سے انتشار میں معنویت ہی نہیں سمت بھی متعین ہوتی ہے۔ یہ انداز فکر ان کی شاعری کو ہمہ دردناکی سے بچاتا ہے اور ہمہ تشکک سے بھی۔ ان کے شعری تجربے کا یہ اہم عنصر اسے دلچسپ اور زندگی بخش بناتا ہے۔

چنانچہ آج ہم غالب کی شاعری کا تجزیہ اور استحسان اپنے مذاق سخن کی راہ سے کرتے ہیں۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ جدید شاعر غالب کا تتبع کریں۔ غالب اپنے دور کے انتشار کا احساس حاصل کر رہے تھے مگر وہ اس کی عظمت کو اپنی روح میں سمو چکے تھے۔ ہم اپنے اس دور کی شکستگی کا مکمل تجزیہ کر چکے ہیں اور نئے دور کی پہلی کرن کو طلوع ہوتا دیکھتے ہیں۔ ہمارے اور غالب کے دور میں قدر مشترک فقط انتشار اور الجھاؤ ہے۔ ہمیں غالب کی طرح ماضی کی طرف نہیں دیکھنا ہے بلکہ مستقبل کی جانب اس لئے ہم غالب کی تکنیک اور اقبال کے فلسفہ ارتقا سے بیک وقت مستفیض ہو سکتے ہیں۔ لیکن میری مراد یہ بھی نہیں کہ ہم اقبال کے تجربے کا تتبع کریں۔ البتہ جدید شاعر ان دونوں عظیم شاعروں اور روایات شاعری سے استفادہ کر سکتا ہے۔ اگرچہ اس کی شاعری اس کی اپنی جدت کی تخلیق ہو گی۔

☆ ☆

اس میں شک نہیں کہ غالب طبعاً خالص عاشقانہ رنگ کا شوخ شاعر تھا اور اس رنگ میں اس نے جو کچھ اور جیسا کچھ کہا ہے وہ اپنا جواب نہیں رکھتا لیکن باوجود اس کے جس وقت اس کی شاعرانہ عظمت کا سوال سامنے آئے گا تو ہماری نگاہ سب سے پہلے اس کی "حکمیاتی" شاعری ہی کی طرف جائے گی۔

نیاز فتح پوری

ڈاکٹر محمد اجمل

غالب

یہ مختصر سا مقالہ میں نے اس لئے نہیں لکھا' کہ غالب کے ذہن میں کسی قسم کا ذہنی مرض تلاش کروں' غالب کی سخنوری کا مقام بہت بلند ہے' لیکن جابجا یہ احساس ہوتا ہے کہ اس سے بلند تر مقام حاصل کرنے کی کوشش اور آرزو کے باوجود غالب کی شخصیت میں بعض عناصر اور محرکات ایسے بھی ہیں' کہ ان کی وجہ سے وہ اعلیٰ مقام شاید حاصل نہیں کر سکے۔ تخلیقی عمل آگہی اور شعور کو متمول اور پہلو دار بناتا ہے۔ اس کے باوجود جب انسان آگہی کو "انا" میں مدغم کر دے تو سخنوری پیغمبری کا جزو نہیں بنتی۔ میں صرف ان محرکات اور عناصر کا ذکر کروں گا جن کی وجہ سے یہ رشک عرفی' و فخر طالب۔ ہزاروں نفسیاتی حقائق کو ژرف بینی اور باریک نظری سے بیان کرنے کے باوجود تشنگی کا احساس چھوڑ جاتا ہے۔ یہاں میں یہ بھی کہنے کی جرات کرتا ہوں کہ غالب نے جن نفسیاتی حقائق کا کمال حسن سے بیان کیا ہے' ان میں اکثر و بیشتر وہ حقائق ہیں جو دفاعی حیثیت رکھتے ہیں' سپردگی' اور روحانی تغیر کے متعلق جو بصیرتیں شخصیت میں قبولیت و انقلاب سلبی و ایجابی پہلوؤں کا امتزاج ہوا کرتی ہیں وہ غالب میں کسی قدر کم نظر آتی ہیں۔

میرزا غالب کے متعلق کچھ کہنے کی جسارت محض اس لیے نہیں کر رہا کہ سخنہائے گفتنی دارم "اور اس لیے بھی نہیں کر رہا کہ غالب کی شاعری کے متعلق جو متضاد مدارس فکر ہیں' ان میں سے کسی کی حمایت یا مخالفت کروں' مجھے نہ ڈاکٹر شوکت سبزواری اور اثر لکھنوی کے درمیان مناظرے سے سروکار ہے' اور نہ قاضی عبدالودود اور مالک رام وغیرہم کے اختلاف یا اختلافات سے' میں تو بہت اختصار کے ساتھ غالب کے فقط چند شعروں کا حوالہ دے کر کچھ ان کے اجزائے نفس کا تجزیہ کروں گا' یہ تجزیہ فقط ایک پہلو کا ہو گا۔

کہتے ہیں کہ غالب کا کوئی استاد نہیں تھا' اور جہاں تک شہادتیں یک جا ہو سکی ہیں' ان کی بنا پر مجھے یہ فریضہ بہت حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے کہ عبدالصمد ایک فرضی نام ہے اور در حقیقت غالب نے طفولیت یا نوشابی کے زمانے میں کسی خاص استاد کے آگے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا' میں یہ نہیں کہہ رہا' کہ غالب نے اس ضمن میں دروغ گوئی سے کام لیا' سو پشتوں کی سپہ گری پر ناز کرنے والے انسان کو اپنی روحانی نسل کو بھی تو ماضی سے متعلق کرنا تھا' اور اسے بھی بلند مرتبہ دینا تھا۔ اپنے روحانی تعلق کی بنا پر جہاں وہ یہ کہہ سکتا ہے۔

زحید ریم من و تو زما عجب نبود گر آفتاب سوئے خاوراں بگردانیم

غالباً اسے یہ بھی حق حاصل ہے کہ وہ اپنے اعجاز تخیل سے ایک فاضل اجل اور عالم بے بدل استاد کی

تحقیق کرلے' میں اسے جھوٹ نہیں سمجھتا' میں اسے ایک "تحقیق التباس" سمجھتا ہوں' جس کے بغیر شعر گوئی بھی غالباً امر محال ہے' لیکن تحقیق التباس کو ذہنی حقیقت کا ایک پہلو سمجھ کر اسے ذہنی سطح پر صحیح تصور کرنا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آخر اس استاد کو پہلے پارسی' آتش پرست ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ اور پھر بعد میں مسلمان ہو گیا' آتش پرستی غالب کے تصور کا ایک اہم پہلو تھا' اور یہ پرستش اس کے تفکر اور تدبر کا ایک لازمی انداز تھا۔ اور اسی پرستش کی وجہ سے اس کے اندر گرمی اندیشہ پیدا ہوئی' اور اسی پرستش کی بنا پر اس کی آگہی میں آشوب تھا'

اس آشوب کا ایک پہلو تو یہ تھا کہ غالب میں جابجا ایک کیفیت کا اثبات ملتا ہے اور پھر فوراً اس کے بعد اس کی تردید ہو جاتی ہے' کوئی کیفیت ایسی نہیں جو جم کر ثبات حاصل کرکے بڑھے اور پھلے پھولے' مثلاً

بے خودی کردہ سبک دوش فراغے دارم
کوہ اندوہ رگ خواب گرانست مرا

اور اس کے فوراً بعد فرماتے ہیں۔

خارہا از اثر گرمی رفتارم سوخت
منتے برقدم راہ روانست مرا

پھر کہتے ہیں۔

سایہ و چشمہ بہ صحرا دم عیسیٰ دارد
اگر اندیشہ منزل نشود راہ زن ما

یہ ہاں اور نہ کی دو بدھا مستقل طور پر غالب میں ملتی ہے ان کی مشہور غزل جو اس طرح شروع ہوتی ہے۔ بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم' کس قدر امید آفریں جوش و خروش کے ساتھ اس کی ابتداء ہوئی ہے' لیکن اس کا مطلع ملاحظہ ہو۔

من وصال تو باور نمی کند غالب
بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ غالب کے ہاں اجزائے نفس کا تو احساس شدید ہے لیکن ان اجزاء کو کسی شیرازہ میں یک جا کرنے کی صلاحیت کا شعور کم ہے۔ پارہ پارہ ہونے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کا شعور تو ہے لیکن ان ٹکڑوں سے کوئی نئی ترکیب Gynthesis بنانے کی کوشش نہیں ہے۔ نار کی فراوانی ہے' لیکن اس میں نور بننے کی سکت نہیں ہے' جب ہم ذہنی کش مکش اور ہاں اور نہ کی دو بدھا کو تعقل اور ذہن کی سطح پر نہ لائیں اور دل کی گہرائیوں میں سلگنے دیں تو شخصیت میں تغیر پیدا ہوتا ہے' شکوہ و شکایت کے ساتھ ساتھ تسلیم و رضا کے جذبات بھی ملتے ہیں اور خودی اور بے خودی ایک ہی سمندر کی موجیں معلوم ہوتی ہیں' اسی لیے غالب کے وہ اشعار جو روحانی یا فلسفیانہ مطالب کے حامل ہیں' اکثر و بیشتر کسی روحانی مسئلے کا عاقلانہ جواب ڈھونڈتے ہیں' دل کی حرارت گرمئی اندیشہ بن جاتی ہے۔

یہ گرمئی اندیشہ کیا چیز ہے؟ جب ہم اندیشہ اور تفکر کا تجزیہ کرتے ہیں' تو اس میں ہمیشہ ایک سرد مہری' ایک برفانی قسم کی بے رخی اور بے نیازی پاتے ہیں' ایک معروضی کیفیت جو موضوعی حدت و تمازت سے محروم ہوتی ہے۔ خون جگر سے فلسفہ لکھا جا سکتا ہے اور ڈی ایچ لارنس کی طرح انسان خون کو کبریائی حیثیت بھی دے سکتا ہے' لیکن کیا جب غالب گری اندیشہ کا ذکر کرتے ہیں' تو وہ دراصل سوز غم ہائے نہانی کی طرف اشارہ نہیں کر رہے۔ اگر وہ سوز غم ہائے نہانی کو اسی سطح پر رہنے دیتے تو شاید یہ معاملہ یہیں تک رہ جاتا لیکن غالب میں جا بجا یہ عمل دکھائی دیتا ہے کہ وہ سوز غم ہائے نہانی کو اندیشہ اور تفکر کی سطح پر اس لیے لاتے ہیں' کہ وہ غم کو دل کی سطح پر برداشت نہیں کر سکتے' انہیں یہ خدشہ محسوس ہوتا ہے کہ غم دل میں رہا' تو انہیں پارہ پارہ کر دے گا' ان کے اجزائے نفس کا شیرازہ بکھر جائے گا' غم اندوہ کی آگ ان کے اندیشے میں سلگتی رہتی ہے' اور یہی نار انا' ان کے وجود کو بقا اور ان کی شخصیت کو یک جہتی بخشتی ہے یہی وجہ تھی کہ غالب نے یہ کہا۔

ہاتھ دھو دل سے یہی گری گر اندیشہ میں ہے
آبگینہ تندی صہبا سے پگھلا جائے ہے
عرض کیجئے جوہر اندیشہ کی گری کہاں
اک خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

غالب کی شاعری کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔ انہیں یہ بھی خدشہ رہتا ہے' کہ کہیں یہ سوز غم ہائے نہانی' روشنی نہ بن جائے' یہ نار نور کا قالب نہ ڈھال لے' اور نار نور تبھی بنتی ہے' جب انسان غم ہائے نہانی کو برداشت کرے' ان کی آگ میں جلنے پر آمادہ ہو اور راکھ بن کر نئے سرے سے روشن ہو' اور نئے چراغ جلانے پر آمادہ ہو' غالب میں اس قسم کی آمادگی کہیں نظر نہیں آتی' دیر و حرم اس کے لیے واماندگی شوق کی پناہیں ہیں' اور دیکھیے جاگیرداری رسم و رواج کو جا بجا غیرت اور خودداری کا نام دے کر کس کس طرح نور سے فرار کرتا ہے۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

اور پھر دیکھیے کہ غالب ہی کہتے ہیں

خلد را نہادم من لطف کوثر از من جو
کعبہ راسوارم من ماسوا نہ از من پرس

گری اندیشہ سے انا کو تابناک اور زندہ رکھنے والا شخص اس مقام پر کیسے پہنچ سکتا ہے' جہاں کعبہ اس کے گرد گھومنے لگے اور اس کے منہ میں پتھر پانی میں ڈھل جائے۔

تشنہ لب بر ساحل دریا زغیرت جاں دہم
گر بموج افتد گمان چین پیشانی مرا

مجھے تو اس قسم کی غیرت اور خودداری میں وہ خود فریبی نظر آتی ہے' جو اکثر جاگیردارانہ رسم و رواج میں

ہوتی ہے۔ یہ وہ روٹھ جانے کی کیفیت ہے، جسے قبائلی مزاج دشمنی یا عداوت کا لقب عطا کرتا ہے، موج کی چین شانی پر ہی بات نہیں لیکن اگر موج کی چین شانی کا شک بھی ہو جائے تو غالب پیا سامرنے کو تیار ہے۔

پھر یہی حال دیکھیے سر پھوڑنے کی تمنا کا؟

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو؟

سوال یہ ہے کہ سر آپ کہیں پھوڑیں، محبوب کے آستاں پر نہ پھوڑیں۔ لیکن خیال تو محبوب ہی کا رہے گا، اس سے کیا فرق پڑتا ہے، فقط یہ کہ محبوب کی انا کے سامنے میری انا ہیچ اور کم تر نظر نہ آئے، اور غالب کی انا آگ تھی، اور اس آگ کو نور بنانے کے لئے غالب کو اس آگ کو دل میں رکھنا اور برداشت کرنا تھا، کیونکہ یہ آگ دل میں رہ کر ہی نور بن سکتی ہے۔

مالک رام۔ ایم اے

غالب اور رقیب

"غالب نے جہاں دوسری متعدد باتوں میں شاہراہ عام پر چلنے سے اجتناب کیا۔ وہاں رقیب سے متعلق بھی اس کا رویہ بہت احتیاط اور رکھ رکھاؤ کا ہے اس کے پورے اردو دیوان میں رقیب کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں ملتی جو اس کے خود اپنے یا کسی اور خوددار آدمی کے مرتبہ سے فروتر ہو۔ یا جسے سن کر کسی شخص کی شرم سے آنکھیں جھک جائیں۔

عام طور پر جب شعرا رقیب کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے سامنے اور باتیں ہوتی ہیں۔ یا تو اس میں شکایت کا پہلو ہوتا ہے کہ معشوق نے اپنی وفا کا حال بیان کرکے اس کے دل میں رحم اور انصاف کے جذبات پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے کہ تم میری قدر نہیں کرتے، حالانکہ تمہارا جاں نثار ہوں اور میرے مقابلے میں رقیب کو ترجیح دیتے ہو جو بوالہوس اور ہرجائی ہے یا پھر اس میں واسوخت کا رنگ ہوتا ہے کہ معشوق کو ظلم و ستم جور و جفا کے طعنے دے کر اپنی بغاوت کا اعلان کیا جاتا ہے۔

غالب نے ان دونوں سے الگ روش اختیار کی۔ اس نے جہاں بھی رقیب کا ذکر کیا ہے وہ گویا ضمناً" آ گیا ہے ہر جگہ مقصود معشوق کی کسی خوبی کا بیان ہے اور سبیل تذکرہ اس میں رقیب کا نام ہے۔

مسعود حسین خاں

کلام غالب

کے صوتی آہنگ کا ایک پہلو

زبان کی بنیاد اصوات پر قائم ہے لیکن اصوات بے معنی ہوتی ہیں- ان میں معنی پیدا ہوتے ہیں لفظ کی سطح پر- ادبی اسلوب کا دارومدار الفاظ کے انتخاب اور استعمال پر ہوتا ہے- تاہم اچھا فن کار' بالخصوص شاعر اپنے ادبی اسلوب کی تشکیل میں زبان کی صوتیاتی سطح کا' شعوری یا غیر شعوری طور پر احساس رکھتا ہے- اس میں شک نہیں کہ عظیم شاعری میں ماورائے صوت بھی کچھ ہوتا ہے تاہم اچھی شاعری زبان کے صوتی وسائل سے بے نیاز ہو کر نہیں کی جا سکتی-

محاسن و معائب سخن کے تحت قدماء نے آہنگ صوت اور تنافر صوت کے مسئلہ کو بارہا اٹھایا ہے- پچھلے چار دہوں میں توضیحی لسانیات کی حیرت انگیز ترقی کی وجہ سے صوتیات کے مسائل میں زیادہ درک اور بصیرت حاصل ہوتی جا رہی ہے- اور اس کے ذریعہ قدماء کے فرمودات کی بہتر تشریحات کی جا سکتی ہیں- قدماء کے لسانی شعور پر "حرف" کا تصور مستولی رہا ہے- موجودہ لسانیات کے مطابق "حرف" پر "صوت" کو فوقیت حاصل ہے- اس لئے کہ ایک زبان ایک سے زائد رسم خط میں لکھی جا سکتی ہے-

اردو کے کسی شاعر کے صوتی تاروپود کا تجزیہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس زبان کی بنیادی آوازوں' ان مخارج اور طریق ادائیگی سے بخوبی واقفیت رکھتے ہوں- اردو کی بنیادی اصوات دس مصوتے جنہیں حروف علت کہا جاتا ہے- اور 37 مصمتے (یعنی حروف صحیح) ہیں- مصوتوں میں زبر' زیر ( ) ی ( )' ے ( ) منہ کے اگلے حصے سے برآمد ہوتے ہیں- پیش ( ) و ( )' و ( ) و ( ) اور الف ( ) منہ کے پچھلے حصے سے نکلتے ہیں-

جہاں تک مصمتوں کا تعلق ہے سب سے زیادہ تعداد بندشی (Stops) آوازوں کی ہے- یعنی 21_ اس کے بعد صفیری (Fricative) آوازیں آتی ہیں جو تعداد میں 9 ہیں آوازوں کی دوسری اقسام انفی (nasals) (م ن / اور پہلوئی (Lateral) / ل اور تھپک دار Flaps / ڑ' اور ڑھ / ہیں- ان کے علاوہ ایک نیم مصوتہ / ی / بھی ہے-

بنیادی طور پر آوازوں کی دو قسمیں ہیں- مسموع (Voiced) اور غیر مسموع (voiceless) اردو کے

سارے مصوتے مسموع ہیں اور ان کی ادائیگی کے وقت صوت تنتریوں (Vocal Card) میں تھرتھراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ مصوتوں میں مسموع کی تعداد 22 ہے اور غیر مسموع کی 15- اس طرح اردو کے صوتی دام میں کل 32 آوازیں مسموع ہیں اور 15 آوازیں غیر مسموع۔

یہ ہے غالب کی صوتی جولاں گاہ اور میدان عمل- غالب اردو کے علاوہ فارسی کے بھی شاعر تھے۔ ذو لسانی شاعر ہونے کی حیثیت سے وہ دونوں زبانوں کے نظام صوت کا شعور رکھتے ہیں- جس طرح ان کی فارسی دانی بلکہ پرستی نے ان کی اردو شاعری میں فارسی الفاظ و تراکیب کا غیر معمولی ذخیرہ جمع کر دیا ہے- اسی طرح فارسی آہنگ صوت میں مسلسل عمل کرنے کی وجہ سے انہوں نے اردو نظام صوت میں خاصے رد و قبول سے کام لیا ہے- جہاں تک فارسی اور اردو کے مصوتوں کے تقابلی مطالعہ کا تعلق ہے یہ عمل بے سود ہے- اس لئے کہ ہندوستان میں فارسی اردو مصوتوں پر ڈھال کر بولی جاتی رہی ہے- ہندوستان فارسی بولنے والا "شیر بیشہ" اور "شیر مادر" تلفظ کے فرق کے ساتھ بولتا تھا جب کہ ایرانی یائے مجہول اور یائے معروف میں فرق نہیں کرتا البتہ جہاں تک مصمتوں کا تعلق ہے فارسی اور اردو میں دو قسم کے اہم اختلافات پائے جاتے ہیں- ایک تو فارسی میں اردو کی کوز آوازیں (ٹ، ٹھ، ڈ، ڈھ، ڑ، ڑھ) (Retroflex) نہیں پائی جاتیں- دیوان غالب کے صفحے کے صفحے الٹتے جایئے- شاعر میر، سودا اور نظیر اکبر آبادی کی صوتی روایت کے علی الرغم ان آوازوں سے مرکب الفاظ استعمال نہیں کرتا اور اگر کرتا ہے تو بہت احتیاط سے اور بہت کم مثلاً غالب کی مشہور غزل جس کا مطلع یہ ہے۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

گیارہ اشعار کی یہ غزل 202 الفاظ پر مشتمل ہے جن میں سے کوز آوازیں صرف چار لفظوں (جھوٹ، توڑ، ٹپکتا، اٹھتا) میں آئی ہیں- اس لحاظ سے تناسب دو فیصد سے زیادہ نہیں- یہی صورت دوسری کامیاب غزل-

ع "نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے"

کی ہے- پوری غزل میں صرف چار لفظ ایسے آئے ہیں- جن میں کوز آوازوں کو استعمال کیا گیا ہے- غالب کی بعض معرکۃ الآرا غزلیں جن میں کوز آوازیں مطلق استعمال نہیں ہوئی ہیں- حسب ذیل ہیں-

ع دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟
ع کوئی امید بر نہیں آتی
ع گئی وہ بات جو ہو گفتگو تو کیوں کر ہو
ع گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
ع اے تازہ وار دان بساط ہوائے دل
ع مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہئے
ع یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں۔

ع نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں
ع کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں
ع جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
ع کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ع آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک
ع نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
ع ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
ع وہ میری چین جبیں سے غم پنہاں سمجھا
ع تو دوست کسی کا بھی ستم گر نہ ہوا تھا۔

یہ ایسی غزلوں کی مکمل فہرست نہیں تاہم اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ غالب کے کلام کے بہترین حصے میں بند آریائی کوز آوازیں غائب ہیں۔ ان سے قطع نظر دیوان غالب میں ایسی غزلیں بھی بے شمار ہیں۔ جن میں کوز آوازیں ایک یا دو بار استعمال میں آتی ہیں۔

صوتیاتی نقطہ نظر سے اردو کی کوز آوازیں وہ آوازیں ہیں جن میں زبان کی نوک موڑی جاتی ہے۔ اور پھر ہوا یا تو روک کر یا ایک تھپک کے ساتھ خارج کی جاتی ہے۔ /ٹ' ٹھ' ڈ' ڈھ/ بندشی آوازیں ہیں۔ لیکن ان میں ہوا زبان کی نوک موڑ کر اوپر کے مسوڑھوں پر روک کر چھوڑی جاتی ہے۔ /ڑ _ ڑھ) تھپک دار آوازیں ہیں۔ ان کی ادائیگی کے وقت ہوا مکمل طور پر نہیں روکی جاتی بلکہ ایک تھپک کے ساتھ چھوڑی جاتی ہے۔ تاریخی نقطہ نظر/ ڑ' ڑھ / مابعد کا ارتقا ہیں۔ اور قدیم کوز آوازیں جو ویدک سنسکرت سے اب تک آریائی زبانوں میں قائم ہیں /ٹ' ٹھ' ڈ' ڈھ / ہی ہیں۔ ان میں /ٹ اور ٹھ / غیر مسموع ہیں اور / ڈ اور ڈھ سموع۔ ایک دوسرے لحاظ سے تقسیم کریں تو / ٹھ ڈھ / ہکاری آوازیں ہیں۔ جب کہ / ٹ اور ڈ / غیر ہکاری۔ کوز آوازیں قدیم و جدید ایرانی میں نہیں پائی جاتیں ایرانی گروہ کی جس زبان میں ان کا چلن ملتا ہے وہ پشتو ہے۔ اس لئے ان آوازوں کو قبل آریائی کہا جا سکتا ہے۔ داردیدی زبانوں میں خاص طور پر پائی جاتی ہیں۔

غالب کی ایرانی نسل اور استاد کے بارے میں جو بھی شبہات ظاہر کئے جائیں' یہ امر مسلم ہے کہ جہاں تک اردو کی کوز آوازوں کا تعلق ہے' ان کے شاعرانہ صوتی نظام میں ان کی حیثیت محض ضمنی ہے۔ انہوں نے ان آوازوں سے کوئی صوتی تاثر قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ جہاں جہاں وہ اپنے کلام کے اچھے حصص میں اس سے مرکب الفاظ لائے ہیں' ان کو اپنے صوتی نظام سے ہم آہنگ کرنے میں انہیں کچھ دقت ہی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ان کا معرکتہ الاراء غزل۔

ع سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں

میں کوز آوازیں صرف حسب ذیل مصرع اور شعر میں آئی ہیں۔

ع ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

ع رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

پوری غزل پڑھ جایئے۔ ان مصرعوں پر صوت کی جو ٹھوکر ملتی ہے اور کہیں نہیں ملے گی۔ / ٹ + گ / ٹ + ج / کا اتصال خود صوتی رخنہ اندازی کی غمازی کر رہا ہے۔
صوتی کھٹکے کا ایک اور مصرعہ ملاحظہ ہو۔

ع تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا۔

عام طور پر غالب نے کوز آوازوں کی ثقالت کو مصوتوں سے رام کیا ہے۔ چنانچہ ذیل کے مصرعوں میں کوز آوازوں کے استعمال کے باوجود ثقالت کا وہ احساس نہیں ہوتا۔ جو مذکورہ بالا غزل کے مصرعوں میں ہوتا ہے۔

ع دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے (ٹ + ا)
ع غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی (ٹ + ی)
ع چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لو (ڑ + ا)
ع بھولے سے اس نے سینکڑوں وعدے وفا کئے (ڑ + وں)
ع کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہئے (ٹ + ے)
ع دوڑے ہے پھر ہر ایک گل ولالہ پر خیال (ڑ + ے)
ع حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد (ٹ + ا)
ع کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے (ڈ + زبر)
ع میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد (ڑ + زبر)
ع در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا (ٹ + زبر)
ع ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا (ڈ + زبر)

لیکن جہاں غالب صرفی و نحوی وقتوں کی وجہ سے کوز آوازوں کے ساتھ مصوتوں کا اجتماع نہیں کر سکے ہیں' وہاں کوز آوازوں کی ثقالت کا ان کے آہنگ کلام میں احساس ملتا ہے' مثلاً

ع غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں (ڑ + ج)
ع زنار باندھ سبحہ صد دانہ توڑ ڈال (ڑ + ڈ)
ع اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے (ڑ + ن)
ع جو پانو اٹھ گئے وہی ان کے علم ہوئے (ٹھ + گ)
ع جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی (ٹ + ج)
ع اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے (ٹھ + ک)

ع گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا (ژ + ب)
ع کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں (ژھ + ی + نیم)
ع دل سے ہوائے کشت وفا مٹ گئی کہ واں (ٹ + گ)

یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ غالب نے اردو کی کوز آوازوں کا اتصال صفیری آوازوں کے ساتھ نہیں کیا ہے۔ ممکن ہے مزید چھان بین سے کوئی ایک آدھ مثال مل جائے لیکن حسب ذیل صوتی اجتماع بادی النظر میں نہیں ملتا: (ٹ + ش)۔ / ڑ + ز / _ / ڈ + ف / _ / ٹھ + س / _ / ڑ + خ / _ / ٹ + غ / وغیرہ۔ اردو زبان میں خالص ہند آریائی آوازوں (ٹ + ٹھ _ ڈ۔ ڈھ۔ ڑ۔ ڑھ۔ بھ۔ بھ۔ تھ۔ دھ۔ جھ۔ چھ۔ کھ۔ گھ) کے ساتھ خالص عربی فارسی آوازوں (ق _ غ۔ ف۔ ز۔ خ۔ ژ) کا اجتماع اردو شاعر کے لئے ایک عجیب و غریب مخلوط نظام صوت فراہم کرتا ہے۔ غزل کا عام مزاج صوتی اعتبار سے بھی ایرانی ہے۔ غالب نے زبان کی دیگر سطحات کی طرح اردو کی صوتیاتی سطح پر بھی ان ایرانی اثرات کا غلبہ قائم کیا ہے۔ غالب کے کلام کے صوتی نظام کا یہ صرف ایک پہلو ہے اس مفروضے کی تصدیق کے لئے اس کے دوسرے پہلوؤں پر اس نقطہ نظر سے کام کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

شیخ محمد اکرام ایم' اے

عرفانیات غالب

انسان جب کسی چیز کی خواہش کرتا ہے اور اسے نہیں پاتا تو اس کی مایوسی قدرتی امر ہے خواہ یہ ناکامی خواہشات کی فراوانی سے ہو یا نامساعد اتفاقات سے' لیکن زندگی میں مسلسل اضطرار اور بے چینی نبھ نہیں سکتی' عام طور پر مایوس اور ناکام لوگ اپنی ناکامیوں کو قضا و قدر کے سر پر ڈال کر سمجھ لیتے ہیں کہ یہ مقدر کا قصور ہے۔ مرزا کی غمزدہ طبیعت نے بھی ایک طرح کا سکون اور توازن حاصل کر لیا تھا لیکن رسمی طور پر قسمت کو ملزم قرار دے کر نہیں بلکہ اس نگاہ ژرف بیں کی مدد سے جو ان کی اپنی ناکامیوں سے آگاہ تھی۔ تو دوسروں کی ناکامیاں اور مایوسیاں بھی اس سے پنہاں نہ تھیں۔ انسان جب یہ دیکھتا ہے کہ زمانے کے ترکش میں ہزاروں تیر ہیں۔ ایک سے ایک زہریلا اور ان سے کوئی محفوظ نہیں تو طبیعت میں ایک طرح کا سکون آ جاتا ہے۔ غالب کے کئی اشعار میں اس خیال کا اظہار ہے۔

میکش اکبر آبادی

مرزا غالب کا مذہب

مرزا غالب کا مذہب کیا تھا؟ وہ شیعہ تھے یا سنی؟ یہ ایک سوال ہے جو ان کی زندگی میں بھی پیدا ہوا' ان کی موت کے وقت بھی اور ان کی وفات کے اتنے زمانے بعد بھی یہ سوال اتنا ہی محتاج جواب ہے جتنا ان کی زندگی میں تھا۔ حالی نے یادگار غالب میں جو کچھ کہا ہے' اس کی بنیاد حالی کا ذاتی علم اور قیاس ہے جو ایک حد تک صحیح مان لینے کے بعد بھی قطعی نہیں ہے۔ حالی لکھتے ہیں:

"اگرچہ مرزا کا اصل مذہب صلح کل تھا مگر زیادہ تر ان کا میلان طبع تشیع کی طرف پایا جاتا تھا اور جناب امیر کو وہ رسول خدا کے بعد تمام امت سے افضل جانتے تھے۔

ایک بار مرحوم بہادر شاہ کے دربار میں کہا' ہم نے سنا ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب شیعی ہیں۔ مرزا کو بھی اطلاع ہو گئی' چند رباعیاں لکھ کر حضور کو سنائیں' جن میں تشیع اور رفض سے تحاشی کی تھی۔ ان میں سے ایک رباعی جو بہت لطیف ہے' مجھ کو یاد رہ گئی ہے' جو یہاں لکھی جاتی ہے۔

رباعی

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری — کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیونکر ہو جو کہ ہووے صوفی — شیعی کیونکر ہو ماوراء النہری"

اس رباعی کی تشریح کرنے کے بعد خواجہ حالی لکھتے ہیں:

"جو لوگ مرزا کی طرز مزاج اور طرز کلام سے ناآشنا ہیں' وہ شاید سمجھیں کہ مرزانے بادشاہ کی حضور میں اپنا رسوخ قائم رکھنے کے لیے اپنا مذہب غلط بیان کیا' لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ سب رباعیاں صرف بادشاہ کو خوش کرنے اور اہل دربار کو ہنسانے کے لیے لکھی گئی تھیں' کیونکہ دربار میں ایک

متنفس بھی ایسا نہ تھا جو مرزا کو شیعی یا کم سے کم تفضیلی نہ جانتا ہو۔"1"۔

یہ ممکن ہے کہ مرزا غالب نے یہ رباعیاں بہادر شاہ کے ہنسانے کو کہی ہوں' لیکن مرزا کے مذہب کے بارے میں سارے دربار کی واقفیت کے باوجود بہادر شاہ کی ناواقفیت کا کیا جواز ہے۔ اس طرح بہادر شاہ کا استفسار اور مرزا کی صفائی ایک لطیفہ اور حالی کا بیان تفنن طبع کے سوا کیا قرار دیا جائے گا۔

خواجہ حالی کی مذکورہ عبارت اور توجیہہ کے ساتھ خود ان ہی کی ذیل کی عبارت ملا کر ملاحظہ کیجئے۔

"مرزا کے جنازے پر جبکہ دلی دروازے کے باہر نماز پڑھی گئی۔ راقم بھی موجود تھا اور شہر کے اکثر عمائد اور ممتاز لوگ جیسے نواب ضیاء الدین احمد خاں' نواب محمد مصطفیٰ خاں حکیم احسن اللہ خاں وغیرہم اور بہت سے اہل سنت اور امامیہ فرقوں کے لوگ جنازے کے مشایعت میں شریک تھے۔ سید صفدر سلطان نبیرہ بخشی محمود خاں نے نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم سے کہا کہ مرزا صاحب شیعہ تھے۔ ہم کو اجازت ہو کہ ہم اپنے طریقے کے موافق ان کی تجہیز و تکفین کریں مگر نواب صاحب نے نہیں مانا اور تمام مراسم اہل سنت کے موافق ادا کیے گئے۔ اس میں شک نہیں کہ نواب صاحب سے زیادہ ان کے اصلی مذہبی خیالات سے کوئی شخص واقف نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر ہمارے نزدیک بہتر ہوتا کہ شیعہ اور سنی دونوں مل کر یا علیحدہ علیحدہ ان کے جنازے کی نماز پڑھتے اور جس طرح زندگی میں ان کا برتاؤ شیعہ اور سنی دونوں کے ساتھ یکساں رہا تھا' اسی طرح مرنے کے بعد بھی دونوں فرقے ان کی حق گذاری میں شریک ہوتے۔"2"۔

اگر خواجہ حالی کا پہلا بیان تسلیم کر لیا جائے کہ "دربار میں ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جو مرزا کو شیعی یا کم سے کم تفضیلی نہ جانتا ہو" تو ان کی تجہیز و تکفین کے وقت یہ اختلاف پیدا ہی نہ ہونا چاہیے تھا' لیکن تجہیز و تکفین کے واقعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب سنی تھے کیونکہ بقول مولانا حالی نواب ضیاء الدین احمد خاں سے زیادہ مرزا کے اصلی مذہبی خیالات سے کوئی شخص واقف نہ تھا۔

ان عبارتوں سے ایک بات ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ مرزا غالب نہ ایسے شیعہ تھے جس میں شبہ کی گنجائش نہ ہو اور نہ ایسے سنی تھے کہ ان کو قطعیت کے ساتھ سنی کہہ دیا جائے۔ اس موقع پر ایک بات ذہن میں

رکھنا ضروری ہے کہ مذہب کے معاملہ میں شیعہ اور سنی دونوں علیحدہ علیحدہ مزاج رکھتے ہیں۔ سنیوں کا مزاج یہ ہے کہ اگر کوئی شخص سنیوں کے پورے مذہب کے مطابق ہو اور اس کے ساتھ حضرت علیؓ کی تعریف و توصیف کے ساتھ جناب امیر معاویہ کے بارے میں اتنا مخلص نہ ہو تو اس کو قطعیت کے ساتھ شیعہ کہہ دیا جاتا ہے اور اکثر شیعہ ہونے کے لیے صرف حب علیؓ ہی کافی سمجھی جاتی ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی جو اپنی کتاب "تحفۂ اثناء عشریہ" کی وجہ سے شیعوں کی مخالفت میں بہت مشہور ہیں۔ خود اپنا واقعہ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے صرف حضرت علیؓ کے فضائل بیان کیے تو میرا ایک طالب علم ناخوش ہو گیا اور اس نے مجھے شیعہ سمجھ لیا۔ اس کے برخلاف شیعوں کا مزاج یہ ہے کہ اگر کسی کے کلام میں حضرت علیؓ کی مدح و ستائش ہو اور دوسرے صحابہؓ کا ذکر نہ ہو تو اسے شیعہ تسلیم کر لیتے ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ مرزا غالب کوئی عالم یا مجتہد نہ تھے جو عقائد و کلام کی جزئیات تک کے متعلق اپنا مسلک متعین یا ظاہر کرتے۔ پھر بھی انہوں نے مختلف مواقع پر اپنے عقائد بیان کیے ایک مرتبہ ان سب کا مجموعی طور پر مطالعہ ضروری ہے۔ یہ ضروری اقتباسات "یادگار غالب" اور ان مکتوبات سے پیش کیے جاتے ہیں جو مرزا صاحب نے حضرت جی غمگین دہلویؒ کو لکھے ہیں:

"میں آدھا مسلمان کہ جس طرح قید کیش و ملت سے آزاد ہوں، اسی طرح بدنامی و رسوائی کے خوف سے وارستہ ہوں۔"3

"لیکن اس میں شک نہیں کہ میں موحد ہوں، ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں۔ لا الہ الا اللہ، لاموجود الا اللہ، لا موثر فی الوجود الا اللہ۔"4

"دریبے کے لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا اور رسائل ابو حنیفہ کو دیکھنا اور مسائل حیض و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے، عرفاء کے کلام سے حقیقت حقہ وحدۃ وجود کو اپنے دل نشین کرنا اور ہے۔ مشترک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں، مشرک وہ ہیں جو نو مسلموں کو ابو الائمہ کا ہمسر مانتے ہیں، دوزخ ان لوگوں کے واسطے ہے۔ میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لاموجود الا اللہ، لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھا ہوا ہوں۔ انبیاء سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ ختم المرسلین اور رحمۃ للعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے، ثم حسن ثم حسین۔ اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام" بریں زیستم ہم بریں بگذرم" ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔"
5

"سخن در باب رباعیات ی رود یارب بیان من مخالف پیرو مرشد نہ شود سہ رباعی کہ در آغاز رقم یافتہ مضمون آں دارد کہ علی خلیفہ بود و ایں عقیدہ رامن ندارم من علی را امام دانم و دیگراں را خلیفہ، خلافت مرادف

سلطنت و ریاست است بزبان عرب رئیس و حاکم را خلیفہ گویند اگرچہ معنی لغوی نیابت است بالجملہ علی بلا فصل بعد از نبی امام است و امامت امریست یزدانی و علی امام است ہم در عہد خلافت ابوبکر وہم در عہد خلافت عمر وہم در عہد خلافت عثمان و این کہ مشہور است علی بعد از عثمان خلیفہ شد غلط است اصل این است کہ امام برحق علی مرتضیٰ چون بعد از رسول امام شد ابوبکر صدیق را خلیفہ کردہ امر قضا بوے سپرد تا قطع خطرات مسلمین نماید و برمومنین فرمانروا باشد و پس از و عمر را برگزید و ازاں بعد عثمان را خلافت داد این ہرسہ تن بداو سپردند نبی و امام را اطاعت کردند بعد از عثمان ہیچ کس لائق قضا در مسلمین یافتہ نشد و آنکہ آرزو کرد نیز شائستہ ایں کار نبود لا جرم امام وقت کار قضا بعہدہ خود گرفت و خود بہ قطع خصومات اہل اسلام پرداخت شاہ اگر کار قاضی کند او را قاضی گویند ہماں بالجملہ علی امام است و در عہد ما خلافت خود بعد از حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بہ بنی امیہ منتقل شد و ازاں گروہ بہ آل عباس رسید و ایں ہر دو گروہ برعکس خلفائے ثلثہ ستم ہا کردند و خونہا ریختند و امامت علی و اولاد علی را محو کردند و ائمہ را کشتند۔" (مکتوب مرزا غالب بنام حضرت جی غمگین دہلوی)

ترجمہ:

رباعیوں کے بارے میں بات شروع ہوئی ہے' یا اللہ میرا بیان پیر و مرشد کے خلاف مزاج نہ ہو۔ تین رباعیاں جو شروع میں رقم ہوئی ہیں' ان کا مضمون یہ ہے کہ علی خلیفہ تھے لیکن میرا یہ عقیدہ نہیں ہے' میں علی کو امام سمجھتا ہوں اور دوسروں کو خلیفہ۔ خلافت' سلطنت اور ریاست کے ہم معنی ہے۔ عرب کی زبان میں رئیس اور حاکم کو خلیفہ کہتے ہیں۔ اگرچہ خلافت کے لغوی معنی نیابت کے ہیں۔ غرض یہ کہ علی نبی کے بعد بلا فصل امام ہیں۔ امامت خدا کی طرف سے ہے اور علی امام ہیں۔ ابوبکر کی خلافت کے زمانے میں بھی عمر کی خلافت کے زمانے میں بھی' عثمان کی خلافت کے زمانے میں بھی۔ اور یہ جو مشہور ہے کہ عثمان کے بعد علی خلیفہ ہوئے' غلط ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ امام برحق علی مرتضیٰ جب رسول کے بعد امام ہوئے تو انہوں نے ابوبکر صدیق کو خلیفہ کر کے حکومت کا کام ان کے سپرد کر دیا' تاکہ مسلمان خطروں سے محفوظ رہیں اور مسلمانوں پر فرمانروائی کریں۔ اس کے بعد عمر کو پسند کیا اور ان کے بعد عثمان کو خلافت دی۔ ان تینوں نے اپنے کو سپرد کر دیا اور نبی اور امام کی اطاعت کی۔ عثمان کے بعد کوئی شخص حکومت کے قابل مسلمانوں میں نظر نہ آیا۔ جس شخص نے اس کی آرزو کی' وہ بھی اس کا اہل نہ تھا۔ مجبوراً" امام وقت نے حکومت کا کام بھی خود ہی سنبھال لیا اور اہل اسلام کے جھگڑوں کو طے کرنے لگے۔ بادشاہ اگر قاضی کا کام کرنے لگے تو اسے قاضی نہیں کہیں گے۔ علی ہی امام ہیں اپنے عہد میں لیکن خلافت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد بنی امیہ کو منتقل ہوئی اور ان سے آل عباس کو پہنچی۔ ان دونوں گروہوں نے خلفائے ثلثہ کے برعکس بہت سے ظلم کیے اور خون بہائے' علی اور اولاد علی کی امامت کو مٹایا اور ائمہ کو شہید کیا۔"

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے' اس کا تعلق مرزا غالب کے شیعہ یا سنی ہونے سے تھا۔ مولانا حالی نے ان کے متعلق جو لکھا ہے وہ بھی قابل توجہ ہے:

"مرزا اسلام کی حقیقت پر نہایت پختہ یقین رکھتے تھے اور

توحید وجود ہی کو اسلام کا اصل اصول اور رکن رکین جانتے تھے۔ اگرچہ وہ بظاہر اہل حال سے نہ تھے مگر جیسا کہ کہا گیا ہے "من احب شیئاً اکثر ذکرہ" توحید وجود ہی ان کی شاعری کا عنصر بن گئی تھی..... انھوں نے تمام عبادات اور فرائض و واجبات میں سے صرف دو چیزیں لے لی تھیں۔ ایک توحید وجودی اور دوسرے نبی اور اہل بیت نبی کی محبت' اور اسی کو وہ وسیلہ نجات سمجھتے تھے۔"6۔

ایک مشہور قول ہے۔ "الصوفی لا مذہب لہ" صوفی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔اس کی تشریح خود صوفی اس طرح کرتے ہیں کہ صوفی کسی معین مذہب کا مقلد نہیں ہوتا۔ چنانچہ صوفی ہر مذہب میں پائے جاتے ہیں۔ اور خود اسلام میں صوفی مختلف مدرسہ ہائے فقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔اصل میں تصوف ایک مخصوص طرز فکر اور مخصوص عقیدہ کا نام ہے۔ مذہبی اعمال کو بھی وہ اپنے مخصوص نقطہ نظرے دیکھتے اور پرکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک ہی سلسلے کے صوفیوں میں کوئی مالکی ہے' کوئی حنبلی' کوئی حنفی ہے' کوئی شافعی۔ البتہ صوفیانہ نظریات میں وہ اپنے نظریے سے مخلص اور اس کے پابند ہوتے ہیں۔ مرزا غالب شدت کے ساتھ وحدت الوجود کے قائل ہیں اور اپنے مکتوبات بنام غمگین میں وہ شیخ اکبر ابن عربیؒ کے پیرو ہیں لیکن اس مسلک میں بھی وہ ابن عربی کے نظریہ اعیان سے اپنا ایک علیحدہ راستہ مقرر کر لیتے ہیں۔ ابن عربی کے وہ اس حد تک متبع ہیں کہ وجود کو ایک ناقابل تقسیم اکائی مانتے ہیں اور خدا کے سوا کسی کو موجود نہیں مانتے۔ لیکن ابن عربی کے برخلاف وہ اس عالم کو وہم اور عدم محض سمجھتے ہیں' اس کی تشریح انھوں نے اپنے مکتوبات میں بھی کی ہے اور اشعار میں بھی۔

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور   جز وہم نہیں ہستی اشیاء مرے آگے

ہاں کھائیو مت فریب ہستی   ہرچند کہیں کہ ہے نہیں ہے

اس طرح مرزا غالب ابن عربی سے زیادہ ویدانت کے نظریے کے متبع معلوم ہوتے ہیں۔ یہ موقع اس کا نہیں ہے کہ ویدانت کے نظریے کی تشریح کی جائے۔ مگر اتنا عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ ویدانت بھی پوری طرح مرزا غالب کا موئد نہیں ہے اور اس عالم کو یوگ و ششٹھ اور بدھ مت کی طرح عدم محض نہیں مانتا ہے' بلکہ اس کے نزدیک صورت عالم دھوکہ ہے' نہ اسے نیست کہہ سکتے ہیں نہ ہست۔

خلاصہ یہ کہ مرزا صاحب ایسے صوفی تھے جو وحدۃ الوجود پر مکمل ایمان رکھتا ہو اور شراب بھی پیتا ہو اور ایسے سنی تھے جو حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافت کو حضرت علیؓ کا عطیہ مانتا ہو اور حضرت علیؓ کو ہر حیثیت سے سب سے افضل سمجھتا ہو۔ اسی طرح وہ ایک ایسے شیعہ تھے جو حضرات ابوبکر و عمر کو خلیفہ تسلیم کرتا ہو اور حضرت علیؓ کو خلیفہ بلا فصل نہ مانتا ہو۔اس طرح وہ درحقیقت آزاد رو تھے اور تقلید کو شاعری کی طرح مذہب میں بھی روا نہیں

رکھتے تھے اور اپنی روش عام سے ہٹ کر چلنے کی عادت کو مذہب میں بھی نہیں چھوڑ سکتے تھے۔
ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

حواشی

1۔ یادگار غالب ص 69
2۔ یادگار غالب ص 90 مطبوعہ فیض عام علی گڑھ
3۔ ایضاً" بحوالہ (ستنبو ص 36)
4۔ ایضاً" ص 48-49
5۔ یادگار غالب ص 163-164
6۔ یادگار غالب ص 67

ڈاکٹر شوکت سبزواری

غالب کی شخصیت

عشق و محبت ہماری غزل کا ایک خاص باب ہے محبت میں خواری غزل کا خاص جوہر تھا غالب نے اس کو خودداری سے آشنا کیا' اس میں جلال کا رنگ بھرا۔ فرشتوں کی بے لوثی اور طہارت پیدا کی' سوز کی جگہ ساز' گداز کی جگہ شگفتگی اور افسردگی کی جگہ درد دیا۔ عشق کا آب و رنگ یہ مردانہ صفات ہیں۔ غالب نے اپنی غزلوں میں اپنی پوری شخصیت سمو دی ہے۔ ان میں رفعت' خودداری اور بے نیازی کی لہریں دوڑادی ہیں غالب کا کلام ان کی شخصیت کا آئینہ ہے۔ انسانیت کے اعلیٰ جذبات کی صدائے بازگشت ہے۔ اس میں فطرت کے جوہر چمکتے ہیں۔ وہ ہمیں اس مقام تک لے جاتا ہے جہاں سے فرشتے کوتاہ قد و حقیر نظر آتے ہیں۔ یہ انسانیت کا مقام ہے۔ وہ انسانیت جس کے سامنے فرشتے جھکنے پر مجبور ہوئے وہ انسانیت جو خدا کی مقدس امانت کی حامل ہے' محبت کے اصلی جوہر یہیں کھلتے ہیں۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

مرزا سجاد علی خاں اختر

غالب کے سفر

ایک مدت مرزا اسد اللہ خاں غالب کا تعلق لکھنؤ سے رہا۔ ان کے والد بزرگوار مرزا عبداللہ بیگ نواب آصف الدولہ فرماں روائے اودھ کے ملازم رہے۔ نواب سے نہ بن سکی اس لیے لکھنؤ چھوڑ کر حیدر آباد چلے گئے۔ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ جس طرح باپ کو راس نہ آیا اسی طرح بیٹے کے لیے بھی یہاں کا ماحول کبھی سازگار نہ ہو سکا۔

جس وقت مرزا صاحب کی مالی حالت خرابی ہوئی ریاست فیروز پور جھرکا کی پنشن بھی بند ہو گئی۔ پریشان حالی نے دامن پکڑا۔ قرض خواہوں نے گھر گھیرا۔ چھوٹے بھائی کی دیوانگی نے دیوانہ بنایا تو دہلی چھوڑ کر کلکتہ کا سفر اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔

1836ء '37 کے لگ بھگ میں غالب لکھنؤ آئے۔ کہتے ہیں کہ موصوف یہاں ٹھہرنے کے ارادے سے نہ آئے۔ اس امر خاص پر کوئی مضبوط دلیل نہیں دی جا سکتی کیونکہ کہ کلکتہ کے سفر کی تفصیل میں لکھنؤ کے قیام پر بہت زیادہ نہیں لکھا گیا ہے۔ بہر حال جب دلی لٹی۔ دربار شاہی کی بہاریں مبدل بہ خزاں ہوئیں۔ روسا و امرائے شہر کی زندگیوں میں انقلاب آیا تو جیسے شہر کے فن کاروں کو وطن چھوڑ کر تلاش معاش میں رواں دواں ہونا پڑا اسی طرح شاعروں' افسانہ نگاروں موسیقاروں' اور دوسرے ادیبوں اور مفکروں کو بھی غریب الوطنی اختیار کرنا پڑی۔ حکومت کی تبدیلی کے بعد حالات بھی بدلے۔ شاعروں میں نہ ذوق کو شاہ کی استادی کا فخر رہا نہ مرزا صاحب کو روسائے دہلی کی جنبہ داریوں پر ناز۔ جس طرح عوام پر بدلتے ہوئے ماحول کا اثر ہوا اسی طرح مرزا اسد اللہ خاں غالب بھی زمانہ کی گردشوں کا شکار ہوئے۔ ہر طرف سے راہ چارہ مسدود ہوئی۔ نفس نے تنگی کی۔ دماغ منتشر ہوا۔ تو سفر پر کمر باندھی۔ اپنی بے کسی کا عالم مرزا صاحب نے خود اپنے ایک خط میں تحریر کیا ہے:

"ہنگامہ دیوانگی بروار یک طرف دغو عنہائے دام خواہاں یکسو۔
آشوبے پدید آمد جہاں جہاں شکستگی و عالم و عالم خستگی باخود
گرفتم......"

زندگی کے ان ہی مصائب نے مجبور کیا کہ وہ کلکتہ کا سفر اختیار کریں۔ شاید اس سفر ہی سے تکلیفیں دور ہو جائیں۔ سفر کا کوئی مخصوص پروگرام تو بن نہ سکا۔ سب کو خدا پر چھوڑا اور بسم اللہ کہہ کر گھر سے نکل پڑے۔

منزلیں طے کرتے ہوئے تھکے ماندے کانپور تک آئے تو سوچا کہ کچھ دن آرام کیا جائے۔ پھر کچھ ذہن میں آیا تو لکھنؤ کی جانب رخ کیا۔ اودھ سے چونکہ رشتہ دیرینہ تھا۔ پدر بزرگوار کی اچھی خاصی زندگی یہاں گذر چکی تھی۔ گو شاہی دور میں تبدیلی ہو چکی تھی۔ آصف الدولہ سا سخی دینا سے اٹھ چکا تھا لیکن سخن پرستی اور ادب نوازی میں کوئی کمی نہ ہوئی تھی دولت کی فراوانی کا وہی عالم تھا جو آج سے تیس سال پہلے تھا۔ ادیب اور شعراء لکھنؤ آتے جاتے رہے..... مگر نہ جانے کیوں دربار شاہی سے ان کا توصل کبھی مضبوط نہ ہو سکا۔ نواب آصف الدولہ کے دور میں میر تقی میر آئے۔ نواب سے مدت تک انہیں خاصی نزدیکی رہی لیکن چونکہ خوددار تھے اک روز فن شاعری کے کسی مسئلے پر ردو قدح ہوئی..... میر صاحب نے دربار کو سلام کہا۔ فاقہ گوارا کیا لیکن ذلت کی روٹی گوارا نہ کی۔ در در کی ٹھوکریں کھائیں مگر دربار کا کبھی رخ نہ کیا——— غالب کے پدر بزرگوار مرزا عبداللہ بیگ کا بھی یہی حشر ہوا۔ نواب وزیر آف اودھ کی نازک مزاجی برداشت نہ ہو سکی۔ اس لیے ترک ملازمت کے بعد لکھنؤ چھوڑ کر حیدر آباد سدھارے۔

مرزا صاحب کے لکھنؤ آنے کے بہت سے اسباب ہیں لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ جب وہ دہلی سے کانپور پہنچے تو یک بارگی خیال آیا کہ لکھنؤ بھی دیکھ لیا جائے۔ چنانچہ یہ پچاس میل کا سفر بھی برداشت کیا اور افتاں و خیزاں شہر میں پہنچ گئے۔ باشندگان لکھنؤ کا ذوق شاعری اس وقت اپنے پورے عروج پر تھا۔ فرماں روایانِ اودھ کو فنون لطیفہ سے دلچسپی تھی۔ شاعری اور موسیقی دونوں کا خواص اور عوام کا دور دورہ تھا۔ روسا اور امراء خود بھی شاعر تھے اور اساتذہ کا احترام بھی کرتے تھے۔ شاہی محلوں میں بیگمات شاہزادیاں بھی شعرو شاعری پر جان دیتی تھیں۔ مثل مشہور ہے کہ رعایا اپنے حکمراں کی پیروی کرتی ہے۔ لکھنؤ کی رئیس زادیوں نے بھی شاہ زادیوں کی دیکھا دیکھی موسیقی اور شاعری دونوں کو خوب خوب اپنایا۔ نواب آصف الدولہ اور ان کی بیگم شمس النساء بیگم کی شاعری کے چرچے جب بیرون محل آئے تو پھر کیا تھا مرد و زن میں نہ صرف ذوق شاعری نے جنم لیا بلکہ فن شاعری نے عروج کی منزلیں طے کرنا شروع کیں مشہور ہے کہ شمس النساء بیگم صاحب دیوان بھی تھیں ان کی ایک جوابی غزل کے چند شعراس وقت کے معیار کا پتہ دیتے ہیں اپنے شوہر کی غزل کے جواب میں وہ فرماتی ہیں۔

خوشی دل میں ہم اپنے کم دیکھتے ہیں   اگر دیکھتے ہیں تو غم دیکھتے ہیں
نہ قطرہ کوئی خوں کا باقی ہے دل میں   نہ آنکھوں کو ہم اپنی نم دیکھتے ہیں
تو آئے نہ آئے یہاں ہم تو ہر شب   پڑے راہ تا صبحدم دیکھتے ہیں

لکھنؤ میں اردو شاعری کی جانب عام رجحانات کی خبریں اکثر مرزا صاحب کو دہلی پہنچا کرتی تھیں۔ اس حالیہ سفر میں ہو سکتا ہے کہ ان کے ذہن میں یہ خیال آیا ہو کہ سرزمین لکھنؤ ان کے مراتب کے لحاظ سے ان کو خوش آمدید کہے گی اور وہاں کے باشندے بلا تفریق دولت و غربت ان کے شایان شان ان کا خیر مقدم کریں گے۔ ایسا ہی ہوا بھی۔ یہ بادشاہ نصیرالدین حیدر کا زمانہ تھا۔ شاہی خزانہ بھرا پڑا تھا۔ زر و جواہرات کے انبار تھے۔ خزانہ میں دس کروڑ روپے جمع تھے۔ بادشاہ کی جوانی تھی' 35 سال کی عمر میں اودھ کی شاہی ملی تو جوان خیالات میں بھی جوانی آئی

بہت سے نیک کام بھی کیے شاعری اور موسیقی دونوں کے ربط باہمی کی نظیران کے دربار سے شروع ہوئی اور آخری تاجدار اودھ نواب واجد علی شاہ بہادر پر ختم ہوئی۔ افتخار الدولہ مہاراجہ میوہ رام بادشاہ نصیرالدین حیدر کی ناک کا بال تھے۔ اردو شاعری سے بڑا شغف تھا۔ جب مرزا غالب کی آمد کی خبران تک پہنچی تو نام سن کر بے چین ہو گئے ایک ایک سے کہا: "بھائی کوئی جائے اور اس ادیب کامل کو مجھ تک تو لائے....." لوگوں نے مرزا صاحب تک مہاراجہ کا پیغام تو پہنچایا مگر نہ جانے کیوں مرزا صاحب نے مہاراجہ تک آنے کی تکلیف برداشت نہ کی۔ کسی نامعلوم کے ذریعہ بادشاہ کے نائب روشن الدولہ تک رسائی کی جدو جہد کی۔ چونکہ قلمدان وزارت روشن الدولہ ہی کے پاس تھا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ فن کار دربار شاہی تک پہنچنے میں ان ہی کا ذریعہ تلاش کرتے ہوں اور ان ہی کے در کی کنجی کھٹکھٹا کر اپنی مراد کو پہنچتے ہوں۔ مرزا صاحب کو بھی روشن الدولہ کی چوکھٹ پر آنا پڑا۔ وہ آئے اور بادشاہ نصرالدین حیدر کی شان میں قصیدہ بھی کہہ کر لائے۔ مگر وزیر اعظم نے بڑی بے اعتنائی برتی اس لیے ان کا یہ شاہکار بادشاہ کی خدمت میں نہ پہنچ سکا۔ یہ وہ وقت تھا جب اردو زبان کے سلسلہ میں دہلی اور لکھنؤ کی رقابت حدوں سے گذر چکی تھی۔ شاید اسی وجہ سے روشن الدولہ نے غالب کا دربار شاہی تک پہنچنا گوارا نہ کیا ہو۔ قصیدہ پیش کرنا تو درکنار بادشاہ کو ان کی آمد تک کی اطلاع نہ دی مرزا صاحب نرے کھرے شاعر ہی نہ تھے۔ علم مجلس کے علاوہ علم نفسیات میں بھی دخل تھا۔ بڑے قیافہ شناس تھے اپنی ناکامی کے اسباب تک دماغ تے فورا" رسائی کی اور پھر پریشانیوں کے عالم ہی میں قصیدہ تو نہ ہو سکا مگر ایک مدیحہ نثر نائب سلطنت کی شان میں کہی جو صنعت تعلیل کا بہترین نمونہ کہی جاتی ہے۔ لیکن وہ نثر بھی وزیر اعلیٰ تک نہ پہنچ سکی۔ بعض محققوں کا یہ کہنا ہے کہ مرزا صاحب نے اس نثر کے پیش کرنے اور روشن الدولہ سے ملاقات کرنے کی دو شرطیں ایسی پیش کیں جو منظور نہ ہوئیں۔ ایک یہ کہ نائب میری تعظیم دیں۔ دوسرے نذر سے مجھے معاف رکھا جائے عالم لوگوں نے لکھنؤ میں مرزا صاحب کی وزیر اعظم تک رسائی میں کوئی کوتاہی نہ کی۔ انکی ایک دعوت خود روشن الدولہ کے محل میں کی گئی تاکہ وزیر اعظم سے اس شاعر نامدار کا تعارف ہو سکے مگر نہ جانے غالب کا ستارہ اس وقت کس برج میں تھا کہ کسی پہلو بھی کامیابی کی جھلک نہ مل سکی۔ آخر گھبرا کر لکھنؤ چھوڑا اور مزید کچھ کہے سنے کلکتہ روانہ ہو گئے۔

لکھنؤ کے قیام کا تذکرہ باتفصیل کہیں نہیں ملتا نہ جانے یہاں کے بزرگوں نے کسی کی کہی ہوئی کہہ ڈالی کہ "مہاراجہ میوہ رام سے جب نہ بنی تو مرزا صاحب حسین آباد میں نواب سالار جنگ بہادر کے کسی بیٹے پوتے کے مہمان ہوئے۔ اور جب ہر طرف سے مرزا جی پر ناکامی کی بوچھار ہوئی تو حسین آباد بھی چھوڑا اور کچھ دنوں لکھنؤ کی گلیاں چھانتے رہے....." یہ بات من گڑھت ہی معلوم ہوتی ہے کیوں کہ کلکتہ کا مسافر سیکڑوں میل کا سفر جب اختیار کرے گا تو ایسے ساز و سامان کیساتھ گھر سے قدم باہر نکالے گا کہ راہیں تنگ نہ ہونے پائیں اور منزل ہاتھ آجائے۔ کہنے والے نے شاید غلط فہمی میں یہ سب کچھ کہہ دیا اور شاید اس نے میر تقی میر پر گذری ہوئی داستان غالب پر منطبق کر دی یہ تو کئی جگہ ملتا ہے کہ ان کے لیے مشاعرے منعقد کے گئے جہاں شعرو سخن کی تقریبیں نہایت شائستہ طور پر منائی گئیں۔ رئیس زادوں نے ان کی دعوتیں کیں۔ ان کے فن کو سراہا۔ ان کی شاعری کا لوہا

مانا۔ یہ دعوتیں اور دوسری نشستیں زیادہ مشہور تو نہ ہو سکیں۔ لیکن بعض جگہ انکے لطیفے اور چٹکلے ایسے پسند کیے گئے کہ ان کے مزاج کی لطافتوں نے اکثر کے دلوں میں گھر کر لیا۔ ان مجلسوں اور محفلوں کا ذکر کہیں کہیں "لکھنؤ کا سفر اور وہاں کے باشندوں کے اخلاق مظاہرے" کے عنوان سے ملتا ہے۔ مگر ان سب کی تفصیل سوانح غالب میں کہیں نہیں ملتی۔

کہتے ہیں کہ کلکتہ سے واپسی پر مرزا صاحب نے لکھنؤ میں قیام کر کے پھر کوشش کی کہ وہ قصیدہ جو نواب نصیرالدین حیدر کی شان میں کہا تھا اسے کسی نامعلوم دوست کے ذریعہ دربار تک پہنچایا جائے چنانچہ قصیدہ بادشاہ تک پہنچا جس پر پانچ ہزار روپے بطور صلہ ملنے کا حکم ہوا مگر یہاں بھی وہی رقابت کار فرما ہوئی۔ شیخ امام بخش نے مرزا کو لکھا:

"پانچ ہزار ملے تھے۔ تین ہزار روشن الدولہ کھا گئے اور یہ
دو ہزار بچے ہیں جو آپ کو ارسال ہیں۔"

ان دو ہزار میں سے بھی متوسط سے شیخ نے کہا "اس میں سے جو تم چاہو لے سکتے ہو۔" مرزا صاحب کو جب یہ خبر پہنچی تو انہوں نے اس توہین کو برداشت نہ کیا اور واقعات کو بادشاہ کے حضور پہنچانے کی مہم شروع کی۔ ابھی یہ تحریک بار آور نہ ہونے پائی تھی کہ نواب نصیرالدین حیدر کا 1937ء میں انتقال ہو گیا۔ اور مرزا بے نیل و مرام دہلی واپس چلے گئے۔

غالب نے لکھنؤ کے علاوہ اور بھی کئی سفر کیے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر حکم چند نیر نے لکھا ہے کہ مرزا غالب کو سیر و تماشا کی ہوس نہ تھی' ان کی افتاد طبع بھی کچھ ایسی ہی تھی کہ ذرا سی تکلیف ان کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتی تھی۔ اگرچہ وہ اپنے میں طاقت رنج سفر اور یاران وطن کی جدائی کا حوصلہ نہیں پاتے تھے۔ لیکن کچھ توقعات کے پیش نظر انہیں چار و ناچار سفر کرنا پڑا تھا۔ ان کا پہلا سفروہ تھا جو انہوں نے عالم ارواح سے عالم آب و گل کی طرف آتے ہوئے 27 دسمبر 1797ء کو بدھ کے دن سورج نکلنے سے چار گھڑی پہلے آگرے میں پورا کیا۔ ایک خط میں اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں:

"ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب 1212ھ کو روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔"

اس کا دوسرا سفر دلی کی طرف تھا اور یہ چودہ پندرہ برس کی عمر میں طے ہوا تھا۔ دلی آنے اور مستقل سکونت اختیار کرنے کے بعد انہیں کلکتہ اور رام پور جانا پڑا۔

کلکتے کا سفر مرزا غالب کی زندگی کا سب سے لمبا سفر تھا' اس سفر میں انہیں لوہارو' فیروز پور جھرکہ' بھرت پور' کان پور' لکھنؤ' باندہ' الہ آباد' بنارس' عظیم آباد اور ہگلی وغیرہ مقامات پر رکنا پڑا۔ کلکتے کا یہ سفر پنشن کے جھگڑے کے سلسلے میں ہوا تھا چونکہ اس زمانے میں ریل اور موٹریں نہ تھیں اس لیے انہیں یہ سفر گھوڑا گاڑی اور

کشتی کے ذریعہ کرنا پڑا تھا۔ کان پور پہنچ کر مرزا غالب بیمار ہو گئے تھے اور ایسے بیمار کہ ان میں چلنے پھرنے کی طاقت بھی نہ رہی۔ چونکہ کانپور میں اچھے معالج نہ تھے۔ اس لیے بیماری ہی کی حالت میں وہ لکھنؤ چلے آئے۔ جہاں وہ پانچ مہینے زیر علاج رہے۔ جب یہاں بھی ان کی صحت بحال نہ ہوئی تو وہ باندہ کی طرف چل کھڑے ہوئے اور جوں توں کر کے باندہ پہنچ گئے۔ یہاں خدا کے کرم اور نواب ذوالفقار علی بہادر کی تیمارداری اور ہمدردی سے انہیں بیماری سے نجات مل گئی۔ قیام باندہ کی یادگار وہ اردو غزلیں ہیں جو حافظ محمود شیروانی والے نسخے پر درج ملی ہیں۔ باندہ سے روانہ ہوئے تو الہ آباد ہوتے ہوئے بنارس پہنچے۔ بنارس میں وہ یقیناً" موسم برسات کے بعد آئے تھے۔

21 دسمبر 1827ء کو وہ کشتی میں سوار ہوئے اور عظیم آباد ہگلی ہوتے ہوئے 21 فروری 1828ء کو کلکتہ پہنچے کلکتہ میں انہیں اپنے مقدمے کی پیروی کرنا تھی لیکن مقدمہ جلدی فیصل ہوتا نظر نہ آیا تو وہ منشی نصراللہ کو اپنا وکیل مقرر کر کے دلی کے لیے روانہ ہوئے اور تقریباً" تین برس باہر رہ کر 29 نومبر 1829ء کو دلی پہنچ گئے۔ اس سفر میں الہ آباد اور کلکتے میں ناخوشگوار واقعات پیش آئے۔ جن کی تلخی کو وہ زندگی بھر نہیں بھلا سکے۔

مرزا غالب کا چوتھا سفر رام پور کا سفر تھا۔ محمد یوسف علی خاں نواب رامپور سے ان کے پرانے تعلقات تھے۔ 1857ء میں مولانا فضل حق خیر آبادی کی بدولت ان تعلقات کی تجدید ہوئی اور نواب صاحب نے اپنے کچھ اشعار مرزا غالب کے پاس بغرض اصلاح بھیجے۔ نواب صاحب نے رامپور آنے کی انہیں کئی مرتبہ دعوت دی، لیکن وہ 19 جنوری 1860ء سے پہلے رامپور نہ جاسکے۔ مرزا غالب جب رامپور پہنچے تو ان کی اچھی طرح پذیرائی ہوئی۔ خاص کوٹھی قیام کے لیے ملی۔ لیکن بچوں کی وجہ سے وہ اس کوٹھی کو چھوڑ کر محلہ راج دوارہ کے ایک شاہی مکان میں جا رہے۔ مرزا صاحب گرمی اور برسات کا موسم یہاں گذارنا چاہتے تھے۔ لیکن عارف مرحوم کے صاحبزادوں نے دلی چلنے کی رٹ لگا دی۔ اس لیے نواب صاحب سے اجازت لے کر 24 مارچ 1860ء کو دلی آ گئے۔

رامپور کا دوسرا سفر 1865ء میں پیش آیا۔ اس سفر کی تقریب نواب محمد یوسف علی خاں مرحوم کی تعزیت اور نواب کلب علی خاں کے جشن مسند نشینی کی تہنیت تھی۔ مرزا غالب 12 اکتوبر 1865ء کو رامپور پہنچے نواب صاحب تعظیم و تکریم اور محبت سے پیش آئے۔ اس بار انکا قیام جرنیلی کوٹھی میں تھا۔ تقریباً" ڈھائی مہینے رہ کر وہ 28 دسمبر کو دلی کے لیے روانہ ہوئے۔

مرزا صاحب کا یہ سفر کامیاب ترین سفر تھا۔ نواب صاحب نے انہیں ایک ہزار روپے بتقریب جشن تخت نشینی اور دو سو روپے بطور زاد راہ عنایت فرمائے۔

☆ ☆

غالب اور طب قدیم

حکیم محمود احمد برکاتی

علوم و فنون جب عروج و ارتقا کی منزلوں میں ہوتے ہیں تو ان کی سرپرستی آزاد اور حوصلہ مند اقوام کے حصے میں آتی ہے۔ ان اقوام کے ذہن و فکر کی جولانیوں کا موضوع ان علوم و فنون کو قرار دیتے ہیں اور عالم انسانیت کے دروازے پر ایک نئے علمی انقلاب کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔

دنیائے علم و حکمت ان رو بہ عروج علوم و فنون کی کلیات و نظریات کو تسلیم و قبول کا خراج پیش کرتی ہے۔ ذیلی علوم و فنون میں ان کے آراؤ افکار کو "مسلمات" کے طور پر قبول کیا جاتا ہے۔ ان کے "قیاسات" کو "حقائق" کا درجہ دیا جاتا ہے۔ ان کے "تجربات" کی طفیلی فنون کو "منسوخ" کر دیتے ہیں۔ ان کے تصورات میں ترمیم کی نیم معتبر اطلاع بھی کتابوں کی الماریوں پر قدامت (Out of date) کی مہر لگا دیتی ہے' سکہ بھی انہی کے نام کا چلتا ہے اور خطبہ بھی انہی کے نام کا پڑھا جاتا ہے اور۔

جس سمت وہ نظریں اٹھتی ہیں' دنیا بھی ادھر ہو جاتی ہے!

بالآخر علم و حکمت کے حصار کے باہر بھی ان علوم و فنون کا بول بالا ہونے لگتا ہے۔ عام بول چال اور شعر و ادب میں تلمیحات اور ضرب الامثال کے طور پر ان کے نظریات کا استعمال عام ہو جاتا ہے۔

طب قدیم بھی ایک زمانے میں عروج و ارتقاء کی منزل میں تھی' یہ ایک حوصلہ مند امت سے منسوب تھی اور اس کے جواں ہمت اور اولوالعزم افراد کی توجہات کا مرکز تھی اسے قبول عام حاصل تھا اور تمام دوسرے طریق ہائے علاج پر فائق و فاتح تصور کی جاتی تھی' لامحالہ اس کے نظریات و اصطلاحات شعر و ادب میں بھی جگہ نکال لیتے تھے۔ زبانوں میں صرف اردو زبان کو لیجئے' سودا سمانا: بخار نکالنا' نزلہ گرنا وغیرہ وہ روز مرہ اور محاورے ہیں جو اردو زبان کو صرف طب قدیم نے دیئے ہیں۔

ہم نے طب قدیم کے رسوخ و نفوذ کا اندازہ کرنے کے لیے تاریخ ادب کے اس دور کا انتخاب کیا ہے جو برصغیر میں طب قدیم کے شباب و عروج کا دور نہ تھا' بلکہ اس کی جوانی ڈھل چکی تھی اور اس کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی اور اس کے دور کے ایک عظیم اور ترقی پسند شاعر۔ غالب۔ کا انتخاب کیا ہے' جو اپنے معاصر مومن کی طرح خود طبیب نہ تھا' کیوں کہ ایک غیر طبیب شاعر کے منقولات پر طب قدیم کی چھاپ دیکھ کر ہی اس کے رسوخ و نفوذ کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ غالب کی وفات ۱۸۶۹ء میں ہوئی تھی۔ یہ وہ دور ہے کہ مسلمان جہاں بانی کے گراں بار فرائض سے اکتا کر فرنگیوں کے لیے تخت سلطنت خالی کر چکے ہیں۔ فرنگی اپنی صد سالہ غاصبانہ

جدوجہد ختم کر کے اپنا نوسالہ دور حکومت شروع کر چکے ہیں اور ان کے اس استیلائے عوامل کے نتیجے میں مغرب اور مغربیوں کا رعب ہمارے اعصاب زیر و زبر کر چکا ہے۔

مغرب کے تازہ بہ تازہ فنون و صناعات غلاموں کے فکر و نظر پر حملہ آور ہیں۔ "جدت" کے نام پر "مادیت" کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ "قدامت" کے پردے میں ایمانیات تک کو ہدف ملامت بنایا جا رہا ہے۔ انگریزی زبان سیکھنے اور سکھانے میں راعی و رعایا میں مسابقت ہو رہی ہے۔ ہر صوبے میں انگریزی مدارس و کلیات جاری کیے جا چکے ہیں۔ کئی صوبوں (بمبئی' مدراس' بنگال وغیرہ) میں جامعات کا قیام عمل میں آ چکا ہے' مغربی زبانوں سے تراجم کا بازار گرم ہے اور زبانوں کے تراجم کے نام پر مغربی افکار و نظریات درآمد کیے جا رہے ہیں اور "جوش لے کر چھان کر" ان کے قدمے قدمے پلائے جا رہے ہیں۔

خود غالب فرنگ و اہل فرنگ سے خوب خوب متاثر تھے۔ انگریزوں سے روابط رکھتے تھے۔ انگریز افسروں کی شان میں قصائد مدحیہ نظم کرتے تھے۔ درباروں میں بڑے خشوع و خضوع سے شرکت کیا کرتے تھے۔ جدید ایجادات ماچس' ریل' گراموفون وغیرہ) کی داد و ستائش کا منظوم خراج پیش کر چکے تھے۔ ایک فرنگی نژاد اردو شاعر ان کا شاگرد تھا' اپنی منثور تحریروں میں ہی نہیں' اشعار(۱) میں بھی انگریزی الفاظ استعمال کیا کرتے تھے۔

۱۔ شعر:

انگلیس کے بہ حکم رب الناس بھر کے بھیجے ہیں سر بہ مہر "گلاس"

صحیات کے دائرے میں بھی طب قدیم کے لیے حالات ساز گار نہیں تھے اور کیوں ہوتے' جب مسلمانوں کے خالص دینی علوم (تفسیر قرآن وغیرہ) سائنس زدگی اور استغراب (Occidantalism) کا شکار تھے تو علم الابدان کس شمار میں تھا۔ طب جیسا "قدامت گزیدہ" بوسیدہ (اور ستم یہ کہ اسلامی) فن ساحر مغرب کی نگاہ سے کیوں کر مامون و مصون رہ سکتا تھا۔ فرنگی معالجین یوں تو شہنشاہ اکبر کے دور ہی میں اپنی ترک تاز کا آغاز کر چکے تھے' مگر اب وہ کہیں حاکم' کہیں مبلغ کے بھیس میں ضلع ضلع اور شہر شہر پھیل گئے تھے' پھر جدید طب کے حاملین کا ایک طبقہ نیٹو ڈاکٹرس (Native Doctors) کے نام سے پیدا ہو چکا تھا۔ برصغیر کے کئی باشندے کعبہ فنون و آداب انگلستان جا کر طب مغرب کے مستند ہو آئے تھے۔ کلکتہ' حیدر آباد دکن اور آگرے میں مدارس طبیہ جاری کر دیئے گئے تھے۔ اس فن کے تراجم سے "بے مایہ اردو" کا دامن پر کیا جا رہا تھا۔

مختصر یہ کہ دیگر مغربی فنون و صناعات کی طرح مغربی(۲) طبوں کی ترویج و اشاعت منظم اور سرکاری پیمانے پر شروع ہو چکی تھی۔

۲۔ ایلو پیتھی اور ہومیو پیتھی مراد ہیں۔ ہومیو پیتھی کے اولین تعارف کا فرض سرسید احمد خاں نے انجام دیا تھا۔

بہرحال شعر و ادب پر طب قدیم کی چھاپ کا صحیح اندازہ اسی دور میں کیا جا سکتا ہے' کیوں کہ طب قدیم اب ملک کا فاتح و فائق طریق علاج نہیں رہی تھی۔ اب اس دور کے ایک نمائندہ شاعر کے ہاں طب قدیم کے تصورات و اصطلاحات کی جھلکیاں ملاحظہ فرمائیے:

پی جس قدر ملے شب مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

قدیم طبیعیات کا لگ بھگ گیارہ سو سال یہ متفقہ اور مسلمہ کلیہ رہا ہے کہ موالیہ ثلاثہ کے اساسی ارکان و عناصر چار ہیں: "آگ، پانی، مٹی اور ہوا۔ قدیم طبیعیات کے اسی کلیہ کو طب قدیم نے تسلیم کرکے اسی بنیاد پر "عناصر ثانویہ کا کلیہ وضع کیا اور (۲ جولائی ۱۹۲۶ ش) تک اسی پر تقریباً" تمام علمائے طب کا اتفاق و اتحاد رہا۔ عناصر ثانویہ (اخلاط) چار ہیں اور یہی بدن انسانی کے اساسی ارکان ہیں خون، صفرا، سودا اور بلغم۔ اخلاط کے باہم امتزاج سے مزاج پیدا ہوتا ہے۔ اخلاط و مزاج، کا یہی وہ نظریہ ہے، جس پر طب قدیم کی تمام عمارت قائم ہے۔ ایک دور تھا جب طب قدیم کے یہ نظریات عام تھے اور عوام و خواص کے قلوب و اذہان پر بغیر شرکت غیرے ان کا اقتدار تھا، جس معاشرے میں جو نظریات رچے بسے ہوئے ہوں وہ غیر طبعی مواقع--- عام گفتگو اور شعر و ادب میں بھی انہی کی تبلیغ کرے گا۔ اخلاط کی کمی و بیشی اور اعتدال و عدم اعتدال سے امراض پیدا ہوتے ہیں۔ اب مثلاً کسی شخص کے باغیانہ خیالات پر اظہار خیال کرنا ہو گا تو یوں کہیں گے "اس شخص کے سر میں بغاوت کا سودا سمایا ہے۔" اس کے برعکس نظریہ جراثیم پر ایمان رکھنے والے اس تاثیر کی تعبیریوں کریں گے "اس شخص کے افکار میں بغاوت کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔" تعبیر و ادا کا یہ اختلاف بظاہر نظر غیر اہم سمجھا جائے گا لیکن درحقیقت یہ دو مختلف تعبیریں دل و دماغ پر دو متضاد نظریوں کی گرفت کو ظاہر کرتی ہیں۔

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب اب عناصر میں اعتدال کہاں؟

یہ شعر بھی اسی نظریے کی بنیاد ہے۔ آج قویٰ کے اضمحلال کا سبب قوت حیات (Energy) کے زیاں یا قوت مدافعت کے ضعف اور قلت الدم (Anaemia) سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن قدیم نقطہ نظر یہی ہے کہ بدن انسانی کے عناصر ثانویہ (اخلاط) میں اعتدال مطلوب برقرار نہیں رہا اس لیے قویٰ مضمحل ہو گئے۔ اس اختلاف کو تعبیر اور اسلوب ادا کا اختلاف کہہ کر گزر جانا صحیح نہیں ہے۔ تحلیل نفسی سے شغف رکھنے والے حضرات میری تائید فرمائیں گے کہ رجحانات، خیالات اور نقطہ نظر کی غمازی تعبیر کے انداز سے بھی ہوتی ہے۔ ایک عوامی خطیب و رہ نما کو ایک شخص "حکومت کا بے باک نقاد" کہتا ہے، دوسرا اسے سرکشوں اور تخریب پسندوں میں محسوب کرتا ہے۔ کیا دونوں رائے زنی کرنے والے ایک ہی مکتب خیال سے وابستہ کیے جائیں گے؟

کیا کہوں بیماری غم کی فراغت کا بیاں
جو کہ کھایا خون دل بے منت کیموس تھا

جس قدر روح بناتی ہے جگر تشنہ ناز
دے ہے تسکیں بدم آب بقا موج شراب

عشق میں بیداد رشکِ غیر نے مارا مجھے
کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمار دوست

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالب اگر عمرِ طبیعی نہ سہی

کاٹ کر پھینکیے ناخن کو بہ اندازِ ہلال!
قوتِ نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے زنہار

مے کشی کو نہ سمجھ بے حاصل
بادۂ غالب عرقِ بید نہیں

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا
کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے
بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمک داں پر

زخم گر دب گیا' لہو نہ تھما
کام گر رک گیا' روا نہ ہوا

لو ہم مریضِ عشق کے تیمار دار ہیں
اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

مندرجہ بالا اشعار میں سے پہلے شعر میں کیموس' دوسرے میں روح بناتی' تیسرے میں کشتہ' چوتھے میں عمر طبیعی' پانچویں میں قوت نامیہ' چھٹے میں عرق بید' ساتویں میں جزو اعظم اور نسخہ مرہم' آٹھویں میں مرہم' نویں میں زخم اور لہو' دسویں میں تیمار دار اور معروف طبی الفاظ و مصطلحات ہیں۔

غالب کی ایک منظوم درخواست رخصت ملاحظہ ہو:

سہل تھا مسہل ولے یہ سخت مشکل آپڑی

۸ مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے؟

تین دن مسہل سے پہلے، تین دن مسہل کے بعد
تین مسہل، تین تبریدیں، یہ سب کے دن ہوئے؟

یہ دل چسپ منظوم درخواست طب قدیم کے ایک معروف "عمل" کی یاد دلاتی ہے، جس میں اخلاط فاسدہ کے تنقیہ کے لیے منضج، مسہل اور تبرید کے مراحل طے کیے جاتے تھے، اب یہ عمل معروف نہیں متروک سا ہے، اس لیے غالب کے اس قطعہ کی اہمیت تاریخی بھی ہو گئی ہیں۔

آخر میں تفنن طبع کے لیے عرض ہے کہ غالب نظریہ دوران خون کے قائل نہیں تھے۔ ثبوت حاضر ہے:

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل

جلیل قدوائی ایم اے

غالب اور اردو غزل

غالب کے ہاتھ میں اس صنف (اردو غزل) نے ترقی و تکمیل کے اعلیٰ ترین مدارج طے کئے اور غالب کے فن کا کمال اسی صنف میں ظاہر ہوا۔ اور اردو ہی کی غزلیات تک اس لیے کہ میرے خیال میں عام عقیدہ کے برخلاف، فارسی کے مقابلہ میں اردو میں غالب نے نہ صرف اپنے فن کا کہیں بہتر مظاہرہ کیا ہے بلکہ بہتر اہل زبان ہونے کا بھی ثبوت دیا ہے۔ فارسی میں وہ زیادہ سے زیادہ اس زبان کے اساتذہ سے انہیں کے میدان میں بازی لے جانے کی کوشش کر سکتے تھے مگر نئی طرح نہیں ڈال سکتے تھے۔ اردو میں انہوں نے ایک نئے مکتب خیال کی داغ بیل ڈالی ہے اور اس حیثیت سے وہ آج تک تنہا نہیں یوں بھی اگر ہمیں غالب کو اپنا شاعر کہنا ہے تو اپنی زبان یعنی اردو میں انہوں نے جو شاعری کی ہے اس پر زیادہ توجہ دینی ہو گی۔

مالک رام

(فیچر)

غالب سے ملئے

راوی : جو لوگ اس جہان سے اٹھ چکے ہیں' ان میں سے کچھ ایسے ہیں جن کے بارے میں اکثر جی چاہتا ہے کہ کاش ہم ان کی زندگی میں ان سے مل سکتے۔ ان میں سے ایک غالب بھی ہیں۔

غالب سے اب ملنا تو ممکن نہیں۔ لیکن آج کی صحبت میں ہم آپ کو تین ایسے اصحاب سے ملائیں گے جو غالب سے مل چکے تھے اور جو اپنی ملاقاتوں کا حال آپ کے لئے لکھ کر چھوڑ گئے ہیں۔ یہ حضرت علی شاہ قلندر' خواجہ عزیز لکھنوی اور میر صیغر بلگرامی ہیں۔

آیئے پہلے غوث علی شاہ سے ملئے

غوث علی شاہ قلندر سلسلہ قادریہ کے مشہور بزرگ گزرے ہیں۔ ان کے ملفوظات بڑے مشہور ہیں' جن میں ان پچاسوں مقامات کا ذکر ہے' جہاں جہاں کی انہوں نے سیاحت کی تھی اور بیسیوں ان اصحاب کے نام ملتے ہیں جن سے انہیں ملنے کے مواقع حاصل ہوتے تھے ۔ مرزا غالب سے ان کی ملاقات زینت المساجد میں ہوئی جہاں وہ چھ مہینے فرد کش رہے۔ وہیں ان کی اور مرزا کی ملاقاتیں رہاکیں۔ اب ان ملاقاتوں کا حال انہیں کی زبانی سنئے۔

غوث علی : ایک روز ہم مرزا نوشہ کے مکان پر گئے۔ نہایت حسن اخلاق سے ملے۔ لب فرش تک آن کر لے گئے۔ تمام حال دریافت کیا۔ ہم نے کہا کہ مرزا صاحب ہم کو آپ کی ایک غزل بہت ہی پسند ہے۔ علی الخصوص یہ شعر۔

تو نہ قاتل ہو کوئی اور ہی ہو ۔۔۔ تیرے کوچے کی شہادت ہی سہی

مرزا غالب : صاحب یہ شعر تو میرا نہیں' کسی استاد کا ہے۔ شعر نہایت اچھا ہے۔ میں نے اس زمین میں کچھ شعر کہے ضرور ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

(مرزا غالب ہلکے ترنم میں اپنے اشعار سناتے ہیں۔)

غالب:

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی — میری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے' تو عداوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے — غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
عمر ہر چند کہ ہے برق خرام — دل کو خوں کرنیکی فرصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تیری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسد
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

غوث علی شاہ: جب تک میں دلی میں مقیم رہا۔ مرزا صاحب نے دستور بنا لیا تھا کہ تیسرے دن زینت المساجد میں ہم سے ملنے آتے اور ایک خوان کھانے کا ساتھ لاتے۔ ہر چند ہم نے عذر کیا کہ کہ یہ تکلیف نہ کیجیے مگر وہ کب ماننے والے تھے۔ ہم نے ساتھ کھانے کے لئے کہا تو کہنے لگے کہ میں اس قابل نہیں ہوں۔ مے خوار' روسیاہ' گنہگار' مجھ کو آپ کے ساتھ کھاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ البتہ اولش کا مضائقہ نہیں۔ ہم نے بہت اصرار کیا تو طشتری میں لے کر کھایا۔

راوی: ایک روز کا ذکر ہے کہ مرزا رجب بیگ علی سرور لکھنؤ سے آئے۔ مرزا نوشہ سے ملے۔ اثنائے گفتگو میں پوچھا۔

رجب علی بیگ: مرزا صاحب! اردو زبان کس کتاب کی عمدہ ہے۔؟

غالب: چار درویش کی!

رجب علی بیگ سرور: اور "فسانہ عجائب" کیسی ہے؟

(مرزا غالب قطع کلام کرتے ہوئے کہہ اٹھتے ہیں)

غالب: اجی لاحول ولاقوۃ' اس میں لطف زبان کہاں۔ ایک تک بندی اور بھٹیار خانہ جمع ہے۔

راوی: اس وقت تک مرزا کو یہ خبر نہ تھی کہ یہی میاں سرور ہیں۔ جب چلے گئے تو حال معلوم ہوا۔ بہت افسوس کیا اور کہا:

غالب: ظالمو! پہلے سے کیوں نہ کہا۔

راوی: دوسرے دن مرزا' غوث علی شاہ کے پاس آئے اور قصہ سنایا۔

غالب: حضرت! یہ امر مجھ سے ناواننگی سے ہو گیا۔ آج ان کے مکان پر چلیں اور کل کی مکافات کر آئیں۔

غوث علی شاہ: ہم ان کے ہمراہ ہو لئے اور میاں سرور کی فرودگاہ پر پہنچے۔ مزاج پرسی کے بعد مرزا

نے عبارت آرائی کا ذکر چھیڑا اور میری طرف مخاطب ہو کر بولے :

غوث علی شاہ : جناب مولوی صاحب ! رات میں نے "فسانہ عجائب" کو بغور دیکھا تو اس کی خوبی عبارت اور رنگینی کا کیا بیان کروں۔ نہایت ہی فصیح و بلیغ عبارت ہے۔ میرے قیاس میں تو ایسی عمدہ نثر پہلے لکھی گئی' نہ آگے لکھی جائے گی اور کیوں نہ ہو' اس کا مصنف اپنا جواب نہیں رکھتا۔

غوث علی شاہ : غرض اس قسم کی بہت سی باتیں بنائیں۔ اپنی خاکساری اور ان کی تعریف کر کے میاں سرور کو نہایت مسرور کیا۔ دوسرے دن ان کی دعوت کی اور ہم کو بھی بلایا۔ اس وقت بھی میاں سرور کی بہت تعریف کی۔ مرزا صاحب کا مذہب یہ تھا کہ دل آزاری بڑا گناہ ہے۔

وقفہ

غوث علی شاہ : ایک دن ہم نے مرزا صاحب سے پوچھا' مرزا صاحب' آپ کو کسی سے محبت بھی ہوئی؟

غالب : ہاں حضرت علی مرتضیٰ سے .... اور آپ کو؟

غوث علی شاہ : واہ صاحب ! آپ تو مغل بچہ ہو کر علی مرتضیٰ کی محبت کا دم بھریں۔ ہم ان کی اولاد کہلائیں اور محبت نہ رکھیں۔ کیا یہ بات آپ کے قیاس میں آ سکتی ہے؟

(وقفہ)

راوی : ایک روز غوث علی شاہ قلندر اپنے مریدوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی نے مرزا غالب کے انتقال کی خبر سنائی

غوث علی شاہ : اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ہم واسطے خدا کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جائیں گے۔ افسوس ہمارے یہ دوست بھی ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ نہایت خوب آدمی تھے۔ عجز و انکسار بہت تھا۔ فقیر دوست بدرجہ غایت اور خلیق ازحد۔ اور فن شاعری میں تو اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ایک روز ہم ان کے پاس گئے تو انہوں نے اپنا یہ قطعہ سنایا (غوث علی شاہ یہ فارسی قطعہ مدہم آواز میں گنگناتے ہیں۔)

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار
ساقی و مغنی و شرابے و سرودے
زنہار ازاں قوم نہ باشی کہ فریبند
حق را بسجودے و نبی را بدرودے

(کسی ساز کی)------- وقفہ ------ (TRAD OUT)

راوی : خواجہ عزیز الدین فارسی کے بڑے باکمال شاعر تھے۔ بزرگوں کا وطن کشمیر تھا' لیکن بچپن ہی میں لکھنؤ چلے گئے اور پھر وہیں کے ہو کے رہ گئے۔ خواجہ نے کشمیر کا سفر متعدد بار کیا تھا۔ ایک سفر کے دوران میں دہلی میں مرزا غالب سے بھی ملاقات کی تھی۔ اس ملاقات کا حال انہیں کی زبان سے سنیے۔

خواجہ عزیز لکھنوی: ایک مرتبہ ہم لکھنؤ سے کشمیر جا رہے تھے' اتفاق سے کچھ دیر کے لئے دلی اتر پڑے۔ سرائے میں قیام کیا پھر اسٹیشن پر جانے کے لئے بگھی منگوائی۔ ابھی بگھی آہی رہی تھی کہ یکایک ہم کو خیال ہوا کہ حسن اتفاق سے دہلی آنا ہوا ہے مرزا غالب سے بھی ملاقات کر لینی چاہیے۔ فوراً اہلی ماراں کا محلہ " دریافت کر کے جانے کو مستعد ہوئے۔ کچھ دور چل کر لوگوں سے پتہ دریافت کیا۔ اتنے میں ایک ملاقاتی مل گئے۔ کہنے لگے' چلئے میں مرزا صاحب سے ملاقات کرا دوں۔

مرزا صاحب کا مکان پختہ تھا۔ ایک بڑا پھاٹک تھا' جس کی بغل میں ایک کمرہ اور کمرے میں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ اس پر ایک نحیف الجثہ آدمی' گندمی رنگ' اسی بیاسی برس کا ضعیف العمر' لیٹے ہوئے ایک کتاب سینے پر رکھے ہوئے' آنکھیں گڑوئے ہوئے پڑھ رہے تھے۔ یہ مرزا صاحب ہیں جو غالباً" دیوان قاآنی ملاحظہ فرما رہے ہیں۔

خواجہ عزیز: ہم نے سلام کیا لیکن بہرے اس قدر تھے کہ ان کے کان تک آواز نہ گئی۔ آخر کھڑے کھڑے واپس آنے کا قصد کیا تھا کہ غالب نے چارپائی کی پٹی کے سہارے کروٹ بدلی اور ہماری طرف دیکھا۔

خواجہ عزیز لکھنوی: آداب عرض کرتا ہوں قبلہ!

غالب: تسلیمات۔ آیئے آیئے۔ آپ کو آئے ہوئے دیر تو نہیں ہوئی۔

خواجہ عزیز: جی نہیں' آپ کے آرام میں مخل ہوا۔

(غالب قطع کلام کرتے ہوئے کہتے ہیں۔)

غالب: بھائی آنکھوں سے تو کچھ سوجھتا بھی ہے لیکن کانوں سے بہت کم سنائی دیتا ہے۔

خواجہ عزیز: مرزا صاحب نے ہم لوگوں کا نام و نشان پوچھا' پھر کہا'

غالب: مجھ سے ملنے آئے ہو تو ضرور کچھ نہ کچھ کہتے ہو گے۔ کچھ اپنا کلام بھی سناؤ

خواجہ عزیز: ہم لوگ تو آپ کا کلام آپ کی زبان مبارک سے سننے کی غرض سے آئے تھے۔

غالب: خیر' مجھ سے سن لینا' پہلے اپنے شعر تو سناؤ

خواجہ عزیز: بہتر' حکم کی تعمیل کرتا ہوں۔ (خواجہ عزیز یہ شعر تحت اللفظ پڑھتے ہیں۔

مہ مصراست داغ از رشک مہتابے کہ من دارم
زلیخا کور شد از حسرت خوابے کہ من دارم

غالب: بھئی خوب۔ لیکن "مہ مصر" نئی ترکیب ہے۔ "مہ کنعاں" تو سنا تھا" "مہ مصر" سننے میں نہیں آیا۔

خواجہ عزیز: قبلہ صائب کہتا ہے۔

زصد ہزار پسر ہم چو ماہ مصریکے
چناں شور کہ چراغ پدر کند روشن

غالب: بھئی بہت خوب۔ کیا پیارا مطلع نکالا ہے تم نے۔ (لرزتی آواز میں غالب تحت اللفظ عجیب لطف اور مزے سے اس مطلع کو پڑھتے ہیں۔

مہ معراست داغ از رشک مہتابے کہ من دارم
زلیخا کور شد از حسرت خوابے کہ من دارم

جب مرزا غالب دو سرا مصرع ختم کرنے کے قریب ہوتے ہیں تو اندر سے ملازمہ بی وفادار کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی)

بی وفادار: بیگم صاحبہ انتظار کر رہی ہیں۔ خاصہ دیر سے تیار ہے۔

غالب: بی وفادار اب تو کھانا بھجوا دو۔

خواجہ عزیز: حضرت زحمت نہ فرمائیے' اب ہمیں اجازت دیجئے۔

غالب: ابھی آئے اور ابھی چل دیئے۔ تشریف تو رکھئے

خواجہ عزیز: پھر کبھی حاضر ہوں گے۔ آج صرف تھوڑی دیر کے لئے دہلی اتر پڑے تھے۔ ریل کا وقت بالکل قریب ہے اور کبھی سرائے میں کھڑی ہے۔ اسباب بندھا ہوا رکھا ہے۔ بابرکاب آپ سے ملنے آئے تھے۔ اب اجازت چاہتے ہیں۔

غالب: آپ کی غائت اس تکلیف فرمائی سے یہ تھی کہ میری صورت اور کیفیت ملاحظہ فرمائیں۔ ضعف کی حالت دیکھی کہ اٹھنا بیٹھنا دشوار ہے۔ بصارت کی حالت دیکھی کہ آدمی کو پہچانتا نہیں ہوں۔ غزل پڑھنے کا انداز ملاحظہ کیا۔ کلام سنا۔ اب ایک بات باقی رہ گئی ہے کہ میں کیا کھاتا ہوں اور کتنا کھاتا ہوں۔

خواجہ عزیز: اتنے میں کھانا آگیا۔ دو پھلکے اور ایک طشتری میں بھنا ہوا گوشت' جس میں کچھ میوہ بھی پڑا ہوا تھا۔ پھلکے کا باریک پرت لے کر دو چار نوالے بمشکل کھائے اور کھانا بڑھا دیا۔ اب دیر ہو چکی تھی۔ ہم لوگوں نے اجازت لی اور رخصت ہو گئے۔

(کسی ساز کی آواز-----فیڈ آؤٹ)

راوی: میر صفیر بلگرامی کے بزرگوں کا وطن بلگرام تھا۔ خود ان کی ولادت مارہرہ میں ہوئی لیکن پانچ ہی برس کی عمر میں بہار کے مردم خیز قصبہ "آرہ" میں سکونت پزیر ہو گئے تھے۔

کم عمری تھے کہ شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ پندرہ برس کے تھے کہ خیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے۔ بیس برس کے تھے کہ امان علی کے شاگرد ہوئے۔ پچیس سال کی عمر میں مرثیہ گوئی کا شوق پیدا ہوا اور دبیر کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ ۱۲۸۰ھ کے لگ بھگ فارسی کی طرف متوجہ ہوئے اور اس رشتے سے کہ حضرت صاحب عالم مارہروی ان کے نانا تھے وہ غالب کے شاگرد ہوئے اور ۱۲۸۲ھ میں ایک لمبا سفر کر کے مرزا غالب کی خدمت میں پہنچے اور دو ڈھائی ماہ تک ان کے پاس مقیم رہے۔ آپ ان سے مرزا غالب کی ملاقات کا حال سنیے:

صفیر بلگرامی: ۱۲۸۰ھ میں میں اپنے نانا حضرت صاحب عالم مارہرُوی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہاں

حضرت غالب کا چرچا اور ان کا ذکر بہت پایا۔ نانا صاحب سے اور غالب سے ایک ربط خاص تھا مگر لطف یہ کہ ملاقات کی نوبت عمر بھر نہ آئی۔ میں نے خواہش ظاہر کی کہ حضرت غالب کا شاگرد ہوں اور ایک عریضہ چند غزلوں کے ساتھ مارہرہ سے روانہ کیا۔ حضرت غالب نے آٹھویں دن جواب میرے خط کا بھیجا اور غزلیں اصلاح دے کر واپس کر دیں۔ اس وقت سے خط و کتابت رہی۔ یہاں تک کہ حضرت کے اشتیاق نے ۱۲۸۲ھ میں بے اختیار دہلی چلنے کی تحریک کی۔ اپنے منجھلے ماموں حضرت شاہ عالم کے ساتھ مع چند ملازموں کے روانہ دہلی ہوا۔

آموں کا موسم تھا۔ حضرت صاحب عالم نے اپنے باغ کے آموں کا ایک ٹوکرا بھر کے قریب دو ہزار کے' میرے ساتھ کر دیئے۔ میں علی گڑھ سے دہلی روانہ ہوا۔ دس بجے شب کو دہلی پہنچا۔ شب جمنا پار قلعے کے نیچے بسر کی----- صبح کو جامع مسجد کو باہر سے دیکھتا ہوا' محلہ بلی ماران میں حضرت غالب کے پاس پہنچا۔ حضرت بر آمدے میں بیٹھے کلی پی رہے تھے۔ گرمی کے دن تھے۔ صفر کا مہینہ تھا۔ حضرت کا لباس اس وقت یہ تھا' پاجامہ سیاہ بوٹے دار' دریا کا کلی دار' نیفہ سرخ قند کا' بدن پر مرزئی۔ سر کھلا ہوا۔ سرخ و سفید رنگ۔۔ داڑھی دو انگل کی۔ آنکھیں بڑی۔ قد لمبا۔ ولایتی چہرہ۔ آنکھوں میں نور موجود تھا۔ کان کی سماعت میں کچھ ثقل آ چلا تھا۔ ماموں حضرت شاہ عالم کو دیکھتے ہی ہشاش بشاش ہو گئے۔ اس کے بعد میں سامنے موجود ہوا۔ پوچھا۔

غالب: شاہ صاحب! آیئے آیئے۔ آپ کا مزاج اچھا ہے؟ اور یہ آپ کے ساتھ کون صاحب ہیں؟

صفیر بلگرامی: میں ہوں آپ کا نیاز مند او حلقہ بگوش صفیر!

شاہ عالم: یہ میرے بھانجے سید فرزند احمد صفیر بلگرامی ہیں۔ آپ کی زیارت اور اشعار پر اصلاح لینے کے لئے مارہرے سے حاضر ہوئے ہیں۔

غالب: کیسی باتیں کرتے ہیں۔ میری زیارت! میں عاصی بے خور' روسیاہ' یہ تو میرے مخدوم اور میرے دوست روحانی کے فرزند ہیں۔ رہی اصلاح اشعار' تو اس واسطے کو میں نے یوں سمجھ لیا ہے کہ میں مولا علی کا بوڑھا غلام ہوں' جنھوں نے اپنی اولاد میں سے ایک صاجزادہ میرے سپرد کر دیا ہے۔ اور حکم دیا ہے کہ تو اس کے کلام کو دیکھ لیا کر۔ ورنہ میں کہاں اور یہ ریاضت کہاں۔

صفیر بلگرامی: نانا صاحب اکثر آپ کو یاد فرماتے ہیں۔

غالب: ان کا کرم ہے' مہربانی ہے۔ حضرت اب کیسے ہیں؟ بہت دنوں سے ان کا کوئی والانامہ تشریف نہیں لایا۔

صفیر بلگرامی: اچھے ہیں۔ اپنے معمولات کے علاوہ خانقاہ کی ذمہ داریوں کی وجہ سے بہت مشغول رہتے ہیں۔ آپ نے مارہرہ آنے کا ان سے وعدہ کیا تھا۔ انہوں نے یاد دہانی کے لئے مجھے چلتے وقت کہہ دیا تھا۔

غالب: خداوند مجھے مارہرے بلاتے ہیں اور میرا قصد مجھے یاد دلاتے ہیں۔ ان دنوں کہ دل بھی تھا اور طاقت بھی تھی' شیخ محسن الدین مرحوم سے بطریق تمنا کہا تھا کہ جی یوں چاہتا ہے کہ برسات میں مارہرے جاؤں اور دل کھول کر اور پیٹ بھر کر آم کھاؤں' اب وہ دل کہاں سے لاؤں اور وہ طاقت کہاں سے پاؤں۔ نہ آموں کی

طرف رغبت' نہ معدہ میں اتنے آموں کی گنجائش۔ (پہلو بدل کر)----- وقفہ----- بے تکلف عرض کرتا ہوں' اتنے آم کھاتا تھا اتنے' کہ پیٹ اپھر جاتا تھا اور دم پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ اب بھی کھاتا ہوں' مگر دس بارہ' اگر پیوندی آم پڑے ہوئے تو پانچ سات

(غالب ایک ٹھنڈی آہ بھر کر یہ شعر پڑھتے ہیں)

دریغا کہ عہد جوانی گزشت
جوانی مگو' زندگانی گزشت

غالب: آؤ ہم تم حضرت صاحب کو عالم کے پاس چلیں اور اپنی آنکھیں ان کے کف پائے مبارک سے ملیں۔ میں سلام کروں گا۔ تم بتانا کہ غالب یہی ہے۔ اہل دہلی میں آپ کے دیدار کا طالب یہی ہے۔ میں نے عزم قدم بوسی کیا' پیرو مرشد نے مجھے گلے لگالیا۔ فرماتے ہیں: "غالب تو اچھا ہے؟" عرض کرتا ہوں کہ "الحمد للہ' حضرت کامزاج مقدس کیسا ہے؟" ارشاد ہوا "مولوی سید برکات حسن منیری بہت تعریف کرتے رہتے ہیں۔" "جناب یہ ان کی خوبیاں ہیں میں ایسا نہیں' جیسا وہ کہتے ہیں۔ کاش وہ میری رنجوری کا حال کہتے۔ ضعف قوی اور اضمحلال کی کیفیت سناتے' تاکہ میں ان کے کلام کی تصدیق کرتا۔ ان کی غمخواری اور دردمند نوازی کا دم بھرتا۔

"اے وائے زمحرومی دیدار' دگر ' ہیچ"

اب اس موسم میں سفر کیا کروں۔ حضرت کے دیکھنے کے واسطے متحمل رنج سفر ہوں گا تو جاڑے میں' اس برسات میں نہیں۔

(قدموں کی آہٹ۔ کلو داروغہ آتا ہے)

کلو: سرکار! نواب ضیاء الدین خان صاحب تشریف لا رہے ہیں۔

غالب: انہیں لے آؤ اور دیکھو' حقہ ٹھنڈا ہو گیا ہے' دوبارہ چلم بھر دے۔

صفیر بلگرامی: نواب ضیاء الدین صاحب تشریف لے آئے۔ حضرت نے مجھے ان سے ملایا۔ وہ وجیہہ آدمی' رئیسوں کی وضع پر تھے۔ کرتہ پہنے' حلقہ دار پاجامہ' سر پر ٹوپی' جریب ہاتھ میں۔ حضرت نے ان سے میرا حال کہا اور فرمایا۔ "یہ میری ملاقات کو آرہ سے آئے ہیں۔" اس کے بعد کچھ ان سے سرگوشی ہوئی۔ جب وہ اٹھ گئے اور دوپہر قریب ہوئی تو حضرت اٹھے اور مجھے اور میرے ماموں کو اپنا تمام مکان دکھایا۔ ہر جگہ نشان دیتے جاتے تھے کہ یہ مقام فلاں کام کے لئے اور یہ فلاں کام کے واسطے۔ آخر زینے کے پاس آئے اور چھت پر چلے۔ ہم لوگ بھی ساتھ تھے۔ اوپر جا کر دیکھا تو بہت بڑی چھت تھی اور اس کے کونے پر ایک کمرہ گلی کے رخ بنا ہوا تھا----- (دور آواز)

غالب: ..... دیکھئے' یہ میری فردوگاہ ہے۔ یہی میرے بیٹھنے اٹھنے' سونے جاگنے' جینے مرنے کا محل ہے۔ بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ یہاں آدھی رات تک دھوپ رہتی ہے۔ ہوں' ہوں' ہوں' (ہنستے ہیں)

غالب: آپ سمجھے؟

صفیر: جی ہاں' یعنی گرمی کے دن اور دہلی کی گرمی اور تمازت آفتاب سے در و دیوار اس قدر......
غالب: جلتے ہیں کہ آدمی رات تک ان کی گرمی فرو ہوتی ہے۔
(دونوں ہنستے ہوئے زینے سے اترتے ہیں۔
غالب: اس مکان کے دکھانے سے میرا مطلب یہ تھا کہ میرے مکان میں گنجائش نہیں اور آپ مہمان عزیز ہیں' اس لئے ضیاء الدین خان صاحب کا مکان جو جامع مسجد کے قریب ہے' آپ کے واسطے تجویز ہوا ہے۔ گو تھوڑا سا دور ہے' مگر آرام بہت ملے گا۔
صفیر: میں تو آپ سے قریب ہی رہنا چاہتا تھا۔
غالب: کچھ ایسا دور بھی نہیں----- (پکارنا-- آواز) کلو!
(خاموشی۔ وقفہ)
(آواز-- کلو.... نیاز علی.... ارے' تم سب کہاں چلے گئے؟)
نیاز علی: (دور کی آواز) آیا سرکار...... (نیاز علی ہانپتا ہوا آتا ہے)
جی سرکار!
: **غالب:** ان لوگوں کو ضیاء الدین خاں کے مکان تک پہنچائیے
صفیر: نواب صاحب کا مکان عالی شان تھا۔ ایک بڑا پھاٹک سڑک کے کنارے' جس پر ایک بنگلہ خوش نما' اس کے اندر ایک خانہ باغ تر و تازہ' اس کے بعد ایک دیوان عالی شان' فرش فروش سے آراستہ' سجا سجایا۔ غرض بہت خوب مکان تھا۔ ٹھہرنے کو ہم سب چھ آدمی تھے' اس مکان کے ایک کونے میں سما گئے' ابھی اچھی طرح بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ پانچ خوان' جن پر خوان پوش خوش نما پڑے تھے' آئے۔ معلوم ہوا' کھانا ہے۔ بہت خوش گوار اور مزے دار تھا۔ قورمہ' قلیہ' شیرمال' پلاؤ' زردہ' شیر برنج' متنجن' کباب' پراٹھا' سب کچھ تھا۔ ایک خوان میں کچھ آم بھی تھے۔ کھانے کے بعد آم جو کھانے بیٹھا' صورت حرام نظر آئی۔ بالکل کھٹے۔ میں پورب کے آم کھائے ہوئے تھا' بڑی نفرت ہوئی۔ اپنے ساتھ کے آم نکال کر کھائے اس سے کہیں بہتر پائے۔ پھر تو میں نے نصف ٹوکرا حضرت غالب کی خدمت میں بھیج دیا۔ وہاں سے تھوڑی دیر کے بعد ایک رباعی لکھ کر آئی' جس کا آخری مصرع مجھے یاد رہ گیا ہے۔

"کھانا نہ اسے' کہ پرائے ہیں آم"

اور سب آم منگالئے۔
صفیر: اک دن قریب دوپہر کے پلنگڑی پر لیٹے ہوئے تھے اور میں قریب پٹی کے حاضر تھا۔
غالب: کیوں حضرت' برف کا پانی پیو گے؟
صفیر: کوثر کا پانی پیتا ہو تو پلوائیے۔
غالب: (ہنستے ہوئے) ضرور' ضرور (پکار کر) ارے لڑکے نیاز علی

نیاز علی: جی سرکار' آپ نے مجھے پکارا۔

غالب: ٹھنڈے کنویں سے پانی لے آؤ۔

صفیر: لیکن حضور نے تو برف کا پانی کہا تھا۔

غالب: برف ہی کا ہے' میر صاحب' برف ہی کا ہے۔

(وقفہ-----صفیر کا پانی پینا)

صفیر: واقعی بہت سرد ہے-----اور بہت شیریں ہے۔

غالب: اس پانی کا شکر کس منہ سے ادا کروں۔ اتنا میٹھا کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ پھیکا شربت ہے۔ سبک۔ گوارا۔ بے شبہ چشمہ آب حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہوئی ہے۔ خیر' اگر یوں بھی ہے' تو بھائی آب حیات عمر بڑھاتا ہے مگر اتنا شیریں کہاں ہو گا۔

صفیر: ایک دن مرزا مجھ سے کہنے لگے۔

غالب: آپ کہتے ہوں گے کہ غالب خود اچھی اچھی چیز کھاتا ہو گا اور میرے کھانے کے لئے معمولی پلاؤ' قورمہ' شیرمال وغیرہ بھیج دیتا ہو گا۔ میرا کھانا بھی آپ دیکھ لیجئے

صفیر: گیارہ بجے دن کو آپ کا کھانا ایک سینی میں آیا۔ ایک دسترخوان بچھایا گیا۔ اس پر ایک چینی کے پیالے میں شوربا اور ایک تانبے کی رکابی میں پاؤ بھر گوشت کی بوٹیاں اور ایک رکابی تانبے کی خالی۔ پھر مرزا! کے ایک رفیق آکر بیٹھے۔ انہوں نے پھلکوں کے کنارے توڑ کر ٹکڑے کئے اور خالی رکابی میں رکھے۔ پھر ایک چمچے سے توڑا گھی اور شوربا لے کر ان ٹکڑوں کو ملایا اور خوب ملا کر' خلوے کی طرح بنا کر لقمے کے انداز سے ایک طرف رکابی میں رکھ دیا۔ اتنے میں حضرت پلنگڑی سے اترے اور دسترخوان پر آبیٹھے۔ پہلے وہ دونوں لقمے نوش جان فرمائے۔ اس کے بعد آدھ پیالہ شوربا پی گئے۔ بعد اس کے دو پھلکوں کے دو چھلکے لے کر شوربا ملا کر کھائے' اس پر بقیہ شوربا پی لیا اور کھانا ختم کر دیا۔

غالب: لو بھائی' کھانا ختم ہوا۔ بس میری غزا یہی ہے۔ سب کو پاؤ بھر بادام نمک میں تلوا کے کھا لیتا ہوں۔ (وقفہ)

صفیر: ایکدن پنکھے کے میلے میں دس روپے دیکر اپنے عزیزوں کیطرح مجھے بگھی پر بھیجا۔ وہ میلہ بھی قابل دید تھا۔ دہلی کا میلہ کیا کہنا ہے۔ جامع مسجد کو دیکھا۔ تبرکات کی زیارت کی۔ چوک کی سیر روز کرتا تھا۔ بازاروں میں پھرتا تھا مگر دہلی عجیب مقام ہے' جہاں کسی کو کسی سے کام نہیں چیزوں کی خریداری کرو' دام پوچھو' چیز لو' دام دو۔ کسی نے نہ پوچھا تم کون ہو' کہاں کے رہنے والے ہو۔ ایک دن مرزا غالب مجھے مولوی صدر الدین صاحب آزردہ کے پاس لے گئے۔ خواجہ امان صاحب مترجم بوستان خیال میری ملاقات کو چند بار تشریف لائے اور بہت تپاک سے ملے۔ دو مرتبہ مشاعروں میں گیا۔ غرض دہلی میں کئی ماہ رہا۔ قلعے کی خوب سیر کی۔ حضرت غالب سے بہت فیض اٹھایا اور ان کی صحبت سے بہت لطف اندوز ہوا۔

رمضان ۱۲۸۲ھ میں آرہ چلا گیا۔ جب تک حضرت غالب کے ہوش و حواس درست رہے' خط و کتابت جاری رہی۔

حضرت ملا واحدی دہلوی

مرزا غالب قید فرنگ میں 1۔

مسٹر آصف علی کا جو فقرہ میں نے آپ کو سنایا تھا' اس کی تفصیل یہ ہے کہ دلی کی مسجد فتح پوری کے بالکل قریب ہندوؤں نے ایک دھرم سالہ بنا رکھا ہے' جہاں ہندو مسافر مفت قیام کر سکتے ہیں۔ دھرم سالے کے اخراجات کے لئے دھرم سالے ہی میں کچھ کمرے اور کچھ دکانیں ہیں' جنہیں کرائے پر اٹھا دیا جاتا ہے۔ دھرم سالے کی دو چھتی اور دو چھتی کا کمرہ دلی کی کانگریس کمیٹی کے پاس تھا۔ دو چھتی کے اوپر کھڑے ہو کر مسٹر آصف علی نے کانگریس کمیٹی کے ممبروں کو مخاطب کیا۔ دفعہ 144 نافذ تھی۔ گورنمنٹ نے پکڑ لیا کہ تم نے مسافروں کے سامنے تقریر کی ہے' اور کوتوالی کی حوالات میں بند کر دیا' کیونکہ دھرم سالہ کوتوالی کے علاقہ میں ہے۔ حوالات وہی تھی جس میں کبھی مرزا غالب بھی رہے تھے۔ یہ مسٹر آصف علی کی پہلی گرفتاری تھی۔ مسٹر آصف علی نے کہا کہ تقریر کے مخاطب عوام نہیں تھے' صرف کانگریس کمیٹی کے گنے چنے منتظم ممبر تھے۔ مسٹر آصف علی کو دھرم سالہ لے جایا گیا اور مسافروں کو اکٹھا کر کے دو چھتی پر سے دوبارہ تقریر کرائی گئی۔ آواز مسافروں تک نہیں جا رہی تھی۔ مسٹر آصف علی چھوڑ دیے گئے اور گھر واپس آ گئے۔ ان کے گھر سے پہلے راستے میں میرا گھر تھا۔ وہ میرے ہاں تھوڑی دیر رکے اور باتوں باتوں میں انہوں نے فخریہ کہا کہ "حضرت غالب والی حوالات میں رہنے کی سعادت حاصل کر لی۔"

1۔ مکتوب بنام قاری

ملا واحدی دہلوی

غالب کے دیکھنے والے ——— جنہیں میں نے دیکھا

دیکھا تو میں نے مرزا اسد اللہ خاں غالب کے بے شمار دیکھنے والوں کو ہے۔ میری ولادت سے انیس سال تین مہینے پہلے مرزا صاحب کا انتقال ہوا تھا۔ میرے اچھی طرح ہوش سنبھالنے بلکہ رسالہ نظام المشائخ نکالنے تک مرزا صاحب کے دیکھنے والے نہ جانے کتنے بوڑھے اور جوان دلی میں زندہ تھے۔ ان میں سے یہاں چند حضرات کا ذکر کرتا ہوں' جنہیں ناظرین جانتے ہیں اور پہچانتے ہیں۔ ایسے نام گنوانے سے کیا فائدہ جو گمنام ہیں' ویسے تو مختصر بات یہ ہے کہ دلی کی مجھ سے پہلی نسل کے ہر آدمی نے مرزا صاحب کو دیکھا تھا۔

چند حضرات کا ذکر بھی اتنا کروں گا' جتنا انہیں براہ راست جانتا ہوں' دوسروں کی لکھی ہوئی اور شائع شدہ تحریروں سے مدد نہیں لوں گا اور مضمون کو طول نہیں دوں گا۔

میرن صاحب

میری خالہ نور جہاں بیگم' جن کا سو کے لگ بھگ عمر میں انقلاب ۱۹۴۷ء کے بعد انتقال ہوا ہے' اس خاندان کی بہو تھیں۔ جس کے میرن صاحب ایک فرد تھے۔ میں بچپن میں خالہ اماں کو بھائی میرن بھائی میرن کہتے سنتا تھا تو تعجب کرتا تھا کہ میرن عجیب نام ہے۔ پھر میرن صاحب کے نواسے سید رؤف علی کے ساتھ اینگلو عربک ہائی اسکول میں پڑھنے کا موقع ملا تو پتہ چلا کہ خالہ اماں کے بھائی میرن وہ میرن صاحب ہیں جنہیں غالب تا حیات زبان اردو حیات بخش گئے ہیں۔ غالب جن کے خطوط چوما کرتے تھے اور جو غالب کا شعر غلط پڑھنا گناہ سمجھتے تھے۔ لیکن یہ پھر بھی معلوم نہ کیا کہ میرن نام تھا یا عرف (۱)۔

بہرحال میرن صاحب کو میں نے دیکھا۔ اوسط قد کے حسین بوڑھے تھے۔ حالات سے زیادہ واقف نہیں ہوں' ہاں میرن صاحب کا ٹھہر ٹھہر کر بات کرنے کا انداز اس وقت بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔ بڑی پیاری زبان بولتے تھے۔ ٹھیٹھ دلی والے تھے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے میرن صاحب پر اپنی کتاب "چند ہم عصر" میں طویل مضمون لکھا ہے۔ وہ عبدالرؤف بیرسٹر کو میرن صاجب کا داماد لکھ گئے ہیں۔ صحیح نام رؤف علی تھا اور رؤف علی میرن صاحب کے داماد نہیں نواسے تھے۔ رؤف علی کے والد داماد تھے۔ میں نے رؤف علی کے والد اور نانا (میرن صاحب) دونوں کو دیکھا ہے۔

رؤف علی' آصف علی اور عبدالمجید (فرزند خان بہادر عبدالاحد' مالک مطبع مجتبائی) تینوں میرے ہم جماعت تھے اور تینوں ایک ساتھ بیرسٹری پڑھنے گئے تھے۔ دلی کے ممتاز بیرسٹر تھے۔ آصف علی نے بیرسٹری بھی کی اور لیڈری بھی کی۔

عبدالمجید کرنل عبدالمجید بنے اور محکمہ ڈاک کے ڈائرکٹر جنرل تک پہنچے۔ کرنل عبدالمجید کراچی میں ہیں۔

نواب طالب

نواب سعید الدین احمد خاں جو نواب احمد سعید خاں کے نام سے مشہور تھے۔ نواب ضیاء الدین احمد نیر درخشاں کے بیٹے تھے اور نواب سر امیرالدین احمد والی ریاست لوہارو کے چچا۔

اگرچہ میرے حقیقی پھوپھا آغا سید احمد شاہ (جاگیردار نواب سروھنہ ضلع میرٹھ) کی بہن' بادشاہ بیگم نواب طالب سے منسوب تھیں۔ لیکن میں نے نواب طالب کو بس دیکھا ہے۔ میری اور ان کی عمر میں باپ بیٹے کا تفاوت تھا۔ کبھی حاضر خدمت ہونے کی ہمت نہیں ہوئی۔ صاحب جمال اور صاحب جلال رئیس تھے۔ کسی سے جھونک نہ کھاتے تھے۔ شریف خانی اطبا کا طوطی بولتا تھا مگر نواب طالب انہیں خاطر میں نہ لاتے تھے۔

گھوڑے پر سواری دلی میں صرف دو رئیسوں کی نکلتی تھی۔ ایک لالہ چھنامل کے چھوٹے بیٹے لالہ پرشاد کی' دوسرے نواب احمد سعید خاں طالب کی۔ چوکڑی (یعنی چار گھوڑوں کی بگھی) میں نکلنے والے ایک صاحب ضرور تھے۔ گھوڑے پر نکلنے والا اور کوئی نہیں تھا۔ نواب طالب شہسوار تھے۔

نواب طالب کی بھانجی ڈاکٹر کرنل زیڈ احمد (غالباً ضیاء الدین احمد) سے بیاہی گئیں' جو صوبہ آسام کے باشندے تھے اور جن کے بیٹے فخرالدین احمد سالہا سال آسام کے وزیر رہے۔ آج کل بھارت کے مرکزی وزیر ہیں۔ فخرالدین احمد کی ایک بہن پاکستان کے سابق گورنر نواب مشتاق احمد گرمانی کی اہلیہ ہیں۔ اور دوسری بہن حمیدہ سلطانہ دلی کی ممتاز سوشل ورکر ہیں۔ انہیں مضمون نویسی کا بھی شوق ہے۔ میرے اور مسٹر فصیح الدین احمد' ایم اے کے ماہ نامہ ادیب ہیں۔ حمیدہ سلطانہ کے مضامین چھپا کرتے تھے۔ حمیدہ سلطانہ ایک دفعہ کراچی تشریف لائی تھیں تو میرے ہاں بھی آئی تھیں۔

نواب طالب مرزا غالب کے شاگرد بھی تھے اور عزیز بھی۔

منشی ذکاء اللہ

شمس العلماء منشی محمد ذکا اللہ شمس العلماء مولوی نذیر احمد شمس العلماء مولوی ضیاء الدین' شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد اور شمس العلماء مولوی الطاف حسین حالی' رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب' مولوی سیف الحق ادیب' لالہ ٹھاکر داس خاں مولوی سید احمد' سب مجھ سے اتنے بڑے تھے کہ شبہ ہی نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے غالب کو نہ دیکھا ہوگا۔ کئی تو ان میں غالب کے تلامذہ تھے۔ میں نے ان سب کو دیکھا۔ بعض کو قریب سے' بعض کو دور سے۔

شمس العلماء خاں بہادر منشی ذکاء اللہ کا مردانہ مکان اسی سڑک پر تھا جس پر میری رہائش تھی۔ اور میرا دفتر رسائل و اخبارات تھا۔ منشی صاحب میرے لکھنے پڑھنے کے شوق کی وجہ سے مجھے عزیز رکھتے تھے۔ آخری پرچہ میرا نظام المشائخ ہی تھا جس کو منشی صاحب نے "دلی کے منہدم معابد و مقابر" کے عنوان سے مسلسل مضامین عنایت فرمائے۔ میں نے ان سے پابندی اوقات اور باضابطگی سیکھی۔ منشی صاحب کی باضابطگی اور بااصولی کا یہ عالم تھا کہ مڈل کلاس (آٹھویں) جماعت کے ریاضی کے پرچے پنجاب یونیورسٹی کو دیا تھا۔ خیر جس سال کا میں واقعہ لکھ رہا ہوں اس سال منشی صاحب

کے چھوٹے بیٹے فرحت اللہ نے امتحان دیا تھا۔ فرحت اللہ بڑے تیز تھے۔ پرچوں کا بکس آیا تو فرحت اللہ نے بکس توڑ پرچہ بدل دیا اور بکس صفائی سے بند کر دیا۔ منشی صاحب نے جو فرحت اللہ کے سارے جواب صحیح دیکھے تو وہ کھٹکے اور بیٹے سے پوچھا کہ تم نے پرچہ بدلا ہے۔ بیٹے نے اقرار کر لیا۔ منشی صاحب نے بیٹے کو تین سال تک امتحان میں نہ بیٹھنے کی سزا دلوا دی۔ منشی صاحب کے ایک بیٹے مولوی عنایت اللہ بی اے صاحب تصنیفات تھے اور ناظم دارالترجمہ ریاست حیدر آباد دکن' اور دوسرے بیٹے مسٹر رضاء اللہ بی اے' بی ای ریاست بہاولپور میں اسٹیٹ انجینئر تھے' تیسرے بیٹے نکالے جانے کے بعد کیا پڑھتے' پھر اسکول کالج کا نام نہیں لیا۔ مشہور صاحب طرز ادیب مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے ہم نام کو شوخی و شرارت میں اپنا استاد بتایا ہے۔

منشی ذکاء اللہ کے زنانہ اور مردانہ مکانوں میں مشکل سے دس منٹ کا فاصلہ تھا۔ لیکن منشی صاحب ایک مکان سے دوسرے مکان جاتے تھے تو پورا لباس پہن کر جاتے تھے۔

وقت کی پابندی منشی ذکاء اللہ کی ضرب المثل تھی۔ روزانہ شام کے ٹھیک چار بجے ٹاؤن ہال لائبریری جایا کرتے تھے' ایک راستے اور ایک رفتار سے۔ سرسید احمد خاں کا مکان راستے میں پڑتا تھا۔ سرسید کے بڑے بیٹے سید حامد گھڑی لے کر منتظر رہتے تھے اور منشی صاحب کو دکھا کر گھڑی ملانے لگتے تھے۔ یہ گویا دونوں کی ٹھٹھول تھی۔

منشی ذکاء اللہ کا سرسید احمد خاں کے لیفٹننٹوں میں شمار تھا۔ مگر منشی صاحب نے سرسید کی لباس اور مذہبی تجدد میں پیروی نہیں کی۔ لباس اور مذہبی تجدد میں سرسید کے بیشتر ساتھی سرسید کے برعکس تھے۔ منشی ذکاء اللہ انگرکھا یا اچکن (شیروانی نہیں) اور چغہ اور دیسی جوتی پہنتے تھے۔ اور سر پر عمامہ باندھتے تھے۔ جاڑے میں روئی دار پاجامہ ہوتا تھا۔

چھیاسی ستاسی سال کی عمر پائی۔ فیملی ڈاکٹر ہیم چندر سین نے ان کے مرض الموت میں کہا تھا' منشی صاحب کے جملہ اعضائے رئیس قابل اطمینان کام کر رہے ہیں لیکن عمر کا کیا علاج کیا جائے' عمر موت کو بلا رہی ہے۔

مرض الموت میں منشی ذکاء اللہ علی الصباح چوبیس گھنٹوں کی کیفیت قلمبند فرما لیتے تھے۔ وہی ڈاکٹر کو پڑھوا دیتے۔ وہی عیادت کرنے والوں کے آگے سرکا دیتے۔ ایک دفعہ مجھ سے فرمایا کہ آج تمام کتابوں اور تمام مضامین کا حساب لایا گیا تھا' میں نے عمر بھر میں اندازاً" دو لاکھ صفحے فل سکیپ سائز کے لکھے ہیں۔

ایک بوڑھا بارہ تیرہ برس کی اپاہج اور سڑن بیٹی کو پشت پر لٹکائے ہمارے مکان کے آگے سے اکثر گزرا کرتا تھا۔ ایک دن منشی صاحب کہنے لگے' اسے دیکھ لو' یہ بڑا آدمی ہے اور بڑا انسان ہے۔ تم آئندہ بڑے آدمی تو دیکھو گے' بڑے انسان نہیں دیکھو گے۔ یہ بوڑھا بارہ تیرہ سال سے اس اپاہج اور سڑن بیٹی کو اٹھائے پھر رہا ہے' گو' موت اور رال کے دریا پیٹھ پر بہتے ہیں' مگر یہ نہیں اکتاتا۔ اللہ کا خوف ہو' یا بیٹی کی محبت یا مری ہوئی بیوی سے وفاداری ہو' ہر صورت میں اس بوڑھے کے اندر بڑی پاکیزہ روح ہے۔

مولوی نذیر احمد

شمس العلماء خاں بہادر مولوی نذیر احمد ایل ایل ڈی المعروف بہ ڈپٹی نذیر احمد انگریزی میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ریاست

نئے اہتمام کے ساتھ

قرآن مجید کے ممتاز اور معتبر اُردو ترجموں میں منفرد، بامحاورہ اور دلنشیں ترجمہ پر مشتمل

قرآن مجید مترجم

از قلم: مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

خصوصیات

☆ رواں اور برمحل بین السطور اُردو ترجمہ۔ اُردوئے مبین کی شان لیے ہوئے
☆ عمدہ کاغذ پر دورنگی طباعت سے مزین
☆ قرآنی متن، ہلکے سبز رنگ کی زمین پر
☆ اردو ترجمہ، سفید زمین پر
☆ عربی متن اور اُردو ترجمہ دونوں اعلیٰ کمپیوٹرائزڈ کمپوزنگ میں
☆ خوبصورت مضبوط جلد، ڈائی اور سکرین پرنٹنگ سے آراستہ

سائز: ۲۰x۳۰/۸ صفحات: ۹۰۰ ہدیہ: ۴۲۵/روپے

شائع کردہ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمٹیڈ

رحمٰن مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

فون: ۷۲۳۴۰۱۴_۷۲۳۶۶۶۵

شہر میں آ کر پڑھنے والے بھول گئے
کس کی ماں نے کتنا زیور بیچا تھا

یہ اور اس طرح کے سینکڑوں خوبصورت شعروں کے خالق

اسلم کولسری

جس نے عہدِ حاضر کی اردو غزل کو نئے ذائقوں سے آشنا کیا

- جس کی شاعری میں گاؤں کی سادگی، سچائی، تازگی، تاثیر اور محبت رچی بسی ہے
- ایک مختلف اور منفرد آواز ________ جیسے
- بانسریوں کی مدھرلے میں زخمی کوئل کی کوک شامل ہوئی ہو
- ایسے خوبصورت شاعر کے مختلف لہجہ کے کلام سے حامل شعری مجموعے

کاش، تخلِ جاں، ویرانہ، نیند، جیون، برسات، عنبر، پنچھی

خود بھی مطالعہ کیجئے اور دوستوں کو تحفہ میں دیں

خوبصورت سرورق سے آراستہ

القمر انٹرپرائزز غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور

حیدر آباد دکن نے کہیں اونچا چڑھا دیا مگر ڈپٹی گیری ایسی چپٹی تھی کہ آخری سانس تک ڈپٹی کہلائے۔

مجھے ڈپٹی صاحب کے ہاں جانے کے مواقع میسر نہیں آئے۔ دیکھا بارہا' ان کی کتابیں ہی نہیں پڑھیں' تقریریں بھی سنیں۔ بس ایک بار خواجہ حسن نظامی کے ہم رکاب شرف نیاز حاصل کیا تھا' خواجہ صاحب نے پوچھا' حضرت! پردے کے متعلق کیا رائے ہے؟ بولے' کس کے پردے کے متعلق آپ پوچھتے ہیں' لڑکوں کے متعلق یا لڑکیوں کے متعلق؟ میرے رائے میں آج کل لڑکوں کو بھی پردہ کرنا چاہیے۔

میرے اور ڈپٹی نذیر احمد کے مکانوں میں ڈھائی تین میں کا فاصلہ تھا۔ اس لیے ڈپٹی صاحب کی صحبت سے فیض یاب نہ ہو سکا۔ جسٹس سر عبدالرحمٰن اور جسٹس کے استاد شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن (پروفیسر سینٹ سٹیفنز کالج) ڈپٹی صاحب کے خاص شاگردوں میں تھے اور مرزا فرحت اللہ بیگ بھی۔

ڈپٹی نذیر احمد اپنے زمانے کے بہترین مقرر تھے۔ سرسید احمد خاں کا جلسہ ان کی تقریر سے چمک اٹھتا تھا۔ تحریر تو ڈپٹی صاحب کی آج بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ ڈپٹی صاحب کی کتابیں ابھی موجود ہیں۔

مولوی ضیاء الدین

شمس العلماء خاں بہادر مولوی ضیاء الدین ایل ایل ڈی بھی صاحب تصانیف تھے۔ ڈپٹی کلکٹر رہے تھے اور ڈپٹی ضیاء الدین کہلاتے تھے۔ زندگی میں ڈپٹی نذیر احمد کے ہم پایہ مانے جاتے تھے۔ انتقال نے فراموش کر دیا۔

میں نے ڈپٹی ضیاء الدین کو دیکھا مگر میرا ان کا سابقہ نہیں پڑا۔ حالانکہ وہ دور نہیں تھے۔ زیر جامع مسجد رہٹ کے کوچے میں رہتے تھے۔ ڈپٹی ضیاء الدین کے ایک بیٹے پروفیسر مرزا محمد سعید کے بہنوئی تھے۔ انہوں نے فقہ حنفی پر ہزار بارہ سو صفحے کی کتاب لکھی تھی' اس کے سلسلے میں ان کا میرے ہاں آنا جانا رہا۔ باپ کی طرح ذی علم تھے۔ پنجاب یونیورسٹی انہیں ممتحن بناتی تھی۔ مجھے دیکھیے کہ ان کا (۴) اور ان کی معرکہ آرا کتاب کا نام بھول گیا۔ کتاب کے مولانا محمد علی جوہر مداح تھے۔

مولانا آزاد

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد نے چونکہ لاہور کی سکونت اختیار کر لی تھی انہیں ایک دفعہ دیکھ سکا۔ جب بیٹی کی موت سے ان کا دماغ ماؤف ہو گیا تھا او وہ لاہور سے پیدل منشی ذکاء اللہ سے ملاقات کرنے دہلی پہنچے تھے۔ مولانا آزاد کے پوتوں آغا محمد طاہر اور آغا محمد اشرف سے میرا کافی اخلاص تھا۔ یہ پوتے میرے دوست میر محمد حسین کے بھانجے تھے۔ تیسرے پوتے آغا محمد باقر بھی میرے پاس آ چکے ہیں۔ اور آغا طاہر سے بڑے پوتے سے بھی ملاقات تھی۔ ان کا نام یاد نہیں آ رہا۔

مولانا حالی

کیا شان پروردگار ہے' زندگی میں جو رتبہ ذوق کو حاصل رہا' وہ غالب کو نصیب نہیں ہوا۔ غالب یاروں کے یار تھے۔ ہر

بلاوق امیر اور رئیس کی محفل میں صدارت کرتے ملتے ہیں۔ اور ذوق کہیں نظر نہیں آتے لیکن ابو ظفر بہادر شاہ کا استاد ہونا ذوق کا پلڑا جھکا دیتا تھا۔ غالب ذوق سے ٹکراتے تھے مگر بالآخر انہیں کہنا پڑا تھا۔

استاد شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے

آج اردو کا دشمن بھارت غالب کو اپنا رہا ہے اور ساری دنیا سے انہیں عظیم شاعر منوا رہا ہے لیکن وہی بھارت ذوق کی قبر پر پبلک کے لیے پاخانہ بنوا رہا ہے۔ نہ جانے سچ ہے' نہ جانے جھوٹ' خبر پڑھی تھی' تردید نہیں پڑھی۔ ممکن ہے مبالغہ ہو' تاہم اتنا تو ماننا ہو گا کہ آج غالب ہی غالب ہیں' ذوق کی پرسش ہے نہ مومن کی' ارے صاحب' میر کو ماند کر دیا' جن کی بابت غالب نے خود فرمایا ہے۔

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

مجھ سے پہلی نسل کے دلی والوں کو مومن کا کلام جتنا ازبر تھا' اتنا غالب اور ذوق کا کلام ازبر نہیں تھا۔

پھر دوسری شان اللہ تعالیٰ کی دیکھئے' صاحب اولاد مومن کا کوئی نام لیوا باقی نہیں رہا' مومن کے پوتے عبدالوہاب میرے ساتھ پڑھتے تھے' وہ بھی جوان مرگئے' لاولد غالب سے سب رشتہ جوڑتے ہیں۔

سب سے زیادہ اچنبھا اس پر ہے کہ ملا ٹاپ ذوق نے رنگین مزاج داغ جانشین پایا اور وہ رند مشرب غالب کو انتہائی ثقہ حالی عطا ہوئے' مولانا حالی کی صورت اور چال ڈھال پر ثقاہت برستی تھی۔

شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسین حالی کی میں طالب علمی کے دور میں اکثر زیارت کرتا تھا۔ وہ دلی میں مولوی عبدالاحد کے ہاں ٹھہرتے تھے۔ مجھے ہمیشہ کرم اللہ خاں المعروف بہ ننھے خاں (رئیس) کے گھر محلہ نیا محل جاتے ہوئے محلہ چوڑی والان میں جوتے والوں کی گلی کے قریب ملتے تھے۔ میں اینگلو عربک ہائی اسکول جاتا ہوتا تھا۔ میری عمر اس وقت سترہ اٹھارہ برس کی تھی۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا کہ سلام کر لوں اور سلام کو جواب لے کر مگن ہو جاؤں۔

مولانا حالی کے بیٹے خواجہ سجاد حسین اپنے دوست مسٹر رضاء اللہ ابن شمس ذکاء اللہ سے ملنے آتے تھے تو مسٹر رضاء اللہ انہیں میرے ہاں بھی لاتے تھے۔ رضاء اللہ میرے بھی دوست تھے۔ مولانا حالی کے پوت دہلاوں' آنریبل خواجہ غلام الثقلین (میونسپل کونسل) اور خواجہ غلام السبطین (مینجر ہندوستانی دوا خانہ دہلی) سے خاصی یاد اللہ رہی۔ خواجہ غلام الثقلین نے محی بھیا احسان الحق کی شرکت میں ایک ماہوار رسالہ "عصر جدید" نکالا تھا۔ بھیا میرٹھ کے رئیس تھے' خواجہ غلام الثقلین میرٹھ کے نمایاں ایڈووکیٹ۔

مولانا حالی مرزا غالب کے ایسے شاگرد تھے کہ مرزا صاحب نے ان سے فرمایا تھا کہ "میں لوگوں کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا' لیکن تمہاری نسبت میرا خیال ہے کہ تم اگر شعر نہیں کہو گے تو اپنی طبیعت پر ظلم کرو گے۔"

پیارے لال آشوب

وائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب کو میں نے دور سے دیکھا ہے۔ آشوب لالہ سری رام ایم اے مصنف خم خانہ

جلوید کے چچا تھے۔ آشوب بھی ایم اے تھے اور غالب کے عقیدت مند کرنل بالرائڈ یا میجر فلر (ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب) کے مزاج میں انھیں دخل تھا۔ مولانا محمد حسین آزاد' مولانا الطاف حسین حالی' مرزا عبدالغنی ارشد' مولوی امو جان اور مرزا بیگ بیدل کو پیارے لال آشوب ہی نے دلی سے لاہور بلایا تھا۔ اور محکمہ تعلیم میں لگایا تھا۔ پیارے لال آشوب ڈائرکٹر کے پیش کار تھے۔ آخر میں انسپکٹر آف اسکولز ہو گئے تھے۔ وہ پہلے ہندوستانی انسپکٹر آف اسکولز تھے' کیا مبارک زمانہ تھا۔ ہندو نے ہندوئیت اور مسلمانیت نہیں دیکھی' اہلیت دیکھی' سیاست کا بھلا ہو کم بخت نے زمانہ بدل ڈالا۔

سیف الحق ادیب

مولوی سیف الحق ادیب شیخ عبدالحق محدث کی لولاد میں تھے اور غالب کے شاگرد تھے۔ شیخ عبدالحق محدث کی اولاد ۱۹۴۷ء تک میرے مکان کے نزدیک گلی مفتی والان میں یکجا رہتی تھی لیکن مولوی سیف الحق ادیب کے بڑے بھائی خاں بہادر مولوی انوار الحق' میر منشی ریذیڈنسی راجپوتانہ بالکل میرے مکان سے متصل مکان میں آبسے تھے۔ مولوی انوارالحق نے میری حقیقی چچی کی بیوہ بہن سے بلوچ سے نکاح ثانی کرلیا تھا۔ ان کی عورتوں کا ہمارے ہاں اور ہماری عورتوں کا ان کے ہاں چھتوں چھتوں آنا جانا تھا۔ اپنے زینے سے چڑھیں لور دوسرے کے زینے سے اتر گئیں۔ بیوہ بلوچ سے مولوی انوار الحق کی دو لڑکیاں ہوئیں۔ ایک رئیس الدین سابق سیکرٹری مرکزی وزارت صحت پاکستان کی والدہ' دوسری اسلام الحق فرزند سیف الحق ادیب کی بیوی' دونوں لڑکیاں میری چھوٹی بہن بن گئیں۔ گیتی آرا بیگم کی سہیلیاں تھیں۔ اسلام الحق سجاد حیدر یلدرم کے ساتھ انگریزی حکومت میں فارن آفس کے اعلیٰ عہدے دار تھے۔

مولوی سیف الحق ادیب کو میں نے خواب سا دیکھا ہے۔ ان کی عمر بہت کم ہوئی۔ مرے ہیں تو میں پانچ برس کا تھا۔ لیکن پانچ برس کی باتیں مجھے بے شمار یاد ہیں۔ آج کل کی باتیں بھول جاتا ہوں۔ ۱۹۴۷ء سے حافظہ بگڑ رہا ہے۔

مولوی سیف الحق ادیب کے دوسرے بیٹے انعام الحق کرکٹ کے کھلاڑی تھے۔ دلی میں جہاں اب ایڈورڈ پارک ہے' وہاں انعام الحق کی کلب کھیلتی تھی۔ میرے عزیز خواجہ فضل احمد بھی اس کلب کے ممبر تھے۔ میں ان کے ساتھ جاتا تھا اور میرے ہم سن مولوی شمس الاسلام (سابق ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن بیورو' پاکستان) انعام الحق کے ساتھ آتے تھے۔ ہم دونوں کا کام یہ تھا کہ گیند باؤنڈری سے باہر جاگرے تو بھاگ کر اٹھا لائیں۔ ہم دونوں تیرہ تیرہ چودہ چودہ برس کے تھے۔

شیخ عبدالحق محدث کی اولاد میں شان الحق حقی کراچی میں ہیں اور شریف الحسن استنبول (ترکی) میں سفارت خانہ پاکستان کے پریس اتاشی کی حیثیت سے میرے بچپن کے ساتھی قاضی لطیف الحق حقی راولپنڈی میں ہیں۔

اسمٰعیل میرٹھی

میرٹھ کے ایک پرانے سے مکان کی لمبی ڈیوڑھی میں ایک تخت بچھا ہوا تھا اور دو چار مونڈھے پڑے تھے' جب مولانا اسمٰعیل میرٹھی سے میری لور خواجہ حسن نظامی کی ملاقات ہوئی۔ خواجہ صاحب بعد میں بھی ملتے رہے' میں دوبارہ

نہیں ملا۔"

ٹھاکر داس

لالہ ٹھاکر داس میرے مخلص لالہ شمبھو ناتھ' مالک دلی پرنٹنگ ورکس کے والد تھے۔ دلی پرنٹنگ ورکس کی بنیاد لالہ ٹھاکر داس نے ڈالی تھی۔ وہ علمی آدمی تھے۔ مدتوں فالنز اردو انگریزی ڈکشنری کی تیاری میں مولوی سید احمد' مولف فرہنگ آصفیہ کی مشل شریک رہے۔ مولوی سید احمد ساتھ ساتھ فرہنگ آصفیہ مرتب کرتے جاتے تھے۔ لالہ ٹھاکر داس نے پریس قائم کرکے علم و ادب کی خدمت انجام دی۔ لالہ ٹھاکر داس کے پوتے اور لالہ شمبھو ناتھ کے بیٹے لالہ شام ناتھ بھارت کے مرکزی نائب وزیر اطلاعات و نشریات تھے۔ حال میں انتقال کیا ہے۔ میرا دادا سے لے کر پوتے تک سے سابقہ رہا۔ میں اس خاندان کی وضع داری کا مداح ہوں۔

مولوی سید احمد

خاں صاحب مولوی سید احمد اپنی اردو لغات فرہنگ آصفیہ کی وجہ سے زندہ جاوید ہیں۔ مولوی سید احمد شمس العلماء مولوی سید احمد' امام جامع مسجد کے پہلے خسر تھے۔ مولوی سید حمید موجودہ امام کے نانا۔ مولوی سید احمد غیر معمولی سلیقے کے آدمی تھے۔ خط خراب تھا۔ لیکن کاغذ بوجھیا استعمال کرکے بدخطی دبا لیتے تھے۔ اچھا پہننے اور خاص طور سے اچھا کھانے کا شوق تھا۔ اپنی گھوڑا گاڑی تھی۔ اس کی دونوں طرف کی نشستیں ڈھکنے دار تھیں۔ گویا صندوق تھا۔ ایک صندوق میں منشی محمد دین خوشنویس دلی پرنٹنگ ورکس کے مسودے اور پروف رکھتے تھے۔ اور دوسرے میں برف کی سلی' لیمنڈ کی بوتلیں اور موسم کے پھل' بند گاڑی تھی' جسے پالکی گاڑی کہا جاتا تھا۔ بھوک پیاس محسوس ہوتی تھی تو اسے راستے میں مارتے نہیں تھے' بجھا لیتے تھے۔

منشی محمد دین خوشنویس میرے مکان کے سامنے والی گلی میں رہتے تھے۔ مولوی سید احمد انہیں کام دینے یا لینے آتے تھے تو میرے پاس بھی ضرور آتے تھے۔ میرے رسالہ نظام المشائخ میں ان کے مضامین چھپتے تھے۔

حکیم عبدالمجید خاں

اوپر جتنے حضرات کا ذکر کیا گیا ہے انہیں غالب کا ہمعصر بغیر شک و شبہ کے کہا جا سکتا ہے۔ ان حضرات نے پختہ عمروں میں غالب کو دیکھا تھا۔ ہاں میں سرسید احمد خاں کو تو چھوڑ ہی گیا۔ سرسید احمد خاں اسی محلے کے رہنے والے تھے جس کا میں رہنے والا تھا۔ سید صاحب علی گڑھ کالج کی مصروفیتوں کے باوجود دلی کے پھیرے لگایا کرتے تھے۔ سید احمد صاحب غالب کے قریباً ہم عصر(۳) تھے۔ سید صاحب کے انتقال کے وقت میں گیارہ برس کا تھا۔

خیر اب میں جن حضرات کا ذکر کرتا ہوں' انھوں نے غالب کو بچپن' لڑکپن اور نوجوانی میں دیکھا تھا۔ نواب سراج الدین احمد خاں سائل تحریر فرمایا کرتے تھے کہ مجھے غالب نے گود میں کھلایا ہے۔

غالب میرے دادا تھے' میں غالب کا پوتا ہوں

حکیم عبدالمجید خاں، حکیم واصل خاں، حکیم اجمل خاں، حکیم رضی الدین، نواب سر امیرالدین، میر ناصر علی، مولانا راشد، مجمود، تاباں اور ناصر نذیر فراق، تمام کے تمام نواب سائل سے کسی نہ کسی قدر بڑے تھے۔ بعض یقیناً اور بعض میرے اندازے کے مطابق، کسی نے غالب کو پانچ برس کی عمر میں دیکھا۔ کسی نے دس گیارہ برس کی عمر میں اور کسی نے پندرہ اور بیس کے درمیان۔ خاندان لوہارو پانچ چھ برس کی عمر میں قطعی دیکھ سکتا تھا۔ میں نے ان تمام حضرات کو خوب دیکھا ہے۔ حکیم عبدالمجید خاں البتہ میری کم عمری میں انتقال کر گئے تھے۔ عبدالمجید خاں کی جھلک یاد ہے۔ ان کے چالیسویں پر تورہ بندی ہوئی تھی۔ اور بڑی سینی کے سائز کی باقر خانیاں بنی تھیں۔ ہمارے ہاں بھی حصہ آیا تھا۔ ویسی باقر خانی پھر نہیں کھائی۔

حکیم واصل خاں

حکیم عبدالمجید خاں کے دو چھوٹے بھائی تھے۔ حکیم محمد واصل خاں اور حکیم محمد اجمل خاں حکیم واصل خاں سے میرا طبیب اور مریض کا تعلق رہا۔ میں ان سے علاج کراتا تھا۔

حکیم اجمل خاں (۴)

مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں کانگریس کی شرکت سے قبل حاذق الملک تھے۔ حاذق الملک کا خطاب حکیم عبدالمجید خاں نے حکومت سے اس شرط کے ساتھ لیا تھا کہ یہ خطاب میرے خاندان کے علاوہ اوروں کو نہیں دیا جائے گا۔ حکیم عبدالمجید خاں حاذق الملک اول تھے، حکیم اجمل خاں حاذق الملک ثانی۔

حکیم اجمل خاں کی بیوی، یعنی حکیم جمیل خاں کی والدہ میرے عزیز خواجہ فضل احمد خاں کی رشتے کی بہن تھیں۔ حکیم جمیل خاں کی بیٹی خواجہ فضل احمد خاں کے بھتیجے محمود احمد خاں، ریجنل الکشن کمشنر، مغربی پاکستان کی اہلیہ ہیں۔ میری بھی بھتیج بہو ہوئیں۔ لیکن میرا حکیم اجمل خاں سے الگ معاملہ رہا۔ انھوں نے ۱۹۱۲ء میں نظام المشائخ کی کامیابی کے پیش نظر مجھ سے ہفتہ وار اخبار طبیب نکالنے کو کہا۔ حکومت سے سفارش کی اسے ضمانت جمع کرنے کی زحمت نہ دے۔ اسے آل انڈیا ویدک اینڈ طبی کانفرس کا آرگن بنا لیا۔ میں ۱۹۱۳ء میں حکیم صاحب سے قریباً روز ملتا تھا۔ میں نے ان سے زندگی کا برتنا سیکھا۔ خواجہ حسن نظامی نے میری بالارادہ تربیت کی۔ حکیم اجمل خاں نے بے ارادہ تربیت فرمائی۔ تین شخص ہیں جنھیں میں اپنا تربیت دہندہ مانتا ہوں۔ نمبر ایک خواجہ حسن نظامی، نمبر دو منشی ذکاء اللہ، نمبر تین حکیم اجمل خاں، میرے والد کا انتقال میری کم سنی میں ہو گیا تھا۔

حکیم اجمل خاں کا خطاب مسیح الملک "خواجہ حسن نظامی نے تجویز کیا تھا جسے حکیم صاحب نے قبول کر لیا اور پورے ملک نے بھی۔ خطاب حاذق الملک لوگ بھول گئے۔ حکیم صاحب نے خطاب حاذق الملک واپس کر دیا تھا۔

حکیم رضی الدین

شفاء الملک حکیم رضی الدین دلی میں حکیم اجمل خاں کے مقابلے کے طبیب اور رئیس تھے۔ ذہین اور دانشمند۔

میں خواجہ حسن نظامی کے ساتھ ان کے ہاں جایا کرتا تھا۔ ان کے والد حکیم ظہیرالدین، حکیم محمود خاں والد حکیم اجمل کے ہم عصر تھے۔ مگر میرے زمانے تک حیات تھے۔ میں نے انہیں دیکھا نہیں (۵)۔

نواب سرامیرالدین

ہزہائی نس نواب سرامیرالدین احمد فرخ مرزا کے سی ایم جی تھے۔ لوہارو جیسی ریاست کے والی و حکمراں لیکن ان کا اثر و رسوخ حکومت میں بڑی بڑی ریاستوں سے زیادہ تھا۔ بڑے بڑے راجاؤں اور نوابوں سے بڑھیا خطابات انہیں ملے ہوئے تھے۔ توپوں کی سلامی کا اعزاز بھی حاصل تھا۔ غیر معمولی سوجھ بوجھ کے شستہ اور شائستہ رئیس تھے۔ عمر کافی تھی، اس لیے بڑے بڑے نواب چچا اور ماموں کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

مسلم لیگ کے قیام سے پہلے ایک وفد سر آغا خاں محمد شاہ کو وائسرائے کے پاس شملہ لے جاتا تھا۔ آغا خاں بیمار پڑ گئے۔ مسلمان لیڈروں نے ان کی جگہ نواب سرامیرالدین کو اپنا لیڈر بنالیا اور وہ وفد لے گئے۔

نواب رضا علی ریاست رام پور کی گدی پر بیٹھے اور ان کا پہلا دربار ہوا تو خواجہ حسن نظامی کو بھی مدعو کیا گیا۔ خواجہ صاحب رام پور پہنچے تو پتہ چلا کہ دربار کے وقت درباری لباس پہننا ضروری ہے۔ نواب سرامیرالدین اور خواجہ صاحب کا کمرہ برابر برابر تھا۔ خواجہ صاحب سے کہا، آپ نے دیکھا ہوگا، میں نظام دکن کے دربار میں اپنی فقیرانہ وردی میں جاتا ہوں۔ نواب صاحب نے فرمایا، میں یہاں بھی آپ کو مستثنیٰ کرا دوں گا۔ چنانچہ مستثنیٰ کرا دیا۔

نواب سرامیرالدین کے بیٹے جمیل الدین عالی پاکستان کی انجمن ترقی اردو اور رائٹرز گلڈ کے جنرل سیکرٹری اور سیکرٹری جنرل ہیں۔

مولوی سید احمد

شمس العلماء مولوی سید احمد (۶) امام جامع مسجد دہلی بھی دوسرے نواب سرامیرالدین تھے۔ والیان لوہارو میں نواب سرامیرالدین اپنے پیش روؤں سے پیش پیش رہے۔ اسی طرح مولوی سید احمد نے جیسی کامیاب زندگی بسر کی ویسی زندگی پہلے کے اماں جامع مسجد نے شاید ہی بسر کی ہو۔ انگریز حکام پر وہ حکومت کرتے تھے۔ مجھے ایک کام لینے کا ان سے اتفاق ہوا، ان میں امام صاحب کی حکومت آنکھوں سے دیکھی۔

مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی ۱۹۱۴ء میں نظر بند ہوئے ہیں تو چونکہ خواجہ حسن نظامی بھی مسجد کانپور کے قضیے کے باعث علی برادران، مولانا ابوالکلام اور مولوی ظفر علی خاں کے قدم بہ قدم چل رہے تھے۔ افواہ پھیل گئی کہ اگلی باری حسن نظامی اور واحدی کی ہے۔ امام صاحب نے ایک دن میرے عزیز خواجہ فضل احمد خاں سے کہا کہ بھئی! یہ تمہارا واحدی ناحق مارا جا رہا ہے۔ اسے تو سیاست سے مطلق تعلق نہیں ہے۔ خواجہ فضل احمد نے امام صاحب کی گفتگو مجھے سنائی اور مشورہ دیا کہ تم امام صاحب کو لے کر چیف کمشنر کے پاس جاؤ اور اپنا پیچھا چھڑاؤ۔ میں نے سوچا چیف کمشنر سے تنہا کیوں نہ مل لوں۔ میں تنہا پہنچ گیا ملاقاتیوں کا کمرہ ملاقاتیوں سے بھر چکا تھا۔ دو کرسیاں خالی تھیں۔ ایک پر بیٹھ گیا اور غور کرنے لگا کہ پچاس ساٹھ رائے بہادروں اور خاں بہادروں کے بعد ملاقات کا وقت ختم ہو جائے گا اور میں بے

نیل و مرام واپس ہوں گے۔ اتنے میں امام صاحب آتے دکھائی دیئے۔ میرے برابر کی خالی کرسی پر تشریف فرما ہو کر انہوں نے مجھ سے دریافت کیا' تم تو حکام سے بھاگتے ہو' تم یہاں کیسے؟ میں نے وجہ حاضری بیان کر دیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو آج میری مدد کے واسطے بھیجا ہے۔ آپ مجھے ملوا دیجئے۔ امام صاحب سب سے آخر میں آئے تھے' مگر سب سے پہلے بلائے گئے اور پانچ منٹ کے اندر اندر میرا نام پکارا گیا اور میں امام صاحب کے طفیل امرا و روسا کو پیچھے چھوڑ چیف کمشنر کے کمرے میں جا پہنچا۔ چیف کمشنر سر مم لیکم ہیلی تھے۔ جو ترقی کر کے صوبہ پنجاب کے گورنر رہے اور پھر صوبہ یو پی کے گورنر۔ گورنریوں سے ریٹائر ہوئے تو لارڈ بنائے گئے۔ لارڈ ہیلی کہلائے۔

امام صاحب نے ان ہیلی صاحب سے اس قدر ڈانٹ ڈانٹ کر باتیں کیں کہ میں حیران رہ گیا۔ جو کام کرنے آئے تھے اسے تو بھول گئے' بار بار جواب طلب کرتے تھے کہ واحدی کو بے بنیاد کیوں شامل کیا جا رہا ہے۔ کوئی قصور تو معلوم ہو۔ بتایئے کوئی قصور! المختصر ہیلی صاحب کو مجھ سے ایسا برتاؤ کرنے پر مجبور کر دیا کہ میرا ایمان سرکنے لگا۔

امام صاحب نے دلی کے سینکڑوں مسلمانوں کو اعلیٰ عہدے دلوائے۔ سفارش کرنا وہ عبادت سمجھتے تھے۔ وائسرائے کے ہاں انہیں "پرائیویٹ انٹری" کی اجازت تھی لیکن مسلمانوں کی خاطر امام صاحب تھانیداروں کے حضور بھی جا کھڑے ہوتے تھے۔ جوشیلے مسلمان تھے۔ آخر عمر میں ان کا میرا سی مجلس اوقاف دہلی میں اور قبرستان کمیٹی دہلی میں ساتھ رہا۔

میر ناصر علی (۷)

خاں بہادر میر ناصر علی محکمہ نمک میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ پنشن ہو گئی تو ماہنامہ صلائے عام نکالا اور علم و فضل اور انشا پردازی کی دھاک بٹھا دی۔ دلی کا پہلا چیف کمشنر سر ا کلم ہیلی تھا۔ دوسرا سرجان تھامسن۔ تھامسن کو مشرقی علوم و فنون سے بے حد دلچسپی تھی۔ اس کا میر ناصر علی سے خاصا یارانہ ہو گیا تھا۔ علم دوستی اور انشا پردازی کے سبب سے تھامسن خواجہ حسن نظامی کی بھی قدر کرتا تھا اور مولانا راشد الخیری سے بھی ملاقات کا خواہش مند تھا لیکن مولانا راشد الخیری نے اس کی خواہش پوری نہیں کی۔ میں مولانا راشد الخیری کے ساتھ جا کر میر ناصر علی سے ملا ہوں۔

میر ناصر علی کے پوتے انصار ناصری پاکستان ریڈیو میں کہیں اسٹیشن ڈائریکٹر ہیں یا ممکن ہے اس سے اونچے ہوں۔

مولانا راسخ (۸)

میں ۱۹۰۳ء میں نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اس وقت سے میں نے اخبار "وطن" لاہور' اخبار وکیل امرتسر اور پیسہ اخبار لاہور میں الٹا سیدھا لکھنا شروع کر دیا تھا لیکن یہ الحمد للہ میرا ریکارڈ ہے کہ میری الٹی

سید ھی تحریریں شائع ضرور ہو جاتی تھیں۔ مولا عبدالرحمن راسخ کے ایک شاگرد، محمد مرزا مشتاق میرے پڑوسی تھے۔ میں غزل کہتا اور انہیں دے دیتا۔ مشتاق صاحب غزل کی نوک پلک درست کرکے راسخ صاحب کے ماہوار گلدستہ "مذاق سخن" میں چھپوا دیتے تھے۔ یوں مجھے مولانا راسخ کے نام کا علم ہوا۔ یہ مولانا راسخ کی رند مشربی کا دور تھا۔ اس دور میں راسخ صاحب اس قسم کے شعر کہہ جاتے تھے۔

چاوڑی قاف ہے یا خلد بریں ہے راسخ
غول حوروں کے یا پریوں کے پرے رہتے
ہیں

مولانا راسخ کے والد مولوی محمد حسین فقیر دلی کے ممتاز عالم اور واعظ تھے۔ مولوی محمد حسین کے تین بیٹوں کی مولویت میں دھوم تھی۔ فقیر تخلص سے ظاہر ہے کہ مولوی محمد حسین خود شاعر تھے۔ مگر مناجاتیں اور نعتیں لکھتے تھے۔ چاوڑی کو خلد بریں نہیں بتاتے تھے۔ چاوڑی طوائفوں کا بازار تھا۔

خیر اللہ نے فضل کیا اور راسخ صاحب نے جوانی ختم ہوتے ہی دینی کتابیں سنبھالیں اور درس نظامی جھٹ پٹ ختم کر ڈالا۔ اور وہ وعظ کہنے میں بھائیوں سے بازی لے گئے۔ شاعری سے اب یہ کام لیا کہ مثنوی مولانا روم کا منظوم ترجمہ کر دیا۔

مولانا احمد سعید جس مسجد میں وعظ کہا کرتے تھے وہ مولانا راسخ کے وعظ کے واسطے ان کے معتقدوں نے تعمیر کرائی تھی۔ مولانا احمد سعید تقریر میں مولانا راسخ کے تتبع تھے۔ مولانا احمد سعید کی گل افشانی سے مولانا راسخ کے وعظ کی کیفیت اور بہار کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ مولانا راسخ کا قال بالکل حال تھا۔ شاعری کا دور طویل رہا اور قال و حال کا قلیل لیکن یہ دور حسنات سے پر تھا۔ مولانا راسخ کا انجام زمین پر بخیر ہوا۔ توقع ہے آسمان پر بھی نوازے گئے ہوں گے۔

استاد مےخو (۹)

منشی وحیدالدین مےخو، جو استاد مےخو کہلاتے تھے، انقلاب ۱۹۴۷ء کے بعد دس برس زندہ رہے، انہوں نے سو کے لگ بھگ عمر پائی۔ مےخو صاحب کے انتقال کی خبر مجھے مولانا احمد سعید کے خط سے معلوم ہوئی تھی۔ میں نے مولانا احمد سعید کو لکھا کہ ہمارا آخری موئتام گر گیا۔ موئتام کہتے ہیں ان ڈھیموں کو جو زمین کی کھدائی کرنے والے رہنے دیتے ہیں کہ ان سے ناپ کر سکتی مٹی کھودی ہے۔ مےخو صاحب ان لوگوں میں تھے جنہیں دیکھ کر سمجھا جاتا تھا کہ دلی کی تہذیب کیا تھی اور دلی کا تمدن کیا تھا۔

مےخو صاحب مجھ پر بزرگانہ شفقت فرماتے تھے۔ خصوصاً جب میں نے اور مسٹر فصیح الدین نے ماہنامہ "ادیب" جاری کیا تو "ادیب" میں میرے مضامین پڑھ کر میرا دل بڑھاتے تھے۔

نواب تاباں (۱۰)

نواب سراج الدین احمد خاں سائل کے بڑے بھائی نواب شجاع الدین احمد خاں بھی شاعر تھے۔ تاباں ان کا

تخلص تھا۔ سائل اور تاباں دونوں سے حکیم اجمل خاں کی دوستی تھی۔ دونوں حکیم صاحب کی نجی صحبت کے حاضر باش تھے۔ تاباں کو گالیاں تصنیف کرنے اور گالیاں دینے کی عادت پڑ گئی تھی۔ تاباں شطرنج کے بھی دھتیا تھے۔ کوئی کھیلنے کو نہ ملتا تو ایک مسلمان ڈولی اٹھانے والا کہار تھا۔ اسے طلب کر لیتے وہ مشاق شاطر تھا۔ تاباں صاحب اس کے ساتھ کھیلتے اور اس پر گالیوں کی بوچھاڑ کرتے۔ کہار غریب گالیاں خاموشی سے سنتا رہتا تھا۔ ایک دن آخر غصہ آگیا۔ فرمایا "الو کے پٹھے! تو مجھے گالی کیوں نہیں دیتا۔ میں تیرے باوا کا نوکر ہوں جو میں ہی گالیاں دیئے جاؤں۔" یہ بھی دلی کا ایک نمونہ تھے۔ ملاحظہ کیجئے' نواب تاباں کی گالی میں کتنا انوکھا پن اور کتنی شیرینی اور غربانوازی تھی۔

حکیم اجمل خاں نواب تاباں کی اس عادت سے لطف لیا کرتے تھے۔ حکیم صاحب کوئی ایسا قصہ چھیڑتے کہ نواب تاباں نواب سائل پر برسنے لگتے۔ نواب سائل بس اتنا جواب دیتے کہ بھائی صاحب! یہ خیال رکھیے کہ میری والدہ آپ کی والدہ تھیں۔ نواب تاباں کی اس عادت کے ڈر سے میں نے ان کے ہاں جانے کی جرات کبھی نہیں کی۔ دور سے دیکھا۔

نواب سائل (۱۱)

نواب سراج الدین احمد خاں سائل کے مکان اور میرے مکان کے درمیان دو سوا دو میل کا فاصلہ تھا۔ مجھے ان کے ہاں حاضر ہونے کی عمر بھر میں ایک مرتبہ توفیق ہوئی۔ وہ بھی مولوی ظفر علی خاں کے کہنے سے۔ مولوی ظفر علی خاں میرے مہمان تھے۔ انہوں نے سائل صاحب سے ملنے کی خواہش کی۔ انہیں لے کر میں نواب سائل کے ہاں گیا تھا۔ اس دن سے سائل صاحب کا معمول ہو گیا کہ میری طرف کسی کے گھر آتے تو مجھ سے ملے بغیر نہ جاتے۔ اپنی بدتمیزی اور ان کی وضع داری آج محسوس کرتا ہوں۔ اس وضع کو نواب سائل نے اتنا نبھایا کہ انتقال سے کئی سال قبل ٹانگوں نے جواب دے دیا تھا' رکشا میں پھرتے تھے مگر میرے گھر کے آگے سے گزرتے تو رکشا رکوا لیتے تھے اور مجھے بلا کر خیریت پوچھتے تھے۔

سائل صاحب مرزا داغ استاد نظام دکن کے داماد تھے۔ اور جانشین داغ تسلیم کیے جاتے تھے۔ اس پر بیخود صاحب سائل صاحب سے خفا رہتے تھے۔ اول تو اس مشاعرے میں جاتے ہی نہیں تھے۔ جس میں سائل صاحب ہوتے تھے' اور اگر جاتے تو سائل صاحب سے فرماتے نشتر لایا ہوں نشتر۔ سائل صاحب بھاری بھر کم اور بردبار نواب زادے تھے۔ ان کا جواب ہوتا' بھائی صاحب! اللہ تعالیٰ نے آپ کو شعر گوئی کا اہل بنایا ہے' سائل صاحب کی آواز بڑی رسیلی تھی' وجیہہ انسان تھے' لانبا قد' مناسب جسم' خوب صورت ناک نقشہ' سرخ و سفید رنگ' لحن سے پڑھتے تھے اور محفل پر چھا جاتے تھے۔ میں نے سائل صاحب کی کالی داڑھی بھی دیکھی اور سفید داڑھی بھی۔ اور سب کی داڑھیاں میرے زمانے میں سفید تھیں۔

بیخود صاحب کا دعویٰ تھا کہ سالہا سال استاد داغ کی جوتیاں سیدھی کی ہیں' جانشین میں ہوں' اس کے ثبوت میں داغ کے خطوط پیش کرتے تھے۔

ناصر نذیر فراق (۱۲)

خواجہ میر ناصر نذیر فراق' خواجہ میر درد کے پوتے تھے۔ بارہ دری میر درد میں رہتے تھے۔ خواجہ حسن نظامی کے بڑے بھائی خواجہ حسن علی نظامی سے میر ناصر نذیر کا ملنا جلنا تھا۔ خواجہ حسن نظامی میر صاحب سے خردانہ پیش آتے تھے۔ میر ناصر نذیر فراق نے نظام المشائخ میں لاتعداد مضامین لکھے۔ نثر اور نظم دونوں پر حاوی تھے ہم محلہ ہونے کی وجہ سے میرے ہاں تشریف لاتے رہتے تھے اور دلی کی پرانی باتیں سناتے رہتے تھے۔ یاد نہیں ٹوپی کیسی ہوتی تھی اور جوتی کیسی۔ البتہ اچکن یاد ہے۔ اچکن میں سونے کے زنجیروں دار بٹن لگاتے تھے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ اچکن شیروانی سے مختلف چیز تھی۔

ابھی غالب کو دیکھنے والے نمایاں لوگ کافی باقی ہیں' لیکن دلی سے باہر والے انہیں پہچانیں گے نہیں۔ جیسا نواب لوہارو کے چھوٹے بھائی مولوی ضمیر مرزا (جید عالم دین) یا حاجی عبدالغفار (جن کا دلی اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں عظیم الشان کاروبار تھا اور جو دلی کے اہم شخص تھے) یا خواجہ شہاب الدین (ہیڈ ماسٹر اینگلو عربک ہائی اسکول' میرے اور میرے زمانے کے کل ممتاز مسلمانوں کے استاد) یا میر جمال الدین (ایر مارشل محمد اصغر خاں کے دو یا خسر)۔

غالب کے جن دیکھنے والوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے ایک بھی زندہ نہیں ہے۔ میں دیکھنے والوں کا دیکھنے والا خود پابہ رکاب ہوں۔

ختم ہی سمجھو زندگی کے دن
کچھ ورق اور ہیں فسانے کے

حواشی

۱ - میر افضل علی نام تھا۔

۲ - ان کا نام منور الدین تھا۔ غالب نے مولوی امین الدین پر ازالہ حیثیت عرفی کا جو مقدمہ کیا تھا' اس میں مولوی امین الدین کی طرف سے مولوی ضیاء الدین گواہ تھے۔ ان کے نام غالب کے دو خط بھی ہیں۔

۳ - سرسید احمد خاں' غالب سے بیس سال چھوٹے تھے۔

۴ - پیدائش ۱۸۶۸ء - انتقال ۱۹۲۸ء

۵ - پیدائش ۶۸-۱۸۶۷ء - انتقال ۱۹۱۶ء

۶ - پیدائش ۱۸۶۵ء - انتقال ستمبر ۱۹۴۷ء

۷ - پیدائش ۱۸۴۷ء - انتقال ۱۹۳۳ء

۸ - پیدائش ۱۲۸۵ھ - انتقال ۱۳۲۵ھ

۹ - پیدائش ۱۸۶۳ء - انتقال ۱۹۵۵ء- بیخود نے دیوان غالب کی شرح مراۃ الغالب کے نام سے لکھی ہے۔

۱۰ ۔ پیدائش ۱۸۶۱ء ۔ انتقال ۱۹۲۸ء
۱۱ ۔ پیدائش ۱۸۶۴ء ۔ انتقال ۱۹۳۵ء
۱۲ ۔ پیدائش ۱۸۶۵ء ۔ انتقال ۱۹۳۳ء

***

کلام غالب کا انتخاب کس نے کیا

مولانا آزاد دہلوی کا بیان ہے کہ مولوی فضل حق خیر آبادی اور میرزا خانی' کوتوال دہلی' نے میرزا غالب کے دیوان ریختہ کا انتخاب کیا ہے۔ لیکن اولاً" تو نسخہ بھوپال' نسخہ شیرانی' گل رعنا اور نسخہ رام پور کا مطالعہ اس کو توثیق نہیں کرتا دوسرے خود میرزا صاحب نے اس انتخاب کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے۔ دیوان ریختہ کے دیباچے میں فرماتے ہیں۔

"ہمانا' نگارندۂ ایں نامہ را آں در سر است پس از انتخاب دیوان ریختہ' بگرد آوردن سرمایہ دیوان فارسی برخیزد۔"

نواب شمس الامراء اور شاکر کے خطوط میں بھی یہی لکھا ہے۔ میرزا صاحب علامہ خیر آبادی کے علم و فضل اور بلند پایہ ذوق سخن سنجی کے بے حد معترف تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے عرفی شیرازی کے مشہور قصیدے "ای متاع درد در بازار جاں انداختہ" کا جواب لکھا' تو اس کی ایک نقل مولانا کے ملاحظے کے لیے بھیجی اور لکھا۔

"دریں روز ہا' ہوای آن ور س راست کہ بتی چند ور توحید' مجیا لعرفی' گفتہ آید چوں کوشش اندیشہ بجائی رسید کہ نہ عرفی را محل ماند' ونہ مرا جائی' ناگزیر آں ابیات را بر کسی عرضہ میدارم کہ چوں منی صد وچوں عرفی صد ہزار را سخن پرورش تواند کرد' وپایہ ہر یک بہر یک تواند نمود۔"

منتخب دیوان ریختہ کا محولہ دیباچہ علامہ خیر آبادی کی زندگی میں لکھا گیا ہے اگر وہ اس مجموعے کے منتخب ہوتے تو ناممکن تھا کہ میرزا غالب اپنے علامہ و ہرو فرید عصر مخلص دوست کے نام کو چھپا جاتے بلکہ اس کے برخلاف علامہ جیسی شخصیت کا نام تحریر کر کے انتخاب کی برتری اور پاکیزگی پر مہر توثیق ثبت کرتے۔ مزید بر آں شیفتہ نے گلشن بیخار میں لکھاہے۔

"دیوانش را بعد تکمیل و ترتیب وگر نگریست فراوان ابیات از آن حذف و ساقط کردہ' قدری قلیل انتخاب زدہ۔"

یہ تذکرہ میرزا صاحب کی نظر سے گزر چکا تھا اور انہوں نے نہ صرف اس کی تقریظ لکھی تھی' بلکہ اس کی بعض کوتاہیوں کی طرف مرتب کی توجہ بھی منعطف کی تھی۔ اگر میرزا صاحب اپنے کلام کے خود منتخب نہ ہوتے تو شیفتہ کیوں لکھتے' اور بفرض محال سنی سنائی لکھ بھی دیتے' تو میرزا صاحب اس پر نکتہ چینی کیوں نہ کرتے۔

(امتیاز علی عرشی)

حمید احمد خاں

غالب کی بہو سے ایک ملاقات

کچھ عرصہ پہلے گلی قاسم جان کے اندر لوہارو والوں کی حویلی میں ایک سن رسیدہ بی بی موجود تھیں جنہوں نے غالب کی زندگی کا آخری دور اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہ بی بی عارف جان کی پڑپوتی' غالب کے دوست نواب ضیاء الدین نیر رخشاں کی بیٹی اور مرزا زین العبدین خاں عارف کی بہو نواب معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم تھیں۔ مجھے جولائی 1938ء میں اپنے کرم فرما اور محترم دوست حکیم محمد کامل خاں صاحب دہلوی کی معرفت بگا بیگم صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا تھا۔ بگا بیگم صاحبہ اپنی حویلی کے ایک والان میں پردے کے پیچھے تشریف لے آئیں۔ پردے کے دوسری طرف ایک تخت پر میں اور حکیم صاحب بیٹھ گئے میں نے مرزا غالب اور ان کی بیگم صاحبہ کے متعلق کئی سوالات کیے جن کا جواب بگا بیگم صاحبہ مجھے تفصیل سے دیتی رہیں۔ ان کی عمر اس وقت لگ بھگ نوے برس کی تھی۔ مگر آواز میں بڑھاپے کی کمزوری کا کوئی خفیف سا اثر بھی میں نے محسوس نہیں کیا۔ برجستہ اور بے تکان بات کرتی تھیں۔ گفتگو کی ہر منزل پر مجھے اُن کے ذہن کی بیداری اور احساس ظرافت کی موجودگی کے ثبوت ملے ہیں۔ ان کے ہر جواب کی یادداشتیں قلم بند کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن بار بار میں نے محسوس کیا کہ میرا قلم ان کی شستہ تقریر کی روانی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

جو کچھ میں نے ان سے سنا' اس کی کیفیت یہاں لکھنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ غالب کی خانگی زندگی سے متعلق بگا بیگم صاحبہ کو کیا خصوصیت حاصل تھی جس کی بنا پر ان کی دی ہوئی معلومات ہمارے لیے قابل قدر ہیں۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ غالب کی اولاد میں سے کسی بچے نے بھی برس سوا برس سے زیادہ کی عمر نہ پائی۔ ان کی بیگم صاحبہ نے اولاد سے مایوس ہو کر آخر اپنے بھانجے (قاسم جان کے بڑے پوتے) زین العابدین خاں عارف کو منہ بولا بیٹا بنالیا تھا۔ مرزا غالب بھی عارف سے حقیقی اولاد کی سی محبت کرتے تھے۔ جس کا اظہار مرزا غالب کے اردو و فارسی کلام' دونوں میں موجود ہے۔ جب عارف کا انتقال ہو گیا تو غالب ان کے دونوں بیٹوں باقر علی خاں اور حسین علی خاں کو اپنے پاس لے آئے اور انہیں اسی لاڈ و پیار سے رکھا جیسے اپنی اولاد کو رکھتے۔ بڑے لڑکے باقر علی خاں کی شادی غالب نے خود اپنی زندگی میں کی۔ اس طریقے سے جو بہو غالب کے گھر میں آئی وہ یہی بگا بیگما صاحبہ تھیں۔

بگا بیگم صاحبہ کے پھوپھی زاد بھائی خضر مرزا مرحوم مجھ سے بیان فرماتے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں دیکھا۔ کہ حسین علی خاں مرزا غالب کے شوخیاں کرتے اور کبھی ان کی چھاتی پر چڑھ بیٹھتے تھے۔ پڑھائی کے معاملے میں بھی ان کی

بہت ناز برداری ہوئی۔ مرزا صاحب نے کہا۔ "ارے حسین علی آکر پڑھ لے۔" انہوں نے جواب دیا "دادا جان آتا ہوں۔" اور دوسری طرف نکل گئے۔ کھیل تماشے کا تو انہیں لپکا تھا۔ کٹھ پتلیوں کے تماشے پر ایک دفعہ بیس روپے خرچ کر دیئے اور پھر مرزا صاحب کے پاس منہ بسورتے ہوئے آئے کہ دادا جان بیس روپے دلوایئے۔ مرزا صاحب نے کلو کو بلا کر کہا۔ "بھئی انہوں نے ایک پتھر مارا دے دو بیس روپے۔"

خضر مرحوم نے اپنے بچپن کے دنوں کا ایک اور واقعہ مجھے اس طرح سنایا۔ "ایک دن میں چلا جاتا تھا۔ بھائی حسین علی خاں بھی گلی میں سے جا رہے تھے۔ مرزا صاحب نے ہمیں دیکھا اور آواز دی "ابے لمڈو یہاں آؤ۔" ہم پہنچے تو مرزا صاحب نے ہمارے لیے مٹھی بھر بادام طشتری میں ڈال دیئے۔ میں نے ہاتھ بڑھایا تو مرزا صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ "ابے یہ کیا۔ منہ سے کھا۔ میرے مرغی کے بچے یوں ہی چگا کرتے ہیں۔"

اس میں شک نہیں کہ بگا بیگم صاحبہ نے غالب کا صرف آخری زمانہ دیکھا۔ لیکن چونکہ وہ رات دن گھر میں رہتی تھیں اس لیے ان کے بیان کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ جہاں کہیں انہوں نے قیاس سے بات کی' ان کا بیان درست نہیں (مثلاً غالب کی عمر کے متعلق مگر باتیں ان کی دیکھی ہوئی تھیں۔ ان کی صحت میں شبہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ مثلاً جب میں نے پوچھا کہ مرزا صاحب کے چلنے کا انداز کیا تھا۔ تو فوراً بولیں "سیج سیج چلتے تھے۔ بڈھے تھے۔ اسی برس کی عمر تھی۔" ظاہر ہے کہ اس قول کا صرف پہلا حصہ بالکل درست اور دوسرا تخمینا" درست ہے۔ لیکن ہم کتنے ہی صحت پسند ہوں ہمارا یہ تقاضا ضرورت سے زیادہ سخت ہو گا کہ بگا بیگم صاحبہ کے کسی تخمینے میں بھی کوئی فرق نہ نکلے۔

اتنا تو سب جانتے ہیں کہ جس قدر مرزا غالب طبیعت کے لحاظ سے آزاد رو تھے' اسی قدر ان کی بیگم صاحبہ اپنے باپ مرزا الٰہی بخش خاں کی طرح پرہیزگار اور نماز روزے کی پابند تھیں۔ اس وجہ سے اکثر میاں بیوی کے درمیان نوک جھونک ہوتی تھی۔ چنانچہ غالب بیوی کو "حضرت موسیٰ کی بہن" کہتے تھے۔ اور اگر زیادہ بگڑتے تو یہاں تک کہہ دیتے کہ "میرا تو ناک میں دم کر دیا ہے۔" مگر یہ جھگڑا محض رندو زہد کے اختلاف تک محدود نہ تھا۔ جو کچھ میں نے سنا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اختلاف مزاج کو بھی گھر کی چپقلش میں خاصا دخل تھا۔ چنانچہ خود بگا بیگم صاحبہ کی موجودگی میں میاں بیوی کی لڑائی ہوتی تھی۔ امراؤ بیگم خفا ہوتی تھیں مگر خاموش ہو جاتی تھیں۔ ان سے کہتی تھیں "بیٹی تو تو بچہ ہے۔ بڈھے کی باتوں کا خیال نہ کیا کر۔ بڑھاتو دیوانہ ہو گیا ہے۔"

اس قسم کا ایک واقعہ بگا بیگم صاحبہ نے مجھے یوں سنایا کہ (مرزا صاحب) پچھلے پہر ہوا خوری کو جایا کرتے تھے۔ ایک روز عصر کے بعد واپس آئے۔ میں اور میری ساس عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ وہ بھی اس تخت کے کنڑ پر آ بیٹھے۔ جب ہم نے سلام پھیرا تو کہنے لگے "واہ واہ خوب بہو کو بھی اپنا سا کر لیا۔ کمہاری بونٹ کا کیڑا اپنے گھر لے جاتی ہے۔ تو چالیس دن میں اسے بھی اپنا سا کر کے نکال دیتی ہے۔

ایک اور لطیفہ بگا بیگم صاحبہ نے مجھے سنایا کہ برسات کے دن تھے۔ مینہ برسنے لگا۔ دونوں (باقر علی خاں اور حسین علی خاں) نے کھانا کھایا اور چلے گئے۔ نیاز علی (ملازم) بھی چلا گیا۔ مرزا صاحب بیٹھے بیوی سے باتیں

کرتے تھے۔ میں یوں بیٹھی تھی گاؤ تکیے کے کونے سے لگی ہوئی۔ کہنے لگے "ایک بیوی دو میں تیسرا آنکھوں میں ٹھیکرا بہو' میں اور میری بیوی بیٹھے ہیں۔ تم کیوں بیٹھی ہو؟" اس پر میری ساس بولیں "ارے توبہ توبہ بڈھا دیوانہ ہے۔ اسے تو ٹھٹھے کے لیے کوئی چاہیے۔ اب بہو ہی مل گئی۔" میں اتنے میں اٹھ کر کونے میں جا چھپی۔ اب انہیں یہ فکر کہ برسات کا موسم اور کیڑے پتنگے کا عالم مجھے ڈھونڈتے پھریں اور کہتے جائیں "مجھے کیا خبر تھی بہو اس بات کو اتنا برا مانے گی۔"

میں نے نوکروں اور بچوں کے متعلق پوچھا کہ غالب ان سے کس طرح پیش آتے تھے۔ حسین علی خاں کے متعلق بتایا کہ "چھوٹے پوتے کو دھمکایا کرتے تھے۔" نوکروں میں کلو کا خاص طور پر ذکر کیا اور کہا "کلو داروغہ کو مرے ہوئے پندرہ برس ہو گئے۔ لوگ ان کی زیارت کو بہت آتے تھے۔ یہ چودہ برس کی عمر میں مرزا صاحب کے پاس آ کر رہے کلو داروغہ کا یہ حال تھا کہ پاؤں کی آہٹ سے پہچان لیتے تھے کہ لڑکیاں ہیں' بہوئیں ہیں یا بوڑھیاں ایک اور نوکر مدار خاں تھا۔ ان دونوں کا بیان انہوں نے خود کیا۔ یہ مجھ سے پہلے کا ذکر ہے۔ میں نے سنا ہے مدار خاں کے لڑکے کا نام نیاز علی تھا۔ یہ مرزا صاحب نے لے لیا۔ مدار خاں کی بیٹی آبادی کی کلو نے اپنی بیٹی بنا لیا تھا۔"

کھانا ایک وقت کھاتے تھے۔ دوسرے وقت کباب تلے ہوئے' دال' مربہ' پسے ہوئے بادام اور حلوہ سوہن' جب کھانا خراب ہوتا تو پکانے والے کو گالیاں دیا کرتے تھے۔ پکانے والا کون تھا؟ دوا تھیں۔ مرزا صاحب پان نہیں کھاتے تھے۔ میں نے انہیں کبھی کھاتے نہیں دیکھا۔ چنے کی دال بیسن کی پھلکیاں اور کڑھی بہت کھاتے تھے۔ چنے کی دال ہر سالن میں ایک ایک چمچہ ضرور پڑتی تھی۔ میرے بیاہ کے بعد کی بات ہے کہ چنے کی دال سالن میں پڑی ہوئی میرے سامنے بھی آئی۔ مجھے پسند نہیں تھی۔ مغلانی نے میری ساس سے شکایت کی کہ بہو نہیں کھاتی۔ چنے کی دال۔ مرزا صاحب یہ بات سن رہے تھے۔ کہنے لگے "اوہو۔ خدا سے بھی بڑھ گئی بہو۔ توبہ توبہ! او پھر میری ساس سے کہنے لگے "بیوی سنو!" وہ بولیں "میں نہیں سنتی۔" اس پر مجھ سے کہا "بیٹی برا نہ مانیو' ایک بات سناتا ہوں' خدا کے آگے چنا گیا اور فریاد کی کہ "باری تعالیٰ یہ کیا بات ہے کہ مجھ کو لوگ طرح طرح سے تنگ کرتے ہیں۔ بھونتے ہیں' تلتے ہیں' ابالتے ہیں' پیستے ہیں' آخر میرا کیا گناہ ہے۔" خدا نے چنے کی طرف دیکھا اور کہا دور ہو' نہیں میں تجھے کھا جاؤں گا' یہ بات سناتے ہوئے خود بھی ہنستے رہے۔

میں نے پوچھا "مرزا صاحب کی یاد کی کوئی چیز آپ کے پاس ہے؟" کہنے لگیں "مجھے کیا خبر تھی کہ لوگ ان کی چیزوں کو اس قدر ڈھونڈیں گے۔ میرے پاس تو کوئی چیز نہیں' ہاں معظم میاں (نواب معظم علی خاں) کے پاس ان کا پیالہ اب تک ہے۔ وہ اس کو اپنے ساتھ بھوپال لے گئے تھے۔" جب میں نے غالب کے مذہب کے متعلق سوال کیا تو بولیں "ان کے مذہب کا کیا ٹھکانا۔ جہاں بیٹھے اسی مذہب میں ہو گئے۔" میں نے پوچھا کہ مرزا صاحب کس عمر میں اونچا سننے لگے تھے؟" جواب دیا "میں نے تو انہیں بہرا ہی دیکھا۔ جب میرا بیاہ ہوا تو بہرے ہی تھے۔"

غالب کے بھائی مرزا یوسف کی وفات کے متعلق دریافت کیا تو کہا "سرس کی گلی میں ڈ مارے گئے تھے۔ مسجد تہور خاں میں دفن ہوئے۔" میں نے غالب کے متعلق بھی پوچھا کہ کس جگہ انتقال کیا۔ تو جواب دیا "دیوان

خانے میں۔ جہاں مجید خاں نے اصطبل بنوایا ہے اس وقت حکیم محمود خاں' حکیم غلام مرتضیٰ اور حکیم احسن اللہ خاں وغیرہ سب موجود تھے۔"

اس سوال کے جواب میں کہ مرزا نے کس مرض میں انتقال کیا بگا بیگم صاحبہ نے کہا "وہ کچھ بیمار تو ہوئے نہیں۔ بس مرہی گئے۔ ہوا یہ کہ کھانا کھانے آئے۔ چندو بیگم کو بہت چاہتے تھے۔ پوچھا۔ جیون بیگ کہاں ہیں بلاؤ۔ احمد بیگ ان کے خادم تھے۔ انہیں بھیجا۔ مرزا صاحب کہنے لگے "اچھا جب وہ آئیں گی تو کھانا کھاؤں گا۔" یہ کہہ کر لیٹ گئے کروٹ لے کر لیٹے ہی تھے کہ بے ہوش ہو گئے۔ اسی حالت میں ان کا دم نکلا۔

امراؤ بیگم کے متعلق بگا بیگم صاحبہ نے مجھ سے کہا "جب میں بیاہی گئی تو وہ اچھور کی پھانک تھیں۔ جانماز پر بیٹھ کر کہا کرتیں۔ "اے اللہ تو کب بلائے گا؟" ایک روز میں نے پوچھا۔ "پھوپھی جان' آپ کو قبر سے ڈر نہیں لگتا؟ کہنے لگیں "تھکا بیل سرا کو دیکھتا ہے۔"

یہ ہے ان معلومات کا بڑا حصہ جو مجھے بگا بیگم صاحبہ سے حاصل ہوئیں۔ یہیں اس تحریر کو ختم ہونا چاہیے تھا لیکن آخر میں مجھے ذاتی حیثیت کی ایک چھوٹی سی بات کا بھی ذکر کرنا ہے جسدن مجھے بگا بیگم صاحبہ سے باتیں سننے کا موقعہ ملا' اسی شام میں نے اپنی والدہ مرحومہ کو (جو اس وقت زندہ تھیں۔) معمول کے مطابق ایک خط لکھا۔ یہ خط محفوظ ہے اور اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس میں مجھے یہ عبارت نظر آتی ہے۔

آج صبح ہوٹل سے نکل کر میں پھر حکیم صاحب کے پاس پہنچا۔ وہ مجھے بگا بیگم صاحبہ (معظم زمانی بیگم) دختر نواب ضیاء الدین نیر رخشاں کے پاس لے گئے۔ یہ عارف کی بہو ہیں۔ نوے برس کی عمر ہے۔ گھر کی باتیں بتاتی رہیں۔ بہت مہربانی سے پیش آئیں باربار اصرار سے پان دینا چاہتی تھیں۔ مگر حکیم صاحب (جنہیں علم تھا کہ میں پان نہیں کھاتا) روک دیتے تھے۔ انہیں باربار یہی خیال ہوتا تھا کہ اتنی دور سے آئے ہیں۔ ان کی تواضع ضرور ہونی چاہیے۔"

میں اب بھی پان نہیں کھاتا ہوں۔ لیکن جب اس عبارت کو پڑھتا ہوں تو یہ افسوس ضرور ہوتا ہے کہ میں اس دن ایک تبرک سے محروم رہا۔

☆☆☆

رضیہ سجاد ظہیر

غالب بچوں کے لیے

غالب کا بچپن

مرزا غالب کے خاندان والے سلجوقی ترک تھے۔ ان کے باپ ہندوستان میں ہی پیدا ہوئے۔ ان کے دادا توقان بیگ اپنے باپ سے کسی بات پر ناراض ہو کر محمد شاہ رنگیلے کے زمانے میں سمرقند سے ہندوستان چلے آئے تھے یہ لوگ ترکی زبان بولتے تھے اور فوج کا کام ان کا پیشہ تھا۔ یعنی فوج میں نوکریاں کرتے تھے۔ مرزا غالب نے خود لکھا ہے:

سال سے ہے پیشہ آبا سپہ گری کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

فوجیوں کے خاندان میں ایسی نفیس اور فنکارانہ طبیعت رکھنے والے شاعر کا پیدا ہونا تعجب کی بات تو ضرور ہے۔ لیکن اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شاعر بنتے نہیں' پیدا ہوتے ہیں اور شاید یہی سبب ہے کہ مرزا نے اپنے لیے شاعری میں ایک الگ راستہ نکالا۔ اگر خاندان میں اور شاعر ہوتے تو ممکن ہے مرزا ان کی پیروی کرتے لیکن وہاں دور دور کوئی شاعر نہیں تھا۔ مرزا نقل کرتے تو کس کی اور رنگ اپناتے تو کس کا؟

ان کے باپ الور کے راجہ بختاور سنگھ کے یہاں فوج میں نوکر تھے۔ 1802ء میں راجہ الور کی ریاست میں زمیندار نے بغاوت کی' مرزا کے باپ اس بغاوت کو کچلنے کے لیے فوج دے کر بھیجے گئے اور اسی لڑائی میں مارے گئے۔

مرزا کی عمر اس وقت کوئی سات سال ہوگی ان کی ماں ایک سمجھدار اور پڑھی لکھی بی بی تھیں' انہوں نے مرزا کی تعلیم کا اچھا انتظام کیا۔ سب سے پہلے بسم اللہ ہوئی۔

بسم اللہ تو تمہاری بھی ہوئی ہوگی' لیکن اگر تمہیں یاد نہ ہو تو اپنے کسی چھوٹے بھائی یا بہن کی بسم اللہ تو دیکھو گے ہی اس دن بچہ پہلی بار پڑھنا لکھنا شروع کرتا ہے اس کو اچھے اچھے نئے کپڑے بنوا کر پہنائے جاتے ہیں۔ گھر کے سب رشتہ دار اور دوست جمع ہوتے ہیں اور سب اس بچے کو روپے دیتے ہیں' مزے دار مٹھائیاں منگوائی جاتی ہیں پکوان تلے جاتے ہیں اور ایک چاندی کی تختی اور چاندی کا ہی قلم بنوایا جاتا ہے۔ ایک پیالی میں زعفران گھولی جاتی ہے۔ پھر اچھی گھڑی دیکھ کر مولوی صاحب بچے کے ہاتھ میں قلم دیتے ہیں اور اس کا ہاتھ پکڑ کر قلم

رضیہ سجاد ظہیر

غالب بچوں کے لیے

غالب کا بچپن

مرزا غالب کے خاندان والے سلجوقی ترک تھے۔ ان کے باپ ہندوستان میں ہی پیدا ہوئے۔ ان کے دادا توقان بیگ اپنے باپ سے کسی بات پر ناراض ہو کر محمد شاہ رنگیلے کے زمانے میں سمرقند سے ہندوستان چلے آئے تھے یہ لوگ ترکی زبان بولتے تھے اور فوج کا کام ان کا پیشہ تھا۔ یعنی فوج میں نوکریاں کرتے تھے۔ مرزا غالب نے خود لکھا ہے:

سال سے ہے پیشہ آبا سپہ گری   کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

فوجیوں کے خاندان میں ایسی نفیس اور فنکارانہ طبیعت رکھنے والے شاعر کا پیدا ہونا تعجب کی بات تو ضرور ہے۔ لیکن اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شاعر بنتے نہیں' پیدا ہوتے ہیں اور شاید یہی سبب ہے کہ مرزا نے اپنے لیے شاعری میں ایک الگ راستہ نکالا۔ اگر خاندان میں اور شاعر ہوتے تو ممکن ہے مرزا ان کی پیروی کرتے لیکن وہاں دور دور کوئی شاعر نہیں تھا۔ مرزا نقل کرتے تو کس کی اور رنگ اپناتے تو کس کا؟

ان کے باپ الور کے راجہ بختاور سنگھ کے یہاں فوج میں نوکر تھے۔ 1802ء میں راجہ الور کی ریاست میں زمیندار نے بغاوت کی' مرزا کے باپ اس بغاوت کو کچلنے کے لیے فوج دے کر بھیجے گئے اور اسی لڑائی میں مارے گئے۔

مرزا کی عمر اس وقت کوئی سات سال ہوگی ان کی ماں ایک سمجھدار اور پڑھی لکھی بی بی تھیں' انہوں نے مرزا کی تعلیم کا اچھا انتظام کیا۔ سب سے پہلے بسم اللہ ہوئی۔

بسم اللہ تو تمہاری بھی ہوئی ہوگی' لیکن اگر تمہیں یاد نہ ہو تو اپنے کسی چھوٹے بھائی یا بہن کی بسم اللہ تو دیکھو گے ہی اس دن بچہ پہلی بار پڑھنا لکھنا شروع کرتا ہے اس کو اچھے اچھے نئے کپڑے بنوا کر پہنائے جاتے ہیں۔ گھر کے سب رشتہ دار اور دوست جمع ہوتے ہیں اور سب اس بچے کو روپے دیتے ہیں' مزے دار مٹھائیاں منگوائی جاتی ہیں پکوان تلے جاتے ہیں اور ایک چاندی کی تختی اور چاندی کا ہی قلم بنوایا جاتا ہے۔ ایک پیالی میں زعفران گھولی جاتی ہے۔ پھر اچھی گھڑی دیکھ کر مولوی صاحب بچے کے ہاتھ میں قلم دیتے ہیں اور اس کا ہاتھ پکڑ کر قلم

زعفران میں ڈبو کر تختی پر اس سے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھواتے ہیں۔ بچے کے منہ میں سب سے پہلے..... مٹھائی دینے کے بعد پھر سب لوگ مٹھائی کھاتے ہیں' اور بانٹتے ہیں' گانا بجانا ہوتا ہے۔

تو مرزا غالب نے بھی اس دن اچھے کپڑے پہنے ہوں گے اور استاد نے ان کا ہاتھ پکڑ کر تختی پر لکھوایا ہوگا۔ لیکن وہاں جتنے لوگ تھے کیا ان میں سے کوئی یہ سوچ بھی سکتا تھا کہ تختی پر ٹیڑھا ٹیڑھا "بسم اللہ لکھنے والا یہ ننھا منا سا ہاتھ ایک دن ایسے ایسے شعر لکھے گا۔ کہ ساری دنیا کی ساری زبانوں میں ان شعروں کے ترجمے ہوں گے اور لوگ اس کی شاعرانہ بڑائی اور عظمت کے آگے اپنا سر جھکائیں گے۔

محلے میں ہی ایک مولوی صاحب تھے جن کا نام محمد اعظم تھا' ان کا مکتب بہت مشہور تھا کیونکہ یہ عربی' فارسی' اردو اور دوسرے بہت سے علوم کے ماہر تھے اور بڑے قابل تھے' لیکن —— اب اس زمانے کے مکتبوں کا حال تم اپنے ابا سے پوچھنا' ہم کیا بتائیں' لگ بھگ سب جگہ ایک ہی سا حال تھا یعنی پڑھائی کے ساتھ ساتھ پٹائی کی بھی بھرمار!

ویسے مرزا کے جو استاد تھے وہ تھے تو نیک آدمی لیکن اپنے شاگردوں پر بڑی کڑی نظر رکھتے تھے ننھے نوشہ کو پڑھنے لکھنے کا تو بہت شوق تھا لیکن مکتب کی پڑھائی سے اس کا بہت جی گھبراتا تھا۔ کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ اسے الفاظ آگے پیچھے کر کے شعر بنانے کی بھی مہلت ملے اور وہ ملتی نہیں تھی۔

نو سال کی عمر میں غالب نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا:

مولوی صاحب اپنے شاگرد کی تیزی اور ذہانت سے تو خوش تھے لیکن اس تیزی کا بہاؤ جس طرف تھا یعنی شاعری کی طرف وہ ان کو پسند نہ تھا۔ چنانچہ مسلسل ایک تناتنی سی استاد شاگرد میں رہتی تھی۔

ایک بار مرزا نے ایک غزل کہی اور بڑے شوق سے اپنے استاد کو دکھائی' سوچے ہوں گے کہ استاد بڑے خوش ہوں گے خوب شاباشی ملے گی' وہاں الٹی پھٹکار ہاتھ آئی' استاد نے ڈنڈا سنبھالا اور بولے "یہ کیا مہمل بکتے ہو' بے معنی باتیں! جیسی ردیف تم نے استعمال کی ہے ایسی کسی شاعر نے نہیں استعمال کی —— جاؤ اپنا کام کرو دل لگا کر —— ٹانگ برابر کا لڑکا شعر کہنے چلا ہے" —— ننھے نوشہ کے دل کو کس قدر چوٹ پہنچی ہوگی۔

لیکن تم جانتے ہو کہ جو لوگ آگے چل کر بڑے بننے والے ہوتے ہیں۔ وہ شروع کی ناامیدیوں سے مایوس ہو کر کبھی نہیں بیٹھ رہتے! مرزا دو چار آنسو بہا کر پھر شعر کہنے میں جٹ گئے۔

اور یہی نہیں انہوں نے اردو اور فارسی کے بڑے شاعروں کے دیوانوں کو گھنگھولنا شروع کیا۔ کیونکہ ان کو یقین تھا کہ جیسی ردیف انہوں نے استعمال کی ہے اس کی سند ضروری کسی بڑے شاعر کے یہاں ملے گی۔

ڈھونڈتے' ڈھونڈتے' ڈھونڈتے' فارسی کے ایک بہت بڑے شاعر ظہوری کے یہاں وہ ردیف مل گئی! دوڑے ہوئے ظہوری کا دیوان لیے' استاد کے پاس پہنچے' استاد نے ظہوری کی غزل دیکھی' پھر ان کی اور پھر ان کو گلے سے لگا لیا ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات! —— آج ان کے استاد کو پہلی بار یہ خیال آیا کہ جس بچہ کو وہ پڑھا رہے ہیں وہ تو ممکن ہے کہ آگے چل کر کوئی بہت بڑا شاعر بنے اتنا سا بچہ اور اتنی لگن' اتنی محنت اور اتنی

تلاش!

ہم نے بھی تمہیں یہ بات اس لیے بتائی ہے مرزا جو مکتب کی پڑھائی سے گھبراتے تھے تو اس سے تم یہ نہ سمجھنا کہ وہ پڑھنے یا محنت کرنے سے گھبراتے تھے۔ نہیں البتہ وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ جو کچھ وہ پڑھیں' اپنے شوق اور پسند سے پڑھیں اور اپنی پسند کی پڑھائی میں وہ بہت محنت کرتے تھے' یہی وجہ ہے کہ ان کے علم میں کوئی کمی نہیں رہی اور ان کے زمانے میں ان سے بڑا فارسی زبان کا عالم اور جاننے والا دوسرا کوئی نہ تھا۔

انہوں نے آخری عمر میں کسی سے باتیں کرتے ہوئے کہا تھا۔ "میں نے باقاعدہ مکتب جانا اور پڑھنا لکھنا دس بارہ سال کی عمر سے پہلے ہی چھوڑ دیا تھا' ماں بھی ناراض ہوئیں ماموں بھی خفا ہوئے پر میں نے دوبارہ مکتب کی طرف منہ نہیں کیا۔ اب سوچتا ہوں کہ ایسا کچھ خاص نقصان بھی نہیں ہوا۔ بھلا اس قسم کی پڑھائی جاری رہتی تو زیادہ سے زیادہ یہی تو ہوتا کہ لوگ مجھ کو مولوی کہنے لگتے۔"

تم بھی مرزا کے بالکل شروع کے دو چار شعر سنو اور ان سے مزہ لو۔

اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے
پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لیے اسد ہر رات شمع' شام سے لے تا سحر جلے

اور ——

زخم دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے ایسے ہنستے کو رلایا ہے کہ جی جانے ہے

غالب آگرے میں

مرزا کے لڑکپن کے زمانے میں' آگرہ میں' ایک اور بہت بڑے شاعر بھی تھے۔ ان کا نام نظیر تھا۔ یہ صوفی تھے' جگہ جگہ گھومتے تھے۔ ہر طرح کے لوگوں سے ملتے تھے' جنتا کے دل کی بات جنتا ہی کی زبان میں کہتے تھے ان کی شاعری بہت بچی' رسیلی مزے دار تھی۔ ان کی مشہور نظم۔

"سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ" تم نے پڑھی یا سنی ہوگی۔

جب آگرے کے بچے بچے کی زبان پر نظیر کے شعر تھے۔ تو ضرور مرزا غالب نے بھی نظیر کے شعر پڑھے اور سنے ہوں گے' اور اس سے ان کو ضرور اکساؤ ہوا ہوگا۔ لیکن کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ مرزا غالب نظیر کے شاگرد تھے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے! تمہیں معلوم ہے ناکہ شاعری میں استادی شاگردی کے کیا معنی ہیں!

بات یہ ہے کہ اس زمانے میں ہر نیا اور نوجوان شاعر جب شعر کہنا شروع کرتا تھا اور تھوڑا بہت کہنے لگتا تھا تو پرانے اور بڑے استادوں میں سے کسی کو اپنا خاص استاد مان لیتا تھا۔ پھر جو کچھ وہ شعر بھی کہتا اپنے ان استاد کو دکھاتا اور ان کے مشورے اور صلاح سے اپنی شاعری میں کانٹ چھانٹ کرتا' اور اسے درست کرتا۔ ایک ایک استاد کے بیسیوں شاگرد ہوا کرتے تھے اور ان استادوں کے یہاں شاگردوں کا دربار سا لگا رہتا تھا جس میں استاد

بادشاہ سے کم نہ ہوتا تھا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ استاد شاگرد تو سب آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہوا کرتے تھے لیکن ان کے شاگردوں میں اکثر خوب خوب پر لطف لڑائیاں ہوا کرتی تھیں۔ اور نوک جھونک چلا کرتی تھیں۔ جو زیادہ تر اس بات پر ہوتی تھیں کہ کون استاد بڑا ہے اور کون چھوٹا "مدعی سست گواہ چست" والا معاملہ ہوتا تھا!

مرزا غالب کے متعلق ایک حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اس طرح کی شاگردی انہوں نے کسی شاعر کی نہیں کی!

ایک اور دلچسپ بات تمہیں سنائیں۔

اسی زمانے میں ایک اور بہت بڑے شاعر تھے ان کا نام میر تھا——— تم نے بھی سنا ہو گا یہ غزل کے اتنے بڑے استاد تھے کہ ہم اردو والے ان کو "خدائے سخن" کہتے ہیں۔ یہ بھی آگرے کے رہنے والے تھے' پھر دہلی میں بہت سال رہے اور آخر میں پریشانیوں سے تنگ آکر لکھنؤ چلے گئے تھے۔

تم کو معلوم ہو گا کہ میر صاحب ذرا نک چڑھے تھے——— بھئی آخر اتنے بڑے شاعر جو تھے' جلدی کسی کی تعریف نہیں کرتے تھے اور تیوری پر بل ڈالے بغیر کسی کا کلام نہیں دیکھتے تھے۔

ایک بار ایک نواب صاحب دہلی سے لکھنؤ گئے۔ تو غالب کی ایک غزل اپنے ساتھ لے گئے۔ اس زمانے میں یہ دستور تھا کہ لوگ ایک شہر کے شاعروں کا کلام دوسرے شہر لے جایا کرتے تھے۔ سوغات کی طرح۔

غالب کی عمر اس وقت تیرہ سال سے بھی کم تھی۔

ہاں تو ان نواب صاحب نے وہ غزل میر صاحب کو دکھائی۔ جانتے ہو میر صاحب نے کیا کہا؟ بولے "اگر اس لڑکے کو کوئی اچھا استاد مل گیا اور س نے اس کو سیدھے رستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بنے گا——— ورنہ مہمل بکے گا۔"

ذرا سوچو تو تیرہ سال سے کم عمر کا لڑکا ایسے شعر کہتا تھا کہ لوگ ایک شہر سے دوسرے شہر لے جایا کرتے تھے———

میر صاحب نے غالب کے بارے میں جو پیشن گوئی کی تھی وہ بالکل ٹھیک نکلی۔ غالب واقعی لاجواب شاعر ہوئے لیکن یہ بھی ایک ان کی تعریف ہے کہ بغیر استاد کے لاجواب ہو گئے۔

ہم نے تمہیں بتایا ہے کہ غالب نے شاعری میں شاگردی کسی کی نہیں کی۔ لیکن ان کے پڑھنے لکھنے میں' فارسی زبان کو اچھی طرح جاننے میں اور شعر کہنے کی طرف دل بڑھانے میں ایک شخص کا ہاتھ کافی تھا!

اس شخص کا نام پہلے ہرمز تھا اور پھر عبدالصمد' کیونکہ یہ پہلے آتش پرست پارسی تھے اور بعد کو مسلمان ہو گئے تھے۔ ایران کے رہنے والے تھے اور عرب کے ملکوں میں رہ کر عربی زبان بھی اچھی طرح سیکھی تھی سیر سپاٹا کرتے ہوئے ہندوستان بھی آئے تھے۔ جب آگرے پہنچے تو یہاں غالب نے ان کو پکڑ لیا اور دو سال تک اپنے یہاں مہمان رکھا۔ اس مہمانی کے دور میں غالب نے علم کے اس سمندر سے خوب موتی چنے۔

ان کو بھی غالب سے اتنی ہی محبت ہو گئی تھی کہ ہندوستان سے جانے کے بعد کسی اور ملک سے انہوں نے

غالب کو خط میں لکھا "میری طبیعت بڑی آزاد ہے۔" یہاں کسی کا گزر نہیں۔ لیکن میرے عزیز تم نہ جانے کیسے ہو کہ تمہاری یاد بار بار آکر اس آزادی میں رکاوٹ ڈالتی ہے۔"

مرزا نے بھی جہاں کہیں ان کا ذکر کیا ہے' بڑی محبت اور عزت کے ساتھ کیا ہے۔ انہیں اپنے استاد سے بہت محبت تھی! اب ہم تمہیں ایک بات اور بتائیں اور پھر ہم تم مرزا غالب کے ساتھ آگرے سے دہلی چلیں گے!

وہ بات یہ ہے ______ شاید تمہیں ہنسی آئے گی سن کر ______ کہ تیرہ سال کی عمر میں غالب کی شادی ہو گئی۔

انہوں نے اپنے آخر زمانے میں اپنے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے لکھا ہے (1809ء میں میرے لیے حبس دوام (یعنی عمر قید) کا حکم ہوا۔ ایک بیڑی (یعنی بیوی) میرے پاؤں میں ڈال دی۔ اور دہلی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔"

مرزا غالب کی بیوی کا نام امراؤ بیگم تھا۔ چھوٹے سے قد کی خوبصورت بیوی تھیں اور اپنے میاں سے بہت محبت کرتی تھیں' غالب میں اور ان میں اکثر جھگڑے ہوا کرتے تھے۔ یہ جھگڑے بڑے دلچسپ ہوتے تھے اور دونوں کے بہت مزے دار لطیفے مشہور ہیں۔

مثلاً" ایک بار مکان بدلنا تھا پہلے غالب خود جا کر دیکھ آئے لیکن صرف باہر کا حصہ دیکھ سکے۔ کیونکہ پردے کی وجہ سے اندر نہیں جا سکتے تھے۔ چنانچہ امراؤ بیگم اندر کا مکان دیکھنے گئیں۔ جب واپس آئیں تو مرزا نے پوچھا۔ "کہئے کیسا مکان ہے۔ پسند آیا۔ وہ بولیں مکان تو اچھا ہے پر اس میں کوئی بلا بتاتے ہیں۔"

غالب نے ہنس کر کہا "اچھا بھلا آپ سے بڑھ کر بھی کوئی بلا ہے۔"

غالب کے ایک رشتے کے پوتے خضر مرزا نے لکھا ہے۔ میں ایک دن مرزا صاحب کے یہاں گیا۔ اوپر سیڑھیوں سے اتر رہے تھے' میرے کھوے پر ہاتھ رکھ کر بولے "آ ______ تیری دادی کے گھر چل رہا ہوں (یعنی اندر زنانے میں) اندر پہنچے تو ماما سے دادی کے بارے میں پوچھا پتہ چلا کہ نماز پڑھ رہی ہیں۔ کہنے لگے "ہیں یہ کیا ہے' بھئی جب آؤ نماز جب آؤ نماز! اے خضر تیری دادی نے تو گھر کو قریب قریب پوری کی مسجد بنا دیا ہے۔"

بات اصل یہ تھی کہ غالب تھے فن کار اور شاعر' آزاد طبیعت' فقیر مزاج' گھرداری الجھنوں اور ذمہ داریوں سے گھبرانے والے اور امراؤ بیگم سیدھی سادی' گرہست بیوی تھیں اس لیے ان کو شوہر کی کچھ باتیں کھل جایا کرتی تھیں۔ ویسے دونوں میاں بیوی میں بہت محبت تھی' اور دونوں ایک دوسرے کا لحاظ اور خیال کرتے تھے اور اس چاہت کا ایک بڑا عجیب سا ثبوت یہ ہے کہ مرنے کے ٹھیک ایک سال بعد ______ اسی دن جب غالب مرے تھے ______ ایک طرف ان کی برسی کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور دوسری طرف امراؤ بیگم اس دنیا کی الجھنوں کو چھوڑ کر اپنے شوہر کے پاس سدھاریں۔

آؤ ______ اب مرزا کا گھر بار آگرے سے دہلی روانہ ہو رہا ہے۔ سامان بیل گاڑیوں میں لادا جا رہا ہے۔ سواریاں رتھوں اور پالکیوں میں بیٹھ رہی ہیں کچھ مرد اور نوکر چاکر گھوڑوں پر بھی ہیں ایک رتھ میں پندرہ سولہ

برس کے مرزا غالب اور بارہ تیرہ برس کی ان کی دلہن امراؤ بیگم' ہچکولے کھاتے مزے مزے کی باتیں کرتے ایک دوسرے کو چھیڑتے' ہنسی مذاق کرتے چلے جا رہے ہیں۔

ہم لوگ بھی اسی رتھ کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ ٹھیک ہے نا؟

غالب دہلی میں

رات کے ایک بجے ہیں!

دہلی کی ایک اندھی گلی میں سے ایک پالکی گزر رہی ہے۔ آج تو پالکی میں صرف عورتیں بیٹھتی ہیں اور وہ بھی کبھی کبھار لیکن انیسویں صدی میں' دہلی اور لکھنؤ کے شریف لوگ اسی سواری پر چلا کرتے تھے!

اس وقت اس میں کون ہو سکتا ہے؟

دیکھو یہ بلی ماروں کی طرف مڑی اور اب گلی قاسم جاں کی طرف جا رہی ہے!

ارے اس میں تو مرزا غالب ہیں!

مگر ان کے چہرے پر یہ رنج اور دکھ کی پرچھائیاں کیسی؟

کیوں نہ ہو دکھ ——— دل میں کیسے کیسے ارمان لے کر مشاعرہ میں گئے تھے کہ غزل کی خوب خوب داد ملے گی ——— پر وہاں مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ نہ ملا ——— یہ اپنے شعر سناتے رہے:

ہے بس کہ ہر ایک ان کے اشارے میں نشاں اور   کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم' جب اٹھیں گے   لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

——— محفل خاموش رہی!

دو ایک چاہنے والے دوستوں نے تعریف کی۔ لیکن وہ کیا دل کو لگتی! آخر وہ وہاں سے اٹھے' آہستہ سے بولے۔

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات   دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

اور بھری محفل چھوڑ کر نکل آئے۔ یہ ارادہ کر کے کہ اب کسی مشاعرے میں نہیں جائیں گے۔

لیکن دوست کب پیچھا چھوڑنے والے تھے' انہوں نے صرف روٹھے ہوئے غالب کو منایا ہی نہیں بلکہ انہیں یہ بھی سمجھایا کہ صرف لوگوں کا دل بدلنے کی دعا مانگنے سے کام نہیں چلے گا۔ اپنی زبان بھی بدلنی ہوگی۔

مرزا غالب کے ان دوستوں میں فضل الحق خیر آبادی کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ جنہوں نے غالب کے ساتھ نہ صرف دوستی کا حق ادا کیا بلکہ ہم پر ——— جو آج غالب کے پڑھنے والے ہیں۔ ہم پر بھی احسان کیا کیونکہ انہوں نے ہی غالب کو ہر وقت کہہ کہہ کر یہ سمجھایا کہ ایسے شعر کہو کہ جن کو لوگ پسند کریں۔ ورنہ لوگ ضرور تمہارے بارے میں کہیں گے۔

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے مزہ کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
زبانِ میر سمجھے اور کلامِ مرزا سمجھے مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اور تمہاری شاعری چلے گی نہیں بے شک جو شاعر ہوتا ہے وہ دل کا خون کر کے شعر کہتا ہے لیکن آخر وہ کہتا تو ہے دوسروں ہی کو سنانے کے لیے پھر اگر تمہاری بات کہنے کا طریقہ ایسا ہو کہ سننے والوں کے دل کو وہ بات نہ لگے تو تمہارا شعر کہنا کیا معنی؟

غالب کے یہ دوست بات تو بہت ٹھیک کہتے تھے مگر اس بات کو ماننا کس قدر دشوار تھا اس کا اندازہ تمہیں عرب کے ایک بہت بڑے مصنف کی بات سے ہوگا۔

وہ کہتا ہے۔"شاعر کے لیے اپنی لکھی ہوئی چیزوں کو کاٹنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا ماں کے لیے اپنے بچے کے گلے پر چھری پھیرنا۔ کیونکہ وہ اپنے شعروں سے اتنی ہی محبت کرتا ہے جتنی ماں اپنے بچے سے کرتی ہے۔"

اس بات کو سمجھنے کے بعد تم مرزا غالب کی ہمت کو داد دو!

ذرا یہ سوچو کہ اپنے دوستوں کی اس رائے کی سچائی کو انہوں نے صرف مانا ہی نہیں بلکہ اس پر عمل کرتے ہوئے اپنے دیوان کو جب چھانٹا تو اس کا تقریباً" تین چوتھائی حصہ کاٹ کر پھینک دیا۔

اس کے یہ معنی ہوئے کہ انسان کی جو سب سے بڑی خوبی ہے یعنی اپنی کمیوں اور کمزوریوں کو ماننا اور پھر اپنی طبیعت پر جبر اور دباؤ ڈال کر ان کمزوریوں کو دور کرنا—— یہ خوبی مرزا غالب میں کس درجہ تھی!

یہی وجہ ہے کہ اگر تم دیوانِ غالب کو دیکھو تو حیران رہ جاؤ گے کہ اتنی چھوٹی سی کتاب اور اس کی اتنی شہرت! لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ غالب کی نظر جوہری کی تھی—— ایک ایماندار اور سچے فنکار کی نظر تھی—— انہوں نے صرف ہیرے چن لیے اور کنکر سب نکال ڈالے!

اسی لیے یہ چھوٹی سی کتاب بھاری بھاری دیوانوں کے مقابلے میں زیادہ قیمتی سمجھی جاتی ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں دہلی میں کچھ خاص لوگوں کا ایک گٹ تھا جو غالب کی بڑھتی ہوئی شہرت سے جلتے تھے اور ہر ممکن کوشش اور طرح طرح کی ترکیبیں کیا کرتے تھے کہ غالب کا کلام نہ چلنے پائے لیکن عام لوگ ان کی غزلوں کو بہت پسند کرتے تھے۔ عام لوگوں کی اس پسند کے بارے میں بھی طرح طرح کی دلچسپ باتیں مشہور ہیں۔

ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ چاندنی چوک میں ایک طوائف رہتی تھی جس کا نام چودھویں تھا۔ یہ بڑی خوبصورت اور سجیلی عورت تھی اور اسے گانا بجانا بھی خوب آتا تھا۔ دہلی کے اکثر خاص و عام اس کے یہاں گانا سننے جایا کرتے تھے۔

چودھویں کو مرزا غالب کی شاعری بہت پسند تھی اور وہ آئے دن نئی نئی دھنیں بنا کر ان کی غزلیں گایا کرتی تھی۔ ہوتے ہوتے مرزا غالب کی غزلیں دہلی کے تمام گلی کوچوں میں پھیل گئیں اور پہنچتے پہنچتے مرزا غالب تک یہ بات پہنچ گئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مرزا غالب اس بات پر بہت رنجیدہ اور غمگین تھے کہ ان کی شاعری خاص لوگوں میں پسند نہیں کی جا رہی تھی۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ اپنی شاعری کی اتنی قدر کرنے والی عورت سے ملنے کی خواہش مرزا کے دل میں ضرور پیدا ہوئی ہوگی۔

اور پھر مرزا اور چودھویں میں محبت ہوگئی!

اپنی اس محبت کا حال مرزا نے کبھی کھلم کھلا نہیں بیان کیا۔ لیکن ان کے خطوط میں کہیں کہیں اس کا اڑتا اڑتا ساذکر ہے۔ تم نے اگر "مرزا غالب" فلم دیکھی ہوگی تو اس میں اس محبت کا پورا حال دکھایا گیا ہے۔

افسوس ہے کہ چودھویں کا انتقال جوانی ہی میں ہوگیا۔

مرزا غالب کے کچھ شعر ایسے ملتے ہیں جن کے بارے میں یہ سوچا جا سکتا ہے کہ انہوں نے چودھویں کی اس بے وقت موت پر کہے ہوں گے۔

کیوں مری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال — دشمنی اپنی تھی' میری دوستداری ہائے ہائے
شرم رسوائی سے جا چھپنا نقاب خاک میں — ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے
عمر بھر کا تو نے پیمان وفا باندھا تو کیا — عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

اور ان کی وہ بہت مشہور اور خوبصورت غزل:

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے — شعلہ عشق سیاہ پوش ہوا میرے بعد
آئے ہے بیکسی عشق پہ رونا غالب — کس کے گھر جائے گا سیلاب میرے بعد

مرزا غالب اور چودھویں کی محبت کی یہ کہانی بڑی دکھ بھری ہے اور اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ فنکار کا دل محبت کا بڑا پیاسا ہوتا ہے اور اس کی سب سے بڑی آرزو اور اس کی پیاری تمنا یہ ہوتی ہے کہ اسے کوئی ایسا شخص ملے جو اس کے فن کا سچا قدردان ہو' اسے سمجھے اور اس سے پیار کرے۔

اکثر فنکاروں کو اپنے گھروں میں یہ بات نہیں نصیب ہوتی تو وہ گھر کے باہر کسی سے پیار کرتے اور اپنا دل بہلاتے ہیں' اپنے فن میں اپنے اس دکھ کی تصویریں کھینچتے ہیں اور شراب کے نشے میں اپنے غم کو بھول جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسے غالب نے لکھا ہے:

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو — اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

ہم سب کو چاہیے کہ ایسی کوشش کریں کہ کلاکار کے نرم اور نازک دل کو سماج کی ٹھوکریں نہ لگیں اور اس کے فن کی ایسی ہی قدر ہو جیسی کہ ہونی چاہیے۔

غالب لکھنؤ میں

دہلی سے لکھنؤ جانے والی سڑک پر ایک گھوڑا گاڑی جا رہی ہے۔

برسات کا موسم ہے' پھوار پڑ رہی ہے' چاروں طرف ہریالی چھائی ہے' جو ہر گڑھے پانی سے بھرے ہیں۔ آموں کی خوب بہار ہے' جدھر دیکھئے ٹوکروں میں زرد زرد آم بھرے ہوئے سڑک کے کنارے لگے ہیں' دوکانوں پر سجے ہیں' پیڑوں سے ٹپک رہے ہیں۔ اور آم بھی کیسے' دسہری' سفیدہ' جن کی مٹھاس بقول مرزا غالب:

انگبین کے بہ حکم ربّ الناس
بھر کے بھیجے ہیں سربہ مہر گلاس

لیکن دسہری اور سفیدہ تو لکھنؤ کے آم ہوتے ہیں؟

تو اور کیا؟——— یہ لکھنؤ تو ہے ہی؟

اس گھوڑا گاڑی میں مرزا غالب دہلی سے لکھنؤ پہنچ رہے ہیں؟

غازی الدین حیدر کا زمانہ ہے' لکھنؤ میں اردو کی شعرو شاعری اپنے پورے شباب پر پہنچی ہوئی ہے۔ لوگوں کو معلوم ہوا ہے کہ مرزا غالب لکھنؤ آئے ان کی خوب خاطرمدارت ہو رہی ہے جگہ جگہ مشاعرے ہو رہے ہیں۔ لوگ اپنا کلام سنا رہے ہیں۔ لو اب شمع مرزا کے سامنے آئی۔

لگے ہاتھوں تمہیں اس شمع کا بھی حال سنا دیں! بات یہ ہے کہ اس زمانے میں اچھے مشاعرے بڑے اہتمام سے ہوا کرتے تھے۔ فرش پر بڑے بڑے نرم اور قیمتی قالین ان پر سفید دودھ سی چاندنیاں' چاروں طرف گاؤ تکیے جن پر سفید اجلے غلاف چڑھے' بیچ بیچ میں چاندی کے حقے کالایچی لپٹی ہوئی سنک لگی چاندی کے خاصدان جن میں بھیگے ہوئے سرخ ریشم میں لپٹی ہوئی پان کی گلوریاں' چاندی کے ورق لگے الائچی وغیرہ پڑی۔ چاندی کے گلاب پاشوں میں عرق گلاب۔ طشتریوں میں چکنی ڈلی الائچی وغیرہ رکھی اوپر شامیانے لٹکتے ہوئے پھولوں کے دروازے چاروں طرف طاقوں میں روشنی کے کنول روشن شمعیں جل رہی ہیں۔ شامیانے میں جھاڑ فانوس قندیلیں لٹک رہی ہیں۔

غرض کہ اک عجب سماں ہوتا تھا!

جب سب شاعر جمع ہو جاتے تو بیچ میں ایک چھوٹی سی چاندی کی لگن لاکر رکھی جاتی' اس کے بیچوں بیچ ایک بڑی سی شمع ہوتی تھی۔ شمع کے چاروں طرف کیوڑا بھرا رہتا تھا۔

جب مشاعرہ شروع ہوتا یہ شمع روشن کر دی جاتی اور جس شاعر کی باری ہوتی اس کے سامنے رکھ دی جاتی شمع سامنے آتے ہی شاعر سنبھل کر بیٹھ جاتا اور اپنا کلام شروع کرتا۔

تو اب شمع مرزا غالب کے سامنے ہے!

ذرا سنو کیا کہتے ہیں:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

کہاں مے خانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

لوگ ہیں کہ سنتے نہیں تھکتے' بار بار فرمائشیں ہوتی ہیں اور وہ بار بار سناتے ہیں۔

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبہ دل — اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر — کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے
عشق پر زور نہیں ، ہے یہ وہ آتش غالب — کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

ایک ملازم باہر سے آکر اطلاع دیتا ہے کہ آغامیر صاحب کے یہاں سے کوئی صاحب مرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں جن صاحب کے گھر مشاعرہ ہے' وہ ٹھہرنے کو کہتے ہیں۔ کیونکہ مرزا حاضرین کے اصرار پر تیسری غزل کے کچھ شعر سنا رہے ہیں۔

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی — میری وحشت تیری شہرت ہی سہی
قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے — غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے اسد — گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

محفل برخاست ہوتی ہے!

مرزا شاعروں کے جھرمٹ میں باہر نکلتے ہیں جو صاحب انتظار میں کھڑے تھے انہوں نے بندگی عرض کر کے بتایا کہ آغا میر نے بھیجا ہے کہ مرزا غالب سے کہنا ہم ان سے مل کر خوش ہوں گے ——— دراصل غازی الدین حیدر تو نام کے بادشاہ ہیں۔ سب کرتا دھرتا تو یہی آغا میر ہیں۔

غالب کا جواب بھی ذرا سنو۔ کہتے ہیں۔ "میں خوشی سے آؤں گا۔ لیکن دو شرطوں کے ساتھ اول تو یہ کہ میں نقد نذر نہیں پیش کروں گا اور دوسرے یہ کہ جب میں پہنچوں تو آغا میر کھڑے ہو کر میرا استقبال کریں۔"

نتیجہ وہی ہوا کہ نہ نو من تیل ہو گا نہ رادھا ناچیں گی نہ انہوں نے غالب کی شرط مانی اور نہ غالب ان کے یہاں گئے۔

اور یہ اس زمانے کی بات ہے جب غالب کی مالی حالت بہت خراب تھی۔ روپے کی بہت تنگی تھی۔ اور یہ دستور بھی تھا کہ شاعر لوگ درباروں میں حاضریاں دیا کرتے تھے۔

آج نہ آغا میر زندہ ہیں اور نہ مرزا غالب لیکن ہم تم یہ ضرور جانتے ہیں کہ مرزا غالب جیسے شاعر چاندی اور سونے کے مول اپنے شعر نہیں بیچا کرتے۔ ان کا ساز اور ہی کچھ ہوتا ہے۔

غالب ایک جگہ کہتے ہیں:

بک جاتے ہیں ہم آپ متاع سخن کے ساتھ — لیکن عیار طبع خریدار دیکھ کر

یعنی کہتے ہیں کہ اگر ہمارے خریدار کی طبیعت ہمارے فن کی بچی خریدار ہے تو ہم اس کے لیے اپنا شعر بیچنا تو کیا اپنے آپ کو بھی بیچ دیتے ہیں۔

لکھنؤ میں کئی مہینے رہنے کے بعد مرزا غالب نکلتے گئے۔ یہ سفر بھی زیادہ تر گھوڑا گاڑی سے طے ہوا۔ پھر

ناؤ سے بھی ——— کلکتہ پہنچ کر شملہ بازار میں ایک چھوٹا سا مکان لیا جو کافی کھلا ہوا تھا اور ہوا دار ——— آرام کا تمام سامان اس میں موجود تھا۔ آنگن کے ایک کونے میں میٹھے پانی کا کنواں بھی تھا۔

وہ انگریزوں کا زمانہ تھا' گورنر جنرل کلکتے میں رہا کرتا تھا اور اسی کے جہاں غالب کو کام تھا۔

بات یہ تھی کہ مرزا غالب کو موروثی حیثیت سے کچھ پنشن ملتی تھی جو تقریباً" ساڑھے سات سو روپے سالانہ تھی۔ یعنی ۶۰ سا ٹھ روپیہ ماہوار ہوئی' مرزا یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ پنشن بڑھ جائے کیونکہ ظاہر ہے کہ اس میں ان کی گزر ہونی مشکل تھی۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ پنشن کا روپیہ ان کو سیدھا سرکار سے ملا کرے کیونکہ جن نوابوں کے ذریعہ یہ روپیہ ملا کرتا تھا ان کی خوشامد کرنا مرزا کو پسند نہ تھا۔

کئی سال یہ مقدمہ چلتا رہا۔ مرزا نے بہت سا روپیہ قرض بھی لے کر اس میں لگایا کہ جب پنشن بڑھ جائے گی تو اس میں سے ادا کر دیں گے۔ جب تک یہ مقدمہ گیا لیکن آخر میں مرزا غالب جیت نہ سکے الٹے ان کے اوپر قرض بہت سا ہو گیا جو وہ آخر عمر تک چکاتے رہے اور اس کی وجہ سے بہت پریشان رہے۔

ویسے کلکتہ شہر ان کو پسند بہت آیا۔

لگ بھگ تین سال کے قریب وہ وہاں رہے اور کلکتہ شہر کی تعریف میں انہوں نے شعر بھی کہے اور خطوں میں بھی جہاں کہیں اسکا ذکر کیا تعریف اور محبت کے ساتھ۔

دیکھو یہ ان کے دو تین شعر کلکتہ کے بارے میں ہیں۔

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں ——— اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطراکہ ہے غضب ——— وہ نازنیں بتان خود آرا کہ ہائے ہائے

سمجھے تم۔

کہتے ہیں کہ ہائے وہ سرسبز کے تختے کہ جن سے دل کو ٹھنڈک اور طراوت ہو ——— اور اس پر غضب ہوئی وہ خوبصورت اور نازنین' مورتوں کی سی حسین حوریں جو اپنے آپ کو بنائے سجائے اپنا سنگھار اور اپنی سجاوٹ دکھائیں اور دلوں کو لبھائیں!

اور پھر کہتے ہیں:

وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ! ——— وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

وہ تازے اور رسیلے اور میٹھے پھل وہ لال لال شیریں اور مزے دار شراب کہ جس کو پی کر دل باغ باغ ہو جائے۔

کہو ——— آنکھوں کے سامنے کلکتے کی تصویر کھنچ گئی نہ؟ ——— اپنے خطوں میں بھی غالب نے کئی جگہ کلکتے کا ذکر کیا ہے اور ہمیشہ بہت پیار سے کیا ہے!

لیکن کلکتہ نے غالب کو یہی کچھ نہیں دکھایا جو تم نے اوپر پڑھا بلکہ کاروباری شہر میں جا کر بڑے شہر میں رہ کر انسان جو کچھ سیکھتا ہے وہ بھی سکھایا!

وہاں جا کر مرزا غالب کے بہت سے لگے بندھے خیالات بدل گئے اور نئے خیالات نے ان کی جگہ لے لیں انہوں نے دیکھا کہ انسان کس طرح ایک نئی زندگی کی طرف بڑھ رہا ہے ان کو زندگی کی خوبصورتی کا زیادہ احساس ہوا اور زندگی کی مضبوطی پر زیادہ بھروسہ!

کلکتے سے واپس آ کر غالب کی شاعری میں ایک نیا موڑ آیا: ان کی بات میں سادگی اور تیزی آ گئی اور اس کے یہ معنی تھے کہ ان کے اشعار میں اثر بڑھتا چلا گیا اور وہ چیز آ گئی جسے ادبی زبان میں "نشریت" کہتے ہیں اب انہوں نے ایسے شعر کہنے شروع کیے جو سماج کی پرانی اور گلی بندھی رسموں کو چوٹ پہنچاتے تھے اور مذہب کا نام لینے والوں پر طنز کرتے تھے۔

یہ بات تو تم جانتے ہی ہو کہ ہر سماج میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو مذہب اور خدا کا ٹھیکیدار سمجھتے ہیں خود دنیا بھر کی برائیاں کریں تو کچھ نہیں لیکن دوسروں کو ہر گھڑی نصیحت کرتے رہتے ہیں۔ یہ کرو گے تو جنت میں جاؤ گے اور وہ کرو گے تو جہنم میں جاؤ گے وغیرہ اچھا اب آزمانے کے لیے تم کسی بھی اچھے شاعر یا فن کار کو دیکھو —— غالب کو لو، تلسی داس کو دیکھو، شیکسپیر کو پڑھو سب کے یہاں تمہیں ایسے جھوٹے لوگوں پر چوٹ ملے گی جو ایمان کے ٹھیکیدار بنتے ہیں!

ایسا کیوں؟

ایسا اس لیے کہ فنکار چاہے کسی ملک، کسی مذہب اور کسی زبان کا ہو اسے سب سے زیادہ دکھاوے سے چڑ ہوتی ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ انسان جیسا ہو ویسا ہی نظر آئے، مکاری اور دھوکہ بازی نہ کرے۔ آدمی سب ایک دوسرے سے پیار کریں۔ لوگ خود بھی خوش رہیں اور دوسروں کو بھی خوش رہنے دیں۔

اب تم سوچو کہ جب غالب نے کہا ہوگا:

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

یا

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن — دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

یا

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے — ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں آئے

یہ واعظ وہی صاحب ہیں جو سمجھتے ہیں۔ جنت میں سیٹ بک کرانا صرف اس کا کام ہے۔

مزے کی بات یہ ہوتی ہے کہ واعظ قسم کے لوگ تو ایسے شعر کہنے والوں کے دشمن ہو جاتے ہیں لیکن عام لوگ ان فنکاروں کو ہاتھوں ہاتھ لیتے اور سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں اور ان کو اپنے دلوں میں اور اپنی زبانوں پر زندہ رکھ کر امر بناتے ہیں کیونکہ تم غور کرو تو تمہیں یہ نظر آئے گا کہ عام لوگ سچائی کے پرستار ہوتے ہیں اور یہ ان کو صاف نظر آتا ہے کہ یہ نصیحت کرنے والے دوسروں کو بے وقوف بنا کر اپنا الو سیدھا کر رہے ہیں۔

چنانچہ ایک بار مرزا غالب بھی ان لوگوں کی دشمنی کا شکار ہوئے!

وہ کیسے؟

یہ ہم تمہیں آگے بتائیں گے۔

اس وقت تو ہم تمہیں ایک واقعہ ایسا اور بتاتے ہیں جس سے تمہیں معلوم ہو گا کہ غالب کتنے رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے اور انہیں اپنی عزت کس درجہ پیاری تھی۔

یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ جب غالب لکھنؤ اور کلکتے گئے تھے تو ان کو پیسوں کی سخت ضرورت تھی ——— دہلی میں اس زمانے میں ایک کالج ہوا کرتا تھا۔ جس کا نام دہلی کالج تھا۔ جب مرزا کلکتے سے واپس آئے تو وہاں ایک بڑے استاد کی ضرورت تھی۔ فارسی پڑھانے کے لیے ٹامسن صاحب جو اس کالج کے کرتا دھرتا تھے۔ انہوں نے مرزا غالب کو بلوایا یہ پالکی پر سوار ہو کر ان کے بنگلے پر گئے۔

اب بنگلے کے دروازے پر پالکی کھڑی ہے کہ کوئی لینے آئے تو اتریں۔ جب کسی نے ان سے کہا کہ "حضرت تشریف لایئے" ——— تو کہا کہ صاحب کوئی مجھے اتروانے آئے تو تب اتروں۔ یہ بات چیت ہو ہی رہی تھی کہ ٹامسن صاحب خود نکل آئے اور یہ بات معلوم کر کے کہنے لگے کہ آپ نوکری کے لیے آئے ہیں۔ کوئی ملاقات کے لیے تو آئے نہیں ہیں اس لیے آپ کو لینے کیسے آتا۔"

مرزا نے جواب دیا۔ جناب۔ میں تو سمجھا تھا کہ اس نوکری سے میری عزت بڑھے گی لیکن یہاں تو یہ دکھائی دے رہا ہے کہ جو رہی سہی عزت ہے وہ بھی ہاتھ سے جائے گی بس ایسی نوکری کو سات سلام۔

پالکی میں بیٹھے ہی بیٹھے کہاروں کو حکم دیا کہ واپس لوٹ چلو۔

اس زمانے میں غالب نے کچھ شعر اپنی غریبی کے بارے میں کہے ہیں۔ مثلاً"

ہم نے مانا یہ کہ دہلی میں رہیں۔ کھائیں گے کیا؟

یا

غم عشق گر نہ ہوتا، غم روزگار ہوتا

اس طرح کے اشعار کو پڑھ کر دل دکھ جاتا ہے اور یہ خیال آتا ہے کہ کاش سماج میں ایسا بندوبست ہو سکتا کہ فن کار اپنی دال روٹی کی فکر سے آزاد ہو کر اطمینان سے شعر کہہ سکتا، تصویریں بنا سکتا ——— مورتیاں گھڑ سکتا تو کتنا اچھا ہوتا اور دنیا کی خوبصورتی اور اچھائی کس قدر بڑھ جاتی۔

تحسین سروری

غالب کی ایک غیر مطبوعہ تحریر

حیدر آباد کے دوران قیام میں- وہاں آثار غالب کی جو میں تلاش و تحقیق کرتا رہا ہوں- اس میں غالب کی ایک ایسی تحریر دستیاب ہوئی جو نہ اب تک ان کے کسی مجموعہ تحریرات میں شامل ہے اور نہ ان کے مکاتیب میں دیکھی گئی-

مجھے اپنے ایک کرم فرما مولوی ابوالحامد عرشی صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب (صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی) کے ذاتی کتب خانے میں فارسی کا ایک ایسا مخطوطہ ہے جس کے آخر میں مطالب کتاب کے متعلق غالب کی اصل تحریر درج ہے- چنانچہ ایک روز میں محترم سروری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا- اور مخطوطہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی- موصوف نے کمال مہربانی سے وہ مخطوطہ مجھے دے دیا- اور شروع سے آخر تک دیکھنے اور غالب کے خط کی نقل لینے کی اجازت بھی دی-

میں صرف غالب کی تحریر کا آرزو مند تھا- اور اصل کتاب کے موضوع سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی- تاہم کافی دیر تک کتاب کی ورق گردانی کرتا رہا-

مخطوطہ کوئی پچاس ساٹھ ورق کے حجم پر مشتمل ہے- کتاب کا نام تو میں پڑھ نہیں سکا- البتہ نفس مضمون کو جس حد تک سمجھ سکا وہ درج کرتا ہوں-

حیدر آباد میں نواب محمد وجیہہ الدین خاں معنی اور میر محمد زکی متخلص بہ زکی دو نامی شخص گذرے ہیں- ان دونوں بزرگوں کے درمیان فن تاریخ گوئی کے کسی مسئلے پر یا کسی کے کسی قطعہ تاریخ پر بحث چھڑ گئی- وجیہہ الدین خاں کا کہنا تھا کہ تائے مُتدیرہ' جو تاریخ گوئی کی اصطلاح میں تائے مثناۃ فوقانی بھی کہلاتی ہے اور ہائے مدورہ کی شکل میں لکھی جاتی ہے بہ قاعدہ ابجد اس کے چار سو عدد شمار کرنا چاہیں- لیکن میر زکی کہتے تھے کہ یہ قاعدہ غلط ہے- جب کہ کتابت میں واضح حرف ہائے ہوز ہو اس کے اوپر صرف دو نقطے لگا کر تائے تانیث' کے عدد شمار کرنا اصول کے خلاف ہے- غرض کہ بحث آگے بڑھتی گئی یہاں تک کہ ایک اچھی خاصی کتاب بن گئی-

بحث کے دوران میں ان دو صاحبوں نے نظائر و امثال اور اسناد و استشہاد کے پیش کرنے میں بڑی عرق ریزی سے کام لیا ہے- ضمناً" بعض ایسے ایسے مسائل زیر بحث آئے ہیں کہ ان دونوں حضرات کی علمیت اور قابلیت

پر رشک آتا ہے- اس کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ دونوں پایہ استدلال میں پکے ہیں اور ایک دوسرے کے مخالف ہونے کے باوجود اس علمی بحث میں ذاتیات پر حملے ہیں نہ کسی نے کسی کی کم علم کا مذاق اڑایا ہے اور کوئی ایسی بات پیدا نہ ہونے دی جس سے بحث میں تلخی پیدا ہو- تحریر میں متانت و سنجیدگی کا خاص خیال رکھا گیا ہے- اس لحاظ سے فن تاریخ گوئی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب کافی معلومات افزا ہو گئی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری بحث تحریر میں ہوتی تھی- اس کے بعد تمام تحریروں کو کتاب کی شکل میں ترتیب دے کر کسی خوشنویس سے لکھوا لیا گیا- آخر میں پندرہ میں ورق سادے لگا دیئے- ہندوستان میں اس وقت جن ماہرین علم و فن کا شہرہ تھا ان کے پاس کتاب بھیجی گئی اور استدعا کی گئی کہ ان مباحث پر اپنی رائے یا فیصلہ کتاب کے آخر میں درج کر دیں۔

میرے خیال میں کتاب پر حق اصحاب علم و فن کی رائے ہے وہ 25 - 30 سے کم نہ ہوں گے- آخری ورق کے آخری صفحے پر مرزا غالب کی تحریر ہے- جس کے ختم پر ان کی وہی 1267ھ والی مشہور مہر ہے- غالب کے خطوط کے عکس اتنے شائع ہو چکے ہیں کہ ان کی تحریر فوراً پہچانی جا سکتی ہے- ان کی مہر کے بعد نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر درخشاں کی رائے ہے- جس کے نیچے ان کی بھی ایک چھوٹی سی مدور شکل کی مہر ہے- جس میں صرف نیر لکھا ہوا ہے- غالبا" ضیاء الدین احمد خاں کی کوئی مہر اس سے قبل کسی کے دیکھنے میں نہیں آتا- کتاب کے پشتے کے قریب روئے کتاب کی طرف اس زمانے کا مروج ڈاک ٹکٹ ابھی تک چپکا ہوا ہے- جس پر ملکہ وکٹوریہ کی تصویر اتری ہوئی ہے- یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جب یہ کتاب دلی سے غالب کی رائے کے بعد حیدر آباد واپس آئی تو پھر کسی اور جگہ نہیں بھیجی گئی- اب مرزا غالب کی تحریر ملاحظہ ہو:

"یہ سگ دنیا کی اسد کہلاتا ہے- اور تخلص اپنا غالب بتاتا ہے- قول المامور و معذور کا پاس کرتا ہے اور حضرات انجمن فیض سے التماس کرتا ہے کہ میں استفتاء کے سزاوار نہ تھا اور اب جو پوچھا گیا تو سچ سچ کہتا ہوں کہ میں فن تاریخ و معما سے بیگانہ ہوں- دیوان میں جو تاریخیں مندرج ہیں بیشتر مادے اوروں کے اور قطعے فقیر کے ہیں- کبھی کوئی مادہ بھی عامیانہ نہ کہہ دیا ہوگا- ہاں حضرات مبداء فیاض نے گنجینہ معنی سے بہت کچھ مجھ کو دیا- میں نے سراسر قصیدہ غزل و مثنوی و رباعی میں صرف کیا- البتہ بزور قوت ابداع مادہ تاریخ میں نیا شیوہ نکالا-"

زسال واقعہ مرزا میتابیگ مات راست شمار آئمہ امجاد

صحیفہ ہائے سماوی متعین از عشرات حدیقہ ہائے بہشتی از آحاد

(1248)

ایضاً

از بروج سپہر جوئے مات عشرات از کواکب سیار

(1270)

"یہ دونوں قطعے کلیات فارسی منطبعہ مطبع اودھ اخبار لکھنؤ میں چھاپے گئے ہیں اور وہ مجلد مجموع بلاد ہند میں پہنچ گئے ہیں۔ اشرف البلاد حیدر آباد میں اگر دو چار نہ ہوں گے تو ایک نسخہ میرا بھیجا ہوا جناب منشی حبیب اللہ خاں ذکا کے پاس ضرور ہو گا۔ اس میں مشاہدہ کیا جائے۔ اب یہ اتباع حکم احباب جس فن کو نہیں جانتا اس کے خصوصی میں عرض کرتا ہوں کہ میں نے یہ مسائل اس سفینے کے سوا کبھی نہیں دیکھے۔ اب جو دیکھے تو باللہ اس سے زیادہ نہیں سمجھا۔ کہ ایک گروہ تائے دراز کے چار سو عدد اور تائے مدورہ کے پاس عدد لیتا ہے۔ پس نہ جناب نواب صاحب وجیہہ الدین خاں بہادر معنی اپنے دعوٰی میں منفرد ہیں اور نہ حضرت سید صاحب میر محمد زکی زکی اپنے دعوے میں تنہا۔ میں جو ایک جہت اختیار کروں۔ تو دوسریَ جہت والوں کو کہ وہ بھی اشخاص کثیر اور سب فاضل تحریر ہیں کیا جواب دوں۔ اور ان کے دلائل کو کن دلائل سے رد کروں؟ امید کہ حضرات طرفین بموجب مفہوم لایکلف اللہ نفسا" الاو سعہا۔ اس پیر ہفتاد و شش سالہ ضعیف الحواس کو معفو فرمائیں۔"

بہادر نظام

جنگ

اسد اللہ خاں الملک

نجم الدولہ دبیر

1267ھ

غالب کی اس تحریر کے بعد نواب ضیاء الدین احمد خاں کی مختصر سی فارسی عبارت ہے:

"احقر العباد ضیاء الدین احمد نیر عفی عنہ دریں مادہ متنازع فیہا مامولائے ملاذی اخی او ستاذی جناب غالب مدظلہ، ہم بیان و ہمداستان و از جملہ بردانست و بجی مجنانست۔ فقط

نیر

غالب کے انکسار کا عالم دیکھئے کہ انہوں نے اس فن سے بیگانہ محض ہونے کا اعتراف کر لیا۔

ایک قابل غور بات یہ ہے کہ پوری کتاب کے مباحث فارسی میں ہیں، اور جن دوسرے اصحاب علم و فن نے اپنی اپنی عبارتیں لکھی ہیں وہ سب فارسی میں ہیں۔ حد یہ ہے کہ غالب کے بعد نواب ضیاء الدین احمد خاں جو چند جملے تحریر کرتے ہیں تو وہ بھی فارسی میں لیکن غالب نے اسی عود ہندی اور اردوئے معلی والی اردو زبان میں اپنی عبارت لکھی ہے۔ طرز تحریر ان کا ایسا ہے کہ فن تاریخ گوئی کو نہ جاننے کا اعلان کرنے کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ جانتے ہیں۔ لیکن اس خیال سے قطعی رائے نہیں دے رہے ہیں کہ اس سے دوسری جہت والے ناراض ہو جائیں گے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ واقعی غالب ایسی باتوں میں سر کھپانا پسند نہیں کرتے تھے۔ تاریخ گوئی کے متعلق منشی میاں داد خاں سیاح کو بھی کس قدر صاف اور واضح الفاظ میں لکھتے ہیں:

"تمہاری جان اور اپنے ایمان کی قسم کو فن تاریخ گوئی و معما سے بیگانہ محض ہوں۔ اردو زبان میں کوئی تاریخ نہ سنی ہو گی۔ فارسی زبان میں دو چار تاریخیں ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ

مادہ اوروں کا ہے۔ اور اشعار میرے ہیں۔ تم سمجھے کہ میں کیا کہتا ہوں؟ حساب سے میرا جی گھبراتا ہے۔ اور مجھ کو جوڑ لگانا نہیں آتا ہے۔ جب کوئی مادہ بناؤں گا' حساب درست نہ پاؤں گا دو ایک دوست ایسے تھے کہ اگر حاجت ہوئی تو وہ تاریخ مجھے ڈھونڈ لادیتے۔ موزوں میں کرتا۔ اگر آپ مادے کی فکر کی ہے اور یہی حساب جمل منظور رکھا ہے تو ایسے تعمیے اور تخرجے آگئے ہیں کہ وہ تاریخ ہنسی کے قابل ہوگئی ہے۔"

(خطوط غالب طبع دوم مرتبہ مولانا غلام رسول مہر' ص 430)

غالب کی منقولہ تحریر کے ساتھ تاریخ و سن نہیں ہے۔ اور کوئی ایسی بات میں نوٹ نہ کرسکا جس کی بنا پر اس تحریر کے زمانے کا تعین کیا جاسکتا۔ 1267ھ کی مہر ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ واقعہ بھی اسی سن کا ہے۔ مخطوطے کے آخری صفحات پر کہیں کچھ تاریخی قطعات بھی مندرج تھے۔ ان میں ایک حبیب اللہ ذکا کی بھی تاریخ تھی۔ لیکن میں نے کچھ غور نہیں کیا۔ اتفاق سے ذکا کے کلیات نظم و نثر موسومہ "خاش و خماش" (مطبوعہ 1302ھ) میں وہ قطعہ مل گیا دراصل یہ تاریخ ہے رفع انتزاع کی۔

"تاریخ رفع نزاع ذکی کہ نظر بصورت رسمی آخر لفظ صلوۃ ہا میدانست باخان معنی کہ بلحاظ اصل تای شمرد۔"

با معنی حق سراز کی را گچھے بود و برفع پوست
آں طنطنہ چوں نماند باقی تاریخ گزشتہ را صلواۃ است

غالب کا انتقال 3 ذ۔ یقعدہ 1285ھ (10 فروری 1869ء) کو ہوا۔ ذکا نے یہ تاریخ 1286ھ میں نکالی۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ ماہ ذ۔یقعدہ 1285ھ سے چند ہی ماہ قبل غالب نے یہ تحریر لکھی تھی۔ اور رفع انتزاع ہوتے ہوتے 1285ھ کا سال گذر گیا تھی کہ 1286ھ شروع ہو گیا۔

اسی "خاش و خماش" میں ذکا کا ایک اور قطعہ بھی ملتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ساری بحث میں نواب وجہ الدین کا پلہ بھاری رہا اور ان کے دلائل کو تسلیم کرلیا گیا۔

رسالہ کہ در تحقیق حرف آخر صلواۃ نوشتہ شدہ بود پایان آن بتقریب استشہاد نگارش یافت:

من برینم من برینم من بریں خان معنی آنچہ فرماید بجاست
در حضور حق تواں گفتن ذکا آخر لفظ صلواۃ البتہ تاست

(سوائے اوقاف و رموز کے 'اصل اقتباسات بجنسہ نقل کیے گئے۔)

روئداد مقدمہ مرزا غالب

جناب عالی

جو کہ مجھ مدعی کا مقدمہ بہ نام مولوی امین الدین بابت ازالہ حیثیت عرفی حسب منشائے دفعہ 499

تعزیرات ہند عدالت ہے' چناں چہ بہ فہمائی چند گرامی روسائے شہر باہم رضا مندی ہوئی اب مجھ کو کچھ دعویٰ بابت مقدمہ باقی نہیں' مقدمہ داخل دفتر ہو جائے۔

عرضے عزیز الدین وکیل مدعی 23 مارچ 1868ء

از پیش گاہ او برین صاحب بہادر
مقدمہ خارج اور کاغذات داخل دفتر۔ فقط

نجات کا طالب غالب

مرزا غالب کے کردار و سیرت کا سرسری مطالعہ

عشرت رحمانی

حسن اخلاق' دوستداری و راست گفتاری

"للہ الحمد کہ سادہ دل و راست گفتارم آفریدہ اند' ہر چہ در دل داشتم بہ زبان باز گفتم"

یہ ہیں مرزا اسد اللہ خاں غالب---- جنہوں نے اپنے مسلک اور اخلاق و عادات کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل خواجہ الطاف حسین حالی نے قریبی مشاہدات کی بنا پر اس طرح بیان کی ہے:-

"مرزا کے اخلاق نہایت وسیع تھے۔ وہ ہر ایک شخص سے جو ان سے ملنے جاتا تھا بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے۔ جو شخص ایک دفعہ ان سے مل آتا تھا اس کو ہمیشہ ان سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ دوستوں کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے تھے اور ان کی خوشی سے خوش اور غم سے غمگین ہوتے تھے۔ ان کے دوست ہر ملت اور مذہب کے نہ صرف دہلی میں بلکہ تمام ہندوستان میں بے شمار تھے۔ جو خطوط انہوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں ان کے ایک ایک حرف سے مہر و محبت اور غم خواری و یگانگت ٹپکی پڑتی ہے۔ ہر ایک خط کا جواب لکھنا وہ اپنے ذمے فرض عین سمجھتے تھے۔ ان کا بہت سا وقت دوستوں کے خطوط کے جواب لکھنے میں صرف ہوتا تھا....

وہ دوستوں کی فرمائشوں سے کبھی تنگ نہ ہوتے تھے۔ غزلوں کی اصلاح کے سوا اور طرح طرح کی فرمائشیں ان کے بعض خالص و مخلص دوست کرتے تھے اور وہ ان کی تعمیل کرتے تھے۔ مروت اور لحاظ مرزا کی طبیعت میں بدرجہ غایت تھا۔

اگرچہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی مگر حوصلہ فراخ تھا۔ سائل ان کے دروازے سے بہت کم خالی جاتا تھا۔ ان کے مکان کے آگے لنگڑے لولے اور اپاہج مرد عورت ہر وقت پڑے رہتے تھے۔"

دراصل غالب کی علمی و ادبی فضیلت اور شاعرانہ عظمت کے ساتھ ان کے حسن اخلاق اور شخصیت و کردار کی بلندی بھی مثالی تسلیم کی جاتی ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس عظیم فن کار اور فاضل ہستی کے کمالات اور ذات میں بڑی مماثلت تھی۔

صداقت شعاری

غالب کا کلام ان کے اپنے ماحول اور خصائل کا آئینہ دار تھا۔ فارسی اور اردو کے مطالعہ سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہوتی ہے کہ حقائق نگاری پر غالب کی کتنی گرفت تھی اور یہ کہ شعر و ادب کی راہوں سے موجودہ عہد کی اذہان ماضی کے نادیدہ دور سے آشنا ہونے کے لیے ان کے کلام سے کس حد تک آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اسی رابطہ سے مرزا صاحب کے دور میں پہنچ کر ایک صدی کے گزرے ہوئے واقعات ہی کے نشان نہیں پاتے بلکہ اس عہد کی نشاط انگیزیوں' اذیتوں اور تمام کیف و کم کے آثار سے وقوف حاصل کرتے ہیں۔ یعنی جب مرزا غالب زندہ سلامت اپنی فاضلانہ زندگی کے آخری ایام بسر کر رہے تھے تو ہمیں ان کے اس دور کے کلام نظم و نثر سے ان کوائف کا بخوبی علم ہو جاتا ہے' اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے ظاہر و باطن میں کس قدر یکسانیت تھی۔ اس مختصر مضمون میں غالب کے کمالات' ان کے زندہ جاوید افکار عالیہ' شاعری اور نثر نگاری سے بحث کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ ان کے ذاتی حالات اور مکارم اخلاق کا اجمالی تذکرہ کرنا ہے۔

خودنوشت حالات

اس سلسلے میں مناسب ہو گا کہ یہاں مرزا صاحب کے وہ سوانح حالات پیش کیے جائیں جو انہوں نے ۱۸۶۳ء ش میں ایک انگریز مسٹر شیکن کی فرمائش پر موصوف کے زیر تالیف تذکرہ شعرائے ہند کے لیے لکھے تھے۔ یہ تذکرہ انگریزی میں مرتب ہوا تھا اور عرصہ دراز کے بعد مرزا کی یہ مختصر آپ بیتی تغیر و تبدل کے ساتھ (بہ زبان اردو) رسالہ اردو (اورنگ آباد دکن) میں شائع ہوئی تھی۔ جس کی اشاعت کو تقریباً" چالیس سال گزر چکے ہیں۔ فرماتے ہیں:

> "اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ غالب تخلص قوم کا سلجوقی ترک سلطان برکیارق سلجوقی کی اولاد میں ہے۔ اس کا دادا قوقان بیگ خان شاہ عالم کے عہد میں سمرقند سے دلی آیا پچاس گھوڑے اور نقارہ نشان سے بادشاہ کا نوکر تھا۔ پہاسو کا پرگنہ جواب سمرو کی بیگم کو سرکار سے ملا تھا وہ اس کی جاگیر میں مقرر ہوا۔ باپ اسد اللہ خاں مذکور کا عبداللہ بیگ خاں دلی کی ریاست چھوڑ کر اکبر آباد میں جا رہا۔ اسد اللہ خاں اکبر آباد میں پیدا ہوا۔ عبداللہ بیگ خاں الور میں راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا اور وہاں ایک لڑائی میں بڑی بہادری سے مارا گیا۔ جس حال میں کہ اسد اللہ خاں مذکور پانچ چھے برس کا تھا اور اس کا حقیقی چچا نصر اللہ بیگ خاں' مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبہ دار تھا۔ ۱۸۰۳ء ش میں جب جرنیل لیک صاحب اکبر آباد پر آئے تو نصر اللہ بیگ خاں نے شہر سپرد کر دیا اور اطاعت کی۔ جرنیل صاحب نے چار سو سوار کا بریگیڈیر کیا اور ایک ہزار سات سو کی تنخواہ مقرر کی۔ پھر جب اس نے اپنے زور بازو سے سونک (Sonk) سونسا (Sonsa) دو پرگنے بھرت پور کے قریب ہولکر کے سواروں سے چھین لیے جرنیل صاحب نے وہ دونوں پرگنے بہادر موصوف کو بہ طریق استمرار عطا فرمائے۔ مگر خان موصوف

جاگیر مقرر ہونے کے دس مہینے کے بعد بہ مرگ ناگاہ ہاتھی پر سے گر کر مرگیا۔ جاگیر سرکار میں باز یافت ہوئی اور اس کے عوض نقدی مقرر ہو گئی اور شرکا کو دے دلا کر ساڑھے سات سو روپیہ سال اس شخص کی ذات کو اسی زر معافی میں سے ملتے ہیں۔ اس (غالب) نے شاعری میں بڑا کمال پیدا کیا۔ نہ فقط شعر بلکہ نثر میں بھی دستگاہ رکھتا تھا' نثر کی تین کتابیں ہیں' پنج آہنگ' مہر نیروز' و دستنبو فارسی نظم کا کلیات دس ہزار بیت کا بالفعل اودھ اخبار لکھنؤ میں چھاپا ہوا ہے۔ گورنمنٹ میں اس کی بڑی عزت ہے۔ اشرفیوں کے عوض قصیدہ مدح نذر دیتا ہے اور سات پارچے۔ جیغہ سرپنچ موتیوں کی مالا خلعت پاتا ہے۔ اب کی بار جو لاہور میں لارڈ صاحب کا دربار ہوا تو موافق سابق کے دربار داروں کی فہرست کے صاحب کمشنر بہادر حصار نے کہ دریں ولا قائم مقام صاحب کمشنر دہلی بھی ہیں مثل اور رئیسوں کے اور رئیس زادوں کے اس کو بھی خط لکھا بے چارہ بہ سبب تہی دستی اور بے مقدوری کے لاہور نہ جاسکا... حق بات کو ظاہر نہ کرنا خدا پرستی اور حق شناسی کے خلاف ہے۔"

(اخذ اقتباس)

وسیع النظری

اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا غالب شاہی خاندان کے فرد تھے اور ان کا بچپن شہزادگی کے انداز میں اور جوانی رئیسانہ ٹھاٹھ سے بسر ہوئی۔ یہی سبب تھا کہ گو رفتہ رفتہ زمانے کی کج روی نے ان کو تنگ دستی اور غربت کا سامنا کرنے پر مجبور کیا اس کے باوجود ان کی فراخ حوصلگی اور عالی ظرفی برقرار رہی' اور وہ نسبی شرافت اور خاندانی امارت کو افلاس کی حالت میں بھی اپنا سرمایہ افتخار تصور کرتے رہے۔ امارت ختم ہو گئی۔ مگر خلقی عادات و اطوار میں قدیم شان کی خو بو باقی رہی۔

مرزا صاحب حسن اخلاق کا پیکر ہوتے ہوئے پاک باطن اور صاف گو حد درجہ تھے۔ وہ اپنی زبان سے اپنے اوصاف ہی بیان نہیں کرتے بلکہ اپنے عیوب کا بھی بلا تکلف اظہار کرنے سے احتراز نہیں کرتے۔ اس سے ان کے طبعی خلوص و صداقت پر روشنی پڑتی ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے ظاہر و باطن میں ذرہ بھر فرق نہ تھا۔ ان محاسن کی بے شمار مثالیں ان کے حالات اور اقوال میں ملتی ہیں۔ ان کے مذہب میں دل آزاری سب سے بڑا گناہ اور ریاکاری بدترین جرم تھا۔ تواضع اور دوسروں کی حاجت روائی عین ایمان جانتے تھے۔ ایک دوست کے خط میں لکھتے ہیں:

"دنیا دار نہیں۔ فقیر خاکسار ہوں تواضع میری خو ہے۔ انجاح مقاصد خلق میں حتی الوسع کمی کروں تو ایمان نصیب نہ ہو۔"

فراخ دلی کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ جنگ آزادی اور فتح دہلی کے بعد انہیں لفٹنٹ گورنر کی طرف سے سات پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر کے ملا لفٹنٹی کے چپراسی اور جمعدار قاعدے کے مطابق انعام کے لیے

آئے۔ غالب کو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ انعام دینا ہو گا چنانچہ چپراسیوں کو ایک الگ مکان میں بٹھا دیا گیا اور خلعت مع رقوم جواہر بغرض فروخت بازار میں بھیج دیا گیا بازار سے قیمت آئی تو چپراسیوں کو انعام دے کر رخصت کیا۔(۱)

یادگار غالب

دوست نوازی اور حوصلہ مندی کی یہ کیفیت تھی کہ احباب کی خاطرداری سے ہمیشہ خوش ہوتے۔ احباب کسی کام کی فرمائش کر دیں تو اس کی انجام دہی فرض سمجھتے۔ اس کے علاوہ دوستوں کی تکلیف کو اپنا دکھ درد سمجھ کر دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔ بعض دفعہ اپنے لیے سختی گوارا کر کے دوست کا دکھ دور کرنے کو تیار ہو جاتے۔ ایسے بے شمار واقعات ان کی زندگی میں ملتے ہیں اور ان کے خطوں میں اس قسم کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ ایک واقعہ مولانا حالی نے بیان کیا ہے:

> "غالب کے ایک امیر دوست جن کی حالت فتح دہلی میں بہت سقیم ہو گئی تھی چھینٹ کا فرغل پہنے ملنے کے لیے آئے۔ غالب نے انھیں کبھی مالیدہ یا جامہ وار کے چغوں کے سوا نہیں دیکھا تھا۔ چھینٹ کا فرغل دیکھ کر دل بھر آیا۔ امداد کا خیال پیدا ہوا لیکن دوست کی خود داری کا احترام پیش نظر رکھتے ہوئے سلوک ایسے طریق پر کرنا چاہتے تھے کہ اسے بے چارگی کا احساس نہ ہو اور پیش کردہ ہدیہ کے قبول میں عار نہ آئے۔ غرض غالب نے چھینٹ کے فرغل کی بے حد تعریف کی۔ پوچھا کہ یہ کہاں سے لی ہے اور درخواست کی کہ مجھے بھی اسی قسم کا فرغل بنوا دیجئے۔ دوست نے بے تکلف کہا کہ اگر آپ کو پسند ہے تو یہی فرغل لے لیجئے۔ غالب نے کہا' جی تو یہی چاہتا ہے کہ آپ سے ابھی چھین لوں لیکن جاڑا شدت سے پڑ رہا ہے۔ آپ یہاں سے مکان تک کیا پہن کر جائیں گے' اس کے ساتھ ہی اپنا مالیدہ کا چغہ انھیں پہنا دیا۔ ایک نازک دل اور نازک احساسات والے شاعر کی شان دوستداری کا تقاضا یہی تھا!"

ایک دوست کی سفارش کے لیے دوسرے دوست کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "آپ ان کی تعظیم و توقیر میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں اور راج کا حال سب ان پر ظاہر کریں' اور انھیں ہانسی سرکار سے ملا دیں اور بابو صاحب سے جو ان کو لکھوائیے تو میرا یہ خط جو آپ کے نام ہے جناب بابو صاحب کو پڑھوا دیجئے۔ کیا خوب ہو کہ یہ سرکار میں نوکر ہو جائیں اور اگر نوکری کی صورت نہ بنے تو راج سے ان کی رخصت بہ آئین شائستہ عمل میں آوے۔"

ایک اور دوست کو خط میں تحریر کیا:

> "اگر کہوں کہ میری جان بھی تمھارے کام آئے تو میں حاضر ہوں یہ کہنا تکلف محض ہے۔ کون کسی کی جان مانگتا ہے' کون جان دیتا ہے! مگر جو فکر مجھ کو تمھاری ہے اور جو میری دسترس ہے

اس کو میرا خدا اور میرا خداوند (مراد حضرت سیدنا مولا علیؑ سے) جانتا ہے۔ دسترس کو تم بھی جانتے ہو۔"

حق پسندی و سادہ دلی

مرزا صاحب کی مرنجان مرنج طبیعت کا تقاضا تھا کہ کسی کو برا نہ کہتے اور اگر اپنے بارے میں کسی کو برا کہتے سنتے تو عفو و درگزر سے کام لیتے۔ جیسا کہ فرماتے ہیں ۔

غالب برا نہ مان جو وشمن برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

اس بارے میں ان کا مسلک سیف الحق سیاح کے نام ایک خط کی عبارت سے واضح ہے۔ قاضی بڑودہ نے غالب کے خلاف تلخ کلامی سے کام لیا۔ اس موقع پر سیاح نے انہیں اطلاع دی تو انہیں لکھا:

"قاضی صاحب بڑودہ کو معاف رکھو۔ اگر کوئی وجہ اپنے پر ان کے عتاب کی پاتا تو ان سے عذر کرتا اور اپنا گناہ معاف کرواتا۔ جب سبب ملال کا ظاہر نہیں تو میں کیا کروں۔ تم برا نہ مانو کس واسطے کہ اگر میں برا ہوں تو اس نے سچ کہا اور اگر میں اچھا ہوں اور اس نے برا کہا تو اس کو خدا کے حوالے کرو۔"

غالب سیدھے سادے سچے مسلمان تھے۔ وہ رند مشرب' آزاد رو ہونے کے باوجود صلح کل مسلک رکھتے تھے۔ تعصب سے دل پاک اور اپنے ظاہر و باطن کے اظہار پر بے باک تھا۔ اسلام اور مسلمانوں سے حد درجہ محبت تھی اور اپنے لیے زہد و اتقا کے بھی دعوے دار نہ ہوئے۔ ان کی صاف گوئی اور دین داری پر ان کا یہ قول صادق آتا ہے:

"مجھ میں کوئی بات مسلمانی کی نہیں پھر میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی ذلت پر مجھ کو کیوں اس قدر رنج و تأسف ہوتا ہے۔"

ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں تو بنی آدم کو مسلمان ہو یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں۔ دوسرا مانے یا نہ مانے۔ باقی رہی وہ عزیزداری جس کو اہل قرابت کہتے ہیں اس کو قوم اور ذات اور مذہب اور طریق شرط ہے اور اس کے مراتب و مدارج ہیں۔"

زہر غم گوارا تھا!

غالب کے متعلق بعض ناقدین نے ان کے کلام کی روشنی میں غلط رائے بھی قائم کی ہے اور ان کی سیرت و کردار پر بے جا اتہام لگائے ہیں جو سراسر ناانصافی ہے۔ ایک نقاد کی رائے میں مرزا صاحب زندگی کے بوجھ کو اتار پھینکنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ بیشہ تلخی حیات اور اس کی مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے بجائے وہ غم و

آلام کی شکایت کرتے رہتے اور اس میدان میں اپنی کمزوری کا اعتراف اس مصرع میں کر چکے ہیں۔

غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے

اگر اس مصرع کو اعتراف شکست تصور کیا جا سکتا ہے تو اس مصرعے کے بارے میں ان کی پامردی اور حوصلہ مندی کا معترف ہونا کیوں ضروری قرار نہیں پاتا۔

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

حالاں کہ ان کے حالات کا صحیح جائزہ لینے سے اندازہ ہو چکا ہے کہ غالب رنج و مصائب کا زہر پی کر بھی سدا مسکراتے ہی رہے۔ مالی پریشانیوں کا گلہ شکوہ کرنا اور بات ہے لیکن صبر و قناعت کا دامن مرزا صاحب کے ہاتھ سے کبھی کسی حالت میں نہ چھوٹا۔ دراصل جو حضرات غالب کے مالی مصائب کا ذکر سن کر اور اس سلسلے میں ان کی گلہ مندیاں پڑھ کر ان کی کمزوری پر طعن کرتے ہیں پہلے تو انہیں یہ حقیقت پیش نظر رکھنا چاہیے کہ مرزا صاحب کی صاف گوئی اس بات کی متقاضی تھی کہ وہ اپنا حال کسی سے نہ چھپاتے تھے ورنہ جس ہستی نے آنکھ کھول کر دولت و ثروت اور جاہ و منزلت کے طور طریقے دیکھے' بعد میں اس پر یہ وقت آیا کہ گلی قاسم جان کے ایک معمولی مکان میں آٹھ برس تک قیام رہا جس کا کرایہ چار روپے تھا' اور وہ بھی مجبوری ایک زمانہ میں ادا نہ کر سکے(۱)! کیوں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے دہلی کی بربادی کا نقشہ پیش کر کے غالب کی پریشانیوں میں اضافہ کیا۔ تین سال پنشن بند رہی۔ بقول ان کے کھانے کو روٹی اور پینے کو شراب تک میسر نہ تھی۔ لیکن یہ سختی اور تنگی بھی صبر شکر سے گزار دی' اور مئی ۱۹۶۰ء میں جوں ہی پنشن ہوئی تین سال کا کرایہ یک مشت ادا کر دیا۔ مرزا صاحب بودے پن پر بے دلیل طنز کرنے والے مبصرین نہ جانے کیوں حقائق پر چشم پوشی کرتے ہیں اور ان کے عادات و خصائل کی نسبت تبصرہ کرتے وقت کیوں فراموش کر دیتے ہیں کہ غالب سلجوقی النسل اور انہوں نے اپنی سپہ گری اور خاندانی عزیمت و شجاعت شاعری سے زیادہ ناز کیا ہے کہ۔

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

ہمت و استقلال

ان کی زندگی کے معمولی واقعات شاہد ہیں کہ انہوں نے کسی بڑی سے بڑی تکلیف و صعوبت میں کمزوری اور بودے پن کا اظہار تو کجا ابرو پر بل نہ آنے دیا۔ تقریباً" ستر سال کی عمر میں احتراق خون کا شدید عارضہ لاحق ہوا' پھوڑوں کی تکلیف شروع ہوئی اور ہاتھ پاؤں پھنسی پھوڑوں سے بھر گئے۔ پاؤں میں ایسا ورم ہوا کہ ایڑی سے پنڈلی تک آماس ہو گیا آخر میں سارا جسم پک کر پھوڑا بن گیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ مدید سے سلسل بول اور قبض کے مرض میں مبتلا رہتے تھے ڈاکٹری علاج پر ان کا عقیدہ نہ تھا۔ تو نانی اطبا کے زیر علاج رہے۔ دہلی کے قیام کے آغاز سے آخر دم تک غالب کا مسکن گلی قاسم جان اور بلی ماران ہی میں رہا۔ یہیں برصغیر پاک و ہند کے مشہور اطبا میں سے اکثر کے آبائی محلات اور مطب بھی تھے جو اب تک موجود ہیں اور اس سے تھوڑے فاصلے پر لال کنواں

واقع ہے جہاں مشہور زمانہ ہمدرد دواخانہ ہے۔ گلی قاسم جان میں حکیم محمود خان اعظم اور ان کے اہل خاندان مطب کرتے رہے۔ غالب اکثر عوارض میں حکیم احسن اللہ خاں اور حکیم محمود خاں سے رجوع کیا کرتے تھے۔ اور انہی حکما کے زیر علاج ان کی بیگم اور دوسرے اقربا بھی رہا کرتے۔ غالب کے پھوڑوں نے جب انہیں چلنے پھرنے اور اٹھنے بیٹھنے سے معذور کر دیا اور حکیم محمود خاں نے تشخیص کیا کہ مدت العمر کی مے نوشی اور بے اعتدالیوں کی وجہ سے یہ صورت پیدا ہوئی ہے تو بعض احباب نے مشورہ دیا کہ کسی لائق ڈاکٹر سے رجوع کیا جائے مگر غالب نے انکار کر دیا۔ آخر حکیم صاحب کے مشورے سے طے پایا کہ سب سے پہلے پاؤں کے پھوڑے کو پکا کر گندا مواد خارج کیا جائے تاکہ اس کا زہر جسم میں سرایت نہ کر سکے۔ شدائد مرض سے بلنے کی تاب نہ تھی گراسی حالت میں لیٹے لیٹے دوستوں کو خطوں کے جواب دیا اور ان کے کلام پر اصلاح کرنا موقوف نہ ہوا۔ آخر جب دواؤں کے ذریعہ ورم خوب پک گیا اور اس کا منہ بن گیا تو حکیم صاحب ہی کے مشورے سے جراح نے نشتر سے سوراخ دے کر گندہ مواد نکالا اور حکیم صاحب کا دیا ہوا مرہم پھوڑوں کے زخموں پر لگایا جاتا رہا۔ احباب ان کی تکلیف کو دیکھ کر ہراساں ہوتے تھے مگر مرزا صاحب نے کبھی آہ تک نہ کی۔ حکیم صاحب کا آدمی زخموں کو صاف کرتا مرہم لگاتا اور پھاہے رکھ کر باندھا کرتا۔ اور اس میں کسی مبالغہ کی گنجائش نہیں کہ جب وہ آدمی سلائی سے زخم صاف کرتا اور پیپ نکالتا تو واقعی طور پر دیکھنے والے کانپ کانپ اٹھتے تھے لیکن غالب کے ماتھے پر بل تک نہ آتا تھا اور یہ تکلیف کی شدت مسلسل کئی سال تک رہی۔ ان کے صبر و تحمل میں ذرہ بھر فرق نہ آیا۔ اس بیماری کا حال ایک دوست کے خط میں اس طرح لکھتے ہیں:

"تین برس عوارض احتراق خون میں ایسا جلتا رہا ہوں کہ اپنے جسم و جان کی بھی خبر نہیں رہی۔ میں اپنی زبان سے کیوں نہ کہوں کہ اچھا ہوں۔ مگر بیمار اور عوارض میں گرفتار نہیں ہوں بوڑھا' بہرا' اپاہج' بدحواس' ناتواں' فلک زدہ آدمی ہوں۔"

اس طویل علالت اور امراض کی شدت کے ساتھ ضعف پیری نے سخت لاچار کر رکھا تھا۔ ایک خط میں اپنی حالت اس طرح بیان کی ہے:

"ضعف کا یہ حال کہ اٹھ نہیں سکتا۔ اگر دونوں ہاتھ ٹیک کر چارپایہ بن کر اٹھتا ہوں تو پنڈلیاں لرزتی ہیں۔ معتادن بھر میں دس بارہ بار اور اسی قدر رات بھر میں پیشاب کی حاجت ہوتی ہے۔ حاجتی پلنگ کے پاس لگی ہے' اٹھا اور پیشاب کیا اور پڑ رہا۔"

لیکن اس حالت میں بھی ہر تکلیف کو صبر سے برداشت کیے اور شکر خدا بجالائے۔ وفات سے دس ماہ پیشتر کی کیفیت ملاحظہ ہو۔ ایک دوست کو لکھا:

"امراض جسمانی کا بیان اور اخلاص ہمدگر کی شرح کے بعد ہجوم غمہائے نہانی کا ذکر کیا کروں جیسے ابر سیاہ چھا جاتا ہے یا ٹڈی دل آتا ہے۔ بس اللہ ہی اللہ ہے۔"

صبر و قناعت

تنگ دستی اور بدحالی کے عالم میں صرف ذات باری پر توکل تھا۔ پنشن کی بندش کے زمانے میں جب شراب کیا کھانا پینا تک ملنا دشوار تھا اس وقت کی حالت بیان کر کے صبر و قناعت کا اظہار کیا ہے۔ وہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ غالب ہر حال میں راضی برضا تھے۔ ارشاد فرماتے ہیں:

"انکم ٹیکس جدا چوکیدار جدا' سود جدا' مول جدا' بی بی جدا' بچے جدا' شاگرد پیشہ جدا' آمد وہی ایک سو باسٹھ۔ گزارا مشکل ہو گیا۔ روزمرہ کا کام بند رہنے لگا۔ سوچا کہ کیا کروں؟ کہاں سے گنجائش نکالوں۔ قہر درویش برجان درویش صبح کی تبرید متروک۔ چاشت کا گوشت آدھا۔ رات کی شراب وگلاب موقوف۔ بیس بائیس روپے مہینہ بچا' روزمرہ کا خرچ چلایا۔ یاروں نے پوچھا تبرید و شراب کب تک نہ پیو گے؟ کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا نہ پیو گے تو کس طرح جیو گے؟ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے۔"

جن مبصرین نے غالب کی نسبت یہ بہتان تراشے ہیں کہ وہ بیوی سے بیزار تھے ان کے لیے مرزا صاحب کا یہ بیان ہی مسکت جواب ہے کہ انہوں نے بدحالی کے زمانے میں اپنے اوپر ہر قسم کی تنگی اور بندش گوارا کیے بیس بائیس روپے مہینہ اس لیے بچایا کہ روزمرہ خرچ چلے۔"

بیگم سے تعلق خاطر

اس کے علاوہ متعدد ثبوت اس امر کے موجود ہیں کہ مرزا صاحب کو (باوجود اس کے کہ ان کی شادی کمسنی میں ان کی مرضی کے موافق نہ ہوئی۔ اور نہ اپنی متاہل زندگی سے مطمئن رہے) اپنی بیگم سے بیزاری تو کیا معمولی پریشانی اور ہلکی سی تشویش گوارا نہ تھی۔ جس زمانے میں نواب یوسف علی خاں والی کے پاس مقیم تھے بیگم کی طرف سے برابر متردد و متشوش رہا کرتے تھے۔ مولانا غلام رسول مہر نے چند مثالیں دے کر یہ حقیقت واضح کی ہے کہ غالب کو بیگم کی کس درجہ فکر تھی۔

۱۸۶۰ء میں قیام رامپور کے دوران جب پنشن بند تھی اور غالب حکومت ہند سے خط و کتابت کر رہے تھے گورنر جنرل کے چیف سیکرٹری نے ان کے کسی خط کا جواب بھیجا تھے بیگم نے حکیم نجف خاں سے کہہ کر بند کا بند رام پور بھجوا دیا۔ حکیم صاحب نے یہ بھی لکھا کہ گھر خط جلد بھیجتے رہا کریں۔ جواب میں لکھتے ہیں:

"تم کیا لکھتے ہو گھر میں خط جلد جلد لکھا کرو؟ تم کو جو خط لکھتا ہوں گویا تمہاری استانی کو لکھتا ہوں (یعنی بیگم غالب) کیا تم سے نہیں ہو سکتا کہ جاؤ اور پڑھ کر سناؤ؟ اب ان کو (بیگم کو) خیال ہو گا کہ انگریزی خط میں کیا لکھا ہے۔ تم یہ خط ہاتھ میں لے جاؤ اور حرف بحرف سناؤ۔"

مولانا مہر کا خیال بالکل درست ہے کہ حکیم صاحب کو غالب کا یہ لکھنا کہ لفافہ کھول کر پڑھ کیوں نہ لیا تاکہ گھر والوں کو پریشانی نہ ہوتی اس بات کی دلیل ہے کہ غالب بیوی کی ہلکی سی تشویش کو بھی برداشت نہ فرماتے تھے۔

رام پور ہی سے ایک اور خط میں حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں:

"ظہیرالدین (ابن حکیم نجف خان) کی دادی (بیگم غالب) کا یہ عارضہ سردو سعال رنجور ہونا کدار ناتھ کا مجھ سے خفا ہونا... مطالب معلوم ہوئے... اس کی دادی اس موسم میں ہمیشہ ان امراض میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ایک نسخہ اس کے پاس ماء اللحم کا ہے وہ کھنچوا دوا اور ذرا خبر لیتے رہو۔"

پھر ایک مرتبہ ۱۸۶۵ ش میں نواب کلب علی والئی رامپور سے ملنے تشریف لے گئے تھے۔ وہاں کے قیام کے زمانے میں حکیم غلام نجف خان اور ان کے صاحبزادے ظہیرالدین کو برابر خطوط میں بیگم کی دیکھ بھال کے لیے لکھتے رہے۔ ایک خط میں ظہیرالدین کو لکھتے ہیں:

"سنو میاں ظہیرالدین! تم اپنی دادی کے پاس ابھی جاؤ اور ان سے میری اور لڑکوں (عارف مرحوم کے لڑکے باقر علی و حسین علی جو سفر رام پور میں ان کے ساتھ تھے) کی خیر و عافیت کہو اور پوچھو کہ شہاب الدین خاں نے اکتوبر کی تنخواہ کے پچاس روپے دیے یا نہیں۔ اچھا میرا بیٹا دونوں باتیں اپنی دادی سے پوچھ کر جلد مجھ کو' لکھو' دیر نہ کیجو۔"

ان تمام بیانات سے کلی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ غالب نہ محض فرائض تاہل کی بجا آوری ہی میں مستعد تھے بلکہ ان فرائض کو دلی لگاؤ اور تعلق سے ادا کرتے تھے۔ البتہ بعض اوقات بیگم اور اقربا کی نسبت جو چند فقرے ان کی زبان یا قلم سے ادا ہوئے جن سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ اپنی متاہل زندگی سے بیزار اور فرائض خانہ داری سے محترز تھے ہرگز درست نہیں۔ کیوں کہ وہ باتیں شوخی طبع کے طور پر کہی گئیں اور ان کی حیثیت لطائف سے زیادہ نہیں' کیوں کہ غالب کی بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی ضرب المثل ہے مثلاً بیگم کو طوق اور بیٹری اور حبشی لڑکوں کو' ہتھکڑیاں کہنا محض بر سبیل مزاح تھا نہ کہ یہ حقیقت کہ وہ واقعی ان سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ ان کی سند میں مولانا حالی کا بیان کافی ہے لکھتے ہیں

"چوں کہ شوخی اور ظرافت ان کی گھٹی میں پڑی تھی ان کی زبان و قلم سے بیوی کی نسبت اکثر ایسی باتیں نکل جاتی تھیں جن کو ناواقف آدمی نفرت یا بے تعلقی پر محمول کر سکتا ہے۔"

اور ایک فاضل سوانح نگار کے یہ الفاظ تائید مزید کرتے نظر آتے ہیں کہ

"واقعہ یہ ہے کہ غالب کو اپنی بیگم صاحبہ سے بڑی محبت تھی۔ بیگم صاحبہ بھی اپنے شوہر کی راحت و آسائش پر اپنی جان قربان کرتی تھیں۔"

بیگم سے نوک جھونک اور لطائف

البتہ اس امر کے شواہد ضرور ملتے ہیں کہ غالب اور بیگم غالب کے درمیان بعض اوقات نوک جھونک ہوا کرتی تھی۔ لیکن یہ اسی طرح جیسے شرفا میں میاں بیوی کے درمیان کبھی کبھار جھگڑا ہو جایا کرتا ہو۔ مثلاً غالب بیگم کو "حضرت موسیٰ کی بہن" اور بیگم انہیں "بڈھا تو دیوانہ ہو گیا ہے" کی قسم کے فقرے ادا کرتی رہتیں۔

مرزا غالب سدا کے رند بلانوش اور عیش کوش تھے جو اس دور کے رؤسا کا خاصہ ہوا کرتا تھا۔ ایک ڈومنی کے عشق وارفتہ بھی رہے۔ اس کیفیت کا بیگم کو بخوبی علم تھا۔ اس سلسلہ میں یقیناً" دونوں کے مابین رنجش رہی ہو گی لیکن اس کے باوجود اختلافات کی خلیج گہری ہو کر افتراق کا موجب نہ بنی۔ نہ کوئی ایسا ناگوار واقعہ ہمارے سامنے ہے جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ کبھی کوئی بڑا جھگڑا ہوا اور اس کی بدولت میاں بیوی میں کچھ عرصے تک ناچاقی رہی۔ یہ ضرور ہے کہ غالب کی خانگی زندگی کے لطیفے اکثر تذکروں میں ملتے ہیں لیکن دائمی فساد یا بدمزگی کی کبھی نوبت نہ آئی۔ مثلاً ایک مرتبہ مرزا صاحب مکان بدلنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ کہیں کوئی مکان دیکھنے گئے۔ نئے مکان کا دیوان خانہ خود دیکھ کر پسند کر لیا اور زنانخانہ دیکھنے کے لیے بیگم کو بھیجا۔ جب بیگم واپس آئیں اور غالب نے دریافت کیا کہ "کہو مکان پسند آیا؟" بیگم نے جواب دیا کہ "اس گھر میں تو لوگ بلا بتاتے ہیں۔" غالب نے برجستہ کہا "مگر کیا دنیا میں تم سے بھی بڑھ کر کوئی بلا ہے!"

ظاہر ہے کہ یہ لطیفہ ہے اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ "غالب واقعی طور پر بیگم کو بلا سمجھتے تھے۔" اگر ایسا ہوتا اور یہ فقرہ انہوں نے سنجیدگی سے کہا ہوتا تو بیگم کی انہیں یہ خاطر کیوں منظور ہوتی کہ زنانخانہ دیکھنے بیگم کو بھیجتے۔

دراصل مرزا غالب کی ذات ستودہ صفات رنجش بیجا کی آلودگی سے پاک صاف تھی۔ انہوں نے ساری عمر کسی غیر کا دل نہ دکھایا۔ دوستوں کی دلداری اپنا شعار بنایا تو بیگم اور عزیزوں سے بیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ قتیل کے معرکہ میں انہوں نے مخالفین کے خلاف سب و شتم سے ضرور کام لیا لیکن وہ سب کچھ اس لیے تھا کہ بعض اصحاب نے نہ صرف ان کی فضیلت و علمیت پر بے جا نکتہ چینی کی بلکہ ذات پر بھی رکیک حملے روا رکھے۔ غالب کی خود داری اس رکاکت کو کب برداشت کر سکتی ہے! اس لیے ان کی طرف سے جو کچھ کہا اور لکھا گیا وہ عزت نفس اور تحفظ ذات کے لیے ضروری تھا۔ ورنہ انہوں نے عام طور پر کسی سے دشمنی کا اظہار نہ کیا بلکہ اکثر بدگویوں کو معاف کر کے ان کی برائیوں سے درگزر فرمایا۔

ذاتی ستائش سے نفرت

اپنی تعریف میں دوستوں کی زبان سے بھی کوئی لفظ سن کر محجوب نظر آتے۔ اور کبھی کسی کو اپنی مدح سرائی کی داد دے کر خوشنودی کا اظہار نہ کرتے۔ جب کبھی کسی شاگرد یا دوست نے ان کی شان میں مدحیہ قصیدہ رباعی یا نظم لکھ کر بھیجی انہوں نے ہمیشہ انہیں روکا اور ٹوکا۔ کسی نہ کسی طریقہ سے مداحین کو جتا دیا کہ انہیں اس قسم کی ستائش اپنے تئیں ناپسند ہے۔ ایک دوست کو قصیدہ کے جواب میں لکھا "مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہو اس ثنا و دعا کے قابل نہیں مگر اچھوں کا شیوہ ہے بروں کو اچھا کہنا اس مدح گستری کے عوض میں آداب بجا لاتا ہوں۔" یہ انداز بھی کیا خوب ہے۔ بہ ظاہر مداح کو آداب بجالائے لیکن حقیقت میں اس سے منشا یہ تھا کہ میں ایسی مدح گستری کو دور سے سلام کرتا ہوں۔ یعنی مجھے اس سے معاف رکھو۔

مسلک و مذہب

غالب کے اخلاق فضائل کا صحیح اندازہ ان کے حسن سلوک، مروت اور تواضع سے ہوتا ہے، وہ اپنے پرائے کی تمیز کیے بغیر ہر کہ و مہ کے ساتھ خوش خلقی اور ارتباط و مہربانی سے پیش آتے تھے۔

غالب کے بے ریائی اور صداقت شعاری کے ثبوت میں وہ دل چسپ حالات شاہد ہیں جو ان کے بارے میں پانی پت کے ایک قلندر بزرگ حضرت سید غوث علی شاہ نے بیان فرمائے اور ان کے ملفوظات "تذکرۂ غوثیہ" میں درج ہیں۔ سید صاحب ایک زمانے میں دہلی تشریف لے گئے تھے۔ آپ کو سیر و سیاحت کا خاص شوق تھا اور علم و ادب سے کمال شغف رکھتے تھے۔ آپ نے ریاضت و مجاہدہ میں خاص مقام حاصل کیا اور اپنے فیض روحانی سے تربیت انسانی کے فرائض انجام دیے۔ آپ ایک صوفی با صفا اور عالم با عمل بزرگ تسلیم کیے جاتے ہیں۔ حسن اتفاق سے سید صاحب نے غالب کا کچھ کلام کسی کی زبانی سنا تھا اور اسے بہت پسند کیا تھا۔ اسی نسبت سے شاہ صاحب دہلی کے قیام کے دوران میں مرزا غالب سے ملنے ان کے مکان پر گئے۔ جب مرزا صاحب کو اطلاع ہوئی تو بڑی تواضع سے لب فرش تک آکر شاہ صاحب کو لے گئے اور بڑے تپاک و عقیدت سے حال دریافت کیا۔ شاہ صاحب نے مرزا صاحب کے کلام کی تعریف کی اور ایک شعر پڑھ کر خاص طور پر داد دی۔

تو نہ قاتل ہو کوئی اور ہی ہو تیرے کوچہ کی شہادت ہی سہی

مرزا غالب نے داد تحسین کا شکریہ ادا کیا اور کہا "قبلہ یہ شعر میرا نہیں کسی استاد کا ہے۔ فی الحقیقت بہت خوب شعر ہے۔" اس کے بعد شاہ صاحب کی فرمائش پر اپنی اس زمین میں غزل سنائی۔

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی بے نیازی تری عادت ہی سہی

پھر ادھر ادھر کی گفتگو ہوتی رہی۔ اردو ادب کا ذکر چھڑا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں "اسی اثنا میں وہیں مرزا رجب علی بیگ سرور (مصنف فسانہ عجائب) جو ان دنوں لکھنؤ سے آئے ہوئے تھے، مرزا صاحب سے ملنے آگئے۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں اور مرزا سرور تعارف کے بغیر چپ چاپ بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر بعد گفتگو کے درمیان میں سرور نے دریافت کیا:

"مرزا صاحب اردو زبان میں کونسی کتاب عمدہ ہے؟" مرزا صاحب نے جواب دیا "چار درویش (میرامن) کی زبان کا جواب نہیں" مرزا سرور نے پھر پوچھا "فسانہ عجائب کی زبان کیسی ہے؟" مرزا غالب نے برجستہ کہا۔

"لاحول ولا قوۃ اس میں لطف زبان کہاں؟
ایک تک بندی ہے بھٹیار خانہ جمع ہے"

مرزا سرور سخت نادم ہوئے اور بلا تعارف خاموشی سے کچھ دیر بعد اٹھ کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد کسی نے بتایا کہ "یہ مرزا رجب علی بیگ سرور تھے۔" مرزا صاحب بے حد رنجیدہ ہوئے اور کہا، "ظالمو! پہلے سے کیوں نہ کہا۔ میں نے ایک مہمان ایک انسان کا دل دکھایا۔ کتنا بڑا گناہ سرزد ہوا مجھ سے۔ غضب ہو گیا۔"

مرزا صاحب کے یہ خیالات سن کر شاہ صاحب ان کے عقائد و اخلاق و مروت سے بہت متاثر ہوئے اور

داد دینے لگے کہ واقعی انسانیت کا یہی تقاضا ہے۔ اس کے بعد مرزا غالب نے شاہ صاحب سے کہا۔
"حضرت! آپ کی موجودگی میں یہ خطا ہوئی ہے آپ اس کے گواہ ہیں کہ میں اس پر نادم ہوں اور مرزا سرور سے معافی مانگے بغیر مجھے چین نہ آئے گا۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ بھی میرے ہمراہ تشریف لے چلیں اور میراگناہ معاف کرائیں۔" چناں چہ شاہ صاحب اور مرزا صاحب چند دوسرے لوگوں کے ساتھ سرور کا پتہ دریافت کرکے ان کی جائے قیام پر پہنچے۔ پہلے معذرت کی کہ آپ مجھ سے ملنے تشریف لائے اور بلا تعارف ہی تشریف لے گئے۔ اطمینان سے باتیں بھی نہ ہوئیں آپ نے مجھے اس لائق بھی نہ سمجھا کہ آپ کی مہمان نوازی کا فرض انجام دے سکتا۔ معانقہ کے بغیر ہی رخصت ہوئے یہ کہاں کی رسم ہے!
اس رسمی گفتگو کے بعد مرزا غالب شاہ صاحب سے مخاطب ہو کر بولے۔ "حضرت فسانہ عجائب کا میں نے کبھی بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا تھا۔ لیکن اس وقت جو اس کتاب کا ذکر آیا تو نکالا اور غور سے پڑھا۔ اس کی خوبی عبارت اور رنگینی کا کیا بیان کروں۔ نہایت فصیح و بلیغ زبان ہے۔ میرے قیاس میں تو ایسی عمدہ نثر نہ پہلے ہوئی نہ شاید آگے ہوگی۔ اور کیوں کر ہو' اس کا مصنف اپنا جواب نہیں رکھتا۔ (سرور کی طرف اشارہ کرکے) آپ سے ملیے۔ آپ ہی وہ بے بدل انشاپرداز اس بے نظیر کتاب کے مصنف ہیں۔" اس کے بعد دیر تک ان کی تعریف اور اپنی خاکساری کی باتیں کرکے مرزا سرور کو مسرور و مطمئن کیا۔ پھر ان کو اپنے گھر کھانے کے لیے مدعو کیا اور شاہ صاحب سے بھی شرکت کے لیے اصرار کیا' بعد ازاں گھر آئے۔
شاہ صاحب نے اس واقعہ کا تذکرہ کرکے فرمایا ہے کہ "مرزا صاحب کا مذہب یہ تھا کہ دل آزاری بڑا گناہ ہے اور واقعی یہ خیال بہت درست ہے۔ رجب علی بیگ سرور کی انشاپردازی کے متعلق غالب کی رائے اس تقریظ میں موجود ہے جو انہوں نے گلزار سرور ترجمہ حدائق العشاق پر لکھی تھی اور عودہندی اور اردوئے معلی دونوں میں موجود ہے۔ فرماتے ہیں:

"ہاں اے صاحبان فہم و ادراک سرور سحربیاں کا اردو کی نثر میں کیا پایہ ہے اور اس بزرگوار کا کلام شاہد معنی کے واسطے کیسا گراں بہا پیرایہ ہے۔

رزم کی داستان گر سنیے ہے زباں ایک تیغ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجیے ہے قلم ایک ابر گوہر بار

شاہ صاحب کو مرزا غالب سے خاص ربط و انس ہوگیا تھا۔ تذکرہ خوغیہ میں غالب کے بہت سے اشعار بھی ملتے ہیں۔

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے
نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

شاہ صاحب کا بیان ہے کہ پہلی ملاقات کے دن سے مرزا غالب نے دستور کر لیا کہ تیسرے دن زینت المساجد(۱) میں ہم سے ملنے آتے اور ایک خوان کھانے کا ساتھ لاتے۔ ہرچند ہم نے عذر کیا کہ یہ تکلف نہ کیجئے مگر وہ کب مانتے تھے ہم نے ساتھ کھانے کے لیے کہا تو کہنے لگے کہ میں اس قابل نہیں ہوں' بے خوار' روسیاہ گنہگار مجھ کو آپ کے ساتھ کھاتے ہوئے شرم آتی ہے البتہ اولش کا مضائقہ نہیں۔ ہم نے بہت اصرار کیا تو ایک تشتری میں لے کر کھایا ان کے مزاج میں کمال کی کسر نفسی اور فروتنی تھی۔"

دہلی کی ایک مسجد جو دریا گنج میں واقع دور مغلیہ کی یادگار ہے۔ شاہ صاحب قیام دہلی میں وہیں مقیم تھے۔

شاہ صاحب نے ایک دن مرزا غالب سے پوچھا کہ آپ کو کسی سے محبت بھی ہے؟ کہا "ہاں حضرت علی مرتضیٰؓ سے" پھر ہم سے پوچھا کہ "آپ کو؟" ہم نے کہا کہ واہ صاحب آپ تو معقل پچھ ہو کر علی مرتضیٰؓ کی محبت کا دم بھریں۔ ہم اُن کی اولاد کہلائیں اور محبت نہ رکھیں۔ کیا یہ بات آپ کے قیاس میں آ سکتی ہے؟ شاہ صاحبؒ نے جب مرزا غالب کی وفات کی خبر سنی تو فرمایا:

"انا للہ و انا الیہ رجعون۔" نہایت خوب آدمی تھے' عجز و انکسار بہت تھا۔ فقیر دوست بدرجہ' غایت اور خلیق ازحد تھے ایک روز ہم ان کے پاس گئے تو انہوں نے اپنے قطعے پڑھے تھے۔ رند مشرب' بے شرر' رحم دل تھے اور فن شاعری میں تو اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ لیکن افسوس ہے ہمارے محب بھی چل بسے۔"

مرزا غالب کے بارے میں حضرت شاہ صاحب کے تاثرات پڑھ کر یقین پیدا ہوتا ہے کہ مرزا صاحب صحیح معنوں میں راست گفتار' نیک دل' صاحب خیر و ایثار' پیکر اخلاق و مروت اور انسانیت کے سچے ہمدرد تھے' مرزا صاحب کا مذہب و مسلک انسان دوستی' صلح جوئی اور عدل و انصاف پرستی کے ساتھ حق و صداقت کی پرستاری تھا۔ مصدق

مباش در پے آزار و ہر چہ خواہی کن
کہ در طریقت ما غیر ازیں گنا ہے نیست

مثنوی "ابر گہربار" کی مناجات میں غالب نے جناب باری سے مخاطب ہو کر اپنے دینی عقائد اور دلی کیفیات کا پورے خلوص و دیانت سے اظہار کیا ہے۔

ہما ناتوانی کہ کا فرنیم پرستار خورشید و آذر نیم

نہ کشتم کسے را بہ اہر یمنی — نہ بردم ز کس مایہ در رہزنی
من اندو ہگیں وے اندہ ربائے — چہ می کردم اے بندہ پرور خدائے
حساب مے و رامش و رنگ و بو — زجمشید و بہرام و پر و یز جو
کہ از بادہ تا چہرہ افر و ختند — دل دشمن و چشم بد سوختند
نہ از من کہ از تاب مے گاہ گاہ — بہ در یوزہ رخ کردہ باشم سیاہ

نہ گیتی درم بے نوا داشتی — دلم را اسیر ہوا داشتی
نہ بخشندہ شاہے کہ بارم دہد — بہ ہر بار زر پیل بارم دہد
کہ چوں پیل زا نجا بر انگیزمے — زرش برگدایاں فرو ریزمے

کہتے ہیں:

"تو خوب واقف ہے کہ میں کافر نہیں ہوں' میں نہ خورشید کا پرستار ہوں' نہ آذر بت پرست ہوں' میں نے کسی کا خون نہیں بہایا۔ کسی کو لوٹا نہیں۔ ہاں میں نے شراب ضرور پی ہے۔ میں غموں کا مارا ہوا شراب کے سوا رنج و غم سے نجات پانے کا اور کیا ذریعہ اختیار کرتا۔ بارالہ! گرمے نوشی کا مجھ سے حساب لینا ہے تو جمشید بہرام اور پرویز جیسے بادشاہوں سے لے۔ جنہوں نے عیش و نشاط کی خاطر شراب سے اپنے چہرے روشن کیے ہیں نہ کہ مجھ سے کہ جس نے بھیک مانگ کر روسیاہی حاصل کی۔

"اگر دنیا میں مجھے دولت کی خواہش ہوئی بھی تو اپنی ذات کے لیے نہیں۔ اپنے عیش و آرام کی خاطر نہیں۔ بلکہ اس لیے کہ بادشاہ باریابی بخشے' ہر بار ہاتھی پر لاد کر زر و جواہر عطا کرے اور جب یہ ہاتھی دولت کے انبار لے کر باہر نکلیں تو فقیروں اور حاجت مندوں پر زر و جواہر نچھاور کرتے جائیں۔"

یہ ہے غالب کی سیرت و کردار کا پاک و صاف آئینہ۔ جس میں اس جیالے فن کار کے کمالات کی عظمت کے علاوہ ان کی حیات سادہ کے تیکھے نقش و نگار نکھرے ابھرے نظر آتے ہیں۔

وفات اور مقبرہ

مرزا غالب کی موت بھی ایک مرد مومن کی موت تھی۔ یوں تو کئی برس پہلے سے مرگ ناگہاں کے منتظر تھے۔

بقول خود۔

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام — ایک مرگ ناگہانی اور ہے

دوستوں کو خطوں میں برابر لکھتے تھے کہ میں اب قریب مرگ ہوں غذا بالکل مفقود اور امراض مستولی' تمتر

برس کی عمر' انا للہ و انا الیہ راجعون۔

دم واپسیں بر سر راہ ہے عزیزو بس اللہ ہی اللہ ہے

یہ وہ زمانہ تھا کہ اٹھتے بیٹھتے ان کے دل سے وہی خیالات و جذبات ادا ہوتے جن کا اظہار مناجات میں کیا ہے۔ وفات سے تقریباً" دس مہینے پہلے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"خرف ہوں۔ پوچ ہوں' عاصی ہوں' فاسق ہوں' روسیاہ ہوں۔

یہ شعر میر تقی کا میرے حسب حال ہے۔

مشہور ہیں عالم میں مگر ہیں بھی کہیں ہم
القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

پیرانہ سالی کے علاوہ شدائد امراض نے ضعف و نقاہت کی حد باقی نہ رکھی تھی۔ غشی کے دورے پڑنے لگے تھے۔ لکھنے پڑھنے سے بھی معذور ہو گئے تھے بصارت و سماعت دونوں زائل تھیں۔ مرنے سے ایک روز پہلے مولانا حالی عیادت کو گئے۔ مرزا صاحب کو بے ہوش پایا۔ کچھ دیر بعد ہوش میں آئے۔ حواس بجا ہوئے۔ نواب علاء الدین خاں کے خط کا جواب لکھوایا۔ اور اپنا حال یوں بیان کیا "میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا!" اور مسکراتے ہوئے اپنا ہی شعر پڑھا جسے ان دنوں اکثر پڑھا کرتے تھے

دم واپسیں برسر راہ ہے عزیزو بس اللہ ہی اللہ ہے

یہ یکشنبہ کا روز ۱۴ فروری ۱۸۶۹ء تاریخ تھی ضعیفی کے سوا بہ ظاہر کوئی بیماری لاحق نہ ہوئی تھی دوسرے روز ۱۵ فروری دو شنبہ کے روز دیوان خانے میں معمول کے مطابق آرام کر رہے تھے۔ اتفاق سے اس وقت ان کے پاس اور کوئی شخص موجود نہ تھا۔ اسی عالم میں بے ہوشی کا دورہ پڑا۔ کلو داروغہ نے آ کر دیکھا۔ ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگا۔ ہوش نہ آیا۔ وہ گھبرایا ہوا زنانخانہ پر پہنچا اور دوا (بوڑھی ملازمہ) کو بلا کر بیگم کو اطلاع دی بیگم بدحواس ہو گئیں اور داروغہ سے کہا کہ "دوڑ کے جا بڑے حکیم صاحب (حکیم محمود خاں) کو بلا لا" اتنے میں حکیم محمود خاں' حکیم غلام مرتضیٰ خاں اور حکیم احسن اللہ خاں وہاں پہنچ گئے اور ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگے۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی بیگم زنان خانے میں چوکی پر بیٹھی قرآن پاک کی آیات پڑھ پڑھ کر دعائیں مانگ رہی تھیں کہ "اللہ پاک تو انہیں جیتا رکھ" اور کلو داروغہ کو بار بار دیوان خانے میں بھیج کر گھڑی گھڑی کی خبر منگا رہی تھیں۔ آخر خبر دیں کر اشکبار نظر آنے لگیں۔ سب عزیز و اقارب دوست احباب جمع ہو گئے۔ ذرا دیر میں یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ جس نے سنا افسوس کیا۔ عوام و خواص جنازے میں شریک ہوئے۔ شیعہ حضرات مرزا صاحب کے میت کے مراسم اپنے طور پر ادا کرنے کے خواہش مند تھے مگر ضیاء الدین احمد خاں نے تمام رسمیں اہل سنت و الجماعت کے طریق پر ادا کیں۔ حضرت نظام الدین اولیا قدس سرہ کی درگاہ کے قریب چونسٹھ کھمبہ کے سامنے دفن کیے گئے۔ مرزا کی لوح سنگ مرمر کی ہے جس پر تاریخ وفات کا ایک شعر۔

رشک عرفی و فخر طالب مرد

اسد اللہ خاں غالب مرد

کندہ ہے اس کے علاوہ ان کے شاگرد میر مہدی مجروح کا کہا ہوا ایک قطعہ بھی ہے۔

کل میں غم و اندوہ میں باخاطر محزوں
تھا تربت استاد پہ بیٹھا ہوا غم ناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کے مجروح
ہاتف نے کہا "گنج معانی ہے تہ خاک

جس احاطے میں مرزا غالب کا مزار ہے وہاں تیئس قبریں اور بھی تھیں جن میں خاندان کے عزیز و اقارب دفن تھے۔ یہی نواب الٰہی بخش خاں معروف، بیگم غالب (امراؤ بیگم)، مرزا علی بخش خاں رنجور، زین العابدین خاں عارف اور مرزا باقر علی خاں کامل کے مدفن بھی ہیں۔ ابتدا میں اس احاطے کے چاروں طرف دیوار تھی اور یہ تمام قبور مرقد غالب کے ارد گرد تھیں۔ لیکن کئی سال ہوئے مزار غالب کی نئی تعمیر ہو چکی ہے اور ان کی قبر سنگ مرمر کے خوش نما حجرے میں ہے۔ پرانی قبروں میں سے کچھ صاف کر دی گئیں اور احاطے کو توڑ کر اس کے ارد گرد کے کھنڈر اور قطعہ زمین کو مسطح و ہموار کر کے ایک جلسہ گاہ بنادی گئی ہے جس کا فرش بھی سنگ مرمر کا ہے۔

ہمدرد، غالب اور میموریل

غالب کے مزار کی جو عمارت اب نظر آتی ہے اس کی بنیاد رئیس الاحرار مولانا محمد علیؒ نے ڈالی تھی اور سنگ مرمر کی لوح کی درستی بھی انہیں کی تحریک سے ہوئی۔ بعد ازاں دہلی کے چند علم دوست و ادب نواز حضرات نے غالب اکیڈمی کی بنیاد رکھی۔ جس کا مقصد مزار کی شایان شان تعمیر، غالب میموریل ہال میوزیم اور کتاب خانہ وغیرہ کی تکمیل و تشکیل تھا۔ ان میں نمایاں محرک و مہتمم حضرت خواجہ حسن نظامیؒ اور ہمدرد دواخانہ (دہلی) کے حکیم حاجی عبدالحمید صاحب محترم تھے۔ زمین حکیم عبدالحمید صاحب کی ملکیت تھی جسے غالب اکیڈمی کے نام منتقل کر دیا گیا اور حکیم صاحب نے یہ قطعہ زمین اکیڈمی کو دے دیا۔

حکیم صاحب ہی کی تحریک پر حکیم محمد احمد خاں مرحوم نے ایک اور قطعہ اراضی بیگم حکیم محمد واصل خاں مرحوم سے دلوا دیا تھا۔ اور اکیڈمی کے زیر اہتمام حکیم عبدالحمید صاحب کی مساعی سے مرمت اور تعمیر کا ابتدائی کام شروع ہو چکا تھا۔ اسی بنیاد پر بعد میں بھارتی حکومت نے تکمیل کا ذمہ لیا اور موجود عمارات تعمیر کرائیں جہاں ۱۵ فروری کو ہر سال غالب کی برسی کے موقع پر تقریبی جلسہ اور مشاعرہ منعقد کیا جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پورے سو سال سے وہ شاعر باکمال و ناثر بے مثال ابدی آرام میں مصروف ہے جس نے اگر ایک طرف اپنے فضل و کمال کی بدولت زندگی جاوید پائی تو دوسری طرف اپنے معتقدات و حسن اخلاق کے طفیل حیات دوام حاصل کی۔ اسی نسبت سے سلطان المشائخ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی قدس سرہ کے قدموں میں جگہ پائی، کیوں کہ اس کا عقیدہ تھا کہ

"یہاں لاموجود الا اللہ کے بادۂ ناب کا رطل گراں چڑھائے ہوئے اور کفر و اسلام اور نور و نار کو مٹائے ہوئے بیٹھے ہیں

کجا غیر و کو غیر کو نقش غیر سوئے اللہ واللہ باقی الوجود

نجات کا طالب

مرزا غالب چوں کہ تصوف سے خاص مناسبت رکھتے تھے اور وحدت الوجود کے قائل تھے' انہوں نے وعوائے اتقاکیانہ برائیوں پر پردہ ڈالا۔ اپنی شفاعت کا وسیلہ حق و صداقت کی بدولت یوں تلاش کیا:

"اباحت و رندقہ کو مردود' شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہو گا بلکہ میں دوزخ کا ایندھن بنوں گا اور دوزخ کی آگ تیز کر دوں گا تاکہ مشرکین و منکرین نبوت مصطفویؐ و امامت مرتضویؑ اس میں جلیں۔"

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

(غالب)

سید مسعود حسن رضوی

غالب کے انتقال پر پہلا مضمون

منشی بالگوبند ماتھر نے آگرہ سے ایک ماہوار رسالہ "ذخیرہ بالگوبند" کے نام سے 1868ء کی ابتداء میں جاری کیا۔ منشی صاحب دہلی گزٹ پریس، آگرہ کے دفتر میں کلرک تھے۔ خود ان کا بھی ایک مطبع تھا' آگرہ اردو' اخبار پریس' اور اس کے مہتمم! پرنٹر اور پبلشر وہ خود ہی تھے۔ یہ مطبع آگرہ کے محلے چیپل منڈوی میں واقع تھا۔ "ذخیرہ بالگوبند" اسی مطبع میں بہت بڑی تقطیع کے 48 صفحوں میں چھپتا تھا۔ اس کا چندہ سالانہ چھ روپے اور محصول ڈاک بارہ آنے تھا۔ اس رسالے کے تیئیس پرچے میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔ ان میں سے پہلا پرچہ مارچ 1868ء کا اور آخری دسمبر 1870ء کا ہے۔ رسالے کے مضامین کی نوعیت کا اندازہ سرورق کی حسب ذیل عبارت سے کیا جا سکتا ہے:

> "ذخیرۂ بالگوبند مشتمل برجمیع علوم و فنون و تحقیقات ہر قسم ورائے و تقاریر و معرفت الٰہی و عجائبات روزگار و حالات دلچسپ و قصص رنگین و لطائف و ظرائف و مراسلات وغزلیات شعرائے حال مع نقشہ جات و تصاویر۔"

اس رسالے کے مارچ 1869ء کے پرچے میں مرزا غالب کے متعلق ایک مضمون شائع ہوا۔ جس کا عنوان ہے "مرزا اسداللہ خاں متوفی المتخلص بہ غالب و نوشہ" غالب کی وفات 15 فروری 1869ء کو واقع ہوئی۔ اس سانحے کے صرف چند روز بعد یہ مضمون لکھا گیا اور غالباً" مرزا غالب کے حالات میں یہ پہلا مضمون تھا جو کسی رسالے میں شائع ہوا۔

یہ شخص شہر دہلی میں ایک بڑا نامی گرامی شاعر فارسی کا تھا۔ اگرچہ اشعار اردو بھی اس کے بہت ہیں مگر زیادہ تر شہرت فارسی میں حاصل تھی۔ ممالک مغربی و شمالی ہند کے پڑھے لکھوں میں کم شخص ہوں گے جنھوں نے اس کے شعر اردو و فارسی پڑھے یا سنے نہ ہوں گے۔ کلام میں تخلص اپنا اس نے کہیں غالب اور کہیں نوشہ لکھا ہے۔ اگرچہ نام اسد اللہ خاں تھا مگر دہلی اور دیگر اضلاع میں عموماً" لوگ مرزا نوشہ کہا کرتے تھے۔

اس کی تحریرات سے واضح ہوتا ہے کہ سلسلہ اس کے خاندان کا افراسیاب بادشاہ ترکستان سے مسلسل تھا۔ ابتداء میں اس نے اور اس کے بزرگوں نے جو دولت ملکیت اور اختیارات پائے یہ فن سپہ گری و جوہر شمشیر پائے۔ علم فارسی اس نے بامید روزگار تحصیل نہیں کیا تھا۔ اپنے دلی ذوق سے سیکھا تھا۔ موزونی طبع کے باعث

طبیعت شاعری کی طرف مائل تھی۔ علاوہ ناظم ہونے کے ناثر بھی تھا۔ نثر میں سات کتابیں اس کی تصنیف و تالیف کی ہوئیں زیادہ معروف ہیں اور بہت سی چھپ بھی گئی ہیں۔ نام اور مطالب ان کے یہ ہیں یعنی۔

1- **دیوان فارسی**: اس میں تخمیناً" دس ہزار شعر ہیں۔

2- **دیوان ریختہ**: یہ دیوان اردو' نہایت مختصر ہے۔

3- **مہر نیمروز**: یہ تاریخ خاندان تیموریہ کی نثر میں ابتدائے زمانہ ہمایوں شاہ سے تابہ عہد بہادر شاہ خارج شدہ بادشاہ دہلی تخلص ظفر ہے۔

4- **دستنبو**: اس میں ایام غدر 1857ء کی تباہی اور بربادی اپنی کا حال نثر میں قلم بند کیا ہے اور عبارت میں کوئی لفظ عربی کا نہیں لایا ہے۔

5- **پنج آہنگ**: اس کتاب میں اپنے خطوط' دیباچے' خاتمے کتب کے' اصطلاحی محاورے' قواعد فارسی' الفاظ اور مصادر درج کیے ہیں۔

6- **اردوئے معلیٰ**: اس صحیفے میں اکمل المطابع واقع دہلی کے مہتمم نے اردو زبان کے رقعات ان کے جمع کر کے یہ نام رکھا ہے اور انہیں کے یہاں شاید چھپ بھی رہے ہیں۔

7- **قاطع برہان**: یہ تبدیلی' درفش کاویانی۔ اس میں برہان قاطع مشہور کتاب لغت کے مولف کی غلطیاں ظاہر کی ہیں۔ لکھا ہے کہ سوائے ان کتابوں کے اور بھی چھوٹی چھوٹی مثنویاں اور رسالے اس کے موجود ہیں مگر اس قدر مشہور نہیں ہیں اور نہ ہنوز معرض طبع میں آئے ہیں۔

ایک عرصہ ہوا جب یہ نامی شاعر زیور اسلام اتار کر حلیہ فری میسن سے آراستہ ہوا تھا۔ ہرچند اس کے احباب نے حال اس مذہب کا اختیار کا اور کیفیت فری میسن ہوس کی دھوکہ دے دے کر بھی دریافت کی پر اس نے ایک کلمہ بھی اپنی زبان سے نہ نکالا۔ یہی کہے گا کہ کچھ نہ پوچھو (یہ کرامت اور وصف اس مذہب کا خاص مشہور ہے) مے پرستی کا ایام شباب سے تابہ عالم پیری شوق تھا۔ جس وقت عالم سرور اور دن ابر کا ہوتا' ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلتی ہوتی۔ روش باغ میں سیر چمن و گلگشت گلشن کرتا ہوتا تھا۔ اس وقت طبیعت بر حتبائے دلکش و گلہائے رنگیں کو خیابانوں میں تراوت بخش دلہا دیکھ کر لہرایا کرتی تھی۔ بعد وفات مرزا ذوق' نامی گرامی شاعر اردو 'ملک الشعراء' خطاب' استاد بہادر شاہ کے یہی مورد عنایات سلطانی رہا کرتا تھا اور غزل بھی اس کی دیکھا کرتا تھا۔

اخیر میں ان دنوں کہ زمانے میں طفیل سرکار دولت مدار انگلشیہ کے علم و ہنر کی ترقی اور رواج بہت ہے تو اکثروں نے واقف ہو کر ان کے نظم و نثر کالموں پر بہتیرے اعتراض کیے۔ وہ اخباروں میں شائع ہوئے تھے۔ جوابات بھی ان کے اسداللہ خاں کی طرف سے اکثر درج کیے جاتے تھے۔ بہت سے قیل و قال ہوتے تھے۔ ان میں بڑا عذر اس شخص کا یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ میں نہایت ضعیف ہو گیا ہوں' حواس باختہ اور خاطر پریشان رہتی ہے'

بدن میں ضعف ضعیفی غالب ہے' سماعت سے عاری ہوں' ہاتھ پاؤں کام کم کرتے ہیں' آدمی کی صورت نہیں پہچانتا' آواز کم سنائی دیتی ہے' جو کوئی بروقت ملاقات بات کیا چاہتا ہے لکھ کر دیتا ہے اور اس کا جواب تحریری لیتا ہے' کاغذ قلم دوات چاقو قلم دان بستہ ہر وقت پیش نظر رہتے ہیں' خورد نوش کے ہضم کی قوت نہیں' زندگی کا لطف نہ رہا' موت نزدیک معلوم ہوتی ہے' اگر چند روز مر مر کے جئے' تو کیا جئے اب قابل معافی ہیں۔ اور واقع میں یہ جواب اس کا معقول تھا۔

کہتے ہیں کہ آدمی اچھا' خوش مزاج' یارباش' خوش وضع' خوش انداز' جلیل القدر' حسب و نسب میں اعلیٰ' ملکوں میں نام ور اور شاعر اور منشی قابل تعریف تھا۔ دم اس کا بھی غنیمت تھا۔ 1212ھ میں پیدا ہوا اور 1285ھ میں 73 برس کی عمر پا کر روضہ رضواں میں جاگزیں ہوا۔ جس نے سنا اس کے مرنے کا افسوس کیا۔ لیکن جب تک اس کا کلام' جو اس نے اپنے پیچھے چھوڑا ہے' روئے زمین پر قائم رہے گا' وہ زندہ تصور کیا جائے گا اور نام اس کا یادگار رہے گا۔ اب ہماری بھی یہی دعا ہے کہ غفور الرحیم اس کی مغفرت کرے۔

نادم سیتاپوری

غالب کی آخری آرام گاہ
(ایک تاریخی جائزہ)

غالب کے اکثر و بیشتر اعزہ اگرچہ فرقۂ اہل سنت سے تعلق رکھتے تھے لیکن خود غالب بالاعلان "شیعہ اثنا عشری" تھے اور اس زمانے میں شیعہ سنی قرابتوں کا عام رواج تھا بھی۔ کہیں کہیں تو ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ سگے بھائی بہن اس عظیم خونی رشتے کے باوجود علیحدہ علیحدہ راستوں پر ہو رہے؟ ایک سنی دوسرا شیعہ! غالب کے حقیقی بھائیوں میں مرزا عباس بیگ (۱) اپنے ماموں کے مسلک پر تھے۔ بقیہ دو بھائی مرزا عاشور بیگ اور مرزا مغل سنی تھے۔

غالب کے عقیدے اور مسلک کی بحث ایک زمانے میں اس موڑ پر پہنچ چکی تھی کہ ان کے بعض شاگردوں نے انہیں لامذہب ہی قرار دے دیا۔ چنانچہ ذکی مارہروی تلمیذ غالب (۱۸۳۷ء - ۱۹۳۰ء) سے ایک روایت مائل سندیلوی نے نقل کی ہے :

> "حضرت مرزا صاحب کے متعلق جو یہ مشہور ہے کہ ان کی شاعری کو پر پرواز لگا دیئے تھے بالکل غلط ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اسی خانہ خراب نے انہیں کہیں کا نہ رکھا تھا۔ مرزا صاحب نہایت وجیہہ تھے۔ خدا نے دل و دماغ بے مثل دیا تھا۔ مگر اس کم بخت شغل نے نہ صرف ان کی جسمانی صحت ہی کو تباہ کیا بلکہ دماغ پر بھی بہت خراب اثر ڈالا۔ جو جیسا کہہ دیتا تھا اس پر عمل کرنے لگتے تھے۔ مذہب کے معاملے میں بھی یہی حال تھا اور آخر میں فرامیسن (Frameson) ہو گئے تھے۔"

(صفحہ ۹، ماہنامہ زمانہ کان پور جنوری ۱۹۳۹ء جلد ۹۲ شمارہ نمبر۱)

مذہب کے بارے میں اقرار باللسان کے باوجود غلط فہمیوں کی فضا قائم کرنے کی مذہبی بے عملی کو زیادہ دخل رہا ہے۔ تمام عمر کسی نے ان کو نہ روزہ رکھتے دیکھا' نہ نماز پڑھتے۔ پھر جام شراب کا دور دورہ۔ مذہب اور عقیدے کی بنیاد قائم کی جاتی تو کیونکر؟ یہی وجہ تھی کہ ان کی آنکھ بند ہوئی تو نہ ان کے "اقرار باللسان" کو کوئی اہمیت دی گئی نہ اس وصف کو تسلیم کیا گیا جو انہوں نے نواب مرزا دہلوی سے کی تھی۔ نواب سید محسن مرزا دہلوی (پرنسپل گورنمنٹ کالج کیمبل پور) کا بیان ہے :

"دوسرے واقعے کا تعلق مرزا اسد اللہ غالب کی تجہیز و تکفین سے ہے۔ غالب نے میرے جد امجد (۲) اور نواب سید نواب مرزا نبیرہ نواب عطاء اللہ خاں "چہل مجلس" سے بتاکید کہا تھا کہ میرے انتقال کی خبر سنتے ہی تم دونوں آ جانا اور میری تجہیز و تکفین کرنا۔ چنانچہ جب مرزا صاحب کا انتقال ہوا تو یہ دونوں نواب ضیاء الدین خاں مرحوم کی خدمت میں جو غالب کے قریبی عزیز تھے فوراً آ گئے اور ان سے مرزا صاحب کی وصیت کا ذکر کیا۔ نواب صاحب و ضیاء الدین احمد خاں) نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا' بھئی مرزا صاحب کی وصیت کا کیا کہنا! تجہیز و تکفین کے بارے میں مجھے ایک دفعہ کی وہ عجیب بات یاد ہے۔ پھر حسب ذیل واقعہ سنایا :

"مرزا صاحب ایک روز میرے بالا خانے پر تشریف فرما تھے۔ میں پاس بیٹھا ہوا تھا کہ نیچے بازار میں کچھ ہندو ایک بوڑھے کی میت کو گاتے بجاتے لیے جاتے ہوئے نظر آئے۔ مرزا صاحب نے کہا' دیکھو کیا اچھی طرح لے جا رہے ہیں؟ جب میں مر جاؤں تو میرا جنازہ اسی طرح اٹھائیو۔ میرے جد امجد اور نواب سید نواب مرزا نے کہا کہ ہم نے اپنے فرائض ادا کیے۔ اب آپ کو اختیار ہے۔ مرزا صاحب کی تجہیز و تکفین نواب ضیاء الدین خان نے کرائی۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں بجائے شیعوں کے قبرستان کے جو درگاہ شاہ مردان (نئی دہلی) میں ہے اور درگاہ نظام الدین سلطان جی کے قریب دفن کیا گیا۔

(ہفت روزہ "سرفراز" لکھنؤ۔ ۹ جنوری ۱۹۷۶ء جلد ۳ شمارہ ۲۳)

نواب محسن مرزا کے اس قول کی تائید جناب مالک رام کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے :

"جنازے کی نماز دلی دروازے کے باہر ہوئی۔ بعض شیعہ حضرات نے کہا کہ مرحوم (غالب) شیعہ تھا اس لیے ہمیں اپنے مسلک کے مطابق ان کی تجہیز و تکفین کی اجازت دی جائے لیکن نواب ضیاء الدین احمد خاں اور حکیم محمود خان نہیں مانتے' دونوں صاحبوں کا دلی میں بہت اثر و رسوخ تھا' خصوصاً حکیم محمود خاں کا۔

اگرچہ مرزا غالب کی شیعیت اور اثنا عشریت کسی سے مخفی نہ تھی لیکن کوئی ان دونوں کے سامنے دم نہ مار سکا۔ اور تمام رسوم اہل سنت ہی کے فریضے پر ادا ہوئیں۔ سلطان جی (نظام الدین) میں "چونسٹھ کھمبا" کے متصل خاندان لوہارو کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ یہاں اس خاندان کے اور افراد بھی محو خواب ہیں۔

مرزا حیرت نے لکھا ہے کہ (اس احاطہ کی پختہ چار دیواری مرزا غالب کے کسی ہندو شاگرد

نے بنوائی تھی (صفحہ ۳۱، چراغ دہلی) میں اس بیان کی تصدیق کہیں سے نہ کر سکا، نہ مجھے ان ہندو شاگرد کا نام ہی معلوم ہوا۔

(صفحہ ۱۶۶ - ۱۶۷ ذکر غالب چوتھا ایڈیشن)

کوئی تیس برس ہوئے جب پہلی بار میں غالب کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے گیا تو نہایت ہی شکستہ اور بے مرمت حالت نظر آئی۔ ایسی حسرت اور ویرانی برس رہی تھی کہ بیان نہیں کر سکتا۔ چار دیواری بھی کہیں کہیں سے ٹوٹی ہوئی تھی اور پختہ قبر تو گویا اینٹوں کا ایک ڈھیر بن کر رہ گئی تھی۔ پھر "نے چراغے نہ گلے" کا منظر! اس سے بھی زیادہ حسرت آگیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ہفتوں سے جھاڑو بھی نہیں دی گئی۔ فاتحہ خوانی کے بعد جب خواجہ حسن نظامی مرحوم سے ملنے گیا تو میں نے اس کا بھی ذکر کیا۔ خواجہ صاحب اہل علم و ادب کی اس تغافل شعاری سے خود دل برداشتہ تھے۔ کہنے لگے، بھئی تھوڑا بہت جو میں کر سکتا ہوں کرتا رہتا ہوں۔ برسوں سے کوشش کر رہا ہوں کہ مرزا کا مقبرہ ان کی شایان شان بن جائے مگر میری ہر تحریک ناکام ہی رہی اور مجھی پر کیا موقوف، دلی میں کون ایسا ہے جو یہ نہ چاہتا کہ مرزا کی یادگار رہتی دنیا تک قائم و دائم رہے۔ لیکن میدان عمل میں کوئی بھی نظر نہیں آتا۔ حکیم اجمل خاں اور مولانا محمد علی نے کیا کچھ نہیں کیا۔ نتیجہ سامنے ہے؟

پھر ۱۹۵۰ء میں جب مستقلاً جامعہ نگر (دہلی) میں قیام کا موقع ملا تو "بستی نظام الدین" راستے ہی میں پڑتی تھی) اکثر فاتحہ خوانی کے لیے جاتا رہا لیکن یہ زمانہ اس "شام قیامت" کی سحر تھا جب دلی انقلاب ۱۹۴۷ء کا کفارہ ادا کر کے تھکن سے چور چور تھی۔ زندوں کو خود اپنا ہوش نہ تھا، مردوں سے کون پوچھتا؟

جس طرح غالب کو ناقدری فن کے ایک طویل صبر آزما دور سے دوچار ہونا پڑا۔ اس طرح ان کی خاک لحد بھی بہت دنوں تک ریگ صحرا کی طرح مختلف تعمیری تحریکوں کے گرد چکر کاٹتی رہی۔ اس صدی کے آغاز میں جب غالب کی "عظمت فن" نے حیات ثانیہ پائی تو لوگوں کو اس کی بھی فکر ہوئی کہ ان کے شکستہ مزار کی بھی مرمت کرا دی جائے۔ یوں تو اس زمانے میں مشاہیر دہلی کی قبور و مزارات کے تحفظ کی ایک خاص تحریک چل رہی تھی اور مولانا محمد علی کے "ہمدرد" کا ابتدائی دور اس تحریک کا سب سے بڑا ترجمان سمجھا جاتا تھا لیکن "مزار غالب" کی حسرت ناک شکستہ حالی کی طرف سب سے پہلے جس نے توجہ دلائی وہ ایک "انگریز ڈاکٹر" تھا۔ اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں مشاہیر اردو کی یادگاروں کے تحفظ کی جو تحریک ۱۹۱۲ء - ۱۹۱۳ء میں شروع کی گئی تھی، اس کا ابتدائی تصور ڈاکٹر جے مورٹن (Dr. J. Mortan) کا یہی مراسلہ تھا جو "ڈیلی پائنیر (Ponior Daily) الہ آباد میں چھپا تھا۔

ڈاکٹر جے مورٹن کون تھے؟ اس کا جواب میری "کم آگاہی" نہیں دے سکی۔ اور نہ "پائنیر" کے پرانے فائل کہیں دستیاب ہوئے جو اس سلسلہ مراسلت کی تکمیل کی جاتی! مجھے ڈاکٹر جے مورٹن کے صرف ایک خط کا

اردو ترجمہ ماہنامہ "معیار" لکھنؤ مئی ۱۹۱۱ء جلد ۵' شمارہ ۵) میں دستیاب ہوا ہے جس پر ایڈیٹر "معیار" کا ایک ادارتی نوٹ بھی ہے :

"ذیل کے دونوں مضمون قبر حضرت غالب علیہ الرحمہ پر تی الحال "پانیئر" (الہ آباد) میں یکے بعد دیگرے شائع ہوئے۔ از بسکہ ان مضامین سے خاص تعلق تھا لہٰذا مضامین مذکور کا سلسلہ وار ترجمہ ہدیہ ناظرین اس غرض سے کیا جاتا ہے کہ دیکھنے کی بات ہے۔ پہلا مضمون ایک "یورپین" نے لکھا ہے اور کیا لکھا ہے؟

ماہنامہ معیار لکھنؤ جس نے انگریزی اخبار (ڈیلی پانیئر' الہ آباد) سے ترجمہ کرکے اس مراسلے کو شائع کیا تھا' اس معیار پارٹی کا ترجمان تھا جس کی بنیاد گزشتہ صدی کی آخری دہائی میں لسان القوم صفی لکھنؤی نے "دائرہ ادبیہ" کے نام سے رکھی تھی۔ اس ادارہ کا نصب العین اردو زبان ہی کی اصلاح نہیں تھا بلکہ قدیم طرز فکر میں بھی ایسی اصلاح تھی جو اردو شعرو ادب کے مستقبل کو سنوارنے میں معین کار ہوتا؟

مولانا صفی لکھنؤی کی اس عظیم تحریک نے ایک طرف تو جدید طرز فکر سخن کی نئی راہوں کو راستہ دیا۔ دوسری طرف دلی اور لکھنؤ کے درمیان لسانی و محاوراتی ہنگامہ آرائی ہو رہی تھی۔ اس محاذ کو بھی قریب قریب ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا چنانچہ ماہنامہ "معیار" کے ایڈیٹر حکیم سید علی محسن خاں ابر (عرف ننھے آغا صاحب) اپنے نام کے ساتھ تخریہ مقلد میر غالب لکھا کرتے تھے اور معیار کے ہر سرورق پر غالب کا ایک چھوٹا سا عکسی فوٹو بھی چسپاں کر دیا کرتے تھے۔

غالب کے فن کا اعتراف تو لکھنؤ پہلے ہی کر چکا تھا' لیکن اس کی تصدیق "معیار" ہی نے کی۔ یہاں تک کہ مرزا محمد ہادی رسوا نے قدیم رنگ کو ترک کرکے غالب کے رنگ میں کہنا شروع کیا اور ان کی پیروی ان کے دوسرے معاصرین نے بھی کی۔ پھر مرزا احمد ہادی عزیز لکھنؤی نے اس تحریک کو اتنا جاندار بنا دیا تھا کہ ڈاکٹر اقبال نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انہیں لکھا :

"میں آپ کے کلام کو بہ نظر "استفادہ" دیکھتا ہوں۔"

حکیم سید علی محسن خاں ابر لکھنؤی کی ادارت میں ماہنامہ معیار ۱۸۹۷ء میں لکھنؤ سے جاری ہوا اور غالباً ۱۹۱۵ – ۱۹۱۶ء تک نکلتا رہا۔ منشی سجاد حسین مرحوم (ایڈیٹر' اودھ پنچ) کے "شام اودھ" پریس لکھنؤ میں چھپتا تھا۔ قسم اول کا سالانہ چندہ تین روپیہ' قسم دوم کا دو روپیہ تھا۔ یہ ماہنامہ دراصل ایک گلدستہ شعرو سخن تھا۔ جس میں معیار پارٹی کے شاعروں کی غزلوں کا انتخاب قوافی کی پابندی کے ساتھ شائع ہوا کرتا تھا۔ نثری حصہ برائے نام ہی ہوتا تھا اور بطور ضمیمہ ایک ایسے مشاعرہ کا اعلان بھی ہے جو ۱۹۱۹ء کے شماروں میں ملتا ہے جو غالب کی زمینوں میں شائع ہونے والا تھا۔ لیکن ایسا کوئی ضمیمہ ابھی تک میری نظر سے نہیں گزرا؟

مرزا غالب کے سلسلے میں ڈاکٹر جے مورٹن کا یہ مراسلہ ۱۷ جون ۱۹۱۱ (دو شنبہ) کے "پانیئر" الہ آباد) میں شائع ہوا تھا۔ ان دونوں خطوط پر "جون ۱۹۱۱ء کی تاریخوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماہنامہ "معیار" کا شمارہ ماہ مئی

کافی تاخیر سے نکلا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ جون ۱۹۱۱ء کے آخری ہفتے میں اس کے بعد بھی شائع ہوا ہو؟ اور اس زمانے میں ادبی رسائل کی اشاعت میں اس قسم کی تاخیر کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

ڈاکٹر جے مورٹن اور حامد علی خاں بیرسٹر کے دونوں مراسلے ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

پائنیر - ۷ جون ۱۹۱۱ء

ایک بھولی ہوئی قبر

بخدمت جناب ایڈیٹر صاحب!

جناب من - برائے مہربانی مجھے اس امر کی اجازت دیجئے کہ غالب کی شاعری کے شیدائیوں کی توجہ میں ان کی بھولی ہوئی قبر کی طرف متوجہ کروں۔ یہ قبر "نظام الدین اولیا" دہلی میں واقع ہے۔ چونکہ احاطے کے باہر ہے اس لیے اس کے وجود سے ان واردین کو بھی اطلاع نہیں ہے جو دلچسپی لیتے ہیں۔ پچھلی مرتبہ جو میں گیا تو میرے ساتھ ایک غیر معمولی ہوشیار اور سمجھ دار خادم تھا جو اس قبر کو دکھانے مجھے وہاں لے گیا۔ قبر ایک ٹوٹے پھوٹے احاطے میں واقع ہے جس کی دیوار منہدم ہو گئی ہے اور پتھر کا فرش گرے ہوئے ریزوں میں پوشیدہ ہو گیا ہے۔ سرہانے کا لوح مزار سنگ مرمر کا ہے اور اس پر ایک نظم کندہ ہے۔ مگر اس کے بھی زیر زمین ہو جانے کا خوف ہے۔ ایک ہی دو سال کی بارش میں اندیشہ ہے کہ اس کا نام و نشان بھی باقی نہ رہ جائے اور اس کے ساتھ ہی اردو کی ایک "پر عظمت نشانی" غائب ہو جائے گی۔ اس لیے کیا میں شاعری کے دلدادہ اور غالب کے دم بھرنے والے حضرات سے اس کی التجا کر سکتا ہوں کہ وہ اس تباہی کو روکیں؟ شاعر مورخ اور مصنف جو مشہور ہو جاتے ہیں قوم کے لیے بہت کچھ مایہ ناز ہوتے ہیں۔ ان کی آرام گاہوں کو ایک محبت آمیز طریقے سے محفوظ اور مامون رکھنا چاہیے۔ ان کی قبریں بے بہا باقیات سے ہیں جن سے غفلت کرنے کو آئندہ نسل آسانی سے معاف نہیں کرے گی۔ اس لیے اور خود اپنی قدردانی ظاہر کرنے کو میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ ایک روپیہ کے چندہ کی ابتدا کی جائے اور شایان شان دیرپا یادگار غالب کی قبر پر قائم کی جائے۔ چونکہ غالب مسلمان تھے اس لیے غالباً "مسلم ریویو (لکھنؤ)" کے ایڈیٹر اس فنڈ کے سیکرٹری کا کام خوشی سے انجام دیں۔ میرے خیال میں کل تین چار ہزار روپیہ کی اس فنڈ کے لیے ضرورت ہوگی۔ اسکول کے طالب علم نہایت ہی آسانی سے آپس میں چندہ کر سکتے ہیں اور آنریری سیکرٹری صاحب کی خدمت میں پیش کر سکتے ہیں۔ جو صاحب کہ اس خدمت کو اپنے ہاتھوں میں لیں گے وہ ایک باعزت خدمت کو انجام دیں گے اور عمدہ ادب کے

شائقین کی منت پذیری حاصل کریں گے۔

(جے مورٹن، مسوری - صفحہ ۱۴ - ۱۵، ماہنامہ "معیار" لکھنؤ، مئی ۱۹۱۱ء

کچھ نہ معلوم ہونے کے باوجود ڈاکٹر مورٹن کی اس تحریر سے اتنا تو پتہ چلتا ہے کہ اردو شعر و ادب سے اسے خاص لگاؤ تھا اور غالب کے فن پر گہری نظر بھی تھی۔ ڈاکٹر مورٹن کی یہ اپیل "صدا بصحرا" ثابت نہیں ہوئی۔ اس سلسلے کا ایک مراسلہ "معیار" کے اوراق میں محفوظ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ "مورٹن" کی آواز پر صدائے لبیک بلند کرنے والوں میں حامد علی خاں غالباً پہلے شخص تھے جنھوں نے اس تحریک میں عمل کی روح ڈالنے کی کوشش کی۔

حامد علی خاں بیرسٹر مرحوم گزشتہ صدی کے لکھنؤ میں ایک سراپا انجمن شخصیت کے مالک تھے۔ اس دور کی تمام ادبی اور مجلسی تحریکوں میں ان کا ہاتھ رہا تھا۔ خدائے سخن میر تقی میر کی گمشدہ قبر کی تلاش و جستجو میں انھوں نے ایک خاص رول ادا کیا تھا۔ معیار پارٹی کے ایک خاص رکن تھے اور اپنے عہد کے تمام مشاہیر سے ان کا مساویانہ ربط و ضبط تھا۔ سخن فہم بھی تھے اور سخن سنج بھی۔ قدیم گلدستوں میں کہیں کہیں ان کی ایک آدھ غزل اب بھی نظر آ جاتی ہے۔ ماہنامہ "معیار" کے دوسرے دور کی تزئین و آرائش انہی کی رہن منت ہے۔

روزنامہ پائنیر الہ آباد میں ڈاکٹر مورٹن مراسلہ دیکھنے کے بعد انھوں نے جو مراسلہ لکھا تھا اس کا ترجمہ بھی "معیار" کے اسی شمارے میں پیش کیا گیا ہے جو درج ذیل ہے :

"قبر غالب"

بخدمت جناب ایڈیٹر صاحب!

جناب من - ڈاکٹر جے مورٹن نے آپ کے اخبار کے ذریعہ سے "قبر غالب" کی تباہ حالت کی طرف توجہ دلا کر غالب کی شاعری کے عاشقوں کو ممنون کیا ہے!

بہ لحاظ غالب کے فارسی اور اردو شاعر ہونے کے، نثر نگار اور بذلہ سنج ہونے کے، میں ان کا دلدادہ ہوں۔ میری محبت و شیدائیت کا اندازہ قدرے اس امر سے ہو سکتا ہے کہ میں ان کے ملازم "کلو" سے جس کا ذکر وہ اپنے خطوط میں کرتے ہیں، ملنے کے لیے گیا۔ میں نے غالب کو کبھی نہیں دیکھا۔ جب ان کا انتقال ہوا تو میں بہت کم عمر تھا۔ چند سال ہوئے کہ میں نے ان کی قبر کی زیارت کی تھی۔ دو پتھروں پر تاریخ کندہ ہے۔ ایک خود غالب کی تصنیف ہے، دوسری ان کے مشہور شاگرد مجروح کی، جس کا چوتھا مصرع یہ ہے ۔

ہاتف نے کہا گنج معانی ہے تہ خاک

مجھے ڈاکٹر مورٹن کے خط سے یہ معلوم کر کے صدمہ ہوا کہ اگلی یا دوسری برسات تک قبر

بالکل نیست و نابود ہو جائے گی۔ میں امید کرتا ہوں کہ قبل اس کے کہ آئندہ برسات کا موسم ختم ہو' ولدادگان غالب ان کی قبر پر ایک شایان شان اور قیام پذیر یادگار قائم کر دیں گے۔ اس کے کہنے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں کہ مجھ سے جو خدمت ہو سکے گی' میں بہت خوش ہوں گا۔

حامد علی خاں

لکھنؤ – ۷ جون ۱۹۱۱ء (ماہنامہ "معیار" لکھنؤ) مئی ۱۹۱۱ء

یہ تحریک کس طرح آگے بڑھی؟ اس سلسلے کی درمیانی کڑیاں' میں فراہم نہیں کر سکا لیکن قدیم اخبارات --- رسائل و جرائد سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ مزار غالب کی تعمیری تحریک کئی سال تک سبک خرامی کے ساتھ چلتی رہی اور نصف صدی اُدھر اس تحریک میں اتنی جان پڑ چکی تھی کہ بعض ادبی رسائل نے اس تحریک کو اپنے رسائل کی توسیع اشاعت کا ذریعہ بنا لیا تھا چنانچہ ماہنامہ "نظارہ" میرٹھ بابت ماہ نومبر و دسمبر ۱۹۱۶ء جلد ۳' شمارہ ۵ – ۶) میں پورے ایک صفحہ کا اعلان کیا تھا اور اس اعلان کے ذریعہ "نظارہ" کے خریداروں کو یہ پیش کش کی گئی تھی کہ ان کے سالانہ چندہ سے ایک روپیہ مزار غالب کے تعمیری فنڈ ماہنامہ "نظارہ" میرٹھ براہ راست نہ سہی' بالواسطہ اس عظیم تحریک کا نمائندہ تھا جسے گزشتہ صدی کے آخر میں شارح دیوان غالب مجدد الشہ مشرقیہ مولانا احمد حسن شوکت میرٹھی لے کر اٹھے تھے۔ شوکت میرٹھی اپنے عہد کے ان وقت شناس لوگوں میں تھے جنھوں نے وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے میں کبھی غفلت نہیں برتی۔ اب سے کم و بیش پچھتر سال قبل انھوں نے غالب کی اس مقبولیت کا اندازہ کر لیا تھا جو آج انھیں حاصل ہوئی ہے۔ لیکن اپنی گرمی بازار قائم رکھنے کے لیے انھیں جو راستہ اختیار کرنا پڑا وہ مستحسن نہ سہی پھر بھی ان کے افتاد مزاج کے مطابق ضرور تھا۔ "حل کلیات اردو مرزا غالب دہلوی" کے نام سے ۱۸۹۹ء میں انھوں نے غالب کی جو شرح لکھی تھی وہ کلام غالب میں تحریف و تصرف کا ایک ایسا المیہ ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

یقینی طور پر تو کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن میرا قیاس یہی ہے کہ ماہنامہ نظارہ میرٹھ کی اس "تعمیری تحریک" کو شوکت میرٹھی کی تائید ضرور حاصل ہوئی ہو گی کیونکہ اس کے کاروباری پہلو اسی افتاد مزاج کی عکاسی کرتے ہیں جو شوکت میرٹھی کا خاصہ مزاج تھا۔

ماہنامہ "نظارہ" میرٹھ میں یہ اعلان "اشتہارات" کے ضمن میں کیا گیا ہے جو درج ذیل ہے :

"مزار غالب"

"حضرت غالب دہلوی رحمتہ اللہ علیہ وہ بزرگ عالی مقام ہیں جن کے نام کو ازل ہی میں حیات جاودانی حاصل ہو چکی ہے اور وہ اپنے علمی کارناموں کے باعث آج تک زندہ ہیں۔

لیکن یہ قاعدہ ہے کہ جب ایسے بزرگ دنیا کو چھوڑتے ہیں اور عالم اجسام کو خیر باد کہہ کر عالم ارواح میں اپنی مبارک ہستی کو منتقل کر لیتے ہیں تو دنیا والے ایک ان کی یادگار بنا لیتے ہیں اور اسی کو "مزار" کہا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دہلی کی زلزلہ انگیز زمین نے اپنے خلف افراد اور نامور اراکین کو اس طرح برباد کیا ہے کہ ان کا نشان بھی نہیں ملتا۔ مگر بصیرت کی نظروں سے وہ اسلاف تک اوجھل نہیں اور نہ اوجھل ہونے والے ہیں۔

دنیا کے لیے ضرورت تھی کہ غالب جیسے زبردست شاعر کا سایہ ہی اس کے سر سے نہ اٹھتا مگر جب حوادث نے اس کے خلاف عمل درآمد کیا ہے اور یہ صورت پیش آئی ہے تو آپ ہی فرمائیے "غالب کے مزار" کی کس قدر ضرورت ہے۔ جس معجز بیان نے "ادب اردو" کے قالب میں تازہ روح پھونکی، جس عیسیٰ نفس نے ایشیائی شاعری کو از سر نو زندہ کیا، ہم اس کا مزار بنانے پر بھی قادر نہیں۔

ہزار افسوس ہم پر اور ہماری بے نصیبی پر

ہم اسلاف کے خلف تو ضرور کہلاتے ہیں مگر ان کو اس طرح بھولے ہوئے ہیں کہ گویا نہ وہ ہمارے تھے اور نہ ہم ان کے ہیں۔

اس امر کی تحریک عرصہ سے ہو رہی ہے مگر اب تک عملی کارروائی کچھ بھی نہیں۔ ہماری زندہ دلی تو اس وقت پایہ ثبوت کو پہنچ سکتی ہے کہ ہم غالب کی "مکانی یادگار" قائم کر لیں اور آج ہی سے اس کی بنیاد ڈال دیں۔

ہم بذات خود کسی قابل نہیں تاہم ہر امکانی امداد کے لیے ہمہ تن موجود ہیں۔ اپنی جیب سے "پانچ روپیہ" دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ہمارے معزز امراء اس قلیل رقم کو بڑھاویں گے اور ہماری تحریک کی لاج رکھیں گے۔

بعض اصحاب کے اصرار سے ہم مکرر اعلان کرتے ہیں کہ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۶ء تک "نظارے" کے رجسٹر میں جس قدر خریداروں کا اضافہ ہوگا ہر خریدار کے سالانہ چندہ (۳ روپیہ) میں سے ایک روپیہ اس کار خیر کے لیے وقف کیا جائے گا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حضرت غالب کے معتقد ان کے نام کو زندہ رکھنے والے کیا کرتے ہیں؟ "نظارہ" ہی اپنی خوبیوں کے اعتبار سے تین روپیہ سالانہ چندہ میں مفت برابر ہے لیکن اب ہم "خرما و ہم ثواب" کا حساب (بوسیدہ) علم دوست حضرات اپنی دریا دلی کو کام میں نہ لائیں تو سخت افسوس ہے۔

منیجر "نظارہ" میرٹھ
(ماہنامہ "نظارہ" بابتہ نومبر و دسمبر ۱۹۱۶ء جلد ۳ شمارہ ۵)

مگران تاریخی شواہد کے باوجود مزار غالب کی تحریک کے صحیح خد و خال سامنے نہیں آسکے۔ اور میں اس جستجو میں ناکام رہا کہ آیا اس تحریک کو کسی مرکزی قیادت کی رہنمائی حاصل تھی یا مختلف تحریکیں منتشر حالت میں کام کر رہی تھیں۔ البتہ حامد علی خاں بیرسٹر کے ایک مراسلے سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ اس قسم کی ایک تحریک دلی میں سرگرم کار تھی۔ حامد علی خاں بیرسٹر نے اپنے ۱۲ جنوری ۱۹۱۷ء کے ایک مکتوب میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

"آپ کو معلوم ہوگا کہ حضرت غالب کے مزار کی مرمت کی نسبت پھر تحریک شروع ہوئی ہے۔ ایک کمیٹی بااثر دہلی میں قائم ہوئی ہے۔ مخدومی مکرمی جناب حافظ محمد اجمل خاں صاحب حافظ الملک نے میرے اصرار سے خدمت "خزانچی" قبول فرمائی ہے۔ تخمیناً کل دو ہزار روپیہ کی ضرورت ہے۔ یہ رقم کوئی بڑی رقم نہیں ہے۔ ہزار ہا دلدادہ و قدردان کلام غالب کے ہندوستان میں موجود ہیں۔ ذرا سی توجہ فرمائیں اور جو رقم ان کے امکان میں ہو وہ براہ راست جناب حکیم صاحب موصوف کی خدمت میں بھیج دیں۔ پتہ یہ ہے : "محلہ بلی ماران دہلی" میں نے پچاس روپیہ جناب حکیم صاحب ممدوح کی خدمت میں بھیج دیئے ہیں اور اس امر کا اظہار محض اس وجہ سے کرتا ہوں کہ مجھ کو بعد بھیجنے اپنی رقم کے یہ استحقاق میری رائے میں حاصل ہوا ہے کہ میں ان صاحبوں کی خدمت میں جن کو مرمت "مزار غالب" میں دلچسپی ہو یہ عرض کروں گا کہ اپنی چندہ براہ راست جناب حکیم صاحب ممدوح کی خدمت میں بھیج دیں۔"

حامد علی خاں
محلہ سدو - امروہہ - ضلع مراد آباد
(صفحہ ماہنامہ "معیار" لکھنؤ جنوری ۱۹۱۷ء - جلد ۱ شمارہ ۱)

حامد علی خاں کے اس مراسلے پر ماہنامہ "معیار" کے ایڈیٹر مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی نے ایک تائیدی نوٹ بھی لکھا ہے جو درج ذیل ہے :

"آپ (حامد علی خاں بیرسٹر) نے مرمت "مزار غالب" کے متعلق پھر تحریک کی ہے کہ کیا ہمارے لیے یہ بات افسوس ناک نہیں کہ ایک مدت سے اخبارات و جرائد میں یہ مسئلہ پیش ہے۔ مضمون نگار لکھتے لکھتے عاجز ہو گئے۔ اخبارات اپنے فرائض ادا کر چکے مگر ہنوز روز اول --- سمجھنے والے سمجھے ہوں گے کہ خاک کے ڈھیر کا سنورنا ہی کیا؟ لیکن ان کو معلوم نہیں کہ اگر اس قطعہ زمین کی تشریح کوئی عرش پیما دماغ کرے تو اس کو کیا نظر آئے گا؟ امید ہے کہ ارباب ادب اس کی طرف توجہ فرمائیں گے۔ ہماری قوم میں ایسے افراد

ہیں جو تنہا اس فرض کو ادا کر سکتے ہیں کیوں غالب کی روح کو چندہ سے شرمندہ کریں۔

جو آرائش دنیا سے تم اپنے مکانوں کو
مٹاتے جاؤ لیکن یوں بزرگوں کے نشانوں کو
نگاہ عبرت افزا غیر قوموں کے مقابر پر
پھر اشک خوں بہانا چاہئے اپنے اکابر پر
زمیں میں دفن کر کے جن کو پھر کروٹ نہ لی تم نے
خدا معلوم انہیں کیونکر نہیں مٹی بھی دی تم نے
نہیں کیا امتیاز اے قوم کوئی تیرے ناموں میں
ہزار افسوس چندے کی ضرورت ایسے کاموں میں
بہت سے نام ہیں ایسے سر فہرست عزت میں
جواہر صرف کر دیں جو تن تنہا عمارت میں
مگر جب ان کی دل سوزی کا پہلو کم نکلتا ہے
بجائے شمع ان باتوں سے دل محفل میں جلتا ہے

(عزیز لکھنوی)

لیکن یہ تحریک سرسبز نہیں ہو سکی اور مزار غالب کا مدفن مدتوں حوادث زمانہ کا شکار رہا۔ چنانچہ انقلاب ۱۹۴۷ء کے بعد پھر یہ تحریک ابھری اور ۱۹۵۵ء میں اس کام کی بہت کچھ تکمیل ہو گئی جو برسہا برس سے تشنہ تکمیل تھا۔ جناب مالک رام صاحب نے "ذکر غالب" (چوتھا ایڈیشن) میں لکھا ہے :

"مرور زمانہ سے قبر بلکہ قبرستان ہی کی حالت بہت خستہ ہو گئی تھی۔ کئی مرتبہ ملک میں تحریک ہوئی کہ اس مایہ ناز شاعر کا مقبرہ تعمیر کیا جائے جو خود اس کی شان کے بھی شایان ہو اور اس کے مداحوں اور رتبہ شناسوں کے لیے بھی باعث فخر! دو تین مرتبہ کچھ روپیہ بھی اکٹھا ہوا لیکن عملی کام زبانی جمع خرچ سے آگے نہیں بڑھا۔ آخر کار بعض اصحاب علم و ذوق نے "غالب سوسائٹی" کی تشکیل کی۔ چندہ جمع کیا اور موجودہ سنگ مرمر کی "چوکھنڈی" تعمیر کرا دی۔ اس کا افتتاح ۱۵ فروری ۱۹۵۵ء کو ہوا تھا جو مرزا کا یوم وفات ہے۔ (صفحہ ۱۶۷، ذکر غالب)

یہ صحیح ہے کہ غالب کا مزار اہل علم و ادب کی قدر شناسیوں کی بدولت اب کسمپرسی کے بھنور سے باہر نکل چکا ہے اور اس کے گرد سنگ مرمر کی جالی تعمیر کی جا چکی ہے لیکن یہ سوال اب بھی باقی ہے کہ غالب کی یہ یادگار ان تقاضوں کو پورا بھی کرتی ہے یا نہیں؟ جو غالب جیسی شخصیت کی شایان شان ہونا چاہئیں۔

حواشی

۱ - مرزا عباس بیگ غالب کی حقیقی بہن چھوٹی خانم (زوجہ مرزا اکبر بیگ بدخشی) کے منجھلے بیٹے تھے۔ غدر سن ۵۷ء سے پہلے ہی یہ اودھ کی طرف چلے آئے تھے اور مستقلاً سیتا پور (یو - پی) میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ غدر میں جب ان کے بڑے بھائی مرزا عاشور بیگ "کانے منکاف" کے مقابلے میں کام آ گئے تو ان کی اولاد اور مرزا عباس بیگ کے چھوٹے بھائی مرزا جواد بیگ عرف مغل دلی سے بھاگ کر الور پہنچے اور وہاں سے سیتا پور آ گئے۔ مرزا عباس بیگ نے اپنے بھائی اور

بھتیجوں کو اپنے پاس رکھا۔ مرزا مغل بیگ کو سیتا پور میں افسر اسلحہ مقرر کرا دیا اور بھتیجوں کی تعلیم و تربیت اپنی اولاد کی طرح کی۔ سرور جنگ آغا مرزا بیگ (وفات ۱۹۳۳ء) استاد آصف جاہ نظام دکن، انہی مرزا مغل کے صاحبزادے تھے۔

غدر کے بعد مرزا عباس بیگ کو ضلع سیتاپور میں انگریزوں نے "بڑا گاؤں" تعلقہ عطا کیا اور ان کا نام تعلقداران اودھ کی فہرست میں شامل کر لیا گیا۔ مرزا عباس بیگ کی کوٹھی قیصر باغ میں اس جگہ پر تھی جہاں پر اب "کوتوالی قیصر باغ" قائم کی گئی ہے۔ کوتوالی قیصر باغ کے حدود کے اندر دکھن طرف ان کا تعمیر کردہ امام باڑہ آج بھی موجود ہے جس میں ماہ محرم میں عزاداری ہوتی ہے۔ اسی امام باڑہ میں مرزا عباس اور ان کی بیوی کی قبریں بنی ہوئی ہیں۔

غالب کے "باقیات الصالحات" میں سوائے ان کی بہن، چھوٹی خانم اور بھتیجی عزیز النساء کی اولاد کے اور کوئی نہیں ہے اور اس خاندان کے افراد سیتاپور، لکھنؤ اور حیدر آباد دکن میں بکھرے ہوئے ہیں۔ مرزا عباس بیگ نے ۱۲۹۹ھ میں وفات پائی۔

۲ - نواب سید محسن مرزا (خلف سید اکبر مرزا مرحوم) کے جد امجد نواب سید حسین مرزا ناظر محلات شاہی، بارزالدولہ ممتاز الملک مرزا حسام الدین حیدر خاں حسام جنگ کے صاحبزادے تھے اور غالب کے خاص دوست؟ نواب حسین مرزا (جن کا اصلی نام ذوالفقارالدین حیدر - نواب معین الدولہ، صفدر الملک، ذوالفقار جنگ تمام دلی میں "ناظر حسین مرزا" کے نام سے مشہور تھے۔ جناب مالک رام نے لکھا ہے "غالب کے نہایت گہرے دوست تھے بلکہ فارسی میں ان کے شاگرد بھی تھے، اگرچہ شعر نہیں کہتے تھے لیکن بلا کے سخن فہم اور سخن سنج تھے۔ غالب کا اردو کلام انہی کے پاس جمع ہو رہا تھا جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں تاراج ہو گیا۔

(۱۴۵ - تلامذہ غالب)

حسن اتفاق کہ حسین مرزا کے یہاں بھی دیوان غالب کا ایک قلمی نسخہ غالب کا دستخطی اور مہر شدہ نکل آیا ہے جسے ۱۹۳۶ء میں آغا طاہر دہلوی مرحوم (نبیرہ آزاد دہلوی) نے دیدہ زیب طباعت کے ساتھ شائع کر دیا جو حسین مرزا مرحوم کے حقیقی نواسے تھے۔ مرحوم دہلی کے آخری دور میں شیعوں کے جس عظیم خاندان کو دربار شاہی میں قرب خاص حاصل تھا، وہ یہی خاندان تھا جس کی یادگار حویلی حسام الدین اب بھی "بلی ماران" دہلی میں موجود ہے۔

(نادم سیتاپوری)

سوچ

غالب ڈرامے

ڈاکٹر حامدی کاشمیری

حسرت تعمیر!

(غالب کی شخصیت اور آرٹ پر ایک اسٹیج ڈرامہ)

کردار

غالب ---- امراؤ بیگم ---- مولانا فضل حق ---- حکیم رضی الدین خاں ----
منشی نبی بخش حقیر منشی نبی بخش ---- حالی ---- نواب مصطفیٰ خان شیفتہ ---- میر
مہدی مجروح ---- متھرا داس ---- درباری مل ---- مالک مکان ---- کلو
---- مداری ---- چند گورے سپاہی وغیرہ ----

--------☆☆☆--------

(پردہ اٹھنے پر ایک دیوان خانہ نظر آتا ہے' جس میں چاندنی کا فرش ہے۔ صدر میں قالین اور دو' تین گاؤ تکیے۔ ایک طرف تپائی پر مٹی کی صراحی ہے۔ پاس ہی چند گلاس' کمرے میں ایک دیوان لگا ہوا ہے۔ اس پر ایک بڑا گاؤ تکیہ ہے۔ (بائیں ہاتھ کی طرف پیچوان ہے۔ پیتل کا اگالدان' چند کتابیں بکھری ہوئی ہیں۔ پاس ہی کاغذ' قلم اور دوات ہے۔ تکیے کے قریب چاندی کا پاندان ہے۔ دیوان کے قریب ایک خالی پلنگڑی ہے۔ کمرے کے بائیں طرف ایک چھوٹا سا عقبی کمرہ دکھائی دے رہا ہے۔)

غالب:- (اسٹیج کے دائیں طرف سے دیوان خانے میں داخل ہوتے ہیں۔ کمرے پر ایک تھکی سی نظر ڈالتے ہیں۔ چہرے پر تھکاوٹ اور افسردگی ہے۔ رومال سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہیں۔ کھڑے کھڑے کچھ سوچتے ہیں۔ آنکھوں میں دہشت اور بے چینی ہے) (تحت اللفظ پڑھتے ہیں۔ گمبھیر آواز میں)

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا
وائے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیران ہونا

(رک کر) صحرا صحرا بھٹکتا ہوں اور صحراؤں کی خاک چھاننے سے مجھے کوئی تدبیر روک نہیں سکتی۔ ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں۔ اب دیوانگی سے سر بھی وبال دوش ہو رہا ہے' اور صحرا میں کوئی دیوار بھی نہیں میرے خدا ---- اف ---- فوہ! تنہائی کا یہ عالم۔ یہاں میرا سایہ بھی مجھ سے بھاگتا ہے۔ آرزو آرزو کی شکست کا

نام ہے۔ دل کی شکست، ایک آئینہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور میں آئینہ خانے میں حیران کھڑا ہوں کتنا سناٹا ہے! میں بھی گویا خاموشی کی تصویر ہوں۔ میری خاموشی میں لاکھوں خوں گشتہ آرزوئیں پوشیدہ ہیں۔
(چونکہ کر، دائیں بائیں دیکھتے ہیں) ارے، میں کن خیالوں میں کھو گیا؟ کوئی ہے؟ کلو میاں، مدار خاں --- مداری۔ کتنی خاموشی ہے!--- یہ سب لوگ کہاں چلے گئے۔ اف، کتنی گرمی ہے۔ آگ برس رہی ہے۔ ارے گھر میں کوئی ہے۔ نہ جانے سب کہاں مرگئے ہیں۔ بیگم تو بس جائے نماز سے اٹھنے کا نام نہیں لیتیں، کمال ہے، اتنی پرہیزگار اور متقی خاتون کو کس روسیاہ کے پلے باندھا گیا ہے۔

کلو:۔ (اندر آکر) سرکار --- سرکار آپ تشریف لائے ہیں؟
غالب:۔ میاں تم کو اس میں اب بھی شک ہی ہے (اپنے آپ سے)
"ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے۔"
کلو:۔ نہیں سرکار (کھسیانی ہنسی ہنس کر) آئیے حضور، میں آپ کا چغہ ٹانگ دوں ذرا۔
غالب:۔ یہ لو بھائی۔ (کلو چغہ لے کر کھونٹی پر ٹانگ دیتا ہے)
کلو:۔ کوئی شربت لاؤں آپ کے لئے، کہئے تو شیرۂ بادام لے آؤں۔
غالب:۔ خالص ٹھنڈا پانی پینا چاہتا ہوں، اور ہاں کلو حقہ تازہ کر کے لاؤ۔
کلو:۔ جو حکم سرکار، ابھی لاتا ہوں (کلو صراحی سے پانی کا گلاس بھر لیتا ہے اور غالب کو پلاتا ہے۔ غالب جوتی اتار کر دیوان پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھتے ہیں) سرکار؟
غالب:۔ کیا بات ہے؟
کلو:۔ ابھی کچھ دیر پہلے حکیم صاحب آئے تھے۔
غالب:۔ حکیم صاحب، کون حکیم صاحب؟
کلو:۔ حکیم رضی الدین خاں صاحب۔
غالب:۔ اوہ سمجھا، اچھا تو وہ بیٹھے نہیں؟
کلو:۔ نہیں حضور، پھر آنے کو کہہ گئے ہیں۔
غالب:۔ خوب! (سوچتے ہوئے)

احباب چارہ سازی وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

(کلو سے) اور ہاں، بیگم کہاں ہیں؟ ہمارے آنے کی اطلاع نہیں کر دی؟
کلو:۔ ہاں سرکار، اطلاع تو کر دی لیکن -----
غالب:۔ لیکن کیا؟
کلو:۔ وہ عصر کی نماز کے بعد -----

غالب :- ----- شام کی نماز کی نیت باندھ رہی ہیں (ہنس کر) یہی کہنا چاہتے ہو نا؟ خوب- اس نیک بخت کو تو محض صوم و صلوۃ اور وظیفہ خوانی سے کام ہے' لیکن ایک ہم ہیں کہ ---- کہ خدا سے ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داد طلب کر رہے ہیں-

امراؤ بیگم:- (اندر آکر) اے ہے' کیا کہہ رہے ہو تم- ابھی گھر میں قدم نہیں رکھا کہ لگے اوٹ پٹانگ باتیں کرنے صبح کے نکلے ہو اور اب گھر کی یاد آئی ہے- (نوکر سے) تم جاؤ کلو اور شامی کباب کی پلیٹ ان کے لئے لاؤ- انہیں بھوک لگی ہو گی-

غالب :- خوب کہا بیگم' اب گھر کی یاد آئی ہے-

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

امراؤ بیگم:- یہ گھر دشت لگ رہا ہے تو اسے بدلتے کیوں نہیں-

غالب :- عمر بھر یہی تو کرتا رہا ہوں- در در کی خاک چھاننا ہی ہمارا مقدر ٹھہرا- یاد نہیں بیگم؟ برسات میں ہمارا کیا حال ہوا دیوان خانے کا حال محلسرا سے بدتر ہوا- تم کہتی رہیں ہائے دبی' ہائے مری- میں مرنے سے نہیں ڈرتا' فقدان راحت سے گھبراتا ہوں- چھت چھلنی ہے- ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے ----

اگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

امراؤ بیگم:- بالکل صحیح ہے-

غالب (یاد کرتے ہوئے) اچھا یہ بتاؤ' تمہارے ذمے وہ جو ایک کام کر گیا تھا-

امراؤ بیگم:- ہاں ہاں- اس مکان کی محل سرا کو دیکھنے کو کہہ گئے تھے-

غالب :- دیکھی تم نے؟

امراؤ بیگم:- جی ہاں' میں گئی تھی وہاں-

غالب :- کہو' کیسا مکان ہے- مجھے تو دیوان خانہ بہت پسند آیا-

امراؤ بیگم:- مکان تو ٹھیک ہے' لیکن ---- لیکن محل سرا مجھے کچھ ---- پسند نہیں-

غالب :- کیوں' اس میں کیا برائی ہے؟

امراؤ بیگم:- (آہستگی سے خوف آلود لہجے میں) اس میں تو ---- میں نے سنا ہے ---- بلائیں رہتی ہیں-

غالب :- (ہنس کر) نیک بخت' کیا دنیا میں تم سے بھی بڑھ کر کوئی بلا ہے؟

امراؤ بیگم:- (روٹھ کر) جی ہاں' میں تم کو بلا ہی نظر آتی ہوں- میں کہتی ہوں تم کو ہو کیا گیا ہے؟

غالب :- مجھے کچھ نہیں ہوا ہے- صرف سچی بات زبان پر آتی ہے' اس لئے کہ جھوٹ کہنے کی مجھے عادت نہیں-

بہ کروم زن بہ شیطاں طوق لعنت

سپر دند از رہ تکریم و تذلیل
و لیکن وراسیری طوق آدم
گراں تر آمد از طوق غرازیل

امراؤ بیگم:- (غصے میں) ہاں ہاں، میں تمہارے لئے طوق لعنت ہی ہوں کاش مجھے موت ہی آتی-!

غالب:- موت؟ (ہنستے ہیں) پچھلے دنوں اتنی سخت وبا پڑی لیکن ایک ستر برس کے بڈھے اور ستر برس کی بڑھیا کو نہ مار سکی، تف بریں وبا!

امراؤ بیگم:- تم کو بس ایسی ہی الٹی سیدھی باتیں سوجھتی ہیں- سچ سچ اب بوڑھے ہونے کو آئے، لیکن اپنی عادتوں سے باز نہ آئے- یہ موئی شراب ایسی منہ سے لگی ہے کہ

غالب:- غالب چھٹی شراب، پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روز ابر و شب ماہتاب میں

لیکن سچ تو یہ ہے:

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
یک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہئے

(ہنس کر) لیکن تمہیں اس سے کیا تکلیف ہوتی ہے؟ تم نے تو اپنے کھانے پینے کے برتن الگ کر ہی لئے-

امراؤ بیگم:- (برہمی سے) یہ تو ہے، لیکن

غالب:- (مضطرب ہو کر) بیگم، تم مجھ سے میری قوت گفتار چھین لینا چاہتی ہو- میرے اندر کے نغموں کو موت کی نیند سلا دینا چاہتی ہو، تاکہ میں گھٹ گھٹ کر مرجاؤں- نہیں---- نہیں، تم اتنی ظالم نہیں ہو ---- تم اتنی ظالم نہیں ہو ---- تم جانتی ہو کہ جام رقص میں آجاتا ہے اور میرے ہونٹوں پر نغموں کے ستارے روشن ہوتے ہیں-

پھر دیکھئے انداز گل افشانی گفتار
رکھ دیجئے پیمانہ و صہبا مرے آگے

کلو:- (جلدی سے اندر آکر) سرکار، سرکار- حکیم صاحب اور مولانا فضل حق صاحب تشریف لائے ہیں-

غالب:- (چونک کر پرسکون لہجے میں) انہیں اندر لے آؤ-

امراؤ بیگم:- اچھا میں کچھ کھانے کے لئے بھجواتی ہوں- دوانے کباب تیار کر رکھے ہوں گے-

غالب:- نہیں بیگم، ابھی کچھ کھانے کی خواہش نہیں- طبیعت بجھ سی گئی ہے- دل کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ سانس لینا بھی مشکل ہو رہا ہے- تسلیم و رضا کا میں قائل تو نہیں ہوں، لیکن جب رنج و غم اپنی طاقت سے زیادہ ہوں تو کیا کروں؟ دل تو دل ہی ہے، پتھر نہیں ہے، گھبرا جاتا ہے (لمبی آہ کھینچ کر) کیا کروں؟ خانہ داری کی ضرورتیں ہیں کہ بڑھتی ہی جا رہی ہیں اور اپنے پاس تو بس اللہ کا نام ہے- گھر میں جو اثاثہ تھا، سب ختم ہوا-

کوئی امید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی

امراؤ بیگم:۔ (آہ کھینچ کر) خدا کارساز ہے۔ تم خدا پر بھروسہ رکھو۔

غالب:۔ زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

(حکیم رضی الدین خاں اور مولانا فضل حق آتے ہیں)

غالب:۔ (لفظوں کو پھیلاتے ہوئے) آیئے حضرات۔ آیئے' تشریف لایئے۔ (دونوں آداب کہہ کر بیٹھ جاتے ہیں)

حکیم صاحب:۔ مرزا صاحب کہئے طبیعت کیسی ہے؟

غالب:۔ بس زندہ ہوں (خیالوں میں ڈوب کر) سوچتا ہوں زندگی غم کا زنداں بن گئی ہے۔ اپنے زندان غم کی تاریکی کا کیا حال کہوں۔ روزن پر رکھی ہوئی سفید روئی صبح کی روشنی سے کم نہیں معلوم ہوتی۔

مولانا:۔ آج کچھ تھکے تھکے سے نظر آ رہے ہیں آپ۔ کہوں کیا بات ہے؟

غالب:۔ جب سے کلکتہ سے لوٹا ہوں' مضمحل سا ہو گیا ہوں۔ دو سال تک وہاں دفتروں کی خاک چھانی۔ کتنی کوششیں کیں۔ لیکن بے سود۔ اسٹرلنگ صاحب' وہی جو گورنمنٹ کے سکریٹری ہیں' نے وعدہ کیا تھا کہ تمہارا حق تم کو ضرور ملے گا' لیکن سر جان میلکم گورنر بمبئی نے ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ (آہ بھر کر) پنشن مل بھی گئی تو سمجھو برائے نام ہی ہو گی۔

مولانا:۔ آپ نے ولایت میں جو اپیل کی تھی؟

غالب:۔ مگر وہاں بھی کچھ نہ ہوا۔ (کلو طشتری میں آم لے کر آتا ہے' طشتری رکھ دیتا ہے۔ الٹے پاؤں باہر جاتا ہے' پھر آتا ہے)

کلو:۔ سرکار' منشی صاحب ہیں۔

غالب:۔ (جوش کے ساتھ) بھائی لے آؤ انہیں۔ ان سے کیا تکلف ہے۔ گھر کے آدمی ہیں۔ (مولانا سے) یوں کہئے مولانا۔

رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم"۔ اور ایک ایسے شخص
کو میرے گھر بھیج دیا' جو میرے زخموں کا مرہم اپنے ساتھ لایا

مولانا:۔ آپ کا مطلب منشی نبی بخش حقیر سے ہے؟

غالب:۔ بالکل صحیح کہا آپ نے۔ کئی روز سے گھر کی رونق بنے ہوئے ہیں۔ (منشی نبی بخش حقیر آتے ہیں)

منشی جی:۔ آداب عرض کرتا ہوں۔

غالب:۔ آیئے آیئے منشی صاحب قبلہ (کھڑے ہو کر ہاتھ ملاتے ہیں) خوب آئے۔ بس آپ ہی کی کمی تھی واللہ!

منشی جی:۔ ذرہ نوازی ہے!

غالب:۔ آپ نہ آتے تو آموں کا مزہ ہی جاتا رہتا۔
منشی جی:۔ (مسکرا کر) کیوں' ایسا کیوں ہوتا؟
غالب:۔ (شوخی سے) یہ حکیم صاحب سے پوچھئے' جو آم سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔
منشی جی:۔ (تعجب سے) اچھا یہ آم نہیں کھاتے؟
حکیم صاحب:۔ اجازت ہو تو ایک چشم دید واقعہ سناؤں؟
غالب:۔ ضرور سنیں گے حضرت۔
منشی جی:۔ ارشاد' ارشاد۔
حکیم صاحب:۔ ابھی ابھی ایک گدھے والا اپنے گدھے لئے ہوئے گلی سے گذرا۔ آم کے چھلکے زمین پر پڑے تھے۔ گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیا' کھایا نہیں۔
منشی جی:۔ (تعجب سے) اچھا؟
حکیم صاحب:۔ ہاں ہاں (ہنس کر) دیکھئے مرزا صاحب' آپ آموں کی بڑی تعریفیں کرتے ہیں' لیکن آم ایسی چیز ہے' جسے گدھا بھی نہیں کھاتا۔
غالب:۔ (ہنس کر) بے شک گدھا نہیں کھاتا۔ (سب ہنستے ہیں' حکیم صاحب شرمندہ ہوتے ہیں) لیکن مولانا ---- منشی صاحب آپ تو آم کھائیں گے؟
مولانا:۔ ضرور کھائیں گے صاحب' لیکن زحمت نہ ہو' آم پر کہے گئے اشعار عنایت کیجئے' تاکہ لطف دوبالا ہو۔
غالب:۔ چند شعر یاد آ رہے ہیں' ملاحظہ ہو۔
منشی جی:۔ بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے
خامہ نخل رطب فشاں ہو جائے
غالب:۔ سن لیجئے۔

نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر
کہ دواخانہ ازل ہے مگر
آتش گل پہ قند کا ہے قوام
شیر کے تار کا ہے ریشہ نام
صاحب شاخ و برگ و بار ہے آم
ناز پروردہ بہار ہے آم

مولانا:۔ بہت خوب!
منشی جی:۔ واہ واہ ---- واہ واہ۔ مزہ دوبالا ہو گیا (حکیم صاحب صرف سر کو ہلاتے ہیں۔ ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں۔ کلو آم کی طشتری سے منشی صاحب مولانا اور غالب کو آم دیتا ہے)

مولانا:۔ یہ تو خیر شاعری ہوئی' آپ یہ بتایئے مرزا صاحب' آم کی کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں؟
غالب :۔ بھئی میرے نزدیک تو آم میں صرف دو باتیں ہونی چاہئیں میٹھا ہو اور بہت ہو (سب ہنستے ہیں۔ حکیم صاحب بھی قہقہہ لگاتے ہیں)
منشی جی:۔ مرزا صاحب اب کوئی غزل ارشاد فرمایئے۔
غالب:۔ آپ کا حکم ہے' تو مجھے انکار کی مجال نہیں۔ آپ کی سخن فہمی کا کھلے دل سے معترف ہوں قبلہ۔
منشی جی:۔ یہ تو آپ کی محبت ہے بندہ پرور!
غالب:۔ عرض کیا ہے۔

ہے بسکہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گذرتا ہے گماں اور
یا رب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور
ہر چند سبکدست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور
ہے خون جگر جوش میں دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خونا بہ فشاں اور
ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

منشی جی:۔ کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیان اور۔ سبحان اللہ! سچ ہے حضور۔
غالب:۔ آداب بجالاتا ہوں۔
حکیم صاحب:۔ واہ وا۔۔ کیا معنی آفرینی ہے!
مولانا:۔ بھئی آپ نے تو دریا کو کوزے میں بند کردیا۔ واہ وا اچھا اب اجازت چاہیں گے۔
منشی جی:۔ میں بھی بازار تک جا رہا ہوں۔ (سبھی باری باری آداب کہہ کر نکل جاتے ہیں۔)
(غالب تنہا رہ جاتے ہیں۔ چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں پھیلتی ہیں۔ سامنے پڑی کتاب اٹھا لیتے ہیں۔ ورق الٹتے ہیں۔ کتاب رکھ دیتے ہیں۔ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ کمرے میں چند قدم چلتے ہیں۔ چہرے پر روشنی اور سائے رقص کر رہے ہیں۔
غالب:۔ (دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے)۔

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے

(سوچتے ہوئے' چہرے پر حیرت اور تجسس)

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

(چہرے پر الجھن) یہ کائنات اور اس کے مظاہر--- کتنے راز بکھرے پڑے ہیں۔ انسانی ذہن پریشان ہو جاتا ہے۔

لاف تمکیں فریب سادہ دلی ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز

ہر طرف رنگا رنگ جلوے ہیں جو دامن نظر کو تھام لیتے ہیں' اور انسان دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ لیکن مجھے حیرت ہے کہ مشاہدہ کس حساب میں ہے' جب کہ شہود' شاہد اور مشہور ایک ہے اور ---- اور اس دنیا میں جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں' ہم خواب میں جاگے ہوئے ہیں اور خیالوں کے دام میں گرفتار ہیں' لیکن میری روح کی پوشیدہ گہرائیوں سے آواز آتی ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

کلو:۔ (گھبرایا ہوا اندر آتا ہے) حضور' حضور۔ متھرا داس آئے ہیں۔

غالب:۔ (محویت سے چونکتے ہوئے) متھرا داس؟ اوہ---- اچھا پھر نازل ہوئے وہ' کیا مصیبت ہے۔

کلو:۔ (غالب کی پریشانی کو بھانپ کر) اجازت ہو تو کہوں' سرکار گھر میں نہیں ہیں۔

غالب:۔ نہیں کلو' یہ ہماری وضع کے خلاف ہے۔ متھرا داس کو اندر لے آؤ۔

(زیر لب گنگناتے ہوئے)

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

(موٹی توند والے متھرا داس اندر آتے ہیں)

غالب:۔ آیئے متھرا داس جی آیئے۔

متھرا داس:۔ (تیز لہجے میں پھولی ہوئی سانس کے ساتھ) عجیب مصیبت ہے صاحب۔ پچھلے مہینے کی تیسری کو روپے

لوٹانے کا وعدہ تھا' لیکن جناب وہ وعدہ کیا ہوا (مشکل سے سانس لے کر) اور پھر میں نے دکان سے کتنی بار لونڈے کو بھیجا' لیکن وہ خالی ہاتھ ہی لوٹا۔ عجیب مصیبت ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ دکان چھوڑ کر آنا کتنا مشکل ہے اور پھر ان دنوں روپے کی سخت ضرورت ہے۔ آج مجھے پھر دکان چھوڑ کر آنا پڑا۔ عجیب مصیبت ہے۔

غالب:۔ مجھے افسوس ہے' آپ کو زحمت کرنی پڑی' لیکن متھر اداس جی ان دنوں ذرا ہم تہی دست ہیں۔ کیا کریں' مجبوری ہے۔

متھر اداس:۔ عجیب مصیبت ہے' ہم لکھ پتی تھوڑے ہیں۔ ہم بھی مجبور ہیں صاحب۔ دنیا میں کون مجبور نہیں؟ اور وہاں دکان سے اگر اسی طرح چیزیں اٹھتی رہیں اور دام وصول نہ ہوئے تو ہمارا دیوالہ پٹنے میں کیا دیر ہے؟

غالب:۔ ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے) بات یہ ہے کہ ابھی قلعے سے تنخواہ واگذاشت نہیں ہوئی' کل پرسوں تک ہو جائے گی۔ میں خود روپے لے کر حاضر ہو جاؤں گا۔ آپ اطمینان رکھئے۔ کہئے آپ کے لئے کیا منگاؤں۔ (کلو کو آواز دیتے ہوئے) کلو میاں!

متھر اداس:۔ عجیب مصیبت ہے۔ بس بس رہنے دیجئے۔ ہم کچھ اور نہیں چاہتے۔ صرف ہمارے روپے جلد لوٹائیے گا۔ مہربانی ہو گی (متھر اداس جاتے ہیں۔ غالب انہیں جاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اطمینان کی سانس لیتے ہیں۔ اتنے میں وہاں سے درباری مل اور مالک مکان داخل ہوتے ہیں)

غالب:۔ (سکتے کے عالم میں) آیئے آیئے۔ آج ہماری خوش قسمتی عروج پر ہے۔ مہربانوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔

درباری مل:۔ (ترش سے پتلے لہجے میں' ناک پر عینک سنبھالتے ہوئے) مرزا صاحب' صبر کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ انسان کب تک صبر کرے۔ تین مہینے ہونے کو آئے' لیکن آپ صرف وعدے پر ٹالتے گئے۔ نا بابا نا۔ ایسے کیسے چلے گا۔ لیکن اپنے پاس اقرار نامہ موجود ہے۔ میں عدالت میں جا کر نالش کروں گا۔

غالب:۔ درباری مل جی! فقیر پر ایسا قہر نہ کیجئے۔ آج صبح ہی تو عدالت کا کارندہ دو ڈگریاں لے کر آیا تھا۔ آپ--- آپ چند روز اور صبر کیجئے۔ جب تک پائی پائی ادا نہ کروں گا' اس دنیا سے اٹھوں گا نہیں۔

درباری مل:۔ لیکن منش کی زندگی کا کیا اعتبار؟ زمانہ خراب آ گیا ہے۔ ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر بھروسہ نہیں۔

غالب:۔ آپ مجھ پر بھروسہ کیجئے اور -----

مالک مکان:۔ (موٹی عینک کے اوپر سے دیکھتے ہوئے) ہوں---- سمجھا۔ اس کا مطلب ہے' ابھی قلعے سے تنخواہ نہیں آئی ہے اور نہ ہی پنشن ملی ہے' لیکن حضرت مجھے روپے کی سخت ضرورت ہے' ہاں' چار مہینے کا کرایہ --- پورے چار مہینوں کا کرایہ ادا کرنا باقی ہے۔ میں کہتا ہوں ---- میں کہتا ہوں اگر اتوار کی صبح تک سارا کرایہ وصول نہ ہوا تو مکان خالی کرنے کا نوٹس دے دوں گا' سمجھے؟

غالب:۔ (برہم ہو کر) آپ زحمت نہ کیجئے۔ میں خود ہی مکان چھوڑ رہا ہوں۔

مالک مکان:۔ کیا کہا؟

غالب :- ----- لیکن پہلے آپ کی ساری رقم ادا کردوں گا۔
درباری مل :- بس ایسی ہی باتوں سے روز ٹالتے ہیں۔
مالک مکان :- خیر اتوار تک دیکھتے ہیں' یہ ٹال مٹول کب تک چلے گی (دونوں جاتے ہیں۔ غالب لمبی سانس لیتے ہیں۔ سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں۔ سوچتے ہیں۔ دائیں بائیں دیکھتے ہیں۔ آنکھیں دھواں دھواں ہیں)
غالب :- (خود کلامی) اف ---- فوہ!

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

کیا زمانہ آگیا ہے۔ سانس گھٹ رہی ہے۔ کتنی تمنائیں سینے کی زنداں میں قید ہو کر رہ گئی ہیں۔ یہ گھٹن۔ --- اف جگر پھٹ رہا ہے۔ سوچتا ہوں جگر کے خون ہونے تک دل کو کس طرح سنبھالوں؟ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں پر نظر پڑتی ہے تو لرز اٹھتا ہوں۔ اب دیکھئے' اخراجات ہیں کہ بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ آمدنی ایک سو باسٹھ۔ تنگ آگیا ہوں۔ گذارہ مشکل ہو گیا ہے۔ اب تو روزمرہ کا کام بھی بند رہنے لگا (سوچتے ہوئے) کیا کروں؟ کہاں سے گنجائش نکالوں؟ قہر درویش برجان درویش پچھلے دنوں سے صبح کی تبرید متروک۔ ناشتے کا گوشت آدھا رات کی شراب و گلاب موقوف۔ بیس بائیس روپیہ مہینہ بچا۔ روزمرہ کا خرچ چلا (طنزیہ ہنسی) لیکن یہ بھی کوئی جینا ہے' یہ ---- بھی کوئی ----- جینا ہے۔ (سوچوں کی کشمکش) اب حالت یہ ہو گئی ہے کہ خود کو پہچانا نہیں جاتا۔ کیا میں واقعی وہ ہوں' جو ایک ترکوں کی نسل سے ہے اور افراسیاب کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے' جس کی جوانی عیش و عشرت میں رنگ گئی' غرق شراب ہوئی' جس کا کام معشوق فریبی تھا' جس کا ہر لمحہ زہرہ جبینوں کے ساتھ گذرتا تھا' جس کی وضعداری اور خود بینی کا زمانے بھر کو اعتراف ہے' جس نے کالج کی پروفیسری اس لئے ٹھکرا دی کہ کوئی حاکم پیش وائی کو نہیں آیا' جسے مال و زر اور جاہ و جلال سے زیادہ اپنی قلندری اور آزادگی پسند ہے' جسے تعریف کی خواہش ہے' نہ صلے کی پروا۔ جس کا سر کسی کے سامنے نہ جھکا۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وانہ ہوا

دریا کی لہروں کو دیکھ کر اگر مجھے یہ گمان گذرے کہ دریا نے مجھے دیکھ کر ماتھے پر بل ڈالے ہیں' تو میں ہرگز اس کا پانی نہیں پیوں گا' بلکہ پیاسا مرجانا پسند کروں گا' لیکن ---- لیکن اب میں وہ غالب نہیں رہا ہوں ---- میں ----- وہ نہیں رہا ہوں۔ میں اپنے چہرے کو پہچان نہیں سکتا۔

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز میں ہوں اپنی شکست کی آواز میں ہوں اپنی شکست کی آواز ----- شکست کی آواز!!

پس منظر میں غمناک آواز میں یہ غزل گائی جاتی ہے۔

آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک
غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

شام کے سرمئی سائے پھیلتے ہیں- غالب کے چہرے پر درد و کرب کی لکیریں ابھرتی ہیں- وہ چند قدم چلتے ہیں اور زیر لب یہ شعر پڑھتے ہیں-

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے

اس کے بعد عقبی کمرے میں جاتے ہیں- وہاں تکیے کے سہارے بیٹھتے ہیں- سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہیں- نگاہیں خواب ناک ہو جاتی ہیں اور پلکیں آہستہ آہستہ جھکتی ہیں- پس منظر میں موسیقی کے ہلکے سر وقت کی رفتار کا احساس دلاتے ہیں- روشنی آہستہ آہستہ مدھم ہو جاتی ہے اور سائے پھیل جاتے ہیں اور پھر مکمل اندھیرا چھا جاتا ہے- اندھیرا ایک دو پل چھایا رہتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ اندھیرے سے نہایت آہستگی کے ساتھ صبح کے آثار پھوٹنے لگتے ہیں- اندھیرے چھٹتے ہیں اور اسٹیج اب صبح چمن کا منظر پیش کرتا ہے' یہ تبدیلی صرف بیک کا پردہ گرانے سے عمل میں آتی ہے' جو پہاڑ اور درختوں کا منظر پیش کرے- کمرے کا سامان عقبی کمرہ تاریکی میں چھپ جاتا ہے- پس منظر میں پرندوں کی چہکار' موسیقی کی لہریں' غالب داخل ہوتے ہیں- نگاہوں میں خواب کی کیفیت' چہرے پر امید نور' جوانی کا عالم' کتابی چہرہ' گھنی لانبی پلکیں' سرخ و سپید رنگ' دائیں بائیں حیرت سے دیکھتے ہیں)
غالب :- گل کھلے' غنچے چٹکنے لگے- اور صبح ہوئی (پرندوں کے چہچہے)

آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج
اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

میرے خدا میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں' خواب ---- خواب آرزو' بہاروں کا خواب!ے

ہاں نشاط آمد فصل بہاری واہ وا
پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزلخوانی مجھے

آج --- آج مرغ سحر کا نالہ میرے لیے دو دھاری تلوار نہیں' آج ہر داغ دل سرو چراغاں نظر آتا ہے- پہاڑ اور جنگل بلبلوں کے نغموں سے آباد ہو گئے ہیں- پھولوں کے کھلکھلا کر ہنسنے سے رستے جاگ پڑے ہیں- گھٹائیں جھوم رہی ہیں- آج میرے دل میں تخلیق کا جنوں تازہ ہوا ہے- چمن کی بہاروں نے میرے نغموں میں رنگینی بھر دی ہے' نفس نفس میں معانی کی خوشبو رچی ہوئی ہے- فکر سخن کا نشہ مستی گھول رہا ہے' لیکن ----

لیکن ----- (سوچوں کی کشمکش) لیکن لالہ و گل کے چہرے کا رنگ پریشان کیوں ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ ہر طرف لالہ و گل کے چراغ جل رہے ہیں' لیکن ----- لیکن یہ چراغاں آندھی کے راستے پر تو نہیں؟

غنچہ تا شگفتنہا برگ عافیت معلوم
باوجود دل جمعی' خواب گل پریشاں ہے

(پس منظر میں جھکڑ چلنے کی آواز' بجلی چمکتی ہے) اف یہ آندھی کے جھکڑ- پھول لرز رہے ہیں- اف' پھولوں کے خواب پریشان ہیں- ہر نقش فریادی ہے- ہر گل تر ایک چشم خوں فشاں- بلبلیں لب فریاد ہے اور پھول جگر چاک- یہ بہار ہے یا خزاں---

خزاں کیا' فصل گل کہتے ہیں کس کو' کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں' قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے- (پس منظر میں سازوں کی طربیہ آواز- غالب متوجہ ہوتے ہیں ساز کی آواز کے ساتھ غزل گائی جاتی ہے' غالب اضطراب کو بھول کر اپنی حرکات اور چہرے کے تاثرات سے غزل کی داخلی کیفیات کا اظہار کرتے ہیں' آہستہ آہستہ غزل میں گم ہوتے ہیں)

پھر اس انداز سے بہار آئی کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنان خطہ خاک اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
سبزۂ و گل کو دیکھنے کے لیے چشم نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر بادہ نوشی ہے' باد پیائی

غالب :- کیا بہار سچ آئی ہے؟ ہاں ہاں' ہوا میں شراب کی مستانہ خرامی' یہ روشنی اور رنگ' لیکن--- لیکن تمہارے بغیر گلستان پر آگ برس رہی ہے- یہ صبح بہار میرے لیے شب غم سے کم نہیں- تم کہاں ہو کس رنگ و بو کی دنیا میں گم ہو؟ تمہاری دنیا میں زمین سے آسمان تک رنگ ہی رنگ ہیں- رنگوں کی برسات او ہاں ہر چیز کو آگ لگی ہوئی ہے آتی ہے ----- تم وہاں ندی میں پھولوں کے چراغوں کا عکس دیکھ رہی ہو اور ان پلکوں سے خون کے آنسو جاری ہیں --- لیکن ---- لیکن --- (طربیہ موسیقی کی لہریں) مجھے محسوس ہوتا ہے کہ گلشن میں آج ایک نیا بندوبست ہے- ایک نیا اہتمام ---- یہ کس کے لیے ہے؟ کون آ رہا ہے؟

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے
کہ غیر جلوۂ گل رہگذر میں خاک نہیں

(اسٹیج کے عقبی حصے سے خوابگوں سایوں میں لپٹی ہوئی "اک نگار آتشیں رخ سر کھلا" نظر آتی ہے- غالب اسے دیکھتے ہیں' چونکتے ہیں' حیرت میں ڈوب جاتے ہیں' اسے پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں- خوابوں کا ایک مبہم معلوم ہوتی ہے)

غالب :- (حیرت اور مسرت کے جذبات کے ساتھ) تم؟ کیا سچ مچ تم ہی ہو؟ میری محبوبہ---ن تم یہاں کیسے؟ تم مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھیں- ایک زمانے سے کان تمہارے پیغام کو ترستے تھے اور آنکھ دید سے محروم تھی-

برسات کی۔ اندھیری راتیں کاٹنا میرے لئے ناممکن ہو گیا تھا۔ تم نے عمر بھر کا پیان وفا باندھا تھا' لیکن عمر ہی کو پائیداری نہیں' انسان لحوں میں زندہ رہتا ہے اور ہر لمحہ اسے موت کے قریب کرتا ہے۔ تم --- تم رسوائی کی شرم سے خاک میں چھپ گئیں اور --- میں تڑپتا رہا ---- تڑپتا ہی رہا اور تمہیں پکارتا رہا۔ ہاں یاد آیا تمہاری موت پر میرا لکھا ہوا مرثیہ ---؟ (سوز و درد کے ساتھ)

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے
شرم رسوائی سے جا چھپنا نقاب خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

(محبوبہ شوخی اور الہڑپن کے ساتھ قہقہہ لگاتی ہے)

غالب:۔ نہیں نہیں' تم خاک میں نہیں چھپی ہو' تم زندہ ہو --- تم زندہ ہو۔ یہ مرا واہمہ تھا' واہمہ --- تم سچ مچ زندہ ہو۔ میری آنکھیں دھوکہ نہیں دے سکتیں۔ وہی لانبی سیاہ پلکیں' وہی نیرنگ نظر' وہی رخساروں کی آگ' وہی خم کاکل' وہی نازک بدن' وہی عطر پیراہن اور --- اور یہ حنا آلود انگلیاں ----

(محبوبہ انہماک سے سنتی ہے۔ انگلیوں کو دیکھتی ہے' شرماتی ہے۔ ہاتھ پرے لے جاتی ہے۔ مسکراتی ہے۔ چند قدم ناز و ادا کے ساتھ چلتی ہے)

غالب :۔ دیکھوں تو دلفریبی انداز نقش پا
موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

(محبوبہ شرماتی ہے اور مہین ریشمی گھونگھٹ میں آدھا چہرہ چھپاتی ہے)

غالب :۔ دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہئے

(محبوبہ دھیرے دھیرے چہرے سے پردہ سرکاتی ہے)

غالب :۔ نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

(غالب محبوبہ کے قریب آتے ہیں۔ چہرے پر جذبات کے متنوع رنگ لئے ہوئے' محبوبہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہیں۔ وہ آنکھیں جھکا لیتی ہے)

غالب :۔ نگاہ بے محابا چاہتا ہوں
تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

(محبوبہ کی نگاہوں میں التفات کی روشنی' ہونٹ متبسم)

غالب :۔ ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم

آنا ہی سمجھ میں میری آتا نہیں گو آئے

(وارفتگی کے عالم میں) آخر کار وہ حسین لمحے آ ہی گئے' جب دوری اور ہجر کی کالی رات گذر گئی اور صبح وصال کے جلوے بکھر گئے- آج میری محبوبہ میرے پاس ہے- میں اور میری محبوبہ! وہ بات کرتی ہے تو دیواروں کی تصویروں میں جان پڑتی ہے- وہ قد دلکش کے ساتھ چلتی ہے تو سرو صنوبر سائے کی طرح ساتھ ساتھ پھرتے ہیں- آج چمن میں جشن موسیقی ہے- چنگ و رباب کی جادوئی آواز سن کر جان نکلی جا رہی ہے-

لطف خرام ساقی ذوق صدائے چنگ

یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے

(پس منظر میں موسیقی کی نشاطیہ لہریں)

(خوابناک لہجہ) یہ میرے خوابوں کا گلشن جو صرف میرے خوابوں میں آباد ہے- یہاں صبا آزادی کے ساتھ محو خرام ہے- یہاں پھولوں کی سانسیں خوشبو سے معطر ہیں- پھولوں کے ہجوم ایک دوسرے کے پیچھے دوڑے جا رہے ہیں- یہاں بلبلوں کے زمزمے ہیں' نغموں کی جوئباریں ہیں' ٹھنڈی ہوائیں ہیں اور نظر افروز شادابیاں-----

چار موج اٹھتی ہے طوفان طرب سے ہر سو

موج گل' موج شفق' موج صبا' موج شراب

(محبوبہ قریب آتی ہے اور غالب کو محبت سے دیکھتی ہے)

غالب:- خوابوں کی اس دنیا میں کسی غیر کا سایہ نہیں میری محبوب- یہاں کسی کی حکمرانی نہیں چلتی- یہاں حسرتیں نہیں' مجبوریاں نہیں' آہ و فریاد نہیں- یہاں مسرتیں ہیں' آزادیاں ہیں اور کامرانیاں ہیں- اس دنیا میں تصور نا آفریدہ گلستوں میں نغمہ خواں ہوتا ہے- یہاں صرف پرواز کی خواہش ہے اور آگے بڑھنے کا مستانہ جذبہ---
اور اس گلشن خواب میں تم ہو- تم' میری بہار ناز' اور تمہاری محبت ہے-

کس منہ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا

پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

(محبوبہ شرماتی ہے)

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے

حیا ہے اور یہی گو مگو تو کیونکر ہو

(محبوبہ مسکراتی ہے اور شگوفہ بار درخت کے پاس بیٹھتی ہے- غالب قریب آ کے بیٹھتے ہیں اور اس کی ٹھوڑی کو کانپتی انگلیوں سے اوپر اٹھاتے ہیں)

غالب:- "میں اور حظ وصل' خدا ساز بات ہے-" میری آنکھوں کے آگے صرف بجلیاں کوند رہی ہیں- لیکن تم بات نہیں کرتیں- میں تشنہ دیدار ہی نہیں' تشنہ تقریر بھی ہوں--- ہاں جب زبان دل کا ساتھ نہیں دیتی تو آنکھوں کی خاموشی بھی بولتی ہے-

(غالب اس کی آنکھوں میں ڈوبتے ہیں- اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھتے ہیں اور اس کے کھلے بالوں کو چھوتے ہیں)
غالب :- نیند اس کی ہے' دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
(محبوبہ کے حنائی ہاتھ کو ہاتھوں میں لیتے ہیں)
دل سے مٹنا تری انگشت حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت کا ناخن سے جدا ہو جانا
(حنائی انگلیوں کو دیکھنے کے بعد آنکھوں میں دیکھتے ہیں)
دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی
(دفعتہً محبوبہ چونکتی ہے اور فوراً کھڑی ہو کر ہرنی کی طرح چوکڑی بھرتے ہوئے دور چلی جاتی ہے- غالب دیوانہ وار پیچھے جاتے ہیں)
غالب :- اللہ اللہ! یہ نزاکت- "ہاتھ آئیں تو ہاتھ لگائے نہ بنے-" نہیں نہیں' آج تم میرے پاس ہو اور تم مجھ سے دور نہیں رہ سکتیں- میں---- میں تم کو اپنے سینے میں چھپالوں گا-
عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر
دامن کو آج اس کے حریفانہ کھینچئے
(محبوبہ کے بدن میں جھرجھری سی دوڑتی ہے' وہ تھر تھر کانپتی ہے)
غالب :- (حیرت سے)
میں مضطرب ہوں وصل میں خوف رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں
(غالب دیوانہ وار ہاتھ اس کے دامن کی طرف بڑھاتے ہیں- اتنے میں پس منظر میں زور کا بھیانک قہقہہ گونج اٹھتا ہے- غالب کا ہاتھ اٹھے کا اٹھارہ جاتا ہے- محبوبہ سہم کر الگ کھڑی ہو جاتی ہے)
غالب :- (سکتے کے عالم میں) اف! یہ بھیانک قہقہہ---- کون؟ (خاموشی) نہیں- کوئی نہیں- یہاں کوئی نہیں آ سکتا- یہاں کسی غیر کا گذر ممکن نہیں- یہ میرا واہمہ تھا' واہمہ-
آواز :- (گمبھیر تا کے ساتھ) ہاہا---- یہ تمہارا واہمہ نہیں ---- حقیقت ہے-
غالب :- (سخت الجھن میں) ہیں؟ لیکن تم کون ہو ؟---- بولو' جواب دو-
آواز :- میں تمہارا دوست ہوں-
غالب :- دوست؟ نہیں نہیں- یہ دوست کی آواز نہیں ہو سکتی-
آواز :- مجھے پہچانو غالب' میں تمہارا ہمدرد ہوں- عشق کے جس راستے پر تم جا رہے ہو' وہ تباہی کا راستہ ہے-

غالب :- تباہی کا راستہ؟---- نہیں نہیں، یہ جھوٹ ہے:

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، درد لا دوا پایا

آواز :- غلط۔ عشق نے تمہیں غم زنداں میں ڈال دیا ہے۔

غالب :- غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

آواز :- لیکن عشق کا غم تمہاری جان کھا کر رہے گا۔

غالب :- غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

آواز :- ہاہاہا---- یہ خود فریبی ہے، بے وقوف۔ آج میں تمہارے دل کی آواز تمہارے کانوں تک پہنچا کے رہوں گا۔

غالب :- (غصے میں) لیکن تم کون ہو؟

آواز :- تمہاری آواز---- تمہارے اندر کی آواز۔

غالب :- تم کہنا کیا چاہتے ہو؟

آواز :- تمہاری محبوبہ، جو تمہارے سامنے مہر و وفا اور شرم و حیا کی تصویر بنی کھڑی ہے (غالب کی توجہ آواز سے ہٹ کر محبوبہ کی طرف جاتی ہے جو غالب کو متوحش نگاہوں سے تک رہی ہے) دراصل تم کو فریب دے رہی ہے۔

غالب :- فریب؟

آواز :- ہاں فریب۔

غالب :- محبت روح کی روشنی ہے اور وفا کی خوشبو۔

آواز :- لیکن یہ تمہاری محبوبہ نہیں بن سکتی، یہ ہرجائی ہے۔ غیروں کے ساتھ پھرتی ہے۔ غیروں سے آنکھیں ملاتی ہے۔ اس کا غیر سے اخلاص ہے۔

غالب :- (تشنج کی حالت میں اپنے آپ سے) "رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص، حیف!"---- لیکن یہ جھوٹ ہے، عورت کی محبت سچی ہوتی ہے۔ وہ ایک مرد کو چاہتی ہے اور دوسروں کی طرف آنکھ بھی نہیں اٹھاتی ---- لیکن اس کا غرور، اس کی بیگانگی، اس کے ظلم و ستم، بات بات پر بگڑنا، خوابوں میں آ کر مجھے پریشان کرنا، راتوں کو رقیب کے ساتھ پھرنا---- اف، وہ مجھے ہمیشہ اذیت پہنچاتی رہی ہے، لیکن اس نے میری بات نہ سنی، کبھی نہیں۔

مجھے اس سے کیا توقع بہ زمانہ جوانی
کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی مری کہانی

وہ غیروں کی طرف تیز تیز نظروں سے دیکھتی ہے اور میں اس کی لمبی پلکوں کی چبھن محسوس کرکے رہ جاتا ہوں' یہ سچ ہے' وہ ---- وہ بے وفا ہے' بے وفا (محبوبہ کی طرف دیکھتے ہیں۔ اس کی بھولی صورت سے متاثر ہوتے ہیں) کیا تم سچ مچ وفا سے بے گانہ ہو؟ نہیں نہیں' یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ غلط ہے۔ میری محبوبہ پیکر وفا ہے۔ اس کے سینے میں بھی دھڑکتا دل ہے۔ اس کے دل میں بھی ارمان ہیں۔ وہ خواب دیکھتی ہے۔ میرے قریب آنے کی خواہش رکھتی ہے۔

ضد کی ہے اور بات ولے خوبری نہیں
بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے

(محبوبہ سے) اے یار عزیز۔ رشک میرا دشمن ہے اور تم ---- تم میری راحت جاں ہو۔ آؤ تم کو سینے سے لگاؤں۔ غالب اس کی طرف بڑھتے ہیں اور پیش دستی کرنے لگتے ہیں۔ اتنے میں زور سے بادل گرجتے ہیں اور بجلیاں چمکتی ہیں۔ محبوبہ تھر تھر کانپتی ہے۔ سایوں میں تحلیل ہو کر اسٹیج سے غائب ہو جاتی ہے اور غالب ہاتھ پھیلائے حیران و ششدر کھڑے رہ جاتے ہیں اور اندھیرے میں باہر گم ہو جاتے ہیں۔ مکمل اندھیرا چھائے رہتا ہے۔ اتنے میں یک بارہ پردہ اٹھتا ہے۔ مدھم سی روشنی پھیلتی ہے اور پھر غالب عقبی کمرے میں بیٹھے آنکھوں کو سہلاتے ہوئے' خواب سے بیدار ہوتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ وہ اٹھتے ہیں۔ چہرے پر اداسی کی عجیب سی کیفیتیں لے کر اور کمرے میں چلتے ہیں۔ موسیقی کی لہریں وقت کے گزرنے کا احساس دلاتی ہیں۔

غالب:۔ (بجھے ہوئے لہجے میں)

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

غالب:۔ خواب اور بیداری ---- اف!

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا

(رات کے سائے اجاڑ منظر پیش کرتے ہیں) اف تم چلی گئیں اور ہم پر قیامت گزر گئی۔ میرا خواب آرزو بکھر گیا۔ شام تنہائی کا یہ اضطراب' یہ مخمور درد' یہ بے قراری' ابھی تک اس کے جسم کی خوشبو میرے مشام جاں میں بسی ہوئی ہے۔ وہ کہاں گئی میرے خدا؟ پھولوں کے جلوے راکھ ہوئے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے' ایک دریائے خواب بہہ رہا ہے۔ اس کے بغیر میرا گھر ویرانہ ہے۔ در و دیوار کی بربادی کا خیال کرتا ہوں اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں (چہرے پر درد کے آثار' آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں)

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

(تکیے کے سہارے بیٹھ جاتے ہیں)

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

(پس منظر میں درد انگیز آواز میں یہ غزل گائی جاتی ہے)

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر' سو خموش ہے
اے تازہ وار دان بساط ہوائے دل
زنہار اگر تمہیں ہوس نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو' جو گوش نصیحت نیوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط
دامان باغبان و کف گل فروش ہے
یا صبح دم جو دیکھئے آ کر تو بزم میں
نے وہ سرود و سوز' نہ جوش و خروش ہے
داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے' سو وہ بھی خموش ہے

(غزل گائے جانے کے دوران روشنی اور سائے پھیلتے ہیں۔ ایک شمع جو جل رہی تھی' بجھ جاتی ہے اور کمرے میں مکمل تاریکی چھا جاتی ہے)

(منظر)

(کمرے میں روشنی پھیلتی ہے۔ غالب کھڑے ہیں۔ چہرے پر فکر و تردد کے آثار)

غالب :۔ (خود کلامی) میں نے زندگی تو گذار ہی دی' مگر کیسی کیسی مصیبت سے گذاری۔ مہینے کے مہینے غم فراق میں کاٹے' سالہا سال بے بیٹے گذارے۔ ہائے کوئی مجھ سے پوچھے' جب ساون بھادوں کی گھٹائیں جھوم کر آتی ہیں اور میرا پیالہ شراب سے خالی ہوتا ہے۔ دنیا بھر میں مسرت کی بہاریں ناچتی تھیں اور میں اپنے گھر کا دروازہ بند کئے پڑا رہتا تھا۔ یہ تو جب کی باتیں ہیں اور اب ---- اب تو قیامت کا عالم ہے۔ غدر کا ہنگامہ زوروں پر ہے (پس منظر میں ہنگامہ اور شور کی آوازیں) نفسا نفسی کا عالم۔ نہ کوئی کسی کا یار ہے' نہ غمگسار۔ ایک کو دوسرے کی خبر نہیں۔ خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ قتل ہونے والوں میں کوئی میرا امید گاہ تھا۔ کوئی میرا شفیق' کوئی میرا دوست' کچھ شاگرد' کچھ معشوق' سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جو اب میں مروں گا تو میرا کوئی

رونے والا بھی نہ ہو گا۔

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے زہرہ ہوتا ہے آب انسان کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

(دہراتے ہیں)

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

ہاں یاد آیا' میر مہدی مجروح کے خط کا جواب لکھنا ہے۔ اب تو یہی چند احباب رہ گئے ہیں' جن کے دم سے زندہ ہوں اور خط و کتابت ہی دل کا واحد سہارا ہے۔ میں اس بے کسی اور تنہائی میں صرف خطوں کے سہارے جیتا ہوں۔ یعنی جس کا خط آیا' میں نے جانا وہ شخص تشریف لایا۔

(دیوان پر بیٹھ کر خط لکھتے ہیں اور پس منظر سے غالب کی آواز میں خط پڑھا جا رہا ہے)

آواز:۔ بھائی کیا پوچھتے ہو' کیا لکھوں' دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ' چاندنی چوک' ہر روز مجمع جامع مسجد کا' ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی' ہر سال میلہ پھول والوں کا' یہ پانچوں باتیں اب نہیں' پھر کہو دلی کہاں؟ ہر سوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازہ تک بلا مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ایک ہو کا عالم ہو جائے۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا۔ (کلو آتا ہے اور چیزوں کی صفائی کرتا ہے)

غالب:۔ لو میاں کلو یہ دو خط لیٹر بکس میں ڈال آؤ۔

کلو:۔ بہتر سرکار (خط لے کر لفافوں میں ڈالتا ہے۔ ٹکٹ لگا کے بند کرتا ہے اور جانے لگتا ہے۔ پھر مڑتا ہے)

حضور وہ خطوط دیکھے' جو دوپہر کو ڈاک کا ہرکارہ دے گیا تھا' آپ دیکھ لیے۔ مرزا حاتم علی بیگ مہر اور مرزا تفتہ کے خطوط تھے۔ آنکھیں روشن ہو گئیں واللہ! اچھا دیکھو بیگم کیا کر رہی ہیں؟

کلو:۔ نماز ادا کر رہی تھیں۔

غالب:۔ ہیں' یہ کیا' جب پوچھو نماز' کمال ہے' بیگم نے گھر کو فتح پوری کی مسجد بنا دیا۔

(اتنے میں امراؤ بیگم اندر آتی ہیں' کلو جاتا ہے)

امراؤ بیگم:۔ (ناراضگی کے ساتھ) اے ہے' جب دیکھو میری نماز کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہو۔ آخر تمہاری مغفرت کیسے ہو گی۔ نماز تو کبھی پڑھتے نہیں ہو۔ روزہ تو خیر بہت بڑی چیز ہے۔

غالب:۔ یہ تو ٹھیک ہے بیگم' لیکن یاد رکھنا تم سے ہمارا حشر اچھا ہو گا۔

امراؤ بیگم:۔ وہ کیسے بھلا؟

غالب:۔ تم تو انہی نیلے تہمد والوں کے ساتھ ہو گی' جن کے تہمد میں مسواک بندھی ہو گی۔ ہاتھ میں ایک ٹوٹی دار بدھنی ہو گی۔ سر منڈھے ہوں گے اور ---- ہمارا حشر بڑے بڑے جلیل القدر بادشاہوں کے ساتھ ہو گا۔

امراؤ بیگم:۔ (تعجب سے) ہوں!

غالب:۔ جیسے فرعون' نمرود' شداد اور مونچھیں چڑھائے ہوئے اکڑتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ چار فرشتے ادھر ہوں گے چار ادھر۔

امراؤ بیگم:۔ بس رہنے بھی دو۔ تم تو پاگل ہو گئے ہو۔ میں جاتی ہوں' اندر بہت سا کام ہے۔ (جاتی ہیں)

(غالب کھڑے ہو جاتے ہیں۔ چہرے پر کشمکش کے آثار)

غالب:۔ انسان کیا ہے؟ اس کی آفرینش کا راز کیا ہے؟ کائنات کی تخلیق کا راز کیا ہے؟ انسان کا انجام کیا ہے؟ نیکی اور بدی کیا ہے؟ مادہ اور روح' زندگی اور موت کیا ہے؟ مسرت اور غم کے کیا معنی ہیں؟--- کتنے سوالات ہیں جو دل و دماغ میں ہیجان بپا کرتے ہیں۔ انسان پاگل ہو جاتا ہے۔ کیا یہ سب نظر کا فریب ہے؟ جس کا ہم تماشا کرتے ہیں۔ کیا عالم کی صورت صرف نام ہی نام ہے اور تمام وجودی چیزیں وہم ہی وہم ہیں؟

آواز:۔ بالکل صحیح سوچتے ہو غالب!

غالب:۔ (حیرت سے) کون؟----- سمجھا۔ تم پھر آ گئے؟

آواز:۔ میں گیا ہی کہاں تھا؟ سائے کی طرح تمہارے ساتھ ساتھ رہتا ہوں۔

غالب:۔ میرے ساتھ؟

آواز:۔ ہاں ہاں تمہارے ساتھ۔ میں تمہاری سوچوں کو بھٹکنے سے روکتا ہوں۔

غالب:۔ (طنزیہ ہنسی) ہا ہا----- میری سوچوں میں آفاق گم ہے' اور تم ہو کس شمار و قطار میں؟ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ --- کہ میں تمام عمر بے یقینیوں کے صحراؤں میں بھٹکتا رہا ہوں۔ میں نے شاعروں' صوفیوں' پیغمبروں اور فلسفیوں کے افکار کا مطالعہ کیا۔ پہروں تک میں غور و فکر میں ڈوبا رہا' لیکن ---- لیکن میری آوارہ نظری نہ گئی اور اب ---- ایمان و ایقان کی روشنی میرے وجود کی گہرائیوں سے پھوٹ رہی ہے۔ یہ روشنی الہام ہے ---- کائنات آئینہ آگہی ہے' جس میں حسن حقیقت کے جلوے بہار نظر بنے ہوئے ہیں۔ وجود ایک وحدت ہے اور لافانی!

آواز:۔ (طنزیہ قہقہہ) کیوں خود کو جھٹلا رہے ہو؟ یہ شعر کس نے کہا ہے؟

غالب:۔ کون سا شعر؟

آواز:۔ ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقہ دام خیال ہے

غالب:۔ یہ ----- یہ میرا شعر ہے۔ ہاں ----- ہاں ٹھیک ہے کہ عالم ایک دام خیال ہے۔ میں اس سے کب انکار کرتا ہوں' لیکن میں حقیقت کے وجود سے منکر نہیں ہوں۔ ہر سمت وہی وہ نظر آتا ہے۔

آواز:۔ پھر تمہاری ہستی کیا ہے؟

غالب:۔ دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر

ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

آواز:۔ یہ کہو کہ تم کچھ بھی نہیں ہو۔ محض پرتو۔ پھر---- پھر یہ گناہ اور غم کہاں سے آتے ہیں؟

غالب:۔ جب نظر کے حجابات اٹھتے ہیں تو دیکھنے والا اور دیکھے جانے والا ایک ہو جاتے ہیں۔ بدی نیکی کا حصہ بن جاتی ہے۔ غم اور درد کا احساس راحت کو بڑھاتا ہے۔ ذرہ صحرا بن جاتا ہے۔ فاصلے مٹ جاتے ہیں۔ وحدت کو فروغ ملتا ہے اور انسان ترک رسوم کرتا ہے۔ ملتیں مٹ جاتی ہیں اور ایمان کا شعلہ چمک اٹھتا ہے اور پھر زندگی اور موت کی گتھیاں خود بخود حل ہو جاتی ہیں۔ موت زندگی کا لطف بڑھاتی ہے اور نشاط کار کا جذبہ تیز کرتی ہے۔

آواز:۔ یہ سب ذہنی اختراع ہے۔

غالب:۔ (اضطراب کے ساتھ) نہیں نہیں' یہ ذہنی اختراع نہیں یہ زندگی کے جلوے ہیں' جو خزاؤں اور بہاروں کا روپ دھارتے ہیں اور زندگی کا حسن بڑھاتے ہیں۔ اور چشم کو ہر رنگ میں وا ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔

آواز:۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ اس طلسم رنگ و بو میں تم صرف تماشائی ہو۔

غالب:۔ میں محض تماشائی نہیں ہوں۔ میں اپنی ذات سے ایک انجمن ہوں---- ایک محشر خیال۔ ہستی کا سارا ہنگامہ مجھ سے ہے۔ میرے دل میں آرزو ہے' شوق ہے' تڑپ ہے۔ میری شخصیت میں کتنی قیامتیں چھپی ہوئی ہیں---- لیکن ---- لیکن تمہیں اس سے کیا مطلب؟ تم مجھے ناحق الجھنوں میں مبتلا کرتے ہو ---- تم ہو کون؟ سامنے کیوں نہیں آتے؟ تم خاموش ہو گئے؟ کہاں گئے تم؟ ---- اف چلا گیا۔ ---- کس طرح ہر لمحہ میرا تعاقب کرتا ہے اور میرے فکر و نظر میں انتشار پیدا کرتا ہے۔ (غالب پسینے میں غرق' تکیے کے سہارے بیٹھتے ہیں۔ اور سر کو ہتھیلی کا سہارا دیتے ہیں)

(کلو اندر آتا ہے)

کلو:۔ سرکار' صحن میں چند مہمان آئے ہیں۔

غالب:۔ (سنبھلتے ہوئے) کون ہیں؟

کلو:۔ مولانا فضل حق' مولوی حالی اور نواب مصطفی خاں شیفتہ تشریف لائے ہیں۔

غالب:۔ خوب' چلو ہم بھی صحن میں جاتے ہیں' وہاں مونڈھے لگے ہیں (سوچ کر) نہیں کلو' انہیں اندر ہی لے آؤ۔ یہ دیکھو پاؤں کی تکلیف پھر بڑھ گئی ہے۔

کلو:۔ اچھا سرکار (کلو جاتا ہے۔ مولانا فضل حق' شیفتہ اور حالی اندر آتے ہیں)

غالب:۔ آیئے آیئے کہئے کیسے مزاج ہیں۔

مولانا:۔ خدا کا فضل ہے۔

حالی:۔ تسلیم عرض ہے قبلہ۔ کہئے کیا حال ہے حضرت کا؟

غالب:۔ ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

شیفتہ:۔ مرزا صاحب! سچ تو یہ ہے کہ آپ کی محبت کھینچ لاتی ہے۔
غالب:۔ زہے قسمت۔ دل کو دل سے راہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تمہاری شفقت پر ہمیں ناز ہے شیفتہ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جب جوئے کے الزام میں قید ہوا اور میرے قریبی رشتے دار انجان بن گئے اگر تم میری خبرگیری نہ کرتے تو نہ جانے میرا کیا حال ہوا ہوتا۔ اس واقعے سے متاثر ہو کر میں نے کہا تھا' شاید تمہیں یاد ہو۔

مصطفیٰ خاں کہ دریں واقعہ غمخوار من است
گر بمیرم چہ غم از مرگ عزادار من است

حالی:۔ خوب!
شیفتہ:۔ مرزا صاحب کی عنایت ہے۔
مولانا:۔ مرزا صاحب میرا خیال ہے کہ اب آپ کا اردو دیوان چھاپہ خانے کو جانا چاہئے۔
غالب:۔ (خوش ہو کر) آپ کی رائے کی میں ہمیشہ قدر کرتا رہا ہوں' آپ نے مشورہ دیا تو مرزا بیدل کے رنگ میں لکھنا میں نے چھوڑ دیا۔
شیفتہ:۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ آپ کا اصلی رنگ نکھر آیا۔
غالب:۔ بھائی آپ لوگوں کی رائے پر مجھے ہمیشہ اعتماد رہا ہے۔
مولانا:۔ مرزا صاحب آپ کو یاد ہو گا جب آپ آگرہ سے آئے تھے تو آپ کی مشکل پسندی پر لوگ کتنا طنز کرتے تھے۔
غالب:۔ ہاں بھائی میں بھولا کب ہوں۔
شیفتہ:۔ ملا عبدالقادر رام پوری نے تو ایک بے معنی شعر آپ سے منسوب بھی کیا تھا۔
حالی:۔ ہاں وہ شعر---- کیا تھا؟ لیجئے یاد آیا۔

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

غالب:۔ کیا زمانہ تھا وہ بھی! (ہنستے ہیں' سبھی ہنستے ہیں)
مولانا:۔ آپ کے اردو دیوان میں بیدل کے طرز کے چند شعر رہ بھی جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔
غالب:۔ میں آپ کی نکتہ سنجی کا قائل ہوں مولانا۔
حالی:۔ قطع کلام معاف ---- آپ کے ایک شعر کو کوشش کے باوجود سمجھ نہ سکا۔
غالب:۔ (ہنس کر)

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

اچھا وہ کونسا شعر ہے؟

حالی:۔ قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

غالب:۔ ارے بھئی اے کی جگہ جز پڑھو' معنی خود سمجھ میں آ جائیں گے۔
حالی:۔ اگر آپ اے کی جگہ جز کا لفظ ہی رکھ دیتے یا بقول کے دوسرا مصرع اس طرح کہتے:
اے نالہ نشاں تیرے سوا عشق میں کیا ہے

تو مطلب صاف ہو جاتا
غالب:۔ (بے چین ہو کر) ٹھیک ہے مطلب صاف ہوتا' لیکن اس طرح طرز بیان کی انفرادیت ختم ہو جاتی۔ میں روایتی شاعر نہیں ہوں۔ شاعری کو معنی آفرینی سمجھتا ہوں۔ میرے مبہم بیان پر وضاحت قربان ہوتی ہے اور ----- اور عام روش مجھے ہرگز پسند نہیں۔ لوگوں کو میرا کلام پسند نہ ہو تو مجھے پروا نہیں:
نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہے مرے اشعار میں معنی نہ سہی

(اتنے میں میر مہدی مجروح آتے ہیں)
مجروح:۔ آداب عرض کرتا ہوں قبلہ!
غالب:۔ آؤ بھائی میر مہدی مجروح' آؤ' کیا حال ہے (کلو کو پکارتے ہوئے) اے میاں کلو' پان لاؤ۔
مجروح:۔ نہیں مرزا صاحب' میں پان نہیں لوں گا۔ آپ کی مزاج پرسی کو حاضر ہوا ہوں۔ کہئے کیا حال چال ہے؟
غالب:۔ بھائی کچھ نہ پوچھو ان دنوں ہمارا کیا عالم ہے۔ معاش کے دو ہی ذریعے تھے۔ سرکاری پنشن اور قلعے کی تنخواہ۔ سو دونوں گئے۔ اب گذارہ ہو تو کیونکر ہو۔ جس قدر کپڑا' اوڑھنا اور بچھونا گھر میں تھا' سب بیچ بیچ کر کھایا۔ گویا اور لوگ روٹی کھاتے ہیں اور میں کپڑا کھاتا ہوں ----- پنشن اگر مل بھی گئی تو بھی کام چلتا نظر نہیں آتا اور نہ ملی تو کام ہی تمام ہے۔ مشکل یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں اس شہر کی آب و ہوا راس آتی معلوم نہیں ہوتی۔ ضرور شہر چھوڑنا پڑے گا۔
شیفتہ:۔ ایسا نہ کہئے مرزا صاحب۔
غالب:۔ بھائی اب رسوائی کے سامان میں کونسی کمی باقی رہ گئی ہے۔
جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

یہ میاں کالے صاحب کی مہربانی تھی کہ قلعے کی ملازمت دلوائی تھی اور خاندان تیموری کی تاریخ لکھنے کا کام ملا تھا' لیکن اب وہ بھی گیا۔ اف ----- فوہ (کراہتے ہیں) پیر میں سخت درد ہو رہا ہے۔
مجروح:۔ (محبت سے) لائیے میں آپ کے پاؤں دبا دوں۔
غالب:۔ اچھا یہی سہی۔ (مجروح پاؤں دباتے ہیں۔ مولانا فضل حق' شیفتہ اور حالی آداب کہہ کے جاتے ہیں۔)

مجروح:۔ زحمت نہ ہو تو کوئی غزل ارشاد ہو۔
غالب:۔ بھائی تمہارا اصرار ہے تو ایک غزل سناتا ہوں۔
مجروح:۔ مجروح ارشاد۔
غالب:۔

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ سال کہاں
فرصت کاروبار شوق کسے
ذوق نظارہ جمال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں
ایسا آساں نہیں لہو رونا
دل میں طاقت جگر میں حال کہا
فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں
مضمحل ہو گئے قویٰ غالب!
اب عناصر میں اعتدال کہاں

مجروح:۔ بہت خوب! بہت خوب!
غالب:۔ چند شعر اور سنئے، طبیعت آمادہ معلوم ہوتی ہے۔
مجروح:۔ ارشاد، ارشاد!!
غالب:۔

رہئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے درو دیوار سا اک گھر بنایا چاہئے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

مجروح:۔ سبحان اللہ!
غالب:۔ اچھا بھئی میر مہدی اب بس کرو۔ شام ہو رہی ہے گورے سپاہی ادھر ادھر پھرتے رہتے ہیں۔
مجروح:۔ اچھا، اب اجازت چاہتا ہوں، لیکن حضور میرے پیر دابنے کی اجرت؟
غالب:۔ بھائی اجرت کیسی؟ تم نے میرے پاؤں دابے، میں نے تمہارے پیسے دابے۔ حساب برابر ہوا۔

(مجروح ہنستے ہوئے چلے جاتے ہیں- غالب تماشا رہ جاتے ہیں- سوچ میں محو ہو جاتے ہیں- دفعتہً "پس منظر سے آواز آتی ہے)

آواز:- دلی اجڑ گئی- تہذیب کی بساط الٹ گئی- مغلیہ سلطنت کی عالی شان عمارت خاک بوس ہو گئی اور آخری مغلیہ تاجدار بہادر شاہ ظفر کو جلاوطن کیا گیا-

غالب:- تم ----- تم -----؟

آواز:- ہاں میں ہوں' سنو غالب دارو گیر کا بازار اب بھی گرم ہے- گھر سے باہر قدم رکھنا مشکل ہے- تم گھر کے زنداں میں قید ہو گئے ہو- سوچوں تو تمہاری زندگی میں کتنا سناٹا ہے-

غالب:- سناٹا! ---- ہاں یہ سچ ہے' لیکن ------ لیکن میں زندگی سے مایوس نہیں ہوں ---- میں زندگی سے مایوس نہیں ہو سکتا ---- مجھے ----- مجھے زندگی سے محبت ہے' بے پناہ محبت! میں اس کی ہر ادا سے پیار کرتا ہوں- میرا یقین غیر متزلزل ہے-

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

آواز:- یہ تمہاری خوش فہمی ہے-

غالب:- نہیں' یہ حقیقت کا شعور ہے- جس تہذیب اور کلچر کی ہم نے خون جگر سے آبیاری کی' سچ ہے' وہ تباہ ہو گیا- آندھی کے وہ تند و تیز جھکڑ چلے کہ سارا گلستان برباد ہو گیا اور گہری تاریکیاں چھا گئیں' لیکن ---- لیکن میں نے اس تاریک رات میں ایک نئی پھوٹتی ہوئی روشنی کی جھلک دیکھ لی-

آواز:- تم نے؟

غالب:- ہاں میں نے ---- وقت برق رفتار ہے- تبدیلیاں زندگی کا مقدر ہیں اور تبدیلیاں ہی زندگی کو حسن اور سوز و ساز عطا کرتی ہیں- پرانی تہذیب کے ملبے پر ایک نئی دنیا تعمیر ہو رہی ہے- ایک نیا دور آ رہا ہے- یہ سائنس اور صنعتی ترقی کا دور ہے- سائنس نے انسان کو ترقی کا ایک نیا شعور دیا ہے-

آواز:- لیکن یہ تمہارے زخموں کا مداوا نہیں غالب- سوچو تو' تمہیں زندگی نے زخموں' آہوں اور کراہوں کے سوا کیا دیا- کیا کیا صدمے تمہیں اٹھانے پڑے- جوئے کے الزام میں تم قید ہوئے- سات بچوں کی لاشیں اپنے ہاتھوں سے دفنا چکے ہو ---- عارف کی جواں مرگی نے تمہیں کسی لائق نہیں رکھا ----

غالب:- (لہجے میں آنسوؤں کی کپکپی) کیوں میرے زخموں کو ہرا کرتے ہو- کیا کیا زخم نہیں کھائے ہیں ---- عارف کی جواں مرگی نے میری دنیا کو تاریک کر دیا- اف ----- (سر پکڑتے ہوئے) ---- میں ---- میں نے کب جگرداری کا دعویٰ کیا ہے- میں بھی انسان ہوں' پتھر نہیں ہوں- میرے سینے میں ایک حساس دل ہے- میں پیہم صدموں سے کیوں نہ گھبرا جاؤں-

(باہر دور سے گولیوں کے چلنے کی آوازیں- غالب گھبراہٹ میں ادھر ادھر دیکھتے ہیں- خاموشی چھا جاتی ہے)

(دوسرا نوکر مداری ہانپتا ہوا آتا ہے)
غالب:- (گھبرا کر) کیوں مداری کیا خبر لائے ہو؟
مداری:- سرکار بڈھا دربان آیا تھا۔
غالب:- وہی جو میرزا یوسف کی ڈیوڑھی پر رہتا تھا؟
مداری:- ہاں سرکار۔
غالب:- (بے چین ہو کر) کیا کہا اس نے؟
مداری:- کہتا تھا --- کہتا تھا کہ سپاہی ان کے مکان میں بھی گھس گئے تھے اور سارا سامان لے گئے اور آدھی رات گزرے مرزا یوسف --- کا --- انتقال ہوا۔
غالب:- ہائے میرا بھائی! اناللہ و انا الیہ راجعون۔ (باہر ملا جلا شور، دوڑو بھاگو کی آوازیں، چیخیں، گولیوں کی آواز نزدیک سے آتی ہے۔ کلو گھبرایا ہوا آتا ہے)
کلو:- سرکار غضب ہو گیا!
غالب:- (انتہائی گھبراہٹ میں) کیا ہوا کلو؟
کلو:- چند گورے سپاہی دیوار پھاند کر محلے میں گھس آئے ہیں۔ مہاراجہ پٹیالہ کے سپاہیوں نے انہیں روکنے کی بہت کوشش کی، لیکن ایک نہ چلی (اتنے میں تین چار سپاہی بندوقیں تانے اندر گھس آتے ہیں۔ انہوں نے محلے کے ایک دو آدمیوں کو گرفتار کیا ہوا ہے)
سپاہی:- (گرج کر) ہم تم کو پکڑ کر لے جائے گا۔
غالب:- (گھبراہٹ کے ساتھ) ہم کو؟
دوسرا سپاہی:- ہاں تم کو ---- مرزا غالب کو۔
غالب:- کس جرم کی پاداش میں؟
سپاہی:- ہم نہیں جانتا مانگتا۔ کرنل براؤن کا آرڈر ہے۔ چلو جلدی کرو۔
غالب:- (بے بسی کے عالم میں) اچھا تو چلو۔

خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیا
ہیں گرفتار وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

کلو!
کلو:- سرکار؟
غالب:- کلو ذرا میرا چغہ دینا اور کلاہ بھی (چغہ اور کلاہ پہنتے ہیں اور سپاہیوں کے ساتھ جانے لگتے ہیں۔ اسٹیج پر کلو اور مداری بے بسی میں ہاتھ ملتے ہیں۔ اسٹیج خالی ہو جاتا ہے اندھیرا چھا جاتا ہے)

(منظر)

(غالب پلنگڑی پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔ کلو اندر آتا ہے)

غالب:۔ (بڑھاپے اور نقاہت کے عالم میں) کلو ذرا پانی پلا دینا۔ (کلو پانی دیتا ہے۔ غالب مشکل سے اٹھ بیٹھتے ہیں۔ کلو جانے لگتا ہے)

کلو!

کلو:۔ (پلٹ کر) حضور!

غالب:۔ ذرا کاغذ اور قلم دان دینا (کلو کاغذ اور قلم دان دیتا ہے) (غالب کاغذ پر جھکتے ہیں، پس منظر میں خط کی عبارت پڑھی جاتی ہے)

آواز:۔ ناتوانی زوروں پر ہے۔ بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے۔ ضعف، سستی، کاہلی، گراں جانی، رکاب میں پاؤں ہے، باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور و دراز در پیش ہے۔ زاد راہ موجود نہیں، خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر، اور اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقر۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

غالب:۔ افوہ، انگلیاں اکڑ گئیں اور درد کرنے لگیں، کلو میاں۔

کلو:۔ سرکار!

غالب:۔ یہ خط لو اور ڈاک میں ڈال آؤ، اور ہاں مرزا تفتہ کی غزل کی اصلاح بھی کر چکا ہوں، یہ بھی ڈاک میں ڈال دو۔ (کلو جاتا ہے۔ امراؤ بیگم آتی ہیں)

امراؤ بیگم:۔ کتنی بار تم سے کہا کہ پلنگ پر لیٹے رہو اور لکھنے پڑھنے سے باز رہو۔ تم ہو کہ اپنی ضد سے باز نہیں آتے۔

غالب:۔ کہاں کا لکھنا پڑھنا بیگم، میں تو اب مشق فنا میں غرق ہوں۔ بو علی سینا کے علم اور نظیری کے شعر کو ضائع، بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زندگی بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت چاہئے۔ باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری سب بکواس ہے۔

امراؤ بیگم:۔ (افسردہ لہجے میں) ہماری قسمت ہی خراب ہے۔ آخری عمر میں کیا کیا دھکے کھانے پڑتے ہیں۔ غدر کے ہنگامہ میں اپنے تمام زیورات اور قیمتی کپڑے میاں کالے صاحب کے مکان پر بھیج دیئے تھے۔ خیال تھا، وہاں محفوظ رہیں گے سب ان کو مانتے تھے، مگر کالے صاحب کا مکان بھی تاراج ہوا اور میرا سارا سامان لٹ گیا۔

غالب:۔ چلو، رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب
خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کہئے

لیکن اکثر سوچتا ہوں بیگم اور سوچ سوچ کر تڑپتا ہوں کہ زمانے نے میری قدر نہ کی' یاد ہے بیگم؟

امراؤ بیگم:۔ کیا؟

غالب:۔ یوسف کو اس کے بھائیوں نے چند کھوٹے روپوں کے عوض سوداگروں کے پاس بیچ دیا تھا---- ہاہا ------

امراؤ بیگم:۔ امراؤ بیگم تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

غالب:۔ نہیں بیگم' میرا دماغ اب ٹھیک ہو گیا ہے اور اب مجھ پر ظاہر ہوا کہ اس ملک میں عرض ہنر بے کار ہے۔

ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
ہوں میں کلام نغز ولے ناشنیدہ ہوں

میں --- میں اب موت کے انتظار میں ہوں۔ حیران ہوں کہ موت کو کیا انتظار ہے' لیکن --- لیکن دل میں حسرتوں کے داغ ہیں۔ اپنے پیچھے کچھ بھی نہیں چھوڑا ہے اور بیوہ بیوی کی مفلسی کا خیال مرکے بھی چین نہیں دے گا۔

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

امراؤ بیگم:۔ کیسی باتیں کرتے ہو تم! لیٹ جاؤ ذرا۔ میں جاتی ہوں اور برف کا پانی بھجواتی ہوں۔ (جاتی ہے! غالب ایک مجلد کتاب دیوان قاآنی پڑھنے لگتے ہیں۔ کتاب رکھ دیتے ہیں۔ چہرے پر گہری سوچ کی پرچھائیاں۔ فکر سخن میں غرق ہوتے ہیں)

غالب:۔ (خود کلامی) جب' جب میں فکر سخن میں کھو جاتا ہوں اس وقت اگر تمہارا گذر میرے ضمیر میں ہو' تم دیکھو گے کہ میرا دل پگھل رہا ہے اور میرے جگر میں آگ کا دریا بہہ رہا ہے۔

عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے' وہ دل نہیں رہا
جاتا ہوں داغ حسرت ہستی لئے ہوئے
ہوں شمع کشتہ' در خور محفل نہیں رہا
مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایان دست و بازوئے قاتل نہیں رہا
گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

آواز:۔ ہاہا---- تم نے آخر شکست تسلیم کر ہی لی۔

غالب:۔ (چونک کر) تم ---؟ کیا تم مرتے دم تک میرا پیچھا نہ چھوڑو گے۔

آواز:۔ نہیں، غالب، غالب سے الگ کیونکر رہ سکتا ہے؟

غالب:۔ تو کیا تم ---؟

آواز:۔ ہاں میں تمہاری آواز ہوں، تمہاری روح کے سناٹے میں گونجتی ہوئی آواز --- اچھا ہوا، تمہیں احساس تو ہوا کہ تمہارے دل کی موت ہو چکی ہے۔ تم بجھی ہوئی شمع ہو اور حسرتوں کا داغ لے کر جا رہے ہو۔

غالب:۔ یہ ٹھیک ہے، لیکن ---- لیکن میں دنیا اور زندگی کی حقیقت کو پا چکا ہوں۔ حسرتوں اور ٹھوکروں کے باوجود میرا سر بلند ہے اور میں خیال کی روشن بلندیوں سے کائنات کو دیکھتا ہوں--- میں زندہ ہوں، میرا فن زندہ ہے، میرا شعور زندہ ہے۔ میرا جسم خاک میں مل جائے گا، لیکن میری آواز زندہ رہے گی۔ میری شاعری کی دھوم سارے جہان میں ہو گی۔

آواز:۔ ہاہاہا---- تمہارے خیالوں کے تیور اب بھی نہیں دبے ہیں، لیکن غالب دیکھو تو تمہاری جسمانی حالت کیا ہو گئی ہے۔ بیماریوں نے تمہیں نیم جاں کر رکھا ہے۔ ضعف کی حالت تو دیکھو، اٹھنا بیٹھنا دشوار ہو گیا ہے۔ بصارت کی یہ حالت ہے کہ آدمی کو پہچانتے نہیں ہو۔ سماعت کا یہ عالم ہے، کہ بات مکرر کہے بغیر نہیں سنتے ہو---- تم ڈھلتے سورج ہو غالب!

غالب:۔ (متاثر ہو کر) ہا---- ں ---- ہاں یہ سچ ہے --- ہاں یہ سچ ہے! (غالب کے جسم پر تھرتھری طاری ہوتی ہے، ہاتھوں میں رعشہ۔ دیوار کا سہارا لیتے ہیں۔ مشکل سے پلنگڑی پر آتے ہیں۔ بیٹھتے ہیں۔ کلو آتا ہے اور غالب کو پانی پلاتا ہے)

(کلو جاتا ہے۔ غالب تنہا رہ جاتے ہیں۔ ماتھے کو ہتھیلیوں سے سہارا دیتے ہیں۔ سوچتے ہیں۔ چہرے پر حسرت، آنکھوں میں موہوم سی امید)

غالب:۔ (لہجے میں حسرت اور امید کا امتزاج)

کوئی دن گر زندگانی اور ہے — اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں — سوز غم ہائے نہانی اور ہے
بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں — پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے
ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام — ایک مرگ ناگہانی اور ہے

ایک مرگ ناگہانی اور ہے---- ایک ---- مرگ ناگہانی ---- اور ہے!

(سر تکیے پر رکھتے ہیں۔ آنکھیں موند لیتے ہیں اور پردہ گر جاتا ہے)

کنہیا لال کپور

ترقی پسند غالب

پہلا منظر

باغ بہشت میں مرزا غالب کا محل۔
مرزا دیوان خانے میں مسند پر بیٹھے ایک پری زاد کو کچھ لکھوا رہے ہیں۔ ساغر و مینا کا شغل جاری ہے۔ ایک حور ساقی کے فرائض انجام دے رہی ہے۔
(منشی ہرگوپال تفتہ داخل ہوتے ہیں)

تفتہ : آداب عرض پیرو مرشد۔ یہ آج پری زاد سے کس قسم کا انتقام لیا جا رہا ہے کہ اسے اچھا خاصا کاتب بنا دیا۔

غالب: آؤ آؤ مرزا تفتہ' بہت دنوں کے بعد آئے ہو بھئی بیٹھو۔ کچھ اپنی کہو' ہماری سنو۔

تفتہ : لیکن بندہ نواز۔ یہ سلسلہ کیا ہے؟ کیا کوئی تازہ غزل لکھوائی جا رہی ہے؟

غالب : جنت اور تازہ کلام! میاں جہاں دودھ اور شراب کی نہریں ہوں۔ حوریں اور پری زاد زلف سیاہ رخ پر پریشان کئے ہر وقت چشم براہ اور گوش بر آواز ہوں۔ وہاں احساس ناامیدی کہاں۔ اور اسکی عدم موجودگی میں ساز غزل سے کوئی نغمہ ابھرے یا پھوٹے یہ کس طرح ممکن ہے۔ واللہ کیا دن تھے وہ بھی جب شراب کے ایک ایک جرعے کو ترستے تھے۔ قرض کی مے پینے میں کتنا مزا تھا جب ....

تفتہ : قطع کلام معاف مرزا صاحب' کل ریاض خیر آبادی سے اس موضوع پر ایک شعر سنا۔ بخدا لطف آ گیا۔

غالب: ارشاد۔

تفتہ : اپنی یہ وضع اور یہ دشنام مے فروش سن کے جو پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا۔

غالب : سبحان اللہ کیا تیور ہیں شعر کے۔ خدا خوش رکھے ریاض کو' خمریات میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔ لیکن رہا مولوی ہی ساری عمر ظالم نے جنت میں آ کر بھی نہیں چکھی۔

تفتہ : باتوں باتوں میں میرا سوال تو آپ فراموش ہی کر گئے۔ میں نے عرض کیا تھا۔ پری زاد سے کیا لکھوایا جا رہا ہے؟

غالب: کوئی نئی چیز نہیں۔ یونہی اپنی چند غزلوں کو بنانے کے لیے بیٹھ گیا۔ سوچا بے کار مباش....

تفتہ : گستاخی معاف حضور' لیکن ان غزلوں میں اصلاح کی گنجائش کہاں ہے۔ سونے پر سہاگہ کرنے

کی ٹھانی ہے کیا؟

غالب : گنجائش اس طرح نکل آئی کہ ان میں رجعت پسندی کے کافی عناصر ہیں۔ انھیں ترقی پسند سانچے میں ڈھال رہا ہوں۔

تفتہ : خوب۔ خوب! تو جنت میں آنے کے بعد آپ کو ترقی پسند بننے کا شوق ہوا ہے۔ خدارا اپنے پہ نہیں تو اپنے عزیزوں پر رحم کیا ہوتا۔

غالب: بھئی بات تو تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن ہوا کے رخ کو بھی تو دیکھنا پڑتا ہے۔

تفتہ: (طنزاً)

ہائے اس زود پشیمان کا پشیمان ہونا

غالب: اور ہم اگر جواب میں کہیں

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

تفتہ : حضور! خدا کے لیے بیاں میں مزید وسعت پیدا کرنے سے احتراز فرمائیے۔ بے چارے نقاد پہلے ہی کافی پریشان ہیں اگر صلاح شدہ کلام کی شرح لکھنی پڑی تو خیر و عافیت معلوم ہو جائے گی۔

غالب: میں نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ کلام دارالبقا میں رہے گا۔

تفتہ : تو اس سے آپ کا مطلب تو حل ہو گا نہیں... دارالکافات کے نقاد آپ کا شمار ترقی پسند شعراء میں کرنے سے تو رہے۔

غالب: دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

تفتہ : بجا ارشاد ہوا قبلہ! ایک سوال بڑی دیر سے میرے ذہن میں چٹکیاں لے رہا ہے۔ اجازت ہو تو عرض کروں۔

غالب: بلا تامل کہئے۔

تفتہ : جنت کی حقیقت تو آپ کو معلوم ہو گئی۔ کبھی جنت میں دلی کی بھی یاد آئی۔ خاص کر محلہ بلی ماراں کی؟

غالب: محلہ بلی ماران! آہ مرزا تفتہ۔ یہ تم نے کس کی یاد دلا دی۔

اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

خدا گواہ ہے وہاں سے آئے ہوئے سو برس ہونے کو آئے لیکن محلہ بلی ماران کا نقشہ دن رات میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔

تفتہ : تو کیوں نہ ایک آدھ دن کے لیے دلی کی سیر کی جائے یہاں رہتے رہتے طبیعت اوب گئی ہے۔ نہ مشاعرے نہ مجلسیں نہ نوک جھونک۔ نہ لطیفہ بازی۔ بس ہر طرف شہد اور دودھ کی نہریں۔ اور ان پر بھنبھناتی ہوئی مکھیاں۔

غالب : لیکن وہاں جائیں تو کیسے۔ نہ تقریب' نہ دعوت نامہ۔ اور پھر دلی میں ہمیں کون پوچھے۔ کون سمجھے گا۔

تفتہ : یہ بات تو نہیں جناب۔ دلی کیا سارے ہندوستان میں آپ کے لاکھوں پرستار موجود ہیں۔ ابھی چند دن ہوئے پنڈت ہری چند اختر وہاں سے تشریف لائے ہیں۔ انہوں نے وہ وہ قصے سنائے کہ طبیعت مچل مچل گئی۔

غالب: اچھا کچھ ہم بھی سنیں۔ کیا کہا انہوں نے؟

تفتہ : دلی میں آپ کا شاندار مزار تعمیر کیا گیا ہے۔ دو فلمیں آپ کی زندگی پر بنائی گئی ہیں اور آپ کا دیوان دیوناگری رسم الخط میں شائع کیا گیا ہے۔

غالب : جزاک اللہ۔ اور یہ اس غالب کی عزت افزائی کی گئی ہے جسے ساری عمر یہ شکایت رہی۔
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

تفتہ : معلوم ہوتا ہے کہ لوگ آپ کی وفات حسرت آیات کے منتظر تھے۔ جونہی آپ اللہ کو پیارے ہوئے۔ قدر افزائی کے ڈونگرے برسنے لگے۔

غالب: یہ بات تھی تو ہمیں ہلکا سا اشارہ کر دیا ہوتا ہم برسوں پہلے سفر آخرت اختیار کر لیتے۔

تفتہ : تو فرمایئے۔ دلی چلئے گا۔ اختر صاحب کی زبانی پتہ چلا کہ لال قلعہ میں عظیم الشان مشاعرہ ہو رہا ہے۔

غالب: لال قلعہ! مشاعرہ!! یہ تو گویا دو آتشہ ہے۔ بھئی ضرور چلیں گے۔

دوسرا منظر

لال قلعہ دلی کے دیوان عام میں غالب کی یاد میں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ شعرا اسٹیج پر جلوہ افروز ہیں۔ سامعین بے تابی سے کارروائی شروع ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اسٹیج سیکرٹری مائیک کے سامنے آتا ہے۔

اسٹیج سیکرٹری : صاحب صدر، خواتین و حضرات! یہ مشاعرہ اقلیم سخن کے اس شہنشاہ کی یاد میں منعقد کیا گیا ہے جسے مرزا اسد اللہ غالب کے نام نامی سے یاد کیا جاتا ہے جو اسی لال قلعہ کی محفلوں میں بارہا غزل سرا ہوا۔ اور جس کے کلام نے عوام کے علاوہ مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار کو محظوظ و مسحور کیا۔ کاش وہ آج ہمارے درمیان موجود ہوتا اور اپنی غزل سرائی سے ہمارے دلوں کو گرماتا۔

ایک آواز: حضرت آپ نے مجھے یاد فرمایا۔ میں تو آپ کے درمیان موجود ہوں۔

ایک اور آواز میں ہرگوپال تفتہ بڑی مسرت سے آپ کو یہ خوش خبری سناتا ہوں کہ نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب بہ نفس نفیس اسٹیج پر تشریف لا رہے ہیں۔

"مرزا غالب اور منشی ہرگوپال تفتہ اسٹیج کی طرف بڑھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ سامعین کھڑے ہو

کر آداب بجالاتے ہیں۔ صاحب صدر اور اسٹیج سیکرٹری مرزا اور تفتہ کے حق میں دست بردار ہو جاتے ہیں)

غالب : (کرسی صدارت پر بیٹھنے کے بعد) بھئی تفتہ! شمع بردار کہاں ہے۔ اس سے کہو کہ شمع کسی ترقی پسند شاعر کے سامنے لائے۔

ایک شاعر : گستاخی معاف مرزا ہمارے مشاعروں میں شمع بردار نہیں ہوتا۔ ہم بجلی کے لیمپ کی روشنی میں مائیک کے سامنے اپنا کلام پڑھتے ہیں۔

غالب: تو پھر شروع کیجئے یہ دونوں چیزیں تو موجود ہیں۔

مصائب دہلوی: غزل سماعت فرمائیے۔

غالب: بھئی کوئی ترقی پسند نظم سنائیے۔ آخر ہم جنت سے غزل سننے کے لیے تو نہیں آئے۔

مصائب دہلوی: معاف کیجئے مرزا نظم سے تو میں تائب ہو چکا ہوں۔

غالب: ہائیں۔ نظم سے توبہ کر لی۔ آخر کیوں؟

مصائب دہلوی: وجہ بیان کئے دیتا ہوں۔ عرض کیا ہے۔

غزل سے بدکنا
غزل سے بھڑکنا
مرا اک معمول سا ہو گیا تھا۔
میں لکھتا تھا نظمیں
جنہیں اہل محفل
بجا راتِ پہلی معما سمجھتے
سمجھتے نہ کچھ بھی بس اتنا سمجھتے
مگر میں نے دیکھا
کہ نظموں میں میری
نہیں مغز کوئی
یہ نظمیں کجا، محض تھی جعل سازی
کہ پڑھ کے انہیں شہر کا کوئی قاضی
پکارے۔ "الہیٰ یہ کیا بک رہا ہے
کہ لاحول پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔"
میں جب بھی کوئی نظم
محفل میں پڑھتا

تو دانتوں تلے انگلیاں
داب کر سب
کنکھیوں سے یوں دیکھتے میری جانب
کہ جیسے ہوا احساس رحم ان میں پیدا
کسی نیم پاگل کسی سر پھرے پر!
بالآخر یہ سوچا
کہ حد مسخرہ دین کی ہوتی ہے کوئی
چنانچہ غزل کی طرف لوٹ آیا
بچایا مجھے' شکر تیرا خدایا۔

غالب : خوب۔ بہت خوب۔ تو گویا شام کا بھولا صبح کو گھر لوٹ آیا۔ لیکن صاحب ہم غزل نہیں سنیں گے۔

مصائب دہلوی : اگر آپ نظم ہی سماعت فرمانا چاہتے ہیں تو پھر حضرت جدت لکھنوی سے کہئے۔ کیونکہ وہ ترقی پسندوں کے سالار ہیں۔

غالب : جدت لکھنوی اسٹیج پر تشریف لائیں۔

جدت لکھنوی : مرزا صاحب! مصائب دہلوی نے تو صرف نظم سے توبہ کی ہے۔ میں نے شاعری سے توبہ کر لی ہے۔

غالب : تعجب' آخر اس انقلاب کی وجہ؟

جدت لکھنوی : اگر آپ اصرار کرتے ہیں تو وجہ بھی ظاہر کئے دیتا ہوں۔

غزل سے مجھے اس لیے دشمنی تھی
کہ آساں نہیں ہے غزل اچھی کہنا
بڑا مارنا پڑتا ہے اس میں پتا
بڑی دور کی لانا پڑتی ہے کوڑی
جو سچ پوچھئے ایک نشتر غزل کا
ہے سو لاکھ بے کیف نظموں پہ بھاری
مگر چاہتی ہے غزل وہ ریاضت
کہ جس کے تصور سے لرزہ ہو طاری
چنانچہ بڑے چھوٹے "مصرعے" ملا کر
میں لکھتا رہا ایسی مہمل سی نظمیں

کہ پڑھ کے جنہیں آئے قاری کو غصہ
پڑھی نظم دلی کی مجلس میں میں نے
تو مزدور نے ایک یوں مجھ کو ٹوکا
"ابے دیکھ تو تو یہ کیا کر رہا ہے"
اسی دن سے کی میں نے نظموں سے توبہ
کہ مشکل بہت شاعری کا ہے شعبہ
چنانچہ میں خاموش ہوں چھ برس سے
فقط اللہ ہو اللہ ہو کر رہا ہوں

غالب: آپ کی معذرت بجا۔ لیکن اگر آپ بھی رضا مند نہیں تو پھر نظم پڑھنے کے لیے کس سے کہا جائے؟

جدت لکھنوی: بسولہ حیدر آبادی جو ہیں۔

غالب: بسولہ حیدر آبادی تشریف لائیں۔

بسولہ حیدر آبادی: مرزا صاحب۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ میں آپ کو غزل یا نظم سناؤں گا۔ تو یہ آپ کی خوش فہمی ہے۔ یہ شغل تو مدت سے ترک کر رکھا ہے اگر چاہیں تو فضا میں ہتھوڑا ورانتی لہرا کر دکھا سکتا ہوں۔

غالب: خدانخواستہ کہیں سر پھوڑنے کا ارادہ تو نہیں۔

بسولہ حیدر آبادی: تسلی فرمایئے' ایسی کوئی بات نہیں۔

غالب: لیکن آپ نظم سنانے سے کیوں گریز کر رہے ہیں؟

بسولہ حیدر آبادی: بات دراصل یہ ہے مرزا کہ شاعری ایک بے کار مشغلہ ہے' پھر جو بات ہتھوڑے میں ہے وہ قلم میں کہاں۔

غالب: معاف کیجئے میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

بسولہ حیدر آبادی: مطلب ابھی واضح کئے دیتا ہوں۔ عرض کیا ہے۔

کبھی قلم ہاتھ میں تھا میرے
غزل بھی کہہ لیتا تھا میں خاصی
نہ جانے کیا میرے دل میں آئی
کہ توڑ ڈالا قلم کو ساتھی
پکڑ کے ہاتھوں میں اک ہتھوڑا
ادب کی تخلیق کر رہا ہوں

ہتھوڑے سے یعنی لکھ رہا ہوں
ادب برائے یہ ماسکو ہے
نہیں ادب یہ برائے دلی
میں صاف اعلان کر رہا ہوں
کہ بن گئی ہے مرکھنی گائے
ہوا جو کوئی تھی بھیگی بلی
قسم مجھے گورکی کی ساتھی
ادب کو رہنے ادب نہ دوں گا
قسم مجھے ایلیاں کی ساتھی
میں شاعری تو نہیں کروں گا
لگاؤں گا میں ادب میں نعرے
کہ آرہا ہے نیا سویرا
کہ شاعری ختم ہو چکی ہے
درانتیاں گیت گا رہی ہیں۔

غالب: یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
کوئی شاعر نظم سنانے کو تیار نہیں۔ (تفتہ سے) اچھا بھئی تفتہ مائیک پر اعلان کر دیجئے کہ اگر کوئی صاحب نظم سنانا چاہتے ہیں تو اسٹیج پر آجائیں۔

تفتہ: ہاں صاحب ہے یہاں کوئی نظم گو شاعر؟

شعراء: کوئی نہیں، کوئی نہیں۔ ہم سب اب غزل گو ہو چکے ہیں۔

تفتہ: (غالب سے) تو پیرومرشد آپ ہی کچھ ارشاد فرمائیے۔

غالب: حضرات! ادھر چند دنوں سے دو ترقی پسند نظمیں کہی ہیں۔ انہیں پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

شعراء: ارشاد قبلہ!

غالب: عرض کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بے زار
کس کی حاجت روا کرے کوئی

شعراء: سبحان اللہ کیا بات پیدا کی ہے

غالب: آداب عرض۔ شعر ہے۔

جان تم پر نثار کرتا ہوں
شرم تم کو مگر نہیں آتی

شعراء: سبحان اللہ۔
غالب: شعر ہے۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کچھ
ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا

اور-----

موت کا ایک دن معین ہے
اور درویش کی صدا کیا

اور صاحب آخری شعر ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

تفتہ: جواب نہیں حضور اس ترقی پسندی کا۔ قبلہ اب دوسری نظم بھی عطا فرمایئے۔
غالب: دوسری نظم ابھی نامکمل ہے۔ صرف تین شعر ہوئے ہیں۔
تفتہ: ارشاد۔
غالب: عرض کیا ہے۔

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

شعراء: واہ واہ، کیا بے نظیر شعر ہے
غالب: اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
تفتہ: واللہ۔ کیا تان توڑی ہے قبلہ! کیا نازک خیال ہے۔
غالب: اور تیسرا شعر ہے۔

دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے
گر نہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

تفتہ: مرحبا، یہ آپ ہی کا حصہ ہے مرزا صاحب۔ ندرت بیان کی داد نہیں دی جا سکتی۔
غالب: آداب عرض۔ تو حضرات اب مجلس برخاست کی جاتی ہے۔ کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ مجھ کافر کے علاوہ سب کافر مسلمان ہو چکے ہیں۔ یعنی غزل گوئی کی طرف لوٹ آئے ہیں۔ اور خاکسار جب

سے جنت آشیانی ہوا ہے غزل کہنے یا سننے کی تاب نہیں لا سکتا (تفتہ سے) بھی تفتہ مائیک پر اعلان کر دو کہ سامعین اور شعراء تشریف لے جاسکتے ہیں۔

تفتہ : خواتین و حضرات! پیرو مرشد کا ارشاد آپ نے سن ہی لیا اب آپ آرام کیجئے۔ خاکسار اور مرزا بھی مرزا غالب پر فاتحہ پڑھنے جائیں گے' اور ہو سکا تو سیکنڈ شو میں فلم "مرزا نیشہ" بھی دیکھیں گے۔ الواع۔ شب بخیر!

ڈاکٹر محمد اشرف

عہد و سوانح غالب
چار مناظر کی ایک تمثیل

(۱)

دہلی میں غدر ۱۸۵۷ء سے کوئی ۱۵ سال پہلے صبح کا وقت ہے

راوی: غالب اپنی عالیشان حویلی میں خوش نظر آتے ہیں۔ دیوان خانہ میں بیٹھے گنگنا رہے ہیں۔
غالب:

غالب از خاک پاک تورانیم
لاجرم در نسب خرد مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی
بہ سترگان قوم پیوندیم
ایبکم از جماعہ اتراک
در تمامی زماہ دہ چندیم
فن آبائے ماکشا ورزیست
مرزبان زادۂ سمرقندیم
در زمعنی سخن گزاروۂ
خود چہ گرئیم تاچہ و چندیم
فیض حق را کمینہ شاگردیم
عقل کل را بہینہ فرزندیم
ہم بہ تابش بہ برق ہم نفسیم
ہم بہ بخشش بابر مانندیم
بہ تلاشے کہ ہست فیروزیم
بہ معاشے کہ نیست خرسندیم
ہمہ بر خویشتن ہمی گرئیم
ہمہ بر روزگار می خندیم

راوی: اتنے میں جانے کیا خیال آیا کہ میرمہدی کو خط لکھنے لگے۔

غالب: مولانا غالب علیہ الرحمۃ ان دنوں بہت خوش ہیں۔ پچاس ساٹھ جز کی کتاب امیرحمزہ کی داستان کی اور اس قدر حجم کی ایک جلد بوستان خیال کی ہاتھ آ گئی ہے۔ سترہ بوتلیں بادۂ ناب کی توشک خانہ میں موجود ہیں دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں۔

رات بھر شراب پیا کرتے ہیں۔
کسے کیں مرادش میسر بود
اگر جمم نباشد سکندر بود"

راوی: خط ختم نہ ہوا تھا کہ ہرگوپال تفتہ آن پہنچے۔

تفتہ: کہئے قبلہ۔ یہ حویلی میں نئی تعمیر کیا ہو رہی ہے۔

غالب: میاں تعمیر کیا۔ لے دے کر آنے جانے کا ایک رستہ ہے سو وہ بھی دیوان خانہ میں ہو کر یہ سمجھ کر خلوت خانہ کو محل سرا بنایا چاہتا تھا کہ گاڑی' ڈولی' لونڈی' اصیل' کا چھن تیلن' تنبولن' کہاری' منہاری ان فرقوں کا وہ دروازہ رہے گا۔ میری اور میرے بچوں کی آمدورفت دیوان خانہ میں سے رہے گی' عیاذاً باللہ وہ لوگ دیوان خانہ میں سے آئیں جائیں' اپنے بیگانے کو ہر وقت بیچھل پائیاں نظر آئیں۔ یہ تو ہو تا رہے گا گر پہلے اپنی اور دوستوں کی خیر و عافیت تو سناؤ۔

تفتہ: کوئی خاص بات نہیں۔ آپ نے امراؤ سنگھ کا حال تو میرے خط میں پڑھ ہی لیا ہو گا۔ اب ہمارے مرزا پر یہ مصیبت آئی ہے۔ جب سے چناجان مری ہیں انہیں ایک دم کے لیے صبر و قرار نہیں۔ صبح شام جب دیکھو آہ و زاری اور چناجان کی یاد۔ میرا تو خیال ہے کہ آپ انہیں خط لکھیں۔

غالب: عزیزم میں نے تمہیں بھی لکھا تھا کہ امراؤ سنگھ کو سمجھاؤ وہ شادی کی بلا میں کیوں پھنستا ہے ایسا ہی ہے تو اس کے بچوں کو میں پال لوں گا۔ مرزا جوان آدمی اور پھر غم کرے ایک ڈومنی کے مرنے کا۔ چناجان جیسی ہزار اس پر قربان ہوں۔ ابھی لکھتا ہوں۔ تم بھی سنتے جاؤ۔

"... مرزا صاحب ہم کو یہ باتیں پسند نہیں..... کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے کیسی اشک فشانی کہاں کی مرثیہ خوانی۔ آزادی کا شکر بجالاؤ غم نہ کھاؤ اور اگر ایسی ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چناجان نہ سہی مناجان سہی..... بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ۔"

زن نوکن اے دوست در نو بہار
کہ تقویم پارینہ نایلہ بہ کار

تفتہ: گر قبلہ وہ آپ کی نوجوانی کی محبوبہ اور وہ مرثیہ جو جانکاہی میں عارف کے مرثیہ سے کم نہیں ہے یاد کیجئے۔

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے

مگر عزیزم! اول تو وہ جوانی دوانی کا معاملہ تھا پھر مقطع پر بھی تو غور کیا ہوتا۔

عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا دل میں تھا جو کچھ ذوق خواری ہائے ہائے

تو پھر یہ کیوں نہ کہئے کہ ذوق خواری ابھی باقی ہے۔ مگر قبلہ یہ تو بتائیے کہ گزارہ کی کیا صورت ہے۔ اب تو یہ صورت نہیں ہے کہ کبھی متھر اداس سے قرض لے لیا۔ کبھی درباری مل کو جا مارا۔ روٹی کا خرچ بالکل پھوپھی کے سر عام اخراجات کے لیے کبھی احمد بخش خاں سے کبھی انور سے ورنہ ماں سے کچھ نہ کچھ مل گیا۔ اب تو تمسکی قرض ہو گا اور قرض خواہوں کے تقاضے اس پر آپ کی شاہ خرچی میں بھلا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔

مرزا تفتہ تم سے کیا چھپاؤں۔ ڈگری داروں سے چھپتا پھرتا ہوں۔ سواری میں نکلنا چھوڑا۔ گھر میں بند ہوں اور یوں ہی پوچھتے ہو تو ناسخ کے نام میرا فارسی خط پڑھ لو۔

"نخستیں شرارہ کہ در خرمن صبر و ثبات من زوند آں بود کہ دو تن از گروہ وام طلباں... ڈگری بہ حق من از عدالت حاصل کردند چوں فرجام آنست کہ یا زر مندرجہ ڈگری گزارہ سودیا تن بہ بند وزنداں داوہ آید... آرے از بہر نام آوراں ایں قدر ہست کہ سرہنگ عدالت بہ کاشانہ شاں نتوانند اخت تاخور بہ رہگذر یافتہ نشوند بہ اسیرے نہ روند۔ چوں گنجائش ادائے زر نبود لاجرم بہ پاس آبرو خود را گرد آوردم نہ ترک نشاط سواری کردم"

اگر میری مانو تو سرکار انگریزی کی کوئی ملازمت کر لو۔ اس سے آئے دن کی امیروں اور نوابوں کی قصیدہ خوانی سے نجات مل جائے گی۔ اور اگر "فتوح" بھی مل جائیں تو اللھم زد فزد۔

بھائی ملازمت سے کس کو یہاں انکار ہے مگر کوئی ملازم رکھے بھی؟ پچھلے مہینہ کی بات ہے کہ دہلی کالج میں فارسی مدرس کی مانگ ہوئی اور امیدواروں میں مجھے بھی بلایا گیا چنانچہ میں پالکی میں سوار ہو کر ٹامس صاحب کے ڈیرے پر پہنچا مگر اول تو وہ مجھے لینے نہیں آئے اور جب بالآخر دیر کے بعد آئے تو فرمانے لگے کہ اس وقت آپ چونکہ نوکری کے لیے آئے ہیں وہ برتاؤ نہیں ہو سکتا جو دربار کے وقت ہوتا ہے۔ اب عزیزم تم ہی سوچو کہ ملازمت کا ارادہ اس لیے کیا تھا کہ اس سے اعزاز کچھ بڑھے گا نہ اس لیے کہ موجودہ اعزاز میں بھی فرق آئے۔ غرضکہ میں خدمت سے معذرت کر کے چلا آیا۔ تمہیں معلوم ہے کہ روٴسا سے میرے تعلقات برادرانہ ہیں۔

مرزا تفتہ اور غالب کی یہ نجی گفتگو ابھی جاری تھی کہ علاؤ الدین خاں حمزہ خاں ایک دوسرے دوست کو ساتھ لیے آپہنچے اور اب خاص مجلس منعقد ہو گئی۔

کہو میاں علاؤ الدین لوہارو میں تو سب خیریت ہے۔ میاں نیر تو اچھے ہیں۔ اخوا کہئے مولوی

حمزہ خاں صاحب آپ کے مزاج تو بخیر ہیں سلی چھوڑ کر رمضان میں ادھر کہاں آنکلے اور آپ کی تعریف میری غالب!" آپ سے پہلے ملاقات نہیں ہوئی۔

علاؤ الدین خاں ہمرزا صاحب! یہ میرے عزیز دوست امیر محمد خاں صاحب سے مشتاق تھے بلکہ قتیل والی نزاعی بحثوں میں آپ کے ہمنوا اور حامی رہے ہیں۔ میں آج انہیں آپ سے ملانے لے آیا۔

غالب: مگران کا اور حمزہ خاں کا کیا جوڑ ہے۔ فرمائیے کچھ شراب حاضر کروں؟

حمزہ خاں: مرزا صاحب! شراب اور پھر ماہ صیام میں۔ کچھ شرماؤ یہ تو گناہ کبیرہ ہے۔

غالب: (ہنس کر) اور جو کوئی رمضان میں پئے تو کیا ہوتا ہے؟

حمزہ خاں: ادنٰی بات یہ ہے کہ دعا قبول نہیں ہوتی۔

غالب: آپ جانتے ہیں شراب پیتا کون ہے؟ اول تو وہ ایک بوتل اولڈ ٹام کی باسامان حاضر ہو دوسرے بے فکری تیسرے صحت۔ آپ فرمائیے کہ جسے یہ سب کچھ حاصل ہو اسے اور کیا چاہیے جس کے لیے دعا کرے؟

حمزہ خاں: (کھسیانے ہو کر) مگر جناب کے عقائد ویسے کون سے درست ہیں؟

غالب: حضرت! دریبے کے بنیوں کے لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا اور رسائل ابوحنیفہ کو دیکھنا اور مسائل حیض و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے اور عرفا کے کلام سے حقیقت حقہ وحدت وجود کو اپنے دلنشین کرنا اور ہے.... میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لاموجود الا اللہ لاموثر فی الوجود والا اللہ سمجھا ہوا ہوں۔

علاؤ الدین خاں ہمرزا صاحب! خدا رحم کرے عقائد کی بحث تو وہ ہے جس پر ہزار برس سے بحثیں جاری ہیں اور فریقین آج تک کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکے۔ میں اور امیر محمد خاں صاحب اس لیے حاضر ہوئے تھے کہ خالص اللہ ممتاز اور اختر کے فارسی کلام کے بارے میں آپ کی رائے معلوم کریں۔

تفتہ: پیشتر اس کے کہ مرزا صاحب نئے اسالیب کے بارے میں کچھ کہیں اور بحث شروع ہو میں چاہتا ہوں کہ ناظم ہروی صاحب کا ایک قطعہ آپ سب صاحبان کو سنا دوں۔ ممکن ہے کچھ بحث میں بھی مدد دے کہتا ہے:

شنیدم کہ در دور گاہ کہن
شدہ عنصری شاہ صاحب سخن

چو اورنگ از عنصری شد تہی
بہ فردوسی آمد کلاہ مہی

چو فردوسی آورد سرور کفن
بہ خاقانی آمد بساط سخن

چو خاقانی از دارِ فانی گذشت
نظامی بہ ملک سخن شاہ گشت

نظامی چو جام اجل در کشید
سرچترِ دانش بہ سعدی رسید

چو اورنگ سعدی فرو شد زکار
سخن گشت برفرق خسرو نثار

ز خسرو چو نوبت بہ جامی رسید
زجامی سخن را تمامی رسید

غالب: مگر تفتہ! ابھی تمامی کہاں مقطع تو چھوڑ ہی گئے اسے اور بڑھا دو

زجامی بہ عرفی و طالب رسید
زعرفی و طالب بہ غالب رسید

امیر محمد خاں: مرزا صاحب! ہے تو سوے ادب مگر مجھے اس میں خودستائی کی بو آتی ہے۔ آپ نے ایک بار بہادر شاہ کے مدحیہ قصیدہ میں بھی اسی طرح ایک جگہ فرمایا تھا۔

امر و زمن نظامی و خاقانیم بہ دہر
دہلی ز من بہ گنجہ و شرواں برابر است
سلجوقیم بہ گوہر و خاقانیم بہ فن
توقیع من بہ سنجر و خاقاں برابر است

غالب: ظاہر ہے کہ قصیدہ میں شاعرانہ تعلی کی گنجائش ہوتی ہے اور یہ عیب نہیں ہے مگر میں نے خود ایک مثنوی لکھنا شروع کی ہے اور شروع ہی میں اس کا کھلے الفاظ میں اعتراف کیا ہے کہ میں کسب فیض اساتذہ کرام سے کرتا ہوں۔ سنئے میں نے اس کے مقدمہ میں لکھا ہے۔
"بدیں استخواں پیکر کہ بہ اسد اللہ غالب نامور است...... بہ ریزش نمک طرز عرفی شیرازی و آمیزش شکر ادای نظیری نیشاپوری شور انگیزی و گلو سوزی حسن بہ رشتہ۔ آں شاید غیبی افزوند غزل و قصیدہ و قطعہ و رباعی را و فرجام کشی دو دلکشی لفظ و معنی کا رازاں گذشت کہ دیگرے را در اندیشہ گزر دبہ سبح نبشتن مثنوی و دلنشیں افتاد۔ فردوسی طوسی را بہ رہنمائی و نظامی گنجوی را بہ نیر فزائی گماشتہ غالباً" اس کے بعد خود پرستی اور خودستائی کا الزام مجھ پر عائد نہ ہوگا۔

امیر محمد خان: اصل میں میرا خیال سید احمد خان صاحب کی اس تحریر کی طرف گیا جہاں انہوں نے آپ کو اساتذہ سے بھی بلند مرتبہ دیا ہے مگر اس فضول بحث کو چھوڑیے اور کوئی غزل سنائیے۔

غالب: غزل تو شاید مشکل سے ہی یاد آئے کہئے تو چیدہ چیدہ اشعار سناوں۔

امیر محمد خاں : مرزا صاحب وہی سنا دیجئے۔ تابم زول برو کا فر ادائے۔

غالب : یہ غزل خود اس کا ثبوت ہے کہ میں اساتذۂ فن کا تتبع کرتا ہوں' ملاحظہ ہو۔

تابم ز دل برو کافر ادائے — بالا بلندے کوتہ قبائے
چوں مرگ ناگہ بسیار تلخے — چوں جان شیریں اندک وفائے
در کام بخشی ممسک امیرے — در دل ستانی مبرم گدائے
گستاخ سازے پوزش پسندے — وز روئے دلکش مینو لقائے
زر دشت کیشے آتش پرستے — برسم گزارے زمزم سرائے
در کینہ ورزی تفسیدہ دشتے — در مہربانی بستاں سرائے
از زلف پرخم مشکیں نقابے — از تابش تن زریں ردائے
در عرض دعویٰ لیلیٰ نکوہے
بر رغم غالب مجنوں ستائے

امیر محمد خاں : سبحان اللہ مرزا صاحب کیا خوب کہا ہے۔ آپ کا دعویٰ خود ستائی نہیں حق بجانب ہے۔ خدا آپ کا سایہ ہم جیسے نو آموزوں پر قائم رکھے۔

تفتہ : صاحبو! وہ مجلس اسے وفادار ماما آ رہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ قبلہ مرزا صاحب کا کھانے پر اندر انتظار ہو رہا ہے اس لیے اب یہ مجلس برخاست ہو تو اچھا ہے۔

راوی : لوگ آداب کے بعد رخصت ہوتے ہیں۔

(۲)

دہلی میں 'غدر ۱۸۵۷ء سے کوئی ۳ سال پہلے

راوی : غالب اب فقط مرزا نوشہ نہیں بلکہ مرزا نجم الدولہ دبیرالملک نظام جنگ کے شاہی خطاب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ آج مہر نیمروز اور ایک قصیدہ لے کر قلعہ معلیٰ جانے کی تیاری کر رہے ہیں کہ اتنے میں میر مہدی دیوان خانہ میں داخل ہوتے ہیں۔

میر مہدی : قبلہ تسلیمات عرض کرتا ہوں۔

غالب : جیتے رہو عزیزم۔ عمر دراز ہو مگر میں تو لال قلعہ جا رہا ہوں۔ پالکی تیار ہے۔

میر مہدی : میں صرف یہ عرض کرنے کے لیے حاضر ہوا تھا کہ سیٹھ جی کسی طرح ڈگری کے اجرا کو ملتوی کرنے کے لیے رضامند نہیں ہوتے۔ میں نے لاکھ سمجھایا منتیں کیں نہیں مانے۔

غالب : میاں' یہی تو باعث ہے میرے فوراً قلعہ معلیٰ جانے کا میں نے مہر نیمروز کے مقدمہ میں اپنی

ناداری کی طرف اشارہ بھی کیا ہے لو یہ حصہ سنو:
"گویند در عہد جہانبانی حضرت صاحبقراں ثانی بہ فرمان آں خسرو دریا دل کلیم را صدرہ بہ سیم وزر و لعل و گہر سختہ اند۔ من آں خواہم کہ دیدہ وراں را دستوری دہی تا از کشش و کوشش نہ رنجند دیک بار گفتار مرا باکلیم بہ سنجند"

میر مہدی: قبلہ کہیں ان اشاروں اور کنایوں سے کام چلتا ہے کھل کر ذرا کہا ہوتا۔

غالب: بھائی ریختہ کے قصیدے میں کھل کر ہی نہیں بلکہ منہ پھٹ ہو کر عرض مدعا کیا ہے سنو:

پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں ذوق آرائش سرو دستار
کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر تانہ دے باد ز مہریر آزار
کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار
کچھ خریدا نہیں ہے اب کی سال کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار
رات کو آگ اور دن کو دھوپ بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
آگ تاپے کہاں تلک انساں دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار

آگے تنخواہ کے بارے میں سن لو۔

میری تنخواہ جو مقرر ہے اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
بس کے لیتا ہوں ہر مہینے قرض اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا ہو گیا ہے شریک ساہوکار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار

میری تنخواہ کیجئے ماہ بہ ماہ
تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

مہدی: ہاں یہ دو ٹوک بات ہے۔ اچھا ہے تشریف لے جایئے اور قسمت آزمائی کر دیکھئے۔

مادی: غرض کہ مہر نیمروز کا نسخہ اور قصیدہ لیکر غالب لال قلعہ پہنچے پیشی ہوئی حضرت بہادر شاہ نے مہر نیمروز پسند فرمائی اور کتابت کے لیے ارشاد ہوا قصیدہ سنا۔ کچھ دیر چپ رہے۔

ظفر بہادر شاہ: (آب دیدہ ہو کر) مرزا نوشہ میں نے اسے تاحال پوشیدہ رکھا تھا مگر اب سن لو کہ پچھلے مہینے انگریزی سرکار نے فیصلہ کیا ہے کہ میرے بعد بادشاہ کا خطاب موقوف ہو جائے گا اور خاندان شاہی کو قلعہ معلی میں بھی رہنے کی اجازت نہ ہو گی۔

(آہ سرد بھر کر)

اے ظفر باقی ہے تجھ سے انتظام سلطنت
بعد تیرے نہ ولی عہد و نہ نام سلطنت

مگر خیر۔ لو میری تازہ غزل سن لو۔ استاد ذوق کو پسند آئی ہے:

سب کار جہاں ہیچ ہیں سب کار جہاں ہیچ
اس ہیچ سے امید ہے اے ہیچداں ہیچ

جن ناموروں کے کہ جہاں زیر نگیں تھا
اب ڈھونڈیئے تو ان کا کہیں نام نشان ہیچ

ہو جنس تنک مایہ ہستی کے نہ خواہاں
یہ جنس یہ بازار یہ گوہر یہ دوکاں ہیچ

جو ہونی ہے ہو گی نہیں امکاں کہ نہووے
پھر فکر سے کیا فائدہ غیر از خفقاں ہیچ

کیا دیکھیں ظفر خانہ ہستی کا تماشہ
اس وہم کدہ میں ہے بجز وہم گماں ہیچ

غالب : پیرو مرشد سبحان اللہ۔ خوب ہے مگر یاس انگریزی لیے ہوئے۔

ظفر: مرزا نوشہ کبھی تم پر بھی ایسا وقت گزرا ہے اور تم نے ان لمحوں میں شعر کہے۔

غالب : مرشد میں ناچیز حقیر اس کے لائق کہاں ہوں کہ کوئی اچھا شعر کہوں البتہ چھ سات برس پہلے جب مجھے زنداں لے گئے تھے تو میں نے ایک "حبسیہ" لکھا تھا اجازت ہو تو اس کے کچھ شعر سنادوں؟

ظفر: ہاں مرزا نوشہ ضرور افسوس کہ استاد اس وقت موجود نہیں ہے جو داد دیتے۔

غالب : شروع میں کہا ہے۔

خواہم از بند بہ زنداں سخن آغاز کنم
غم دل پردہ دری کرد فغاں ساز کنم

ایک شعر ہے:

بے مشقت نہ .. قید بہ شعر آویزم
روز کے چند رسن تابی آواز کنم

اہل زنداں بہ سرد چشم خودم جا داوند
تابدیں صدر نشینی چہ قدر ناز کنم

ایک بعد کا بند اس طرح شروع ہوتا ہے
پاسباناں ہمہ آئید کہ من می آیم
در زنداں بکشائید کہ من ی آیم

ہر کہ دیدے بہ درخویش سپاسم گفتے
خیر مقدم بہ سرائید کہ من ی آیم

ظفر: مرزا تمہاری ظرافت اور خوش دلی نہ گئی میرا مضمون دوسرا ہے۔

غالب: مگر سرکار آخری شعر اور سن لیجئے عرض کیا ہے۔
شادم از قید کہ از بند معاش آزادم
از کف شحنہ رسد جامہ و نانم ایں جا

ظفر: ہاں مرزا میں مطلب سمجھا۔ سوچوں گا مگر بھئی کریم الدین کے مشاعرہ میں ضرور آنا۔ خدا معلوم کہ پھر دوبارہ مشاعرہ ہو کہ نہ ہو۔ میں بھی ابھی غزل بھیجوں گا۔ مرزا فخرو خود شریک ہوں گے اور اب کی بار پچھلے مشاعروں جیسا ہلڑ نہ ہو گا۔ یہ اور اچھا ہے کہ مصرع طرح کوئی نہیں ہے۔

غالب: پیرو مرشد جب حضور غزل بھیج رہے ہیں اور استاد ذوق اور مومن شریک ہو رہے ہیں تو اس حقیر کی کیا مجال کہ ارشاد عالی باسرو چشم نہ بجالائے۔

راوی: غرض کہ غالب لال قلعہ سے خالی ہاتھ اور اداس ہی لوٹے حویلی میں آئے تو ایک دوست کا خط ملا جس میں انہوں نے خیریت اور حال پوچھا تھا۔ کھانا تیار تھا مگر پہلے جواب کا رقعہ لکھ کر کلیان کے حوالے کیا تاکہ ڈاک میں ڈال آئے۔ لکھا تھا:

غالب: "..... مجھ کو دیکھو نہ آزاد ہوں نہ مقید نہ رنجور نہ تندرست نہ خوش ہوں نہ ناخوش' نہ مردہ ہوں نہ زندہ جئے جاتا ہوں' باتیں کئے جاتا ہوں' روٹی روز کھاتا ہوں' شراب گاہ گاہ پئے جاتا ہوں۔ جب موت آئے گی مر بھی رہوں گا۔ نہ شکر ہے نہ شکایت جو تقریر ہے بہ سبیل حکایت ہے۔"

راوی: سہ پہر کو غالب قیلولہ کر کے دیوان خانہ میں آئے ہی تھے کہ میرمہدی اور تفتہ استاد کو مشاعرہ میں لے جانے کے لیے آ پہنچے۔ غالب لال قلعہ میں پہلے ہی وعدہ کر آئے تھے۔ سوچا کہ جی بہل جائے [illegible] ہمراہ لے چل دیئے۔ مشاعرہ کا اہتمام نام کو میاں کریم الدین کے

سر، مگر دراصل زین العابدین خاں کے ذمہ تھا چنانچہ فرش فروش آؤ بھگت، ساز سامان کسی چیز میں کوئی کمی نہ تھی اور پہلی بار شہر کے اشراف اور اساتذہ کرام بڑی متانت سے باسلیقہ بیٹھے ہوئے تھے دستور کے مطابق پہلے ظفر بادشاہ پھر ولی عہد بہادر کی غزل پڑھ کر سنائی گئی۔ اس کے بعد مشاعرہ شروع ہوا جس میں پہلے نوجوان شاعروں کا نمبر آیا۔ نوجوانوں میں ایک فرانسیسی نژاد الیگزنڈر آزاد اور ایک ہندوستان عیسائی جارج پیلیس شوز بھی تھے۔ نازنین نے اپنے خاص انداز میں ریختی پڑھی۔ نوجوانوں کے بعد استادوں کی باری آئی اور ان میں بھی غالب کی تقریباً" سب کے بعد

غالب :

ابن مریم ہوا کرے کوئی میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے اب کسے رہنما کرے کوئی
بات پر واں زبان کٹتی ہے وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

راوی : اس مشاعرہ میں قابل ذکر منشی محمد علی تشنہ بھی ہیں۔ یہ ننگ دھڑنگ دوزانو بیٹھے جھوم رہے تھے کہ چوبدار نے لاکر شمع ان کے سامنے رکھ دی جب آنکھوں میں روشنی پڑی تو میاں تشنہ نے پھونک مار کر شمع گل کر دی اور کہا۔

تشنہ : میں بھی کچھ عرض کروں؟

حاضرین : فرمایئے۔

تشنہ : (نہایت آزادانہ لہجہ میں گاتے ہوئے)

آنکھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے
سب کی ہے تم کو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں
شمع ہے گل بھی ہے بلبل بھی ہے پروانہ بھی
رات کی رات یہ سب کچھ ہے سحر کچھ بھی نہیں
حشر کی دھوم ہے سب کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے
فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں
نیستی کی ہے مجھے کوچہ ہستی میں تلاش
سیر کرتا ہوں ادھر کی جدھر کچھ بھی نہیں
ایک آنسو بھی اثر جب نہ کرے اے تشنہ
فائدہ رونے سے اے دیدۂ تر کچھ بھی نہیں

راوی : غزل کا مضمون، آدھی رات کی کیفیت پڑھنے والے کی حالت، غرض یہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری محفل کو سانپ سونگھ گیا ہے اور ہر یہ عالم طاری تھا ادھر میاں تشنہ ہاتھ جھٹکتے ہوئے اور "کچھ

بھی نہیں' کچھ بھی نہیں" کہتے ہوئے اٹھے اور اسی عالم بے خودی میں دروازے سے باہر نکل گئے۔ ان کی "کچھ بھی نہیں' کچھ بھی نہیں" کی آواز بڑی دیر تک کانوں میں گونجتی رہی ذرا طبیعتیں سنبھلیں تو سب کے منہ سے بے اختیار یہی نکلا کہ "واقعی کچھ بھی نہیں"

(۳)

دہلی میں۔ غالب اور غدر ۱۸۵۷ء

راوی : میرٹھ سے باغی سپاہیوں کی آمد کے کچھ دن بعد غالب کوچہ قاسم جان میں دروازہ بند کیے بیٹھے ہیں کہ ایک آدمی دستک دیتا ہے اور ہرگوپال تفتہ کا رقعہ دے کر جواب کا منتظر ہے۔

تفتہ : قبلہ مدت سے خیرو عافیت کا طالب ہوں۔ دو حرف اگر لکھ دیں تو اطمینان ہو جائے۔

راوی : غالب فوراً جواب میں دستی رقعہ لکھتے ہیں اور آدمی کے حوالے کرتے ہیں۔

غالب : عزیزم مرزا تفتہ انگریز کی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے اس میں کوئی میرا امید گاہ اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز کچھ دوست کچھ شاگرد کچھ معشوق۔ سو وہ سب خاک میں مل گئے ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیونکر نہ دشوار ہو رہائے اتنے یار مرے کہ جواب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہو گا۔ موت کا طالب غالب۔

راوی : چند مہ بعد جب انگریز فوج شہر میں داخل ہوئی تو قتل و غارت کا بازار اور بھی گرم ہوا۔ خیر سے پٹیالہ کے سپاہیوں نے غالب کے محلّہ کی حفاظت کا ذمہ لے لیا اور غالب دستنبو کی ترتیب میں لگے رہے۔ ایک دن دستنبو کی ترتیب میں معروف تھے کہ دروازہ سے ٹھاکر امید سنگھ پوچھتے پاچھتے اندر داخل ہوئے۔

امید سنگھ : مرزا صاحب۔ بندگی بجالاتا ہوں۔

غالب : آیئے آیئے ٹھاکر صاحب۔ کہاں آ نکلے۔ میں تو مہینوں سے آپ کے خط کا منتظر تھا۔

امید سنگھ : میں ایک کام سے آگرہ آیا تھا مگر جب معلوم ہوا کہ انگریزی فوج نے دہلی پر قبضہ کر لیا ہے تو خیال ہوا کہ آپ کا حال معلوم کرلوں کہ کیسے گزری کہئے بسر اوقاف کیسے ہے؟

غالب : بسر اوقات! آپ نے بھی ایک کہی۔ بھائی نقدی زیور ایک دوست کے گھر رکھوا دیا تھا وہ لٹ گیا۔ اس کے بعد برتن بھانڈے بیچ کر گزارہ کیا۔ اب کپڑوں کی باری ہے۔ لوگ روٹی کھاتے ہیں اور میں کپڑا کھاتا ہوں۔ ایک پیسے کی آمد نہیں بیس آدمی روٹی کھانے والے موجود۔

امید سنگھ : تو پھر آئندہ کیا ہو گا۔

غالب : آئندہ دستنبو کے خاتمہ پر میں اسی کے بارے میں لکھ رہا تھا اسے پڑھ لو "جو حالت کہ اس وقت درپیش اس کا انجام یا موت ہے یا بھیک مانگنا پہلی صورت میں یقیناً" یہ داستان ناتمام رہنے والی ہے اور دوسری صورت میں نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ کسی دوکان سے دھتکارے گئے اور کسی دروازہ سے کوڑی پیسہ کچھ مل گیا۔ بس اپنی ذلت اور رسوائی کے سوا اب اس میں کچھ لکھنے کو باقی نہیں رہا!

امید سنگھ : خدا نہ کرے مرزا صاحب۔ آپ کے دشمنوں کو یہ دن دیکھنا نصیب ہوں۔ مگر یہ تو فرمایئے کہ آپ کا کلام تو محفوظ ہے اس قتل و غارت میں کہیں اس پر تو کوئی مصیبت نہیں آئی۔

غالب : میں نے جو کچھ نظم و نثر میں لکھا تھا وہ سب بھائی ضیاء الدین خاں نے جمع کیا تھا بلکہ کلیات فارسی 'پنج آہنگ' مہرنیمروز اور دیوان ریختہ کی سنہری جلدیں بنوائی تھیں۔ پھر ان سے لے کر ایک شہزادے نے اس کی نقل کرائی۔ مگر یہ دونوں کتب خانے اس ہنگامہ میں لٹ گئے اور میں دوستوں سے منت ساجت کر رہا ہوں کہ بھائی اگر کہیں یہ نسخے بکتے نظر آئیں تو ان کو میرے واسطے خرید لینا۔ مگر اس انتشار و ابتری میں ہوش کسے ہے۔

امید سنگھ : تو کیا انگریز فوج بھی اس لوٹ اور غارت میں شریک تھے۔

غالب : "ایک پرزہ جیب سے نکال کر) یہ شعر پڑھ لو مگر کسی سے ذکر نہ کرنا۔

بس کہ فعال ما یرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک
تشنہ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک
آدمی واں نہ جا سکے یاں کا

راوی : ابھی امید سنگھ نے شعر ختم بھی نہ کئے تھے کہ دروازہ پر دستک ہوئی اور ایک گورا مکان کے اندر داخل ہوا۔

گورا : اسد اللہ کون ہے؟ کرنل ان کو مانگتا ہے۔

راوی : ٹھاکر امید سنگھ کو رخصت کر کے غالب گورے کے ساتھ کرنل کی پیشی میں پہنچے۔

کرنل: براؤن ویل۔ تم مسلمان آدمی ہے؟
غالب: حضور آدھا!
کرنل براؤن: اس کا کیا مطلب ہے؟
غالب: حضور شراب پیتا ہوں' سور نہیں کھاتا وزیر ہند کی چٹھی دکھاتے ہیں۔
کرنل براؤن: (ہنس کر) تم سرکار کی فتح کے بعد پہاڑی پر سلامی کے لیے حاضر کیوں نہیں ہوئے۔
غالب: حضور! میں چار کہاروں کا افسر تھا وہ چاروں مجھے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ایسی صورت میں حاضری دیتا تو کیوں کر؟
کرنل براؤن: مرزا صاحب! ہم کو آپ کی وفاداری پر بھروسہ ہے۔ آپ جاسکتے ہیں۔
راوی: ماہ دو ماہ بعد دہلی میں امن قائم ہو گیا یعنی صدہا لوگوں کی جائدادیں ضبط ہوئیں ہزاروں مارے گئے اور دہلی ویران نظر آنے لگی۔ اس زمانے میں ایک دوست نے غالب سے پوچھا۔
ایک دوست: حامد علی خاں کی حویلی سنا ہے کہ نیلام ہو گئی۔ آپ نے نونڈ رائے سے مرافعہ کیوں نہ کرایا۔
غالب: مکانات کو حامد علی خاں کا کر کیوں کہتے ہو۔ وہ تو مدت سے ضبط ہو کر سرکار کا مال ہو گیا.... سنگ وخشت کا نیلام کر کے روپیہ داخل خزانہ ہوا.... جب بادشاہ اودھ کی املاک کا وہ حال ہو تو رعیت کی املاک کو کون پوچھتا ہے۔ تم اب تک نہیں کہ حکام کیا سمجھتے ہیں اور نہ کبھی سمجھو گے۔ کیسا نونڈ رائے کیسی نقل حکم کیسا مرافعہ؟ جو احکام کہ دہلی میں صادر ہوئے ہیں وہ احکام قضاو قدر ہیں ان کا مرافعہ کہیں نہیں۔
راوی: غالب ایک دن بیٹھے کہ چٹھی رساں نے علاؤ الدین احمد خاں کا خط لا کر دیا۔
علاؤ الدین: احمد خاں۔ قبلہ محترم۔ سنا ہے دہلی میں اب امن ہے۔ آپ نے جو دستنبو کی جلد کے بارے میں فرمایا ہے میرا خیال ہے کہ اس کا اہتمام دہلی میں بہتر ہو سکے گا۔ آخر دہلی عروس البلاد ہے ہر قسم کے آدمی وہاں بست ہوں گے۔
راوی: غالب اس پر جھلا اٹھے اور فوراً جواب لکھا۔
غالب: کل تمہارے خط میں دوبار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلی بڑا شہر ہے' ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ اے میری جان یہ وہ دلی نہیں ہے جس میں تم پیدا ہوئے ہو' وہ دلی نہیں جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے' وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے' وہ دلی نہیں ہے جس میں ۷ برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں' وہ دلی نہیں ہے جس میں ۵۱ برس سے مقیم ہوں۔ ایک کیمپ ہے اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنود۔ معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیہ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپیہ مہینہ پاتے ہیں۔ اناث میں سے جو پیرزن ہیں وہ کٹنیاں اور جوانیں

کسبیاں .... شہر کی امارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہنرمند آدمی یہاں کیوں پایا جائے۔"

راوی : مسلمان شرفاء میں دلی میں لے دے کر غالب' سلطانجی میں مولوی صدرالدین خاں اور میرٹھ میں مصطفیٰ خاں رہ گئے تھے اور لوگ انہیں سے بقیۃ السیف کا حال پوچھتے تھے۔ کبھی کبھی غالب خود بھی اپنے تاثرات قلمبند کر دیتے تھے مرزا یوسف کو لکھتے ہیں:

غالب : "یوسف مرزا! میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرت غم سے سودائی ہو جاتے ہیں عقل جاتی رہتی ہے اگر اس ہجوم غم میں میری قوت متفکرہ میں فرق آگیا ہو تو عجب ہے بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے پوچھو کہ غم کیا ہے غم مرگ غم فراق' غم رزق.... یہاں اغنیا اور امرا کے ازواج و اولاد بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں۔ بس معیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیے۔"

راوی : بالاخر غدر کے بعد غالب کی محتگی اس درجہ کو پہنچ گئی کہ نہ رہائشی مکان ڈھنگ کا رہا' نہ گزارے کے لیے ہی کوئی سبیل تھی قرض پنشن سب تبدلے دے کر چند ہندو دوست اور شاگرد رہ گئے تھے جنہیں غالب کی ضروریات کا خیال رہتا تھا۔ ایک دن اتفاق سے علاؤ الدین احمد خاں بھی آ نکلے۔

علاؤ الدین: پھوپا جان۔ اس سال مکان کی مرمت کا بھی کوئی انتظام ہے۔

غالب : میاں بڑی معیبت میں ہوں۔ محلسرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔ پاخانہ ڈھے گیا۔ چھتیں ٹپک رہی ہیں۔ تمہاری پھوپی کہتی ہیں ہا کے دبی ہائے مری۔ دیوان خانہ کا حال محرا سے بدتر ہے میں مرنے سے نہیں ڈرتا فقدان راحت سے گھبرا گیا ہوں۔

علاؤ الدین احمد :اور یہ خط کس کا ہے؟

غالب : منشی عبدالغفور کا۔ انہیں وہی رٹ ہے کہ قصیدہ کیوں نہیں لکھتے' تمہارا مرتبہ تو انوری اور خاقانی سے کم نہیں ہے۔ یہاں کھانے کو میسر نہیں قصیدہ کیا خاک لکھوں۔ پنشن مل جائے' حواس ٹھکانے ہو جائیں تو کچھ فکر کروں۔ اس عسرت میں تو رباعیاں ہی لکھی جا سکتی ہیں چنانچہ کل ہی ایک کہی ہے۔ فسق پر محمول نہ کرو تو تمہیں بھی سنا دوں۔

علاؤ الدین خاں قبلہ میں اور آپ کا نیاز مند شاگرد۔ ضرور ارشاد ہو۔

غالب :

یا رب تو کجائی کہ بماز رندہی
بے در و خدائی کہ بماز رندہی
نے نے تو نہ غالبیی دنے لے رحمی
بے مایہ چومائی کہ بما زر ندہی

علاؤ الدین خاں تو پھر آپ نے منشی عبدالغفور کو کیا جواب دیا۔ ان کا منشا یہ ہو گا کہ انگریزی حکام کی خوشنودی کے لیے قصیدہ کہئے۔ اس میں آخر عیب کیا ہے؟

غالب: میں نے منشی صاحب کو جو جواب لکھا ہے تم بھی سن لو

"کرم فرمائے بندہ... میں اموات میں ہوں۔ مردہ شعر کیا کہے غزل کا ڈھنگ بھول گیا' معشوق کس کو قرار دوں جو غزل کی روش ضمیر میں آوے۔ رہا قصیدہ ممدوح کون ہے... گورنمنٹ کے دربار میری طرف سے قصیدہ نذر گزرتا ہے اشرفیاں نہیں اور خلعت ریاست دودمانی کا' پارچہ اور ۳ رقم بیغہ سرپیچ مالائے مروارید مجھ کو ملا کرتا ہے۔ اب نواب گورنر جنرل بہادر یہاں آتے ہیں۔ دربار میں بلائے جانے کی توقع نہیں پھر کس دل سے قصیدہ لکھوں۔ مناعت شعراء عضاء و جوارح کا کام نہیں۔ دل چاہیے' دماغ چاہیے' ذوق چاہیے' امنگ چاہیے' یہ سامان کہاں سے لاؤں جو شعر کہوں۔

راوی: بالآخر یہ سامان بھی دوبارہ فراہم ہو گئے یعنی کچھ مدت بعد غالب کے تعلقات حکومت برطانیہ سے خوشگوار ہو گئے اور جب دوبارہ منشی عبدالغفور نے غالب سے خیر و عافیت پوچھی تو مرزا صاحب نے لکھا:

غالب: حقیقت میری مجملاً" یہ ہے کہ راہ و رسم مراسلت حکام عالی مقام سے بدستور جاری ہو گئی ہے۔ نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر غرب و شمال کو نسخہ دستنبو بہ سبیل ڈاک بھیجا تھا ان کا خط فارسی شعر تحسین عبارت و قبول صدق ارادت و مودت بہ سبیل ڈاک آ گیا۔ پھر قصیدہ بہاریہ تہنیت و مدحت میں بھیجا گیا اس کی بھی رسید آ گئی' وہی خان صاحب بسیار مہربان دوستاں القاب اور کاغذ افشانی۔ ازاں بعد ایک قصیدہ جناب رابرٹ مانٹگمری صاحب لیفٹیننٹ گورنر بہادر قلمرو پنجاب کی مدح میں بتوسط صاحب کمشنر بہادر دہلی گیا۔ اس کے جواب میں بھی خوشنودی نامہ بتوسط کمشنر بہادر کل مجھ کو آگیا۔ پنشن ابھی تک مجھ کو نہیں ملی۔ جب طے گی حضرت کو اطلاع دی جائے گی۔

راوی: بالآخر پنشن بھی مل گئی اور اب تعلقات حکام سے ایسے شگفتہ ہو گئے ایسے شگفتہ کہ غالب ان کے احسان کا دم بھرنے لگے' تھوڑے دن بعد جب انہوں نے منشی عبدالغفور کو لکھا تو ایڈ منسٹن صاحب چیف سیکرٹری کا ذکر خصوصیت سے کیا۔

غالب: جناب ایڈ منسٹن صاحب بہادر سے میں صورت آشنا نہیں... نامہ و پیام کی یوں بات ہے کہ جب کوئی نواب گورنر جنرل بہادر نئے آتے ہیں تو میری طرف سے ایک قصیدہ نذر جاتا ہے.... ایڈ منسٹن صاحب بہادر چیف سیکرٹری کا جو مجھ کو خط آیا تو انہوں نے باوجود عدم سابقہ معرفت میرا القاب بڑھایا قبل ازیں "خان صاحب بسیار مہربان دوستاں" میرا القاب تھا اس قدر شناس نے ازراہ قدر افزائی خان صاحب مشفق بسیار مہرباں مخلصاں لکھا۔ اب فرمائیے ان کو کیوں کر اپنا محسن اور

مربی نہ جانوں۔ کیا کافر ہوں جو احسان نہ مانوں"

راوی : غرض کہ اب غالب کی شراب دوبارہ جاری ہوئی اور دوستوں اور شاگردوں کے پھر جمگھٹے رہنے لگے۔ مگر اب مرزا بوڑھے ہو چلے تھے اور غدر ۱۸۵۷ء کے حادثہ نے ویسے بھی انہیں بے دم کر دیا تھا۔ اس دور میں انہیں خیال آیا کہ شاہنامہ کے انداز میں مثنوی ابر گوہر بار لکھیں تاکہ اسلامی فتوحات کی تاریخ اور مومنین کے لیے شاہنامہ کا کام دے۔ مگر تھے بہرنوع عقل پرست صوفی اور مے پرست شاعر۔ اپنی مے پرستی کا حوالہ دینا بھی مناسب سمجھا اور لطف یہ کہ اس پر شرمساری اور ندامت کا گمان تک نہ ہوا۔

غالب:

ہما ناتوانی کہ کافر نیم
پرستار خورشید و آذر نیم
نہ کشتم کسے را بہ اہر یمنی
نہ بردم ز کس مایہ در رہزنی
مگر مے کہ آتش بہ گورم از دست
بہ ہنگام پرواز مورم از دست
مے اندوہ گین و مے اندہ رباۓ
چہ ی کہ دم اے بندہ پرور خداۓ
حساب مے درا مش ورنگ و بو
ز جمشید و بہرام و پرویز جو
نہ از ہن کہ از تاب مہ گاہ گاہ
بہ در یوزہ رخ کردہ باشم سیاہ
نہ بستاں سراۓ نہ مے خانہ
نہ دستاں سراۓ نہ جانانہ
نہ رقص پری پیکراں بربساط
نہ نو خانے را شگراں در رباط

(۴)

دہلی میں۔ غالب کی موت سے کچھ پہلے

راوی: بلی ماروں کے محلہ میں کرایہ کا نیا مکان میر مہدی اور شیو نرائن چارپائی کے پاس مونڈھوں پر بیٹھے ہیں۔ غالب بستر پر پڑے گنگنا رہے ہیں۔

غالب:

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند ز خورشید نشانم دادند
رخ کشودند و لب ہرزہ سرایم بستند
دل ربودند ودو چشم نگرانم دادند
سوخت آتشکدہ ز آتش نفسم بخشیدند
ریخت بت خانہ ز ناقوس فغانم دادند
گوہر از تاج گسستند و بدانش بستند
ہرچہ بردند بہ پیدا بہ نہانم دادند

میر مہدی: قبلہ آپ نے جو کہا اگر اس کا کوئی تعلق ہماری تہذیب وادب کے مستقبل سے ہے تو کم از کم میں مایوس ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ شاہجہاں آباد اور لال قلعہ کے مٹنے کے بعد ہماری تہذیب کیسے سلامت رہ سکتی ہے اور اسے قائم کون اور کیسے رکھ سکتا ہے۔

غالب: میاں مہدی! کیا تم واقعی سمجھتے ہو کہ مغل بادشاہت میں رکھ رکھاؤ کے سوا کچھ رہ بھی گیا تھا' شاہ عالم کے بارے میں دلی والے کہا کرتے تھے کہ حکومت شہنشاہ' عالم از دہلی تاپالم۔ بادشاہ ظفر بہادر شاہ مرحوم تو بس لال قلعہ تک تھے اور ان کے مرنے کے بعد غدر نہ بھی ہوتا تو بھی شاہی خاندان قلعہ سے نکال دیا جاتا۔ میاں مستقبل کی سوچو یہ گڑے ہوئے مردے کب تک اکھاڑو گے۔

میر مہدی: میرا مطلب بادشاہت سے نہ تھا میں اس انتشار پر سوچ رہا تھا جو سو ڈیڑھ سو برس سے برپا ہے۔ دہلی نے اس زمانہ میں نادر گردی بھاؤ گردی جاٹ گردی' روہیلا گردی' غرض کہ طوفان ہی دیکھے ہیں اور ان طوفانوں میں جو شیرازہ بندی شہنشاہیت کے نام پر صدیوں سے جاری تھی اس کا تار پود ہمیشہ کے لیے بکھر گیا۔ اس اس کی جگہ نئی بنیاد کیا ہو گی' مجھے تو کوئی نظر آتی نہیں اور جو دکھائی دے رہا ہے وہ دل بندی ہے جس میں ہندو مسلمان سے شیعہ سنی سے' وہابی بدعتی سے دست بہ گریباں ہے۔

غالب: تو پھر میرا تو خیال ہے کہ ان بکھیڑوں نے آنے والوں کی منزل اور بھی آسان کر دی ہے۔

شیو نرائن: آسان یا مشکل۔ ہندوؤں میں تو فرقے مٹانے نکلے تھے وہ خود فرقہ ساز بن گئے۔

غالب: نہیں عزیزم آسان اور بہت آسان۔ میرا شعر یاد کرو۔

بس کہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

حقیقت یہ ہے کہ ان فرقہ وارانہ تعصبات سے ماورا اور بعید ہے میں تو بنی آدم کو مسلمان یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں دوسرا مانے یا نہ مانے۔ میرا خیال ہے اب زیادہ لوگ اس حقیقت کو سمجھیں گے۔

کفر و دیں چیست جز آلائش پندار وجود
پاک شو پاک کہ ہم کفر تو دین تو شود

شیو نرائن : بندہ پرور۔ سب مذہبوں کو ملا کر ایک نیا مذہب آخر اکبر نے بھی تو بنایا تھا مگر آخر میں اس کا انجام کیا ہوا۔ آج اس کا نام و نشان نہیں ہے ڈھونڈو تو بس تاریخوں میں مذکور ہے۔

غالب : مگر میاں شیو نرائن۔ بادشاہوں کے اختراع کردہ مذاہب کو انسانیت سے کیا تعلق اور پھر اس میں اکبر کی سیاسی مصلحتیں یہ کوئی گوتم بدھ کی واردات تھوڑی تھی۔ بادشاہت کے ہتھکنڈے تھے۔ میری مراد تو بس اتنی ہے۔ لو رباعی سنو۔

یارب بہ جہانیاں دل خرم دہ
در دعوی جنت آشتی باہم دہ
شداد پسر نداشت باغش ازتست
آں مسکن آدم بہ بنی آدم دہ

میر مہدی : مگر قبلہ یہ تو تصوف کے رمز ہوئے بتایئے یہ کہ اس نئی سماج کی بنیاد کیا ہو گی۔

غالب : بنیاد وہی اللہ کی دی ہوئی عقل۔ میں نے قاطع برہان کے مقدمہ میں لکھا تھا کہ "یزداں دل دانا و چشم بنیا بہر آں دادہ است کہ کار دانش و بینش ازیں ہر دو گوہر پر فرگیریم و ہرچہ نبگریم جز بہ دستوری دانش آں رانہ پذیریم" سو آج بھی میرا ایمان ہے اور میں اسی عقل کے بل پر مذاہب جداگانہ کی بجائے توحید خالص پر ایمان لاتا ہوں اور ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں لا الہ الا اللہ لا موجود الا اللہ لا موثر فی الوجود الا اللہ۔

شیو نرائن : مگر یہ عقیدہ تو اپنشد اور ہندوؤں کے بہت سے مذاہب میں مشترک ہے۔

غالب : میں نے کب کہا کہ نہیں ہے۔ ہندوؤں میں ہی نہیں نصرانی مجوس زردشتؔ مانی سب بندگان خدا نے یہی تعلیم دی ہے پھر اگر ہم اسے بھلا دیں تو ہماری غلطی ہے۔

میر مہدی : مگر دنیا کا انتظام، نظام مدنیت، حکومت، خاندان اس کی صورت کیا ہو گی۔

غالب : صورت کیا ہو گی؟ عقل کا ہے کے لیے ہے۔ آخر افلاطون اور فارابی نے اپنا نظام تمدن کس بنیاد پر قائم کیا تھا۔ اخلاق اصری نے کیا تعلیم دی ہے اور عملاً ایرانیوں کو دیکھو کہ انہوں نے دنیا کو کیسا سبق دیا تھا کہ آج تک ہر ایک ان کا تتبع کرتا چلا آتا ہے۔ آخر پچھلے ہزار برس میں ہم

ایرانیوں کے نقش قدم پر نہیں چلے تو حکومت اور تہذیب اور کہاں سے سیکھی ہے میاں ژند واوستا پڑھو۔

میر مہدی: مگر فرنگی کے راج کو کیا کہئے گا؟

غالب: فرنگی نے بھی آخر اپنے آئین ازروئے عقل ہی بنائے اور ہم سے بہتر بنائے ہیں۔ فرنگی کو کب دعویٰ ہے کہ میں ازروئے مذہب کلیسائی حکومت قائم کرنا چاہتا ہوں۔ فرنگی میں اور ہم میں بس اتنا فرق ہے کہ وہ عقل سے کام لیتا ہے اور ہم نہیں لیتے۔ میں نے اتنی سی ہی بات اپنی تقریظ میں کہی تھی کہ سید احمد خان برامان گئے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ:

شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

راوی: یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ تفتہ اپنی سنبلستان بغل میں دبائے دروازہ سے داخل ہوئے اور ایک خالی مونڈھے پر بیٹھ گئے۔

غالب: مرزا تفتہ۔ تم ہی فیصلہ کرو۔ میں بیٹھا اپنے کچھ شعر پڑھ رہا تھا وہی جو تمہیں بھی یاد ہوں گے۔

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

کہ ایک بحث اٹھ کھڑی ہوئی کہ ہماری تہذیب اور ہمارے ادب کا کوئی مستقبل ہے یا نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ہے گو معنوی اعتبار سے اس کی شکل بدل جائے گی۔ یہ حضرات نہیں مانتے۔

تفتہ: قبلہ میں تہذیب کے بکھیڑے میں تو پھنسنا نہیں چاہتا اس لیے کہ ہم سب کی تہذیب قطعاً" ایک اور یکساں ہے۔ ناموں میں بظاہر فرق ہے مگر سروست ہم سب مرزا صورت اور مرزا سیرت ہیں۔ فارسی پڑھتے اور لکھتے ہیں اور شعر کہتے ہیں یا یہ کہئے کہ کہنے کی کوشش کرتے ہیں یعنی ہم نو آموز لوگ مجھے تو صرف اس سے دلچسپی ہے کہ اس نظم و نثر اور اس ادب کا آئندہ کیا حشر ہو گا۔ بالفاظ دیگر یہ ایک عملی سوال ہے۔ آپ یہ بتائیے کہ ہم اب قلعہ معلی کے بعد کیا لکھیں کس کے لیے لکھیں اور کیسی زبان میں لکھیں میری مراد فارسی اور ریختہ دونوں سے ہے۔

غالب: آخر مشکل کیا ہے؟ یہ سوال تمہارا ہی نہیں جس میں اسکندر الیگزنڈر آزاد اور شور کا بھی ہے حالانکہ یہ سب نہ ہندو ہیں نہ مسلمان نہ قلعہ معلی کے وابستگان سے ہیں۔ ایک ادبی روایت چلی آتی تھی اور یہ لوگ بھی ہماری طرح اس کا تتبع کرتے تھے۔

تفتہ: ایمان کی بات ہے کہ مسجع اور مقفی عبارتیں نثر میں ان کا قدر کرنے والا اب کوئی نہیں ہے۔ آپ ہی انصاف سے کہئے کہ آپ نے جو تقریظ سید احمد خاں کی آثار الصنادید پر لکھی ہے اسے کون پڑھے اور سمجھے گا؟

غالب : مجھے اپنے ایمان کی قسم میں نے اپنے نظم و نثر کی داد باندازۂ بایست پائی نہیں۔ آپ ہی کہا آپ ہی سمجھا۔ مگر بہرحال جو روایت چلی آتی تھی اس میں بڑے سے بڑے اہل کمال کا تتبع کیا بلکہ ان کے ہم رتبہ اور ہم مرتبہ درجہ حاصل کرنے کی سعی کی۔

تفتہ : مگر ہم کیا کریں' ہم نوآموز تو آپ کے ہم مرتبہ ہونے کا حوصلہ نہیں رکھتے اور پھر مسجع نثر میں۔ نظم کی بات خیر دوسری ہے۔ یوں سمجھئے کہ از دل خیزد بردل ریزد اس کا نثر کا تو بادشاہت کے بعد کوئی پرسان حال ہے نہیں۔

غالب : عزیزم۔ تو اس میں اشکال کیا ہے جس طرح بہادر شاہ کا تخت و تاج اسی طرح کے لوازمات میں تمہاری نثر بھی تھی وہ بھی گئی تم اسی طرح لکھتے تھے جس طرح امرا اور شرفا بولا کرتے تھے۔ اب اس طرح لکھو جس طرح آپس میں بات چیت اس وقت کر رہے ہو۔ تحریر گویا وہ مکالمہ ہے جو باہم ہوا کرتا ہے۔ میرے خطوط دیکھو میں سمجھتا ہوں کہ مرزا صاحب نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے یہ زبان قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔ اس میر مہدی کو دیکھو۔ اردو عبارت لکھنے کا ڈھنگ کیا ہاتھ آیا ہے سارے جہاں کو سر پر اٹھایا ہے۔

تفتہ : مگر قبلہ' مہدی نوجوان ہے۔ میرے سامنے سوال پرانے اسلوبوں کو بھلانے کا ہے اور پرانی عادت جاتے جاتے ہی جائے گی۔ اپنی نئی نثر کا کوئی اصول بھی تو بتایئے۔

غالب : عزیز از جان۔ اصول کوئی خاص نہیں۔ میں نے مدت ہوئی اپنے فارسی رسالہ میں لکھا تھا:
"مکتوب الیہ را بہ لفظے کہ فراخور حال اوست آواز دہم وزمزمہ سنج مدعا گردم۔ القاب و آداب گوئی و عافیت جوئی حشو زاید است و پختگاں حشو را دفع نہند۔ نامہ نگار را باید کہ نگارش را از گزارش دور تر نبرد و نبشتن را رنگ گفتن دہد"
بس اس عام کلیہ کا لحاظ رکھنا کافی ہے۔

شونرائن : مگر مرزا صاحب نئی نسل کے سامنے تو عجیب و غریب مصیبت یہ آ کھڑی ہو گی کہ لوگ فارسی بھول جائیں گے اور اردو کی جگہ انگریزی زبان لینا شروع کر دے گی۔ آخر اردو تو شاہ صاحب کے خاندان کے لوگ بھی لکھا کرتے تھے' مگر میری مراد اردو سے وہ شستہ اوصاف زبان ہے جو قلعۂ معلی میں بولی جاتی تھی۔

میر مہدی : یہ کیوں نہ کہئے کہ اردو زبان خود اردو دانوں کو سکھائی جائے۔۔

شونرائن : مگر اس میں بگڑنے کی کیا بات ہے۔ میرا بس چلے تو مبتدیوں کے لیے اردو کا قاعدہ لکھدوں۔

غالب : عزیزم۔ دعا دو عارف مرحوم کے بچوں کو کہ ان کی بدولت میں نے اس کام کی ابتدا کر دی

ہے۔ یہ دونوں بچے انتہا درجہ کے شریر تھے اور میں نے ان کے بہلانے اور پڑھانے کے لیے قادر نامہ لکھا تھا۔ مجھے آج تک اس کا گمان بھی نہ تھا کہ یہ قاعدہ بھی کسی کام آ سکتا ہے مگر شوزائن کی بات سے مجھے اندازہ ہوا کہ شاید مفید ہو۔

تفتہ: مگر قبلہ! آپ نے تو اسے راز سربستہ ہی رکھا۔ اس کے کچھ حصے سنایئے۔

غالب: آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے میرا کوئی قصیدہ یا چیدہ غزل ہو۔ بھائی یہ بچوں کا قاعدہ ہے۔ سادہ زبان ہے ایک دو بچوں کے لیے غزلیں بھی ہیں۔

میرمہدی: بہرنوع کچھ سنا دیجئے۔

غالب: اچھا تو سنو۔

قادر اللہ اور یزداں ہے خدا
ہے نبی مرسل پیغمبر راہبر
پیشوائے دیں کو کہتے ہیں امام
ہے رسول اللہ کا وہ قائم مقام

اور آگے سبق:

اسم وہ ہے جس کو تم کہتے ہو نام
کعبہ مکہ وہ جو ہے بیت الحرام
تیغ کی ہندی اگر تلوار ہےفارسی پگڑی کی بھی دستار ہے
ہے قلم کا فارسی میں خامہ نام
ہے غزل کا فارسی میں چامہ نام
کس کو کہتے ہیں ۔غزل ارشاد ہو
ہاں غزل پڑھے سبق گر یاد ہو

اس کے بعد غزل بھی اسی انداز میں ہے یعنی غزل کیا بچوں کی تک بندی ہے تاکہ شوق ہو۔

تفتہ: تو پھر کیوں نہ کہیئے کہ آپ نے بھی خسرو کی طرح خالق باری لکھی ہے اور غزل کا اضافہ کر دیا ہے۔

غالب: تفتہ' بات تو یہی ہے اور اب میری سمجھ میں آتا ہے کہ خالق باری کی بدولت ہماری فارسی دانی اور عام تعلیم میں کتنا اضافہ ہوا۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ اگر خالق باری نہ لکھی گئی ہوتی تو نہ ہرکرن ہوتے نہ چندر بھان اور نہ میاں ہرگوپال تفتہ۔

تفتہ: تو پھر قادر نامہ کے بعد اردوئے معلی کی زندگی کے لیے عمردوام کی امید کی جا سکتی ہے۔

غالب: عزیزم۔ دوام کا نام نہ لو۔ بہادرشاہ کے پیشرو بھی ہمیشہ اپنی دولت کو "بہ ابد مقرون" لکھا

کرتے تھے تو اس کا حشر ان آنکھوں نے دیکھ لیا۔ یہ کھو کہ اردو کے بقا کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ میں اور تم بس کوشش ہی کرسکتے ہیں۔

راوی : یہ گفتگو جاری تھی کہ جواہر سنگھ اور علاؤ الدین خاں اور شریک ہو گئے مگر ان حضرات کے آنے سے فضا بدل گئی۔ اب ہر طرف سے تقاضا تھا کہ مرزا غالب ان عزیز شاگردوں کو کچھ کلام سنائیں۔ بلکہ شرط یہ بھی تھی کہ اس میں زار نالی کی بجائے امید اور شگفتگی ہو اور یاس کا پہلو کہیں نہ آنے پائے۔ طبیعت حوصلہ اور امنگ کی متلاشی نہیں۔

غالب : (کچھ سوچنے کے بعد)

اچھا لو سنو کہاں کا دکھڑا کہاں کا سوگ
شباب کو یاد کرو اور مست رہو

بقول خود میرے

ہمہ بروز گاری خندیم

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوت مژگاں کئے ہوئے
پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے
پھر پرشش جراحت دل کو چلا ہے عشق
سامان صد ہزار نمکداں کئے ہوئے
باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے
دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے
پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرض متاع عقل و دل و جاں کئے ہوئے
پھر چاہتا ہوں نامہ دلدار کھولنا
جاں نذار دلفریبی عنوان کئے ہوئے
مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس

زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے
اک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغ ے سے گلستاں کئے ہوئے
پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیر بار منت درباں کئے ہوئے
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

راوی : اب رات ہو چکی تھی اور غالب بھی تھکے ماندے تھے۔ سب شاگرد و سلام کر کے رخصت ہوتے ہیں۔

غالب کے خطوط کی اساس پر لکھی گئی بصری تمثیل (Teleplay) جو غالب کی ۱۲۲ ویں برسی کے موقع پر ۱۹۹۱ء میں پاکستان ٹیلی وژن سے نشر ہوئی۔

........اچھا کہیں جسے

تحریر : ابصار عبدالعلی

کردار :

۱ - میرزا غالب
۲ - مولانا حالی
۳ - نواب صاحب
۴ - بنارسی مہمان
۵ - خدا بخش (میرزا غالب کا ملازم)
۶ -میر مہدی مجروح
۷ - فقیر
۸ - منشی نبی بخش حقیر
۹ - میرزا حاتم علی مہر
۱۰ - لڑکی (مغنیہ) اس کے علاوہ
فقیرنی اور ہمراہی نمبر۱ - ہمراہی نمبر۲

کردار نمبر۱، ۲، ۴، ۵، ۶، ۷ اور ۱۰ بالترتیب محمد قوی، فاروق ضمیر، سہیل اصغر، انعام خان، خالد ابراہیم، حامد علی خان (گلوکار) اور ناصرہ کامران نے ادا کیے۔ غزلیں حامد علی خان اور ثمینہ زاہد نے گائیں۔ موسیقار خلیل احمد تھے اور اس بصری تمثیل کی ہدایات روحی اعجاز نے دیں۔

(منظر کھلتا ہے --- سکرین کے فریم میں ایک فرشی میز پر چند کاغذ' چند لفافے' قلم اور قریب رکھا ہوا ایک شمع دان- یہ غالب کا کمرہ ہے)

راوی : انداز بیاں غیر روایتی ہو تو اسلوب کہلاتا ہے- اس حوالے سے کچھ نام زبان پر آتے ہیں- ان میں ایک بہتوں پر غالب ہے-

(منظر وسیع ہوتا ہے --- فرشی میز پر کہنی ٹکائے غالب بیٹھے ہیں- اردگرد فرش پر بھی کچھ کتابیں بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی ہیں- دیواروں کے ساتھ جو شیلف اور الماریاں ہیں ان میں بھی کتابوں کے انبار ہیں- غالب کے چہرے پر اضطراب ہے' کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں- مضطرب ہو کر اٹھنے کی کوشش کرتے ہیں- نہ بھولا ہوا یاد آتا ہے اور نہ اٹھا جاتا ہے- اٹھنے کا ارادہ ترک کرکے سوچ میں غرق ہو جاتے ہیں)

راوی : نجم الدولہ' دبیر الملک' نواب میرزا اسد اللہ خان غالب جن کا یہ کہنا کہ ان کا انداز بیاں اور ہے' صرف ان کا اپنا قول نہ رہ سکا- ان کے عہد کا اعتراف بن گیا- اس کے بعد جو عہد آئے اور یہ عہد جس میں ہم اور آپ زندہ ہیں اس میں بھی غالب کا یہ قول تردید کے بغیر زندہ ہے- غالب تخلیق کے سفر میں شارع عام کے مسافر نہ تھے- یہاں تک کہ وضع میں' لباس میں' طعام میں' طریق ماند و بود میں بھی وہ عام روش پر چلنا گوارا نہ کرتے تھے-

غالب : (خود کلامی کا انداز)

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

راوی : ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

شعری ہنر میں تو غالب کے رقیب' قریب نہ سہی' کچھ فاصلے پر مل جاتے ہیں لیکن نثر میں دور دور تک کوئی ان کا ہمسر نظر نہیں آتا۔ ان کے خطوط' طرز میں اپنے عہد کی روش سے انحراف ہیں۔ انہوں نے رسمی القاب و آداب کے طولانی سلسلہ کو مراسلہ کے دامن سے یوں جھٹکا کہ مراسلہ 'گفتگو بن گیا۔ ان کے خطوط کا انداز ایسا ہے جیسے وہ بیسویں صدی میں جی رہے ہیں اور ٹیلی فون پر کسی سے ہم کلام ہیں۔ یا اس سے بھی سوا' وہ شخص جسے وہ خط لکھ رہے ہیں' ان کے روبرو ہے۔

(قلم اٹھا کر غالب نے اب خط لکھنا شروع کر دیا ہے۔ خط کی عبارت ہم غالب کی آواز میں سنتے ہیں اور غالب کی نظروں سے میرزا حاتم علی مہر کو غالب کے سامنے بیٹھا ہوا دیکھتے ہیں)

غالب : (خط لکھ رہے ہیں) میرزا صاحب! میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بہ زبان قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔ کیا تم نے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھائی ہے۔ اتنا تو کہو کہ یہ کیا بات تمہارے جی میں آئی ہے۔ برسوں ہو گئے کہ تمہارا خط نہیں آیا۔ نہ اپنی خیریت لکھی نہ کتابوں کا بیورا بھجوایا۔ ہاں میرزا تفتہ نے ہاترس سے خبر دی ہے کہ پانچ ورق پانچ کتابوں کے ان کو دے آیا ہوں اور انہوں نے سیاہ قلم کی لوحوں کی تیاری کی ہے۔

مہتمم مطبع کا خط پرسوں آیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ تمہاری چالیس کتابیں بعد رہنمائی لینے سات جلدوں کے اسی ہفتہ میں تمہارے پاس پہنچ جائیں گی۔ ایسا لکھو کہ آنکھوں کی گرانی اور دل کی پریشانی دور ہو۔ خدا کرے ان ۳۳ جلدوں کے ساتھ یہ سات جلدیں عنایتی بھی آئیں۔

میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا۔ نواب ضیاء الدین اور نواب حسین میرزا جمع کر لیتے تھے۔ جو میں نے کہا انہوں نے لکھ لیا۔ ان دونوں کے گھر لٹ گئے۔ ہزاروں روپیہ کے کتب خانے برباد ہوئے۔ اب میں اپنے کلام کے دیکھنے کو ترستا ہوں۔

(دور سے آتی ہوئی آواز --- غالب کی غزل کوئی فقیرانہ انداز میں گا رہا ہے۔ غالب کی توجہ جیسے ہی اس آواز کی طرف مبذول ہوتی ہے تو خط کی تحریر رک جاتی ہے۔ میرزا

حاتم علی مہر نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ فقیر کی آواز
قریب ہوتی جا رہی ہے)

درد منت کش دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا' برا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو — اک تماشا ہوا' گلہ نہ ہوا
ہے خبر گرم ان کے آنے کی — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب — گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

(غالب خوش الحان فقیر کی آواز میں اپنی غزل سن کر خط
ادھورا چھوڑ دیتے ہیں۔ بے اضطرابی میں ادھر ادھر دیکھتے
ہیں۔ پھر اسی عالم میں کھڑے ٹہلنے لگتے ہیں۔ کھڑکی سے باہر
جھانکتے ہیں' کبھی دروازے تک آ کر لوٹ جاتے ہیں۔ آخر
کمرہ سے نکل کر سیڑھیاں اترنے لگتے ہیں۔ بے کلی بڑھتی جا
رہی ہے۔ سمجھ نہیں پا رہے کہ کیا کیا جائے۔ ایک سیڑھی پر
جو درمیان میں ہے' بیٹھ جاتے ہیں)

غالب : ہوئے ہیں پاؤں پہلے ہی نبرد عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے' نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے
(شعر پڑھ کر غالب پھر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ چہرے کے
اضطراب میں اشتیاق کا امتزاج جھلک رہا ہے۔ تیزی سے
بقیہ سیڑھیاں اتر کر صحن میں دانہ چگتے ہوئے کبوتروں
کے جھرمٹ کو چیرتے ہوئے ڈیوڑھی کی طرف بڑھتے ہیں
جہاں ان کا ملازم خدا بخش کھڑا ہوا ہے)

غالب : یہ غزل کون گا رہا ہے؟

خدا بخش : نہیں معلوم۔ مگر ہاں باہر ڈیوڑھی کی چوکھٹ پر ایک گداگر بیٹھا تھا یقیناً اسی کی آواز ہے۔

(غالب ڈیوڑھی میں داخل ہو کر دروازہ کھولتے ہیں۔ مگر
چوکھٹ پر ایک فقیر کو کاسہ لیے بیٹھا دیکھ کر مایوس ہو جاتے
ہیں کہ فقیر کی آواز دور سے پھر سنائی دیتی ہے جس کی زبان
پر غزل کا مقطع ہے)

فقیر : کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

غالب : کون ہے یہ؟ دیکھنا تو خدا بخش۔ ہاتھ لگے تو بلاؤ ذرا۔

(خدا بخش باہر دوڑتا ہے اور غالب بے اضطرابی کے عالم میں
ٹہلتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں بول رہے ہیں)

غالب : کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں...... ارے بھئی لوگو! غالب تو اپنی یادداشت سے مغلوب ہو کر رہ گیا ہے۔ اب نہ پچھلا کہا یاد ہے' نہ آگے کچھ کہا جاتا ہے۔ پھر غالب غزل سرا ہو تو کیونکر۔

(خدا بخش فقیر کو ساتھ لے کر آتا ہے)

خدا بخش : درویش کہتا ہے' وہ تو ڈیوڑھی کے آگے کافی دیر رکا رہا۔

فقیر : ہاں بھائی.... رکا تو رہا' غنی کا دروازہ ہوتا تو کھل جاتا۔

غالب : تم بجا کہتے ہو میاں۔ یہ دروازہ تو ایک فقیر کا ہے جو اب محض دل کی حد تک غنی رہ گیا ہے۔

فقیر : (کاسہ بڑھاتا ہے) اللہ خیر کرے' کچھ ڈال دے فقیر کے کاسہ میں۔

غالب : میں تو تیرے آگے سوالی ہوں درویش۔ یہ غزل جو تو گا رہا تھا کس کی ہے؟

فقیر : کہتے ہیں کوئی شاعر ہے' غالب' اس کی ہے۔

غالب : تو اسے جانتا ہے؟

فقیر : میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ جس دن میں یہ غزل گاتا ہوں' اس دن میں بھوکا نہیں سوتا۔

غالب : تو غالب سے ملنا چاہے گا؟

فقیر : فقیر کو غالب سے مل کر اور کیا ملے گا' اس کی یہ غزل ہی کافی ہے۔

غالب : کاش تیری قناعت مجھے مل جاتی.... کیا یہ غزل تو مجھے دے سکے گا۔

خدا بخش : ارے بھائی۔ یہ حضرت جو تم سے ہم کلام ہیں' یہی نواب اسد اللہ خان غالب ہیں۔ اور یہ غزل جو تم گا رہے تھے' ان کی ہی ہے۔

فقیر : پھر یہ مجھ سے کیوں مانگ رہے ہیں۔ ان کی ہے تو ان کے پاس کیوں نہیں ہے؟

غالب : تو ٹھیک کہتا ہے بھائی۔ اس فقیر کے پاس تو کچھ بھی نہیں رہا۔ (گلا رندھ جاتا ہے' آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں) تو فقیر ہے' اس حقیر کو بھی فقیر جان اور اس کی جھولی میں یہ غزل ڈال دے۔ آج تو غنی بن جا۔

(فقیر غالب کا بڑھا ہوا ہاتھ دیکھ کر خاموش ہے' حیرت سے غالب کو دیکھ رہا ہے)

غالب : کیوں بھئی تامل کیوں؟ فقیر کو غنی ہونے کا شرف ملے تو کفران نعمت نہیں کرنا چاہئے.... یہ غزل میری ہے' میرے پاس نہیں رہی' نقل کرکے واپس کر دوں گا۔ دو گھڑی انتظار کر لو .... واپس کر دوں گا' ہاں بھائی بس دو گھڑی۔

(فقیر گدڑی میں سے کاغذ نکال غالب کے حوالے کرتا ہے۔ غالب کی آنکھوں کے آنسو اب واضح طور پر نظر آ رہے ہیں' نہیں معلوم یہ خوشی کے ہیں یا فقیر کے آگے دست طلب دراز کرنے پر امڈ پڑے ہیں کہ اس طرح ان کی انا پر چوٹ پڑی ہے)

غالب : (کاغذ کو مٹھی میں بھینچ کر) بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

DISSOLVE

(غالب اسی جگہ آ بیٹھے ہیں جہاں خط ادھورا چھوڑ کر فقیر کی آواز کی طرف چلے گئے تھے۔ تحریر کا سلسلہ دوبارہ شروع کرتے ہیں۔ حاتم علی مہر' جن کے نام غالب ادھورا خط مکمل کرنے لگے ہیں' دوبارہ نمودار ہو جاتے ہیں جنہیں ہم غالب

کی سی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

غالب : (خط لکھ رہے ہیں) ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی' ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اس نے وہ کاغذ مجھ کو دکھایا۔ یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا۔ غزل تم کو بھیجتا ہوں۔ صلہ میں اس ے اس خط کا جواب چاہتا ہوں۔۔ تمہارا غالب

(قلم رکھ کر خط کو لفافے میں بند کرتے جاتے ہیں اور یہ شعر پڑھتے جاتے ہیں)

غالب : قدر سنگ سر رہ رکھتا ہوں سخت ارزاں ہے گرانی میری

FADE OUT

2

(غالب کے گھر کا صحن۔ کبوتروں کی ڈھابلی بائیں جانب ہے جس کے ساتھ دالان ہے۔ دوسری جانب چند کمرے۔ پہلو سے سیڑھیاں اوپر ایک برآمدہ میں جاتی ہیں جس کے بعد غالب کا کمرہ ہے۔ صحن میں سیڑھیوں کے مخالف سمت ڈیوڑھی سے صحن میں داخل ہونے کا دروازہ ہے۔

صحن کے درمیان میں کبوتروں کا غول دانہ چگ رہا ہے۔ سیڑھیوں کے قریب ایک پنجرہ لٹکا ہوا ہے جس میں پروں میں سر دیئے طوطا بیٹھا ہے۔ غالب ڈیوڑھی کے دروازہ سے صحن میں داخل ہوتے ہیں۔ چند لمحے کبوتروں کے پاس رکتے ہیں۔ پھر اس طرح کہ کبوتر ڈسٹرب نہ ہوں' بچتے ہوئے سیڑھیوں کی جانب بڑھنے لگتے ہیں' طوطے کو دیکھ کر ٹھہرتے ہیں)

غالب : میاں مٹھو! تمہارے جورو نہ بچے ۔ تم کس فکر میں بیٹھے ہو؟

(غالب چند لمحے طوطے پر نظر جمائے مسکراتے ہیں اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر برآمدے میں پہنچ جاتے ہیں۔ برآمدہ میں فرش پر چاندنی بچھی ہے۔ کچھ کاغذات اور قلم دوات رکھے ہیں۔ ایک پیک دان بھی ہے۔ وہاں غالب کا ملازم خدا بخش ایک سادہ فرغل لیے ان کا منتظر ہے۔ غالب مجلسی فرغل اتارتے ہیں۔ ملازم انہیں دوسرا سادہ فرغل پہننے میں مدد کرتا ہے۔ قلم دوات درست کرتا ہے۔ غالب گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے ہیں)

غالب : کاغذ اٹھاؤ خدا بخش۔ دن ہو گئے یاروں سے مکالمہ نہیں ہوا۔
خدا بخش : (کاغذ دیتے ہوئے) بنارس سے کوئی صاحب آئے تھے۔ ہمراہ دو بشر اور بھی تھے۔ میں نے کہا نواب صاحب کچہری گئے ہیں اور دوپہر ملیں گے۔ اب آئیں تو ملا دوں؟
غالب : جب سب کچھ خود کہہ سن لیا تو ملاقات مجھ پر کیوں چھوڑ دی؟
خدا بخش : کہتے تھے سیکڑوں کوس سفر کیا ہے۔ آپ کے سودائی ہیں۔ آپ کے نیاز کو ہی دلی آئے ہیں۔
غالب : اب آئیں تو اوپر ہی لے آنا۔ دو گھونٹ پانی تو پلاؤ (خود کلامی)

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

(خدا بخش پانی لاتا ہے۔ پی کر کٹورا واپس کرتے ہیں اور قلم اٹھا لیتے ہیں)

غالب : تم جاؤ خدا بخش

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ' ساقی کو کیا ہوا تھا

(غالب خط لکھنے کا آغاز کرتے ہیں۔ میر نبی بخش حقیر' جنہیں غالب خط لکھ رہے ہیں سامنے آ بیٹھے ہیں۔ یہ غالب کا تصور ہے جسے ہم غالب کی ہی نظر سے دیکھ رہے ہیں)

غالب : (خط لکھ رہے ہیں) بھائی صاحب! حال منشی عبداللطیف اور ذکیہ کا معلوم ہوا۔ گرمی کا موسم ہے۔ میں جانتا ہوں ان دونوں کو زہر مہرہ کا استعمال مفید ہوگا۔ کبھی کبھی شربت نیلوفر میں تمس کر پلایا کریں اور چاٹ لیا کریں۔ بھائی لڑکوں کا گھر ہے۔ شربت نیلوفر' شربت بنفشہ' عرق نعناع کی سکنجبین' عرق کاسنی' عرق بادیان اس طرح کی چیزیں گھر میں تیار کرو۔ گاہ گاہ استعمال میں آتی رہیں۔

آپ کی کتاب کی فکر میں ہوں۔ اگر اجل اماں دیتی ہے تو لکھ کر بھیجے دیتا ہوں۔ ہمایوں کا حال پندرہ سطر کے مسترے چار جز میں آیا ہے۔

خدا بخش : (آتا ہے) وہ بنارسی مہمان آ گئے ہیں۔

(خط کی تحریر کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ میر نبی بخش حقیر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں)

غالب : کیا بے وقت آئے۔ میر نبی بخش حقیر سے آدھی ملاقات بھی پوری نہ ہو سکی۔ بلا لو۔ صبح بنارس کے طفیل سمع خراشی بنارسی بھی برداشت کر لیں گے۔

(خدا بخش جاتا ہے۔ غالب پھیلے ہوئے کاغذ درست کرتے ہیں۔ بنارسی مہمان کے ہمارہ دو لوگ اور بھی ہیں جنہیں لا کر خدا بخش ایک جانب کھڑا ہو جاتا ہے۔ غالب مہمانوں سے بیٹھے بیٹھے ہاتھ ملاتے ہیں۔ ادھر تینوں مہمان مصافحہ کرنے کے بعد غالب کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں)

بنارسی مہمان : بڑا اشتیاق تھا شرف ملاقات کا۔ آنکھوں پر یقین نہیں کہ حضرت غالب کے سامنے آ بیٹھا ہوں۔

غالب : ہاں صاحب تم دلی کی گلیوں کے شیدائی اور ہم بنارس کی صبح کے۔ سفر کلکتہ کے دوران بنارس میں بھی قیام رہا۔ اچھا لگا تمہارا شہر۔

بنارسی مہمان : دلی کے مقابلہ میں بنارس کہاں۔ بنارس کی سیکڑوں صبحیں آپ پر نثار۔ میں تو آپ کے کلام نیک نام کا شیدائی ہوں۔ اور وہ ایک شعر آپ کا واہ واہ۔ پڑھتا ہوں اور سر دھنتا ہوں۔ کبھی شاہیں بھول جاتا ہوں۔

غالب : ارشاد تو ہو وہ کون سا شعر ہے میرا؟

بنارسی مہمان : واہ واہ سبحان اللہ کیا شعر ہے۔ دل میں سما کر رہ گیا ہے۔ واہ واہ (بقیہ دونوں ہمراہی بھی واہ واہ میں شامل ہو جاتے ہیں) جزاک اللہ شعر تو بہت سنے مگر یہ شعر۔ حضرت آپ نے تو کمال ہی کر دیا۔ واہ واہ سبحان اللہ!

غالب : ہم ہیں مشتاق اور وہ --- بھئی وہ شعر بھی تو سنا دیجئے۔

بنارسی مہمان : بھئی واہ۔ یہ شعر بس نواب میرزا اسد اللہ خان غالب کا ہی حصہ ہے۔ وہی لکھ سکتے ہیں.... واہ سبحان اللہ کیا خوب کہا ہے۔

غالب : (اشتیاق حد سے بڑھ چکا ہے) ارشاد!

بنارسی مہمان : (سر دھنتے ہوئے) اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

ہمراہی نمبر ا اور
ہمراہی نمبر ۲ :
(ایک ساتھ) واہ واہ جزاک اللہ، سبحان اللہ!

غالب : (جو شعر سننے کے اشتیاق میں تقریباً اٹھ گئے تھے، سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں) --- لاحول ولا....

(غالب شرمندہ بھی ہیں اور بدمزہ بھی۔ تینوں ملاقاتی حیرت
سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں)

غالب : کہاں سے اٹھالائے بھائی۔ یہ تو کسی اور کی جوتی ہے۔ اپنی ہوتی تو سر تسلیم خم کر دیتا۔ استغفراللہ۔ کس کا شعر ہے؟

بنارسی مہمان : (نہایت معصومیت کے ساتھ) آپ کا --- کیا آپ کا نہیں؟

غالب : نہیں بھائی نہیں! پشیمان ہوں۔ کچہری جانے سے پہلے تم سے ملاقات کیوں نہ کر لی --- بیان حلفی لکھوا لیتا۔ یہ شعر میرا نہیں ہے۔

بنارسی مہمان : واقعی!

غالب : حد چاہئے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہ گار ہوں، کافر نہیں ہوں میں

بنارسی مہمان : یہ شعر آپ کا نہیں تو کس شاعر کا ہے؟

غالب : یہ شعر کسی شاعر کا نہیں ہو سکتا۔ اور اگر واقعی کسی شاعر ہی کا ہے تو قسم وحدہ لا شریک کی، علیؑ مشکل کشا کی، میرا ہرگز نہیں ہے۔ ایسی مبتذل رعائتیں میرے شعر کا شرف کیونکر بن سکتی ہیں۔

(غالب کو بے مزہ دیکھ کر خدا بخش تینوں مہمانوں کو اٹھاتا ہے
اور واپس لے جاتا ہے۔ غالب سر جھٹک کر دوبارہ قلم اٹھا
لیتے ہیں۔ خط لکھنا شروع ہی کرتے ہیں۔ ہم غالب کی
نظروں سے میر نبی بخش حقیر کو دوبارہ غالب کے سامنے بیٹھا
ہوا دیکھتے ہیں)

غالب : ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

(غالب موڈ کی تلخی کو کم کرنے کی کوشش میں اپنے تصور میں
سامنے بیٹھے میر نبی بخش حقیر سے خیالی تخاطب کرتے ہیں)

غالب : لو بھئی میر نبی بخش حقیر ہم تم سے پھر مکالمہ کرتے ہیں۔ سخن فہمی کا معیار ...
حقیر : (جملہ مکمل کرتے ہوئے)... اس حد تک گر گیا ہے' تصور میں بھی بھی نہیں تھا۔ آشوب شہر نے انحطاط مذاق کو کہاں تک پہنچا دیا ہے
غالب : دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
سلامت رہو بھائی میر نبی بخش حقیر' میرے دل کی بات کہہ دی۔ لو اب تحریر سے مکالمہ کا
ادھورا سلسلہ جوڑتا ہوں۔

(غالب خط لکھنا شروع کرتے ہیں)

غالب : ....ایک بات تم کو معلوم رہے کہ جب حضور میں حاضر ہوتا ہوں تو اکثر بادشاہ مجھ سے ریختہ طلب کرتے ہیں۔ سو وہ کہی ہوئی غزلیں تو کیا پڑھوں۔ نئی غزل کہہ کر لے جاتا ہوں۔ آج میں نے دوپہر کو یہ غزل کہی ہے۔

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے
نہ بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

(غالب سر جھکائے خط لکھنے میں منہمک ہیں کہ بے خبری میں
نواب صاحب آ کر بیٹھ جاتے ہیں)

نواب صاحب : سمع خراشی کی معذرت چاہتا ہوں حضرت۔ کچھ آم لایا تھا۔ خدا بخش کو سواری سے اتارنے کو بھیجا ہے اور بلا اجازت نازل ہو گیا ہوں۔

غالب : نواب صاحب! اگر نزول اتنا شیریں ہو کہ ملاقاتی ہمراہ آموں کے آئے تو سمع خراشی جائز اور اجازت ناجائز ہو جاتی ہے۔ تشریف رکھئے۔

نواب صاحب : (بیٹھتے ہوئے) آپ بھی مصروف ہیں۔ بس چند لمحے لوں گا۔ اور ایک وعدہ ..... فرمایئے تشریف لائیں گے؟

غالب : مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

غالب : سبحان اللہ۔ تقریب یوں ہے کہ سلاطین زادوں نے باہم مل کر ایک محفل سخن کا اہتمام کیا ہے۔ چاہتے ہیں کہ حضرت بھی قدم رنجہ فرمائیں۔

غالب : نہیں بھئی۔ وہ بیٹروں اور امیلوں کی محفلیں سجائیں۔ ہمیں مدعو کرنے کا ذوق ان میں کیوں کر پیدا ہو گیا۔

نواب صاحب : میں تو آپ کی نظر عنایت کا یقین لے آیا تھا۔

غالب : (کچھ سوچ کر) نہیں بھئی نہیں۔ پھر یہ کہ تازہ کلام بھی نہیں' کیا لے کر آؤں؟

نواب صاحب : ابھی کچھ گنگنا تو رہے تھے آپ۔ نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے۔

غالب : کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

نواب صاحب : بات تو کچھ بنتی نظر آ رہی ہے مرزا صاحب۔

غالب : نواب صاحب! یہ غزل میں نے بادشاہ سلامت حضرت بہادر شاہ ظفر کی نذر کے لیے کہی ہے۔ کل یا پرسوں لے کر جاؤں گا۔

نواب صاحب : اس خاکسار کو ہی عنایت کر دیجئے۔ قلعہ میں تو یہ جائے گی ہی۔ پرسوں نہ سہی کل سہی۔

غالب : چلو نواب صاحب! اس طرح کر لو' غزل لے جاؤ' مجھے چھوڑ دو۔ مگر ہاں غزل قلعہ کے علاوہ کہیں اور نہ جائے۔

نواب صاحب : تشکر مرزا صاحب۔ آپ نے میرا دل ہی نہیں لاج بھی رکھ لی۔

(غزل لے کر مصافحہ کرتے ہیں اور سیڑھیوں سے نیچے آتے
ہیں۔ سیڑھیوں کے درمیان رکتے ہیں۔ غزل کو چوم کر ایک
جانب نظریں ٹھہرا کر مسکراتے ہیں اور غالب کا جملہ خود کلامی
کے انداز میں دہراتے ہیں)

نواب صاحب : (خود کلامی ....) "ہاں مگر غزل کہیں اور نہ جائے" .... لیکن میرزا صاحب خوشبو پھول سے نکل کر کہاں کہاں جائے گی، کون کہہ سکتا ہے۔

DISSOLVE

3

(بالا خانہ، شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ کی سجاوٹ، مجرا جاری ہے، شائقین میں نواب صاحب بھی شامل ہیں۔ لڑکی غالب کی وہی غزل گا رہی ہے جو نواب صاحب قلعہ کے مشاعرہ کے لیے لائے تھے)

لڑکی :

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے
میں بلاتا تو ہوں ان کو مگر اے جذبہ دل
ان پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے
کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

DISSOLVE

4

(غالب پر کیمرہ واپس آتا ہے' غالب اوپر والی منزل کے اسی برآمدہ میں جہاں سے نواب صاحب غزل لائے تھے' بیٹھے ہوئے خط مکمل کر رہے ہیں۔ غالب کی نظر سے ہم میرنی بخش حقیر کو غالب کے سامنے بیٹھا ہوا دیکھتے ہیں)

غالب : عشق پر زور نہیں' ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے
اگر ریختہ پایہ سحر یا اعجاز کو پہنچے تو اس کی یہی صورت ہوگی یا کچھ اور شکل --- تمہارا غالب

(خط کے خاتمہ کے ساتھ ہی میرنی بخش حقیر بھی غائب ہو جاتے ہیں)

FADE OUT

5

(سب پہلے والا سیٹ یعنی غالب کا کمرہ)

راوی : کہا تو یہ بھی جاتا ہے کہ غالب کی تخلیقی ذات کے اصل جوہر ان کی نثر خصوصاً اردو نثر میں کھلتے ہیں جو انہوں نے کم لکھی اور یہ نثر بھی وہ جس نے خطوط نویسی کے اسلوب میں نئی طرز کے امکانات کو دریافت کیا۔ نثر میں ان کا کام اور بھی ہے۔ قاطع برہان' دستنبو' چند دیباچے' اور چند تقریظیں جو انہوں نے دوستوں کی فرمائش پر لکھیں یا پھر کچھ رسالے لکھے جو برہان قاطع کے طرفداروں کے جواب تھے۔ مرنے سے چند روز پہلے ایک قصہ لکھنے کا آغاز بھی کیا تھا جو انجام کو نہ پہنچ سکا۔ اس تھوڑے سے نثری سرمایہ میں جو اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ہے جہاں وہ سب سے بالا اور مختلف نظر آتے ہیں وہ ان کے خطوط ہیں۔ یہ خطوط بیک وقت غالب کی سوانح کا ثقہ حوالہ بھی ہیں' تاریخی سرمایہ بھی جن سے زبان کی تشکیل کے عمل کا سراغ بھی ملتا ہے اور غالب کے عہد کے جذباتی' معاشرتی اور سیاسی احوال کی تصویر بھی بنتی ہے۔

(منظر وسیع ہو تا ہے۔ غالب میر مہدی مجروح کو خط لکھ رہے
ہیں اور ہم غالب کی آنکھوں سے میر مہدی مجروح کو غالب
کے روبرو بیٹھا دیکھ رہے ہیں)

غالب : میاں!
اب اہل دلی یا ہندو ہیں یا اہل حرفہ یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں۔ لکھنؤ کی آبادی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی، باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں۔
..... یاد کرو۔ میرزا گوہر کے باغیچہ کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ باغیچہ کے صحن کے برابر ہو گیا ہے۔ کشمیری دروازہ کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب آہنی کلکتہ دروازہ سے کابلی دروازہ تک میدان ہو گیا۔ جرنیل بی بی کی حویلی، سعادت خان کا کٹرہ، صاحب رام کا باغ، حویلی، ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا۔ اب شہر نہیں ہے، کیمپ ہے۔ چھاؤنی ہے نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر۔
الور کا حال کچھ اور ہے۔ مجھے اور انقلاب سے کیا کام؟ الگزنڈر ہڈلے کا کوئی خط نہیں آیا۔ ظاہرا ان کی مصاحبت نہیں ورنہ مجھ کو ضرور خط لکھتا رہتا۔ میر سرفراز حسین اور میرن صاحب اور نصیرالدین کو دعا کہنا۔

(خط مکمل کر کے نظر اٹھاتے ہیں تو مولانا حالی کو آتا دیکھتے ہیں
جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میر مہدی مجروح خط
کے خاتمہ کے ساتھ غائب ہو جاتے ہیں)

حالی : (قریب آکر) بندہ ناچیز الطاف حسین۔
غالب : (کان پر ہاتھ رکھ کر آگے جھکتے ہوئے) بہرہ ہوں میں تو چاہئے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر
حالی : (قدرے اونچی آواز) خاک پا الطاف حسین۔
غالب : اچھا اچھا ..... الطاف حسین حالی۔ مولانا ذکر تمہارا نواب مصطفیٰ خان نے کیا تھا۔ سو منتظر تھا کہ آؤ گے۔ کہو سب خیر و عافیت۔
حالی : خدا کا شکر ہے۔ اپنی سنائیے۔

غالب : ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

حالی : خدا آپ کو صحت کامل اور عمر خضر عطا کرے۔

غالب : نہیں میاں۔ یہ دعائیں کسی اور کے لیے اٹھا رکھو۔

جیتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

حالی : ہم نے غالب کو رجائی اور بذلہ سنج سنا تھا۔ یہ ناامیدی کیسی۔ چھوڑیئے یہ مشقت اب آرام فرمائیے۔

غالب : تم خط لکھنے کو مشقت کہتے ہو گر میرے لیے راحت اور رحمت ہے۔ میاں اب چل چلاؤ ہے۔ شاعری چھوڑی ہی سمجھو پر ملاقاتیں کیونکر چھوڑ دوں۔ بظاہر خط لکھتا ہوں۔ درحقیقت ملاقات کرتا ہوں۔ ابھی میر مہدی مجروح کو خط لکھ رہا تھا۔ وہ میرے سامنے تمہارے پہلو میں بیٹھے تھے۔

حالی : میرے پہلو میں؟ نہیں حضرت' کب؟ بخدا مجھے تو نظر نہیں آئے۔

غالب : آتے بھی کیسے۔ خط تو میں لکھ رہا تھا۔ مکالمہ تو میں کر رہا تھا۔ وہ مجھ کو ہی نظر آ سکتے تھے۔

حالی : بجا ارشاد۔ آپ کے خط پڑھ کر گمان تو یہی ہوتا ہے کہ آپ اور مکتوب الیہ آمنے سامنے بیٹھے ہیں۔

غالب : ہاں میاں غزل بہت لکھ لی۔ اب مراسلہ نویسی ہی مشغلہ ہے۔ بس دل بہلاتا ہوں۔

حالی : مراسلہ نویسی نے آپ کے تخلیقی تکلم کو ایک نئی راہ پر لا کھڑا کیا ہے۔ لیکن لمبے لمبے القاب اور بوجھل آداب کی روایت سے انحراف راہ پرخار نہ بن جائے۔

غالب : ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

حالی : حضرت کیا ان دنوں آپ نثر کے ذیل میں خطوط کے علاوہ کچھ اور بھی لکھ رہے ہیں؟

غالب : ہاں کچھ لکھا تو تھا۔ "برہان قاطع" ایک دن ہاتھ آگئی تھی۔ یونہی ورق گردانی کرتا تھا کہ پہلی ہی نگاہ میں کچھ بے ربطیاں سی معلوم ہوئیں۔ ایک ایک لفظ مختلف صورتوں میں لکھا دیکھا جو اصول لغت نگاری کے سراسر خلاف ہے۔ میں تو بس یونہی کچھ قابل اعتراض لفظوں اور معانی کو ضبط تحریر میں لایا تھا کہ شدہ شدہ کتاب بن گئی۔

حالی : بلکہ یوں کہئے' آپ کے لیے عذاب بن گئی۔

غالب : ہاں مولانا! ہر کس و ناکس' خواندہ و ناخواندہ سب ہی چڑھ دوڑے لیکن :

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں' کافر نہیں ہوں میں

بھائی میرے اعتراض کو نہیں مانتے' نہ مانو۔ اپنا جہل چھپانے کے لیے مجھے کیوں جاہل کہتے ہو۔ لو بھائی گالیاں تک دی گئیں مجھے۔ اور یہ خرافات جاری ہے۔

حالی : تو کیا آپ بے مزہ ہو گئے۔

غالب : بخدا نہ ہوا ہوتا اگر گالیاں عالموں نے دی ہوتیں۔ شریں لبوں نے دی ہوتیں۔
حالی : بجا ارشاد۔ مگر مولوی امین الدین نے آپ کی کتاب "قاطع برہان" کے رد میں جو کتاب "قاطع قاطع" لکھی ہے اس کا جواب آپ کی جانب سے نہیں دیا گیا۔
غالب : اماں وہ ہذیان ہے۔ ہذیان اور تم اسے کتاب فرما رہے ہو۔
حالی : آپ کی جانب سے اس کا کچھ نوٹس تو لیا جانا چاہئے تھا۔
غالب : مولانا اگر کوئی گدھا تمہارے لات مار دے تو کیا تم بھی ایسا ہی کرو گے۔

(حالی شرمندہ سے ہو جاتے ہیں۔ اتنے میں خدا بخش چند خطوط لاتا ہے۔ غالب خطوط نہیں لیتے۔ پریشان ہو جاتے ہیں)

غالب : لے جاؤ انہیں ور یا برد کر دو۔ میں عاجز آ چکا ہوں۔
حالی : خطوں سے؟ آپ؟ عاجز؟ میرزا صاحب آپ نے تو فرمایا تھا کہ خط خدا کی رحمت ہوتے ہیں۔
غالب : جی ہاں کہا تھا۔ اب بھی اس قول پر قائم ہوں لیکن یہ جو پڑے آئے ہیں انہیں پڑھ لیجئے اگر ان میں واقعی رحمت ہو تو مجھ پر نازل فرما دیجئے۔

(حالی خطوط لے تو لیتے ہیں مگر کھولتے ہوئے جھجکتے ہیں۔ ملازم خدا بخش خط دے کر ایک جانب کھڑا ہو جاتا ہے)

حالی : مگر قبلہ۔ دیکھئے یہ گستاخی ہوگی۔ نام آپ کے نام ہیں، میں کس طرح.....
غالب : (بات کاٹتے ہوئے) آپ بلا تامل کھول لیجئے۔ ان میں جو گستاخیاں ہوں گی ان کے مقابلے میں آپ اپنی یہ گستاخی بھول جائیں گے۔

(حالی خطوط کھولتے ہیں۔ پڑھتے ہی چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے۔ ندامت سے کبھی میرزا غالب کو دیکھتے ہیں، کبھی خدا بخش کو)

غالب : کس قدر رحمتیں وصول کیں آپ نے؟ کچھ ہم بھی ساعت کریں۔
حالی : قبلہ میرزا صاحب واقعی حد ہو گئی۔ میرے تو تصور میں بھی نہیں تھا۔ (خدا بخش سے) جاؤ بھئی اب تم کیوں کھڑے ہو۔ (خدا بخش جاتا ہے) میرزا صاحب اس میں تو .... (کہتے کہتے رک جاتے ہیں)
غالب : گالیاں ہیں۔ فحش کلامی ہے۔ ہذیان ہے۔ یہ اس لیے کہ میں نے "قاطع برہان" لکھی۔ نام نہاد دانشوروں اور خود ساختہ عالموں کی لیاقت کا بھانڈا پھوڑا۔ یہ بے سروپا بکتے رہے۔ میں خانہ نشین رہا۔ محفلیں چھوڑ دیں۔ اب یہ کیا چاہتے ہیں۔ میری کمزوری جانتے ہیں نا۔ یہ جانتے ہیں کہ میں خطوں کا انتظار کرتا ہوں اور جواب بھی دیتا ہوں۔ یہ میری ہی کچھار میں مجھے شکار کر رہے ہیں۔ میرے عذابوں میں اضافہ کر رہے ہیں۔
حالی : گستاخی معاف حضرت۔ آپ نے "قاطع برہان" میں کچھ احتیاط کر لی ہوتی تو اچھا تھا۔ کہیں کہیں آپ کی تحریر نالائم بھی ہو گئی ہے۔
غالب : یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا' کوئی غم گسار ہوتا
حالی : معذرت خواہ ہوں میرزا صاحب۔ یہ نالائم کا لفظ میں نے آپ کی نیت کے حوالے سے نہیں کہا۔ ممکن ہے یہ آپ کی بذلہ سنجی ہو۔ شوخی طبع ہو .....
غالب : اماں عذر گناہ چھوڑو۔ اگر میں نے "برہان قاطع" کی نسبت نرم سے نرم اور سرد سے سرد مضامین باندھے ہوتے تو بھی میری مخالفت ضرور ہوتی۔ یہ جو نام نہاد دانشور ہیں انہیں گوشہ گمنامی سے نکلنے کے لیے کوئی اشتد تو چھوڑنا ہی تھا۔ اس کے لیے غالب سا ممتاز تختہ مشق انہیں کہاں مل سکتا تھا۔ مجھے علم ہے' ان کے ترکش ابھی تیروں سے خالی نہیں ہوئے۔

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

حالی : (خطوط کو پھاڑتے ہوئے) لیکن ان کا کچھ تو تدارک ہونا چاہئے۔ آپ کی کیا سوچ ہے اس ذیل میں۔
(غالب کوئی جواب نہیں دیتے۔ ان کے چہرے کو ہم ٹائٹ کلوز میں دیکھتے ہیں۔ غصہ دھیرے دھیرے تحلیل ہو رہا ہے۔ پھر پرسکون ہو کر تصویر جامد ہو جاتی ہے۔ اور جب تک راوی کی آواز جاری رہتی ہے' غالب کا ساکت چہرہ سکرین پر موجود رہتا ہے)

راوی :
نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

FADE OUT

خاتمہ

نقدِ غالب

سید محمد تقی

غالب کی تخلیقات

مابعد الطبیعیاتی پس منظر میں

تمام تخلیقات جن میں شاعری بھی شامل ہے کسی نہ کسی مابعد الطبیعیاتی تصور سے پیدا ہوتی ہیں اور ذہن کے پس منظر خانوں میں کائنات کی نہج سے متعلق کوئی خاص نقطہ نظر یا انداز فکر موجود رہتا ہے مابعد الطبیعیات کی اصطلاح پہلے پہل ارسطو نے استعمال کی تھی لیکن ارسطو نے مابعد الطبیعیات کو عملیات کے مخصوص درجہ سے تعبیر کیا ہے جبکہ یہاں مابعد الطبیعیات سے مراد فرد کا وہ تحت الشعوری پس منظر ہے جو خارجی دنیا سے اپنے ذہنی رشتوں کے سلسلہ میں رکھتا ہے۔ انسان کا یہ تحت الشعوری پس منظر ادب اور فن کی ہر تخلیق سے پہلے موجود رہتا ہے اور فرد کی زندگی کے ہر لمحے میں اس کا ساتھ دیتا ہے۔ خواب کی حالت میں بھی جب فرد کا ذہن متعین زمانی اور مکانی رشتوں سے تعلق باقی نہیں رکھتا یہ لاشعوری مابعد الطبیعیاتی پس منظر باقی رہتا ہے اور مدہم حالات میں انسان کے حیاتی نظام سے منسلک رہتا ہے مابعد الطبیعیاتی پس منظر کی اس ہمہ گیری کے پیش نظر یہ سوال کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کی شاعری کا مابعد الطبیعیاتی پس منظر کیا تھا۔ ایک بڑی طویل فکری بحث کی حیثیت سے سامنے آتا ہے جو ایک طویل مطالعہ کے بغیر اپنا پورا مفہوم پیدا نہیں کر سکتا لیکن اس لمبی بحث کو چھیڑے بغیر جہاں تک مسئلے کے چند سرسری پہلوؤں کا تعلق ہے بعض ایسی اساسیں سامنے لائی ممکن ہیں جو توقع ہے کہ دلچسپ فکری بحثوں کا سبب بن جائیں گی۔

انسانوں کی تاریخ اب تک مختلف انداز اور مختلف درجوں میں بانٹی گئی ہے۔ مارکس کے خیال میں تاریخ کو سمجھنے کا انداز خالص معاشی ہے۔ آگسٹ کامٹ انسانی تہذیب کی تاریخ کو ذرا بدلے ہوئے طرز پر مختلف فکری حصوں میں بانٹنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ لیکن راقم الحروف کے خیال میں تہذیب کی تاریخ فکری انداز میں منقسم ہونے کی صورت میں اپنا مفہوم پیدا کر سکتی ہے یہ بالکل ممکن ہے کہ فکر کا ارتقاء معاشی قوتوں کے عمل سے گہرا اثر لیتا ہو اور لازماً" وہ اس سے شدت کے ساتھ متاثر ہوتا بھی ہے لیکن فکر کے ارتقاء کی اپنی تاریخ ایک خاص بہاؤ رکھتی ہے جو معاشی عناصر کو پس منظری قوتیں ماننے کے باوجود اپنا مفہوم نہیں کھوتا۔ انسان کی ساری تہذیبی تاریخ کا آپ اس کے پس منظری فکری انداز کے طور پر جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ کلچر کا بہاؤ دو واضح منزلوں سے ہو کر

گذرتا ہے ایک نمایاں سنگ میل ہے جو ان واضح ادوار کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے' یہ بات انسانوں نے یونان ہی میں سوچ لی تھی کہ یہ کائنات یا تو سکونیاتی تشریح کی متحمل ہے یا حرکی تشریح کی پارمنائیڈیس سکونیاتی تشریح کا حامی تھا جبکہ ہیریکلیٹس کائنات کی حرکتی تشریح کرنے پر مصر رہا۔

کائنات اور انسان کے کائنات سے سلوک کے سلسلے میں سکونیاتی ذہنی پس منظر یا حرکتی فکری پس منظر دو جدا جدا دور ہیں جو انسان کی تاریخ میں ایک دوسرے کے بعد آئے ہیں۔ یہ دونوں تصور موجود تو شروع ہی سے رہے لیکن سکونیاتی تصور کائنات سرسری طور پر نشاۃ ثانیہ کے عہد تک باقی رہا ہے جبکہ حرکتی تصور نے نشاۃ ثانیہ کے بعد نئی زندگی اور نیوٹن کی پرنسپیا کی اشاعت سے نئی توانائی حاصل کی زندگی کی موجودہ نہج اور حیات کے علمی' ادبی اور فن خانے نیوٹن ی ڈائنمکس (Dynamics) (حرکیات) سے گہرے طور پر متاثر ہوئے ہیں اور یوں آپ کہہ سکتے ہیں کہ نشاۃ ثانیہ سے بعد کا عہد ہیریکلیٹس کا اور اس سے پہلا دور پارمنا آئیڈس کا دور تھا۔ تاریخ گیر حقیقتوں کے لیے کلیئے بنانے کا کھیل بڑا خطرناک کھیل ثابت ہوا ہے جو محتاط مفکر کبھی کھیلنے کی غلطی نہیں کرتے۔ لیکن یہاں اگر اس عدم احتیاط کی اجازت دی جا سکے تو یہ کہنا ممکن ہے کہ ادب اور شعر کی تاریخ بھی تہذیبی رجحانات کے ان دو ادوار سے ہو کر گذری ہے عہد کا ادب حرکیاتی انداز نظر سے اپنے تخیل کے سوتے ملاتا ہے۔ جبکہ نشاۃ ثانیہ سے پہلے ادب سکونیاتی طرز فکر سے اپنی تخلیقات کو سنوارتا تھا۔ نشاۃ ثانیہ یوروپی تاریخ کے ایک مخصوص عہد کا نام ہے لیکن یوروپی تاریخ نشاۃ ثانیہ کے عہد میں جس موڑ سے گذری تھی اس قسم کے موڑ دوسرے ملکوں کی تہذیبوں میں بھی آئے اور آرہے ہیں اس لیے نشاۃ ثانیہ کو سنگ میل قرار دینے کی یہ کوشش تاریخ گیر اطلاق رکھتی ہے صرف یوروپی ملکوں تک محدود ہو کر نہیں رہ جاتی۔

ادب کے فکری اور تخلیقی پس منظر کو سمجھنے کا یہ انداز اگر صحیح ہو تو یہ سوال بالکل قدرتی طور پر پیدا ہو گا۔ کہ اردو ادب اپنے پس منظری تخلیقی عناصر میں ان عام تہذیبی رجحانات سے کس موڑ پر آکر گذرا ہے راقم الحروف کے خیال میں اردو میں غالب ماضی کے سکونیاتی اور مستقبل کے حرکیاتی دور کے درمیان سنگ میل کی حیثیت سے آتے ہیں ان کے یہاں ماضی کا مابعد الطبیعیاتی پس منظر مرا نہیں ہے لیکن مستقبل کا مابعد الطبیعیاتی پس منظر تیزی کے ساتھ ابھرتا معلوم ہوتا ہے اور غالب کا یہی وہ اختصاص ہے جو انہیں دوسرے تخلیق کاروں سے ذرا مختلف درجے پر لے آنے کا سبب بن گیا ہے غالب کا یہ شعر کہ۔

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود میں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

کائنات کے سکونیاتی پس منظر سے ابھرا ہے۔ افلاطون نے اپنی جمہوریت کی کتاب السابع۔ میں غار اور سایوں کی مشہور مثال سے کائنات کی جو حقیقت بیان کی تھی' جسے پلوٹینس نے اینیاڈ میں کافی تفصیل سے اور ایک مکمل نظریئے کے طور پر بیان کیا ہے غالب کے اس شعر میں بڑی واضح تشریح کے ساتھ آئی ہے اسی طرح غالب کی مشہور فارسی غزل کا یہ شعر کہ۔

خون شد اجزائے زمانے در فشار بیخودی رفت ایامے کہ من امسال دیارے داشتم

سکونیاتی تصور کائنات ہی کی نمائندگی کرتا ہے۔ اسمال دیار ے یعنی زمانے کی اولیت اور بعدیت کے ختم ہو جانے کا خیال مسلمان مفکروں کے دہر کے تصور سے میل کھاتا ہے اس لیے کہ دہر میں بھی نہ اول باقی رہتا ہے نہ بعد۔ ایران کے میرابا قرداماد۔ دہر۔ کو زماں کی طرح مرنے والا تسلیم کرتے ہیں اور غالب کے اس شعر میں بھی دہر پیدا ہونے اور مرنے کی خصوصیت رکھتا ہے تاہم اس شعر کے پس منظر میں جو سکون اور عدم حرکت آئی ہے وہ پارمنا ئڈیس کے سکونیاتی تصور کائنات کی نمائندگی کرتی ہے لیکن ان جیسے اشعار کے برعکس جب بات اس نقطے پر پہنچتی ہے۔

دام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پے گہر ہونے تک

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

تو وہ حرکتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو جدید عہد کے سائنسی مزاج سے پوری طرح میل کھاتی ہیں۔

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

بڑا معنی خیز مصرعہ ہے اور اگر کہنے والے نے پورے شعوری کرب اور فکری گہرائی کے ساتھ یہ مصرعہ تخلیق کیا ہے تو اس میں سائنسی Fatalism کے اس تصور کی تائید کی گئی ہے جو ایک طرف مسلسل حرکت اور دوسری طرف تعلیل یعنی Causation کے مجموعے سے پیدا ہوتا ہے جو نیوٹن کی ڈائنامکس اور سائنس کے اساسی جوہر کی حیثیت رکھتی ہے غالب کے کلام میں سائنس کے جدید مزاج سے جو شعر سب سے زیادہ قریب آتا ہے وہ میرے خیال میں ان کا یہ شعر ہے کہ۔

دام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہرے ہونے تک

نئے عہد نے۔ اتفاق۔ کو ایک منظم سائنسی نظریئے کے طور پر اپنایا ہے۔ اتفاق کا یہ عنصر جو مستقبل میں ان گنت امکانات کو جنم دینے کا سبب بن سکتا ہے۔

دام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ

کے مصرعہ میں بڑے سلیقے، بڑی فنکارانہ مہارت کے ساتھ آگیا ہے۔

دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

زماں کے غیر یقینی بہاؤ کائنات کی خود تخلیقی کے لامحدود امکانات اور اتفاق کے عنصر کی غیر متعین سرگرمیوں کی نمائندگی کرتا ہے جسے کوانٹم "تھیوری کے بنانے والوں نے ایک متعین فلسفیانہ اسکول کی شکل دینے کی کوشش کی ہے۔ زماں کے غیر یقینی بہاؤ سے جس میں اتفاق کا عنصر اتنا اہم پارٹ ادا کرتا ہے مستقبل کی بابت غیر یقینیت جنم لیتی ہے جو تشکیک یا Scepitcism کی بنیاد بن جاتی ہے ذہن کے خانوں میں جب تشکیک موجود ہو تو اس قسم کے اشعار کا تخلیق پا جانا بالکل منطقی تقاضے کی حیثیت رکھتا ہے۔

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

بہرحال ان چند سطور میں مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا وہ یہ تھا کہ غالب کا مابعد الطبیعیاتی پس منظر پارمنائڈیس،

کے سکونیاتی تصور کائنات اور بیبریکلینیٹس کے حرکیاتی نظریہ نظر سے پیدا ہوا ہے وہ ماضی کے سکونیاتی تصور کائنات کو بھی زندہ رکھتے ہیں اور نئے عہد کے حرکتی تصور کو بھی اپنانے میں کامیاب ہوتے ہیں کبھی کبھی تو یہ دونوں رجحانات ایک ہی شعر میں ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ ان کا یہ شعر کہ۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

دونوں وجوہات کی نمائندگی کرتا ہے پہلا مصرعہ۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رَب

کائنات کے حرکتی یا سائنسی انداز نظر سے ابھرا ہے جبکہ دوسرے مصرعے میں۔

ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

ماضی کے تہذیبی رجحانات کی نمائندگی ہوتی ہے۔ غالب کے یہاں گھرے ہوئے اور آنے والے کی یہ کشمکش پورت شدت کے ساتھ موجود ہے ایک ان کا ماضی کا ثقافتی ورثہ ہے جسے وہ بھلانے پر قادر نہیں ہو سکے جبکہ دوسرا رجحان ان کے جینئس ذہن کی تخلیق ہے جس نے انہیں اردو ادب کے ایک نئے دور ایک نئے عہد کا نمائندہ بنانے کا اعزاز عطا کر دیا جو ان سے پہلے کسی کو حاصل ہوا اور نہ ان کے بعد کسی دوسرے کے حاصل کرنے کی توقع قائم کی جا سکتی ہے۔

مولانا غلام رسول مہر

داستان فرہاد اور غالب کا تصور محبت

ورنہ ہر حرف غالب چیدہ ام میخانہ تاز دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن

فارسی اور اردو کے عام شاعروں کی طرح مرزا غالب کے کلام میں بھی جا بجا مجنوں اور فرہاد کا ذکر ہے۔ میں دوسرے شاعروں کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن مرزا نے فرہاد یا کوہکن اور مجنوں یا قیس کا نام جہاں کہیں لیا ہے اپنے تصور عشق و محبت کا کوئی نہ کوئی پہلو نمایاں کرنے کی غرض سے لیا ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں فرہاد کے متعلق مرزا کے چند فارسی اور اردو اشعار پیش کر کے میں اپنا نقطۂ نگاہ واضح کروں گا اور مجنوں کو پھر کبھی معرض بحث میں لاؤں گا۔

فرہاد اور مجنوں کے متعلق جو کچھ بیان کیا جاتا ہے اس میں شاعرانہ رنگ آمیزی اس پیمانے پر ہو چکی ہے کہ اب اس داستان اسرائی میں سچائی اور واقعیت کا دریافت کرنا ممکن نہیں رہا۔ فرہاد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اچانک خسرو پرویز ساسانی کی ملکہ شیریں کو دیکھ کر عاشق ہو گیا۔ پرویز کے مشیروں نے غالباً رسوائی سے محفوظ رہنے کے لئے فرہاد کے ذمے ایک ایسا کام لگا دیا جس کا سرانجام بظاہر غیر ممکن تھا یعنی "بستون" پہاڑ کاٹ کر شیریں کے باغ کے لئے دودھ کی نہر لانا۔ لیکن جواں ہمت فرہاد نے یہ ناممکن کام بہت جلد پورا کر دیا۔ پھر اسے مروانے کے لئے ایک بڑھیا کو یہ پیغام دے کر بھیجا گیا کہ شیریں اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ فرہاد نے یہ سنتے ہی تیشہ سر پر مارا اور مر کر اپنی نکالی ہوئی نہر میں گر گیا۔

میں نے بیان کردہ واقعات کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کر دیا اور اس سلسلے میں فردوسی کے شاہنامے یا نظامی کی مثنوی خسرو شیریں سے تفصیلات پیش کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

تاریخی حقائق

ایران کے مشہور مغربی شہر کرمانشاہ (جسے پہلے کرمان شاہان کہتے تھے) سے جو سڑک ہمدان کی طرف آتی ہے اس پر "بیستون" یا "بستون" اب بھی موجود ہے۔ اور اس کا فاصلہ مہران و کرمان شاہ سے قریباً یکساں ہے۔ یہاں سیاہ پتھروں کے ایک پہاڑ کے دامن میں کیانی اور ساسانی دور کے آثار موجود ہیں' اس مقام کو آج کل "طاق بستان" کہتے ہیں۔ سیاہ پہاڑ کا نام اصطخری اور ابن حوقل نے "بستون یا بیستون" بتایا ساسانی دور کے آثار میں سے ایک مقام پر خسرو پرویز کو اپنے مشہور گھوڑے شبدیز پر سوار دکھایا گیا ہے اور شیریں اس سے بالا تر کھڑی ہے تشابیں پتھر تراش کر بنائی گئی ہیں۔ اغلب ہے کہ یہاں کسی زمانے میں خسرو پرویز نے اپنے لیے نہایت عمدہ باغ اور عشرت گاہ تعمیر کرائی ہو جس کے اردگرد رفتہ رفتہ داستان بافیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ ایک عجیب و

غریب رومان وجود میں آگیا۔

غیرت و حمیت

مرزا کے نزدیک عشق و محبت میں نہایت اہم حیثیت غیرت و حمیت کو حاصل ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

عشق و مزدوری عشرت گہ خسرو کیا خوب ہم کو تسلیم نکو نامی فرہاد نہیں

حقیقت حال کی توضیح کے لیے عرض کر دینا چاہئے کہ فرہاد نے جب "بیستوں" کو کاٹ کر شیریں کے باغ کے لیے نہر لانے کے لیے ذمہ اٹھایا تھا تو اس کے پیش نظر خسرو پرویز کی عشرت گاہ کی رونق یا اس کے باغ کی آبیاری نہ تھی وہ صرف محبوب کے فرمان کی پیروی واجب و لازم سمجھتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب عاشق منزل رضا و تفویض میں پہنچ جائے تو وہ صرف احکام محبوب کے امتثال کا پیکر بن جاتا ہے اور متعلقات پر نظر نہیں ڈالتا۔ لیکن مرزا غالب نے پورے واقعے کا معروضی مطالعہ کیا تو ان کے دل میں کھٹک پیدا ہوئی۔ انہوں نے معاملہ فرمان شیریں کے امتثال تک محدود نہ رکھا اور یہ خیال پیدا ہوگیا کہ اس طرح رقیب کی عشرت گاہ کے لیے رونق و شادابی فراہم کی گئی۔ اگرچہ بلا واسطہ نہ سہی بالواسطہ ہی سہی۔ چنانچہ ان کے نزدیک یہ معاملہ فرہاد کی نیک نامی میں خلل کا باعث بن گیا۔ یہ خیال مرزا کے کلام میں ایک سے زیادہ مقامات پر ظاہر کیا گیا ہے۔ مثلاً

کوہکن گرسنہ مزدور طرب گاہ رقیب بے ستوں آئنہ خواب گران شیریں

نیز

از جوئے شیر و عشرت خسرو نشاں نہ ماند غیرت ہنوز طعنہ بہ فرہادی زند

مرزا فطرۃً بھی غیور طبیعت کے تھے ایک مقام پر کہتے ہیں:

تشنہ لب بر ساحل دریا ز غیرت جاں دہم گر بہ موج افتد گمان چین پیشانی مرا

یعنی اگر میں پیاس بجھانے کے لیے دریا پر جاؤں اور اس کی موجیں دیکھ کر دل میں خیال گذرے کہ دریا کی سطح پر لہریں نہیں اس کی پیشانی پر شکن ہیں کہ کیوں یہ شخص میرے پانی سے استفادے کے لیے آگیا تو پیاسا مر جاؤں گا لیکن پانی سے لب تر نہ کروں گا۔

پیشوں کا اعزاز و اکرام

پہاڑ کاٹنے کے لیے فرہاد کو مزدوری کرنی پڑی اور کم از کم مرزا کے عہد کا معاشرہ مزدوری اور محنت کشی کو کوئی معزز مشغلہ نہیں سمجھتا تھا مگر مرزا اپنے عہد کی اس کم نگہی اور حقیقت ناشناسی کو درخور قبول نہیں سمجھتے چنانچہ فرماتے ہیں۔

پیشے میں عیب نہیں رکھئے نہ فرہاد کو نام ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

یعنی اگر فرہاد نے مزدوری کی محنت و مشقت کی زحمت اٹھائی تو اس میں عیب کی کون سی بات ہے؟ دنیا کے

دوسرے پیشوں کی طرح یہ بھی ایک پیشہ ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اسے حقیر و کم رتبہ سمجھا جائے۔ اس حقیقت پر نظر رہنی چاہئے کہ اس نے خاراشگافی کا کارِ شوار مردانہ وار اپنے ذمے لے لیا اور اسے پورا کر دیا۔ وہ ہم ہی آشفتہ سروں میں سے تھا جو سچے عاشق ہیں۔ افسوس کہ اس نے جوانی ہی کے عالم میں جان دے دی۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالب اردو زبان کے شاعروں میں پہلے فرد جلیل و عظیم تھے جنہوں نے مزدوروں کے پیشے کی عزت و حرمت کا ڈنکا پورے زور سے بجایا اور اس طرح تمام پیشوں کی یکساں عزت و حرمت کے لیے آواز بلند کی۔

رسموں اور ریتوں سے نفرت

"مرزا فطرۃ" آزادہ رو تھے۔ پرانی رسموں اور ریتوں سے انہیں ہمیشہ نفرت رہی۔ مرزا حاتم علی بیگ مہر کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔

> "تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما تھا۔ تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے ...... جب داڑھی مونچھ میں بال سفید آگئے تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے تو اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔ مگر یہ یاد رکھئے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام رہاطی' نیچا بند' دھوبی' سقا' بھٹیارا' کنجڑا' منہ پر داڑھی سر پر بال۔ فقیر نے جس دن داڑھی رکھی اسی دن سے سر منڈوایا۔"

گویا انہیں عموی احوال میں بھی رسم عام کی پیروی منظور نہ تھی۔ پھر وہ فرہاد کے سلسلے میں رسوم و قیود کی پابندی کو کیونکر پسندیدہ سمجھ سکتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد　　سرگشتہ خمار رسوم و قیود تھا

یعنی تیشے یا کوئی اور چیز سر پر مار کر جان دے دینا ایک پرانی و قانونی رسم تھی۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ فرہاد سرگشتگی خمار رسوم و قیود سے بالاتر نہ ہو سکا۔ گویا مرزا غالب کو عشق و محبت کی جاں بازیوں میں بھی رسم عام کی پیروی ناگوار تھی۔

سادگی

عشق و محبت کا ایک وصف "سادگی" بھی ہے جو مرزا کو بہت پسند ہے۔ فرماتے ہیں۔

دی سادگی سے جان' پڑوں کوہکن کے پانو　　ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو

پرکار و عیار بڑھیا نے بے تکلف فرہاد کو یہ جھوٹی خبر سنا دی کہ شیریں مر گئی۔ بدنصیب عاشق نے یہ سنتے

ہی تیشہ سر پر مارا اور مر گیا اس لیے کہ محبوب کے مرجانے کے بعد محب و عاشق کے لیے جینا باعث ننگ تھا۔ اگر وہ سادگی کا پیکر نہ ہوتا تو اصل واقعہ کی چھان بین کرتا۔ پوچھتا کیا صورت پیش آگئی؟ آیا شیریں بیمار ہوئی؟ بیمار ہوئی تو اسے کیا آزار تھا؟ علاج کس سے کرایا گیا؟ یا کم از کم یہی سوچ لیتا کہ ایک بے سروپا بڑھیا کی بات کیوں صحیح سمجھ لے۔ اور کس وجہ سے حقیقت حال کی ٹوہ نہ لگائی جائے۔

غرض مرزا کے نزدیک عاشق مدبروں' سیاست دانوں اور دانش مندوں کی طرح ہر شنید کا کھوج لگانے کا عادی نہیں ہوتے ہر امر کی تحقیق کے درپے نہیں رہتے۔ عشق اسے تحمل اور غور و فکر کا متحمل کب ہوتا ہے؟

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق　　　عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

فرہاد کو یہ کام سونپا گیا تھا کہ پہاڑ کاٹ کر نہر لے آئے۔ یہ اس کے زور بازو اور نیروئے تن کی آزمائش تھی۔ جس میں وہ پورا اترا۔ پھر حوصلہ آزمائی کا مرحلہ پیش آیا تو پہلے ہی قدم میں ناکام رہا۔ اور نامراد دنیا سے رخصت ہو گیا۔ مرزا فرماتے ہیں۔

کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحان آخر　　　ہنوز اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

☆ ☆

پروفیسر سردار احمد خان ایم اے
اسلامیہ کالج سکھر

غالب اور علم نفسیات

دور جدید میں حکمت و دانش کے فروغ نے مختلف علوم کی درجہ بندی اس طرح کی ہے، کہ کسی ایک علم کے بسیط مطالعہ کے نتیجہ میں الحاقی علوم بھی معرض وجود میں آ گئے اور ہر شعبہ علم بجائے خود علیحدہ علم کی صورت اختیار کر گیا۔ سترھویں صدی عیسوی میں یورپ میں جب احیائے علوم ہوا تو بے شمار عالموں نے مختلف علوم کے بارے میں نئے نئے نظریات پیش کیے اور ہر علم کی جداگانہ طور پر ترتیب و تدوین کی۔ فلسفہ ایک قدیم علم ہے جس کی نشوونما یونان میں ہوئی۔ عقلائے یونان نے اس علم کو اپنے خون جگر سے سینچا اور عہد بہ عہد اس میں اضافے ہوتے رہے۔ کائنات اور اشیائے کائنات کے بارے میں بے شمار نظریات وضع ہوئے اور انسان اور اس سے متعلق اشیاء کا گہری نظر سے مطالعہ کیا گیا۔ انسان چونکہ اس دنیا میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے اس لیے انسانی افعال و اطوار کا بہت غور و فکر سے مطالعہ کیا گیا۔ اور انسانی سیرت و کردار سے متعلق اصول وضع کیے گئے۔ یہ تمام افکار و خیالات انسانی زندگی کے مذہبی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، اخلاقی اور روحانی مسائل سے متعلق تھے جن کو ہم مختصر طور پر فلسفہ حیات انسانی کے نام سے پکار سکتے ہیں۔ ان تمام مسائل کا جائزہ خالصتاً" عقلی اور فکری تھا۔ اور مادے کی عینک لگا کر روحانیت کی حقیقت کو پانے کی کوشش کی گئی تھی یہی وجہ ہے کہ علمائے یونان بیشتر مقامات پر نسل انسانی کی رہنمائی کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔

عقل کے دھندلکوں اور مادہ کی کثافت پر جب اسلام کی شعاعوں کا عکس پڑا تو عقل انسانی نے مادی حقائق کو روحانی اقدار سے فروتر پایا۔ اور روحانی بصیرت اور حکمت ملکوتی نے کائنات اور اشیائے کائنات کے بارے میں ایک واضح تصور پیش کیا اور انسان کو مرکزی کردار قرار دے کر اس کو ایک ایسی سیرت اور کردار کی تعمیر کا درس دیا جو فطرت کائنات سے ہم آہنگ ہو۔ فلسفہ کی پر پیچ راہوں کو روحانی بصیرت سے طے کیا گیا اور انسانی اطوار و عادات کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالا گیا اور علماء و عقلا کا ایک ایسا گروہ تیار ہوا جس نے قدیم علوم کی ہیت ترکیبی میں دور رس تبدیلیاں پیدا کر دیں۔ لیکن ایک وقت پھر ایسا آیا کہ احیائے علوم کی تحریک مغربی مادہ پرستوں کے ہاتھوں میں جا پہنچی۔ اور عقلی بنیاد پر نئے مفروضات وضع کیے گئے۔ اور ہر علم کی اتنی چھان پھٹک کی گئی کہ اس سے بہت سے دیگر علوم پیدا ہو گئے۔ یہی حال علم نفسیات کا ہے یہ پہلے فلسفہ کی ایک شاخ تھا لیکن سترھویں صدی میں اور اٹھارویں صدی عیسوی میں اس کو علیحدہ ایک باضابطہ علم کا درجہ دے دیا گیا۔ اس علم کے نامور علماء ڈس کارٹر Des-carter (1596ء تا 1650ء) ہابز Hobbes (1588ء تا 1679ء) لاک Locke (1632ء تا 1704ء) ہیوم Hume (1711ء تا 1776ء) جان مل John Mill (1806ء تا 1873ء) ہربرٹ اسپنسر Herbertspencer

(1583ء تا 1648ء) فرائڈ Freud (1856ء تا 1936ء) گذرے ہیں ان فلسفیوں اور محققوں نے اپنے اپنے زاویہ ہائے نگاہ سے علم نفسیات کو پیش کیا ہے۔ حد یہ کہ 1879ء میں ایک جرمن ماہر نفسیات ولیم ونٹ wund William نے لپزگ کے مقام پر ایک معمل گاہ بھی قائم کر دی جہاں "نئی نفسیات کا مطالعہ تجرباتی اور مشاہداتی طور پر کیا جاتا تھا۔ ان تمام باتوں کے پس پردہ کون سے عوامل تھے ان سے قطع نظر ہم یہ ضرور محسوس کرتے ہیں کہ یورپ میں جدید علم نفسیات کو فروغ 1860ء سے پہلے نہیں ہوا۔

انسانی کردار افعال و اطوار اور فطرت کائنات سے ان کا باہمی تعلق اور الحاق کے جو نظریات وضع ہوئے وہ آج بھی تغیر پذیر اور لچک دار یا دوسرے الفاظ میں مفروضات پر قائم ہیں لیکن ان مفکرین مغرب سے بہت ہٹ کر ایک فلسفی شاعر جس نے علم نفسیات کی باضابطہ تحصیل کہیں سے نہیں کی تھی۔ اپنی فطری فرزانگی اور باطنی مشاہدے کے ذریعہ 1869ء تک ایسے مستحکم بالشان نظریات پیش کر گیا جس کی بنیاد حقائق پر ہے اور جو آج بھی ناقابل تردید ہیں۔

غالب اردو کے محض ایک شاعر ہی نہیں ہیں بلکہ ان کی شخصیت بہت پہلو دار اور صد رنگ ہے۔ انہوں نے اپنے اشعار میں جا بجا علم نفسیات کے اہم مسائل پر اظہار خیال کیا ہے۔ انہوں نے اپنے اصولوں کو اپنے مخصوص طرز استدلال سے تقویت دے کر قابل فہم اور دل نشین بنایا ہے۔ آج ہم غالب کے اس پہلو کا مطالعہ کریں گے جس میں انہوں نے نفسیات انسانی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور اس کی جبلت اور فطری تقاضوں کی پردہ کشائی کی ہے۔ غالب نے یہ اصول کسی خود ساختہ مفروضہ پر قائم نہیں کئے ہیں بلکہ فطرت انسانی کے عمیق مطالعہ کے بعد انہوں نے مختلف کیفیات بیان کی ہیں۔ غالب نے ایک بھرپور تہذیبی، معاشرتی اور مجلسی زندگی بسر کی تھی۔ ان کا تعلق اپنے دور کے ممتاز ترین افراد سے لے کر گمنام ترین افراد تک سے تھا۔ انہوں نے اقتدار کو بنتے اور بگڑتے دیکھا۔ عروج و زوال کی کیفیات کا مطالعہ کیا۔ وہ خوشحالی، بے سروسامانی اور لاچاری کے حالات سے گذرے اور مسرت و شادمانی اور غم و آلام سے پر، زندگی کے دونوں رخ دیکھے تھے۔ اس لیے ان کے مشاہدات اور تجربات حقیقت سے بے حد قریب ہیں اور آئے دن ہمارے مشاہدے میں آتے رہتے ہیں۔ غالب کے یہ مشاہدات زندگی کے مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور انسانی زندگی کی مختلف النوع کیفیات کی عکاسی کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے دور کے حالات کو جانچا اور پرکھا۔ ان کا سابقہ جن لوگوں سے پڑا اور جو مشاہدات کیے ان کو نہایت صحت کے ساتھ ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ انسانی افعال و عادات کا غائر نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد ہی وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں۔

؎ میں آدمی نہیں ہوں میں آدم شناس ہوں

غالب کے ہاں ہم کو نفسیات کا درجہ بدرجہ مطالعہ کرنے کی سہولت حاصل ہے۔ پہلے وہ انفرادی نفسیاتی مطالعے، مشاہدے اور تجربے میں مصروف نظر آتے ہیں اور انسان کی ذہنی ہیئت اور اس کی جبلی صفات کا تجزیہ کرتے نظر آتے ہیں اور بعد میں وہ اجتماعی طور پر آفاقی حقائق کا جائزہ لے کر یہ بتاتے ہیں کہ انسان پر ان کا کتنا اثر

پڑتا ہے اور انسان ان کلیات کا کہاں تک تابع ہے۔ ذیل میں ہم مختلف عنوانات کے تحت ان کے نفسیات انسانی کے مشاہدے کو پیش کریں گے۔

1- جذبہ محبت

فطری طور پر انسان میں کچھ احساسات و جذبات مشترک ہوتے ہیں۔ عام طور پر اردو شاعری میں عشق و محبت کی کارفرمائی ہے۔ اور محبت کے جذبہ کو اس کی اصلیت سے بڑھاچڑھا کر بیان کیا گیا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ جذبہ ایک شدید قسم کی ہیجانی اور اضطراری کیفیت کی پیداوار ہے اور اس میں دو ذہنوں کے درمیان کچھ مشترک اقدار کا ہونا لازی ہے۔ صرف ایک ذہن اگر کسی ہیجانی اور اضطراری کیفیت سے متاثر ہے تو دوسرے ذہن پر اس کیفیت کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ مرتب نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے غالب نے اس کو یک طرفہ اضطراری کیفیت قرار دیا ہے۔

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل   کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

عام ذہنی کیفیت پر جب کوئی بیرونی مہیج خلل اندازی کرتا ہے تو دماغ اس بیرونی مہیج کے زیر اثر ہو جاتا ہے۔ اور اس کی حرکات و سکنات سے اس مخصوص کیفیت کا اظہار ہونے لگتا ہے۔ عمر کے ایک حصہ میں جنسی شعور اپنے عروج پر ہوتا ہے۔ عنفوان شباب ہر شے میں ذوق نظر کا طالب ہوتا ہے۔ اور پا لینے کا جذبہ ذہن کے گوشوں میں سرایت کر جاتا ہے۔ لیکن ضروری نہیں ہے کہ یہ جذبات مستقل کیفیت کے حامل ہوں۔ لہٰذا کسی وقتی کیفیت کے زیر اثر اگر ذہنی شعور پراگندہ ہوتا ہے۔ تو اس کو ایک مستقل کیفیت نہیں کہا جا سکتا۔ یہی ہیجان جب عام ہو جائے تو ذہن خس و خاشاک کی طرح سلگنے لگتا ہے۔ لیکن جنسی کیفیت کی تسکین پذیری کے بعد ذہنی کیفیت نارمل ہو جاتی ہیں

فروغ شعلہ خس یک نفس ہے   ہوس کو پاس ناموس وفا یہ

اس لیے غالب نے محبت کو اوراک حس اور حصول حس کو ہوس کی اصطلاحوں سے واضح کیا ہے۔ جذبہ محبت ایک مستقل چیز ہے۔ جب کہ ہوس ذہنی اضطراب اور جنسی ہیجان کا پیدا کردہ ہے۔ جذبہ محبت کی پختگی کا اثر شخصی کردار پر پڑتا ہے اور کردار جذبہ ی ڈھل کر اسم سے صفت کی طرف مراجعت کرتا ہے۔ اس وقت ظاہری کیفیات اصل حقیقت حال کی شارح بن جاتی ہیں۔

شوق ہر رنگ رقیب سرد ساماں نکلا   قیس تصوری کے پردے میں بھی عریاں نکلا

اس لیے جذبہ کا استحکام داخلی محرکات پر موقوف ہے۔ اگر قلبی کیفیت کو جذبہ محبت برقرار نہیں رکھے گا تو عشق کا شعلہ خود بہ خود سرد ہو جائے گا۔

جو نہ نقد داغ دل کی کرے شعلہ پاسبانی   تو فسردگی نہاں ہے بہ کمین بے زبانی

2- نفسیات نسواں

نوع انسانی ہونے کے اعتبار سے مرد و عورت کے جذبات و احساسات یکساں ہوتے ہیں لیکن کچھ خاص قسم کی عادتیں ایسی ہیں جو صرف عورتوں کے لیے مخصوص ہیں۔ غالب نے صنف لطیف کی عادات' انداز فکر' طرز عمل اور ذہنی کیفیات کا مطالعہ بہت گہری نظر سے کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ نسائیت بظاہر سادہ ہے۔ لیکن اس سادگی کے پس پردہ' بہت چالاکی پوشیدہ ہے۔ بظاہر ہم حسن کو لاابالی سمجھتے ہیں لیکن حقیقت میں وہاں پوری ہوشیاری کار فرما ہے۔ حسن کے اس تجاہل اور تغافل کا مطلب محض یہ ہے کہ طالب کو اس بات کی جرات دلائی جائے کہ وہ حسن کی جانب بڑھے۔

سادگی و پرکاری بے خودی وہشیاری — حسن کو تغافل میں جرات آزما پایا

نسائیت اس بات کا اقرار نہیں کرتی کہ وہ وابستگی رکھتی ہے۔ غالب حسن کے اس تصنع کا پردہ چاک کر کے خود حسن ہی سے حقیقت حال کا اعتراف کرا لیتے ہیں۔

کہتے ہو نہ دیں گے دل ہم نے گر پڑا پایا — دل کہاں کہ گم کیجئے ہم نے مدعا پایا

خودنمائی کا جذبہ صنف نازک میں صنف دگر سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے غالب تصویر کشی کا فن صرف اس وجہ سے سیکھے ہیں کہ مصور بن کر وہ حسینوں کی محفل میں بار پا سکیں گے۔ کون ہے جو اپنی تصویر بنوانے سے دلچسپی نہیں لے گا۔

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری — تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے

صنف نازک کا عمل ہمیشہ اس کے رجحان سے مختلف ہوتا ہے۔ دل کی بات ظاہر ہونے نہ دینا اس کی سب سے بڑی کوشش ہوتی ہے۔ غالب اس مخصوص طرز عمل کو دوسرے رخ سے دیکھتے ہیں۔

دوستی کا پردہ ہے بے گانگی — منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہئے

صنف نازک کی چشم اشکبار صنف قوی کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ آنکھ سے ٹپکا ہوا ایک آنسو مرد کے دل کے تمام غبار کو دھو دیتا ہے۔ غالب نے دونوں کی نفسیاتی کیفیات کا نہایت عمدگی سے تجزیہ کیا ہے۔

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہو گا — قیامت ہے یہ اشک آلود ہونا تیری مژگاں کا

3- نفرت

نفرت کا جذبہ محبت کے جذبے سے زیادہ تند و تیز ہوتا ہے۔ جب اس کا شدید قسم کا عمل ہوتا ہے۔ تو جس سے نفرت ہوتی ہے اس کا ذکر اگر کوئی پسندیدہ شخص بھی کرے تو گوارا نہیں ہوتا۔ بلکہ بسا اوقات اگر پسندیدہ شخص برائی کے ساتھ بھی اس شخص کا نام لے جس سے نفرت ہے تو نفرت کرنے والا پسندیدہ شخص کو بھی ناپسند کرنے لگتا ہے۔

ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں — غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

یا

دشمنی نے میری کھویا غیر کو کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہئے

غالب نے نفرت، دشمنی اور عداوت کے بارے میں اثباتی پہلو کو ملحوظ رکھا ہے۔ یہ ان کا ایک بنیادی تصور ہے۔ ان کے نزدیک نفرت، دشمنی اور عداوت دراصل دوستی اور آشنائی کی دلیل ہے کسی اجنبی اور ناواقف شخص سے نہ نفرت ہو سکتی ہے۔ نہ دشمنی اور نہ عداوت۔ یہ جذبات اسی شخص کے بارے میں پرورش پائیں گے جو واقف کار ہو جس سے راہ و رسم رہی ہو اور جو کبھی عزیز اور پسندیدہ رہا ہو۔

خطر ہے رشتہ الفت رگِ گردن نہ ہو جائے غرور دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جائے

نفرت و عداوت دو ہستیوں کے درمیان ایک گہرے رشتے کو ظاہر کرتی ہے۔ جتنی زیادہ نفرت یا عداوت ہو گی اتنا ہی دونوں کے مابین گہرا تعلق رہا ہو گا۔

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

4- حسد

معاشرتی اور مجلسی زندگی میں ایک دوسرے پر برتری اور تفوق حاصل کرنے کا جذبہ عام ہوتا ہے۔ ہر شخص مسابقت کی جنگ میں مصروف نظر آتا ہے۔ بسا اوقات ذاتی اور ودیعت کیے ہوئے جوہروں کی بنا پر ایک شخص اپنے دور میں دوسرے ہم پیشوں سے گوئے سبقت لے جاتا ہے۔ اس وقت ودیعت کیے ہوئے ہنر اور اکتسابی ہنر میں آویزش اور ٹکراؤ ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں اہل ہنر کے ساتھ حسد اور کینہ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ پورا ماحول اس کے خلاف سرگرم کار ہو جاتا ہے اور معاشرے میں اسے سخت اذیت ناک زندگی بسر کرنا پڑتی ہے جب کسی شخص کو ایسے حالات سے گذرنا پڑے تو غالب کے نقطہ نظر سے وہ اس کے کمال فن کی دلیل ہے اور حالات کا ناسازگار ہونا اس کی دولت علم کی زکوۃ ہے۔

حسد سزائے کمال سخن ہے کیا کیئے ستم بہائے متاع ہنر ہے کیا کیئے

یا

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے بے وجہ ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

اور

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

5- رشک و رقابت

ارتباط و یگانگت کے نتیجہ میں جذبہ رشک و رقابت پیدا ہوتا ہے خلوص اور محبت کی زیادتی اس جذبہ کو تقویت دیتی ہے اور بسا اوقات اپنے مفاد میں کام کرنے والے کے خلاف رشک پیدا ہونے لگتا ہے۔

گذرا اسد مسرت پیغام یار سے قاصد پہ مجھ کو رشک سوال و جواب ہے

ہر چند کہ جس سے تعلق خاطر ہے۔ اس پر کامل اعتبار ہے پھر بھی رشک دامن نہیں چھوڑتا

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے ۔۔۔ وگرنہ خوف بد آموزی عدو کیا ہے

جذبہ رقابت کی تسکین غیر کو معمولی سی تکلیف پہنچنے سے بھی ہو سکتی ہے۔

دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا ۔۔۔ نالہ کرتا تھا ولے طالب تاثیر بھی تھا

کبھی کبھی رشک کے جذبے اور شخصی مزاج میں عدم مطابقت کی وجہ سے عجیب گو مگو کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف ۔۔۔ عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

6- خوف

خوف کی حالت میں ذہنی اور جسمانی کیفیتیں ایک خاص نہج پر نہایت سرعت سے کام کرتی ہیں۔ کچھ واقع ہو جانے کا خوف انسان کو آنے والے واقعہ کے لیے مستعد وتیار رکھتا ہے۔ کبھی غیر متوقع طور پر اگر کوئی بات واقع ہوتی ہے تو اس کی القوی پوشیدہ قوتیں بچاؤ کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔ کبھی کبھی کسی نہ ٹلنے والی بات سے بچنے کے لیے انسان بہت دلچسپ پناہ گاہیں تلاش کرنا چاہتا ہے۔ اس قسم کی ایک پناہ گاہ غالب کے ذہن کی بھی بنائی ہوئی ہے۔

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین ۔۔۔ ہاں منہ سے مگر بادۂ دو شینہ کی بو آئے

انتقام

انتقام کا مادہ ہر شخص میں ہوتا ہے۔ یہ جذبہ اتنا شدید ہے کہ دیگر شخصی اوصاف پر غلبہ پاکر انسان کو یکسر غیر انسانی حرکات کرنے پر آمادہ کر دیتا ہے۔ یہ جذبہ کبھی کبھی ایسی ہستیوں کے خلاف بھی پیدا ہوتا ہے جن کا بال بیکا ہونا بھی ہمیں گوارا نہیں ہو سکتا۔

دل لگا کر لگ گیا انکو بھی تنہا بیٹھنا ۔۔۔ بارے اپنی بے کسی کی پائی ہم نے داریاں

یا

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر ۔۔۔ آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

انتقامی جذبہ کو اس طرح بھی تسکین ہوتی ہے۔

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے ۔۔۔ صاحب کو دل نہ دینے پر کتنا غرور تھا

مصلحت کوشی

عملی زندگی میں انسان قدم قدم پر محتاط رہتا ہے۔ وہ ماحول اور اپنے عمل میں مطابقت رکھتا ہے معاملہ فہمی اور مصلحت کوشی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ اگر ایک شکل سے دلی مدعا پورا نہیں ہوتا ہے تو دوسرے طریقہ سے حصول مقصد کی کوشش کرتا۔

ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پر عاشق ہیں

تکلف بر طرف مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر

کبھی کسی فرد کی توجہ کسی دوسرے فرد پر ہوتی ہے تو دیگر افراد جو اس سے تعلق خاطر رکھتے ہیں اول الذکر کو سرد مہر اور بے وفا کہہ دیتے ہیں۔ اس وقت وہ شخص جس پر عنایت ہو رہی ہے دوسروں کے الزامات کو زائل کرنے اور اپنے مہربان کو متاثر نہ ہونے دینے کے لیے کچھ اور ہی بات کہتا ہے۔

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

دوست اور دشمن کی تمیز بہت مشکل ہے۔ یہ وقت پڑنے پر ہی معلوم ہوتا ہے کہ کون دوست ہے اور کون زمانہ ساز اس لیے آزمائش کے لیے کبھی یہ طریقہ اختیار کرلینا بھی مناسب ہے۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

کبھی انسان دشمن کو دوست بنا لیتاہے اور اس کا راز دار بن کر درپردہ اس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتاہے۔

تاکرے نہ غمازی' کرلیا ہے دشمن کو دوست کی شکایت میں ہم نے ہم زباں اپنا

اس قبیل کا ایک یہ بھی عمل ہے جس میں

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے میرا کام مجنوں کو برا کہتی ہے لیلٰی میرے آگے

-معاملہ فہمی

کسی حقیقت سے آگاہ ہونے کے لیے تجربہ شرط ہے۔ لیکن عملی زندگی میں ہم کبھی کبھی بغیر تجربہ کئے بھی عام ظاہری کیفیات اور تاثرات سے معاملے کی حقیقت کو پہچان لیتے ہیں۔

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا نبض خس سے تپش شعلہ سوزاں سمجھا

-احساس فخر

اپنی خداداد صلاحیتوں کا احساس شخصیت کو خود بخود ہو جاتا ہے۔ اگر اس جیسی خوبیوں کا حامل کوئی دوسرا اس کی نظر میں نہیں ہوتا ہے اس وقت صاحب صلاحیت فرد اپنی یکتائی کا دعویٰ کرتا ہے۔

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

اور

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

-جذبہ آزادی

فطرت انسانی آزادی کی خواہاں ہے وہ کسی بیرونی دباؤ یا تسلط کو قبول نہیں کرتی۔ انسان کا جسم قید ہو سکتا ہے۔ روح کو قید نہیں بنایا جاسکتا۔ ظلم سلسلہ حیات منقطع کر سکتا ہے لیکن روح کی پکار کو دبایا نہیں جاسکتا۔ اس کی

وجہ یہ ہے کہ جب کسی قوت کو اخراج کا راستہ نہیں ملتا تو وہ شدید سے شدید تر ہو جاتی ہے۔ مثلاً

احباب چارہ سازی وحشت نہ کر سکے زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

اور

نہ آئی سطوت قاتل بھی مانع میرے نالوں کو لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

یا

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

- ضد

بندشوں کے خلاف فطرت انسانی آواز اٹھاتی ہے۔ پابندی کے رد عمل کے بطور اس میں بغاوت اور ضد کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔

موج خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے آستان یار سے اٹھ جائیں کیا

اور

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں بیٹھے ہیں راہ گذر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

- خودداری

اپنی روش پر قائم رہنا اور سبک سری سے بچتے رہنا غیرت و حمیت اور خودداری کی دلیل ہے۔ خودداری ایک اعلیٰ صفت ہے جو عظمت کردار کا پتہ دیتی ہے۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں سبک سر ہو کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

بلکہ

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے یار کا دروازہ گر پائیں کھلا

اور

تغافل دوست ہوں یا میرا دماغ عجز عالی ہے اگر پہلو تہی کیجئے تو جا میری بھی خالی ہے

- تحفظ کا کردار

شدت جذبات میں ڈوب کر انسان کسی فعل کو کرنا چاہتا ہے لیکن اس وقت عظمت کردار مانع آتی ہے خواہ

آرزوؤں کا خون ہی کیوں نہ ہو جائے۔

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

-پختگی عادت

زندگی میں بھی ہم بعض عادتوں کے شعوری و لاشعوری طور پر تابع ہو جاتے ہیں۔ ہم بہت سی حرکتیں بغیر سوچے سمجھے کرتے رہتے ہیں۔ کبھی یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہمارے کسی عمل کا کوئی نتیجہ نہ نکلے گا ہم اس عمل کو عادتاً" دہراتے رہتے ہیں۔

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

اور

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ بھی نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

کبھی ہماری تعمیر عادت یا پختگی عادت کا علم دوسروں کو بھی ہو جاتا ہے اور ہماری عادت کا یقین ان کے دل میں اتنا راسخ ہو جاتا ہے کہ خواہ وہ فعل ہم سے سرزد نہ بھی ہوا ہو مگر وہ اسے ہم ہی سے منسوب کرتے ہیں۔

اعتبار عشق کی خانہ خرابی دیکھنا غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

-عفو درگذر

معاف کردینے کا جذبہ' انتقام لینے کے جذبہ کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ اکثر ہم یہ تہیہ کر لیتے ہیں کہ کسی مسئلہ پر مخالف سے باز پرس کریں گے لیکن جب وہ مسئلہ وقت گزرنے کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے تو ہم اپنے اس ارادے کو ترک کر دیتے ہیں۔

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کہئے

-پشیمانی

پشیمانی رد عمل ہے کسی غلط کام کو سرانجام دینے کا۔ جس قسم کا غلط فعل ہو گا اسی نوعیت سے پشیمانی بھی ہو گی۔

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسد غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

ایک دوسری جگہ

لو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ یہ بے ننگ نام ہے یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

پشیمانی کی ایک یہ بھی صورت ہے

کبھی نیکی بھی اس کے جی میں اگر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں اپنی کرکے یاد شرما جائے ہے مجھ سے
اور
جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار اے کاش جانتا نہ تری رہ گذر کو میں

۔اذیت پسندی

انسانی فطرت کا ایک دلچسپ پہلو اذیت پسندی کا ہے۔ کبھی یہ جذبہ اذیت رسانی کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ جس میں دوسروں کو ایذا دے کر لطف محسوس ہوتا ہے۔

جراحت تحفہ' الماس ارمغاں' داغ جگر ہدیہ مبارک باد اسد غم خوار جان درد مند آیا
اور
ہوائے سیر گل آئینہ بے مہری قاتل کہ انداز بہ خوں ملیدن بسمل پسند آیا

اور کبھی خود کو اذیت پہنچا کر سکون محسوس ہوتا ہے۔

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں
اور
رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی سمجھیو مت کہ پاس درد سے دیوانہ غافل ہے
اور
سر کھجاتا ہے اگر زخم سرا چھا ہو جائے لذت سنگ بہ انداز ہ تقریر نہیں

۔جبلت حصول

ہماری ساری زندگی خواہش اور طلب سے عبارت ہے۔ ارمانوں اور تمناؤں کا ایک طوفان ہے جو امنڈ تا رہتا ہے۔ بہت سے ارمان پورے ہونے پر بھی مزید کی تکمیل کے لیے دم نکلتا رہتا ہے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

بلکہ کبھی تو یہ حالت ہو جاتی ہے۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

جبلت حصول کے ذریعہ ہم نہ صرف جد و جہد کی طرف مائل ہوتے ہیں بلکہ اسکی وجہ سے ہماری زندگی میں ایک ہماہمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر ہمارا ذہن اور ہماری زندگی بے مقصد ہو تو عمر بسر کرنا دشوار ہو جائے بغیر کسی مشغلہ کے یہ مختصر زندگی کاٹے نہیں کٹ سکتی یہی وجہ ہے کہ ہم یہ جانتے ہوئے بھی کہ مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکتی ہم اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں اور اسی طرح زندگی مصروف رہ کر کٹ جاتی ہے۔

طبع ہے مشتاق لذت ہائے حسرت کیا کہوں آرزو سے ہے شکست آرزو مطلب مجھے
اور

بس ہجوم نا امیدی خاک میں مل جائے گی   وہ جو اک لذت ہماری سعی بے حاصل میں ہے

- حوصلہ

جہد زندگی میں حوصلہ اور ہمت شرط ہے۔ ظاہری اسباب کی موجودگی اور اس کی فراہمی کسی مجزاتی انداز سے نہیں ہوتی۔ بلکہ آرزو اور طلب جو کسی مطلب کے حصول کے لیے ہوتی ہے اسباب و سامان فراہم کرتی ہے۔ اگر حالت بے سرو سامانی کو عدم جد و جہد کا جواز بنا لیا جائے تو مقصد زندگی فوت ہو جاتا ہے۔ حصول مقصد کے لیے جذبہ اور طلب لازمی ہے۔ یہی پریشان خاطری اسباب جمعیت دل فراہم کرتی ہے۔

آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست   ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

اگرچہ کامیابی اور ناکامی کے احساس ایک دوسرے سے الجھتے رہتے ہیں۔ اس جنگ میں اہل معاملہ سخت کشمکش اور اضطراب میں مبتلا ہوتا ہے۔ لیکن کامیابی اور ناکامی کے ان احساسات کے درمیان مقصد کو پانے کے لیے ایک بیچ کا راستہ انسانی شعور خود نکال لیتا ہے۔ اور غالب کی اصطلاح میں وہ عجز ہمت ہے۔ یہی عجز ہمت یا شعور خود اعتمادی انسان کو ذاتی تحفظ اور بچاؤ کا احساس دلاتی ہے۔

یاس و امید نے اک عربدہ میدان مانگا   عجز ہمت نے طلسم دل سائل باندھا

راہ طلب میں بہت صعوبتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ راحت طلبی قدم اٹھانے نہیں دیتی۔ لیکن حوصلہ اور ہی طریقہ کار اختیار کرتا ہے۔

سفر عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی   ہر قدم سائے کو میں اپنے شبستاں سمجھا

- احساس محرومی

زندگی بجائے خود ایک المیہ ہے۔ پیدائش سے لے کر موت تک ہم کو محرومیوں سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔

کار گاہ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے   برق خرمن راحت خون گرم دہقاں ہے

یہ شکستگی اور توطیت زندگی کا عنوان بن جاتی ہے اور زندگی کا ہر غم سرنگونی اور گرانباری میں اضافہ کردیتا ہے اور انسان آہ و زاری کرنے لگتا ہے۔

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا   ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے

اور

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے   نالہ پابند نے نہیں ہے

- مایوسی

محرومی و مایوسی اور ناکامیوں کا غم مل کر ایک اضمحلالی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ دنیاوی سہارے جب ساتھ چھوڑ دیتے ہیں تو دل شکستگی کے باعث انسان خدا کی امداد و اعانت سے بھی مایوس ہونے لگتا ہے۔

سنبھلنے دے مجھے اے نا امیدی کیا قیامت ہے　　کہ دامان خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

اور جب دنیا اندھیر ہو جاتی ہے تو زندگی بوجھل معلوم ہوتی ہے۔ اور شمع زندگی کو گل کرنا ہی بہتر معلوم ہوتا ہے۔

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا　　نہ ہوتا گر جدا سر سے تو زانو پر دھرا ہوتا

لیکن سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ خود موت بھی اپنے اختیار میں نہیں ہے۔

میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں　　وہ ستم گر میرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

ان کیفیات سے گذر کر انسان خود بخود اس حقیقت کو سمجھ لیتا ہے کہ جب تک زندگی قائم ہے آفات دنیاوی سے نجات نہیں مل سکتی۔ کیونکہ

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں　　موت سے پہلے آدی غم سے نجات پائے کیوں

یہیں سے انسانی شعور میں ایک خاص قسم کا تحمل اور نظر افروزی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ غم و آلام کو حیات کا لازمہ سمجھ لیتا ہے۔ اور ہنگامہائے روزگار کو غنیمت سمجھتا ہے۔

نغمہ ہائے غم ہی کو اے دل غنیمت جانیئے　　بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن

کیونکہ

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق　　نوحہ غم ہی سہی نغمہ شادی نہ سہی

مزید یہ کہ اگر انسان غم کا خوگر ہو جائے اور خوشی کے تصور کو محو کر دے تو پھر غم اور کشاکش حیات کا عمل دخل کم ہو جاتا ہے

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج　　مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

اور

شادی سے گذر کہ غم نہ ہووے　　اردی جو نہ ہو تو دے نہووے

یہیں سے قناعت اور طمانیت قلب کا جذبہ انسان کو اپنی پناہ میں لے لیتا ہے۔ حالت بے سروسامانی بجائے خود ایک دولت معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس طرح انسان بہت سی کلفتوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔

ہوس گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا　　عجب آرام دیا بے پروبای نے مجھے

اور

نہ لٹتا دن کو تو یوں رات کو کیوں بے خبر سوتا　　رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

مزید یہ کہ ہر اکائی بجائے خود ایک اعدادی کش مکش ہے اگر سیر چشمی کے ساتھ حالات کو برداشت کیا جائے تو پھر اعدادی کش مکش خود ختم ہو جاتی ہے۔

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا　　درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

اسی کیفیت کو غالب ایک خاص نام "بے دلی" سے پکارتے ہیں اور اسی کے سہارے کشاکش دنیاوی کو

آسان کر لیتے ہیں۔

بہ فیضِ بے دلی نومیدیِ جاوید آساں ہے کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

اس طرح کبھی کبھی خود فریبی کے ذریعہ وہ کسی تلخ حقیقت کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم گری ہو جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

مسائل حیات جتنے پیچیدہ ہیں اسی قدر نفسیاتی الجھنیں بھی مشکل و دشوار ہیں۔ ہر لحہ انسانی ذہن مختلف جذبات و کیفیات کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ غالب کے کلام میں انسانی ذہن کی بے شمار کیفیات موجود ہیں۔ زیر نظر مضمون میں اجمالاً چند مسائل کو پیش کیا گیا ہے ورنہ غالب کا ایک مفکر نفسیات کی حیثیت سے مطالعہ کیا جائے تو اس علم میں ان کو نامور علمائے نفسیات میں سر فہرست شمار کرنا چاہئے علم نفسیات کے جن موضوعات پر انہوں نے اظہار خیال کیا ہے اس کی اہمیت اور افادیت اس لحاظ سے بہت زیادہ ہے کہ غالب ایک شاعر تھے۔ اور انہوں نے اس علم کے بنیادی نکات جس صحت کے ساتھ پیش کیے ہیں اس سے ان کے مشاہدے کی داد دینا پڑتی ہے اور یہ کہنا کچھ بے جا نہ ہو گا کہ ان کا مطالعہ عمیق ہے اور انہوں نے ہر مسئلہ پر ایک مدلل طریقہ کار اختیار کیا ہے۔ مغربی مفکرین نفسیات کے مقابلے میں ان کے نتائج زیادہ وقیع ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی مفکرین نے عقلی بنیادوں پر روحانی اقدار سے ہٹ کر غور کیا ہے۔ جب کہ غالب کے انداز فکر میں روحانی بصیرت کار فرما ہے۔ تصوف کے رموز ان کی رہبری کرتے ہیں اور حقیقت کائنات کا فہم و ادراک ان کے اصل حقیقت کو بہت جلد پالینے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ انفرادی نفسیاتی الجھنوں سے ہٹ کر وہ اجتماعی اور آفاقی مسائل پر جب روشنی ڈالتے ہیں تو ان کی فکر کو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان کے ہاں صرف الجھنوں کا ذکر ہی نہیں بلکہ ان کا حل بھی ہے۔ اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جو حل انہوں نے پیش کیے ہیں وہ فطرت کے اصولوں کے عین مطابق ہیں اور اختلاف طبائع کے باعث ان کے لگائے ہوئے حکم میں تزلزل پیدا نہیں ہوتا وہ فطرت انسانی کو فطرت کائنات کے تابع رکھنا چاہتے ہیں۔ اور ان کے اس نظریہ کی رو سے پھر کسی تصادم کا امکان باقی نہیں رہتا۔

دنیاوی نفع و نقصان اور دیگر مسائل روحانی اقدار کے تابع ہیں۔ مذہبی اصولوں کی پابندی ذہن کو بالیدگی بخشتی ہے اور اس طرح بے شمار ضمنی اور غیر اہم باتوں سے ذہن آزاد ہو جاتا ہے۔ اس طرح غالب علم نفسیات کے واحد عالم ہیں جنہوں نے عقل اور قلبی اقدار کو مربوط کر کے ایک منظم اور متوازن انداز فکر اختیار کیا ہے۔ ان کے ہاں تشنگی نہیں آسودگی ہے۔ اضطراب نہیں بلکہ سکون ہے۔ وہ مفروضات پر نتائج مرتب نہیں کرتے بلکہ مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں حقائق کی جانچ پڑتال کرنے کے بعد اپنی رائے دیتے ہیں۔ اگر مغربی مفکرین سے ان کا مقابلہ کیا جائے تو وہاں سطحیت پوری طرح نمایاں ہے جب کہ غالب کے ہاں گہرائی اور آفاقیت ملتی ہے۔ وہ اپنے طرز استدلال سے سائل کو لاجواب نہیں بلکہ مطمئن کر دیتے ہیں اور ان کی عظمت کا راز اسی میں پوشیدہ ہے۔

☆ ☆

ابراہیم خلیل ایم' اے لیکچرار گورنمنٹ کالج دادو

غالب اور علم نجوم

شعرائے اردو میں صرف مومن کو نجوی تصور کیا جاتا ہے اور انجم شناسی کی متعدد حکایتیں ان سے منسوب ہیں مطالعہ کلام غالب سے پتہ چلتا ہے کہ غالب بھی علم نجوم سے کماحقہ واقف تھے۔ لیکن وہ مومن کی طرح شعبدہ گری نہیں کرتے تھے۔ شعبدہ بازی سے میرا اشارہ چھپکلی اور چوری کے واقعات کی طرف ہے۔ کہتے ہیں ایک دن مومن آپنے احباب میں بیٹھے ہوئے تھے دیوار پر ایک چھپکلی نظر آئی انھوں نے حکم لگایا کہ اس کا جوڑا فلاں جانب سے آئے گا کچھ ہی دیر گذری تھی کہ ایک بساطی آیا اس نے سامان تجارت نکالا۔ سامان سے ایک چھپکلی نکلی اور دیوار پر چڑھ گئی اور دونوں چھپکلیاں ساتھ ساتھ چلی گئیں۔ اسی طرح ایک چوری کا واقعہ مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ ایک شخص آیا اس نے کہا میرا زیور چوری ہو گیا ہے۔ مومن نے حکم لگایا کہ تمہارا زیور چوری نہیں ہوا۔ وہ فلاں جگہ رکھا ہے۔ یہ واقعات صحیح ہوں یا غلط لیکن ان کی صحت کسی کے ماہر نجوم ہونے کی دلالت نہیں کرتی۔ یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ ان کے برج طالع میں آفتاب اور ماہتاب دونوں جمع ہوں۔ علمائے نجوم کا کہنا ہے کہ اس قسم کے طالع کا حامل اگر اندھا دھند بھی حکم لگا دے تو وہ بھی صحیح ہوتا ہے۔ یہ سہم الغیب کی کار فرمائی ہوتی ہے اس استثناء کے علاوہ ائمہ فن کا کہنا ہے کہ اس قسم کے احکامات کے لیے ارتفاع معلوم کرنا طالع درست کرنا۔ زائچہ کھینچنا۔ ستاروں اور برجوں کو قائم کرنا۔ شرائط خمسی اور ضمیر پوری کرنا وغیرہ ضروری ہے لطف یہ کہ جب مومن کوٹھے سے گرے تو حکم لگایا کہ میں پانچ دن یا پانچ ماہ یا پانچ سال میں مرجاؤں گا۔ چنانچہ پانچ ماہ کے بعد انتقال کیا یا تو یہ عالم کو کھویا ہوا سامان بتا رہے ہیں اور چھپکلی کا جوڑا تلاش کر رہے ہیں اور اپنے معاملہ میں پانچ کا پہاڑہ پڑھ رہے ہیں۔ چہ خوش۔

مومن کی شاعرانہ عظمت سے ہمیں انکار نہیں دوسری صلاحیتوں کے علاوہ علم نجوم میں ان کی مہارت کے بھی بہ دل معترف۔ لیکن ایسی بے سروپا باتیں واستانوں اور افسانوں میں اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ تاریخ۔ تحقیق و تنقید سے ان کا کیا علاقہ۔

چونکہ غالب کے حالات میں اس قسم کے چٹ پٹے نجوم کے قصے درج نہیں ہیں اس لیے کسی نے اس جانب توجہ نہیں دی۔ بلکہ کسی کو اگر خیال بھی آیا ہو گا تو اس نے اسے غالب کی ظرافت پر محمول کیا ہو گا۔ حالانکہ غالب جس دور سے تعلق رکھتے تھے اس میں طب' نجوم' شاعری' فلسفہ' منطق وغیرہ کا علم شامل نصاب تھا اور لازی تصور کیا جاتا تھا۔ چنانچہ میر مہدی کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔1۔

"مجتہد العصر سلطان العلماء مولانا سرفراز حسین کو میری دعا کہنا اور کہنا حضرت ہم تم

کو دعاء کہیں تم ہم کو دعا دو۔ میاں کس قصہ میں پھنسا ہے؟ فقہ پڑھ کر کیا کرے گا۔ طب و نجوم و ہیت و منطق و فلسفہ پڑھ جو آدمی بنا چاہیئے۔"

چونکہ خط کا انداز مزاحیہ ہے اس لیے نجوم پڑھنے کی نصیحت کو بھی جیسا ہم نے گذشتہ سطور میں عرض کیا مزاح پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے بہتر ہو گا کہ ان کے کلام سے مزید اسناد فراہم کرنے سے پہلے یہ متعین کر لیا جائے کہ جس شعبہ سے مرزا متعلق تھے اس کے لیے کن علوم کا مطالعہ ضروری تھا۔ یا جو مقام وہ حاصل کرنا چاہتے تھے اس کے لوازم کیا تھے۔ مرزا کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ استاد شاہ مقرر ہوں اس لیے قربت شاہ لازمی ہوئی اب دیکھنا یہ ہے کہ مصاحبین شاہ کو کن اوصاف کا حامل ہونا چاہیئے۔ ان کی تعلیم کیسی اور کیا ہونی چاہیے۔ اور بادشاہ کے لئے کن لوگوں کا وجود لازمی ہے یا تھا۔

مولانا نظامی عروضی سمرقندی جو ایک بلند پایہ عالم بدیہہ گو اور بے نظیر شاعر اور فقید المثال منجم تھے اور مختلف سلاطین کے دربار سے وابستہ بھی رہے تھے انہوں نے بادشاہوں اور سلاطین کی رہنمائی کے لئے "چار مقالہ" تصنیف کیا تھا جس کا مقصد سلاطین کو یہ سمجھانا تھا کہ انہیں کس تعلیم "کس قابلیت" کس انداز کے مصاحب منتخب کرنا چاہئیں اور کن لوگوں کا وجود بادشاہوں کے لئے لازمی "ضروری اور ناگزیر ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ دبیر۔ شاعر۔ منجم اور طبیب بادشاہ کے خواص ہیں اور ان کے بغیر چارہ نہیں۔ مولانا نے ان ہی چار فنوں کی مناسبت سے کتاب کا نام چہار مقالہ رکھا۔ تمہید میں ہر فن کا تعارف کرایا اور اس کی اہمیت کو واضح کیا اور ہر ایک کی متعدد مثالیں دیں۔ فرماتے ہیں۔2۔

"بس در سر ہر مقالتے از حکمت آنچہ بدین کتاب لائق بود آوردہ شد۔ بعد ازاں دہ حکایت طرفہ از نوادر آں باب و از بدائع آں مقالت کہ آں طبقہ را افتادہ باشد آوردہ آمد تا بادشاہ را روشن شود و معلوم گردد کہ دبیری نہ خرد کارے ست "و شاعری نہ اندک شغلے و نجوم علمی ضروری است و طب صنعتی ناگزیر و بادشاہ خرد مند را چارہ نیست ازیں چار شخص دبیر و شاعر و منجم و طبیب۔"

ظاہر ہے کہ جو شخص مصاحبت شاہ کا متمنی ہو گا وہ ان علوم کو حاصل کرے گا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ زمانہ قدیم کے وابستگان دولت کی تحریروں میں بالعموم اور بلند پایہ شعراء کے یہاں بالخصوص ان علوم پر قدرت کے اشارے ملتے ہیں۔ فارسی میں ظہیر فاریابی "خاقانی" انوری "قاآنی۔ اردو میں غالب۔ میر۔ سودا۔ ذوق کے قصائد میں ان علوم کی اصطلاحیں اور اشارے جا بجا ملتے ہیں ان میں سے کسی نے بھی مشتری کو جلاد فلک "مریخ کو قاضی فلک یا زہرہ کو نحس اکبر اور زحل کو رقاصہ فلک نہیں کہا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے نجوم کے اسماء اور اصطلاحات نہیں رٹ لی تھیں بلکہ ان کے اثرات ان کی چالوں سے واقفیت اور فن کے اسرار و رموز سے بھی کلی واقفیت بہم پہنچائی تھی۔ اور یہ لوگ ان کے صحیح استعمال پر قدرت رکھتے تھے۔ شعراء کی ان علوم پر قدرت ایسی مستند اور متفق الیہ ہے کہ فرہنگ نویسوں کو بھی جب سند دینی ہوتی ہے تو وہ اساتذہ کے اشعار بطور سند پیش کرتے

ہیں۔ اب بات صرف اتنی رہ جاتی ہے کہ کیا شعرانے اس فن سے کوئی منفعت حاصل کی۔ احکامات لگائے۔ یا نجوم کو بطور فن برتا۔ چونکہ ہمارا موضوع "غالب کی انجم شناسی ہے" اس لیے ہم دیگر شعرا سے قطع نظر کر کے صرف غالب پر گفتگو کریں گے۔ اشعار غالب میں گو بجا بجا برج۔ سیاروں اور ستاروں کا ذکر ہے لیکن سے مبادیات نجوم سے آشنائی پر محول کیا جا سکتا ہے اس لیے ہم دانستہ طور پر اشعار سے استناد کرنے سے گریز کرتے ہیں اس کے بجائے ہم غالب کی نثری نگارشات کو اپنے موقف کی توضیح میں پیش کریں گے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ فن کی باریکیوں سے بخوبی واقف تھے۔

اصل موضوع کی جانب رجوع کرنے سے پہلے مناسب ہو گا کہ اس امر کا تجزیہ بھی کر لیں کہ نظامی عروضی سمرقندی نے مصاحبت سلطانی کے لئے جن لوازم کا ذکر کیا ہے غالب ان پر کہاں تک پورے اترتے ہیں۔ جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا نظامی کا کہنا ہے کہ بادشاہ کے لئے دبیر' شاعر' نجومی اور طبیب کا وجود لازمی ہے۔

1:- یہ مسلم ہے کہ غالب جادو بیان شاعر تھے۔

2:- (الف) ان کی تصانیف میں صرف مہر نیم روز ہی ان کی فارسی انشا کا نا قابل تردید ثبوت ہے۔ دبیرالملک کا خطاب اس پر مستزاد ہے۔

(ب) اردو میں خطوط غالب جن کی شہرت وہ اپنی سخن وری کے شکوہ کے منافی تصور کرتے تھے اردو داں طبقہ نے اسے آنکھوں سے لگایا ہے۔

3:- نادرات غالب میں غالب کی طبی دستگاہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ غالب کی شاعری' دبیری اور طبی دستگاہ کے لوگ معترف ہیں۔ لیکن علم نجوم سے واقفیت پر کسی نے بحث نہیں کی ہے۔ ایسی کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ غالب نے لازمی مصاحبت چار چیزوں میں سے تین چیزوں کی تو تحصیل کی اور چوتھی کو نظرانداز کر دیا۔ غالب قال اللہ قال الرسولؐ بھی نہیں کرتے تھے کہ مذہبی نقطہ نظر سے انہوں نے اسے قابل اعتنا نہ سمجھا۔ شراب وہ پیتے تھے۔ لہو و لعب کے معترف تھے۔ جوئے سے ~~حسم~~ ہوئے۔ آخر نجوم کیوں چھوڑتے۔

تعجب ہے کہ اس جانب اعتنا نہیں کی گئی حالانکہ ان کے خطوط میں جا بجا اس علم سے واقفیت کے واضح ثبوت ملتے ہیں مثلاً نواب یوسف علی خاں والی رام پور کو اپنے خط مورخہ 22 مارچ 1865ء میں لکھتے ہیں۔

"ہمانا دریں روزگار' خسرو ستارگان کہ مہرمنیرش دانی' دربرہ واز سوی فراز نحستین سیارگان کہ زحلش خوانی' در ترازو' سعد اکبر بہ قوس' سعد اصغر بہ ثور' آں نیر بہ بیت الشرف خوشنود و شاد' وایں دواختر بکاشانہ ہائے خویشتن آباد گمان ندارم کہ از خسروان پارس و سلاطین عرب ہیچ کس راچنیں طالعی بہر جلوس اتفاق افتادہ باشد' کہ حضرت ولی نعمت رابرائے غسل صحت دست بہم دادہ است۔"3

اتفاق دیکھئے کہ یہاں بھی اعتراض وارد کیا جا سکتا ہے کہ خط والی رام پور کو لکھا گیا تھا اور والی رام پور

ے غالب مشاہرہ پاتے تھے اس لئے والی کو خوش کرنے کے لئے شاعری کی ہے کہ حضور پر نور بندہ پرور بڑی اچھی ساعت میں آپ نے غسل صحت فرمایا بس اب آپ امر ہو گئے اور ادھر ادھر کتابوں سے دیکھ کر یا لوگوں سے مشورہ کر کے یہ چند جملے لکھ دیئے۔ لیکن اس کا کیا جواب ہے کہ شاگردوں اور دوستوں سے تو وظیفہ نہیں ملتا تھا ان سے بھی تو نجوم کے اسرار و نجوم پر مراسلت رہی ان سے تو عذر کر سکتے تھے کہ بھائی میں شاعر ہوں نجومی نہیں۔ لیکن شاعروں اور دوستوں کے استفسارات کا بڑے عالمانہ انداز میں جواب دیا ہے۔

مولوی نعمان صاحب کے استفسار کے جواب میں 16 اکتوبر 1866ء کو لکھتے ہیں۔

"قران کے باب میں یہ ہے کہ زہرہ مشتری کا ایک برج و دقیقہ میں برابر ہونا قران السعدین ہے اور یہ قرانات حزنیہ میں سے ہے اور اکثر واقع ہوتا ہے اور یہ قران جب سلطنت موعود نہیں۔ اگر کسی بادشاہ کے ہنگام ولادت یہ قران آپڑا ہو گا۔ بشرط آنکہ برج طالع میں یا اوتاد ثلثہ یا مائل اوتاد میں واقع ہو کہ نظر اس کے طالع موعود پر ہو تو وہ افادہ صحت و عیش و عشرت کرتا ہے اور بس وہ قرانات اور ہیں جو موجب تغیر اوضاع عالم و انتقال سلطنت ہوتے ہیں۔ ازان جملہ ایک یہ قران تھا کہ زحل و مریخ سرطان میں فراہم ہوئے تھے۔ سراسر ہندوستان کی خاک اڑا دی۔"4

مولوی نعمان صاحب نے استفسار ہی اس وقت کیا ہو گا کہ جب ان کے علم میں آیا ہو گا کہ غالب کو نجوم میں بھی دخل ہے اور مرزا کے جواب کے بعد مزید کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں۔ یہ قیاس کرنا مناسب نہ ہو گا کہ غالب بہر حال ایک بلند پایہ فاضل تھے اس لئے جو مشکل درپیش ہوتی شاگرد اور احباب بلا تکلف رجوع کر لیتے ہوں گے مکاتیب غالب اس امر کے شاہد ہیں کہ مرزا نے کسی کو ترکیب وضو۔ نیت نماز۔ مسائل حج روزہ او... نہیں بتائے۔ ادبی علمی مسائل اور نجی معاملات کے سوا کسی سے مراسلت نہیں کی اور نہ کسی نے ان سے غیر متعلق سوال کرنے کی جرات کی۔

5 نومبر 1858ء کو چودھری عبدالغفور کے نام ایک خط مرزا صاحب نے لکھا ہے اس میں صاحب عالم مارہروی کو جو فاضل اجل اور متبحر عالم تھے لکھتے ہیں۔

"پیرو مرشد کو سلام و نیاز پہنچے۔ "کف الخضیب" صور جنوبی میں سے ایک صورت ہے اس کے طلوع کا حال مجھ کو کچھ معلوم نہیں اختر شناسان ہند کو اس کا کچھ علم نہیں اور ان کی زبان میں اس کا نام بھی یقین ہے نہ ہو گا۔

"قبول دعا وقت طلوع "مجملہ مضامین شعری ہے جیسے "کتان" کا پرتو ماہ میں پھٹ جانا اور "زمرد" سے افعی کا اندھا ہو جانا۔ آصف الدولہ نے افعی تلاش کر کے منگوایا اور قطعات زمرد اس کے محاذی چشم رکھے۔ کچھ اثر نہ ہوا۔ ایران و روم و فرنگ سے انواع کپڑے منگوائے، چاندنی میں پھیلائے کوئی مسکا بھی نہیں۔

"تحویل آفتاب برج حمل' کے باب میں موٹی سی بات ہے کہ 22 مارچ کو واقع ہوتی ہے کبھی 21 کبھی 23 بھی آ پڑتی ہے اس سے تجاوز نہیں۔ رہا طالع وقت تحویل درست کرنا۔ بے کتب فن اور مبلغ علم ممکن نہیں میرے پاس یہ دونوں باتیں نہیں۔"5

قبول دعا وقت طلوع' مولانا کا ازروئے نجوم استفسار تھا۔ ظاہر ہے ایک ایسا شخص جو خود بلند پایہ عالم دین ہو نہ جانے گا کہ اس بارے میں احادیث صحیحہ موجود ہیں۔ انہیں مرزا سے رجوع کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ انور الدولہ شفیق کو خط مورخہ 5 نومبر 1858ء میں فرماتے ہیں۔

"اب ضرور آ پڑا کہ کچھ حال اس ستارۂ دم دار کا لکھوں چنانچہ جس وقت سے وہ خط پڑھا ہے سوچ رہا ہوں کہ کیا لکھوں چونکہ بسبب فقدان اسباب یعنی عدم رصد و کتاب کچھ نہیں کہا جاتا ناچار مرزا صائب کا مصرع زبان پر آ جاتا ہے۔

؎ ازیں ستارہ دنبالہ داری ترسم

یہ مطلع ہے اور پہلا مصرع یہ ہے۔

؎ زخال گوشہ ابروئے یاری ترسم

کیا آپ مجھ کو بے ہنری اور ہیچ میرزی میں صاحب کمال نہیں جانتے اور خاص عبارت فارسی کو میرا مصداق حال نہیں مانتے۔

"پیش ملا طبیب و پیش طبیب ملا و پیش ہر دو' پیش ہر دو ہیچ؟ آرائش مضامین شعر کے واسطے کچھ تصوف کچھ نجوم لگا رکھا ہے ورنہ سوائے موزونی طبع کے اور کیا رکھا ہے۔ یہ ہر علم نجوم کے قاعدے کے موافق جب زمانہ کے مزاج میں فساد کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں تب سطح فلک پر یہ شکلیں دکھائی دیتی ہیں جس برج میں یہ نظر آئے اس کا درجہ و دقیقہ دیکھتے ہیں۔ ہزار طرح کے جال ڈالتے ہیں تب ایک حکم نکالتے ہیں شاہجہاں آباد میں بعد غروب آفتاب افق غربی شہر پر نظر آتا تھا اور چونکہ ان دنوں آفتاب اول میزان میں تھا تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ صورت عقرب میں ہے۔ درجہ اور دقیقہ کی حقیقت نامعلوم رہی بہت دن شہر میں اس ستارہ کی دھوم رہی اب دس بارہ دن سے نظر نہیں آتا۔ وہاں شاید اب نظر آیا ہے جو آپ نے اس کا حال پوچھا ہے۔ بس میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ صورتیں قہر الٰہی کی ہیں اور دلیلیں ملک کی تباہی کی۔ قران نحسین۔ پھر کسوف' پھر خسوف پھر یہ صورت پر کدورت۔ عیاذاً باللہ و پناہ بخدا۔
6

اس خط سے تو یہ واضح ہو ہی گیا کہ نواب صاحب نے استفسار کیا تھا جہاں تک "آرائش مضامین شعر کے واسطے کچھ تصوف کچھ نجوم لگا رکھا ہے" کا تعلق ہے تصوف کے باب میں ہم خاموش ہیں اس لیے کہ "تصوف برائے شعر گفتن خوب است" لیکن نجوم کے بارے میں یہ ضرور عرض کریں گے کہ مرزا صاحب کا عذر صرف

آرائش مضمون ہی کے واسطے تھا ورنہ نجوم کے بارے میں یہ گفتگو ئیں یہ مراسلات اور پھر ہیچ مدانی کا دعویٰ۔ تکلف محض سے زیادہ نہیں۔ اگر بالفرض مرزا کے اس قول سے احتراماً روگردانی نہیں کی جاسکتی تو اسی خط میں یہ جملہ بھی اس کے بعد ہی موجود ہے کہ "سوائے موزونی طبع کے اور کیا رکھا ہے۔" اسے بھی بجنسہ تسلیم کر لیجئے۔ جہاں نجوم گیا وہاں شاعری اس کے ساتھ۔

ے اسی روشنی طبع تو بر من بلا شدی

مرزا کی مذکورہ بالا تحریریں (بجز مکتوب رام پور) کسی نہ کسی خط کے جواب میں تھیں اب چند ایسی چیزیں پیش کی جاتی ہیں جو انہوں نے از خود لکھیں اور جو ان کی اس علم سے واقفیت' لگاؤ اور اس پر کسی نہ کسی حد تک توجہ کی غمازی کرتی ہیں۔

نواب امین الدین احمد خاں والئ ریاست لوہارو کو لکھتے ہیں:۔

"آج 22 جون ہے۔ آفتاب سرطان میں آ گیا نقطہ انقلاب صیفی میں دن گھٹنے لگا۔ چاہئے کہ تمہارا غیظ وغضب ہر روز کم ہوتا جائے۔" 7۔

نواب علاؤ الدین احمد خاں نسبتی ثم علائی والی ریاست لوہارو کو لکھتے ہیں:۔

"مکان کے مالکوں کی طرف سے مد شروع ہو گئی ہے نہ لڑکا ڈرتا ہے' نہ بی بی گھبراتی ہے۔ نہ میں بے آرام ہوں۔ کھلا ہوا کوٹھا۔ چاندنی رات' ہوا سرد۔ تمام رات فلک پر مریخ پیش نظر دو گھڑی کے تڑکے کے زہرہ جلوہ گر ادھر چاند مغرب میں ڈوبا۔ ادھر مشرق سے زہرہ نکلی۔ صبوحی کا وہ لطف' روشنی کا وہ عالم۔"8۔

امثلہ بالا سے یہ مدعا ہے کہ مرزا صاحب نے نجوم کا سطحی مطالعہ نہیں کیا تھا اور ان کی معلومات کا دائرہ صرف متداولہ کتب پر ہی منحصر نہ تھا بلکہ وہ سیاروں کی گردش کا بھی دلچسپی سے مطالعہ کرتے تھے نیز تقویم ان کے پیش نظر رہتی تھی جس کی تصدیق ان کے خطوط سے ہوتی ہے۔ اس لئے تاریخ عیسوی کے ساتھ تاریخ ہجری کا التزام نظر آتا ہے اور جہاں تقویم میں سہو ہوتا اس کی نشان دہی کرتے تھے۔ چنانچہ نواب انور الدولہ رئیس کالپی کو خط کے اخیر میں یوں تاریخ لکھی ہے۔

"دو شنبہ بہ حساب تقویم یازدہم و از روئے رویت دہم ربیع الاول 1273ھ (10 نومبر1856ء) 9۔

حبیب اللہ ذکا کے خط میں تاریخ یوں رقم کی ہے:۔

"سہ شنبہ از روئے جنتری 26' اور از روئے رویت 25 رجب 1283ھ اور 4 دسمبر (1866ء) 10۔

نواب ابراہیم خاں وفا (بقول عسکری رئیس سورت) کو لکھتے ہیں:۔

"میر صاحب قبلہ سید عالم علی خاں بہادر کی دو غزلیں پہنچیں۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ میں

رجب کے مہینے میں وطن کو جاؤں گا اور وہاں سے تیرے پاس آؤں گا۔ آج بحساب جنتری 27 اور از روئے رویت 26 رجب ہے۔ غزلیں ان کی موجود مگر بھیج نہیں سکتا آپ میری بے گناہی کے گواہ رہیں۔"

اخیر میں عیسوی تاریخ لکھی ہے:-

"پنجم دسمبر 1866ء رجب کی تاریخ اوپر لکھ آیا ہوں۔" 11۔

مضمون تشنہ رہے گا اگر مرزا کے احکامات کے باب میں گفتگو نہ کی جائے۔ مرزا نے غالبًا 1839ء میں اپنی موفات کا حکم لگایا تھا چنانچہ اپنے ایک خط مورخہ 3 جنوری 1859ء میں خواجہ غلام غوث بے خبر کو لکھتے ہیں۔

"جانتا ہوں کہ تم کو ہنسی آئے گی کہ کیا بکتا ہے۔ مرنے کا زمانہ کون بتا سکتا ہے؟

یہ چاہے الہام سمجھے، چاہے اوہام سمجھے، بیس برس سے یہ قطعہ لکھ رہا ہے۔

من کہ باشم کہ جاوداں باشم چوں نظیری نماند و طالب مرد
ورگبویند ورکدا میں سال مرد غالب؟ بگو کہ غالب مرد

اب بارہ سو چھتر ہیں اور غالب مرد کے بارہ سو ستتر ہوتے ہیں اس عرصہ میں جو مسرت پہنچنی ہو پہنچ لے۔ ورنہ پھر ہم کہاں۔ 12۔

قاضی عبدالجمیل صاحب کو تقریر نو ماہ کے بعد 8 ستمبر 1859ء کو لکھتے ہیں۔

کیستم من کہ تا ابد بزیم

لاحول ولا قوۃ! یہ مصرع میرا نہیں "تا ابد بزیم" یہ فارسی لالہ قتیل کی ہے۔ میرا قطعہ یہ ہے۔

کیستم من کہ جاوداں باشم چوں نظیری نماندو طالب مرد
ورگبویند ور کدا میں سال مرد غالب؟ بگو کہ "غالب مرد"

"یہ مادہ تاریخ از روئے نجوم نہیں بلکہ از روئے کشف ہے۔ انا اللہ و انا الیہ راجعون۔" 13۔

مرزا صاحب کی مجوزہ تاریخ وفات کے بارے میں تمام اقتباسات ہم نے پیش کر دیئے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اپنی پیش گوئی کا کس حد تک یقین تھا۔ چنانچہ مرزا صاحب نے اپنی اس پیش گوئی کو کہیں الہام، کہیں اوہام، کہیں کشف سے تعبیر کیا ہے۔

کشف کا جہاں تک تعلق ہے یہ ہر ایک کو نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ریاض، مجاہدہ، مراقبہ کرنا ہوتا ہے اور یہ کلام صوفیائے کرام کا ہے۔ لطف یہ کہ آپ کا عقیدہ اثنا عشری جس میں تصوف کی گنجائش نہیں بلکہ ایک دوسرے کی ضد اور کشف کے مدعی۔

الہام بھی ایسی آسان چیز نہیں آپ کا عالم تو یہ تھا کہ، عمر بھر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر اور ایک دفعہ بھی نماز پڑھی ہو تو مسلمان نہیں۔ الہام کے لئے کچھ شرائط ہوتی ہیں عالم سرخوشی میں کوئی کیفیت طاری ہو جائے

اسے تو کوئی الہام تسلیم کرنے کو تیار نہ ہو گا۔ پھر یہ کیسا الہام ہے کیسا کشف ہے کہ غلط ثابت ہو۔

رہا معاملہ اوہام کا۔ حضرت معوج الذہن نہ تھے۔ صحیح الدماغ تھے۔ علیل نہ تھے صحت مند تھے۔ مراق جنون مالیخولیا کا شکار نہ تھے جو بیس سال بعد مرنے کی پیش گوئی کر دی۔ یہ تو ممکن ہے کہ ایک شخص بیمار ہوا۔ اسے وہم ہو گیا کہ اب میں جلد ہی مرجاؤں گا سال دو سال زیادہ سے زیادہ ورنہ دو چار ماہ کی زندگی اور ہے آپ نے کسی بیمار یا مریض کو یہ کہتے سنا ہو گا کہ بیماری نے بالکل نڈھال کر دیا۔ اب مجھ میں کچھ نہیں رہا صرف ایک ربع صدی کا مہمان ہوں سبحان اللہ کیا مبارک اور شاعرانہ مرض ہے کہ بیماری میں بھی مبالغہ کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ راقم الحروف نے تو بمشکل پانچ سال کا اضافہ کر کے اغراق تک پہنچایا تھا لیکن مرزا صاحب نے آخری لمحہ اس میں مزید تین سال کا اضافہ کیا اور سرحد غلو تک پہنچا دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ یہ پیشین گوئی از روئے کشف تھی نہ از روئے الہام بلکہ خالصتہ "از روئے نجوم تھی۔ لیکن جیسا مرزا صاحب کی تحریروں سے ظاہر ہے کہ نہ ان کے پاس رصد اور اصطرلاب تھی (جسے انہوں نے فقدان اسباب سے تعبیر کیا ہے) اور نہ کتب نجوم تھیں اس لئے صرف ظن و تخمین پر حکم لگایا تھا۔ علاوہ ازیں نجوم میں ریاضی کی بے حد ضرورت پڑتی ہے۔ بے انتہا جمع تفریق تقسیم کرنی پڑتی ہے۔ مرزا صاحب کو حساب سے کوئی مناسبت نہ تھی بلکہ انہیں الجھن ہوتی تھی (یہ بھی ان کی تحریروں سے ثابت ہے) اس لیے انہیں خود بھی اپنی پیش گوئی پر یقین کامل نہ تھا اس لئے پیش بندی کے طور پر اپنی پیش گوئی کو الہام و کشف سے تعبیر کیا تھا۔ اس میں کلام نہیں کہ جس سال انہوں نے اپنے مرنے کی پیش گوئی کی تھی اسی سال دلی میں زبردست وبا پھیلی تھی اور بے انتہا اموات واقع ہوئی تھیں۔ اور جب جناب پر کوئی آنچ نہ آئی تو پھر شوخیاں شروع کر دیں۔ میر مہدی کو لکھا۔

"میاں 1277ھ کی بات غلط نہ تھی۔ میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔
واقعی اس میں میری کسرشان تھی۔ بعد رفع فساد ہوا سمجھ لیا جائے گا۔"14۔

یا قاضی عبدالجمیل صاحب کو لکھا کہ :-

"1277ھ میں میرانہ مرنا صرف میری تکذیب کے واسطے تھا۔"15۔

گمان غالب ہے کہ مرزا کی ان ہی نکتہ طرازیوں نے ناقدین غالب کی توجہ تنجوم کی جانب منعطف نہ ہونے دی اور ہر ایک نے ان کی پیش گوئی اور علم نجوم سے متعلق نگارشات کو کوئی اہمیت نہ دی۔

یہاں یہ عرض کرنا مناسب ہو گا کہ کسی بھی نجومی کے کسی حکم کے غلط ہو جانے سے اس کے علم نجوم میں مہارت پر حرف نہیں آتا۔ بادی النظر میں تو بات بڑی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔ لیکن غور فرمایئے کیا ماہر سرجن سے آپریشن میں لغزش نہیں ہوتی کیا اسپیشلسٹ ڈاکٹروں سے کیس نہیں بگڑتے کیا بلند پایہ انجینئروں کی زیر نگرانی تعمیر کی جانے والی عمارتیں نہیں بیٹھ جاتیں' پل منہدم نہیں ہو جاتے۔ اس کے باوجود انہیں ڈاکٹری اور انجینئری کے شعبہ سے خارج نہیں کیا جاتا۔ پھر کوئی معقول جواز نہیں ملتا کہ نجومی کا سہو قابل معافی نہ سمجھا جائے۔ نجوم میں حکم لگانے سے پیشتر کافی جمع تقسیم کا عمل کرنا پڑتا ہے ہزار طرح کی چال ڈالنی پڑتی ہے ظن و تخمین سے کام لینا پڑتا ہے

پھر کہیں حکم لگایا جاتا ہے کہیں بھی سہو ہوا اور نتیجہ معلوم۔ باوجود یہ کہ نجوم کو باقاعدہ سائنس تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن غالباً اسی لئے اس کے احکامات پر یقین کرنے کی ممانعت آئی ہے اور اسی لئے علم نجوم کے ماہر کا کہنا ہے کہ۔

"احکام نجوم اگرچہ صنعتے معروف است اعتماد رانشاید وباید کہ منجم در آں اعتماد مکند و ہر حکم کہ کند حوالہ باتفاق کند "16۔

یہاں یہ خیال پیدا ہو گا کہ نجوم باقاعدہ ایک علم ہے۔ اس کا مطالعہ بھی مرزا نے کیا پھر اس واقفیت سے انکار کیوں۔ اور احکامات لگانے سے گریز کیوں اور احتراز کی کیا وجہ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مرزا ریاضی سے طبعاً متنفر تھے اسی لیے تاریخ گوئی سے دامن بچاتے تھے لیکن اس کے باوجود دوستوں' شاگردوں اور احباب کے اصرار پر آخر تاریخیں کہنی پڑیں۔ اگر نجوم سے واقفیت کا اعتراف کرتے تو احباب کے اصرار پر مجبوراً" زائچے اور تقویمیں بھی بنانی پڑتیں --- علاوہ ازیں انہوں نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ مومن کی نجوم میں مہارت کی عوام نے کیا قدر کی۔ عبداللہ خاں اوج مومن کی علم نجوم میں مہارت کی داد یوں دیتے ہیں۔

بھنوں میں وہ اپنا مکان لیتا ہے نجومی بن کے جو ہتنی کا دان لیتا ہے

غالب نے سوچا ہو گا کہ میرے خلاف پہلے ہی کیا کم محاذ کھلے ہیں جو ایک نیا محاذ کھولنے کی لوگوں کو دعوت دوں۔ اور اگر ایسا ہوتا تو کیا حکیم آغا جان عیش۔ اوج مذکور وغیرہم انہیں معاف کر دیتے۔ علاوہ ازیں کیا غالب کو فارسی کے مشہور شاعر انوری کا حال نہ معلوم ہو گا کہ غریب کو ایک حکم لگانے پر ملک سنجر کا عتاب سہنا پڑا تھا۔ (جس کی تفصیل تذکرۃ الشعراء دولت شاہ سمرقندی میں دی گئی ہے۔ صفحہ 52)

یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ غالب اپنی فارسی کے مقابلہ میں کسی چیز کو پیش کرنا پسند نہیں کرتے تھے جس طرح انہوں نے اپنی اردو شاعری اردو نثر نگاری کو فارسی کے مقابلہ میں لانا پسند نہ کیا اسی طرح نجوم کو بھی دون مرتبہ عائی سمجھا ہو گا۔

حواشی

1۔ عود ہندی ص 204 مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور۔

2۔ چہار مقالہ ص 19 مرتبہ شعبہ تالیف و ترجمہ ادارہ شرفیہ دہلی 1949ء

3۔ مکاتیب غالب مرتبہ امتیاز علی عرشی ص 31- 32- ناظم برقی پریس رام پور 1945ء

4۔ غالب کی نادر تحریریں مرتبہ خلیق انجم ص 70 مطبوعہ مکتبہ شاہراہ دہلی فروری 1961ء

5۔ عود ہندی ص 45 مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ۔

6۔ خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر ص 357

7۔ خطوط غالب مہر ص 53

8۔ خطوط غالب مہر ص 82

9۔ حطوط غالب مہر ص 355

10۔ خطوط غالب مہر ص 355

11۔ خطوط غالب فہر ص 419

12۔ خطوط غالب مہر ص 324

13۔ عود ہندی مجلس ترقی ادب لاہور ص 405-406

14۔ خطوط غالب مہر ص 236

15۔ خطوط غالب مہر ص 519

16۔ چہارم مقالہ ص 99 - 100

غالب کی ابتدائی شاعری کا نفسیاتی پس منظر

مسلم ضیائی

انسان کبھی جمودی حالت میں نہیں رہتا۔ وہ بدلتا رہتا ہے، جسمانی اعتبار سے بھی اور ذہنی اعتبار سے بھی۔ اس کی زندگی تغیر مسلسل کا نام ہے۔ رحم مادر میں نطفہ قرار پانے سے آغوش لحد میں پہنچنے تک ہر لحہ لاکھوں نہیں کروڑوں خلئے پیدا ہوتے اور فنا ہوتے رہتے ہیں۔ رنج والم اگر اس کی زندگی کو گھلاتے ہیں تو مسرتیں بالیدگی بخشتی ہیں، اور یہ دونوں کیفیتیں بھی وقفے وقفے سے اس کی ساری زندگی پر حاوی رہتی ہیں۔ ماحول اسے بناتا اور بگاڑتا ہے۔ یہ ماحول خاندانی اور سماجی بھی ہوتا ہے اور جغرافیائی اور معاشی بھی۔

غالب کی تاریخ پیدائش میں اختلاف ہے۔ مروج تاریخ ۸ر رجب ۱۲۱۲ھ روز یک شنبہ ہے، لیکن تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا سال پیدائش ۱۲۱۳ھ ہے۔

(غالب کا زائچہ اور تاریخ ولادت۔ اردو نامہ جنوری ۱۹۶۷ء)

بہرحال انہوں نے دنیا کو پہلی بار اس وقت دیکھا جب اٹھارویں صدی دم توڑ رہی تھی۔ مغل سلطنت کی عمارت سے ایک وست رعشہ دار کے مانند آنے والی تباہی کے خوف سے لرز رہی تھی۔ سمندر پار سے آئی ہوئی قوم کے قدم تیزی سے قلب پر حملہ کرنے کے لیے بڑھ رہے تھے۔

غالب کے باپ مرزا عبداللہ بیگ، غلام حسین کمیدان کے خانہ داماد تھے۔ ان کی مالی حالت کچھ زیادہ اچھی نہیں معلوم ہوتی، چنانچہ کبھی تو اودھ کے نوابوں کی ملازمت میں نظر آتے ہیں اور کبھی نظام علی خاں کی فوج میں خدمات انجام دیتے ہیں۔ آگرے میں ان کا قیام بہت کم رہا۔ ان کی عمر کے آخری پانچ چھے برسوں کے بارے میں قیاساً" کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے آگرے ہی میں گزارے ہوں گے جب ان کی بڑی بیٹی "چھوٹی خانم" بڑے بیٹے مرزا محمد اسد اللہ بیگ خاں اور چھوٹے بیٹے مرزا یوسف اللہ بیگ خاں پیدا ہوئے۔ ان تینوں نے یکے بعد دیگرے اٹھارویں صدی کے آخر میں یعنی ۱۸۰۰ سے پہلے جنم لیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے باپ عبداللہ بیگ خوددار اور باہمت آدمی تھے۔ چونکہ انہیں عام خانہ داماد کے مانند خسر کا مرہون احسان ہونا پسند نہ تھا، اس لیے تلاش معاش میں ہتھیلی پر سر رکھ کر ہر طرف سرگرداں رہتے۔ چنانچہ اسی کش مکش روزگار میں الور کے علاقہ راج گڑھ میں لڑتے ہوئے مارے گئے۔ میرے خیال میں غالب کی سفردوستی موروثی تھی۔ اگرچہ شخصیت کی تعمیر توریثی لحاظ سے پیدائش سے پہلے ہی شروع ہو جاتی ہے، لیکن پیدائش کے بعد بچے کا ماحول اس کی شخصیت کی تعمیر میں بہت اہم حصہ لیتا ہے۔ اس کے علاوہ پیدائش سے

پہلے ماں کی جذباتی کیفیت کا بھی بچے کی ذہنی تعمیر اور تخریب میں بڑا دخل ہوتا ہے' اس لیے مرزا یوسف کے اسباب جنوں پر غور کرتے ہوئے پیدائش سے پہلے ان کی ماں عزت النساء بیگم کی ذہنی کیفیت لائق توجہ ہے۔ شاید اس زمانے میں عبداللہ بیگ کے جنگ پر چلے جانے کا اثر عزت النساء پر بہت گہرا پڑا تھا۔

غالب سے پہلے ان کی بڑی بہن "چھوٹی خانم" پیدا ہو چکی تھی۔ وہ پہلوٹھی کی بیٹی ہونے کے باعث بہت چہیتی تھیں۔ ہمارے معاشرے میں لڑکا پیدا ہونے پر زیادہ مسرت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بیٹے کی پیدائش پر بڑی خوشی کا اظہار کیا گیا ہوگا اور غالب اپنے گھر میں ایک ننھے بادشاہ کی طرح زندگی بسر کرتے ہوں گے۔ لیکن دو سال بعد مرزا یوسف کے پیدا ہونے پر ان کا تخت شاہی چھن گیا۔ اب وہ چھوٹی خانم اور مرزا یوسف اللہ بیگ کے درمیان تھے۔ بچوں میں لڑائیاں بھی ہوتی ہوں گی جن میں سے ایک سے پٹتے اور دوسرے کے لیے پٹتے جاتے ہوں گے۔ ننہال کے دوسرے بچوں سے متعلق ہمارے پاس کوئی معلومات نہیں اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان بچوں میں لڑائیوں کے باعث کیا مسائل پیدا ہوتے تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑا بیٹا ہونے کے باعث ان سے زیادہ محبت بھی کی جاتی اور ان کی ضدیں بھی پوری کی جاتی تھیں۔ غالب کے کردار میں اسی وجہ سے یہ بات نمایاں طور پر نظر آتی ہے کہ خود تو سب کچھ کہتے اور کرتے' لیکن اپنے مخالف کی بات برداشت نہ کر سکتے تھے۔ ان کا کردار یہ تھا کہ دوسرے ان کے سامنے سر جھکائیں اور ان کا احترام کریں۔

ان میں دروں بینی' خود سری اور خود پرستی پیدا ہو گئی۔ ہندوستان کے فارسی گو شعرا کو لائق اعتنا نہ سمجھنا' ان کی شاعری پر آمرانہ حکم لگانا اور فیضی ایسے شاعر کے بارے میں یہ کہنا کہ "میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔" ان کے کردار کی ترجمانی کرتا ہے۔ اپنی اسی خود پرستی اور خود بینی یا نرگسیت کی بنا پر وہ قتیل' ملا غیاث رامپوری اور محمد حسین تبریزی کا نام سننا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔

طفولیت کے زمانے میں ان کی ذہنی کش مکش نے رشک اور حسد کے مادوں کو جنم دیا' لیکن ان کے وسیع مطالعے' مشاہدے' علم' تربیت' ماحول اور شعور نے اگرچہ ان پر پردے ڈال کر انہیں تحت شعور کی تاریک بھول بھلیوں میں دھکیل دیا تھا' پھر بھی یہ جذبات بعض اوقات بڑی شدت سے نمایاں ہو جاتے تھے' جیسا کہ کلکتہ میں معرکہ قتیل اور پورے ہندوستان میں قاطع برہان کے ہنگامے سے ظاہر ہے۔ خود ان کو بھی احساس تھا' چنانچہ ۔ :

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو
کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو

غالب کی اس شعوری کوشش کی نمائندگی کرتا ہے' جس کے ذریعے یہ عظیم شاعر اپنی شخصیت کو بلند اور برتر بنانے میں معروف تھا۔

باپ کی موت پر جب ان کی عمر پانچ سال سے زائد نہ تھی' انہوں نے شاید پہلی بار گھر میں لوگوں کو آنسو بہاتے' آہیں بھرتے اور ماں کو چوڑیاں توڑتے دیکھا ہوگا۔

ننھے غالب کی زندگی کا یہ پہلا حادثہ تھا' جس سے اس کے دل و دماغ متاثر ہوئے ہوں گے اور یہ غم انگیز

واقعہ یادوں کے پردے پر مرتسم ہو گیا ہو گا۔ اس وقت ان کی حیثیت ایک یتیم بچے کی تھی جسے غالباً اسی زمانے میں مکتب میں بٹھا دیا گیا تھا۔ غالب کی ابتدائی یادوں میں مکتب کی یاد بھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے استاد خواہ محمد معظم ہوں یا ان سے پہلے کے کوئی اور استاد' زبان سے زیادہ ہاتھ سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ ان کے دیوان میں "سیلی استاد" کا ذکر بار بار آتا ہے:

اہل بینش کو ہے طوفان حوادث مکتب — لطمہ موج کم از سیلی استاد نہیں

رہ خوابیدہ تھی' گردن کش یک درس آگاہی — زمیں کو سیلی استاد ہے نقش قدم میرا

ساقی و تعلیم رنج محفل و تمکیں گراں — سیلی استاد ہے ساغر بے مل ہنوز

ان کے بچپن کی یادیں روشن یادیں نہیں' تاریک اور غم انگیز یادیں ہیں:

ہمیشہ مجھ کو طفلی میں بھی مشق تیرہ روزی تھی
سیاہی ہے مرے ایام میں لوح دبستاں کی

ہمارے معاشرے میں شوہر کے مرجانے پر اگرچہ بیوہ کے باپ یا بھائی' بیوہ بیٹی یا بہن اور اس کے بچوں کو طوعاً" کرہاً" ہی سہی' اپنے گھر میں پناہ دیتے تھے' لیکن یتیم بہرحال یتیم ہوتے ہیں اور بیوہ بہرحال بیوہ ہوتی ہے اور انہیں گھر میں وہ مقام حاصل نہیں ہوتا جو متوفی شوہر اور باپ کی زندگی میں حاصل تھا۔

یہی وجہ ہے کہ میرے خیال میں نہ بیوہ عزت النساء بیگم کی زندگی میں مسرت کے شادیانے تھے اور نہ یتیم غالب کے لیے' خواجہ غلام حسین خاں کی مرفع الحالی کے باوجود آزاد شادمانی اور بلند مقامی حاصل نہ تھی' جو اسے اپنے باپ کی زندگی میں حاصل تھی۔

لیکن خوش قسمتی نے ایک بار پھر اپنا تابندہ و درخشندہ چہرا دکھایا' یعنی ان کے لاولد چچا نصر اللہ بیگ خاں انگریزوں کے متوسل ہو کر سترہ سو روپیہ ماہوار تنخواہ پانے لگے اور اپنی ترک تازیوں کی بدولت ایک سیر حاصل علاقے کے مالک بن بیٹھے۔ مگر یہ روشنی بھی ڈوبتے آفتاب کی روشنی ہوئی۔ چنانچہ ابھی غالب نو سال ہی کے تھے کہ نصر اللہ بیگ خاں ہاتھی سے گر کر فوت ہو گئے۔ (۱۸۰۶)

ایک انتہائی اندھیری رات چاروں طرف مسلط ہو گئی۔ معاشی اور سماجی برتری کے محل اچانک زمین بوس ہو گئے اور غالب اور ان کی ماں ننھیال والوں کے پھر محتاج ہو گئے۔ غالب نے ایک بار پھر اپنے گھر میں موت کا پرہول چہرہ دیکھا اور اس کے بھیانک سائے اپنے اردگرد پھیلتے ہوئے دیکھے۔ غالب کی تحریروں یا کسی اور ذریعے سے اس بات کا پتا نہیں چلتا کہ ان کے ننھیالی رشتے داروں میں کون کون لوگ تھے' لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان سے متعلق غالب کی یادیں خوش گوار نہ تھیں' اسی لیے ان کا ذکر ان کی تحریروں میں نہیں ملتا۔ ان کی ابتدائی شاعری میں البتہ عزیزوں کی شکایتیں بار بار ملتی ہیں لیکن یہ شکایتیں کچھ ننھیالی عزیزوں کی ہیں اور کچھ ان کے ابتدائی شاعری

کے آخری دور میں دولت مند اور مغرور سسرالی اعزا کی۔ اس دور کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ناخن دخل عزیزاں یک قلم ہے نقب زن — پاسبانی طلسم کنج تنہائی عبث!
برنگ سبزہ عزیزان بدزباں یک دوست — ہزار تیغ بہ زہراب دادہ رکھتے ہیں!

کیا پوچھے ہے برخود غلطیہائے عزیزاں — خواری کو بھی اک عار ہے عالی نسبوں سے
اسد مت رکھ تعجب خرد ماغیہائے منعم کا — کہ یہ نامرد بھی شیرافگن میدان قالی ہے

ان اشعار سے غالب کی اس ذہنی کش مکش کا پتا چلتا ہے جس میں ان کی آزادی پر حد بندیاں لگائی جانے کے باعث انہیں مبتلا ہونا پڑا تھا' کیوں کہ باپ کے موجود نہ ہونے کے باعث انہیں اپنی تنہائی اور بے کسی کا احساس ہوتا اور ان کے سونے ہاتھ اور اپنے جسم پر یتیمی کی سفید' گرمیلی چادر چاروں طرف لپٹی ہوئی نظر آتی تھی' لیکن غالب کے ذہن کی تیز کرنوں نے اس تاریکی کا سینہ چاک کر دیا اور آہستہ آہستہ روشنی بڑھتی گئی' جس نے غالب کو ایک بڑا شاعر اور بڑا انسان بنا دیا۔

ہماری قدیم تعلیم میں سب سے پہلے شعر و سخن سے دلچسپی پیدا کرائی جاتی تھی۔ صاحب قلم یعنی انشاء پرداز کی بڑی عزت تھی۔ اس معاشرے میں دو قسم کے لوگ ہوتے تھے۔ یا تو صاحب سیف یا صاحب قلم۔ صاحب قلم وزیر ہوتے اور حکومت کرتے۔ صاحبان سیف علاقے فتح کرتے اور اقتدار میں اضافہ کرتے۔ ابھی کوئی دو ربع صدی پہلے تک' جب فارسی ختم ہو رہی تھی اور اردو کے قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ بچوں سے یہ اشعار لکھوا کر انہیں یاد کرائے جاتے تھے:

قلم گوید کہ من شاہ جہاں نم
قلم کس را بدولت ی رسا نم

علم ہو یا حصول زر' جو حصول اقتدار و احترام کا ذریعہ بھی ہے' قلم ہی کا مرہون منت تصور کیا جاتا تھا۔ غالب کو بھی مکتب میں یقیناً یہ شعر پڑھوایا اور لکھوایا گیا ہوگا۔ مغرب کے نئے اسلحہ توپ اور بندوق نے سپہ گری کے فن کو ختم کر دیا تھا۔ دست بدست نیزہ اور تلوار کی لڑائی کا دور بھی ختم ہو چکا تھا۔ غالب کے بزرگ' سپاہی پیشہ اور ترکتاز تھے' لیکن چونکہ اب ترکتازی کا دور ہی ختم ہو چکا تھا' اس لیے غالب نے تیرنیاگاں کو قلم بنا کر اس سے عظمت و برتری حاصل کرنا اپنا مقصد زندگی بنا لیا۔ ان کے دماغ میں اس جذبے نے گھر کیا کہ میرے بزرگ نامور تھے' اس لیے مجھے بھی نامور ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم شروع ہی سے غالب کو شعر و ادب کے میدان میں قلم کے گھوڑے دوڑاتے دیکھتے ہیں۔ عمر کا دسواں سال ختم کر کے گیارھویں سال سے شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ محمد معظم کو "کہ چہ" کے استعمال سے متعلق ظہوری (یا بیدل؟) کی سند پیش کی جاتی ہے۔ پچیس سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے "یادگار نالہ' اک بے شیرازہ" تلف ہوتا اور دوسرا ۵ صفر ۱۲۳۷ھ یا اس سے بھی پہلے تکمیل کے مراحل طے کر کے پچیس سالہ غالب کو صاحب دیوان بنا دیتا ہے۔

شخصیت کی تعمیر میں توریث کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ غالب ترک نژاد تھے' جن کے بارے میں سعدی نے ---- سعدیا روز ازل حسن بہ ترکاں دادند---- کہا ہے اور جو عیش امروز یعنی---- "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کے قائل ہوتے ہیں۔

خواجہ غلام حسین کمیدان میرے خیال میں کشمیری نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ غالب نے ماں اور باپ دونوں کی طرف سے میراث میں خوب صورت چہرہ اور خوب صورت جسم پایا۔ پہلا اور بڑا بیٹا ہونے کی وجہ سے یقیناً وہ بہت چہیتے تھے۔ زیادہ لاڈ پیار اور بات بات پر اللہ آمین کیے جانے سے بچہ دوسروں پر انحصار کرنے لگتا ہے۔ غالب کی ایک اعتبار سے یہ خوش قسمتی بھی تھی کہ ان کے دو سال بعد ہی مرزا یوسف اللہ بیگ پیدا ہوگئے۔ غالباً یہ زمانہ عزت النساء بیگم کی پریشانیوں کا زمانہ تھا۔ جس کے اثرات بعد میں مرزا یوسف کی دیوانگی کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ اس طرح غالب اس بیجا لاڈ پیار سے بچ گئے' جس کے باعث مستقبل میں انسان دوسروں پر انحصار کرنے لگتا ہے۔

غالب کے بھائی بہنوں کی عمروں میں بظاہر ہر دو دو سال کا تفاوت معلوم ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ عبداللہ بیگ نے ۱۷۹۳ء سے ۱۷۹۸ء تک کا زمانہ کم و بیش آگرے ہی میں گزارا اور غالب ایام رضاعت میں باپ کی شفقت بھری آغوش سے محروم نہ رہے۔ عبداللہ بیگ لاکھ خانہ داماد سہی لیکن تین بچوں کے باپ ہونے کے باعث ہاتھ پاؤں توڑ کر گھر میں نہ بیٹھ سکتے تھے' اس لیے قسمت آزمائی کے لیے الور گئے اور وہاں لڑتے ہوئے راج گڑھ میں مارے گئے۔ (۱۸۰۲ء) اس وقت غالب کی عمر ۵-۶ سال کے درمیان تھی۔

والدین کی توجہ جب ایک بچے کی طرف سے ہٹ کر دوسرے کی طرف ہو جاتی ہے تو بڑے بچے کے دل میں رشک پیدا ہوتا ہے' کیوں کہ وہ اپنی ماں پر بلا شرکت غیرے قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ غالب اس وقت دو "مصیبتوں" کے درمیان تھے۔ پہلی بڑی بہن تھی' دوسری چھوٹا بھائی۔ بہن کے مقابلے میں کم زور اور بھائی کے مقابلے میں ماں کی محبت میں کمی کا احساس' لیکن میرے خیال میں خوش قسمتی سے بڑا بیٹا ہونے کے باعث غالب کو ان "مصیبتوں" کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور وہ بزرگوں کے لطف خاص سے محروم نہیں رہے۔ پھر بھی شاید اس توجہ خاص اور محبت کے باعث ان میں یہ جذبہ پیدا ہوگیا کہ لوگ ان کی بات مانیں اور وہ سب پر حکومت کریں۔ یہی وجہ ہے کہ مستقبل میں لوگوں کو مختلف خطابوں مثلاً میاں داد خاں سیاح کو سیف الحق اور منشی ہرگوپال تفتہ کو مرزا کے لقب سے نوازتے نظر آتے اور خود اپنے آپ کو غالب علی شاہ کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

وہ رواج کے مطابق غالباً پانچویں سال کے ابتدائی نصف حصے میں مکتب میں بٹھا دیئے گئے۔ باپ زندہ تھے اور چچا خوش معاش' اس لیے غالباً بسم اللہ کی رسم دھوم دھام سے منائی گئی ہوگی اور غالب نے بسم اللہ کا دولھا بن کر مسرت اور اپنی اہمیت کو محسوس کیا ہوگا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس دور میں وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کیوں کر رہے لیکن منشی ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں انہوں نے اپنے ایک ہم مکتب حکیم وارث علی کا ذکر کیا اور انھیں محبت سے یاد کیا' لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ذہانت کے باعث اپنے ساتھیوں میں ممتاز اور شاید شریر بھی تھی' کیوں

کہ اس عمر میں بچے اپنے گھر میں پیدا ہونے والے رشک کو اپنے ساتھیوں پر منتقل کرتے' لڑتے جھگڑتے' افسانے تراشتے' مذاق اڑاتے اور بعض اوقات سیلی استاد سے نوازے جاتے ہیں۔ غالب اپنی معاشی برتری کے باعث بھی اپنے آپ کو دوسروں سے برتر اور بہتر سمجھتے ہوں گے۔ ان کا حسن' ذہانت اور سماجی برتری ان میں نرگسیت پیدا ہونے کا باعث ہوئی۔

ماہر نفسیات کا خیال ہے کہ دس بارہ سال کی عمر میں جذباتیت بڑھ جاتی ہے اور پڑھنے کا سب سے زیادہ شوق بارہ سال کی مدت میں ہوتا ہے' جس میں نظمیں خاص طور سے پڑھی جاتی ہیں۔ نئی اخلاقی قدریں جڑ پکڑتی ہیں اس وقت یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو باتیں گھر میں پسند کی جاتی ہیں انہیں باہر ناپسند تصور کیا جاتا ہے اور باہر جو باتیں پسند کی جاتی ہیں انہیں گھر میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ غالب نے گروہ کا ساتھ دیا اور ان کا اخلاقی ضابطہ گھر میں بتائے ہوئے ضابطوں سے الگ ہوگیا۔ چنانچہ وہ لہو و لعب میں پڑ گئے' لیکن اسی دور میں عمر کے گیارھویں سال میں وہ شعرگوئی سے لذت آشنا ہوئے۔ پہلے وہ بزرگوں کی آنکھوں سے دیکھتے تھے' اب اپنی آنکھوں سے دیکھنے لگے۔ معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی عمر کا یہ دور بڑے عیش و آرام سے گزرا۔ باپ اور چچا کا انتقال ہوچکا تھا۔ نانا کی زمیندارانہ مصروفیتیں تھیں۔ ان کی تفریحی ضروریات باسانی فراہم ہو جاتی تھیں' اس لیے اپنے ساتھیوں کے مقابلے میں ان کی زندگی آسودہ اور مطمئن تھی' جس نے باپ اور اس کے بعد چچا کی موت کے غم کو بھلا دیا۔

لیکن اب وہ لہو و لعب سے فسق و فجور کی طرف جا رہے تھے۔ ان کی صحبت ویسی ہی تھی' جیسے اس زمانے کے عام رئیس زادوں کی ہوتی تھیں یعنی:

ساقی زبادہ بر اثر نغمہ عذر خواہ	مطرب ز نغمہ در ہوس بادہ حق گزار
ہموارہ ذوق مستی و لہو و سرور و سور	پیوستہ شعر و شاہد و شمع و مے و قمار
بدمستی شبینہ و خواب سحر گہی	رنگینئی سفینہ و اشعار آبدار

شاید اس لیے ۱۳۔۱۴ سال کی عمر میں الٰہی بخش معروف کی گیارہ سالہ صاحب زادی امراؤ بیگم سے شادی کر دی گئی۔ چونکہ اس خاندان سے قرابت وارانہ تعلقات پہلے ہی سے موجود تھے' اس لیے اگرچہ غالب کو راہ راست پر لانے کے لیے یہ اقدام کیا گیا تھا' لیکن رخصتی نہ ہوئی' جس کے باعث غالب آگرے ہی میں رہے اور مے و نغمہ و رقص و قمار کا سلسلہ جاری رہا۔

اس وقت غالب شباب اصغر سے شباب اکبر کی طرف قدم بڑھا رہے تھے۔ عنفوان شباب کی منزلیں طے ہو رہی تھیں۔ غالب کی شعرگوئی کا بھی سلسلہ جاری تھا۔ اگرچہ بیدل کے (انتقال کو ایک صدی سے ایک عشرہ کم مدت گزر چکی تھی لیکن ابھی تک اس کا رعب اہل علم کے دلوں پر طاری تھا۔ اس کا ضخیم مجموعہ نظم و نثر مضامین کی تلاش' وقت پسندی اور پیچ در پیچ ترکیبیں ابھی تک ناقابل تقلید اور ناقابل جواب ثابت ہوئی تھیں۔ اس کی مترنم بحروں میں غزلیں محفلوں میں گائی جاتی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی محمد معظم بیدل سے بہت متاثر تھے اور شاید انہی کی صحبت میں غالب نے بیدل کی طرف توجہ کی' کیوں کہ وہ غالب کے مزاج اور افتاد طبیعت کے مطابق تھے۔

بچہ ابتدا ہی سے کسی نہ کسی کو اپنا ہیرو بنا لیتا ہے۔ ابتدا میں عموماً یہ ہیرو اس کا باپ یا خاندان کا کوئی اور بزرگ ہوتا ہے' جس سے وہ محبت کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اپنے پسندیدہ اور محبوب شخص کے مانند بنانے کی کوشش کرتا ہے' یہاں تک کہ پسندیدہ شخص خود بچے کی شخصیت کا جزو بن جاتا ہے۔ وہ اس سے مماثلت اور تطابق پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگرچہ عمر میں اضافے' علم اور تجربات کے ساتھ ان میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔

غالب نے شاعری شروع کی تو بیدل کو اپنا ہیرو بنایا۔ اس وقت ان کا عنفوان شباب تھا۔ بیدل کی منائی اور مضمون آفرینی نے غالب کو اپنی طرف متوجہ کیا' کیوں کہ محمد معظم جو ممکن ہے اس وقت غالب کے ہیرو بن جاتے' شاعر نہ تھے اور اگر تھے بھی تو ناقابل توجہ۔ وہ دیوانہ وار اس کی پرستش کرنے لگے۔ ان کے ابتدائی کلام میں ایک درجن سے زیادہ اشعار بیدل کی تعریف و توصیف میں موجود ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

گر ملے حضرت بیدل کا خط لوح مزار
اسد آئینہ پرواز معانی مانگے

ہے خامہ فیض بیعت بیدل بکف اسد
یک نیستان قلمرو اعجاز ہے مجھے

اسد ہرجا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگ بہار ایجادی بیدل پسند آیا

مجھے اس قطع رہ میں خوف گمراہی نہیں غالب
عصائے خضر صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

جوش دل سے نشہ ہائے فطرت بیدل نہ پوچھ
قطرے سے ہے خانہ دریائے بے ساحل نہ پوچھ

آہنگ اسد کچھ نہیں جز نغمہ بیدل
عالم ہمہ افسانہ ما دارو و ما ہیچ

لیکن اس دور میں ان کی شاعری محض دماغی شاعری تھی' جس کا ایک سبب یہ تھا کہ ابھی وہ لالہ عذاروں کی صحبت اور لذت عشق سے آشنا نہ تھے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی شاعری کے بارے میں لکھتے ہوئے بتایا ہے کہ وہ ابتدا میں بیدل' اسیر اور شوکت کے رنگ میں ریختہ لکھتے تھے۔ اس میں بھی بیدل کو اولیت حاصل ہے اور اسیر اور شوکت کو ذیلی مقام دیا گیا ہے۔

غالب کا مزاج انفرادیت پسند تھا۔ ہر بات میں ایک نیا پہلو نکالنا' روش عام سے ہٹ کر چلنا' چونکا دینے والی باتیں کرنا' نئی ترکیبیں اور نئے استعارے استعمال کرنا ان کی خصوصیت تھی۔ اس لیے اس دور کی شاعری کا تعلق دل سے نہیں' صرف دماغ سے ہے۔ اس میں آمد نہیں' آورد ہے اور اسی لیے ان کی شاعری الجھی ہوئی ہے۔ ابھی تک "ہر ایک گل و لالہ" کی طرف خیال نہ تھا اور وہ ذہنی ورزشیں کر رہے تھے' اسی لیے ان کے اس دور کی شاعری میں پرکاری تو ہے مگر سادگی نہیں۔

اسی زمانے میں ان کی زندگی میں ایک اہم تبدیلی آئی۔ ماہرین نفسیات کا بیان ہے کہ بچوں میں مذہب کے بارے میں سوچنے اور سوال کرنے کا رجحان ۱۲-۱۶ سال کی عمر میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ زمانہ ان کی نفسیاتی کش مکش کا ہوتا ہے۔ اس وقت ان کا شمار نہ بچوں میں ہوتا ہے اور نہ ان بڑوں میں۔ وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ پاتے اور مسائل کا مقابلہ کرنے کی اپنے آپ میں سکت نہیں پاتے۔ آبائی مذہب صرف اسی صورت میں ان کی ضروریات پوری کر سکتا ہے کہ اس کے صحیح معنی سمجھ سکیں۔ بچپن میں دی ہوئی مذہبی تعلیم اس وقت ان کے کام نہیں آتی اور بالغ

تصورات کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اس لیے نئی ضروریات کے لحاظ سے ان پر نظرثانی کی جاتی ہے اور تقریباً ۱۵-۱۶ سال کی عمر میں والدین کی تعلیم کے خلاف نوجوان بغاوت کرتا ہے۔ اگر اس زمانے میں جسمانی یا ذہنی پریشانیاں بھی ہوں اور ایسے لوگوں کی صحبت ملے جو اس کے نوجوان دماغ کو متاثر کرسکیں تو مذہبی تبدیلی عمل میں آتی ہے۔

غالب کے اس دور کے اشعار سے ان کی بیماری اور پریشانی کا علم ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حسام الدین حیدر اور ان کے بیٹوں سے غالب کے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے ننھال میں روایتی مذہب پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ دہلی میں نجف خاں کے دور سے نہ صرف شیعیت کا زور ہوا بلکہ تفضیلیت کا بھی۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ میر صاحب کی طرح غالب نے بھی کوئی سولہ سترہ سال کی عمر میں آبائی مذہب کو خیرباد کہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے کلام میں حضرت علیؓ کی منقبت میں قصیدے بھی ملتے ہیں اور غزلوں کے مقطعے بھی، جو بعد میں انتخاب کے وقت جب وہ دیر و حرم کو "آئینہ تکرار تمنا" سمجھنے لگے تھے، خارج کر دیئے گئے۔

ممکن ہے حسام الدین حیدر خاں کے علاوہ جن کو غالب "حرز بازوئے ایماں" سمجھتے تھے، مذہب کی تبدیلی میں ان کی محبوبہ کا بھی حصہ ہو، جس کے بارے میں کہتے ہیں:

اس جفا مشرب پہ عاشق ہوں کہ سمجھے ہے اسد
مال سنی کو مباح اور خون صوفی کو حلال

غرض یہ دور ان کا تقلیدی دور تھا۔ ہر تیز رو کے ساتھ دوڑنے کی کوشش کرتے، لیکن نئی راہیں بھی ڈھونڈتے رہتے تھے، کیوں کہ تقلید کسی کو بڑا آدمی نہیں بناتی، اس کے لیے جذبہ، بغاوت، گری، حسن کاری اور حسن پرستی کی ضرورت ہوتی ہے۔

ان کے کلام کا پہلا معلوم مجموعہ --- نسخہ فوجدار محمد خاں --- ۵ صفر ۱۲۳۱ھ میں تکمیل کو پہنچا۔ اس وقت غالب کی عمر پچیس سال تھی۔ غالب نے خود بھی لکھا ہے کہ پندرہ سے پچیس سال کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا، لیکن یہ بیان صرف ایک حد تک ہی درست ہے، کیوں کہ اس میں بیدلانہ خیالی مضامین کے علاوہ بھی ایسا کلام موجود ہے جس میں محبت کی گرمی بھی ہے اور یادوں کے آنسو بھی جھلکتے نظر آتے ہیں۔ اس میں آورد بھی ہے اور آمد بھی۔ اس میں پرکاری بھی ہے اور سادگی بھی۔

غالب کی یہ خوش قسمتی تھی کہ وہ لہو و لعب کے بعد فسق و فجور کی منزلوں سے گزر کر کندن بن کر نکلے ورنہ شاید ایک گم نام آدمی رہ جاتے اور آج ان کے نام سے بھی کوئی آشنا نہ ہوتا۔

آگرے اور اس کے بعد دہلی میں بھی وہ خوبان دل آزار کی محفلوں میں رہے اور وصال لالہ عذاران سرو قامت سے شاد کام ہوئے۔ زندگی کے سرد گرم کو دیکھا۔ جذبات کے تلاطم سے دوچار ہوئے۔

اس دور کی داستان انہی کے اشعار میں ملاحظہ کیجئے:

چاہیے خوباں کو جتنا چاہیے

یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

ہے بزم بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
رنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

کثرت جور و ستم سے ہوگیا ہوں بے دماغ
خوب رویوں نے بنایا ہے اسد بدخو مجھے

شمع سے ہے بزم انگشت تحیر در دہن
شعلہ آواز خوباں پر بہ ہنگام سماع

اسد زندانی تاثیر الفت ہائے خوباں ہوں
خم دست نوازش بن گیا ہے طوق گردن میں

لب عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی
قیامت کشتہ لعل بتاں کا خواب سنگیں ہے

تکلف برطرف ہے جانستاں تر لطف بدخویاں
نگاہ بے حجاب یار، تیغ تیز عریاں ہے

میرا نیاز عجز ہے، مفت بتاں اسد
یعنی کہ بندۂ درم ناخریدہ ہوں

سادہ پرکار ہیں خوباں کہ اسد
ہم سے پیمان وفا باندھتے ہیں

امیدوار ہوں تاثیر تلخ کامی سے
کہ قند بوسہ شیریں لباں مکرر ہو

کشود غنچہ دل ہا عجب نہ رکھ غافل
صبا خرامی خوباں بہار ساماں ہے

اسد ہمیشہ پئے نقش پائے سیم تناں
شعاع مہر سے کرتا ہے چرخ زردوزی

اسد بہار تماشائے گلستان حیات
وصال لالہ عذاران سرو قامت ہے

عروج نشہ ہے سرتا قدم قدچمن رویاں
بجائے خود وگرنہ سرو بھی مینائے خلی ہے

اسد اٹھنا قیامت قامتوں کا وقت آرائش
لباس نظم میں بالیدن مضمون عالی ہے

کہوں کیا گرم جوشی مے کشی میں شعلہ رویاں کی
کہ شمع خانہ دل آتش مے سے فروزاں کی

ان چمن رویوں، لالہ عذاروں، سیمیں تنوں، شعلہ رویوں، سادہ پرکاروں، شعلہ آوازوں، چمن سامانوں اور صبا خرام حسیناؤں نے نوجوان غالب کو حسن دوستی اور حسن پرستی کے سبق دیئے اور اب ان کے خیال میں تصنع کے بجائے دل کی دھڑکنیں سمانے لگیں۔ زبان میں سادگی اور تصورات میں شادابی آنے لگی۔ صنعت گری قدم پیچھے ہٹانے لگی اور کوہ کندن و کاہ برآوردن میں کمی ہونے لگی۔ اگرچہ وہ انیس سال کی عمر یا اس کے ایک دو سال بعد بھی بیدل کی مثنویوں کا مطالعہ کرتے نظر آتے ہیں۔ (۱) لیکن اس زمانے میں آگرے میں ان کے فسق و فجور کی زندگی نے ان کے خسر الٰہی بخش معروف کو اپنی طرف متوجہ کیا اور انہوں نے غالب کو جو کبھی کبھی دہلی جاتے رہتے تھے، اب مستقل طور پر دہلی بلالیا اور اب وہ وہیں رہنے لگے۔

۱۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں بیدل کی دو مثنویاں "طور معرفت" اور "محیط اعظم" ہیں۔ دونوں پر غالب نے ایک ایک شعر اپنے قلم سے لکھ کر مہر لگائی ہے، جس پر ۱۲۳۱ درج ہے۔

ازیں صحیفہ بنوع ظہور معرفت است — کہ ذرہ ذرہ چراغان طور معرفت است
ہر حبابے راکہ موجش گل کند جام جم است — آب حیواں آب جوئے از محیط اعظم است

دہلی کا معاشرہ آگرے کے معاشرے سے زیادہ مختلف نہ تھا' بلکہ یہاں آگرے سے زیادہ وسیع میدان تھا اور اس گئی گزری حالت میں بھی مغل سلطنت کا دارالحکومت اور مغل شہنشاہ کی تخت گاہ ہونے کے باعث حسن' دولت اور اقتدار لال قلعے اور اس کے گرد و نواح میں سمٹ آئے تھے۔ ساتھ ہی عہد زوال کے جملہ لوازم۔۔۔ طاؤس و رباب سے لے کر ہر قسم کی اخلاقی بدعنوانیوں تک موجود تھے۔ اس لیے دہلی میں نووارد غالب کی ابتدائی زندگی کو آگرے کی زندگی کا ضمیر تصور کرنا چاہیے۔

اس وقت دہلی میں نصیر کا طوطی بول رہا تھا۔ معروف' ذوق' مومن وغیرہ ان کے شاگرد تھے۔ غالب نے بھی شاید معروف کے ایما سے ایک دو غزلیں شاہ نصیر کو دکھائیں' لیکن دامن چھوکر علیحدہ ہوگئے۔ ظاہر ہے جہاں نصیر کا طوطی بولتا ہو وہاں ایک اجنبی' غیر معروف آواز کون سنتا۔ ان کے کلام پر اعتراضات ہونے لگے اور محفلوں میں مذاق اڑایا جانے لگا۔ جوانی کا گرم خون کھول اٹھا اور غالب نے ان لوگوں کو عنوران جاہل کے خطاب سے نوازا اور پھر پکار اٹھے:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
نہ ہوئے گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی (۲)

۲۔ اس شعر کی ابتدائی شکل یہی ہے۔

لیکن غالب کے مزاج میں لاکھ خود پسندی ہو اور وہ خود کتنے ہی خود رائے ہوں' رائے عامہ جس میں اہل علم بھی شامل ہوں' مزاج کے انتہائی منہ زور گھوڑے کو راہ راست کی طرف آنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ چنانچہ غالب نے عنوران جاہل کو عنوران کامل میں بدلا۔ طریقہ شعرگوئی میں ترمیم کی اور اعلان کیا کہ:

عیب کا دریافت کرنا ہے ہنر مندی اسد
نقص سے اپنے ہوا جو مطلع کامل ہوا

لیکن غالب کی شاعری کے اس موڑ کا باعث محض اعتراضات نہ تھے۔ میرے خیال میں یہ محبت کا وہ گلستان تھا جس نے غالب کو رنگین نوائی بخشی۔ انہوں نے اسی زمانے میں ایک مطربہ شیریں نوا سے محبت کی اور بہت جلد خود اس کے محبوب بن گئے۔ اب ان کی غزلوں میں عشق کی گرمی اور حسن کی رنگینی آگئی' لیکن بیدل کی زبان عشق کی زبان نہیں' منطق اور فلسفے کی زبان نہیں' اس لیے غالب کو عشق اور حسن کی زبان میں بولنا پڑا جس میں سادگی ہوتی ہے' نرمی ہوتی ہے۔ نزاکت اور لطافت ہوتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس دور میں جو اشعار کہے ان کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجئے ہم نے مدعا پایا

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا
سادگی و پرکاری، بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرات آزما پایا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا
ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ
شہیداں نگہ کا خوں بہا کیا
بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

واں کرم کو عذر بارش تھا عناں گیر خرام
گریہ سے یاں پنبہ بالش کف سیلاب تھا
یاں سر پرشور بیتابی سے تھا دیوار جو
واں وہ فرق ناز محو بالش کمخواب تھا

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے
کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

کس کا خیال آئینہ انتظار تھا
ہر برگ گل کے پردے میں دل بے قرار تھا
یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں ذوق خامہ فرسا کا

گر کیا ناصح نے ہم کو قید، اچھا یوں سہی
یہ جنون عشق کے انداز چھٹ جاویں گے کیا

بخشے ہے جلوۂ گل ذوق تماشا غالب
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

تو اور آرائش غم کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

دام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک
غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

سطوت سے تیرے جلوۂ حسن غیور کی
خون ہے مری نگاہ میں رنگ ادائے گل

غنچہ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں
مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح
دیکھ کے میری بے خودی چلنے لگی ہوا کہ یوں

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں!
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں
ترے سرو قامت سے اک قد آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
تماشا کر اے محو آئینہ داری!
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

دل لگا کر لگ گیا ان کو بھی تنہا بیٹھنا
بارے اپنی بے کسی کی ہم نے پائی داد یاں

آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے — طاقت بیداد انتظار نہیں ہے

جادو ہے طرز گفتگوئے یار اے اسد — یاں جز فسوں نہیں اگر افسانہ چاہیے
ساقی، بہار موسم گل ہے سرور بخش — پیماں سے ہم گزر گئے، پیمانہ چاہیے
جب تک دہان زخم نہ پیدا کرے کوئی — مشکل کہ تجھ سے راہ سخن وا کرے کوئی

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے — ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے
پھونکا ہے کس نے گوش محبت میں اے خدا — افسون انتظار تمنا کہیں جسے

اسد جاں نذر الطافے کہ ہنگام ہم آغوشی
زبان ہر سر مو حال دل پرسیدنی جانے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے
شرم رسوائی سے جا چھپنا نقاب خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے
خاک میں ناموس پیمان محبت مل گئی
اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسم یاری ہائے ہائے

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد
شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلہ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا دل جگر تشنہ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز پھر ترا وقت سفر یاد آیا
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

وہ فراق اور وہ وصال کہاں وہ شب و روز ماہ و سال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصور سے اب وہ رعنائی خیال کہاں

غم دنیا سے گرپائی بھی فرصت سراٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

غرض یہ کہ محبت کے اس دور میں غالب کی شاعری کا رنگ ہی بدل گیا۔ اور اس رنگ نے اس منزل کی طرف رہنمائی کی' جس میں غالب نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کی اور خطوط لکھے۔ ایسی شاعری جو زندہ ہے اور زندہ رہے گی' ایسے خطوط جو اپنی نظیر آپ ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔

آغا افتخار حسین

یورپ میں غالب کا مطالعہ

اردو زبان کی تعلیم یورپ کی کئی یونیورسٹیوں میں داخل نصاب ہے۔ جن مستشرقین کو اردو اور برصغیر ہندو پاک کے فارسی ادب سے دلچسپی رہی ہے انہوں نے غالب کا مطالعہ کیا ہے۔ ادھر آٹھ دس سال سے اقبال اور غالب کے مطالعہ میں یورپ میں خاص دلچسپی لی جا رہی ہے۔ غالب کے کلام کا مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ نظم و نثر کے تراجم یورپی زبانوں میں کئے جا رہے ہیں۔ غالب کے فکر و اسلوب پر مضامین لکھے جا رہے ہیں۔ یہ سب ہو رہا ہے لیکن افسوس ہے کہ پاکستان میں کوئی ادارہ ایسا نہیں جو ان یونیورسٹیوں کے کام میں دلچسپی لے۔ اور مستشرقین کو ان کے کام میں مدد دے۔ میں نے اردو نامہ کراچی کے ذریعہ ایک مرتبہ درخواست کی تھی کہ جن اداروں میں اردو کی تعلیم ہوتی ہے ان سے باقاعدہ رابطہ قائم کیا جائے اس کام میں خاطر خواہ دلچسپی نہیں لی گئی۔ اب میں نے خود ہی اپنی بساط کے مطابق اس کام کی ابتداء کی ہے۔

یورپ کے ممالک میں غالب کے مطالعہ کی کیفیت مختصراً" حسب ذیل ہے۔

انگلستان

حال ہی میں مسٹر رائف رسل ریڈر شعبہ اردو لندن یونیورسٹی نے غالب پر کام کیا ہے۔ انہوں نے Panguin Companion of Oriental Literature کے لیے اردو ادب پر پانچ مضامین لکھے ہیں جن میں ایک مضمون غالب پر ہے اس کے علاوہ رسل صاحب نے ڈاکٹر رشید الاسلام کے ساتھ مل کر غالب کی نثر و نظم اور خطوط کے تراجم کیے ہیں جو یونیسکو کے توسط سے عنقریب کتابی صورت میں شائع ہوں گے۔

فرانس

تاریخ ادب ہندی و ہندوستانی "Histoire dela Litterature Hindouıe et Hindoustani" کی جلد اول میں گارسیں و تاسی نے غالب کا بیان سات صفحات میں لکھا ہے ابتداء میں غالب کی زندگی کے مختصر

حالات کے تحتِ د تاسی نے لکھا ہے کہ غالب آگرے میں 1212ء میں پیدا ہوئے لیکن زیادہ عرصے دلی میں رہے۔ 1863ء میں ان کے کلام کا انتخاب تو دیوان "میر نوشہ" اے کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس کتاب میں 1790ء اشعار ہیں۔ (گارسیں نے اس اطلاع کے لیے "اخبار عالم" میرٹھ کے شمارہ 25 جولائی 1867ء کا حوالہ دیا ہے) اس کے بعد 1864ء میں "دیوان غالب" کے نام سے پھر شائع ہوا۔ اس میں 104 صفحات ہیں اور ہر صفحہ میں 21 سطریں ہیں۔ 1863ء میں ایک اور مجموعہ کلام کانپور سے بھی شائع ہوا۔ جو 104 صفحات پر مشتمل ہے۔

غالب کا فارسی کلام 1847ء میں منشی نور الدین حکے زیر اہتمام شائع ہوا۔ ان کی کلیات مطبع "نول کشور (لکھنؤ) سے بھی شائع ہوئی۔ لسانیات اور تنقید کے موضوع پر غالب کی تصنیف "قاطع برہان" 1861ء میں شائع ہوئی غالب نے 1285ھ مطابق 1869ء میں وفات پائی۔

گارسیں و تاسی نے غالب کی وفات پر تین تاریخوں کا حوالہ دیا ہے۔ پہلی تاریخ غالب کے پوتے مرزا خدا داد بیگ شوق نے کہی جو اودھ اخبار میں 23 فروری 1869ء کو شائع ہوئی دوسری "سرکاری اخبار" لاہور کے 10 مارچ 1869ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔ یہ تاریخ دلی کالج کے پروفیسر وزیر سنگھ نے کہی تھی۔ تیسری غالب کے شاگرد مرزا اوصاف علی نے کہی جو اودھ اخبار میں 4 مئی کو شائع ہوئی۔ "اودھ اخبار" کی 16 مارچ 1869ء کی اشاعت میں غالب پر ایک مضمون کے بعد (جس کا ذکر آگے آئے گا) ایک تاریخ مرزا قربان علی بیگ کی شائع ہوئی جو انیس اشعار پر مشتمل ہے۔

گارسیں د تاسی نے دو مضامین کا حوالہ دیا ہے جو غالب کی وفات پر اودھ اخبار میں شائع ہوئے۔ یہ مضامین 16 مارچ اور 23 مارچ 1869ء کے شماروں میں شائع ہوئے۔ گارسیں و تاسی نے دونوں مضامین کا مکمل ترجمہ فرانسیسی میں کیا ہے۔ یہاں ان ترجموں کی تلخیص پیش کی جاتی ہے۔

"اودھ اخبار کے مورخہ 16 مارچ 1869ء کے پرچے میں جو مضمون چھپا ہے اس میں سب سے پہلے غالب کی وفات پر اظہار افسوس کرتے ہوئے ان کی شاعرانہ عظمت کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے اور ان کے خاندانی حالات کا ذکر کرتے ہوئے غالب کی ایک فارسی کی تحریر کی تلخیص پیش کی گئی ہے جس میں غالب نے کہا ہے کہ وہ افراسیاب شاہ ترکستان کی نسل سے ہیں۔ اس کے بعد غالب کی زندگی کے مختصر حالات لکھے ہیں اور حسب ذیل تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ دس ہزار اشعار کا ایک فارسی دیوان مہرنیم روز وست دبو 2۔ جس میں غالب نے ستاون سال کی عمر تک کے حالات لکھے ہیں اور ساری کتاب میں ایک عربی لفظ استعمال نہیں کیا۔ پنج آہنگ قاطع برہان ایک دیوان ریختہ اور "اردوئے معلٰی"

اودھ اخبار کے شمارہ 23 مارچ 1869ء میں جو مضمون شائع ہوا ہے اس کا عنوان "غالب کی یادگار قائم نے کی تجویز" ہے اس مضمون میں غالب کے ایک شاگرد محمد مردان علی خان نے لکھا ہے کہ غالب کی ایک ایسی یادگار قائم کرنا ضروری ہے جو ان کا نام ہمیشہ زندہ رکھے۔ یادگار قائم کرنے میں ان کے شاگردوں کو خاص طور پر حصہ لینا چاہیے مردان خاں صاحب نے تجویز کیا ہے کہ اہل دہلی کی ایک خصوصی کمیٹی ایک جلسے میں غالب کی یادگار

قائم کرنے کی قرار داد منظور کرے۔ اس کے بعد اس یادگار کے اخراجات کے لیے رقم جمع کرنے کے لیے ایک فنڈ کھولا جائے۔ مردان علی خاں صاحب نے ذاتی طور پر یہ رائے ظاہر کی کہ غالب کی بہترین یادگار ایک خالص ادبی تحقیق ہی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے تجویز پیش کی کہ ایک کتاب مرتب کی جائے جس میں غالب کی زندگی کے بارے میں تمام تاریخی معلومات فراہم کر کے شامل کی جائیں۔ اس کتاب میں غالب کے شاگردوں کی وہ تمام تحریریں شائع کی جائیں جو انھوں نے غالب کی وفات پر لکھیں۔ مثلاً" تاریخ ہائے وفات / مرثیے وغیرہ غالب کے شاگردوں کی ایک مکمل فہرست اور ان کے حالات زندگی کے بارے میں مختصر نوٹ بھی شائع کئے جائیں۔ اس کتاب کے دو حصے ہوں۔ ایک اردو میں دوسرا فارسی میں۔ اس کتاب میں صرف غالب کے شاگردوں کی تحریریں شامل کی جائیں۔ اگر غالب کے شاگردوں کے علاوہ دوسرے اہل قلم کی تحریریں غالب کی وفات کے سلسلے میں موصول ہوں تو انھیں کتاب کے آخر میں ضمیمہ کے طور پر شامل کر دیا جائے۔ تجویز کے محرک نے آخر میں لکھا ہے کہ اگر کسی دوسری تجویز کو میری تجویز سے بہتر خیال کیا جائے تو بلا تامل اس پر عمل کیا جانا چاہیے۔

اٹلی

مشہور اطالوی مستشرق پروفیسر بادسانی کا ایک مقالہ "اردو اور ہندو فارسی تاریخ میں غالب کا مقام" کے عنوان سے مغربی جرمنی کے رسالے ——— Der Islam کے ستمبر 1959ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اٹھائیس صفحات پر مشتمل یہ مقالہ دو وجوہ سے نہایت اہم ہے ایک تو یہ کہ غالب کی شاعری پر کسی یورپین 'مستشرق کا غالبا" یہ پہلا مقالہ ہے۔ دوسرا یہ کہ اس مقالہ میں پروفیسر صاحب نے نہ صرف غالب کی چند غزلیات اور اشعار کا ترجمہ اور تشریح کی ہے بلکہ اردو فارسی شاعری کی بہت سی تلمیحات اور تصورات کی مغربی نقطہ نظر سے تفسیر اور وضاحت بھی کی ہے تاکہ مغربی اہل ادب کو مشرقی شاعری کے سمجھنے میں مدد ملے۔ ان خصوصیات کی بنا پر یہ مقالہ مغرب میں مشرقی ادب کے تعارف اور تفہیم کے لیے ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔

مقالے میں پروفیسر بادسانی نے غالب پر بیدل کے اثرات پر بحث کرتے ہوئے پہلے غالب کے ان اشعار کا حوالہ دیا ہے۔ جنہیں غالب نے اپنے منتخب کلام میں سے اس لیے خارج کر دیا کہ ان میں بیدل کا اثر بہت زیادہ نمایاں تھا۔ مثلاً" غالب نے اپنے مطبوعہ دیوان میں ایک غزل کے صرف حسب ذیل اشعار شامل کیے ہیں۔

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا تماشائے بیک کف بردن صددل پسند آیا
بہ فیض بیدلی نومیدیٔ جاوید آساں ہے کشائش کو ہمارا عقدہ مشکل پسند آیا
ہوائے سیر گل آئینہ بے مہری قاتل کہ انداز بخوں غلطیدن بسمل پسند آیا

لیکن حسب ذیل چار اشعار منتخب دیوان میں شامل نہیں کیے۔

فضائے خندہ گل تنگ و ذوق عیش بے پروا — فراغت گاہ آغوش و داع دل پسند آیا
ہوئی جس کو بہار فرصت ہستی سے آگاہی — بہ رنگ لالہ جام بادہ بر محمل پسند آیا
سواد چشم بسمل انتخاب نقطہ آرائی — مرام ناز بے پروائی قاتل پسند آیا
اسد ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے — مجھے رنگ بہار جادہ 2ء بیدل پسند آیا

فاضل مقالہ نگار نے دوسری مثال غالب کی مشہور غزل کی دی ہے جس کا پہلا مصرع ہے ۔ سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں۔ اس غزل کے ہر شعر کی مفصل شرح کی گئی ہے اور سات ایسے اشعار نقل کیے گئے ہیں جو غالب کے انتخاب 1866ء میں موجود نہیں ہیں۔

غالب کی دیگر غزلیات میں سے چیدہ چیدہ اشعار کا ترجمہ اور شرح پیش کی گئی ہے اور پروفیسر باؤسانی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ غالب کو ایک نئے اسلوب کا موجد قرار دینے کے مقابلے میں زیادہ صحیح یہ ہوگا کہ غالب نے ہندوستانی اسلوب اور بیدل کے اسلوب کو درجہ کمال تک پہنچایا۔ اس کے بعد فاضل مقالہ نگار نے جدید اردو شعراء پر غالب کے اثرات کا جائزہ لیا ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ مغربی اسلوب بیان کو خوبصورتی کے ساتھ اردو شاعری میں سمونے کے لیے غالب کا اسلوب ہی بہترین وسیلہ بن سکتا ہے۔ فاضل مقالہ نگار کی رائے میں فیض نے اس سلسلے میں غالب سے فیضان حاصل کیا ہے اور اس ضمن میں فیض کے کلام سے گیارہ مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ آخر میں پروفیسر باؤسانی لکھتے ہیں فیض انگریزی ادب سے خوب واقف ہیں اور اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے لیکن انہوں نے یہ اثر اس طرح قبول نہیں کیا کہ اچانک تمام مشرقی اثرات سے اپنا رشتہ توڑ دیں اور مغربی ادب کے زیر اثر آجائیں اس کے بجائے فیض نے مغربی اثر قبول کرنے کے لیے اسلوب کا وہ راستہ اختیار کیا جس کی رہنمائی غالبؔ نے کی تھی۔

ڈاکٹر سولیرنو جو کراچی میں اطالوی کلچرل سنٹر کے ناظم تھے۔ اردو زبان کے بڑے رسیا تھے انہوں نے پاکستان میں رہ کر اردو سیکھی اور یہیں شادی کی۔ گزشتہ سال وہ واپس اٹلی چلے گئے دیگر تصانیف کے علاوہ انہوں نے اردو شاعری کی مختصر بیاض شائع کی۔ جس میں مشہور اردو شعراء کے کلام کا اطالوی زبان میں ترجمہ کیا اس کتاب کا نام Antolgia della Poesia Urdu ہے اور یہ میلان (اٹلی) سے 1963ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے مقدمے میں ڈاکٹر سولیرنو نے اردو شاعری کی مختصر تاریخ اور اس کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ بعض تلمیحات اور تشبیہات کے معانی کی وضاحت اور اردو ادب کی روایات پر مختصر اظہار خیال کیا ہے۔ غالب کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر سولیرنو لکھتے ہیں کہ وہ خود اعلیٰ خاندان سے تھے اور انہوں نے اپنی خاندانی نجابت کی روایات سے اپنی شاعری کو متاثر کیا۔ انہوں نے خاندانی مغلیہ کا زوال اور حکومت برطانیہ کا عروج اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ اس المیے سے متاثر ہوئے لیکن انہوں نے محض اس کی نوحہ خوانی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ شاعری کے لیے ایک نئی فضا تخلیق کی جس میں شاعر نئے دور کے تقاضوں اور تجربات کی عکاسی کر سکے۔ غالب کے ساتھ اردو شاعری کا کلاسیکی دور ختم ہوگیا۔

چیکو سلوواکیہ

چیکو سلوواکیہ میں 1923ء سے اردو کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ اور گزشتہ سات آٹھ سال میں اردو ادب میں ترجمے اور تحقیق کا کام اعلیٰ پیمانے پر ہوا ہے۔ پراگ چیکو سلوواکیہ کے مشرقی ادارے Orientalni utar Akademie میں پروفیسریاں مارک Jan Marek نے اردو میں گرانقدر تحقیقی کام کیا ہے ان کے تحقیقی مطالعوں میں میرامن کا قصہ چہار درویش اور اقبال کی ضرب کلیم خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ میں نے پروفیسریاں مارک کو خط لکھا تھا جس میں ان سے دریافت کیا تھا کہ انہوں نے غالب کا مطالعہ کب اور کیسے شروع کیا اور غالب کی نثر اور شاعری کے بارے میں ان کے کیا تاثرات ہیں؟ پروفیسریاں مارک نے مجھے جواب میں جو خط لکھا ہے اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

"میں نے غالب کے کلام کا مطالعہ اس وقت شروع کیا جب میں کارولین یونیورسٹی پراگ میں اردو کورس کا طالب علم تھا۔ غالب کا مطالعہ ہمارے کورس میں لازمی نہیں تھا لیکن ہم دو طالب علم میں اور مسزبیش مانوا Hubschmannora غالب کے مطالعہ میں شرکت کرتے تھے کیونکہ ہمیں اردو کی کلاسیکی شاعری سے خاص دلچسپی تھی۔ ہمارے استاد ایک ہندوستانی مسلمان ڈاکٹر مسعود علی خاں تھے جو بھوپال کے رہنے والے تھے۔ وہ آج کل ماسکو میں ایک اخبار کے نامہ نگار ہیں۔ ڈاکٹر مسعود علی صاحب اردو کلاسیکی شاعری پر پورا عبور رکھتے تھے۔ انہیں بہت سی غزلیات زبانی یاد تھیں۔ اور وہ اشعار کے معانی سے خوب واقفیت رکھتے تھے۔ میں اس کا اعتراف کروں گا کہ پہلے پہلے میں غالب کے اشعار کو بالکل نہ سمجھ سکا۔ غالب کی زبان تو کچھ زیادہ مشکل نہیں تھی میں انفرادی طور پر ہر لفظ کے معنی اچھی طرح سمجھ لیتا تھا۔ لیکن پورے جملے یا بیت کا اصل مطلب سمجھ میں نہ آتا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ یہ محرومی زیادہ عرصے تک باقی نہیں رہی۔ دو تین ہفتوں میں ہم غالب کی غیرمانوس تشبیہات اور رموز سے واقف ہو گئے۔

غالب ہندوستان اور پاکستان کے اہل علم اور اوسط درجے کے شہریوں میں کافی مقبول ہیں۔ لیکن میں نے کسی عام آدمی کو غالب کے اشعار پڑھتے نہیں سنا حالانکہ میں کئی بار ہندوستان اور پاکستان جا چکا ہوں میں سمجھتا ہوں ایسا ہونا ایک فطری امر ہے۔ غالب کی شاعری کو اچھی طرح سمجھنا عام آدمی کے لیے مشکل ہے۔ غالب کو عجیب اور غیر معمولی الفاظ کا استعمال پسند تھا۔ جب میں نے بعد میں فارسی شاعری کا مطالعہ کیا تو میرے اس خیال کی تائید ہوئی۔ اس لیے ایک لحاظ سے غالب کی فارسی شاعری کو اردو شاعری پر فوقیت حاصل ہے۔ خالص ادبی نقطہ نظر سے اردو شاعری کے مقابلہ میں ان کی فارسی شاعری کا پلہ بھاری تھا۔ ان کی مشکل زبان اور غیرمانوس تشبیہوں کی وجہ سے ان کی شاعری کا کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنے میں شدید مشکلات حائل تھیں۔ غالب کو انیسویں صدی کے پہلے نصف کا بہترین اور اہم شاعر سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ان کے کلام کے یورپی زبانوں میں بہت کم تراجم ہوئے ہیں۔

اور جو ترجمے کیے بھی گئے ہیں وہ زیادہ تر یا تو محض خیال آرائیوں پر مبنی ہیں یا غزل کے قافیے اور ردیف کے ظاہری حسن و خوبی پر طویل اور اکتا دینے والی بحثیں ہیں۔ غالب کی شاعری کا ایک اچھا جائزہ ایک کتاب میں ملتا ہے جو حال ہی میں تاجکستان سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کا نام Godiyat -e Mrroasadullo Galib Hayatva اور اس کے مصنف عبداللہ جان غفوروف Abdullajau Gafforov ہیں۔ یہ کتاب 1965ء میں شائع ہوئی اور اس میں 102 صفحات ہیں آج کل ہم اپنے طالب علموں کے لیے یہی کتاب تجویز کرتے ہیں۔

غالب پر پروفیسریاں مارک کا ایک مضمون اردوئے معلیٰ دہلی کے غالب نمبر فروری 1960ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون سے ایک مختصر اقتباس ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

"یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غالب سے ہمیں اس قدر شدید محبت کیوں ہو گئی؟ اس کا واحد جواب ہمارے پاس یہ ہے کہ غالب کی عظیم شخصیت اور اس کے وجد آفریں اشعار نے ہمارے دل و دماغ پر جادو سا کر دیا۔ غالب زندگی کے حقائق سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں ان کے کلام میں نشاط اور الم کی سچی تصویریں ملتی ہیں۔"

چیکوسلوواکیہ کے مشرقی ادارے کی ایک اور گریجویٹ مسز ہبش 4۔ منوا Hubschmannora ہیں یہ خاتون آج کل ریڈیو سے متعلق ہیں۔ انہوں نے نظیر اکبر آبادی علی سروار جعفری کیفی اعظمی اور ساحر لدھیانوی وغیرہ کی نظموں کے چیک زبان میں ترجمے کیے ہیں۔ انہوں نے علی سروار جعفری کی نظم "ایشیاء جاگ اٹھا" پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا ہے ان کا سب سے اہم کام غالب کے کلام کا چیک زبان میں ترجمہ ہے۔ پروفیسریاں مارک نے مجھے مطلع کیا ہے کہ یہ ترجمہ عنقریب پراگ سے شائع ہوگا۔

حواشی

1۔ معلوم ہوتا ہے اس جگہ گارسیں د تاسی سے سہوا ہوا ہے۔ "دیوان میرنوشہ" کے عنوان سے غالب کا کوئی دیوان شائع نہیں ہوا۔ خیال یہی ہے کہ اس نے "مرزا نوشہ" کو غلطی سے "میرنوشہ" لکھ دیا ہے۔ (ا۔ا ح)

2۔ یہاں بھی د تاسی سے سہو ہوا ہے۔ یہ کتاب دراصل "دستنبو" ہے۔ اس کتاب میں صرف ایک سال کے حالات یعنی 57 1858ء کے حالات درج ہیں۔ (ا۔ا ح)

3۔ پروفیسر باؤسانی نے میرے نام ایک حالیہ خط میں اس خیال کی تائید کی ہے۔
یہ مصرعہ بعض نسخوں میں اس طرح درج ہے۔

مجھے رنگ بہار ایجادی بیدل پسند آیا

4۔ اس سلسلے میں میں نے مادام ہبش منوا سے بھی معلومات فراہم کی۔ 11 فروری 1866ء کے ایک خط میں انہوں نے لکھا ہے کہ غالب کی چالیس پینتالیس غزلوں کا ترجمہ تقریباً" دس سال پہلے کیا تھا اور مسودہ ایک ناشر کے حوالہ کر دیا تھا۔ ناشر نے

مجھے بتایا تھا کہ مسودہ اشاعت کے لیے منظور کر لیا گیا ہے لیکن آج تک اس کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی لیکن پروفیسر یماں مارک کی تحریر کے مطابق یہ ترجمہ پراگ سے شائع ہو رہا ہے۔ (۱۰۱ ح)

انل برن گنگولی

بنگلہ شاعری پر غالب کا اثر

مرزا غالب 1827ء میں کلکتہ روانہ ہوئے۔ یہ سفر پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں تھا۔ اس سفر کی تفصیلات بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

غالب غالباً اردو کے پہلے شاعر ہیں جس نے اس زمانے میں اتنا دور دراز سفر کیا جب سفر کرنا واقعی ایک بے حد مشکل کام تھا۔ اس امر سے بھی ان کی مہم جوئی اور انداز طبیعت کا پتہ چلتا ہے۔ پٹنہ سے انھوں نے کشتیوں کے ذریعے سفر کیا تھا اور پہلے مرشد آباد پہنچے۔ 2 فروری 1828ء کو کلکتہ میں وارد ہوئے۔

کلکتہ اس زمانے میں کوئی بہت بڑا شہر نہیں تھا۔ شمالی اور مرکزی علاقے میں نئے نئے مکانات بن گئے تھے اور لوگ آکر بس رہے تھے۔ غالب نے شملہ بازار کے علاقے میں دس روپے کرائے پر ایک مکان لیا اور جلد ہی یہاں کے بعض اکابرین سے ان کے تعلقات استوار ہوگئے۔

حیدر اور ٹیپو سلطان کے خاندان کے لوگ ٹالی گنج کے علاقے میں رہتے تھے اور ان کے اردگرد اردو اور فارسی سے دلچسپی رکھنے والوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ اس طرح راجہ رام موہن رائے اور ان کے دوستوں کا بھی ایک حلقہ تھا جو اردو اور فارسی کا اچھا مذاق رکھتا تھا۔ شمالی کلکتہ کے سوابازار کے علاقے میں راجہ رادھوکانتو دیو بھی اپنے علمی مذاق کے لیے معروف تھے۔ جو راسنکو کا ٹیگور خاندان بھی اردو اور فارسی کا شغف رکھتا تھا اور مہاکوی رابندرناتھ ٹیگور کے دادا دوار کا ناتھ ٹیگور اردو اور فارسی کے بڑے اچھے عالم تھے اور انہوں نے اردو میں شعر بھی کہے ہیں۔ قرینہ اغلب ہے کہ دوار کا ناتھ ٹیگور اور راجہ رام موہن رائے کی غالب سے ملاقاتیں ہوئی ہوں گی۔ ان لوگوں کے علاوہ راجہ کالی کرشن ٹیگور، جگن ناتھ پرشاد ملک، ہری ہروت، راجہ رام بوس، دوندرناتھ ٹیگور اور پیارے چند مترا بھی تھے جو فارسی اور اردو میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے اور باذوق لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ کلکتے میں غالب کو ایسے دوست اور قدر دان بھی ملے جن سے ساری زندگی کے لیے تعلقات قائم ہو گئے۔ ان لوگوں میں گھر علی طباطبائی، مولوی سراج الدین احمد، بشیر الدین، خواجہ فخر الدین اور عبدالغفور خاں فساخ قابل ذکر ہیں۔

یہیں غالب نے چکنی ڈلی پر اپنا 13 شعر کا مشہور قطعہ کہا تھا جو "مرقع د لکشا" میں بھی شائع ہوا تھا۔ جس کے مولف مشہور مستشرق راجندر لال متراتھے۔

1837ء سے پہلے فارسی تقریباً سارے ہندوستان کی سرکاری نیز تہذیبی زبان تھی۔ فارسی کے واسطے سے

اردو تک رسائی آسان تھی اس لیے بنگال کے ایسے پڑھے لکھے خاندان جن کی مادری زبان بنگلہ تھی مگر جو فارسی سے واقف تھے۔ مرزا غالب کے فارسی اور اردو کلام سے محظوظ ہو سکتے تھے۔ لہٰذا مرزا غالب کے افکار و خیالات نے بنگلہ زبان کے بعض شاعروں کو متاثر کیا۔ ایسے شعراء میں انیسویں صدی کے دو شاعر سب سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان میں سے ایک ایشور چندر گپتا اور دوسرے کرشن چندر مجمدار ہیں۔

ایشور چند گپتا اپنی نوجوانی کے زمانے میں مرزا غالب سے بھی مل چکے تھے اور ان کی شعر و سخن کی محفلوں میں شریک بھی ہوتے رہتے تھے۔ بنگلہ ادب میں انہیں "گپتا کانی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انہوں نے خصوصی طور پر غالب کے طرز اظہار کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی ایک مشہور نظم جس کا پہلا مصرع ہے۔ "بیاں چولی (چل) جان' لب جان کری" ان کا یہ تجربہ بنگلہ ادب میں کافی مشہور ہے۔ انیسویں صدی کے وسط تک بنگلہ شاعری روایات کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ ایشور گپتا پہلے شاعر ہیں جنہوں نے ان روایات کو توڑا اور بنگلہ شاعری کو نیا رنگ و آہنگ عطا کیا۔ انہوں نے ایسے ان گنت اشعار اور بہت سی ایسی نظمیں لکھی ہیں جن میں غالب کی شوخی اور ظرافت ہے اس کے علاوہ انہوں نے غالب کے بہت سے اشعار کا بنگلہ میں ترجمہ کیا ہے۔

کرشن چندر مجمدار نے زیادہ تر غالب کی فارسی شاعری سے استفادہ کیا ہے۔ مجمدار کا ایک شعری مجموعہ ہے جس کا نام "سد بھاباستک" ہے۔ اس مجموعے میں جو کلام شامل ہے اس پر غالب کی فارسی شاعری کی چھاپ صاف نظر آتی ہے۔ انہوں نے غالب کے بہت سے فارسی اشعار کا ترجمہ کیا ہے۔

غالب مہاکوی رابندر ناتھ ٹیگور کے محبوب شاعر تھے۔ ان کے والد اور دادا غالب سے مل چکے تھے۔ ٹیگور کی ایک نظم کا عنوان "ہوری کھیلا" ہے۔ اس نظم پر غالب کے اسٹائل کا پرتو صاف نظر آتا ہے۔ ان کے علاوہ ٹیگور نے ایسے بہت سے شعر لکھے ہیں جن میں غالب کی شوخی اور ظرافت ہے۔ اس طرح کے اشعار ان کے مجموعہ "کلام" کنیکا میں شامل ہیں۔

زندہ شاعروں میں قاضی نذر الاسلام کا نام لیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اردو اور فارسی شاعری کے بہت سے علائم اور استعارے کو بنگلہ شاعری میں متعارف کیا ہے اور انہوں نے پہلی بار اردو فارسی کی ہیئت کو بنگلہ میں روشناس کرایا ہے۔

نذرل کی شاعری میں جابجا غالب کا تفکر' گہرائی اور وسیع مشاہدہ نظر آتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ غالب کا منتخب کلام بنگلہ' میں شائع کیا جائے ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو یہ کام حسن و خوبی سے انجام دے سکیں۔ صحیح معنوں میں غالب کی قدر یہی ہوگی کہ انہیں زیادہ سے زیادہ بڑے حلقے میں روشناس کرایا جائے۔

☆☆☆

غلام نبی خیال

کشمیری شاعری پر غالب کا اثر

سب سے پہلے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی شاعر یا ادیب کا کسی دوسرے قلم کار یا ادیب پر اثر کیا معنی رکھتا ہے اور اس کی حقیقت کس طرح نمایاں کی جا سکتی ہے۔ ہاینے نے ایک بار کہا تھا کہ یہ اثر رفتہ رفتہ دل میں اتر تا جاتا ہے اور بعد میں یا تو دیر تک یا شاعر کے کسی خاص دور میں اس کے اپنے اسلوب اور ہیئت کا جامہ اوڑھ کر ظاہر ہو جاتا ہے۔

گوئٹے نے جب حافظ کو پڑھا تو بلبلِ شیراز کی نغمہ باریاں اس کے دل و دماغ پر اس والہانہ انداز سے چھا گئیں کہ اثر پذیری کے اس خوش گوار ماحول میں دیوانِ مغربی کی تخلیق ہوئی اور یہی دیوانِ مغربی بعد میں اقبال کے پیامِ مشرق جیسے شہرۂ آفاق مجموعے کا باعث بن گیا۔ اثر قبول کرنے کا عمل بعض اوقات اس انداز سے بھی ظہور میں آ جاتا ہے۔ کہ خود غالب جب کسی فارسی شاعر کا یہ شعر پڑھتا ہے۔

بوئے گل نالہ دل دود چراغِ محفل
ہر کہ از بزمِ تو برخاست پریشان برخاست

تو وہ کہتا ہے۔

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

اسی شعر کو اثر پذیری کی حدود سے نکال کر تو ادھو ہی نہیں بلکہ سرقہ تک کہا جا سکتا ہے۔

ایک شاعر سے دوسرے کا اثر لینا ہی اس تاثر کی قوت اور افادیت کو ثابت نہیں کرتا بلکہ ہاینے کے مطابق جب یہ اثر دوبارہ کسی نہ کسی شکل میں ظاہر ہو جائے تو اس کے وجود کو تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ آج اگر کشمیری شاعری میں چند ایسے اشعار بھی نظر آ رہے ہیں جن پر غالب کے اندازِ بیان یا تخیل کا گماں ہوتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ یہ شاعری غالب سے متاثر ہوئی ہے۔ پڑھنے کو یوں تو غالب کو تقریباً سبھی کشمیری شاعروں نے پڑھا ہو گا۔ اور دیوانِ غالب کے صفحات الٹنے کے بعد بار بار کہا ہو گا۔

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

لیکن آج تک ہمارا ایسا کوئی سخن ور نہیں گذرا ہے جس کا بھرپور مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس اثر کے

موجود ہونے کا دعویٰ کرسکتے۔

غالب کا ذکر ہی کیا آج تک کشمیر کا کوئی شاعر برصغیر کے کسی شاعر سے پوری طرح متاثر نہیں ہو پایا ہے۔ جہاں تک اقبال کا تعلق ہے وہ تو یوں سمجھئے کہ مذہبی لحاظ سے ہمارے چند سخن وروں نے اس کی تقلید کی ہے۔ اس لاتعلقی کی کئی وجہیں ہیں۔ جن میں کشمیر کی جغرافیائی حد بندی کو بھی دخل ہے اس سلسلے میں اگر تاریخی، لسانی اور تہذیبی پس منظر کو زیر بحث لایا جائے تو وہ بجائے خود ایک طویل مقالہ کی شکل اختیار کرسکتا ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

میرے خیال میں ہمارے شاعروں کے غالب سے متاثر نہ ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ غالب کو ایک محبوب شاعر اور مشاق استاد کی حیثیت سے پڑھنے اور سمجھنے میں جس دلچسپی اور انہماک کی ضرورت ہے وہ انہیں شاید کبھی پیش ہی نہیں آئی اور غالب کے گہرے اور سرور بخش مطالعے سے کس حد تک وہ محروم ہی رہے۔ نتیجے کے طور جب آج کشمیری شاعری پر غالب کے اثر پر قلم اٹھایا جاتا ہے تو یہ اثر مجھے معشوق کی کمر کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ اور میں خود سے سوال کرتا ہوں۔

کہاں ہے کس طرف ہے اور کدھر ہے؟

ماسٹر زندہ کول یوں تو بہت بے باکی کے ساتھ کہتے ہیں۔

میتہ اثر کرہ غالبن اکہ شارتیتہ پیدا اثر

واعظ ہے کرہ تیر واعظ کی ممبرس پیٹھ خالئے

(اگر واعظ منبر پر اپنے واعظ کے سبھی تیر خالی کردے پھر بھی سامعین پر اتنا اثر نہیں ہو سکتا جتنا غالب کا ایک شعر کرسکتا ہے۔)

___ بہر حال ذرا غور سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت بھی صاف نظر آتی ہے کہ کشمیری زبان کے بالخصوص جدید شعراء کے ذہنی دریچوں میں سے وہ روشنی ضرور گذری ہے جو غالب کا آفتاب شاعری سالہا سال سے دنیا کے بے شمار سخن فہموں اور سخن سنجوں کے فکر اور تخیل پر برسا رہا ہے۔

کشمیر میں فارسی مدتوں تک سلاطین اور حکام کی مادری زبان رہی ہے۔ ایک طویل عرصہ پر پھیلے ہوئے اس دور میں فارسی زبان کشمیر کی علمی اور ثقافتی فضاؤں پر اس حد تک حاوی رہی کہ ہر شاعر نے فردوسی نظامی اور سعدی و حافظ کو دل و جان سے پڑھا اور ان سے خوشہ چینی کر کے کشمیری شاعری کے دامن کو مالا مال کیا یہ وہ زمانہ ہے جب ہماری شاعری میں مثنوی داخل ہوئی اور فارسی زبان کی رزمیہ اور بزمیہ مثنویوں کے تراجم کیے بعد دیگرے کشمیری شاعری کے سرمایہ میں اضافہ کرتے رہے۔ کلاسیکی فارسی ادب سے حد درجہ متاثر ہونے کی وجہ سے کشمیری شاعری نے اردو کی طرح بحور و اوزان بھی فارسی ہی سے لئے اور ہماری شاعری میں مثنوی کے ساتھ ساتھ غزل اور نظم جیسی اصناف نے بھی جگہ پائی۔ ممکن ہے کہ محمود گامی اور رسول میر کی نظروں سے غالب کی چند غزلیں گذری ہوں لیکن غالب کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ زندگی میں کبھی مقبول شاعر نہیں بنا اور زمانے کی بے اعتنائی

کے شکار اس شاعر کو محمود اور رسول میر نے بھی حسب توقع نظر انداز کیا ہو گا۔
غالب کی شاعری کی صدائے بازگشت کشمیر میں سب سے پہلے اس وقت سنائی دیتی ہے جب ہم مجور کا یہ شعر پڑھتے ہیں۔

چانہ کتھ مجور چاوان عارفن آب حیات
مانہ ہتھ درویش کامل آسہ بکہ نے حلقہ وار

(اے مجور! تمہاری باتیں عارفوں کے لئے آب حیات ہیں۔ اگر تو پڑاری نہ ہوتا تو ہم تجھے درویش کامل مانتے۔)
اور ہر ایک کو غالب کا یہ مقطع یاد آجاتا ہے۔

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

مجور کا ہی ایک اور مشہور شعر ہے۔

چھ کر نازنین کانسہ سیود روے ہاوان
تو کہ آب منزہ زون ڈلان ٹاٹھ یارو

(نازنین کسی کو اچھی طرح سے چہرہ نہیں دکھاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ پانی میں عکس ماہ ہمیشہ تھرتھراتا رہتا ہے)

کہ عکس ماہ در آب رواں بجنباند

اور صاف نظر آتا ہے کہ مجور نے اپنے شعر کا حسن غالب ہی سے مستعار لیا ہے۔
مجور نے یہ مصرع کہہ کے بھی۔

داتہ عشقہ دینہ موجوب حسنہ کس مالس زکوٰۃ
(عشق کے مذہب کے مطابق حسن کے مال پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے)

غالب کے اس شعر سے استفادہ کیا ہے۔

زکوٰۃ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا
چراغ خانہ درویش ہو کاسہ گدائی کا

اور غالب کا شعر پڑھ کر حافظ شیرازی کا یہ شعر یاد آجاتا ہے۔

تو صاحب نعمتی من مستحقم
زکوٰۃ حسن دہ حق دارم امشب

عبدالاحد آزاد کے سوانح حیات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے مطالعہ میں دیوان غالب پر کلام اقبال کو ترجیح دی ہے۔ ایک غریب کشمیری گھرانے میں پیدا ہونے کے ناتے اور حد درجہ حساس ہوتے ہوئے ان کے ذہن کی نشوونما طبقاتی امتیاز سے بھرے ہوئے ماحول میں ہوئی۔ آزاد اتنے پڑھے لکھے نہیں تھے کہ وہ غالب

کی نزاکتوں میں ڈوبنے کی فکر کرتے اور اقبال کی ان ہنگامہ خیز اور جذبات انگیز نظموں سے لطف نہیں لیتے جو انہیں اپنے محسوسات کی ترجمان معلوم ہوئیں۔ پھر بھی کبھی کبھی ایسا گمان ہوتا ہے کہ آزاد غالب سے غافل نہیں رہے بلکہ انہوں نے بھی دانستہ یا نادانستہ طور پر غالب کو اپنے ذہن سے خارج کرنے کی جرات نہیں کی ہے۔ ان کے ایک گیت کے دو شعر ہیں۔

بالی سہ ہے چھ بے وفا میون امارتس کیاہ کرے
سورہ و نس مجتس زور تہ زار کیاہ کرے
نیرہ برسینہ داری داری زندہ یہ پان ماری ماری
تیر کمان چاری چاری میر شکار کیاہ کرے

(اے سہیلی وہ بے وفا ہے۔ میری محبت اس پر کوئی اثر نہیں کرتی ہے۔ اس کا پیار تو اب ختم ہو رہا ہے اور میری آہ و زاری سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ میں اپنا سینہ تان کر اور جان بکف ہو کے نکلوں گا۔ مجھے یہ دیکھنا ہے کہ وہ شکاری تیر و کمان لے کر میرے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہے)

اب غالب کو بھی ملاحظہ کیجئے۔ وہ کہتا ہے۔

نکلا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

اور

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

آزاد کے یہاں سے چند مثالیں دینے کے بعد غالب کو اگر کشمیر کی جدید شاعری میں ڈھونڈھنے کی کوشش کی جائے تو اسے ایک ایسی مبہم اور موہوم شکل ہی میں تلاش کیا جا سکتا ہے جس کے خط و خال کبھی صاف صاف ہو کے سامنے آ جاتے ہیں اور بسا اوقات ان میں تفصیلات کو دیکھنے اور جانچنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔

راہی کے اس شعر پر۔

ہاؤسن ہندی حدمیہ ژھا نجالے بارہا
زانہ تہ نواند واتی یم افسانہ تے

(میں نے بار بار اپنی تمناؤں کی حدیں تلاش کیں لیکن یہ افسانے کبھی تکمیل کو نہیں پہنچے)

غالب کے اس شعر کی چھاپ اور گہرا تاثر نمایاں طور پر نظر آتا ہے جس میں اس نے ہر شے کو پانے کے بعد بھی ہر شے کو پانے کی تمنا کرتے ہوئے کہا ہے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

البتہ ہماری شاعری میں ایسے بھی متفرقات اور مفردات ملیں گے جن کو پڑھ کے گمان ہوتا ہے کہ شاعری نے غالب کو ضرور پڑھا اور سمجھا ہے اس کے فکر و خیال کی داد دی ہے لیکن اپنے خیال پر اس کے تصورات کو حاوی نہیں ہونے دیا ہے۔ مثال کے طور پر غالب کا شعر ہے۔

عشرت پارۂ دل زخم تمنا کھانا
لذت ریش جگر غرق نمک داں ہونا

اور کشمیری میں اس شعر کی دھیمی دھیمی صدائے بازگشت اس شعر میں سنائی دیتی ہے۔

شوق لاگان چھ خون دل داوس
زانہ نہ عاشق کھنیا کلک خیرات

(شوق اپنے خون دل کو داؤ پر لگا دیتا ہے اور عشاق سر کی خیرات قبول نہیں کرتے۔

کشمیری شاعری پر غالب کے ہمہ گیر اثر کو ثابت کرنے کے لئے ممکن ہے کہ بعض متوقع قسم کی شعری یا اصطلاحی یا تصوری مماثلت کا سہارا لیا جائے لیکن اس قسم کے نوادرات تو ہر زمانے میں اور ہر شاعری میں پائے جاتے ہیں۔

خواجہ اکرم وردمند کشمیری زبان کا ایک ناخواندہ شاعر گذرا ہے جس کی علمی استعداد "کریمانام حق" کے صفحات تک ہی محدود تھی اس کا ایک مصرع ہے۔

چھ تقدیر شیشہ نہ تدبیر سنگ
(تقدیر شیشہ ہے اور تدبیر سنگ)

یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وردمند نے یہ مصرع چاسر کو پڑھ کر موزوں کیا ہے جس نے کہا تھا۔
اپنے مٹی کے برتن کو قضا کی آہنی دیوار کے ساتھ مت ٹکراؤ غالب کا ایک مشہور شعر ہے۔

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا

ہمارے ایک ہم عصر شاعر عارض نے بھی' جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے لاشعوری طور پر اور یقیناً غالب سے اثر لئے بغیر دیکھئے اسی خیال کا کتنا ہی پیارا شعر کہا ہے۔

خابہ حنزی سودم لرہ ورف تراوتھ نرہ شاند تھاوتھ گوم
خاب اوس خابی چشمہ مژراوتھ سنی ژور ژجیپ دتھ گوم

اس نے خواب میں اپنے محبوب کو اپنی بانہوں میں سلایا لیکن خواب تو خواب ہی تھا اور جب میں جاگا تو وہ دزد دل دل لے کر کے بھاگ چکا تھا)

غالب اور کشمیری شاعری کے تعلق کے پیش نظر میں سمجھتا ہوں کہ یہ مضمون تشنہ تکمیل ہی رہے گا جب تک کہ ان شاعروں کا بھی تھوڑا سا تذکرہ سامنے نہ آجائے جو کشمیری الاصل تھے اور جنہیں غالب کی شاگردی کی

سعادت حاصل ہوئی۔

سرزمین کشمیر سے جتنے بھی سخن ور غالب کے شاگرد ہو گذرے ہیں' بدقسمتی سے ان کے حالات زندگی اور کلام کے بارے میں مکمل تفصیلات آج دستیاب نہیں لہٰذا یہاں پر ایسے صرف تین شاعروں کا ذکر کیا جائے گا۔

کشمیر میں رہنے والے خواجوں کا ایک خاندان جب بسلسلہ تجارت ڈھاکہ چلا گیا تو اس خاندان میں عبدالغفار اختر جیسا چشم و چراغ پیدا ہوا۔ اختر کو فارسی اور اردو پر مکمل دسترس حاصل تھی اور دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں وفا' ریختہ میں نزاکت اور اردو میں اختر تخلص تھا۔ اختر نے صرف فارسی کلام پر غالب سے اصلاح لی ہے ان کے کچھ اشعار یہ ہیں۔

گر خضر نے عمر جاودانی پائی
یا آب حیات کی نشانی پائی
کیا ناز کرے اس پہ کہ جب اختر
مرنے کے لئے یہ زندگانی پائی

پنڈت بھچی نراین مفتوں کے آباو اجداد کشمیر میں اونچے عہدوں پر فائز تھے۔ اپنے وطن پر نامساعد حالات کی ستم ظریفی سے عاجز آ کر مفتوں فرخ آباد میں جا کر بس گئے جہاں وہ ترقی کرتے کرتے شہر کے میونسپل کمشنر بن گئے اور اعزازی مجسٹریٹ کا رتبہ پایا۔ فارسی شاعری میں مہارت کے علاوہ نستعلیق خط میں بھی جانکاری حاصل کی۔ نمونے کے چند شعر یوں ہیں۔

عمر گذری کہ تری راہ میں ہم بیٹھے ہیں
پر ابھی شوق یہ کہتا ہے کہ کم بیٹھے ہیں
کیونکہ بیت الصنم عشق سے اٹھیں مفتوں
اب تو اللہ کی ہم کھا کے قسم بیٹھے ہیں

نواب سید محمد زکریا خان ذکی کشمیر سے جا کر دکن میں آباد ہوئے۔ 1857ء کے پر آشوب زمانے میں ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگتے رہے اور 1903ء میں بدایوں میں وفات پائی۔ دیوان ذکی ان کی زندگی ہی میں شائع ہوا جس پر غالب کی لکھی ہوئی چند سطور بھی رقم تھیں ذکی کا نمونہ کلام یہ ہے۔

تمکین وضع طرز تبسم میں دیکھئے
انداز اس کی شوخی طبع سلیم کا
حیف صد حیف ذکی زندگی تلخ تیری
بے کسی کا اگر انجام یہ ہو مر جانا

مولانا سعید انصاری

مرزا غالب کا علم کلام

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے
اقبال کے "علم کلام" پر مولانا سید سلیمان ندوی نے مولانا عبدالسلام ندوی نے ایک مقالہ تحریر فرمایا تھا' جو مقالات یوم اقبال کے آغاز میں شامل ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ مرزا غالب کے "علم کلام" سے چند اہم مسائل نکال کر یہاں پیش کیے جائیں۔ چونکہ انہوں نے خسرو شیریں سخن کے پاؤں دھو دھو کر پیے تھے' ان کا کلام اس سلسلے میں بہت صاف اور بامزہ ہوتا ہے۔

"حور" کے متعلق رندنے صاف کہہ دیا تھا۔

حور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا سب سے بیگانہ ہے اے دوست شناسا تیرا

لیکن مرزا صاحب نے حور کے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس سے دو بنیادی مسائل پیدا ہوتے ہیں (1) حوریں پیدا ہو چکی ہیں (2) حوریں ابھی تک نہیں پیدا ہوئی ہیں۔ بلکہ آئندہ پیدا ہوں گی۔ یہ وہی نظریات ہیں جو جنت و دوزخ کے نسبت علمائے کلام کی کتابوں میں ملتے ہیں۔

پہلے نظریہ کو مرزا صاحب اپنے مخصوص انداز میں اس طرح ادا فرماتے ہیں۔

جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں ایسی جنت کو کیا کرے کوئی

دوسرا نظریہ ذرا شک کے پیرایے میں' مگر بڑے تیکھے طرز ادا کے ساتھ' یوں بیان ہوا ہے۔

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

قدرت کے کرشمے سے پری زادوں یعنی معشوقوں کا حوروں کی شکل میں تبدیل ہونا پھر عرصہ محشر میں اور محشر کے حضور عشاق کے دل میں ان کی نسبت انتقام کا جذبہ پیدا ہونا' مضمون کی نزاکت اور بیان کی جدت کا بڑا شاندار نمونہ ہے۔ (حور کے متعلق لطیفے کے طور پر یہاں اگر مرزا صاحب کا ایک شعر اور لکھ دوں تو شاید بے جا نہ ہو)

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

اس شعر میں اگرچہ زبان و بیان کی بے انتہا خوبیاں اور رعنائیاں ہیں' لیکن جانتا ہوں کہ علم کلام کے کوچے میں اس کا گذر نہیں "جنت کی نسبت جو شعرا صاف لفظوں میں انکار یا اقرار کا پہلو اختیار کرتے ہیں' ان کے ہاتھ شوخی' نزاکت اور لطافت کا دامن چھوٹ جاتا ہے۔ مرزا صاحب اس معاملہ میں "گوگو" ہیں انہوں نے اس مسئلہ کے رخ پر "ابہام" کا ایسا ہلکا پردہ ڈال رکھا ہے کہ شاہد حقیقت نہ ہو تو صاف چھپتا ہے اور نہ سامنے ہی آتا

ہے-

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

کم نہیں جلوہ گری میں تیرے کوچے سے بہشت.
یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تیرا جلوہ گاہ ہو

"وجود" اور عدم میں سے وجود کے متعلق مرزا صاحب نے ایک شعر میں جو خیال باندھا ہے' اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ وجود کو بڑی اہمیت دیتے ہیں-

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل! بارہا
میری آہ آتشیں سے بال عنقا جل گیا

آہ آتشیں اور بال عنقا' خیالی دنیا کی مخلوقات ہیں اور شاعران کو "عدم" کے دائرے میں سمجھتا ہے- لیکن عدم سے "پرے" وہ جس دنیا کا نشان دے رہا ہے' وہ وجود ہی تو ہے-

شہود کو مرزا صاحب نے ایک بدیع مثال کے ذریعے سمجھایا ہے!

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

شہود کی تعریف میں "غیب غیب" کی ترکیب اضافی' الاشیاء تعرف باضد اوحاء کا حیرت انگیز پیرایہ ہے- " وحدۃ الوجود" کی ماہیت ظاہر کرنے کے سلسلے میں اس "مرد مسلمان" نے کفر کی خوب نمائش کی ہے-

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم   کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے

"ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا" کی زبان سے کفر کا ایسا خوبصورت اعلان کس قدر جاذب توجہ ہے- " انسان" بہت ہی کھلا ہوا اور صاف بھی ہے' اور ساتھ ہی نہایت پیچیدہ بھی- پہلا خیال' شاعر کو "جلوت در خلوت" بنانے پر آمادہ کرتا ہے-

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال   ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

دوسرے خیال نے آدمی اور انسان کا فرق نمایاں کیا ہے- جو بہت ہی دقیق اور نازک ہے-

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آسان ہونا   آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا

"بت" اور توحید کا تضاد سب کو معلوم ہے لیکن شاعر نے دونوں کے درمیان ایک نسبت پیدا کر لی ہے گو

دو رہی سہی۔

گوواں نہیں وہاں کے نکالے ہوئے تو ہیں   کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

اتنا سننے کے بعد اب بتوں کو بھی یہ حق پہنچتا ہے کہ کعبہ سے اپنے رشتے کا اعلان کر دیں۔

گرچہ خوردیم' نسبتے است بزرگ۔ ذرۂ آفتاب تابانیم۔ "روزہ" کی نسبت "ایک نہیں رکھا" کہنے والے نے روزہ داری اور روزہ خوری کی کیا پر لطف توجیہ کی ہے۔

افطار صوم کی کچھ اگر دست گاہ ہو
اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو بے چارہ کیا کرے

"قربانی" مرزا صاحب نے ایک حج کا قصد کیا تھا! چنانچہ جب وہ لکھنؤ کے ارادے سے دلی سے نکلے تو آئندہ پروگرام کے متعلق یہ ارشاد فرمایا۔

مقطع سلسلہ شوق نہیں ہے وہ شہر   عزم سیر نجف و طوف حرم ہے ہم کو

لیکن وہ راجہ غضنفر علی خاں تو تھے نہیں' جو ہوائی جہاز پر بیٹھ کر جلدی سے مکہ معظمہ پہنچ جاتے۔ بہر حال ان کو حج کی توفیق نہیں ہوئی! لیکن قربانی! تو وہ ہندوستان میں بھی ہو سکتی تھی! اور اس کے متعلق ان کا ایک پیش رو کہہ بھی گیا تھا۔

یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروز عید قرباں   وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

مرزا صاحب جو معشوق کو خنجر آزمائی کی ہمیشہ دعوت دیا کرتے تھے اس مسئلہ میں امریکہ کے بیل (ٹام بل) کا پاٹ ادا کرتے ہیں! وہ جس طرح قیادت کر کے مذبح میں' بیلوں کو خوش خوش پہنچاتا ہے' مرزا صاحب بھی نمائندہ بن کر قربان ہونے والوں کی طرف سے کہتے ہیں۔

عشرت قتل گہ اہل تمنا مت پوچھ   عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

مرزا غالب کے "علم کلام" کی گذشتہ دقیق بحثیں سن کر غالباً ناظرین مرعوب ہو گئے ہوں گے! جس طرح مولوی مناظر احسن گیلانی نے "جامع المجددین" پڑھ کر یہ اعتراف کیا ہے کہ مولوی اشرف علیؒ صاحب تھانوی کی اخلاقی تعلیمات' امام غزالیؒ کے اخلاقیات سے بڑھ گئی ہیں۔ اسی طرح آپ بھی اپنے دل میں کہہ رہے ہوں گے کہ مرزا غالب کے "کلامیات" کا مرتبہ سرسید' شبلی چراغ علی' اقبال' حتیٰ کہ امام رازیؒ کے علم کلام سے بھی بالاتر ہے! میں نے ان طویل مباحث کو حد درجہ مختصر کر کے لکھا ہے۔ یعنی دریا کو کوزہ میں بند کیا ہے۔ ورنہ خیال تو کچھ اور تھا۔

نہ بندھے تشنگی ذوق کے مضموں غالب   گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

نریش کمار شاد

غالب پر میر کا اثر

میرو غالب دونوں آسمان شعرو ادب کے آفتاب و ماہتاب ہیں۔ کسی پر کسی کو ترجیح دینے کا سوال ہی نہیں کیونکہ دونوں اپنے وقت کے تاریخ ساز اور صاحب طرز غزل گو تھے۔ دونوں کی شاعرانہ شخصیتیں بھی ایک دوسرے سے قطعی مختلف تھیں' ایک احساس کا شاعر تھا تو دوسرا ذکر' میر کی شاعری کا غالب رجحان گداز تھا سوز اور درد سے ان کے مزاج کا خمیر اٹھا تھا۔ ان کے زیادہ تر اشعار نہایت غمناک احساسات کی پیداوار ہیں' مجنوں گورکھپوری کے بقول ان کی آواز نہایت شائستگی کے ساتھ اپنے زمانے کے سارے کرب و اضطراب کو ظاہر کر رہی ہے اور غالب کی شاعری کا بنیادی عنصر تفکر تھا۔ ان کا تجزیہ و تحلیل کرنے والا شعور' انسانی تجربات و محسوسات کا صرف مشاہدہ ہی نہیں کرتا تھا بلکہ ان کی تہہ میں ڈوب کر ایسے ایسے لازوال اشعار کی تخلیق کرتا تھا جن کی ہمہ گیری اور آفاقیت ہر دور میں مسلم رہے گی۔ سردار جعفری نے ان دونوں عظیم فن کاروں کی شاعری کا موازنہ کرتے ہوئے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ غالب کی شاعری کے عاشق میں انانیت اور خود پرستی ہے اور میر کی شاعری کے عاشق میں مظلوم اور جھنجلائے ہوئے آدمی کا جذبہ انتقام ہے لیکن اس غیر معمولی ذہنی تفاوت کے باوجود غالب میر سے بے حد متاثر تھے اور اس کا انہیں شعوری طور پر احساس بھی تھا جبھی تو انہیں یہ کہنا پڑا۔

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

اور بے پناہ طباعی' خلاقی اور جدت طرازی کے باوجود ان کے کلام میں ایسے اشعار ملتے ہیں جنہیں دیکھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ارادی یا غیر ارادی طور پر اس خدائے سخن کے اشعار کی رہنمائی میں کہے گئے ہیں جس نے ان کا بالکل ابتدائی کلام دیکھ کر یہ پیشن گوئی کی تھی کہ اس لڑکے کو اگر کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے راستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفان نکلا

اور اسی بات کو میر اپنے مخصوص انداز میں اس طرح کہہ چکے ہیں۔

جگر ہی میں یک قطرہ خوں ہے سرشک
پلک تک گیا تو تلاطم کیا

ظاہر ہے کہ میر کے شعر میں غالب کے شعر سے زیادہ کسک ہے' وجہ یہ ہے کہ یہ حسرت ناک مضمون میر کے طبعی میلان سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔
یا غالب کا ایک بہت مشہور مطلع ہے۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

فارسی شاعری میں تو یہ مضمون عام ہے۔ خیام نے بھی اسے اپنی بعض رباعیات کا موضوع بنایا ہے جیسے۔

در ہر دشتے کہ لالہ زاد ے بودست
آں لالہ ز خون شہر یارے بودست
ہر برگ بنفشہ کز زمین ے روید
خال ایست کہ بر رخ نگارے بودست

لیکن غالب کے اس مطلع کی بنیاد میر کا یہ شعر معلوم ہوتا ہے جس کا انداز بیان نسبتاً" زیادہ دردناک ہے۔

کوگل و لالہ کہاں سنبل سمن ہم نسترن
خاک سے یکساں ہوئے ہیں ہائے کیا کیا آشنا

غالب کا شعر ہے

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

شعر کا انداز بیان اگرچہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ لیکن میر اسی مضمون کا اس سے زیادہ سلیس اور سلجھا ہوا شعر کہہ چکے ہیں۔

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دم کے جانے کا نہایت غم رہا

اور میرزا غالب کا یہ شعر۔

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

جوش ملسیانی کے الفاظ میں واقعی لاجواب اور غیر فانی شعر ہے اور اس کی خوبی بیان کی طاقت سے باہر ہے لیکن حقیقت میں میر کے اس شعر کا عکس جمیل معلوم ہوتا ہے۔

سراہا ان نے ترا ہاتھ جن نے دیکھا زخم
شہید ہوں میں تیری تیغ کے لگانے کا

اور یہ دونوں شعر فیاض لاھی کے اس شعر سے ماخوذ ہیں۔

ہر کس کہ زخم کاری مارا نظارہ کرد
تا حشر دست و بازوئے اورا دعا کند

اور غالب کے اس شعر میں۔

سخن میں خامہ غالب کی آتش افشانی
یقین ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کے لیے

بلاشبہ "دم" کے پہلودار استعمال نے شعر میں جان ڈال دی ہے۔ لیکن میر نے اسی مضمون کو زیادہ بے تکلفی سے ادا کیا۔

گوکہ آتش زباں تھے آگے میر
اب کی کہئے گئی وہ تب کی بات

اور غالب کے اس شعر میں

زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ بن کہے ہی ہمیں سب خبر ہے کیا کہئے

بیان کی شوخی اور احسان کی شگفتگی کا کیا جواب ہے۔ محبوب کے اشاروں کے جادو نے ایسا فریب دے رکھا ہے کہ عاشق کو یقین ہے کہ اس کے دل کا حال معشوق سے مخفی نہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ میرزا کا یہ شعر میر کے اس شعر کی شائستہ تر صورت ہے۔

جب درد دل کا کہنا میں دل میں ٹھانتا ہوں
کہتا ہے بن سنے ہی میں خوب جانتا ہوں

میرزا غالب کا ایک اور مطلع ہے۔

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم وراہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

اس زمین میں ہر شعر قدرتی طور پر تنافر کے عیب کا شکار ہو گا اور ردیف میں "ہ" کی تکرار صوتی کراہت کا باعث ہو گی۔ لیکن اس سقم سے قطع نظر شعر کے نفس مضمون کو میر نے یہاں یوں ادا کر چکے ہیں۔

کون کہتا ہے نہ غیروں پہ تم امداد کرو
ہم فراموش ہوؤں کو بھی کبھی یاد کرو

اور یہاں "فراموش ہوؤں" نے جو کربناک تاثر پیدا کیا ہے اس کی گہرائی کا کیا ٹھکانا میرزا غالب فرماتے ہیں۔

غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو
نہیں دماغ ہمیں خندہ ہائے بے جا کا

حق تو یہ ہے کہ میرزا نے خندۂ گل کو خندۂ بے جا کہہ کر بلاغت کا حق ادا کر دیا ہے۔ لیکن یہی مضمون میر کے

یہاں پہلے موجود ہے اور میر کی فطری بدمزاجی سے زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے اس میں تیکھا پن بھی زیادہ ہے۔

ہمیں تو باغ کی تکلیف سے معاف رکھو
کہ سیر گشت نہیں رسم اہل ماتم کی

ویسے یہ مضمون دونوں نے ابو تراب تراب سے مستعار لیا ہے۔

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

غالب کا شعر۔

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

شعر میں قیامت کا لفظ واقعی قیامت ہے اور پھر خدا کی رعایت سے محبوب کا کافر کہہ کر شعر میں تضاد کا لطف بھی پیدا کر دیا گیا ہے لیکن شعر کا نفس مضمون اور بنیادی میلان دراصل میر کے اس شعر کی ترقی یافتہ صورت ہے۔

عشق تو ان کو ہے جو یار کو اپنے دم رفتن
کرتے نہیں غیرت سے بھی خدا کے حوالے

غالب کا یہ شعر۔

دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

بے شک اردو کے بہترین اور زندہ جاوید اشعار میں سے ہے اور قوت بیانیہ کے شاہکار کا درجہ رکھتا ہے لیکن اس حقیقت کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس شاہکار میں رنگ بھرنے کے لیے شعوری یا غیر شعوری طور پر میرزا نے استفادہ میر کے اس شعر سے کیا ہے۔

عشق کی شوزشوں نے دل میں کچھ نہ چھوڑا کیا کہیں
لگ گئی یہ آگ نا گاہی کہ بس گھر ٹھپک گیا

اسی طرح غالب کا ایک اور سلگتا ہوا شعر ہے۔

جلتا ہے جی کہ کیوں نہ ہم ایک بار جل گئے
اے ناتمامئ نفس شعلہ بار حیف

جلنے کی وجہ سے جس خوبی سے اپنے دل کو جلایا گیا ہے۔ اس کی داد نہیں دی جا سکتی۔ لیکن کیا عجب کہ اس شعر کا شرار بھی میر کے اس شعر سے پھوٹا ہو۔

ادھ جلا لالہ ساں رہا تو کیا
داغ بھی ہو تو کوئی پالکل ہو

غالب کا یہ شعر۔

ہم ہیں مشتاق اور وہ بے زار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

برجستگی کی نہایت عمدہ مثال ہے لیکن قیاس کہتا ہے کہ اس برجستگی کو بھی میر کے اس شعر سے تراشا گیا ہے۔

بھاگے مری صورت سے وہ عاشق میں اس کی شکل پر
میں اس کا خواہاں یاں تلک وہ مجھ سے بیزار اس قدر

غالب کا بہت مشہور شعر۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

جو نہایت صاف اور سلجھے ہوئے مضمون کا حامل ہے۔ لیکن میر کے اس شعر کا مرہون منت معلوم ہوتا ہے۔

بالیں پہ میرے گھر سے تو آؤں گا جب تلک
کر جاؤں گا سفر ہی میں دنیا سے تب تلک

غالب کا یہ شعر۔

فراغت کس قدر ہوتی مجھے تشویش مرہم سے
بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر

ان کے نکتہ آفریں تفکر کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔ دل کے ٹکڑے نمکدان کی لذت کے اس حد تک حریص ہو گئے کہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں باہم لڑنے لگے اور میں نے ان کے جھگڑے سے تنگ آ کر انہیں اس لذت ہی سے محروم کر دیا لیکن میرزا نے شاعرانہ تکلیف سے جو بات کہی ہے وہ میر کے اس بے تکلف شعر سے عبارت معلوم ہوتی ہے۔

ریزۂ الماس یا مشت نمک ہے کیا برا
جو میں اپنے ایسے زخم سینہ کو مرہم کروں

میر کے شعر میں احساس کی جو کسک اور چبھن ہے وہ غالب کے شعر میں نہیں۔

غالب کا شعر ہے۔

آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے کہ تا تجھ پہ کھل جائے کہ مجھ کو حسرت دیدار ہے

اور مزے کی بات یہ کہ غالب کے ہمعصر ذوق نے بھی قریب قریب اس خیال کو اس طرح نظم کیا ہے۔

یہ چاہتا ہے شوق کہ قاصد بجائے مہر آنکھ اپنی ہو لفافہ خط پر لگی ہوئی

لیکن ان دو شعروں کے سوتے میر کے اس شعر سے پھوٹے ہیں۔

وہ بھی جانے ہے لہو رو کے لکھا ہے مکتوب ہم نے سر نامہ کیا کاغذ افشانی کا

غالب ابھی تیرہ یا چودہ برس کے تھے جب میر کا انتقال ہو گیا۔ گویا میر نے شاعری میں' غالب سے تقریباً پچاس برس پہلے کی زبان استعمال کی ہے پچاس برس میں زبان نے جو ارتقائی منازل طے کیے اکثر اشعار میں مضامین کی یکسانیت کے باوجود وہی اسالیب کے تفاوت کا باعث ہیں۔

ضیاء احمد بدایونی

محاورات غالب

ایک ادبی شاہ کار کو جانچنے کے لئے مواد وہیئت دونوں کو پرکھنا ضروری ہے۔ مواد روح ہے اور ہیئت جسم۔ اور زندگی روح و جسم دونوں کے تعاون سے عبارت ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ادب کے لئے ہیئت کی حیثیت مقدم ہے اور مواد کی ثانوی۔ پوپ نے تو صرف اتنا ہی کہا تھا کہ "اسلوب خیال کا لباس ہے۔" کارلائل نے اس حقیقت کو زیادہ صحت کے ساتھ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ "اسلوب کسی ادیب کا کوٹ نہیں ہے کہ جب چاہا اتارا اور جب چاہا پہن لیا۔ یہ اس کی جلد ہے۔" دراصل یہ تفریق و تقسیم بھی مسئلے کی توضیح اور تجزیہ کی سہولت کے پیش نظر کی گئی ہے۔ ورنہ جہاں تک ادب و شعر کا تعلق ہے' ادیب و شاعر کے ذہنی عمل میں اور نیز اس کی خارجی تشکیل میں مواد وہیئت ایک وحدت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اسلوب جو ہیئت کا دوسرا نام ہے ایک فن کار کی شخصیت کے متعین کرنے کا اہم ذریعہ ہے۔ یہ خیال ہمارے ناقدین کی طرف سے بار بار دہرایا گیا ہے۔ ہمیں اس سے انکار نہیں' لیکن اگر ہم اس کی حدود کو پیش نظر رکھے بغیر اس کو بے کم و کاست تسلیم کرلیں تو یہ گمراہی کا سبب ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ ادیب و شاعر کا رول ایک مصور کا سا ہے۔ جس طرح مصور کبھی بالقصد اور کبھی وسائل کے فقدان کی مجبوری سے تصویر کے گرد و پیش کے مناظر کو کسی جگہ نمایاں اور کسی جگہ دھندلا کرکے دکھاتا ہے' ادیب یا شاعر بھی ہمیشہ ایک صداقت کو بتمامہ پیش نہیں کرتا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہلکے خطوط جو اس نے کھینچے ہیں وہ خود چھوٹے ہوئے خطوط کو سمجھانے (Suggest کرنے) میں مدد دیتے ہیں۔ جو چیز اسلوب کے بارے میں بیان کی گئی وہی پوری شاعری یا پورے ادب پر بھی صادق آتی ہے۔ جیسا کہ پروفیسر آل احمد سرور نے ایک جگہ کہا ہے "کہا جاتا ہے کہ شاعری شخصیت کا آئینہ ہے۔ یہ قول نہایت گمراہ کن ہے۔ جس طرح آئینے میں کسی شخص کا عکس نظر آجاتا ہے اس طرح شخصیت کا عکس شاعری میں نظر نہیں آتا۔ نہ شخصیت اتنی سادہ اور واضح شے ہے اور نہ شاعری اتنی شفاف اور ہموار سطح رکھتی ہے کہ ہمیں شاعر کی شخصیت اس کے کلام میں بجنسہ نظر آئے۔ شخصیت شاعری میں ضرور جھلکتی ہے مگر اس پر شاعری کے مخصوص اظہار اور فن کے تقاضوں کا پردہ ہوتا ہے۔"

ان تمام حد بندیوں کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک بڑے فن کار (ادیب یا شاعر) کے یہاں اسلوب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسلوب دراصل ایک طرح کی علامت ہے جو اپنے خالق کی طرف کم و بیش اشارہ کرہی دیتی ہے۔ جب ہم فردوسی و نظامی' انوری و خاقانی' سعدی و حافظ یا میرو سودا' ذوق و مومن' داغ

وامیر وغیرہ کا کلام سن کر کہتے ہیں کہ اس میں ان کا خاص رنگ ہے یا نہیں تو اس حقیقت کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔
اسلوب کے اجزائے ترکیبی کیا ہوتے ہیں' اس کا جواب بہت مشکل ہے۔ اول تو ہر فنکار کا اسلوب جدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کوئی ایسا کمپنڈ نہیں جس کو دیکھ کر اس کے اجزا کی الگ الگ نشاندہی کی جا سکے۔ سائنس کی دنیا میں تو ایسا ہوتا ہے کہ ہم ایک مرکب کو آلات کی مدد سے جانچ کر اس کے اجزا کی نشان دہی کر دیں۔ مگر ذہنی یا روحانی فضا میں یہ آلات کام نہیں دیتے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اصل خیال یا جذبے کے علاوہ ہر چیز' زبان' بیان' تراکیب' روزمرہ' محاورہ' تمثیل' تشبیہ' استعارہ' بحر اسلوب کے تحت آ جاتی ہے' پھر بھی ہر فن کار کا انداز (Mode) ایسی چیز ہے جس کا تجزیہ کما حقہٗ' دشوار ہے۔ بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کے علائم اور آثار کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی نے سچ کہا ہے کہ "لسانیات کے باب میں تحلیل اور تجزیے کے وہ اصول عمدہ بر آ نہیں ہو سکتے جو طبیعیات و مادیات پر حاوی ہیں۔ زبان سالمات و سالبات کے قدغن سے مبرا ہے" پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے اسی بحث کو دوسرے پہلو سے زیادہ واشگاف طور پر پیش کیا ہے وہ لکھتے ہیں "ادب اور زبان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہر ادبی کارنامے خصوصاً شاعری کے میدان میں آخری تجزیے میں دراصل زبان ہی عمدہ بر آ ہونے کا ایک وسیلہ ہے۔ تخلیقی عمل میں الفاظ کو اضافی یا آرائشی چیز سمجھنا یا انہیں ایک منفعل (Passive) وظیفے کا حامل سمجھنا صریح غلطی ہے کیوں کہ الفاظ ہی کی وساطت سے خیالات و جذبات کے مرکب (Comolex) کی واگذاشت عمل میں آتی ہے اور اسی کی مدد سے عام تجربہ گہرائی اور معنی خیزی حاصل کرتا ہے۔" بقول فراق "غزل کے اشعار میں بسا اوقات ایک لفظ یا دو تین لفظوں کا ٹکڑا جادو کا حکم رکھتا ہے اور سہل ممتنع کے کئی مدارج ایک (بظاہر) معمول لفظ یا ٹکڑے سے طے ہو جاتے ہیں غرض زبان و بیان کی سحر طرازی سے کوئی بڑے سے بڑا نابغہ (Genius) بے نیاز یا کوئی سخت سے سخت ناقد منکر نہیں ہو سکتا۔ آج کی صحبت میں ہم چاہتے ہیں کہ مرزا غالب کے اردو کلام میں جو محاورات استعمال ہوئے ہیں' ان کی افادیت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں۔
محاورہ یوں تو گفتگو یا بات چیت کے معنی دیتا ہے لیکن زبان داں اصحاب کی اصطلاح میں جب ایک یا کئی لفظ مصدر سے مل کر حقیقی معنی سے متجاوز ہو کر کچھ دوسرے معنی دیں تو اس کو محاورہ کہتے ہیں۔ مثلاً اتارنا از روئے لغت کسی چیز کو اوپر سے نیچے لانا ہے۔ مگر جب ہم احسان اتارنا' نقل اتارنا' تصویر اتارنا بولتے ہیں تو محاورہ بن جاتا ہے۔ غالب فارسی زبان کے ساتھ اردو پر بھی کامل قدرت رکھتے تھے۔ انہوں نے بکثرت محاورے برتے ہیں جن میں سے کچھ پہلے سے زبان میں متعارف تھے اور کچھ انہوں نے خود فارسی سے ترجمے کے ذریعے سے اخذ کئے۔ اگرچہ محاورے میں تصرف یا ترجمہ جائز نہیں مگر ان کو اپنے اجتہادات پر اصرار تھا۔ اس کی دو وجہیں سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کی آزاد طبعی ادب اور زبان میں قیود اور حدود کی قائل نہ تھی۔ دوسرے وہ جانتے تھے کہ اردو کے مقابلہ میں فارسی ایک ترقی یافتہ زبان ہے' جس میں مختلف مطالب کو ادا کرنے کے لئے بنے بنائے پیانے موجود ہیں۔ ان پیانوں میں حسن بھی ہے' ایجاز بھی۔ اس لئے شاعر کا فرض ہے کہ یا تو ان کو جوں کا توں

استعمال کرے یا ان کا ترجمہ دے دے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ یہ یقیناً زبان کی توسیع کی طرف ایک مبارک اقدام تھا۔ لیکن جب تک عوامی چلن زبان کی پشت پر نہ ہو اس کا چلنا اور رواج پانا بہت مشکل ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس قسم کے ترجمے کم مقبول ہوئے۔ ذیل کی مثالوں سے ان کے استعمال کردہ محاورات کی نوعیت ظاہر ہو گی۔

جوئے شیر لانا:۔ کوئی بڑا کٹھن کام انجام دینا۔ فرہاد کی کوہ کنی کی طرف اشارہ ہے۔
غالب لکھتے ہیں:

کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

دام شنیدن بچھانا:۔ سننے کی تدبیر یا کوشش کرنا۔ سننے کو جال قرار دیا ہے۔ جس سے مدعا یا مضمون گرفت میں آ سکتا ہے۔

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

بہ روئے کار آنا:۔ میدان میں آنا۔

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگی چشم حسود تھا

نقش درست کرنا:۔ نقش قائم کرنا۔ درست کردن نقش فارسی میں بولتے ہیں۔

آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

مدعا پانا:۔ مراد پانا۔ مگر غالب کے شعر میں مدعا پانا بات کی تہ کو پہنچنا کے معنی میں آیا ہے۔

کہتے ہو کہ نہ دیں گے دل اگر بڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجئے ہم نے مدعا پایا

مرغوب آنا:۔ مرغوب ہونا۔

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بہ یک کف بردن صد دل پسند آیا

دانت میں تنکا لینا:۔ خس بہ دنداں گرفتن کا ترجمہ ہے اور فارسی دانان ہند کی ایجاد ہے۔ ہندوستان میں قاعدہ تھا کہ جو شخص مغلوب ہوتا وہ غالب کے سامنے دانت میں تنکا دبا کر حاضر ہوتا یعنی ہم تمہاری گئو (گائے) ہیں۔ یہ اظہار عجز کا طریقہ تھا۔

نہ آئی سطوت قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

تماشا کرنا:- یعنی دیکھنا تماشا کردن سے ماخوذ ہے- ورنہ اردو میں تماشا کرنا بازی گروں کا کام ہے-

اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

لہو پانی ہونا:- انتہائی اذیت اٹھانا-

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہو گا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

صرفہ ہونا:- نفع ہونا، بچت ہونا-

صرفہ ہے ضبط آہ میں میرا وگرنہ میں
طعمہ ہوں ایک ہی نفس جاں گداز کا

اسی طرح مرزا نے کھلنا مختلف الفاظ کے ساتھ مختلف معانی میں استعمال کیا ہے- یعنی وا ہونا، بے تکلف ہونا، زیب دینا وغیرہ-

گلستاں ہونا:- پھولنا، پھلنا-

لے گئے خاک میں ہم داغ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بہ صد رنگ گلستاں ہونا

بہ باد دینا:- (بہ باد دادن) برباد کرنا-

نالہ دل نے دیئے اوراق لخت دل بہ باد
یاد گار نالہ اک دیوان بے شیرازہ تھا

جگر تشنہ فریاد آنا:- فریاد کا مشتاق ہونا- جگر تشنہ یعنی مشتاق-

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنہ فریاد آیا

جاں درھوائے یک نگہ گرم ہونا:- کسی کا (معشوق کا) ایک نگاہ غضب کا آرزو مند ہونا-

جاں در ہوائے یک نگہ گرم ہے اسد
پروانہ ہے وکیل ترے داد خواہ کا

دندان کا رزق کرنا:- (انگلی کو) دانتوں سے کٹوانا افسوس کے طور پر-

افسوس کہ دندان کا کیا رزق فلک نے
جن لوگوں کی تھی در خور عقد گہر انگشت

انگشت دکھلانا:- شوخی سے انگوٹھا دکھانا-

کافی ہے نشانی ترے چھلے کا نہ دینا

خالی مجھے دکھلا کے بہ وقت سفر انگشت

انگشت رکھنا- اعتراض کرنا' نکتہ چینی کرنا-

لکھتا ہوں اسدؔ سوزش دل سے سخن گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

نفس کھینچنا- سانس لینا- نفس کشیدن کا ترجمہ ہے- اسی طرح انتظار کھینچنا- انتظار کرنا جو فارسی میں انتظار کشیدن تھا-

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ

علی ہذا ناز کھینچنا(اس قبیل سے ہے خمیازہ کھینچنا (انگڑائی لینا) منت کھینچنا (احسان اٹھانا) حالانکہ اردو محاورہ ناز اٹھانا ہے- سب سے پر لطف کباب دل سمندر کھینچنا ہے جس سے مراد دستر خوان پر سمندر کے دل کے کباب چننا ہے- یہ ان محاورات میں ہے جن کو اردو مطلق ہضم نہیں کر سکتی- اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے بعض لوگ انگریزی کی تقلید میں کہہ دیتے ہیں کہ میں نے چائے لے لی- میں نے دوا لے لی- یعنی پی لی-

مرے قدح میں ہے صہبائے آتش پنہاں
بروئے سفرہ کباب دل سمندر کھینچ

سفیدی پھرنا- دیوار وغیرہ پر سفیدی کرنا-

نہ چھوڑی حضرت یوسفؑ نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوبؑ کی پھرتی ہے زنداں پر

آئینہ باندھنا- آئینہ لگانا یا نصب کرنا-

برنگ کاغذ آتش زدہ نیرنگ بے تابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بال یک تپیدن پر

تسلی ہونا- معنی تسلی پانا- فارسی میں تسلی شدن مستعمل ہے- صائب لکھتا ہے:

زحسن شوخ تسلی مشو بہ دیدن خشک گلے کہ ی رود از دست از و گلاب بگیر

جگر تشنۂ آزار تسلی نہ ہوا
جوئے خوں ہم نے بہائی بن ہر خار کے پاس

آتش لگانا- آگ لگانا کے موقع پر اردو میں صحیح نہیں- مگر غالب کہتے ہیں-

نہ لیوے گر خس جوہر طراوت سبزہ خط سے
لگا دے خانہ آئینہ میں روئے نگار آتش

ارزانی رہنا- مبارک ہونا- یہ بھی فارسی کا اثر ہے-

مجھ کو ارزانی رہے تجھ کو مبارک ہو جیو
نالہ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک

سر ہونا:- پیچھے پڑ جانا- نیز رسائی ہونا (مہم سر ہونے کے قیاس پر)

آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

عہدے سے باہر آنا:- اردو میں عہدہ بر آہونا مستعمل ہے-

عہدے سے مدح ناز کے باہر نہ آسکا
گر اک ادا ہو تو اسے اپنی قضا کہوں

پاؤں میں چکر ہونا:- آوارہ گردی کی عادت ہونا-

مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

دریغ آنا:- کسی کام میں تامل ہونا-

ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو
تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

آگے والے اشعار میں باندھنا مختلف مفاہیم کا فائدہ دیتا ہے مثلاً نظم میں کوئی مضمون استعمال کرنا نیز شہرت دینا- دھوم مچانا جیسے

تیرے تو سن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں

ہماری زبان میں مہندی (یا حنا) لگانا بولا جاتا ہے- مگر فارسی میں حنا بستن برابر آتا ہے- غنی نے لکھا ہے-

جلوۂ حسن تو آورد مرا بر سر فکر
تو حنا بستی و من معنی رنگیں بستم

غالب بھلا کیوں کر نہ لکھتے-

اہل تدبیر کی واماندگیاں
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

پیان باندھنا بھی اردو میں کم آتا ہے عہد و پیاں کرنا عموماً استعمال میں ہے- مگر غالب کہتے ہیں-

سادہ پرکار ہیں خوباں غالب
ہم سے پیمان وفا باندھتے ہیں

پر افشاں ہونا:- پھڑ پھڑانا- مضطرب ہونا-

ہوئے اس مہوش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پر افشاں جوہر آئینے میں' مثل ذرہ روزن میں

منت اٹھانا:- احسان اٹھانا-

ہے سنگ پر برات معاش جنون عشق
یعنی ہنوز منت طفلاں اٹھایئے

طرف ہونا:- مقابل ہونا- حریف ہونا- فارسی میں رائج ہے- صائب کہتے ہیں-

کار مرداں نیست با نامرد گردیدن طرف
ورنہ رستم از گریبان فلک کوتاہ نیست

اردو کے اساتذہ کے یہاں بھی ملتا ہے سودا-

سودا تو اس زمین میں غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف

اس کے مقابلے میں میر کی بد دماغی بھی ملاحظہ فرمایئے-

طرف ہونا مرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن میں
یونہی سودا کبھی ہوتا ہے' سو جاہل ہے کیا جانے

غالب نے بھی ایک شعر میں یہ محاورہ برتا ہے-

رندان درمیکدہ گستاخ ہیں زاہد
زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے

اجارہ کرنا:- ذمہ داری قبول کرنا-

غالب ترا احوال سنا دیں گے ہم ان کو
وہ سن کے بلا لیں یہ اجارہ نہیں کرتے

جاگرم کرنا:- جاگرم کردن کا ترجمہ ہے- یعنی قرار پکڑنا- بیلی کہتا ہے-

ایام چوں فتیلہ داغم تمام سوخت
تابچو شمع پیش تو جا گرم کردہ ام

اردو میں یہ محاورہ نہیں چلا- مگر غالب نے لکھا ہے-

کی اس نے گرم سینہ اہل ہوس میں جا
آئے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

کھویا جانا:- (حیران ہونا) اور پاجانا (سمجھ جانا) اچھے محاورے ہیں- جو بہت برمحل صرف ہوئے ہیں- ایہام تضاد بھی بے ساختہ آگیا ہے-

گرچہ ہے طرز تغافل پردہ دار راز عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

دل بیٹھنا:۔ تو متعارف محاورہ تھا۔ مگر مرزا نے فارسی کے محاورے نقش نشستن (اعتبار پیدا کرنا) سے نقش بیٹھنا بھی مستعار لیا اور پورے بندوبست کے لئے استعمال کیا۔

اس کی بزم آرائیاں سن کر دل رنجوریاں
مثل نقش مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

رنگ کھلنا:۔ رنگ صاف ہونا۔ رنگ اڑنا۔ رنگ فق ہونا۔ منہ اتر جانا۔

ہو کے عاشق وہ پریزاد اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے

نقش:۔ (تصویر) کے لئے دو فعل متعدی اور لازم کھینچنا اور کھنچنا ایک شعر میں لائے ہیں پہلا تصویر کشی کے اور دوسرا غرور و ناز کے مفہوم میں اور دونوں پر لطف ہیں۔

نقش کو اس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں
کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

گل کترنا:۔ (گل تراشیدن) کاغذ کے پھول بوٹے بنانا۔

دیکھو تو دل فریبیٔ انداز نقش پا
موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

تقریر کرنا:۔ کلام کرنا۔ شک کرنا۔

کی ہم نفسوں نے اثر گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے

جگر کھودنا:۔ کلیجہ چھیلنا یا زخمی کرنا جس کو فارسی والے جگر کاویدن کہتے ہیں۔

پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آمد فصل لالہ کاری ہے

گفتار میں آنا:۔ یہ گفتار آمدن سے لیا ہے۔ مگر اردو نے اسے اب تک قبول نہیں کیا ہے۔

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آئے
جاں کالبد صورت دیوار میں آئے

مستی جھاڑنا:۔ مستی نکال دینا۔ دور کر دینا۔

غم زمانہ نے جھاڑی نشاط عشق کی مستی
وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذت الم آگے

آگے آنا: بدلا ملنا۔

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں، ہم نے
تمہارے آئیو، اے طرہ ہائے خم بہ خم آگے

دوسری جگہ لکھتے ہیں

خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شب ہجراں کی تمنا مرے آگے

چل نکلنا: ہنگامہ برپا کرنا۔

میں انہیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں
چل نکلتے جو مے پئے ہوتے

دن پھرنا: قسمت کا موافق ہونا۔ مشہور اور متعارف محاورہ ہے۔

شاہ کے ہے غسل صحت کی خبر
دیکھئے کب دن پھریں حمام کے

پہلو تہی کرنا: بے اعتنائی کرنا، جا خالی ہونا۔ کسی غیر حاضر شخص کی موجودگی کا پسندیدہ ہونا۔ اس موقع پر اہل ایران کہتے ہیں جائے فلاں خالی است یا سبز است یا پیداست۔

تغافل دوست ہوں میرا دماغ عجز عالی ہے
اگر پہلو تہی کیجئے تو جا میری بھی خالی ہے

خوش آنا: بھانا

گلشن کو تیری صحبت از بسکہ خوش آئی ہے
ہر غنچے کا گل ہونا آغوش کشائی ہے

پشت گرمی دینا: تقویت پہنچانا۔

سیماب پشت گرمی آئینہ دے، ہے ہم
حیراں کئے ہوئے ہیں دل بے قرار کے

لیجئے کھینچنے کے محاورے نے پھر کشش کی۔

مے کھینچنا: شراب پینا (یعنی مے کشی) اپنے کو کھینچنا۔ اپنے آپ کو الگ رکھنا۔ پرہیز کرنا۔

صحبت رنداں سے واجب ہے حذر
جائے مے اپنے کو کھینچا چاہئے

اگلے شعر میں سمجھنا جاننا اور سمجھنا بمعنی سزا دینا اردو کے مشہور محاورے ہیں۔

چاہنے کو ترے کیا سمجھا تھا دل

بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے

بات بننا:- اور بات بنانا میں بظاہر تو "یک الف بیش" کوئی فرق نہیں لیکن دراصل دونوں میں بڑا بل ہے- پہلا تدبیر کارگر ہونا' کے اور دوسرا حیلے بہانے سے کام لینا کے معنی میں آتا ہے-

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

زہر اترنا:- یوں تو ایک مبارک فال ہے لیکن اگر رگ و پے میں اترنا کہیں تو سمجھ لیجئے کہ برا حال ہے-

رگ و پے میں جب اترے زہر غم تب دیکھئے کیا ہو
ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے

آنکھیں دکھلانا:- بھی اسی قبیل کا محاورہ ہے- اگر کوئی خوش چشم آنکھیں دکھلائے (دکھائے) تو سینکڑوں نظر باز نظارے کے لئے ٹوٹ پڑیں- لیکن اگر نگاہ عتاب بھی شامل ہو تو ہر کسی کا ٹھہرنا مشکل ہو-

منہ نہ دکھلاوے نہ دکھلا' پر بہ انداز عتاب
کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

پاک ہو جانا:- چھٹے ہوئے رند بن جانا-

رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

نیز پاک ہونا: حساب صاف ہو جانے اور جھگڑا فیصل ہونے کے معنی میں بھی آتا ہے-

صرف بہائے مے ہوئے آلات مے کشی
تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

راہ سخن وا ہونا:- گفتگو کا ڈھب پیدا کرنا-

جب تک دہان زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہ سخن وا کرے کوئی

اٹھا دینا:- نکال دینا- کسی جگہ سے اٹھانا بٹھانا کی ضد نیز مردے (جنازے) کو کاندھے پر لے کر چلنا-

زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے
دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

بھرم کھل جانا:- اعتبار جاتا رہنا-

بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے!

پچ آپڑنا:- ضد ہو جانا- بات کی لاج ہونا-

پچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

وقت پڑنا:- مصیبت آنا- ذیل کے شعر میں "سایہ" کے لفظ سے خاص فائدہ لیا ہے- کیوں کہ سائے سے وقت کا اندازہ کیا جاتا ہے-

اے پرتو خورشید جہاں تاب ادھر بھی
سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

آنکھ پڑنا:- حسرت یا رغبت سے نظر کرنا-

اک خوں چکاں کفن پہ کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

چور بننا:- چھپے چھپے پھرنا

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

متداول دیوان کے علاوہ نسخہ حمیدیہ میں بھی گلدستہ باندھنا (سجانا) آئینہ باندھنا (لگانا۔ رکھنا) وغیرہ ملتے ہیں جن میں فارسی کی تقلید صاف جھلکتی ہے-

ان محاورات سے قطع نظر' جو پہلے سے زبان پر رائج تھے' مرزا نے بکثرت نئے محاورات برتے ہیں جو ان کی مجتہدانہ طبیعت کی پیداوار ہیں اور جن میں سے اکثر کو قبول عام کی سند نہیں ملی- تاہم اس میں شک نہیں کہ وہ محاورے دوسرے شعراء کی طرح صرف محاورے کی خاطر نہیں لائے گئے بلکہ ان کو مرزا کے فن میں وہی حیثیت حاصل ہے جو ایک مشین میں اہم پرزوں کو حاصل ہوتی ہے انہوں نے سچ کہا ہے-

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

فضیل جعفری

کلام غالب میں شعری پیکر تراشی

ایک اشاراتی جائزہ

غالب کی وفات اور "اپالو 8" کی اڑان کا درمیانی عرصہ کچھ کم عرصہ نہیں۔ پورے سو برس۔ ان سو برسوں میں دنیا کی تاریخ اور جغرافیہ میں کیا کچھ تبدیلیاں رونما نہیں ہوئیں۔ ان سو برسوں میں انسانی زندگی نے کیا کچھ انقلاب نہیں دیکھے۔ بنی نوع انساں نے ایک دوسرے پر اپنی فوقیت جتانے اور اپنی قدرت کا اظہار کرنے کے لیے اس عرصے میں دو دو عظیم جنگیں لڑ ڈالیں۔ ملک تقسیم ہوئے۔ شہر اجڑے اور بسے۔ تاریخیں بنیں اور بگڑیں۔ سائنس اور علم نفسیات نے زندگی اور اس کے متعلقات کو از سر نو سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کی۔ تہذیب اور کلچر جیسے الفاظ کے معنی بدل گئے۔ ادبیات عالم کے معیار یکسر تبدیل کر دیے گئے' لیکن ان تغیرات زمانہ کے باوجود فن کاروں اور شاعروں میں سے کچھ نام اپنی اپنی جگہ پر پہاڑوں کی طرح اٹل رہے اور تغیرات کی آندھی انہیں اپنی جگہ سے ایک انچ بھی تو نہ کھسکا سکی۔ اگر ہم ادبیات عالم پر ایک اچٹتی سی نگاہ بھی ڈالیں تو شعری ادب میں ہمیں ہومر' ورجل اور شیکسپئر کے ساتھ ایک نام غالب کا بھی نظر آتا ہے۔ غالب جس نے ہر زمانے کی نئی شعری نسل کا زندہ ہم عصر کی طرح ساتھ دیا اور جس کا کلام آج بھی اسی طرح زندہ و تابندہ ہے جس طرح سورج ہر صبح طلوع ہونے کے باوجود پہلے جیسا ہی زندہ و تابندہ رہتا ہے۔ فی زمانہ جب کہ بیشتر نئے اذہان کے نزدیک جدیدیت ادب کا واحد معیار ہے اور سارے اردو ادب میں ایک انتہائی شدید غیر کلاسیکی اور غیر رومانی فضا پھیلی ہوئی ہے' غالب کی شاعری کا جادو نہ کم ہوا ہے' نہ پھیکا پڑا ہے۔ آج غالب اپنے بزرگوں (مثلاً" میر اور سودا)' اپنے ہم عصروں (مثلاً" ذوق اور مومن) اور اپنے چھوٹوں (مثلاً" اقبال اور جوش) کے مقابلے میں ہمارے ذہنوں سے زیادہ قریب ہیں۔ شاید اس لیے کہ آج کا دور غالب کے دور سے کئی لحاظ سے ملتا جلتا ہے۔ غالب کے دور کے مسائل خواہ وہ سماجی ہوں یا نفسیاتی' تہذیبی' کسی نہ کسی حد تک اسی نوعیت کے تھے' جو آج جدید شاعروں اور فن کاروں کا مقدر بن چکے ہیں۔ مرزا تفتہ کے نام ان کے ایک خط کا یہ اقتباس:

"مجھ کو دیکھو کہ نہ آزاد ہوں' نہ مقید' نہ رنجور ہوں' نہ
تندرست' نہ خوش ہوں نہ ناخوش' نہ مردہ ہوں' نہ زندہ'

جئے جاتا ہوں' باتیں کیے جاتا ہوں..... جب موت آئے گی' مر
رہوں گا۔ نہ شکر ہے نہ شکایت۔ جو تقریر ہے بہ سبیل
حکایت۔"

اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اس دور کے ذہنی و روحانی انتشار اور سماجی و سیاسی افراتفری کے تعلق سے غالب کا رد عمل تقریبا" ویسا ہی کچھ تھا جیسا فی زمانہ جدید شاعروں کا اپنے دور کے تعلق سے ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں' بلکہ اگر ہم ان باتوں سے الگ ہٹ کر خالص فنی اور شعری زاویے سے موجود شعری روایات کی روشنی میں غالب کی شاعری اور فن کا جائزہ لیں تو بھی ہمیں کسی موقع و محل پر غالب کے (بحیثیت شاعر) پرانے یا مورخ ہو جانے کا شبہہ تک نہیں ہوتا۔ شعری اور فنی لحاظ سے ہمیں نئی شاعری اور غالب کی شاعری میں خاصی گہری مماثلت نظر آتی ہے۔ یہاں میں اس سلسلے میں صرف ایک پہلو کی طرف اجمالی اشارہ کرنا چاہوں گا۔ نئی شاعری سے دلچسپی رکھنے والے ناقدین و قارئین کے لیے اب یہ بات راز نہیں رہ گئی کہ نئی شاعری میں علائم اور استعاروں کے علاوہ شعری پیکر کم و بیش ریڑھ کی ہڈی کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ غالب کے سامنے نہ تو کسی ازرا پاونڈ کا یہ قول تھا کہ "ضخیم ضخیم کتابوں کی تصنیف کے مقابلے میں ساری زندگی میں صرف ایک پیکر کی تخلیق زیادہ اہم کام ہے۔" اور نہ ہی انہیں کسی گراہم ہاؤ Graham Hough نے یہ سمجھایا تھا کہ "شعری پیکر اور علائم ہی پیچیدہ جذبات کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہیں۔" لیکن ہمیں غالب کی شاعری میں جگہ جگہ خوبصورت اور تاثر سے بھرپور شعری پیکر جگمگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ بالکل ویسے ہی ہے جیسے شیکسپئر کے زمانے میں اگرچہ شعری پیکر' علائم یا استعاروں کی کوئی باقاعدہ تھیوری موجود نہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس کے ڈراموں اور اس کی شاعری میں یہ خصوصیات بدرجہ اتم ملتی ہیں۔ غالب چونکہ ایک ذہن جدید کے مالک تھے' اس لیے فطری طور پر ان کی شاعری اپنے زمانے سے بہت آگے تھی اور ان کی شاعری کی قدر و قیمت متعین کرتے وقت ہم شعری پیکر تراشی یا علائم و استعارہ کو کسی بھی طرح نظرانداز نہیں کر سکتے۔ شعری پیکر جیسا کہ ڈے۔ لیوس نے اپنی مشہور کتاب The Petic Image میں کہا ہے' دراصل وہ لفظی تصویریں ہیں جنہیں حروف بناتے ہیں۔ کبھی کبھی کسی تلمیح یا تشبیہ یا استعارہ کے ذریعے بھی شاعر شعری پیکر کی تخلیق کرتا ہے۔ علاوہ ازیں بعض اوقات شعری پیکر کی تشکیل ایسے فقروں یا جملوں سے بھی ہوتی ہے جو بظاہر تو بیانیہ معلوم ہوتے ہیں' لیکن جو معنی کے اعتبار سے ہمارے تخیل کو زیادہ گہری معنویت اور دور رس تاثرات سے دو چار کرتے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شعری پیکر کسی نہ کسی سیاق و سباق میں بڑی حد تک ہمارے ذہنوں تک الفاظ کا استعاراتی تاثر منتقل کرتے ہیں۔ غالب نے چونکہ حیات و کائنات کا مطالعہ ہر پہلو سے کیا تھا۔ اور ان کے تجربات و مشاہدات کا کوئی اور چھور نہ تھا' اس لیے ان کے پاس Abstract خیالات و احساسات کا ایک ایسا سلسلہ لامتناہی تھا' جس کا بہتر اظہار پیکر کی مدد ہی سے کیا جا سکتا تھا۔ اگر ہم کلام غالب کا ایک سطحی جائزہ بھی لے ڈالیں تو ہم بہ آسانی اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ غالب کی شاعری میں بصارتی۔ سماعی' احساساتی اور استعاراتی ہر طرح کے پیکر خاصی بڑی تعداد میں مل جاتے ہیں۔ غالب نے پیچیدہ انسانی جذبات اور نفسیاتی کیفیات

کے اظہار کے لیے جابجا فن پیکر تراشی کا سہارا لیا ہے۔ اگر ہم غالب کے ان اشعار کا مطالعہ کریں۔

موجہ گل سے چراغاں ہے گذر گاہ خیال ہے تصور میں زبس جلوہ نما موج شراب

ثابت ہوا ہے گردن مینا پہ خون خلق لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر

تو اور آرائش خم کاکل میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

تو پہلی نظر میں ہمیں ان اشعار میں استعمال شدہ شعری پیکر بہت زیادہ چونکانے والے یا متحیر کر دینے والے نہیں معلوم ہوتے بلکہ موضوعات کے لحاظ سے یہ مناسب ترین اور عام فہم شعری زبان کا حاصل معلوم ہوتے ہیں' لیکن قاری جیسے جیسے ان اشعار کا بہ نظر غائر مطالعہ کرتا ہے اور ان پر غور کرتا ہے تو اس کے دل و دماغ میں انبساط آمیز تحیر کی پرتیں ایک ایک کر کے کھلتی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض پیکر (مثلاً خم کاکل اور زخم جگر وغیرہ) بے حد روایتی ہونے کے باوجود غالب کے ان اشعار میں ایک بالکل ہی نئی اور انوکھی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ یہ ہمیں نہ صرف سوچنے پر بلکہ متذکرہ اشیاء کے داخلی جوہر کی تلاش و دریافت پر اکساتے ہیں اور شعر کے تخلیقی عمل میں ہمیں شاعر کا شریک سفر بناتے ہیں.....

علاوہ ازیں ہمیں غالب کے یہاں خاصی بڑی تعداد میں ایسے اشعار مل جاتے ہیں' جن میں ہمیں بصارتی پیکر کا بے حد جاندار اور بے حد مناسب استعمال ملتا ہے۔ ان شعری پیکروں کا یہ استعمال محض کوئی حادثہ یا اتفاقی بات نہیں' بلکہ ایسا لگتا ہے کہ غالب نے شعوری طور پر اپنے مشکل خیالات اور پیچیدہ جذبات و تجربات کو زیادہ سے زیادہ ٹھوس انداز میں قاری تک منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

بوئے گل' نالہ دل' دود چراغ محفل جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

باغ پاکر خفقانی' یہ ڈراتا ہے مجھے سایہ شاخ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ اے نالہ! نشان جگر سوختہ کیا ہے

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

مجبوری و دعوائے گرفتاری الفت دست تہ سنگ آمدہ پیمان وفا ہے

درد دل لکھوں کب تک جاؤں انکو دکھلاؤں انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

کھینچے بیاں سرور تپ غم کہاں تلک ہر مو مرے بدن میں زبان سپاس ہے

ان اشعار میں کبھی پہلے مصرع میں اور کبھی دوسرے مصرع میں جو لفظی تصویریں ملتی ہیں' وہ صرف بصارت سے تعلق رکھنے والی جمالیاتی حس کو محظوظ و مطمئن نہیں کرتیں' بلکہ ان لفظی تصویروں کا شعری عمل اس سے کہیں زیادہ پہلو دار اور معنی خیز ہے۔ ان میں سے ہر پیکر خواہ وہ فگار انگلیاں ہوں یا دود چراغ محفل' پڑھنے والے پر گنجینہ معنی کا طلسم آشکار کرتا چلا جاتا ہے۔ "دست تہ سنگ آمدہ" جیسے ٹکڑے شعری پیکر تراشی کے فن میں غالب کی خلاقانہ قوتوں کے مظہر ہیں کہ ان کے ذریعے سے اختصار کے ساتھ اور موثر طور پر وہ بات کہہ دی ہے جسے کہنے

کے لیے اور اس موثر انداز میں کہنے کے لیے بیسیوں صفحات بھی ناکافی ہوتے' یہ پیکر عشق اور عاشق کی نفسیات اور اس کے تمام تلازمات کا اظہار کچھ اس انداز میں کرتا ہے کہ پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اسی طرح۔

"لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں"

ہمارے سامنے غالب کے جیتے جاگتے' شوخ اور کٹیلے معشوق کو لا کھڑا کرتا ہے۔

آخر میں میں کلام غالب میں استعاراتی اور احساساتی پیکر کی چند مثالیں پیش کرنی چاہوں گا۔

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے نے ہاتھ باگ پر ہے' نہ پا ہے رکاب میں

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا نہ کبھی جنازہ اٹھتا' نہ کہیں مزار ہوتا

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر ہم اس کے ہیں' ہمارا پوچھنا کیا

نے گل نغمہ ہوں نہ پردہ ساز میں ہوں اپنی شکست کی آواز

نقش قیس کہ ہے چشم و چراغ صحرا گر نہیں شمع سیہ خانہ لیلیٰ نہ سہی

مندرجہ بالا تمام اشعار کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان میں موجود شعری پیکر قاری کو لغوی اور لفظی معنی سے آزاد کرا کے اسے استعاراتی معنی کی وسیع ترین کائنات میں پہنچا دیتے ہیں۔ یہاں ہمیں اگر ایک طرف "دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر" میں پورا فلسفہ وحدت الوجود سمویا ہوا ملتا ہے' تو دوسری طرف "رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے" جیسے مصرعوں میں حیات و کائنات کی بے ثباتی اور اس سے انسانی زندگی کا رشتہ اور اس کا رد عمل سبھی چیزیں بحسن و خوبی متعارف کرائی گئی ہیں۔ ان اشعار کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں لفظی پیکر فوراً" ابھر کر سامنے نہیں آتے' بلکہ شعر کو پڑھ کر ہمیں پہلے یہ محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارے احساسات و خیالات کے گہرے سمندر میں کسی نے کنکر پھینک دیا ہے اور لہریں چھوٹے چھوٹے دائرے بناتی چلی جا رہی ہیں۔ یہی دائرے آگے چل کر واضح تصویروں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان اشعار میں پیکر تراشی ہماری سوچ کو مہمیز لگاتے ہیں اور پھر تصویر بناتے ہیں غالب کی شاعری میں شعری پیکر تراشی کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ انہوں نے اس سلسلے میں پیکر تراشی کی کسی ایک مخصوص جہت Pattern کو نہیں اپنایا اور نہ ہی وہ اس سلسلے میں کسی ایک مخصوص و محدود اصول پر کاربند رہے ہیں' بلکہ انہوں نے حسب ضرورت اپنی بات کو بہتر سے بہتر انداز میں قاری تک پہنچانے کے لیے پیکر تخلیق کرتے ہوئے مختلف قسم کی تبدیلیوں (Variations) سے کام لیا ہے اور یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے۔

زیر نظر مضمون غالب کے فن پیکر تراشی کا یقیناً" ایک ناکمل اور تشنہ مطالعہ ہے' لیکن اگر نقادان کرام کلام غالب کے اس پہلو نیز دیگر لسانی تکنیکی پہلوؤں کی طرف توجہ دیں تو غالبیات میں مزید اضافے کی ابھی گنجائش ہے۔

☆ ☆

آل احمد سرور

غالب کی شخصیت

ادب شخصیت کا جلوہ بھی ہے اور پردہ بھی شخصیت ادب میں بجنسہ ظاہر نہیں ہوتی۔ اول تو یہ کچھ پھیل کر ظاہر ہوتی ہے دوسرے اسے فن کے اداب کو قبول کرنا پڑتا ہے پھر بھی شخصیت کی کرامت ہی سے شعرو ادب میں انفرادیت اور انوکھا پن پیدا ہوتا ہے۔ میر کی داغ' داغ شخصیت سے ان کا کلام وردمند انسانیت کی ایک آواز بن جاتا ہے۔ غالب اپنے داغوں سے ایک سروچراغ کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ یہ شخصیت خلاء میں وجود نہیں پاتی اس کے پیچھے موروثی خصوصیات' گھریلو تربیت طفل کی زندگی کی محرومیاں اور سرشاریاں' جوانی کے خواب اور خیال' سماجی تحریکات کی لہریں جسم کی تشنگی اور روح کی سیرابی سب کا ایک کارواں ہوتا ہے ہر فنکار کی شخصیت اس کے فن پر اثر انداز ہوتی ہے اور فن کے عرض میں شخصیت کا جوہر تڑپاتا رہتا ہے شخصیت کے متعلق علم سے فن کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے میں مدد ملتی ہے' مگر یہ علم کافی نہیں ہے جب تک ہم فن کی تاریخ اس کی روایات اور اس کے امکانات پر بھی نظر نہ رکھیں فن کا وجود شخصیت کا مرہون منت ہے مگر یہ شخصیت سے علیحدہ بھی اپنا ایک آزاد مقام حاصل کرلیتا ہے جس میں اس دور کا ذہن اس کے احساسات و جذبات اس کے میلانات و رجحانات آجاتے ہیں فن میں فرد ایک انجمن بن جاتا ہے قطرے میں ساز انا لجر کی گونج سنائی دیتی ہے آپ بیتی جگ بیتی ہو جاتی ہے ایک تجربہ زندگی کے نتیجہ خیز تجربات کا ایک خزانہ بن جاتا ہے فن کار کے افسانہ و افسوں زندگی کے حقائق کی توسیع کرتے ہیں اور انسانی ذہن زیادہ زرخیز' زیادہ بصیرت افروز اور زیادہ ہمہ گیر اور ہمہ جہت ہو جاتا ہے شخصیت کا آئینہ فن کے بہت سے آئینوں میں سے ایک ہے اس کے علم کے بغیر ہمیں فن کے آئینہ خانے میں بار نہیں ملتا اس کی مدد سے غالب کی فکر روشن کے بہت سے پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں ان کے فن میں روشنی اور سایہ کا تناسب سمجھ میں آجاتا ہے اس کی تربیت سے تنظیم اس کی تہذیب و شائستگی اس کی عبارت اشارت ادا کا راز معلوم ہوتا ہے غالب کی شخصیت کا علم وہ کنجی ہے جس کے بغیر ان کے فن کے بت خانے میں بار نہیں مل سکتا اور اس کے حسن کا عرفان نہیں ہو سکتا ان کی شخصیت یکرنگ نہیں بلکہ جامع ہے اس میں ذات کے علاوہ کائنات کا بھی جلوہ ہے اس لیے دوسرے شعراء سے زیادہ غالب کی شخصیت کا مطالعہ ان کے فن کی عظمت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

غالب کی شخصیت میں سب سے پہلے ایک توانائی اور برتری کا احساس ہوتا ہے۔ غالب کو اپنے حسب و نسب پر فخر تھا انہیں فطرت سے ایک تندرست جسم اور زندگی کی ایک پیاس ملی تھی۔ ان کی ابتدائی زندگی رنگ رلیوں میں گزری باپ دادا کی تلوار ان کے یہاں آکر نشتر سخن' بن گئی مگر سپاہیانہ بانکپن باقی رہا۔ نوعمری کی زندگی رنگین بھی تھی اور فارسی میں مہارت تامہ کی وجہ سے ذہن پر جلا کرنے والی بھی۔

ہر ادیب و شاعر زخم خوردہ ہوتا ہے اس زخم کی خلش اسے تڑپاتی ہے یہی خلش پوری زندگی کو ایک

داستان درد بنا دیتی ہے۔ عام شخصیتیں زندگی کی سختیوں سے سستے داموں صلح کرلیتی ہیں۔ شاعرانہ شخصیتیں یا زخم خوردہ شخصیتیں آسانی سے قابو میں نہیں آئیں جو تخیل ان کی دولت ہے اور جو زخم ان کی امانت ہے اس کے سہارے انہیں جو آزادی و بلندی حاصل ہے اسے روزمرہ زندگی کے مفاہموں اور لین دین کے حوالے نہیں کرنا چاہتیں اس کش مکش سے جو درد و محرب حاصل ہوتا ہے جو خون کے آنسوں ٹپکتے ہیں جو روح کی فریاد بلند ہوتی ہے وہی ان کا انعام ہے کیونکہ زندگی بالاخر ان سے صلح کرلیتی ہے جو خود اس سے صلح کرنے کو تیار نہیں ہوتے جو آنکھ بند کرکے اس کے پیچھے نہیں ہو لیتے وہ ان کے پیچھے ہو لیتی ہے غالب نے اس فاتحانہ جذبہ کا اظہار ان اشعار میں کیا ہے۔

ہر سنگ خشت ہے صدف گوہر شکست
نقصان نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی
نفس قیس کہ ہے چشم و چراغ صحرا
گر نہیں شمع سیہ خانہ لیلیٰ نہ سہی
رہا آباد و عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے
زمانہ سخت کم آزار ہے بجان اسد
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

غالب کے یہاں سے یہ فاتحانہ جذبہ نہیں ہے بلکہ' رزم گاہ حیات کی پوری داستان ہے ان کی شخصیت کی دلفریبی کی وجہ یہ ہے کہ اس میں شکست وفتح طربیہ والمیہ نغمہ و نالہ سب کا احساس ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے ان کا کام ایک جام جہاں نما معلوم ہوتا ہے۔

توانائی اور احساس برتری نے غالب کو وضع داری سکھلائی شروع کے عیش و نشاط اور شباب میں محرومیوں نے انہیں سہانی مگر دلدوز یادیں عطا کیں چنانچہ غالب کی ابتدائی شاعری میں ان کے فردوس تخیل کی بہاریں ہیں رنگ بہار ایجادی بیدل کا دلدادہ خیال پرست ہے اور اس لیے رومانی ہے وہ زندگی کی بے رحم تلواروں کے لیے سنہرے خیالوں کی ایک سپر بنالیتا ہے۔

فریب صنعت ایجاد کا تماشہ دیکھ
نگاہ عکس فروش و خیال آئینہ ساز
ہوں گرمی نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن ناآفریدہ ہوں

کچھ شخصیتیں درون بیں ہوتی ہیں' کچھ بیرون بین۔ غالب درون بینی سے چلے تھے مگر ان کا گمان یہ ہے کہ وہ صرف اپنے خیالوں کی دنیا میں رہ سکے انہوں نے اپنے گریبان سے سر نکالا اور چشم تنگ کو کثرت نظارہ سے واکیا

ان کی خیال پرستی زندگی کی تجلی ترجمانی بن گئی۔ یہ انقلابی تبدیلی کئی باتوں کی وجہ سے وجود میں آئی دہلی کی بزم میں کوئی بڑی روشنی نہ تھی ہر شمع مضمحل تھی عقائد کے بندے افکار و حوادث کے سیلاب کو نہ روک سکتے تھے مغربی علم و فن کے نقوش پھیل رہے تھے مغربی تہذیب کے اثرات نمایاں ہونے لگے تھے مشرق مغربی سیلاب کے سامنے سمٹا سکڑا روحانیت کے قلعہ میں محصور پرانی یادوں کا جادو جگانے میں ناکام ہو رہا تھا۔ غالب کچھ اپنے حق کو من مانی کی خاطر کچھ ہاتھ پاؤں مارنے کی عادت سے مجبور ہو کر کلکتہ کے سفر کو نکلے اس سفر نے ان کی خیال پرستی کو حقائق شناسی میں بدل دیا۔ وہ وہاں سے ایک صحت مند تشکیک لے کر آئے۔ آزاد مشرقی و ذہنی آئینے کو ایک فکری رجحان یا میلان مل گیا وہ لکیر کے فقیر تو پہلے بھی نہ تھے انہوں نے اپنی کسی محرومی کو اپنا مقدر نہ سمجھا تھا وہ توڑنے والے اور لڑ کر اپنا حق حاصل کرنے والے تھے مگر اس سفر میں انہیں مادی حقائق کی اہمیت کا احساس ہوا۔ مذہب و ملت سے بلند انسانیت کا ایک شعور پیدا ہوا۔ دنیا کے ہنگاموں میں ایک معنی و مقصد نظر آیا۔ اب تک وہ اپنے لیے کہتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے میرے عالم تقریر کا
نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اب انہیں اپنی بصیرت کو عام کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ انسانی نفسیات کے سربستہ راز فاش کرنے لگے عقائد و تصورات کے بتوں پر وار کرنے لگے۔ تفریحاً نہیں۔ ایک زیادہ تسکین بخش عقیدے کی تلاش میں۔ تصوف ان کے زمانے تک فلسفے کا کام دیتا تھا۔ انہوں نے مسائل تصوف بھی بیان کیے مگر اس طرح کہ ان میں زندگی کی کوئی کرن آ جائے ہاں معاصرین سے معرکوں نے ان کے لہجے میں ایک فریادی کیفیت بھی پیدا کر دی ہے انہیں افسردہ و ملول بھی کیا ہے مگر سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کی بصیرت نے ان کے تخیل کو اس طرح جلا دی کہ ان میں ایک حکیمانہ نکتہ سنجی اور شوخی آگئی۔ اس شوخی نے انہیں رنج و راحت تلخی و مستی کو ہموار کرنا سکھایا۔ اور اس نے انہیں حسن و عشق، حیات و کائنات، مذہب و فلسفہ مشرق و مغرب کے متعلق ایک تازہ کار و تازہ خیال نظر عطا کی۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت ہے لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہو
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آتے ہیں
ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے
آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد

مجھ سے میرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

وفاداری بشرط استواری عین ایمان ہو
مرے بتخانہ میں تو کعبے میں گاڑو و برہمن کو

غالب کے مزاج میں ایک نرگیست تھی انہوں نے عشق بھی کیا ہے مگر دراصل وہ اپنے آپ عاشق تھے یہ ان کی بڑائی کی دلیل ہے کہ ان کی نرگیست کم ہو کر ایک انانیت رہ گئی اور یہ انانیت ایک نظر بن کر تہذیبی قدر بن گئی۔ غالب کے تخیل نے زندگی کے ہر فن کو ایک استعارہ بنا لیا ہے۔ اور استعارے کے نقاب میں شوخی کی کرنیں پیدا کیں غالب کی شخصیت کی سب سے نمایاں صنعت اس طرح ان کی شوخی بن جاتی ہے جو کبھی حسن تخیل بن کر کبھی ادائے رندانہ بن کر کبھی ایک عارف کے تبسم زیر لب میں اور کبھی ایک زندگی کے سپاہی کی طنز تلوار میں رونما ہوتی ہے یہ مومن کی شوخی سے زیادہ بزرگ و برتر ہے۔ مومن کی شوخی میں ایک مہذب عاشق کا احساس برتری ملتا ہے۔ وہ جب سیدھی طرح اپنا مطلب نکلتا نہیں دیکھتا تو طنز کے نشتر سے محبوب کی بے نیازی کا اور حسن کا سادہ لوحی کا علاج کرتا ہے۔ غالب کی شوخی چونکہ ذات سے کائنات تک پھیلی ہوئی ہے اس لیے ایک سماجی اور تہذیبی قدر ہے۔ غالب کی شخصیت کے اثر سے ان کا فن زندگی کا عرفان اور آنے والے تغیرات و انقلابات کی پہچان سکھاتا ہے اور اس طرح قدیم سے جدید تک پہنچنے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ غالب کی تکنیک نہ ہوتی تو ہمیں سرسید اور حالی کا نیا یقین نہ ہوتا۔ غالب نے اپنے زمانے کے ذہن کو جدید تصورات کے ہم آہنگ ہونے کے قابل بنایا۔ اس لیے غالب اپنے دور میں خواص میں ایک حد تک مقبول ہونے کے باوجود بڑی حد تک اجنبی تھے کیونکہ وہ دور رس حقائق اور نتیجہ خیز حقائق میں فرق آسانی سے نہیں کر سکتا تھا۔ ناسخ اور ذوق کی مقبولیت اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے غالب نے ایک بڑے بلیغ شعر ہی میں اپنی پوری زندگی اس طرح سمو دی ہے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

روح کی یہ پیاس غالب کی شخصیت کی ایک اور بڑائی ظاہر کرتی ہے۔ غالب اپنی شخصیت کی ساری شراب فن کے آبگینوں میں نہ بھر سکے۔ ان کا آبگینہ ہمیشہ تندی فضا سے چھلکتا رہا۔ انہوں نے تنگنائے غزل کو بھی بقدر شوق نہ پایا۔ چنانچہ انہوں نے قصیدے بھی لکھے مثنویاں بھی رباعیاں بھی اور قطعے بھی، فارسی میں بھی اور اردو میں بھی پھر انہوں نے فارسی میں اور اردو میں دیباچے لکھے خط تاریخ خود نوشت حالات سب کچھ لکھا۔ اردو میں غالب اور اقبال دو کی شخصیتیں ہی ایسی ہیں جو اپنی تصانیف کا بے روح قالب نہیں معلوم ہوئیں بلکہ جو ان سے بڑی اور بزرگ اور تابناک تر نظر آتی ہیں۔ غالب نے زندگی سے اتنا کچھ حاصل کیا تھا کہ وہ اس کے متعلق نظم ہو یا نثر خط ہوں یا بے تکلف بات چیت بہت کچھ کہہ سکتے تھے پہلے ان کی شاعری بھی ایک طرح کی خود کلامی تھی پھر یہ ابلاغ Communication بن گئی۔ مگر بڑھاپے میں جب غدر کی چیرہ دستیوں، مالی پریشانیوں اور بیماریوں نے انہیں مضمحل کر دیا تو وہ خطوط کے ذریعہ سے زندگی کی لہریں سمیٹتے بھی رہے اور انہیں نشر بھی کرتے رہے۔ دوسروں کی

کمزوریاں' دنیا کے نشیب و فراز پر انہیں ہنستے ہنستے اپنے اوپر بھی ہنسنا آ گیا۔ یہی مزاج کی حس اعلیٰ درجہ کی ذہنی صلاحیتوں کو ظاہر کرتی ہے۔

غالب نے جہاد کیا نہ شہادت حاصل کی ان کی شخصیت میں کردار کی بلندی اور عظمت نہیں ہے۔ ان کا اپنا ایک حسن ہے۔ وہ نہ فرشتہ تھے نہ شیطان۔ وہ موقع محل کو پہچانتے تھے جو لوگ ان کی قدر کرتے تھے ان سے کم ظلا بھی جانتے تھے۔ وہ عملی بحث میں گھبرا کر جلی کٹی باتیں بھی کہہ دیتے تھے وہ ہمارے جاگیردارانہ تمدن کی آخری شمع تھے۔ مگراس کے نظام اخلاق کو پوری طرح برتنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے۔ وہ ان دیوتاؤں میں سے تھے جن کے مٹی کے پاؤں فوراً نظر آ جاتے ہیں۔ انہوں نے جو خط لکھے ہیں ان میں کوئی نقاب نہیں ہے مگر انہیں خطوط کی وجہ سے وہ ماضی کی بھول بھلیوں سے نکل کر ہدایت کی روشنی میں آ گئے ہیں۔ حالی نے ٹھیک کہا ہے کہ خسرو اور فیضی کے بعد کوئی ایسا جامع حیات آدمی ہند کی سرزمین سے نہیں اٹھا۔ اس جامع و تخیلی نظر نے غالب کے فکر و فن میں بھی بڑائی اور دلکشی پیدا کر دی ہے۔ ان کی بیدار شخصیت نے ان کی نظم و نثر کو بھی ہزار داستان بنا دیا ہے وہ صراحی ہے جس سے برابر شراب ناب چھلکتی رہی مگر یہ صراحی آخر دم تک خالی نہیں ہوئی غالب سے پہلے لوگ مروجہ افکار کے سانچے میں اپنی شخصیت کو ڈھالتے تھے غالب نے اپنی شخصیت کے سانچے میں اپنے دور کے جذبات و خیالات کو ڈھالا بقول حالی

لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھٹھوں
سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

ان کی شخصیت میں بڑی دلیری اور دل آویزی ہے یہ دیر تک اور دور تک رفاقت کر سکتی ہے اور اس کی تاب و توانائی سے ہمیں بھی روشنی اور طاقت ملتی ہے ان کی مہذب انانیت اور ان کا شائستہ اعتماد ان کے فن کو صحت مند اور ان کی روایات کو قابل قدر بناتا ہے اور شعر و ادب ان کے اثر سے زندگی کے ہر پیچ و خم کا ساتھ دینے لگتا ہے اگر یہ جن قابو میں آ جائے تو اس سے زندگی کی تہذیب و تنظیم میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔

غالب نے اپنی انفرادیت کو کچلا نہیں اسے ترفع سکھایا غالب نئے خیالات و افکار کو قبول کر سکتے تھے۔ ان میں احساس کمتری پیدا نہیں ہوا۔ ہاں رنج محرومی انہیں ضرور ستاتا رہا۔ یہ معمولی بات نہیں بڑے بڑے علماء اہل فن اور صاحب نظر ان کے معترف تھے پھر ان کے حلقہ میں ہر رنگ' ہر وضع ہر طرح اور ہر خیال کے لوگ تھے۔ غالب کے خطوط پر نظر ڈالئے تو معلوم ہو گا وہ دنیا بھر کے حالات معلوم کرنا چاہتے تھے۔ ہر واقعہ اور حادثہ پر نظر رکھتے تھے شہر اور دوسرے مقامات کی خبریں انہیں فوراً معلوم ہو جاتی تھیں وہ ان میں اپنے مفاد کا پہلو بھی ڈھونڈتے تھے مگر انہیں دنیا اور دنیا والوں سے دلچسپی برابر رہی زندگی کی یہ پیاس' مزاج کی یہ شوخی۔ ذہن کی یہ لالہ کار خصوصیت نظم ہو یا نثر فارسی ہو یا اردو و غالب کی برابر رفیق رہی اس کی وجہ کے بغیر کسی عقیدے' مسلک یا نقطہ نظر کے سہارے کے اپنے ہی بل بوتے پر یہ شخصیت ہمارے لئے کتنی اور قدر و منزلت رکھتی ہے۔ "لگ ہر خار" شاخ گل ہو یا نہ ہو یہ باغبانی صحرا میں لگی رہی اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

فتح محمد ملک

غالب کے بغیر

اردو ادب میں افادیت کے سب سے پہلے علمبردار حالی نے غالب کی موت پر زار زار رونے اور ہائے ہائے کرنے کے باوجود یہ اعلان کرنا ضروری سمجھا کہ غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں؟ غالب کا نہایت عمدہ اور دل گداز مرثیہ لکھنے کے بعد جب حالی اس عقیدت کی عقلی بنیادیں تلاش کرنے نکلے تو انہیں "غالب کی زندگی میں شاعری اور انشاپردازی کے سوا کوئی بڑا اور مفید کام نظر نہ آیا۔" "یادگار غالب" معذرت کے ساتھ پیش کی گئی اور اس کے "دیباچہ" اور "خاتمہ" میں بار بار اعتراف کرتے بنی کہ غالب کی "ذات سے قوم کو کوئی براہ راست فائدہ نہیں پہنچا۔" اور یہ کتاب ("کہ عقل کی صوابدید" کی بجائے "معتقدانہ جوش عصبیت" اور "دوستوں کے تقاضوں" سے وجود میں آئی ہے) "ان تصنیفات میں شمار نہیں ہو سکتی جن کی آج کل ملک میں ضرورت سمجھی جاتی ہے"----

یہ اس زمانے کی بات ہے جب بلاد اسلامیہ ہند کو برطانوی ہند کے نام نامی سے منسوب ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا مگر انگریزوں کے زیر اثر ایک نو آبادیاتی ذہنیت تیزی سے تشکیل پا رہی تھی۔ علم و ادب کی دنیا میں اس ذہنیت کے پہلے پہل حالی اور ان کے پاسبان عقل سرسید کے ہاں ظہور پایا۔ حالی کی ابتدائی تربیت تہذیب فن کے قدیم اصولوں پر ہوئی تھی۔ اس لئے پہلی نظر میں تو انہیں غالب کی شاعری سرمایہ افتخار نظر آئی اور زندگی مرقع عبرت۔ مگر بے تہ عقلیت پسندی اور سطحی افادیت پرستی کے نئے معیاروں کی روشنی میں جب انہوں نے زندگی اور فن پر دوسری نظر ڈالی تو "یادگار غالب" کی افادیت کے بارے میں تذبذب میں پڑ گئے ____ جب سے لے کر اب تک ہم گومگو کی اس کیفیت سے نجات نہیں پا سکے۔ یہ اسی کا شاخسانہ ہے کہ ہنوز نو آبادیاتی طرز فکر و احساس کی آبیاری میں مشغول دانشوروں کو غالب کی فنی عظمت کا اعتراف ہے مگر غالب کو اپنا شاعر کہنے میں تامل ہے۔ حالانکہ غالب کا عالمگیر قد و قامت اپنے مخصوص تہذیبی گرد و پیش سے زندہ تعلق اور دلیرانہ تصادم ہی کا عطیہ ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے لفظوں میں "اگر غالب ہمارا نہیں ہے تو ہم اپنے ہی نہیں اس لئے کہ غالب کے بغیر ہماری فکری تاریخ کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے اور ہماری تہذیبی معنویت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔"

غالب ہماری فکری اور تہذیبی تاریخ کے اس نازک مرحلے پر نمودار ہوئے۔ جب ہمارے ذہن میں قرون وسطیٰ کے دھندلکوں سے عہد جدید کی روشنیوں کی طرف قدم بڑھانے کی کشمکش برپا تھی۔ تاریخی اور تہذیبی ماحول کی نسبت سے غالب کی فنی اور فکری نشو و نما کا خیال کرتا ہوں تو مجھے غالب کے کارنامہ فن اور ان کے ہم عصر علمائے دین کی

اصلاحی اور انقلابی جدوجہد میں ایک خاص ربط نظر آتا ہے۔ اس اعتبار سے غالب کی شاعری اس عہد کے ہندی مسلمان کے اجتماعی دینی اور سیاسی فکر و عمل کا فنی اور جمالیاتی تکملہ ہے بے شک غالب طبقہ امراء میں سے تھے۔ ان کی زندگی کے بادی آورش ہمیشہ طبقہ امراہی سے وابستہ رہے اور عملی جدوجہد انگریزوں' ابو ظفر بہادر شاہ اور نوابان رامپور سے ستائش کی تمنا اور صلے کی پروانگی تک محدود رہی۔ لیکن یہ ان کی زندگی کا محض خارجی رخ ہے۔ غالب کی اندرونی زندگی کی شادابی اور شاعرانہ شخصیت کی توانائی اور دلکشی کا سرچشمہ علمائے حق کی تحریک اصلاح و جہاد میں ہے بجاکہ اس تحریک سے غالب کی دلچسپی بظاہر علمی بحث و تمحیص تک محدود رہی لیکن وہ اپنی صورت حال کو حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت حال کے مماثل سمجھا کئے۔

قید میں یعقوبؑ نے لی گو نہ یوسفؑ کی خبر لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

نہ چھوڑی حضرت یوسفؑ نے یاں بھی خانہ آرائی سفیدی دیدۂ یعقوبؑ کی پھرتی ہے روزن پر

مولانا حالی کا کہنا ہے کہ غالب "احکام ظاہری کے بہت کم پابند تھے لیکن مسلمانوں کی ذلت کی کوئی بات سن پاتے تے تو ان کو سخت رنج ہوتا تھا" ___ مسلمانوں کی ذلت کی باتیں آئے دن سننے میں آتی ہوں گی' اس لئے کہ جن زمانے میں غالب تعلیم و تربیت کے ابتدائی مراحل میں تھے ہندی مسلمانوں کا سیاسی اور اخلاقی زوال اپنے آخری مراحل میں تھا۔ غالب کی ذاتی زندگی میں خاندانی وقار کو برقرار رکھنے کی عملی کوششیں بھی پے در پے پسپائیوں اور ذلتوں سے دو چار ہوتی رہیں۔ ذاتی اور اجتماعی ذلت کا یہ احساس ہی غالب کے ہاں شاعرانہ تجسس اور فکری تشکیک کے امکانات روشن کرتا ہے!

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

غالب کو جہاں اپنی خاندانی عظمت پر ناز تھا وہاں یہ احساس بھی تھا کہ "اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن۔" ان کے بزرگ مغلوں' مرہٹوں' سکھوں اور انگریزوں میں سے ہر ایک کے ساتھ تھوڑی دور چلنے اور ان میں سے کسی ایسے رہبر کو بچاننے میں کوشاں تھے جو ان کی جاہ و حشمت کو برقرار رکھ سکے مگر غالب کی تیز بیں نگاہوں کے سامنے زمین سے آسمان تک سوختن کا باب ا۔ پیشہ آبا سپگری تھا مگر غالب تک پہنچتے پہنچتے تلوار ٹوٹ چکی تھی غالب کا اپنا پیرایہ بیان مستعار لیا جائے تو غالب نے اپنے آباو اجداد کی ٹوٹی ہوئی تلوار کو قلم بنالیا اور سیاسی انتشار اور تمدنی زوال کے سامنے سینہ سپر ہو گئے۔ ابتدائی دور میں غالب کا متاخرین شعرائے فارسی اور خصوصاً بیدل کی طرف متوجہ ہونا مشکل پسندی کی وجہ سے ہے' نہ کجروی کی بنا پر' بلکہ بیدل کے محرکات شعری اور غالب کی اندرونی زندگی کے مطالبات میں ایک گونہ مماثلت کے باعث ہے۔ بقول ڈاکٹر خورشید الاسلام "بیدل زوال کو روکنے کی کوشش میں سر گرم دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا مقصد مسلمانوں کی حکومت کو برقرار رکھنا ہے اور وہ ان جماعتوں کو بری نگاہ سے دیکھتے ہیں جو مغلوں کی حکومت میں رخنہ پیدا کر رہی ہیں۔" چونکہ غالب زوال کو سمجھنے اور روکنے کے جذبے سے متاخرین شعرائے فارسی کی طرف متوجہ ہوئے تھے اس لئے غالب نے ان شعرا سے فنی اکتساب پر ہی قناعت نہ کی بلکہ مذہب و

تصوف میں اصلاح و تجدید کی ان سرگرمیوں سے بھی تخلیقی روابط قائم رکھے جن کا مقصد ہندی مسلمانوں کے سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی زوال کو روکنا اور اسلام کی اصل اور قدرتی سادگی کو از سرنو دریافت اور رائج کرنا تھا۔

بیدل کی وفات سے پہلے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سن بلوغ کو پہنچ چکے تھے جنکی تحریک اصلاح غالب کے سن بلوغ، تک پہنچتے پہنچتے سید احمد بریلوی کی تحریک جہاد اور بنگال کی فرائضی تحریک میں ڈھل چکی تھی۔ بقول حالی "حقائق" و معارف کی کتابیں اور رسالے کثرت سے غالب کے مطالعے سے گذرے تھے۔" شیفتہ کو اعتراف ہے کہ حقائق و معارف کے نہایت دقیق مسائل پر شاہ ولی اللہ کے رسالے میں جس مقام کو وہ خود نہ سمجھ پائے تھے غالب نے "اس کا مطلب ایسی خوبی اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا کہ شاہ ولی اللہ صاحب بھی شاید اس سے زیادہ بیان نہ کر سکتے"---ایک مرتبہ جس کسی مولوی حمزہ خاں نے غالب کے عقائد پر شک کیا وہ غضبناک ہو گئے۔

"بنیوں کے لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا اور ہے اور عرفا کے کلام سے حقیقت حقہ وحدت وجود کا دل نشیں کرنا اور ہے۔"

علاوہ ازیں تصوف کی کتابوں پر غالب کے دیباچے اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ "ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا۔"

غالب کفر کے فتووں میں ہی ان علمائے دین کے ہم نصیب نہیں بلکہ عملی جدوجہد میں بھی ہیں، وہ یوں کہ جس وقت غالب پنشن کا مقدمہ ہارتے ہیں تقریباً اسی وقت بنگال میں ٹیٹو میاں اور سرحد میں سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل کی شہادت کے ساتھ ہندی مسلمان شکست آشنا ہوتا ہے اور غالب اجتماع کو اپنی ذات میں جذب کر کے کہتے ہیں:

ہر سنگ و خشت ہے صدف گوہر شکست نقصان نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

قدوگیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب اک آبلہ پا وادی پر خار میں آوے

غالب کے پچیس برس کی عمر کے کلام کے نہایت عمدہ اور خیال انگیز تجزیہ کو ختم کرتے ہوئے ڈاکٹر خورشید الاسلام نے غالب کی فعال شخصیت، ان کی عقلیت پسندی اور سچے کفر کی پیغمبرانہ شان کو ایک زوال پسند ادبی اور سماجی خول سے باہر نکلنے میں غالب کی کامیابی کا باعث ٹھہرایا ہے۔ میرے خیال میں غالب کی شخصیت کے یہ جوہر ہندی مسلمان کی مذکورہ بالا دینی اور سیاسی جدوجہد کا فیضان ہیں۔ اسی وجہ سے میں غالب کے فنی کارنامہ کو اس جدوجہد کا تکمیلی جزو مانتا ہوں۔

شاہ ولی اللہ نے ہندی مسلمانوں کے روحانی زوال کے سدباب کے لیے قرون وسطیٰ کے منجمد تمدنی اور سکونی تصور حیات کو رد کر کے دینی زندگی کی جدید، متحرک اور روشن خیال فکری اساس قائم کرنے کی جو تحریک شروع کی تھی۔ وہ غالب کے عنفوان شباب میں سید احمد بریلوی کی مجاہدانہ تڑپ سے آشنا ہو چکی تھی۔ شیخ احمد سرہندی کی مساعی کو ان کے منطقی انجام کی طرف لے جانے والی اس تحریک کی سب سے بڑی خصوصیت تقلید سے اجتناب اور اجتہاد پر انحصار ہے۔ اسی روح اجتہاد کے سہارے اگر ایک طرف اسلام کے تصور توحید کی اصل انقلابی روح کو بیدار کیا گیا، بے

جان رسوم و روایات کی زنجیروں کو عقلیت پسندی کے زور سے توڑا گیا' تو دوسری طرف تصوف کے مختلف مروجہ سلسلوں کو یک جان کر کے عملی زندگی کی اصلاح و تجدید کے جذبے سے ہمکنار کیا گیا___ غالب نے ہندی مسلمانوں کی فنی اور جمالیاتی تاریخ میں یہی کارنامہ سرانجام دیا- غالب کا شیوہ پرستاری وہم نہیں بلکہ وہ غیر مقلد اور بت شکن ہیں:

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایمان بن گئیں

جس ادبی فضا میں غالب نے اپنے فنی سفر کا آغاز کیا اس میں تقلید پرستی اور بے عملی کا دور دورہ تھا- وہ لسانی تحریک اپنے عروج پر تھی جس کے زیر اثر مناسبات لفظی اور متعلقات شعری کا فرسودہ نظام ہنوز پسند خاص و عام تھا اور زبان و بیان کے پیش پا افتادہ سانچوں میں خیالی اور مثالی زندگی کی عکاسی کا رجحان پنپ رہا تھا- غزل کا معشوق قرون وسطی کے ناک نقشے کے ساتھ جلوہ گر تھا اور اس کے مثالی عاشق ذاتی تجربات محبت کے بجائے طبقہ امراء کے قائم کردہ سکہ بند تجربات کی ترجمانی میں مبالغہ آرائی اور محاورہ بندی کے جوہر دکھا رہے تھے- سادگی بیان اور روز مرہ سے محبت کے باعث جو مقامی رنگ رواج پا رہا تھا وہ ان روایات کو کمزور کر رہا تھا جو اردو شاعری کو ہندوستان سے باہر کے مسلمانوں کے ادب سے ہم رشتہ کرتی تھیں-

آغاز کار میں ہی غالب نے اس تحریک کے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا- وہ قافیہ پیمائی کی بجائے معنی آفرینی پر ناز کرتے ہیں- خالص لسانی اعتبار سے ان کی شاعری کا رخ روز مرہ' محاورہ اور مقامی رنگ کی بجائے بدنام زمانہ مشکل پسندی کی طرف ہے- غالب کا یہ رجحان سیاسی اور تمدنی انتشار کے زمانے میں اپنی تہذیبی روایات سے وابستہ رہنے کی ایک غیر شعوری کوشش ہے- اسی طرح فارسی زبان سے مستعار لیا' مکتب ایجری اور علائم و رموز باہر کی اسلامی دنیا سے فنی اور جمالیاتی یکجہتی کی مثبت خواہش کے غماز ہیں- لسانی پہلو سے قطع نظر' فکری اعتبار سے بھی غالب کی شاعری رہ و رسم زمانہ کی پیروی سے آزاد ہے- وہ متعدد اور سکہ بند کیفیات حسن و عشق کی بجائے ذاتی اور منفرد تجربات محبت کے ترجمان ہیں- بقول ڈاکٹر خورشید الاسلام:

"غالب عشق کے طوفان میں بھی اپنے حواس برقرار رکھتے ہیں اور یہ نہیں بھول جاتے کہ ان کے چاروں طرف وسیع دنیا پھیلی ہوئی ہے- پرواز میں بھی ان کی آنکھ نشیمن پر رہتی ہے- یہی سبب ہے کہ ان کے اشعار میں ہم عاشق سے زیادہ ایک باعمل انسان کی تصویر دیکھتے ہیں-"

غالب کی دنیائے محبت میں مرکزی حیثیت معشوق کی نہیں عاشق کی ہے:

نفس قیس کہ ہے چشم و چراغ صحرا گر نہیں شمع سیہ خانہ لیلٰی نہ سہی

عالم تمام وحشت مجنوں ہے سر بسر کب تک خیال طرہ لیلٰی کرے کوئی

جذبہ عشق شخصیت کو حیرت انگیز وسعت اور توانائی بخشتا ہے اور عاشق کو کائنات اور انسان کے ظاہر و باطن کی تسخیر کے بے پناہ امکانات سے دوچار کرتا ہے:

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار صحرا مگر بہ تنگی چشم حسود تھا

آتش کدہ ہے سینہ مرا راز نہاں سے　　اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب　　ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

قرونِ وسطیٰ کی فرسودہ روایاتِ حسن و عشق کو غالب یا تو رد کر دیتے ہیں یا معرضِ شک میں ڈال دیتے ہیں:

عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر　　دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچئے

رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجئے　　کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہئے

بلا سے گر مژۂ تشنہ خوں ہے　　رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کے لیے

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب　　آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں خنجر کھلا

عشق و مزدوریِ عشرت گہ خسرو کیا خوب　　ہم کو منظور نکو نامیِ فرہاد نہیں

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا　　تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟

رسمیاتِ عشق پر ہی موقوف نہیں بلکہ سماجی اقدار سے لے کر مذہبی اور صوفیانہ تصورات تک زندگی کا ہر شعبہ غالب کے شاعرانہ استدلال اور فلسفیانہ تشکیک کی زد میں آجاتا ہے:

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا　　ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

کیا کیا خضر نے سکندر سے　　اب کسے رہنما کرے کوئی

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر　　نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم　　الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن — ہم کو منظور تنک ظرفیٔ منصور نہیں

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

طاعت میں تا رہے نہ مئے وانگبیں کی لاگ — دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا — وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاق نسیاں کا

کیوں نہ فردوس کو دوزخ میں ملا لیں یا رب — سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

. غالب بہ یک وقت اپنی تہذیب کے بہترین ترجمان بھی ہیں اور کٹر باغی بھی۔ جہاں وہ اس تہذیب کی انسانی اور آفاقی قدروں کے عاشق ہیں وہاں اس کی تعمیر میں مضمر خرابیوں کا شعور بھی رکھتے ہیں' غالب چونکہ علمائے حق کے ہنگامہ ہائے رزم سے دور دلی اور کلکتہ کی بزم مائے قال واقوال اور کوچہ ہائے دلدار کی جنت نگاہ اور فردوس گوش فضاؤں میں سرگرم عمل رہے ہیں۔ اس لئے وہ ان خرابیوں کا شعور علمائے حق سے کچھ زیادہ ہی رکھتے ہیں۔ علمائے حق کی تحریک اصلاح و تجدید میں مجاہدانہ تڑپ نے وسیع النظری اور رواداری کے باوجود جو فرقہ وارانہ سی کیفیت پیدا کر دی تھی وہ غالب کے ہاتھوں مفقود ہے۔ مسلمانوں کے ادب میں کفر اور متعلقات کفر کی علامتی معنویت سے ناآشنا ذہن نے غالب کی وسیع القلبی' آزادہ روی اور تمام بنی آدم سے محبت کو غلط رنگ میں پیش کیا ہے۔ یہ اسلام کی نفی نہیں بلکہ اس کے تمدنی مسلک کا ثمر ہے۔ غالب نے کہ اس ثمر سے بہرہ ور تھے' علمائے حق کی شکست کے پس منظر میں دہلی کالج میں نئے علوم کے ہنگاموں اور قیام کلکتہ کے دوران سائنسی ترقی کی برکتوں پر اپنی چشم تجسس کو وا کیا تو انہیں یہ سب کچھ مومن کی گم شدہ متاع نظر آیا۔ چنانچہ مذہب کے رسمی اور رواجی پہلوؤں سے بے نیازی' ایسے مذہبی اور صوفیانہ تصورات کے بارے میں طنز اور تشکیک کا رویہ جو عہد جدید میں نئی تفسیر و تعبیر کے مستحق ٹھہرے' محض انانیت کا کرشمہ نہیں۔ پھر غالب کی انانیت ایک فرد واحد کی بلند آہنگی نہیں بلکہ اس میں اجتماعی احساس کروٹیں لے رہا ہے۔ غالب جب احکام ظاہری میں الجھے ہوئے کسی عالم کو مشورہ دیتے ہیں "فقہ پڑھ کر کیا کرے گا۔ طب و نجوم و منطق و ہیئت و فلسفہ پڑھ جو آدمی بنا چاہے۔ 2۔ تو ان کا مقصد اس کی تنگ نظری کا مذاق اڑانا نہیں بلکہ ان کے ذہن میں شاہ ولی اللہ گونج رہے ہوتے ہیں جنہوں نے اٹھارہویں صدی میں ہی یہ قرار دے دیا تھا کہ اب وہ وقت گذر چکا ہے جب ہمارے دینی مدارس میں اسلامی سلطنت کے تقاضوں کے پیش نظر فقہ کی تعلیم کو مرکزی اہمیت دی جاتی تھی۔ اسلامی سلطنت میں زوال اور انتشار کے آثار کے بعد اب قرآن' حدیث اور نئے علم الکلام سے نئے تخلیقی رابطے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح جہاں وہ بعض سماجی اور روحانی تصورات کے بارے میں جارحانہ رویہ اختیار کرتے ہیں وہاں یہ دعوت بھی دیتے ہیں:

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

غالب نے قرون وسطیٰ کے جن تصورات کو رد کیا یا معرض شک میں ڈالا' عہد جدید کے آغاز میں ان تصورات کو منسوخ کرنے یا ان کی نئی تفسیر میں آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ اگر غالب جناب خضر کو طنز کا نشانہ نہ بناتے تو شاید سر سید احمد خاں "کیا خضر کا وجود فرضی ہے؟" کے عنوان سے مضمون لکھنے کی جرات نہ کر سکتے!_____ اگر غالب جنت اور دوزخ کے تصورات سے رندانہ شوخیاں نہ کرتے تو شاید اقبال کے لئے اپنے مشہور خطبات میں جنت اور دوزخ کے تصورات کی مادی حیثیت کو ضمنی اور فروعی قرار دے کر ان کی علامتی اہمیت پر اظہار خیال کرنا اتنا آسان نہ ہوتا:

چاک "لا" اندر گریباں جہاں افگندہ ایم　　بے جہت بیروں خرام از پردۂ پندار ما

یہ محض شاعرانہ تعلی نہیں غالب نے جرات رندانہ کے ساتھ ان فرسودہ اقدار کو رد کر دیا جن کی تخریب عہد جدید کی تعمیر کے لئے لازم تھی۔ اس اعتبار سے ہماری فنی اور جمالیاتی تاریخ میں غالب کی حیثیت اس پل کی سی ہے جو قرون وسطیٰ کو عہد جدید سے ملاتا ہے۔ قرون وسطیٰ میں مجاز اور حقیقت کے جو صوفیانہ تصورات ہماری شاعری کا مابعد الطبیعاتی اور فکری پس منظر مہیا کرتے تھے اور جو غالب کے عہد میں زوال پسندانہ رجحانات کے زیر اثر تخلیقی معنویت کھو چکے تھے' غالب نے انہیں بھی نئی معنویت بخشی۔ غالب نے روحانی لطافت اور مادی کثافت کو یک جان کر کے دنیائے آب و گل پر نظر ڈالی تو ذرۂ خاک کو ساغر جلوۂ سرشار اور ہر پارۂ سنگ کو لخت دل کوہ طور پایا۔ غالب کے ہاں زندگی کی حرکت اور وفور جمال کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر خورشید الاسلام لکھتے ہیں:

"غالب جب خارجی اور مادی دنیا کا مشاہدہ کرتے ہیں تو انہیں معنی سے لبریز دکھائی دیتی ہے۔ غالب اس معنی کو خدا کے نام سے پکارتے ہیں۔ غالب مادی دنیا میں خدا کو تلاش کرتے ہیں لیکن اس کی ذات میں خود کو بھلا نہیں دیتے۔ ان کی خواہش یہ نہیں ہے کہ خدا کی بنائی ہوئی دنیا کے کنارے دور تک پھیل جائیں۔ ان کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے اندر سمٹ جائیں بلکہ ان کی آرزو یہ ہے کہ انسان اپنے ممکن ذہنی اور روحانی قد و قامت کو پہنچ جائے۔"

اور [illegible] حقیقت اور مجاز' ماورائیت اور مادیت ابدی اور عارضی کو یکجا کر کے غالب نے علمائے حق کی طرف سے مذہب، تصوف کو عملی زندگی سے ہم رشتہ کرنے کی جد و جہد کو تکمیل تک پہنچا دیا۔ غالب کے اس تہذیبی کارنامے کی داد اقبال ہی دے سکتے تھے۔ شاید اسی لئے غالب کو اپنے عہد سے گلہ تھا:

کوئی نہیں ہے اب ایسا جہاں میں غالب
کہ جاگنے کو ملا دیوے آ کے خواب کے ساتھ

سچ کہتے تھے مولانا حالی! بھلا جاگنے کو خواب کے ساتھ ملا دینے سے قوم کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

حواشی

1۔

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موج رنگ کا　　یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا
ناگہاں اس رنگ سے خونناب ٹپکانے لگا　　دل کہ ذوق کاوش ناخن سے لذت یاب تھا

2۔ خط بنام میر مہدی مجروح

مظفر علی سید

غالب کی بغاوت

"آری، صہبائی سخن بروزگار من از کہنگی تند و پرزور درست و شب اندیشہ رابغر دمیدن سپیدہ سحری برات فراوان- ہر آئینہ رفتگان سرخوش غنودہ اندو من خرابستم، پیشینیاں چراغاں بودندو من آفتابستم-"

(دیباچہ کلیات نظم فارسی)

اس ایک صدی میں غالب کی عظمت کو بالعموم تسلیم کر لیا گیا ہے اور اس کی نظم و نثر کو ایک بے حد معزز کلاسیک کا مرتبہ بھی مل چکا ہے یعنی بڑی حد تک غالب کی اس شکایت کی تلافی کر دی گئی ہے جو اس کو اپنے دور کے ادبی ذوق سے تھی-

پھر بھی سوچنا چاہیے کہ اس بعد از وقت اعتراف کمال کی عمارت اس مردہ پرستی پر تو قائم نہیں کی گئی جس کی وجہ سے غالب کو اپنے ہمعصر معاشرے سے یہ کہنا پڑا تھا:

تو ای کو محو سخن گستران پیشینی   مباش منکر غالب کہ در زمانہ تست

اس شک و شبہ کو اس بات سے تقویت ملتی ہے کہ ہمارے ہم عصر معاشرے کا ادب و شعر کے ساتھ زیادہ سے زیادہ ایک سرسری قسم کا تعلق ہے اور یہ ماننے کے بعد غالب کی وہ عزت و تکریم جو اب تک اس پر نچھاور کی گئی ہے بڑی مشکل سے سمجھ میں آتی ہے ہم نے جو اپنے خیال میں "دیوان غالب" کو ایک الہامی کتاب کا درجہ دے رکھا ہے، کہیں اس وجہ سے تو نہیں کہ ہم اس کتاب کے ساتھ بھی وہی سلوک کرنا چاہتے ہیں جو اب تک صرف الہامی کتابوں کے ساتھ روا رکھا گیا ہے- کسی بھی زندہ و پائندہ صحیفے کو نقش و نگار سے مزین کرنے کے بعد طاق نسیاں کی زینت بنا دینا معاشرتی احترام کی بجائے ایک قسم کی معاشرتی سازش کا مظہر ہوتا ہے- جس آدمی کے اقوال و اعمال سے فرسودہ معاشرتی ڈھانچے کو کوئی ضرر پہنچنے کا احتمال ہو' اس کے ساتھ ظاہری تکریم کا یہ دستور کوئی انوکھی چیز بھی نہیں- دانا قسم کے ارباب اختیار کسی بہت بڑے باغی کو عضو معطل بنانے کی خاطر اسے اکثر اپنے ساتھ شریک کر لینے کو بے حد مفید سمجھتے ہیں اور یوں اس کی بغاوت کو خوش اسلوبی سے سبو تاژ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں-

غالب کے سلسلے میں چونکہ یہ دانائی بہت دیر سے ہو رہی ہے اس لئے اب تو یہ سوال بھی پوچھا جائے گا کہ آیا غالب کو ایک باغی کہا بھی جا سکتا ہے یا نہیں-

یوں تو غالب کو ہماری تحریک آزادی کے ہراول دستے کا ایک سپاہی بلکہ سربراہ تک ثابت کرنے کی

کوششیں بھی ہو چکی ہیں اور بعض لوگ اب تک اس کو ایک سرگرم انقلابی مفکر بنا کے بھی پیش کرتے رہتے ہیں مگر یہ سب جانتے ہیں کہ غالب کو کسی ایسے معنوں میں باغی نہیں کہا جا سکتا' اس لیے کہ سیاست کو زندگی میں جو اہمیت اب حاصل ہے وہ غالب کے زمانے میں قطعاً" موجود نہ تھی اور اس کی عظمت کو کسی ایسے پیمانے سے ناپنا جو اس کے لیے وجود ہی نہیں رکھتا تھا درست نہیں ہو گا- اسی طرح غالب کو ایک آتش نوا قسم کا شاعر کہنا بھی بہت مشکل ہے- اس لئے کہ لارڈ بائرن سے لے کر مائیکو فسکی تک جو چیز بہت سے شاعروں کے یہاں ملتی ہے اسے غالب کے یہاں ڈھونڈنا لاحاصل ہو گا- یہاں تک کہ بیسویں صدی کے مشرق میں بھی جو آگ سے کھیلنے والے شاعر پیدا ہوئے جیسے ترکی میں ناظم حکمت' ایران میں عشقی' لاہوتی اور برصغیر میں نذر الاسلام' جوش ملیح آبادی وغیرہ ____ ان سے مشابہ ہونے کی بجائے غالب تو ان کے مقابلے میں ایک بے حد وضعدار اور نستعلیق آدمی معلوم ہوتا ہے-

پھر بھی غالب میں واضح طور پر ایسے قومی عناصر موجود ہیں جو اس کی رسوم و قیود کے خمار میں سرگشتہ نہیں ہونے دیتے' جو اس کو اپنے زمانے اور ماحول کا اسیر ہونے کے باوجود آتش زیر پا رکھتے ہیں- اس قسم کی ذہنی صورت حال کو بغاوت کا نام دیا جا سکتا ہے یا نہیں' یہ ایک لفظی بحث ہو گی چنانچہ اس مضمون میں جہاں جہاں بغاوت کا لفظ آئے' اگر کوئی پڑھنے والا اس کی جگہ کوئی مناسب تر لفظ (مثلاً اضطراب) پڑھنا چاہے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا- ویسے نہ اضطراب کے بغیر بغاوت کا تصور کیا جا سکتا ہے اور نہ اس اضطراب کو جو بغاوت نہیں بن سکتا' ایک ہنگامی خلش سے زیادہ کوئی اہمیت دی جا سکتی ہے- چنانچہ یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ غالب کی بغاوت کسی وقتی ابال کی پیداوار تھی یا اس میں تاریخ اور تہذیب کے دیرپا اور دور رس عوامل کا کوئی دخل تھا-

خود غالب نے اپنی شاعری میں بغاوت کا لفظ شاید کبھی استعمال نہیں کیا- انہوں نے اپنے آپ کو نظم یا نثر میں کسی جگہ بھی باغی نہیں کہا البتہ 1857ء میں میرٹھ چھاؤنی سے دلی شہر میں وارد ہونے والوں کو یہ لقب ضرور دیا ہے اور وہ بھی ناپسندیدگی کے ساتھ- شاید ان کے زمانے میں یہ لفظ محض ایک فوجی یا انتظامی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا تھا- چنانچہ غالب کی اردو فارسی نثر میں بغاوت اور باغی اس طرح آئے ہیں جیسے سرسید کی اسباب بغاوت ہند یا داغ کے مرثیہ دہلی میں-

فکری اور معاشرتی فریاد کی وہ صورتیں جن کو آج کل بغاوت کا نام دیا جاتا ہے' ان سے ذرا بھی مشابہت رکھنے والا کوئی رویہ اگر غالب کے زمانے میں ہوتا تو اس کو یقیناً جنون اور دیوانگی کا نام دیا جاتا- نفاست اور تہذیب میں رچا ہوا معاشرہ جو برہنہ بات نہ کرنے کو گویائی کا کمال سمجھتا تھا شاید اپنی شائستہ گفتگو میں بغاوت کے اس مرض کو وحشت' وارفتگی' شوریدگی یا آشفتگی کہہ کر پکارتا- اس ایک چیز کے اتنے سارے نام رکھنے کی وجہ نازک امتیازات قائم کرنے کے علاوہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حقیقت سے آنکھیں دو چار کرنے کی اس معاشرے میں ہمت نہ تھی- ادب میں چونکہ معاشرے کی زبان استعمال کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں اس لیے غالب نے بھی اپنی تکلیف کا ذکر انہیں الفاظ میں کیا ہے- آشفتگی کی صورتیں:-

یارب اس آشفتگی کی داد کس سے چاہئے

کہا ہے کس نے کہ غالب برا نہیں لیکن سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیے

اے ساکنان کوچہ دلدار دیکھنا تم کو کہیں جو غالب آشفتہ سر ملے

مرگیا غالب آشفتہ نوا کہتے ہیں

غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار مگر آشفتہ بیانی میری

اس کے علاوہ وحشت اور شوریدگی بھی:

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دل وحشی کہ ہے عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

یک قدم وحشت سے درس دفتر امکاں کھلا

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبال دوش صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

کبھی کبھی اس لاعلاج رجحان کو کوئی نام نہیں دیتے مگر اس کے سلسلے میں نہایت فخریہ انداز اختیار کرتے ہیں اور اس کی انتہا کو بھی ناکافی سمجھتے ہیں:-

گرد بار رہ بیتابی ہوں صرصر شوق ہے بانی میری

ملی نہ وسعت جولان یک جنون ہم کو عدم کو لے گئے دل میں غبار صحرا کا

یہاں پر کہا جائے گا کہ وحشت اور بادیہ پیمائی کے مضامین تو ہماری ساری کلاسیکی شاعری میں بھرے پڑے ہیں- غالب نے بھی ان کو دہرا دیا تو اس سے کوئی معنویت برآمد نہیں ہوتی- اول تو کلاسیکی شاعری میں بھی اس قسم کے رجحان کی کوئی وجہ ہونی چاہئے- پھر غالب کے یہاں اس پر ایک نئی قسم کا اصرار ملتا ہے اور ایک بے حد ذاتی قسم کا لہجہ- یقیناً اس کے لئے یہ الفاظ کسی فکری نصب العین کا ذریعہ اظہار ہیں' بالخصوص جب کہ ان کے ساتھ ساتھ آزادگی' آزادہ روی اور وارستگی کے تصورات بھی تواتر کے ساتھ پیش ہوتے ہوں- غالب ان کے ذریعے

اپنے طرز حیات کو ایک فکری نہج کے ساتھ مربوط کرتا ہے۔

خطر ہے رشتۂ الفت رگ گردن نہ ہو جائے

نفس قیس کہ ہے چشم و چراغ صحرا گر نہیں شمع سیہ خانۂ لیلیٰ، نہ سہی

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو کیجے ہمارے ساتھ، عداوت ہی کیوں نہ ہو

واں پرفشان دام نظر ہوں جہاں اسد صبح بہار بھی قفس رنگ و بو نہ ہو

علائق دنیاوی سے بے نیازی اس کے خمیر میں تھی، فراغت اور عافیت کوشی سے اس کو طبعی عناد تھا مگر سرو آزاد کو گرفتار چمن ہونا بھی لازم ہے کہ تہذیب آدمیت سے بیگانگی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتی:

آخر کار گرفتار سر زلف ہوا دل دیوانہ کہ وارستہ ہر مذہب تھا

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعی آزادی ہوئی زنجیر، موج آب کو، فرصت روانی کی

وحشت اور مدنیت، وارستگی اور شائستگی کے متصادم تقاضوں کو بیک وقت پورا کرنا کوئی آسان کام نہیں اور غالب جیسے اصیل آدی کو اکثر اوقات انسانی تہذیب اور تمدن ایک قید خانے سے کم نظر نہیں آتا:

شرح اسباب گرفتاری خاطر مت پوچھ اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسد جانتے ہیں سینۂ پر خوں کو زنداں خانہ ہم

یہاں تک تو انفرادی آزادی اور معاشرتی تقاضوں کے ٹکراؤں کا سوال تھا مگر اب اس معاشرے اور اس کی بنیادوں کا مطالعہ لازم ہے جس نے فرد کو اس قدر بے بس کر رکھا ہے۔ ایک آدی جو دستور عام کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ کیا وہ اپنی ایک جداگانہ تقدیر لے کر آیا ہے یا کسی اتفاق سے غلط قسم کے ماحول میں نازل کر دیا گیا ہے؟

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسم صواب سے ٹیڑھا لگا ہے قط قلم سر نوشت کو

نہ جانے نیک ہوں یا بد ہوں، پر صحبت مخالف ہے جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں، جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

مگر غالب کی انفرادیت ایسی نہیں کہ آزادہ روی کے پندار میں مست ہو کر دنیا و مافیہا کو فراموش کر دے۔ اپنے آپ کو مخالف صحبت میں گھرا ہوا محسوس کرنے سے بھی کوئی بات واضح نہیں ہوتی کہ آخر قصور کس کا ہے؟ اپنا یا

معاشرے کا یا کسی تیسری طاقت کا جس نے دونوں کو زبردستی بہم کر دیا ہے؟ تیک وبد کا فیصلہ بھی کرنا ہی پڑے گا کہ انسان محض اپنے آپ کو Outsider کہہ کر بھی نہ ساری زندگی بسر کر سکتا ہے نہ کوئی ایسا کمال انجام دے سکتا ہے جس کی کوئی تہذیبی یا تاریخی اہمیت ہو۔

چنانچہ معاشرے کی فکری بنیاد یعنی مذہب و اخلاق کی طرف رجوع کرنا ہی پڑے گا۔ یہاں ایک آزادہ رو اور بے تعصب آدمی کے مشاہدے میں سب سے پہلے جو چیز آئے گی وہ مذہب و اخلاق کے معاملے میں ظاہر و باطن کے درمیان کی خلیج ہوگی۔ یہاں غالب کی خراباتی نظرنے جو ریو و ریا سے پاک تھی' اپنے عصر کے معاشرے کو بے نقاب دیکھا اور اسے بے نقاب ہی پیش کرنا پسند کیا۔ دعوے زہد رکھنے والوں کی طرف غالب کی پہلی نظرنے ہی اس کو اپنی راستی کا قائل کر دیا:

رفتم کہ کہنگی ز تماشا برا فگنم | در بزم رنگ و بو نملی دیگر افگنم
ہنگامہ راجیم جنوں برجگر زنم | اندیشہ راہوای فسوں در سر افگنم
باؤریاں زشکوۂ بیداد اہل دیں | مہری زخویشتن بدل کافر افگنم
راہی زنج دیر بہ مینو کشادہ ام | ازخم کشم پیالہ دور کوثر افگنم
تا یاد تلخ تر شود و سینہ ریش تر | بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار | ساقی و مغنی و شرابی و مرودی
زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند | حق را بسجودی و نبی رابد رودی

غنا ہے فوت فرصت ہستی کا غم کہیں | عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو

ولم در کعبہ از تنگی گرفت' آوارہ ای خواہم | کہ با من وسعت بتخانہ ہائے ہند چیں گوید

ہرچہ فلک نخواستست' ہیچ کس از فلک نخواست | ظرف فقیہ مے نہ جست بادہ ماگزک نخواست
بحث و جدل بجای ماں' میکدہ جوی کاندراں | کس نفس از جمل نزد' کس سخن از فدک نخواست

تنگ نظری' ریاکاری' ناکردہ گناہوں کی حسرت اور دست ہمت کی کوتاہی کا نام اگر مذہب ہوتا تو غالب شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کافر ہی رہنا پسند کرتا لیکن جب اسے یہ احساس ہوا کہ مذہب کا مقصد ان معاشرتی کوتاہیوں سے جو رسوم آباء کی بے جان تقلید سے پیدا ہوتی ہیں' بلند و ارفع ہے تو اس نے تقلید کی بجائے تحقیق کا راستہ اختیار کر کے ان سے ارفع حقائق کو بھی سمیٹنے کی کوشش کی یادگار غالب میں لکھا ہے:

"مرزا کی دراکی اور عالی فطرتی کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ باوجودیکہ ایسی

> سوسائٹی میں گھرے ہوئے تھے جس میں سلف کی تقلید سے ایک قدم تجاوز کرنا ناجائز سمجھا جاتا تھا' اپنے فن میں محققانہ چال چلتے تھے اور اندھا دھند اگلوں کی تقلید ہرگز نہ کرتے تھے۔"

غالب کا یہ مسلک فقط علوم ادب تک محدود نہیں تھا۔ مذہب و اخلاق اور فکر و خیال کے اور بھی دائرے آخر کار اسی مسلک تحقیق کی وجہ سے اس کی دسترس میں آسکے۔ اگرچہ ان تک پہنچنے کا راستہ بے شمار ٹھیکوں اور تلخیوں کے بعد ہی ملنے پایا تھا۔

کس بات پہ مغرور ہے اے عجز تمنا
سامان دعا وحشت و تاثیر دعا ہیچ

دیر و حرم آئینہ تکرار تمنا
واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملت کا
خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے

طاعت میں تار ہے نہ مے وانگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

کس پردے میں ہے آئینہ پرداز' اے خدا
رحمت کہ عذر خواہ لب بے سوال ہے

اس سلسلے میں غالب کا وہ قصیدہ خاص طور سے اہم ہے جس میں اس نے بقول خود بہت ہرزہ سرائی کی ہے اور وقار و تمکیں کے آداب سے یک قلم خارج ہو کر مذہب' فن اور دوسرے فکری مسلمات کی حقیقت کو "فطرت وسواس قریں" کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی ہے:

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

ہرزہ ہے نغمہ زیر و بم ہستی و عدم
لغو ہے آئنہ فرق جنون و تمکیں

نقش معنی ہمہ خمیازہ عرض صورت
سخن حق ہمہ پیمانہ ذوق تحسیں

لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم
درد یک ساغر غفلت ہے چہ دنیا وچہ دیں

عشق بے ربطی شیرازہ اجزائے حواس
وصل زنگار رخ آئنہ حسن یقیں

کوہکن گرسنہ مزدور طرب گاہ رقیب
بیستوں آئنہ خواب گران شیریں

کس نے دیکھا نفس اہل وفا آتش خیز
کس نے پایا اثر نالہ دلہائے حزیں

سامع زمزمہ اہل جہاں ہوں لیکن
نہ سر و برگ ستائش نہ دماغ نفریں

اس قصیدے میں پہلے یہ شعر بھی شامل تھا مگر بعد میں نکال دیا گیا:

موج خمیازہ یک نشہ، چہ اسلام چہ کفر   کجی یک خط مسطر، چہ توہم چہ یقیں

ویسے عام طور سے ایسی شوخیاں جن کو استزائی الدین کا نام دیا گیا ہے، غالب کے اردو کلام میں بھی پائی جاتی ہیں جیسے خضر و موسیٰ جنت دوزخ کے بارے میں ان کے معروف شعر، مگر کسی وجہ سے ان کے فارسی کلام میں ان کی مذہبی فکر کی آزادہ روی زیادہ نمایاں ہے۔ شاید اس لئے کہ ایسے موضوع پر اگر غیر ملکی زبان کا پردہ ساپڑ جائے تو بلوے کا خطرہ کم ہو جاتا ہے۔ شاید یہ بات دوسری طرف کے لئے دلچسپی کا باعث ہو کہ بعض لمحوں میں غالب نے تقلید کی آواز بھی اپنے ضمیر کے نہاں خانے میں سنی ہے اور اسے بھی محفوظ کرنے سے دریغ نہیں کیا:

کافر نتوانی شد، ناچار مسلمان شو

حمکین برہمن ولم از کفر بگرداند   بتخانہ بتے خانہ ہر انداز ندارد

ہیں اہل خرد کس روش خاص پہ نازاں   پابستگی رسم و رہ عام بہت ہے

اس آخری شعر "رموز بے خودی" کا وہ حصہ یاد آتا ہے جہاں اقبال نے غلامی کے دور میں ملت کا شیرازہ بہم رکھنے کے لیے تقلید کو بھی مستحسن قرار دے دیا ہے۔

بہر حال غالب کے یہاں مذہب اور بعض دوسرے فکری مسائل کے بارے میں اچھے خاصے باغیانہ خیالات کے ساتھ ساتھ رسم و رہ عام کے تقاضے بھی دکھائی دے جاتے ہیں جو بعض اوقات لطف سے خالی نہیں ہوتے۔ ان تضادات سے یہ نمود واضح ہوتا ہے کہ ساری زندگی باغی رہ کر نہیں گذر سکتی مگر دنیا کے مشہور باغیوں کو جو بڑھاپے میں شدید قسم کی قدامت پسندی کے دورے پڑے ہیں۔ ان کو دیکھتے ہوئے غالب کا پیچ و تاب کسی شکست کا احساس نہیں دلاتا۔

غالب کے ابتدائی کلام میں ایک شعر ہے:

مدعا درپردہ یعنی جو کہوں باطل سمجھ   وہ فرنگی زادہ کھاتا ہے قسم انجیل کی

یقین نہیں آتا کہ یہ اسی غالب کا کلام ہے جس نے یہ بھی کہا ہے:

کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

مگر فی الحقیقت یہ ایک ہی نقطہ نظر کی ارتقائی کڑیاں ہیں۔ پہلا شعر اس وقت کا ہے جب غالب کو نصرانیوں کے بارے میں سرسری واقفیت تھی، یعنی جب وہ ان کے سلسلے میں اپنی تہذیب اور معاشرے کے تعصبات سے الگ نہیں ہوا تھا۔ اور یہ بھی عام طور سے معلوم ہے کہ جب اس کو یورپ سے آئی ہوئی نئی دنیا سے آشنائی ہوئی تو اس وقت اس کے دل و دماغ پر کیسی کیفیت گذری تھی۔ پھر تو وہ اپنی ترقی پسندی کے مقابلے میں سرسید کو بھی ایک مردہ پرست سمجھنے لگ گئے تھے۔

صاحبان انگلستان رانگر   شیوہ و انداز اینان رانگر

تاچہ آئین ہا پدید آوردہ اند — آنچہ ہرگز کس ندید آوردہ اند
زیں ہنر منداں ہنر بیشی گرفت — سعی بر پیشینیاں و بیشی گرفت
حق ایں قوم است آئین داشتن — کس نیارد ملک بہ زیں داشتن
داد و دانش راباہم پیوستہ اند — ہندرا صد گونہ آئیں بستہ اند

سرسید جو "آئین اکبری" کے ایڈیشن کے ساتھ چھاپنے کے لیے غالب سے تقریظ کی فرمائش کر بیٹھے تھے۔ سوچتے ہوں گے کہ ایسی انگریز پرستی تو شاید مجھ سے بھی نہ ہو سکے۔ شاید انگریز کے بارے میں غالب کا جو رویہ تھا اسے بغاوت کی بجائے غداری کا نام دیا جائے گا مگر اس موقع پر ایک تو کارل مارکس کا وہ مشہور فقرہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہندوستان میں انگریز نے تاریخ کے ایجنٹ کا کردار ادا کیا ہے۔ پھر' مرحوم ابوالکلام آزاد نے جو اس سلسلے میں توضیح کر رکھی ہے وہ بھی نظر میں ہو تو سوچ سمجھ کر کوئی رائے قائم کرنے میں آسانی ہو گی:

> "انگریزوں کے اوضاع و اطوار سے خوش اعتقادی اور ہر اس چیز کی ناپسندیدگی جو انگریزوں کے نزدیک ناپسندیدہ ہو۔ اس اعتبار سے بھی مرزا غالب اپنے عہد کے مستثنیات میں سے ہیں۔ ان کا خاندان انگریزوں کی حکومت سے وابستہ ہو چکا تھا اس لئے آنکھ کھولتے ہی وہ انگریزوں سے آشنا ہو گئے۔ ان کے شباب کا زمانہ' دہلی و آگرہ میں انگریزی حکومت کا نیا نیا آغاز تھا۔ طبیعت چونکہ رسم و تقلید کی بندشوں سے آزاد تھی اس لئے مذہبی اور ملکی تعصبات ان کے لئے سد راہ نہ ہو سکے اور وہ انگریزوں کے فضائل و محاسن سے آشنا ہو کر بلا روک گرویدہ ہو گئے۔ ہندوستانی زندگی کے تمام سانچے ٹوٹ رہے تھے اور انگریزی اوضاع و اطوار اور ذہن و دماغ کا علو و غلبہ ایک غیر متعصب دماغ کو صاف صاف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ قدیم آئین و فنون کی بے مائگی اور یورپ کی جدید ترقی و انکشافات سے بھی کافی واقفیت رکھتے تھے اور اس بارے میں ہندوستانیوں کی عام متعصبانہ ذہنیت کا ساتھ نہیں دیتے تھے۔ آئین اکبری کی تقریظ میں انہوں نے کتاب کی اہمیت سے جو انکار کیا ہے اگرچہ وہ صحیح نہیں کیوں کہ تاریخی لحاظ سے اس کی حیثیت واضح اور معلوم ہے لیکن ان کے استدلال سے جدید فنون کے علم و اعتراف کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔" (نگارشات آزاد)

بہرحال غالب کی انگریز پرستی یا انگریزی راج کی برکتوں کی قصیدہ خوانی' محض موقع پرستی یا حسن طلب کا مضمون نہیں تھی کم سے کم شروع شروع میں تو اس کا لہجہ مداحی کی بجائے عاشق کا انداز رکھتا ہے اور تاریخ کے جس مرحلے پر اس نے برطانوی حکومت کی فوقیت کا راز جاننے کی کوشش کی وہ تو سرسید کے لیے بھی قابل رشک قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے غالب کو علی گڑھ تحریک کا پیش رو تسلیم کر لینے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیے۔ البتہ یہ رند ہزار شیوہ چونکہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا اس لئے اس نے تاریخ کے ایجنٹوں کا کردار ہی معلوم کرنے تک خود کو محدود نہیں رکھا۔ 1857ء میں دہلی پر انگریزوں کے دوبارہ قبضے کے بعد تباہی آئی' غالب نے اپنے خطوں کے ذریعے اس المیے کی گواہی بھی دی ہے اور اس کی بدولت وہ ان لوگوں کی نظر میں بھی محترم ہے جو اس کی انگریز پرستی سے شدید نف

رکھتے ہیں۔ "دستبنو" کا لہجہ یقیناً نا قابل برداشت ہے اور اس واقعے کو "رستخیز بیجا" کہنا بھی معانی کے قابل نہیں جو تحریک آزادی کا پہلا قدم قرار دیا جا چکا ہے مگر یہ تب کی بات ہے جب شمشیر بغاوت کی دھار کند ہو چکی تھی اور جدوجہد میں لگے ہوئے زخموں پر مرہم رکھنے کی ضرورت تھی۔

یہ بات شروع میں ہی کہی جا چکی ہے کہ غالب کو کسی طرح کھینچ تان کے بھی ایک سیاسی باغی تو قرار نہیں دیا جا سکتا مگر تاریخ کی نئی قوتوں کو محسوس کرنے کی وجہ فکری بغاوت کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی یہ بات البتہ مشکل سے ہی تسلیم کی جائے گی کہ قیام کلکتہ کے دوران غالب پر انگریزی تعلیم کے زیر اثر پیدا ہونے والی نئی اردو نثر کا کوئی سایہ پڑا ہے۔ نہ شیخ اکرام کی اس رائے پر صاد کرنا آسان ہے کہ راجہ رام موہن رائے کا "ریشنل ازم" غالب کے فکری ارتقا میں کچھ اہمیت رکھتا ہے۔ غالب کے ہاں عقل و خرد پر جو اصرار ملتا ہے اسے کلکتہ ہی کی دین نہیں کہا جا سکتا۔ آخر ہماری فکری تاریخ میں بھی یہ رویہ موجود رہا ہے اور یہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں کہ غالب جو طب اور نجوم اور دوسرے قدیم علوم و فنون سے گہری دلچسپی رکھتا تھا۔ حکمائے اسلام کے مسلک سے کلیتہً "ناواقف ہو گا۔ غالب کی بغاوت کو سراسر جدید یورپ کے اثرات کا نتیجہ قرار دینا اس لئے بھی ضروری نہیں کہ اپنے ماحول سے بغاوت کا یہ مطلب نہیں ہو تاکہ اپنی تہذیب اور اس کے جملہ کمالات سے یک قلم انکار کر دیا جائے۔

اصل میں یہی ایک پہلو ایسا ہے جو غالب کی بغاوت کو ____ بیسویں صدی کے باغیوں کے برعکس ___ ایک شائستہ اور نستعلیق لہجہ عطا کرتا ہے جو ماحول کی تلخیوں کو شوخی طبع کے کرشموں میں اور زندگی کے زہر کو غزل کے سوز میں تبدیل کر کے رکھ دیتا ہے۔ غالب کی ابتدائی اردو شاعری پر یورپ کا کوئی اثر نہیں دیکھا گیا اور یہ اس کی زندگی کا سب سے زیادہ باغیانہ اظہار ہے۔ اس کے بعد تو وہ اس بغاوت کو زندگی کے دوسرے عناصر کے ساتھ امتزاج دینے میں مصروف نظر آتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ادب میں بڑی حد تک اس کا رویہ ایک کلاسیکی فن کار کا رویہ ہے۔ وہ اپنے علمی اور ادبی ماحول سے بغاوت کرتا ہے تو بھی اس بغاوت کے سارے جواز اپنی تہذیب اور اس کے کمالات سے فراہم کرتا ہے۔ ہندوستان کے فارسی گو شعراء اور لغت نویسوں کے خلاف اس نے جو پرچم اپنی عمر کے آخری حصے میں اٹھایا ہے اس کی مضبوط کلاسیکی بنیادوں پر شک نہیں کیا جا سکتا چاہے کوئی غالب کی دس پانچ تحقیقی غلطیاں دریافت کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

اردو ادب کی جدید تحریک جس کا آغاز ہی غالب سے ہوتا ہے' اب اپنی فکری نہج اور فنی اظہار کے سانچوں کے سلسلے میں غالب سے بہت دور جا چکی ہے۔ پھر بھی غالب کی رہبری کو تسلیم کرنا ضروری ہے تاکہ ہم نت نئے تجربوں کی دھن میں اپنی تہذیب اور اس کے کمالات سے بالکل ہی لاتعلق ہو کر ہوا میں ہی تحلیل ہو کر نہ رہ جائے۔ بغاوت کے لئے بھی مضبوط فکری اور تہذیبی بنیاد کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ہماری سب شوریدگی ہوا میں معلق نہ ہو جائیں۔ بغاوت کا کوئی بھی اصول قربان کئے بغیر غالب کو خود سے یہ کہنے کی بھی ضرورت پیش آئی۔

برزہ مشتاب و پے جادہ شناساں بردار   اے کہ در راہ سخن چوں تو ہزار مد و رفت

☆ ☆

نور العین نوید

غالب اور حرم

اردو ادب کے ایک عام قاری کے نزدیک مرزا غالب کی شخصیت ایک رند مشرب اور آزاد خیال شاعر کی ہے جو اپنے روزہ مرہ کے معمولات میں مذہبی رسوم و قیود کے سے بے نیاز ہے' اور جو اپنی شاعری میں واعظ اور جنت کا تمسخر اڑاتا نظر آتا ہے۔ غالب کی اس عموی شبیہ کے پیش نظر غالب اور حرم عنوان بظاہر کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ بھلا اس رند مشرب اور آزاد خیال شاعر کو حرم سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر غالب کی شاعری اور شخصیت کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ غالب کو اس موضوع سے خصوصی دلچسپی رہی ہے۔ یہ اس کے پسندیدہ موضوعات میں سے ہے اور اس کی شاعری میں جابجا اس کی جھلک ملتی ہے۔

حرم کا موضوع چونکہ خالص مذہبی موضوع ہے اس لئے اس کا غالب کی مذہبیت سے براہ راست تعلق ہے' لہذا مناسب ہو گا اگر غالب کی مذہبیت کا بھی کچھ ذکر ہو جائے۔ مرزا کے سبھی سوانح نگار اس پر متفق ہیں اور ان سے بڑھ کر خود مرزا کے خطوط میں اس کا اعتراف موجود ہے' کہ وہ مذہبی معاملات میں آزاد خیالی کی روش پر گامزن تھے۔ نماز اور روزے کے پابند نہیں تھے۔ شراب نوشی تو گویا ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ قمار بازی کے سلسلے میں دوبار سزا بھی پا چکے تھے۔ فسق و فجور' کا اعتراف ان کے خطوط میں کثرت سے موجود ہے۔ اس کے علاوہ مذہبی عقائد کی تعبیر میں بھی وہ آزاد خیالی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود انہیں لامذہب یا دہریہ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ جوش کی طرح خدا اور مذہب کے منکر یا باغی نہیں تھے۔ وہ توحید رسالت اور آخرت سب کے قائل تھے' لیکن وہ ان عقائد کی تشریح عامتہ المسلمین کی تشریح سے مختلف طریقے پر کرتے تھے۔ وہ تصوف کے معروف دبستان وحدت الوجود کی فکر روایت سے وابستہ تھے' اور بنیادی عقائد کی تشریح اسی دبستان کے حوالے سے کرتے تھے۔ انہیں اپنے موحد اور صوفی ہونے پر اصرار تھا' جیسا کہ حالی نے غالب کے مرثیہ میں کہا ہے:

بے ریائی تھی زہد کے بدلے　　زہد اس کا اگر شعار نہ تھا

یہ غالب کی بے ریائی اور صاف گوئی ہی ہے جو ان سے اپنی بے عملی میں صاف صاف کہلوا دیتی ہے:

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد　　پر طبیعت ادھر نہیں آتی

طبیعت اور کردار کی اس کمزوری کا غالب کو اعتراف تھا' اس لئے وہ اپنی گنہگاری کو تسلیم اور کفر کا انکار کرتے ہیں۔ ع آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں۔ رشید احمد صدیقی نے کیا خوب کہا ہے: "اگر ان کے اعمال کے کچھ مصرعے تقطیع سے گرتے ہوں تو انہیں کافر نہیں صرف گنہگار سمجھنا چاہیے۔ غالب کو اپنے گنہگار ہونے کا شدید احساس تھا۔ حالی کی نماز پڑھنے کی نصیحت پر ان کا رد عمل دیکھیے۔ انھوں نے کہا: "ساری عمر فسق و فجور میں گزری۔ نہ کبھی نماز پڑھی نہ' روزہ رکھا'------ نہ کوئی نیک کام کیا۔ زندگی کے چند انفاس باقی رہ گئے ہیں۔

اب اگر چند روز بیٹھ کر یا ایماء و اشارے سے نماز پڑھی تو اس سے ساری عمر کے گناہوں کی تلافی کیونکر ہو سکے؟ میں تو اس قابل ہوں کہ جب مروں، میرے عزیز اور دوست میرا منہ کالا کریں اور میرے پاؤں میں رسی باندھ کر شہر کے تمام گلی کوچوں اور بازاروں میں تشہیر کریں اور پھر شہر سے باہر لے جاکر کتوں اور چیلوں اور کووں کے کھانے کو، اگر وہ ایسی چیز کو کھانا گوارا کریں، چھوڑ آئیں۔ اگرچہ میرے گناہ ایسے ہی ہیں کہ میرے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک کیا جائے، لیکن اس میں شک نہیں کہ میں موحد ہوں، ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں۔ لا الہ الا اللہ، لا موجود الا اللہ، لا موثر فی الوجور الا اللہ()

غالباً" اپنے گناہ گار ہونے پر ندامت ہی کے شدید احساس نے غالب سے یہ شعر کہلوایا ہے، جو آج بھی حرم جاتے ہوئے ہر گنگار مسلمان کو یاد آجاتا ہے، اور وہ اپنے آپ کو غالب کا ہم نوا پاتا ہے۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب شرم تم کو مگر نہیں آتی

غالب کے سوانح، ان کے خطوط اور کلام کے مطالعے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ معروف مذہبی اعمال میں انہیں نماز اور روزے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، لیکن زیارت کعبہ اور طواف حرم ان کی دلی آرزو محسوس ہوتی ہے۔ اس آرزو کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے جو وسائل درکار تھے۔ وہ ان کی دسترس میں نہیں تھے، اس لئے ان کی یہ آرزو پوری نہیں ہو سکی۔ لیکن اپنی اس خواہش کا اظہار انہوں نے کئی مواقع پر کیا ہے۔ سب سے پہلا اظہار ۱۸۲۷ء میں ملتا ہے۔ جب غالب کی عمر تیس سال تھی اور وہ کلکتہ جاتے جاتے "معتمد الدولہ بہادر کی امید "پر" "جادہ رہ" "کو کشش کاف کرم" سمجھتے ہوئے لکھنؤ آگئے۔ لکھنؤ کے قیام سے مرزا غالب کی بہت سی امیدیں وابستہ تھیں معتمد الدولہ آغا میرے جس حسن سلوک کے متوقع تھے۔ ان کا اظہار مندرجہ ذیل قطعہ بند اشعار سے ہوتا ہے:

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی ہوس سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو
طاقت رنج سفر بھی نہیں ہائے اتنی ہجر یاران وطن کا بھی الم ہے ہم کو
لائی ہے معتمد الدولہ بہادر کی امید جادۂ رہ، کشش کاف کرم ہے ہم کو

لیکن جب معتمد الدولہ سے مایوسی ہوئی تو انہوں نے قطعہ بند اشعار میں ترمیم کر دی۔ ترمیم شدہ قطعہ جو اب ان کے دیوان میں شامل ہے، اس طرح ہے:

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی ہوس سیرو تماشا، سو وہ کم ہے، ہم کو
مقطع سلسلہ شوق نہیں ہے یہ شہر عزم سیر نجف و طواف حرم ہے ہم کو
لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب جادہ رہ، کشش کاف کرم ہے ہم کو

اس ترمیم شدہ قطعہ کا دوسرا شعر قابل توجہ ہے۔ اس میں غالب نے سیر نجف اور طواف حرم کے عزم کا اظہار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ لکھنؤ کا یہ سفر تو ان کے سلسلہ شوق کی ایک کڑی ہے، مقطع نہیں ہے، بالفاظ دیگر مقطع سلسلہ شوق تو سیر نجف و طواف حرم ہے۔ غالب کے نہاں خانہ دل میں طواف حرم کی جو آرزو تھی، عین عہد

شباب میں اس کا یہ پہلا واضح شوق اظہار ہے۔

اس شوق کے اظہار کا ایک اور موقع غالب کو ۱۸۵۱ء میں ملا۔ جب ان کی عمر ۵۴ سال کی تھی۔ اس سال بہادر شاہ ظفر نے حج پر جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ غالب نے موقع غنیمت جانتے ہوئے اپنے جانے کی خواہش کا اظہار کیا اور غزل کہی جس کا مطلع تھا:

منظور تھی یہ شکل، تجلی کو نور کی　　　قسمت کھلی ترے قدو رخ سے ظہور کی

اس غزل کا مقطع یوں ہے:

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں　　　حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

مولانا حالی "یادگار غالب" میں اس شعر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اس شعر سے مرزا کی کمال شوخی طبع ظاہر ہوتی ہے۔ یہ غزل اس زمانے میں لکھی تھی جب کہ بہادر شاہ مرحوم کا ارادہ حج کو جانے کا تھا۔ مرزا اس سفر میں بادشاہ کے ساتھ جانے کا کمال اشتیاق ظاہر کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے لئے یہ منت مانتے ہیں کہ حج کا ثواب حضور کی نذر کروں گا۔ ادھر سفر حج کا وہ اشتیاق اور ادھر حج کے ثواب کی یہ بے قدری۔"

حالی کے علاوہ ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی اس شعر پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"اس آرزو میں سیر کا جذبہ حصول ثواب کے جذبہ پر غالب تھا"۔ لیکن غلام رسول میرے ان خیالات سے متفق نہیں۔ وہ لکھتے ہیں (۳) "تعجب ہے کہ خواجہ مرحوم جیسے بالغ نظر اور در حقیقت فہم انسان نے فرمایا۔ ادھر سفر حج کا وہ اشتیاق اور ادھر حج کے ثواب کی بے قدری، حالانکہ مرزا نے صرف انتہائے اشتیاق حج کا اظہار کیا ہے۔ جو شخص حج کرے گا وہ ادائے فرض کا ثواب بہرحال پائے گا۔ لیکن جس شخص کی وجہ سے اسے یہ سعادت نصیب ہو گی وہ اپنی جگہ ثواب کا حق دار ہو گا' کیونکہ اس نے ایک نیک کام میں مدد کی۔ مرزا' شاعرانہ طریق پر صرف یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ انہیں ان پاک مقامات دیکھنے کی کتنی آرزو ہے' جنہیں ہم حرمین شریفین کہتے ہیں۔ ان کے دیکھنے سے دل اور روح میں جو بالیدگی پیدا ہو گی' اس کی خاطر وہ حج کا ثواب بھی چھوڑنے کے لئے تیار ہیں۔ مطلب یہ نہیں کہ ان کے چھوڑنے سے ثواب واقعی چھن جائے گا۔ مطلب صرف یہ ہے کہ اس مقدس سفر کا جو اصل ثواب ہے وہ بھی کوئی لے لے لیکن ان کی زیارت کرا وے' اسلام کے اس بنیادی فریضے کو ادا کرنے کا موقع بہم پہنچا دے۔ حرمین شریفین کی زیارت کا انتہائی اشتیاق معاذ اللہ ثواب حج کی ناقدری کا موجب نہیں بن سکتا۔ یہ شاعری ہے' اس میں منطق سے کام نہ لینا چاہیے۔ ہر استدلال کو شاعری ہی کے نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔"

غالب کے کعبہ جانے کی آرزو کا ایک ذکر اس خط میں ملتا ہے جو انہوں نے اپنی قمار بازی کی سزا پانے کے بعد اپنی رسوائی اور مصائب سے دل برداشتہ ہو کر لکھا ہے۔ ۱۲۶۴ھ (جب ان کی عمر ۵۲ سال تھی) کا یہ خط فارسی میں لکھا گیا تھا اور حالی نے اس کا اردو ترجمہ یادگار غالب' میں نقل کیا ہے۔ اس خط میں ہمیں یہ جملے ملتے ہیں۔

"اگرچہ میں اس وجہ سے کہ ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جا سکتا' جو کچھ گزرا' اس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گزرنے والا ہے' اس پر راضی ہوں' مگر آرزو کرنا آئین عبودیت کے خلاف نہیں۔ میری یہ آرزو ہے کہ میں اب دنیا میں نہ رہوں۔ اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں۔ روم ہے' مصر ہے' ایران ہے' بغداد ہے' یہ بھی جانے دو' خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانہ رحمت للعالمین دل داروں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھئے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جانفرسا نجات پاؤں اور بغیر اس کے کہ کوئی منزل مقصود قرار دوں سر بصحرا نکل جاؤں۔ یہ ہے جو کچھ مجھ پر گزرا ہے اور یہ ہے جس کا میں آرزو مند ہوں۔"

اس خط میں ہم جس غالب سے دو چار ہوتے ہیں وہ ایک دل شکستہ اور مایوس انسان ہے' جو قمار بازی کی رسوائی سے دو چار ہے اور جس نے قید خانے میں یہ شعر کہے ہیں:

راز دانا غم رسوائی جاوید بلاست   بہر آزار غم از قید فرنگم نبود

جور اعداروود از دل بہ رہائی لیکن   طعن احباب کم از زخم خدنگم نبود

وہ طعن احباب اور غم رسوائی کی وجہ سے ہندوستان سے ہجرت کر کے کہیں جانا چاہتا ہے اور اس ضمن میں اسے کعبہ کا بھی خیال آتا ہے' جو بقول اس کے' آزادوں کی جائے پناہ ہے' ڈاکٹر وزیر آغا نے اس خط پر بھی تبصرہ کیا ہے' وہ لکھتے ہیں۔ :

"غالب سے منسوب یہ بیان اس اعتبار سے بہت دل چسپ ہے کہ یہ غالب کی دبی ہوئی آرزوئے سیاحت کی نشاندہی کرتا ہے۔ ہرچند انہوں نے انتہائی دکھ کے عالم میں یہ الفاظ لکھے۔ لیکن دیکھئے کہ سیر کے لئے ان تمام جگہوں کے نام لے گئے جہاں وہ جانا چاہتے تھے۔ حد یہ کہ کعبہ کا بھی ذکر کر دیا اور یہ اس طور آیا کہ وہ کعبہ کی زیارت سے اپنے دکھوں کا مداوا چاہتے تھے' لیکن میرا اندازہ ہے کہ دراصل طواف کعبہ بھی ان کے سلسلہ شوق ہی کی ایک کڑی ہے نہ کہ کسی روحانی طلب کی تسکین کا ذریعہ۔ اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ ان کے اس بیان میں کعبہ ان کی آخری منزل نہیں۔ وہ بات ایران اور مصر کے ذکر سے شروع کرتے ہیں اور کعبہ کا ذکر کرتے ہوئے۔ منزل مقصود تک سے بے نیاز ہو کر سر بصحرا ہو کر نکل جانے کی آرزو کرنے لگتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ سفر کے طالب تھے نہ کہ کسی خاص منزل کے۔ دوسرا ثبوت یہ ہے کہ جب ایک بار ان کے ممدوح نے حج کا ارادہ کیا تو غالب کے دل میں بھی ساتھ جانے کی آرزو پیدا ہوئی۔ مگر اس آرزو میں سیر کا جذبہ حصول ثواب کے جذبے پر غالب تھا۔

چنانچہ برملا کہا:

غالب' گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں   حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

ڈاکٹر وزیر آغا کا یہ تبصرہ بعض اعتبار سے محل نظر ہے اور اسے جزوی طور پر صحیح کہا جا سکتا ہے۔ لکھنؤ والے شعر کہتے وقت غالب کی عمر تیس سال تھی۔ اس وقت غالب جوان تھا اور اس وقت حرم جانے کی آرزو اس

کے دلی شوق کی غماز معلوم ہوتی ہے' اور ڈاکٹر وزیر آغا کے "نظریہ سیاحت" سے بھی اس کی تشریح کی جا سکتی ہے' لیکن مزکورہ بالا خط لکھتے ہوئے اور حج کے ثواب والا شعر کہتے وقت غالب کی عمر بالترتیب ۵۰ اور ۵۲ سال تھی۔ وہ حادثہ اسیری کی رسوائی کی وجہ سے دل شکستہ تھے' اور اس وقت ان پر سیاحت سے زیادہ ملک سے ہجرت کرنے کا جذبہ غالب تھا۔ جوانی کے عالم میں سیرو عافیت کی آرزو کرنا اور بات ہے' اور بدنامی اور رسوائی سے بچنے کی خاطر ملک چھوڑنے کی آرزو کرنا دوسری بات ہے۔ اس خط کے الفاظ اور لہجے پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ غالب کے پیش نظر اس طرح کی کوئی سیاحت نہیں تھی جو "مثنوی دیر" والے بنارس اور "اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے" والے کلکتے کی مانند ہو۔ وہ درماندگی کی قید سے (جسے وہ گزری ہوئی قید سے زیادہ جاں فرسا سمجھتے تھے) نجات پانا چاہتے تھے' مکہ اور مدینہ جانا چاہتے تھے کیونکہ وہ کعبہ کو "آزادوں کی جائے پناہ" اور "آستانہ رحمت للعالمین کو دل داروں کی تکیہ گاہ" سمجھتے تھے۔ ان الفاظ کے ہوتے ہوئے جو صریحا" روحانی طلب کی تسکین "ہونے کا مفہوم دیتے ہیں' کوئی دوسرا مفہوم لینا صحیح نہیں ہے۔ یہ الفاظ کسی شعر سے نہیں لئے گئے جہاں ان کا مفہوم سمجھنے میں قدرے آزادی ہوتی ہے' بلکہ یہ ان کے نثری خط سے لئے گئے ہیں' جو ایک مایوس اور درماندہ انسان کی روحانی آرزو کا آئینہ دار ہے

غالب کی تحریروں میں یہ تین مواقع ایسے ہیں جن میں غالب نے حرم جانے کی خواہش کا اظہار واضح اور غیر مبہم انداز میں کیا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ بھی غالب کے کئی اشعار ہیں جن میں حرم جانے کے شوق کا ذکر ہے۔ ان میں دو نمایاں اشعار وہ ہیں جو مروجہ دیوان میں نہیں ہیں۔ لیکن نسخہ حمیدیہ میں موجود ہیں۔

کفر ہے غیر از دفور شوق رہبر خواستن　　راہ صحرائے حرام میں ہے جرس ناقوس بس
بوقت کعبہ جوئی ہا' جرس کرتا ہے ناقوسی　　کہ صحرا' فصل گل میں' رشک ہے بتخانہ چین کا

چونکہ نسخہ حمیدیہ غالب کی ۲۵ سال کی عمر میں مرتب ہو چکا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر انہوں نے ۲۵ سال کی عمر سے پہلے کہے تھے اور یہ موضوع ان کے ذہن میں اوائل شباب ہی سے تھا۔

غالب کے اردو کلام کی طرح ان کا فارسی کلام بھی آرزوئے حرم کے ذکر سے خالی نہیں ہے۔ اس کی نمایاں مثال وہ غزل مسلسل ہے جس کا مطلع ہے:

رفت آنکہ کسب بوئے تو از باد کردے　　گلگ دیدے وروئے ترا یاد کردے

اس غزل کے کچھ اور اشعار یوں ہیں۔

رفت آنکہ گر براہ تو جاں دادی ز ذوق　　از موج گرد رہ' نفس ایجاد کردے
اکنوں خود از وفائے تو' آزارمی کشم　　رفت آنکہ از جفائے تو فریاد کردے
غالب ہوائے کعبہ بسر جا گرفتہ است　　رفت آنکہ عزم نلخ و نوشاد کردے

اس غزل کے بارے میں نیاز فتح پوری لکھتے ہیں (۲):

"یعنی وہ زمانہ گیا جب ہوا سے تیری خوشبو حاصل کیا کرتا تھا اور جب کوئی پھول نظر آتا تھا تو تیری صورت سامنے آجاتی ہے' وغیرہ وغیرہ' اب تو خود تیری وفا سے مجھے آزار ہوتا ہے' اور کسی دوسری درگاہ سے اتنا دل وابستہ ہو چکا ہے کہ تیرے ظلم و ستم کا شکوہ بھی اب کوئی معنی نہیں رکھتا۔ غالب نے یہ غزل غالباً" اس وقت کہی ہے جب زیارت کعبہ کی خواہش اس کے دل میں شدت سے موجزن تھی اور ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں غزل محض نعتیہ رنگ اختیار کر لیتی جو بالکل پھیکا ہوا کرتا ہے' لیکن غالب نے جس خوبی سے تغزل کو قائم رکھا ہے اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ اگر آپ مقطع نکال دیں تو یہ واسوخت کے رنگ کی مسلسل غزل ہو جاتی ہے۔"

اس غزل مسلسل کے علاوہ فارسی کے مندرجہ ذیل اشعار بھی ملاحظہ ہوں:

روم بکعبہ زکوئی تو وزحق تجلم — زسجدہ جبہ داز پوزشم زبان خالیست
بے گناہم پیر دیر از من مرنج — من بہ مستی بستہ ام احرام را
براہ کعبہ زادم نیست شادم کز سبک ساری — بہ رفتن پائے ہر خار مغیلانم نمی آید
دگر زایمنی راہ و قرب کعبہ چہ حظ — مراکہ ناقہ ز رفتار ماند و پا خفتست

حرم کی زیارت کے خواہش مند اگر اسباب مہیا نہ آنے پر زیارت سے محروم رہیں تو ان کی آتش شوق اور بھڑکتی ہے۔ ان کی دلی کیفیت کی ترجمانی اس شعر سے ہوتی ہے:

پروانے جو شمع تک نہ پہنچے — احساس کی لو پہ جل رہے ہیں
(فصیح چغتائی)

غالب کے ہاں زیارت حرم سے محرومی پر احساس کی لو پہ جلنے کی یہ کیفیت پوری طرح نمایاں نظر آتی ہے ان کی تحریروں میں حرم کی آرزو کا بار بار تذکرہ اور عمر کے مختلف مراحل میں موقع بموقع اس خواہش کا اظہار اس امر کا غماز ہے کہ زیارت حرم ان کی دلی خواہشوں میں سے ایک تھی' اور قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جب انہوں نے یہ شعر کہا تھا:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے — بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

تو اس رند مشرب شاعر کے پیش نظر جہاں دوسری ہزاروں خواہشیں ہوں گی۔ وہاں حرم جانے کی خواہش بھی ان میں شامل رہی ہو گی' اور جن ارمانوں کے پورا نہ ہونے کا اسے افسوس ہو گا' اس میں حرم نہ جانے کا ارمان بھی شامل رہا ہو گا۔

دنیا عالم اسباب ہے۔ اسباب مہیا نہ ہونے کی بنا پر غالب کو حرم جانے کا موقع نہ مل سکا' لیکن تخیل کی دنیا اسباب کی محتاج نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ غالب نے حرم کا یہ سفر بھی "رہ وادی خیال" کے سفر کی طرح مستانہ وار طے کیا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس سفر کے کئی مرحلوں کا ذکر غالب کے اشعار میں اس طرح ملتا ہے جیسے وہ سچ مچ یہ سفر طے کر چکے ہوں۔ اس "تخیلی سفر" کو شروع کرتے ہی جہاں وہ ایک طرف عالم شوق سے دو چار ہیں وہاں دوسری طرف احساس ندامت بھی دامن گیر ہے۔ سفر شروع کرتے ہیں کہتے ہیں۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب ‌ ‌ ‌ شرم تم کو مگر نہیں آتی

روم بکعبہ ز کوئی تو وزحق تجلم ‌ ‌ ‌ زسجدہ جبہ و از پوزشم زبان خالیست

حجاج کے قافلے حرم کے لئے روانہ ہوتے ہیں تو یہ بھی ان کے ہمراہ چل پڑتے ہیں۔ شوق اور ایمان انہیں کعبہ لے جانا چاہتے ہیں لیکن تشکیک ان کا راستہ روکنا چاہتی ہے اور انہیں آگے بڑھنے نہیں دیتی:

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر ‌ ‌ ‌ کعبہ مرے پیچھے ہے' کلیسا مرے آگے

اس کش مکش کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ بار بار راستے سے واپس آجاتے ہیں۔

وہ نہیں ہم کہ چلے جائیں حرم میں اے شیخ! ‌ ‌ ‌ ساتھ حجاج کے اکثر کئی منزل آئے

بالاخر ایمان کا جذبہ تشکیک پر غالب آجاتا ہے اور وہ حرم کے سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں۔ ان کے پاس نہ تو زاد راہ ہے اور نہ کوئی رہبر ہے' لیکن یہ بھی ان کے جذبہ شوق پر مہمیز کا کام کرتے ہیں۔

براہ کعبہ زادم نیست شادم کزسبک ساری ‌ ‌ ‌ یہ رفتن پائے ہر خار مغیلانم نمی آید

کفر ہے غیر از وفور شوق رہبر خواستن ‌ ‌ ‌ راہ صحرائے حرم میں ہے جرس ناقوس بس

وہ تخیل کے سہارے شوق کا یہ سفر طے کرتے ہی۔ں زاد راہ کی کمی اور رہبر نہ ہونے کی وجہ سے سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے حرم کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن قرب حرم کی خوشی کے باوجود سفر کی وجہ سے یہ حالت ہو جاتی ہے:

دگر ز ایمنی راہ و قرب کعبہ چہ خظ ‌ ‌ ‌ مرا کہ ناقہ ز رفتار ماند و پا خفتست

ضعف کے مارے وہ پکار اٹھتے ہیں:

منعم بکعبہ مرتبہ قرب خاص داد ‌ ‌ ‌ سجادہ گستری تو و من بستر افگنم

بہرصورت یہ مرحلہ بھی طے ہو جاتا ہے۔ وہ طواف کے لئے احرام باندھتے ہیں اور زمزم پہ جاتے ہیں' لیکن ہو جانتے ہیں کہ شراب نوشی کی عادت ان سے وہاں بھی نہیں چھٹے گی اور شراب کے دھبے ان کے احرام کو مے آلود کر دیں گے۔ انہیں احساس ہے کہ اگرچہ وہ عبادت کے لئے تیار ہیں لیکن بری عادتیں اس درجہ راسخ ہو چکی ہیں کہ وہ عبادت کی تیاری میں بھی حائل ہو رہی ہیں۔ اس مرحلے پر انہیں اپنے مرشد بیدل کا خیال آتا ہے اور وہ ان سے راہنمائی طلب کرتے ہیں۔ بیدل کا جواب یہ ہے۔

اگر آلودہ احرام غیری ‌ ‌ ‌ اگر ہم کعبہ باشی ننگ دیری

چنانچہ احرام باندھنے اور زمزم پر پہنچنے کے باوجود اپنے آپ کو طواف حرم سے قاصر پاتے ہیں۔

رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم ‌ ‌ ‌ دھوئے دھبے جامہ احرام کے

زم زم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طواف حرم سے ‌ ‌ ‌ آلودہ بہ مے جامہ احرام بہت ہے

اپنے احرام کی آلودگی کا یہ احساس انہیں ایک عجیب کیفیت سے دو چار کر دیتا ہے اور جوار کعبہ میں موجودگی کے باوجود ان کے قدم طواف حرم کے لئے نہیں اٹھتے۔ وہ غالب جو کبھی "مقطع سلسلہ شوق" طواف حرم

بیتا تھا' عالم تصور میں بھی کعبہ کا طواف نہیں کرپاتا۔ اس کے اشعار میں طواف کوئے ملامت کا تذکرہ تو ملتا ہے لیکن طواف حرم کی کسی بھی کیفیت کا ذکر نہیں ملتا۔ تعجب ہے کہ کعبہ اور اس کے متعلقات کا ذکر تو غالب کے ہاں بہت ہے لیکن اس کے سب سے اہم رکن یعنی طواف حرم کی کیفیات کا ذکر اس کے اشعار سے بالکل غائب ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ اقبال بھی اگرچہ حرم جانے کی سعادت سے محروم رہے۔ لیکن عالم تصور میں وہ طواف حرم سے محروم نہیں رہے:

کمال جوش جنوں میں رہا میں گرم طواف — خدا کا شکر' سلامت رہا حرم کا غلاف

غالب نے ایک جگہ اقرار کیا ہے:

رموز دین نشاسم درست و معذورم — نہاد من عجمی و طریق من عربی ست

غالب کی طبیعت کی اس عجمیت میں فارسی شاعری کی روایات کا بہت دخل ہے۔ ان روایت میں ایک اہم ذات وحدت الوجود کے عقیدے کا شعری اظہار ہے۔ اس عقیدے کی رو سے کائنات کی ہر شے میں ایک ہی وجود جلوہ فرما ہے اور ہر شے کی حقیقت ایک ہی ہے' لہٰذا کفرو اسلام میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کعبہ اور بت خانے میں اسی ایک ذات کی جلوہ فرمائی ہے۔ عبادات کی ظاہری اشکال بے معنی ہیں' وغیرہ وغیرہ۔ ان عقائد کے اثرات فارسی کے مشہور شعراء کے کلام میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ صرف کعبہ ہی کے حوالے سے چند مشہور فارسی شعراء کے شعر ملاحظہ ہوں:

نظیری
دیر و حرم کہ دشمنی کفر و دیں چہ است
از یک چراغ کعبہ و بت خانہ روشن است

عرفی
ہرگز گو کہ کعبہ ز بت خانہ خوشتر است
ہر جا کہ ہست جلوۂ جانا نہ خوشتر است

قیسهاں دفترے را ی پرستند
حرم جویاں درے را ی پرستند
بر افگن پردہ' تا معلوم گردد
کہ یاراں دیگرے را ی پرستند

فیضی
آنکہ میگو مرا منع پرستیدن بت
در حرم رفتہ طواف در و دیوار چہ کرد

جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے' غالب توحید وجودی کے قائل تھے اور یہ عقائد ان کے اندر رچ بس گئے تھے۔ ان عقائد کا فنکارانہ اظہار غالب کے اشعار میں ملتا ہے۔ کعبہ' بت خانہ اور دیر و حرم کے معاملے میں بھی انہوں نے بیشتر اسی عجمی روایت کی پیروی کی ہے جو فارسی شاعری میں دبستان وحدت الوجود کے اثرات سے پیدا ہوئی اور پروان چڑھی۔ غالب اگرچہ پامال مضامین سے پرہیز کرتے تھے لیکن کعبہ کے سلسلے کے بیشتر اشعار میں انہی

روایتی خیالات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان اشعار میں نزاکت خیال اور شعر کہنے کا وہ منفرد انداز ملتا ہے جو غالب کے ساتھ ہی مخصوص ہے اور جس کی وجہ سے یہ اشعار اردو ادب میں ضرب الامثال کا درجہ اختیار کر چکے ہیں:

کعبہ میں جا رہا تو نہ دو طعنہ' کیا کہیں　　بھولا ہوں حق صحبت اہل کنشت کو
اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں　　اس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے
کعبے میں جا بجائیں گے ناقوس　　اب تو باندھا ہے دیر میں احرام
سر پائے خم پہ چاہیے ہنگام بے خودی　　رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیے
خدا کے واسطے پردہ نہ کعبہ سے اٹھا ظالم　　کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے
تیرے کوچے کا ہے سائل دل مضطر میرا　　کعبہ اک اور سہی' قبلہ نما اور سہی
مقصود ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست　　ہر جا کنیم سجدہ باں آستاں رسد

کعبہ کے موضوع پر غالب کے بیشتر اشعار میں ہمیں یہی وحدت الوجود کی فکری روایت ملتی ہے لیکن چند اشعار ایسے بھی ہیں جو ان اثرات سے پاک ہیں اور عامۃ المسلمین کے عقائد سے متصادم نہیں۔ ان میں سب سے نمایاں شعر یہ ہے:

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود　　قبلہ کو اہل نظر' قبلہ نما کہتے ہیں۔

یہ شعر اپنی صحیح فکر' خیال کی ندرت اور طرز بیان کی انفرادیت کی وجہ سے غالب کے بہترین اشعار میں شمار ہوتا ہے' اور اسے اس موضوع پر غالب کا خصوصی اضافہ سمجھنا چاہیے۔

دوسرے فارسی اشعار جو وحدت الوجودی اثرات سے پاک ہیں' یوں ہیں:

خلد را نہادم من' لطف کوثر از من جوئی　　کعبہ را سوادم من شور زمزم از من پرس
ردم بکعبہ ز کوئی تو وز حق خجلم　　زسجدہ جبہ و از پوزشم زبان خالیست
اگر بشرع سخن درمیاں بگر دانی　　ز سوئے کعبہ رخ کارواں بگردانی

غالب نے بعض اشعار میں کعبہ کو اپنے عقائد کے اظہار کے لئے نہیں بلکہ علاماتی انداز میں پیش کیا ہے اور اس کے حوالے سے چند مخصوص کیفیات یا ترجیحات پیش کی ہیں:

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم　　الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا
ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر　　کعبہ میرے پیچھے ہے' کلیسا میرے آگے
وفا داری بشرط استواری اصل ایماں ہے۔　　مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو
گو واں نہیں پر واں سے نکالے ہوئے تو ہیں　　کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

ان اشعار میں غالب نے خود داری' وفاداری کی صفات اور کش مکش اور تعلق نسبتی کے مضامین کو کعبہ کے حوالے سے جس فنکاری سے پیش کیا ہے' اس کی وجہ سے ان مضامین پر غالب کے یہ اشعار خود حوالے کے

اشعار بن گئے ہیں۔

حرم کے متعلقات میں جہاں غالب نے کعبہ' زمزم اور احرام کا ذکر کیا ہے' وہاں لباس کعبہ اور حجر اسود بھی ان کے اشعار کا موضوع بنے ہیں۔ لباس کعبہ کے بارے میں کہتے ہیں۔:

مشکیں لباس کعبہ علیؑ کے قدم سے جان   ناف زمین ہے' نہ کہ ناف غزال ہے

اسی طرح مومن کے مرثیہ میں کہتے ہیں:

کافر باشم اگر بمرگ مومن   چوں کعبہ سیہ پوش نے باشم ہمہ عمر

چکنی ڈلی کو حجر اسود سے تشبیہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

حجر اسود دیوار حرم کیجئے فرض   نافہ آہوئے بیابان ختن کا کہیے

حرم کی داستان چھڑے تو معماران حرم کا تذکرہ ہو جاتا ہے' چنانچہ غالب نے معماران حرم کو بھی نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے' فرماتے ہیں:

بامن میاویز اے پدر' فرزند آذر رانگر   آں کس کہ شد صاحب نظر' دین بزرگاں خوش نکرد

فرزند زیر تیغ پدر می دھر گلو   گر خود پدر در آتش نمرود میرود

زخونیکہ در کربلا شد سبیل   ادا کرد وام زمان خلیل

پہلے شعر میں غالب نے اپنی آزاد خیالی یا صاحب نظری کے جواز میں حضرت ابراہیمؑ کے اسوہ سے سند حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور بعد کے دونوں اشعار میں معماران حرم کی عظمت کا قصیدہ پڑھا ہے۔ آخری شعر پڑھتے ہوئے بے اختیار اقبال کا یہ شعر یاد آتا ہے:

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستان حرم   نہایت اس کی حسینؓ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

اگرچہ غالب کی زندگی میں بھی زیارت حرم کی آرزو کا تذکرہ جا بجا ملتا ہے لیکن ان کے کلام کا تو یہ خصوصی موضوع محسوس ہوتا ہے۔ اس موضوع پر انہوں نے کبھی واقعاتی' کبھی روایتی' کبھی تمثیلاتی اور کبھی علامتی انداز میں معنی آفرینی کی ہے۔ یہ سب اس بات کے شاہد ہیں کہ اس موضوع سے انھیں غیر معمولی دلچسپی تھی اور یہ ان کے نظام فکر کا ایک اہم جز ہے۔

حواشی

۱۔ شخصیت اور شاعری

۲۔ یادگار: اس سلسلے میں مولانا حالی اور غالب کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی، اس کے آخر میں غالب نے ایک قطعہ لکھ بھیجا جس کے دو شعر یہ ہیں۔

گزشتہ عمر و ہندم اگر بفرض محال برآں سرم کہ دراں عمر ایں دو کار کنم
یکے ادائے عبادات عمر پیشینہ دوم بیارگہ حالی اعتذار کنم

۳۔ نوائے سروش

۴۔ غالب کی آوارہ خرامی "نقوش' غالب نمبر"

۵۔ حالی نے یادگار غالب میں لکھا کہ اس وقت غالب کی عمر ۴۰ سال تھی لیکن یہ بات انہوں نے اندازاً" لکھی ہے' غالب کو کلکتے کا سفر ۱۸۲۷ء میں پیش آیا تھا۔ اس حساب سے اس وقت ان کی عمر ۳۰ سال تھی۔

۶۔ غالب کی فارسی غزل۔ نگار غالب نمبر'

ڈاکٹر وزیر آغا

غالب ---- ایک جدید شاعر!

غالب کو جدید شاعر ثابت کرنے کے لیے جو دلائل عام طور سے دیے جاتے ہیں ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ آج کے جدید شاعر کی طرح غالب بھی تنگنائے غزل سے برگشتہ تھا اور چاہتا تھا کہ غزل کے بجائے کسی اور صنف شعر میں اپنی ذات کو سمونے کا اہتمام کرے۔ دوسری دلیل یہ دی جاتی ہے کہ غالب کے ہاں ابہام کی وہ کیفیت موجود ہے جو جدید شاعری کا ایک وصف خاص قرار پائی ہے۔ اس لیے جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے غالب اپنے زمانے کی بہ نسبت جدید دور سے زیادہ تعلق رکھتا ہے۔ تیسری دلیل یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے سے بہت آگے تھا۔

اگر غالب کی جدیدیت کا تمام تر انحصار انہی دلائل پر ہے تو پھر ہمیں غالب کی جدیدیت کو خدا حافظ کہنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ مثلاً غالب نے غزل کی تنگ دامانی کا جو شکوہ اپنی ایک غزل میں کیا ہے وہ محض ایک اضطراری فعل ہے جو غالب کے عقیدے سے قطعاً" کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ غالب غزل کے علاوہ مثنوی اور قصیدہ بھی لکھ رہا تھا۔ اس لیے محض غزل لکھتے چلے جانے کی اسے کوئی پابندی نہ تھی۔ اس کے باوجود اگر اس نے بہترین شاعری اردو اور فارسی غزل میں کی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ غزل کے ظرف میں اپنی ذات کو پوری طرح سمو رہا تھا۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ آج کے دور میں جدید شاعر نے جس خوبی سے غزل کو ذریعہ اظہار بنایا ہے اس سے یہ سارا نظریہ ہی باطل ہو گیا ہے کہ جدیدیت کے لیے غزل کے پیانے کو ترک کرنا ضروری ہے۔ دوسری دلیل ابہام کے بارے میں ہے۔ اگر ابہام سے مراد تہہ داری ہے تو یہ خصوصیت کسی ایک دور تک محدود نہیں چنانچہ اس پر بنا پر غالب کو جدید شاعر کہنا بہت مشکل ہے اور اگر ابہام سے مراد اسلوب کا پیچیدہ اور گنجلک ہوتا ہے تو اول تو اسے خوبی کہنا ہی محال ہے۔ دوم غالب کے بہترین اشعار اسلوب کی تازگی اور ندرت اور بیان کی صفائی اور کاٹ کے لیے مقبول ہیں نہ کہ اسلوب کی کسی گنجلک کیفیت کے باعث! آخری دلیل یہ دی جاتی ہے کہ غالب کو اس کے اپنے زمانے نے دریافت نہ کیا۔ مگر جب اس بات کو ملحوظ رکھ کر سوچا جائے کہ غالب کو اس کے اپنے زمانے میں استاد کا درجہ ملا اور وہ استاد شہ بھی مقرر ہوا اور اس نے اپنے معاصرین کو اس درجہ مرعوب کیا کہ وہ اس کے اشعار کی تحریف لکھنے یا اس سے بے اعتنائی برتنے پر مجبور ہوئے تو پھر "دریافت کا مسئلہ بھی کھٹائی میں پڑ جاتا ہے۔ غرض غالب کی جدیدیت مندرجہ بالا دلائل میں سے کسی ایک کے سہارے بھی قائم نہیں بلکہ جدیدیت کے اس مفہوم کے تابع ہے جو بیسویں صدی کی متعدد کروٹوں سے مرتب ہوا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جدیدیت کا یہ مفہوم کیا ہے اور غالب کی شاعری کس طرح مفہوم کے جملہ پہلوؤں پر

محیط ہے؟ اس ضمن میں پہلی بات تو یہ ہے کہ جدیدیت ہمیشہ تخریب اور تعمیر کے سنگم پر جنم لیتی ہے اور اس لیے جہاں ایک طرف یہ ٹوٹ پھوٹ اور انتشار کے جملہ مراحل کی نشان دہی کرتی ہے، اس "نئے پیکر" کے ابھرنے کا منظر بھی دکھاتی ہے جو قدیم سے برآمد ہو رہا ہوتا ہے۔ یوں تو ہر گزرتا ہوا زمانہ جدید کہلانے کا مستحق ہے لیکن ضروری نہیں کہ اسے فکری یا فنی اعتبار سے "جدیدیت" کا حامل بھی قرار دیا جائے۔ جدیدیت صرف اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب فکری تناؤ ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے، جہاں مسلمہ اقدار اور آداب ریزہ ریزہ ہونے لگتے ہیں اور اقدار و آداب کی ایک نئی کھیپ وجود میں آنے کے لیے برقرار ہو جاتی ہیں دلچسپ بات یہ ہے کہ جدیدیت کے دور میں نظروں کے سامنے خول تڑخنے اور ٹوٹنے کا منظر اس قدر اہم اور نمایاں ہوتا ہے کہ وہ اس داخلی تحرک کو بالعموم گرفت میں لینے میں ناکام رہ جاتی ہیں جو زمانے کے باطن میں چھپا ہوتا ہے۔ ایک بڑے شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ بیک وقت ان دو حقیقتوں کے سنگم پر کھڑے ہو کر شعر کہتا ہے یعنی ایک طرف تو وہ شکست و ریخت کا ناظر بن کر نمودار ہوتا ہے اور دوسری طرف اندر کی دھڑکن کا نباض بن کر خود کو منکشف کرتا ہے۔ چنانچہ جدیدیت کی حامل شاعری میں ایرانہ یا ویسٹ لینڈ کا تصور عام طور سے ملے گا جس میں ہر چیز تڑختی جھڑتی اور فنا پذیر ہوتی ہوئی نظر آئے گی۔ یہ ویرانہ برفستان کی صورت بھی اختیار کر سکتا ہے اور پیاس کی صحرا کی بھی اس اور بنجر پہاڑوں کا کرب انگیز منظر بھی نظر آ سکتا ہے اور یہ ان بڑے بڑے مشینی شہروں کی صورت میں بھی ڈھل سکتا ہے جن میں افراد انبوہ میں رہتے ہوئے بھی خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔ غرض ایک شدید پیاس، تھکاوٹ تنہائی، کا کرب اور شکست و ریخت میں مبتلا ہونے کا ایک گہرا احساس اس ویرانے کے ہر باسی کا نوشتہ تقدیر ہے۔ بیسویں صدی میں فکر اور جذبہ میں جو بے پناہ خلا پیدا ہوا ہے اور سائنسی انکشافات اور معتقداتی رجحانات میں جو خلیج وجود میں آئی ہے اس سے صدیوں پرانے نظام حیات میں بڑی بڑی دراڑیں پیدا ہوئی ہیں اور ہر قدر اور ہر نظریہ شک و شبہ کی زد میں آگیا ہے مجموعی اعتبار سے دیکھئے تو بیسویں صدی کے فکری اور جذباتی ویسٹ لینڈ میں رہتے ہوئے ہر فرد کو اپنے ماضی، اپنی زمین اور اپنے سماج سے منقطع ہو جانے کے کرب سے گزرنا پڑا ہے اور وہ اپنے چاروں طرف ٹوٹتی اور گرتی ہوئی دیواروں کو دیکھ کر چیخ اٹھتا ہے۔ چنانچہ آج کی شاعری اس شکست و ریخت پر ایک نوحہ کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ خود اردو نظم اور غزل نے بیسویں صدی کے انسان کے اس کرب کو پوری فنی دیانت سے پیش کیا ہے مگر غور کیجئے کہ آج سے سو برس پہلے جب معاشرہ میں ابھی شکست و ریخت کی بالکل ابتدا تھی اور زندگی بظاہر پرسکون متوازن اور جڑی ہوئی تھی تو غالب وہ واحد شخص تھا جس نے بیسویں صدی کے ویسٹ لینڈ کے ابھرتے ہوئے سایوں کو دیکھا اور اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ کو سنا اور پھر اپنے تجربات کو شعر میں پوری طرح منتقل کر دیا مثلاً غالب کے یہ چند اشعار لیجئے جنہیں پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہیں جیسے کوئی بیسویں صدی کے نصف آخر کے ذہنی اور جذباتی ویسٹ لینڈ میں رہ رہا ہو۔

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیے تھمے،
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم وطن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز
گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا!
اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا
بوئے گل' نالہ دل' درد چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

مگر ویسٹ لینڈ محض ایک ویرانہ نہیں جس سے فرار حاصل کرنا ہی فرد کا مطمح نظر قرار پائے ایسی صورت میں تیاگ اور سنیاس کا رویہ جنم لے سکتا ہے' فنی اظہار کی روش وجود میں نہیں آسکتی۔ دراصل ویسٹ لینڈ کے کرب سے وابستہ ایک نئی حقیقت کے وجود میں آنے کا تصور بھی ہے۔ کم تر شعرا کے ہاں شاید اس نئی حقیقت کی پرچھائیں ابھرنے نہ پائے لیکن ایک عظیم شاعر کے کلام میں اس کا پرتو صاف دکھائی دینے لگتا ہے مگر اس کے لیے اکھڑنے کے بجائے جڑنے اور منسلک ہونے کا عمل پہلی شرط ہے۔ وہ شعرا جو ویسٹ لینڈ سے متاثر ہو کر جذباتی اور فطری طور پر اکھڑ جاتے ہیں۔ محض خلاء میں معلق ہو کر رہ جاتے ہیں۔ مگر جو شعراء ویسٹ لینڈ کی ویرانی اور سنگلاخیت کے اندر سے ایک نئی حقیقت کے طلوع ہونے کا منظر دیکھ سکنے کی سکت رکھتے ہیں' نہ صرف اس میں کامیاب ہوتے ہیں بلکہ تیاری کے طور پر زندگی اور اس کے جملہ پہلوؤں سے منسلک رہنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ اثبات ذات بلکہ اثبات حیات کا یہ عمل ایک نئے نظام کی پیدائش کا ضامن بھی ہے۔ غالب کے ہاں زندگی اور اس کے ارضی پہلوؤں سے جو والہانہ انس ہے' وہ اس بات پر مدلل ہے کہ زندگی پر غالب کی گرفت ڈھیلی نہیں پڑی اور وہ فکری اور جذباتی ویرانے میں رہتے ہوئے بھی زندگی سے منسلک اور ایک ابھرنے والی میٹھی بانی کے انتظار میں محو ہے' غالب کی یہ مثبت روش جدیدیت کی روح کے عین مطابق ہے اس کی جھلک جدید اردو غزل کے ان لاتعداد اشعار مین دیکھیے جن میں شعرا نے اردگرد کی زندگی اور اس کے مظاہر ہی سے رشتہ نہیں جوڑا بلکہ اس آواز کو بھی سنا ہے جو ایک نئے عہد کی بانگ درا ہے مگر غور کیجئے کہ آج سے سو برس پہلے یہی مثبت رجحان کس

نفاست اور توانائی سے غالب کے اشعار میں اپنا اظہار کر رہا تھا۔

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
مستانہ طے کروں ہوں رہ وادی خیال'
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے
اے عندلیب یک کف خس بہر آشیاں
طوفان آمد آمد فصل بہار ہے
بخشے ہے جلوۂ گل ذوق تماشا غالب
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا
ہوں گری نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

دونوں جہاں حاصل کرنے کے بعد بھی تمنا کا تشنہ کام ہر خواہش پر دم نکلنا اور ارمانوں کا پھر بھی کم نہ ہونا' اس بات کے شاہد ہیں کہ زندگی پر غالب کی گرفت بہت کڑی تھی لیکن یہی آمد فصل بہار کا عرفان اور گلشن نا آفریدہ کی پرچھائیں کا احساس اس بات پر مدلل ہے کہ بے پناہ اندھیروں میں غالبا" اس لمحے کے لمس سے آشنا تھیں جسے ایک روز طلوع ہونا تھا چنانچہ اسی لیے غالب کے اشعار آج کے ذہن کو مطمئن کرتے اور تسکین دیتے ہیں کہ وہ حال سے منسلک ہونے کے علاوہ مستقبل سے بھی مربوط ہیں۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں آج کا انسان کھڑا ہے۔

جدیدیت کے سلسلے میں دوسری بات یہ ہے کہ ایک ایسے فرد کی آواز ہے جو احساسی اور ذہنی طور پر فعال ہو کر تخلیق پر بیدار ہو گیا ہو قدیم سوسائٹی میں فرد کو خلوت نصیب میں تھی اور نہ اس کی زندگی کا کوئی منفرد اسلوب ہی مرتب ہوا تھا وہ اپنی ساری زندگی گروہ اور فطرت سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہو کر گزارتا تھا اور سوسائٹی کے چھتے میں محض ایک کارکن کی حیثیت رکھتا تھا بعد ازاں جب اسے خلوت نصیب ہوئی جس کی سماجی صورت جائیداد کے تصور کی ابتدا تھی تو گویا سوسائٹی فطرت (Nature) کے دائرے سے نکل کر خط مستقیم پر گامزن ہوئی۔ یہی زمانہ فرد کی قوت میں معتدبہ اضافے کا بھی دور تھا اور اسی دور میں فرد کی قوت نے منفی انداز اختیار کر کے (Exploitation) ظلم اور سماجی بے انصافی کو تحریک دی۔ انفرادیت کا یہ منفی انداز بہت عرصہ تک رائج رہا۔ لیکن بیسویں صدی میں فرد کی انفرادیت اپنے مثبت انداز میں ابھر آئی ہے۔ یعنی اب فرد ایک Parasite کے طور پر نہیں بلکہ ایک تخلیق کار کے طور پر نظر آنے لگا ہے مراد یہ کہ وہ سوسائٹی کے "زندان" سے ازاد تو نہیں ہوا۔ لیکن اس نے اس زندان کو ایک چمن میں تبدیل کر دینے کی کوشش ضرور کی ہے یہ نہیں ۔

اس کی مساعی مشکور ہو چکی ہیں لیکن اتنا ضروری ہے کہ فرد تخلیقی اعتبار سے فعال ہو چکا ہے اور اب وہ ایک طرف تو زنگ آلود زنجیروں سے ناراض ہے اور دوسری طرف معاشرہ کو ایک ایسی اونچی سطح پر لے جانے کا متمنی ہے جہاں پہنچ کر معاشرے کے اندر خلاق افراد پیدا ہوں گے نہ کہ خون چوسنے والے (Parasite) جدیدیت بحیثیت مجموعی ادب میں ایک مثبت تحریک ہے جو ایک فعال اور تخلیقی اعتبار سے زرخیز فرد کی آواز ہے۔ یہ فرد بعض اوقات چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرتا ہے' بعض اوقات توڑ پھوڑ پر مائل ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی ایک غلط روش پر گامزن ہو کر سوسائٹی سے "انحراف" پر بھی اتر آتا ہے لیکن اس سارے جذباتی جزر و مد سے گزرنے کے باوجود وہ ایک "طرح نو" کا مبلغ اور ایک نئے عہد کا علم بردار ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ایک جاگیردارانہ نظام اور ایک منجمد سوسائٹی میں رہنے کے باوجود غالب کی حساس طبیعت نے ماحول کی گھٹن سے اسی طرح برگشتگی کا اظہار کیا ہے جیسے کہ آج کا برہم نوجوان کر رہا ہے اور اس نے ایک نئے عہد کی تخلیق کرنے کی بالکل اسی طرح خواہش کی جیسے کہ آج کا ایک خلاق فرد کرتا ہے اور پھر دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ غالب آج کے حساس فرد کی طرح اپنی ذہنی اور جذباتی صلاحیتوں سے واقف تھا اور اپنی طباعی اور جدت طراز طبیعت کا عرفان رکھتا تھا اور وہ قدم قدم پر اپنے ماحول کی سنگلاخیت اور افراد کی بھیڑ چال میں اثبات ذات کا اظہار کرنے پر خود کو مجبور پاتا تھا۔ یہ چند اشعار دیکھیے جو غالب کے ہاں نئے فرد کی آواز کو پیش کرتے ہیں۔

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے
تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسد!
سرگشتہ خمار رسوم و قیود تھا
تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعہ خیال ابھی فرد فرد تھا
بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا
وہی اک بات جو یاں نفس واں نکہت گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا
دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا
میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دل وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا
منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے

عرش سے ادھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا
سایہ میرا مجھ سے مثل دود بھاگے ہے اسد
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے
لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہمسفر ملے

مگر غالب کی یہ انفرادیت محض ایک خلاق یا برہم شخصی کی انفرادیت نہیں۔ یہ ایک ایسی کیفیت سے بھی دو چار ہوئی ہے جو خالصتاً" جدید دور کی پیداوار ہے یعنی اس میں مزاج کی وہ منفرد روش ابھری ہے جو فرد کی ہنسی (Individual laughter) سے منسلک ہوتی ہے نہ کہ گروہ کی ہنسی (Choral Laughter) سے بات یہ ہے کہ قدیم زمانے میں جب ابھی انسان تہذیبی طور پر بہت پست تھا تو ہنسی نہ صرف جسمانی نقائص و بے رحمی کے مظاہرے سے تحریک پاتی تھی بلکہ زیادہ تر ناہمواریوں پر گروہ کی مشترکہ ہنسی کی ایک صورت تھی نیز اس میں فرد کے ہمدرانہ انداز نظر میں کفایت پیدا کرنے کی منفرد روش کا فقدان بھی تھا۔ مگر جدید دور میں فرد کی انفرادیت کے نمایاں ہونے کے ساتھ ساتھ ہنسی کی وہ منفرد کیفیت ابھر آئی ہے جو فرد کی اپج اور آزردہ روی سے تحریک پاتی ہے اور جو گروہ کی ٹھٹھہ مخول ایسے رجحان کے تابع نہیں۔ چنانچہ فرد کی ہنسی میں بلند بانگ لہجے کے بجائے ایک زیر لب تبسم کی کیفیت ابھری ہے جو بجائے خود ایک تہذیبی عمل ہے۔ غالب اس اعتبار سے اردو کے غزل گو شعراء میں منفرد ہے کہ اس کے اشعار میں جو تبسم ابھرا ہے وہ آنسو کی ایک زیریں لہر میں گھل مل گیا ہے اور اس نے غالب کو آنسوؤں میں مسکراتے ہوئے شخص کے سے پیکر میں ڈھال دیا ہے۔ اگر غالب دوسرے شعراء کی طرح قطعاً" سنجیدہ رہتا یا بعض شعراء کی طرح تمسخر اور استہزا کے حربوں کو استعمال کرنے کی طرف مائل ہوتا تو اس کی انفرادیت میں وہ خاص بات پیدا نہ ہو سکتی جو فرد کی ہنسی سے متعلق ہونے کے باعث ایک خالصتاً" جدید انداز نظر ہے۔

یہ چند اشعار قابل غور ہیں:

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملہ اسباب ویرانی مجھے
کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤنا ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پرناحق!
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی،

دیکھئے پاتے ہیں کیا فیض' بتوں سے عشاق
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے
جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی'
عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے
چاہتے ہیں خوبروؤں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

فرد جب معاشرے کا جزو لاینفک تھا تو اس کا یہ عمل سنجیدگی سے پوری طرح مملو تھا اور یہ سوچنا بھی ممکن نہیں کہ وہ اپنے اس عمل پر کبھی غور کرنے کی ضرورت بھی محسوس کرتا ہو گا اسی طرح فرد کی انفرادیت کا عمل معاشرہ کے ضوابط سے انحراف کرنے کی صورت تو ہے لیکن جب تک فرد خود کو اپنی جذباتیت سے لحظہ بھر کے لیے منقطع کر کے اس پر ایک متبسم نظر نہ ڈالے اس کی انفرادیت اپنی تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔ احساس مزاح کی خوبی یہ ہے کہ وہ فرد کی انفرادیت کو مکمل کرتا ہے اور اسے رجحانات اور مقاصد نیز اپنی انا کی مجہولیت پر ہنسنے کی ترغیب دیتا ہے۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنی انفرادیت کا بھرپور اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کو نشاد' تمسخر بھی بنایا اور اپنے جزباتی تقاضوں پر مسکرانے کی روش بھی اختیار کی اور یوں ذات کے حصار سے باہر آ کر خود اپنی انفرادیت میں ایک نئی سطح کا اضافہ کر کے اسے مکمل کر دیا۔ اور یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

جدیدیت کے ضمن میں آخری بات یہ ہے کہ یہ فرد کی شخصیت کی تنگنائے سے آزاد ہو کر ماحول کی مختلف لہروں کا نباض بننے کی ایک روش ہے گو دیکھا جائے تو یہ بھی بیسویں صدی میں انفرادیت کے ظہور ہی کا ایک کرشمہ ہے۔ وہ یوں کہ اب فرد اپنی محدود اور تنگ دنیا سے باہر آ کر سیاسی اور سماجی اعتبار سے فعال ہو گیا ہے اور وہ اس نئی سطح پر ایک وسیع تر واقعات اور رجحانات سے خود کو منسلک محسوس کرنے لگا۔ اس میں ایک بڑا ہاتھ بیسویں صدی کی سائنسی ترقی کا بھی ہے وہ یوں کہ ریڈیو' ٹیلیویژن اور اخبار کے رواج نے ساری دنیا کو گھر کی دہلیز پر لا کھڑا کیا ہے اور فاصلے اس قدر کم ہو گئے ہیں کہ فرد اگر چاہے تو ایک بار نہیں بلکہ بار بار دنیا کے گوشے گوشے مین پہنچ سکتا ہے چنانچہ اس کے مطمح نظر میں کشادگی پیدا ہوئی ہے اور وہ اپنی اس حیثیت کو محسوس کرنے لگا ہے جو دنیا کا شہری ہونے سے اسے حاصل ہیں پھر علوم کی تحصیل اور اثرات قبول کرنے کی صلاحیت نے اس کے ہاں ایک توانا سیاسی اور سماجی شعور بھی پیدا کر دیا ہے اور وہ نہ صرف سماجی ظلم' جہالت اور بے انصافی کو اب برداشت کرنے سے گریزاں ہے بلکہ سیاسی سطح کے ہر بڑے سے بڑے واقعہ پر بھی نقد و تبصرے سے کام لینے پر خود کو مائل پاتا ہے

چنانچہ بیسویں صدی کے مزاج میں سیاسی اور سماجی شعور کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اس نے نہ صرف خود ادب کے مزاج پر گہرے اثرات مرتسم کیے ہیں بلکہ قاری کے ادبی ذوق کو بھی ایک خاص نہج عطا کی ہے یہی وجہ ہے کہ جدید دور کے شاعر کے ہاں نہ صرف سیاسی اور سماجی شعور کا احساس ہوتا ہے بلکہ خود قاری بھی شعر میں اس شعور کی ہلکی سی ہلکی کروٹ کو گرفت میں لینے پر بھی قادر نظر آتا ہے۔ عام مشاہدہ کی بات ہے کہ مشاعرہ میں وہی شاعر سب سے پہلے اور سب سے زیادہ مقبول ہوتا ہے جو بین السطور میں بعض سیاسی یا سماجی ناہمواریوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جدید شاعری سیاسی یا سماجی افکار کے اظہار کے لیے مختص ہے بلکہ یہ کہ اس میں جو ذہن اپنا اظہار کرتا ہے وہ سیاسی اور سماجی شعور سے بہرہ ور ہوتا ہے نتیجہ یہ ہے کہ شعر میں ایک ایسی سطح پیدا ہو جاتی ہے جو بیک وقت فرد اور معاشرہ کی جملہ لہروں کو منعکس کر رہی ہوتی ہے اور اس لیے قاری کو کئی سطحوں پر تحصیل حظ کے مواقع فراہم کر دیتی ہے غرض جدیدیت کا ایک امتیازی وصف سیاسی اور سماجی شعور بھی ہے اور جو شعراء اس سے بہرہ مند ہوتے ہیں ان کے کلام میں ایک ایسی کھلی کھلی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس سے محدود علم رکھنے والے اور ایک محدود ماحول میں زندگی بسر کرنے والے شعراء عام طور سے محروم ہوتے ہیں۔

جدیدیت کے اس خاص وصف کا ذکر یوں ہوا کہ غالب سیاسی اور سماجی شعور کے اعتبار سے بھی اپنے دور کے باقی شعراء سے بالکل الگ اور ممتاز دکھائی دیتا ہے درآنحالیکہ اس کے اپنے زمانے میں یہ شعور ابھی پوری طرح پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ غالب کے زمانے میں مغل سلطنت زوال پذیر تو ہو چکی تھی مگر ابھی دلی میں بادشاہ کا دربار لگتا تھا تعلیم میں مشرقی علوم کی فراوانی تھی اور مغرب کا وہ انداز فکر جو انفرادیت بغاوت اور اجتہاد کو تحریک دیتا ہے' ابھی معاشرے میں نمودار نہیں ہوا تھا کچھ اخبارات ضرور نکلنا شروع ہو گئے تھے جیسے مثلاً اردو اخبار جسے مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے ۱۸۳۶ء میں جاری کیا اور سید الاخبار جسے سرسید کے بڑے بھائی سید محمد خان نے ۱۸۳۷ء میں نکالا اور "نور مشرقی" جس کے مالک سید امیر علی تھے اور جو ۱۸۴۲ء میں جاری ہوا' وغیرہ اور ان اخبارات میں بعض اوقات انگریزی عملداری پر سخت تنقید بھی کی جاتی تھی لیکن بحیثیت مجموعی اس تنقید کی حیثیت لطیفہ گوئی سے زیادہ نہیں تھی اور وہ شے جسے "سیاسی شعور" کا نام دینا چاہیے ابھی قطعاً زیر زمین پڑی تھی۔ خود غالب کی عام زندگی پر انگریزی عملداری سے بغاوت یا بادشاہت کے تصور سے انحراف کے شواہد بھی نظر نہیں آتے۔ وہ ساری عمر پنشن کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا اور خطابات کے لیے کوشاں رہا۔ استاد شہ بننے میں بھی اسے عار نہیں تھی اور رام پور سے وظیفہ کو بھی وہ کوئی بری بات نہیں سمجھتا تھا اور اس سارے عمل میں وہ حق بجانب بھی تھا کہ اس وقت شرفاء کا یہی انداز اور زمانے کی یہی روش تھی لیکن جب غالب کے اشعار کو پڑھا جائے تو قاری کو فوراً احساس ہوتا ہے کہ وہ انیسویں صدی کے وسط میں رہنے والے کسی شخص کا کلام نہیں پڑھ رہا بلکہ بیسویں صدی کے ایک حساس اور باشعور فرد کے خیالات سے مستفید ہو رہا ہے۔ غالب کو یہ سیاسی اور سماجی شعور کہاں سے ملا اور کن محرکات نے اس شعور کو صیقل کیا' شاید ابھی ایک طویل مدت تک اس کا کوئی سراغ نہ مل سکے لیکن اس کے وجود سے ایک معمولی نظر رکھنے والا قاری بھی انکار نہیں کر سکتا' مثلاً دیکھئے:

کچھ تو دے اے فلک نا انصاف!
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستم گر
کچھ تجھ کو مزہ بھی میرے آزار میں آوے
فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابند نے نہیں ہے
زمانہ عہد میں اس کے ہے محو آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے
یاد کرو وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا
انتظار صید میں اک دیدہ بے خواب تھا
اے پر تو خورشید جہاں تاب ادھر بھی
سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے
کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی!!!
رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا
موج خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستان یار سے اٹھ جائیں کیا
پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہو رواں آؤ
چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں
کام تیرا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں
نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو
کیا تنگ ہم ستم زدگان کا جہان ہے
جس میں کہ اک بیضہ مور آسمان ہے

خزاں کیا فصل گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں' قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے
دل ہی تو ہے سیاست درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کئے

غالب کے یہ شعر زبان زد خاص و عام ہیں اور ہم تاریخی اعتبار سے ان کے سن ولادت کی نشاندہی بھی کر سکتے ہیں' ورنہ مزاج لہجے اور علامات کے اعتبار سے یہ خالصتاً" بیسویں صدی کے اشعار ہیں اور آج کے قاری کو پوری طرح مطمئن کرتے ہیں بلکہ مجھے تو بعض اوقات یوں محسوس ہوا ہے جیسے ساری جدید غزل غالب کے لہجے جست اور مزاج سے متاثر ہے اور اس میں رہبر' رہزن' سایا' جنوں' قلم' مکان' زبان' خنجر وغیرہ کے نئے علامتی مفاہیم براہ راست غالب کے انداز فکر سے ماخوذ ہیں مثلاً فیض کے یہ شعر لیجئے۔

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے
لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
درد دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلا دوں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا
رہے نہ جاں تو قاتل کو خوں بہار دیجئے
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہئے
مجبوری و دعویٰ گرفتاری الفت!
دست تہ سنگ آمدہ پیمان وفا ہے

تو آپ کو فیض کی شاعری بالخصوص غزل پر غالب کے گہرے اثرات کا فوراً احساس ہونے لگے گا۔ حد یہ کہ اس نے اپنے دو مجموعوں "نقش فریادی" اور "دست تہ سنگ" کے نام تک غالب سے مستعار لیے ہیں۔ فیض جدید اردو غزل میں ایک گہرے سیاسی شعور کے لیے بہت مشہور ہیں مگر جب خود فیض ایک بڑی حد تک غالب کے خوشہ چیں ثابت ہو جائیں تو پھر اس سے اندازہ لگانا چاہیے کہ غالب کے سیاسی شعور کا کیا عالم ہو گا۔

غالب کے ہاں سیاسی شعور کے علاوہ سماجی شعور بھی بہت تیز اور توانا ہے اور اس ضمن میں بھی اس کا عام رد عمل بیسویں صدی کے ایک حساس انسان کے رد عمل سے مماثل ہے۔ غالب کے بیشتر معاصرین کو اول تو اپنے شخصی غم کو پیش یا افتادہ انداز میں بیان کرنے کے علاوہ اور کسی موضوع کو اپنانے کی فرصت ہی کم تھی لیکن جہاں کہیں انہوں نے بالا خانے سے نیچے اتر کر انسان اور اس کے مسائل کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے وہاں بھی وہ یا تو صوفیانہ مسلک کے اظہار کی طرف جھکتے رہے ہیں اور یا زندگی کے فانی ہونے کا ماتم کرتے رہے ہیں۔ وجہ یہ کہ

اس دور میں ابھی افراد ایک دوسرے سے ذہنی اور نظریاتی طور پر اس قدر متصادم نہیں ہوئے تھے کہ کوئی نیا سماجی شعور مرتب ہو سکتا۔ مگر حیرت کی بات ہے کہ اسی منجمد ماحول میں غالب بھی زندہ تھا جس کے ہاں بیسویں صدی کا سماجی شعور خاصا تیز اور توانا تھا اور وہ نہ صرف صدیوں پرانے انسانی روابط و اقدار کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھ رہا تھا بلکہ خود انسان کی نفسیات کو بھی ایک نئے زاویے سے ٹٹولنے پر مائل تھا۔ مثلاً:

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو
ہر ابوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوہ اہل ہنر گئی!!
پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں
میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا
بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر
ہر گل تر ایک چشم خونفشاں ہو جائے گا
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

انسان اور انسانی روابط کو پرکھنے کا یہ انداز غالب سے خاص ہے اور مزاجاً" بیسویں صدی کے انداز فکر ہی کی ترجمانی کرتا ہے۔

خاتمے سے قبل اس بات کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر تحقیق کی جائے تو غالب مذہبی عقائد کی تشہیر کے بجائے مذہبی تجربے سے گزرنے کے عمل کے باعث بھی جدید ذہن کا حامل ثابت ہو سکتا ہے مگر اس کے لیے آج کی شاعری کے جملہ مذہبی اور روحانی پہلوؤں کا جائزہ لینا اور ان کی روشنی میں غالب کے انداز نظر کا محاکمہ کرنا ضروری ہو گا اور موجودہ مقالے کی تنگ دامانی اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

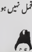

نادم سیتاپوری

غالب کے کلام میں تحریف و تصرف

غالب کے اردو کلام پر جس کثرت کے ساتھ غیر معتدل تنقیدیں کی گئیں' اس سے کہیں زیادہ ترمیمات و تحریفات:—— اصلاحیں بھی دی گئیں اور الحاق کلام کو بھی ان کی فن کارانہ عظمت میں سمونے کی کوشش کی گئی' یہاں تک کہ آج غالب کا ایک ایک شعر اور ایک ایک مصرع مشکوک و مخکوک ہو کر رہ گیا۔ شارح غالب نواب حیدر یار جنگ نظم طباطبائی (وفات مئی 1933ء) نے اپنے ایک مختصر سے مراسلے میں ایک ایسی ہی مثال پیش کی ہے' جو کتابت کی ایک معمولی سی غلطی کی وجہ سے بہت دنوں تک معمہ بنی رہی۔ تحریر فرماتے ہیں:

1۔ "میرے دوستوں میں ایک صاحب دیوان غالب کا نسخہ "حمیدیہ" لیے ہوئے میرے پاس آئے اور اس مطلع کے معنی مجھ سے پوچھنے لگے۔

جنوں گرم انتظار و نالہ بیتابی کمند آیا   سویدا تا بلب زنجیر سے دود سپند آیا

شعر کے الفاظ سے یہ سب باتیں پیش نظر ہو گئیں کہ "سپند" کو سویدائے دل سے تشبیہ دیتے ہیں' لیکن "سویدا تا بلب زنجیر" کیا معنی؟ اور پھر زنجیر سے "دود سپند" آیا" کیا معنی؟ اس کے ساتھ ہی یہ خیال پیدا ہوا کہ شاعر یہ بات کہنا چاہتا ہے کہ سویدا لبوں تک آگیا' یعنی کلیجہ منہ کو آگیا۔ "آیا" اگر سویدا کے ساتھ ہے تو پھر "دود" کے ساتھ اسے تعلق نہ ہونا چاہیے؟ کچھ کاتب کا تصرف تو اس میں نہیں ہے؟ گمان غالب ہوا کہ ضرور تصرف ہے۔ اب سے پچاس ساٹھ برس پیشتر یائے معروف و مجہول کا فرق کتابت میں نہ تھا—— یقین ہو گیا شاعر نے یوں کہا تھا۔

سویدا تا بلب "زنجیری" دود سپند آیا

"ی" کو اس طرح لکھئے کہ اس پر "ی" کا شبہ ہو سکے۔ اب شعر کے معنی کھل گئے۔ یعنی " سویدا دود سپند" کا زنجیری ہو کر لب تک آیا۔ اس میں شاعر نے "دود سپند" کو زنجیر سے تشبیہ دی ہے۔

اب میں نے دعوے کے ساتھ یہ کہہ دیا کہ جس طرح میں پڑھتا ہوں' یہی صحیح ہے۔ غرضیکہ بھوپال میں لکھا گیا کہ اصل نسخہ (نسخہ حمیدیہ) سے مقابلہ کیا جائے۔ اس کا جواب بھوپال کے

ناظم تعلیمات کی طرف سے انہیں میرے عنایت فرما کے نام آیا کہ اصل نسخہ (میں "زنجیری دود سپند" ہے (زنجیر سے) کاتب کی غلطی ہے۔"

(صفحہ 3 کالم 2/3 اودھ پنچ لکھنؤ 19 اگست 1925ء جلد اول شمارہ 31)

یہ مثال نہ اصلاح کی ہے نہ تحریف و ترمیم کی لیکن موجودہ دیوانوں کی ایسی ہی غلطیوں کا سہارا لے کر تحریف خیزی کی ایک پوری تحریک کو جنم دے دیا اور جس طرح شرح غالب کے پردے میں مولانا عبدالباری آسی ا ۔ مرحوم (وفات 1946ء) نے بہت سا اپنا کلام شیر و شکر کر کے غالب کے نام سے منسوب و موسوم کر دیا' بالکل اسی طرح مجدد السنہ مشرقیہ شوکت میرٹھی مرحوم اس سے بہت قبل غالب کے اردو کلام کو تحریف و ترمیم کا نشانہ بنا چکے تھے۔ ہوشیار جنگ سید ناظر الحسن ہوش بلگرامی مرحوم نے اپنے ایک مضمون "دیوان اردوئے غالب اور حضرت شوکت میرٹھی" میں تحریر فرمایا ہے:

2۔ "جب تک حضرت شوکت میرٹھی نے دیوان غالب کی ایک ناکمل شرح نہیں چھاپی تھی' اس وقت تک نسخوں میں ہندو مسلمانوں کی طرح اختلاف نہ تھا۔ ان کا اپنے اجتہاد شاعری پر اعتماد کر کے شرح کو چھپوانا تھا کہ دنیائے شاعری میں اختلاف پھیل گیا۔ جناب شوکت غالب کے شعروں میں تصرف ہی کر کے خاموش نہیں ہوئے' بلکہ اس حد تک اصلاح دی کہ غالب کو مرنے کے بعد اپنے تلمذ ہونے کا خود ہی شرف بخش دیا۔ پھر دو ایک جگہ کے سواء کہیں یہ بھی ظاہر نہیں فرماتے کہ مطبوعہ نسخوں میں یہ لفظ تھا۔ میں یہاں پر دوسرا لفظ مناسب سمجھتا ہوں۔ یہ اخلاقی جرم اگر غالب کی روح معاف کر دے تو شاید معاف ہو جائے۔ اس قسم کی جسارتوں سے واقف ہو کر اجتہادات شوکت کا پردہ مقلدین غالب کے لیے اٹھانا پڑا تاکہ غالب پرست " میرٹھی اجتہاد" پر ایمان نہ لے آئیں۔"

غالب مرحوم کا صحیح کیا ہوا نسخہ جس کے آخر میں وہ فرماتے ہیں کہ ——— "اس کے پروف اور کاپیاں سب میری نظر سے گذرے ہیں۔" پیدا کیا اور شوکت صاحب کی شرح بھی قیمتاً" منگوا کر اپنی مالیات پر بلا قصور جرمانہ کیا۔ اول سے آخر تک دونوں نسخوں کو ملایا اور مقابلہ کیا' جس نے یہ ثابت کر دیا کہ شوکت صاحب نے جو جو "من گھڑت" تحریفیں کی ہیں' وہ 57ء کے میرٹھی نسخہ کے سوا کسی میں نہیں پائی جاتیں۔ ان تحریفوں کے جواب وہ قوم کے سامنے حضرت شوکت ہی ہو سکتے ہیں' مگر دلدادگان اردو کو کیا غرض کہ وہ اجتہادات شوکت میں دخل دے کر اپنی شاعری کا ایمان بگاڑیں۔

دیوان غالب کے کئی نسخے اس وقت میرے پیش نظر ہیں اور وہ سب کے سب اپنے اتحاد و مطابقت سے بغلگیر ہیں۔ امید ہے' ناظرین ان تحریفوں کو ملاحظہ فرما کر شوکت صاحب کی "روح شاعری" پر فاتحہ پڑھیں گے۔"

(صفحہ 47-48 عروس ادب مطبوعہ نگار مشین پریس لکھنؤ 1927ء)

مولانا سید احمد حسن شوکت میرٹھی اپنے دور کی ایک "عہد آفریں" شخصیت تھے۔ رواج زمانہ کے مطابق "مجدد السنہ مشرقیہ" کو اپنے نام کا جزو بنانے میں انہوں نے کبھی جھجک محسوس نہیں کی اور "امیر اللغات" کے ان تمام ادبی ہنگاموں میں ہمیشہ پیش پیش رہے جو "طوطی ہند" میرٹھ اودھ پنچ اور ریاض خیر آبادی کے "ریاض الاخبار" میں چل رہے تھے۔ یہ سلسلہ برسہا برس جاری رہا' یہاں تک کہ ماہنامہ "پروانہ" میرٹھ میں ایک ایسا تنقیدی سلسلہ شروع کر دیا' جس کی زد سے ریاض تو خیر کیا بچتے' مولانا شوکت کھل کر غالب پر آگئے سید عقیل احمد جعفری نے لکھا ہے:

"مجدد الوقت جناب شوکت میرٹھی نے اپنے رسالہ "پروانہ" مین ایک بار حضرت امیر مینائی مرحوم اور مرزا اسد اللہ خاں غالب مغفور کی چوری پکڑی تھی۔ اس کے بعد داغ اور جلال کے کلام کو مہمل بتاتے ہوئے حضرت ریاض (خیر آبادی) کی فکر کو قابل اصلاح قرار دے کر تحریر فرمایا تھا.....؟"

(صفحہ 181 نثر ریاض خیر آبادی مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد۔ دکن)

غالب کے کلام میں تحریف و تصرف کا آغاز شوکت میرٹھی کی "حل کلیات غالب" سے ہوا' جو غالب کی باضابطہ شرحوں میں دوسری شرح کہی جاتی ہے۔ اس سے قبل نظم طباطبائی کی شرح غالب شائع ہو چکی تھی ——— لیکن جہاں تک کلام غالب کی شرح کاری کا تعلق ہے' اس کی ابتدا طباطبائی سے بہت پہلے سید محمد مرتضیٰ بیان یزدانی میرٹھی (وفات مارچ 1900ء) کر چکے تھے۔ مرحوم ماہنامہ "العصر" لکھنؤ نے اپنے ایک اوارتی نوٹ میں لکھا ہے:

3_ "(رسالہ) لسان الملک (میرٹھ اجراء 1887ء) میں ایک عرصے تک "حل المطالب" کے نام سے ایک سلسلہ مضامین نکلتا رہا ہے۔ یہ حضرت بیان کی شرح دیوان غالب ہے۔ غالباً یہ شرح کتابی صورت میں آج تک شائع نہیں ہوئی ہے' ورنہ ادب اردو میں ایک قابل قدر اضافہ ہوتا۔"

(ماہنامہ العصر لکھنؤ بابت اگست و ستمبر1913ء)

مولانا سید عبدالرزاق راشد مرحوم حیدر آبادی کا بیان ہے:

"حل غالب مصنف سید مرتضیٰ بیان و یزدانی میرٹھی۔ بیان رسالہ "لسان الملک" نکالتے تھے۔ اشعار غالب کا حل چیدہ چیدہ اس رسالے میں شائع ہوتا تھا۔ شرح پوری ہوئی یا ادھوری اس کا علم نہ ہو سکا۔"

(صفحہ 57 اصلاحات غالب۔ مطبوعہ اعجاز پرنٹنگ پریس حیدر آباد دکن 1966ء)

بیان میرٹھی کی یہ شرح غالباً نامکمل ہی رہی۔ اس کے کچھ سرسری خدوخال کا پتہ چل سکا' جن کا ذکر میں نے اپنے مضمون (دیوان غالب) کی ابتدائی شرحیں) مطبوعہ ماہنامہ "صبح نو" پٹنہ ستمبر 1962ء میں کر دیا ہے۔

اگرچہ اس کا کوئی تحریری ثبوت نہیں ملتا لیکن قیاس یہی کیا جا سکتا ہے کہ 1881ء میں جب شوکت رامپور سے ترک سکونت کر کے میرٹھ پہنچے تو انہیں میرٹھ کا ایک رچا بسا ادبی ماحول مل گیا اور وہ سید محمد مرتضیٰ بیان کے ساتھ مل جل کر ادبی سرگرمیوں میں کھو گئے۔ اخبار طوطی ہند میرٹھ اور رسالہ "لسان الملک" کے فائل کمیاب ہی نہیں، تقریباً نایاب ہو چکے ہیں اس لیے قطعی طور پر تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شوکت کا براہ راست تعلق ان کے ادارۂ تحریر سے تھا مگر ماضی کے ادبی معرکوں میں جب طوطی ہند۔ ریاض الاخبار اور اودھ پنچ کا نام لیا جاتا ہے تو شوکت میرٹھی کا ذکر ضرور آجاتا ہے اور ماضی کے دھندلکوں سے ایک ایسی شخصیت جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے، جس کا ہلکا سا عکس "انا راشد مرحوم کے ان الفاظ میں موجود ہے:

"شرح غالب مصنفہ سید احمد حسین شوکت میرٹھی جو اپنے آپ کو "مجدد السنہ مشرقیہ" لکھا کرتے تھے، کسی رسالہ کے ایڈیٹر تھے۔ اس زمانے کے اخباروں اور رسالوں میں آپ کے "بلند بانگ دعوے" شائع ہوتے تھے کہ ان کے مانند کوئی شخص عرفیؔ، خاقانیؔ اور غالب کے اشعار کو نہیں سمجھا سکتا۔

اس شرح (غالب) میں بہت سے اشعار حذف کیے ہیں اور کلام غالب پر غلط اصلاحیں دی ہیں۔"

(صفحہ 57 اصلاحات غالب)

بیان میرٹھی آخری عمر میں مراق اور مالیخولیا کا شکار ہو کر ذہنی توازن کھو بیٹھے تھے۔ جب تک سورج کی شعاعیں رہتیں وہ اندھیرے میں چھپے رہتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شوکت ان کے مقربین خاص میں ممتاز مقام رکھتے تھے اور "حل المطالب" کا جو کام بیان نے ادھورا چھوڑ دیا تھا "حل کلیات" کی شکل میں انہیں کے ہاتھوں پایہ تکمیل تک پہنچا اور "حل کلیات غالب" جو بیان میرٹھی کی زندگی میں خود شوکت نے اپنی شوکت المطابع میرٹھ سے اکتوبر 1899ء میں شائع کیا تھا۔ اس کا ابتدائی تصور بیان میرٹھی کی فکر رسا کا رہین منت ہے ——— مگر حقیقت یہ ہے کہ اسے بیان میرٹھی کی شرح سے دور کا علاقہ نہ تھا ——— بلکہ اس عہد کے علمی و ادبی ماحول میں اسے شرح کا درجہ بھی نہیں دیا گیا اور جب شوکت نے ایک اعلان کیا تو اس کا رد عمل بہت ہی سخت ہوا۔ ہوش بلگرامی لکھتے ہیں:

4۔ "شوکت صاحب نے غالب مرحوم کے کلام میں جو تحریفیں کی تھیں، ان کا ظاہر کر دینا تو مجھ پر فرض تھا، اس لیے کہ صلائے عام (دہلی) اور مخزن (لاہور) وغیرہ میں شوکت صاحب نے "انجمن ترقی اردو" کو مخاطب کر کے اس امر کا اظہار کیا ہے کہ ابھی سو شعر غالب کے اور ہیں جو غلط چھپ گئے ہیں اور ہم نے اپنی شرح میں یہ سمجھ کر چھوڑ دیئے ہیں کہ دیکھیں کوئی سمجھتا ہے یا نہیں؟———"

(صفحہ 63 عروس ادب)

شوکت نہ صحیح معنوں میں محقق تھے' نہ نقاد "مجد السنہ مشرقیہ" ہونے کا دعویٰ بھی ان کا ایک طرح سے خود ستائی تھی' کیونکہ اس شرح میں انہوں نے جابجا غلط اور بے سروپا حکایتیں بیان کر کے اپنی سخن فہمی کی پردہ پوشی بھی کی ہے اور "مجدد لسان" بننے کے لیے لغت کی غلط اور مہمل تعبیرات دی ہیں۔ غالب کے اس شعر کی شرح کرتے ہوئے شوکت نے ایک عجیب و غریب حکایت (بلاکسی حوالے کے) پیش کی ہے۔

میں مضطرب ہوں وصل میں خوف رقیب سے ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

فرماتے ہیں' اس سلسلے میں:

5۔ "ہم کو معلوم ہوا ہے کہ جب مرزا غالب نے یہ شعر مشاعرے میں پڑھا تو ختم مشاعرہ کے بعد مولوی امام بخش صہبائی مرحوم نے جو ایک مقدس اور متورع بزرگ تھے' مرزا صاحب سے پوچھا کہ آپ نے اس شعر میں کیا معنی پہنا دیئے ہیں؟ مرزا صاحب نے کہا——— مولانا آپ اس شعر کے کیا معنی سمجھیں گے۔ نہ آپ نے کبھی "رنڈی بازی کی——— نہ خانگی بازی نہ امرد بازی کی' نہ فاعل بنے نہ مفعول۔" میں نے اپنا ایک واقعہ لکھا ہے۔ یعنی جس "مساۃ" پر میں فریفتہ تھا' بڑی بڑی تدبیروں اور چالوں سے اس کو کسی "کھدرے" میں ڈھب پر چڑھایا۔ مگر اس خوف سے کہ کوئی آکھڑا ہوگا——— "رجولیت" چوہے کے بل میں گھس گئی۔ "مساۃ" سمجھی کہ——— "غالب محض نامرد اور عنین ہے۔" میں نے معذرت میں یہ شعر پڑھا۔"

(صفحہ 88 حل کلیات مرزا غالب اردو دہلوی مطبوعہ شوکت المطابع میرٹھ 1899ء)

اب سے چالیس پچاس سال ادھر اس قسم کی مبتذل رکیک اور اہانت آمیز حکایت سازی بعض نجی محفلوں کی جان سمجھی جاتی تھی' پھر غالب کی "ہجو یلیح" تو اس اس انداز سے کی گئی کہ——— "ناطقہ سرگریباں ہے....." یاس یگانہ چنگیزی (وفات 1956ء) نے "چراغ سخن" (رسالہ عروض و قوافی) میں بلاکسی حوالے کے ایک اسی قسم کی حکایت تحریر فرمائی ہے:

"غالب پہ کیا؟ کتنے ہی ہونہار شاعر اس قوت متخیلہ کی آزادی اور مطلق العنانی کی بدولت' گمراہ ہو گئے اور بعضے جو گمراہ ہوئے' وہ اس وقت تک راہ پر نہیں آئے جب تک قوت ممیزہ کو تخیل پر حاکم نہ بنا لیا۔ میر تقی میر کیا جوہری سخن تھا۔ مرزا غالب کے شعر سن کر صاف کہہ دیا کہ "اس لڑکے کو اگر کوئی استاد کامل مل گیا اور سیدھے راستے پر لگا دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا' ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔

وہی ہوا کہ غالب نے نہ کسی کو استاد بنایا اور نہ راہ راست پر آئے۔ چنانچہ غالب کے کسی بے تکلف دوست نے یہ مطلع پڑھ کر ازراہ تمسخر ان کی بہت تعریفیں کیں۔

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال

بعد اس کے جز وکل بھینس کے انڈے سے نکال

غالب نہایت آزردہ ہوئے ——— اور کہا نہ معلوم کس مسخرے نے یہ مطلع میری طرف منسوب کر دیا ہے۔ اس پر ان کے مہربان نے فرمایا کہ بھئی براکیوں مانتے ہو' تمہارے شعر تو ایسے ہی ہوتے ہیں ———"

(صفحہ 39 چراغ سخن مطبوعہ نو کشور لکھنؤ دسمبر1921ء)

شوکت میرٹھی اور بیان میرٹھی میں بعد المشرقین تھا۔ یہ اپنے زعم خود ستائی میں کسی کی ہجو سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے اور وہ (بیان) غالب کے پرستاروں میں تھے۔ غالب کے تتبع اور فن کارانہ عظمتوں کو وہ اپنے فکر و فن کی جان سمجھتے تھے۔ غالب کے رنگ میں کہتے تھے اور خوب کہتے تھے ——— ان کے بعض اشعار کا ایک ایک لفظ پکار پکار کر کہتا ہے کہ اگر غالب زندہ ہوتے تو اپنے اس معنوی شاگرد کو سینے سے لگا لیتے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ان کا منجملہ ارباب وفا ہو جانا میرے نزدیک ہے بندے کا خدا ہو جانا

سرشوریدہ پائے وحشت پیا' شام ہجراں تھا کبھی گھر تھا بیاباں میں' کبھی گھر میں بیاباں تھا

گئے تھے روندنے دل کو لیے بیٹھے ہیں تکوؤں کو فرو رگ رگ میں نشتر ہے نہاں نس نس میں پیکاں تھا

گروش آسماں فلاخن ہے آدمی سنگ ہیں زمانے کے

لیکن شوکت "منفی سرشت" کے انسان تھے۔ زمانے کے ساتھ چلنے میں اپنی توہین سمجھتے تھے۔ ہمیشہ عام روش سے ہٹ کر چلنے جو ان کے نزدیک ان کی انفرادیت کی روح تھی' اسی لیے غالب کی جو شرح انہوں نے لکھی' اس کا ابتدائی تصور تو بیان میرٹھی کے ذہن و فکری کی پرواز کہا جا سکتا ہے' اس کے علاوہ جو کچھ بھی اس شرح میں ہے' وہ از اول تا آخر خود شوکت ہی کی جودت طبع کا شاہکار ہے۔

شوکت میرٹھی "طوطی ہند" (ہفت روزہ) کے علاوہ میرٹھ ہی سے ایک ادبی ماہنامہ "پرواز" بھی نکالتے تھے۔ ان کی شرح "حل کلیات اردو مرزا غالب دہلوی" سب سے پہلے "پروانہ" میں بالا قساط چھپی تھی۔ میرے پاس "پروانہ" کے کئی شمارے تھے افسوس کہ سب ضائع ہو گئے' صرف ایک بوسیدہ 2۔ صفحہ تلاش سے ملا ہے' جس پر "پروانہ" جلد 1 تحریر ہے۔ غالباً" آخری صفحہ ہے۔ اس کی چند سطروں میں یہ اعلان ہے:

"صاحبو ——— اس لیے "حل کلیات غالب" (جو آج تک نیز اور چیستاں سے کم نہیں سمجھا گیا اور کسی نے آج تک اس کے حل کا ارادہ نہیں کیا) بطور کتاب کے معہ جدید طرز کی "تحقیق لغت" کے شائع ہو رہا ہے گا۔ مبصر ناظرین خود نگاہ انصاف سے ملاحظہ فرمائیں گے۔"

شوکت کی اس شرح (حل کلیات 3۔ اردو مرزا غالب دہلوی) میں غنما" سات سو اشعار کی شرح کی گئی ہے۔ سرورق پر "شارح" کا نام اس التزام کے ساتھ دیا گیا ہے:

"شہنشاہ اقلیم سخن۔ مجدد السنہ مشرقیہ ابو ادریس۔ مولانا حافظ احمد حسن صاحب شوکت مالک و مدیر اخبار شحنہ ہند و طوطی ہند و پروانہ ———"

شرح کی ضخامت 146 صفحات پر مشتمل ہے- اختتام پر چودھری گھنشیام سنگھ "غار" رئیس "چند سینا" کا ایک فارسی قطعہ تاریخ ہے جس کا آخری شعر ہے۔

سال تاریخ "غار" نکتہ شناس گفت حل و قائق الغالب

شوکت ایک خالص کاروباری قسم کے آدمی تھے' جس کا ہلکا سا عکس آپ کو اس "اعلان عام" میں آنظر آئے گا' جو اس شرح کے آخری صفحے پر شائع کیا گیا ہے:

"جن حضرات کو اردو' فارسی' عربی شاعری کی تکمیل کا شوق ہو اور اصناف سخن پر قادر ہونا چاہتے ہوں' وہ حضرت مجدد السنہ شرقیہ مولانا شوکت کی جانب رجوع لائیں۔

جس پایہ کا شاعر بننا چاہیں گے' کامیاب ہوں گے اور جس درجے کا کلام ہوگا' اسی درجے کی اصلاح ہوگی انشاء اللہ تعالیٰ۔

یہ اعلان اس لیے دیا جاتا ہے کہ شعراء ہند تکمیل فن سے غافل ہیں- ہر شخص اپنے حال میں مست ہے اور اپنے کو کامل سمجھتا ہے۔

ہاں- ایسے بھی حضرات یقیناً" موجود ہیں' جن کو تشنگی طلب ہے- پس وہ آئیں اور "چشم تجدید" سے سیراب ہوں-"

(شحنہ ہند- میرٹھ)

ماہنامہ "پروانہ" کے جس بوسیدہ صفحے کا ذکر کیا گیا ہے' اس میں شوکت کی ایک غزل بعنوان ذیل شائع ہوئی ہے:

"از مجدد الوقت شوکت بجواب غزل حضرت غالب دہلوی"

اس میں پندرہ اشعار ہیں اور تین کالم لکھوائی گئی ہے- ثانی اور اولیٰ مصرعے سب گڈمڈ ہو گئے ہیں- ہر سطر میں سیدھے سیدھے تین مصرعے ہیں- درمیان میں ثانی بیشتر اشعار بے روح اور صرف الفاظ کا مجموعہ ہیں- چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے جا رہے ہیں:

جلوہ افگن ہے مرقع حسن عالمگیر کا آئینہ حیرت سے منہ تکتا ہے ہر تصویر کا
پردہ اے مانی کھلا پیشانی تحریر کا تاب رخ سے جل اٹھا خود پیرہن تصویر کا
بند ہے محشر میں ہر سو سلسلہ تقریر کا شور گوش صور تک پہنچا میری زنجیر کا
لذت دست نزاکت کے ہوئے دونوں شہید چل رہا ہے میرے دم کے ساتھ دم شمشیر کا
وسعت وحشت سے شوکت تنگ ہے یہ کس قدر دام صحرا بن گیا حلقہ مری زنجیر کا

اس وقت جب اس کی "شارحانہ اہمیت" پر زوال آچکا تھا اور ذی علم بزرگ اسے صرف "مسخرہ پن" سمجھتے تھے' کیونکہ اس کی عبارتوں کا سیاق و سباق اتنا عامیانہ تھا' جو تنقید کیا؟ اس زمانے میں بھی "تنقیص" کے حدود سے متجاوز سمجھا جاتا تھا- ہوش بلگرامی نے اپنے اسی متذکرہ مضمون میں جابجا ان بازاری اور عامیانہ اصطلاحات کا

تذکرہ کیا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

لیتا ہوں مکتب غم دل میں سبق ہنوز لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

شوکت نے اس کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"دل غم عشق کا ایک مکتب ہے مگر مجھے اب تک پورا غم عشق الٰہی حاصل نہیں ہوا۔ ابھی تو "ایرا پھیری" کر رہا ہوں۔ اور درحقیقت یہی بات ہے، کیونکہ ہر شخص کا دل محبت الٰہی کی جانب راغب ہونے کی ہدایت کرتا ہے، مگر نفس "اٹان گھائی" بتا دیتا ہے۔ (جی "ابھی تو دودھ کے دانت بھی نہیں جھڑے" بڑھاپے میں دیکھ لیا جائے گا۔) بس غالب اسی کا رونا روتا ہے۔"

(صفحہ 64 عروس ادب)

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

شوکت نے اس کی شرح ان الفاظ میں کی ہے:

"یعنی ——— میں تو اس کے غم میں کسی قابل نہیں رہا اور وہ بھی بدگمان ہے۔ غالب نے میرے جلانے کو اپنے پاس کوئی "مسٹنڈی" رکھ چھوڑی ہے۔"

(صفحہ 65 عروس ادب)

ہے کس قدر ہلاک فریب وفائے گل بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

بس کہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے میری "آہیں" بخیہ چاک گریباں ہو گئیں

شوکت کی تحریف کے بعد شعر اس صورت میں تبدیل ہو گیا۔

بس کہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے میری "آنکھیں" بخیہ چاک گریباں ہو گئیں

یعنی (آہیں اور آنکھیں) میں جو "ہلکا سا" معنوی فرق تھا، شوکت نے اسے دور کر دیا۔

دیتے ہیں جنت حیات دہر کے بدلے نشہ بہ اندازہ خمار نہیں ہے

"حیات دہر" کو "عبادت دہر" میں بدل کر مصرع ناموزوں کر دیا گیا۔

نہ "پوچھ" سینہ عاشق سے آب تیغ نگاہ کہ زخم روزن در "سے" ہوا نکلتی ہے

پہلے مصرع میں "پوچھ" کو "پونچھ" اور دوسرے مصرع میں "سے" کو "ہے" میں بدلا گیا ہے۔

غنچہ نا شگفتہ را برگ عافیت معلوم۔ باوجود دل جمعی خواب گل پریشاں ہے

شوکت میرٹھی نے مصرع اولیٰ میں "نا شگفتہ" کا ایک نقطہ اڑا کر اسے "تا شگفتہ" بنا دیا اور اس کی شرح یہ بیان فرمائی ہے:

"یعنی نہ کھلنے کا نام ہی غنچہ ہے، پس سامان آسائش کہاں؟ ———" (صفحہ 55 عروس ادب)

اصلاح — تحریف — تصرف! اور وہ بھی غالب کے کلام میں!! یقیناً "صحت مند تنقید کے تقاضوں کو پورا نہیں

کرتی۔ غلطیاں غالب نے بھی کی ہیں اور میر نے بھی۔ مصحفی نے بھی۔ سودا نے بھی۔ آتش کے یہاں بھی۔ اس کی مثالیں ملیں گی اور ناسخ کے یہاں بھی نہ انیس کا دامن اغلاط سے پاک ہے' نہ دبیر کا ——— لیکن "جدید تنقید" اصولی حیثیت سے اس زاویہ نگاہ سے اتفاق نہیں کرتی کہ تنقید نگاری میں اصلاح کاری کے فن کو سمو دیا جائے۔ پھر شرح نگاری میں "اصلاح کاری" کے فنی کمالات کا مظاہرہ کرنا ایک طرح سے ادبی اور علمی خیانت کا درجہ رکھتا ہے ——— اور شوکت میرٹھی کی شرح اس میعار پر پوری نہیں اترتی بلکہ اس کے ایک ایک لفظ سے غالب کی عظمت فن پر "ہجو ملیح" کی چوٹ پڑتی ہے۔

حواشی

1۔ ملاحظہ ہو "غالب کے کلام میں الحاقی عناصر۔" شائع کردہ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ 1965ء

2۔ نادم صاحب نے یہ صفحہ مضمون کے ساتھ بھیج دیا ہے' افسوس کہ اس کا عکس یا بلاک پیش کرنا ممکن نہیں۔ (ادارہ)

3۔ اس کا ایک نسخہ پروفیسر سید مسعود حسن ادیب (لکھنؤ) کے کتب خانے میں موجود ہے۔ (نادم سیتاپوری)

4۔ غالب نے اپنے اس شعر کے معنی "عود ہندی" میں بیان کیے ہیں۔ علامہ نظم طباطبائی نے اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے ——— "میں جب دیوان غالب کی شرح لکھ رہا تھا تو یہ شعر دیکھ کر مجھے فکر ہوئی کہ یہ کوئی کہنے کا طرز نہیں ہے' اس میں ضرور تحریف ہوئی ہے۔ خیال میں یہ بات آگئی کہ مرزا غالب "تا" کا استعمال اس طرح بھی کرتے ہیں، "دیدہ تا دل اسد آئینہ یک پر تو شوق" وہی "تا" یہاں بھی ہے' یعنی ——— غنچہ تا شگفتنہا" ——— میری شرح چھپ کر نکل چکی ہے۔ میں مرزا داغ سے بیٹھا ہوا باتیں کر رہا ہوں۔ ایک عنایت فرما یاد ش بخیر نواب سائل دہلوی دوسرے کمرے سے اٹھ کر ہمیں آبیٹھے! وہ شوکت میرٹھی کی شرح میں شاید یہ فقرہ دیکھ چکے تھے۔ "غنچہ کیا ہے' تا شگفتنہا ہے" داغ مرحوم کے سامنے حضرت سائل نے اس شعر کو یونہی پڑھا۔ "غنچہ نا شگفتنہا....." مرزا داغ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ پھر سر اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے کہ ——— دیکھوں' اس نے (بھی) تو شرح لکھی ہے۔ یہ کیا کہتا ہے؟ میں نے شعر کو صحیح کر کے پڑھ دیا۔ اس پر جناب سائل نے مجھ سے پوچھا ہی تھا کہ "تا شگفتنہا" کے کیا معنی ——— کہ مرزا داغ مرحوم بول اٹھے کہ ——— "تا شگفتنہا" پڑھو۔"

(صفحہ 3 اودھ پنچ لکھنؤ شمارہ 31' جلد 10' بابت 19 اگست 1925ء)

وجاہت علی سندیلوی

ماہر غالبیات

ادھر کئی مہینوں سے مکان کی تلاش میں شہر کے بہت سے حصوں اور گوشوں کی خاک چھاننے اور کئی محلوں کی آب و ہوا کو نمونے کے طور پر چکھنے کا اتفاق ہوا تو پتہ چلا کہ جس طرح ہر گلی کے لیے کم سے کم ایک کم تول پنساری ایک گھر کا شیر کتا' ایک لڑاکا ساس' ایک بد زبان بہو' ایک نصیحت کرنے والے بزرگ' ایک فضیحت پی جانے والا۔ رند اور حوائج ضروری سے فارغ ہوتے ہوئے بہت سے بچوں کا ہونا لازمی ہے اسی طرح کسی نہ کسی بھیس میں ایک ماہر غالبیات کا ہونا بھی لازمی ہوتا ہے۔ اور بغیر اس کے گرد و پیش کا جغرافیہ کچھ ادھورا رہ جاتا ہے۔

اچھا بھلا ایک مکان مل گیا تھا۔ لیکن ابھی اس میں منجملہ اسباب ویرانی میرا لپٹا ہوا بستر بھی ٹھیک سے کھلنے نہ پایا تھا کہ محلے کے ماہر غالبیات نے نہیں معلوم کیسے سونگھ لیا کہ میں "سخن فہم" نہ سہی غالب کا طرف دار ضرور ہوں اور مجھے اپنی "غائبانہ گرفت" میں ایک "صید زبوں" کی طرح جکڑ لیا۔ آتے ہی انہوں نے غالب کے متعلق دو چار حیرت انگیز انکشافات کے بعد مجھے پھانسنے کے لیے ایک آدھ ہلکا پھلکا سوال کر دیا۔ اب میری حماقت ملاحظہ ہو--- کہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو بہت بڑا غالب فہم سمجھتا ہوں--- میں نے ان کو نرم چارہ سمجھ کر ان پر دو چار منہ مار دیئے یا یوں کہہ لیجیے کہ ان کی دم پر پیر رکھ دیا یعنی ان کے سامنے غالب کو اپنے مخصوص زاویہ نگاہ سے پیش کرنے کی سعی لاحاصل کر بیٹھا مجھے کیا خبر تھی کہ میں کسی بارود کے خزانے کے قریب دیا سلائی جلانے کی کوشش کر رہا ہوں پھر کیا تھا۔ آپ غالب کو غلط سمجھتے ہیں "چیخ کر ماہر غالبیات پھٹ ہی تو پڑے مجھ پر! اور میری معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے فن غالبیات کی ایسی ایسی توپوں اور آتش فشانوں کے دہانے کھول دیئے کہ میں سراسیمہ بہوت اور ششدر ہو کر ہمیشہ کے لیے عہد کر بیٹھا کہ آئندہ کسی اجنبی بزرگ کے سامنے حضرت غالب کا نام اپنی زبان بے لگام سے ہرگز ہرگز نہ نکلنے دوں گا۔

دوسرے ہی دن سے ماہر غالبیات نے "آپ غالب کو غلط سمجھتے ہیں" کے عنوان سے میری باقاعدہ تعلیم شروع کر دی۔ سویرے میں بستر پر ہوتا۔ کہ وہ "لذت خواب سحر" پر دھاوا بولتے آ پہنچتے اور پہلے غالب کے کچھ انتہائی سنگلاخ اشعار پڑھ کر ان کے معنی مجھ سے پوچھتے گویا میرا آموختہ سنتے۔ اور پھر قبل اس کے کہ میں ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نکال پاؤں وہ "آپ غالب کو غلط سمجھتے ہیں" کہہ کر ان کے معنی اور مطالب خود بیان کرنا شروع کر دیتے اور پھر اپنی گل افشانی گفتار سے جدت آفرینی' حسن تخیل' لطف بیان' شکوہ الفاظ' بلند پروازی' ندرت کلام بلکہ پھانس کو بانس اور رائی کو پہاڑ بنانے کے لیے ایسے ایسے "گل کترتے" کہ میرے لیے "صاعقہ و شعلہ و

سیماب" کا عالم ہو جاتا اور وہ خود اس شعر کی مجسم تفسیر بن کر رہ جاتے۔

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

اور پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ میں داڑھی بنا رہا ہوں اور وہ غالب کا فلسفہ حسن سمجھا رہے ہیں۔ میں کنگھا کر رہا ہوں اور وہ آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز' میں مسئلہ ارتقاء کو پروان چڑھتے دیکھ رہے ہیں میں کپڑے بدل رہا ہوں۔ اور وہ "ہیولی برق خرمن کا ہے خون گرم دہقان کا" پڑھ پڑھ کر اور گا ہے بگاہے انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگا لگا کر غالب کو ہندوستان کا سب سے پہلا انقلابی ثابت کر رہے ہیں میں جوتے کی ڈوریاں باندھ رہا ہوں اور وہ "بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے" والے مصرع سے فضائے آسمانی پر اپسٹک چھوڑ رہے ہیں۔ میں ناشتہ کر رہا ہوں اور وہ "مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے" دہرا دہرا کر غالب کے علم الغذا پر کچھ اس انداز سے روشنی ڈال رہے ہیں کہ میرے منہ کا نوالہ حلق میں جانے سے انکار کر بیٹھتا ہے۔ دفتر جانے کے یے سائیکل نکال رہا ہوں اور وہ غالب کا فلسفہ عرانیات بیان کر رہے ہیں میں سائیکل پر بیٹھ چکا ہوں اور وہ شام کو دفتر سے میری واپسی پر غالب اور ضبط تولید کے موضوع پر اپنے تازہ ترین الہامات کو مجھ پر نازل کرنے کی, دھمکیاں دے رہے ہیں۔

شام کو ظہور پذیر ہوتے تو غالب اور دوسرے شعراء کا موازنہ شروع فرما دیتے اور غالب کے منہ لگنے والے دیگر تمام شعراء کو گردن زونی قرار دے کر بھی جب تسلی نہ ہوتی تو غالب کے مختلف شارحین کا پہلے سرکس پھر کشتی شروع کرا دیتے اور کافی دھرپنخ کے بعد جب شارح کافی پست ہو چکتا تو خود بھی اکھاڑے میں کود پڑتے ہیں اور فردا" فردا" شارح کو پچھاڑتے اور پھر ہر شعر کے متعلق اپنی ایک انوکھی' اچھوتی اور عجوبہ روزگار شرح کا آغاز کر دیتے جس کا انجام غالبا" اس وقت تک نہ ہوتا۔ جب تک میں اپنے ہوش و حواس کی قید و بند سے نجات پا کر وہاں نہ پہنچ جاتا جہاں سے خود مجھ کو میری خبر نہ آتی یعنی بالکل ہی بے سدھ ہو کر اپنے بستر پر گر نہ جاتا۔

میں اکثر خواب میں دیکھتا کہ حضرت غالب اپنی دیوان بغل میں دبائے بے تحاشہ چیختے ہوئے بھاگ رہے ہیں "بچاؤ! بچاؤ! مجھے میرے شارحین اور ماہرین سے بچاؤ!" اور ان کے پیچھے شارحین' ماہرین اور پرستاروں کا ایک غول بیابانی ان کا تعاقب کر رہا ہے جس کی قیادت ایک ڈنڈا لئے میرے محلے کے ماہر غالبیات کر رہے ہیں اور اپنے ساتھ مجھے بھی ایک زنجیر میں باندھے گھسیٹ رہے ہیں۔

کئی دفعہ تکلف بر طرف کر کے ان کی منت سماجت کی۔ ہاتھ جوڑے' ڈاڑھی میں ہاتھ دیا' کان پکڑ کر اٹھا بیٹھا اور حرف مطلب یوں زبان پر لایا کہ ماہر غالبیات آپ کو آپ کے حضرت غالب مبارک! مجھ مغلوب کو میرے ہی حال پر چھوڑ دیجئے تو آپ کی غالیست میں کونسا بٹہ لگ جائے گا؟ میں ایک گدائے بے نوا' احمق' جاہل اور ہیمدان ہوں' میرے ایسے ذرہ ناچیز کو غالب ایسے آفتاب عالم تاب سے کیا نسبت؟ میں حضرت غالب کا صرف اس قدر گنہگار ہوں کہ عالم طفولیت میں ایک مولوی صاحب نے اسکول میں کورس کی کتاب سے ان کی چند غزلیں

زبردستی پڑھادی تھیں۔ اسکے علاوہ مجھ سے قسم لے لیجئے جو میں نے کبھی انہیں ہاتھ بھی لگایا ہو۔ اور ہاتھ لگانا بھی خاک۔ ہاتھ آئیں تو ہاتھ لگائے نہ بنے! غالب کو میں کیا میری سات پشتیں بھی نہیں سمجھ سکتیں میں نہ انہیں سمجھا ہوں اور نہ سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔ آپ بے کار میرے ہوش و حواس پر چاند ماری گویا بنجر زمین میں تخم ریزی اور آبیاری کرتے ہیں نتیجہ اس کا یہ ہو گا کہ میں پاگل ہو جاؤں گا اور میرے بیوی بچے آپ کو اور مرزا غالب کو کوستے پھریں گے۔

لیکن ماہر غالبیات بھلا کب ماننے والے تھے۔ میرے اظہار بیچارگی سے ان کی ہمہ دانی میں اور بھی چار چاند لگ جاتے اور فخر و تمکنت سے ان کے گلے کی رگیں پہلے سے بھی زیادہ پھولنے لگتیں۔ "ہو گا کوئی ایسا بھی جو غالب کو نہ جانے؟ دے اور دل ان کو نہ دے مجھ کو زباں اور! آپ غالب کو غلط سمجھے ہیں! اے دریغا رند شاہد باز!" اور فرمانے کے بعد...... وہ غالب کے متعلق اپنی تحقیق اور دریافت کی گولہ باری مجھ پر کچھ اور تیز کر دیتے مجھے کبھی انگیتھا یا حواس باختہ دیکھتے تو چوکنا کرنے کے لیے مجھ پر دو چار انتہائی زلزلہ خیز سوالات داغ دیتے مخاطب کے نظریہ فلکیات کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے اور اس کے ماتحت مہ نخشب' کے ساتھ دست قضا نے کیا برتاؤ کیا تھا؟" غالب نے قدرتی مناظر سے جو نفسیاتی موشگافیاں کی ہیں اس سے ان کے تحت الشعور کی کس بلندی کا پتہ چلتا ہے؟" "غالب کے سماجی شعور میں سیاسی اور اقتصادی بلوغیت کب اور کیسے پیدا ہوئی؟" وغیرہ وغیرہ میں بھلا ان سوالات کا جواب کیا دیتا؟ میں مجبورا" ماہر غالبیات کی طمانیت قلب کے لیے آنکھیں پھاڑ کر منہ کھول دیتا اور ان کی خواہش کے مطابق انہیں اپنے حیرت زدہ ہونے کا پورا پورا یقین دلا دیتا۔ لیکن دل ہی دل میں سوچتا کہ اگر میں اپنی سماجی بلوغیت کو کام میں لاتے ہوئے اپنا وزنی قلمدان ماہر غالبیات کے تحت الشعور پر پوری قوت سے پٹخ دوں تو یقینا" ان پر فلکیات کے بہت سے طبق روشن ہو جائیں گے۔

بس کیا عرض کیا جائے کہ کس طرح عاجز اور پریشان کر رکھا تھا ان ماہر غالبیات نے؟ ان سے جان چھڑانے کے لیے بیسیوں ترکیبیں کیں محلے کے بااثر لوگوں کا دباؤ ڈلوایا گمنام خطوط لکھے ایک انسپکٹر پولیس سے ان کے خلاف کوئی فرضی مقدمہ چلانے کی فرمائش کی۔ بیماری کا ڈھونگ بنایا۔ بہرے بنے (تو التفات دونا ہو گیا) دوستوں کے گھر جا کر پناہ لی گھر کے دروازے بند کرائے نوکر کو ہدایت کی کہ "ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے!" لیکن اجی توبہ کیجئے------ اہل تدبیر کی واماندگیاں! ماہر غالبیات مجھے نہ پاتے تو گھنٹوں غالب کا کوئی شعر اور اس سے متعلق ایک نئی داستان ہو شربا اپنے اوپر طاری کئے ہوئے میرے دروازے کے سامنے گلی میں ٹہلا کرتے اور جب تک مجھے گھر جاتے یا گھر سے نکلتے گرفتار کر کے مجھ پر شعر صادق نہ کر دیتے دم ہی نہ لیتے۔

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں

ان حالات میں چاہے اسے میری بدذوقی کہئے چاہے اقدام قتل سے گریز کہ جیسے ہی مجھے ایک دوسرا مکان ملا جو اگرچہ میرے پہلے مکان کا صرف نصف بہتر معلوم ہوتا میں رسیاں تڑا کر بھاگا۔ ماہر غالبیات سے میں نے کہہ دیا

کہ میں شہر کیا صوبہ چھوڑ رہا ہوں اور وہ مجھے آبدیدہ ہو کر رخصت کرنے آئے تو بڑے رقت انگیز لہجے میں فرمایا" آپ غالب کو غلط سمجھے ہیں"۔ اور اگر میں "شرم تم کو مگر نہیں آتی" نہ چیختا اور غلطی سے تانگے والا اس کا مخاطب اپنے آپ کو سمجھ کر فوراً تانگہ ہانک نہ دیتا تو یقیناً ماہر غالبیات مجھے ایک فی البدیہہ الوداعی جلاب دیئے بغیر ہرگز نہ مانتے۔

اپنے ان جان لیوا ماہر غالبیات سے چھٹکارا پا کر مجھے جو مسرت بے پایاں حاصل ہوئی اس کا اظہار غالباً غیر ضروری ہے۔

مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں

مکان تبدیل کرنے کے سلسلے میں اپنا ایک مکان سے انتہائی بدحواسی اور سراسیمگی سے باندھا ہوا سامان جب دوسرے مکان میں کھولا جاتا ہے تو کہیں سے لوٹ کر لائے ہوئے مال غنیمت کا لطف آ جاتا ہے اور اس میں ایسے ایسے حیرت انگیز انکشافات نمودار ہونے لگتے ہیں کہ ناطقہ سر گریباں ہو کر رہ جاتا ہے میرا وہ آئینہ جس کو میں نے یقیناً "کسی بہت محفوظ جگہ بڑی احتیاط سے چھپا دی تھا کہ سندر ہے اور وقت ضرورت کام آئے انتھک تلاش اور جستجو کے بعد بھی ہاتھ نہیں لگتا ہے کیسن نگار کا وہ جو تاجس کے متعلق کامل یقین تھا کہ وہ مہینے ہوئے کھو چکا ہے چنانچہ اس کے جوڑی دار کو میں نے چلتے چلاتے ماہر غالبیات کے مکان کی طرف اچھال دیا تھا ایک ڈبے سے بے ساختہ نکل پڑتا ہے میں اپنے سامان سے کشتی لڑ لڑ کر اس قسم کے حوادث سے دو چار تھا کہ "شفعتا" کسی نے باہر کا دروازہ بھڑ بھڑانا شروع کر دیا مجھے اس وقت سچ پوچھئے تو ملک الموت سے ملنے کی فرصت نہ تھی طوعاً "کرہا" لاحول پڑھتا ہوا لپکا۔ اور دروازہ کھول دیا۔

ڈاڑھی بڑھاتے اور صرف بنیان اور تہمد پہنے ایک بزرگ نمودار ہوئے اور بڑی بے تکلفی سے سلام علیکم کہتے ہوئے بیٹھک میں داخل ہو کر ایک کرسی گھسیٹی اور اس پر اکڑوں بیٹھ گئے اور کچھ جھوم کر یہ شعر پڑھا۔

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا!

مجھے مجبوراً "وعلیکم السلام کہہ کر ایک مونڈھے پر پناہ لینی پڑی۔

"اس مکان کے نئے کرایہ دار آپ ہی ہیں؟"

۔ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے؟

مطلب یہ کہ

۔ آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے!"

مرزا غالب کا تابڑ توڑ کلام سننے کے بعد غصے یا مستقبل کے خوف سے میرے کان خود بخود جلنے لگے اور بڑی مشکل سے میرے منہ سے فقط ایک "جی" نکل سکی۔

ابھی ابھی مرزا کبن صاحب سے معلوم ہوا کہ یہاں تشریف لانے سے قبل آپ دہلی میں رہتے تھے۔

"کیوں نہ دلی میں ہر اک چیز نوابی نہ کرے۔"

"جی ہاں دو تین ماہ دلی بھی رہا ہوں۔ کیا میرے خلاف خفیہ پولیس کی کوئی تحقیقات آپ کے سپرد ہوئی ہے؟"

مسکرا کر چیخ اٹھے۔

ہے ہے خدانخواستہ وہ اور دشمنی
اے شوقِ منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

میں نے ہمت کر کے دہلی زبان میں عرض کیا "آپ نے ابھی تک مجھے خود اپنے آپ سے متعارف ہونے کا شرف نہیں بخشا۔"

اپنے سر کے بال نوچتے ہوئے بولے۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

اب میری بدحواسی مکمل ہو چکی تھی۔ "جی۔ آپ؟ حضرت غالب!"

"جی ہاں حضرت غالب، ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا۔ میں اس وقت صرف پوچھنے حاضر ہوا تھا کہ آپ دہلی میں رہے ہیں تو شہنشاہِ اقلیمِ سخن حضرت غالب سے تو ضرور ہی واقف ہوں گے۔"

مجھے جھرجھری محسوس ہونے لگی اور میں نے بڑی بے اعتنائی سے جواب دیا جی ہاں سنا ہے کہ اس نام کے ایک بزرگ کا مزار دہلی ہی میں ہے۔ اپنا سر پیٹتے ہوئے بولے۔ "معاف کیجئے گا آپ نے بے رخی کی حد کر دی سنا ہے کہ اس نام کے ایک بزرگ کا مزار دہلی ہی میں ہے ع جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں۔ ابی آپ کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ آپ اس بارگاہ فلک منزلت پر ع رتبہ میں مہروماہ سے کم تر نہیں ہوں۔ سرِ عقیدت خم کر کے شرفِ قدم بوسی تو حاصل کر ہی لیتے۔ وہی مثل بارہ برس دہلی میں رہے اور ع سر جائے یار ہے نہ زمین پر کے بغیر۔ بھاڑ ہی جھونکتے رہے۔"

میں نے بھی کچھ اس جھلاہٹ سے جواب دیا۔ جیسے اگر میرا بس چلتا تو غالب کو ان کی خواہش کے مطابق "غرقِ دریا" ہو جانے دیتا۔ اور کچھ نہیں تو دہلی میں ان کا مزار ہرگز بننے نہ دیتا میں مزار پر حاضر بھی ہوتا تو مرحوم تو قبر کے اندر تھے نہ کہ اوپر میں شرفِ قدم بوسی کیسے کرپاتا؟"

کلیجہ پکڑ کر بولے ہے ہے!

ع رکھتا ہے ضد سے کھینچ کر باہر لگن میں پاؤں

ابی آپ کو کیا خبر۔

پس از مردن بھی دیوانہ زیارت گاہ طفلاں ہے
شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گل فشانی کی

میں خاموش رہا چند لمحوں کی خاموشی کے بعد پھر گویا ہوئے کم سے کم ازراہ تعزیت آپ کو مرحوم کے بیوی بچوں کے پاس تو چلا ہی جانا چاہیے تھا۔

ع بچوں کا بھی دیکھانہ تماشا کوئی دن اور۔"

"اب کسی روز آپ کو ساتھ لیکر چلا جاؤں گا۔"

میرے جواب کو سنا ان سنا کر کے اچانک ہڑبڑائے اور میری کتابوں کے ٹھر پر جو ابھی میز پر بے ترتیبی سے رکھا ہوا تھا۔ جھپٹے اور سب سے اوپر کی کتاب اتفاق سے دیوان غالب تھی اٹھا کر "جوش بہار جلوہ" بنتے ہوئے بولے۔ "یہ صحیفہ آپ کو کہاں سے دستیاب ہوا؟ ع یادگار نالہ اک دیوان بے شیرازہ تھا مدت بعد آج ایک مسلم دیوان غالب ہاتھ آیا ہے۔ جو کسی طرح بھی مجھے مرغ مسلم سے کم عزیز نہیں۔

ع کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

"بازار سے۔"

"بازار سے" "اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا! کیا بازار میں اس قسم کا کلام بھی بکتا ہے؟ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو سترہ اٹھارہ سال ہوئے میرے پاس بھی ایک مسلم دیوان غالب تھا۔ جو میرے رشتہ کے ایک نانا میرے گھر پر بھول گئے ۔ کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا۔ لیکن خوش قسمتی سے ایک روز برخوردار جمن کی والدہ جو آگ جلانے بیٹھیں۔ ۔ کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے۔ تو اس صحیفہ زرین کو کچھ اس طرح پھاڑ کر بس ۔ ول سے تیرے نگاہ جگر تک اتر گئی۔ یعنی دیوان کا قریب قریب ہر مصرع اولی اپنے مصرع ثانی سے جدا ہو گیا۔ وہ تو کہئے کہ بروقت میری نظر پڑ گئی۔ ورنہ ۔ آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا۔ کا مضمون درپیش آ جاتا۔ کیوں صاحب یہ لفظ خوش قسمتی پر آپ چونکے کیوں؟ جی ہاں۔ ۔ اس میں کچھ شائبہ خوبی تقدیر بھی تھا۔"

میں نے اپنا پیٹ پکڑتے اور منہ بناتے ہوئے عرض کیا۔ "اس وقت پیٹ میں کچھ درد ہو رہا ہے۔ اگر یہ گفتگو آپ کسی دوسرے وقت کے لیے ملتوی کر دیں....."

نادر شاہی حکم دیا۔

درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

"جی ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ اب جو والدہ محترمہ مطلب یہ کہ جمن کی والدہ محترمہ اوراق پریشاں کو جو کسی عاشق کا گریبان ہو چکے تھے جوڑنے بیٹھیں تو ان کو کچھ ایسا جوڑ دیا کہ فن غالبیات میں ایک نئے دور کا آغاز بلکہ اضافہ ہو گیا اور جس پر ناچیز اپنی عمر عزیز کے بارہ سال صرف کر چکا ہے۔ اور اب بہت جلد دیوان غالب حسب ترتیب بالغ منظر عام پر جلوہ افروز ہو کر مشتاقان غالب اور قدر شناساں بالغ کے لیے جنت نگاہ اور فردوس گوش بننے والا ہے۔ محض مصرعوں کی تھوڑی سی الٹ پلٹ سے کلام کی لطافت' ظرافت اور صداقت نہیں معلوم کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے اور یقیناً" اب مرزا غالب کو فرمانے کا۔ ۔ نہ سہی گر میرے اشعار میں معنی نہ سہی--- کوئی حق

باقی نہیں رہتا ہے۔ کاش کہ وہ خود اس کو دیکھتے تو عش عش کر کے کف افسوس ملتے کہ ہائے خود مجھے یہ کیوں نہ سوجھی اور بلا امداد بالغ میں نے یہ پہلی کیوں نہ بوجھی۔

سلسلہ کلام ایک طرف کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔ "نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں دیکھئے کس طرح دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے؟ ایک روز مجنوں اسکول سے روتا ہوا لوٹا تو اس نے اپنے گارجین مرزا غالب سے شکایت کی کہ اس کو ماسٹر نے بے قصور مارا ہے مرزا غالب کا افراسیابی خون جوش میں آگیا۔ اور وہ ماسٹر کے پرزے اڑانے اسکول پہنچے تو عین موقع واردات پر شاعر مل گیا۔ اور وہ انہیں سمجھاتا ہے کہ ماسٹر نے برخوردار مجنوں کو جو سزا دی وہ بالکل حق بجانب تھی کیونکہ یہ صاحبزادے کوئلے سے اسکولوں کی دیوار خراب کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔

نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اس نے شدت کی
کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار و دبستان پر

ذرا خدا لگتی کہئے گا کہ اب شعر کی اخلاقی حیثیت کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے عاشق کی عزت نفس کے متعلق غالب نے بہت سے اشعار کہے ہیں لیکن خدارا اس شعر کے تیور ملاحظہ فرمایئے۔ ایک دفتر میں کلرک ہو جانے کے بعد عاشق کے لہجے میں کیسی خود اعتمادی آجاتی ہے۔

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

کون کہتا ہے کہ مرزا صاحب ناعاقبت اندیش تھے۔ دیکھئے کس طرح اپنے چھوٹے بھائی اسد کو مشورہ لینے کے بہانے نصیحت کرتے ہیں۔

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر
فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسد

اور غالباً" یہ آپ کے مذاق کا شعر ہو۔ ذرا معشوق کی جلد بازی تو ملاحظہ فرمایئے۔

زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

اور معشوق کی تیز رفتاری تو غالباً" اس سے بہتر کبھی بیان ہی نہیں کی جا سکتی۔

تھان سے وہ غیرت صرصر کھلا
کس نے کھولا" کب کھلا" کیونکر کھلا

اور غالباً" یہ شعر تو واد سے مستغنی ہے۔ ساقی اس سے بڑھ کر مرزا صاحب پر اور احسان ہی کیا کر سکتا تھا۔

میں اور حظ وصل خدا ساز بات ہے
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

اور پھر معشوق کے بڑھاپے کی جب وہ کئی بچوں کی ماں بن کر اپنے شوہر یعنی غالب کے پرانے رقیب کے ساتھ حسب خیریت ہے، قسم کی زندگی بسر کر رہی ہے کیا خوب تصویر کھینچ کر رکھی دی ہے۔

یقیں ہے ہم کو بھی، لیکن اب اس میں دم کیا ہے
رقیب پر ہے اگر لطف، تو ستم کیا ہے

دیکھئے۔ ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد! یہ سب مصرعے حضرت غالب ہی کے ہیں۔ اور میں نے ان میں کسی قسم کی کوئی تحریف نہیں کی ہے۔ صرف ذرا چابکدستی سے ان کی ترتیب میں تھوڑی سی الٹ پلٹ کر دی ہے۔

میں نقش حیرت بنا یہ سب سن رہا تھا۔ لیکن نہیں معلوم میرے ہاتھوں میں ایک خاص قسم کی خشخی کیفیت کیوں پیدا ہو رہی تھی۔

بالغ صاحب کی روانی طبع کچھ اور تیز ہو چلی۔ "دیکھئے مرزا صاحب معشوق کو بہلا پھسلا کر اسے چھپ چھپ کر ملنے کے کیسے کیسے مقامات بتاتے ہیں گرگ باراں دیدہ تھے کہ نہیں!

مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو
مسجد ہو، مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

اس کے بعد کیا ہوا؟ تفصیلات برطرف ایک تہمد اور ایک بنیان کی کچھ دھجیاں میرے حصے میں آئیں۔ اور میرا پرانا رفیق دیوان غالب مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا فی الحال میں ہسپتال میں ہوں اور بیوی بچے ہوٹل میں۔ الاٹمنٹ افسر کو درخواست دے رکھی ہے۔ کہ مجھے کوئی ایسا مکان الاٹ کیجئے جس میں چاہے روشن دان، تابدان بلکہ چھتیں اور دیواریں تک نہ ہوں لیکن اس کے ایک میل کے قطر میں کوئی ماہر غالبیات نہ پایا جاتا ہو۔ ابھی تک تو کوئی ایسا مکان مل نہیں پایا ہے۔

واضح رہے کہ غالب اب بھی میرا محبوب ترین شاعر ہے بلکہ ماہرین و شارحین کے ہاتھوں اس کی درگت بنتے دیکھ کر وہ مجھے پہلے سے بھی کہیں زیادہ عزیز ہو گیا ہے بحمد اللہ میں نے دیوان غالب کا ایک نسخہ خرید لیا ہے اور غسل خانے میں جب بھی پانی ضرورت سے زیادہ ٹھنڈا ہوتا ہے تو میں اس کے اور صرف اس کے اشعار گنگنایا کرتا ہوں اور اکثر اس کی مظلومیت کا تصور کر کے یہ مصرع بھی پڑھ لیتا ہوں۔

شاعر تو وہ اچھا ہے پر بدنام بہت ہے

محمد انصار اللہ ناظر

غالبِ ذوق اور ناسخ

نجم الدولہ مرزا اسد اللہ خاں غالب اور خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق میں معاصرانہ چشمک جیسی بھی تھی اس کا اندازہ ان واقعات سے کیا جا سکتا ہے جو کتب تاریخ اور تذکروں میں تحریر ہیں لیکن ضروری ہے کہ ہم ان کی صحت کا بھی تعین کر لیں۔ ان واقعات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے ان میں ذرا سا ستم بھی بڑے غلط نتائج کی صورت میں ظاہر ہو سکتا ہے' سطور ذیل میں اس سلسلہ کے بعض مشہور واقعات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں تاکہ ان کی واقعی کیفیت معلوم ہو جائے۔

(1)

مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی نے مختلف شاعروں اور بزرگوں کے دلچسپ حالات "لطائف الشعراء" میں شائع کیے ہیں' ان میں غالب اور ذوق کے بھی کئی لطیفے تحریر ہیں:۔

"قلز محل کے تمام شہزادے حضرت ذوق کے شاگرد تھے شہزادہ عالی سیرت زیادہ استاد کے منہ لگے تھے وہ مرزا غالب کے کلام پر اکثر حرف گیری کیا کرتے تھے ایک دن کچھ کہہ سن رہے تھے اتنے میں مرزا خضر سلطان بھی آ گئے حضرت ذوق نے ان کے آنے کا خیال نہ کیا طرہ یہ کہ خود بھی مرزا صاحب سے خوش نہ تھے عالی سے کہنے لگے یہ غزل آج ہی کہی ہے اممقطع سنو۔

سمجھ ہی میں نہیں آتی ہے کوئی بات ذوق اس کی
کوئی جانے تو کیا جانے کوئی سمجھے تو کیا سمجھے

خضر سلطان جب شہر آئے تو استاد (مرزا غالب) سے کل ماجرا کہا جس سے مرزا نے بھی حضرت ذوق کی خبر لی' یہ جب ذوق نے سنا تو خضر سلطان سے پہلے ہی کھنچے رہتے تھے' فرماتے ہیں۔

کہئے نہ تنگ ظرف سے اے ذوق کبھی راز
کہہ کر اسے سنتا ہو ہزاروں سے تو کہئے

اس لطیفہ میں کئی اسقام موجود ہیں۔ مفتی صاحب نے صرف اتنا بتایا کہ غالب نے ذوق کی خبر لی مگر کس طرح؟ یہ نہ بتایا۔ مرزا خضر سلطان' آخری تاجدار ہند بہادر شاہ کے چھوٹے صاحبزادے تھے' فن شعر میں مرزا اسد اللہ خاں غالب کے شاگرد تھے۔ غالب نے اپنی ایک مشہور غزل میں ان کی دعاگوئی اس طرح کی ہے۔ شعر

خضر سلطان رکھے خالق اکبر سر سبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

مولانا الطاف حسین حالی کے بیان کے۔مطابق یہ غزل مرزا کے آخری زمانہ کی ہے (مکتوبات آزاد) لالہ سری رام کا بیان ہے کہ وفات کے وقت یعنی 1887ء میں مرزا خضر سلطان کی عمر تقریباً چھبیس برس کی تھی (خمخانہ جاوید 130؍25) گویا ان کی پیدائش 1831ء؍1247ھ کے قریب کی ہو گی۔

ذوق کی وہ غزل جو "سمجھے" کی ردیف میں ہے اور جس کا مقطع مفتی صاحب نے نقل کیا ہے 1255ھ مطابق (1839ء کے قریب کی ہے اور ایک طرحی مشاعرہ کے لئے کہی گئی تھی (اس پر تفصیل بحث میں نے اپنے مضمون "ذوق کے متعلق آزاد کے بیانات" شائع شدہ نگار لکھنؤ ماہ مارچ 1960ء میں کی ہے' ایسی صورت میں اس غزل کی تصنیف کے وقت تک مرزا خضر سلطان کی عمر زیادہ سے زیادہ آٹھ سال ہو سکتی ہے' اس عمر میں ان کی شاعری کی ابتدا بھی قرین قیاس نہیں' چہ جائیکہ وہ مرزا غالب سے قلعہ کی باتیں جا لگاتے۔

مولانا الطاف حسین حالی کے بیان کے مطابق غالب قلعہ میں 1850ء میں پہنچے (بحوالہ یادگار غالب) اور مذکورہ حالات میں یہی زمانہ مرزا خضر سلطان کے استاد مقرر ہونے کا بھی ہو سکتا ہے' غزل (کیا سمجھے) گلشن بیخار 1259ھ مطابق 1843ء میں کئی اشعار تحریر ہیں' اس طرح بھی یہ بات ممکن نہیں کہ اس غزل کی بات مرزا خضر سلطان کے ذریعہ غالب تک پہنچی۔

حکیم آغا جان عیش کا قطعہ اسی زمین (خدا سمجھے) میں مشہور ہے جو غالب سے متعلق ہے اتفاقاً" ذوق کا مقطع بھی ایسا ہو گیا کہ مفتی صاحب کو یہ لطیفہ قلم بند کرنے کا موقع مل گیا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ لطیفہ بالکل بے بنیاد ہے' مفتی صاحب نے اس سلسلہ میں کوئی حوالہ بھی تحریر نہیں کیا کہ اس کی صحت کا کسی درجہ میں خیال کیا جا سکتا۔

زیر بحث لطیفہ میں ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ مفتی صاحب نے "قلعہ کے تمام شہزادے ذوق کے شاگرد" بتائے ہیں' اور آنجا لیکہ یہ بات بھی حقیقت کے خلاف ہے' متعدد مرشد زادے حافظ احسان اور شاہ نصیر کے شاگرد تھے' شاہزادہ خضر سلطان جن کا اس لطیفہ میں بہت اہم کردار ہے' مرزا غالب کے تلامذ میں سے تھے وغیرہ' بات صرف اس قدر ہے کہ شہزادوں میں سے بہت سے ذوق کے دامن تلمذ سے وابستہ تھے لیکن "اکثر" کو "تمام" کہنا غلط ہے۔

مفتی صاحب غالباً شاہزادے اور مرشد زادے میں فرق نہ کر سکے' مرزا خضر سلطان شہزادہ تھے لیکن عالی کو شہزادہ کہنا مناسب نہیں قلعہ کی اصطلاح میں ان کو مرشد زادہ یا صاحب عالم کہنا مناسب ہے' یہ ذوق کے اولین شاگردوں میں سے تھے چنانچہ گلشن بیخار میں ان کا ذکر اس طرح ہے۔

"عالی تخلص از خانوادۂ امیر تیمور است و شاگرد و شیخ ابراہیم ذوق" (ص 130)

ایسی صورت میں یہ بات ممکن ہے کہ ذوق ان کو زیادہ مانتے ہوں۔ لیکن نہ تو ذوق کی طبیعت ایسی تھی کہ کسی کی غیبت کرنے یا کسی کی برائی سننا پسند کرتے اور نہ مرزا خضر سلطان اور عالی کے متعلق ایسی شہادتیں ملتی ہیں جن سے یہ قیاس ہو کہ یہ لوگ ایک کی بات سن کر دوسرے سے جا لگاتے ہیں۔

(2)

شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی کی تصنیف "یادگار غالب" کو "غالبیات" کے موضوع پر اہم ترین ماخذ کی حیثیت حاصل ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس تصنیف نے غالب کو واقعتاً غالب بنا دیا۔ اس میں ایک لطیفہ یہ بھی درج ہے۔

"ایک صحبت میں مرزا (مراد اسد اللہ خاں غالب سے ہے) میر تقی کی تعریف کر رہے تھے' شیخ ابراہیم ذوق بھی موجود تھے۔ انہوں نے سودا کو میر پر ترجیح دی' مرزا نے کہا میں تو تم کو میری سمجھتا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ آپ سودائی ہیں" (ص 40)

اس لطیفہ سے عام خیال ہوتا ہے کہ غالب میر کے معتقد تھے' لیکن ذوق' سودا کے مداح تھے بلکہ میر پر سودا کو ترجیح دیتے تھے۔ مولانا نے مذکورہ لطیفہ کے زمانہ کا ذکر نہیں کیا ہے اور نہ یہ بتایا کہ اس صحبت میں کون کون لوگ موجود تھے' پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ مولانا نے غالب کا ایک جملہ تو تفریح طبع کے لئے لکھ دیا لیکن اس صحبت کے مبحث پر ذرا بھی روشنی نہ ڈالی' حالانکہ یہ بہت اہم تھا کیونکہ اس سے دونوں اساتذہ کے نظریات دریافت ہوتے۔

منشی دیانرائن نگم مرتب "یادگار غالب" کہتے ہیں کہ حالی پہلی مرتبہ ڈیڑھ سال رہ کر 1855ء میں دہلی سے واپس چلے گئے (صفحہ 8) گویا حالی پہلی مرتبہ دہلی 1853ء میں آئے ہوں گے' ایسی صورت میں اگر مذکورہ صحبت میں حالی کا موجود ہونا تسلیم کر لیا جائے تو یہ واقعہ 1853ء کے بعد کا ہوگا۔ حالی نے کسی راوی کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ ان کے الفاظ سے یہی خیال ہوتا ہے کہ وہ خود اس صحبت میں موجود تھے۔

شیخ ذوق اکثر اساتذہ قدیم سے متاثر تھے جیسا کہ آزاد کے بیان اور ان کے کلام سے ظاہر ہے' دیکھنا یہ ہے کہ وہ میر اور سودا میں کس سے زیادہ متاثر تھے' اور کس کی اتباع زیادہ کرتے تھے۔ ذوق کے کلام میں صرف ایک مقطع ایسا ملتا ہے جس میں کسی اردو کے شاعر کا نام احترام اور عزت کے ساتھ لیا گیا ہے' اور یہ کہا ہے کہ اس کا انداز کسی دوسرے کو (بشمول خود کے) نصیب نہ ہو سکا اور یہ ذات صرف میر تقی میر کی ہے۔

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

یہ مقطع ذوق نے 1261ھ سے قبل کہا تھا (گلستان بے خزاں) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں ذوق کے معاصرین میں سے اکثر میر کے طرز خاص میں شعر کہنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ذوق کہتے ہیں کہ کسی کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ گویا صرف ذوق کو یہ فخر حاصل ہوا کہ وہ میر کی اتباع میں کامیاب ہوئے' یہ مقطع اس حقیقت کے اثبات کے لئے بہت کافی سند ہے کہ ذوق' میر کی اتباع نہ صرف بہتر جانتے تھے بلکہ اس پر فخر کرتے تھے' اور اس سلسلہ میں ان کی کامیابی کا اعتراف اکثر اہل بصیرت نے کیا ہے۔

شمس العلماء مولانا محمد ذکاء اللہ صاحب بہادر شاہ کا ذکر کرتے ہوئے ذوق کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"ابراہیم ذوق طوطی ہند و جو ریختہ گوئی میں دوسرے میر تھے اس کے استاد تھے" (تاریخ ہندوستان 9 / 342)

مولانا کی ذات سے گرامی کو جو اہمیت اور خصوصیات ہے محتاج بیان نہیں' اس کے علاوہ مولانا کو ذوق سے کوئی ایسا تعلق بھی نہیں کہ جس سے ان کے قول کی اہمیت کم ہو سکے' یہ امتیاز ذوق کا ہے کہ وہ دوسرے میر کہلائے۔

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد نے ایک موقع پر میر ببر علی انیس کو ذوق کا ایک مقطع سنایا' میر صاحب نے اسے بار بار پڑھوا کر سنا اور فرمایا:-

"دوسرے مصرع میں قافیہ ایسے پہلو سے بیٹھا ہے کہ اس کا حق ہے وہ استاد تھے جو انہوں نے کہا ہی لفظ ہو تو ہوا اور ہو تو نہیں ہوتا۔"

پھر فرمایا:-

"خواجہ میر (مراد میر تقی سے ہے) کے بعد یہی ہوئے اور دلی میں شاعری کون ہوا" (آب حیات' دیوان ذوق 87)

اگر آزاد کا بیان کردہ واقعہ بالکل درست نہ بھی ہو تو بھی یہ مسلم ہے کہ کم از کم آزاد اپنے استاد کو دوسرا میر ضرور سمجھتے تھے اور آزاد بھی اردو کی چیدہ ہستیوں میں سے تھے' چنانچہ ان کی اپنی رائے بھی کچھ کم وقیع نہیں' خصوصاً اس وقت جب آزاد کا جملہ میرو مرزا کے متعلق لاجواب سمجھا گیا اور سند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے کہ میر کا کلام آہ ہے اور سودا کا کلام واہ اس لطیفہ میں آزاد نے اپنے استاد کو دوسرا سودا نہیں کہا بلکہ میر کے بعد بہترین شاعر قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر سر شاہ سلیمان صاحب نے بھی ذوق کے کلام میں میر کا رنگ پایا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"مثنوی) اگر مکمل ہوتی تو شاید میر تقی میر کی مثنویات کا جواب ہوتی" (غزلیات ذوق: 6)

قاضی غلام امید بدایونی نے اپنے مقالہ میں یہی ثابت کیا ہے کہ ذوق' میر کے بعد بہترین غزل گو ہوئے' ان کے مقابلہ پر الناظر لکھنؤ کی طرف سے غور و خوض کے بعد پہلا انعام ملا۔ اس سے ان کے استدلال کی قیمت بھی ظاہر ہے۔

ذوق انتہا پسند نہ تھے اور یہی ان کی سب سے بڑی خوبی تھی' وہ اگر میر کے ایسے معتقد تھے کہ میر کی طرز میں وہ خصوصیت حاصل کی جو بیان کی گئی تو دوسری طرف وہ سودا کے کمال فن کے بھی مداح تھے' چنانچہ قصائد میں اور بعض غزلیات میں بھی سودا کا تتبع انہوں نے کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس صحبت کا ذکر حالی نے کیا ہے وہاں میر تقی میر کی تعریف ہو رہی تھی اور اس سلسلہ میں انتہا پسندانہ طور پر تبصرہ ہو رہا تھا یعنی میر کو ہر طور دوسرے تمام شعراء پر ترجیح دی جا رہی تھی' حالانکہ یہ بات صحیح نہیں' انصاف پسند طبائع اس قسم کی انتہا پسندانہ باتوں کو کبھی گوارا نہیں کرتیں چنانچہ ذوق نے اس کی تردید کی اور بعض پہلو سودا کے کلام کے ایسے بھی بیان کئے جن سے سودا

کا تفوق میر پر ثابت ہو سکے۔ جواب میں مرزا غالب نے اپنی مخصوص تیز زبانی سے کام لیا ہو گا اور وہ جملہ کہا ہو گا' جو حالی نے لکھا۔ یہ میرا قیاس ہے جس کی تائید مذکورہ حالات سے ہوتی ہے' لیکن اس قیاس پر ہی اکتفا کرنا کیا ضروری ہے' دیکھنا یہ چاہئے کہ مذکورہ لطیفہ کس حد تک حقیقت پر مبنی ہے' ذوق اور غالب کی چشمک مشہور ہے اور زیادہ امکان ہے کہ یہ آخر عمر میں اور ترقی کر گئی ہو' ایسی صورت میں ان ادبی صحبتوں کی گنجائش بہ مشکل نکل سکتی ہے جہاں ایسی بحثیں ہوتی ہوں اور دونوں استاد موجود رہے ہوں۔ غالب کا ایسے مشاعروں سے احتراز مشہور بھی ہے جن میں ذوق شریک ہوتے ہوں اور جو بڑے معرکے کے مشاعرے کے جا سکتے ہوں۔

(2)

میر صفیر بلگرامی شاگرد غالب (1249ھ 1307ھ) جلوۂ خضر میں اپنی ایک ملاقات کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:۔

> "مجھ سے اور حضرت غالب علیہ الرحمتہ سے ایک مرتبہ لکھنؤ اور دہلی کی زبان کے بارے میں گفتگو ہوئی ---- فرمایا اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو زبان کو زبان کر دکھایا تو لکھنؤ نے اور لکھنؤ میں ناسخ نے ---- جب ناسخ کا کلام دہلی میں پہنچا ---- اس وقت ہم تین شاعر بامذاق نام بر آور تھے' میں اور مومن خاں اور ذوق ---- ذوق نے ادھر کم رغبت کی کیونکہ ان کو اپنے مضمون ہی باندھنے میں دقت ہوتی تھی' زبان کی طرف کیا خیال کر سکتے تھے گر مومن خاں نے خیال کیا ---- ادھر میں نے بھی۔"

ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب نے احوال غالب میں صفیر کے اس پورے بیان میں کئی معقول استقام کی نشان دہی کی ہے اور بہت فاضلانہ رائے دی ہے' میں مرزا کے اس بیان سے واقعات کی روشنی میں بحث کرنا چاہتا ہوں۔ مرزا کا بیان ہے کہ جس وقت ناسخ کا کلام "دہلی پہنچا وہاں تین بامذاق نام بر آور وہ شاعر تھے' غالب' مومن' ذوق۔ ناسخ کا کلام' پہلی مرتبہ دلی کب پہنچا؟ اس کے زمانہ و سال کا تعین اب دشوار ہے' البتہ مولانا محمد حسین آزاد کا ارشاد ہے کہ:

> "لکھنؤ سے شیخ ناسخ کی غزل اس طرح سے آئی ---- استاد مرحوم کی اصلاح بند ہو چلی تھی گر آداب شاگردانہ کی آمد و رفت جاری تھی۔"

ذوق 1221ھ تک باقاعدہ شاہ نصیر کے شاگرد ہے (مجموعہ نغز 385) لازماً یہ واقعہ اس کے بعد ہو گا' بقول آزاد اس وقت ذوق کی عمر سترہ سال سے زائد تھی' غالب کی پیدائش 1212ھ کی ہے اور مومن خاں 1215ھ میں پیدا ہوئے' اس لحاظ سے اس وقت جب ناسخ کا کلام دہلی پہنچ رہا تھا۔ غالب اور مومن کی عمر علی الترتیب دس اور سات برس کی زیادہ سے زیادہ ہو سکتی تھی۔ ان عمروں میں ان کی شاعری کی ابتدا بھی قرین قیاس نہیں چہ جائیکہ ان کا شمار دلی کے تین بامذاق شاعروں میں کیا جاتا۔ مرزا اپنے ایک خط میں فرماتے ہیں۔

> "15 برس کی عمر سے 25 برس کی عمر تک بڑا دیوان جمع کیا آخر جب تمیز آئی تو اس

دیوان کو دور کیا اوراق یک قلم چاک کئے۔" (عود ہندی، سرگذشت غالب:25)

گویا خود بقول غالب ان کو "تمیز آنے" کا زمانہ 1237ھ کے بعد کا ہے اور اس سے پہلے ان کے کلام کی خود ان کی نگاہ میں یہ قیمت تھی کہ "اوراق یک قلم چاک کئے" اس وقت تک غالب خود اپنے بیان کے مطابق بیدل، اسیر اور شوکت کی طرز میں ریختہ لکھتے تھے، یعنی ناسخ کی اتباع کا خیال بھی پیدا نہ ہو سکا تھا ناسخ کا پہلا دیوان 1332ھ میں مکمل ہوا اگر ہم آزاد کے بیان پر خیال نہ بھی کریں تو بھی یہ یقینی امر ہے کہ دیوان مکمل ہو چکنے کے بعد دہلی ضرور پہنچا ہو گا اس وقت تک غالب نے ناسخ کی اتباع نہیں کی اور ان کا شمار تین نام بر آوردہ شعرا میں نہیں ہو سکا تھا جیساکہ بیان ہوا البتہ ذوق کے دیوان میں منہ (ابتدائی غزلیں ملتی ہیں جو ناسخ کی طرز خاص بلکہ ان ہی کی غزلوں اور زمینوں میں کہی گئی ہیں) پھر آزاد کے بیانات سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ ذوق ابتدا ہی سے ناسخ کی اتباع کر رہے تھے یا یہ کہ ان کی غزلوں پر غزل کہتے تھے، غالب کا یہ قول کہ ذوق نے ناسخ کے کلام کی طرف رغبت کم کی، صحیح نہیں بلکہ ابتدائی زمانہ پر خیال کریں تو جیساکہ بیان ہوا ذوق نے کلام ناسخ کی طرف توجہ کی، البتہ غالب کو اسیر، شوکت اور بیدل کی اتباع سے ہی فرصت نہ ہو سکی وہ ناسخ کا خیال کب کر سکتے تھے۔

میر صغیر کے بیان کے مطابق غالب نے "ناسخ کے کلام" کے پہنچنے کا ذکر کیا ہے نہ کہ "ناسخ کے دیوان" کے پہنچنے کا، اور کلام کا پہنچنا اس وقت بھی ممکن ہے جب دیوان مکمل نہ ہو سکا ہو، گویا 1232ھ سے قبل جیساکہ آزاد کے بیان سے ثابت ہے البتہ اگر "دیوان" کہتے تو بات کچھ اور ہوتی اور پھر یہ دیکھنا پڑتا کہ مرزا نے دیوان اول، دوم، سوم میں سے کس سے مراد لی ہے۔

غالب، مومن اور ذوق کس زمانہ میں دلی کے تین نام بر آوردہ شاعروں میں شمار ہوئے؟ اس کا تعین بھی دشوار ہے، البتہ بعض بیانات یہاں پر نقل کرتا ہوں جن سے مبحث پر روشنی پڑتی ہے۔

1845ء میں محل حیات بخش میں ایک عام مشاعرہ ہوا، اس میں مومن غالبا شریک نہ تھے، غالب اور ذوق موجود تھے، غالب کے سامنے شمع پانچویں یا چھٹے نمبر پر آئی، ان کے بعد شاگرد صہبائی نے غزل پڑھی، سب سے آخر میں بقول غالب سلطان الشعراء ذوق نے غزلیں پڑھیں۔ (کلیات نثر غالب، سرگذشت غالب وغیرہ)

1850ء میں مولانا حالی کے قول کے مطابق غالب دربار پہنچے اور تاریخ نویسی کی خدمت سپرد ہوئی اسی کے صلہ میں ان کو خطابات عطا ہوئے (یادگار غالب) غالب شعراء کے زمرہ میں کب داخل ہوئے اس کا علم نہیں، اغلب ہے کہ دربار میں پہنچنے کے بعد ہی ایسا ہوا ہو گا۔

1844ء میں مولانا صہبائی نے "انتخاب دواوین شعرائے مشہور زبان اردو کا" مرتب کیا اس میں بقول گارسان، ولی، درد، سوداء، میر، جرات، حسن، نصیر، ممنون، ناسخ، مو چلند، ذوق اور مومن کے کلام کے انتخابات ہیں (خطبات 1854ء:94) اس میں غالب کا نام نہیں آتا ورنہ ضرور اس کا ذکر کیا ہوتا۔

1850ء کے ایک خطبہ میں گارساں کا یہ جملہ بھی اہمت سے خالی نہیں کہ:۔

"میں حال کے زندہ ہر دلعزیز شعراء یعنی مومن، نصیر، ذوق، ناسخ اور آتش کے کلام کا ذکر کرتا

ہوں۔" (خطبات:6)

ان بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ مومن کا شمار اردو کے مشہور شعراء میں 1844ء سے پہلے ہو چکا تھا اور ذوق کو خطاب خاقانی ہند اس سے پہلے بلکہ بہت پہلے حاصل ہو چکا تھا' غالب کا ذکر بھی تذکروں میں عزت کے ساتھ کیا گیا ہے لیکن تذکروں میں متعدد شعراء کے حالات درج ہوتے ہیں اور عام ہے کہ جس شخص سے تذکرہ نویس کا تعلق بہتر ہوتا ہے' اس کا ذکر بھی اسی قدر خوبی سے کیا جاتا ہے' اس لیے ان سے کسی شخص خاص کی مقبولیت عام کا واقعی تعین دشوار ہوتا ہے' میر کے نزدیک غالب کی عام مقبولیت کے اظہار کے لیے حالی کا بیان زیادہ وقیع ہے' صاف ظاہر ہے کہ مرزا کا شمار دہلی کے تین نہیں "چند" نام برآوردہ شاعروں میں بھی 1850ء تک یا کم از کم 1844ء تک نہ ہوا تھا۔ ناسخ کا انتقال (1354ھ 1838ء) میں ہو گیا تھا اور اس وقت ان کے تینوں دیوان مکمل ہو چکے تھے۔ ایسی صورت میں اگر یہ کہا جاتا کہ جس وقت دہلی ناسخ کا کلام پہنچا وہاں کے سربرآوردہ شاعروں میں "مومن اور ذوق" بھی تھے تو صحیح ہوتا' غالب کا خود کو بھی ان میں شامل کرلینا درست نہیں تھا۔ کیونکہ غالب کا شمار تین نام سربرآوردہ شعرائے دہلی میں اس وقت تک بھی نہ ہو سکا تھا' جب ناسخ کے تینوں دیوان مکمل ہو چکے تھے۔ اگر غالب کے نام سربرآوردہ ہو چکنے کے بعد کے زمانہ کو خیال کرلیں کہ اس وقت شعرائے دہلی کو ناسخ کی طرز اور ان کے کلام کی طرف توجہ ہوئی تو مومن کو ان شعراء میں شمار کرنا مشکل ہو جائے گا کیونکہ مومن بیچارے کا انتقال 1851ء میں ہی ہو گیا تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ مومن نے زبان کی طرف کافی توجہ کی اور بقول مرزا یہی ناسخ کے کلام کی قابل ذکر خوبی تھی۔

غالب نے اپنے اس بیان میں ایک عجیب بات یہ کہی ہے کہ "ذوق" کے حالات بخوبی معلوم ہوں گے۔ معلوم نہیں وہ کون سے مواقع تھے جن سے مرزا نے یہ اندازہ کیا جو بیان ہوا' تمام معاصر اور مابعد کے تذکرہ نویسوں کو اس معاملہ میں اتفاق ہے کہ ذوق نہایت قادر الکلام شاعر تھے بلکہ اکثر کو اس بات کا دعویٰ بھی ہے کہ " قوت مشقی کہ اوراست دیگرے رادیدہ نہ شد آخو غالب' ذوق کو "سلطان الشعراء" کہہ کر خطاب کرتے ہیں۔ اب اگر سلطان الشعراء کو بھی اپنے مضمون باندھنے میں وقت پڑتی تھی تو عام شاعروں کی حالت کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے۔

مرزا کا یہ کہنا کہ "ذوق زبان کی طرف کب توجہ کر سکتے تھے" اور بھی عجیب ہے خصوصاً اس وقت جب کہ خود غالب ہی نے ایک موقع پر محمد نثار علی شہرت سے کہا تھا کہ :۔

"داغ (کی اردو) ایسی عمدہ ہے کہ کسی کی کیا ہو گی' ذوق نے اردو کو اپنی گود میں پالا تھا' داغ اس کو نہ فقط پال رہا ہے بلکہ اس کو تعلیم دے رہا ہے۔" (بحوالہ احوال غالب:15)

ذوق جس نے اردو کو اپنی گود میں پالا کیسے کہا جائے کہ اسی ذوق کے متعلق غالب نے یہ کہا ہو گا کہ وہ زبان کی طرف کب توجہ کر سکتے تھے' گو میر صفیر بلگرامی یہ واقعہ اسی غالب سے منسوب کرتے ہیں اور صفیر' غالب کے شاگرد ہیں چنانچہ استاد کے متعلق کچھ کہنے کا کافی حق رکھتے ہیں۔ لیکن ذوق کے متعلق مرزا کا یہ دعویٰ حقیقت

سے بہت دور ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی متعدد لطیفے کتابوں میں درج ہیں لیکن صحیح حالات اور صحیح نتائج اخذ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم پہلے ان لطیفوں کی صحت کا تعین کریں' ورنہ ظاہر ہے کہ لطیفوں کی بنیاد پر جو نتیجہ بھی اخذ کیا جائے گا اور جو رائے بھی قائم کی جائے گی وہ خود بھی "لطیفہ" ہی ہو گی۔

پروفیسر احمد علی

غالب

ایک مابعد الطبیعیاتی شاعر

غالب کی زندگی ایک ایسے دور میں گزری جو انقلاب، سیاسی ہیجان، مذہبی تنازعات، ادبی تغیرات، سائنسی ترقی، احساس زوال، احیاء اور اصلاح سے عبارت تھا۔ ایک ایسے ماحول میں جہاں معصوم وفاداریاں جبری سمجھوتوں سے برسرپیکار ہوں، جہاں واضح حقیقتوں اور سہانے خوابوں میں جنگ ہو رہی ہو وہاں تضادات زندگی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ عظمت رفتہ کے ماتم نے احساس زیاں پر پردہ ڈال دیا تھا تمام فلسفہ حیات تبدیل ہو رہا تھا۔ سماج کے روایتی تصورات اور اخلاقی نظام کو اہل برطانیہ کے نافذ کردہ نئے سیاسی نظام کا چیلنج درپیش تھا۔ مستقبل کچھ ایسے حالات کی نشاندہی کر رہا تھا جو ماضی سے بالکل مختلف تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت مسلم ہو چکی تھی اور غالب کی شاعرانہ زندگی کے تمام عرصے میں 1857ء کا المیہ فکر پسند ذہنوں کے سامنے چھایا ہوا تھا۔ (غالب 1797ء میں پیدا ہوئے اور ان کا سال وفات 1869ء ہے) شاہ عالم نے اٹھارویں صدی ہی میں اردو زبان اور مسلم ثقافت کی سرپرستی اور انتظام و انصرام "جان کمپنی" کو سونپ دیا تھا۔ اس کے مطابق انگریزوں نے 1771ء میں مدراس میں مدرسہ قائم کیا' 1798ء میں فورٹ ولیم کالج اور 1833ء میں پبلک انسٹرکشن کمپنی کا قیام عمل میں آیا۔ فارسی کو پس پشت ڈال دیا گیا اور میکالے کے مشہور منصوبے کی روشنی میں انگریزی کو آہستہ آہستہ نافذ کرنے کی پالیسی کا آغاز کر دیا گیا۔

مغل بادشاہ کو اس تمام المیے میں ایک تماشائی کی حیثیت حاصل رہی اور اس نے اپنی زندگی خاموش عبادت و ریاضت اور اپنی سرپرستی میں فن شاعری کی ترویج و ترقی کے لیے وقف کر دی۔ برطانوی استعماریت کے ان آہستہ لیکن بتدریج پھیلتے ہوئے اخراجات کے خلاف مسلمانوں نے نفرت کا اظہار کیا اور ہندوؤں نے برطانوی تعلیم کو برضا و رغبت قبول کر لیا۔ تاہم قرآن پاک کا پہلی بار اردو میں ترجمہ کیا گیا اور شاہ ولی اللہ' شاہ عبدالعزیز' شاہ عبدالقادر اور محمد اسمٰعیل شہید نے اسلامی مسائل پر رسالے لکھے جن کا مقصد دین کا احیاء اور تطہیر تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1857ء کے بعد ان کے مکتب فکر اور ان کے مقلدین کو وہابی قرار دے کر مطعون کیا گیا۔

سماجی حالت قابل مذمت تھی۔ لوگ زوال آمادہ مشاغل اور ارزاں تفریحات میں ملوث تھے اور طوائفوں

اور صوفیانہ مشرب کی ایک ہی سانس میں سرپرستی کرتے اور اپنی پسندیدہ طوائفوں کے کوٹھوں سے ہو کر اولیاء اللہ کے مزارات پر حاضری دیتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ وقت آنے پر 1880ء میں بادشاہ وقت کی ناتوانی اور مجموعی طور پر مسلم متوسط طبقے کی خزاں رسیدگی کے باوجود انہوں نے آزادی کے لیے جدوجہد کی صلاحیت کا مظاہرہ بھی کیا تھا۔ ان قومی سانحوں کے سلسلے میں عام رجحان یہ تھا کہ قومی زبوں حالی اور مصائب کو بالائے طاق رکھ کر ذاتی عیش کوشیوں کو زندگی کا شعار بنالیا جائے۔ البتہ دانشوروں مذہبی رہنماؤں اور غالب و مومن جیسے شاعروں میں اس رجحان کے خلاف شدید ردعمل پیدا ہوا۔

غالب اپنی قوم کی بے بسی اور کسمپرسی پر کڑھتے تھے' اور بڑے رنج اور حقیقت پسندی کے ساتھ انہوں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے۔

دل کو نیاز حسرت دیدار کر چکے دیکھا تو ہم میں طاقت دیدار بھی نہیں
بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں طاقت بقدر لذت آزار بھی نہیں
شوریدگی کے ہات سے سر ہے وبال دوش صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں
گنجائش عداوت اغیار اک طرف یاں دل میں ضعف سے ہوس یار بھی نہیں

بے بسی کے احساس کے ساتھ ساتھ از سرنو تعمیر کی خواہش بھی پائی جاتی ہے:

ہوا ہوں عشق کی غارتگری سے شرمندہ سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں

جب تک بادشاہ تخت پر متمکن رہا امید کی شعاع بھی باقی رہی لیکن 1857ء کے بعد تو فنون کی سرپرستی کا بھی خاتمہ ہوگیا:

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد کھلا کہ فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں

اس مائل بہ تغیر سماجی نظام میں تقدیر کی پیش خبری تھی اور تضادات اس میں پیوست ہو چکے تھے۔ غالب کا مخصوص مزاج تخیل تعقل پسندی' احساس' ظرافت اور زندگی کی محبت سے معمور تھا۔ اس صورت حال نے ان میں ایک خاص قسم کا تشکک پیدا کر دیا جس میں روحانی اضطراب اور حقیقت پسندانہ مشاہدے کی آمیزش تھی۔ ان کی زندگی کی کش مکش اور ذاتی مصائب سے عبارت تھی اس میں قومی ہزیمت و رسوائی کا شعور بھی شامل ہوگیا۔ تاہم ایک جذبہ افتخار جو درحقیقت عزت نفس کا پختہ احساس تھا' ان میں باقی رہا جس نے ان کے نفسیاتی ابتلا کے احساس کو اور بھی فزوں کر دیا۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

خارجی حقیقت کے ساتھ نبرد آزمائی میں انا سرخرو رہتی ہے' خواہ وہ مادی دائرے میں ہو خواہ روحانی میں:

واں وہ غرور عز و نازیاں یہ حجاب پاس وضع راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں
بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

ان کی بیباکی اور دانش ورانہ دیانت اور اس حقیقت نے کہ وہ احمقوں سے کوئی سروکار نہیں رکھ سکتے

تھے۔ ان کی شاعری کو اور خود انہیں نامقبول بنا دیا اور ان کی شاعری ان کی زندگی میں تشنہ فہم و استحسان ہی رہی۔
اس محرومی نے سماجی نظام کی شکست کے عام احساس کے ساتھ مل کر انہیں اور بھی بے بس بنا دیا:

کوئی امید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی

ان کا دل سکون حاصل کرنے، فراموش ہو جانے اور فراموش کر دینے کے جذبات سے معمور ہو گیا۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
گر بہ معنی نہ رسی جلوہ صورت چہ کم است خم زلف و شکن طرف کلاہے دریاب

محبت کے یہ زاویئے انسان اور شاعری کے لیے نئے نہیں مگر غالب جس اسلوب حیات کی نمائندگی کرتا ہے اس میں حسن کے ناز کی مانند، عشق کی غیوری بھی ایک مسلم حقیقت ہے۔ یہ تصور عام شاعرانہ تصورات سے الگ چیز ہے۔ کیونکہ عموماً "عشق کو نیاز مند بیان کیا جاتا ہے۔ مگر غالب خودداری تمکین اور وضع داری کا ایک اور ہی تصور پیش کرتا ہے —— (یاد رہے کہ تمکین غالب کے کلام کا ایک مستقل کلیدی لفظ ہے) غرض عشق کی غیوری مندرجہ ذیل شعر میں حسن کی بے نیازی کا استخفاف کرتی سنائی دیتی ہے۔

پوچھ مت رسوائی انداز استغنائے حسن دست مرہون حنا رخسار رہن غازہ ہے

حسن کو استغنا اور بے نیازی کا دعویٰ ہے مگر اس کے دعوے کو کون مانے گا جب ہم دیکھتے ہیں کہ حسن خود اور چیزوں کا حاجتمند اور ضرورت مند ہے۔ اسے اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے لیے دیکھئے کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔ ہاتھوں کو حنا کے رنگ کی اور رخسار کو غازے اور گل گونے کی ضرورت پڑتی ہے۔ تو پھر یہ مستغنی کہاں ہوا یہ بھی اپنے طور سے حاجت مند ہی ٹھہرا۔

عشق کی غیوری کی غالب نے کامیاب وکالت کی ہے اور جب عشق جیسے شدید جذبے میں تمکین و پاس وضع کا سبق دیا گیا ہو تو زندگی کے باقی اعمال، مراحل میں تمکین کی اہمیت کیوں نہ ہوگی؟

عشق کی غیوری مسلم، مگر زندگی میں حسن کی جو اہمیت ہے اس سے کسے انکار ہوگا۔ غالب کے کلام میں حسن کو نظم زندگی اور ربط حیات قرار دیا گیا ہے —— حسن صرف جسم انسانی تک محدود نہیں بلکہ کائنات میں چار سو پھیلا ہوا ہے' وہ جس کی کشش سے ۔

ذرہ ذرہ ساغر مے خانہ نیرنگ ہے

اور یہی نہیں خود عملی زندگی میں ایک خاص ترتیب' ایک خاص حسن پیدا کرنا۔ حسن ہی کی ایک صورت ہے۔ غالب کی نظر میں خیال حسن اور حسن عمل کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ "ع" ہے خیال حسن میں بھی حسن عمل کا سا خیال! حسن پرستی کا یہ مسلک (برے معنوں میں نہیں اچھے معنوں میں): سلیقہ و آہنگ کے اس احساس کو ابھارتا ہے جو کسی کلچر کی برتری کی خاص علامت ہے۔ غالب ایک ایسے انسان کے طلب گار ہیں جو حسن کا احساس رکھتا ہو اور خود غیور ہو —— اسی غیور کے اندر سے حسن کا (جلال و شکوہ پیدا ہوگا۔ ورنہ وہ

پیلاہٹ نمودار ہوگی جو مردہ حسن کا نشان ہے۔)

امید' خطر طلبی' جفاکوشی اور مقاومت کے تصور کے ساتھ عشق غیور اور حسن پر جلال کا نقش ہم دیکھ چکے ہیں۔ اب یہ بھی دیکھئے کہ غالب جس اسلوب حیات کا مقنن ہے' اس میں عقل و خرد اور دیدہ وری بھی' ایک اہم زاویہ ہے۔ ادیب غالب' مفکر غالب سے الگ نہیں' شعر گوئی اور شعر فہمی کوئی ایسی منزل نہیں جو خرد مندی اور دیدہ وری کی منزل سے بہت دور ہو——— ہماری شاعری میں عقل و عشق کے محاربے' کی وجہ سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ عقل کوئی ایسی پتھر شے ہے جس کا شاعری کے ضمن میں ذکر بھی نہیں آنا چاہیے' یہ تصور اپنی جگہ کچھ جواز بھی رکھتا ہو' تب بھی غالب کے یہاں دیدہ وری' شاعری ہی کی ایک آگے کی منزل ہے———!

غالب کے اس نقطہ نظر کے تحت' ایک تہذیب یافتہ انسان ادب شناس بھی ہوگا اور خرد مند بھی ہوگا نکتہ رسی اور دانش مندی اس کی نمایاں صفت ہوگی۔ وہ زندگی میں حسن کا بھی طلبگار ہوگا اور دانش کے حقائق سے بھی بہرہ مند ہوگا۔ اور یہ امر غالب کو اقبال کے قریب لے جاتا ہے۔

میں نے ابتداء میں بجنوری کا ذکر اس لیے کیا تھا کہ اس کے مقدمے نے پہلے غالب تک ہمیں پہنچایا۔ اس کے بعد اس اسلوب حیات کے دل کشا اور خرد افروز زاویے ہم پر کھولے جو ایک اچھی تہذیب کی لازمی صفت ہے۔ اگر ہم مغرب پسندی کے بحران میں' اس شاعر سے غافل رہتے تو ہم اپنی تہذیب کے اس عظیم نمائندے کی صحیح شناخت سے قاصر رہتے! بجنوری نے غالب شناسی کا دروازہ کھولا' ان کے بعد غالب شناسی ایک تہذیب بن گئی۔ اور اب ایک اسلوب حیات ہے۔ جو شخص غالب شناس نہیں اسے ذوقی لحاظ سے الجھا ہوا سمجھنا چاہیے۔ غالب نے جس قسم کے انسان کا تصور ہمیں دیا وہ ایک ایسے خوش ذوق'' خوش معاش' دانش ور کا تصور ہے جسے زندہ رہنا آتا ہے وہ مسرتوں اور مصیبتوں کو لازمہ حیات خیال کر کے زندگی کا استقبال کرتا ہے۔

○

''جیسی مرزا کی طبیعت میں دراکی اور ذہن میں جودت اور سرعت انتقال تھی اسی طرح ان کا حافظہ بھی نہایت ہی قوی تھا۔ ان کے گھر میں کتاب کا کہیں نشان نہ تھا ہمیشہ کرائے کی کتابیں منگوا لیتے تھے اور ان کو دیکھ کر واپس بھیج دیتے تھے۔ مگر جو لطیف یا کام کی بات کتاب میں نظر آجاتی تھی' ان کے دل پر نقش ہو جاتی تھی۔ فارسی کلام میں وہ کوئی لفظ یا محاورہ یا ترکیب ایسی نہیں برتتے تھے جن کی سند اہل زبان کے کلام سے نہ دے سکتے ہوں۔''

———حالی

پروفیسر جعفر بلوچ

فیض اور غالب

ہر بڑے شاعر کا روایت سے دوہرا تعلق ہوتا ہے۔ وہ روایت سے اپنا رشتہ استوار بھی رکھتا ہے اور پھر روایت کا حصہ بن کر اسے محکم تر بھی بناتا ہے۔ یہی بات جناب فیض احمد فیض کے فکر و فن پر بھی صادق آتی ہے۔ ان کے لطیف' جیلے' دلنواز اور موثر اسلوب کی ترکیب میں اردو اور فارسی شاعری کی عظیم روایات کی کارفرمائی نا قابل تردید ہے اور پھر اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے فکر و فن سے حال اور استقبال نے روشنی پائی۔

اپنے ثقافتی ورثے سے محبت اور اس کے تحفظ کے سلسلے میں فیض صاحب کے محسوسات کیا تھے اس کا کچھ اندازہ ان کے ان الفاظ سے کیا جاسکتا ہے جو انہوں نے مختار زمن صاحب کو انٹرویو دیتے ہوئے کہے۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنی ثقافتی اور تاریخی ہستیوں سے متعلق اہم تاریخوں کا ایک کیلنڈر مرتب کرنا چاہیے یہ ایک وسیع میدان ہے جو محمد بن قاسم سے قائد اعظم تک' خسرو سے اقبال تک' جس میں ابو الفضل' فیضی' میر اور غالب بھی شامل ہیں اور تان سین سے روشن آرا بیگم تک پھیلا ہوا ہے۔ ہمیں اپنے بڑے بڑے فن کاروں' مصوروں' معماروں اور فلسفیوں کو یاد رکھنا چاہئے جنہوں نے ہمارے کلچر کو مالا مال کیا۔" (۱)

اپنی ثقافت اور تاریخ کے اہم عناصر میں شعبہ ادب میں سے فیض صاحب نے خسرو' ابو الفضل' فیضی' میر' غالب اور اقبال کا خصوصاً ذکر کیا ہے۔ اپنی اسی گفتگو میں فیض صاحب نے غالب کے بارے میں یہ بھی فرمایا:

ہم شاعروں میں غالب وہ پہلا شخص ہے جس نے شاعر کا مرتبہ بہ حیثیت ایک "غیر سرکاری ساجی قانون ساز" کے پہچان لیا۔ حالانکہ شاعر کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ شاعر محض ایک درباری' مصاحب یا عام تماشہ گر کی قسم کا ذرا بہتر نمونہ ہے...... دیوان غالب کا ایک نسخہ ہمیشہ میرے سرہانے رہتا ہے۔ میں اکثر بلکہ بعض اوقات میں روزانہ اس کا مطالعہ کرتا ہوں۔ یہ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ غالب کا متبنی ہوگیا۔ میں اپنی شاعری میں اسے شعوری اور غیر شعوری طور پر استعمال کرتا ہوں۔" (۲)

حضرت غالب سے فیض صاحب کا ذہنی ارتباط زمانہ طالب علمی سے ہی ہو گا "میزان" کے ان مضامین میں جو ۳۹-۱۹۳۸ء میں لکھے گئے' غالب پر فیض صاحب کی تنقیدی آراء ملتی ہیں۔ کہیں وہ اردو کی تنقیدی اصطلاحات کی وضاحت کے لیے غالب کے اشعار پیش کرتے ہیں۔ کہیں وہ غالب کو خیالات کی شاعری کا نمائندہ قرار دیتے ہیں اور عشق میں ان کے باغیانہ رویوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اسی "میزان" میں "غالب اور زندگی کا فلسفہ" کے زیر عنوان انہوں نے ایک خوبصورت تمثیل پیش کی ہے جس سے غالب کے فکر و فن پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ متاع "لوح و قلم" میں نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا' مدت ہوئی ہے یار کو مہمان کئے ہوئے' اور غالب (انٹرویو)

غالب کی تفہیم کے سلسلے میں خاصے اہم ہیں۔
جناب فیض' غالب کو اجتماعیت پسند شاعر قرار دیتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ غالب کی غزل میں تسلسل خیال' اور وحدت فکر (Unity of Thought) کے عناصر پائے جاتے ہیں۔
فیض کی غالب دوستی ان کی کتابوں کے ناموں سے بھی مترشح ہے "نقش فریادی" "دست تہ سنگ" اور نسخہ ہائے وفا" غالب ہی سے مستعار لی ہوئی تراکیب ہیں۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

مجبوری و دعوی گرفتاری الفت
دست تہ سنگ آمدہ پیان وفا ہے

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعہ خیال ابھی فرد فرد تھا

غالب سے فیض کی ذہنی قربت اور فیض اندوزی کا اظہار فیض کے ان شعروں یا نظموں سے بھی ہوتا ہے۔ جن میں غالب کے اشعار یا ان کے اجزا کو تضمین کیا گیا ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

فیض: اپنی نظریں بکھیر دے ساقی
مے باندازہ خمار نہیں (نسخہ ہائے وفا' ص ۲۵)

غالب: دیتے ہیں جنت' حیات دہر کے بدلے
نشہ باندازۂ خمار نہیں ہے

فیض: "ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں"
ہر صنم اپنی بارہ گاہ میں ہے (نسخہ ہائے وفا' ص ۳۴۴)

غالب: ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

فیض: تری امید ترا انتظار جب سے ہے
نہ شب کو دن سے شکایت نہ دن کو شب سے ہے

(نسخہ ص ۳۶۹)

غالب:

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتی چشم و گوش ہے

اپنی نظم "ختم ہوئی بارش سنگ" میں فیض نے غالب کے اس شعر کی تضمین کی ہے

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد!

کسی شاعر کی زمین سخن میں کچھ کہنا بھی دراصل اس شاعر کی عظمت کے اعتراف کا ایک اسلوب ہے۔ فیض نے جہاں میر، درد، سودا، مصحفی، داغ اور حسرت موہانی کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں۔ وہاں انہوں بعض غزلیں غالب کی زمینوں میں بھی کہی ہیں مثال کے طور پر:

فیض: دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے (نسخہ ہائے وفا ص ۶۳)

غالب

آغوش گل کشودہ برائے وداع ہے
اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

فیض: کسی گماں پہ توقع زیادہ رکھتے ہیں
پھر آج کوئے بتاں کا ارادہ رکھتے ہیں (نسخہ ہائے وفا ص ۱۷۵)

غالب: زمانہ سخت کم آزار ہے بجان اسد
وگر نہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں۔

علاوہ ازیں فیض نے جا بجا اپنے مضامین میں غالب سے استشہاد اور استنباط کیا ہے اور اپنے مکاتیب میں اشعار غالب سے توثیق و تزین کا کام لیا ہے۔

فیض اپنے طرز بیان اور اسلوب اظہار میں بھی غالب سے کافی متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً غالب کے اسلوب میں اشکال پسندی اور سہل بیانی دونوں انداز ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ یہی بات فیض کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ مجموعی طور پر فیض کا اسلوب سادہ اور بات چیت کے لہجوں سے ہم آہنگ ہے۔ تاہم ان کے یہاں فارسی آمیز پیرایہ بھی جابجا نظر آتا ہے۔ اور یہ اپنی خوش نمائی اور شیریں ادائی کی وجہ سے غالب کی یاد دلاتا ہے۔ فیض کے مختلف ادوار شاعری سے اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

حسن مرہون جوش بادۂ ناز
عشق منت کش فسون نیاز

(نقش فریادی)

ہم پہ وارفتگی شوق کی تہمت نہ دھرو
ہم کہ رماز رموز غم پنہانی ہیں۔
اپنی گردن پہ بھی ہے رشتہ فگن خاطر دوست
ہم بھی شوق رہ دلدار کے زندانی ہیں (سروادی سینا)

لہو دینے لگا ہر اک دہن میں بخیہ لب ہا
چلا پھر سوئے گردوں کارواں نالہ شب ہا (مرے دل مرے مسافر)

یہ کس دیار عدم میں مقیم ہیں ہم تم
جہاں پہ مژدہ دیدار حسن یار تو کیا
نوید آمد روز جزا نہیں آتی
یہ کس خمار کدے میں ندیم ہیں ہم تم
جہاں پہ شورش رندان میگسار تو کیا
شکست شیشہ دل کی صدا نہیں آتی (غبار ایام)

فیض کا شعر اہمال سے دور اور وجدان رس ہوتا ہے۔ وہ ادب وفن کے اس نکتے کو خوب سمجھتے ہیں کہ :
"ادب موضوع اظہار اور طریق اظہار دونوں سے عبارت ہے۔ موضوع بغیر خوبی اظہار کے ناقص اور اظہار' خوبی موضوع کے بغیر بے معنی!(۳)

فیض اپنے ایک مضمون میں شعر میں اظہار اور ترجمانی کے رویوں میں امتیاز کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ :
"شعر کی کامیابی اظہار پر نہیں ترجمانی پر منحصر ہے۔ ہم کسی اظہار کو اس وقت تک کامیاب نہیں کہہ سکتے جب تک وہ دو پیروں کے لیے ترجمانی کا حق ادا نہ کرے" (۴)

اس مضمون میں کلام غالب سے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں :
"اچھے شعر یا اچھی نظم کی کامیابی یہی ہے کہ اس کا مضمون پڑھنے والوں تک سہولت اور برجستگی سے پہنچے تاکہ وہ اسے سمجھ سکیں۔ اس سے متاثر ہو سکیں اور اپنے تاثر کو داد کی صورت میں شاعر تک پہنچائیں۔" (۵)

فیض علی انسانی قدروں کے شاعر ہیں اور انہوں نے ان بلند مضامین کو بیشتر مواقع پر اظہار یا ان کی اپنی اصطلاح میں ترجمانی کے دلنشین' اسالیب کے ذریعے ادا کیا ہے لیکن حسن اظہار اور ترجمانی کی لطافتوں کے حوالے سے دیکھیں' تو فیض صاحب کا سارا کلام یکساں معتبر نہیں ٹھہرتا۔ غالب کی سی بلندی فکر و خیال بھی ان کے یہاں

نہیں۔ اور ان کے پیرایہ ہائے بیان بھی کہیں غلط آہنگ ہو گئے ہیں۔ جس سے ذوق سلیم کو گرانی محسوس ہوتی ہے۔ شتر گربہ اور ادغام عین کی مثالیں ان کے یہاں بہت ملتی ہیں۔ بعض اوقات وہ محاوروں کو بھی غتر بود کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات ان کی تراکیب کی ناموزونی بار خاطر ہو جاتی ہے۔ کہیں حشو و زوائد ان کے کلام میں راہ پاتے ہیں۔ کہیں وہ الفاظ کی بندش میں صحت سے کام نہیں لیتے اور انہیں غلط طور پر باندھ جاتے ہیں۔ کلام فیض کے اس پہلو پر آغا شیدا کاشمیری اور جناب رشید حسن خان نہ تفصیل لکھ چکے ہیں۔ میں صرف چند مثالیں پیش کروں گا۔

ع جانانہ وار آئی شام فراق یاراں

جانانہ خود ADVERB تھا' وار یہاں حشو ہے۔

ضیائے بزم جہاں بار بار ماند ہوئی
حدیث شعلہ رخاں بار بار کرتے رہے

یہ حدیث کرنا کیا ہے۔ پھر اس شعر میں فاعل کون ہے؟

ہر آئے دن یہ خداوند گان مہر و جمال
لہو میں غرق مرے غمکدے میں آتے ہیں۔ (ن۔ ۲۷۳)

پہلے مصرع میں ہر حشو ہے۔ پھر خداوند کی جمع خداونداں آتی ہے نہ خداوندگاں۔

سانس تھامے ہیں نگاہیں کہ نہ جانے کس دم
تم پلٹ آؤ' گزر جاؤ' یا مڑ کر دیکھو (ن۔ ۲۸۶)

دوسرے مصرع میں "یا" سے مصرع بے وزن ہو جاتا ہے (کہ) چاہئے تھا۔

دامن دامن رت پھولوں کی آنچل آنچل اشکوں کی
قریہ قریہ جشن بپا ہے ماتم شہر بہ شہر (ن۔ ۳۰۳)

دوسرے مصرع میں اک "فصل" کی کسرہ رہ گئی ہے۔

جب بھی ابروئے در یار نے ارشاد کیا
جس بیاباں میں بھی ہم ہوں گے چلے آئیں گے (ن۔ ۳۳۸۹)

پہلے مصرع میں در کالفظ زائد محض ہے۔

ہر دور میں ملعون شقاوت ہے شمر کی
ہر عہد میں مسعود ہے قربانی شبیر

شمر کی میم متحرک باندھی گئی حالانکہ یہ ساکن ہے

کچھ بھی ہو آئینہ دل کو مصفا رکھیے
جو بھی گزرے' مثل خسرو دوراں ملے

یہاں مثل کی ث کو متحرک رکھا گیا ہے حالانکہ اسے ساکن ہونا چاہئے تھا۔

رحمت حق سے جو اس سمت کبھی راہ ملے
سوئے جنت بھی براہ رہ جاناں چلئے

"بارہ رہ جاناں کی ترکیب مضحکہ خیز ہے۔ اس میں "رہ" سراسر زائد ہے۔

اظہار و بیان میں لکنت کی ایسی مثالیں کلام فیض کے چہرہ روشن کے بدنما داغ ہیں۔ یہاں فیض' غالب سے'فیض یاب ہوتا نظر آتا۔

فیض صاحب نے غالب کے بعض اشعار کی تشریح و توضیح بھی فرمائی ہے اور بعض اشعار کے ضمن میں معانی کی نئی سطحیں سامنے لائے ہیں۔ تاہم یہاں بھی ان کے بعض ارشادات سے اتفاق کرنے کی گنجائش نہیں نکلتی۔ مثلاً" دیوان غالب کا پہلا شعر ہے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

اس شعر کا مفہوم بیشتر شارحین نے یہی قرار دیا ہے کہ انسان اپنے خالق کا فریادی ہے۔ لیکن فیض صاحب فرماتے ہیں کہ:

"میری رائے میں اس شعر کے معنی کسی طرح نہیں بنتے کیونکہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ معنی صحیح ہیں تو دوسرے مصرع میں کاغذی پیرہن کا جو استعارہ ہے' وہ پھر مہمل ہو جاتا ہے۔ کوئی انسان کاغذی پیرہن پہن کر تو نہیں پھرتا۔ کاغذی پیرہن سے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ شعر صرف اس تحریر یا تخلیق کے بارے میں ہے جو کہ انسان کرتا ہے۔ نہ کہ اس تخلیق کے بارے میں جو کہ اللہ تعالیٰ نے کی ہے۔

غالب کہتے یہ ہیں کہ لکھنے والے یا مصور نے جس شوخی' جوش یا جیتے جذبے سے اپنے الفاظ کے ذریعہ کاغذ پر کچھ منتقل کیا ہے یا اسے الفاظ میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے' وہ اس قدر تند و تیز ہے کہ کاغذ یا الفاظ اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس لیے یہ الفاظ یا کاغذ کا ورق فریاد کر رہا ہے کہ مجھ پر جو کچھ لکھا جا رہا ہے یا مجھ پر جو تصویر بنائی جا رہی ہے' یا جو نقش آرائی کی جا رہی ہے' وہ میری جان ناتواں کے لیے بہت زیادہ ہے..... اس کی وضاحت غالب کے ایک دوسرے شعر سے ہوتی ہے۔ غالب فارسی میں کہتے ہیں۔

غالب نہ بود شیوۂ من قافیہ بندی
ظلمیست کہ برکلک و ورق می کنم امشب

...... غالب نظیری کے بہت معتقد تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہی مضمون نظیری نے بھی بالکل اسی طریقے سے بیان کیا ہے (۵)

فیض صاحب کو غالب کے اس شعر کی تفہیم میں دو مغالطے ہوئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ کاغذی پیرہن کا استعارہ مہمل ہو جاتا ہے------ کیونکہ کوئی انسان کاغذی پیرہن پہن کر تو نہیں پھرتا۔ کاغذی پیرہن پہن کر حاکم

کے پاس جانے کی روایت خود غالب نے اپنے ایک مکتوب بنام مولوی محمد عبدالرزاق شاکر میں بیان فرمائی ہے۔ اور انسان کے کاغذی لباس سے مراد انسان کی بوسیدہ حالی' یا پھٹے حالوں ہونا' لیا جا سکتا ہے۔ پھر "غالب فرماتے ہیں۔ کہ نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا اور فیض صاحب ابھی تک اس مخمصے میں نہیں کہ فریادی کون ہے کاغذ یا نقش۔ وہ لکھتے ہیں۔ کہ "یہ الفاظ یا کاغذ کا ورق فریاد کر رہا ہے۔" نقش سے کاغذ کا ورق مراد لینا' غالب کے شعر پر ظلم کرنا ہے۔ غالب کے تقریباً" تمام شارحین نے اس شعر کا کم و بیش ایک ہی مفہوم بیان کیا ہے اور وہ مفہوم خود حضرت غالب کا بیان کردہ ہے جسے پڑھ کر فیض صاحب کے زاویہ تفسیر کی نفی ہو جاتی ہے۔ آئیں ہم بھی غالب ہی سے اس شعر کا مطلب پوچھیں۔ غالب مولوی محمد عبدالرزاق صاحب شاکر کے نام اپنے ایک خط میں اس شعر کے یہ معنی بیان فرماتے ہیں۔:

"نقش فریادی........ الخ" ایران میں رسم ہے کہ داد خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے جیسے مشعل دن کو جلانا' یا خون آلودہ کپڑا بانس پر لٹکا کر لے جانا۔ پس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس کی شوخی تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورت تصویر ہے اس کا پیرہن کاغذی ہے۔ یعنی ہستی اگرچہ مثل تصاویر اعتبار محض ہو' موجب رنج و ملال و آزار ہے۔" (۷)

کیا فرماتے ہیں ارباب نظر حضرت غالب کی بات مانی جائے یا جناب فیض کی۔ پھر اس شعر کی توضیح کرتے ہوئے فیض صاحب نے غالب کا جو فارسی کا شعر درج فرمایا ہے۔ اس کے معنی بھی وہ صحیح طور پر نہیں سمجھے۔ شعر یہ ہے

غالب نہ بود شیوۂ من قافیہ بندی
ظلمیست کہ بر کلک و ورق ی کنم امشت!

فیض صاحب اس شعر کی شرح میں فرماتے ہیں۔

یعنی میں وہ شاعر نہیں ہوں جو قافیہ بندی کرتا ہے بلکہ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ تو کاغذ اور قلم پر ظلم ہے۔ میرے جو الفاظ ہیں اور میرے جذبات کی جو حدت ہے وہ اس قدر زیادہ ہے کہ جب میں اپنے دل کی آگ کو قلم تک پہنچاتا اور کاغذ پر منتقل کرتا ہوں تو قلم اور کاغذ دونوں چلا اٹھتے ہیں کہ یہ ہم پر کیا ظلم ہو رہا ہے۔ اس ظلم کے خلاف قلم اور کاغذ فریاد کرتے ہیں۔ (۸)

آیئے دیکھیں فیض صاحب کے استاد مکرم صوفی غلام مصطفیٰ صاحب تبسم نے اس شعر کے کیا معنی بیان فرمائے ہیں۔ صوفی صاحب لکھتے ہیں۔:

"مرزا غالب نے اس غزل میں سنگلاخ قافیے استعمال کیے ہیں۔ فارسی اور اردو کے بعض شعراء اس طرز کی سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنے کو کمال فن سمجھتے تھے۔ جس سے شعر کا فکری پہلو دب جاتا ہے اور شاعری محض لفاظی بن جاتی ہے۔ اسی بنا پر مرزا غالب کہتے ہیں۔ اے غالب! قافیہ بندی میرا شیوہ نہیں۔ آج رات (میں ایسی غزل کہہ کر) اپنے قلم اور کاغذ پر ظلم کر رہا ہوں۔ مرزا غالب نے اس غزل کی ساخت و پرداخت کو قافیہ بندی سے

تعبیر کیا ہے اور کہا ہے کہ اس قافیہ بندی سے وہ اپنے قلم اور کاغذ پر' دوسرے لفظوں میں خود اپنی شاعری پر ستم ڈھا رہا ہے۔ اس کا یہ احساس محض اظہار انکسار ہے' کیونکہ باوجود سخت "قافیہ ردیف" کے اس کی یہ غزل بہت بلند ہے اور اس کی ان بہترین غزلوں میں سے ہے جن میں فکر و فن کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ (۹)

فیض صاحب نے نظیری کا جو شعر غالب کی تشریح کی غرض سے نقل فرمایا ہے' اسے بھی غالب کے شعر کے مفہوم سے کچھ تعلق نہیں۔ اور "متاع لوح و قلم" میں وہ شعر صحیح نقل بھی نہیں ہوا۔ شعر کی صحیح صورت یہ ہے۔

صدبار ز آغاز بہ انجام رساندیم
افسانہ وردے کہ بہ پایاں نہ رسیدہ

غالب سے فیض کی فیضان اندوزی ناتمام سہی' لیکن یہ ہمیں غالب کے مزید غائر مطالعہ اور اس سے مزید استفادہ کی دعوت ضرور دیتی ہے۔

حواشی

۱ متاع لوح و قلم مکتبہ دانیاں کراچی ۱۹۸۷ ـ ص ۱۳۹
۲ متاع لوح و قلم ۱۹۴۷ء ص ۱۳۸
۳ میزان ستمبر ۱۹۶۵ء ص ۸۴
۴ متاع لوح و قلم ۱۹۸۷ء ص ۹۹
۵ متاع لوح و قلم ۱۹۸۰ء ص ۱۰۰
۶ متاع لوح و قلم ص ٦۷ تا ٦۹
۷ غالب کے خطوط مرتبہ خلیق انجم۔ جلد دوم۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی ۱۹۸۵ء ص ۸۳۷
۸ متاع لوح و قلم ص ٦۷
۹ شرح غزلیات غالب (فارسی) پیکجز لمیٹڈ لاہور ـ س ن ـ ص ٦۱۸

سعید احمد اکبر آبادی

غالب اور حافظ کا ایک تقابلی مطالعہ

غالب ان نادرۂ روزگار شعراء میں سے جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنی نسبت جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ

عمر ہا چرخ بگردو کہ جگر سوختہ   چوں من از دودۂ آتش نفساں برخیزد

تو غلط نہیں کیا۔ بڑے شاعر ہمیشہ دو قسم کے ہوتے ہیں' ایک وہ جو فن پر غالب ہوتے ہیں اور دوسری قسم ان شعراء کی ہوتی ہے جن پر فن غالب ہوتا ہے۔ یہ وہ حضرات ہوتے ہیں جو باکمال' صاحب فن اور بلند پایہ سخنور ہونے کے باوجود ایجاد و اختراع کی صلاحیت کم رکھتے ہیں اور متقدمین نے فن کے لئے جو اصول اور آداب و رسوم مقرر کر دیئے ہیں' ان پر کاربند رہتے ہیں اور ان سے سر مو انحراف نہیں کرتے۔ لیکن غالب کا تعلق پہلی قسم کے شعرا سے ہے' جو ایجاد و اختراع کا مادہ رکھتے ہیں' نئی نئی ترکیبیں اور بندشیں ایجاد کرتے ہیں اور اپنے ذوق کو معیار بنا کر درست اور نادرست کا فیصلہ کرتے ہیں۔ غالب اپنی اس خصوصیت سے بھی ناواقف نہیں تھے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

مانبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب   شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

غالب نے اپنی طبیعت کو "سروش غیبی" کہا ہے اور اسی مناسبت سے کہتے ہیں۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں   غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

غالب نے فارسی کے اساتذہ قدیم کا مطالعہ بڑی وسعت نظر اور دقت نگاہ سے کیا تھا اور ابتداء میں عرفی۔ نظیری اور ظہوری سے غیر معمولی طور پر متاثر بھی ہوئے تھے' لیکن جیسا کہ انہوں نے اپنی کلیات نظم فارسی کی تقریظ میں کہا ہے' ان کی خودبین و خود آرا طبیعت تقلید کی ان زنجیروں کو زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کر سکی اور انہوں نے ان سے آزاد ہو کر اپنا ایک مستقل اسلوب اور رنگ اختیار کر لیا۔ غالب کا یہ فن کمال اور اسلوب و رنگ جس قوت و شدت کے ساتھ ان کے فارسی کلام میں نمایاں اور روشن ہے' اردو میں نہیں ہے۔ چنانچہ خود کہتے ہیں۔

فارسی بیں تابہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ   بگزر از مجموعہ اردو کہ بے رنگ من است

لیکن با ایں ہمہ زمانے نے جو ستم ظریفی غالب کے ساتھ کی ہے' غالباً شعر و ادب کی تاریخ میں کسی کے ساتھ نہیں کی اور اس بنا پر وہ جتنے بڑے شاعر اور فن کار ہیں' اتنے ہی بڑے مظلوم اور بدنصیب بھی ہیں۔ آج بحیثیت شاعر ان کی شہرت و عظمت کا دارومدار جو کچھ بھی ہے اردو زبان کی وہ چند غزلیں ہیں جو مختصر سے دیوان میں

محفوظ ہیں اور جن کو خود شاعر نے "بیرنگ من" کہا تھا۔ ان کے فارسی کلام کے ساتھ جو اعتناء کیا گیا ہے' وہ بس اتنا ہی ہے جتنا کہ اس زبان کے کسی معمولی شاعر کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ آج تک نہ فارسی کلام کا کوئی اعلیٰ ایڈیشن تحقیق و ترتیب کے موجودہ اصول و ضوابط کے مطابق شائع ہوا ہے' نہ اس کی کسی نے شرح لکھی ہے اور نہ اس پر کسی نے سیر حاصل نقد و تبصرہ لکھ کر غالب کی انفرادیت کو نمایاں کیا ہے۔ چند ایک مقالات ضرور لکھے گئے ہیں' لیکن اردو کلام پر جو کچھ لکھا گیا ہے' اس کے مقابلہ میں ان مقالات کی حیثیت دریا میں چند قطروں سے زیادہ نہیں ہے۔ مولانا شبلی کے لئے موقع تھا کہ جہاں انہوں نے ہندوستان کے فارسی گو شعرا میں سے امیر خسرو فیضی اور عرفی کا ذکر کیا تھا' غالب کا بھی کرتے اور اگر یہ نہیں تو چوتھی اور پانچویں جلد میں انہوں نے فارسی شاعری اور اس کے ارتقا پر عام تبصرہ کیا ہے' کم از کم اس ذیل میں غالب کی شاعرانہ اور فنی خصوصیات کا تذکرہ فرماتے۔ لیکن انہوں نے یہ بھی نہیں کیا۔ اگرچہ کہیں کہیں غالب کے ایک دو شعر نقل کر گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا غالب کے فارسی کلام کا مطالعہ اس طرح نہیں کیا جس طرح انہوں نے شعرا لعجم کی تالیف کے سلسلے میں دوسرے شعراء کے دواوین کا کیا تھا۔ اور اگر کیا بھی تھا تو مولانا نے کلام غالب میں بحیثیت مجموعی کوئی خاص کشش' کوئی غیر معمولی بات محسوس نہیں کی۔ البتہ مولانا حالی نے "یادگار غالب" لکھ کر استاد کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ غالب کی فارسی شاعری کے متعلق مولانا نے جس بسط و تفصیل سے گفتگو کی ہے اب تک کسی نے نہیں کی۔ لیکن جیسا کہ مولانا نے خود لکھا ہے۔ فارسی زبان و ادب سے عام بیگانگی اور فارسی شاعری کے فقدان ذوق کے باعث غالب کا فارسی کلام جس توجہ اور سیر حاصل نقد و تبصرہ کا مستحق تھا' مولانا حالی اس کا حق ادا نہ کر سکے۔

بہر حال غالب کی فارسی شاعری کی طرف سے ایک عام بے توجہی (اور وہ بھی فارسی زبان میں) کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ آج ایران میں غالب ایک اجنبی اور نا معلوم شاعر کی حیثیت میں ہیں۔ وہاں شعرا کے تذکروں میں اور ادبیات فارسی کی تاریخوں میں کہیں غالب کا ذکر نہیں ملے گا۔ اس میں اہل ایران کے لسانی تعصب کا بھی بڑا دخل ہے' لیکن ہمارا قصور بھی کچھ کم نہیں ہے۔ ہم نے خود غالب کو ایران میں متعارف کرانے اور اہل ایران سے غالب کی عظمت کا اعتراف کرانے کے لئے وہ کچھ بھی نہیں کیا جو ہمیں کرنا چاہئے تھا۔ اس سلسلے میں ضرورت اس بات کی تھی کہ فارسی شاعری کی ہر صنف میں غالب کا موازنہ اس صنف کے سب سے بڑے ایرانی شاعر سے کیا جاتا اور اس میں غالب کی جو خصوصیات و ممیزات ہیں' انہیں دلائل و براہین کے ساتھ وضاحت سے بیان کیا جاتا۔ مولانا حالی نے غالب کا موازنہ عرفی' نظیری اور ظہوری سے کیا ہے' لیکن یہ کافی نہیں ہے۔ حافظ شیراز کی غزل فارسی تغزل کی معراج ہے۔ اہل ایران آج تک اس پر متفق ہیں کہ فارسی زبان کا اتنا بڑا غزل گو شاعر نہ پیدا ہوا ہے اور نہ آئندہ ہو گا۔ اس بنا پر جہاں تک غالب کے فارسی تغزل کا تعلق ہے' ہمارے نزدیک ان کا موازنہ حافظ سے ہونا چاہئے تھا' نہ کہ عرفی' نظیری اور ظہوری سے۔ سطور ذیل میں اسی کی ایک حقیر کوشش کی گئی ہے:

حافظ کی خصوصیات کلام جن کو مولانا شبلی نے شعرا لعجم میں بڑی تفصیل اور وضاحت سے بیان کیا ہے'

جوش بیان- تنوع مضامین- روانی- برجستگی اور صفائی- بدیع الاسلوبی یعنی جدت و خوبئ ادا ہیں- اب کلام غالب کا مطالعہ سمجھ کر کیا جائے تو صاف ظاہر ہو گا کہ جہاں تک جوش بیان- تنوع مضامین اور جدت ادا کا تعلق ہے' غالب کسی طرح حافظ سے کم نہیں ہیں- البتہ- روانی- برجستگی اور صفائی' ان تینوں چیزوں کی بہ ظاہر کمی نظر آتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب نے شروع میں طرز و روش بیدل کی پیروی میں وقت پسندی- نغز گوئی اور مشکل نویسی کی راہ اختیار کی تھی اور اگرچہ بعد میں انہوں نے بیدل کی پیروی ترک کر دی تھی' لیکن مولانا حالی کے بقول بیدلیت پھر بھی نہیں گئی اور غالبا اسی وجہ سے مولانا حالی نے لکھا ہے:

"ان (غالب) کے عاشقانہ اشعار میں باوجود کمال جزالت اور متانت کے وہ گرمی اور تاثیر جو شعر کی جان ہے' عام طور پر نہیں پائی جاتی-" (یادگار غالب- مطبوعہ الہ آباد ص 189)

لیکن حیرت کی بات ہے' مولانا ایک طرف یہ فرماتے ہیں اور دوسری جانب اگلے ہی صفحے پر غالب کی غزل کو عرفی اور طالب کی غزل پر سبقت ربودہ قرار دیتے ہیں- پھر یہی نہیں بلکہ کچھ آگے چل کر ہی صفحہ 196 پر اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ: آخر کار تغزل میں بے انتہاء گھلاوٹ اور صفائی پیدا ہو گئی تھی-"

حقیقت یہ ہے کہ غالب کو جو معاملہ اردو شاعری میں پیش آیا' فارسی میں بھی ان کو اس سے دوچار ہونا پڑا- یعنی اول اول متقدم اساتذہ سخن کی پیروی کی اور کلام دقیق اور غامض ہوتا تھا- الفاظ کی بندش اور ان کا دروبست پیچیدہ ہوتا تھا' لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ جب انفرادیت کا رنگ پیدا ہونے لگا اور خیالات میں زیادہ صفائی آگئی ___ اور عہد شباب کی اپج نے سن و سال میں اضافہ کے بقدر سنجیدگی اور متانت کی صورت اختیار کرلی تو طبعی طور پر کلام میں بڑی روانی- برجستگی اور حلاوت و شیرینی پیدا ہو گئی- یہ نشیب و فراز تنہا غالب کی خصوصیت نہیں ہے' بلکہ غالبا ہر ذکی الحس اور غیر معمولی طور پر ذہین و طباع شاعر اور ادیب کو ان مراحل سے گذرنا پڑتا ہے- چنانچہ خود حافظ شیراز کو بھی آغاز کار میں یہی معاملہ پیش آیا تھا- مولانا شبلی فرماتے ہیں:

"خواجہ (حافظ) صاحب نے غزل گوئی شروع کی تو خواجو کے کلام کو سامنے رکھ کر کہنا شروع کیا- چنانچہ خود فرماتے ہیں: دارد سخن حافظ طرز و روش خواجو-" (شعر العجم ج 2- ص 212)

اور ایک خواجو نہیں' بلکہ حافظ نے سعدی اور سلیمان کا بھی تتبع کیا اور ان کی غزلوں پر غزلیں لکھی ہیں- لیکن آخر مشق و تمرین اور پختگی فکر و خیال کے بعد خواجہ حافظ کے اپنے رنگ کا آفتاب جب شعر و شاعری کے مطلع پر طلوع ہوا تو اس آسمان کے چھوٹے بڑے ستارے سب ماند پڑ گئے- اگر غالب اور حافظ کے ہم معنی اور ہم مضمون اشعار کا یکجائی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اگرچہ حافظ کے یہاں جو سلاست' روانی اور شگفتگی ہے' وہ مجموعی طور پر غالب کے ہاں اس درجہ کی نہیں ہے لیکن غالب نے اسی مضمون کو جس خاص انداز اور تیور سے ادا کیا ہے' اس نے سلاست اور روانی کی' جو حافظ کے ہاں ہے' تلافی نہیں کی بلکہ خیال اور اسلوب میں ایک ایسی طرفگی اور ندرت پیدا کر دی ہے کہ ایک صاحب ذوق اسے پڑھتا ہے اور جھوم اٹھتا ہے- مثلاً حافظ اور غالب دونوں کو زمانے کی ناقدری اور گوہر سخن کے مرتبہ شناسوں کے فقدان کی شکایت ہے- چنانچہ حافظ فرماتے ہیں-

معرفت نیست دریں قوم خدایا مددے تابرم گوہر خودرا بخریدار دگر
لیکن غالب کہتے ہیں۔
بیاوریدگر اینجا بود سخن دانے غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد
مضمون بہت طویل ہو جائے گا' اس لئے ہم خود اپنی طرف سے کسی قسم کی تشریح و توضیح کے بغیر غالب اور حافظ دونوں کے متقابل اشعار نقل کرتے ہیں اور فیصلہ خود ارباب ذوق پر چھوڑ دیتے ہیں۔
حافظ
چہ جائے گفتہ خواجو و شعر سلمان ست کہ شعر حافظ شیراز بہ زشعر ظہیر
غالب
چونست کہ در عرصہ دہر اہل دلے نیست دربحر کف و موج و حیا بست و گہرہم
یا
در فن سخن دلم مزن از عرفی و طالب این آیہ خاص ست کہ برمن شدہ نازل
انسان کو مصائب و آلام سے گھبرانا نہ چاہئے۔
حافظ

گرچہ منزل بس خطر ناک ست و مقصد ناپدید
ہیچ راہے نیست کورانیست پایاں غم مخور

غالب

گربود مشکل مرنج اے دل کہ کار1ے
چوں رود از دست آساں می شود

رندی و سرمستی اور زاہد و واعظ کی ہجو و مذمت عام اور مشترک مضامین ہیں۔ خواجہ حافظ فرماتے ہیں۔

شراب لعل کش و روئے مہ جبیناں بیں
خلاف مذہب آناں جمال اینان بیں
بزیر دلق مرقع کمندہا دارند
دراز دستی ایں کوتہ آستیناں بیں

لیکن غالب کہتے ہیں۔

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار
ساقی و مغنی و شرابے و سرودے
زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند
حق را بسجودے و نبی را بدرودے

اہل باطن کو حقائق کی جو معرفت ہوتی ہے' ارباب ظاہر کو نہیں ہوتی۔
حافظ

حلاج برسردار ایں نکتہ خوش سراید
از شافعی مپرسد امثال ایں مسائل

غالب

آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ ست
بردار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت

آنحضرت ﷺ کی نعت میں:
حافظ

غلام نرگس مست تو تاجدار انند
خراب بادۂ لعل تو ہوشیار انند

غالب

نشاط معنویان از شرابخانہ تست
فسون بابلیاں فصلے از فسانہ تست

اسلام اور کفر کیا ہے:
حافظ

گر مسلمانی ازیں است کہ حافظ دارد
وائے گر درپس امروز بود* فردائے

غالب

کارے عجب افتاد بدیں شیفتہ مارا
مومن نبود غالب و کافر نتواں گفت

ہجوم آلام و مصائب:
حافظ

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل
کجا دانند حال ماسبکساران ساحلہا

غالب

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز
گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتہ ست

جام شراب میں روئے یار کا عکس:

حافظ

عکس روئے تو چو در آئینہ جام افتاد
عارف از پر تو مے در طمع خام افتاد

غالب

نازم فروغ بادہ ز عکس جمال دوست
گوئی فشردہ اند بجام آفتاب را

شب فراق کی درازی اور طلوع سحرامید کی آرزو:

حافظ

برآ اے صبح روشن دل خدارا
کہ بس تاریک می بینم شب ہجر

غالب

درازی شب ہجر از حد گذشت بیا
فدائے روئے تو عمر ہزار سالہ ما

عاشق غم والم اور ظلم وستم سے گھبراتا نہیں، بلکہ اس میں لطف اور مزہ ملتا ہے:

حافظ

ہر دم غمے فرست مرا بگو نیاز
کایں تحفہ از برائے خدامی فرستمت

غالب

بیک دوشیوہ ستم دل نمی شود خورسند
بمرگ من! کہ بسامان روزگار بیا1ے

عشق اگر حقیقی ہو تو قرب وبعد اور ہجرووصال سب میں ایک خاص لطف محسوس ہوتا ہے۔

حافظ

در راہ عشق مرحلہ قرب و بعد نیست
می بینمت عیان و دعامی فرستمت

غالب

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

اس تقابل سے ہمارا مقصد یہ جتانا ہرگز نہیں ہے کہ غالب کو تغزل میں حافظ پر فوقیت ہے۔ حافظ بلاشبہ اقلیم

تغزل کے شہنشاہ اور اس قلم رو کے واحد اور یکتا فرمانروا ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا انداز بیان۔ سوز و گداز اور حسن و عشق کی نفسیات شناسی اور ان نفسیات و واردات کو بیان کرنے کا سلیقہ ہے اور یہ وہ خصوصیت ہے جس میں فارسی زبان کا کوئی غزل گو شاعر ان کی ہمسری اور برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ غالب نے بھی عرفی۔ نظیری۔ طالب۔ ظہوری اور ظہیر وغیرہ کا نام لیا اور ان سے مقابلے کا دعویٰ کیا۔ لیکن حافظ کا کہیں نام نہیں لیا' بلکہ ہمارا مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ غالب نے اپنی قوت شعر گوئی اور مہارت فن کا پورا زور قصیدہ گوئی۔ مثنوی اور نظم نگاری پر صرف کر دیا اور اس میدان میں صناعی طبیعت کی جولانی اور براقی اور زبان و بیان پر قدرت کے وہ وہ جوہر دکھائے کہ باید و شاید۔ اس میدان سے ہٹ کر جب کبھی وہ غزل گوئی کی طرف متوجہ ہوئے تو اپنی طبع وقت پسند کی افتاد کے مطابق شروع میں قدیم اساتذہ نغزگو کا اتباع کرتے رہے۔ لیکن وقت جوں جوں گذرتا رہا اور فنی تجربات کا دامن وسیع ہوتا رہا۔ وہ اردو کی طرح فارسی میں بھی ہلکی پھلکے' رواں دواں اور شگفتہ اشعار کہنے کی طرف مائل ہوتے رہے۔ ظاہر ہے' اس راہ کا سب سے بڑا رہنما جس کا نقش قدم غالب کے لئے آئینہ بصیرت اور سرمایہ تقلید ہو سکتا تھا۔ وہ بلبل شیراز و لسان الغیب ہی ہو سکتا تھا۔ چنانچہ غالب کی فارسی غزلوں میں ایک معتدبہ مقدار ایسے اشعار کی ہے جن کا انداز اور ہیئت صاف طور پر اس حقیقت کی غمازی کر رہے ہیں کہ یہ پھول چمنستان حافظ سے مستعار لے کر اپنے گل دستے میں سجائے گئے ہیں مثلاً ایک طرف حافظ کے یہ اشعار پڑھئے۔

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند
وندراں ظلمت شب آبحیاتم دادند
بیخود از شعشعہ پر تو ذاتم کردند
بادہ از جام تجلی بصفاتم دادند

اور اب غالب کے یہ شعر ملاحظہ کیجئے۔

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و زخورشید نشانم دادند
رخ کشودند و لب ہرزہ سرایم بستند
دل ربودند و دو چشم نگرانم دادند

علاوہ ازیں اشعار ذیل پر ایک نظر ڈالئے۔

مالذت دیدار ز پیغام گرفتیم مشتاق تو دیدن ز شنیدن شناسد
بے پردہ شواز ناز و میندیش کہ مارا چوں آئینہ چشمیست کہ دیدن شناسد

خوش ست آنکہ با خویش جزغم ندارد ولے خو شترست آنکہ ایں ہم ندارد
گلت را نوا نرگست راتماشا تو داری بہارے کہ عالم ندارد

اے جمال تو بتاراج نظر ہا گستاخ وے خرام تو بپا مالی سرہا گستاخ
داغ شوق تو بہ آرائش دلہا سرگرم زخم تیغ تو بہ گلگشت جگر ہا گستاخ

سحر دمیدہ و گل درد میدنست مخسپ جہان جہان گل نظارہ چیدنست مخسپ
مشام رابہ شمیم گلے نوازش کن نسیم غالیہ ساد روزیدنست مخسپ
ستارۂ سحری مژدہ سنج دیداریست بہ بیں کہ چشم فلک درپریدنست مخسپ

ہم پھر کہتے ہیں، اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ فارسی تغزل میں حافظ کا کوئی جواب اب تک پیدا نہیں ہوا۔ لیکن مذکورہ بالا اشعار سے یہ اندازہ کر لینا مشکل نہیں ہے کہ غالب کی شاعری کے تدریجی ارتقا میں ایک منزل ایسی ضرور آ گئی تھی جب کہ وہ تغزل میں حافظ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرنے لگے تھے اور اس بنا پر کون کہہ سکتا ہے کہ اگر اس میدان میں تگ و دو کی ان کو مزید فرصت و مہلت ملتی اور حافظ کی طرح وہ بھی غزل ہی کے ہو کر رہتے اور اپنا سارا جوہر کمال قصیدہ اور مرثیہ و مثنوی وغیرہ پر نہ صرف کر چکے ہوتے تو آج فارسی تغزل میں ان کا مرتبہ بلبل شیراز سے زیادہ نہیں تو کم ہرگز نہ ہوتا۔

نحوست طالع:۔

"شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے، طریق صید افگنی سکھاتا ہے۔ جب وہ جوان ہو جاتے ہیں آپ شکار کر کے کھاتے ہیں۔ تم سخنور ہو گئے۔ حسن طبع خداداد رکھتے ہو۔ ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو۔ نام تاریخی کیوں نہ نکال لو، کہ مجھ پیر غمزدہ دل مردہ کو تکلیف دو۔ علاء الدین تیری جان کی قسم۔ میں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخی نظم کر دیا تھا۔ وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوست طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیرالدین حیدر اور امجد علی ایک ایک قصیدہ میں چل دیئے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے، پھر نہ سنبھل سکے، جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے۔ وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ نہ صاحب دہائی خدا کی۔ نہ تاریخ ولادت کہوں گا نہ نام تاریخی ڈھونڈوں گا۔"

(غالب)

حواشی

۱۔ اس مضمون کو اردو میں اس طرح بیان کیا ہے۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج   مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

2۔ اس مضمون کو اردو میں کہتے ہیں۔

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے   تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

انور سدید

شیخ محمد اکرام اور تنقید غالب

مرزا اسد اللہ خان غالب کو انیسویں صدی کے ایک ایسے نابغۂ ادب و فن کی حیثیت حاصل ہے جس نے فارسی اور اردو کے خیابان شعر و نثر کو بیک وقت سیراب کیا۔ غالب کو ماضی اور مستقبل کے نقطۂ انضمام پر ایک ایسا دیدہ ور تسلیم کیا گیا جس کی شاعری الہامی اور حکمت آفرین تھی۔ اس میں شک نہیں کہ غالب کو اپنے زمانے میں ذوق اور ناسخ پر فوقیت نہیں دی گئی تھی لیکن اس کے مقام مرتبے سے انکار کی مجال کسی کو نہ ہو سکی اور اسے مومن اور ذوق کے ساتھ دلی کا تیسرا بڑا شاعر تسلیم کیا گیا۔ اور جب ناسخ کے شاگردوں کا ہجوم اور محمد حسین آزاد کی تنقید کی چاندنی سمٹ گئی اور تنقید، مذاکروں کی "آہ" اور "واہ" کی گونج سے نکل کر علوم نو کی کھلی فضا میں سانس لینے لگی تو ذوق اور ناسخ کو تو تاریخ کے محفوظ صفحات میں جگہ دے دی گئی لیکن غالب کی تفہیم و تفسیر کا ایک نیا دور شروع ہو گیا جو حالی بجنوری ڈاکٹر لطیف سے ہو کر شیخ محمد اکرام تک پہنچا تو اس میں عمل اور ردعمل اثبات اور نفی کے اتنے متنوع زاویے پیدا ہو چکے تھے کہ اردو ادب میں غالبیت کو ایک اہم اور مستقل موضوع کی حیثیت مل گئی۔ ذوق اور ناسخ نے صرف ایک زندگی بسر کی تھی لیکن غالب کو اس ققنس کی حیثیت حاصل ہوئی جو اپنے خاکستر سے پیدا ہوا تھا اور زندگی کا نیا نغمہ الاپنے لگا تھا۔ چنانچہ غالب انیسویں صدی کا شاعر ہونے کے باوجود ہمیں ایک ایسا حکیم زمانہ نظر آتا ہے جس نے اپنے خارجی حالات اور باطنی کشاکش کا اظہار شاعری اور نثر میں کیا اور اپنے فکر کے محیط میں آنے والے زمانوں کو بھی سمیٹ لیا۔ ڈاکٹر گیان چند نے لکھا ہے کہ:

"غالب ان دیدہ وروں میں سے تھے جو اپنے زمانے سے آگے جھانک لیتے ہیں ان کی شاعری انیسویں صدی کے لئے نہیں تھی ان کے فکر کی اڑان ان کے ابنائے عصر سے بالاتر تھی"۔[1]

ڈاکٹر وزیر آغا نے خیال ظاہر کیا ہے کہ

"غالب دراصل بیسویں صدی کا انسان تھا جو غلطی سے انیسویں صدی میں پیدا ہو گیا"۔[2]

مجھے یہ دونوں آرا مبنی برحقیقت نظر آتی ہیں۔ کیوں کہ بیسویں صدی میں جس والہانہ سرگرمی سے غالب کو دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ سرگرمی انیسویں صدی میں عنقا نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ اور اب جبکہ بیسویں صدی نویں عشرے کے اختتام پر ہے اور مولوی عبدالحق کی یہ پیش گوئی کہ

"مرزا غالب پر بہت سی کتابیں اور مضامین لکھے گئے اور ابھی بہت کچھ لکھا جائے گا"

درست ثابت ہو رہی ہے اور عرفان غالب عام ہوتا جا رہا ہے تو شاید یہ کہنا درست ہو کہ تقویم کے

اعتبار سے غالب کسی ایک صدی کے شاعر نہیں تھے وہ ہر زمانے کے اور ہر صدی کے شاعر ہیں' ان کے اپنے زمانے نے انہیں پوری طرح دریافت نہیں کیا تھا تو اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے

غالب کی فریکوئنسی (Frequency) اپنے عہد کی دانش سے مختلف تھی اس لیے غالب کے چند قریبی دوست مثلاً شیفتہ' آزروہ' مولانا صدر الدین' فضل حق خیر آبادی اور حالی تو ان کے ذہن کو سمجھنے میں کامیاب ہو گئے لیکن عام لوگ جن کی تربیت مقامی محاورے کے مطابق ہوئی تھی نا شناس غالب ہی رہے۔ بیسویں صدی کے ہندوستان میں جب فرد افروزی کی تحریکیں فروغ حاصل کرنے لگیں تو اس دور کا نقاد اس فریکوئنسی کو دریافت کرنے میں کامیاب ہوا جس پر خود غالب نے فکری اور فنی سفر طے کیا تھا۔ ڈاکٹر سید عابد حسین کا ارشاد ہے کہ

"جتنی اچھی اور اونچے درجے کی کتابیں غالب کی زندگی اور شاعری پر لکھی گئیں اتنی کسی اور شاعری کو نصیب نہیں ہوئیں"۴

شیخ محمد اکرام کا شمار بھی چند ایسے ادبا میں ہوتا ہے جنہوں نے غالب کی حیات' شخصیت اور فن کے زاویے تحقیق و تنقید کی نئی روشنی میں دریافت کرنے کی کاوش کی اور مطالعہ غالب کو "حیات انسانی کی عمیق گہرائیوں کا مطالعہ" بنا دیا۔

○

مطالعہ غالب سے شیخ محمد اکرام کی شیفتگی محض لحاتی نہیں تھی۔ نظریوں آتا ہے کہ غالب ان کے لڑکپن میں ہی ان کے تہذیبی مزاج کا جزو بن گیا تھا۔ شیخ محمد اکرام ۱۹۰۸ء میں فیصل آباد کے نواحی قصبہ چک جھمرہ کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے' ان کی ابتدائی ادبی تربیت السنۂ شرقیہ کے گہوارے میں ہوئی' انہیں درسی مضامین میں فارسی زبان و ادب سے خاص رغبت تھی' گمان غالب ہے کہ فارسی زبان کی محبت نے ہی انہیں غالب سے متعارف کرایا ہو گا۔ چنانچہ طالب علمی کے زمانے میں ہی انہیں غالب سے ایسی محبت ہو گئی کہ جب وہ گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج لائیل پور میں زیر تعلیم تھے تو اپنا نام "طالب مصطفےٰ اکرام" لکھنا شروع کر دیا ۵

ان کے دوست ممتاز حسن نے لکھا ہے کہ

"محمد اکرام سے میری دوستی تھی۔ ہم پہلی مرتبہ غالباً ۱۹۱۶ یا ۱۹۱۷ میں ملے تھے وہ مجھ سے ایک آدھ سال پیچھے تھے اور گورنمنٹ کالج میں پڑھتے تھے۔ میں فورمن کرسچین کالج میں پڑھتا تھا۔ مگر ہماری ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ مجھے اس زمانے میں تصوف سے دلچسپی تھی اور یہ دلچسپی غوث علی قلندر کے "تذکرہ غوثیہ" سے اور بھی زیادہ ہو گئی ...... میں نے یہ تذکرہ اکرام کو دکھایا۔ انہیں پسند آیا اور یہ تذکرہ تصوف سے ان کی وابستگی کی بنیاد ثابت ہوا۔ ہمارا دوسرا موضوع غالب تھا جس سے میں ان دنوں بہت متاثر تھا۔ مجھے اردو دیوان تقریباً حفظ تھا مگر میں نے اسے تمام تر اپنے ہاتھ سے نقل بھی کیا تھا ..... اکرام نے میرا نقل کردہ دیوان غالب دیکھا تو مجھ سے لے لیا"۶

ممتاز حسن نے یہ بھی لکھا ہے کہ ملازمت کے سلسلے میں انہیں انتظامی معاملات اور امور خلائق سے واسطہ پڑا تو تصوف کی طرح غالب اور اقبال کے بارے میں بھی ان کے اور محمد اکرام کے راستے الگ الگ ہو گئے۔ گویا ممتاز حسن صاحب ملازمتی اور دنیاوی امور میں تو غالب سے ہٹ گئے اور اقبال کے ساتھ ہو لیے لیکن شیخ محمد اکرام نے مطالعہ غالب کو وظیفہ حیات بنائے رکھا' ان کے لڑکپن کا یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ انہوں نے ۱۹۱۵-۱۶ء میں غالب پر ایک مضمون انگریزی میں لکھا اور یہ گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج لائل پور کے رسالہ "بیکن" میں "Ghalib - the Man" کے عنوان سے شائع ہوا۔ شیخ محمد اکرام نے بعد میں غالب کو اپنے مطالعہ کے ایک اہم مضمون کی حیثیت دی اور وجہ یہ بیان کی کہ

"غالب کی اہمیت فقط شخصی اور انفرادی نہیں۔ ان کا مطالعہ فقط اس لیے دلچسپ نہیں کہ انہوں نے شگفتہ' دل فریب نثر' اور دل گداز' آب دار اشعار لکھے ہیں بلکہ وہ ہمارے' ادب میں قدیم اور جدید کے درمیان ایک سنگم کی حیثیت رکھتے ہیں (مذہب میں امام الہند شاہ ولی اللہ ﷺ اور قوم کی سیاسی تاریخ میں سرسید احمد خان کی طرح) دوسرے دو کی طرح اپنے دائرہ عمل میں انہوں نے قدیم اور جدید کا رشتہ جوڑا۔ اور قدیم کے سرچشمہ سے جدید کی آب پاشی کر کے اسے تروتازگی اور نشوونما کی طاقت عطا کی۔ مرزا غالب نئی نسل کے محبوب ہیں اور قدیم کی روایات کے بہترین ترجمان"۸

شیخ محمد اکرام نے غالب کو قدیم اور جدید کی خلیج کو پر کرنے والا ادیب تصور کیا اور "قدیم" ان کے نزدیک فقط وہ نہیں جو آج سے ڈیڑھ دو سو سال پہلے ولی احمد آبادی سے شروع ہوتا ہے بلکہ وہ اس کا سلسلہ بیدل' فیضی اور خسرو کے واسطے سے مسعود لاہوری کے ساتھ قائم کرتے ہیں واضح رہے کہ آب کوثر' موج کوثر' رود کوثر اور یادگار شبلی جیسی کتابوں کے مصنف کی حیثیت میں شیخ محمد اکرام نے بھی قدیم اور جدید کے درمیان ایک رابطہ پل مرتب کرنے ہی کی کاوش کی ہے۔ غالب کا مطالعہ ان کی محض افادی گل چینی نہیں بلکہ اس نابغۂ فن کی تہذیبی اور فنی شخصیت کی دریافت نو کا ایک نہایت سنجیدہ عمل ہے۔ یہ مطالعہ انہوں نے "دلی لگاؤ اور ذاتی دلچسپی کی کشش" سے شروع کیا تھا۔ اور مرور ایام کے ساتھ اس کا ارتقاء ہوتا ہے۔ اس سعئ مسلسل کا حاصل "غالب نامہ" ہے جس میں نئے مواد اور نئے مطالعے کی روشنی میں اضافے ہوتے رہے اور بعد میں اس کا تنقیدی حصہ جو غالب کے فلسفہ اور دید و دانش پر مشتمل ہے "حکیم فرزانہ" کے نام سے' سوانحی حصہ "حیات غالب" کے عنوان سے اور دیوان کی تاریخی ترتیب "ارمغان غالب" کے نام سے شائع ہوا۔ شیخ محمد اکرام نے ان تین گل دستوں کا مجموعی نام "غالب نامہ" ہی رکھا ہے۔۹

○

تنقید غالب کی تاریخ میں شیخ محمد اکرام کا ظہور ایک ایسے مقام پر ہوا جب مرزا غالب مدح فراواں اور قدح بے جا کی زد میں آ چکے تھے۔ میر مہدی مجروح نے اردوئے معلّی کے پہلے ایڈیشن (۱۸۶۹ء) کے دیباچہ میں' سید محمد صدیق حسین خان نے فارسی تذکرہ "شمع انجمن" (۱۸۷۶ء) میں اور امیر مینائی نے تذکرہ

انتخاب یادگار (۱۸۷۱ء) میں جو کچھ لکھا ہے اسے محبت کے جذبات سے چھلکتا ہوا آبگینہ یا تحسین سخن شناس کہنا زیادہ موزوں ہے۔ اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔

میر مہدی مجروح

"حضرت کا جو سخن ہے وہ در عدن ہے۔ جو بات ہے ازرہ معنی کرامات ہے۔ یہ نثر کی رنگینی، یہ نظم کی شیرینی، یہ غزل کی فصاحت، یہ قصیدہ کی متانت، یہ لفظوں کی محبوبی، یہ ترکیب کی خوش اسلوبی، یہ جدت معانی، یہ طاقت لسانی، یہ سلاست عبارت، یہ روانی عبارت، دیکھی نہ سنی، سطریں ہیں کہ موتی کی لڑیاں ہیں۔ باتیں ہیں کہ مصری کی ڈلیاں ہیں۔ نثر نثار پر نظم انجم قربان۔ حسن تقریر پر تحریر شعاع سے متاثر کرنے کو آفتاب زر بداماں۔ گفتار شکربار کو جادو کہوں۔ سحر کہوں۔ حیران ہوں کیا کہوں"۔

سید محمد صدیق حسین خان

"خطاب نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ بہادر، شاہجہان آباد کے نامی سخن وروں میں سے ہیں، قوت فکر خداداد کا ملک ہے۔ اشعار کی خوش وضع بنیاد قائم کرتا ہے۔ اور دلکش معنی اختراع کرتا ہے۔ پیشہ سخن پروری کا شیر ہے اور معنی گستری کی ولایت کا فرماں روا ...... نثر و نظم میں طرز خاص کا ملک ہے اور دل نشین تراکیب ایجاد کرتا ہے ...... اس بات میں کوئی شک نہیں کہ نثر و نظم کی اصناف سخن پر ان کی قدرت دوسروں سے بیشتر ہے"۔

○

امیر مینائی

"مرزا صاحب کی طباعی اور ذکاوت ان کے نتائج افکار سے پیدا ہے۔ بات سے بات پیدا کرنا تمام کلام سے ہویدا ہے"

○

مولانا محمد حسین آزاد کا تذکرہ "آب حیات" (۱۸۸۱ء) شائع ہوا تو مرزا غالب کو وفات پائے ۱۱ برس گزر چکے تھے لیکن آزاد اپنے استاد محمد ابراہیم ذوق کے سحر فن سے آزاد نہیں ہوئے تھے۔ ان کی تنقید غالب انشا پردازی اور نکتہ طرازی کا عمدہ نمونہ ہے لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ آزاد نے ذوق کا پلڑا بھاری رکھنے اور غالب کو اس کے جائز مقام سے محروم رکھنے کی شعوری کاوش کی ہے۔ اور غالب کی تحسین اس لگاوٹ سے کی ہے کہ ہجو ملیح میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ایک مثال حسب ذیل ہے۔

"اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنے نام کی تاثیر سے مضامین و معانی کے شیر تھے اور دو باتیں ان کے انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں۔ اول کی معنی آفرینی اور نازک خیالی ان کا شیوۂ خاص تھا۔ دوسرے چونکہ فارسی کی مشق زیادہ تھی اور اس سے انہیں طبعی تعلق تھا اس لئے اکثر الفاظ اس طرح ترکیب دے جاتے تھے کہ بول چال میں اس طرح بولتے نہیں"۔۱۰

ڈاکٹر گیان چند نے آزاد کے اس قسم کے جملوں کو شاعرانہ قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ ان کی بات بدگمانی اور جانبداری نظر آتی ہے۔[11]

آزاد کی تنقید اس دور کے اس قسم کے جملوں کی مدح غالب اور آنے والے زمانے کی قدح غالب کے درمیان ایک ایسے نیمے کی حیثیت رکھتی ہے جس کی معتی آفرینی میں لذت بھی ہے اور کڑواہٹ بھی۔

مجھے حالی کی "یادگار غالب" آزاد کی جانبداری کا ردعمل نظر نہیں آتی۔"یادگار" لکھ کر حالی نے استاد کا وہ قرض ادا کیا جو ایک عقیدت مند اور فرماں بردار شاگرد اپنی گردن پر محسوس کرتا ہے۔ انہوں نے غالب کی شخصیت کو اپنی اور دوستوں کی یادوں سے مرتب کیا اور اسے ایک ایسا تمثیل دار آئینہ بنا دیا جس میں ناہمواریاں بھی خوبصورت نظر آتی ہیں اور تضادات انسانی فطرت کا حصہ بن جاتے ہیں یادگار کے تنقیدی حصے میں حالی کا انداز وضاحتی اور تشریحی ہے اور تاثر پر عقیدت کی دبیز تہہ جمی ہوئی ہے۔ حالی اس غلو کا شکار بھی ہوئے جو آزاد نے ذوق کے لئے استعمال کیا تھا۔ لیکن اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ یادگار کو غالب پر پہلی تنقیدی کتاب کا درجہ حاصل ہے جس کی تاریخی حیثیت مسلمہ ہے اور جو مطالعہ غالب میں ایک اساسی حوالے کے لحاظ سے بھی اہم ہے۔ اس کتاب سے حالی کی وسعت نظر کا بھی خاطر خواہ اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ غالب کی شاعری اور نثر کے بارے میں حالی کی آرا کو وقعت اور اعتبار حاصل ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

ا۔ مرزا کی شاعری اکتسابی نہ تھی۔ بلکہ ان کی حالت پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا۔[14]

۲۔ مرزا کے ابتدائی کلام کو مہمل و بے معنی کہو یا اس کو اردو زبان کے دائرے سے خارج سمجھو مگر اس میں شک نہیں کہ اس سے ان کی اور جتن اور غیر معمولی اپچ کا خاطر خواہ سراغ ملتا ہے"۔[11]

۳۔ مرزا نے اپنی غزل کی عمارت دوسری بنیاد پر قائم کی ہے۔ ان کی غزل میں زیادہ تر ایسے اچھوتے مضامین پائے جاتے ہیں جن کو اور شعرا کے فکر نے مس نہیں کیا۔"[11]

تنقید غالب میں غلو آمیز مدح عبدالرحمٰن بجنوری نے اور مدلل قدح ڈاکٹر عبداللطیف نے لکھی۔ اس مقصد کے لئے دونوں نے انگریزی پیمانے استعمال کیے۔ بجنوری کی غالب پرستی ان کے رومانی مزاج کا حصہ ہے۔ "محاسن کلام غالب" [19]۱۹ میں منظر عام پر آئے' اور اس جملے کی گونج تو ادبی دنیا میں اب تک سنی جا رہی ہے کہ "ہندوستان کی الہامی کتابیں فقط دو ہیں۔ ایک وید مقدس اور دوسری دیوان غالب"

حالی نے غالب کی نظم و نثر کی قدر و قیمت کے تعین میں نظریاتی مسائل کو اہمیت دی اور غالب کی انفرادیت' جدت طبع استعارہ و تشبیہ کا نادرہ کار استعمال اور شوخی و ظرافت کی طرنگی کو مثالوں سے ثابت کیا۔ انتہائے عقیدت کے باوجود ان کی تنقید حقیقت سے بعید نہیں آتی۔ غالب کو بجنوری نے دفور شوق اور طغیان جذبات سے متعارف کرایا اور ورڈس ورتھ' شیکسپیر اور ٹینی سن کو غالب کا حریف تصور کی۔ وہ غالب کو ان

سب سے بڑا شمار کرکے مغرب پر مشرق کی فوقیت ثابت کرنا چاہتے تھے۔ اس سے طغیان تنقید پیدا ہوا اور ڈاکٹر گیان چند نے لکھا کہ

بجنوری طویل تشبیب کے بعد آخر میں غالب کے معمولی اشعار کو ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اس عالمانہ انشائیے کے آخر میں غالب کے چند اشعار (مجھے معاف کیا جائے) ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ جیسے اہرام مصر کو الٹ کر رکھ دیا گیا ہو۔ یعنی پہنائی اوپر اور تنگی سب سے نیچے۔ جس طرح آریہ سماجی موجودہ دور کی تمام ایجادات کو ویدوں میں تلاش کر لیتے ہیں اسی طرح بجنوری نے قدیم فلسفیوں کی حکمت کا نچوڑ اور جدید سائنس کے تمام اہم انکشافات غالب کے کلام میں ڈھونڈ نکالے"۔۱۵

بجنوری نے تنقید غالب میں انتہا پسندی کا جو مظاہرہ کیا ہے اس کے دوسرے انتہائی کنارے پر ڈاکٹر سید عبداللطیف کھڑے ہیں۔ انہوں نے غالب کی خوبیوں کو تو نظر انداز کر دیا اور ان کی خامیاں تلاش کرنے اور استہزائی انداز میں اچھالنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ چنانچہ بعض لوگوں نے خیال ظاہر کیا کہ ان کی انگریزی کتاب "غالب" (۱۹۱۸) "محاسن کلام غالب" کا ردعمل ہے۔ بجنوری نے لکھا تھا کہ "میں بیدار یا خوابیدہ نہیں ..... مرزا کو ایک رب النوع تسلیم کرنا لازم آتا ہے۔ غالب نے بزم ہستی میں جو فانوس خیال روشن کیا ہے کون ہے "پیکر تصور" ہے جو اس کے "کاغذی پیرہن" پر منازل زلیست قطع کرتا ہوا نظر آتا ہے"۔۱۶

ڈاکٹر عبداللطیف نے فرمایا کہ

"کلام غالب کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ ظاہر ہو گا کہ اس کا اصلی رنگ ذہنی اور دماغی ہے۔ زندگی بھر شاعر کی یہ آرزو رہی کہ فکر و کلام میں شاعری سے زیادہ فن بلکہ صنعت گری نمایاں ہے اور احساس سے زیادہ فکر و تخیل یا خیال آرائی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ جہاں احساس کے نشان بھی پائے جاتے ہیں وہاں عقل کا رنگ چڑھانے کی محسوس کوشش ظاہر ہوئی جاتی ہے"۔ ۱۷

عملی تنقید میں ڈاکٹر عبداللطیف کا رویہ مندرجہ ذیل مثال سے واضح ہے۔

"منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

بتلایئے اس شعر میں کون سا فلسفہ ہے۔ اگر حیدر آباد سے کسی شخص کو لندن جانے کے وسائل حاصل ہو جائیں اور وہاں پہنچ کر سینٹ پال کی سب سے اونچی چوٹی پر جا بیٹھے تو وہ یقیناً قدیم لندن پر ایک طائرانہ نظر ڈال سکے گا۔ لیکن اصل مرحلہ تو یہ ہے کہ پہلے وہ لندن جائے اور پھر اس کو وہاں کے مشہور و معروف گرجا پر چڑھنے کا موقع حاصل ہو۔ کیا غالب کو اپنی زندگی میں کہیں عرش کے آستانہ تک بھی رسائی ہوئی"؟ ۱۸

ڈاکٹر لطیف کی تنقید غالب کو بعض نقادوں نے خلوص سے عاری قرار نہیں دیا۔ تاہم وہ غالب کی طرف پیش قدمی محبت سے نہیں کرتے اور اکثر راستے کے خارزار میں ہی الجھ جاتے ہیں' ان کی حیثیت ایک ایسے نقاد کی ہے جو غالب کی تعریف برداشت نہیں کر سکتا اور تنقیص میں توازن کو برقرار نہیں رکھتا۔ ان کی تنقید غیر

ہمدردانہ جذبے کی پیداوار ہے اور نقاد کے تعصب کو آشکار کرتی ہے۔

○

تنقید غالب کا متذکرہ بالا پس منظر (۱۸۶۹ تا ۱۹۱۸) انسٹھ سالوں پر محیط ہے۔ ۱۹۱۱ میں "محاسن کلام غالب" چھپی تو شیخ محمد اکرام کی عمر صرف ۱۳ سال تھی اور وزیر آباد میں مڈل کلاس کے طالب علم تھے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت محاسن ان کی ذہنی استعداد سے بلند تھی' ڈاکٹر عبداللطیف کی کتاب "غالب" منظر عام پر آئی تو ان کی عمر 20 کے لگ بھگ تھی اور وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں سال پنجم کے طالب علم تھے اور ڈاکٹر ممتاز حسن اور چودھری محمد علی ان کے حلقہ احباب میں شامل ہو چکے تھے۔ اسی عرصے میں انہوں نے فارسی میں آنرز لی۔ لیکن ایم اے کے لیے انگریزی ادب کا انتخاب کیا۔۱۹ اس عرصے میں غالب سے ان کی شیفتگی کے جو آثار نظر آتے ہیں اس کی پرورش میں انگریزی علوم کے مقابلے میں فارسی زبان و ادب کے مطالعے کا زیادہ حصہ ہے۔ غالب سے ان کی محبت کو مستحکم کرنے میں ممتاز حسین نے جو حصہ لیا اس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ اور یہ کہنا درست ہے کہ شیخ محمد اکرام اپنی عملی زندگی میں داخل ہوئے تو غالب کا فکری اور فنی تاثر ان کے دل و دماغ کو اپنے محیط میں لے چکا تھا۔ اس عرصے میں ہی انہوں نے محسوس کیا کہ غالب کا رویف وار دیوان مرزا کی شاعری کے ارتقائی مطالعے میں پوری معاونت نہیں کرتا۔ چنانچہ انہوں نے کلام غالب کو سن تصنیف کے اعتبار سے مرتب کرنے کا بیڑا اٹھایا اور ان کا حاصل تحقیق غالب نامہ (۱۹۳۶) ہے جو ان کی سب سے پہلی اور بقول حمید احمد خان مشہور ترین تصنیف ہے۔۲۰ اس تدوین کے دوران ہی انہیں کئی قابل ذکر باتیں معلوم ہوئیں۔ غالب کی فارسی اور اردو شاعری اور نثر کے بالاستیعاب مطالعے نے ان پر غالب کے فکر و فن کے نئے گوشے آشکار کیے۔ مرزا کی زندگی کو غیر جذباتی زاویوں سے پرکھنے اور ان کی شخصیت کا تجزیہ کرنے کا موقعہ ملا۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ غالب شیخ محمد اکرام کی ادبی اور فکری زندگی کا ایک اٹوٹ انگ بن گیا۔ وہ حالی نہیں تھے لیکن انہوں نے غالب کی دریافت میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں وہ "یادگار غالب" کے کارناموں سے کم نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ انگریزی زبان و ادب کا زیرک طالب علم ہونے کے باوجود شیخ محمد اکرام نے اپنی مشرقیت کو برقرار رکھا' فارسی زبان و ادب کے سرچشموں کو خشک نہیں ہونے دیا اور مغرب سے مرعوب نہیں ہوئے۔

یہی وجہ ہے کہ انہوں نے تنقید غالب میں نہ بجنوری بننے کی کوشش کی ہے اور نہ ہی ڈاکٹر عبداللطیف۔ وہ ایک ایسے روشن خیال مشرقی اد یب نظر آتے ہیں جو دید و دانش کی تفہیم میں مغرب کے تنقیدی اصولوں کو نظر انداز نہیں کرتے' جدید علوم بالخصوص نفسیات سے استفادہ کرتے ہیں' تجزیہ کرتے ہیں تو جذباتی دھند کو اپنے اوپر غالب نہیں آنے دیتے اور حقائق کی بازیافت اور صداقت کی تلاش کو اپنا مقصد تصور کرتے ہیں نتائج کے استخراج میں مطالعے نے ان کی راہنمائی زیادہ کی ہے۔ اور اس میں ان کی انگریزی دانی کا عمل دخل نمایاں نظر آتا ہے۔ چنانچہ سید فیاض محمود نے لکھا ہے کہ

"انگریزی نقادوں میں غالب شناسی کی جو کمی تھی وہ شیخ محمد اکرام نے پوری کر دی۔ کیوں کہ ان کے "غالب نامہ" سے جدید تنقید کا آغاز ہوتا ہے۔"۲۱

ڈاکٹر گیان چند نے ان کے جائزے پر بحیثیت مجموعی ہر جگہ تشفی کا اظہار کیا اور کہا کہ

"یادگار غالب" کے بعد شیخ محمد اکرام کی "آثار غالب" ایسی کتاب ہے جو سوانح کی تحقیق کے لیے بھی اہم ہے اور تصانیف کی تنقید کے لیے بھی۔ اس میں بڑا توازن پایا جاتا ہے۔"۲۲

چنانچہ "تنقید غالب" میں شیخ محمد اکرام کی عطا یہ ہے کہ انہوں نے مدح اور قدح کی فراوانی میں توازن و اعتدال کا زاویہ پیدا کیا اور غالب کو رب النوع ثلث کرنے کی بجائے حقیقی غالب کو متعارف کرایا جو بنیادی مغل روایات کے کامیاب ترجمان تھے۔ حکیم فرزانہ تھے' حقائق و واقعات زمانہ کو ذاتی جذبات و احساسات سے پرکھتے تھے اور روزمرہ کے بشری مسائل سے صرف نظر نہیں کرتے تھے۔ حالی بجنوری اور اکرام کا ممدوح بلاشبہ ایک ہی شخص ہے لیکن ان میں ہر ایک کا زاویہ نظر جداگانہ ہے۔ حالی غالب کو بلند مقام پر ایستادہ کرکے خود ان کے پاؤں میں کھڑے ہو جاتے ہیں' بجنوری نے اپنے ہاتھ میں محدب شیشہ سنبھال رکھا ہے اور وہ شعاع شع کو بقعہ نور بنانے کی کوشش میں مبتلا ہیں شیخ محمد اکرام نے غالب کو ہموار سطح سے دیکھنے کی سعی کی اور ان کے قد کو بڑھانے یا کم کرنے کے بجائے ان کی ادبی قامت کا منصفانہ اور متوازن تعین کیا ہے۔ میں اس اجمال کی مزید وضاحت کی اجازت چاہتا ہوں۔

○

ڈاکٹر گیان چند نے حالی کی تنقید غالب کے ذکر میں ایک دلچسپ بات یہ لکھی ہے کہ

"آج جو ہم غالب کے بعض پہلو دار اشعار کے لطیف معنوں سے محظوظ ہوتے ہیں' وہ "یادگار" ہی کی دین ہیں۔

شاید انہوں نے یہ معنی غالب سے سنے ہوں گے۔"۲۳

شیخ محمد اکرام نے تنقید غالب کا ادبی فریضہ ادا کیا تو اس وقت غالب دنیا میں موجود نہیں تھے' انہوں نے ابتدا غالب سے محبت پیدا کرنے سے کی لیکن ممتاز حسن کی طرح غالب کو شرحوں کی مدد سے سبقاً سبقاً اور شعراً شعراً تو شاید نہیں پڑھا۔ انہوں نے براہ راست غور و خوض کا راستہ اختیار کیا اور جب غالب کا ردیف وار دیوان غالب کے زمانی اور تدریجی مطالعے میں معاون نہ ہوا تو تحقیق غالب کی طرف راغب ہو گئے۔ اس لحاظ سے ان کی تحقیق ان کے اپنے مطالعے کی ضرورت کا نتیجہ ہے۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ کلام غالب کی تاریخی تدوین ہے اور اس میں شیخ محمد اکرام نے غالب کی شاعرانہ شخصیت کو نئے طریقے سے پیش کیا ہے۔ ان کا یہ کام اس سلسلے کی ایک کڑی تھا جسے قاضی انوار الحق نے "نسخہ بھوپال" میں سرانجام دیا تھا۔ ۲۴ ادوار کا تعین ڈاکٹر عبداللطیف نے بھی کیا لیکن انہوں نے "دیوان غالب" شائع نہیں کیا۔ شیخ محمد اکرام نے اعتراف کیا ہے کہ انہیں کلام غالب کی تاریخی تدوین کا خیال ڈاکٹر عبداللطیف کی کتاب پڑھ کر ہوا

تھا۔۲۵ لیکن وہ اس سے مطمئن نہیں تھے۔ انہیں یہ احساس بھی تھا کہ ”مرزا کی ذہنی حالت اور ان کے خیالات کا اظہار فقط ان کے اردو کلام میں نہیں۔ بلکہ فارسی زبان میں بھی انہوں نے شعر کہے ہیں جو تعداد میں اردو سے کہیں زیادہ ہیں۔ اس کے علاوہ شاعرانہ نقطہ سے بھی مرزا کا فارسی کلام اردو دیوان سے کم رتبہ نہیں۔“ غالب کے فارسی خطوط کے مطالعے کے دوران ان پر یہ بات منکشف ہوئی کہ ”ایک طویل حصہ عمر میں غالب نے اردو شعرگوئی ترک کر دی تھی“ اس عرصے میں غالب کی ذہنی نشوونما اور فکری ارتقا کا سب سے بڑا ماخذ غالب کی فارسی شاعری تھی جس سے ڈاکٹر عبداللطیف نے شعوری اغماض برتا تھا۔ تلاش و تحقیق کے اس عمل میں ان کی رسائی کلام غالب کے ایسے نادر معاصرانہ نسخوں تک بھی ہوئی جو تذکرہ گلشن بے خار آثار الصنادید اور جلوۂ خضر وغیرہ سے زیادہ قابل اعتماد تھے۔ انہوں نے ”ارمغان غالب“ میں جن ماخذات کی نشان دہی کی ہے ان میں نسخہ حمیدیہ' گلشن بے خار' جلوۂ خضر' آثار الصنادید' دیوان غالب اردو طبع اول (مملوکہ خان بہادر سید ابو محمد صاحب) قلمی نسخہ میخانہ آرزو (بانکی پور لائبریری) قلمی نسخہ دیوان فارسی (رام پور لائبریری)۔ دیوان اردو (مملوکہ حافظ محمود شیرانی) دیوان اردو طبع ثانی (۱۸۴۷)۔ دیوان فارسی طبع اول (۱۸۴۵)۔ دیوان غالب قلمی نسخہ رام پور شامل ہیں اور تاریخی ترتیب مندرجہ ذیل ادوار پر مشتمل ہے۔

پہلا دور ۔ ریختہ ۱۸۰۷ تا ۱۹۱۱ء اس دور میں غالب کے ان اشعار کا انتخاب ہے جو 25 برس کی عمر سے پہلے لکھے گئے تھے

دوسرا دور ۔ نغمتہ شباب ۱۸۱۱ تا ۱۸۱۷ء اس دور کے لیے نسخہ شیرانی پر زیادہ انحصار کیا گیا ہے اور ایسے اردو اشعار پیش کیے گئے ہیں جو نسخہ حمیدیہ کے متن میں درج نہیں ہیں۔

تیسرا دور بہار عجم ۔ ۱۸۱۷ تا ۱۸۴۷ء اس دور میں غالب کے فارسی اشعار تین ذیلی ادوار میں پیش کیے گئے ہیں اور گلشن ہندی کے زیر عنوان وہ اشعار بھی شامل ہیں جو مرزا نے کبھی کبھار اردو میں کہے۔

چوتھا دور ۔ نوائے ظفر ۱۸۴۷ تا ۱۸۵۷ء اس دور میں اشعار کا انتخاب نسخہ رامپور کی مدد سے کیا گیا ہے اور اس زمانے کے فارسی اشعار کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

پانچواں دور ۔ چراغ سحری ۱۸۵۷ تا ۱۸۶۹ء اس دور میں ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کے بعد لکھے جانے والے فارسی اور اردو اشعار کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ متذکرہ بالا ادواری تقسیم حتمی نہیں اور بعض محققین غالب نے اسے مورد اعتراض و تنقید بھی ٹھہرایا ہے تاہم بیشتر ادبا نے اس تحقیق و ترتیب کو شیخ محمد اکرام کا بے حد قابل اعتنا کارنامہ شمار کیا ہے۔ ”غالب نامہ“ کے مقدمہ کو تنقیدی اعتبار سے یہ اہمیت حاصل ہے کہ اس میں شیخ محمد اکرام ایک بااصول منصف کے طور پر سامنے آتے ہیں' ذہنی طور پر وہ طرفدار غالب ہیں لیکن انہوں نے فوقیت سخن اور صداقت کی تلاش اور حقائق کے تعین کو دی ہے۔ اور حاصل تحقیق پیش کرتے وقت غالب سے اپنے جذباتی تعلق کو بیشتر اثر انداز نہیں ہونے دیا۔ ”آب حیات“ میں آزاد اپنے عصری تعصب سے اور

"یادگار" میں حالی اپنی شاگردانہ نیاز مندی سے مغلوب ہیں لیکن "غالب نامہ" میں شیخ محمد اکرام نے غالب کو فاصلے سے دیکھا' تجزیہ کی اساس داخلی شہادت اور عصری واقعات پر رکھی اور غالب کی انفرادیتوں کو ہی پیش نہیں کیا بلکہ اسے اولیتوں کا وہ حق دینے سے انکار بھی کیا جو بیشتر نقاد غالب کو دیتے چلے آئے تھے۔ چنانچہ ان کے بعض نتائج نہ صرف حیران کن ہیں بلکہ ان سے غالب کی شاعرانہ شخصیت کا بھی ایک نیا تصور مل جاتا ہے۔ مثال کے طور پر انہوں نے غالب کی ابتدائی دور کی اردو شاعری کے بارے میں لکھا کہ

"یہ اشعار شاعرانہ حسن سے عاری ہیں' ان میں آمد کم ہے۔ آورد اور تصنع بہت' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کی تمام محنت عجیب و غریب خیالات اور دور از کار تشبیہیں ڈھونڈنے میں صرف ہوتی تھی' شعریت کی طرف وہ توجہ نہ کر سکتے تھے ..... اشعار کسی طبعی یا نفسیاتی حقیقت کا بیان نہیں تھے بلکہ ان کا وجود فقط شاعر کے بے پروا دماغ میں تھا۔ کئی جگہ ان کی بنیاد محض رعایت لفظی پر ہے اور وہ مصنوعی حسن سے بالکل عاری ہیں۔"۲۶

○

۱۸۴۷ کے بعد چوتھے دور کے بارے میں انہوں نے خیال ظاہر کیا کہ چوتھا دور ان کا درباری دور سمجھنا چاہیے کیوں کہ اگرچہ ذوق زندہ تھا اور مرزا ظفر کے استاد نہیں ہوئے تھے لیکن اس زمانے کی بیشتر غزلیں یا تو بادشاہ کے پاس بطور سوغات لے جانے کے لیے لکھی گئیں یا قلعۂ شاہی کے مشاعروں میں پڑھنے کے لیے ..... دربار سے تعلق استوار ہونے کی وجہ سے مرزا کو بھی درباری زبان کو اپنی زبان بنانا پڑا ..... بادشاہ اور شہزادے شاہ نصیر کی طرز کے مداح تھے جسے ذوق نے برقرار رکھا تھا۔ چنانچہ مرزا بھی مشاعروں میں دیکھتے تھے کہ وہ غزلیں مقبول ہوتی ہیں جن کی زبان سادہ اور آسان ہو۔ تشبیہیں اور فارسی ترکیبیں اس قدر ہوں جس قدر آٹے میں نمک اور ان کے بجائے روز مرہ اور محاورہ کی افراط ہو۔ چنانچہ مرزا پر بھی یہی رنگ چڑھ گیا اور اس دور کی کئی غزلیں ہیں جن پر ذوق کا رنگ غالب ہے ..... مثلاً غالب کی وہ مشہور غزل لیجیے جس کے مقطع میں بہادر شاہ ظفر کے ارادہ حج کی طرف اشارہ ہے۔ اس غزل کا شاید کوئی شعر ایسا نہیں جو ذوق نہ لکھ سکتا ہو۔ مضامین سادہ اور عامیانہ ہیں اور روزمرہ کی افراط ہے۔

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو کیا بات ہے تمھاری شراب طہور کی
آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی" ۲۷

اس قسم کے نتائج جو شیخ محمد اکرام کے تجزیاتی عمل کا نتیجہ ہیں واضح ہوتا ہے کہ وہ غالب کی جمالیاتی چکاچوند اور بجنوری کی بکھری ہوئی چاندنی سے متاثر نہیں ہوئے اور فروغ فکر غالب کے دور میں انہوں نے جرأت مندی کا مظاہرہ کیا۔ سید فیاض محمود نے تو شیخ محمد اکرام کو داد ہی اس بات پر دی ہے کہ

"وہ پہلے نقاد ہیں جنہوں نے یہ بات کہنے کی جرأت کی کہ غالب کے آخری (درباری) دور کے اشعار جنہیں مدت سے اس لیے سراہا جا رہا تھا کہ وہ اسیر کے انداز میں لکھے گئے تھے دراصل غالب کے فکری اور جذباتی اضمحلال کا نتیجہ اور ان میں وہ گہرائی نہیں جو پہلے ادوار کے اشعار میں پائی جاتی ہے۔"۲۸

بجنوری کی تنقید میں تجلیل و تزئین غالب اور ڈاکٹر لطیف کی تنقید میں تخفیف غالب کا زاویہ نمایاں ہے۔ بجنوری نے ایک ایسا اسٹیج آراستہ کیا جو کئی ہزار کینڈل پاور کے برقی قمقمے سے جگمگا رہا ہے۔ ڈاکٹر لطیف نے اس سٹیج کی بیشتر روشنیاں بجھا دیں۔ شیخ محمد اکرام نے غالب کو ہموار اجالے میں دیکھا ہے۔ ان کا موضوع تو "غالب ایک شاعر" تھا لیکن انہوں نے غالب کا مطالعہ ایک پورے انسان کی حیثیت میں کیا اور اس کے محاسن کے ساتھ معائب کو بھی قبول کیا۔ اس قسم کے مطالعے میں ان کا تنقیدی نظریہ یہ ہے کہ

"تبصرہ نگار کا اصل کام شاعر کی ذاتی خصوصیتوں کو نمایاں کرنا ہے"۲۹

اور حصول مقصد کے لیے انہوں نے مختلف شعراء کے باہمی موازنے کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا ہے۔ تاہم "یہ طریق تنقید جسے حالی اور شبلی نے کثرت سے اختیار کیا معائب سے مبرا نہیں۔ کیوں کہ اس میں فیصلہ کی اساس ایک غزل یا چند اشعار کو بنا لیا جاتا ہے جو کبھی اتفاق سے صحیح ہو تو ہو لیکن عام طور پر اس کے صحیح ہونے کا امکان کم ہے۔" شیخ محمد اکرام نے "حکیم فرزانہ" میں موازنہ کا طریق کثرت سے استعمل کیا ہے۔ لیکن انہوں نے ہم طرح غزلوں یا ہم خیال اشعار کو بنیاد بنانے اور سرقہ اور توارد کی بحث کو ہوا دینے کے بجائے مختلف شعراء کی مجموعی شعری شخصیت، شاعری کی جملہ خصوصیات، تخلیقی مزاج اور معائب و محاسن کی گہرائی اور سطحیت کو معیار بنایا اور نہ صرف غالب کی عظمت کا مدلل محاکمہ کیا بلکہ اس عمل کے دوران دوسرے اصحاب ادبا اور شعرا کا بھی تجزیہ کر دیا۔ اور اس سلسلے کو عہد غالب تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے زمانہ حال تک پھیلا دیا۔ چنانچہ شاعری میں غالب کا موازنہ اقبال سے اور نثر میں مولانا ابوالکلام آزاد سے کیا اور اس طرح غالب کے اطراف و جوانب اور بعد کے زمانے کو بھی منور کر دیا۔ اس قسم کے موازنے کی ایک مثال حسب ذیل ہے جس میں شخصیات وسیع تاریخی تناظر میں سامنے آئی ہیں۔

"مرزا غالب کا معاشرہ جس کشمکش سے دوچار تھا اس میں نیا راستہ ڈھونڈنے کی صلاحیت ان میں نہیں تھی۔ وہ سید احمد خان نہیں تھے جو ایک ٹوٹے ہوئے برباد شدہ جہاز کے WRECK میں سے مضبوط و سالم تختے نکال کر ایک نئی کشتی تیار کرتا ہے اور اس میں ایک نیا بادبان لگا کر پھر بحرنوردی نہ سہی مسافت دریائی کا آغاز کر دیتا ہے۔ وہ اقبال بھی نہیں تھے جو قوم کے تاریخی تقاضوں سے خبردار ہو کر اور گردوپیش پر نظر ڈال کر ایک نئی منزل کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ غالب کا ملک اور مقام دوسرا تھا۔ اس کے علاوہ شاید وقت بھی ابھی ظاہری تخریب کی تکمیل کا تھا۔ لیکن مرزا کی جواں ہمتی انہیں نچلا نہ بیٹھنے دیتی۔ وہ دیکھتے تھے کہ قدیم نظام کی تباہی یقینی ہے اور یہ بھی سمجھتے تھے کہ معاملہ ان کے بس کا نہیں

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر . کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

لیکن وہ کسی نہ کسی سطح پر شعر و سخن کی منزل ہی میں سہی، یا کم از کم خیال و تخیل کی دنیا میں ــــ ماحول سے نبرد آزما رہے۔" ۳۰

اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا غالب سرسید اور اقبال کی نوع کے راہنما نہیں تھے اور ان کے

ذہن میں مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت کا قومی تصور موجود نہیں تھا لیکن ان کے سیاسی وژن سے انکار ممکن نہیں۔ شیخ محمد اکرام نے مندرجہ بالا اقتباس میں جو بات اجمال سے کہی ہے اس کی وضاحت سے غالب کی عظمت اور ان کے قومی مرتبے کے تعین کی کاوش بھی کی ہے اور لکھا ہے کہ

"ایک نئی قوم کی تعمیر کا کام تو فی الحقیقت شاہ ولی اللہ کے وقت سے شروع تھا لیکن نہایت خاموش طریقے سے۔ ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا دعویٰ نہ تھا بلکہ وہ بیج بوئے گئے جو صالح اور سالم تھے۔ لیکن اپنے وقت پر ہی ایک بھرپور فصل کا سامان کر سکتے تھے۔ مرزا غالب کا بھی اس خاموش تعمیری کام میں حصہ تھا (۱) انہوں نے قوم کے تہذیبی ورثہ کو جو فارسی میں تھا اردو سے رشتہ جوڑا اور قوم کی نئی تہذیبی زندگی کو گہری اور ٹھوس بنیادوں پر استوار کیا۔ (۲) اردو ادب (نثر اور شعر) کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ اردو زبان اور رسالیب بیان میں بڑی وسعتیں پیدا کیں۔ ورنہ شاید میر کی زبان نہ غالب کے بیان کو سنبھل سکتی نہ اقبال کے پیام کو (۳) ہمارے ادب اور ہماری تاریخ میں ایک شگفتہ' صلح کل' انصاف پسند' حقیقت نگر' ژرف بین' حیات شناس' متوازن' زندہ و توانا ہشیار و بیدار' باہمت اور اولوالعزم' شوخ و ظریف شخصیت کا اضافہ کیا۔ جس کا پر تو ہماری ذہنی زندگیوں پر اس حد تک پڑا کہ شاید یہ کہا جا سکے کہ شاہ ولی اللہ اور شاید اقبال کو چھوڑ کر نئی قوم کی ذہنی ساخت میں سب سے زیادہ دخل غالب کا ہے" ۲۱

غم کا عنصر میر اور غالب کی شاعری میں ایک قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ شیخ محمد اکرام نے غم کی بحث میں ان دو عظیم شعراء کے اشعار کو آپس میں ٹکرانے کی بجائے ان کی مزاجی کیفیت اور غم سے نبرد آزما ہونے کے طریق کا موازنہ کیا۔ ملاحظہ کیجیے۔

"میر کی گریہ وزاری کا باعث اس کے ذاتی مصائب یا زیادہ سے زیادہ گرد و پیش کے ناساعد حالات ہیں ..... بعض اشعار سے تو خیال ہوتا ہے کہ انہیں غم سے اس قدر محبت ہو گئی تھی کہ غم و حزن میں مبتلا رہنے اور جلنے کڑھنے سے ان کی تسکین ہوتی.." ۲۱

"مرزا غالب کی زندگی میں مایوسیوں اور ناکامیوں کا بہت دخل تھا اور ان کا اظہار ان کے اشعار میں بھی پوری طرح ہوا ہے .... مگر ان کی بلند ہمتی نے غم کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ زندگی میں انہوں نے سکون کچھ تو اس شوخ طبعی اور حکیمانہ ظرافت کی مدد سے حاصل کیا جو غم یا کسی دوسرے جذبے کو مناسب حدود سے آگے نہ بڑھنے دیتی تھی اور کچھ اس فلسفیانہ بالغ نظری سے جس کے سامنے نہ صرف ان کی اپنی بلکہ تمام انسانوں کی مایوسیاں اور کوتاہیاں بے نقاب تھیں" ۲۲

چنانچہ نوع انسانی کی فطری اور بنیادی کوتاہیوں پر آنسو بہانا ایسا عمل ہے جو بقول شیخ محمد اکرام غالب کو میر بلکہ اقبال کے سوا دوسرے تمام اردو شعرا سے ممتاز کرتا ہے۔ دوسری طرف یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ شیخ محمد اکرام نے میر کی عظمت کے مقامات تلاش کیے اور انہیں مقامات غالب سے بلند پایا تو اس کا اعتراف بھی کشادہ دلی سے کیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ

"غالب کی زبان میں وہ صفائی نہیں جو میر کی غزلوں میں ہے۔ جو سوز و گداز میر کی اشعار میں عام ہے وہ بھی عام طور پر غالب کو میسر نہیں۔ ان دونوں باتوں میں میر کا مرتبہ غالب سے بالا ہے۔
مومن' سودا اور غالب کے موازنوں میں بھی اپنے منفرد نتائج اخذ کیے۔ ملاحظہ کیجئے۔
"مرزا غالب میر کی نسبت سودا سے زیادہ قریب تھے ..... غالب کی طرح سودا کے کلام میں شوخ نگاری بہت ہے لیکن بد قسمتی سے انہوں نے اسے ہجو نگاری کے لئے وقف کر رکھا تھا ..... غالب میں سودا کی خوبیاں سبھی تھیں' عیب کوئی نہ تھا"

○

"غالب اور مومن دونوں کو خدا نے شاندار دل و دماغ دیئے تھے دونوں میں خود پسندی بہت تھی' دونوں ناسخ کے مداح اور مقلد تھے اور دونوں کی زبان میں فارسیت اور تصنع کا عنصر نمایاں تھا ..... لیکن مومن نے غزل کو بیشتر مضمون آفرینی اور جدت نگاری کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ اسے غالب اور میر کی طرح داستان دل کہنے کا ذریعہ نہیں بنایا ..... ایک قابل ذکر چیز ظرافت ہے جو دیوان مومن میں قطعاً نہیں ..... سوز و گداز کے اشعار جو دیوان غالب میں کثرت سے ہیں غزلیات مومن میں بہت تھوڑے ہیں" ۲۴
شیخ محمد اکرام نے غالب اور اقبال کی متعدد مشابہتوں کا اعتراف کیا ہے لیکن انہوں نے شیخ عبدالقادر کے اس خیال کی نفی بھی کی ہے کہ
"اردو اور فارسی شاعری کے عشق نے غالب کی روح کو عدم میں بھی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ کسی طرح جسد خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے اور اس نے پنجاب کے ایک گوشہ جسے سیالکوٹ کہتے ہیں میں دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال کا نام پایا"
شیخ محمد اکرام نے خیال ظاہر کیا ہے کہ
"سرعبدالقادر نے سطحی مشابہتوں پر زیادہ توجہ دی اور ظاہری مشابہتوں کے باوجود غالب اور اقبال کی شخصیتیں بالکل مختلف ہیں اور ان کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ دو قالبوں میں ایک ہی روح تھے صحیح نہیں" ۲۵

انہوں نے غالب اور اقبال کے درمیان اختلاف طبائع' اختلاف مقاصد اور تعلیم و تربیت کے مختلف وسائل کو بھی ملحوظ رکھا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ
"اقبال اصلاً فلسفی تھے اور مرزا اصلاً شاعر۔ اقبال کے پیش نظر زیادہ تر وہی مسائل تھے جن سے فلسفیوں کو دلچسپی ہے اور مرزا کے ارتقاء میں وہ مضامین ہیں جو مشرقی شعرا کو مرغوب ہیں۔ اقبال حقائق و واقعات کو بلند حکیمانہ نظر سے دیکھتے تھے اور مرزا ذاتی احساسات اور جذبات کی روشنی میں ..... غالب اور اقبال دونوں ہمارے ادب کی بلند ترین چوٹی تک پہنچے ہیں۔ لیکن ایک سراالوصال تھا اور دوسرا سرالفراق۔ ایک میں شان جمالی جلوہ گر تھی تو دوسرے میں شان جلالی۔ ایک غیر منقسم اسلامی ہندوستان کی بلند ترین تہذیبی

روایت کا ترجمان تھا۔ دوسرا پاکستان کا مفکر اعظم۔ ان کے اسلوب خیال اور فلسفۂ زندگی میں وہی فرق تھا جو امام الہند شاہ ولی اللہ اور حضرت مجدد الف ثانی کے طریق کار میں تھا''۳۶

شیخ محمد اکرام کی تنقید غالب کو ڈاکٹر لطیف کا ردعمل بھی شمار کیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ''غالب نامہ'' لکھتے وقت وہ ڈاکٹر لطیف کی کتاب ''غالب'' کا مطالعہ کر چکے تھے لیکن اکرام صاحب کی تنقید میں ردعمل کی تیزابیت نظر نہیں آتی۔ بلکہ اس میں یہ احساس کار فرما ہے کہ غالب کو زندگی کی کٹھن منازل طے کرنے کے لیے جن صورتوں کا سامنا کرنا پڑا اس کا کسی کو احساس نہیں ہے وہ ابتدا میں ہی تسلیم کر لیتے ہیں کہ

''مرزا غالب کی ابتدائی زندگی میں مغلیہ عہد زوال کے بگڑے ہوئے رئیس زادوں کی ساری باتیں تھیں ...... ایک امیر زادہ تھا جو چار سال کی عمر میں پدرانہ نگہداشت سے محروم ہو گیا۔ عشق اور لہو و لعب کے سارے سامان میسر تھے لیکن عنان طبیعت کو سنبھالنے والا کوئی نہ تھا۔ مرزا غالب اس ماحول میں بگڑے اور خوب بگڑے ...... عنفوان شباب کی سرمستیاں تو کیسہ خالی ہونے پر ایک خواب بن کر رہ گئیں ...... لیکن شراب نوشی سے انہیں عمر بھر آزادی نہ ملی اور قمار بازی نے تو انہیں قید خانے کا راستہ دکھایا'' ....''لیکن غالب عہد انحطاط کا بگڑا ہوا رئیس زادہ ہی نہیں تھا۔ انہوں نے اکتسابی معائب کی جس طرح تلافی کی شیخ محمد اکرام کو ملال ہے کہ اس کا اندازہ کسی کو نہیں ہوا۔ وہ راہبرو راہنما اور علمی زاد راہ کے بغیر شعر و ادب کی جس منتہائے کمال کو پہنچے اس کا کسی کو احساس نہیں۔ مرزا غالب نے ابتدائی طرز تحریر ترک کر کے زیادہ صاف اور مستحسن طرز شعرگوئی اختیار کیا۔ لیکن کیا یہ معاملہ اتنا آسان تھا؟ اشعار میں اس وقت تک نکھار نہیں آ سکتا جب تک طبیعت نہ نکھر جائے اور ذہن کی الجھنیں اور گرہیں نہ کھل جائیں غالب کی طبیعت نے یہ نکھار حاصل کیا۔ لیکن اس کے لیے انہیں جس طرح خون جگر پینا پڑا۔ کاش! اس کا اندازہ کیا جا سکے''؟

شیخ محمد اکرام نے یہ سوالات اس داخلی کرب سے اٹھائے ہیں کہ مجھے بیشتر تنقید غالب اس احساس ملال کا ہی ازالہ نظر آتی ہے۔ چنانچہ وہ غالب کو حکیم فرزانہ کہتے اور راز دان حقیقت تسلیم کرتے ہیں تو غالب کے اس قسم کے اشعار سے اپنے ایقان کو مستحکم نہیں کرتے کہ

فرزانہ حکیم من و حدمت گر شاہم — در شعر زمن جوئے براہین حکم را
دلم خزینہ دو عالم است و لے — زبے زبانی خویشم بہ گنج راز امین

بلکہ وہ غالب کو اس کے سیاسی' تہذیبی اور معاشی' تناظر میں دیکھتے ہیں' اس کے نسلی اور ثقافتی ورثے کے اثرات تلاش کرتے ہیں۔ اشعار کے اعماق سے اس کے نفسیاتی اور ذہنی محرکات تلاش کرتے ہیں اور آخر کار وہ غالب کی ان داخلی خوبیوں کو دریافت کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جن سے عبداللہ بیگ خان کا مرزا نوشہ غالب بن گیا تھا۔ شیخ محمد اکرام کی ایک بنیادی عطا یہ ہے کہ انہوں نے غالب کو دریافت کرنے میں نفسیاتی عوامل سے بھی استفادہ کیا اور ذہنی عوارض کا سراغ لگانے اور شخصی لاشعور کی کارستانیوں کو سطح پر

اچھالنے کے بجائے ان تجلیات کو اہمیت دی جو پوری نسل انسانی کا ورثہ تھے اور جن کا شاعری اور نثر میں اظہار غالب کو صحت مند' توانا اور متوازن حیوان ظریف بنا دیتا ہے۔

مرزا غالب کو شیخ محمد اکرام نے مثالی انسان بنانے اور ان کی شخصیت اور فن کو بیرونی روشنی کے سیلاب سے منور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ اس حقیقی غالب کو تلاش کیا ہے جو کرب انگیز ماحول میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ پورا معاشرہ جس کشمکش میں مبتلا تھا وہ انہیں نفسیاتی طور پر مریض بھی بنا سکتی تھی لیکن غالب نے تو قدیم اور جدید کے سنگم پر زندگی گزاری تھی' اس کی طبع سلیم کو نئے نظام کی کئی چیزیں پسند تھیں۔ شیخ محمد اکرام نے غالب کے اس دکھ کو ٹٹولا ہے جو قدیم تہذیبی نظام کی شکست و ریخت پر غالب کے دل پر وارد ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے بزرگوں کے امیرانہ رکھ رکھاؤ اور طرز حیات سے دستبردار نہ ہوئے اور فارسی نثر و نظم کی حفاظت بھی اپنے تہذیبی ورثے کے طور پر کی۔ شیخ محمد اکرام غالب کے نظریہ نعم البدل Law of compensation تک بھی شاعری کے حوالے سے ہی پہنچے' انہوں نے غالب کے شیوہ تسلیم و رضا کو ان کے خطوط سے دریافت کیا۔ غالب نیرنگی قدرت کے تماشائی تھے اور شاعری میں ایسے ایسے امور حکمت کہہ جاتے کہ لوگ انہیں فلسفی شمار کرنے لگے تھے۔ شیخ محمد اکرام نے اس قسم کی غلط العام باتوں کی نہ صرف توضیح کی بلکہ اپنے استخرجات سے ان کی تصحیح بھی کر دی۔ چنانچہ ایک ایسے دور میں جب فلسفہ کلام غالب پر مشتمل کتابیں لکھی جا رہی تھیں۔ شیخ محمد اکرام نے کچھ یوں وضاحت کی کہ

"اگر فلسفہ سے دقیق اور غور طلب خیالات کا اجتماع مراد لیا جائے تو اس رائے سے بہت کم لوگ اختلاف کریں گے کہ غالب ایک بہت بڑا فلسفی تھا۔ لیکن اگر کسی شاعر کے فلسفے سے مراد اس کا انسانی زندگی یا اس کے کسی اہم پہلو کے متعلق کوئی خاص شخصی نقطہ نظر مراد ہے تو آج تک یہ دعویٰ ثبوت اور توضیح کا محتاج ہے"

شیخ محمد اکرام نے غالب کو باقاعدہ فلسفی شمار نہیں کیا لیکن اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ

"غالب نے اپنے سامنے جو مقصد حیات رکھا تھا وہ ایک حکیم اور مفکر کا تھا۔ شاعری اس کے لیے دل لگی کا سامان نہیں تھی۔ وظیفہ حیات تھا اور اصل مقصد شاعری سے پرے تھا۔ یعنی آئینہ زدون و صورت معنی نمودن اور قانون راز کی نوا سنجی ....."

مرزا غالب کے چند سیاست دان مداحوں نے ان کے بعض اشعار سے یہ ثابت کرنا چاہا کہ مرزا ایک پر جوش وطن پرست تھے' اور جنگ آزادی میں بہادر شاہی آئین کی تباہی سے بہت متاثر تھے۔ شیخ محمد اکرام نے اس مفروضے کو بھی غلط قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ

"مرزا ایک معاملہ فہم انسان تھے اور اپنے جذبات کو عقل کے تابع رکھتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہادر شاہ سے ان کی ذاتی دل بستگی اور بہادر شاہی دربار سے ان کے خاندانی تعلقات کبھی بھی اتنے گہرے نہیں تھے کہ وہ اس کی بربادی سے بے قرار ہو جاتے ..... انگریزوں کے ساتھ ان کے مخلصانہ تعلقات تھے۔

اسٹرلنگ کے مرجانے کے بعد انہوں نے جو مرثیہ لکھا ہے اسے کسی طرح رسمی اور خود غرضانہ نہیں کہا جا سکتا۔ میجر جان جیکب کے ساتھ ان کے گہرے دوستانہ مراسم تھے اور جب میجر دہلی آتے تو بسا اوقات مرزا ان کے ٹھہرنے کا انتظام کرتے سرجان میلکم' میٹکف اور ایلی سن نے ان کے ساتھ شریفانہ برتاؤ کیا"۔ ۲۴
غدر کے زمانے میں لکھے ہوئے خطوط اگرچہ خوف کی کیفیت نظر آتی ہے اور غالب نے اپنا مافی الضمیر پوری طرح ظاہر نہیں کیا اس کے باوجود شیخ محمد اکرام کے اس استخراج سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ
"مرزا غالب حب وطن سے عاری نہیں تھے۔ مرزا کے ہم وطنوں پر کوئی زیادتی ہوتی تھی تو اس امر کا مرزا کو دکھ ہوتا تھا۔ غدر کے بعد میرٹھ کے باغیوں پر جو قیامت ٹوٹی اس کے خلاف مرزا کے خطوط شکایت ہی سے نہیں بھرے پڑے بلکہ جا بجا ان کے دل کے پھپھولے پھوٹ بہے ہیں"۔
شیخ محمد اکرام کی تنقید غالب بنیادی طور پر ایک مکمل تہذیبی انسان اور ایک مکمل فطری شاعر کو دریافت کرنے کا عمل ہے۔ یہ انسان بنیادی مغل روایات کا ترجمان تھا اور اس نے اپنا تہذیبی فریضہ شاعری اور نثر کے وسیلے سے ادا کیا۔ شیخ محمد اکرام نے اس انسان کی تلاش و جستجو میں نفی کے بجائے اثبات کا زاویہ ابھارا ہے۔ وہ غالب سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں اور ان کی توقیت ثلث کرنے کے لیے عقل و خرد اور دانش و بینش کو استعمال میں لاتے ہیں۔ تاہم مجھے ان کی تنقید کا مجموعی مزاج رومانی نظر آتا ہے۔ وہ تنقید لکھتے وقت جب تخلیق کی سرحد میں داخل ہو جاتے ہیں تو غالب سے ان کی گہری محبت اپنا جادو جگاتی ہے اور ان کی تحریر لو دینے لگتی ہے۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ کیجئے جس میں بجنوری کی رومانی صدائے بازگشت موجود ہے۔
"مرزا غالب کے ذہنی کارناموں کی جان دو چیزیں تھیں۔ ایک شعر و ادب' دوسرے دانش و حکمت"
فرق صرف یہ ہے کہ بجنوری ستائش غالب میں جادۂ اعتدال سے ہٹ جاتے ہیں لیکن شیخ محمد اکرام پاسبان عقل کی انگلی کو مضبوطی سے تھامے رکھتے ہیں۔ انہوں نے تنقید غالب کے لیے ایسا تحقیقی اور سرسبز و شاداب اسلوب تراشا جو مجسم بالشان بھی ہے اور روح افزا بھی۔ اس کا مطالعہ ایک رومانی اور لطافت انگیز تجربہ بن جاتا ہے اور محسوس یوں ہوتا ہے جیسے ہم تنقید نہیں پڑھ رہے بلکہ شبنم پر ننگے پاؤں چل رہے ہیں۔ "حیات غالب" سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے۔
"شاہجہاں کا تاج محل اور غالب کی شاعری فن کی دو مختلف اصناف کے شاہکار ہیں لیکن دونوں کی تہہ میں ایک ہی روح کارفرما ہے۔ تخیل کی سربلندی و لطافت۔ تلاش حسن او فنی پختگی دونوں میں معراج کمال پر ہے فرق اتنا ہے کہ جب مغلوں کے سامنے خزانوں کے منہ کھلے ہوئے تھے تو ان کے سنہرے خواب اور حسین آرزوئیں سنگ مرمر کے قیمتی لباس میں جلوہ گر ہوئیں۔ لیکن جب یہ خزانے خالی ہو گئے اور خوابوں اور آرزوئں پر افسردگی چھاگئی تو ان کا اظہار حسین و جمیل الفاظ اور حزین و دل گداز اشعار میں ہوا"

شیخ محمد اکرام کی "تنقید غالب" مدح کی چاندنی اور قدح کی ظلمت سے غالب کو نکالتی اور انہیں توازن و اعتدال کی فضا میں لے آتی ہے۔ انہوں نے غالب کی شاعری اور شخصیت کا تجزیہ اس خنک مزاجی سے کیا ہے کہ مستقبل کی تنقید غالب نے اپنا بہت سا سفر ان کے فیصلوں میں طے کیا۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ محمد اکرام کی معرکہ آرا کتاب "غالب نامہ" جواب حکیم فرزانہ۔ حیات غالب اور ارمغان غالب کا مجموعی نام ہے۔ غالبیات کے دور جدید کا منشور قرار دیا جاتا ہے اور ان کا یہ منصب اعلیٰ اب تک قائم ہے۔

ا۔ اس مقالے کی ترتیب و تحریر میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے ذخیرہ غالبیات سے استفادہ کیا گیا ہے۔
۲۔ ڈاکٹر گیان چند، "غالب کے نقاد"۔ صحیفہ۔ شمارہ ۴۹۔ ص ۶۶۔ لاہور۔ ۱۹۶۹ (مرتبہ ڈاکٹر وحید الدین قریشی)
۳۔ ڈاکٹر وزیر آغا۔ "دائرے اور لکیریں"، ص ۱۹ مکتبہ فکر و خیال۔ لاہور ۱۹۸۶
۴۔ بحوالہ۔ "تحقیق غالب" مولفہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن۔ ص ۱۵۹۔ لاہور ۱۹۸۱(ڈاکٹر گیان چند نے لکھا ہے کہ "اردو میں غالب پر جتنا زیادہ لکھا گیا ہے۔ اتنا ماسوائے اقبال اور کسی شاعر پر نہیں لکھا گیا۔ (حوالہ ایضاً)
۵۔ حمید احمد خان۔ سوانح حیات شیخ محمد اکرام مرحوم" صحیفہ۔ شمارہ ۶۳ ص ۱۶۰ لاہور ۱۹۷۳ (مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی)
۶۔ ممتاز حسن، "محمد اکرام" صحیفہ حوالہ ایضاً۔ ص ۱۵۵
۷۔ قمر النساء شیخ۔ ڈاکٹر ایس ایم اکرام۔ بطور غالب شناس۔ (مخزونہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن)۔ یہ تحقیقی مقالہ کی نگرانی میں لکھا گیا۔
۸۔ شیخ محمد اکرام۔ "حیات غالب"۔ ۷۷۔ لاہور ۱۹۸۳ (بار دوم)
۹۔ ایضاً۔ ص ۸
۱۰۔ محمد حسین آزاد۔ آب حیات۔ ص ۵۱۴۔ شیخ مبارک علی۔ لاہور۔ ت۔ ن
۱۱۔ ڈاکٹر گیان چند۔ صحیفہ لاہور۔ شمارہ ۴۹۔ ص ۶۶
۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ الطاف حسین حالی۔ "یاد گار غالب"۔ ص ۱۱۶' ۱۱۴' ۱۱۹۔ عشرت پبلشنگ ہاؤس۔ لاہور۔ ت۔ ن
۱۵۔ ڈاکٹر گیان چند۔ غالب کے نقاد۔ حوالہ ایضاً۔ ص ۷۵
۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ بحوالہ "تنقید غالب کے سو سال" مرتبہ سید فیاض محمود۔ ۱۱۳' ۱۸۴' ۱۹۱۔ لاہور ۱۹۶۹
۱۹۔ بحوالہ حمید احمد خان۔ صحیفہ۔ حوالہ ایضاً۔ ص ۱۶۰
۲۰۔ ایضاً۔ ص ۱۶۳
۲۱۔ سید فیاض محمود۔ نذیر حمید احمد خان۔ ص ۱۶۶۔ لاہور ۱۹۸۰
۲۲۔ گیان چند۔ غالب کے نقاد۔ حوالہ ایضاً۔ ص ۱۷
۲۳۔ ایضاً۔ ص ۶۸

۲۴۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے لکھا ہے کہ کلام غالب کی تدوین کا کوئی جائزہ قاضی انوار الحق کے نسخہ حمیدیہ (بھوپال) اور نسخہ محمود شیرانی کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا"۔ نذیر غالب۔ ص ۱۵۔ لاہور ۱۹۷۵

۲۵۔ ارمغان غالب۔ ص ۱۶ بمبئی ۱۹۴۴

۲۶۔ بحوالہ "تنقید غالب کے سو سال" مرتبہ فیاض محمود۔ ص ۱۰۷

۲۷۔ شیخ محمد اکرام۔ حکیم فرزانہ۔ ص ۴۳۔ لاہور ۱۹۷۷ (بار دوم)

۲۸۔ نذیر حمید احمد خان۔ ص ۱۶۸۔ حوالہ ایضاً

۲۹ حکیم فرزانہ۔ ص ۱۴۱

۳۰۔ ۳۱۔ حکیم فرزانہ۔ ص ۱۱۱

۳۲۔ ایضاً۔ ص ۱۴۶

۳۳۔ ایضاً۔ ص ۱۴۵

۳۴۔ حکیم فرزانہ۔ ص ۱۵۳

۳۵۔ ۳۶۔ ایضاً۔ ص ۱۶۷، ص ۱۸۶

۳۷۔ حکیم فرزانہ۔ ص ۱۸۳

سید علی عباس جلالپوری

غالب کی جمالیات

غالب کے جمالیاتی شعور کا ذکر کرنے سے پہلے یہ طے کرنا ہو گا کہ حسن کیا ہے؟
ایک دفعہ انگریز فلسفی جی۔ ای۔ مور سے کسی نے پوچھا "خیر کیا ہے؟" تو اس نے بے ساختہ جواب دیا "خیر خیر ہے" اس سوال کا مناسب جواب کہ حسن کیا ہے؟ یہی ہو سکتا تھا کہ "حسن حسن ہے" لیکن سیدھی سادی بات کو سمجھنے میں عموماً وقت پیش آتی ہے اس لیے جمالیات 1۔ سے رجوع کئے بغیر چارہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ حسن و جمال سے زیادہ لطیف شے اس دارفانی میں اور کوئی نہیں لیکن اس پر علمائے جمالیات نے ایسی ایسی سنگلاخ بحثیں کی ہیں کہ ان سے زیادہ بے کیف تحریریں دنیائے علم میں اور کہیں نہیں ملیں گی۔ مزید براں حسن کے مفہوم میں بھی شدید اختلافات رونما ہوئے ہیں جن کا اندازہ مندرجہ ذیل اقوال سے ہو سکتا ہے۔

"حسن وہ مسرت ہے جس نے معروض Obuect کا روپ دھار لیا ہو۔" (سیٹیانا)

"حسن مسرت کا وعدہ ہے۔" (ستاں وال)

"اپالو بلویدیر (ایک مشہور مجسمہ) اس لیے حسین نہیں ہے کہ وہ ہمیں مسرت بخشتا ہے بلکہ وہ مسرت بخشتا ہے کیوں کہ وہ حسین ہے۔" (کولرج)

"حسن جہاں کہیں بھی دکھائی دے اور جس صورت میں دکھائی دے، وہ حسن ازل ہی کا پرتو ہے۔" (فلاطینوس)

"حسن نہ نور ہے اور نہ تاریکی بلکہ ان دونوں کے بین بین ایک جھٹپٹا سا ہے۔" (گیٹے)

"حسن اظہار ہے۔" (کروچے)

"حسن جنسی خواہش کی تخلیق ہے۔" (فرائڈ)

"حسن توافق Harmony ہے۔" (دل ڈیورنٹ)

"حسن وہ ہے جو نیکی کی طرف مائل کر دے۔" (لیوٹالسٹائے)

یہ اقوال عام فہم ہیں لیکن ان کے بین السطور جمالیات کے چند اہم نظریات مخفی ہیں جن میں سے بعض کا ذکر بے محل نہ ہو گا۔

عقلیاتی نظریہ:۔

کانٹ اور اس کے تتبع میں کولرج نے پیش کیا۔ کانٹ کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ جیسا کہ ہیوم نے کہا تھا۔

حسن سے جو آسودگی حاصل ہوتی ہے وہ حیاتی نہیں بلکہ عقلیاتی ہے۔

جذباتی نظریہ:۔

شوپنہائر اور نیٹشے نے پیش کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ حسن سے لطف اندوز ہونے کے لیے اس سے جذباتی لگاؤ کا ترک کرنا ضروری ہے جس میں حسن پایا جاتا ہے۔

اظہاری نظریہ:۔

کروچے کہتا ہے کہ جمالیاتی عمل داخلی ہے اور اظہار ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ تمثالی پیکر (Image) کے صفحہ ذہن پر ابھر آنے سے فنی تخلیق کا عمل مکمل ہو جاتا ہے لہٰذا اظہار ہی حسن ہے۔ فرائڈ جنسی جبلت کے اظہار کو حسن کا خالق سمجھتا ہے۔ ہمارے ہاں اقبال اس اظہاری نظریے کے شارح ہیں۔ ان کے خیال میں فعال انا حسن کی تخلیق کرتی ہے۔

تجرباتی نظریہ:۔

حسن کا تجربہ ہیگل کے خیال میں نظریاتی ہے اور ہماری ذات کے عملی پہلو کے مخالف ہے ہیگل فطرت کو حسین نہیں سمجھتا اور جمالیات کو فنون لطیفہ کا فلسفہ قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حسن خواہ فنی ہو خواہ فطری' وہ ہر حالت میں انسانی ذہن ہی کی پیداوار ہے۔ نتیجہ" وہ فلسفے کو آرٹ پر فائق سمجھتا ہے۔

وجودی نظریہ:۔

اس کا سب سے بڑا شارح سکندریہ کا نو اشراقی فلسفی فلاطینوس تھا۔ وہ کائنات کے تمام مظاہر کو حسن ازل کی تجلی گاہ سمجھتا ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ حسن و جمال خواہ کسی روپ میں ہو' حسن ازل ہی کا عکس ہے۔ ایران کے مشاہیر وجودی شعراء حافظ شیرازی' محمود شبستری' عراقی' رومی' جامی وغیرہ کا جمالیاتی نظریہ نو فلاطونی ہے۔

اخلاقی نظریہ:۔

افلاطون۔ ٹیو ٹالسٹائے اور رسکن نے پیش کیا۔ ان کے خیال میں حسن کو' خواہ وہ موسیقی کے توافق میں ہو یا کسی شخص کے تناسب اعضاء میں' انسان کو نیکی کی طرف مائل کرنا چاہیے۔

ان تمام نظریات کے ماحصل کو مختصر الفاظ میں سمیٹنے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہو گا کہ ان میں سے بعض موضوعی Sulyictnic اور بعض معروضی (Colyctive) ہیں۔ موضوعی نظریہ یہ ہے کہ حسن دیکھنے والے کی نگاہ میں ہوتا ہے اور معروضی نظریہ یہ ہے کہ حسن موضوع یا شاہد سے بے نیاز ہے۔ یاد رہے کہ تمام اظہاری نظریے لازماً موضوعی ہوتے ہیں چنانچہ کروچے' فرائڈ اور اقبال کے خیال میں موضوع خواہ اسے انا کہا جائے یا اس کا وجود جنسی جبلت اور شاہد و سامع میں تسلیم کیا جائے حسن کی تخلیق کرتا ہے۔ ان کے برعکس فلاطینوس اور

کولرج کے نظریات معروضی ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ حسن مستقل بالذات حیثیت رکھتا ہے اور اپنے وجود کے لئے کسی شاہد یا ناظر کا محتاج نہیں ہے۔ اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جمالیاتی قدر کی تصریح کر دی جائے کہ اس سے ہمیں حسن کی تعریف کرنے میں مدد ملے گی۔

افلاطون کے خیال میں اعلیٰ قدریں تین ہیں ـــــ حسن، خیر اور صداقت ـــــ بعض اہل نظر نے اس تقسیم اور تخصیص سے انکار کیا ہے۔ کیٹس کہتا ہے کہ حسن صداقت ہے اور صداقت حسن۔ جرمن مثالیت پسند شیلنگ کا عقیدہ تھا کہ ہماری حس جمال ہی صداقت کبریٰ کا ادراک کرنے میں کامیاب ثابت ہو سکتی ہے۔ کروچے کہتا ہے۔ کہ حسن و جمال کی پرستش کو مذہبی اخلاق یا خیر کا نعم البدل سمجھا جا سکتا ہے۔ فرانسیسی جمالیین حسن کے مقابلے میں خیر اور صداقت کو ناچیز سمجھتے تھے۔ ان میں سے ایک کا قول ہے کہ نیرو نے روم کو آگ لگا کر خاکستر کر دیا تو کیا ہوا۔ سارے شہر کا ایک ہمہ گیر شعلے کی لپیٹ میں آکر بھڑک اٹھنا اشارہ جمیل (Beau Geste) تھا۔ بہر حال فلسفہ اقدار پر بحث کرتے ہوئے کلفورڈ بیرٹ کہتا ہے کہ انسان اپنی طرز زندگی سے مطمئن نہیں ہوتا اور ہمیشہ بہتر و برتر کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ برتر کے حصول کے امکانات ہمیشہ سے موجود رہے ہیں۔ یہی امکانات اس کے دل و دماغ میں احساس قدر کو بیدار کرتے ہیں۔ وہ مثالی صداقت کا خواہاں اس لئے ہے کہ وہ اسے اپنی روزمرہ کی زندگی میں نہیں پا سکتا۔ وہ مثالی خیر کو اس لئے تلاش کرتا ہے کہ اپنے گرد و پیش میں اس سے دو چار نہیں ہوتا اور مثالی حسن کی جستجو اس لئے کرتا ہے کہ اسے زندگی میں کہیں نہیں دیکھ سکتا۔ یہاں سوال پیدا ہو گا کہ:-

قدر کیا ہے؟

اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ قدر اس شے میں ہوتی ہے جس میں کوئی شخص دلچسپی لیتا ہے۔ مثلاً ایک عطار اور ایک شاعر گلاب کے پھول کو دیکھتے ہیں۔ عطار اس میں اس لئے دلچسپی لیتا ہے کہ اس سے عطر کھینچا جا سکتا ہے اور شاعر کو پھول دیکھ کر اپنی محبوبہ کا عارض گلگوں یاد آ جاتا ہے۔ اول الذکر کے لئے پھول میں افادی قدر ہو گی اور ثانی الذکر کے لئے جمالیاتی۔ یا فرض کیجئے کہ برسات کی ایک شام ہے۔ مغربی افق پر بدلیاں چھائی ہوئی ہیں جن میں ڈوبتے سورج کی قرمزی شعاعوں نے آگ لگا دی ہے۔ ایک کسان اپنے ڈھور ڈنگر ہنکاتا ہوا سڑک پر سے گذر رہا ہے لیکن وہ منظر کے اس حسن سے بالکل بے خبر و بے پروا ہے اور اس کی جمالیاتی قدر کا مطلق احساس نہیں رکھتا لیکن ایک مصور ان شعلہ بداماں بدلیوں کے نظارے سے دھک سے رہ جائے گا اور خدا معلوم حسن و جمال کی کیسی کیسی تجلیاں اس کی چشم تصور کے سامنے جھلملانے لگیں گی۔

قدریں دو قسم کی ہیں۔ وسائلی قدریں اور بنیادی قدریں۔ ہمیں بعض اشیاء اس لیے اچھی لگتی ہیں کہ وہ دوسری چیزوں کے حصول میں مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ یہ وسائلی قدر رکھتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص دن رات دولت سمیٹنے میں مصروف رہتا ہے تاکہ دولت کے وسیلے سے وہ حکومت حاصل کر سکے لیکن بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو فی نفسہٖ اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ چیزیں بنیادی قدروں کی حامل ہوتی ہیں۔ اس مفہوم میں حسن، خیر اور صداقت کو بنیادی

قدریں سمجھا جا سکتا ہے کیوں کہ انہیں کسی دوسری شے کے حصول کا وسیلہ نہیں بنایا جا سکتا بلکہ وہ خود اپنی ذات میں ہماری ذوقی آسودگی اور قلبی طمانیت کا باعث ہوتی ہیں قدر کا وجود ان کے خارج میں نہیں بلکہ ان کے بطون میں موجود ہے۔ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ قدر اس وقت منکشف ہوتی ہے جب شاہد یا سامع اس شے میں دلچسپی لے جس میں قدر موجود ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ حسن کی قدر کسی حسین شے میں موجود ہوتی ہے لیکن اس کی نشان دہی کے لئے کسی شاہد یا سامع کا دلچسپی لینا ضروری ہے فلسفے کی زبان میں یہ کہا جائے گا کہ حسن موضوعی بھی ہے اور معروضی بھی۔ لیکن یہی بات ہم دوسری اعلیٰ قدروں کے متعلق بھی کہہ سکتے ہیں اس لیے حسن کی قدر کا تشخص کرنے کے لیے اس کی بنیادی خصوصیت یعنی توافق (Harmony) کو بھی مد نظر رکھنا ہو گا۔ قدماء یونان توافق ہی کو حسن سمجھتے تھے۔ یہ بات بداہتہً "صحیح ہے کہ حسن خواہ کسی شے میں ہو اس شے کے اجزاء ترکیبی میں توافق و تناسب لازماً" موجود ہو گا۔

حسن کے اظہار کی تین صورتیں تسلیم کی گئی ہیں ---- صوفیہ حسن ازل کو چوتھی صورت قرار دیتے ہیں ---- فطری مناظر کا حسن۔ حسن نسوانی اور حسن ادا یا اسلوب فن کا حسن۔ آسمان پر ادھر ادھر پھیلی ہوئی بدلیوں کو کوئی نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا لیکن جب چاند کی کرنیں ان میں روشنی اور سائے کا توافق پیدا کر دیتی ہیں تو منتشر بدلیاں ایک خوبصورت منظر کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور ان میں حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ عورت کے حسن کی بھی یہی کیفیت ہے۔ ایک حسینہ کے چہرے کے نقوش اور اس کے پر شباب بدن کے دلاویز خطوط اور زاویوں میں توافق موجود ہوتا ہے۔ بعض لڑکیوں کے خدوخال موزوں ہوتے ہیں لیکن اعضاء میں گدراہٹ اور گداختگی کے نہ ہونے کے باعث ان میں کسی چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ یہ کمی توافق ہی کی ہوتی ہے۔ اصول فن کا یہی حال ہے۔ تصویر خواہ کتنے ہی بدصورت شخص کی ہو، اس کے خطوط اور رنگوں میں توافق ہو گا تو ہم اسے حسین کہنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ معروض کے توافق ترکیبی کے ساتھ دیکھنے والے کے ذہن و قلب میں بھی توافق کا ہونا ضروری ہے ورنہ دونوں میں ذوقی اور باطنی ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکے گی۔ چنانچہ قدرت کے کسی منظر یا فن کے کسی اعلیٰ شاہکار یا عورت کے حسن و جمال سے کماحقہ محظوظ اور بہرہ یاب ہونے کے لیے ضروری ہے کہ دیکھنے والے کے اپنے ذہن و قلب میں بھی توافق ہو۔ اس حقیقت کے پیش ہم کہہ سکتے ہیں کہ موضوع کے توافق قلب و نظر اور معروض کے توافل ترکیبی کے درمیان ربط و اتحاد کا نام حسن ہے۔

مرزا غالب کا تصور حسن موضوع اور معروض کے لطیف امتزاج اور باہمی تاثیر و تاثر سے جنم لیتا ہے۔ بام گارٹن کی تعریف کے پیش نظر جمالیات صداقت سے بحث نہیں کرتی بلکہ حسی تاثرات کی توضیح و ترجمانی کرتی ہے، چنانچہ اسی پہلو سے کسی شاعر کے جمالیاتی شعور و احساس سے بحث کی جا سکتی ہے۔ غالب کے یہاں حسن اور عشق ایک دوسرے سے بے نیاز مستقل بالذات وجود نہیں رکھتے بلکہ باہمدگر اس طرح وابستہ ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا کر کے ان کا مطالعہ نہیں کیا جا سکتا حسن، عشق کا زائیدہ ہے اور عشق، حسن کا پروردہ ہے فلسفے کی زبان میں حسن کی تعریف کرتے ہوئے ہم نے کہا تھا کہ موضوع کے توافق قلب و نظر اور معروض کے توافق ترکیبی

میں ربط و اتحاد کا نام حسن ہے جب ہم شعرو شاعری کے حوالے سے حسن کی تعریف کریں گے تو موضوع اور معروض کا یہ فرق باقی نہیں رہے گا۔ عشق کو موضوع اور حسن کو معروض سمجھنا تکلف بے جا ہو گا۔ شاعری کی دنیا میں عشق اور حسن مل کروہ اکائی بناتے ہیں جو فارسی شاعری کا اساسی جمالیاتی تصور اور غالب کی جمالیات کا مرکزی نقطہ ہے۔ حسن و عشق کے ربط باہم سے جو اکائی بنتی ہے' غالب نے اس کی ترجمانی جا بجا کی ہے۔

جلوہ کن منت منہ از ذرہ کمترنیستم
حسن با ایں تابناکی آفتابی بیش نیست

نازم فروغ بادہ زعکس جمال دوست
گوئی فشردہ اند بجام آفتاب را

سچ کہتے ہو خود بین و خود آراہوں نہ کیوں ہوں
بیٹھا ہے بت آئینہ سیما مرے آگے

تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق
آئینہ بانداز گل آغوش کشا ہے

اچھا ہے سر انگشت حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

کرے ہے بادہ تیرے لب سے کسب رنگ فروغ
خط پیالہ سراسر نگاہ گلچیں ہے

دل سے مٹنا سر انگشت حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

غالب کو بدیہہ گوئی' رفعت تخیل اور ندرت ادا کی روایت عرفی' نظیری' کلیم' طالب آملی' صائب اور ظہوری سے ورثے میں ملی تھی جو بابا فغانی کے مکتب شعر سے تعلق رکھتے تھے۔ غالب نے ان کے اسالیب کو کورانہ تقلید نہیں بلکہ ان میں ایسی ایسی نادر جدتیں پیدا کیں کہ بعض پہلوؤں سے غالب کی منفرد امتیازی حیثیت قائم ہو

گئی۔ وہ خود بھی ان شعراء سے کسب فیض کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں۔ کلیات فارسی کی تقریظ میں لکھتے ہیں:۔

"شیخ علی حزیں بخندہ زیرلبی پیراہہ روی ہائے مرا ور نظرم جلوہ گر ساخت۔ وزہر نگاہ طالب آملی و برقی چشم عرفی شیرازی مادہ آں ہرزہ جنبش ناروا درپائے من بسوخت۔ ظہوری بسرگری گیرائی نفس حرزی بازوی و توشہ برکرم بست و نظیری لا ابالی خرام بنجار خامہ خود بچالش آو۔ واکنوں بہ من فرۂ پرورش آموختگی ایں گروہ فرشتہ شکوہ کلک رقاص من بخرام تدروست و برامش مویسقار بجلوہ طاؤس است و بہ پرواز عنقا۔"

غزلیات میں جابجا ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔

'اندریں شیوہ گفتار کہ داری غالب گر ترقی نکنم شیخ علی رامائے

غالب زہند نیست نوائی کہ مے کشم گوئی زاصفہان دہرات و قمیم ما

کیفیت عرفی طلب از طینت غالب جام دگراں بادۂ شیراز ندارد

زلہ بردار ظہوری باش غالب بحث چیست در سخن درویش باید نہ دکاں دارے

غالب از آب و ہوائے ہند بسمل گشت نطق خیز خود رابہ اصفاہاں و شیراز افگنم

ہمارے زمانے کے بعض ناقدین کا شیوہ ہے کہ وہ انگریزی ادب سے اخذ کئے ہوئے جدید ترین ادھ کچرے نظریات کو کھینچ تان کر غالب کی شاعری پر منطبق کرتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ فارسی شاعری کی اس روایت سے ناواقف ہوتے ہیں جس کے آخری عظیم ترجمان مرزا غالب تھے۔ غالب کی شاعری کا مطالعہ اس روایت سے ہٹ کر کیا جائے گا تو ان کی شاعری سے انصاف نہیں کیا جاسکے گا اور ان کا اصل مقام مجروح ہو جائے گا۔

شاعری میں بالعموم اور فارسی شاعری میں بالخصوص حسن کے اظہار و ترجمانی کے چار نمایاں پہلو سامنے آتے ہیں۔ حسن ازل، قدرتی مناظر کا حسن، حسن نسوانی اور حسن ادا۔ ہم غالب کے کلام میں ان چار پہلوؤں کا مطالعہ فارسی شاعری کی روایات کی نسبت سے کریں گے جس سے ان کے جمالیاتی شعور کے ادراک میں مدد ملے گی۔

حسن ازل:۔

سب سے پہلے افلاطون نے وجود مطلق کو حسن ازل کہا تھا۔ نو اشراقیت کے مشہور شارح فلاطینوس نے

اس تصور کو آگے بڑھایا اور اس پر اپنے فلسفے کی بنیاد رکھی۔ مامون الرشید کے عہد میں فلسفے کی جو کتابیں سریانی سے عربی میں منتقل کی گئیں' ان کی الہیات اساسی طور پر نو اشراقی ہی تھی۔ حکمائے اسلام فارابی' اخوان الصفا اور ابن سینا اسی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابن سینا نے کہا کہ اشیاء اپنی تکمیل کے لئے ہمہ وقت کوشاں رہتی ہیں۔ حسن ازل کی اس کشش کا نام عشق ہے۔ ایران کے صوفی شعراء نے اسے عشق کا نام دیا اور وجود مطلق یا حسن ازل کو شاہد حقیقی اور محبوب ازلی کہنے لگے جس کے جلوے کائنات میں ہر کہیں طاری و ساری ہیں۔ بقول شیخ عطار۔

تاب در زلف و وسمہ درابرو   سرمہ در چشم و غازہ بر رخسار
رنگ در آب .و آب دریا قوت   بوئے ور مشک و مشک در تاتار

زمانے کے گذرنے کے ساتھ یہ روایت فارسی شاعری کے مہمات میں شمار ہونے لگی۔

حافظ شیرازی:۔

اگر برقع براگفندی ازاں روے جومہ روزی   مدام از نرگس مستش جہاں پر شور و شر بودے

عرفی:۔

براگفن پردہ تا معلوم گردد   کہ یاراں دیگرے رای پرستد

نظیری:۔

یک چراغ است دریں خانہ واز پر تو آں   ہر کجای نگری انجمنے ساختہ اند

صائب:۔

تو بصد آئینہ از دیدن خود سیرنہ   من بہ دو چشم ز دیدار تو چوں سیر شوم

غالب وحدت الوجود پر محکم عقیدہ رکھتے تھے۔

عالم کہ تو چیزو دیگرش میدانی   ذاتے ست بسیط و منبسط دیگر ہیچ

فارسی کے وجودی شعراء کی طرح وہ بھی وجود مطلق کو شاہد حقیقی مانتے ہیں جس کے جمال جہاں آراء کی تجلیاں کائنات کے گوشے گوشے کو منور کئے ہوئے ہیں۔ اس مضمون کو وہ نئے نئے پیرایوں میں ادا کرتے ہیں۔

گرنہ مشتاق عرض دستگاہ حسن خویش   جاں فدایت دیدہ رابہر چہ بینا کردہٗ

جب وہ جمال دل فروز' صورت مہر نیم روز   آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

نظارہ کیا حریف ہو اس برق حسن کا — جوش بہار، جلوے کو جس کے نقاب ہے

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں — ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

ہر ذرہ محو جلوۂ حسن یگانہ ایست — گوئی طلسم شش جہت آئینہ خانہ ایست

بچوراۓ کہ بہ مستی زدل آید بیروں — در بہاراں ہمہ بوئیت زمبای آید

ہے وہی بد مستی ہر ذرہ کا خود عذر خواہ — جس کے جلوے سے زمین تا آسمان سرشار ہے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے — پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھاۓ نہ بنے

اس نوع کے اشعار میں جہاں کہیں مجاز کا رنگ شامل ہو گیا ہے اس نے لطف و ذوق کو دوبالا کر دیا ہے۔

سوز و زبسکہ تاب جمالش نقاب را — داغم کہ درمیاں نہ پسند و حجاب را

مرزا حقیقت پسند ہیں کہتے ہیں کہ جن اشخاص کی رسائی عالم معنی تک نہیں ہو سکتی، وہ حسن کے ظواہر سے ہی متمتع ہو سکتے ہیں:

گر معنی نزی جلوۂ صورت چہ کمست — خم زلف و شکن طرف کلاہے دریاب

قدرتی مناظر کا حسن:۔

فارسی کے مثنوی نگار اور قصیدہ گو شاعروں نے خوبصورت قدرتی مناظر پیش کئے۔ غزل کی ہیت منظر نگاری کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے قدرتی مناظر کی وصف نگاری عام طور پر معاملات حسن و عشق کے عنوان سے کی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اقوام عالم میں جاپانی اور ایرانی سب سے زیادہ پھولوں سے پیار کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ذکر سے ان کی شاعری کا دامن رشک جناں ہے فارسی شاعروں نے لالہ و گل کے پیرایے میں معاملات حسن و عشق اس خوبی سے بیان کئے ہیں کہ عالمی شاعری میں اس کی مثال مشکل سے ملے گی جستہ جستہ اشعار درج ذیل ہیں:

حافظ شیرازی

غرور حسن اجازت مگر ندا داۓ گل — کہ پرسشے نکنی عندلیب شیدا را

دوش باداز سر کویت بگلستان بگذشت　　　اے گل ایں چاک گریبان تو بے چیزے نیست

آذر بیکدلی:

گراں کروند گوش گل پس آنگاہ　　　بہ بلبل رخصت فریاد واند

عاشق اصفہانی:

فغاں کہ دامن گل می برند اہل ہوس　　　زگلشنے کہ مرا رخصت تماشا نیست

نظیری:

ہمہ شب برلب و رخسار و گیسوی زنم بوسہ　　　گل و نسرین و سنبل را صبا ور خرمن است امشب

لف و نشر مرتب کی اس سے بہتر اور لطیف تر مثال راقم کی نظر سے نہیں گذری۔ شاعر کہتا ہے کہ میں رات بھر اپنی محبوبہ کے ہونٹ' رخسار اور گیسو چومتا رہا جیسے ہوا گلاب' نسرین اور سنبل کے پھولوں اور پودوں میں گھس گئی ہو۔

صائب

می دہد رخنہ دیوار زگلزار خبر　　　لطف اندام تو از چاک گریباں پیداست

جس طرح باغ کی دیوار کے شگاف میں سے کھلے ہوئے پھول دکھائی دیتے ہیں اسی طرح اے حسینہ تیرے چاک گریباں میں سے تیرے بدن کی لطافت جھلک رہی ہے

بابا فغانی:

تو اے گل بعد ازیں باہر کہ می خواہد دلت بنشیں　　　کہ من چوں لالہ باداغ جفایت زیں چمن رفتم

فضلی جرفادقانی:

یاد آں گلشن کہ گل ہر چند می چیدم ازو　　　وقت بیروں آمدن حسرت بداماں داشتم

انیسی طوسی:

بعمر خویش نگردیدہ ام بگرد گلے　　　ہمیں ز چک قفس دیدہ ام گلستاں را

طالب آملی:

زغارت چمنت بر بہار منت ہاست   کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

تیرے پھول توڑنے سے بہار تیری ممنون احسان ہے کیوں کہ پھول تیرے ہاتھ میں شاخ کی بہ نسبت زیادہ ترو تازہ دکھائی دیتا ہے۔

گریہ ام گر سبب خندۂ او شاچہ عجب   ابر ہر چند کہ گرید رخ گلشن خندد

میرے رونے پر وہ ہنستا ہے۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کیوں کہ بادل روتا ہے تو پھول مسکراتے ہیں۔

ادیب پیشاوری:

چناں نہفتم در سینہ داغ لالہ رخے   کہ شد چو غنچہ لبالب زخون دل جگرم

محمد قلی سلیم:

نو بہار است و چمن بر سر سامان گل است   ابر بر روئے ہوا دود چراغان گل است

شاعر نے باغ پر منڈلاتے ہوئے بادل کو چراغان گل کا دھواں کہا ہے۔

کلیم:۔

شیرنی تبسم ہر غنچہ رامپرس   در شیر صبح خندۂ گلہا شکر گذاشت

غنچہ کی مسکراہٹ کی شیرنی کا کیا ذکر کروں۔ صبح کے دودھ میں پھولوں کی ہنسی نے شکر گھول دی ہے۔

بیدل:۔

ماہم از گلشن دیدار گلے می چیدیم   ہر کجا آئینہ بینید مرا یاد کنید

نا معلوم:۔

صد باغ و بہارست و صلائے گل و گلشن   گر سنبل یک باغ نچیدیم نچیدیم

مرزا غالب کے یہاں قدرتی مناظر کی وصف نگاری دو طرح سے کی گئی ہے۔ منظر کشی اور مناظر کے پیرائے میں معاملات حسن و عشق کی نگارش۔ ان کے ایک قصید کے اشعار ہیں۔

سازیک ذرہ نہیں فیض چمن سے بیکار   سایہ لالہ بے داغ سویدائے بہار
مستی باد صبا سے ہے بعرض سبزہ   ریزہ شیشہ مے جوہر تیغ کہسار
سبز ہے جام زمرد کی طرح داغ پلنگ   تازہ ہے ریشہ نارنج صفت روئے شرار
مستی ابر سے گلچین طرب ہے حسرت   کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار
کوہ و صحرا ہمہ معموری شوق بلبل   راہ خوابیدہ ہوئی خندہ گل سے بیدار

ان اشعار میں دوراز کار استعاروں نے منظر کا حسن مجروح کر دیا ہے۔ ایک اور قصیدے میں طلوع آفتاب کا منظر بڑا دلاویز ہے:۔

بہ ہجوم دروازہ خاور کھلا   مہر عالمتاب کو منظر کھلا
خسرو انجم کے آیا صرف میں   شب کو تھا گنجینہ گوہر کھلا

وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود   صبح کو راز مہ و اختر کھلا
ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ   دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا
سطح گردوں پر پڑا تھا رات کو   موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا
صبح آیا جانب مشرق نظر   اک نگار آتشی رخ سر کھلا

غزل کے اشعار میں بھی کہیں کہیں قدرتی مناظر کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

سمجھ اس فصل میں کوتاہی نشونما غالب   اگر گل سرو کے قامت پہ پیراہن نہ ہو جائے

کہتے ہیں کہ پھول اس کثرت سے اگیں کہ سرو کو ڈھانپ دیں ورنہ قوت نمو کا قصور ہو گا۔

یہ بینی برگ رز زرگشت و گل کیریت احمر شد   کند پائیز گوئی کیمیا گر باغباناں را

خزاں میں انگور کی بیل کے پتے زرد پڑ جاتے ہیں اور پھولوں کا رنگ گہرا سرخ ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ خزاں نے باغبانوں کو کیمیاگر بنا دیا ہے کہ وہ گل کی سرخ گندھک سے انگور کی بیل کے پتوں کا سونا بنا رہے ہیں۔

دوسری نوع کے اشعار وہ ہیں جن میں گل و لالہ کے حوالے سے معاملہ نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ اور متنوع مضامین ادا کئے ہیں۔

تماشائے گلشن' تماشائے چیدن   بہار آفرینا! گنہگار ہیں ہم

اس میں اپنے گناہوں کی لطیف معذرت پیش کی ہے۔

غارت ناموش نہ ہو گر ہوس زر   کیوں شاہد گل باغ سے بازار میں آئے

شاہد گل کے نام سے شدان بازاری پر چوٹ کی ہے۔

غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو   ہمیں دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

شبنم بہ گل و لالہ نہ خالی ز ادا ہے   داغ دل بے درد نظر گاہ ہے

چو بوئے گل جنون تازیم از مستی چہ ی پرسی   گستن وارو از صدجا عنان اختیارہا

ہجوم گل بگلستان ہلاک شوقم کرو   کہ جاماندہ و جائی تو ہچناں خالیست

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو   یاں رواں مژگان چشم تر سے خون ناب تھا

چمن پر از گل و نسریں و دلربای نے   بدشت فتنہ ازیں گرد بے سوار چہ حظ

باغ شگفتہ تیرا بساط نشاط دل   ابر بہار خمکدہ کس کے دماغ کا

اک نو بہار ناز کوتا کے ہے پھر نگاہ   چہرہ فروغ مے سے گلستان کئے ہوئے 2۔

باندازِ صبوحی چو گلشن ترکتاز آری   پرید نہائے رنگ گل شفق گرد و گلستان را

جب شراب پی کر مستی کی حالت میں تو باغ میں پھول چننے آئے گی تو پھولوں کا رنگ اڑ کر باغ کے لیے شفق بن جائے گا

چمن ساماں بتی دارم کہ دارو وقت گلچیدن   خرامی کز ادائے خویش پر گل کروہ داماں را

"بت چمن ساماں" کی ترکیب بڑی لطیف ہے۔ کہتے ہیں جب ہماری محبوبہ پھول توڑنے آتی ہے تو اس کا خرام ناز اس قدر پھول کھلاتا ہے کہ دامن پھولوں سے بھر جاتا ہے۔ غالب کو یہ مضمون بہت پسند ہے۔

دیکھو تو دل فریبی انداز نقش پا   موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں   خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

مست ورخ کشادہ بہ گلزاری رود   خوں وردل بہار زتاثیر آہ کیست

زیتسیاں کہ سر بسر گل وریحان و سنبلست   طرف چمن نمونہ طرف کلاہ کیست

شکستہ رنگ توازعشق خوش تماشائیست   بہار دہر بہ رنگینی خزان تو نیست

کسی کے عشق میں مبتلا ہو کر تیرے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا ہے جس سے تیرا چہرہ اور زیادہ حسین لگتا ہے۔

رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے

تیرے چہرے کی یہ خزاں موسم بہار سے زیادہ دلکش ہے۔

گلت رانوا نرگست راتماشا   توداری بہارے کہ عالم نہ دارد

تیرا گل (لب) گویا ہے اور تیری نرگس (آنکھ) بینا ہے۔ اس جیسی بہار کہاں آئے گی۔

لالہ و گل دماز طرف مزارش پس مرگ　　تا چہ در دل غالب ہوس روئے تو بود

غالب کے دل میں تیرے دیدار کا اتنا شوق تھا کہ اس کی موت کے بعد اس کے مزار پر لالہ و گل کھل رہے ہیں۔ حسرت اور محرومی کا ذکر کیسے اچھوتے اور لطیف انداز میں کیا ہے۔ اسی پیرائے سے نیا مضمون پیدا کرتے ہیں۔

مردن زراز داری شو قم نجات داو　　صد رنگ لالہ زارز خاکم دمیدہ باد

موت نے مجھے راز عشق کو چھپانے کی کاوش سے آزاد کر دیا ہے۔ خدا کرے میری موت کے بعد میرے مزار پر گل لالہ کھلیں۔

زیں بیش نیست قافلہ رنگ را درنگ　　گل یک قدح بسایہ شمشاد ی زند

قافلہ بہار صرف اتنی دیر تک رکتا ہے کہ پھول شمشاد کے سایہ میں ایک پیالہ پی سکے۔

پر تو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم　　میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

موجہ گل سے چراغاں ہے گذر گاہ خیال　　ہے تصور میں زبس جلوہ نما موج شراب

سطوت سے تیرے جلوۂ حسن غیور کی　　خوں ہے میری نگاہ میں رنگ ادائے گل

نشہ رنگ سے ہے واشد گل　　مست کب بند قبا باندھتے ہیں

ہے رنگ لالہ و گل و نسرین جدا جدا　　ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

عارض گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسد　　جوشش فصل بہاری اشتیاق انگیز ہے

حسن نسوانی:۔

سفید فام اور گندمی رنگ کی اقوام میں حسن نسوانی کا مثالی تصور کم و بیش ایک ہی جیسا ہے البتہ جغرافیائی ماحول کے اختلاف نے تنوعات پیدا کر دیئے ہیں مثلاً سویڈن میں سنہرے بال اور نیلی آنکھیں پسند کی جاتی ہیں ہسپانیہ اور اطالیہ میں سیاہ آنکھیں خوبصورت سمجھی جاتی ہیں۔ فرانسیسی نازک کلائی اور گداز ٹخنے پر مرتے ہیں۔ جرمنی اور ہندوستان میں اثمار شباب اور سرین کے غیر معمولی ابھار کو خوش وضع خیال کیا جاتا ہے عرب موٹی تازی عورت پر جان چھڑکتے ہیں۔ ایرانی کشیدہ قامت نازک اندام حسین پر فریفتہ ہیں۔ اردو شاعری کے اسالیب، تلمیحات، تشبیہات اور استعارے فارسی سے ماخوذ ہیں اس لئے اردو شعراء نے ایرانی حسن نسوانی کی وصف نگاری ہی میں زور قلم صرف کیا ہے اور عربوں اور ہندیوں کے تصور سے چنداں اعتنا نہیں کیا۔ ان کا موازنہ خالی از دلچسپی نہ ہو گا۔

عربی حسن:۔

چہرہ گول۔ آنکھیں سیاہ۔ آنکھوں کی سیاہی بغایت سیاہ اور سفیدی بغایت سفید۔ پلکیں لمبی اور نکیلی۔ ابرو محرابی ہونٹ سرخ شہد آگیں۔ کولھے بوجھل (جسم فربہ۔ فربہی کے باعث شکم اور پشت پر شکنیں پڑی ہوئی۔ بدن کا رنگ چمپئی۔

ہندی حسن:۔

بوٹا سا قد۔ بدن گداز سرس کے پھول کی طرح کومل۔ جلد کا رنگ کنول کے پھول کی مانند زردی مائل۔ آنکھیں مدھ بھری سینے اور سرین کا ابھار نمایاں۔ چال راج ہنس کی۔ آواز کوئل کی۔ اشارہ چشم اور ہاتھوں کی انگلیوں کی حرکات میں لطیف بلاغت۔

ایرانی حسن:۔

کشیدہ قامت، گھنیری تاب دار زلفیں۔ طرہ مشکیں، حد مشکناب۔ کاکل پیچاں۔ قوسی ابرو۔ آہو چشم۔ آنکھیں سخن ساز ان میں شیریں خستگی کی وہ کیفیت جن کے باعث انہیں نرگس بیمار کہا جاتا ہے۔ ساعد چاندی کی طرح سفید و ساق بلوریں۔ کمر معدوم سرین بوجھل۔ (ج کوہ را با تار موئے بستہ آخر چساں) سروقد۔ انار پستاں غنچہ دہن، سمن بر۔ سیب رخسار۔ ایرانی حسینہ کے سراپا میں پورا باغ کھلا ہوا ہے۔

فارسی شعراء بلند قامت، شمشاد قد حسینہ سے پیار کرتے ہیں۔

حافظ شیرازی:۔

غلام نرگس جماش آں سہی سروم   کہ از شراب غرورش بکس نگاہ نیست

—

روز ہا رفت کہ دست من مسکیں نگرفت   ساق شمشاد و قدے ساعد سیم اندامے

—

ایں سرکشی کہ در سر سرو بلند تست   کے با تو دست کوتہ ما در کمر شود

—

رہی معیری:۔

ہوس از سرآں سرو سیمتن تا پای   بہ پای اور چوری ایں لطیفہ از سر گیر

—

صائب:۔

قمریاں پاس غلط کردہ خودی دارند   ورنہ یک سرو دریں باغ بہ اندام تو نیست

غالب کی محبوبہ بھی بلند قامت سرو قد ہے۔

تابم زول بروکافر ادائے بالا بلندے کوتہ قبائے

مرزا غالب نے حسب معمول مضمون آفرینی کا حق ادا کر دیا ہے۔

ترے سر و قامت سے اک قد آدم قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

اے گل زنقش کف پای تودامان ترا گلفشاں کردہ قبا سرو خرامان ترا

تادر آب افتادہ عکس قد دل جویش چشمہ ہچو آئینہ فارغ ازروانیماست

جب سے تیرے قد کا عکس پانی میں پڑا ہے چشمے کا پانی بہتے بہتے رک گیا ہے اور آئینے کی طرح دکھائی دیتا ہے۔

سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر تو اس قد دلکش سے جو گلزار میں آوے

ایک شعر میں حسیناؤں کو قیامت قامت کہا ہے اور نہایت لطیف مضمون پیدا کیا ہے۔

اسد اٹھنا قامتوں کا وقت آرایش لباس نظم میں بالیدن مضمون عالی ہے

فارسی کے استادوں نے حسن سراپا کے مضمون میں نئے نئے پیرائے اختراع کئے ہیں۔

حافظ شیرازی:۔

حیفم آید کہ خرای بہ تماشائے چمن کہ تو خوشترز گل و تازہ تراز نسرینی

صفائی:۔

سرتا قدم آئینہ حسنی و لطافت افسوس کہ در چشم و بت صلح و صفائیست

کمر اصفہانی:۔

ہچہ عضو تو زند بوسہ نداند چہ کند بر سر سفرہ سلطان چو نشیند درویش

یہاں بھی غالب کا انداز بیان نرالا ہے۔

مرجاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تن نازک آغوش . خم حلقہ زنار میں آوے

اندرے ژید نے ایک افسانے میں لکھا ہے۔ مجھے رشک آتا ہے حوض کے پانی کی لہروں پر جو ایک ہی دفعہ میری حسین محبوبہ کے نازک بدن کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہیں۔ ناسخ نے کہا ہے:۔

جب نہانے کو ہوا عریاں وہ پتلا نور کا حوض میں روشن برنگ شمع فوارہ ہوا

فارسی کے شاعروں نے چشم و مژہ کے ذکر میں شگفتہ اور لطیف مضامین پیدا کئے ہیں۔ صائب چشم بیار

کو ظالم مظلوم نما کہتا ہے۔

آن نرگس بیمار عجب ہو شربا یست　　این ظالم مظلوم نما طرفہ بلائیست

فارسی شاعری میں چشم فتاں، چشم غزال، چشم مست، نرگس بیمار کے مضامین کثرت سے ملتے ہیں۔

حافظ شیرازی:-

ہر کس بدید چشم اوگفت　　کو محتسبے کہ مست گیرد

گشت بیمار کہ چوں چشم تو گرد و نرگس　　شیوۂ آں شدش حاصل و بیمار بماند

خواب آں نرگس فتاں تو بے چیزے نیست　　تاب آں زلف پریشانے تو بے چیزے نیست

کمال اسمٰعیل:-

زمستاں راست اندازی ندارد چشم کس ہرگز　　مگر چشمش کہ چوں شد مست ناوک بہتر اندازد

مستی کی حالت میں آدمی صحیح نشانہ نہیں لگا سکتا لیکن اس کی مست آنکھوں کا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھتا ہے۔

کلیم:-

من مست بہ ہشیاری چشم تو ندیدم　　مدہوش ولے باہمہ در گفت و شنیداست

صائب:-

کس زبان چشم خوباں رانمی فہد چومن　　روزگارے ایں غزالاں راشبانی کردہ ام

کوئی شخص حسیناؤں کی آنکھوں کی زبان کو مجھ سے بہتر نہیں سمجھ سکتا کہ میں ایک مدت ان غزالوں کو چراتا رہا ہوں۔

شکر چشم تو کند محتسب شہر کزو　　ہر کجا میکدہ ہست خراب افتادہ ست

محتسب شہر تیری چشم مست کا ممنون احسان ہے کہ اس کے طفیل تمام میکدے ویران ہو گئے ہیں

وحید قزوینی:-

ساقی چناں خوش است کہ گرے کی کند　　پری کند بگردش چشمش پیالہ را

شراب کی کمی ہو تو ساقی اس کی گردش چشم سے پیالہ بھر لیتا ہے۔

عراقی:-

نخستیں بادہ کاندر جام کردند　　زچشم مست ساقی وام کردند

پہلی بار جو شراب پیالے میں انڈیلی گئی وہ ساقی کی چشم مست سے ادھار لی گئی تھی۔

کہیں کہیں نیلی آنکھوں کا ذکر بھی ملتا ہے صائب:۔

دل خراب مرا جور آسماں کم بود — کہ چشم شوخ تو ظالم ہم آسمان گوں شد

لیکن یہ آسمان کی رعایت سے کہا گیا ہے۔ فارسی شعراء چشم سیاہ کے شیدائی ہیں۔ طالب آملی کہتا ہے:۔

بے نیازانہ زار باب کرم می گذرم — چوں سیہ چشمے کہ بر سرمہ فردشاں گذرد

میں ارباب سخا سے اسی بے نیازی سے گذرتا ہوں کہ جس بے نیازی سے ایک سیہ چشم حسینہ سرمہ فروشوں کی دکانوں کے سامنے سے گذر جاتی ہے۔

غالب نے اس مضمون میں نئی نئی لطافتیں پیدا کی ہیں۔

کم نہیں نازش ہمتائی چشم خوباں — تیرا بیمار برا کیا ہے گر اچھا نہ ہو

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو — سرمے سے تیز و شنہ مژگاں کیے ہوئے

چو لعل تست غنچہ اما سخن ندارد — چوں چشم تست نرگس اما حیا ندارد

لیکن مرزا کا اصل رنگ نگاہ ناز کی حشر سامانیوں کے ذکر میں نکھرتا ہے۔ شفائی کہتا ہے:۔

خاطرم از تو تسلی بہ نگاہے نہ شود — چشم لطف از تو باندازۂ حسرت دارم

غالب نگاہ بے محابا کے مشتاق ہیں:۔

یا تغافل برنیا مدطا قتم لیک از ہوس — در تمنائے نگاہ بے محابایم ہنوز

گر قتم کز تغافل طاقت ماباج می گیرد — حریف یک نگاہ بے محابائے تونتواں شد

تکلف بر طرف ہے جانستاں تر لطف بد خوباں — نگاہ بے حجاب ناز تیغ تیز عریاں ہے

نگاہ بے محابا چاہتا ہوں — تغافہائے تمکیں آشنا کیا

بیدل کا مشہور شعر ہے:۔

شوق فسردہ از نگہے تازہ می شود — یک برگ کاہ شعلہ واماندہ عصاست

غالب شعلہ وَ خس سے ایک نیا مضمون پیدا کرتے ہیں:۔

گر نگاہ گرم فرماتی رہی تسلیم ضبط — شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا

فارسی کے ایک استاد نے نگاہ اور تغافل کی رعایت سے ایک نادر مضمون پیدا کیا:۔

جانب من گونہ بیند غیر گو خوش دل مشو ، صد نگہ چوں جمع گردد یک تغافل می شود

میری محبوبہ میری جانب نہیں دیکھتی تو رقیب کو خوش نہیں ہونا چاہئے کیوں کہ سینکڑوں نگاہوں کو جمع کیا جائے تو ایک تغافل بنتا ہے۔

غالب کے اس شعر کا کیا جواب ہے:۔

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی　　وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

نگاہ غلط انداز اور نگاہ دزدیدہ کے مضامین میں بھی مرزا نے نکتہ آفرینی کی ہے:۔

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یا رب دل کے پار　　جو مری کوتاہی قسمت سے مژگاں ہو گئیں

———

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا　　لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

———

جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو　　یہ نگاہ غلط انداز تو سم ہے مجھ کو

مرزا نگاہ ناز سے ارتباط کے لئے نئے نئے عنواں پیدا کر لیتے ہیں:۔

بن گیا تیغ نگاہ یار کا سنگ فساں　　مرحبا میں، کیا مبارک ہے گراں جانی مجھے

———

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جائے　　نگاہ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہئے

لب و دہن، عارض و رخسار، خط و خال اور زلف و گیسو کے حسن کے ذکر میں فارسی کے شاعروں نے بڑی شگفتہ نگاری سے کام لیا ہے حافظ شیرازی اعادۂ شباب کا نسخہ لکھتے ہیں:۔

گفتم زلعل نوش لباں پیر راچہ سود　　گفتہ بہ بوسہ شکر ینش جواں کنند

———

شاہداں از آتش رخسار رنگیں، و مبدم　　زاہداں رارخنہ ہا اندر دل دیں کردہ اند

———

نہ بوسہ نہ شکر خندہ نہ دشنامے　　بہ ہیچ وجہ مرا روزی از دہانے تونیست

اہل مغرب دہن فراخ کو پسند کرتے ہیں۔ ایرانی پستہ دہن اور غنچہ دہن پر مرتے ہیں۔ اس سے کلیم نے ایک اچھوتا مضمون پیدا کیا ہے۔

در گلستاں بہ یاد دہان تو غنچہ را　　امسال باغباں ہمہ ناشگفتہ چیدہ بود

اس سال باغباں نے تیرے دہن کی یاد میں تمام کلیوں کو کھلنے سے پہلے چن لیا۔

ظہوری نے ایک شعر میں دہن فراخ کا بھی ذکر کیا ہے:۔

عیب دہن فراخ اونیست جزازیں　　کز حسرت اودل جہانے شدہ تنگ

اس کے دہن فراخ میں کوئی عیب ہے تو یہی ہے کہ اس کی حسرت میں دنیا والوں کا دل تنگ ہے۔ فراخ

دیوانہ منم سلسلہ درپائے تواز چیست

تیزی زلف تیرے پاؤں پر لوٹ رہی ہے۔ دیوانہ تو میں ہوں' تیرے پاؤں میں زنجیر کیوں ڈال دی گئی ہے۔

غالب نے اس مضمون میں بھی ندرت و اجتہاد کا ثبوت دیا ہے:۔

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے — تمہارے آئیوائے طرہ ہائے خم بہ خم آگے

خط عارض سے لکھا ہے زلف کو الفت نے عہد — یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

ابھی آتی ہے بوبالش سے اسکی زلف مشکیں کی — ہماری دید کو خواب زلیخا عار بستر ہے

پڑا رہ اے دل وابستہ بیتابی سے کیا حاصل — مگر پھر تاب زلف پر شکن کی آزمائش ہے

چہرے پر بکھرے ہوئے گیسو نقاب کا کام بھی دیتے ہیں۔

از زلف پر خم مشکیں نقاب — از تابش تن زریں ردائے

غالب کے جمالیاتی احساس کی لطافت ملاحظہ ہو کہتے ہیں کہ محبوبہ نے زلف مشکیں کا نقاب اوڑھ رکھا ہے اور اس کے بدن کی تابناکی سے اس کا لباس سنہرا سنہرا لگتا ہے۔

تو اور آرائش خم کاکل — میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

زلف کی رعایت سے دراز کا لفظ لائے ہیں اور اندیشہ اس بات کا ہے کہ خدا جانے یہ آرائش کس کے لیے کی جا رہی ہے۔

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں — جس کے شانوں پر تیری زلفیں پریشاں ہو گئیں

غالب بادہوائی قسم کے عاشق نہیں ہیں۔ ان کی حسرتیں اور تمنائیں صحت مند قسم کی ہیں۔

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس — زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے

کہتے ہو تم سب کو بت غالیہ مو آئے — اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے

بلایت چہرہ با مشکینہ مویاں — ادایت چہرہ بر نازک میانان

شانہ برائے طرہ سیاہ کشیدن — قیمت کا لائے مشکناب شکستن

فارسی شاعروں نے حسین عورت کے اعضاء کی توصیف میں تفصیل نگاری سے کام لیا ہے۔ اور ان اعضاء سے بھی صرف نظر نہیں کیا جن کا ذکر عام طور سے معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ہم نے اس نوع کے اشعار کو قلم

زد کر دیا ہے۔ کیونکہ مرزا غالب نے بھی ان سے اعتنا نہیں کیا مثال کے طور پر اشمار شباب سے متعلق شیخ سعدی کا ایک شعر ہے:۔

پستان یار درخم گیسوئے تابدار چوں گوئی عاج در خم چوگان آبنوس

حسینہ کی زلف سیہ و بر پیچ اس کے سینے کا حلقہ کئے ہوئے ہے گویا ہاتھی دانت کی گیندیں آبنوس کے چوگان کے حلقے میں آگئی ہوں اس تفصیل نگاری کے باوجود فارسی شاعروں کا تصور حسن نقوش کی موزونی، تناسب اعضاء بدن کی گدراہٹ اور جسمانی زاویوں کی رعنائی تک محدود نہیں تھا۔ ان سب کے ساتھ وہ ناز و ادا اور عشوہ و غمزہ کو لازمہ حسن و جمال سمجھتے تھے اور جو حسینہ ناز و ادا سے عاری ہوتی اسے بت بے جان مانتے تھے۔ عرفی کہتا ہے:۔

زبت نہ گوشہ چشمے نہ چین ابروئے بحیرتم کہ دل برہمن زکف چوں شد

فارسی میں حسینہ اور معشوقہ کو بت کہتے ہیں۔ لفظ بت لفظ بدھ کی بدلی ہوئی صورت ہے' اشوک کے زمانے میں خراسان میں مہایانا بدھ مت کی اشاعت ہوئی۔ ہندومت کے زیر اثر مہایانا فرقے کے بدھ اپنے گرو کے بت تراشنے لگے تھے۔ وادی بامیان (افغانستان) میں آج بھی اس زمانے کے بت موجود ہیں۔ بتوں کو اس خوبی سے تراشا جاتا تھا کہ اعضاء کا تناسب اور بدن کے خطوط کی لطافت بخوبی ابھر آتی تھی۔ بدھ کا لفظ بت کی صورت میں فارسی زبان میں داخل ہوا تو جسمانی زاویوں کی رعنائی کے باعث حسینہ و معشوقہ کو بھی بت کہنے لگے۔ عرفی اس شعر میں کہتا ہے کہ میں حیران ہوں کہ برہمن کیوں بت پر فریفتہ ہے کہ بت نہ آنکھ سے اشارہ کر سکتا ہے نہ ابرو سے۔ مطلب یہ ہے کہ جس حسینہ میں شوخی و ادا نہ ہو وہ محض پتھر کی مورتی ہے۔ حافظ شیرازی:۔

لطیفہ ایست نہانی کہ عشق از وخیزد کہ نام آن نہ لب لعل و خط زنگاریست

یعنی کسی حسینہ کی کشش کا راز اس کے حسن کی ایک پر اسرار کیفیت میں ہوتا ہے جو ظاہری خط و خال کی محتاج نہیں ہوتی۔ آج کل کی زبان میں اس لطیفہ نہانی کو Glamoor کہا جاتا ہے۔ ہر حسین عورت اس سے بہرہ یاب نہیں ہوتی۔ بعض عورتیں جو معمولی شکل و صورت کی ہوتی ہیں اس لطیفہ نہانی کے طفیل "فتنہ شہر ہمہ ان" بن جاتی ہیں۔ حافظ نے ایک شعر میں اسے نکتہ کہا ہے:۔

بس نکتہ غیر حسن بہ باید کہ تا کسے مقبول طبع مردم صاحب نظر شود

دوسرے شعر میں اسے "آن" کا نام دیا ہے:۔

شاہد آن نیست کہ موئے ومیانے دارد بندہ طلعت آں باش کہ آنے دارد

نظیری:۔

مشاطہ رانگو کہ براسباب حسن را چیزے فزوں کند کہ تماشا بمارسید

اس ضمن میں فغانی کا ایک شعر خوب ہے اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے:۔

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

وصال شیرازی اس پر اسرار کیفیت کو "معنی زیبا" کہتا ہے:۔

روئے زیبا ہمہ دارند چرا دل نہ برند دلبری ہائے تو از معنی زیباست ترا

ناز و نیاز اور عشوہ و غمزہ کے بیان میں فارسی شاعروں نے جادو جگائے ہیں۔

اصلی قمی کے خیال میں عاشق کا نیاز معشوق میں ناز آفرینی کا باعث ہوتا ہے:۔

نیاز عاشقاں معشوق را برنازی دارد تو سرتا پا وفا بودی ترا من بے وفا کردم

عرفی بڑے اچھوتے انداز میں اپنی محبوبہ کی اداؤں کے تنوع اور مزاج کے تلون کا ذکر کرتا ہے:۔

ازاں بدرو دگر ہر زماں گرفتارم کہ شیوہ ہائے ترا باہم آشنائی نیست

سعدی محبوبہ کے خرام کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں:۔

رفتن بہ چہ ماند؟ بخرا میدن طاؤس برگشتن ودیدن بہ چہ؟ آہوئے رمیدہ

حافظ کی محبوبہ اس قدر نازک مزاج ہے کہ انہیں آہستہ دعا کرنے کا بھی حوصلہ نہیں رہا:۔

من چہ ی گویم کہ ترا ناز کی طبع لطیف تابحدیست کہ آہستہ دعا نتواں کرد

عرفی کے خیال میں محبوبہ اپنے حسن و جمال کی نمائش پر مجبور ہے:۔

حسنش نیاز مند تماشا ز ناز نیست اناز ذوق جلوۂ خود بے نیاز نیست

ایک اور شعر میں ناز و ادا کی نئی توجیہہ کرتا ہے:۔

حسن را از شیوہ ہا گاہے بود میلے بناز ورنہ موئی بے طلب صید راہ تماشا کردہ بود

امیر خسرو کہتے ہیں کہ محبوبہ کا نظارہ ہی قاتل تھا اس پر ناز و ادا نے اور قیامت برپا کر دی:۔

جاں ز نظارہ خراب و ناز اور زاندازہ بیش مابہ بوئی مست و ساقی پردہد پیانہ را

غالب بھی معشوق شوخ کے طالب ہیں:۔

ہے وصل ہجر عالم تمکین و ضبط میں معشوق شوخ و عاشق دیوانہ چاہئے

ایک حسینہ کی شوخی گفتار دیوار کی تصویروں میں بھی زندگی کی حرارت دوڑا دیتی ہے۔

جس بزم میں تو ناز گفتار میں آوے جاں کا لبد صورت دیوار میں آوے

محبوبہ کے خندۂ ناز آفریں کے سامنے جمیت خاطر کا دعویٰ مضحکہ خیز ہے:۔

عرض ناز شوخی دنداں برائے خندہ ہے دعوئی جمیت احباب جائے خندہ ہے

ناز و کرشمہ بے پناہ سہی لیکن عاشق کا جوش نگاہ انہیں بھی ضیق میں ڈال دیتا ہے:۔

حسن تو در حجاب ز شرم نگاہ کیست جابر کرشمہ تنگ ز جوش نگاہ کیست

غالب کو اس بات کا قلق ہے کہ میں جو حسیناؤں کے ناز اٹھانے کا حوصلہ رکھتا تھا حوادث زمانہ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

لکد کوب حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی مری طاقت کو ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

"ہتان ہزار شیوہ" کا ایک نہایت ہلاکت آفریں شیوہ یہ بھی ہے کہ اپنے عشاق کے سامنے لگاوٹ کے انداز میں آنسو بہانا شروع کر دیتی ہیں۔ حسیناؤں کے دو حربے بے پناہ ہیں مسکراہٹ اور آنسو۔ بعض سخت جان ممکن ہے مسکراہٹ کے وار جھیل جائیں لیکن نکیلی پلکوں پر لرزتے ہوئے اور آتش رخسار میں بجھتے ہوئے آنسوؤں کے سامنے بڑے بڑے جبابرہ سجدہ ریز ہو جاتے ہیں:-

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا ۔۔۔ تری طرح کوئی تیغ نگاہ کو آب تو دے

محبوبہ کی نزاکت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا ۔۔۔ ہاتھ آویں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا ۔۔۔ کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا ۔۔۔ رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو ۔۔۔ ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

غالب کہتے ہیں کہ تغافل کے عالم میں ایک حسینہ کی کافر سامانیاں زیادہ جرات آزما ہوتی ہیں:-

سادگی و پرکاری بے خودی و ہشیاری ۔۔۔ حسن کو تغافل میں جرات آزما پایا

غالب محبوبہ کے ناز و ادا کو اپنے عشق پر منحصر مانتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان کی موت پر ناز و ادا کا بازار سرد پڑ جائے گا:-

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد ۔۔۔ بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

منصب شیفتگی کے کوئی بھی قابل نہ رہا ۔۔۔ ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد

فارسی کے کسی استاد کا شعر ہے:-

باچنیں چہرہ کہ امروز تو آراستہ ۔۔۔ ہر کہ آئینہ بدست تو دہد دشمن تست

مشاطہ نے آج تیرا چہرہ کچھ اس طرح آراستہ کیا ہے کہ جو شخص تیرے ہاتھ میں آئینہ دے گا وہ تیرا دشمن ہوگا۔ مرزا غالب پیرایہ بدل کر کہتے ہیں۔

دشنہ غمزہ جانستاں ناوک ناز بے پناہ ۔۔۔ تیرا ہی عکس رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

حسن ادا:-

حسن ادا اسلوب بیان کی خوبصورتی کی مثال ارسطو نے یہ دی ہے کہ گرگٹ ایک کریہہ المنظر جانور ہے لیکن جب کوئی مصور اس کی ایسی تصویر کھینچ دے کہ جو اس کا نقش سامنے آجائے تو وہ تصویر حسین کہلائے گی اور یہ حسن تکنیک یا اسلوب کا ہوگا۔ حسن ادا کی مزید مثالیں غالب کے کلام سے دینا تکلف بے جا ہے کیونکہ اشعار

گذشتہ صفحات میں نقل کئے گئے ہیں وہ حسن ادا کے بھی بہترین نمونے سمجھے جا سکتے ہیں۔ اس خصوصیت میں مرزا غالب تمام اردو شعراء میں ممتاز ہیں اور فغانی کے مکتب شعر سے تعلق رکھنے والے شعروں عرفی، نظیری، صائب، کلیم طالب وغیرہ کے برابر کے شریک ہیں۔ ہم مرزا کے کلام سے جستہ جستہ مثالیں دینے پر اکتفا کریں گے۔

محبوب کے محض دیکھ لینے سے چاہنے والے کی تسکین نہیں ہو سکتی کیونکہ عاشق لمس کا آرزو مند ہوتا ہے۔

تکلف بر طرف لب تشنہ بوس و کنار ستم — ز راہم باز چیں دام نوازش ہائے پنہاں کا

اپنی محبوبہ کے حسن کا تقابل حسن ازل سے اس طرح کیا ہے۔

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا — رو برو کوئی بت آئینہ سیما نہ ہوا

"بت آئینہ سیما" کی لطافت ملاحظہ ہو۔ ذات باری کو بت آئینہ سیما میں اپنی ہی صورت دکھائی دے گی اور دوئی میں یکتائی کا اور یکتائی میں دوئی کا عنصر پیدا ہو جائے گا۔ افلاطون نے خیر مطلق کو حسن کہا تھا۔ غالب نے یہی خیال کس خوبی سے ادا کیا ہے:۔

ہے خیال حسن میں حسن عمل کا سا خیال — خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

وصال میں ہجر کی کیفیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

تو در آغوشی دوست و دلم از کار شدہ — تشنہ بے ولوور من بر سر چاہے دریاب

کہتے ہیں یہ تم نے سنا ہو گا کہ آگ نے جناب ابراہیم علیہ السلام کو نہیں جلایا تھا۔ مجھے دیکھو کہ کس طرح بغیر آگ کے جل رہا ہوں:۔

شنیدہٗ کہ باتش نسوخت ابراہیم — بہ بیں کہ بے شرر و شعلہ ی توانم سوخت

کہتے ہیں میں نے کہا کہ میرے مرنے سے تم ضرور خوش ہو گے۔ جواب ملا نہیں کیوں کہ مرنا تیرے لئے آسان ہو گیا ہے:۔

گفتم البتہ زمن شاد بمردن گردے — گفت دشوار کہ مردن بتو آساں شدہ است

اس مضمون کو بڑے لطیف پیرایوں میں ادا کیا ہے:۔

دشوار بودمردن و دشوار ترز مرگ — آنست کہ من میرم و دشوار نداند

نہ از مہرست کز غالب بمردن نیستی راضی — سرت گردم تو میدانی کہ مردن نیست دشوارش

بے تو گر زیستہ ام سختی ایں درد مسنج — بگزر از مرگ کہ وابستہ بہنگای ہست

مرزا کے یہاں سخت کوشی اور العزی کے مضامین کی کمی نہیں ہے۔ انداز بیان ملاحظہ ہو:۔

چہ ذوق رہروی آنراکہ خار خاری نیست — مرو بہ کعبہ اگر راہ ایمنی دارد

بے غم نہاد مرد گرامی نمی شود   زنہار قدر خاطر اندوہ گیں شناس

غم لذتیست خاص کہ طالب بذوق آں   پنہاں نشاط در زور پیدا شور ہلاک

دانش و گنجینہ پنداری یکیست   حق نہاں داو آں چہ پیدا خواستم

من از فریب عمارت گدا شدم ورنہ   ہزار گنج بویرانہ دل افتادہ داشت

شراب نوشی کا اس سے بہتر اور لطیف ترجواز راقم کی نظر سے نہیں گذرا۔

شب تاریک منزل دور و نقش جادہ نا پیدا   ہلاکم جلوۂ برق شرابے گاہ گاہی را

مرزا غالب کا جمالیاتی شعور نہایت شستہ و پختہ ہے جس میں انداز بیان کی لطافت اور شگفتگی نے چار چاند لگا دیئے ہیں۔ مرزا فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ بدیعہ گوئی اور حسن ادا کی روایات انہیں عرفیؔ، نظیریؔ وغیرہ سے ملی تھیں۔ ان روایات کو انہوں نے فارسی کے علاوہ اردو کلام میں بھی نہایت حسن و خوبی سے منتقل کیا ہے۔ فارسی میں وہ بابا فغانی کے اسلوب شعر کے خاتم تھے۔ اردو شاعری میں انہیں اس اسلوب کا فاتح سمجھا جا سکتا ہے۔ اس روایت کی ترجمانی میں بھی ان کا اپنا خاص رنگ ہے جو انہیں عرفیؔ، نظیریؔ، صائب وغیرہ سے ممتاز کرتا ہے۔ انہیں خود بھی اس بات کا احساس تھا:۔

اوجتہ جتہ غالب و من دستہ دستہ ام   عرفی کیست لیک نہ چوں من دریں چہ بحث

حسن لفظ و حسن معنی کا جو لطیف امتزاج ان کی شاعری میں دکھائی دیتا ہے وہ دنیا کے کسی بھی عظیم شاعر کے لئے باعث فخر ہو سکتا ہے۔

حسن لفظ و معینم غالب گواہ ناطق بست
برعیار کامل نفس من و آبائے من

حواشی

۱۔ حسن و جمال کی قدر پر افلاطون نے بحث کا آغاز کیا تھا لیکن Aesthetics (جمالیات کی ترکیب سب سے پہلے بام گارٹن نے 1750ء میں استعمال کی تھی۔ یعنی وہ صنف علم میں منطق کی طرح صداقت سے بحث نہیں کرتی۔ بلکہ حیاتی تاثرات کو معرض بحث میں لاتی ہے ہیگل نے 1830ء میں

ایک مقالہ لکھا جس میں یہ ترکیب متداول مفہوم میں استعمال ہوئی تھی۔ اس کے بعد عام طور سے رواج پا گئی۔

2۔ جدید دور کے شاعروں میں اخگر گونڈوی نے اس مضمون میں دلکش شعر کہے ہیں۔

عارض نازک پہ ان کے رنگ سا کچھ آ گیا ان گلوں کو چھیڑ کر ہم نے گلستان کر دیا

رخ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی شعاعیں کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی

کی رعایت سے تنگ کا لفظ لائے ہیں۔ محاورے نے مزید لطف پیدا کر دیا ہے۔
مرزا دہن اور کمر کے ذکر میں فارسی شاعروں کی طرح غلو سے کام لیتے ہیں۔

دل آشفتگاں خال کنج دہن کے سویدا میں سیر عدم دیکھتے ہیں

یا رب ایں مایہ وجود از عدم آوردۂ تست بوسہ چند ہم از گنج دہانے من آر

اے خدا تو نے وجود کو عدم سے خلق کیا ہے' اس گنج دہن سے جو عدم ہے میرے لئے چند بو سے مقدر کر۔

فریب وعدہ بوس و کنار ،بینی چہ دہن دروغ درروغ و کمر دروغ درروغ

ہے کیا جو کس کے باندھئے میری بلا ڈرے کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

حافظ شیرازی نے کہا ہے:۔

جواب تلخ مے زیبد لب لعل شکر خارا۔

غالب کہتے ہیں:۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب گالیاں کھا کے بد مزا نہ ہوا

فارسی شاعروں نے حسین چہرے کو آفتاب اور ماہتاب سے تشبیہ دی ہے اور آئینہ اور جلوہ کے تقابل سے ندرت پیدا کی ہے۔ ایک استاد کا شعر ہے:۔

تیرۂ بختی آئینہ حیرتے دارم ترا کشید با آغوش و آفتاب شد

آئینہ کی بدنصیبی پر مجھے حیرت ہے کہ تجھے اپنی آغوش میں لیا (تیرا عکس اس میں پڑا) پھر بھی آفتاب نہ بن سکا۔ عرفی کہتا ہے:۔

مدار جلوہ دریغ از و لم کہ خرمن حسن بخوشہ چینی آئینہ کم نے گردد

میرے دل میں اپنے حسن کی تجلیاں پڑنے دو۔ کہ آئینہ کی خوشہ چینی سے خرمن حسن کم نہیں ہوتا۔

یہاں بڑے لطیف پیرائے میں اپنی تعریف بھی کر گیا ہے۔ غالب کہتے ہیں:۔

کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے کرے جو پر تو خورشید عالم شبنمستان کا

نہایت خوبصورت تشبیہ سے کہتے ہیں کہ آئینہ خانہ تیرے جلوے سے روشن ہو گیا ہے جس طرح سورج کی کرنوں سے شبنم کے قطرے جگ مگ جگ مگ کرنے لگتے ہیں:۔

تماشا کر اے محو آئینہ داری تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو ریزش سجدۂ جبین نیاز

دل خوں شدۂ کشمکش حسرت دیدار   آئینہ بدست بت بد مست حنا ہے
خون سے حنا کی رعایت ملاحظہ ہو۔

حسن بے پروا خریدار متاع جلوہ ہے   آئینہ زانوے فکر اختراع جلوہ ہے

ایہامی سیاہ، دراز، گھنیرے، پر پیچ اور معطر بالوں کے فدائی ہیں۔ کلاسیکی عہد میں ایرانی عورتیں سروں پر جعد، کاکل اور طرہ بناتی تھیں جیسا کہ آج کل رواج ہو رہا ہے۔ کنواری لڑکیاں چوٹی کو دو لٹوں میں گوندھ کر کندھوں پر ڈال دیتی تھیں۔ سیاہی اور خوشبو کی رعایت سے شاعروں نے زلف مشکیں۔ غالیہ موکی تراکیب وضع کیں۔ زلف دراز و مسلسل کو زنجیر، بنفشہ، سنبل اور کمند سے تشبیہ دیتے تھے۔ زلف پریشاں سے عشاق کی پریشانی کے مضامین اختراع کرتے تھے۔

فردوسی:۔

بہ پیچیدہ مورا بصد آب و تاب   گرہ کرد شب راپس آفتاب
چوں بکشاد آں طرہ مشکتاب   شب آمد بہ پابوسی آفتاب

چہرے کا استعارہ آفتاب سے کیا ہے اور لطف بیان کا حق ادا کیا ہے۔

حافظ شیرازی:۔

تاب بنفشہ می دہد طرہ مشک سائے تو   پردۂ غنچہ می درد خندۂ دلکشائے تو

علی حزیں:۔

صید از حرم کشد خم جعد بلند تو   فریاد از تطاول مشکیں کمند تو

طراز یزدی:۔

ازاں زلف سیہ مشکل کہ شانم را سحر باشد   مگر زاں چاک پیراہن درے از صبح بکشائی

شب وصال ہے۔ لطف اختلاط کا مضمون ہے۔ کہتا ہے کہ تیری زلف سیہ میری رات کو صبح نہیں ہونے دے گی البتہ تیرے لباس کے چاک سے تیرے بدن کی صباحت در صبح کھول سکتی ہے۔

نخشی طرائی:۔

زلفت زہر دو جانب خونریز عاشقاں است   چیزی نمی تواں گفت روئے تو درمیاں است

محاورے کا استعمال نہیں شگفتہ ہے۔ فغانی خلخالی:۔

افتادہ بپا زلف سمن سائے تواز پیست

ڈاکٹر گیان چند

منفرد شاعر

غالب کا ایک شعر ہے۔

ہم پکاریں اور کھلے، یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

یہ غالب کی انفرادیت ہے کہ وہ بھیڑ کے ساتھ چلنے پر رضامند نہیں۔ انھوں نے ۱۸۷۷ء میں اپنی وفات کا مادۂ تاریخ نکالا لیکن اس سال وباء پھیل گئی اور انھوں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا ایک جگہ کہتے ہیں۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسد
سرگشتہ خمار رسوم و قیود تھا

جو مرنے میں بھی نئی راہ بنانا چاہے وہ زندگی میں کیوں نہ شارع عام سے ہٹ کر چلے گا۔ ان کی ساری زندگی تقلید اور رسوم پرستی کے خلاف جہاد میں گزری کلکتے کا ہنگامہ ہو یا آخری عمر کا برہان قاطع کا معرکہ دونوں کی تہ میں صرف یہی اجتہاد تو تھا کہ انھوں نے فارسی کے مستند ادیبوں اور نعت نگاروں پر آنکھیں بند کر کے ایمان لانے سے انکار کر دیا تھا۔ غالب کی شاعری ان کی زندگی کا عکس ہے جس طرح وہ زندگی میں منفرد رہے اسی طرح ان کی شاعری بھی اپنے دور ہی میں نہیں اپنی صدی میں منفرد ہے غالب کے متعدد اشعار ایسے ہیں جو بیسوئیں صدی سے قبل کی اردو شاعری کی تاریخ میں غالب کے سوا کسی اور شاعر کے قلم سے نہ نکل سکتے تھے۔

اس وقت تک کی اردو غزل جذبے کا چھلکاؤ تھی۔ یہ قول صحیح ہے کہ غالب نے اردو شاعری کو ذہن دیا ایک بار اردو شاعری کی تاریخ میں پہلے شاعر سے لے کر انیسویں صدی کے آخر تک کے شعرا پر نظر دوڑایئے اقبال سے پہلے غالب کے سوا کوئی ایک بھی شاعر ایسا دکھائی دیتا ہے جس کی شاعری میں فکر کا عنصر غالب ہو؟ غالب کی غزل فکر پاروں سے عبارت ہے۔ مجھے ماحول کے جبر پر کڑھن ہوتی ہے۔ غالب کے زمانے میں اردو علوم کا حصار محدود تھا اور غزل کی دنیا تو قبر کی طرح تنگ تھی۔ غالب کو اسی تنگ دائرے میں کاوے کرنے پڑے وہ فریاد کرتا ہے۔

بہ قدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کیلئے

اگر اسے بڑا کینوس میسر ہوتا تو وہ اقبال کی طرح زندگی کے گوناگوں مسائل کی گرہیں کھولتا دکھائی دیتا۔

کوئی [illegible] ہے کہ ۱۹۰۰ء تک کے شعرا میں صرف [illegible] نے غزل کی تنگ دامانی کا شکوہ کیا کسی اور شاعر کو یہ

احساس نہ ہوا۔ وجہ یہ ہے کہ غالب کے پاس اتنا تڑپتا ہوا اتنا عرش پرواز تخیل تھا کہ وہ دو مصرعوں میں سمانے کو تیار نہ تھا۔ غالب نے خیالات کو پکڑ کر زبردستی الفاظ کی جالی میں ٹھونسنا چاہا ہے لیکن اس کوشش میں ایک طرف الفاظ مسکنے کو ہیں تو دوسرے طرف خیالات مچھلی کی طرح تڑپ رہے ہیں باہر کو نکلے جا رہے ہیں غالب نے اس کشاکش کو شیشہ نازک اور صہبائے تند کے استعارے میں ظاہر کیا ہے بار بار کہتے ہیں۔

ہجوم فکر سے دل مثل موج لرزاں ہے
کہ شیشہ نازک و صہبا ہے آبگینہ گداز
ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گراندیشے میں ہے
آبگینہ تندی صہبا سے پگھلا جائے ہے

ان پھیلے ہوئے پریشاں خیالات کو اسیر کرنے کے لیے غالب نے غزل کی زبان بھی غیر معمولی استعمال کی۔ ریختہ انھیں ناکافی معلوم ہوا اس لیے انہوں نے فارسی پر جال پھینکا اور کم از کم ابتدا میں اردو اور فارسی کے درمیان کی کوئی زبان استعمال کی فارسی ترکیبیں، فارسی مصادر، فارسی حروف اور فارسی محاوروں کے تواتر سے بعض مصرعے تو فارسی ترکیبوں کا گلدستہ بن گئے۔

خواہش دل ہے زباں کو سبب گفت و بیاں
ہے سخن، گرد ز دامان ضمیر افشاندہ
کی ہے واہل جہاں نے بہ گلستان جہاں
چشم غفلت نظر شبنم خور نادیدہ

یہ زبان بھی غالب کا انفرادی رنگ ہے اس کی صفائی میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ اتنے وسیع خیالات کو کسی اور طرح غزل کے شعر میں سمانا آسان نہ تھا گویا غالب نے غزل کے ایک ایک شعر سے ایک ایک مختصر نظم کا کام لیا۔

رسوم شکنی، اولیت فکر اور عالمانہ زبان کے بعد غالب کی انفرادیت ان کی سوالیہ ذہنیت ہے۔ وہ کائنات کی حقیقت کے بارے میں غور کرتے ہیں۔ مذاہب اور تصوف کی بیان کردہ توجیہات میں انھیں شبہات پیدا ہوتے ہیں اور وہ دبی زبان سے اس کا اظہار کرتے ہیں۔ مجھے تو ان اضطرابات میں فکر کی معصومی دکھائی دیتی ہے۔

جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزۂ عشوۂ و ادا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں!
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دم سماع
گرہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں
ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب
آخر تو کیا ہے اے "نہیں ہے؟"

انیسویں صدی میں "ڈارون کے نظریات نے ارتقائے ہستی کے تمام پرانے نظریات باطل کر دیئے تھے۔ مذہب کا طلسم شکست ہو کر فلسفیانہ تشکیک رونما ہو رہی تھی۔ غالب بھی اپنے عہد کے عالمگیر رو کا جزو ہیں۔ یہ استفہام و سوال آزادی رائے و حریت فکر کی پہلی سیڑھی ہے۔

غالب کی انفرادیت مسائل ہستی ہی تک محدود نہیں وہ غزل کے روایتی میدان میں بھی اپنا رنگ رکھتے ہیں غزل کے دو اہم ترین کردار واحد متکلم اور محبوب ہوتے ہیں۔ غالب کی غزل میں ان دونوں برگزیدہ ہستیوں کا انداز بقیہ غزل گویوں سے ہٹ کر ہے ان کی غزل کے ہیرو کی خصوصیت ہے شکست قبول نہ کرنا۔ خدا ہو یا ناصح، محبوب ہو یا دربان ہر شخصیت سے وہ مساویانہ مباحثہ کرتے ہیں الجھتے ہیں اور ہر بات پر ترکی بہ ترکی جواب دینا لازمی جانتے ہیں۔

تماشائے گلشن تمنائے چیدن
بہار آفرینا! گنہ گار ہیں ہم
کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر سے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہو کہ ہاں کیوں ہو
واں گیا بھی میں تو اس کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں

یہ کردار بڑا شوخ و ظریف بھی ہے۔

غیر کی مرگ کا غم کس لیے اے غیرت ماہ
ہیں ہوس پیشہ بہت وہ نہ سہی اور سہی
کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

آتش کو چھوڑ کر اس وقت تک کی روایت تو یہی تھی کہ محبوب کے سامنے منمناتے رہیے۔ غالب بڑے گجردار ہیں۔ وہ اپنے حقوق منوانے کے لیے زور زبردستی تک پر اتر آئے ہیں۔

عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر!
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے

جیسی روح ویسے فرشتے جس مزاج کا عاشق ہے اسی پائے کا محبوب بھی ہے۔ شوخ طراز، شعلہ خو۔ کسی کو

منہ سے بات نہیں نکالنے دیتا۔

بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی
ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے
میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھکو اٹھا دیا کہ یوں

مجھے دکھائی نہیں دیتا کہ اس وقت تک کی غزل میں کسی اور شاعر کے یہاں عاشق اور محبوب کی شخصیت زندگی سے بھرپور، گفتار و کردار میں اتنی تیز طرار ہو۔ یہ غالب کا مخصوص رنگ ہے۔

غالب کا رسوم پرست زمانہ ان کے رنگا رنگ اجتہادات کی قدر نہ کر سکا۔ اس لیے وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے۔

میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

انفرادیت و اجتہاد کی اتنی قیمت تو دینی پڑتی ہے

مجنوں گورکھپوری

دیوان غالب اور اردو غزل

(اس مضمون کے کچھ ابتدائی پیرے آل انڈیا ریڈیو دھلی سے نیشنل پروگرام کے تحت ۳ فروری ۶۰ ع کو نشر کئے جا چکے ہیں۔

میر کے بعد اور اقبال سے پہلے غالب ھی ایک ایسی شخصیت ہے جس کو عہد آفرین کہا جا سکتا ہے۔ وہ میر اور اقبال دونوں سے زیادہ قوی اور موثر شخصیت رکھتا تھا۔ اردو شاعری کی آنے والی نسلوں پر جیسا شعوری اور ویرپا اثر غالب کا رہا میر کا نہیں رہا۔ اور اقبال کے شعری کردار کی تشکیل و تربیت میں اور موثرات کے ساتھ ساتھ غالب کا اثر ایک نمایاں اور اہم حیثیت رکھتا ہے۔ غالب جس قدر اپنے زمانے کی تخلوق تھا اس سے بہت زیادہ نئے زمانے کا آفرید گار تھا۔ وہ ایک ایسی ہستی ہے جس کے ذھن کی تعمیر میں خارجی' حالات اور اسباب کی غیر شعوری کار فرمائی جس قدر بھی رہی ہو لیکن وہ کسی خاص تحریک کا نتیجہ نہیں تھا وہ تاریخ کی فطری اور بے ساختہ پیداوار تھا۔

اردو غزل کی رفتار میں غالب ایک نیا رہنما ہے اور "دیوان غالب" ایک نیا موڑ۔ ڈاکٹر بجنوری نے "دیوان غالب" کو ہندوستان کی دوسری الہای کتاب بتایا ہے۔ ہم بھی غالب کے کلام کو کچھ الہام ھی کی قسم کی تخلیق پاتے ہیں جیسا کہ دنیا کی تواریخ میں ہر اس بڑے شاعر کا کلام ہوتا آیا ہے جس نے آئندہ نسلوں کو نئی آگاہیاں دی ہوں۔ لیکن اس کے لئے ضروری نہیں کہ وید مقدس یا کسی دوسرے مذہبی صحیفہ کو دیوان غالب کے مقابلہ میں لایا جائے اور نہ یہ دعوہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوسری یا آخری کتاب ہے۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ اردو شاعری میں غالب پیغمبر یا اوتار کے قسم کی ہستی ہے اور اس کا دیوان الہام کا حکم رکھتا ہے۔ خود غالب کو بھی یہ پندار تھا کہ اگر "فن سخن" کوئی دین ہوتا تو یہ یعنی دیوان غالب اس دین کے لئے "ایزدی کتاب" ہوتا۔

غالب سے پہلے اردو غزل یا تو خالص جذبات اور اندرونی واردات کی شاعری تھی یعنی اس میں داخلیت کا زور تھا اور اس داخلیت میں بھی انفعالیت اور سپردگی کی فضا چھائی ہوئی تھی یا پھر جرات اور مصحفی کی رائج کی ہوئی سطحی خارجی واقعیت اپنا رنگ جما رہی تھی۔ لیکن سب سے زیادہ دبستان ناسخ کی دور از کار مضمون آفرینی اور خواہ مخواہ کی لفظی زور آزمائی کو شاعری کے میدان میں قبول عام حاصل ہو رہا تھا۔ غالب نے اردو غزل کو ایک طرف تو

مجہولی داخلیت اور سطحی خارجیت دونوں کے تنگ دائرے سے نکال کر فطرت انسانی سے قریب کیا دوسری طرف خود اپنی مشکل زبان اور پیچیدہ طرز بیان کے باوجود اس کو بڑھتی ہوئی لفظی جسامت کا شکار ہونے سے بچا کر اس کے اندر معنوی حجم پیدا کیا۔ غالب سے اردو غزل میں فکر و تامل کی ابتدا ہوئی ہے۔ وہ اردو کا شاعر ہے جس نے دلی واردات اور ذہنی کیفیات کو محض بیان کر دینے پر قناعت نہیں کی بلکہ ہم کو ان پر مستفسرانہ انداز میں نظر ڈالنا اور غور کرنا سکھایا اور ان کے متعلق ہم کو نیا شعور دیا۔ دیوان غالب کے مطالعے سے ہم کو محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کو آفرینش اور حیات انسانی کے تمام رموز اور اسرار کا پورا ادراک حاصل ہے اور وہ ان کو بیک وقت بڑے حکیمانہ انداز اور فنکارانہ سلیقہ کے ساتھ بیان کرنے کی قابلیت رکھتا ہے۔ اردو شاعری میں "دیوان غالب" کی سب سے بڑی دین یہی ہے

اردو میں غالب کی آواز پہلی آواز ہے جو دل و دماغ دونوں کو مخاطب کر کے چونکاتی ہے۔ غالب کے اشعار احساس اور فکر دونوں کو چھیڑتے ہیں اور دونوں کو آسودہ کرتے ہیں۔ غالب کو اردو کا پہلا مفکر شاعر کہنا غلط نہ ہوگا۔ اس کے کلام کے مطالعے سے ہم کو یہ سبق ملتا ہے کہ انسان کی زندگی میں جذبات یا جذباتی سپردگی ہی سب کچھ نہیں بلکہ ہم کو ہمت کے ساتھ اپنے تمام خارجی حادثات و حالات اور ذہنی کوائف و واردت کا جائزہ لینا چاہئے اور ان کی اصلیت پر عارفانہ عبور حاصل کرنا چاہئے۔

یوں تو غالب بھی غزل کا شاعر ہے اور غزل میں کوئی خاص فکری نصاب نبھانا مشکل ہے۔ لیکن "دیوان غالب" کو غور کے ساتھ پڑھا جائے تو یہ اثر ہوتا ہے کہ زندگی اور زندگی کے حقائق اور مسائل کے متعلق شاعری کا ایک واضح اور مستقل فکری میلان ہے جو استفسار، و تجسس اور تفتیش و تامل کا نتیجہ ہے۔ غزل کے مزاج کا خمیر عشق سے ہوا۔ حسن اور عشق اور دونوں کے باہمی رابطے اور معاملے غزل کے اساسی اور مستقل ترکیبی عناصر ہیں۔ غالب کے کلام میں بھی یہ عناصر حاوی اور نمایاں ملیں گے مگر یہ اس لئے کہ یہ غزل کا اصلی مزاج اور اس کا ناموس ہے اور "بادہ و ساغر" کے بغیر یہاں بات بن نہیں پاتی ورنہ غالب در حقیقت زندگی کا شاعر ہے۔ وہ محبت کا راگ اس لئے گاتا ہے کہ محبت بھی زندگی کا ایک فطری اور لازی میلان ہے۔ مگر حسن اور عشق کے میدان میں بھی غالب کا انداز مجتہدانہ ہے۔ وہ حسن کی برتری کو تسلیم کرتے ہوئے عشق کے وقار اور اس کی عظمت کا قائل ہے۔ دیوان غالب میں اس عنوان سے متعلق جتنے اشعار ہیں ان کے تیور سے ظاہر ہوتا ہے کہ عاشق و معشوق شریک ازلی ہیں اور دونوں اپنا اپنا منصب اور اپنا اپنا مقدر رکھتے ہیں۔ غالب نے کبھی کھلے الفاظ میں تو یہ نہیں کہا ہے لیکن معشوق سے وہ اکثر جس معنی خیز طنز اور بلیغ شوخی کے ساتھ خطاب کرتا ہے اس کا پیغام یہ ہے کہ معشوق کا مقام اپنی جگہ مسلم لیکن عاشق بھی اپنی ایک حیثیت اور حرمت رکھتا ہے اور اس کی انسانی فطرت کے بھی کچھ مطالبے ہیں۔ غرض کہ غالب کے اشعار کا موضوع چاہے عشق ہو چاہے زندگی کا کوئی اور نکتہ ان سے بہر صورت اردو شاعری کو جرأت فکر اور جرأت اظہار کا سبق ملا ہے

"دیوان غالب" نے ہم کو صرف نئے زاویوں اور نئے انداز سے محسوس کرنا اور سوچنا نہیں سکھایا بلکہ

اظہار کا نیا سلیقہ بھی بتایا۔ اسلوب بیان میں بھی غالب اپنا انفرادی مقام رکھتا ہے۔ وہ محض فکر و نظر کا مجتہد نہیں ہے۔ اس کا "انداز بیاں" بھی "اور" ہے۔ وہ افکار اور الفاظ کے درمیان مکمل آہنگ کا قائل ہے۔ اس کے اسلوب میں بیک وقت منطقی ترتیب اور جمالیاتی تہذیب کا احساس ہوتا ہے۔ الفاظ ہوں یا تشبیہات و استعارات وہ ان کو بڑی حکیمانہ فرزانگی اور بڑے حسن کارانہ قرینہ کے ساتھ استعمال کرتا ہے۔ دیوان غالب میں مشکل سے دو چار اشعار ایسے نکلیں گے جو اپنی تمام تہ در تہ بلاغتوں کے ساتھ حسن صوتی سے خالی ہوں۔ غالب جس وقت مانوس سے مانوس الفاظ یا لفظی تراکیب یا اجنبی سے اجنبی تشبیہات و استعارات سے کام لیتا ہے اس وقت بھی وہ حسن آہنگ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ اس کے اشعار آسان ہوں یا مشکل ہمارے خیال میں بالکل مہمل لیکن ہو کم سے کم ایسے تو ہوتے ہی ہیں کہ نازک سے نازک ساز پر گائے جا سکیں۔ "دیوان غالب" کا ہر مصرع بہ قول ڈاکٹر بجنوری "تار رباب" ہوتا ہے۔ پھر یہ موسیقیت محض لفظی اور سطحی نہیں ہوتی بلکہ اس کے اندر معنوی گہرائیوں کا احساس ہوتا ہے۔ ایسی بلیغ اور بے خال موسیقیت غالب کے بعد صرف اقبال کو نصیب ہو سکی۔

یہ ہے وہ ترکہ جو "دیوان غالب" سے بعد کی نسلوں کو ملا۔ آج غالب نہ ہوتا تو ابھی حالی اور اقبال کی متوازن سنجیدہ اور زندگی سے آنکھیں ملا سکنے والی شاعری کے وجود میں آنے میں نہ جانے کتنی دیر لگتی اور ہماری اردو شاعری موجودہ منزل تک نہ جانے کب پہنچتی سینٹسبری نے ایک موقع پر کہا ہے "کہ کیٹس نے ٹینی سن کو پیدا کیا اور ٹینی سن نے باقی تمام شعرا کو" ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ غالب سے اقبال پیدا ہوا اور اقبال سے بعد کے تمام اردو شعرا پیدا ہوئے۔

ڈاکٹر میمونہ انصاری

غالب کی شاعرانہ انفرادیت

یہ کسی مغربی نقاد کا قول ہے کہ فن میں انفرادیت بغیر شخصی انفرادیت کے ممکن نہیں ہے۔ ماہرین نفسیات کی تدقیق و تحقیق نے بھی یہ ثابت کر دیا ہے کہ فن ہمیشہ فن کار کے داخلی عوامل اور خارجی رد عمل سے عبارت ہے۔ داخلی عوامل اور خارجی رد عمل کے بھی کچھ نفسیاتی کلیات ہیں جو ہر فن کار کی اپنی الگ الگ افتاد طبع اور نفسیات کی ریاضی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ فن کار کا نظام مشاہدہ اور دائرہ۔ بصیرت اور حدیقہ ادراک ممیز ہو کر اپنی فنی انفرادیت ایک دوسرے سے مختلف کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ غالب کی شاعرانہ انفرادیت پر جب بات چل نکلتی ہے تو میرے سامنے غالب کی شخصیت آ جاتی ہے۔ اس کی شخصیت کی تہ داریوں کو سمجھنے کے لیے میں پہلے ایک بات یہ عرض کر دینا چاہتی ہوں کہ شخصیت کا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے۔ بعض ادبی شخصیتیں اپنی ذات کی تعمیر و تخریب سے بے نیاز ہوتی ہے۔ پس اپنے چولے میں مگن رہنا اور اپنی انفرادیت کو بنانے سنوارنے نکھارنے اور ابھارنے کے ہنر سے بے غرض ہونا ہی ان کی ذات کا انوکھا حسن ہوتا ہے۔ مگر غالب کی شخصیت کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ اپنی شخصیت کی تالیف اور ترتیب میں بہت ہی حساس اور ذہین واقع ہوئے تھے۔ غالب نے تو باقاعدہ اپنی شخصیت کو اپنے ہاتھوں بڑی فنکاری سے بنایا تھا۔ ایک منفرد شخصیت کی تخلیق میں بھی لوازمات کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان سب سے غالب نے بدرجہ اتم اور بطریق احسن استفادہ کیا۔ مثلاً نسلی شجاعت' خاندانی نجابت اور موروثی فضیلت ان سب پر انھیں فخر تھا۔ اسی طرح انھیں اپنی طباعی اور فطانت پر گھمنڈ تھا۔ وہ اپنی اختراعی صلاحیتوں پر ناز کرتے تھے اور اپنی خلاقانہ اور فن کارانہ بصیرتوں پر بھی انھیں جی بھر کر غرور تھا۔ اسی نفسیاتی طرز احساس نے ان کی شخصیت کو تہ دار اور پہلو دار بنا دیا تھا اور اسی طرز احساس نے انھیں زندگی' علم اور فن کا موقف اور استدلال عطا کیا تھا جو انھیں زندگی میں فن میں اور علم و فضل میں ہر جگہ ایک اپنی ذات کو دوسرے سے دو چار نہیں ہونے دیتا ہے۔ اپنا یہ امتیاز انھیں بے حد پسند تھا۔ وہ شعوری اور لاشعوری طور پر اسے برتتے تھے۔ نفسیات کا یہ طرہ ایک طرف انھیں نرگسیت کی طرف بہا لے گیا۔ اور دوسری طرف فن میں تجدید و تجدد کا موجب بن گیا۔ یہی وہ میلان تھا جو اورنگ سلیمان کو کھیل اور دنیا کو بازیچہ اطفال بنا کر یہ اشعار تخلیق کرنے کا سبب بن گیا تھا۔

بازیچہ اطفال ہے دنیا میرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے
اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک

اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

اور پھر یہ دیکھیے

ہوتا نہاں گرد میں صحرا میرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

غالب نے اپنے اس تصور فکر کی مہر علم و فن کے مختلف دائروں میں ثبت کر دی۔ خط لکھنے بیٹھے تو پرانی روش کو القط کر دیا۔ قصیدہ کہا تو نیا اسلوب ایجاد کر دیا۔ تقریظ نویسی پر آئے تو وہاں بھی طرز جدید دریافت کر لیا۔ انشا کو چھوڑیئے غالب نے تو املے میں بھی نئی جدتیں پیدا کر دیں۔ ذرا غور تو کیجئے اس انفرادیت پرست فن کار کی فن کارانہ جدتوں پر کہ قصیدہ نگاری اور مکتوب نویسی میں ایک طرف اس نے زبان کی ثقالت اور ادقیت کو ختم کیا لیکن دوسری طرف مشکل پسندی' اعجاز اور تعقید کو سر ماتھے چڑھایا اور طرز بیدل میں ریختہ کہا۔ محض اس لیے کہ غالب کا فن سب سے الگ ہو جائے فقط اس لیے کہ غالب کا تصور فن دبستان شاعری میں اپنا الگ جھنڈا گاڑ سکے۔ اور یہی ہوتی ہے دراصل ایک نابغہ فن کی پہچان۔

غالب کے شاعرانہ فکر کا تمام سرمایہ اسی تصور پر محیط ہے اور اسی طرح ان کا یہ ارتقا پذیر فن ہر دور میں ایک منفرد شاہراہ بناتا ہوا چلا جاتا ہے۔ ہمارے بعض تذکرہ نگاروں نے اور پرانی چال کے تنقید نگاروں نے غالب کی شاعرانہ انفرادیت اور حیثیت کو ثابت کرنے کے لیے ان کے استعارائی' تشبیہی اور تمثیلی عناصر کو نکال کر یا ان کی شاعری کے اعجازی اور اختراعی کمالات کو مختلف مضامین اور کتابوں میں یکجا کر دیا ہے۔ میرے خیال میں تنقید کا یہ مبادیاتی نقطہ نظر غالب کی شاعرانہ انفرادیت کو سمجھنے کے لیے ایک صورت پیدا کر دیتا ہے اسی طرح شاعروں کا تقابلی مطالعہ بھی اس مسئلے کو سمجھنے میں ایک معیار قائم کرتا ہے۔

مگر جو سچ پوچھیے تو اس کی شاعرانہ انفرادیت کو گرفت کرنے کے لیے یہ تحقیقی بصیرت کسی بڑے فن کار کی آگہی کے لیے زیادہ ثقہ اور معتبر ذریعہ نہیں ہے۔ مگر یہ اصول بھی ممکن نہیں ہے جن کا میں ابھی ابھی ذکر کر چکی ہوں میں اپنے موقف کی ایک بار پھر تائید کرنا چاہتی ہوں کہ غالب اپنے تصور فکر کو الگ کرنے کے لیے شعوری طور پر دوسروں سے ہٹ کر اپنا راستہ بنانا چاہتے تھے۔ وہ نیا راستہ کونسا تھا؟ وہ نیا راستہ دراصل تھا۔ زندگی اور کائنات کو سمجھنے کا ایک مخصوص فکری تصور! غالب کا فنی سانحہ جو اپنے عصر کے تمام شاعروں سے انہیں مختلف کرتا ہے اپنے عصر پر کیا قدغن ہے بلکہ شمالی ہندوستان کے شاعروں میں حاتم اور فائز سے لے کر شاہ نصیر اور ناسخ تک کسی بھی فن کار کے یہاں زندگی کو سمجھنے کا اتنا گہرا تعقل نہیں ملتا۔ غالب انسان اور کائنات کو مختلف شکلوں میں دیکھنے کا گن اور گر جانتا تھا۔ اور نتائج کو مرتب کرنے کے لیے یہ سچ ہے کہ ان کی واقفیت عصری علوم پر مبنی تھی مگر ان علوم سے اپنا ادراک اور شعور استوار کرنے والا سب سے پہلا اردو کا شاعر غالب تھا۔

ہمارے بعض نقادوں نے غالب کی انفرادیت کو عصر کے فنی اقدار اور معیار سے انحراف تک محدود کر دیا ہے۔ میرے خیال میں ان کی انفرادیت اور عظمت فقط اس میں نہیں ہے کہ انہوں نے مشاہدے سے تخیل اور

تصور کی نئی شیشوں کو تراشا ہے۔ یا سنگلاخ زمینوں یا قافیہ و ردیف کی شعبدہ بازی کو ترک کر دیا۔ بلکہ غالب کی انفرادیت اس میں ہے کہ اس نے شاعری میں سماجی شعور کو پہچانا۔ مادی تصور کو پیش کیا۔ عمرانی اور تاریخی فکر کو شاعری کا مغز اور مواد بنایا اور ان تصورات کو شعر کو پیکر میں تخلیق کرنے کے لیے اس نے اپنے نظام حسی کو ترتیب دیا۔ قوت مشاہدہ کو بالغ کیا اور اپنے ادراک کو تہذیب کیا۔ یہی سب ہے کہ بعض اوقات اس کا ٹھوس مادی تصور جمالیات کے رنگ میں اس طرح ڈھل کر نکھر جاتا ہے کہ بعض غالب کے اناڑی فہیم مادی تصور سے ناآشنا رہ جاتے ہیں اس قبیل کے پچاسوں اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں مثلاً

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اور پھر یہ ملاحظہ فرمائیے۔

ہوں گرمی نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن ناآفریدہ ہوں

میں غالب کو نہ ماہر نفسیات تسلیم کرتی ہوں نہ ہیت و طبیعیات کا استاد' نہ ہی غالب کو الہامی شاعر ماننے کو تیار ہوں نہ دیوان غالب کو وید مقدس کا ہم سر ٹھہراتی ہوں۔ ان سب سے قطع نظر میں غالب کو سب سے پہلا مادی اور سماجی شعور کا ادراک رکھنے والا احساس اور نازک طبع شاعر سمجھتی ہوں۔ جس کے دیوان میں اپنی صدی کی گونج سنائی دیتی ہے جس کے کلام میں مغلیہ سلطنت کا جلال و جمال ہے۔ جہاں فکر جمیل' احساس لطیفہ کی قوس و قزح کے ساتھ ساتھ خارا شگافی اور طاؤس و رباب کے مزے بھی ملتے ہیں۔ غالب کے فن کدے میں ہر موہنی صورت اپنے عصری تعقل کی منہ بولتی تصویر ہے۔ غالب کا یہ نگار خانہ ان کی مناعی اور منفرد شخصیت کی دلیل ہے۔ جس نے جدید شاعری کو نیا آہنگ بخشا اور آئندہ آنے والے شاعروں کی راہ میں چراغ روشن کر دیئے غالب کی شاعرانہ انفرادیت نہ ہوتی تو کیوں بھلا سر عبدالقادر یہ کہتے کہ اقبال کا روپ غالب کا دوسرا جنم ہے۔

غالب کی مثنوی دردو داغ

محمد عبداللہ قریشی

غالب نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے۔ ہر صنف سخن میں اپنی جودت طبع کے جوہر دکھائے ہیں۔ غزل ہو یا قصیدہ' مثنوی ہو یا رباعی' قطعہ ہو یا مرثیہ' ہر میدان میں اپنے کمال فن کے جھنڈے گاڑے ہیں۔ بقول مولانا حالی: "ان کا مرتبہ قصیدہ اور غزل میں عرفی اور نظیری کے لگ بھگ اور عرفی و نظیری سے بالا' نثر میں تینوں سے بالا تر ہے ..... ظہوری سے بڑھا ہوا' مثنوی میں ظہوری کے لگ بھگ اور یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں معلوم ہوتا کہ لٹریری قابلیت سے مرزا جیسا جامع حیثیات آدمی امیر خسرو اور فیضی کے بعد آج تک ہندوستان کی خاک سے نہیں اٹھا اور چونکہ زمانے کا رخ بدلا ہوا ہے' اس لیے آئندہ بھی یہ امید نہیں کہ قدیم طرز کی شاعری و انشا پردازی میں ایسے باکمال لوگ اس سرزمین پر پیدا ہوں گے۔" 1۔ یادگار غالب (لاہور 1963ء)' 588 - 589۔

غالب نے گرچہ رومی' نظامی' خسرو یا فیضی کی طرح کوئی مبسوط مثنوی نہیں لکھی مگر ان کے فارسی کلیات میں چھوٹی بڑی گیارہ مثنویاں موجود ہیں جن میں سب سے بڑی 1098ء بیت کی اور سب سے چھوٹی 33 بیت کی ہے۔ یہ مثنویاں مختلف موضوعات پر ہیں۔ دو مثنویاں بہادر شاہ ظفر کی مدح میں' ایک ولی عہد بہادر شاہ کی شان میں' دو تقریظ کے طور پر' ایک شہر بنارس کی تعریف میں' ایک اہل کلکتہ کے اعتراضات کے جواب میں' ایک اسلامی مسائل کی تشریح میں' دو اخلاقی اور ایک نامکمل صورت میں ہے۔ ان میں سرمہ بینش' دردو داغ' رنگ و بو' چراغ دیر' باد مخالف' ابر گہربار اور امتناع نظیر خاتم النبیین وغیرہ خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں۔

مثنوی لفظ مثنیٰ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں "دو" چونکہ اس کے بیت میں دو ہم وزن قافیے ہوتے ہیں' اس لیے اسے مثنوی کہتے ہیں۔ یہ صنف اسے وہیں چھوڑ کر بھاگ گیا۔

عورت (مادہ خوک) اپنے مستقبل سے مایوس ہو کر اپنے لڑکے اور خاوند کے پاس واپس آئی اور نہایت رحم طلب نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔ بوڑھے نے منہ پھیر لیا اور اس کی طرف التفات ہی نہ کیا۔ مگر بیٹے کا دل بھر آیا۔ ماں کی محبت اس کے خون میں جوش مارنے لگی۔ اس نے نہایت عجزو زاری سے دعا کی۔

خداوندا! تو میری والدہ کو دوبارہ انسانی صورت عطا فرما دے۔ یہ دعا بھی قبول ہوئی اور عورت پھر اپنی اصلی حالت میں آ گئی۔

تقدیر کے آگے تدبیر کی کوئی پیش نہ چلی اور تینوں اپنی محرومی اور حرماں نصیبی کا داغ لیے وہاں سے یہ کہتے

ہوئے چل دیئے:

در بدر ناصیہ فرسائی سے کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے

غالب کی یہ مثنوی تسلسل خیال، حسن ترتیب، فنی خوبیوں، وقائع نگاری اور افسانے کی دلچسپی کے لحاظ سے ایک عجیب چیز ہے۔ یہی خصائص ایک اچھی مثنوی کا طغرائے امتیاز ہو سکتے ہیں۔ دیکھئے افلاس کی تصویر کتنی مکمل ہے:

دست تہی آئینہ قسمتش — زخم دل و داغ جگر دولتش
خانہ اش از دشت خطرناک تر — پیرہنش از جگرش چاک تر
مایہ او داغ و ہمان در برش — حاصل او خاک و ہمان بر سرش
ہر سحرش تیرہ تر از تیرہ شام — فاقہ پے فاقہ کشیدی مدام

یعنی اس کے خالی ہاتھ قسمت کا آئینہ تھے۔ دل کے زخم اور جگر کے داغ ہی اس کی دولت تھے۔ اس کا مکان ویرانے سے زیادہ دہشت ناک اور ہراس آفریں تھا۔ اس کا پیراہن جگر سے زیادہ پھٹا ہوا تھا۔ داغ اس کی پونجی اور خاک اس کی کمائی تھی جو ہروقت اس کے سر پر پڑی رہتی تھی۔ ہر صبح شام سے زیادہ تاریک تھی اور وہ فاقے پر فاقہ سہتا تھا۔

عزیمت سفر کا منظر کس قدر ہولناک دکھایا ہے:

ہر سہ تن آئینہ وحشت شدند — بادیہ پیمائی سیاحت شدند
ریخت جنون برتپش آہنگہا — ماند وطن دور بفرسنگہا
مرحلہ چند نوشتند راہ — تا برسیدند بدشتے تباہ

"آئینہ وحشت" کی ترکیب بالکل اچھوتی اور قابل داد ہے۔

لق و دق صحرا اور تشنگی وحدت آفتاب کا نقشہ کھینچنے میں بھی شاعرانہ کمال دکھایا ہے:

وادی دردے کہ ہزارش بلا — خاک بلا خیز و غبارش بلا
لالہ خود روش زخون شہید — ذرہ اش از جوہر تیغ یزید
گشت در آن وادی آشوبناک — جامہ عریانی شاں چاک چاک
ہر قدم آنجا بسر دار بود — عربدۂ آبلہ و خار بود
بود بہم ہر غم و رنجے کہ بود — تشنہ لبی آفت دیگر فزود
شد ہوس آب بدل شعلہ زن — سوختن آمد بہ جگر سوختن
ہوش دران معرکہ بے ہوش گشت — پا بوداع قدم آغوش گشت
تیزی رفتار ستم کردہ بود — پائے تگ و تاز قلم کردہ بود

آبلہ ساغر شد و ساغر شد   زہرہ شد آب و لب شان تر شد
از تپش دل بتمنائے آب   ظرف نہ بتند بجز اضطراب

پیر زال جب جوانی حاصل کرتی ہے تو مرزا غالب اس کے حسن و شباب کی تصویر میں یوں رنگ بھرتے ہیں:

دید کہ مہ چہرہ و زیبا ستم   حیرت خویشم چہ تماشا ستم
چہرہ بر افروخت ز تاب عذار   یافت خزاں راسر و برگ بہار
ارث خم پشت بکاکل رسید   سلسلہ ناز بسنبل رسید
قمری طاؤس پدید آمدہ   چوں رمضان رفتہ و عید آمدہ
تازہ فسونے بہ تمنا دمید   شاد و نوان بر سر شوہر رسید
تاب عذارش بسیاہی موی   زد شبخونی بدل و جان شوی

یعنی بڑھیا نے دیکھا کہ اس کا چہرہ روکش مہتاب اور آئینہ دار آفتاب ہو گیا۔ وہ حسن دلاویز کی مجسم مورت بن گئی۔ رخسار کی آب و تاب سے اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ خزاں دیدہ سرو کو باد بہاری نے نیا لباس پہنا دیا۔ قد کی خمیدگی کا کل سیاہ نے چھین لی۔ ناز و انداز عود کو آئے۔ طاؤس طناز کی طرح اس کا جسم حسن کی رعنائیوں کا گہوارہ بن گیا۔ گویا رمضان رخصت ہوا اور عید آ گئی۔ آرزوؤں اور تمناؤں نے اس کے دل میں ایک نیا افسوں پھونکا اور وہ خراماں خراماں اپنے خاوند کے سامنے آئی تا کہ اپنے رخساروں کی آب و تاب اور بالوں کی سیاہی سے اس کے دل و جان پر شبخون مارے۔

حسن کی رعنائی اور دلفریبی کی تصویر اس سے زیادہ مختصر الفاظ اور دلکش پیرایہ میں کیا کھینچی جا سکتی ہے۔ یہ مثنوی غالب کے علو تخیل اور جذبات انسانی کی ترجمانی کا بہترین نمونہ ہے۔ افسانے کی دلچسپی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے۔ اور مثنوی ختم کیے بغیر دل نہیں مانتا۔

تقدیر کا فلسفہ کیا ہے؟ اس سے بحث نہیں۔ غالب نے اس قصے کو یہ کہہ کر ختم کر دیا ہے:

عالم تقدیر چنین است و بس   حاصل تحریر من این است و بس

حواشی

1۔ پنج آہنگ۔ نو کشور۔ لکھنؤ' 1897 199_

2۔ اردوے معلیٰ (دہلی 1869)' 252_

3۔ دیوان مہر (مطبع الٰہی۔ آگرہ)' 473_

4۔ اگر 1213 سال ولادت مان لیا جائے تو 21-20 سال۔ ملاحظہ ہو اردو نامہ جنوری 1967 "غالب کا زائچہ اور تاریخ ولادت"۔

5۔ عمدۂ منتخبہ خطی سرور نسخہ قومی آثار خانہ' کراچی۔

6۔ غالب نے مغاں شیوہ کی ترکیب کلیات فارسی میں کئی جگہ استعمال کی ہے

زہے بتان مغاں شیوہ داد خواہانش زدست ہائے حنا بستہ گل بدامانش
مسکین نہ بودہ زمغان شیوہ بانواں در خوابگاہ بختن و دارا گرستن
ہم ھویدہ از ادائے مغان شیوہ شاہدان فہرست روزنامہ اندوہ انتظار
آتش ہنگامہ بجان داشتی داغ مغان شیوہ بتان داشتی

7۔ مغ مرد روحانی زرتشتی پیشوائے مذہبی زرتشتی' مغان) (جمع) طبقہ پائیں تر از موبدان بودہ اند' فرہنگ عمید' تہران۔

8۔ سید آفاق حسین' نادرات غالب۔ خط بنام حقیر نوشتہ 4 جون 1848' 3۔ 4۔

9۔ نہ نازک نگاری کہ نازش کنم بہر بوسہ زلف درازش کنم
گریزد دم بوسہ ایش کجا فریبد بسو گند ریش کجا
برد عکم و نبود بش تیغ گو دہد کام و نبود دلش کام جو

10۔ کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتو خورشید عالم شبنمستاں کا
یہ کس ناہید کی تمثال کا ہے جلوہ سیمانی
کہ مثل دیدہ ہائے خاک' آئینے پر افشاں ہیں

11۔ مندرجہ بالا میں پہلی دو غزلیں نسخہ فوجدار محمد خاں (بھوپال) میں اسد تخلص کے تحت اور تیسری حاشیہ پر اور نسخہ شیرانی لاہور میں ہے۔ نسخہ شیرانی نسخہ فوج دار سے نقل کیا گیا لیکن بعض غزلیں نظر انداز کر دی گئی ہیں. نسخہ فوجدار 1237 میں لکھا گیا اور نسخہ شیرانی اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد غالب کے فیروز پور اور وہاں سے کلکتہ روانہ ہو جانے کے باعث نسخہ شیرانی ناتمام رہا۔ حاشیے پر البتہ چند غزلوں کے اضافے ہوئے جن میں سے بعض پر "از بانده فرستادند" لکھا ہوا ہے لیکن متن ہی کے خط میں۔

12۔ اکبر شاہ ثانی تاریخ پیدائش 7 رمضان۔ 1751/1173_

13۔ خط بنام علائی' مورخہ 28 جولائی 1862_ اردوے معلیٰ (1869) 443_

14۔ اردوئے معلی : بنام حاتم علی مہر۔

15۔ نسخہ فوجدار کا یہ شعر لائق توجہ ہے

طلسم مستی دل آنسوے ہجوم سرشک
ہم ایک میکدہ دریا کے پار رکھتے ہیں

16۔ اس سلسلے میں "نخواندہ آمدن من در انجمن یار آر" والی غزل ملحوظ رہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حسینہ شمع محفل احباب بھی ہوا کرتی تھی۔ اسی طرح دیکھیے "خامہ بر صدر شنے کہ بہ پہلوے تو بود" والی غزل بھی۔ بعض شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس گلدستہ احباب کا ایک پھول مومن خاں بھی تھے۔

17۔ غزل کی یہ شکل نسخہ شیرانی سے لی گئی ہے۔

18۔ تلخ دریائے سیحوں کے پار ترکوں کا ایک قبیلہ۔ پرانے شعرا اس کے حسن و جمال کے معترف تھے' یہ لوگ' خرلخ اور قرلق بھی کہلاتے تھے۔ نوشاد ایک شہر یا بت کدہ' فرہنگ عمید' تہران۔

19۔ چو حرز بازوے ایمان تو سم حسام الدین حیدر خان تو سم

20۔ مجھے یقین ہے کہ غالب کو طرز بیدل سے ہٹانے میں نہ "سخنوران جاہل" کا اتنا حصہ تھا اور نہ "سخنوران کامل" کا بلکہ یہ غالب کا عشق تھا اور اس کی محبوبہ جس نے آسمان گوئی کی طرف غالب کی رہنمائی کی اور اسد اللہ خاں کو غالب نام آور بنا دیا۔

مالک رام

غالب کی فارسی تصانیف

1۔ کلیات غالب:

مرزا کی فارسی تصانیف میں بہ لحاظ اشاعت ان کے دیوان فارسی کو اولیت کا فخر حاصل ہے' حالانکہ جہاں تک ترتیب کا تعلق ہے' پنج آہنگ کے بعض حصے سب سے پہلے مرتب ہوئے تھے۔

گل رعنا کے فارسی حصے کے آغاز میں مرزا نے جو مختصر دیباچہ لکھا ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ 1828ء تک دیوان فارسی مرتب نہیں ہوا تھا۔ بلکہ میرے خیال میں تو اس وقت تک فارسی کلام مقدار میں بھی کچھ زیادہ نہیں تھا۔ فارسی دیوان کی ترتیب کی طرف سب سے پہلا اشارہ پنج آہنگ کے دیباچہ میں ہے۔ مرزا علی بخش خاں لکھتے ہیں:۔

"ور آغاز سال یک ہزار و دو صد و پنجاہ و یک ہجری (1251ھ) شمس الدین خاں را۔ تقضائے آسمانی آں پیش آمد کہ ہیچ آفریدہ مبیناد وآں خود از غایت شہرت بہ شرح احتیاج ندارد و بعد ازاں ہنگامہ' ہم وراں ہنگام ازجے پور بہ دہلی رسیدم و بہ کاشانہ برادر والاشان و آموز گار مہربان مولانا غالب زاد افضالہ فرود آمدم۔ چوں درآں ایام دیوان فیض عنوان کہ مسمی بہ 'میخانہ آرزو سرانجام تازہ فراہم آمدہ و پیرایہ اتمام پوشیدہ بود' آنچہ از نثرواں ہمایوں صحیفہ صورت ارقام داشت' ہمہ رابہ خدمت وائے آں خسرو اقلیم عنخوری خواندم۔"

نواب شمس الدین احمد خاں کے قتل فریزر کے سلسلہ میں 8 اکتوبر 1835ء کو پھانسی کی سزا ہوئی تھی۔ جس کی طرف اس تحریر میں مرزا علی بخش خاں نے اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ: "بعدازاں ہنگامہ ہم وراں ہنگام" میں جے پور سے دہلی آیا اور غالب کے ہاں ٹھہرا۔ گویا وہ اکتوبر' نومبر 1835ء میں دلی آئے اور انہی ایام میں دیوان "تازہ" فراہم ہوا تھا۔ پس ہم یہ خیال کرنے میں حق بجانب ہیں کہ دیوان ستمبر' نومبر 1835ء کی سہ ماہی میں مرتب ہوا۔ دوسری بات یہ کہ اس کا نام "میخانہ آرزو سرانجام" رکھا گیا تھا۔ بدقسمتی سے تاحال اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہو سکا۔ اس وقت تک دیوان کا جو سب سے پرانا مخطوطہ ملا ہے۔ یہ خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے۔ اس کی کتابت کی تاریخ 11 ربیع الآخر 1254 ہجری (4 جولائی 1838ء) ہے اور اس کے کاتب غالب کے مشہور دوست لالہ ہیج مل کھتری ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ مخطوطہ اصل نسخہ "میخانہ آرزو و سرانجام" ہی کی نقل ہو۔ بہرحال

یہ خطی نسخہ بھی غالب کا دیکھا ہوا ہے اور اس کے حاشیے میں بعض چیزیں خود ان کے قلم سے اضافہ ہوئی ہیں۔

فارسی دیوان پہلی مرتبہ 1845ء میں چھپا۔ جیسا کہ اس کے صفحۂ اول پر تحریر ہے۔ یہ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کی تصحیح و ترتیب سے مطبع دارالسلام حوض قاضی دہلی میں طبع ہوا تھا۔ یہ بڑے سائز کے پندرہ سطری مسطر پر لکھا گیا ہے۔ کاتب خوشخط اور بڑی حد تک صحیح نویس ہے، غلطی کم کرتا ہے۔ اس کے آغاز اور آخر میں خود غالب کا لکھا ہوا دیباچہ اور تقریظ ہے' جو اس وقت بھی دیوان میں ملتی ہے اور پنج آہنگ کے آہنگ چہارم میں بھی شامل ہے۔ دیوان میں نثر اور نظم (506) صفحات پر محیط ہے۔ اس کے بعد مزید تین صفحوں کا اضافہ کیا ہے۔ پہلے صفحے "صحت نامہ" کے لئے وقف ہیں اور تیسرے پر اند' رباعی اور ایک قطعہ میں دیوان کی طباعت کی دو تاریخیں ہیں۔ یہ نیر رخشاں نے لکھی ہیں۔ تقریظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں (6672) شعر ہیں۔

دیوان کا دوسرا ایڈیشن بہت مدت بعد 1863ء میں شائع ہوا۔ مرزا کا اردو' فارسی کلام نواب ضیاء الدین احمد خاں اور ناظر حسین مرزا کے پاس جمع ہوتا تھا۔ 1862ء میں منشی نو کشور نے مرزا کی رضامندی سے نیر رخشاں کا مرتبہ نسخہ اپنے مطبع لکھنؤ سے شائع کرنے کی غرض سے ان کے صاحبزادے مرزا شہاب الدین احمد خاں سے منگوا لیا۔ لیکن بعض مواقع ایسے پیش آئے کہ کتابت و طباعت کا کام سرعت سے نہ ہو سکا۔ اور دیوان کہیں 1863ء کے وسط میں شائع ہوا۔ یہ متوسط سائز کے (562) صفحات پر مشتمل ہے۔ پوری کتاب 21 سطری مسطر پر لکھی گئی ہے۔ کاتب خوش خط ہے لیکن غلطی سے مبرا نہیں۔ حالانکہ اصل مسودہ نواب فخرالدین محمد خاں خرد کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہایت خوش خط اور روشن تھا' اس کے باوجود اس سے اغلاط سرزد ہو گئی ہیں۔ اس کی تقریظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں (10424) شعر ہیں یعنی طبع اول سے (3752) زیادہ۔ مرزا کی زندگی میں دیوان کے یہی دو ایڈیشن شائع ہوئے۔

2۔ سبد چین:۔

کچھ ایسا کلام رہ گیا تھا جو کلیات میں شامل نہیں ہو سکا تھا یا 1863ء کے بعد معرض وجود میں آیا۔ اس کا ایک مجموعہ انہوں نے "سبد چین" کے نام سے اپنی وفات سے کوئی دو برس پہلے شائع کیا۔ اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"سبد چین میوۂ راگویند کو پایان موسم برشاخسار ماند وچوں آں را پچینند' شاخسار بے بار ماند۔ ہر آئینہ آنچہ پس از انطباع کلیات فارسی گفتہ شد و آنچہ یاراں ازویس مسودات واشتند و من ازاں خبرنداشتم وایک من رسانند' در اوراق جدا کردہ شدو آں راسبد چین نام نہادہ آمد"

اس میں 31 سطر پر لکھے ہوئے 40 صفحے ہیں اور ان کے بعد دو صفحوں پر صحیح نامہ ہے۔ یہ مختصر کتاب 1867ء (1284ھ) میں محمد مرزا خاں کے مطبع محمدی' کوچہ چیلاں' دہلی میں چھپ کر شائع ہوئی۔ اس میں صرف (730) شعر ہیں۔

3_ سبد باغ دودر:۔

اگرچہ جیسا کہ مرزا نے سبد چین کے دیباچہ میں لکھا تھا' اس میں ان کا تمام منتشر کلام جمع کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور ان کا ارادہ یہ تھا کہ اگر اس کے بعد کوئی کلام ہو ابھی تو وہ اسے قلم بند نہیں کریں گے۔ اس کے باوجود غالبا منشی ہیرا سنگھ دردؔ (خلف رائے بجے مل کھتری) کی فرمائش پر انھوں نے سبد چین کا دوسرا ایڈیشن مرتب کرنے کی اجازت دے دی۔ یہ ایڈیشن شائع نہ ہو سکا۔ خوش قسمتی سے اس کا اصلی خطی نسخہ دستیاب ہو گیا ہے اور اسی کی نقل میرے پیش نظر ہے۔ چونکہ اس میں نظم و نثر دونوں شامل ہیں۔ اس لیے غالب نے اس کا نام "باغ دودر" رکھا تھا۔ "سبد باغ دودر" سے (1283ھ) برآمد ہوتے ہیں جو اس کی ترتیب کا ہجری سال ہے۔ اس لیے ان کے قول کے مطابق اس میں بھی ایک لطف ہے۔ "سبد باغ دودر" میں "سبد چین" سے (146) شعر بہ تفصیل ذیل زیادہ ہیں:۔

قطعات	(12عدد)	42 :
مثنوی	(1)	25 :
قصیدہ	(1)	31 :
غزل	(2)	20 :
مخمس	(1)	22 :
رباعی	(3)	میزان: 146

اس میں بہت سا کلام میں نے اپنے مرتبہ "سبد چین" اور مختلف مضامین میں شائع کر دیا ہے۔ مثنوی کے (25) اشعار میں سے (23) جناب قاضی عبدالودود صاحب کے مرتبہ "ماثر غالب" میں شامل ہیں جو انھوں نے رائے بجے مل کے قلمی نسخے سے اخذ کئے تھے۔ کچھ اور کلام بعض اور اصحاب کے مضامین میں آ گیا ہے۔ صرف (30) شعر ایسے ہیں جو آج تک کہیں شائع نہیں ہوئے۔ یہ اس مضمون کے ساتھ بطور ضمیمہ شامل کئے جا رہے ہیں۔

4_ مثنوی دعاء صباح:۔

حضرت علی کرم اللہ وجہ سے منسوب ایک دعا ہے۔ یہ اسی کا منظوم فارسی ترجمہ ہے۔ جیسا کہ مطبوعہ نسخے کے سرورق سے ظاہر ہے۔ مرزا نے یہ ترجمہ اپنے بھانجے مرزا عباس بیگ کی فرمائش پر کیا تھا۔ یہ مختصر سا رسالہ ہے۔ اوپر جلی قلم سے عربی عبارت اور اس کے نیچے کسی اور کا کیا ہوا فارسی نثری ترجمہ ہے۔ پھر اس کے نیچے غالب کا منظوم ترجمہ ہے۔ یہ مثنوی مرزا کی زندگی ہی میں مطبع نو لکشور لکھنؤ میں چھپی تھی لیکن اس پہلے اڈیشن کے نسخے نایاب ہیں۔ میرے علم میں اس کا صرف ایک نسخہ ہے۔ اس میں کل 26 صفحے ہیں۔ دعاء صباح کے (122) شعر پہلے 24 صفحوں میں آ گئے ہیں۔ صفحہ 25 _ 24 پر سات شعر ایک اور دعا کے ہیں۔ جو حضرت امام زین العابدین سے منسوب ہے اور جس سے متعلق روایت ہے کہ اسے دعاء صباح کے بعد سجدے میں پڑھنا چاہیے۔

2۔ نثر فارسی

1۔ پنج آہنگ:۔

اس کتاب کی بنیاد 1825ء (1241ھ) میں رکھی گئی تھی۔ اس سال انگریزوں نے بھرت پور کے قلعہ پر لشکر کشی اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ اس لڑائی میں نواب احمد بخش خاں والئی فیروز پور جھرکہ و لوہارو انگریزوں کی طرف سے لڑ رہے تھے۔ غالب اور مرزا علی بخش خاں بھی اس موقع پر نواب صاحب موصوف کے ہم رکاب تھے یہ دونوں دن بھر ایک دوسرے کے ساتھ رہتے اور ایک ہی خیمے میں شب باش ہوتے۔ مرزا علی بخش خاں نے غالب سے فرمائش کی کہ آپ میرے لیے تمام ایسے کلمات اور جملے جمع کر دیں جو رسمی القاب و آداب میں اور شکر و شکوہ اور شادی و غم کے مواقع پر خطوں میں استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ اس پر مرزا نے آہنگ اول مرتب کیا۔ اس میں بہ فرق مراتب القاب و آداب اور وہ فقرات درج کیے ہیں جو تعزیت و تہنیت' شکر و شکوہ دعا و عتاب کے لئے لکھے جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد آہنگ دوم بھی مرزا علی بخش خاں ہی کی درخواست پر لکھا اور اسے چار "زمزموں" میں تقسیم کیا۔ زمزمہ اول میں مختصراً" مصادر کی حقیقت اور صرف کے چھ اصول بیان کیے ہیں۔ زمزمہ دوم میں گویا زمزمہ اول کی توضیح و تشریح کے لئے مثالاً" تقریباً (150) فارسی مصادر کی تعریف کی ہے اور ان کے ماضی' مفعول' مضارع' فاعل اور امر کے صیغے لکھے ہیں۔ زمزمہ سوم میں بعض محاورات و مصطلحات دے کر ان کی تشریح کی ہے اور ان کے محل استعمال کی طرف اشارہ کیا ہے۔ زمزمہ چہارم میں بعض الفاظ کے معانی ہیں۔

آہنگ سوم میں اپنے دیوان فارسی سے ایسے اشعار انتخاب کیے ہیں جو خطوط یا دوسری نثری تحریروں میں آرائش کلام کے لئے مفید اور کار آمد ہو سکتے ہیں۔ ہر شعر کے عنوان میں لکھ دیا ہے کہ یہ کس موقع پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

آہنگ چہارم میں وہ نثریں ہیں' جو مرزا نے خود اپنی تصنیفات کے آغاز و خاتمہ میں یا دوسرے احباب کی کتابوں کے دیباچے یا تقریظ کے طور پر قلم بند کی ہیں۔ دراصل یہی وہ تحریریں تھیں جنہیں یک جا کرنے کا خیال سب سے پہلے مرزا علی بخش خاں کے دل میں آیا تھا اور جس نے بڑھ کر پنج آہنگ کی شکل اختیار کر لی۔ اس سے ان کی غرض یہ تھی کہ جس طرح میں نے ان سے استفادہ کیا ہے اسی طرح میرا بیٹا غلام فخر الدین بھی ان کے مطالعہ سے مستفید ہو گا۔ جب وہ یہ نثریں جمع کر چکے۔ تو انہوں نے پہلے تین آہنگ جو ان کے پاس تھے ان پر اضافے کر دیے اور مرزا کے دوست احباب نے ان کے خطوط لے کر انہیں آہنگ پنجم کا نام دیا اور یوں پنج آہنگ مرتب ہوئی۔

پنج آہنگ کے پہلے ایڈیشن کا چھاپا قلعہ دہلی کے مطبع سلطانی میں اگست 1849ء میں ختم ہوا یہ عضد الدولہ حکیم غلام نجف خاں بہادر کے اہتمام میں چھپا تھا۔ اس میں 13 سطری مسطر کے متوسط سائز کے (493) صفحے ہیں۔

کتاب تو دراصل صفحہ (492) ہی پر ختم ہو گئی ہے صفحہ (493) پر صرف ترقیمہ ہے۔

دوسرا ایڈیشن چھوٹے سائز پر اپریل 1853ء میں منشی نورالدین احمد لکھنوی کے مطبع دارالسلام دہلی میں چھپ کر شائع ہوا۔ دیوان فارسی کا پہلا ایڈیشن بھی 1848ء میں اسی مطبع میں چھپا تھا۔ دوسرے ایڈیشن میں (444) صفحات ہیں۔ کتاب کا مسطر شروع سے آخر تک یکساں نہیں۔ 304 صفحہ تک فی صفحہ 14 سطریں ہیں اس کے بعد صفحہ 305 سے لے کر آخر تک 15 سطریں۔

دونوں اشاعتوں میں پہلے تین آہنگ یکساں ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں۔ آہنگ چہارم، طبع اول میں "تقریظ آثار الصنادید" پر ختم ہو جاتا ہے' لیکن طبع دوم میں اس کے بعد اور بھی دو نثریں ملتی ہیں۔ اول "دیباچہ دیوان ریختہ نواب حسام الدین حیدر خاں بہادر" دووم "دیباچہ تذکرہ الموسوم بہ طلسم راز فراہم آوردۂ میر مہدی" اسی طرح طبع اول میں آہنگ پنجم کا آخری خط شیخ بخش الدین مارہروی (کذا) کے نام ہے۔ طبع دوم میں یہ خط صفحہ 408 - 409 پر ہے۔ اور اس کے بعد (25) خطوط کا اضافہ کیا ہے جو 35 صفحات پر محیط ہیں۔ اس میں آخری خط یوسف مرزا کے نام ہے۔ مرزا کی زندگی میں پنج آہنگ کے مستقل یہی دو ایڈیشن شائع ہوئے۔

2_ مہرنیم روز:۔

غالب اس میں شبہ نہیں کہ خود رئیس بن رئیس اور رئیسوں کے دوست تھے چنانچہ رئیسوں کی تمام خوبیاں اور خامیاں بھی انہیں ورثہ میں ملی تھیں۔ جو کمی رہ گئی تھی اسے انہوں نے "بزور بازو" خود پورا کر لیا۔ ان میں فضول خرچی' اور ظاہری ٹھاٹ باٹ سے رہنا سہنا غالباً سب سے نمایاں ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساری عمر عسیر الحالی اور مفلسی میں گزری۔ 1850ء میں ان کے دوستوں کو ان کی زوہ حالت سے فکر ہوئی۔ آخر مولانا محمد نصیرالدین عرف میاں کالے صاحب اور دارا لمہام احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں بہادر نے کہ دونوں بہادر شاہ ظفر کے مقربین میں سے تھے' سلسلہ جنبانی کی اور بادشاہ عہد نے انہیں خاندان تیموری کی تاریخ لکھنے کی خدمت تفویض کی۔ خیر' تاریخ نویسی کا تو ایک بہانہ تھا۔ مقصود دراصل مرزا کی امداد تھی۔ وہ اس طرح پورا ہو گیا۔ مرزا نے مہرنیم روز کے دیباچے میں لکھا ہے کہ وہ جولائی 1850ء میں اس کام پر مقرر ہوئے تھے ان کا ارادہ یہ تھا کہ پوری تاریخ "پرتوستان" کے نام سے دو حصوں میں لکھی جائے۔ جزو اول "مہرنیم روز" جس میں امیر تیمور سے لے کر ہمایوں کی جہاں گردی اور جہانگیری تک کا بیان ہو۔ چونکہ اس زمانے سے متعلق ابوالفضل کی زوہ مفصل کتابیں۔ اکبر نامہ اور آئین اکبری موجود تھیں۔ اس لئے یہ حصہ مختصر لکھنے کا ارادہ تھا۔ دوسرے حصہ کا نام انہوں نے "ماہ نیم ماہ" تجویز کیا تھا۔ اس میں وہ جلال الدین اکبر سے بہادر شاہ ظفر تک کے حالات زیادہ شرح و بسط سے قلم بند کرنا چاہتے تھے۔ پہلے دستور یہ قرار پایا تھا کہ وہ خود ہی کتب تواریخ سے مضامین کا انتخاب کر کے انہیں فارسی کا جامہ پہنائیں لیکن پھر حکم ہوا کہ کتاب امیر تیمور سے نہیں' بلکہ آغاز آفرینش سے لکھی جائے۔ دوسری تبدیلی یہ ہوئی کہ اب حالات حکیم احسن اللہ خاں لکھ کر بھیجا کریں گے اور غالب انہیں فارسی قالب میں ڈھالیں گے۔ بڑی تگ و دو کے بعد "مہرنیم روز" یعنی پوری کتاب کا پہلا حصہ 1271ھ (1854)ء میں ختم ہوا۔

فکر تونسوی غالب کے شعر کی شرح کرتے ہیں

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ غالب بے ننگ و نام ہے   یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

اللہ اور غالب کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ احباب میری غالب کے اشعار کی تشریح پر یوں جھوم اٹھے، جیسے کوئی کسی دیانت دار کانگری کو دیکھ کر جھوم اٹھتا ہے۔ میں ناشرین کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ امید ہے، وہ اسے رسمی شکریہ سمجھ کر میری روح کو تکلیف نہیں دیں گے۔

آج غالب کا ایک اور شعر تشریح کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔ پہلے سن لیجئے۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ غالب بے ننگ و نام ہے   یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

اس شعر میں دو کردار ہیں۔ ایک عاشق اور ایک معشوق، اردو کے شعر میں ہمیشہ یہی دو کردار ہوتے ہیں۔ اور ان دونوں کے تصادم سے ایک شاعر جنم لیتا ہے۔ غالب کے اس شعر میں بھی یہ تصادم موجود ہے۔ اس شعر کا عاشق کافی بے وقوف آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اور معشوق کافی ہوشیار، عیار زمانہ ساز ہے۔ یعنی یہ ایک بے وقوف اور سادہ لوح آدمی کی ایک عیار اور چالاک انسان سے ٹکراؤ کی کہانی ہے۔ نہ جانے خدا نے عشق کے نصیب میں بے وقوفی کیوں لکھ رکھی ہے۔

شعر کی کہانی یوں چلتی ہے کہ عاشق صاحب نے ایک معشوق صاحبہ سے عشق کا آغاز کیا اور پہلی ملاقات پر ہی اعلان کر دیا کہ جانِ من! میں تمہاری خاطر اپنا تن، من، دھن تک قربان کر دوں گا——عشق کے آغاز میں ہر عاشق کے منہ سے یہ فقرہ نکل جاتا ہے۔ چنانچہ غالب کے منہ سے بھی نکل گیا ہوگا یہ شعر پڑھ کر ظاہر ہوتا ہے کہ اب غالب صاحب سخت پچھتا رہے ہیں کہ میں نے یہ فقرہ زبان سے کیوں نکالا تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ فقرہ رسمی نہیں تھا، بلکہ حقیقی تھا اور مجھے واقعی اپنا دھن دولت لٹا دینا پڑے گا، تو...... تو۔ (شاید میں عشق ہی نہ کرتا بلکہ بزازی کی دکان کھول لیتا۔)

یہ شعر عشق کے آغاز کی ایک میٹھی یاد کو تازہ کرتا ہے، جو اب ایک تلخ یاد بن گئی ہے۔ عاشق صاحب مالی طور پر قریب قریب برباد ہو چکے ہیں۔ یعنی آبائی مکان نیلام ہو چکا ہے، گہنا پاتا، گروی رکھا جا چکا ہے، تن پہ کپڑا نہیں رہا، کپڑوں کا آخری جوڑا ڈرائی کلینرز کے پاس پڑا ہے اور دھلائی کی اجرت ادا نہ کر سکنے کے باعث لایا نہیں جا سکا۔ عاشق صاحب تندور یا ڈھابے پر جا کر کھانا کھاتے ہیں، اور کئی بار ڈھابے کے مالک کے ہاتھوں دھتکارے بھی جاتے ہیں۔

یعنی یہ دردناک صورت حالات ہے' جب کہ یہ شعر کہا گیا۔ یہ شعر عشق کی اس منزل پر کہا گیا' جو عشق کا آغاز نہیں ہے بلکہ انجام ہے۔ اور آغاز اور انجام کے درمیان عاشق اور معشوق کے تعلقات کی ایک لمبی داستان ہے۔ اور ظاہر ہے' یہ داستان حسن اور عشق کی نہیں' پیار اور ایثار کی نہیں' بلکہ عاشق اور معشوق کے درمیان خالص اقتصادی تعلقات کی داستان ہے کہ عاشق صاحب تو عشق کے دوران میں اپنا پیسہ دھیلا بڑی فراخ دلی سے لٹاتے رہے اور معشوق صاحب اس سے اس بنا پر محبت جتاتے رہے کہ عاشق کافی موٹی مرغی ہے۔ جب تک اس کے پاس مال و دولت ہے' عشق کرتے رہو' اور جوں ہی عاشق صاحب پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے ایک کیلا تک نہ خرید سکیں اس وقت اسے دھتا بتادو۔

اور ادھر عاشق صاحب یہی سمجھتے رہے کہ پیسہ ہاتھ کا میل ہے کہ اصل چیز محبت ہے۔ سچی اور پاک محبت لہٰذا تن' من' دھن لٹادینا چاہیے تاکہ معشوق صاحبہ کے دل پر یہ خیال نہ جم جائے کہ یہ بنیا ہے' کنجوس ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ اس شعر میں معشوق عاشق کو دھتا بتا دیتا ہے' کیوں کہ معشوق جب دیکھتا ہے کہ عاشق صاحب تو شہر میں اب دھکے کھاتے پھرتے ہیں' کوئی اسے نوکری نہیں دیتا' کوئی کھانا نہیں کھلاتا' کوئی بزاز اسے ادھار کپڑا بھی نہیں دیتا' تو معشوق سوچتا ہے کہ ایسے بے ننگ و نام آدمی سے عشق کرنا مفت کی رسوائی ہے۔ یہ معشوق کے خاندانی وقار کی توہین ہے کہ وہ اس کا عاشق کہلاتا پھرے۔ "میرے پاس کار ہے' اس کے پاس بس کا کرایہ تک نہیں ہے۔ میرے پاس کوٹھی ہے' اس کے پاس کرایہ کا کوارٹر تک نہیں ہے' بلکہ دھرم شالہ میں پڑا رہتا ہے۔" چنانچہ ایک دن معشوق صاحبہ کو کسی اڑوس پڑوس والے نے طعنہ دیا کہ جناب! سنا ہے آپ غالب نامی آدمی سے عشق فرماتی ہیں۔ تو معشوق نے حقارت سے کہا "ہنھ! یہ موہنہ اور مسور کی دال! بھلا ایسا بے ننگ و نام آدمی بھی میرے عشق کا اہل ہو سکتا ہے؟"

چنانچہ معشوق کے منہ سے جوں ہی یہ فقرہ نکلا' آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گیا کہ معشوق تو غالب کو بے ننگ و نام کہتا پھرتا ہے اور غالب ہے کہ بایں ہمہ ناداری و بدحالی ہر جگہ ایڈ ایڈ کرتا پھرتا ہے کہ وہ ہم سے اور ہم اس سے عشق فرماتے ہیں۔

غالب نے یہ افواہ سنی۔ کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ کیوں کہ غالب ایک آورش وادی عاشق تھا۔ وہ عشق کو غلہ نہیں سمجھتا تھا کہ جیب میں پیسے ہوئے تو غلہ خرید لیا ورنہ سرد آہ بھر کر چپکے سو رہے۔ نہیں اسے عشق صادق پر یقین تھا۔ اسے اقتصادیات زدہ عشق سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ اس لیے اسے اپنے معشوق پر بھی پختہ اعتماد تھا کہ چاہے ساری دنیا مجھے بے ننگ و نام کہے میرے عشق کا مذاق اڑائے' لیکن میرا معشوق (ہائے میرا معشوق) کبھی ایسے الفاظ منہ سے نہیں نکال سکتا۔ کیوں کہ معشوق تو میرے ساتھ ہی بھوکوں مرے گا' میرے ساتھ ہی بناسپتی گھی کھائے گا' میرے ساتھ ہی دکان کے پیڑوں پر کروٹیں بدلے گا۔

یہ تھی مثالی معشوق کی تصویر' جو غالب کے ذہن میں تھی۔

غالب نے معشوق کے پاس آ کر اس کی تصدیق کی۔ معشوق نے افسرانہ شان سے کہہ دیا کہ ہاں ہاں، میں نے تمہیں بے ننگ و نام کہا ہے۔ "جاؤ" جا کر تھانہ میں رپورٹ کرو۔ بس اسی مرحلے پر غالب کے منہ سے یہ شعر نکل گیا کہ۔

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ غالب بے ننگ و نام ہے   یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

یعنی غالب پر پہلی بار عشق اور اقتصادیات کی حقیقت کھلی اور اسے پہلی بار پچھتاوا ہوا کاش! اگر انجام عشق یہی ہونا تھا تو کم از کم میں اپنی پراپرٹی تو بچا کر رکھتا اور صرف زبانی جمع خرچ سے ہی کام چلا لیتا۔

دراصل یہ شعر دنیا بھر کے عاشقوں کے لیے ایک "ایڈوائس" ہے کہ حضرات! عشق کرنا ہے تو گانٹھ کے پکے رہو اور میرے تجربے سے سبق حاصل کرو۔

لیکن کیا عاشق حضرات اس نصیحت پر عمل کریں گے؟ میرا خیال ہے کہ کریں گے، کیوں کہ عاشق کے نصیب میں ازل سے بے وقوفی لکھی ہے اور وہ "اکاؤنٹ بک" سامنے رکھ کر عشق نہیں کر سکتے۔

(فکر تونسوی)

☆☆☆

فیض احمد فیض
مختار زمن

غالب - ایک مکالمہ

فیض احمد فیض سے یہ سوالات انگریزی میں کیے گئے تھے اور ان کے جوابات بھی انگریزی میں حاصل کیے گئے اے پی پی فیچر سروس نے یہ انٹرویو انگریزی روزنامہ "ڈان" کے لیے مرتب کیا تھا تاکہ انگریزی داں طبقہ بھی غالب سے واقفیت حاصل کر سکے۔ ذیل میں اس انٹرویو کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔
(مختار زمن)

زمن:۔ فیض صاحب، مرزا غالب کا شمار صف اول کے شعراء میں ہوتا ہے، دیوان غالب جب پڑھئے اس میں تازگی محسوس ہوتی ہے کیا آپ کو اس خیال سے اتفاق ہے؟ اور اگر ہے تو آپ کی رائے میں غالب کی عظمت اور اس کے کلام میں تازگی اور تنوع کا راز کیا ہے؟

فیض:۔ تنوع اور تازگی عظیم شاعری کی خصوصیات ہیں اگرچہ ہر بڑے شاعر کی عظمت کے اسباب یکساں نہیں ہوتے لیکن بعض خصوصیات مشترک ہوتی ہیں غالب کی عظمت کا راز بھی حقائق کاملہ سے ہم آہنگی میں مضمر ہے۔

زمن:۔ آپ "حقیقت" کی کیا تعریف کرتے ہیں؟

فیض:۔ میں "حقیقت" کو ادبی معنی میں استعمال کر رہا ہوں یعنی سماج کے کسی خاص دور میں انسانیت کا نچوڑ، اسے آپ اس دور کی روح کا نام بھی دے سکتے ہیں، سماجی احساس بھی کہہ سکتے اور حقیقت پسندی کے عنوان سے بھی پکار سکتے ہیں۔ ایک ہی خیال کو ادا کرنے کی یہ مختلف صورتیں ہیں، جیسا کہ ایک نقاد نے کہا ہے۔ "ایک بڑا مصنف ایک خاص دور کے حقائق اور انسانیت کا مرقع پیش کرتا ہے، اسی لیے ان شعراء کے کلام میں جنھوں نے بھرپور انسانی تجربات کی روح کو تاریخ کے کسی بھی عہد میں اپنے قابو میں کر لیا آج بھی وہی تازگی پائی جاتی ہے جو ان کے اپنے زمانے میں تھی۔ اس لیے کہ انسانی تجربات کا سلسلہ ہمیشہ جاری و ساری رہتا ہے اور بڑے قدیم شعرا کے تجربات ہمارے دور کے تجربات ہی کی ایک

کڑی ہوتے ہیں: یہ تجربات کیا ہیں؟ اپنے ساتھیوں کو آس اور یاس' حصول اور ناامیدی' درد اور خوشی' جسے نہ صرف ہم سمجھ سکتے ہیں بلکہ واقعی یا تخیل میں ہم خود بھی ان تجربات میں شریک و سہیم ہوتے ہیں' جہاں تک ہمارا تعلق ہے یہ بات غالب کے سلسلے میں ہمارے لیے تو خاص طور پر صحیح ہے۔ اس کی شاعری نے جاگیردارانہ نظام کے سماجی اور سیاسی انحطاط کے آخری دور کا احاطہ کیا۔ سترھویں صدی عیسوی کے وسط سے انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک اردو شاعری کے کلاسیکی دور میں جو تجربات ہوئے' اس کی شاعری میں ان کا نچوڑ موجود ہے۔ ولی سے لے کر اس کے اپنے زمانے تک اردو کے تمام بڑے شعراء کا جو "موڈ" تھا' غالب نے اسے مجتمع کر کے اس پر اور سان رکھ دی اگر آپ اس تمام "موڈ" کو ایک فقرے میں ادا کرنا چاہتے ہیں تو اسے جاگیردارانہ جذباتیت کا نام دے سکتے ہیں۔

زمن:- تو کیا آپ خیال میں اس دور کے شعراء جن میں غالب بھی شامل ہے' جاگیردارانہ نظام کے پرستار اور اس کے استحکام کے خواہاں تھے۔

فیض:- میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ شعراء اس تہذیب' ان اقدار اور اس پورے نظام زندگی کو دم توڑتے ہوئے دیکھ رہے تھے جس کے وہ عادی تھے۔ لیکن ان کی نظر ان بنیادی سیاسی اسباب پر نہ تھی جو اس انحطاط کے ذمہ دار تھے اور نہ وہ اب تک اس صورت اور سماجی نظام کے ڈھانچے کو دیکھ سکتے تھے جو اس نظام کی جگہ لے رہا تھا جس کے وہ عادی تھے۔ ان کے اس موڈ میں تین اہم خصوصیات نظر آتی ہیں۔

1- جانی پہچانی چیزوں سے لگاؤ اور محبت جو ان کی نظروں کے سامنے ختم ہو رہی تھیں اور سماجی اقدار کو بدل رہی تھیں اس صورت حال نے ان کے دل میں سوز و گداز اور درد و ملال کا عنصر پیدا کر دیا۔

2- حال کے خلاف بے اطمینانی' بدگمانی اور عدم اعتماد جس کا مطلب تھا افراتفری اور بعضوں کے لیے اقتصادی بدحالی اس سے جو فلسفیانہ عناصر پیدا ہوئے وہ یہ ہیں: ماورائیت' دنیا کی انسانی زندگی کی بے ثباتی کا خیال جان و مال کو پرکاہ اور دنیاوی عز و جاہ کو بیکار ہی سمجھنا۔

3- اور آخر میں امید و بیم۔ امید خصوصاً" غالب کا حصہ ہے۔ مگر عام طور ان دیکھی چیزوں اور نامعلوم مستقبل کے متعلق خوف کا پایا جانا اہم موڈ تھا۔

غالب اس عہد میں آخر میں پیدا ہوا اس نے پرانے تجربات کا نچوڑ پیش کیا مگر ساتھ ہی اس نے ایک نئے ڈھنگ کا تعارف بھی کرایا اس لیے کہ قدامت کے رحم میں ایک نیا دور جنم لے رہا تھا۔ یہی وہ بات ہے جو غالب کو دوسرے شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔

زمن:- کیا آپ غالب کے طرز ادا اور طریقہ بیان پر بھی کوئی تبصرہ کریں گے؟

فیض:- ہاں ضرور' میں نے جو کچھ ابتک کہا ہے وہ غالب کا جذباتی اور تجرباتی پہلو ہے۔ لیکن دوسرا پہلو اس کی خاص طرز ادا ہے یعنی اس کی شاعری کی تشکیل اور قاعدہ' شاعروں کو کئی وجوہ سے اشاریت اور

پہلو دار طرز ادا اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اول تو یہ کہ اپنے تجربہ کو بلا واسطہ اور صاف وسیدھے طریقے' سے بیان کرنا بعض مواقع پر سیاسی مصلحتوں کے خلاف ہوتا ہے دوسرے یہ کہ نئے نئے تجربوں کے مقابلے میں جانے پہچانے طریقوں کے ذریعے اظہار خیال کرنا زیادہ آسان ہے۔ تیسرے یہ کہ شاعر کے لیے حقیقت داخلی اور جذباتی شے ہوتی ہے لیکن غالب کے یہاں اس داخلی اور ذاتی طریق کار میں سماجی احساس کا عنصر بھی ملتا ہے۔ اسی لیے اس کا کلام تنگ نظر اور اپنی ذات تک محدود ہونے کے بجائے کل سماج کا احاطہ کیے ہوئے ہے غالب کی طرز ادا کا ذکر کرتے وقت یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس نے منجمد اور باتوں کے اردو شاعری کو انانیت اور خود فریبی کے پنجے سے آزاد کرایا۔ اس نے استعارے کا نیا استعمال یعنی۔ Trans Fered Epithet شروع کیا (جیسے جنت نگاہ و فردوس گوش)۔ اچھی شاعری کی وہ خصوصیت' یعنی تشبیہ و استعارے سے مضمون آفرینی کے یہاں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔

ان سب کے علاوہ غالب نے مشاعروں کی ستم رانی سے شاعری کو نجات دلائی اس لیے کہ اس نے وہ لفظی شعبدہ بازیاں ترک کر دیں جو مشاعروں کے ان سامعین پر جن کا ردعمل معلوم و معروف ہے اثر اندازی کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ اس طور پر اس نے "بلند سنجیدگی" کی شاعری کا راستہ ہموار کیا۔

ہم شاعروں میں غالب وہ پہلا شخص ہے جس نے شاعر کا مرتبہ بحیثیت "ایک غیر سرکاری سماجی قانون ساز" کے پہچان لیا۔ حالانکہ شاعر کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ شاعر محض ایک درباری مصاحب یا عام تماشہ گری کا زرا ہمتر نمونہ ہے۔

زمن:۔ غالب کے قصائد کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

فیض:۔ اس کے قصیدے محض روزی پیدا کرنے کا ذریعہ تھے اس کا تعلق اس کی عظیم شاعری سے نہیں۔

زمن:۔ فیض صاحب' کیا آپ اکثر غالب کا کلام پڑھتے ہیں؟ اور کیا آپ کی اپنی شاعری پر اس کا کوئی اثر پڑا ہے؟

فیض:۔ دیوان غالب کا ایک نسخہ ہمیشہ میرے سرہانے رہتا ہے۔ میں اکثر' بلکہ بعض حالات میں روزانہ اس کا مطالعہ کرتا ہوں سو کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ غالب کا متبع نہیں ہے۔ میں اپنی شاعری میں اسے شعوری اور غیر شعوری طور پر استعمال کرتا ہوں۔

زمن:۔ فیض صاحب سیاسی طور پر براعظم ہند و پاک تقسیم ہوگیا۔ لیکن ہمارے ثقافتی ورثے اور تمدنی روایات کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں؟ اب ہم اس سلسلے میں کس منزل پر کھڑے ہیں؟

فیض:۔ دراصل سوال یہ ہے کہ ہمارے ثقافتی اور سیاسی مسائل اور بنیادی گتھیوں کا حل کیسے تلاش کیا جائے؟ لیکن ابھی تک کوئی بھی اس کام کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس کا اطلاق غالب ہی پر نہیں ہوتا۔ یہ تو ہمارے کلچرل کی پوری تاریخ کا معاملہ ہے۔ ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ ہمارے کلچر اور ثقافت کی تاریخ کہاں سے شروع ہوتی ہے' لیکن آپ جہاں سے بھی شروع کریں ہند کی تاریخ کا ایک حصہ ہماری تاریخ

کا بھی حصہ ہے اور ہماری تاریخ کا ایک حصہ ہندی تاریخ سے منطبق ہے۔ یہی بات ایران اور عرب کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔

ثقافتی ورثے تاریخ اور جغرافیہ سے متعلق ہوتے ہیں اور وہی کلچر کی حدود ہیں۔ جغرافیائی حدود اصل ہوتی ہیں لیکن تاریخ کی حدود کے ڈانڈے ضروری نہیں کہ جغرافیہ سے ملیں ہمارے جغرافیہ کی عمر 20 سال ہے مگر ہماری تاریخ پانچ ہزار سال پرانی ہے۔

میرا خیال ہے ہمیں اپنی ثقافتی اور تاریخی ہستیوں سے متعلق اہم تاریخوں کا ایک کلینڈر مرتب کرنا چاہیے۔ یہ ایک وسیع میدان ہے جو محمد بن قاسم سے قائداعظم تک' خسرو سے اقبال تک جس میں ابو الفضل فیضی میر اور غالب بھی شامل ہیں۔ اور تان سین سے روشن آراء بیگم تک۔ پھیلا ہوا ہے۔ ہمیں اپنے بڑے بڑے فنکاروں' مصوروں' معماروں اور فلسفیوں کو یاد رکھنا چاہیے جنہوں نے ہمارے کلچر کو مالا مال کیا ہے۔

حمیدہ سلطان

غالب کی محبوبہ

اسد اللہ خاں غالب نے آگرے کے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جو نصف صدی پہلے سمرقند سے آیا تھا۔ اپنے شجاعانہ بانکپن اور بے مثل دلیری سے ہندوستان میں بھی اس کو عزت و اعزاز مل گیا' اسی بنا پر غالب نے ذوق پر طنزیہ چوٹ کرتے ہوئے کہا تھا۔

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری

باب کا سایہ بچپن میں غالب کے سر سے اٹھ گیا۔ ننہیال امیر تھیں۔ اس لیے لڑکپن ہاتھوں چھاؤں گزرا اور اوائل شباب اللھوں تلوں میں تعلیم بھی باقاعدہ نہ ہو سکی' ہاں' اتنا ضرور پڑھ لیا تھا جتنا اس زمانے میں شرفاء کے لیے ضروری سمجھا جاتا تھا۔

تیرہ سال کی بالی عمر میں نواب الٰہی بخش خاں معروف کی چھوٹی صاحب زادی' امراؤ بیگم سے شادی ہوئی اور میرا یہ کہنا تعلی نہیں حقیقت ہے' اس شادی نے جس کو خوش طبعی سے مرزا صاحب عمر بھر "حبس دوام اور پاؤں کی بیڑی" کہتے رہے' ان کے ذوق شعری کو بلند کیا' کردار کو پاکیزگی بخشی۔ آگرے والی بے راہ روی اور رنگ رلیاں دلی کے مستقل قیام کے بعد غالب میں باقی نہیں رہیں۔ ان کے خسر دلی کے ایک بہت اونچے خاندان کے جو نہ صرف امارت' بلکہ علم و فضل کے لحاظ سے بھی اونچا تھا۔ ایک فرد تھے اور بڑے پایہ کے شاعر بھی اور اس وقت کے اہل علم نواب صاحب کے پاس اکثر جمع رہتے۔

نوجوان اور ذہین شاعر پر اس علمی اور ادبی ماحول کا اثر بہت اچھا ہوا' ان کا انداز فکر بدلا اور شاعری نے نئی تازگی پائی۔!

غالب کا فن' ان کی وجیہہ شخصیت کا عکس جمیل ہے' وہ تورانی النسل تھے' عالی خاندان تھے' اس لیے چوڑا چکلا ہاڑ تھا۔ بیضوی انداز کا بارعب چہرہ' سرخی مائل چمپئی رنگ' بڑی بڑی غلافی مخمور آنکھیں' چڑھی ہوئی مونچھیں' صفا چٹ داڑھی' سر پر کلاہ پیاخ' گلے میں شبنم کا کرتا اس پر نین سکھ یا جامدانی کی سینہ کشا "جیسے پھولوں کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہوں" اس ج دھج سے مرزا صاحب جب مشاعرے میں جاتے تو ہر ایک ان کی وجیہہ شخصیت سے مرعوب ہو جاتا۔ پھر ان کے اشعار بھی انسانی جذبات و احساسات کا ایک موجیں مارتا ہوا سمندر ہیں اور ہر مصرع زندگی کی مونہہ بولتی تصویر۔۔۔۔۔ فطرات کے لامحدود پہلو جس طرح جذبہ محبت کے تحت بنتے اور سنورتے ہیں' اس کو

بیان کرنے میں مرزا کو کمال حاصل ہے۔ اردو غزل کے روایتی معشوق کو غالب نے بالکل رخصت کر دیا' وہ تو اس دنیا کی عورت کو حوران خلد پر ترجیح دیتے ہیں۔

مثنوی "چراغ دیر" میں جس پر جوش اور البیلے انداز سے انہوں نے نازنینان بنارس کے دل ربا حسن کی تصویر کشی کی ہے' وہ ان کے فن کو بہت بلند کر دیتی ہے۔ غالب فرسودہ انداز سے محبوبہ کے سامنے بھیگی بلی بنے کبھی نظر نہیں آتے بلکہ ان کی فطری انا ہر موقع پر ان کے آڑے آتی ہے اور اپنی شوخ طبعی کی بدولت محبوبہ پر کبھی کبھی وہ پھبتی بھی کس دیتے ہیں:

پوچھ مت رسوائی انداز استغنائے حسن دست مرہون حنا رخسار رہن غازہ تھا

لیکن اس میں شک نہیں کہ اس شعلہ خو حسینہ سے مرزا بہت مرعوب بھی تھے جو ان کو اکثر نگاہ گرم سے تعلیم ضبط دیتی رہتی تھی۔ غالب کی محبوبہ شوخ و شنگ' فتنہ طراز تو ہے لیکن اردو شاعری کی روایتی درندگی کے خصائل اس میں بالکل نہیں اور یہ بھی بڑی دل چسپ بات ہے کہ غالب کا تصور شعری ساکت نہیں ہے' وہ اکثر اپنی محبوبہ کو چلتے پھرتے ہی دیکھتے ہیں:

موج خرام ناز بھی کیا گل کتر گئی لرزے ہے موج سے تری رفتار دیکھ کر

لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں

خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں آ'ہ بہار ناز کہ تیرے خرام سے

دستار گرد شاخ گل نقش پا کروں

غالب کی ساری شاعری پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجاز کے پردے میں حقائق بھی کچھ نہ کچھ موجود ہیں۔ مرزا صاحب کا یہ پاکیزہ انداز فکر اور دل آویز بیان کسی "ستم پیشہ" ڈومنی کے لیے ہی صرف نہیں ہوا تھا۔ آگرے میں ممکن ہے "حسن لب بام" سے ان کو کچھ دل چسپی رہی ہو اور ان کی حسین اور رنگین جوانی مشاغل عیش و طرب امیرانہ ماحول سے یہ بعید بھی نہیں کہ کوئی ڈومنی بھی ان کی منظور نظر رہی ہو گر یہ سمجھ لینا مرزا پر بہت بڑا ظلم ہے کہ ان کی پوری شاعری کا مرکز ایک ڈومنی ہو سکتی ہے غالب کی شاعری کا بے مثل حسن' انفرادی بانکپن جس نکتہ ناز کا عطیہ ہے ان کے فکر کو جس دل کش خیال نے یہ دل آویزی بخشی وہ کوئی ان کی ہی ہم مذاق اور عالی خاندان ناظورہ جمال تھی جس کے حسن صورت پر ہی نہیں' حسن سیرت و ذہانت کے بھی وہ گرویدہ تھے' جس کی اشارت و عبارت مرزا کے لیے بلائے جاں تھی اور وہ بے اختیار کہہ اٹھتے تھے۔

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو کاش کہ تم مرے لیے ہوتے

لیکن ایک شریف' پردہ نشین خاتون کا نام بھلا مرزا صاحب کی زبان پر کیسے آسکتا تھا۔ اس لیے کبھی اپنے دل کے درد کو بذلہ سنجیوں میں چھپاتے اور کبھی "ستم پیشہ ڈومنی" کا ذکر کر کے لوگوں کو ٹال دیتے۔ اس طرح وہ حسین وجود دنیا کی نظروں سے پنہاں ہی رہا جو دراصل مرزا کی شاعری کو رنگین و دل آویز بناتا گیا۔

میں نے اپنی نانی اماں' معظم زمانی بیگم باقر علی خاں سے سنا ہے جو عارف کی بہو اور نیر رخشاں کی بیٹی تھیں

اور جن کو بت جاہ و حشم اور بڑے چاؤ کے ساتھ غالب بیاہ کر اپنے گھر لائے تھے اور جو کئی سال تک ان کے گھر میں بہو کی حیثیت سے رہیں کہ مرزا غالب کی ایک شاگرد ترکی نژاد خاتون شاعرہ بھی تھیں' ان کو ترک کا تخلص مرزا صاحب ہی نے دیا تھا۔ میں نے اپنی نانی اماں سے سوال کیا آپ نے ان بیگم کو دیکھا تھا؟ انہوں نے جواب دیا۔ "نہیں اماں! میں ان کو کہاں سے دیکھتی وہ بے چاری تو غدر کے زمانے میں ہی مرگئی تھیں۔ مرزا صاحب سے ہی میں نے دو تین مرتبہ ان کا نام سنا تھا۔ کہتے تھے افسوس' ترک کی عمر نے وفا نہ کی' اگر جیتی رہتی تو بڑے پائے کی شاعرہ ہوتیں۔"

ترک کے متعلق مجھے نانی اماں سے اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ ان کے آباؤ اجداد بخارا سے آئے اور وہ نوعمری میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ پڑھی لکھی اور باذوق خاتون تھیں' اس لیے شوہر کی دائمی جدائی کے بعد شعر کہنے لگیں۔ نانی اماں فرماتی تھیں کہ پھپھی اماں (بیگم غالب) سے میں نے سنا کہ ترک کی ماما روزانہ ان کا کلام مرزا صاحب کے پاس اصلاح کرانے کے لیے لاتی تھیں۔ یہ سلسلہ 1857ء تک رہا' اس خونی ہنگامے میں ترک کو بھی دلی چھوٹنی پڑی۔ بادیہ پیمائی اور صعوبات سفر کی تاب ترک کا نازک جسم نہ لاسکا اور وہ گھر سے نکلنے کے چند مہینے بعد فوت ہو گئیں۔

اس کہانی کو سننے کے بعد میں نے اندازہ لگایا کہ غالب کے ہر شعر میں جو دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔ وہ اغلباً" ترک کا عطیہ ہے۔ یہ عالی دماغ اور سلجھے ہوئے خیالات والی خاتون ذہنی مناسبت اور ذوق کی ہم آہنگی کی وجہ سے یقیناً" مرزا صاحب کے خیالوں میں بس گئی ہوگی' غالب کے انداز فکر میں جو خلوص کی آنچ ہے اور دن بدن اس کی دل آویزی کو زیادہ سے زیادہ جس طرح محسوس کیا جا رہا ہے' اور اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ان کے اشعار کی ملیناً پر کیف ہے' یہ اسی کا پرتو ہے اور مرزا کے بعض اشعار سے بھی اس محبوب دل فریب کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔

کرے ہے بادہ ترے لب سے کسب رنگ فروغ — خط پیالہ سرا سر نگاہ گل چیں ہے
تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق — آئینہ بہ انداز گل آغوش کشا ہے
سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر — تو اس قد دل کش سے جو گلزار میں آوے
نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا — مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی
دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

مرزا کی 1840ء کے قریب لکھی ہوئی ایک مسلسل فارسی غزل ان کی دل کیفیت کی غمازی بھی ہے اور ایک نقش تابناک کی حیثیت بھی رکھتی ہے اور اس سے ایک غم گین حسینہ کا عکس بھی سامنے آتا ہے۔ پہلا مصرع ہے:

"گریہ از بس ناز کی رخ مادہ بر خاکش نگر"

اس پردہ نشین کی ایک جھلک دیکھنے پر ہی مرزا بے اختیار جھوم اٹھے تھے۔

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے — میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

کبھی اس محبوبہ دل نواز کی دل فریبی تحریر پر جاں نذر کرنے کی تمنا ان کے دل میں پیدا ہوتی تھی کبھی اس کی بے نیازی پر دل کو یہ کہہ کر سمجھا لیتے تھے۔

بے نیازی تری عادت ہی سہی

ایک مرتبہ یہ شعلہ خو حسینہ نہ جانے کس بات پر مرزا صاحب سے روٹھ بھی گئی اور ان کے نامہ شوق کا جواب نہیں دیا۔ مرزا صاحب بے چین تو بہت ہوئے لیکن اپنی شان مرزائی کو محبوبہ کے سامنے بھی برقرار رکھنا تھا اس لیے جب دل نہ مانا تو یہ لکھ کر بھیج دیا:

سبک سر بن کے کیوں پوچھیں کہ آخر سرگراں کیوں ہو

اس حقیقت سے تو سب ہی واقف ہیں کہ جیسا کسی انسان کا خیال ہوتا ہے۔ ایسا ہی اس کا فن ہوتا ہے۔ کسی بھی خلاق کا کمال اس کے تصور عشق میں بھی نمودار ہوتا ہے۔ غالب نے عشق کو "رونق ہستی" کہا ہے:

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے　　انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

غالب کا تصور عشق توانا اور حقیقت کے قریب ہے' فرسودہ خیالات اور یاوہ گوئی کا ڈھیر نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ غالب نے ایک حسین خیال کو چاہا اور چاہے گئے۔ انہوں نے جھوٹ کا طومار نہیں باندھا۔ اپنی کیفیات قلبی کو شعروں میں پیش کیا اور جس طرح جو بھی محسوس کیا' لوح و قلم کے حوالے کر دیا جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ اپنے اس اخلاص کی بدولت وہ جس مقام پر ہیں آج بھی تنہا کھڑے ہیں۔ کوئی ان کا حریف نہ بن سکا۔

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق　　ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

میرے خیال کی تصدیق اس سے ہوتی ہے کہ غالب پر تنقید کرتے ہوئے اکثر نقادوں نے لکھا ہے کہ غالب نے ایک نہیں کئی مرتبہ عشق کیا ہے۔ یوں تو وہ حسن لب بام' کے بھی شیدا ہوئے اور ایک "ستم پیشہ ڈومنی" کو بھی انہوں نے تاڑ رکھا' مگر وہ اس محبوبہ کو کبھی نہ پا سکے جس سے ان کو واقعی عشق تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنے داغ ناتمامی کو اس شمع سے تشبیہ دی ہے جسے کسی نے بجھا دیا ہو:

اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے　　میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغ ناتمامی

☆☆☆

ادارہ

تنہائی کی وادی میں

(غالب اور اختر شیرانی کے ساتھ)

جناب حفیظ ہوشیارپوری لکھتے ہیں : اختر شیرانی مرحوم کے ساتھ ایک صحبت میں غالب کے مشہور شعر زیر بحث آئے ۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ۔۔۔ ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے ۔۔۔ کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار ۔۔۔ اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

میرے اور اختر شیرانی مرحوم کے درمیان یہ طے پایا کہ وہ ان اشعار میں اضافہ کریں۔ اس طور کہ تنہائی کے مختلف مدارج اور اس کی کیفیتیں بیان ہو جائیں۔ اس کے بعد ان تمام اشعار کو میں مخمس کی صورت میں تضمین کروں۔ مرحوم نے اس زمین میں آٹھ شعر کہے۔ غالب کے تین شعر شامل کرنے کے بعد کل گیارہ شعروں کو اس طرح ترتیب دیا گیا کہ پہلا، دوسرا اور دسواں غالب کا اور باقی اشعار اختر شیرانی مرحوم کے تھے۔ غالب اور اختر شیرانی کی یہ ملی جلی غزل "رومان" میں شائع ہوئی، عنوان تھا "تنہائی کی وادی میں غالب کے ساتھ" اس پوری غزل پر میری تضمین جو ۸ ستمبر ۱۹۳۷ء کو شملہ میں لکھی گئی "رومان" ہی کے ستمبر ۱۹۳۷ء کے پرچے میں شائع ہوئی۔

غالب - اختر شیرانی - حفیظ ہوشیارپوری

کاش اب اندیشہ سود و زیاں کوئی نہ ہو ۔۔۔ دوستوں کا لطف، جور دشمناں کوئی نہ ہو
سر زمیں ایسی ہو جس پر آسماں کوئی نہ ہو ۔۔۔ رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

زندگی کو کیوں پریشاں تر بنایا چاہیے ۔۔۔ فکر ہستی کو نہ درد سر بنایا چاہیے
دل کو ویرانے کا ہی خوگر بنایا چاہیے ۔۔۔ بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

نکتہ چیں ذوق جنوں پر ہو نہ دنیائے دنی   اپنے بیگانے نہ ہم پر کر سکیں طعنہ زنی
خوف تنہائی سے گرچہ اپنی جاں پر ہو بنی   اہل عالم ہوں نہ ربط دوستی و دشمنی
مہرباں کوئی نہ ہو نا مہرباں کوئی نہ ہو

عشق کو دل میں نہاں رکھنے کا یارا چاہیے   جوش غم کو ضبط پیہم کا سہارا چاہیے
اب یہ طرز بود و باش اپنی خدارا چاہیے   دامن صحرا میں چل کر یوں گزارا چاہیے
سر میں ہو بیتاب سودا، آستاں کوئی نہ ہو

حرف باطل ہو سراسر شکوہ جور و جفا   دفتر پارینہ ہو افسانہ مہر و وفا
آشنا کے نام تک سے کان ہوں ناآشنا   ابن آدم کے اثر تک سے ہو بیگانہ فضا
مرد و زن کوئی نہ ہو، پیر و جواں کوئی نہ ہو

کارفرما ہو شرر بن کر نہ سوز عاشقی   پھونک ڈالے صورت اخگر نہ سوز عاشقی
روح و تن میں ہو خلش پر ورنہ سوز عاشقی   زخمہ زن ہو بربط دل پر نہ سوز عاشقی
کوئی دلدادہ نہ ہو اور دلستاں کوئی نہ ہو

سب سے بے پروا، خوشی سے رنج تنہائی سہیں   کوئی ہمدم ہو نہ دل کی بات ہم جس سے کہیں
پونچھنے والا نہ ہو اور دمبدم آنسو بہیں   اپنی فریادوں کی نے میں رات دن کھوئے رہیں
ہم نوا کوئی نہ ہو ہم داستاں کوئی نہ ہو

حسن سے بیگانہ تر کر دے جو ذوق جستجو   اس طرح ہم چھوڑ کر جائیں جہان رنگ و بو
گونج اٹھے یہ "نالہ موزوں" فضا میں چارسو   دل میں پیدا ہی نہ ہو اول تو درد آرزو
ہو تو اس کی بے کسی کا رازداں کوئی نہ ہو

عشق کی تیرہ نصیبی پر نہ ہو گریاں کوئی   شوق کی دیوانگی پر بھی نہ ہو خنداں کوئی
رہیے گر چپ تو نہ ہو اس بات پر حیراں کوئی   روئیے تو ہو نہ اپنے حال کا پرساں کوئی
اور اگر فریاد کیجے، ہم زباں کوئی نہ ہو

کاش اپنی بے بسی کا ہو نہ کوئی رازدار   نالہ "یارب" سے بھی آئے ہمارے دل کو عار
جلائے غم ہو جاں، کوئی نہ ہو پر غمگسار   پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

زندگی میں آشنا لب جن کے شکوؤں سے رہے   مر کے بھی احساں اٹھائیں کیوں ہم ان احباب کے
ذکر مت کر لوح تربت کا حفیظ زار سے   "اختر اس تنہائی کی وادی میں اپنے واسطے
جب بنے تربت تو تربت کا نشاں کوئی نہ ہو"

مرزا غالب کا قصیدہ شمس الامراء

غالب کے فارسی مکاتیب میں ایک خط نواب شمس الامراء "شب دوئی حیدر آباد" کے نام ہے۔ اس میں وہ کہتے ہیں:-

"سعادت و قوت بخشنے والے خدا کا شکر ہے کہ میں اس دوری کے۔ وجود آپ کے خدا شناس ہوں، اس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ کے معتقدین میں کیوں نہ سہی میرے اس خوبی کی دلیل یہ ہے کہ مسلمانانِ عالم کے مخدوم مکرم مولانا عبدالرزاق نے جو سینے کے سید و رصد ق و صفا کی تصویر میں خود سے بیان کیا ہے۔ خاکسار کا ذکر آپ کی بزم جاوید میں ہوا۔ گویا آپ کی روانی بلیغ ساقی سے حاضر نہ ہونے والے اور دور بزدیک سب بہرہ یاب ہوتے ہیں۔ میری قسمت کا خواب گراں ختم ہو گیا اور دولت میری دلجوئی کے لئے میرے گھر میں داخل ہوئی۔ فطرت نے یہ حکم دیا ہے کہ شعر و سخن کو خاک کر دو۔ نظم کے ساتھ ایک رشتہ روحانی ہے۔ شروع میں ریختہ گوئی اور اردو زبان میں غزل سرا ہوا۔ جب فارسی زبان کا ذوق ہوا تو تمام میدان سے سامان سخن سمیٹ لیا۔ مختصر سا دیوان ریختہ جو زیر جدید ہوا ہے۔ قدرت طاق نسیاں بنایا۔ اب کم و بیش پچاس سال ہوتے ہیں کہ فارسی میں سخن آزمائی ہوں۔ صبح کے وقت میرے دل نے حکم دیا کہ مجھے دیکھو اور میری نیک طبع نے زمزمہ سرائی کے لئے پر پرواز بھرا۔ خدا کی حمد اور خداوند کی مدح کرنے کا آئی۔ ایک قصیدہ جو ۶۰ شعروں پر مشتمل ہے بند ذریعہ میں آیا۔"

جس قصیدے کا ذکر انہوں نے اس عبارت میں کیا ہے اُس کے ابتدائی دو شعر اسی خط کے آخر میں درج کر دیئے ہیں:-

اے مظہر کل در ازل آثار کرم را ——— منت بہ سر لوح ز اسم تو قلم را

اے تو کہ ازل کے دن لطف و کرم کا مظہر کامل بنا ——— تیرا نام لکھ کر قسم کا غذ پر احسان کرتا ہے

شمس الامراء کز شرف نسبت نامش ——— خور قبلہ بد اورنگ نشینانِ عجم را

شمس الامراء وہ شخص ہے کہ اس کے نام کی نسبت کے صدقے ——— شاہان عجم سورج کی پرستش کیا کرتے تھے

ان دو شعروں کے علاوہ اس قصیدے کے باقی ساٹھ شعر اظہار تلف ہو گئے ہیں کیونکہ کلیات نظم فارسی یا غالب کی دوسری تصانیف میں کہیں اس کا اندراج نظر نہیں آتا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ۶۰ شعر کا یہ قصیدہ آخر کیوں اور کس طرح ناپید ہو گیا؟ زیادہ تعجب اس لئے ہوتا ہے کہ شمس الامراء کے نام کا نسبتاً کم قیمت خط تو غالب نے اپنے پاس محفوظ رکھا لیکن ایک طویل قصیدہ جو آثار ناسر بشیر و کا قصیدہ تھا وہ اس سے زیادہ نہ سہی اسی قدر احتیاط کا مستحق بھی نہ سمجھا گیا۔ مرزا غالب اپنے مکاتیب میں بعض دفعہ تیس چالیس برس پہلے کی کہی ہوئی کسی غزل کے صرف ایک شعر کا ذکر بڑی محبت سے کرتے ہیں۔ اپنے ایک پرشکوہ قصیدے کو خاموشی سے بغیر ایک آہ کھینچے ہمیشہ کے لئے دفن کر دینا نہیں کس طرح گوارا ہو سکا؟

شمس الامراء کے قصیدے کا معاملہ ایک ضمنی مسئلہ ہے اس لئے کبھی زیر بحث نہیں آیا۔ حضرت مولانا غلام رسول مہر نے اپنی مبسوط تصنیف "غالب" میں جہاں بیشتر جزئیات کا ذکر کیا ہے وہاں اس مسئلے پر بھی بلفظ ڈالی ہے۔ فرماتے ہیں:-

"... انہوں نے ۶۰ شعر کا ایک قصیدہ شمس الامراء کی مدح میں لکھا۔ وہ ایک مکتوب کے ساتھ جس کی تاریخ معلوم نہیں حیدر آباد بھیج دیا۔ اس فارسی

قصیدے کے [illegible] مرزا غالب کے [illegible] [illegible] کسی اور کے نام [illegible]
کریم کیسے [illegible] [illegible] مرزا کے [illegible] غالب کا قصیدہ [illegible] [illegible] صاحب [illegible] بہت بڑی [illegible]

جناب قمر کی مندرجہ بالا [illegible] اور کہیں غالب کے [illegible] قصیدے کا منسوب کرنے کی کوشش تو میری نظر سے نہیں گزری لیکن میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس قصیدے کی تلاش میں غالب کے مطبوعہ کلام کے [illegible] کی ضرورت نہیں۔ یہ قصیدہ غالب کے کلیات نظم میں موجود ہے۔

ایک کا قصیدہ دوسرے کے نام پر کرنے کا دستور مرزا غالب سے بہت پہلے شاعری کی دنیا میں موجود تھا۔ قصیدہ شمس [illegible] مرزا [illegible] وہ ایک ملکے سے پردے کے پیچھے اب بھی غالب کے باقی کلام کے ساتھ شامل ہے۔ اگر ہم غالب کے مطبوعہ [illegible] پر نظر [illegible] تو دو قصیدے (نمبر ۱۱ اور ۵۶) ایسے ملتے ہیں جن کی زمین وہی ہے جس میں نواب شمس الامرا کے دو شعر لکھے گئے ہیں۔ قصیدہ [illegible] کا [illegible] ہے:

آوارۂ غربت نتواں دید صنم را ——— خواہم کہ دگر بتکدہ سازند حرم را

(بتوں کا غریب الوطنی کے عالم میں بھٹکتے پھرنا دیکھا نہیں جاتا؛ — میں چاہتا ہوں کہ کعبہ پھر بتکدہ بنادیا جائے)

یہ قصیدہ حضرت عباس ابن علی علیہ السلام کی منقبت میں ہے۔ اس قصیدے کے مضامین کسی مرثیہ قصیدے کے مضامین سے قدرۃً مختلف ہیں لہٰذا اس پر قصیدۂ شمس الامرا کا گمان قطعاً نہیں ہو سکتا۔

قصیدہ نمبر ۵۶ نواب وزیر الدولہ خاں بہادر والیِ ٹونک کی مدح میں ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے:

اے ذات تو با منبع منت، مدد و کرمرا ——— وے بر شرف ذات تو آہنگ [illegible] را

اے کہ تیری ذات میں عدل و کرم کی [illegible] صفت جمع ہو ——— [illegible] شرف [illegible] تمام [illegible] ہے

اس قصیدے میں ۵۰ شعر ہیں اور حاشیے میں لکھا ہے کہ شمس الامرا کے قصیدے کا بھی زمین میں ہونا اور تعداد اشعار کا دونوں قصیدوں میں تقریباً برابر ہونا محض اتفاق نہیں ہو سکتا اور اگر محض اتفاق ہے تو عجیب اتفاق ضرور ہے۔ مرزا غالب کے بارے میں اس قسم کے اشتباہ کی صورت اس لیے بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ فارسی شاعری کی معاصر روایات کے مطابق [illegible] [illegible] ممدوحین سے متعلق کوئی اصلیت کا اظہار مقصود نہیں ہوتا۔ [illegible] ان کے لیے اظہارِ کمال کا ذریعہ اور صلہ پانے کا جائز ذریعہ تھی۔ چنانچہ اسی نکتہ نظر کے مطابق وہ سمجھتے تھے کہ اگر کبھی بیٹے کا قصیدہ باپ کے نام پر [illegible] [illegible] نہیں۔ امجد علی شاہ کا ایک قصیدہ انہوں نے نام کے تغیر کے ساتھ بلا تامل واجد علی شاہ سے منسوب کر دیا۔ اپنے اس طرزِ عمل کو وہ بڑی حد تک جائز قرار دیتے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں:

"انوری نے بارہا ایسا کیا کہ ایک کا قصیدہ دوسرے کے نام پر کر دیا۔ میں نے باپ کا قصیدہ بیٹے کے نام پر کر دیا تو کیا غضب ہوا۔ اور پھر کیسی حالت اور کیسی مصیبت میں! اس قصیدے سے مجھ کو [illegible] [illegible] [illegible] منظور ہے۔"

جب قصیدوں میں ممدوحین کا رد و بدل یوں جائز قرار دے دیا گیا تو ذاتی سہولت کے پیشِ نظر شمس الامرا کا قصیدہ وزیر الدولہ کی خدمت میں پیش کر دینا کون سا دشوار تھا۔ شمس الامرا کے نام غالب نے جو فارسی خط لکھا ہے اُس کے مضمون سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی غالب نے دربار بہادر شاہ کے

اور سے دوبارہ اُردو میں شعر کہنا شروع نہیں کیا تھا۔ اُردو شاعری کا یہ آخری دور ۱۸۵۰ء سے شروع ہوا۔ اس لئے قیاس یہ چاہتا ہے کہ شمس الامراء کے نام کا خط اور قصیدہ غالب نے ۱۸۵۰ء سے پہلے لکھا ہوگا۔ شمس الامراء ۱۸۴۹ء میں چند مہینوں کے لئے نواب ناصر الدولہ کے مدار المہام رہے۔ اس لحاظ سے عجب نہیں کہ اس خط اور قصیدے کا سالِ تحریر ۱۸۴۹ء ہو۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ شمس الامراء کے بہت جلد معزول ہو جانے کی وجہ سے غالب کو اپنے قصیدے کا کوئی صلہ نہ مل سکا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ غالب کا قصیدہ حیدرآباد پہنچنے سے پہلے ہی شمس الامراء کی جگہ اُن کے جانشین سالار جنگ کا تقرر عمل میں آ چکا ہو۔ بہرحال اس واقعے کے بارہ برس بعد ۱۸۶۱ء میں جب نواب وزیر الدولہ کو قصیدہ بھیجنے کی ضرورت پیش آئی تو حالت یہ تھی کہ طبیعت کی جولانی سرد پڑ چکی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے قوائے ذہنی کو شل کر رکھا تھا۔ اُس وقت شمس الامراء کا یہی رکھا ہوا قصیدہ کام آیا۔ پہلے دو شعر کاٹ کر پانچ نئے شعر لکھے اور باقی پینسٹھ شعر بجنسہٖ قائم رکھ کر ستر شعر کا قصیدہ ٹونک بھیج دیا۔

لیکن محض تعدادِ اشعار ہی سے ٹونک کے قصیدے پر قصیدۂ شمس الامراء کا گمان نہیں ہوتا۔ تعدادِ اشعار سے قطعِ نظر مطبوعہ قصیدے کے بعض اشعار خود اپنی غمّازی کر رہے ہیں۔ مثلاً ایک شعر ہے ؎

در بزمِ تو گویند سخن می رود از من ——— از بلبلِ شیدا کہ خبر کرد ارم را؟

(کہتے ہیں کہ تیری بزم میں میرا ذکر ہوتا ہے ——— باغِ ارم کو بلبلِ شیدا کی خبر کس نے پہنچا دی؟)

اس شعر کا اشارہ شمس الامراء کے خط کے جس حصّے کی طرف جاتا ہے، وہ خود بخود ظاہر ہے۔

سب سے دلچسپ اور پُرلطف بات یہ ہے کہ قصیدے کی بحر شمس الامراء کے نام کو تو قبول کرتی ہے لیکن وزیر الدولہ کا نام اس میں نہیں کھپ سکتا۔ حالانکہ غالب کے دُوسرے قصائد میں ممدوح کا نام بہ آسانی قیدِ نظم میں آ جاتا ہے۔ بظاہر یہ ایک ایسی دقت تھی کہ اس کا حل کئے بغیر شاعر کو نواب وزیر الدولہ کے لئے ایک نیا قصیدہ لکھنا لازم آتا۔ لیکن مرزا غالب نے یہ پہلو بڑی خوش اسلوبی سے بچایا ہے ؎

معذورم اگر نامِ تو در بحر نگنجد ——— در کوزہ چساں جائے دہم دجلہ و یم را؟

(اگر تیرا نام بحر میں نہیں سما سکتا تو میں معذور ہوں ——— آخر میں دریا کو کوزے میں کس طرح بند کر دوں؟)

یہ نواب وزیر الدولہ کے قصیدے کا پانچواں شعر ہے۔ ان پہلے پانچ شعروں کو کاٹ دیجئے اور ان کے بجائے وہ دو شعر رکھ دیجئے، جو شمس الامراء کے نام غالب کے خط میں درج ہیں۔ شمس الامراء کا ۶۷ شعر کا وہی قصیدہ ہاتھ آ جائے گا جو بظاہر کسی پُراسرار وجہ سے ناپید ہو گیا تھا۔

حمید احمد خاں

قصیدے کے سو دو شعر کہتا ہوں ... ہے بہت ہے ... غالب کے قصیدہ تو ... ہے ... قصیدہ ...

کہ یہ کیسے ممدوح ہوا ... ممکن ہے غالب ... کے پڑنے کے بعد ... غالب کا قصیدہ ہی ہے۔ اگر کوئی صاحب ... تو بہت بڑی ... خدمت ہوگی

جناب تمکین کی مندرجہ بالا بحث کے علاوہ ہمیں غالب کے اس گمشدہ قصیدے کا سراغ لگانے کی کوشش میں یہی نظر نہیں گزری لیکن میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس قصیدے کی تلاش میں غالب کے مطبوعہ کلام سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ قصیدہ غالب کے کلام میں موجود ہے۔

ایک کا قصیدہ دوسرے کے نام پر کر دینے کا دستور مرزا غالب سے بہت پہلے شاعری کی دنیا میں موجود تھا۔ قصیدہ شمس الامرا پر بھی یہی عمل ہوا چنانچہ وہ ایک ہلکے سے پردے کے پیچھے اب بھی غالب کے باقی کلام کے ساتھ شامل ہے۔ اگر ہم غالب کے مطبوعہ فارسی قصائد پر نظر ڈالیں تو ہم قصیدہ نمبر ۵۶ (اردو) ایسے ملتے ہیں جن کی زمین وہی ہے جس میں نواب شمس الامرا کی مدح کے دو شعر لکھے گئے ہیں۔ قصیدے کا مطلع یہ ہے:

آوارۂ غربت نتواں دید صنم را ——— خواہم کہ دگر بتکدہ سازند حرم را

(جنوں کا غریب الوطنی کے عالم میں بھٹکتے پھرنا دیکھا نہیں جاتا) ——— (میں چاہتا ہوں کہ کعبے کو پھر بتکدہ بنا دیں)

یہ قصیدہ حضرت عباس ابن علی علیہ السلام کی منقبت میں ہے۔ اس قصیدے کے انداز میں کبھی مدحیہ قصیدے کے مضامین سے قدرے مختلف ہیں لیکن اس پر قصیدۂ شمس الامرا کا گمان قطعاً نہیں ہو سکتا۔

قصیدہ ۵۶ نواب وزیر الدولہ بہادر والیٔ ٹونک کی مدح میں ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے:

اے ذات تو جامع صفت عدل و کرم ——— وے بر شرف ذات تو اجماع امم را

اے کہ تیری ذات میں عدل و کرم کی دو گونہ صفت جمع ہے ——— وہ مرتبہ جس پر تمام فرقوں کا اتفاق ہے

اس قصیدے میں ستر شعر ہیں اور معاملہ یہاں بھی وہی نظر آتا ہے کہ شمس الامرا کے قصیدے کا اسی زمین میں ہونا اور تعداد اشعار کا دونوں قصیدوں میں تقریباً برابر ہونا محض اتفاق نہیں ہو سکتا۔ وہ اگر محض اتفاق ہے تو عجب اتفاق ضرور ہے۔ مرزا غالب کے بارے میں اس قسم کے شبہات کی صورت اس لیے بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ فارسی شاعری کی مسلمہ روایات کے مطابق وہ بھی اس کو ممدوحین کے متعلق کسی اصلاح کا اظہار مقصود نہیں ہوتا، وہ پیشگوئی ان کے لیے اظہار کمال کا ذریعہ اور ساماں بہی کا جائز وسیلہ تھی۔ وہ اسی نقطۂ نظر کے تحت یہ بات کہتے تھے کہ اگر کسی سے بہتر دو شکار مل جائیں تو کیا مضائقہ نہیں۔ امجد علی شاہ کا ایک قصیدہ انہوں نے نام کے تغیر کے ساتھ بلا تامل واجد علی شاہ سے منسوب کر دیا۔ اپنے اس طرز عمل کو وہ بڑی صداقت سے جائز قرار دیتے تھے، چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں:

"انوری نے بارہا ایسا کیا کہ ایک کا قصیدہ دوسرے کے نام پر کر دیا۔ میں نے باپ کا قصیدہ بیٹے کے نام پر کر دیا تو کیا غضب ہوا۔ اور پھر کیسی حالت اور کیسی مصیبت میں! اس قصیدے سے محمد و عرض یہ تھا کہ سخن میں گدائی منظور ہے۔"

جب قصیدوں میں ممدوحین کا رد و بدل یوں جائز قرار دے دیا گیا تو ذاتی سہولت کے پیش نظر شمس الامرا کا قصیدہ وزیر الدولہ کی خدمت میں پیش کر دینا کون سا دشوار تھا۔ شمس الامرا کے نام غالب نے جو فارسی خط لکھا ہے اُس کے مضمون سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی غالب نے دربار بہادر شاہ کے

اُس سے دوبارہ اُردو میں شعر کہنا شروع نہیں کیا تھا۔ اُردو شاعری کا یہ آخری دور ۱۸۵۰ء سے شروع ہوا۔ اس لئے قیاس یہ چاہتا ہے کہ شمس الامراء کے نام کا خط اور قصیدہ غالب نے ۱۸۵۰ء سے پہلے لکھا ہوگا۔ شمس الامراء ۱۸۴۹ء میں چند مہینوں کے لئے نواب ناصر الدولہ کے مدار المہام ہوئے۔ اس لحاظ سے عجب نہیں کہ اس خط اور قصیدے کا سالِ تحریر ۱۸۴۹ء ہو۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ شمس الامراء کے بہت جلد معزول ہو جانے کی وجہ سے غالب کو اپنے قصیدے کا کوئی صلہ نہ مل سکا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ غالب کا قصیدہ حیدر آباد پہنچنے سے پہلے ہی شمس الامراء کی جگہ اُن کے جانشین سالار جنگ کا تقرر عمل میں آ چکا ہو۔ بہر حال اس واقعے کے بارہ برس بعد ۱۸۶۱ء میں جب نواب وزیر الدولہ کو قصیدہ بھیجنے کی ضرورت پیش آئی تو حالت یہ تھی کہ طبیعت کی جولانی سرد پڑ چکی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے قوائے ذہنی کو شل کر رکھا تھا۔ اُس وقت شمس الامراء کا یہی رکھا ہوا قصیدہ کام آیا۔ پہلے دو شعر کاٹ کر پانچ نئے شعر لکھے اور باقی ۵۶ شعر بجنسہٖ قائم رکھ کر ۶۱ شعر کا قصیدہ ٹونک بھیج دیا۔

لیکن محض تعداد اشعار ہی سے ٹونک کے قصیدے پر شمس الامراء کا گمان نہیں ہوتا۔ تعداد اشعار سے قطع نظر مطبوعہ قصیدے کے بعض اشعار خود اپنی غمازی کر رہے ہیں۔ مثلاً ایک شعر ہے ؎

در بزم تو گوید سخن می رود از من ——— از بلبل شیدا کہ خبر کرد ارم را؟

(کہتے میں کہ تیری بزم میں میرا ذکر ہوتا ہے   باغ ارم کو بلبل شیدا کی خبر کس نے پہنچادی؟)

اس شعر کا اشارہ شمس الامراء کے خط کے جس حصّے کی طرف جاتا ہے، وہ خود بخود ظاہر ہے۔

سب سے دلچسپ اور پُر لطف بات یہ ہے کہ قصیدے کی بحر شمس الامراء کے نام کو تو قبول کرتی ہے لیکن وزیر الدولہ کا نام اس میں نہیں کھپ سکتا۔ حالانکہ غالب کے دُوسرے قصائد میں ممدوح کا نام بہ آسانی قیدِ نظم میں آ جاتا ہے۔ بظاہر یہ ایک ایسی دقت تھی کہ اس کا حل کئے بغیر شاعر کو نواب وزیر الدولہ کے لئے ایک نیا قصیدہ لکھنا لازم آتا۔ لیکن مرزا غالب نے یہ پہلو بڑی خوش اسلوبی سے بچایا ہے ؎

معذورم اگر نام تو در بحر نگنجد ——— در کوزہ چساں جائے دہم دجلہ و یم را؟

(اگر تیرا نام بحر میں نہیں سماسکتا تو میں معذور ہوں   آخر میں دریا کو کوزے میں کس طرح بند کردوں؟)

یہ نواب وزیر الدولہ کے قصیدے کا پانچواں شعر ہے۔ ان پہلے پانچ شعروں کو کاٹ دیجئے اور ان کے بجائے وہ دو شعر رکھ دیجئے، جو شمس الامراء کے نام غالب کے خط میں درج ہیں۔ شمس الامراء کا ۵۸ شعر کا وہی قصیدہ ہاتھ آجائے گا جو بظاہر کبھی پُر اسرار وجہ سے ناپید ہو گیا تھا۔

احمد حمید خاں

رسولؐ نمبر کے بعد
دو نسلوں کی عاجزانہ کاوش

نقوش قرآن نمبر

- ہر مسلمان گھرانے کی ضرورت۔
- اپنے آپ کو اپنی آیندہ نسلوں کو سنواریں۔
- گھر میں رکھیں۔ ○ احباب کو تحفہ دیں۔
- 20 سے 25 جلدوں پر مشتمل ایک طویل سلسلہ جس کی تکمیل کا کام تیزی سے جاری ہے۔
- الحمدللہ پہلی دو جلدیں دستیاب ہیں۔
- اب الحمدللہ جلد سوم اور چہارم بھی دستیاب ہے۔
- صفحات فی جلد 725 تقریباً قیمت فی جلد -/250 روپے

نقوش
اُردو بازار ○ لاہور

فون: 7226516-7311291-7353525 فیکس: 92-42-7229389

ہماری چند ادبی کتب

پہلی بیوی اور دوسری کہانیاں

نوبل ایوارڈ یافتہ مصنفہ پرل ایس۔بک کی شاہکار تالیف ن م راشد کی نظر ثانی کے ساتھ قیمت 150 روپے

ڈبل کراس طارق اسماعیل ساگر

مصنف کا کبھی نہ بھولنے والا شاہکار ناول قیمت 150 روپے

آپریشن کہوٹہ طارق اسماعیل ساگر

ایسا ناول جس کی ایک ایک سطر تجسس، ایڈونچر اور وطن دوستی کے باب واکرتی محسوس ہوتی ہے قیمت 150 روپے

فاتح اندلس اصغر چودھری

اندلس پر ایک خوبصورت تاریخی ناول قیمت 150 روپے

انشاء اللہ خان انشاء ڈاکٹر تقی عابدی

حیات، شخصیت اور فن پر بلند پایہ تصنیف قیمت 200 روپے

رموز شاعری ڈاکٹر تقی عابدی

علم عروض، علم قافیہ، علم بیان، محاسن کلام، اقسام نظم و دیگر مربوط علوم ادب کا بیان قیمت 300 روپے

تحقیق شناسی مرتب رفاقت علی شاہد

تحقیق اور تدوین پر ایک خوبصورت کتاب قیمت 300 روپے

جستجو ڈاکٹر تحسین فراقی

اردو ادب پر خوبصورت مضامین کا مجموعہ قیمت 150 روپے

مکالمات ڈاکٹر احسن اختر ناز

ترقی پسند تحریک و صحافت پر دلچسپ معلوماتی انٹرویو قیمت 150 روپے

قلم درازیاں پروفیسر افضل علوی

طنز و مزاح سے بھرپور کتاب قیمت 300 روپے

القمر انٹر پرائزز غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

وہی تصور جو ڈھل گئی ہے رگوں میں میری لہو کی صورت ☆ اس ایک لڑکی کے نام اپنی حیات کا انتساب لکھو

نامور محقق و دانشور تسلیم احمد تصور کی شاعری کا خوبصورت مجموعہ

سمندر آنکھیں

نیا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے

قیمت 100 روپے

القمر انٹر پرائزز غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

دیوان غالب

____ اردو شاعری کے باوا آدم اور وقت کے حافظے میں زندہ رہنے والے شاعر کا مجموعہ

____ کلام غالب کے شائقین اور علم و ادب کے قارئین کے لئے بے بہا خزانہ

____ اغلاط سے پاک ____ مجلد خوبصورت سرورق سے آراستہ قیمت صرف 50 روپے

غالب کا مقدمہ پنشن

تحقیق : ڈاکٹر انیس ناگی

غالب کو دنیا سے پردہ کئے ڈیڑھ صدی ہونے کو ہے۔ لیکن غالب کی زندگی و شخصیت میں قارئین کی دلچسپی اب بھی نہ صرف قائم ہے بلکہ بڑھتی جارہی ہے۔

"غالب کا مقدمہ پنشن" غالب کی زندگی کا اہم مسئلہ تھا

____ غالب کو سب پر غالب کرنے میں اس مقدمے کا بڑا دخل تھا ____ اس کتاب میں وہ دستاویزات شامل کی گئی ہیں جو اس سے پہلے کبھی منظر عام پر نہیں آئیں۔ قیمت: 80 روپے

عظمتِ غالب

ڈاکٹر عبدالغنی

____ کوئی شاعر یونہی عظمت کے مرتبے پر فائز نہیں ہو جاتا اسکے پس منظر میں شاعر کی شخصیت، اس کا مزاج اور اس کا ماحول بھی شامل ہوتے ہیں

____ غالب کو عظمت سے ہمکنار کرنے والے محرکات کا جائزہ لینا ایک وقت طلب کام تھا لیکن مصنف انگریزی ادب کے استاد ہونے کے باوجود عظمت غالب کو تحقیقی انداز سے آشکار کیا ہے۔

مجلد ایڈیشن قیمت 75 روپے

القمر انٹرپرائزز غزنی سٹریٹ، اُردو بازار ○ لاہور

سوچ

نوادراتِ غالب

بخدمت مولوی صاحب معظم مسلم علمائے عرب و عجم مولوی ضیاء الدین خاں صاحب [illegible]

جناب مولوی صاحب میں نے ایام دبستان نشینی میں شرح مائۃ عامل تک پڑھا بعد اس کے لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق و
فجور و عیش و عشرت میں منہمک ہو گیا فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر و سخن کا ذوق فطری و طبعی تھا ناگاہ ایک
شخص کہ ساسان پنجم کی نسل میں سے معہذا منطق و فلسفہ میں مولوی فضل حق مرحوم کا نظیر اور مومن
موحد و صوفی صافی تھا میرے شہر میں وارد ہوا اور لطائف فارسی بحت اور غوامض فارسی آمیختہ بعربی
اوس سے میرے حالی ہوئے سونا کسوٹی پر چڑھ گیا ذہن معوج تھا زبان دری سے پیوند ازلی اور استاد بے مبالغہ
جاماسپ عہد و بزرجمہر عصر تھا حقیقت اس زبان کی دلنشین و خاطر نشان ہو گئی

اہل پارس جو قدم عالم کے قائل ہیں وہ مثل ہنود کے آفرینش عالم کا آغاز و انجام و سرو بن نہیں بتاتے
ہمارے مذہب کے موافق بھی کیومرث وغیرہم کی سلطنت کو دو چار ہزار برس سے کم نہ گزرے ہوں گے تا آنکہ اور
نجوم اور طب اور فقہ اور انشا اور انشاء کونسا علم اور کونسا فن ہوگا جو اوس گروہ میں نہ ہوگا سکندر جب
ایران پر مسلط ہوا تو ارسطو کی کتابخانہ دارا سے بہت سے علوم یونانی زبان میں نقل کیے القصہ اوس
گروہ کو دیکھیے جن کا کلام علم حکمت میں حکمائے یونان کا ماخذ ہو اگر ابو علی سینا و ابونصر [illegible] کتابیں
سب کتب حکمائے یونانیہ لیکر مرتب حکمیہ کو زبان عربی میں نقل نہ کرتا تو ان کا عرب میں سوائے مسائل فقہیہ شرعیہ
علم معقول کا نشان نہ پایا جاتا

دو تین ہزار برس قبل آج سے کہ عرب و عجم بیگانہ ہمہ گر تھے اہل پارس اپنی مذہب علم بلکہ علوم معقولہ کو
کس زبان میں شرح کیا کرتے تھے اور تعلیم و تعلم و سوال و جواب کا مدار کن الفاظ پر ہوگا بے شبہہ الفاظ
پارسی ہوں گے جب خلیفہ ثانی کے عہد میں یزدجرد مارا گیا اور پارس پر اعراب مسلط ہوئے درفش کاویانی
کا جواہر آمود چھرا پارہ پارہ ہو کر غازیان اسلام میں بٹ گیا کتابخانے پارس کے کیا بادشاہی اور کیا
امرا و رعایا کے جو لوٹ میں چھوٹ گئے پھینکے اوس حمام جیسا کہ میں نے ایک جگہ اس واقعہ کو فارسی عبارت
میں لکھا ہے وہ یہ ہے مذا کتابخانہا پارسیاں افروزینہ گلخن گرمابہ ہا بغداد شد ہمانا احکام آتش پرستی
ہم بہ آتش باز گشت اگر چہ بلاغت خاص اہل عرب کے حصے میں آئی [illegible] فصاحت میں اہل پارس بھی
ان کے شریک ہیں بالجملہ اعیان عجم و بلغائے عرب میں امتزاج و اختلاط و مہر و محبت و قرب و قرابت

نامہ غالب کے بعد غالب کا سب سے طویل خط جس میں 72 ریما ہیں۔ یہ خط 1862ء کے بعد
تحریر کیا گیا۔ اس کے مکتوب الیہ مولوی ضیاء الدین خاں پروفیسر دہلی کالج تھے۔ جنہیں شمس العلماء
کا خطاب، اور ایل ایل ڈی کا اعزاز ایڈنبرا یونیورسٹی سے ملا تھا۔ سال وفات غالباً 1909ء ہے۔

(۲)

پیدا ہوئے اختلاف مذہب او تہہ گیا تھا امور ریاست و سیاست اصلاح و جواہد بید فریقین ہونے لگی جب
طبیعتیں تھیں دراک فارسی وعربی کو باہم ربط دیگر ایک اُردو پیدا کیا سچ القدوہ زبان نکلی کہ نہ
عربی فارسی میں وہ مزا نہ عربی میں وہ مذاق زبان فارسی کے قواعد کے کتب خاکستر ہوگئی تھی اوس پر
طرّہ یہ اعراب کے قواعد کی بڑی بڑی جلیل القدر رسالی مرتب ہوگئی تھی اور ہوتے جاتے تھے بیچارہ فارسی زبان
غریب الوطن بے سر و سامان نہ اسکی کوئی فرہنگ اسکی قوانین کا کوئی رسالہ نہ علم پارسی کا کوئی عالم باقی
دو چار ہزار لغت و اسم و فعل زبان زد اہل عصر ہونگی فارسی کا صرف کہاں فارسی کا نحو کہاں فارسی
زبان اعراب کی لونڈی جو چاہا نام رکھدیا منور النہار کہہ کر پکارا شمس النہار کہکر بلا لیا او لونڈی
چھوکری کہکر بلا لیا سو بھی جو اکابر فریقین موجد اردو زبان ہوئے تھی وہ تسمیہ قواعد فارسی کیطرف
متوجہ نہیں ہوئے تھے یا تسعہ ہجریہ میں ہو سکا کہ لوگ فارسی کی فرہنگ لکھنی پر متوجہ ہوئے
نہ ایک نہ [illegible] بلکہ ہزار دو ہزار فرہنگیں فراہم ہوگئیں یہانتک کہ قتیل نو مسلم لکھنوی اور غیاث الدین
ملا مکتب دار رامپوری اور کوئی روشنغل جو نیور اور کہانتک کہوں کون کون جسکے جیمیں آئی وہ مقصد
تحریر قواعد انشا ہوگیا میں ان سبکو یا اونمیں سے مخصص فلاں و بہماں کو اپنا مطاع کیونکر جانوں اور
کسی دلیل سے اونکی تحکیم کو مانوں ۱۲

یار سیاح سابق جو جانتے غیر کہ فاعل کسکو کہتے ہیں اور جمع کسی مرض کا نام ہی امر کا صیغہ کون جانور ہے
اور اسم جامد کس قسم کے پتھر کو کہتے ہیں اونہوں نے کبھی کہا ہوگا کہ دانا و بینا صیغہ اسم فاعل اور
نالاں و گریاں صیغہ [illegible] فاعل یا حالیہ ہے ایک عجم نے کہہ دیا کہ الف نون افادۂ معنی فاعلیت کرتا ہے
ایک صف ایکار اوٹھا ہر الف نون علامت حالیہ ہے خدا جانے اہل پارسی صیغہ امر کو اپنی زبان میں کیا کہتے ہونگے اور
الف فاعل کا او نکے لسان میں کیا نام ہوگا آخر یہ فن امور دینی میں سے تو نہیں ہے کہ جو امام اعظم کے قول
کو نمانے وہ مرتد ہے قوت قیاسی کا مادہ اور وہ نہیں تھا ہمکو مبدا فیاض سے یہ قوت عطا نہیں ہوئے
اور یہ الف نون حالیہ کے وجود کے اعتراف میں تمہیں منفرد نہیں ہوں بقول تمہارے اور اشخاص بھی
ہیں سوال اسقدر ہے کہ الف نون حالیہ موجود ہے یا نہیں سائل کا تو جواب دیجے تمام ہوا جواب

تم نے فرمایا کہ سابقین افغان و خیزان کے الف نون کو حالیہ لکھہ گئے لاحقین نے کہا کہ یہ الف نون فاعل کا ہی خیر ایک تردد اگر پیدا ہوا تو تسمیہ میں پیدا ہوا متاخرین کا قول متقدمین کے کلام کا ناسخ اور الف نون حالیہ کے وجود کا مبطل تو نہیں ہوا بہر حال یہی لکھہ کہ بعض لوگ اس الف نون کو فاعل کا الف نون بتاتے ہیں اور بعض الف نون حالیہ کہتے ہیں قصہ مختصر کاغذ استفتا مع دستخط حضرات یا اپنی دستخط کل میرے پاس بھیج دیجے ۱۲

تھوڑی سی تقریر اگرچہ خارج از مبحث ہے لیکن اسواسطے وہ تقریر تحریر میں لاتا ہوں کہ پھر مجھکو کہنا نہ پڑے اہل پارس کے منطق میں روز و دو ز ہے مع نظائر کے وہ بہت ہیں کہ اس قسم سے ساتھ مختص نہیں جیسے اہل عرب نے بلکہ توبہ تو بہ میں اونکو کیوں متہم کروں فرہنگ نگاران ہند نے یہ نام موافق اپنے قیاس کے رکھے ہیں ہم افادہ معنے فاعلیت لینے والوں سے قیاس کو نہیں مانتے الف نون حالیہ کہتے ہیں اون کے معنے مطابقت رکھتے ہیں فارسی میں اسم فاعل صورت پر ہے یا گو ہندہ یا گو یا صیغہ امر کے مابعد جو الف نون ہے وہ حالیہ ہے ہاں فعل کا ایک توہم سا گزرتا ہے سو اگر بہ امعان نظر دیکھیے تو ویسا ہی ایک وہم مفعولیت کا بھی پایا جاتا ہے پس نظر اس بات پر کہ فاعلیت کی حالت اور مفعولیت کی حالت معا پائی جاتی ہے یہ الف نون حالیہ ہے اور اپنی وجود کے اثبات میں قواعد نحو عربیہ کا محتاج نہیں خاص افاد نہیں دیکھو افتندہ مستعمل ہے مثل گویندہ افتان مسموع و موجود ہے مثل گویا افتان صیغہ فاعل کہاں سے آ گیا اور دوسری دلیل یہ ہے افتان کو ہم اسم فاعل جب جانتے کہ آفت و [illegible] بمعنی امرا اہل زبان بمعنی مالک ملکہ اردو فارسی و عربی میں اونکے نظم و نثر میں آیا ہوتا اصل مادہ افتان جو افت ہے موجود نہیں افتان کہاں سے بمعنے فاعل نکل آیا گمراہ کرنے کے علاوہ جیسے طار ہو وہ افتان ہے از روی حالت نہ بحسب فعل میر نورہ کہنہ مرد میں سے کیوں نہ بنا یا صیغہ فاعل متروک رہا صرف صیغہ مفعول یعنی مردہ پر قناعت کی اور یہہ جو قبلۂ اہل سخن فردوسی طوسی علیہ الرحمہ کے ہاں آیا ہے

(۴)

میان کرے اور ہرگز ہمیر مجازی امر ہی اور بعد یہ بہی متاخرین مین سے ہی عبدالقادر بیدل
کہتا ہی سے ہمیری سرکشی ناپاک تا یکدم ہیاساتی بلکہ اردو مین بہی گرانجانی آدمیکو کہتی ہین
ای فلان کے فلان مرجایگا سودا کہتا ہے سے جیتا رہیگا کب تلک ای خضر مرکہین یہ سب طریق
مجازی ہی خلاصہ یہ کہ الف نون قابل ہیچ نہ فارسی تحتی تہا نہ فارسی آمیختہ بعربی مین ہے فیسر
مین مانتا نہین الف نون جزئی اسمای جو جامد کے آگے ہے جمع کا ہی اور جہان صیغہ ہای اور کے آگے

ہے حالیہ ہے والسلام بہ الوف الاحترام
بہارقہ بعد پڑہنے کی یا نقل لینے کے
استفتا کے کاغذ کے ساتھ مجکو واپس
ملی نجات کا طالب غالب

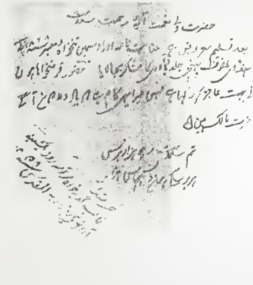

غالب کے آخری خط کا عکس

حکیم محمد آرٹسٹ کی بنائی ہوئی قیاسی تصویر جو سب سے پہلے تاریخ ادب ۱۹۰۰ء مطبوعہ نولکشور لکھنو سے شائع ہوئی تھی۔

غالب کی تصویر جو مصور مشرق عبدالرحمان چغتائی کے موقلم کا نتیجہ ہے۔

مہر نیمروز کا سرورق جو 268 ہجری میں فخر المطابع میں فتح الملک ولی عہد بہادر سلطان فخر الدین (مرزا فخرو) کے حسب الحکم شائع کی گئی۔

رو داد پانزدہ ماہہ
غالب ناکام است واین
نامہ را دستنبو نام است
زہی پارسی نیامیختہ بہ تازی
خوشا آئین سخن پرداز ۱۲

دستنبو کا قلمی نسخہ جو غالب کے کاتب خاص کا لکھا ہوا ہے۔ اس نسخے کی اہمیت یہ ہے کہ غالب کے پاس رہ چکا ہے۔ اور پوری کتاب کے حواشی مرزا غالب نے خود اپنے ہاتھ سے تحریر فرمائے ہیں۔

غالب کا مزار۔ اس وقت مقبرہ تعمیر نہیں ہوا تھا۔

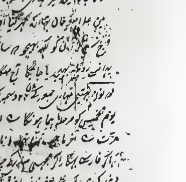

میرزا غالب کے وہ سات نادر خطوط جن کی عکسی نقول کو پہلی مرتبہ سورج کے صفحات کے ذریعے منظر عام پر لایا جا رہا ہے۔

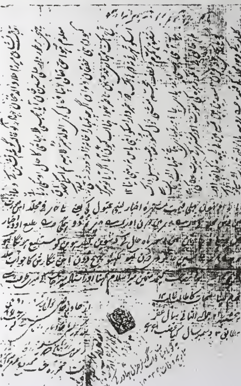

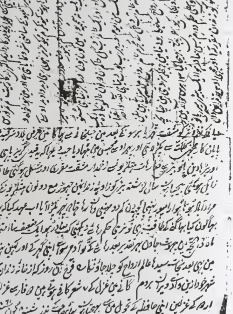
سیا فکر لذتوں کو مشقت تھی بارہا برسوں کے بعد میں جیلخانے سے بھاگا میں عرفی بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا
بابان کا محبس کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اسی محبس میں بٹھا دیا جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے دو ہتکڑیاں
اور بڑھا دیں پانو بیڑی سے فگار ہاتھ ہتکڑیوں سے زخمدار مشقت مقرری اور مشکل ہو گئی طاقت یکقلم
زائل ہو گئی بے حیا ہوں سال گذشتہ بیڑی کو زاویہ زنداں میں چھوڑ مع دونوں ہتکڑیوں کے بھاگا میرٹھ
مراد آباد ہوتا ہوا رامپور پہنچا کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا
بھاگوں کیا بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی حکم رہائی دیکھئے کب صادر ہو ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اسی
ماہ ذی الحجہ میں چھوٹ جاؤں بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا
میں بھی بعد نجات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤں گا ... روز کہ از خانہ زندان تن
شہر خود از ین و آدویران بردم گانے میں غزل کے شعر کافی ہوتے ہیں فارسی غزلیں اور
اردو کی غزلیں اپنی حافظے کی تحویل میں ... سہ شنبہ ... ۱۸۶۱

بلاحظہ مولانا غالب صاحب کو اپنا دعاگو اور خیرخواہ تصور کریں
مادہ ہای تاریخ کو نہ آپ قالب نظم میں لاتیں نہ اور کو اس امر منکر
کے تکلیف دیں بہات سمجھو یزید بر لعن منجملہ نمبات بہا لیکن تقریبا
کہنہ تی میاہ بر یزید لعنت کہ مومن نے اوسکے ہجو میں قصیدہ نہیں
لکہا ابداع مادہ ہای تاریخ تہا حسنات میں لکہا گیا مشاب م
ہو چکا اجر باؤگے انشاء اللہ اب اپنی کو بدنام اور ولی نعمت کو
ملول اور عدو کو ظاہر اوراگر ظاہر ہے تو محکم نکرو ۱۲

علی بخش خاں مرحوم مجھسے چار برس چھوٹا تہا میں ۱۲ سنہ میں پیدا
ہوا ہوں اس رحمت میں ہوں سے شروع برس شروع ہوا ہے اوس
۲۲ برس کا عمر ہی میں نی تقریر و تحریر کا آدمی تہا۔ اکبر آباد میں مشہور صاحب
سے ملی اثنای مکالمت میں کہنے لگی کہ میں چچا جان کے ساتھ جرنیل
لارڈ لیک صاحب کے لشکر میں موجود تہا اور ہولکر سے جو محاربات

جنگ میں وہ بھی شامل رہے ہونگے یاد ہے ہو گئے ہے ورنہ اگر قبا و پیرہن ہی اوتار کر دکھلاؤں تو سارا بدن
تمام ٹکرے ہے جابجا تلوار اور برچھے کے زخم ہیں وہ ایک بیدار مغز و دیدہ ور آدمی انکو دیکھ کر
کہنے لگا ہم تو اب جب ہم ایسا جانتے ہیں اور کم جرنیل صاحب کے وقتیں چار یا پانچ برس کے ہو گئے ہونگے
آپ نے کہا کہ درست بجا ارشاد ہوا حق عدالتش بیامرزاد و بدین در و فہا تنگ گیراد غالب ۱۲

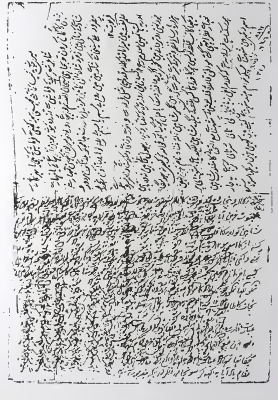

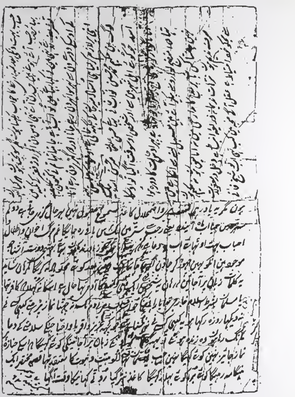

اسد اللہ خاں غالب تخلص قوم کا ترک سلجوقی سلطان برکیارق سلجوقی کی اولاد میں سے اسکا دادا
قوقان بیگ خاں شاہ عالم کے عہد میں سمرقند سے دلی میں آیا پچاس گھوڑے اور نقارہ و نشان سے بادشاہ
کا نوکر ہوا پہاسو کا پرگنہ جو اب سمرو کی بیگم کو سرکار سے ملا تھا وہ اسکی جاگیر میں مقرر تھا باپ
اسد اللہ خاں مذکور کا عبد اللہ بیگ خاں ~~[illegible]~~
~~[illegible]~~ اکبرآباد میں جا رہا اب اسد خاں اکبرآباد میں پیدا ہوا
عبد اللہ بیگ خاں الور میں راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا اور وہاں ایک لڑائی میں مارا
گیا [illegible] جب اسد خاں مذکور پانچ برس کا تھا اسکا حقیقی چچا نصر اللہ بیگ خاں مرہٹوں کی
طرف سے اکبرآباد کا صوبہ دار تھا ۱۸۰۳ میں جب جرنیل لیک صاحب اکبرآباد پر آئے تو نصر اللہ بیگ خاں
نے شہر سپرد کر دیا اور لیک صاحب کے جرنیل صاحب نے چار سو سوار کا برگیڈیر کیا اور ایک ہزار سات سو روپیہ
تنخواہ مقرر کی [illegible] اپنی [illegible] برس [illegible]
سوار [illegible] جرنیل صاحب نے وہ [illegible] پرگنے [illegible] کو [illegible] فرمان
[illegible] جاگیر مقرر ہو گئے [illegible] مہینے کے بعد [illegible] ناگاہ [illegible] مر گیا جاگیر سرکار میں
بازیافت ہوئی اور اسکے عوض نقدی مقرر ہو گئی [illegible] اور [illegible] کا [illegible]
سات سو روپیہ سال اس شخص کی ذات کو [illegible] میں ملتے ہیں اسنے [illegible]
ہنر [illegible] پیدا کیا نہ فقط شعر بلکہ نثر میں بھی دستگاہ رکھتا ہے نثر کی تین کتابیں پنج آہنگ
مہر نیمروز دستنبو فارسی نظم کا کلیات دس ہزار بیت کا بالفعل [illegible] اخبار لکھنؤ میں
چھپا ہوا ہے [illegible] گورنمنٹ میں اسکی [illegible] ہے [illegible] عوض قصیدہ [illegible]

نہیں ہے بلکہ فقیر کے نزدیک جمع الجمع ہی نہیں ہے مثلاً معانی جمع ہے اور احکام جمع اور
اسرار جمع ہے یہ آدمی لکھ سکتا ہے مگر ان آمال ہا یہ کہ جسکی شہرت ہے سو خطائے بزرگان
گرفتن خطاست ہمکو اپنی تہذیب سے کام ہے اغلاط میں سند کیوں ڈھونڈھتے ہیں
مثلاً حضرت حافظ نے لکھا ہے سو صلاح کار کجا و من خراب کجا ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا
میری جان ایسے موقع میں یہ چاہیے کہ بزرگوں کے کلام کو ہم مورد اعتراض نہ کریں اور خود اسکے
پیروی نہ کریں فقیر گوارا نہیں رکھنیکا جمع الجمع کو اور برا کہیگا حضرت صائب کو جنکی شہرت
فلانے شخص کے انتقال کی یہ غلط البتہ میرا بھی موجب ملال ہے مگر یہ کوئی واقعہ عظیم
ہولناک ہے کہ چھاپے کے اخبار اسکو چھاپیں آپ اس طرف اتنا اعتنا نہ فرمائیے گر ماند
آفتاب بمیرد عزا مگیر ور تیرہ ذرہ گشتہ نشد نوحہ خوان مخواہ میں کالے صاحب کے مکان سے اٹھ
آیا ہوں بلیماروں کے محلے میں ایک حویلی کرایہ کو لیکر اسمیں رہتا ہوں وہاں کا میرا رہنا
تخفیف کرایہ کے واسطے نہ تھا صرف کالے صاحب کی محبت سے رہتا تھا اس واسطے اطلاع کرکے تمکو
لکھا ہے اگرچہ میرے خط پر حاجت مکان کے نشان کی نہیں ہے اردو بازار دہلی پہنچنا کافی ہے
مگر اب بلیماروں نہ لکھا کرو محلہ بلیماران لکھا کرو اور ہاں صاحب ہمارے شفیق بابو صاحب کا حال
لکھو مسہل سے فراغت ہوگئی اور مزاج کیسا ہے اور اب اجمیر اور وہاں سے آبو پہاڑ کو کب
جائینگے میرا سلام بھی کہہ دیجیگا والسلام اسد اللہ محررہ دو شنبہ بست و دوم اپریل ۶۰ء

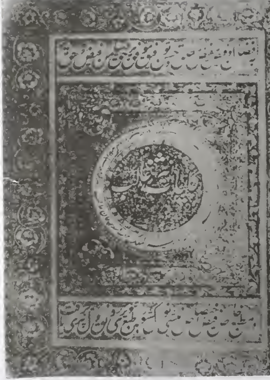

کلیات نثر غالب کا سرورق جو غالب کی زندگی میں 1868ء میں مطبع نول کشور سے شائع ہوئی۔

کلیات غالب فارسی، حاشیہ پر غالب کی تحریر ہے۔ یہ کتاب نواب مصطفیٰ خان کے لیے 1257ھ میں لکھی گئی۔ غالب نے اس پر نظرثانی کی اور حاشیہ پر بعض جگہ خود سے تحریر فرمایا۔

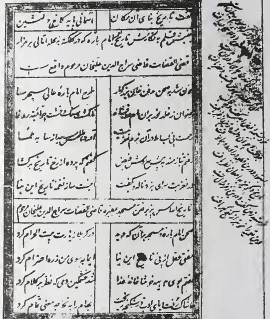

یہ دونوں عکس کلیات غالب کے اس قلمی نسخے سے لیے گئے ہیں جو ان کے فارسی کلام کا قدیم ترین مجموعہ ہے۔ نسخے کے حاشیے پر بعد میں کچھ اور نیا کلام درج کیا گیا ہے۔ حاشیے پر پانچ فارسی مثنویاں درج ہیں۔ اس سے ان مثنویوں کے زمانہ تصنیف کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس نسخے میں مختلف مقامات پر غالب نے حک و اصلاح سے کام لیا ہے۔ دو مختلف صفحوں کے حاشیوں پر مرزا نے اپنے دو اشعار کے مطالب اردو میں لکھے ہیں۔

(۸)

مکتوب غالب بنام مرزا یوسف علی خاں، عزیز

سعادت و اقبال نشان مرزا یوسف علیخاں کو بعد دعا کے دلنشین ہو کہ تانیث و تذکیر ہرگز متفق علیہ جمہور نہیں
ایک لفظ اس ملک کے لوگوں کے نزدیک مذکر ہے اہل پورب اسکو مونث بولتے ہیں خیر جو میر زبان ہے
وہ میں لکھدیتا ہوں اس باب میں کسیکا کلام حجت اور برہان نہیں ہے ایک گروہ نے کچھ مان لیا ایک گروہ
نے کچھ جان لیا اسکا قاعدہ منضبط نہیں الف مذکر بے تے ثے مونث جیم مذکر حے خے مونث دال ذال
رے زے مونث سین شین مذکر صاد ضاد طا ظا مونث عین غین مذکر فے مونث قاف کاف لام میم نون مذکر واو
ہے یے مونث ہمزہ مذکر لام الف حروف مفردہ میں نہیں مگر بولتے ہیں مذکر بولا جائیگا مثلاً لام الف کیا خوب
لکھا ہے کہینگے کیا خوب لکھی ہے نہ کہینگے خرزادہ خداوندزادہ کا مخفف ہے لیکن فارسی میں نہیں عربی نہیں
کا روزمرہ تھا خرزادہ اور خرزادی رادف صاحبزادہ اور صاحبزادی مگر فی زماننا متروک ہے فی فارسی لغت نہیں
ہو سکتا عربی بھی نہیں روزمرہ اردو ہے جیسا کہ میر حسن کہتا ہے کہ ستم ہے دیکھئے جا ہے فی شعرائے حال کے کلام
میں نظر نہیں آتا تکیہ لفظ عربی الاصل ہے فارسی والے اردو میں مستعمل ہے دونوں زبانوں میں بمعنی بالش اور بمعنی
مکان فقیر آتا ہے ایرانی تکیۂ میرزا صائب مشہور ہے گل تکیہ لفظ مرکب ہے ہندی اور فارسی سے گل مخفف
گالی کا اور تکیہ بمعنی بالش وہ چھوٹا گول تکیہ جو رخسار کے تلے رکھیں گل تکیہ کہلاتا ہے گل بمعنی یہاں سے انگریزی لغت
ہے انگریزی زبان نے بنگالہ میں سو برس سے اور دلی اکبرآباد میں ساٹھ برس سے رواج پایا ہے گل تکیہ وضع کیا
ہوا نور جہان بیگم کا ہے جہانگیر کے عہد میں اہل ہند کیا جانتے تھے کہ گل کیا چیز ہے معنی مفرد بہ تلفظ جمع اس جملہ
کو میں اچھی طرح نہیں سمجھا معنی مفرد معنی جمع اور یہ جو اردو کے محاورہ میں تقریر کرتے ہیں کہ اس شعر کے
معنے کیا ہیں یا اس شعر کے معنے کیا خوب ہیں اسمیں دخل نہیں کیا جاتا خاص و عام کے زبان پر یوں ہے ہی
معانی کے جگہ بھی معنی بولتے ہیں زرشت لفظ ہندی الاصل رتھ ہے یہاں معلوم بعض مذکر بولتے ہیں بعض
مونث ۔ شعر بہت اچھا ہے ممنون و ہموار راقم غالب ۔

[سنہ ۱۸۵۶ع]

مکتوب غالب بنام مرزا یوسف علی خاں عزیز 1856ء

نامہ ہائے غالب

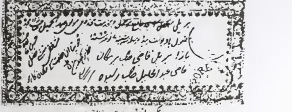

عکسِ لفافہ (تحریرِ غالب)

قاضی عبدالجلیل (بریلی) کے نام

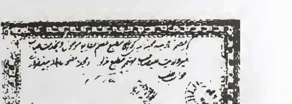

عکسِ لفافہ (تحریرِ غالب)

میر ولایت علی مہتمم مطبع عظیم المطابع عظیم آباد کے نام

لفافوں کے عکس جن پر مرزا غالب نے خود اپنے ہاتھ سے پتے تحریر فرمائے۔

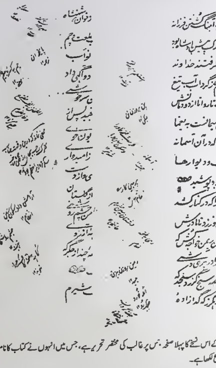

دستنبو کے اس نسخے کا پہلا صفحہ جس پر غالب کی مختصر تحریر ہے، جس میں انھوں نے کتاب کا نام اور موضوع لکھا ہے۔

بھوپال (بھارت) کے ممتاز مصور ایم عرفان کا ایک
مایہ ناز شہ پارہ "دیوان غالب" بصورت شبیہ غالب

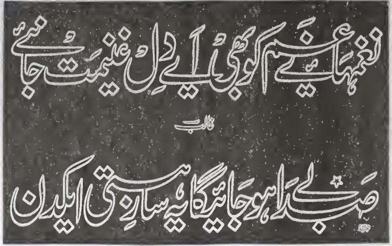

رفتار قلم جنبش بال جبریل ...... خطاط منشی عبدالمجید دہلوی۔

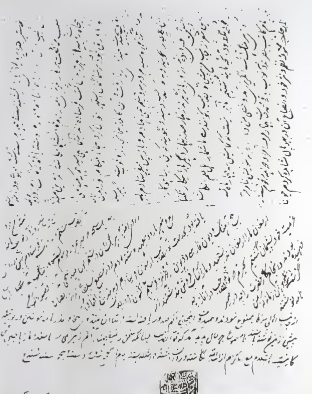

غالب کے غیر مطبوعہ فارسی مکتوب کا عکس

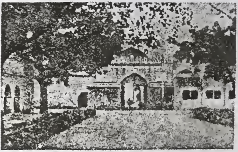

دہلی کا جیل خانہ جہاں غالب نے سزا کاٹی

غالب کے متبنیٰ صاحب زادے عارف زین العابدین کے مزار کی ایک نایاب تصویر

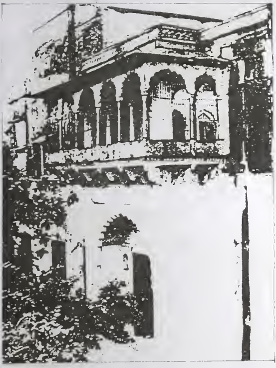

آگرے کا گھر جہاں غالب کا لڑکپن گزرا

خصوصی پیشکش

مرقعِ غالب

مع حواشی

تلمیحات و تشریحاتِ اشعار مندرجہ مکتوبات

و عکسِ خطوطِ منتخب نوشتہ مرزا غالب

مرتبہ

پرتھوی چندر

اشاعت پہلی بار
سال ۱۹۶۶ء
تعداد دو ہزار
مطبوعہ لکشمی پرنٹنگ ورکس دہلی
خوش نویس حفیظ صدیقی

ملنے کے پتے
۱۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ: جامعہ نگر، نئی دہلی
اردو بازار، دہلی ۶
۲۔ لکشمی بک سٹور، ۲۰، جن پتھ۔ نئی دہلی

قیمت:۔ -/۱۴

پرتھوی چندر
۲۰، جن پتھ، نئی دہلی

نورِ بصر راحتِ جان فرزند اقبال نشان

ویدپرکاش جی

کے نام

جن کی عقیدت اور لگن نے اس کام کو

انجام دیا اور اُن کی سُلجھی ہوئی

فوٹوگرافی نے

مکتوباتِ مرزا

اور

مرقعِ غالب کو مرصع کیا

सत्यमेव जयते

UP(U)5643
उपराष्ट्रपति, भारत
नई देहली
VICE-PRESIDENT
INDIA
NEW DELHI

مورخہ ۲۲ مارچ سنہ ٦٦

محب مکرم پرتھوی چندر صاحب ـ تسلیم

بہت دن ہوئے آپ نے مجھے اپنا مرتبہ نسخہ " مرقع غالب " نامی عنایت فرمایا تھا ـ میں نے دیکھتے ہی اپنے تاثرات آپ کے سامنے بیان کیے تھے ـ مگر اس کے بعد تفصیل سے اس کو دیکھنے کا موقع ملا ـ تو اس کی خوبیاں اور بھی نقوش ہوگئیں ـ بہت خوب کام کیا ہے آپ نے ـ مبارک ہو ـ
طباعت کے سلسلہ میں بھی جو اہتمام آپ فرما رہے ہیں وہ نہایت قابل تعریف ہیں ـ متن کے ساتھ مفید حواشی اور حواشی میں خود غالب کی تحریروں کے عکس، پھر نہایت دیدہ زیب کتابت اور فوٹو آفسیٹ سے طباعت یہ سب چیزیں اس نسخہ کو بے نظیر بنا دیں گی ـ غالب کے قدر شناس ہمیشہ آپ کے شکرگزار رہیں گے اور غالب کی روح ہوگی ـ

مخلص
ذاکر
(ذاکر حسین)

جناب پرتھوی چندر صاحب
۴۲ ـ جن پتھ ـ ویسٹرن کورٹ؟

٤٧ ـ جن پتھ ـ ویدینشن
نئی دہلی

دِیبَاچَہ

مرزا غالب کی شاعرانہ شخصیت کو کسی خاص تعریف و تعارف کی ضرورت نہیں، اُن کا درجہ سخنوری ہر طرح کی توصیف سے بالا تر ہے۔ اُن کی جدت پسند طبیعت نے اُردو نظم و نثر دونوں میں وہ امتیازی شان پیدا کی کہ اس کا جواب نہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ مرزا کی حیات میں اُن کی وہ قدر و منزلت نہ ہوئی جس کے وہ مستحق تھے، تاہم وفات کے بعد جب علم و ادب کی ترقی کے ساتھ فکر و نظر کی راہیں کشادہ ہوئیں تو غالب کی شخصیت و عظمت اُبھرنے اور نکھرنے لگی محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" میں غالب پر مقالہ لکھا اور خواجہ حالی نے یادگارِ غالب پیش کی تو ہر ادیب کی فکر و نظر غالبیت کی طرف جانے لگی، یہاں تک کہ شارحین و اہلِ قلم نے غالبیات کو ایک مخصوص ادبی موضوع بنا لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غالب اور کلامِ غالب پر مایۂ ناز کتابیں وجود میں آگئیں۔ ہر شائقِ ادب اور صاحبِ تحقیق نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق نئے نئے زاویوں سے کلامِ غالب کو پیش کیا ہے، اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ شعرائے اردو میں غالب ہی ایک ایسا شاعر ہے جس پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں اور کسی دوسرے شاعر کو ایسی مقبولیت نصیب نہیں ہوئی۔

اور یہ بھی کہنا غلط نہ ہوگا کہ تمام شعرائے اردو کے کلیات، دواوین اور مجموعہ ہائے کلام میں دیوانِ غالب ہی ایک ایسا نسخہ ہے جو سب سے زیادہ اشاعت پذیر ہوا ہے۔ ۱۸۴۱ء سے اب تک نہ جانے اس کے کتنے اچھے اور بُرے، سادہ و پرکار، صحیح و غلط، گراں و ارزاں، چھوٹے اور بڑے نسخے شائع ہو چکے ہیں یہ نسخے اپنے ظاہری رنگ روپ میں ہی ایک دوسرے سے مختلف نہیں بلکہ ان کے متن میں بھی فرق ہے کیونکہ جب بھی کوئی نیا نسخہ شائع ہوتا ہے تو اُس میں کوئی نہ کوئی نیا پہلو اور نئی تحقیق پائی جاتی ہے۔

مجھے شروع سے ہی کلامِ غالب سے دلچسپی رہی ہے اور اس سلسلہ میں جو بھی تصنیف و تالیف ہاتھ آئی اُس کا مطالعہ غائر نظر سے کرتا رہا ہوں اور اسی ذوق کی بنا پر 'فکرِ غالب' کے نام سے ایک کتاب پیش کی ہے جس کو غالب کے قدردانوں کے حلقے میں کافی پسند کیا گیا اور میری توقع سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ خصوصاً

جناب موہن چند محروم اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے میری ہمت بڑھائی اور اسی حوصلہ افزائی کی بنا پر اپنی دوسری تالیف "مرقع غالب" پیش کر رہا ہوں جس کی ترتیب میں مندرجہ ذیل امور کا خیال رکھا گیا ہے ۔

۱۔ جن اشعار کی تشریح مرزا صاحب نے اپنے خطوط میں کی ہے، اُن کے حاشیوں میں وہ تحریریں درج کردی گئی ہیں تاکہ اشعار کا مفہوم شاعر کے نقطۂ نگاہ سے واضح ہو جائے ۔

۲۔ غزلوں کے وہ اشعار جن میں کوئی تلمیح پائی جاتی ہے اُن کا مطلب واقعے کی تشریح کے ساتھ لکھ دیا گیا ہے

۳۔ مرزا صاحب نے بعض اشعار خطوط میں استعمال کیے ہیں ان ہی اشعار کے تحت خطوط کے حصے بھی شامل کر دیے ہیں تاکہ شعروں سے لطف اندوزی کے ساتھ ساتھ انشا پردازی سے بھی حظ اٹھایا جائے ۔

۴۔ اشعار و فردیات کا حال اور کچھ حصہ قادر نامہ کا بھی درج کر دیا ہے جن سے پتہ چل جائے کہ وہ کب اور کس موقع پر کہے گئے تھے ۔

۵۔ تصاویر: بعض تصاویر بھی فراہم کی گئی ہیں ، جو مرزا غالب کی جائے پیدائش ، مقامات رہائش ، دلّی ، آگرہ ، رام پور اور مدفن سے تعلق ہے ۔

۶۔ دلچسپ اشعار: کچھ ایسے اشعار کے مطالب بھی درج کر دیے ہیں جو کسی نہ کسی نوعیت سے اہم خیال کیے گئے ہیں۔

۷۔ سوانح حیات: مرزا غالب کی سوانح حیات اُن کے خطوط ہی سے مرتب کی گئی ہے

۸۔ دلچسپ خطوط: سب سے اہم اور دلچسپ غالب کے منتخب خطوط کے عکس ہیں جو انھوں نے اشعار کے ساتھ ساتھ تحریر فرمائے تھے ۔

۹۔ سب سے آخر میں مرزا غالب کے نوشتہ خطوط، عکسی، متذکرہ بالا کے علاوہ دوسرے فراہم شدہ خطوط بھی یکجا درج کر دیے گئے ہیں جن کی نوعیت خاص ہے اور ایک بے بہا مجموعہ ہے ۔

میں اُن ارباب ادب کا نہایت ممنون ہوں جن کی ادبی کاوشوں کے نتائج میرے زیر مطالعہ رہے ہیں اور اُن افسران رضا لائبریری کا عموماً جن کی نوازش سے مجھے خطوط غالب کے عکس حاصل ہوئے اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا خصوصاً جنھوں نے "مرقع غالب" کی ترتیب میں میری رہنمائی فرمائی ، صدق دل سے شکر گزار ہوں ۔

پرتھوی چند

۱۹۶۶ء

CHIEF MINISTER
JAMMU & KASHMIR
No.. 573/CM-66
Dtd-23 [illegible]-1966

مکرمی پرتھوی چندر صاحب

آپ کا خط ملا "مرقع غالب" کی ایک جلد آپ نے مجھے عنایت کی تھی۔ میں نے اسے اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔ دیوان غالب کے آج تک بیسیوں ایڈیشن شائع کئے گئے ہیں، اور "مرقع غالب" ان میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔

غالب ہندوستان کا عظیم ادبی سرمایہ ہے۔ اسی لئے غالب کے متعلق ہمارے ادیبوں اور نقادوں نے بہت کام کیا ہے اور یہ کام ابھی تک جاری ہے۔ "فکر غالب" کی اشاعت کے بعد غالب شناسی کے سلسلے میں آپ نے ایک اور قدم اٹھایا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ "مرقع عام" کو کافی محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ تیار کیا گیا ہے۔ اس کی صوری اور معنوی خوبیاں بہت ہیں اور میں آپ کے اس پُرخلوص کام کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

آپ کا مخلص

غلام محمد صادق

جناب پرتھوی چندر صاحب
۲۷، جن پتھ۔ ویسٹرن کورٹ
نیو دہلی

جناب پرتھوی چندر کی کتاب فکرِ غالب ۱۹۶۰ء میں دہلی سے شائع ہو چکی ہے۔ اب دہلی ہی سے ان کی دوسری کتاب مرقعِ غالب شائع ہو رہی ہے معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ظاہری خوبیوں سے یہ کتاب اس قدر آراستہ ہے کہ مرزا غالب زندہ ہوتے تو اسے دیکھ کر معلوم نہیں ان کی مسرت کا کیا عالم ہوتا۔

مرزا کی تصانیف میں دیوان اردو کو ہر زمانے میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اس کے نت نئے اڈیشن نکلتے رہتے ہیں۔ اور خواص و عوام میں مقبول ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں جناب مالک رام اور جناب امتیاز علی عرشی کے اڈیشن اپنے گوناگوں محاسن کی وجہ سے بہت مقبول ہوئے ہیں، اب جناب پرتھوی چندر کا مرتب کردہ دیوانِ غالب شائع ہو رہا ہے جس میں انھوں نے یہ جدت کی ہے کہ مرزا غالب کے خطوط میں جہاں کہیں انہیں اشعار کی تشریح ملی ہے اسے حواشی میں درج کر دیا ہے، اور بعض مقامات پر وہ عبارتیں بخطِ غالب درج ہیں۔ اس طرح اشعار کا مفہوم غالب کے ذہن میں کیا تھا، یہ متعین کرنے میں مدد ملتی ہے، دیوان کی ابتدا میں غالب کے سوانح حیات اور کلام پر تبصرہ بھی ہے۔ غالب کے ان مکاتیب کے عکس کتاب کے آخر میں دے دیئے گئے ہیں جو انھوں نے نوابانِ رامپور کو لکھے ہیں، اور دارالانشا رام پور میں غالب کے لکھے ہوئے محفوظ ہیں، ان مکاتیب کا دیوان اردو سے کوئی تعلق نہیں۔ اور یہ علیحدہ شائع ہوتے تو بہتر ہوتا —— لیکن اچھی چیز بہرحال اچھی ہوتی ہے، اور یہاں اس مجموعہ میں ان کا شمول افادیت سے خالی نہیں،

مجھے یقین ہے جناب پرتھوی چندر کا یہ کارنامہ غالب کے قدردانوں میں خاص طور پر ادبی حلقوں میں عام طور پر بہت پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا اور اسے وہ مقبولیت حاصل ہوگی جس کی یہ کتاب مستحق ہے۔

مختار الدین احمد

ادارہ علوم اسلامیہ
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
۹ جون سنہ ۱۹۶۶ء

Dr Zakir Husain receiving the first copy of a new compilation of Ghalib's verse and letters from Mr Prithvi Chandra, the author in New Delhi on Monday —Statesman

پرتھوی چندر جی کی مہربانی سے اس
دیدہ زیب مرقع کی زیارت نصیب ہوئی!
خوش باش کہ وقت ما خوش کردی۔

ذاکر حسین
۸ر فروری ۶۹ء

مرزا اسد اللہ خاں غالب

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

تعارُف

غالبؔ ہندوستانی ادبِ عالیہ کے چند اہم اور قابلِ قدر تخلیق کاروں میں شمار ہوتا ہے وہ ہندوستان کی اُس شاعرانہ فکر کا نمائندہ ہے جس میں عجمی روایات کی قلم لگی ہے اور جس کی سادگی و پُرکاری اور بےخودی و ہشیاری عالمی ادب کو اظہار اور اسلوب کے بہت سے بیش قیمت اور لائقِ تقلید نمونے دیتی ہے اس لئے غالب کے کلام کو بار بار پیش کر کے ہم عالمی ادب میں بلند ترین ہندوستانی فکرِ شاعرانہ کے مکرر اضافے کا مبارک کام انجام دیتے ہیں۔

برادرِ محترم پرتھوی چندر صاحب کا مرتبہ مُرقّعِ غالب بھی اسی سلسلے کی ایک تازہ کڑی ہے۔ جو کتابت، طباعت اور ترتیب کے لحاظ سے خوبصورت تحفہ شمار کئے جانے کی بہر طور مستحق ہے۔

انہوں نے جس عقیدت محبت شیفتگی اور لگن کے ساتھ یہ کام انجام دیا ہے اُس کی داد نہ دینا ادبی دیانت کے خلاف ہوگا۔

مجھے امید ہے کہ یہ کتاب اردو دیوان غالب کے ایک اور خوبصورت ایڈیشن کے طور پر خوش ذوق پڑھنے والوں کے ذخیرے میں جگہ پائے گی۔

امتیاز علی عرشی

دیوان غالب کے بےشمار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور ہر سال شائع ہوتے رہے ہیں۔ لیکن پرتھوی چندر صاحب کا مرتب کیا ہوا دیوان جس نے حُسنِ طباعت کا نیا معیار قائم کیا ہے ایک ایسا مرقع ہے جو صاحبانِ ذوق ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور اپنے احباب کی خدمت میں تحفے کی طرح پیش کریں گے۔ دیباچے کے طور پر حیاتِ غالب اور شاعری پر تبصرے کے علاوہ حواشی کے اضافے نے اس کتاب کو خاصے کی چیز بنا دیا ہے۔ اس طرح اشعار کا حُسن نئے لطف کے ساتھ بےنقاب ہوتا ہے۔ خود غالب کے خطوط کے اقتباسات اور عکسِ تحریر نے صفحات کی آرائش ہی نہیں کی ہے بلکہ پڑھنے والوں کے لئے احساس و ادراک کے نئے دروازے کھول دیے ہیں۔

پرتھوی چندر صاحب کی یہ خوبصورت پیش کش ہزاروں مبارکباد کی مستحق ہے جو بہت سے دلوں میں نیا ذوق پیدا کرے گی۔

سردار جعفری

جناب پرتھوی چندر کی کتاب فکر غالب ۱۹۶۰ء میں دہلی سے شائع ہو چکی ہے۔ اب دہلی ہی سے ان کی دوسری کتاب مرقع غالب شائع ہو رہی ہے معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ظاہری خوبیوں سے یہ کتاب اس قدر آراستہ ہے کہ مرزا غالب زندہ ہوتے تو اسے دیکھ کر معلوم نہیں ان کی مسرت کا کیا عالم ہوتا۔

مرزا کی تصانیف میں دیوان اردو کو ہر زمانے میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اس کے نت نئے اڈیشن نکلتے رہتے ہیں۔ اور خواص و عوام میں مقبول ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں جناب مالک رام اور جناب امتیاز علی عرشی کے اڈیشن اپنے گوناگوں محاسن کی وجہ سے بہت مقبول ہوئے ہیں، اب جناب پرتھوی چندر کا مرتب کردہ دیوان غالب شائع ہو رہا ہے جس میں انھوں نے یہ جدت کی ہے کہ مرزا غالب کے خطوط میں جہاں کہیں انہیں اشعار کی تشریح ملی ہے اسے حواشی میں درج کر دیا ہے، اور بعض مقامات پر وہ عبارتیں بخط غالب درج ہیں' اس طرح اشعار کا مفہوم غالب کے ذہن میں کیا تھا، یہ متعین کرنے میں مدد ملتی ہے، دیوان کی ابتدا میں غالب کے سوانح حیات اور کلام پر تبصرہ بھی ہے۔ غالب کے ان مکاتیب کے عکس کتاب کے آخر میں دے دیئے گئے ہیں جو انھوں نے نوابان رامپور کو لکھے ہیں، اور دارالانشا رامپور میں غالب کے لکھے ہوئے محفوظ ہیں، ان مکاتیب کا دیوان اردو سے کوئی تعلق نہیں۔ اور یہ علیحدہ شائع ہوتے تو بہتر ہوتا ——— لیکن اچھی چیز بہر حال اچھی ہوتی ہے، اور یہاں اس مجموعہ میں ان کا شمول افادیت سے خالی نہیں،

مجھے یقین ہے جناب پرتھوی چندر کا یہ کارنامہ غالب کے قدردانوں میں خاص طور پر ادبی حلقوں میں عام طور پر بہت پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا اور اسے وہ مقبولیت حاصل ہو گی جس کی یہ کتاب مستحق ہے۔

مختار الدین احمد

ادارہ علوم اسلامیہ
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
۹ جون ۱۹۶۶ء

غالب کا اردو دیوان ان کی زندگی میں پانچ مرتبہ چھپا، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک مطبع نظامی، کانپور کے ایڈیشن (۱۸۶۲ء) کو چھوڑ کر ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں جسے ہم کسی پہلو سے بھی تسلی بخش کہہ سکیں۔ کتابت کی اغلاط تو شاید ناگزیر ہیں، ان کے علاوہ کاغذ، طباعت، ظاہری شکل وصورت ان میں سے کوئی بات بھی جاذب نظر نہیں۔ اسی لئے غالب کو عمر بھر اس کی حسرت رہی کہ کاشکے میرا دیوان ایک مرتبہ تو حسن و اہتمام سے چھپ جاتا!

جو بات ان کی زندگی میں نہیں ہو سکی تھی، وہ ان کی وفات کے بعد ہوئی۔ پچھلے پچاس برس میں دیوان اردو کے متعدد ایسے خوبصورت اور دیدہ زیب اور قیمتی ایڈیشن شائع ہوئے ہیں کہ اگر کہیں غالب انہیں دیکھ لیتے، تو شادی مرگ ہو جاتے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ دیوان ہے، حسن کتابت، متن کی صحت، عمدہ کاغذ، طباعت کا اعلیٰ معیار غرض ہر پہلو سے یہ ایڈیشن نفیس کلام اور غالب کے شایان شان ہے اور ان سب پر مستزاد اس میں ایک چیز ایسی بھی ہے جو پہلی مرتبہ قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

غالب نے اپنے خطوط میں دسیوں جگہ اپنے اشعار کے معانی بیان کئے ہیں۔ بعض اوقات کسی دوست یا شاگرد نے ان کے کسی شعر کی وضاحت چاہی، تو انہوں نے جواب میں اسکے معنی لکھ دیے، یا کبھی کسی اور سلسلے میں انھیں اپنا کوئی شعر یاد آ گیا، تو اس کا ذکر کر دیا۔ مختلف شارحین غالب نے اس طرح کے تمام اشارات سے فائدہ اٹھایا ہے۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے اپنے مرتبہ دیوان (نسخہ عرشی) کے حواشی میں ان کا احاطہ کر لیا ہے۔ لالہ پرتھوی چندر نے اس دیوان میں نہ صرف ان مقامات ہی سے استفادہ کیا ہے، بلکہ جا بجا مزید توضیحی حاشیوں کا بھی اضافہ کیا ہے لیکن انھوں نے ایک چیز بالکل پہلی مرتبہ شامل دیوان کی ہے یعنی غالب کے اصلی خطوں کے عکس۔ خوش قسمتی سے غالب کے متعدد ایسے خط تا حال محفوظ ہیں جن میں انھوں نے اپنے اشعار کی توضیح و تشریح کی ہے۔ مرتب نے ان خطوں کے عکس متعلقہ مقام پر حاشیے میں دے دیے ہیں۔ اس سے یہ صورت پیدا ہو گئی ہے گویا یہ حواشی خود غالب نے اپنے قلم اور ہاتھ سے لکھے ہوں۔

یقین ہے کہ غالب کے شیدائی اس تحفے کی پوری قدر کریں گے۔ —————— مالک رام

نئی دہلی،
یکم فروری ۱۹۶۶ء

۵

سوانح حیات از مرزا غالب

پیدائش، نام و نسب اور خاندان نجم الدولہ دبیر الملک۔ نظام جنگ مرزا اسد اللہ بیگ خاں عرف مرزا نوشہ ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے لکھتے ہیں:

میں ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوا ہوں۔ اب کے رجب کے مہینے سے ۶۹ واں برس شروع ہوا ہے

پھر لکھتے ہیں:

میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں، دادا میرا، ماوراء النہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان میں آیا تھا۔ سلطنت ضعیف ہو گئی تھی، صرف پچاس گھوڑے نقارہ نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ اور رسالے کی تنخواہ میں پایا بعد انتقال اُس کے جو طوائف الملوکی کا ہنگامہ گرم تھا وہ علاقہ نہ رہا۔ باپ میرا عبد اللہ بیگ خان بہادر لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعد چند روز حیدر آباد جا کر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا، تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا، کئی برس وہاں رہا، وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا۔ نصر اللہ بیگ خاں میرا چچا حقیقی مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبہ دار تھا، اس نے مجھے پالا۔ ۱۸۰۶ء میں جرنیل لیک صاحب کا عمل ہوا، صوبہ داری کمشنری ہو گئی اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر ہوا، میرے چچا کو جرنیل لیک صاحب نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار سو سوار کا برگیڈیر ہوا ایک ہزار روپیہ ذات کا لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر حین حیات علاوہ سال بھر مرزبانی کی تھی کہ بہ یک ناگاہ مر گیا۔ رسالہ برطرف ہو گیا۔ ملک کے عوض نقدی مقرر ہو گئی وہ اب تک پاتا ہوں۔ پانچ برس کا تھا جو باپ مر گیا، آٹھ برس کا تھا جو چچا مر گیا۔"

مرزا غالب کے والد ماجد عبد اللہ بیگ خاں کی شادی آگرہ میں خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی صاحبزادی عزت النساء بیگم سے ہوئی تھی اور یہ خاندان شہر کے عمائدین اور امراء میں شمار ہوتا تھا مرزا غالب

کی والدہ اچھی پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ لہٰذا ابتدائی تعلیم مرزا نے ان سے ہی حاصل کی اور بعد میں آگرہ کے مولوی معظم سے۔ یہاں مرزا کو فارسی زبان و ادب سے گہرا لگاؤ پیدا ہو گیا اور حُسنِ اتفاق کہ ملا عبدالصمد جن کا پارسی نام ہرمزد تھا اکبر آباد (آگرہ) میں وارد ہوئے، مرزا کی ان سے ملاقات ہو گئی حالانکہ غالب کی عمر اس وقت ۱۴ سال کی تھی۔ وہ مرزا کی ذکاوت و ذہانت اور لیاقت دیکھ کر حیران رہ گئے جس فارسی ذوق کی بنیاد مولوی معظم نے ڈالی تھی اس کی تکمیل ملا عبدالصمد نے کی جیسا کہ غالب نے نواب کلب علی خاں کو ایک خط میں لکھا ہے۔

"بدوِ فطرت سے میری طبیعت کو زبانِ فارسی سے ایک لگاؤ تھا چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھ کو ملے۔ بارے مراد بر آئی اور اکابر پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا اور اکبر آباد فقیر کے مکان پر دو برس رہا اور میں نے اس سے حقائق و دقائق زبانِ فارسی کے معلوم کیے۔ اب مجھے اس امرِ خاص میں نفسِ مطمئنہ حاصل ہے مگر دعویٰ اجتہاد نہیں ہے۔ بحث کا طریقہ یاد نہیں۔"

اپنے ننہال کے متعلق شیو نرائن آرام کو یوں لکھتے ہیں

ننہال

میں کیا جانتا تھا کہ تم کون ہو۔ جب یہ جانا کہ تم ناظر منشی بنسی دھر کے پوتے ہو تو معلوم ہوا کہ میرے فرزند دلبند ہو۔ اب تم کو مشفق و مکرم لکھوں تو گناہگار۔ تم کو ہمارے خاندان اور اپنے خاندان کی آمیزش کا حال کیا معلوم ہے، مجھ سے سنو۔ تمہارے دادا کے والد عہد نجف خاں و ہمدانی میں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے، جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو تمہارے پردادا نے بھی کمر کھولی اور پھر کہیں نوکری نہ کی۔ یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں۔ مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے یہ دیکھا کہ منشی بنسی دھر خاں صاحب کے ساتھ ہیں اور انھوں نے جو کٹیھم گانوں اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا ہے تو بنسی دھر اس امر کے منصرم ہیں اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں۔ وہ اور میں ہم عمر تھے۔ شاید بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہیں یا چھوٹے ہوں انیس بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر اُن کی۔ باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت آدھی آدھی رات گذر جاتی تھی چونکہ گھر اُن کا بہت دور نہ تھا اس واسطے جب چاہتے تھے چلے

جاتے تھے بس ہمارے اور اُن کے مکان میں مجھیا رنڈی کا گھر اور دو کٹڑے درمیان تھے۔ ہماری بڑی حویلی وہ ہے کہ جواب لکھمی چند سیٹھ نے مول لی ہے۔ اس کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی اور پاس اُس کے ایک کھٹیا والی حویلی اور سلیم شاہ کے تکیہ کے پاس دوسری حویلی اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اس سے آگے بڑھ کر ایک کٹڑہ کہ وہ گڈریوں والا مشہور تھا اور ایک کٹڑہ کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا اس کٹڑے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔ واصل خاں نامی ایک سپاہی تمہارے دادا کا پیش دست تھا اور وہ کٹڑوں کا کرایہ اگاہ کر اُن کے پاس جمع کرواتا تھا

شادی اور دلی میں سکونت

مرزا غالب کی شادی ۱۳ سال کی عمر میں نواب احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش صاحب کی گیارہ سالہ دختر امراؤ بیگم سے ہوئی۔ اگرچہ ان کا دلی میں آنا جانا پہلے ہی سے تھا۔ مگر شادی کے بعد انھوں نے مستقل سکونت دلی میں ہی اختیار کر لی۔

شادی کے متعلق یوں تحریر فرماتے ہیں:۔

"۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی (یعنی بیوی) میرے پانوں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔"

حُلیہ

حلیہ کے متعلق حاتم علی مہر کو یوں لکھا۔

بہر حال تمھارا حلیہ دیکھ کر تمھارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمہارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چنپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے، ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خونِ جگر کھایا تو اس بات پر کہ داڑھی خوب گھٹی ہوئی ہے وہ مزے یاد آ گئے کیا کہوں جی پہ کیا گزری، جب داڑھی مونچھ میں بال سفید آ گئے۔ تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ناچار مستی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی۔ مگر یہ یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے، عام،

مُلّا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقہ، بھٹیارا، جولاہا، کنجڑا، منہ پر داڑھی، سر پر بال، فقیر نے جس دن داڑھی رکھی اسی دن سر منڈوایا۔

اولاد

سیف الحق کو اُس کے لڑکے کے مرنے پر یوں لکھا: تمہارے ہاں لڑکے کا پیدا ہونا اور اُس کا مر جانا معلوم ہو کر مجھ کو بڑا غم ہوا، بھائی اس داغ کی حقیقت مجھ سے پوچھو کہ چوہتر برس کی عمر میں سات بچے پیدا ہوئے، لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہ ہوئی۔

شاعری کی ابتدا

"بارہ برس کی عمر سے کاغذ نظم و نثر میں مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں، باسٹھ برس کی عمر ہوئی پچاس برس اسی شیوے کی ورزش میں گذرے"۔

"ابتدائے سنِ تمیز سے اردو زبان میں سخن سرائی کی بادشاہ دہلی کا نوکر ہو کر چند روز اسی روش پر خامہ فرسائی کی نظم و نثر فارسی کا عاشق ہوں، ایک کم ستّر برس دنیا میں رہا، اب اور کہاں تک رہوں، ایک اُردو کا دیوان، ہزار بارہ سو ابیات، تین رسالے نثر کے۔ یہ پانچ نسخے مرتب ہو گئے۔ اب اور کیا کہوں گا۔ مدح کا صِلہ نہ ملا، غزل کی داد نہ پائی، ہرزہ گوئی میں ساری عمر گنوائی"۔

مرزا غالب کو اپنی پنشن کے متعلق کچھ مغالطہ سا تھا کہ جو مقررہ رقم ان کو ملتی ہے وہ بہت ہی کم ہے اور اس کی چارہ جوئی کے لیے اپنا مرافعہ گورنر جنرل کے سامنے پیش کرنے کے لیے ۱۸۲۷ء میں کلکتہ روانہ ہوئے۔ دورانِ سفر میں مرزا براہِ کانپور، لکھنؤ پہنچے۔ وہاں مرزا کی بہت اچھی طرح خاطر مدارات ہوئی۔ نصیر الدین حیدر والی اودھ اور اعتماد الدولہ نائب السلطنت تھے۔ مرزا کی ملاقات کا بندوبست کیا گیا۔ مگر مرزا نے دو شرطیں پیش کیں۔ نائب السلطنت میرا استقبال کریں اور مجھے نذر دینے سے معاف رکھا جائے۔ یہ شرطیں مانی نہ گئیں۔ مرزا غالب لکھنؤ سے روانہ ہو کر بنارس، مرشد آباد ہوتے ہوئے ماہ فروری ۱۸۲۸ء میں کلکتہ پہنچے مگر وہاں ان کے مرافعہ کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ سوائے اس کے کہ خلعت اور خطاب بحال رہے۔ دورانِ قیام کلکتہ مرزا کو ایک ادبی ہنگامہ پیش آیا۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں ہر اتوار کو مشاعرہ ہوتا تھا۔ مرزا غالب کے اعزاز میں بھی ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ جس میں مرزا نے ایک فارسی غزل پڑھی۔ حاضرین میں سے کچھ لوگوں نے مرزا کے بعض الفاظ، محاوروں اور ترکیبوں پر اعتراضات کیے اور جواز میں قتیل کے کلام کو

مرزا غالب ہندوستان کے فارسی شعرا میں سے سوائے خسرو کے کسی کو نظر میں نہ لاتے تھے۔ ناک بھوں[9] چڑھا کر کہا: میں فرید آباد کے کھتری بچے کے قول کو نہیں مانتا۔ اس پر زیادہ جوش پھیلا اور مرزا پر اعتراضوں کی بھرمار ہونے لگی۔ مرزا نے مخالفت سے گھبرا کر ایک مثنوی "بادِ مخالف" کے نام سے فارسی میں لکھی کہ میں اس شہر میں انصاف حاصل کرنے کے لیے آیا ہوں۔ مجھے چند روز آرام سے رہنے دیجیے اور مہمان نوازی کا حق ادا کیجیے۔ مجھے کسی سے کبھی پرخاش نہیں رہی ہے۔ میں نے جو کچھ لکھا اہلِ زبان کے الفاظ اور محاوروں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے لکھا ہے لیکن حاسدوں اور مفسدوں نے کوئی بات نہ سُنی اور مرزا کی آخر تک مخالفت کرتے رہے۔ یہاں مرزا کچھ عرصہ رہ کر واپس دہلی چلے گئے۔

حادثۂ اسیری

مرزا کو شطرنج اور چوسر کھیلنے کی عادت تھی۔ لبسا اوقات دوست و احباب بھی ان کے مکان پر آجاتے تھے۔ مرزا غالب تفریحاً کچھ بازی بدکر کھیلا کرتے تھے مگر چونکہ کوتوال شہر ان کا دشمن تھا اور موقعہ کی گھات میں تھا۔ ایک دن موقع سے مکان پر چھاپا مارا اور دوستوں سمیت کھیلتے ہوئے مرزا کو گرفتار کر لیا۔ مرزا صاحب یوں لکھتے ہیں:-

"کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف، فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔ باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے، میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔ سشن جج باوجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ برتتا تھا اور اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا۔ اس نے بھی اغماض اور تغافل اختیار کیا۔ صدر میں اپیل کیا گیا مگر کسی نے نہ سُنا اور وہی حکم بحال رہا۔ پھر معلوم نہیں کہ کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گزر گئی تو مجسٹریٹ کو رحم آیا اور صدر میں میری رپورٹ کی اور وہاں سے حکم رہائی کا آگیا اور حکام صدر نے ایسی رپورٹ بھیجنے پر اس کی بہت تعریف کی۔ سنا ہے کہ رحم دل حاکموں نے مجسٹریٹ کو بہت نفرین کی اور میری خاکساری اور آزردہ حالی سے اس کو مطلع کیا۔ یہاں تک کہ خود بخود اس نے میری رہائی کی رپورٹ بھیج دی۔ میں ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جا سکتا۔ جو کچھ گزرا اس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گزرنے والا ہے، اس پر راضی ہوں مگر آرزو کرنا آئینِ عبودیت کے خلاف نہیں ہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں

تو ہندوستان میں نہ رہوں، روم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے، یہ بھی جانے دو، خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ، آستانہ رحمۃ للعالمین، دلداروں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھیے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جان فرسا ہے نجات پاؤں اور بغیر اس کے کوئی منزلِ مقصود قرار دوں، سر بصحرا نکل جاؤں۔ یہ ہے جو کچھ کہ مجھ پر گزرا اور یہ ہے جس کا میں آرزومند ہوں۔"

مرزا غالب کی عمر ۱۳ برس کی تھی جبکہ انھوں نے دلی میں مستقل سکونت اختیار کی اور کئی مکانات تبدیل لیے۔ کالے میاں کی حویلی، حکیم محمد حسین خاں کی حویلی جیسا کہ لکھتے ہیں "میں کالے صاحب کے مکان سے اُٹھ آیا ہوں اور بلی ماران میں ایک حویلی کرایہ پر لے کر اس میں رہتا ہوں۔"

دوران برسات یوں لکھتے ہیں۔

مکان اور برسات

دس گیارہ برس سے اس تنگنا میں رہتا تھا۔ سات برس تک ماہ بماہ چار روپیہ دیے گیا۔ تین برس کا کرایہ کچھ اوپر سو روپیہ یکمشت دیا گیا۔ مالک نے مکان بیچ ڈالا جس نے لیا ہے اس نے مجھ سے پیام بلکہ ابرام کیا مکان خالی کر دو، مکان کہیں ملے تو میں اٹھوں۔ بیدرد نے مجھ کو عاجز کیا اور مدد لگا دی صحن۔ بالاخانے کا جس کا دو گز عرض اور دس گز طول اس میں پاڑھ بندھ گئی۔ رات کو وہیں سویا۔ گرمی کی شدت، باڑ کا قرب، گمان یہ گزرتا تھا کہ یہ کٹگھرہ ہے اور صبح کو مجھ کو پھانسی ملے گی۔ تین راتیں اس طرح گزریں۔ دوشنبہ ۲۹ جولائی کو دوپہر کے وقت ایک مکان ہاتھ آگیا، وہاں جا رہا۔ جان بچ گئی۔ یہ مکان بہ نسبت اُس مکان کے بہتر ہے۔

"نہ مجھے خوفِ مرگ نہ دعویٰ صبر ہے، میرا مذہب بخلاف عقیدہ قدریہ جبر ہے۔ تم نے میاں نجیگری کی بھائی نے برادر پروری کی۔ تم جیتے رہو وہ سلامت رہیں ہم اس حویلی میں تا قیامت رہیں۔ اس ابہام کی توضیح اور اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مینہ کی شدت سے چھوٹا لڑکا ڈرنے لگا۔ اس کی دادی بھی گھبرائی مجھ کو خلوت خانے کا دروازہ غرب رویہ اور اس کے آگے ایک چھوٹا سا درہ یاد تھا۔ جب تمہارے پاؤں میں چوٹ لگی ہے تو میں اسی دروازے سے تم کو دیکھنے آیا تھا یہ سمجھ کر کہ خلوت خانہ کو محل سرا بنانا چاہتا تھا کہ گاڑی، ڈولی، لونڈی، اصیل، کاچھن، تیلن، تنبولن، کہاری، پنہاری، ان فرقوں کا ممرہ دروازہ رہے گا۔"

قلعہ کی ملازمت

"دلّی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی۔ سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔ بادشاہ دہلی نے پچاس روپیہ مہینہ مقرر کیا۔ ان کے ولی عہد نے چار سو روپیہ سال۔ ولی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔"

"جب بادشاہ دہلی نے مجھے نوکر رکھا اور خطاب دیا اور خدمتِ تاریخ نگاری سلاطین تیموریہ مجھ کو تفویض کی تو میں نے ایک غزل طرزِ تازہ پر لکھی مقطع اس کا یہ ہے ؎

غالب وظیفہ خوار ہو، دو، شاہ کو دُعا — وہ دِن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے۔ بخشی، ناظر، حکیم کسی سے توقیر کم نہیں مگر فائدہ وہی قلیل۔"

"مہر نیم ماہ نہیں اُس کا نام مہر نیم روز ہے اور سلاطینِ تیموریہ کی تاریخ ہے، اب وہ بات بھی گئی گذری بلکہ وہ کتاب اب چھپانے کے لائق ہے نہ چھپوانے کے قابل"

غدر کے بعد کے حالات

"پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا مسجد جامع ہوتا ہوا راج گھاٹ دروازہ کو چلا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے، اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اُٹھ جائیں تو ہو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو۔ مرزا گوہر کے باغیچہ کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ باغیچہ کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا فصیل کے کنگرے کھلے رہے ہیں۔ باقی سب اٹ گیا۔ کشمیری دروازہ کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازہ سے کابلی دروازہ تک میدان ہو گیا۔ لاہوری دروازہ کا تھانے دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے، جو باہر سے، گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے یہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپیہ جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے اِس سے علاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو، کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے، تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔"

کیا پوچھتے ہو؟ کیا لکھوں؟ دلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی، قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز بازار مسجد جامع کا۔ ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلا پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں پھر کہو

[14] دلّی کہاں! ہاں، کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔

"مسجد جامع واگزاشت ہوگئی چیلی قبر کی طرف سیڑھیوں پر کبابیوں نے دکانیں بنالیں۔ انڈا مرغی کبوتر بکنے لگے عشرہ بشرہ یعنی دس آدمی مہتمم ٹھہرے، مرزا الٰہی بخش، مولوی صدرالدین، تفضل حسین خاں ابن فضل اللہ خاں، تین یہ اور سات اور۔۔ ، ۷ نومبر ۱۴ جمادی الاوّل سال حال، جمعے کے دن ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ وقید جسم سے رہا ہوئے اناللہ وانا الیہ راجعون"۔

یہاں شہر ڈھہ رہا ہے، بڑے بڑے نامی بازار، خاص بازار اور اردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا اب پتہ بھی نہیں کہ کہاں تھے۔

"کشمیری کٹرا گر گیا وہ اونچے اونچے در اور وہ بڑی بڑی کوٹھریاں دوروبہ نظر نہیں آتیں کہ گیا ہوئیں آہنی سڑک کا آنا اور اس کی رہ گزر کا صاف ہونا ہنوز ملتوی ہے"۔

او سنو، اور تمہاری دلّی کی باتیں ہیں۔ چوک میں بیگم کے باغ کے دروازہ کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا اس میں سنگ و خشت و خاک ڈال کر بند کر دیا۔ بلی ماروں کے دروازے کے پاس کی کئی دکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر لیا کلکتہ دروازہ سے کابلی دروازہ تک میدان ہوگیا۔ پنجابی کٹرا دھوبی واڑہ، رام جی گنج، سعادت کا کٹرا، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی، ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر کہ شہر صحرا ہوگیا تھا اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہوگیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ شہر کا حال میں کیا جانوں کیا ہے۔ پَون ٹوٹی کوئی چیز ہے وہ جاری ہوگئی ہے۔ سوائے اناج اور اپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں جس پر محصول نہ لگا ہو۔ جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا۔ دکانیں حویلیاں ڈھائی جائیں گی۔ دارالبقا فنا ہو جائے گی۔ رہے نام اللہ کا، خان چند کا کوچہ، شاہ بولا کے بڑ تک ڈھے گا۔ دونوں طرف سے پھاوڑا چل رہا ہے۔

اب یہاں ٹکٹ چھاپے گئے ہیں میں نے دیکھے فارسی عبارت یہ ہے،

"ٹکٹ آبادی درونِ شہر دہلی بہ شرط ادخال جرمانہ"

دربار رام پور سے تعلق

۱۸۵۵ میں نواب یوسف علی خاں بہادر والیِ رام پور کہ میرے آشنائے قدیم ہیں اس سال یعنی ۱۸۵۵ میں میرے شاگرد ہوئے۔ ناظم ان کو تخلص دیا گیا۔ بیس پچیس غزلیں اردو کی بھیجتے ہیں۔ اصلاح دے کر بھیج دیتا۔ گاہ گاہ کچھ روپیہ ادھر سے آتا رہتا۔ قلعہ کی تنخواہ جاری، انگریزی پنسن کھلا ہوا۔ ان کے عطایا فتوح گنے جاتے تھے۔ جب وہ دونوں تنخواہیں جاتی رہیں تو زندگانی کا مدار ان کے عطیے پر رہا۔ بعد فتحِ دہلی وہ ہمیشہ میرے مقدم کے خواہاں رہتے تھے۔ میں عذر کرتا تھا۔

مرزا غالب کے اس خط کا عکس ہے جو انھوں نے اپنی فارسی کتاب 'دستنبو' کے ساتھ نواب یوسف علیخاں کو لکھا تھا

حضرت شوقی نعمت آیہ رحمت منشور عطوفت کے دیکھنے سے زندگی کی صورت نظر آئی مخمس اور
غزلوں کی پہنچنے کی اطلاع پائی یہ بھی ایک بخشش کا بہانہ ہے اگر نہیں ورنہ حضور کے کلام کو اصلاح
کی احتیاج کیا ہے میرے کیا سخنوری اور سخن سرائی ہے آپ کی قدردانی بلکہ قدر افزائی ہے تکلف ہے
اگر کہوں کہ ہم تاقیامت رہو بے تکلف دعا یہ ہے کہ خدا کرے ایک سو بیس برس تک سلامت رہو آج
قرنیہ ہے کہ بسبب کم فرصتی اونکا ملاحظہ نکرنا درقوم ہوا ریختہ کے دیوان اور اس کتاب کا
پہنچنا معلوم ہوا دیوان کو دیکھنے نہ دیکھنے میں آپکو اختیار ہے مگر یہ چار جزو کا رسالہ جو
اب بھیجا ہے اسکا دیکھنا ضرور در کار ہے فارسی قدیم اور پھر حسن معنی اور صنعت الفاظ با ایں ہمہ
ہر امر کا اختیار اور ہر بات کا لحاظ جناب عارفہ معاملہ ہے خدا کا شکر ہے اور اپنی قسمت کا گلہ
ہے خدا کا شکر یہ ہے کہ باوجودِ تعلق قلعہ کسی طرح کا جرم کا بہ نسبت میرے احتمال بھی نہیں قسمت کا
گلہ یہ کہ علاقۂ پنسن قدیم کا حکام کو خیال بھی نہیں یہ نومبر ۱۸۵۸ اٹھیسواں مہینا ہے گویا
جو کہائی جینا ہے کہتے ہیں کہ جنوری شروع سال میں پنسن داروں کو روپیہ ملیگا دیکھیے کیا بنا
گل کھلیگا پہلی نومبر کو یہاں اشتہار عام ہو گیا ہے کہ اب قلمرو ہندوستان میں عمل ملکہ معظمہ
عالیمقام ہو گیا ہے میں پہلے سے مداحوں میں اپنا نام لکھوا چکا ہوں اور وزراے ملکہ دار العلوم کی
ذوسابقہ فکت پا چکا ہوں اگر اس اجمال کو بہ تفصیل معلوم کیا چاہیے تو اس کتاب موسوم
بہ دستنبو میں دیکھا چاہیے خشنود رکھو غالب نگاشتہ روز یکشنبہ ہفتم نومبر ۱۸۵۸

۱۴ نواب یوسف علی خاں والی رام پور بڑے اشتیاق و احترام سے مرزا غالب کو تشریف لانے کے لیے لکھتے ہیں۔
"مشفقا! چونکہ مخلص اشتیاق حصول معانقہ اور مکالمہ آپ کا بدرجہ کمال ہے اور اب تشریف آوری آپ کی اس جگہ مناسب ہے۔ اس واسطے حوالۂ خامۂ محبت نگار کے ہوتا ہے کہ آپ دیدار فائض الانوار اپنے سے مخلص کو مسرور فرمائیے۔"
۲۵ نومبر ۱۸۵۹ء

دوسری بار یوں تحریر فرماتے ہیں: " حال تشریف آوری آپ کا اس طرف کو ابھی تک سامعہ نواز نہیں ہوا اور دل صفا منزل مشتاق اور منتظر دریافت مسرور ملاقات کا ہے۔ اس واسطے حوالہ خامۂ اتحاد نگار کے ہوتا ہے کہ آپ براہِ عنایت کے نوید تشریف فرمائی اس مدت سے کہ کب تک ممکن الوقوع ہے مطلع اور مطمئن فرمائیے۔"

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت — جواب میں مرزا غالب کا خود نوشتہ خط ملاحظہ فرمایئے۔

بعد آداب بجا لانے کے عرض کرتا ہوں کہ منشور رافت تیجا براہ ۱۰ نومبر کا جمعہ کے دن تیسری
دسمبر کو اس دعاگو حیرت کے پاس پہنچا ڈھائی سو روپیہ کی ہنڈوی معتمد کے حوالہ کی گئی
آج یا کل روپیہ آجائیگا خاطر عاطر اقدس جمع رہے ۱۲ تیرا حاضر ہونیکو جو ارشاد ہوتا ہے
میں وہاں نہ آؤنگا تو اور کہاں جاؤنگا نہیں کہ وصول کا زمانہ قریب آیا ہے اسکو متروک
چھوڑ کر کیونکر چلا آؤں سنا جاتا ہے اور یقین ہے آتا ہے جنوری آغاز سال ۵۹ میں
یہ قصہ انجام پاجائیگا جسکو روپیہ ملنا ہے اوسکو روپیہ جسکو جواب ملنا ہے اوسکو جواب مل جائیگا ۱۲
حضور نے یہ کیا تحریر فرمایا ہے کہ ان بارہ غزلوں کی اصلاح نہ کلام خوش مطلوب ہے
اگلی غزلوں کی طرح نہیوں مگر اگلی غزلوں کی اصلاح بیشتر نہ آئی اور اون اشعار
میں بعدم خوشی تنہا حضرت کا تو اون غزلوں میں بھی وہ کلام ہے کہ شاید اوروں کے
دیوان میں ویسا ایک شعر بھی نہ نکلیگا میں بقدر اپنی فہم و استعداد کے کبھی اصلاح میں
قصور نہیں کرتا زیادہ حد ادب عرضداشت غالب سہ شنبہ ۲ ربیع الثانی ۱۲۷۵ سنہ ۸ دسمبر

۔ غالب خط ملنے کے بعد بھی پنشن منظور ہونے کی امید پر ایک سال تک رامپور نہ جا سکے اور جب کوئی فیصلہ ہوتا نظر نہ آیا تو دہلی سے مرادنگر، میرٹھ، شاہجہانپور، گڑھ مکتیسر، مراد آباد ہوتے ہوئے جنوری ۱۸۶۰ء کو رامپور پہنچے۔ نواب صاحب نے بڑی تعظیم و تکریم کی اور اپنی خاص کوٹھی میں رہائش کا انتظام کیا مگر چند یوم بعد محلہ [illegible] دوارہ ایک " [illegible] مکان میں تا قیام رامپور وہیں رہے۔

آخری ایام ناتوانی زوروں پر ہے، بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے ضعف، سستی، کاہلی، گراں جانی گرانی، رکاب میں 15
پاؤں ہے، باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور و دراز درپیش ہے۔ زادِ راہ موجود نہیں، خالی ہاتھ جاتا ہوں
اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقر ہے ہاویہ زاویہ ہے، دوزخ جاوید اور ہم ہیں۔

اس تین برس میں ہر روز مرگِ نو کا مزہ چکھتا رہا ہوں۔ حیران ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں پھر میں کیوں جیتا ہوں۔ روح میری اب جسم میں اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں حواس کھو بیٹھا، حافظہ کو رو بیٹھا۔ اگر اٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں اٹھتا ہوں کہ جتنی دیر میں ایک قدِ آدم دیوار اٹھے۔

آپ کی پرسش کے قربان جاؤں جب تک میرا مرنا نہ سُنا میری خبر نہ لی

میرے محب! میرے محبوب! تم کو میری خبر بھی ہے۔ آگے ناتواں تھا، اب نیم جاں ہوں، آگے بہرا تھا، اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔ رام پور کے سفر کا رہ آورد ہے، رعشہ، ضعف بصر، جہاں چار سطریں لکھیں انگلیاں ٹیڑھی ہو گئیں۔ حروف سوجھنے سے رہ گئے۔ اکہتر برس جیا۔ اب زندگی برسوں کی نہیں مہینوں اور دنوں کی ہے۔

بقول حالی، وفات سے ایک دن قبل نواب علائی کو خط میں لکھوایا "میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو
ایک آدھ روز میں میرے ہمسایوں سے پوچھنا۔" ان دنوں میں یہ شعر مرزا صاحب عموماً پڑھتے رہتے تھے ٥

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

بیہوشی کے عالم میں حکیم محمود خاں اور حکیم احسن اللہ خاں نے تشخیص کی کہ دماغ پر فالج گرا ہے تمام کوششیں اور علاج بے سود ثابت ہوئے۔ آخر کار وہ دن آگیا جس کا غالب کو ایک مدت سے انتظار تھا اور ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء بروز شنبہ دوپہر ڈھلے شاعری کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ یہ افسوسناک خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی اور زیارت کے لیے لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ تجہیز و تکفین کا انتظام نواب ضیاء الدین احمد خاں نے کیا۔ شہر کے تمام اکابر و عمائد جنازے میں شریک ہوئے، دہلی دروازہ کے باہر نماز ادا کی گئی اور حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار کے قریب اپنے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف کے پہلو میں دفن ہوئے۔

تبصرہ

پتہ نہیں اس کارگاہِ عالم میں پیدائش و موت کا عمل کب سے جاری ہے اور خدا جانے کب تک جاری رہیگا ہر طلوعِ صبح کے ساتھ نہ جانے کتنے جامۂ ہستی سے آراستہ ہو کر سطح ارض پر قدم رکھتے ہیں اور کتنے تارِ ہستی کو شکستہ کر کے آغوشِ فنا میں جا چھپتے ہیں۔ یہ عمل ہر لمحہ بر سر کار ہے۔ پیدا ہونے والوں میں ہر قسم کے لوگ اِس دنیا میں آکر اپنے افکار و اعمال کے ڈنکے بجا کر چلتے بنتے ہیں مگر ان کی دکھائی ہوئی شاہراہیں اربابِ دُنیا کے لیے غور و فکر کا مرکز بنی رہتی ہیں۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ ایسی ابدی اور یکتائے زمانہ ہستیاں روز روز پیدا نہیں ہوتی ہیں بلکہ ان کا ظہور صدیوں بعد ہوتا ہے اور جب ایسی ہستیاں ابھرتی ہیں تو علم و ادب کی نئی شمعیں روشن ہوتی ہیں۔

مرزا اسداللہ خاں غالب بھی ایسے ہی نادرہ کار فن کاروں میں یگانہ و یکتا تھے جن کی رفعتِ تخیل، جدتِ ادا اور حُسنِ بیان نے شعر و ادب کو ایسی حیات بخشی جس کی آب و تاب کے سامنے مرزا غالب کے ہمعصر تاب نہ لاسکے۔ یوں تو شعر و ادب کے افق پر لے شمار ستارے اُبھرے اور اُبھرتے رہتے ہیں مگر ان میں وہ روشنی کہاں جو غالب میں ہے کیونکہ جہاں غالب کی فکری پرواز پہنچتی ہے وہاں دوسرے شعرا کا گزر بھی نہیں ہوتا

مرزا غالب کا ابتدائی کلام الفاظ و معانی میں مشکل اور پیچیدہ معلوم ہوتا ہے جس پر معاصرینِ غالب نے اکثر ہنگامے برپا کیے، مگر مابعد ان کی نکتہ رس طبیعت نے کلام میں سادگی اور پرکاری کے ایسے جوہر دکھائے کہ جن کی روشنی رہتی دنیا تک قایم رہے گی۔

مرزا غالب ہی پہلا شاعر ہے جس نے اُردو غزل کو نئے نئے مضامین سے بھر دیا اور فلسفہ و حکمت کا رنگ دے کر گہرائی اور گیرائی بخشی۔ ورنہ غالب کے عہد تک غزل گوئی برابر ایک ہی روش پر چلی آرہی تھی وہی فرسودہ محاورے، سیدھا سادا روزمرہ، مقررہ تشبیہات و استعارات، ہجر و وصال کے پامال جذباتِ حسن و عشق وغیرہ۔ چونکہ مرزا غالب فطرتاً ایک شوخ اور ندرت پسند طبیعت لے کر آئے تھے اس لیے ان کو یہ داستان گوئی اپنی طرف متوجہ نہ کرسکی۔ وہ شعر و سخن کے میدان میں ایک نئے آہنگ کے ساتھ داخل ہوئے۔ انھوں نے غزل کو

نیالب ولہجہ اور نئے اندازِ بیان سے آراستہ کیا۔

غالب کی کتابِ شاعری میں بے شمار جلی عنوانات ہیں ۔طنز وظرافت کو دیکھا جائے تو زعفران زار نظر آتا ہے۔ گہرائیِ افکار کا مشاہدہ کیا جائے تو لاامثال ہے۔ طرزِ ادا اور ندرتِ بیان پر روشنی ڈالی جاے تو ایک جہانِ نو کی سیر کا لطف حاصل ہوتا ہے

مرزا صاحب بحیثیت نثر نگار

مرزا کی شاعرانہ عظمت میں تو گنجائشِ کلام نہیں مگر اُن کی نثر نگاری کا مرتبہ بھی ان کی شاعری سے کم بلند نہیں۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں کہ جن میں گوناگوں کمالات وصلاحیتیں یکجا پائی جاتی ہوں ۔ اگر کسی میں ملکۂ شاعری پایا جاتا ہے تو کسی کو نثر میں موتی بکھیرنا آتا ہے کسی کا قلم جاندار ہے تو کسی کی زبان تیغ جوہر دار ہے۔ مگر یہ غالب کی ہستی ہے کہ جہاں کمالات برابر کی حیثیت سے جلوہ گر ہیں۔ یعنی اگر وہ ایک طرف عظیم شاعر ہیں تو دوسری طرف اعلیٰ پایہ کے نثر نگار اور انشاپرداز بھی ہیں ۔

مرزا صاحب کی نثری تصانیف میں خطوط کا سرمایہ گراں بار ہے اور گراں قدر بھی۔ یہ خطوط اگر ایک نوعیت سے مرزا کی اندرونی اور بیرونی زندگی کے ترجمان ہیں تو دوسری حیثیت سے ان کی شوخیِ تحریر اور پاکیزگیِ بیان کی منہ بولتی تصویریں ہیں جنھوں نے ایک البم کی صورت اختیار کرلی ہے، وہ پُرکشش بھی ہیں اور دلچسپ بھی۔

مرزا پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی ہستی کو خطوط کے آئینہ میں پیش کیا ہے۔ روزمرہ کی باتیں ایسے انوکھے اور شگفتہ انداز سے قلم بند کی ہیں کہ عبارت کی دلچسپی اور طرزِ بیان کی خوبی میں چار چاند لگ گئے ہیں یہ خطوط تمام کے تمام فطری اور بے تکلف ہیں۔ ان میں نمائش اور ظاہر داری کا پتہ نہیں ۔ اپنے کلام پر ناز بھی کرتے ہیں اور قسمت کا گلہ بھی۔ وہ دنیا کے اچھے خاصے شعور کے باوجود بھی دنیادار اور زمانہ ساز نہیں ہیں۔

غالب خطوط میں مکتوب الیہ کی حیثیت کے اعتبار سے ایسے جملے اور الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ جن سے ہر جگہ ایک امتیازی شان ٹپکتی ہے۔ عبارت کی سلاست وروانی سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آمنے سامنے بیٹھے بات چیت کر رہے ہیں۔ ظرافت سے بھرپور جملے، چھوٹے چھوٹے چٹکلے، لطیف شوخیاں، نرالی ادائیں، کچھ عجیب لطف اور دلچسپی پیدا کر دیتے ہیں۔ غالب نے لمبے چوڑے القاب یک قلم ترک کر دیے وہ کبھی کبھی تو بغیر ہی

القاب[۱۸] کے نفسِ مضمون پر اُتر آتے ہیں۔ غالب کی شوخیاں اپنے عزیزوں، دوستوں اور شاگردوں تک ہی محدود نہیں رہتیں بلکہ وہ اپنے گھر والوں سے بھی اسی انداز سے مخاطب ہو جاتے ہیں۔

جو حضرات مرزا غالب کا موازنہ ان کے ہمعصروں سے کرتے ہیں وہ کوئی قابلِ تعریف ادبی خدمت انجام نہیں دیتے بلکہ معیارِ ادب ہی کو گھٹا دیتے ہیں۔ کیونکہ مقابلہ کرنے میں کلامِ غالب کی آب و تاب کے سامنے ان کے معاصرین کے کلام کی خوبیاں اور اوصاف مزید مدھم پڑ جاتے ہیں۔ لوگ موازنہ کرتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ غالب کے ادب کی تخلیق ایک قدرتی عطیہ ہے جبکہ دوسرے شعراء کا کلام محنت و کوشش کی پیداوار ہے۔ بالعموم ایسا ادب جدّت و ندرت سے محروم ہوا کرتا ہے کیونکہ اس کے آس پاس روایت و تقلید کے پردے پڑے ہوتے ہیں برخلاف اس کے غالب کا فن سر تا سر ایک نئے فہم کی دولت سے مالا مال ہے جو ان کے اپنے ذہن و فکر کی تخلیق (جدت) ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں تقلید و پیروی کے بجائے انوکھا پن ہے اور نرالا ڈھنگ ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھنا چاہیے کہ ستاروں کی روشنی، ماہتاب کی روشنی، سورج کی روشنی، ہر ایک اپنی اپنی جگہ روشنی ہے لیکن اگر کوئی شخص ان روشنیوں کا مقابلہ کرنے لگے تو اسے کیا کہا جائے گا۔ حالانکہ ستارے، چاند اور سورج سب ہی روشن ہیں مگر ان میں جو فرق ہے وہ ہر باشعور کو معلوم ہے۔ بس یہی فرق کلامِ غالب اور ان کے ہمعصروں کے کلام میں ہے۔ بے شک و شبہ کہنا پڑتا ہے کہ: غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

مرزا نے حالات کی ناسازگاری سے متاثر ہو کر انتہائی پریشانی کے عالم میں اپنے دردِ دل اور خونِ تمنّا کا اظہار کتنے مایوسانہ انداز میں کیا ہے "میں زمانے سے زیادہ نہیں تھوڑی سی آسایش اور اطمینانِ قلب چاہتا تھا جو مجھے نہ مل سکا"۔ ان تمام حرماں نصیبیوں کے باوجود انہوں نے جو کچھ بھی کہا اور جس عالم میں کہا اس کی قیمت اور بلندی کا ان کو احساس تھا چنانچہ مہرِ نیمروز میں بہادر شاہ ظفر کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔
"صاحبقرانِ ثانی حضرت شاہجہاں نے اپنے درباری شاعر کلیم کو سیم و زر اور لعل و گہر سے تلوایا تھا۔ میں تو بس اتنا چاہتا ہوں کہ زیادہ نہیں تو آپ سخن سنج حضرات کو حکم دیں کہ وہ ایک بار میرے کلام کو ہی کلیم کے کلام کے ساتھ تولنے کی زحمت گوارا فرمالیں"۔

سچ تو یہ ہے کہ لوگوں نے مرزا صاحب کے مرتبے اور مقام کا ان کی زندگی میں صحیح اندازہ نہیں لگایا۔

دنیا نے کم فہمی اور ناسمجھی کے سبب ان کی علمی اور ادبی صلاحیتوں کا پورا فائدہ نہیں اٹھایا۔

"درفشِ کاویانی" میں مرزا صاحب نے اپنے اعلیٰ مقام کے بارے میں اس طرح لکھا ہے۔

" روحِ سخن کی جستجو میں میری عمر کے باون برس گزر چکے اور اب میری عمر چھیاسٹھ کی ہو چکی ہے۔ میں اس نعمتِ کلام عطا کرنے والے خداوند کریم کا شکر گزار ہوں کہ کمالاتِ فن سے نوازنے والے مالک نے ان باون برسوں میں مجھ پر کیسے اعلیٰ خیالات اور معنویت کے دروازے کھول دیے ہیں اور میرے فکر و خیال کی کرسی کو معرفت و آگاہی کی کس بلندی پر جگہ دی ہے وہ بیان نہیں کر سکتا۔ افسوس تو یہ ہے کہ میرے دور کے لوگوں نے میری شاعرانہ خوبیوں کو نہیں پہچانا۔ ایسے لوگوں کی کج فہمی اور کوتاہ نظری سے میرا دل جل رہا ہے۔ نظر کو روشنی بخشنے والے کمالات کہ جن کو میں نے اپنی نظم و نثر میں صرف کیا ہے ان کی خوبیوں کو دیکھ کر یہ نوگ پیچ و تاب میں پڑ گئے۔

(ترجمہ فارسی)

شاکر کو ایک خط میں لکھا "نظم و نثر کے قلمرو کا انتظام ایزد دانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہو چکا ہے۔ اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام و نشان باقی و قائم رہے گا۔

پھر ایک خط میں نواب علاؤالدین احمد کو لکھا "مجھے اپنے ایمان کی قسم ہے میں نے اپنی نظم و نثر کی داد باندازۂ بایست پائی نہیں۔ آپ ہی کہا اور آپ ہی سمجھا"

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجایش نہیں۔ ان کے کلام اور ادب کی جو قدر ہوئی یا دنیا نے اس کی جو قیمت لگائی اس کی مثال اس پیرزال کی سی ہے جو سوت کی انٹی لے کر بازارِ مصر میں حضرت یوسف کی خریداری کے لیے پہنچی تھی۔ بقولِ غالب ؎

جو چاہیے نہیں وہ مری قدر و منزلت — میں یوسف بقیمتِ اول خریدہ ہوں

یوں تو مرزا غالب کے کلام میں بے شمار قسم کے مضامین و خیالات موجود ہیں جو غزل گوئی کے دائرہ میں شامل ہیں۔ یہاں کچھ عنوانات کے تحت اشعار کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔ ہر شعر جادو کا اثر رکھتا ہے۔ لطفِ زبان اور حسنِ بیان کی وہ کونسی خوبی ہے جو ان شعروں میں موجود نہیں۔ یقیناً ایسے ہی اشعار ہوتے ہیں جو خود بھی ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور شاعر کو بھی زندہ جاوید بنا دیتے ہیں۔

۲۰

عاشقانہ

نہ ہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب ۔۔۔ کہ بن کہے ہی انھیں سب خبر ہے کیا کہیے
لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ ۔۔۔ جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا
گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار ۔۔۔ لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا ۔۔۔ تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے
نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا ۔۔۔ مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی
حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ ۔۔۔ جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا
کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق ۔۔۔ ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد
لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا ۔۔۔ لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا! ۔۔۔ پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں
عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب ۔۔۔ دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک
غالبؔ گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں ۔۔۔ حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

خمریات، شوخی

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید ۔۔۔ مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ ۔۔۔ مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے
رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنِ مے ۔۔۔ مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے
رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم ۔۔۔ دھوئے دھبے جامۂ احرام کے
مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو ۔۔۔ اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے
پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے ۔۔۔ پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے
مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام ۔۔۔ ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار ۔۔۔ یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے؟

رقابت

اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھ کو بعدِ قتل ۔۔۔ میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے
ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا ۔۔۔ بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا
رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف ۔۔۔ عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا
دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہیے ۔۔۔ ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہیے
جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار ۔۔۔ اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں ۔۔۔ ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

۲۱

پاسباں	دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے	بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا
	گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے	اٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے
	بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہیے	کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
شبِ غم	کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے	مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
	کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول	آج اُدھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا
	کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ	صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا
اَخلاق	دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا	یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
	نہ سنو گر برا کہے کوئی	نہ کہو گر برا کرے کوئی
	روک لو گر غلط چلے کوئی	بخش دو گر خطا کرے کوئی
	سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالبؔ	خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے
یادِ رفتگاں	سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں	خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
	مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم	تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے؟
ناصح	شور پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا	آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا
	حضرتِ ناصح گر آویں دیدہ و دل فرشِ راہ	کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھاویں گے کیا؟
	یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح	کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا
	گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی	یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جاویں گے کیا؟
	نہ از ناصح سے غالبؔ کیا ہوا گر اس نے شدت کی	ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر
موت	ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی	میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا
	ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا	نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
	تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا	اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا
	رہا گر کوئی تا قیامت سلامت	پھر اِک روز مرنا ہے حضرت سلامت
	یہ ضد، کہ آج نہ آوے اور آئے بِن نہ رہے	قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے؟
سوز و گداز	ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا	نہ کبھی جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا
	نامے کے ساتھ آ گیا پیغامِ مرگ	رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا
	نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے	بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

۲۲

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گِلا کرے کوئی

تصوف

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کُل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہرچند ہر ایک شے میں تو ہے
پر تجھ سی کوئی شے نہیں ہے

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

دُشمنی

تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں ہم نے ہم زباں اپنا

کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے

دوستدارِ دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم
آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

دشمنی نے میری کھویا غیر کو
کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیے

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

شکایت

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں غالبؔ
بدی کی اُس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دُور
رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم

متفرق اشعار

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

بوئے گُل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال
کہ یہ کہے کہ سرِ رہ گذر ہے کیا کہیے

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اِک بزرگ ہیں ہم سفر ملے

جور سے باز آئے، پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں "ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا"

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھُلا

کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول
آج اُدھر ہی کو رہے گا دیدہ اختر کھُلا

وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

واں گیا بھی میں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
ترا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے

میں بھی رُک رُک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے
دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

مرزا غالب عجیب و غریب دماغ لے کر آئے تھے۔ ان کو اپنی صلاحیتوں کا پورا احساس تھا۔ زمانہ کی بے حسی و کم نگاہی پر ان کا دل جلتا تھا مگر خود اعتمادی میں کسی طرح کمی نہ آنے پائی۔ انھوں نے اپنی شاعری کے لیے راستہ بھی الگ اختیار کیا۔ نادر تشبیہیں اور خوبصورت استعارے تلاش کیے۔ تخیل کی نزاکت اور معنی آفرینی سے گلستانِ شاعری کو یوں آراستہ کیا کہ شعر و ادب کو چار چاند لگ گئے۔ قدرت نے یہ عطیہ غالب ہی کو بخشا تھا جو ان کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ اگرچہ متعدد شاعروں نے مرزا غالب کے رنگ کو اپنانا چاہا اور ہر زاویہ سے دوڑ دھوپ کی مگر گردِ راہ کو نہ پہنچ سکے۔ گویا

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

۲۴

تصانیف

کلیاتِ نثر فارسی

سبدِ چین ، دُرفشِ کاویانی ، دستنبو ، پنج آہنگ ، قاطع برہان ، مہرِ نیمروز ، دعاء صباح ، مآثرِ غالب ،

کُلیاتِ نظم فارسی

غزلیات ، رباعیات ، قطعات اور مثنویات کا مجموعہ ہے مثنوی ابرِ گہر بار اور درد و داغ شاہکار مثنوی ہیں

نثر اردو

عُودِ ہندی ، اردوے معلّٰے ، مکاتیب غالب مرتبہ عرشی خطوط کے مجموعے ہیں۔ نکاتِ غالب و رقعاتِ غالب

دیوان غالب اُردو

یہ وہی منتخب دیوان ہے کہ جو مرزا کی حیات میں پانچ مرتبہ شائع ہوا یعنی ۱۸۴۱ و ۱۸۴۷ و ۱۸۶۱ دہلی میں ۱۸۶۲ کانپور میں اور ۱۸۶۳ آگرہ میں چھپا اور یہ سلسلہ مسلسل جاری ہے اور یہ کلام ہی ہے جس سے مرزا زندہ جاوید ہیں

شجرہ مرزا غالب

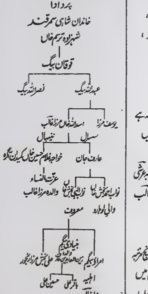

الف

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا (۱) کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ (۲) صبح کرنا شام کا لانا ہے جُوئے شیر کا
جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے مُدّعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا
بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرِ پا مُوئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

جراحت تحفۂ الماس ارمغان داغِ جگر ہدیہ (۹) مبارکباد اسد! غمخوارِ جانِ دردمند آیا

(۱) اس شعر کو بعض شارحین نے بے معنی قرار دیا ہے جوکہ سراسر بے انصافی ہے جبکہ اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے مرزا صاحب نے عبدالرزاق شاکر کو لکھا ہے کہ "ایران میں رسم ہے کہ داد خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے جیسے مشعل دن کو جلانا یا خون آلودہ کپڑا بانس پر لٹکا کر لے جانا. پس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس کی شوخیِ تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورتِ تصویر ہے اُس کا پیرہن کاغذی ہے یعنی ہستی اگرچہ مثلِ تصاویر اعتبارِ محض ہو موجبِ رنج و ملال و آزار ہے "۔

(۲) جُوئے شیر دودھ کی نہر شیریں کے عاشق فرہاد نے کوہِ بے ستون کو عرصہ دراز کی محنت سے کاٹ کر نہر کو نکالا تھا۔ کہتے ہیں کہ شیریں کا ہمراز شاپور اپنے دوست فرہاد کو شیریں کے پاس لایا. فرہاد شیریں کو دیکھتے ہی فریفتہ ہو گیا اور جب اس کے عشق کا چرچا پھیلا تو خسرو کو بھی پتہ چل گیا۔ اُس نے سزا کے طور پر فرہاد سے کہا کہ شیریں کو تازہ دودھ ملنے میں دقّت ہے اگر وہ کوہِ بے ستون کاٹ کر اُس کے لیے دودھ کی نہر محل کے نیچے لے آئے تو شیریں کو پاسکتا ہے۔ خُسرو کو یقین کامل تھا کہ یہ محال کام فرہاد سے نہ ہو سکے گا اور ایفائے وعدہ کا موقع کبھی نہ آئے گا۔ مگر عاشق زار ایسا مصروف ہوا کہ برسہا برس کی مشقت سے ناممکن کام کو بھی ممکن بنا دیا۔ جب وعدہ کا موقع آیا تو خُسرو نے ایک مکّار بڑھیا کے ذریعہ جھوٹی خبر اُڑا دی کہ شیریں مر گئی ہے جس کو سُنتے ہی فرہاد نے اپنے تیشے سے سر پھوڑ کر خود کو مار ڈالا۔ فرماتے ہیں: ہجر کی رات کاٹنی اتنی مشکل ہے جتنی فرہاد کو نہر کے لانے میں ہوئی تھی۔

(۹) جراحت: زخم۔ الماس: ہیرا جس کے چاٹنے سے آدمی مجروح ہو جاتا ہے اور جس کا سفوف زخم پر چھڑکنے سے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ ارمغان: تحفہ۔ اسد غالب کا پہلا تخلص، اے اسد مبارک ہو کہ تمہاری دردمند جان کا ہمدردِ عشق اس شان کے ساتھ تم سے ملنے آیا ہے کہ جگر کے داغ اور الماس جیسے تحفے اپنے ہمراہ لایا ہے۔

۲۶

جُز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار — صحرا مگر بہ تنگیٔ چشمِ حسود تھا
آشفتگی نے نقشِ سُوَیدا کیا درست — ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دُود تھا
تھا خواب میں خیال کو تجھ سے مُعاملہ — جب آنکھ کُھل گئی نہ زیاں تھا نہ سُود تھا
لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز — لیکن یہی کہ "رفت" گیا اور "بُود" تھا
ڈھانپا کفن نے داغِ عیُوبِ برہنگی — مَیں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجُود تھا
تیشے بغیر مَر نہ سکا کوہکن اسدؔ (۶) — سرگشتۂ خُمارِ رُسوم و قیُود تھا

کہتے ہو نہ دیں گے ہم، دل اگر پڑا پایا — دل کہاں، کہ گُم کیجے؟ ہم نے مدّعا پایا
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا — درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا
دوستدارِ دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم — آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا
سادگی و پُرکاری، بیخودی و ہُشیاری — حُسن کو تغافل میں جُرأت آزما پایا
غنچہ پھر لگا کھِلنے، آج ہم نے اپنا دل — خُوں کیا ہوا دیکھا، گُم کیا ہوا پایا
حالِ دل نہیں معلوم لیکن اِس قدر یعنی — ہم نے بارہا ڈھونڈھا تُم نے بارہا پایا
شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا — آپ سے کوئی پوچھے تُم نے کیا مزا پایا؟

(۶) کوہکن کا عشق کامل نہ تھا ورنہ شیریں کی موت کا علم ہوتے ہی اُس کی جان نکل جاتی لیکن اُس نے اپنے مرنے کے لیے تیشے کا استعمال کیا۔ ایک عاشق کی یہ شان ہے کہ مرنے کے لیے کسی ذریعہ کا محتاج نہ رہے۔
مرزا صاحب کوہکن کی موت پر طنز کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ عشقِ کامل کا درجہ بہت بلند ہے کوہکن وہاں تک نہ پہنچ سکا رُسوم و قیود نے اُسے مرنے کے لیے تیشہ کا محتاج بنا دیا۔ عشقِ کامل ان پابندیوں سے ہمیشہ آزاد ہے۔

دِل مرا سوزِ نہاں سے بے مُحابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اِس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

عرض کیجیے، جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں ؟
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اِس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

مَیں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا

شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا (۷)
قیس تصویر کے پردے میں بھی عُریاں نکلا

زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی یارب! (۸)
تیر بھی سینۂ بسمل سے پَر افشاں نکلا

بُوئے گُل نالۂ دل، دُودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذّتِ درد
کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

تھی نوآموزِ فنا ہمّتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

دل میں پھر گریہ نے اِک شور اٹھایا غالبؔ
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

(۷) اس شعر کا مطلب مرزا صاحب نے مولوی عبدالرزاق شاکر کے خط میں اس طرح لکھا ہے۔
"رقیب بمعنی مخالف۔ شوق سر و ساماں کا دشمن ہے۔ دلیل یہ ہے کہ قیس جو زندگی میں ننگا پڑا پھرتا تھا، تصویر کے پردے میں بھی ننگا ہی رہا۔ لطف یہ ہے کہ مجنوں کی تصویر باتنِ عُریاں ہی کھنچتی ہے جہاں کھنچتی ہے۔"
(۸) اس شعر کے متعلق مرزا صاحب نے شاکر کو لکھا ہے۔ یہ ایک بات میں نے اپنی طبیعت سے نکالی ہے جیسا کہ اس شعر میں ہے۔
'نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں ÷ وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے' یعنی زخمِ تیر کی توہین بسبب ایک رخنہ ہونے کے اور تلوار کے زخم کی تحسین بسبب ایک طاق سا کھل جانے کے زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی یعنی زائل نہ کیا تنگی کو۔ پَر افشاں بمعنی بیتاب اور یہ لفظ تیر کے مناسب حال ہے۔ معنی یہ کہ تیر تنگیِ دل کی داد کیا دیتا وہ تو خود ضیقِ مقام سے گھبرا کر پَر افشاں اور سراسیمہ نکل گیا

دھمکی میں مرگیا جو نہ بابِ نبرد تھا (۱) عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا
تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا
تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا
دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب اس رہگذر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا
جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا
احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا
یہ لاشِ بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے (۲) حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا (۳) تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا
بفیضِ بے دلی نومیدیِ جاوید آساں ہے کشایش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا
ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریِ قاتل کہ اندازِ بخوں غلتیدنِ بسمل پسند آیا

(۱) فرہاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہم نے صرف عشق کی دھمکی میں آکر ہی اُس کی طرح جان نہیں دی، بلکہ ہم تو مردانگی کے ساتھ عشق اور مصائبِ عشق کا مقابلہ تمام عمر کرتے رہے۔

(۲) اسدِ خستہ جان کو خدا بخشے عجیب آزاد مرد تھا۔ لاش کے لیے بھی پابندِ کفن ہونا گوارا نہ کیا اور اپنی آزادی مرکر بھی برقرار رکھی۔
حضرت ذوق نے بھی اپنی موت کے متعلق اسی قسم کا شعر کہا ہے ؎

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

(۳) یہ مطلع اور اس کے بعد کے دو شعر مرزا صاحب کے ابتدائی کلام کا نمونہ ہیں، ابتدائی کلام میں مرزا صاحب کے یہاں بیان کی پیچیدگی اور فارسیت بہت زیادہ ہوتی تھی۔ فرماتے ہیں ہمارے محبوب کو ایک ہی ہاتھ سے سو سو دل اُڑا لینے کا مشغلہ پسند ہے اس لیے اُس مشکل پسند محبوب کو تسبیح کے سو دانوں کو شمار کرنے کا مشغلہ پسند ہے۔

۲۹

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

(۶) سبزۂ خط سے ترا کاکُلِ سرکش نہ دبا
یہ زمُرّد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سرمنزلِ تقوی نہ ہوا

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

(۷) مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

بیاں کیا کیجیے بیدادِ کاوش ہائے مژگاں کا!
کہ ہر یک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

دکھاؤں گا تماشہ دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

(۶) مرزا صاحب نے سانپ اور زمرد کے متعلق چودھری عبدالغفور کو اس طرح لکھا ہے: "قبولِ دعا وقت طلوع منجملہ مضامینِ شعری ہے جیسے کتاں کا پرتوِ ماہ میں پھٹ جانا اور زمرد سے افعی کا اندھا ہو جانا۔
دمِ افعی۔ سانپ کی پھنکار۔ زمرد سبز رنگ کا قیمتی پتھر جس کے دیکھنے سے سانپ اندھا ہو جاتا ہے۔ آصف الدولہ والیِ اودھ نے اسکا تجربہ کیا۔ سانپ کے سامنے زمرد رکھا لیکن سانپ اندھا نہ ہوا۔ مرزا صاحب نے اسکی تائید میں سبزۂ خط کو زمرد اور زلف کو سانپ سے تشبیہ دیکر یہ مضمون پیدا کیا ہے۔
(۷) دمِ عیسیٰ۔ عیسیٰ کی پھونک۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک زبردست پیغمبر گزرے ہیں ان کے ماننے والوں کو عیسائی کہتے ہیں مسلمان بھی ان کو پیغمبر مانتے ہیں۔ ان کا یہ معجزہ تھا کہ اپنی پھونک سے مردہ زندہ کر دیا کرتے تھے۔
فرماتے ہیں مسیحا نے مجھے حیات دینے کے لیے لب ہلائے مگر میری ناتوانی کو جنبشِ لب بھی گراں گزری اور یہ صدمہ میں برداشت نہ کر سکا۔ جو جنبشِ لب زندگی بخشنے والی تھی میرے لیے موت کا باعث بن گئی۔

٣٠ مری تعمیر میں مُضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرمِ دہقاں کا

اُگا ہے گھر میں ہر سُو سبزہ، ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مُردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا!

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بیدماغی ہے
کہ موجِ بُوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

تو اور سُوئے غیر نظرہائے تیز تیز!
مَیں اور دُکھ تری مژہ ہائے دراز کا

صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا وگرنہ مَیں
طُعمہ ہوں ایک ہی نَفَسِ جاں گداز کا

ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اِس گرہِ نیم باز کا

تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ
سینہ کہ تھا دفینہ گُہرہائے راز کا

۳۱۔

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھُلا (۱) رکھیو یارب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھُلا
شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھُلا (۲) اس تکلف سے کہ گویا بُتکدہ کا در کھُلا
گرچہ ہوں دیوانہ پرکیوں دوست کا کھاؤں فریب؛ آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھُلا
گو نہ سمجھوں اُسکی باتیں گو نہ پاؤں اُسکا بھید پر یہ کیا کم ہے کہ مُجھ سے وہ پری پیکر کھُلا
ہے خیالِ حُسن میں حُسنِ عمل کا سا خیال خُلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھُلا
مُنھ نہ کھُلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں زُلف سے بڑھ کر نقاب اُس شوخ کے مُنھ پر کھُلا
در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھُلا
کیوں اندھیری ہے شبِ غم! ہے بلاؤں کا نزول آج اُدھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھُلا
کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھُلا
اُسکی اُمت میں ہوں مَیں میرے رہیں کیوں کام بند؟ (۱۰) واسطے جس شہ کے غالب گنبدِ بے در کھُلا

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا شعلۂ جوّالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا
واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا
واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

(۱) ان مشاعروں کی طرف اشارہ ہے جو حضرت بہادر شاہ ظفر کی زیرِ سرپرستی قلعہ معلی میں ہوا کرتے تھے اور جن میں مرزا صاحب بھی شرکت کیا کرتے تھے (۲) دوسرے شعر میں مشاعرہ کی چہل پہل اور رونق کو بتکدہ کے حسن و جمال سے تشبیہ دے کر ایک لطیف بات پیدا کر دی ہے۔
(۱۰) مقطع میں مرزا صاحب نے شبِ معراج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ میں اُن کی اُمت میں ہوں جن کے لیے عرش پر جاتے وقت آسمان کے دروازے کھُل گئے تھے۔ پھر میرے کام کس طرح بند رہ سکتے ہیں وہ بھی کھُل جائیں گے۔ معراج اہل اسلام کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک رات حضرت محمدؐ کو دیگر انبیاء سے اُن کا درجہ بلند کرنے کے لیے عرش پر بلایا تھا۔ رسول اللہ صلعم ایک خاص سواری (براق) پر سوار ہو کر آسمانوں کا فاصلہ طے کر کے اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچے تھے۔

۳۲

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو — یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا
یاں سرِ پُرشور بے خوابی سے تھا دیوار جُو — واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا
یاں نَفَس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی — جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا
فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا — یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا
ناگہاں اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا — دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا — (۶) تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر گو بیتاب تھا
مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے! — خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا
نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں؟ — پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا
کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں — ذرہ ذرہ رُوکشِ خُورشیدِ عالمتاب تھا
آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے؟ — کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا
یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا — انتظارِ صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا
میں نے روکا رات غالبؔ کو وگرنہ دیکھتے — اُسکے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب — خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا
اب مَیں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو — توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا
گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں — جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار تھا
موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال — ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آبدار تھا
کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب — دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

(۶) سپند، اسپند۔ کالا دانہ جس کو نظرِ بد سے بچانے کے لیے آگ میں جلاتے ہیں۔ رات کو ہمارے دل کے نالے میں بالکل اثر نہ تھا اگرچہ وہ جلتے ہوئے اسپند کے مانند بے چین ضرور تھا لیکن ہمیں بچانے کے بجائے وہ محبوب اور غیر کی ملاقات کو نظرِ بد سے بچانے کے لیے اسپند بن گیا تھا!

بسکہ دُشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا — آدمی کو بھی مُیسّر نہیں انساں ہونا
گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی — در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا
وائے دیوانگیِ شوق کہ ہر دم مجھ کو — آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا
جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے — جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا
عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنّا مت پُوچھ — عیدِ نظّارہ ہے شمشیر کا عُریاں ہونا
لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنّائے نشاط — تُو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا
عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنّا کھانا — لذّتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا
کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ — ہائے اُس زُود پشیماں کا پشیماں ہونا
حیف اُس چارگرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ (۱) — جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا — تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا
یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا — جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا
مانعِ وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے؟ (۲) — خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا
پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حُسن — دست مرہونِ حنا رخسار رہنِ غازہ تھا
نالۂ دل نے دیے اوراقِ لختِ دل بہ باد — یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

(۱) مرزا صاحب کو ایک دفعہ زنداں میں بھی جانا پڑا۔ رہائی کے دن جب وہ چلنے لگے اور لباس تبدیل کرنے کا موقع آیا تو کرتہ وہیں پھاڑ کر پھینکا اور یہ شعر پڑھا۔ حیف اِس چارگرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ — جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

(۲) وحشت خرامی، دیوانہ وار گھومنا، صحرا گرد، جنگل ہی میں گھومنے والا، خانۂ بے دروازہ بغیر دروازہ کا مکان
دیوانگیِ عشق کی وجہ سے مجنوں ہمیشہ جنگل میں گھومتا رہتا تھا۔ یہی اُس کا گھر در تھا اگر لیلیٰ بھی مجنوں کے عشق میں گھومتی ہوئی ادھر جانکلتی تو اُسے مجنوں سے ملنے میں کوئی دقت نہ ہوتی اسلئے کہ مجنوں کے گھر صحرا کا کوئی دروازہ نہیں تھا جسمیں داخل ہونے وقت لیلیٰ کو کوئی رکاوٹ ہوتی

۳۴ دوست غمخواری میں میری سعی فرماویں گے کیا؛ زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جاویں گے کیا؛
بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرماویں گے کیا؛
حضرتِ ناصح گر آویں دیدہ و دل فرشِ راہ کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھاویں گے کیا؛
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لاویں گے کیا؛
گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جاویں گے کیا؛
خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؛ ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبراویں گے کیا؛
ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ (۱) ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہیں کھاویں گے کیا؛

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا کبھی تُو نہ توڑ سکتا اگر اُستوار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا؛
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح؛ کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

(۱) مرزا غالب نے پتہ نہیں کب یہ غزل کہی ہو گی مگر مقطع کے مصرعہ ثانی کا مضمون مندرجہ تحت خط سے وابستہ نظر آتا ہے جب کہ وہ مصائب و تنگدستی کا شکار ہو کر دِلی کو خیر باد کہنے کا ارادہ کر چکے تھے۔ فرماتے ہیں:

"خوشی مجھ میں تم میں مشترک ہے۔ تم نے مجھے تہنیت دی تو مبارک اور میں نے تمہیں تہنیت دی تو مناسب۔ اللہ الحمد، للہ الشکر بھائی سچ تو یوں ہے کہ ان دنوں میں میرے پاس ٹکٹ نہیں۔ اگر بیرنگ بھیجوں تو کہار ماندہ الخ نہیں سکتا۔ ڈاک گھر تک جائے کون؟ اپنا مقصود تمہارے والد ماجد سے اور تمہاری جدہ ماجدہ اور تمہارے عم عالی مقدار سے کہہ چکا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ میری بیوی اور بچوں کو کہ یہ تمہاری قوم کے ہیں مجھ سے لے لو۔ میں اب اس بوجھ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے بھی بشرط ان لوگوں کے لوہارو جانے کے اس خواہش کو قبول کر لیا۔ میرا مقصد سیاحت کا ہے۔ پنشن اگر کھل جائے گی تو وہ اپنے صرف میں لایا کروں گا جہاں جی لگا، وہاں رہ گیا جہاں سے دل اکھڑ گیا چل دیا۔" مگر مرزا صاحب نے اپنے خاندانی وقار کا پورا خیال مدنظر رکھتے ہوئے دلّی چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیا اور وہ دلّی سے باہر نہ گئے جیسا کہ ایک خط بنام حکیم غلام نجف خاں میں لکھتے ہیں "بھائی میرا دکھ سنو۔ پٹیالے جانے میں ایک سبکی اور ذلت تھی۔"

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا — جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گُسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے؟ — غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بُری بلا ہے — مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رُسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا — نہ کبھی جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا
اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا — جو دوئی کی بُو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا
یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالبؔ (۶) — تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ہَوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا؟
تجاہل پیشگی سے مدّعا کیا؟ — کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا؟
نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں — شکایت ہائے رنگیں کا گِلا کیا؟
نگاہِ بے مُحابا چاہتا ہوں — تغافل ہائے تمکیں آزما کیا؟
فروغِ شعلۂ خس یک نَفَس ہے — ہَوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا؟
نَفَس موجِ محیطِ بیخودی ہے — تغافل ہائے ساقی کا گِلا کیا؟
دماغِ عطر پیراہن نہیں ہے — غمِ آوارگی ہائے صبا کیا؟
دلِ ہر قطرہ ہے سازِ اَنَاالبحر — ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا؟
مُحابا کیا ہے میں ضامن اِدھر دیکھ — شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا؟
سُن اے غارت گرِ جنسِ وفا سُن — شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا؟
کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ؟ — شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا؟
یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں؟ — یہ کافر فتنۂ طاقت رُبا کیا؟
بلائے جاں ہے غالبؔ اُس کی ہر بات — عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا؟

(۶) ظفر بادشاہ نے مقطع سُنا تو کہا کہ ہم تو اسوقت بھی نہ سمجھتے، مرزا نے کہا حضور تو اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں یہ اسلیے ارشاد ہوا کہ میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں

۳۶

درِ خورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا!

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا
رُوبرو کوئی بُتِ آئینہ سیما نہ ہوا

کم نہیں نازشِ ہم نامیِ چشمِ خوباں
تیرا بیمار بُرا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا!

سینہ کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

نام کا میرے ہے جو دُکھ کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا

ہر بُنِ مُو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خوں ناب (۱)
حمزہؓ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کُل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

تھی خبر گرم کہ غالب کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہی داستان حمزہ قصہ موضوعی ہی شاہ عباس ثانی کی عہد مین ایران کی صاحب طبعون نی اسکو تالیف کیا ہی ہندستانین امیر حمزہ کی داستان اسکو کہتی ہین اور ایرانین رموز حمزہ اسکا نام ہی دو سو کئی برس اسکی تالیف کو ہوئی اب تک مشہور ہی اور ہمیشہ مشہور رہیگا آپکی اس تکیہ دار روزینہ خوار فقیر نی آپ کی مدح مین ایک قصیدہ لکھا ہی مشتمل اس التزام پر کہ تشبیب کی ابیات اور مدح کی اشعار مین حمزہ و اولاد حمزہ و زمرد شاہ وغیرہ یا انکی معاملات و حالات کا ذکر درمیان آئی سو وہ قصیدہ آج اس خط کی ساتھ ارسال کرتا ہون امید ہے کہ حضرت اسکو مرقوم کر محفوظ رکہین خدا آپکو قیامت تک سلامت رکہی گا جب تک امیر حمزہ کا قصہ مشہور رہیگا یہ قصیدہ بھی شہرت پذیر رہیگا سے تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کی ہون دن پچاس ہزار

نجات کا طالب غالب ۱۱ ماہ اگست سنہ ۱۸۶۵ء

(۱) مرزا صاحب نے داستان امیر حمزہ کے متعلق جو خط نواب کلب علیخاں کو مع قصیدہ بھیجا تھا اس خط کا فوٹو ملاحظہ فرمائیں

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سروپا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا ٣٧

پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا
بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

نہ ہو حسنِ تماشا دوست رسوا بیوفائی کا
بہ مُہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

زکات حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا
چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا

نہ مارا جان کر بے جرم غافل تیری گردن پر
رہا مانندِ خونِ بے گنہ حق آشنائی کا

تمنائے زباں محوِ سپاسِ بے زبانی ہے
مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بے دست و پائی کا

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

دہانِ ہر بتِ پیغارہ جو زنجیرِ رسوائی
عدم تک بیوفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا

نہ دے نامہ کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھ دے
کہ "حسرت سنج ہوں عرضِ ستم ہائے جدائی کا"

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا
بے تکلف داغِ مہ مُہرِ دہاں ہو جائے گا

زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب
پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائے گا

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا
یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائے گا

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط
شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا

باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا

فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسدؔ!
دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے گا

دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا (۱)　مَیں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو؟　اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں؟　تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب　گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی　آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟ (۹)　بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی　حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گر دب گیا لہو نہ تھما　کام گر رُک گیا روا نہ ہوا
رہزنی ہے کہ دلستانی ہے؟　لے کے دل دلستاں روانہ ہوا
کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں (۱۰)　آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

(۱) اس غزل کے متعلق مرزا غالب نے مرزا حاتم علی مہر کو لکھا ہے۔
"میرا کلام میرے پاس کبھی کچھ نہیں رہا۔ ضیاء الدین خاں اور حسین مرزا جمع کر لیتے تھے جو میں نے کہا وہ انہوں نے لکھ لیا ان دونوں کے گھر لٹ گئے۔ ہزاروں روپے کے کتاب خانے برباد ہوے۔ اب میں اپنے کلام کے دیکھنے کو ترستا ہوں۔ کئی دن ہوے ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی ہے ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا۔ اُس نے وہ کاغذ جو مجھ کو دکھایا یقین سمجھنا کہ مجھ کو رونا آیا غزل تم کو بھیجتا ہوں اور صلہ میں اس کے اس خط کا جواب چاہتا ہوں"۔ اور خط کے ساتھ مندرجہ بالا غزل بھیجی گئی "دردِ منت کش دوا نہ ہوا" . . . . .
(۹) نمرود ایک بادشاہ تھا جس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا اور جو اُسے خدا نہیں مانتا تھا اُس پر بڑا ظلم کرتا تھا۔
اس خدائے تعالیٰ کی اطاعت اور بندگی نمرود کا عہدِ حکومت تو نہ تھی جس میں مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ اس خدائی میں تو میری آرزوئیں اور تمنائیں پوری ہونی چاہیے تھیں۔ بندگی سے مراد عبادت نہیں بلکہ بندہ ہونا ہے۔
(۱۰) یہ غزل قلعہ معلّی کے مشاعرہ میں مرزا صاحب نے پڑھی تھی چونکہ طرحی غزل نہیں کہی تھی۔ اس لیے لوگوں کے اصرار پر یہ غزل سنائی جس کا اظہار مقطع میں کیا گیا . . . . مع کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں الخ

گِلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا — گہر میں محو ہُوا اضطراب دریا کا
یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب — مگر ستمزدہ ہوں، ذوقِ خامہ فرسا کا
حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی — دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیش دُنیا کا
غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو — مجھے دِماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا
ہنوز محرمیِ حُسن کو ترستا ہوں — کرے ہے ہر بُنِ مُو کام چشمِ بینا کا
دل اُسکو، پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے — ہمیں دماغ کہاں حُسن کے تقاضا کا؟
نہ کہہ کہ گریہ بمقدارِ حسرتِ دل ہے — مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا
فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اُسکو یاد اسدؔ — جفا میں اُس کی ہے اندازِ کار فرما کا

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نَفَس پرور ہوا — خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا (۹)
اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا — غیر نے کی آہ! لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

(۹) خط بنام عبدالجمیل جنوں میں غزل گم ہو جانے کی بات خوب پیدا کی ہے اور شعر مذکورہ کی تشریح بھی ملاحظہ فرمایئے

جناب عالی وہ غزل جو ہمارا رلا با تھا وہاں نہیں پہنچا اب میں جانے والا ہوں یعنی عدم مدعا یہ کہ
گم ہو گئی سے گاہات میں مدعا برآئے ہمنے نمبروں کی ٹانگ رکھے تقدیم و تاخیر مدعا غلط
کرکے رہنی دو اسمیں کوئی سقم نہیں مدعا برآری کا یہ تونکا لفظ ہے میں اسطرح کی الفاظ
سے احتراز کرتا ہوں مگر چونکہ وہ حیثیت معنے یہ لفظ صحیح ہے مضایقہ نہیں ہے
قطرۂ مے اس مطلع میں خیال ہی دقیق ہے کوہ کندن و کاہ برآوردن یعنی لطف زیادہ
نہیں قطرہ ٹپکنیں تیا بے اختیار ہے بقدر یکمژہ برہمزدن ثبات و قرار ہے حیرت از لہ
حرکت کرتے ہی قطرۂ مے افراط حیرت سے ٹپکنا بھول گیا برابر برابر بوندیں جو تھم گرہ
گئیں تو پیالی کا خط بصورت او سی تاگے کے بن گیا جسمیں موتی پروئے ہوئے ہوں ۔

جب بہ تقریبِ سفر یار نے محمل باندھا — تپشِ شوق نے ہر ذرّہ پہ اک دل باندھا
اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیِ ناز — جوہرِ آئینہ کو طوطیِ بسمل باندھا
یاس و امید نے یک عربدہ میداں مانگا — عجزِ ہمّت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا
نہ بندھے تشنگیِ شوق کے مضموں غالبؔ! — گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

میں، اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں — گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا؟
ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں — وہ دن گئے، کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا
درماندگی میں غالبؔ! کچھ بن پڑے تو جانوں — جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا — بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا
تنگیِ دل کا گِلہ کیا یہ وہ کافر دل ہے — کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا
بعدِ یک عمرِ ورع بار تو دیتا، بارے (۱۰) — کاش رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا (۱۱) — ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا؟
ہوا جب غم سے یوں بےحس تو غم کیا سر کے کٹنے کا؟ — نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا
ہوئی مدت کہ غالبؔ مر گیا پر یاد آتا ہے — وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

(۱۰) رضواں، جنت کے داروغہ کا نام ہے۔ ورع، تقویٰ، پرہیزگاری۔ بار دینا، داخلہ کی اجازت دینا۔ ایک عمر کی پرہیزگاری کے بعد رضوان تو جنت میں داخلہ کی اجازت دیدیتا ہے۔ کاش وہی تیرے گھر کا درباں ہوتا تو میرے شوق اور محبت کو دیکھ کر یہاں بھی داخلہ کی اجازت دیدیتا لیکن تیرا درباں بڑا سخت ہے اور کسی صورت سے بھی داخلہ کی اجازت نہیں دیتا۔

(۱۱) جب تخلیق عالم نہیں ہوئی تھی تب بھی خدا موجود تھا۔ اور اگر کائنات پیدا نہ ہوتی تب بھی خدا ضرور ہر جگہ موجود ہوتا۔ اگر میں پیدا نہ کیا جاتا تو میرا وجود بھی خدا کے وجود میں مدغم ہوتا یعنی میری ہستی ہی میری بربادی کا باعث ہوئی بدنیستی ہی اچھی تھی۔

۴۱

یک ذرّۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا — یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالہ کے داغ کا
بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی؟ — کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا
بُلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گُل — کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا
تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے (۱) — تریاکیِ قدیم ہوں دُودِ چراغ کا
سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے — پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا
بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار — یہ میکدہ خراب ہے مے کے سُراغ کا
باغِ شگفتہ تیرا۔ بساطِ نشاطِ دل — ابرِ بہار خُم کدہ کس کے دماغ کا!

وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا — رازِ مکتوب بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا
یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز (۲) — چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا
شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پوچھ — اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

(۱) جس طرح چنڈو پینے والے چراغ کی لَو سے افیون جلا کر اس کے دھوئیں کا کش لیتے ہیں۔ اسی طرح میں بھی شاعری کے نشے کا پُرانا عادی ہوں اور اس نشہ کو ترک نہیں کر سکتا۔ شعرا بھی رات کو بیٹھ کر فکرِ سخن کیا کرتے ہیں۔ دُود سے فکرِ سخن اور چراغ سے خوش کلامی مقصود ہے اور میں فکرِ سخن کا زمانۂ قدیم سے خوگر ہوں۔

(۲) اس شعر کی شرح خود مرزا صاحب نے ماسٹر پیارے لال آشوب کے خط میں اس طرح کی ہے: "پہلے سمجھنا چاہیے کہ آئینہ عبارت فولاد کے آئینے سے ہے ورنہ حلبی آئینوں میں جوہر کہاں اور ان کو صیقل کون کرتا ہے۔ فولاد کی جس چیز کو صیقل کرو گے بے شبہ پہلے ایک لکیر پڑے گی اس کو الف صیقل کہتے ہیں جب یہ مقدمہ معلوم ہوا تو اب اس مفہوم کو سمجھیے مصرع "چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا" یعنی ابتدائی سنِ تمیز سے مشقِ جنوں ہے۔ ابتک کمالِ فن حاصل نہیں ہوا، آئینہ تمام صاف نہیں ہوگیا۔ بس ایک لکیر صیقل کی جو ہے سو ہے چاک کی صورت الف کی سی ہوتی ہے اور چاکِ جیب آثارِ جنوں میں سے ہے"

۴۲

بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرمِ خرام — رُخ پہ ہر قطرہ عرق دیدۂ حیراں سمجھا
عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا — نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا
سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی — ہر قدم سایہ کو میں اپنے شبستاں سمجھا
تھا گریزاں مژۂ یار سے دل تا دمِ مرگ — دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا
دل دیا جان کے کیوں اُسکو وفادار اسدؔ — غلطی کی کہ جو کافر کو مُسلماں سمجھا

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا — دل جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز — پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
سادگی ہائے تمنا یعنی — پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا
عُذرِ واماندگی اے حسرتِ دل — نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی — کیوں ترا راہ گزر یاد آیا؟
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی — گھر ترا خُلد میں گر یاد آیا
آہ. وہ جرأتِ فریاد کہاں — دل سے تنگ آکے جگر یاد آیا
پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال — دلِ گُم گشتہ مگر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے (۱۰) — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ (۱۱) — سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

(۱۰) اسی مضمون کا ایک شعر مومنؔ نے بھی کہا ہے ؎ جائیں دشت میں سوئے صحرا کیوں؟ — کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی
اسی طرح ایک شعر قابلِ مطالعہ ہے ؎ یاد آیا مجھے گھر دیکھ کے دشت — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

(۱۱) مجنوں. دیوانہ. جب کوئی عاشق دیوانہ وار کسی راہ سے گذرتا ہے تو لڑکے اس کے پتھر مارتے ہیں۔ اسی طرح میں نے بھی بچپن میں مجنوں کو مارنے کے لیے پتھر اٹھایا کہ دفعتہً مجھے اپنا سر یاد آگیا۔ یعنی یہ خیال ہوا کہ ممکن ہے کبھی میں بھی دیوانہ ہو جاؤں اور لڑکے مجھ پر بھی پتھر ماریں۔

ہوئی تاخیر، تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا — آپ آتے تھے، مگر کوئی عناں گیر بھی تھا
تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ — اُس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا
تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں — کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا؛
قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد — ہاں کچھ اک رنجِ گرانباریِ زنجیر بھی تھا
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا؟ — بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا
یوسف اُسکو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی (۶) گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا
دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا؟ — نالہ کرتا تھا۔ ولے طالبِ تاثیر بھی تھا
پیشہ میں عیب نہیں۔ رکھیے نہ فرہاد کو نام — ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا!
ہم تھے مرنے کو کھڑے، پاس نہ آیا نہ سہی — آخر اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا؛
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق — آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا؟
ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب — کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

لبِ خشک در تشنگی مُردگاں کا (۱) زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا
ہمہ ناامیدی ہمہ بدگمانی — میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

(۶) حضرت یوسفؑ کی کہانی عام ہے کہ وہ ایک مرتبہ غلاموں کی طرح بازار میں فروخت ہوئے تھے۔ لائقِ تعزیر۔ سزا کے قابل۔ میں نے اپنے محبوب کو انتہائی حسین ہونے کی وجہ سے یوسف کہہ دیا گویا ایک غلام سے تشبیہ دیدی، وہ تو خیریت ہوئی کہ اس نے کچھ نہیں کہا۔ اگر وہ ناراض ہو جاتا تو میں واقعی سزا کے قابل تھا۔ یوسف کو زلیخا نے بازار میں ایک غلام کے طور پر خریدا تھا۔

(۱) لبِ خشک۔ پیاسا، آرزو مند۔ در تشنگی مردگاں۔ پیاس سے مرے ہوئے لوگ۔ جو لوگ کسی خواہش کی حسرت میں ناکام ہو گئے ہیں میں ان لوگوں کا لبِ خشک ہوں یعنی ان کی آئینہ داری کر رہا ہوں اس لیے محروم قسمت لوگوں کی زیارت گاہ بن گیا ہوں۔

۴۴

تُو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہُوا تھا | اَوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہُوا تھا
چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے (۴) | خورشید ہنوز اُس کے برابر نہ ہُوا تھا
توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے | آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہُوا تھا
جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم | میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہُوا تھا
مَیں سادہ دل آزردگیِ یار سے خوش ہوں (۵) | یعنی سبقِ شوق مکرر نہ ہُوا تھا
دریائے معاصی تنک آبی سے ہُوا خشک (۶) | میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہُوا تھا
جاری تھی اسدؔ داغِ جگر سے مری تحصیل | آتشکدہ جاگیرِ سمندر نہ ہُوا تھا

شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا | رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا
مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا | کس قدر یارب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا
حاصلِ اُلفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو | دل بہ دل پیوستہ گویا یک لبِ افسوس تھا
کیا کہوں بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں! | جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا

(۴) ماہِ نخشب: وہ مصنوعی چاند جس کو حکیم ابن عطا مشہور بہ ابن مقنع نے ادویاتِ مرکب سے تیار کیا تھا۔ وہ چاند چاہِ نخشب سے نکلتا تھا۔ اس کی روشنی زیادہ دُور تک نہ جاتی تھی وہ اصل چاند کے برابر روشن نہ تھا۔ آخر کار کچھ عرصہ بعد شق ہوگیا۔۔
کارکنانِ قضا و قدر نے آفتاب بنانا شروع کیا ابھی اس کی روشنی تیرے حسن و جمال کے برابر نہ ہوئی تھی کہ اس کا حال بھی ماہِ نخشب کی طرح ہوا۔

(۵) مرزا صاحب ایک خط میں خواجہ غلام غوث بیخبر کو تحریر فرماتے ہیں: پیر و مرشد خفا نہیں ہوا کرتے۔ یوں سنا مجھے باور نہ آیا یہاں تک تو میں موردِ عتاب نہیں ہو سکتا اسی خط کے آغاز میں یہ شعر تحریر فرمایا ہے ؎ مَیں سادہ دل ....

(۶) دریائے معاصی گناہوں کا دریا۔ تنک آبی۔ پانی کی کمی۔ کم مائیگی
میرے گناہ کرنے کا حوصلہ اتنا بڑھا ہوا ہے کہ اگرچہ گناہوں کے دریا کا پانی کم مائگی کی وجہ سے خشک ہو گیا ہے مگر ابھی تک میرے دامن کا سرا تک تر نہیں ہوا یعنی میں نے اتنے زیادہ گناہ کیے کہ اب ارتکاب کیلیے کوئی گناہ باقی نہیں رہا پھر بھی میری خواہشِ گناہ پوری نہیں ہوئی۔
ذوق نے بھی اس شعر کی بہت تعریف کی ہے اور کہا ہے کہ غالب کو اپنے اچھے اشعار کی بھی خبر نہیں اور یہ شعر پڑھ کر سر دُھنتے تھے۔ (آبِ حیات)

آئینہ دیکھ اپنا سا مُنہ لے کے رہ گئے   صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غُرور تھا
قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے   اُس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا (۱)   جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا
جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے   ہوں شمعِ کُشتہ درخورِ محفل نہیں رہا
مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ مَیں   شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا
بر رُوئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے   یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا
وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حُسن   غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا
گو مَیں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار   لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں   حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا
بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ   جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

رشک کہتا ہے کہ "اُس کا غیر سے اخلاص حیف!"   عقل کہتی ہے کہ "وہ بے مہر کس کا آشنا؟"
ذرّہ ذرّہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے   گردشِ مجنوں بہ چشمک ہائے لیلیٰ آشنا

(۱) مرزا صاحب منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں: "افسوس ہے کہ تم کو میرے حال کی خبر نہیں، اگر دیکھو تو جانو ع

جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

کوئی دم ایسا نہیں کہ مجھ کو دمِ واپسیں کا خیال نہ ہو، ساٹھ برس کا ہو چکا اب کہاں تک جیوں گا۔ غزل، قطعہ، رباعی۔ فارسی لگ بھگ دس ہزار بیت کہہ چکا! اب کہا خاک کہوں گا زندگی مجری بھلی جس طرح بنی کاٹی، اب فکر یہ ہے کہ دیکھیے موت کیسی ہوتی ہے اور بعد موت کیا در پیش آتا ہے اور پھر لکھتے ہیں ۔   عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ   مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز — ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا
میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے — عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا
شکوہ سنجِ رشکِ ہمدیگر نہ رہنا چاہیے — میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا
کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ (۶) — سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا — بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا
مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یارب؟ — آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحاں اپنا
منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے — عرش سے اِدھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا
دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے — بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا
دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلادوں — انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا
گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا — ننگِ سجدہ سے میرے سنگِ آستاں اپنا
تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو — دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا
ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے؟ (۸) — بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

سُرمۂ مُفتِ نظر ہوں مری قیمت یہ ہے (۱۰) — کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا
رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم — تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

(۶) کوہکن: پہاڑ کھودنے والا، مراد فرہاد۔ اے اسدؔ فرہاد کو شیریں کی تصویر نقش کرنے ہی میں کمال حاصل تھا لیکن پتھروں پر تصویر بنانے سے معشوق نہیں ملا کرتا۔ اس کے لیے جذبِ صادق اور عشقِ کامل کی ضرورت ہے۔

(۸) کہا جاتا ہے کہ [illegible] بیں آسمان سے ہی نازل ہوتی ہیں لیکن آسمان تو دانا اور ہنرمند کا دشمن ہوتا ہے ہم کہاں کے دانا اور ہنرمند ہیں وہ بے سبب ہمارا دشمن بن گیا ہے۔ اپنی ہنرمندی کا اظہار کس عمدہ پیرایہ میں کیا ہے۔

(۱۰) مرزا صاحب فرماتے ہیں: "میرے کلام کا فیض مفت اور عام ہے جو فائدہ اٹھانا چاہے اٹھا سکتا ہے۔ اس کی قیمت یہ ہے کہ بصیرت حاصل کرنے والے اس فیض رسانی کی قدر کریں اور میرے کلام کی عظمت کے قائل ہوں" بجا فرمایا ہے

۴۷

غافل بہ وہمِ ناز خود آرا ہے ورنہ یاں — بے شانۂ صبا نہیں طُرّہ گیاہ کا
بزمِ قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ کہ رنگ — صیدِ زِ دام جستہ ہے اِس دام گاہ کا
رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے — شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا
مَقتل میں کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے — پُرگُل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا
جاں درہوائے یک نگہِ گرم ہے اسدؔ — پروانہ ہے وکیل ترے داد خواہ کا!

(۱) جَور سے باز آئے پر باز آئیں کیا؟ — کہتے ہیں" ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا!"
(۲) رات دن گردش میں ہیں سات آسماں — ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا؟
لاگ ہو تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ — جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا؟
ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ؟ — یارب! اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا؟
موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے — آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا؟
(۶) عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ — مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا!
پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے؟ — کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا!

(۱ و ۲) مرزا صاحب ایک خط میں حاتم علی مہر کو یوں تحریر فرماتے ہیں "میں نے کتابیں جابجا بھیجیں، بیبیں پارسل ارسال کی۔ اگرچہ پہنچنے کی خبر پائی ہے مگر نوید کہیں سے نہیں آئی — رات دن گردش میں ہیں . . . الخ
دیکھنا بھائی اس غزل کا مطلع کیا ہے۔ جَور سے باز آئے پر باز آئیں کیا :: کہتے ہیں" ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا!"
اس کے علاوہ ایک خط بنام مرزا رحیم بیگ مصنف "ساطع برہان" لکھا ہے جس سے مرزا صاحب کی دماغی صلاحیت علمیت اور تحقیق کا پورا اظہار ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں "کہہ چکا ہوں کہ نہ مجھ کو مناظرے کا دماغ، نہ ہجوم امراضِ جسمانی و آلامِ روحانی سے فراغ۔ آگے جو ہمت نہیں ہاری تھی اور غیب سے توقع مددگاری تھی اور اپنا یہ شعار دو میرے ورد زبان اور اس ہنجار سے میں زمزمہ سنج فغاں رہتا تھا۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں — ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

(۶) نواب انوار الدولہ سید الدین خاں شفق کو لکھتے ہیں "اللہ اللہ دریا سارا تیر چکا ہوں ساحل نزدیک ہے دو ہاتھ لگائے اور بیڑا پار ہے۔ عمر بھر دیکھا... الخ
پھر مرزا صاحب نے حقیر کو ایسا ہی لکھا "زندگی میری بھلی جس طرح بنی کاٹی۔ اب فکر یہ ہے کہ دیکھیں موت کیسے ہوتی ہے اور بعد موت کے کیا درپیش آتا ہے

عمر بھر دیکھا کیا مرنے کی راہ — مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

۴۸ لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی   چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا
حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداری ساحل   جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا   درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد   تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا
دل ہوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام   مٹ گیا گھسنے میں اس عقدہ کا وا ہو جانا
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ   اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا
ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا   باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا
دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال   ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا
ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا   روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا
گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس   کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا
تاکہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل   دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا
بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب   چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

ب

پھر ہُوا وقت کہ ہو بال کُشا موجِ شراب   دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب (۱)
پُوچھ مت، وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن   سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب
جو ہُوا، غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہے   سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب
ہے یہ برسات وہ موسم، کہ عجب کیا ہے، اگر   موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب
چار موج اٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سُو   موجِ گُل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب

(۱) ایران میں قاعدہ ہے کہ جب انگور پک جاتے ہیں تو سنگِ مرمر کے حوضوں میں بھر دیے جاتے ہیں۔ آفتاب کی تیزی سے دو چار دن بعد ان کا عرق نکلنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس وقت نوعمر لڑکے ان حوضوں میں اتر کر انگوروں کو پاؤں سے روندتے ہیں۔ اس کے بعد مٹی کی منہ بند صراحیاں حوضوں میں ڈال دی جاتی ہیں۔ انہی صراحیوں کو بطِ مے کہتے ہیں۔

۴۹

جس قدر روحِ نباتی ہے جگر تشنۂ ناز — دے ہے تسکیں بدمِ آبِ بقا موجِ شراب
بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر — شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب
موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال — ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب
نشّہ کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ — بسکہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب
ایک عالم پہ ہیں طوفانیِ کیفیتِ فصل — موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب
شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے، زہے موسمِ گل! — رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے، خوشا موجِ شراب
ہوش اُڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ، اسدؔ — پھر ہُوا وقت، کہ ہو بال کشا موجِ شراب

ت

افسوس کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے — جن لوگوں کی تھی، درخورِ عقدِ گہر، انگشت
کافی ہے نشانی تری، چھلّے کا نہ دینا — خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر، انگشت
لکھتا ہوں، اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم — تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت — (۱) پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت
جگر کو مرے عشقِ خونابہ مشرب — لکھے ہے "خداوندِ نعمت سلامت"
علی الرغمِ دشمن، شہیدِ وفا ہوں — مبارک مبارک، سلامت سلامت
نہیں گر سر و برگِ ادراکِ معنے! — تماشائے نیرنگِ صورت سلامت

(۱) بظاہر تو اس شعر کے معنی یہی ہیں کہ چاہے کسی کی زندگی روزِ قیامت تک کیوں نہ ہو لیکن ایک نہ ایک دن اُسے مرنا ہی پڑے گا لیکن لفظ "حضرت" سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ اشارہ "حضرت" حضرتِ خضر کی طرف کیا گیا ہے۔ کیونکہ جنابِ خضرؑ کے سلسلہ میں مرزا صاحب نے اکثر شوخیانہ اندازِ بیان اختیار کیا ہے۔ مثلاً ؎

بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضرؑ — حضرت بھی کل کہیں گے کہ "ہم کیا کیا کیے"
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں رُوشناسِ خلق اے خضر — نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

اور پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرتِ خضر اگرچہ قیامت تک سلامت رہیں گے مگر ان کو بھی قیامت کے دن مرنا ہی پڑے گا۔

۵۰

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ (۱) یار لائے مری بالیں پہ اُسے پر کس وقت؟

آمدِ خط سے ہُوا ہے سرد جو بازارِ دوست دودِ شمعِ کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست
اے دلِ ناعاقبت اندیش! ضبطِ شوق کر (۲) کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست؟
خانہ ویراں سازیِ حیرت تماشا کیجیے صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست
عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمارِ دوست
چشمِ ما روشن! کہ اُس بے درد کا دل شاد ہے دیدۂ پُرخوں ہمارا، ساغرِ سرشارِ دوست
غیر یوں کرتا ہے میری پرسش اُسکے ہجر میں بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوارِ دوست
تاکہ میں جانوں کہ ہے اُسکی رسائی واں تلک ق مجھ کو دیتا ہے پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست
جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست
چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیِ گفتارِ دوست
مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجیے یا بیاں کیجے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست؟
یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ ہے ردیفِ شعر میں غالبؔ! زبس تکرارِ دوست

(۱) عالمِ نزع میں میرے احباب محبوب کو اُس وقت میرے پاس لائے جب میں اس کے انتظار میں بار بار آنکھیں کھولنے کی کوشش کر رہا تھا گویا انتظار میں میری آنکھیں ہمیشہ کیلیے بند ہو گئیں اور میں اُسے دیکھ بھی نہ سکا۔ حسرت کی انتہا ہے۔ اس مضمون کا ایک شعر حضرت غالب نے اور بھی کہا ہے
مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

(۲) اس شعر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اُس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جب وہ جلوۂ دیدارِ خدا کی تاب نہ لاسکے تھے اور بیہوش ہو گئے تھے واقعہ اس طرح ہے کہ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہِ طور پر خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں درخواست کی کہ ربِّ اَرِنِیْ (اے خدا مجھے اپنا جلوہ دکھا دے) خدا کی طرف سے جواب ملا لَنْ تَرَانِیْ (اے موسیٰ تم نہیں دیکھ سکتے)
مرزا صاحب فرماتے ہیں اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق سے کام لے۔ جلوۂ دیدارِ دوست کی کون تاب لا سکتا ہے۔

ج

گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج — قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج
آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ — تارِ نفس، کمندِ شکارِ اثر ہے آج
(۳) اے عافیت! کنارہ کر، اے انتظام چل — سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج
(۱) لو ہم مریضِ عشق کے بیمار دار ہیں — اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج؟

چ

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ — اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ
کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ — برنگِ خار مرے آئینہ سے جوہر کھینچ
تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار اے دل! — کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ
تری طرف ہے، بہ حسرت، نظارۂ نرگس — بکوریِ دل و چشمِ رقیب، ساغر کھینچ
بہ نیم غمزہ ادا کر، حقِ ودیعتِ ناز — نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ
(۶) مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں — بروئے سفرہ کبابِ دلِ سمندر کھینچ

(۳) سیلابِ گریہ سے دیوار و در گر جائیں گے۔ لہٰذا آسایش و اطمینان رخصت ہُوا۔

(۱) مسیحا کو شکایت ہے کہ بیمارِ محبت کی تیمارداری صحیح طور پر نہیں ہو رہی ہے۔ تو ہم بیمارِ عشق کے تیماردار بنے جاتے ہیں۔ اگر بیمارِ محبت اچھا نہ ہوا تو پھر چارہ گر کا کیا علاج کیا جائے گا یعنی کیا سزا لے گی۔ مقصودِ کلام یہ ہے کہ عشق کے آگے مسیحا بھی عاجز ہے۔ وہ اپنا قصور بیماردار پر ڈال رہا ہے کیونکہ مریضِ عشق لاعلاج ہے۔ حضرت عیسیٰ کا یہ معجزہ تھا کہ وہ جنبشِ لب سے مُردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے۔

(۶) قدح۔ پیالہ۔ صہبا۔ شراب۔ سفرہ۔ دسترخوان۔ میرے ساغر میں سُرخ شراب ہے۔ وہ باطن میں محبت کی آگ ہے۔ جو سُرخ سیال کی صورت میں چھلک رہی ہے۔ اس لیے میرے دسترخوان پر دلِ سمندر کے کباب ہونے چاہئیں۔ سمندر ایک کیڑا ہوتا ہے جو آگ میں پیدا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب میں پانی کی صورت میں آگ پی رہا ہوں تو کھانے کے لیے بھی آگ ہی کے کباب ہونے چاہئیں۔

د

حُسن غمزے کی کشاکش سے چُھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد

شمع بُجھتی ہے تو اُس میں سے دُھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہُوا میرے بعد

خُوں ہے دل خاک میں، احوالِ بتاں پر یعنی
ان کے ناخُن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

درخورِ عرض نہیں، جوہرِ بیداد کو، جا
نگہِ ناز ہے سرمہ سے خفا میرے بعد

ہے جنوں، اہلِ جنوں کے لیے آغوشِ وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جُدا میرے بعد

کون ہوتا ہے حریفِ مےِ مردافگنِ عشق؟ ،
ہے مُکرّر لبِ ساقی میں صَلا میرے بعد

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

آئے ہے بےکسیِ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد؟

(۱) مے مردافگنِ عشق ۔ مرد کو پچھاڑ دینے والی عشق کی شراب۔

میرے مرنے کے بعد ساقی پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اب کوئی ہے جو مے مردافگنِ عشق کا حریف ہو، یعنی عشق کی شراب کا جام پیے۔ لیکن جب کوئی آواز نہیں آتی تو پھر چپکے سے مایوس ہو کر کہتا ہے کہ حریف مے مردافگنِ عشق کون ہو سکتا ہے، یعنی کوئی بھی نہیں ہو سکتا۔
اس شعر میں نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ پہلا مصرعہ بھی ساقی کی صَلا کے الفاظ ہیں۔ اس مصرعہ کو مکرر پڑھ رہا ہے۔ ایک دفعہ بلانے کے لہجہ میں پڑھتا ہے "کون ہوتا ہے حریف مے مردافگنِ عشق" یعنی کوئی ہے جو مے مردافگنِ عشق کا حریف ہو، پھر جب اس آواز پر کوئی نہیں آتا تو اسی مصرعہ کو مایوسی کے لہجہ میں مکرر پڑھتا ہے "کون ہوتا ہے حریف . . . " یعنی کوئی نہیں ہوتا۔ اس میں لہجہ اور طرزِ ادا کو بہت دخل ہے کسی کو بلانے کا لہجہ اور ہے اور مایوسی سے چپکے چپکے کہنے کا انداز اور۔ اسی طرح مصرعہ مذکور کی تکرار کرنے سے یہ معنی فوراً ذہن نشین ہو جائیں گے۔

بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار
نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر، در و دیوار

وفورِ اشک نے کاشانہ کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و در، در و دیوار

نہیں ہے سایہ، کہ سُن کر نویدِ مَقدمِ یار
گئے ہیں چند قدم پیشتر، در و دیوار

ہوئی ہے کس قدر ارزانیِ مےِ جلوہ
کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار

جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار، تو آ
کہ ہیں دُکانِ متاعِ نظر، در و دیوار

ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے؟
کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار

وہ آ رہا مرے ہمسایہ میں، تو سایے سے
ہوئے فِدا در و دیوار پر در و دیوار

نظر میں کھٹکے ہے، بِن تیرے، گھر کی آبادی
ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار

نہ پوچھ بےخودیِ عیشِ مَقدمِ سیلاب
کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

نہ کہہ کسی سے کہ غالبؔ نہیں زمانے میں
حریفِ رازِ محبت، مگر در و دیوار

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
جانے گا اب بھی تُو نہ مرا گھر کہے بغیر؟

کہتے ہیں، جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن
"جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر؟"

کام اُس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام، ستمگر کہے بغیر

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے، وگرنہ ہم
سر جائے یا رہے، نہ رہیں پر کہے بغیر

چھوڑوں گا میں نہ اُس بُتِ کافر کا پُوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بہرا ہوں مَیں، تو چاہیے دُونا ہو التفات
سُنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

غالبؔ نہ کر حضور میں تُو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر

۵۴

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر؟ جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے (۲) سرگرمِ نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا؟ رُکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے مرتا ہوں اُس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ ہم کو حریصِ لذّتِ آزار دیکھ کر

بِک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ (۷) لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

زُنّار باندھ سُبحۂ صد دانہ توڑ ڈال رَہرَو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

اِن آبلوں سے پانو کے گھبرا گیا تھا میں جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

(۲) آتش پرست ـ پارسی لوگ آگ کو مظہرِ خدا سمجھ کر اُس کی پرستش کرتے ہیں۔ اُن کی عبادت گاہوں میں ہر وقت آگ روشن رہتی ہے ۔
فرماتے ہیں: محبوب کی جدائی میں جو میں آہ و بُکا کرتا ہوں اور میرے منہ سے آگ برسانے والے نالے نکلتے ہیں تو ان کو دیکھ کر لوگ مجھے آتش پرست کہنے لگے ہیں ۔

(۷) متاعِ سخن ـ کلام کی دولت ـ ہم اپنے متاعِ سخن کے خریدار کے ہاتھ بِک جاتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ وہ سخن فہم اور سخن شناس ہو۔
اس سلسلہ میں منشی ہرگوپال تفتہ کو ایک فارسی خط میں منشی نبی بخش حقیر کی سخن فہمی کے متعلق لکھتے ہیں یہ خط کتنا حسرت آمیز ہے
"خدا نے میری بیکسی اور تنہائی پر رحم کیا اور ایک شخص کو میرے پاس بھیجا جو میرے زخموں کا مرہم اور میرے درد کا درماں اپنے ساتھ لایا جس نے میری اندھیری راتوں کو روشن کر دیا۔ اس نے اپنی باتوں سے ایسی شمع روشن کی جس کی روشنی میں مَیں نے اپنے کلام کی خوبی جو تیرہ بختی کے اندھیرے میں خود میری نگاہ سے مخفی تھی دیکھی ۔ میں حیران ہوں کہ اس فرزانۂ یگانہ منشی نبی بخش کو کس درجہ کی سخن فہمی اور سخن سنجی عنایت ہوئی ہے حالانکہ شعر میں کہتا ہوں اور شعر کہنا جانتا ہوں مگر جب تک میں نے اس بزرگوار کو نہیں دیکھا یہ نہیں سمجھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے اور سخن فہمی کس کو کہتے ہیں؟
"مشہور ہے کہ خدا نے حسن کے دو حصے کیے آدھا یوسف کو دیا اور آدھا تمام بنی نوعِ انسان کو۔ کچھ تعجب نہیں کہ فہمِ سخن اور ذوقِ معنے کے بھی دو حصے کیے گئے ہوں اور آدھا منشی نبی بخش کے اور آدھا تمام دنیا کے حصے میں آیا ہو۔ گو زمانہ اور آسمان میرا کیسا ہی مخالف ہو مگر میں اس شخص کی بدولت زمانے کی دشمنی سے بے فکر ہوں اور اس نعمت دنیا پر قانع ۔" (از یادگارِ غالب)

55

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے — طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر
گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی، نہ طور پر (۱) — دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر
سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا — یاد آگیا مجھے، تری دیوار دیکھ کر

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر — میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر
نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی (۲) — سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر
فنا تعلیمِ درسِ بیخودی ہوں اُس زمانے سے — کہ مجنوں "لام الف" لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر
فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے؟ — بہم گر صُلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر
نہیں اقلیمِ اُلفت میں کوئی طُومارِ ناز ایسا — کہ پُشتِ چشم سے جس کے نہ ہووے مُہر عنواں پر
مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ، یاد آیا — کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر
بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا — قیامت اِک ہوائے تُند ہے خاکِ شہیداں پر
نہ لڑ ناصح سے غالب! کیا ہوا گر اُس نے شدّت کی؟ — ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

(۱) برقِ تجلّی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر اللہ تعالیٰ نے اپنا جلوہ دکھایا بس ایک بجلی کی مانند روشنی آنکھوں کے سامنے آگئی حضرت موسیٰ جلوہ کی تاب نہ لاکر بیہوش ہوگئے اور کوہِ طور جل گیا۔ برقِ تجلی کے گرنے کے ہم مستحق تھے نہ کہ کوہِ طور۔
فرماتے ہیں کہ برقِ تجلّی ہم پر گرنی چاہیے تھی کوہِ طور پر نہیں اس لیے کہ وہ برداشت نہ کرسکا اور جل گیا اگر ہمیں وہ جلوۂ دیدار دکھاتے تو ہم برداشت کرلیتے ہماری یہ ایسی حالت نہ ہوتی۔ شراب خوار کے ظرف کو دیکھ کر اس کی برداشت کے مطابق شراب دیجاتی ہے۔
(۲) حضرتِ یعقوبؑ حضرتِ یوسفؑ سے نہایت محبت رکھتے تھے۔ اس لیے ان کے دوسرے بھائی ان سے بہت جلتے تھے۔ ایک دن سب بھائی ان کو شکار کے بہانے جنگل میں لے گئے اور ان کو ایک کنوئیں میں دھکیل دیا، گھر آکر اپنے باپ سے کہہ دیا کہ یوسفؑ کو بھیڑیا اٹھالے گیا حضرت یعقوبؑ بہت رنجیدہ ہوئے اور یوسفؑ کی یاد میں روتے روتے اندھے ہوگئے۔
اُدھر یوسفؑ کو ایک قافلے کے لوگوں نے کنوئیں سے نکال کر عزیز مصر کے ہاتھ فروخت کردیا۔ وہ حضرت یوسفؑ کے حُسن جمال پر عاشق ہوگئی لیکن حضرت یوسف نے اس کی کوئی بات نہ مانی۔ آخرکار مایوس ہوکر اور ان پر الزام لگا کر ان کو زنداں میں ڈالدیا۔ اس شعر میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ قید میں بھی حضرت یوسفؑ نے خانہ آرائی نہ چھوڑی۔ حضرت یعقوبؑ کی آنکھوں کی سفیدی زنداں کی دیواروں پر پھر پھر کر اُسے آراستہ بنا رہی تھی یعنی حُسن کسی حالت میں بھی اپنی آرائش نہیں چھوڑتا۔

ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

یارب! وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھکو زباں اور

ابرو سے ہے کیا، اُس نگہِ ناز کو پیوند؟
ہے تیر مُقرّر مگر اس کی ہے کماں اور

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

ہر چند سُبک دست ہوئے بُت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

ہے خونِ جگر جوش میں، دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشاں اور

مرتا ہوں اِس آواز پہ ہر چند سر اُڑ جائے
جلاّد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ "ہاں اور"

لوگوں کو ہے خُورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

لیتا نہ اگر دل تمھیں دیتا کوئی دم چین (۹)
کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے (۱۱)
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

(۹) مرزا غالب نے اس شعر کی تشریح جنوں کو یوں لکھی ہے

سہ لیتا نہ اگر دل، یہ بہت لطیف تقریر ہے۔ لیتا کو ربط ہے چین سے، کرتا مربوط ہے آہ و فغاں سے۔ عربی میں تعقید معنوی اور لفظی دونوں معیوب ہیں۔ فارسی میں تعقید معنوی عیب ہے اور تعقید لفظی جائز بلکہ فصیح اور ملیح۔ ریختہ تقلید ہے فارسی کی۔ حاصل معنی مصرع یہ ہے۔ اگر دل تمہیں نہ دیتا تو کوئی دم چین لیتا۔ اگر نہ مرتا تو کوئی دن اور آہ و فغاں کرتا۔

نیز یہ پوری غزل (اس ایک شعر کو چھوڑ کر) مرزا صاحب نے حاتم علی مہر کو ارسال فرمائی تھی۔ علاوہ ازیں اس غزل کے سات شعر اور ایک اور غزل "اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے" نواب علائی کو اپنی یادداشت پر بھیجی تھی۔

(۱۱) خودستائی کے پہلو بچاتے ہوئے اپنے کلام کو کس انداز سے سراہا ہے۔ بظاہر دوسروں کی تعریف کی ہے مگر اصل میں اپنی سخنوری کا اظہار مقصود ہے۔ اگرچہ یہ بالکل سچ ہے مگر اپنی تعریف دوسروں کی زبان سے کی ہے۔

۵۷

صفائے حیرتِ آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر
تغیّر آبِ برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر
نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہوا جامِ زمرّد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر

جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عُریانی
گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر
برنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بیتابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر
فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بُردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر
ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے
شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر
فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر
اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
"کہ مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر"
ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں
تکلف برطرف مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور (۱)
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور
مٹ جائے گا سر گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور
آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ "جاؤں"
مانا، کہ ہمیشہ نہیں اچھا، کوئی دن اور

(۱) یہ غزل نہیں مرثیہ ہے، مرزا غالب نے نواب زین العابدین عارفؔ کی موت پر لکھا جو عین جوانی کے عالم میں راہیِ ملکِ بقا ہوئے تھے جبکہ ان کی عمر ۳۵ برس کی تھی۔ مرزا صاحب کے اپنے سات بچے پیدا ہوئے۔ لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی مگر کوئی پندرہ مہینے سے زیادہ نہ جیا۔ لہٰذا زین العابدین خاں کو جو اُن کی سالی کا لڑکا تھا متبنیٰ بنا لیا۔ زین العابدین خاں خوش فکر ہونے کی وجہ سے مرزا غالب کو اور بھی زیادہ عزیز تھے۔ ان کی اچانک موت کا مرزا کو نہایت صدمہ ہوا اور یہ دلدوز نوحہ لکھا۔ چونکہ اسی سال مومنؔ اور تسکینؔ بھی گزرے تھے اس لئے سالکؔ نے یہ تاریخ کہی تھی :-

برس دن میں ہوئے یہ تین شاعر
ارم میں عارفؔ و تسکینؔ و مومنؔ

۵۸

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے"
کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور؟

تم ماہِ شبِ چاردہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور؟

تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے؟
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمھیں نفرت سہی نیّر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور؟

گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ! گزارا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ "کیوں جیتے ہیں غالبؔ"
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

فارغ مجھے نہ جان کہ مانندِ صبح و مہر
ہے داغِ عشق زینتِ جیبِ کفن ہنوز

ہے نازِ مفلساں زرِ از دست رفتہ پر
ہوں گلفروشِ شوخیِ داغِ کہن ہنوز

میخانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں
خمیازہ کھینچے ہے بُتِ بیدادفن ہنوز

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز
دُعا قبول ہو یارب! کہ عمرِ خضر دراز

نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نوردِ وہمِ وُجود
ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز

وصالِ جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں؟
کہ دیجے آئینۂ انتظار کو پرواز

ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست
گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز

نہ پوچھ وسعتِ میخانۂ جنوں غالبؔ
جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

وسعتِ سعیِ کرم دیکھ کہ سرتاسرِ خاک
گزرے ہے آبلہ پا ابرِ گہربار ہنوز

یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت
نقشِ پا میں ہے گرمیِ رفتار ہنوز

کیونکر اُس بُت سے رکھوں جان عزیز! کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز؟
دل سے نکلا، پہ نہ نکلا دل سے ہے ترے تیر کا پیکان عزیز
تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ (۳) واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

نہ گُلِ نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تُو اور آرائشِ خمِ کاکُل میں اور اندیشہ ہائے دُور دراز
لافِ تمکیں، فریبِ سادہ دلی ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز
ہوں گرفتارِ الفتِ صیّاد ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز
وہ بھی دن ہو! کہ اُس ستمگر سے ناز کھینچوں، بجائے حسرتِ ناز
نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز
اے ترا غمزہ، یک قلم انگیز اے ترا ظلم سر بسر انداز!
تُو ہُوا جلوہ گر، مبارک ہو ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز
مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا میں غریب اور تُو غریب نواز
اسد اللہ خاں تمام ہوا اے دریغا! وہ رندِ شاھد باز

(۳) مرزا صاحب نے ایک خط میں مرزا تفتہ کو لکھا۔
کیوں ترکِ لباس کرتے ہو۔ پہننے کو تمہارے پاس ہے کیا جس کو اُتار کر پھینکو گے ترکِ لباس سے قیدِ ہستی مٹ نہ جائے گی۔ بغیر کھائے پیے گزارا نہ ہوگا۔ سختی اور سُستی، رنج و آرام کو ہموار کرو جس طرح ہو اسی صورت سے بہر صورت گزرنے دو ع تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ
نیز نواب علائی کو بھی لکھا:
"بھائیوں سے پھر نہیں ملا۔ بازار میں نکلتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ جو اہر خبر دار میر اسلام اخوین کو اور ان کا سلام مجھ کو پہنچا دیتا ہے اسی کو غنیمت جانتا ہوں" ع تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ

۶۰

مژدہ اے ذوقِ اسیری! کہ نظر آتا ہے
دامِ خالی، قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس

جگرِ تشنۂ آزار، تسلی نہ ہوا
جُوئے خوں ہم نے بہائی بُنِ ہر خار کے پاس

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں، ہے ہے!
خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

میں بھی رُک رُک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے
دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس

دہنِ شیر میں جا بیٹھیے لیکن اے دل!
نہ کھڑے ہوجیے خوبانِ دل آزار کے پاس

دیکھ کر تجھ کو چمن بسکہ نمو کرتا ہے
خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس

مر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی، ہے ہے (۱)
بیٹھنا اُس کا وہ آ کر تری دیوار کے پاس

نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے
لگا دے خانۂ آئینہ میں رُوئے نگار آتش

فروغِ حُسن سے ہوتی ہے حلِّ مشکلِ عاشق
نہ نکلے شمع کے پائے نکالے گر نہ خار آتش

جادۂ رہ خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع
چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع

رُخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیِ شمع
ہوئی ہے آتشِ گل آبِ زندگانیِ شمع

زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ، خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیِ شمع

کرے ہے صرف بایمائے شعلہ قصہ تمام (۲)
بطرزِ اہلِ فنا ہے، فسانہ خوانیِ شمع

غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ
ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیِ شمع

ترے خیال سے رُوح اہتزاز کرتی ہے
بجلوہ ریزیِ باد و بہ پر فشانیِ شمع

نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ
شگفتگی ہے شہیدِ گلِ خزانیِ شمع

جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو
نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیِ شمع

(۱) مرزا صاحب نے ایک اور جگہ فرمایا ہے ؎ سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا ؛ یاد آ گیا مجھے تری دیوار دیکھ کر
(۲) ایما: اشارہ۔ قصہ تمام کرنا: زندگی ختم کرنا یعنی شمع شعلہ کا اشارہ پاتے ہی اپنے کو ختم کر لیتی ہے اور فنا کے درجہ کو پا جاتی ہے۔

بیمِ رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش
مجبوریاں تلک ہوئے، اے اختیار حیف!

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
اے ناتمامیِ نفسِ شعلہ بار حیف!

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک
کیا مزا ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل
ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک

مجھ کو ارزانی رہے تجھ کو مبارک ہوجیو!
نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک

شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج
گردِ ساحل ہے بزخمِ موجۂ دریا نمک

داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی، واہ واہ
یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وہ جس جا نمک

چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے
دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضا نمک

غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توفیرِ درد
زخم مثلِ خندۂ قاتل، ہے سرتاپا نمک

یاد ہیں، غالبؔ تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک؟

آہ کو چاہیے اک عمر، اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک!

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک!

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

پرتوِ خور سے، ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں، ایک عنایت کی نظر ہونے تک

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی، غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج!
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے، سحر ہونے تک

۹۲

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت، دعا نہ مانگ — یعنی بغیر یک دلِ بے مدّعا نہ مانگ
آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گُل — بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گُل
آزادیِ نسیم مُبارک کہ ہر طرف — ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گُل
جو تھا، سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا — اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گُل
خوش حال اُس حریفِ سیہ مست کا کہ جو — رکھتا ہو مثلِ سایۂ گُل سر بہ پائے گُل
ایجاد کرتی ہے اُسے تیرے لیے بہار — میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گُل
شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے — مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گُل
سطوت سے تیرے جلوۂ حُسنِ غیور کی — خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گُل
تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک — بے اختیار دوڑے ہے گُل در قفائے گُل
غالبؔ، مجھے ہے اُس سے ہم آغوشی آرزو — جس کا خیال، ہے گُلِ جیبِ قبائے گُل

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفَس — برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم
محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال — ہیں ورق گردانیِ نیرنگِ یک بُت خانہ ہم
باوجودِ یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں — ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم
ضعف سے ہے، نے قناعت سے، یہ ترکِ جستجو — ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمّتِ مردانہ ہم
دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ — جانتے ہیں سینۂ پُرخوں کو زنداں خانہ ہم

بہ نالہ حاصلِ دل بستگی فراہم کر — متاعِ خانۂ زنجیر جُز صدا معلوم

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا، وطن سے دُور — رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں، اے خدا! — رکھ لیجو میرے دعویِ وارستگی کی شرم!

تُوں دامِ بختِ خُفتہ سے، یک خوابِ خوش، ولے — غالبؔ، یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں؟

وہ فراق اور وہ وصال کہاں؟ — وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں؟

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے؟ — ذوقِ نظارۂ جمال کہاں؟

دل تو دل، وہ دماغ بھی نہ رہا — شورِ سودائے خطّ و خال کہاں؟

تھی وہ اک شخص کے تصوّر سے — اب وہ رعنائیِ خیال کہاں؟

ایسا آساں نہیں لہو رونا — دل میں طاقت، جگر میں حال کہاں؟

ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق — واں جو جاویں گرہ میں مال کہاں؟

فکرِ دُنیا میں سر کھپاتا ہوں — میں کہاں اور یہ وبال کہاں؟

مُضمحل ہو گئے قوےٰ، غالبؔ (۱۲) — وہ عناصر میں اعتدال کہاں؟

(۱۲) مرزا صاحب اس شعر کے متعلق عبدالرزاق شاکر کو یوں لکھتے ہیں:

"بندہ نواز زبانِ فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری و ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی و جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارتِ غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے کہ ؎

مُضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ — وہ عناصر میں اعتدال کہاں

کچھ آپ کی تخصیص نہیں۔ سب دوستوں کو جن سے خط و کتابت رہتی ہے۔ اردو ہی میں نیاز نامے لکھا کرتا ہوں"۔ اسی مکتوب میں آگے چل کر فرمایا ہے "اور میں اب انتہائے عمرِ ناپائیدار کو پہنچ کر آفتابِ لبِ بام اور ہجومِ امراضِ جسمانی و آلامِ روحانی سے زندہ درگور ہوں۔ کچھ یادِ خدا بھی چاہیے۔ نظم و نثر کی قلم رو کا انتظام ایزدِ دانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہو چکا ہے۔ اگر اس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام و نشان باقی و قائم رہے گا"۔ آثار ایسے ہی نظر آتے ہیں۔

کی وفا ہم سے تو غیر اُس کو جفا کہتے ہیں | ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں
آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر اُن سے | کہنے جاتے تو ہیں، پر دیکھیے کیا کہتے ہیں
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، انہیں کچھ نہ کہو | جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں
دل میں آجائے ہے، ہوتی ہے جو فرصت غش سے | اور پھر کون سے نالے کو رَسا کہتے ہیں؟
ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود (۵) | قبلہ کو، اہلِ نظر قبلہ نُما کہتے ہیں
پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے (۶) | خارِ رَہ کو ترے، ہم مہر گیا کہتے ہیں
اک شرر دل میں ہے، اُس سے کوئی گھبرائے گا کیا! | آگ مطلوب ہے ہم کو، جو ہوا کہتے ہیں
دیکھیے لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ | اُس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں
وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید (۹) | مر گیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

(۵) ادراک۔ سمجھ۔ مسجود، جس کو سجدہ کیا جائے۔ خدا کی ذات۔

قبلہ: جس طرف کو اہلِ اسلام منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں اسے کعبہ بھی کہتے ہیں۔ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ میں قبلہ کی طرف منہ کر کے جو نماز پڑھتا ہوں تو قبلہ کو سجدہ کرتا ہوں یہ بات بالکل غلط ہے قبلہ تو اس معبودِ حقیقی کی طرف رہنمائی کرتا ہے میں جس کو سجدہ کرتا ہوں وہ ذاتِ حقیقی تو زمان و مکاں سے بھی بالاتر ہے۔ اور اس تک عقل و فہم کی رسائی ممکن نہیں ہے۔

(۶) مہر گیا۔ ایک قسم کی گھاس جس کے متعلق روایت ہے کہ جو اس کو اپنے پاس رکھتا ہے لوگ اس پر مہربان ہو جاتے ہیں گویا یہ حُب کا اثر رکھتی ہے۔ جب سے تجھے رحم آیا ہے ہم نے یہی سمجھ لیا ہے کہ تیرے راستے کے کانٹے "مہر گیا" کا اثر رکھتے ہیں اور انہی کی وجہ سے تو ہم پر مہربان ہوا ہے۔

(۹) آشفتہ نوا۔ پریشان باتیں کہنے والا۔ وحشت و شیفتہ دونوں مرزا کے ہمعصر شاعر اور خاص دوست تھے۔

اس شعر میں وحشت و شیفتہ کے الفاظ نے خاص خوبصورتی پیدا کی ہے۔ وحشت صاحب کا نام غلام علی خاں اور شیفتہ کا نام نواب مصطفٰے خاں تھا وہ جہانگیر آباد کے رئیس تھے۔ شیفتہ صاحب ایک مانے ہوئے سخن فہم اور سخن سنج تھے جو دلی میں رہتے تھے وہ مرزا صاحب کی عظمت کے حد سے زیادہ معتقد اور قدر شناس تھے ان دونوں کو اس مقطع میں یاد کرتے ہیں۔

آبرو کیا خاک اُس گُل کی کہ گلشن میں نہیں   ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں
(۲) ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں   رنگ ہو کر اُڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں
ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب   ذرّے اُس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں
کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم اندھیر ہے   پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں
رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے   انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں
زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن   غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں
بسکہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے   جلوۂ گُل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں
قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا   خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں
لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری   موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں
ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود   قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں
تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر   بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آ سکا   گر اک ادا ہو تو اُسے اپنی قضا کہوں
حلقے ہیں چشم ہائے کشادہ بسوئے دل   ہر تارِ زلف کو نگہِ سُرمہ سا کہوں
میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش   تو اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں
ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ   ہے ہے خدا نہ کردہ تجھے بیوفا کہوں

(۲) فرماتے ہیں کہ ضعیفی سے خون کی قلت ہے جسم و چہرہ کا رنگ پیلا پڑ گیا اور آنسوؤں کی شکل میں بہہ بہہ کر رنگ کی طرح اُڑ گیا۔ اس طرح ایک اور شعر بھی ارشاد فرمایا ہے ؎

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود   قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

مہرباں ہوکے بُلالو مجھے چاہو جس وقت — میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں
ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے! — بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اُٹھا بھی نہ سکوں
زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ (۳) — کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں؟

ہم سے کھُل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن — ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عُذرِ مستی ایک دن
غرّۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو — اس بُلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن
قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں (۴) — رنگ لاوے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن
نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے — بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن
دھول دھپّا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں — ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

(۳) اس غزل کے متعلق عرشی صاحب رامپوری نے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں: جناب حامد حسن قادری نے نہایت دلچسپ اطلاع بہم پہنچائی۔ اپنے مکتوب بنام حیرت شملوی میں رقم طراز ہیں میرے پاس بزرگوں کے وقت کا دیوان غالب ہے۔ اس میں میرے والد مرحوم کے قلم سے دو شعر یہ لکھے ہیں

لگ گئی آگ اگر گھر کو تو اندیشہ کیا — شعلۂ دل تو نہیں ہے کہ بجھا بھی نہ سکوں
تم نہ آؤ گے تو مرنے کی ہیں سو تدبیریں — موت کچھ تم تو نہیں ہو کہ بُلا بھی نہ سکوں

ان اشعار کے ناقل مولوی صادق علی تاباں گڈھ مکتیسری غالب کے زمانے کے ایک بزرگ تھے۔ ممکن ہے غالب نے دیوان چھپنے کے بعد یہ شعر کہے ہوں۔ بہرکیف اشعار کا انداز اور مرتبہ سابقہ اشعار کے ہم پلہ ہیں

(۴) مولوی محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ مرزا صاحب قرضدار ہو گئے۔ قرضخواہوں نے نالش کر دی۔ جواب دہی میں طلب کیے گئے۔ مفتی صدر الدین صاحب کی عدالت تھی جس وقت پیشی میں گئے انہوں نے یہ شعر پڑھا: قرض کی پیتے تھے مے الخ آزردہ نے مدعی کو روپیہ اپنی گرہ سے ادا کر دیا۔ اور اس طرح مرزا غالب قرض سے سبکدوش ہو گئے۔

هم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں — اک چھیڑ ہے وگرنہ مُراد امتحاں نہیں
کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا؟ — پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں
ہم کو ستم عزیز، ستمگر کو ہم عزیز (۳) — نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں
بوسہ نہیں، نہ دیجیے دُشنام ہی سہی — آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں
ہر چند جاں گدازیِ قہر و عتاب ہے — ہر چند پشت گرمیِ تاب و تواں نہیں
جاں مطربِ ترانۂ ہَل مِن مَزِید ہے — لب پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں
ہے ننگِ سینہ، دل اگر آتشکدہ نہ ہو — ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں
خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم — دل میں چھری چبھو مژہ گر خونچکاں نہیں
نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب — سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں
کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں؟ — گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں
پاتا ہوں اُس سے داد کچھ اپنے کلام کی (۱) — رُوح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں
جاں ہے بہائے بوسہ ولے کیوں کہے ابھی — غالبؔ کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

(۳) محبوب نے جور و ستم کے لیے مجھے منتخب کیا ہے تو اس کی یہ ادا بھی مجھے عزیز ہے۔ گویا نامہربانی ہی میرے لیے مہربانی کا سبب ہے

(۱) رُوح القدس سے مراد فرشتہ جبرئیل ہے جو فرشتوں کی جماعت میں سب سے بلند مرتبہ ہے۔ فرماتے ہیں۔ جبرئیل اگرچہ میری زبان نہیں جانتا پھر بھی اس سے اپنے کلام کی داد مجھے مل جاتی ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ جبرئیل تو میرے کلام کی داد دے اور لوگ اسکی قدر نہ کریں۔ مصرعِ اولیٰ میں "کچھ" بہت پُر لطف ہے اس میں نکتہ یہ ہے کہ پوری داد تو جبرئیل بھی نہیں دیتا یعنی میں اس سے بھی زیادہ داد کا مستحق ہوں۔ دوسرا مفہوم یہ پیدا ہوتا ہے کہ میرا کلام الہامی ہے۔ اس لیے جبرئیل ہی سے کچھ اپنے کلام کی داد پاتا ہوں۔ حالانکہ وہ میرا ہم زباں نہیں ہے۔ ایسے ہی ایک اور جگہ مرزا صاحب نے کہا ہے ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں — غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

۶۸

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں ... ایک چکّر ہے مرے پانْوں میں زنجیر نہیں
شوق اُس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں ... جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں
حسرتِ لذّتِ آزار رہی جاتی ہے ... جادۂ راہِ وفا جُز دمِ شمشیر نہیں
رنجِ نومیدیِ جاوید گوارا رہیو ... خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں
سر کھجاتا ہے جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے ... لذّتِ سنگ باندازۂ تقریر نہیں
جب کرم رُخصتِ بیباکی و گستاخی دے ... کوئی تقصیر بجُز خجلتِ تقصیر نہیں
غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ (۱) "آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں"

مت مردُمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں ... ہیں جمع سُویدائے دلِ چشم میں آہیں
برشکالِ گریۂ عاشق ہے، دیکھا چاہیے ... کھل گئی مانندِ گُل، سَو جا سے دیوارِ چمن
اُلفتِ گُل سے غلط ہے دعویِ وارستگی ... سرو ہے با وصفِ آزادی گرفتارِ چمن

(۱) میر تقی میرؔ کی غزل گوئی اور ان کے کلام کی عظمت کا ہر شاعر نے اعتراف کیا ہے۔ ذوقؔ نے کہا ہے ؎

نہ ہوا، پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب ... ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

سوداؔ نے بھی کہا ہے ؎

سوداؔ تو اس غزل کو غزل در غزل ہی کہہ ... ہونا پڑا ہے میرؔ سے اُستاد کی طرف

غالب جیسے بلند اور گراں پایہ شاعر کا اس رائے سے اتفاق کرنا میر تقی میرؔ کے بلند پایہ شاعر ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا جیسا کہ انہوں نے کہا ہے

ریختے کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالبؔ ... کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا"

ناسخؔ لکھنؤ کے مشہور شاعر اور اپنے زمانے کے اُستاد تھے۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ جو شخص میر تقی میرؔ سے عقیدت نہیں رکھتا وہ بے بہرہ ہے غالبؔ نے مقطع میں ناسخؔ کے مصرعۂ ثانی کو باندھا ہے۔

عشق تاثیر سے نومید نہیں — جاں سپاری شجرِ بید نہیں
سلطنت دست بدست آئی ہے (٢) — جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں
ہے تجلّی تری سامانِ وجود — ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں
رازِ معشوق نہ رُسوا ہو جائے — ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں
گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے — غمِ محرومیِ جاوید نہیں
کہتے ہیں جیتے ہیں اُمید پہ لوگ — ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں (٧) — خیاباں خیاباں اِرم دیکھتے ہیں
دل آشفتگاں خالِ کنجِ دہن کے — سُویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں
ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم — قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں
تماشا کہ اے محوِ آئینہ داری — تجھے کس تمنّا سے ہم دیکھتے ہیں
سُراغِ تفِ نالہ لے داغِ دل سے — کہ شب رَو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ — تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

(٢) خاتمِ جمشید: ایران کے بادشاہ جمشید کے پاس ایک نہایت قیمتی انگوٹھی جس پر اس کا نام کندہ تھا وہ اسی کے لیے مخصوص تھی فرماتے ہیں جامِ مے کی سلطنت میخواروں کو جمشید سے دست بدست ملی ہے یہ کوئی خاتمِ جمشید نہیں ہے جو جمشید کے لیے مخصوص تھی اور دوسرے اس سے محروم رہتے گویا ہمارا جامِ مے قدر و قیمت میں خاتمِ جمشید سے کم نہیں ہے۔ شعر کہا ہے ؎
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا ؛ ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے۔ اس میں اپنے مے کے جام کو جامِ جمشید سے فضیلت دی ہے۔
(٧) جس طرح نقشِ قدم دیکھ کر مسافر کے آنے اور جانے کا راستہ معلوم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ہم داغِ دل سے اپنے نالے کی حرارت کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ داغ کو نقشِ قدم سے تشبیہ دی ہے۔

۷۰

ملتی ہے خُوئے یار سے نار التہاب میں (۱) — کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں؟ — شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں
تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر — آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں — میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں
مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام؟ — ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
جو منکرِ وفا ہو فریب اس پہ کیا چلے — کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں؟
میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے — ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں
میں اور حظِ وصل خدا ساز بات ہے — جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے — ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں
لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا (۲) — لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
وہ نالہ دل میں خس کی برابر جگہ نہ پائے — جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں
وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے — جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں
غالبؔ چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی — پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہ تاب میں

(۱) نار: آتش، دوزخ۔ التہاب: شعلوں کا بھڑکنا۔ فرماتے ہیں، محبوب کی بدخوئی بھی میرے لیے سامانِ راحت ہے۔ دوزخ کی آگ بھی شعلہ زنی اور بھڑکنے میں اس کی خو سے مشابہت رکھتی ہے اس لیے یہ بھی میرے لیے سامانِ راحت ہے اگر میں ایسا نہ سمجھوں تو کافر ہوں عشق کا ایمان یہی ہے۔

(۲) لگاؤ سے لگاوٹ یا محبت مراد ہے۔ فرماتے ہیں: دوست کی لاکھوں لگاوٹیں ایک طرف اور نگاہ کا چرانا ایک طرف۔ اسی طرح مصرعہ ثانی میں لاکھوں بناؤ سنگار ایک طرف اور غصہ میں بگڑنا ایک طرف، دونوں مصرعے ہم پلہ اور لاجواب ہیں۔ عاشق و معشوق کے درمیان ہمیشہ ایسا ہی گزرتا رہا ہے معشوق کی لگاوٹ عاشق کے لیے بہت بڑی چیز ہے اور عاشق کی نظر میں آنکھ چرانا لگاوٹ سے بھی زیادہ دلفریب ہے۔ اسی طرح معشوق بناؤ سنگار میں نہایت دلفریب ہوتا ہے مگر اس کا غصے سے بگڑنا اس کے بناؤ سے بدرجہا دلربا ہو جاتا ہے۔

مولانا آزردہ جو ہمیشہ سادہ کلام کو پسند کرتے تھے اور مرزا کی پیچیدہ گوئی پر حرف رکھتے تھے۔ اس شعر کو سن کر نہایت خوش ہوئے مگر طنزاً بطور مزاح یہ کہا: یہ تو ہماری طرز کا شعر ہے۔ اس میں مرزا کی کون سی خوبی ہوئی۔

٦١

کل کے لیے کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سُوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند (۲)
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع؟
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے (۴)
نَے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اُتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے (۵)
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے (۶)
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر (۷)
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

غالبؔ ندیمِ دوست سے آتی ہے بُوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیِ بُو تراب میں

(۲) جب خدا نے حضرت آدم کو خاک سے پیدا کر کے اس میں جان ڈالی اور فرشتوں کو حکم دیا کہ اسے سجدۂ تعظیم کریں تو سب فرشتوں نے اس کی تعظیم کی لیکن ابلیس (شیطان) نے نہیں کی اور کہا میں آگ سے بنایا گیا ہوں اور یہ انسان مٹی سے۔ میں اس سے افضل ہوں۔ اس لیے اسے سجدہ نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ حکم عدولی و گستاخی پسند نہ آئی اور اسے اپنی بارگاہ سے نکال دیا۔ اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

کل تک تو ہماری یہ قدر و منزلت تھی کہ ہماری جناب میں اگر فرشتے نے گستاخی اور بے ادبی کی تو اسے بارگاہ سے نکال دیا۔ آج ہم اتنے ذلیل ہیں کہ ہماری پستی انتہا کو پہنچ چکی آخر اس کی کیا وجہ ہے اور بارگاہِ الٰہی نے اتنا ناقابلِ التفات کیوں سمجھ لیا ہے۔

(۴) منشی میاں داد خاں سیاح کو لکھتے ہیں، ناتوانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے نکما کر دیا۔ ضعف، سستی، کاہلی، گراں جانی، گرانی رکاب میں پاؤں ہے نہ باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور و دراز درپیش ہے زادِ راہ موجود نہیں، خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔

(۵، ۶ و ۷) اشعار میں ذاتِ واحد کا ہر شے میں موجود ہونا ظاہر کیا ہے۔ خدائے تعالیٰ کی ذات دنیا کی ہر شے میں جلوہ گر ہے اور اس طرح قطرہ و موج اور حباب کی کوئی ہستی نہیں۔ یہ سمندر ہی کے اجزا ہیں۔ یعنی ممکنات کی ہستی وجوبِ واجب ہی کے ضمن میں ہے۔ آگے فرماتے ہیں۔ عارف کو تمام موجوداتِ عالم جو نظر آتے ہیں اس کو شہود کہتے ہیں۔ دیکھنے والا شاہد ہے اور جس کو دیکھا جائے مشہود۔

۷۲

حیراں ہوں، دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو مَیں — مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو مَیں
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں — ہر اک سے پُوچھتا ہوں کہ "جاؤں کدھر کو مَیں"؟
جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار — اے کاش! جانتا نہ تری رہ گزر کو مَیں
ہے کیا، جو کَس کے باندھیے میری بلا ڈرے — کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو مَیں؟
لو، وہ بھی کہتے ہیں کہ "یہ بے ننگ و نام ہے" — یہ جانتا اگر، تو لُٹاتا نہ گھر کو مَیں
چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک تیز رَو کے ساتھ — پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو مَیں
خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار — کیا پُوجتا ہوں اُس بُتِ بیداد گر کو مَیں؟
پھر بیخودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار — جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو مَیں
اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا — سمجھا ہوں دلپذیر متاعِ ہنر کو مَیں
غالبؔ خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز (۱۰) — دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو مَیں

ذکر میرا بہ بدی بھی، اُسے منظور نہیں — غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں
وعدۂ سیرِ گلستاں ہے، خوشا طالعِ شوق (۱۲) — مژدۂ قتل مُقدر ہے جو مذکور نہیں
شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم — لوگ کہتے ہیں کہ "ہے" پر ہمیں منظور نہیں

(۱۰) مقطع میں نواب علی بہادر خاں والیِ باندہ کی طرف اشارہ ہے جنھوں نے مرزا غالب کو اپنے ہاں مدعو کیا تھا۔ ایک خط میں انوار الدولہ شفق کو یوں تحریر فرماتے ہیں: "میرے باندا بندیل کھنڈ آنے کا میں نے سب سامان کر لیا۔ ڈاک میں روپیہ ڈاک کا دیا۔ قصد یہ تھا کہ فتحپور تک ڈاک میں جاؤں گا، وہاں سے نواب علی بہادر کے ہاں کی سواری میں باندے جا کر ہفتہ بھر رہ کر کالپی ہوتا ہوا آپ کے قدم دیکھتا ہوا سبیل ڈاک دلّی چلا آؤں گا۔ ناگاہ حضور رو الابیمار ہو گئے (ظفر بادشاہ) اور مرض نے طول کھینچا۔ وہ ارادہ قوت سے فعل میں نہ آیا۔

(۱۲) مرزا صاحب نے ایک خط شاہ عالم مارہروی کو لکھا۔

مشفقی مکرمی، چودھری عبدالغفور صاحب کو میرا سلام کہیے گا اور یہ پیام پہنچایئے گا کہ حضرت صاحب عالم کی تمنائے دیدار بتقیید مارہرہ کنایہ اس سے ہے کہ اور کسی کا بھی دیدار مطلوب ہے۔ خواہشِ وصل مقدر ہے جو مذکور نہیں۔ مصرعۂ ثانی ترمیم کے ساتھ لکھا

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن (۱) ہم کو تقلیدِ تُنک ظرفیِ منصور نہیں
حسرت اے ذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی عشقِ پُر عربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں
میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمھیں" کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ "ہم حور نہیں"
ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں
صاف دُردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں
ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائیٔ غالب (۶) میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں
عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب! (۸) ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں
کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں
اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں

(۱) ہم بھی وہ قطرہ ہیں جو دریا کا جزو ہے یعنی فنافی الذات۔ لیکن ہم کبھی حضرتِ منصور کی پیروی نہیں کرسکتے کہ سب کے سامنے یہ کہتے پھریں کہ ہم خدا ہیں اور اس طرح اپنی کم ظرفی کا ثبوت دیں۔

(۶) ظہوری اور خفائی فارسی کے بہت بڑے شاعر گزرے ہیں۔ ظہوری کے کلام کی عوام میں بہت شہرت تھی۔ خفائی اتنا مشہور نہیں تھا لیکن خفائی کا کلام ظہوری کے کلام سے زیادہ بہتر تھا اور خواص میں مقبول تھا۔ دونوں شاعروں کے ناموں سے بھی اس خصوصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ ظہوری: بمعنی ظاہر، مشہور۔ خفائی: بمعنی پوشیدہ، گمنام۔ یہ حضرتِ غالب کا کمال کہ شاعروں کے ناموں سے بھی اپنا مفہوم ظاہر کردیا۔ فرماتے ہیں کہ دوسرے شاعروں کے مقابلہ میں میری حیثیت ایسی ہے جیسے ظہوری کے مقابلے میں خفائی کی تھی۔ اگرچہ میں ظہوری کی طرح مشہور نہیں ہوں لیکن میرا کلام خفائی کی طرح دوسرے شاعروں سے مشہور ہے۔

(۸) فرہاد خسرو کا رقیب تھا۔ محض شیریں کو دیکھنے کے لیے خسرو کے محل میں معماری کرتا تھا۔ عاشق کے مرتبۂ عشق سے یہ بات بعید ہے کہ اپنے رقیب کا احسان اٹھائے یا اس سے مدد لے۔ فرہاد نے شیریں کو حاصل کرنے کے لیے خسرو کے محل میں مزدوری کی اس لیے ہم عاشق کی دنیا میں اس کی نکونامی تسلیم نہیں کرسکتے یعنی عشق اور رقیب کے گھر مزدوری باعثِ بدنامی ہے۔

۴،

وائے محرومیِ تسلیم و بدا حالِ وفا — جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں
رنگِ تمکینِ گُل و لالہ پریشاں کیوں ہے؟ — گر چراغانِ سرِ رہ گزرِ باد نہیں
سَبدِ گُل کے تلے بند کرے ہے گلچیں — مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیّاد نہیں
نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا — دی ہے جائے دہن اس کو دمِ ایجاد نہیں
کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت — یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں
کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ (۶) — تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں؟

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا — یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے — تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں؟
کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم؟ — ہو غم ہی جاں گداز تو غمخوار کیا کریں؟

ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر — عشق کا اُس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

قیامت ہے کہ سُن لیلےٰ کا دشتِ قیس میں آنا — تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں؟
دلِ نازک پہ اُس کے رحم آتا ہے مجھے غالبؔ — نہ کر سرگرم اُس کافر کو اُلفت آزمانے میں

(۶) اے غالبؔ تم کس منہ سے غربت کی شکایت کرتے ہو اور غیروں کا رونا روتے ہو۔ کیا تم کو یارانِ وطن کی سرد مہری اور دل آزاری یاد نہیں یعنی اہلِ وطن نے کتنا تمہیں ستایا اور پریشان کیا پھر پردیس میں غیروں کی بدسلوکی کی شکایت کیا ہے ؎

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مُشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

دل لگا کر لگ گیا اُن کو بھی تنہا بیٹھنا　　بارے اپنی بے کسی کی ہم نے پائی داد یاں ۵،
ہیں زوال آمادہ، اجزا آفرینش کے تمام　　مہرِ گردوں، ہے چراغِ رہگزارِ باد یاں

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں　　کبھی صبا کو کبھی نامہ بَر کو دیکھتے ہیں
وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے　　کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو　　یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں؟
ترے جواہرِ طرفِ کُلہ کو کیا دیکھیں؟　　ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں　　شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں
کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا بُرائی ہے　　بَلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں
جو آؤں سامنے اُن کے تو مرحبا نہ کہیں　　جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں
کبھی جو یاد بھی آتا ہوں مَیں تو کہتے ہیں　　کہ "آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں"
علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب　　گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں
جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام؟　　دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں
تم اُنکے وعدے کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالب　　یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ "یاد نہیں"

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں　　ہم بھی مضموں کی ہَوا باندھتے ہیں
آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے؟　　ہم بھی ایک اپنی ہَوا باندھتے ہیں
تیری فرصت کے مقابل، اے عمر!　　برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں
قیدِ ہستی سے رہائی معلوم　　اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں
نشۂ رنگ سے ہے واشُدِ گُل　　مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں!
غلطیہائے مضامیں مت پوچھ　　لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

۷۶

اہلِ تدبیر کی واماندگیاں — آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں
سادہ پُرکار ہیں خوباں غالبؔ — ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں
زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسدؔ — وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں (۴) — خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں
کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل! — انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یارب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؟ — لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں
حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے — آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں
کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے — لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں
رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ — رُتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں
کرتے ہو مجھ کو منعِ قدمبوس کس لیے؟ — کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں
غالبؔ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دُعا — وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں"

(۴) خط بنام نواب کلب علی خاں: بعدِ تسلیم معروض ہے جب بادشاہ دہلی نے مجھ کو نوکر رکھا اور خطاب دیا اور خدمتِ تاریخ نگاریِ سلاطینِ تیموریہ مجھ کو تفویض کی تو میں نے ایک غزل طرز تازہ پر لکھی مقطع اس کا یہ ہے "غالبؔ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا الخ" اب مقطع کی صورت بدل کر حضور کی نذر کرتا ہوں خدا کرے کہ حضرت کو پسند آئے۔"

خود نوشتہ غزل مرزا غالب، مقطع کی صورت بدلی ہوئی پیش کی جاتی ہے

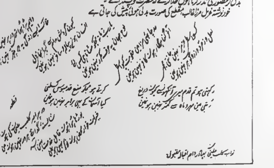

"

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں (۱) خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں
تھیں بنات النعشِ گردوں دن کو پردے میں نہاں (۲) شب کو اُنکے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں
قید میں یعقوبؑ نے لی گو نہ یوسفؑ کی خبر (۴) لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

(۱) یہ غزل دہلی اردو اخبار میں اس تمہید کے ساتھ شائع ہوئی تھی کہ اس ہفتہ میں جو مشاعرہ ہوا جناب مرزا نور الدین بہادر جو لکھنؤ سے تشریف لائے تھے اور شاہزادہ والا تبار رونق افروز محفلِ مشاعرہ تھے۔ ایک غزل مرزا حاجی یعنی میر مشاعرہ اور غزل جناب نجم الدولہ محمد اسد اللہ خاں غالب کی راقمِ اخبار کے پاس پہنچی جو کہ اردو اخبار میں شائع کر دی گئی۔ غالب نے منشی حقیر کو بھی اس غزل کے متعلق لکھا ہے

"بھائی خدا کے واسطے غزل کی داد دینا اگر ریختہ یہ ہے تو میر و مرزا کیا کہتے تھے اگر وہ ریختہ تھا تو پھر یہ کیا ہے۔ صورت اس کی یہ ہے کہ ایک صاحب شہزادگانِ تیموریہ میں سے لکھنؤ سے یہ زمین لائے۔ حضور نے خود بھی غزل کہی اور مجھے بھی حکم دیا سو میں حکم بجا لایا اور غزل لکھی۔"

(۲) شمال کی جانب سات ستارے آسمان پر قطب شمالی کے قریب ہوتے ہیں۔ عرب ان کو لڑکیاں کہتے ہیں اور ہندوستان میں سات سہیلیوں کا جھمکا کہا جاتا ہے۔ نیز چار ستاروں کو جنازہ اور تین کو جنازہ لے جانے والے بیان کیا جاتا ہے۔

فرماتے ہیں یہ سات لڑکیاں (بنات النعش) شرم و حیا کا ثبوت دینے کے لیے دن بھر تو آسمان کے پردے میں پوشیدہ رہتی ہیں مگر رات کو انہیں کیا ہوتا ہے اور ان کے جی میں کیا آتی ہے کہ عریاں و بے حجاب ہو کر سامنے آجاتی ہیں۔

(۴) روزنِ دیوارِ زنداں سے مراد ہے، آنکھوں کا بے نور ہونا اور دوسری طرف یہ اظہار کرنا مقصود ہے کہ یعقوب نے یوسف کی خبر نہ لی لیکن حقیقت میں ان کی آنکھیں روزن دیوارِ زنداں ہو کر ہر وقت یوسف کو دیکھتی تھیں۔ روزن اور نابینا آنکھوں کی تشبیہ بہت خوب ہے۔ جب آنکھوں کی روشنی ختم ہو جاتی ہے تو وہ سفید ہو جاتی ہیں اور روزن کے ساتھ پورے طور پر مشابہت رکھتی ہیں۔ جس طرح روزن بند نہیں ہوتا اسی طرح نابینا آنکھیں بھی کھلی رہتی ہیں۔ روزن کے ذریعہ اندھیرے میں روشنی آتی ہے۔ اس لئے یعقوب کی آنکھیں روزن بننے سے یہ مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ یوسف زنداں کی تاریکی سے نہ گھبرائے۔ غالب کا یہ شعر کس قدر حسین ہے اور جذبۂ عشق کو ظاہر کرتا ہے۔

۲۸

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے (۱) ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہوگئیں
جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہوگئیں
اِن پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام (۲) قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہوگئیں
نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں تیری زُلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں
مَیں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھُل گیا بُلبلیں سُن کر مرے نالے غزلخواں ہوگئیں
وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار؟ جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہوگئیں
بسکہ روکا مَیں نے اور سینہ میں اُبھریں پے بہ پے میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہوگئیں
واں گیا بھی مَیں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب یاد تھیں جتنی دعائیں، صرفِ درباں ہوگئیں
جانفزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا (۹) سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہوگئیں
ہم موحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم مِلّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں
یونہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں! دیکھنا اِن بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

(۱) قاعدہ ہے کہ عاشق ہمیشہ رقیبوں سے ناخوش رہتے ہیں مگر زلیخا اس سے مستثنیٰ رہی یعنی وہ مصر کی عورتوں کو دیکھ کر خوش ہوئی جو زلیخا کو طعنہ زن تھیں کہ تو نے ایک غلام سے عشق کیا ہے۔ زلیخا نے انھیں اپنے گھر مدعو کیا جب وہ آئیں تو ایک ایک لیموں اور ایک ایک چھری سب کے ہاتھ میں دے کر ہدایت کی کہ جب یوسف آئے تو چھری سے لیموں کاٹ دیں مگر جب یوسف سامنے آئے تو انکے جمال کو دیکھنے میں اتنی محو ہو گئیں کہ سب نے انتہائی وارفتگی میں بجائے لیموں کاٹنے کے اپنی اپنی انگلی کاٹ لی تب زلیخا نے کہا کہ تم مجھے طعنہ زن تھیں اب حسن کا اثر دیکھ لیا
(۲) اہلِ اسلام کا عقیدہ ہے کہ نیک بندے جنت میں جائیں گے اور اُن کی خدمت کے لیے حوریں ملیں گی۔ ازراہِ شوخی فرماتے ہیں:
یہ حسین جو آج ہمیں یہاں ستا رہے ہیں اگر قدرتِ حق سے جنت میں حوریں بن گئیں تو ہم ان سے اپنا انتقام لیں گے چونکہ جنت میں حوریں ہماری خدمت اور فرمانبرداری کے لیے ہوں گی اس لیے ہم وہاں ان کو اپنی خدمت اور فرمانبرداری میں مصروف رکھ کر بدلہ لیں گے کیونکہ انہوں نے ہمیں اپنی فرمانبرداری پر مجبور کر رکھا ہے۔
(۹) اِس مضمون کو مرزا غالب نے میر مہدی مجروح کے ایک خط میں اس طرح لکھا ہے "میر مہدی! صبح کا وقت ہے جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے دو حرف لکھتا ہوں آگ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی سہی مگر اے وہ آتشِ سیّال کہاں کہ جب دو جرعے پی لیے فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی۔ دل توانا ہوگیا۔"

دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں — یعنی ہمارے جیب میں اک تار بھی نہیں
دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے — دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں
ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے (۳) — دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں
بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں — طاقت بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں
شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش — صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں
گنجایشِ عداوتِ اغیار یک طرف — یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں
ڈر نالہ ہائے زار سے میرے خدا کو مان — آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں
دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی — حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں
اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا! — لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں
دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا — دیوانہ گر نہیں ہے تو ہُشیار بھی نہیں

نہیں ہے زخم کوئی بخیے کے درخور مرے تن میں — ہوا ہے تارِ اشکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن میں
ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی — کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں
ودیعت خانۂ بیدادِ کاوش ہائے مژگاں ہوں — نگینِ نامِ شاہد ہے مرا ہر قطرہ خوں تن میں
بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی — شبِ مہ ہو جو رکھ دوں پنبہ دیواروں کے روزن میں

(۳) مرزا صاحب عبدالجمیل جنوں کو اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔ "ملنا ترا اگر نہیں الخ یعنے اگر ترا ملنا آسان نہیں تو یہ امر ہم پر آسان ہے خیر ترا ملنا آسان نہیں نہ سہی ہم مل سکینگے نہ کوشش کرینگے اور دل بیکار مشکل تو یہ ہے کہ یہی ترا ملنا دشوار بھی نہیں [illegible] ل بھی سکتا ہے ہم کو تو یہی سہل سمجھ لینا تھا مگر رشک کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتے"

۸۰

نکوہش، مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں آئی — ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں
ہوے اُس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے — پرافشاں جوہر آئینے میں مثلِ ذرّہ روزن میں
نہ جانوں نیک ہُوں یا بد ہُوں پر صحبت مخالف ہے — جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں
ہزاروں دل دیے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو — سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں
اسدؔ زندانیِ تاثیرِ الفت ہاے خوباں ہوں — خمِ دستِ نوازش، ہو گیا ہے طوق گردن میں

مرے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں — سواے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں
مگر غبار ہوے پر ہوا اُڑا لے جاے — وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں
یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے؟ — کہ غیرِ جلوۂ گل رہ گزر میں خاک نہیں
بھلا اُسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا — اثر مرے نفَسِ بے اثر میں خاک نہیں
خیالِ جلوۂ گُل سے خراب ہیں میکش — شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں
ہُوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ — سواے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں
ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ — (۱۲) کھُلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

(۱۲) اے اسدؔ ہمارے اشعار کو لوگ محض اپنی تفریح کا سامان سمجھتے ہیں۔ اشعار کی خوبی کو نہیں پہچانتے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اپنے فن کا اظہار کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ مرزا کا ابتدائی کلام پیچیدہ اور مشکل پسندی سے بھرا ہوا تھا۔ جب ان سے آسان کہنے کی فرمائش کی تو انہوں نے یہ رباعی کہی

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل — سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش — گویم مشکل، وگرنہ گویم مشکل

اور یہ شعر بھی اسی وقت کا کہا ہوا ہے ؎

نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا — گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں؟ (۱) روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں؟
دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم، غیر ہمیں اُٹھائے کیوں؟
جب وہ جمالِ دلفروز، صورتِ مہرِ نیم روز آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں مُنہ چھپائے کیوں؟
دشنۂ غمزہ جانستاں، ناوکِ ناز بے پناہ تیرا ہی عکسِ رُخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں؟
قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟
حُسن اور اُس پہ حُسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم (۲) اپنے پہ اعتماد ہے، اور کو آزمائے کیوں؟
واں وہ غرورِ عز و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بُلائے کیوں؟
ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بیوفا سہی جس کو ہو دین و دل عزیز، اُس کی گلی میں جائے کیوں؟
غالبِ خستہ کے بغیر، کون سے کام بند ہیں؟ روئیے زار زار کیا؟ کیجیے ہائے ہائے کیوں؟

(۱) یہ غزل دہلی اردو اخبار میں ۱۳ر فروری ۱۸۵۳ء میں شائع ہوئی۔ اس غزل پر مرزا نورالدین المتخلص بہ شاہی نے ایک مخمس لکھا جس میں آخر کے دو مصرعوں میں غالب کا پورا شعر تھا۔ یہ مخمس بہت پسند کیا گیا اور بادشاہ نے پانچ مرتبہ اس کو پڑھوا کر سنا۔ اس کے علاوہ اس غزل کا مطلع "دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت" مرزا صاحب نے قاضی عبدالجمیل کے خط میں بھی استعمال کیا ہے۔ جب انھوں نے مرزا صاحب سے غزل طلب کی تھی۔ فرماتے ہیں:

یہ شہر بہت غارت زدہ ہے۔ نہ ناشناس باقی نہ اکنہ۔ کتاب فروشوں سے کہہ دوں گا۔ اگر میری نظم و نثر کے رسالوں میں سے کوئی رسالہ آجائے تو وہ مول لے کر خدمتِ عالی میں بھیجا جائے گا۔ دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت الخ
ایک دوست کے پاس بقیۃ النہب و الغارۃ کچھ میرا کلام موجود ہے۔ اس سے یہ غزل لکھوا کر بھیج دوں گا۔

(۲) قاضی عبدالجمیل جنوں کو اس طرح لکھتے ہیں:

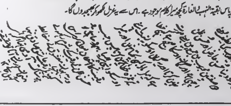

غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ یُوں   بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یُوں
پُرسشِ طرزِ دلبری کیجیے کیا کہ بِن کہے   اُس کے ہر ایک اشارہ سے نکلے ہے یہ ادا کہ یُوں
رات کے وقت مے پیے ساتھ رقیب کو لیے   آوے وہ یاں خدا کرے، پر نہ کرے خدا کہ یُوں
"غیر سے رات کیا بنی" یہ جو کہا تو دیکھیے   سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یُوں
بزم میں اُس کے رُو برو کیوں نہ خموش بیٹھیے؟   اُس کی تو خامشی میں بھی، ہے یہی مدعا کہ یُوں
میں نے کہا کہ "بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی"   سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یُوں؟
مجھ سے کہا جو یار نے "جاتے ہیں ہوش کس طرح؟"   دیکھ کے میری بیخودی، چلنے لگی ہوا کہ یُوں
کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی؟   آئینہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پا کہ یُوں
گر ترے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال   موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یُوں
جو یہ کہے کہ "ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی؟"   گفتۂ غالب ایکبار پڑھ کے اُسے سُنا کہ یُوں

حسد سے دل اگر افسردہ ہے، گرمِ تماشا ہو   کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظّارہ سے وا ہو
بقدرِ حسرتِ دل چاہیے ذوقِ معاصی بھی   بھروں یک گوشۂ دامن گر آبِ ہفت دریا ہو
اگر وہ سَرو قد گرمِ خرامِ ناز آجاوے   کفِ ہر خاکِ گلشن شکلِ قمری نالہ فرسا ہو

کعبہ میں جا رہا تو نہ دو طعنہ، کیا کہیں   بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو؟
طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ   دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو
ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے؟   ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سرنوشت کو
غالب کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے   خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گِلا
ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

"پیدا ہوئی ہے" کہتے ہیں، "ہر درد کی دوا"
یوں ہو تو چارۂ غمِ اُلفت ہی کیوں نہ ہو

ڈالا نہ بیکسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے، انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں
اپنے سے کر نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی
عُمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

اس فتنہ خُو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسد
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

قفس میں ہُوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا بُرا کیا ہے نوا سنجانِ گلشن کو؟

نہیں گر ہمدمی آساں، نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے؟
نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اُس جراحت پر
کیا سینے میں جس نے خونچکاں مژگانِ سوزن کو

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناور جُوئے خوں میں تیرے توسن کو

ہوا چرچا جو میرے پانو کی زنجیر بننے کا
کیا بیتاب کاں میں جنبشِ جوہر نے آہن کو

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے؟
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈھے ہے ابھی برقِ خرمن کو

۸۴

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خو مجھ کو
جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یُوں بیخبر سوتا؟
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے؟
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو؟

مرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالبؔ
فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اُس سیم تن کے پاؤں
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

دی سادگی سے جان، پڑوں کوہکن کے پانو (۱)
ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو

بھاگے تھے ہم بہت سو اُسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پانو

مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دُور دُور
تن سے سوا فگار ہیں اِس خستہ تن کے پانو

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانو

ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
اُڑتے ہوئے اُلجھتے ہیں مُرغِ چمن کے پانو

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دکھتے ہیں آج اُس بُتِ نازک بدن کے پانو

غالبؔ مرے کلام میں کیونکر مزا نہ ہو؟
پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پانو

(۱) جب فرہاد جوئے شیر شیریں کے محل کے نیچے تک لانے میں کامیاب ہو گیا تو خسرو کو اپنی ذلت اور شکست نظر آئی۔ اس نے اپنے مصاحبین سے مشورہ کرنے کے بعد ایک مکار بڑھیا کو تیار کیا کہ وہ فرہاد کو جھوٹی خبر دے کہ شیریں کا انتقال ہو گیا۔ چنانچہ اس عیار بڑھیا نے فرہاد کے پاس پہنچ کر شیریں کی موت کی خبر سنائی۔ فرہاد نے یہ خبر سنتے ہی تیشے سے اپنا سر پھوڑ لیا اور جان دے دی۔

فرماتے ہیں کہ کوہکن نے کس سادگی سے اپنی جان دے دی۔ جی چاہتا ہے کہ اس کے قدموں پر فدا ہو جاؤں۔ دوسرے مصرعہ میں بڑھیا کو بد دعا دیتے ہیں کہ اس مکار بڑھیا کے پاؤں راستے ہی میں کیوں نہ ٹوٹ گئے کہ وہ شیریں کے مرنے کی جھوٹی خبر فرہاد کے پاس نہ لے جاتی۔

۸۵

واں اُس کو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار — یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو

اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم تو دیکھ — آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

واں پہنچ کر جو غش آتا پَے ہَم ہے ہم کو — صد رہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو

دل کو مَیں اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے — کس قدر ذوقِ گرفتاریِ ہَم ہے ہم کو

ضعف سے نقشِ پَے مور، ہے طوقِ گردن — تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو

جان کر کیجے تغافل، کہ کچھ امید بھی ہو — یہ نگاہِ غلط انداز تو سَم ہے ہم کو

رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں — نالۂ مرغِ سحر تیغِ دو دم ہے ہم کو

سر اُڑانے کے جو وعدے کو مکرّر چاہا — ہنس کے بولے کہ "ترے سر کی قسم ہے ہم کو"

دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ؟ ولیکن ناچار — پاسِ بے رونقیِ دیدہ اہم ہے ہم کو

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو — ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی (۱۱) — ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر — عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ — جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

(۱۱) مرزا غالب جب کلکتہ گئے تو راستہ میں لکھنؤ ٹھہرے تھے۔ نواب آغا میر سے ملاقات کا اہتمام کیا گیا۔ مگر سازگاری نہ دیکھی۔ غازی الدین حیدر شاہِ اودھ تھے اور سیاہ سفید کے مالک نائب السلطنت سید محمد خاں آغا میر۔

غالب کے دوستوں نے آغا میر کو خبر کی کہ غالب لکھنؤ میں موجود ہیں۔ انھوں نے ملنے کے لیے رضامندی ظاہر کی اور مرزا صاحب بھی راضی ہو گئے۔ لیکن اپنی خودداری کا پاس رکھتے ہوئے شرط لگا دی کہ میرے پہنچنے پر آغا میر کھڑے ہو کر پذیرائی کریں اور مجھے نقد نذر پیش کرنے سے باز رکھا جائے۔ آغا میر نے یہ شرائط نامنظور کر دیں۔ غالب بھی خوددار تھے۔ لہٰذا ملاقات نہ ہو سکی۔ اور کلکتہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو (۱) مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو؟
بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو
کیا وہ بھی بے گنہ کُش و حق ناشناس ہیں مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو
اُبھرا ہوا نقاب میں ہے اُن کے ایک تار مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید (۵) مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو
سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست لیکن خدا کرے وہ ترا جلوہ گاہ ہو
غالب بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں دنیا ہو یارب اور مرا بادشاہ ہو

(۱) مرزا صاحب نے نواب علائی کو ایک خط میں لکھا:

اشعار تازہ مانگتے ہو کہاں سے لاؤں، عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ تبعد ہے جو ایمان سے کفر کو۔ گورنمنٹ کا بھاٹ تھا۔ مدحتیں کرتا تھا خلعت پاتا تھا، خلعت موقوف مدحت متروک۔ نہ غزل نہ مدح، ہزل و ہجو میرا آئین نہیں پھر کہو کیا لکھوں۔ بوڑھے پہلوان کے سے پیچ بتلانے کو رہ گیا ہوں۔ اکثر اطراف و جوانب سے اشعار آ جاتے ہیں اصلاح پا جاتے ہیں باور کرنا اور مطابق واقع سمجھنا تمہارے دیکھنے کو دل بہت چاہتا ہے اور دیکھنا تمہارا موقوف اس پر ہے کہ تم یہاں آؤ۔ کاش اپنے والد ماجد کے ساتھ چلے آتے۔ اور مجھ کو دیکھ جاتے ع

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہے مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہے

(۵) حالی نے اس شعر کی تشریح یوں کی ہے کہ مسجد و مدرسہ و خانقاہ مساوی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میکدہ جہاں حریفوں کے ساتھ شراب پینے کا لطف تھا۔ جب وہی چھٹ گیا اب مسجد، مدرسہ اور خانقاہ میں بیٹھ کر پی لینے میں کوئی عار نہیں ہے۔ یعنی یہ مقامات اس شغل کے بالکل لائق نہیں ہیں۔ وہاں بھی میکدہ چھٹنے کے بعد پی لینے سے انکار نہیں ہے اور شراب پینے کی تصریح نہ کرنا عین مقتضائے بلاغت ہے۔ مرزا غالب شوخی برتنے سے کبھی نہیں چوکتے۔ یعنی مسجد، مدرسہ، خانقاہ جائے عزت ہیں مگر مرزا صاحب نے ان سب کو مساوی سمجھ لیا ہے۔

۸۷

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو، تو کیونکر ہو | کہے سے کچھ نہ ہوا، پھر کہو تو کیونکر ہو؟
ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال | کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں؟ ہو تو کیونکر ہو؟
ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے | حیا ہے اور یہی گومگو تو کیونکر ہو؟
تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا | بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو؟
الجھتے ہو تم، اگر دیکھتے ہو آئینہ | جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو؟
جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا | وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو؟
ہمیں پھر ان سے امید، اور انہیں ہماری قدر | ہماری بات ہی پوچھیں نہ وو تو کیونکر ہو؟
غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا | نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیونکر ہو؟
بتاؤ اس مژہ کو دیکھ کر کہ مجھ کو قرار | یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیونکر ہو؟
مجھے جنوں نہیں غالبؔ ولے بقولِ حضور (۱۰) | "فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو؟"

کسی کو دے کے دل کوئی نواسنجِ فغاں کیوں ہو؟ (۱۱) | نہ ہو جب دل ہی سینہ میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو؟
وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں؟ | سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو؟"
کیا غمخوار نے رسوا، لگے آگ اس محبت کو | نہ لاوے تاب جو غم کی، وہ میرا رازداں کیوں ہو؟

(۱۰) یہ غزل اور غزلوں کے ساتھ دہلی کے اردو اخبار میں چھپی جب قلعۂ معلی میں مشاعرہ ہوتا اس میں یہ غزل مرزا صاحب نے پڑھی۔ غزل کے لیے طرح ہمیشہ بادشاہ ظفر دیا کرتے تھے۔ مقطع میں غالب نے بادشاہ کے طرحی مصرع کو اس طرح نظم کیا ہے

مجھے جنوں نہیں غالب ولے بقولِ حضور | "فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو"

(۱۱) مرزا غالب نے حاتم علی مہر کو لکھا کہ میں نے ان دنوں دو غزلیں لکھیں ہیں۔ ایک تو "دریا ہوا" سو وہ آپ کے پاس بھیج چکا ہوں۔ دوسری غزل "رواں کیوں ہو" "گماں کیوں ہو" اب یہ بھیجتا ہوں۔ نیز دوسرے خط میں انہیں کو لکھا:

"تم سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ برابر کئی خطوں میں تم کو غم و اندوہ کا شکوہ گزار پایا ہے بس اگر کسی بے درد پر دل آیا ہے تو شکایت کی گنجائش نہیں ہے بلکہ یہ غم تو نصیب دوستاں و درخورِ افزائش ہے بقول غالب ؎

کسی کو دے کے دل کوئی نواسنجِ فغاں کیوں ہو | نہ ہو جب دل ہی سینہ میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

نیز یہ شعر ؎ یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے | ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

۸۸

وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا — تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو!
قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم (۲) — گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو!
یہ کہہ سکتے ہو "ہم دل میں نہیں ہیں" پر یہ بتلاؤ — کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو!
غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے — نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو!
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے — ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو!
یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں؟ — عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو!
کہا تم نے کہ "کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی؟" — بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ "ہاں کیوں ہو؟"
نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب — ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو!

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو — ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے — کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو بیمار دار (۱) — اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

(۲) شعر کیا ہے ایک سرگزشت ہے، ایک پرندہ قفس میں بند ہے اس نے باغ پر بجلی گرتی دیکھی۔ ہے وہ فکر مند ہے کہ کہیں بجلی میرے آشیانہ پر نہ گری ہو سامنے ایک اور ہم صفیر شاخ پر آبیٹھا ہے وہ جانتا ہے کہ مرغ اسیر کے آشیانہ پر بجلی گری ہے وہ یہ واقعہ بیان کرنے سے جھجکتا ہے۔ مبادا اس کی معیت دو بالا ہو جائے لیکن اسیرِ قفس اس کو صاف صاف بیان کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور کہتا ہے مجھ سے چمن کی سرگزشت کہتے نہ ڈر، باغ میں ہزاروں آشیانے ہیں کل جس آشیانے پر بجلی گری ہے یہ ضروری نہیں کہ وہ میرا ہی آشیانہ ہو۔ ان دو مصرعوں میں اتنی بڑی کہانی بیان کرنا مرزا صاحب ہی کا حصہ ہے۔

(۱) مرزا صاحب نے یہ شعر ایک مکتوب میں بنام علاءالدین احمد خاں نقل کیا ہے فرماتے ہیں:۔
مجھ کو رشک ہے جزیرہ نشینوں کے حال پر عموماً رئیس فرخ آباد پر خصوصاً کہ جہاز سے اتر کر سرزمینِ عرب میں چھوڑ دیا۔ ہا ہا ہا ہا
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو بیمار دار — اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو
یہ نواب تفضل حسین خاں کی طرف اشارہ ہے جن کی مدح سرائی میں ان کی مشہور غزل کا ایک مصرع یہ ہے۔ ع
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

از مہر تا بہ ذرّہ دل و دل ہے آئینہ　　طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ　　جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ
ناچار بیکسی کی بھی حسرت اٹھائیے　　دشواریِ رہ و ستمِ ہمرہاں نہ پوچھ

صد جلوہ رُوبرُو ہے جو مژگاں اُٹھائیے　　طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھائیے
ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق (۵)　　یعنی ہنوز منّتِ طفلاں اُٹھائیے
دیوار بارِ منّتِ مزدور سے ہے خم　　اے خانماں خراب نہ احساں اُٹھائیے
یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجیے　　یا پردۂ تبسمِ پنہاں اُٹھائیے

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے　　بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے
عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر　　آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے
دے داد اے فلک، دلِ حسرت پرست کی　　ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیے
سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لیے ہم مصوری　　تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے
مے سے غرض نشاط ہے کس رُو سیاہ کو؟　　اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

(۵) برات: وہ کاغذ یا فرمان جس کی رو سے خزانہ سے روپیہ وصول کیا جاتا ہے۔ (چیک)

۹۰ ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جُدا جُدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

پائے خُم پہ چاہیے ہنگامِ بیخودی
رُو سُوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے

یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیے

نشو و نما ہے اصل سے غالبؔ فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے؟
مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہوگا باعثِ افزایشِ دردِ دروں وہ بھی

نہ اتنا بُرّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی

مئے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

ہے دورِ قدح وجہِ پریشانیِ صہبا
یک بار لگا دو خُمِ مے میرے لبوں سے

رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہد (۱۴۳)
زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے

بیدادِ وفا دیکھ کہ جاتی رہی آخر
ہرچند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

(۱۴۳) فرماتے ہیں (طرف ہونا۔ مقابلہ کرنا) اے زاہد میکدہ کے ہوشیار رندوں کے منہ نہ لگنا ان کو وعظ و نصیحت نہ کرنا۔ یہ بڑے گستاخ اور بے ادب ہوتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تیری بے عزتی کر دیں۔ یہ وعظ و نصیحت کی تاب ہرگز نہ لائیں گے۔

تاہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا — سُن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے
غالبؔ ترا احوال سنا دیں گے ہم اُن کو (۲) وہ سُن کے بُلا لیں یہ اجارا نہیں کرتے
گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا (۳) وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

غمِ دُنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی (۴) فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی
کُھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یارب؟ (۵) قسم کھائی ہے اُس کافر نے کاغذ کے جلانے کی
لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے — ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چُھپانے کی
اُنھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا — اُٹھے تھے سیرِ گُل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

(۲) احباب میری بے چینی اور انتہائی شوقِ دیدار کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ اے غالبؔ ہم تیری بے تابی کا ذکر تیرے محبوب سے ضرور کردیں گے لیکن ہم اس کا ذمہ نہیں لیتے کہ وہ تجھے اپنے پاس ضرور بلالیں۔

پہلے مصرع میں شوقِ دیدار اور دوسرے مصرع میں محبوب کے غرور کی کیفیت ہے۔ مرزا صاحب اپنے دوستوں سے کہتے ہیں میری حالتِ زار ان کو سنادو۔ شاید رحم کھا کر وہ مجھے اپنے پاس بلالیں۔ احباب جواب دیتے ہیں کہ ہم تمہاری پریشان حالی کا ذکر تو ضرور کردیں گے لیکن وہ اتنے مغرور ہیں کہ شاید کوئی پروا نہ کریں اس لیے ہم اس کا ذمہ نہیں لیتے کہ وہ تمہیں اپنے پاس بلالیں گے۔

(۳) میرے دل کے اندر رکھا ہی کیا تھا کہ جو تیرا غمِ عشق اس کو غارت کرتا۔ ہاں ایک حسرتِ تعمیر تھی (تجھ سے ملاقات کی آرزو تھی)، وہ ابھی تک محفوظ ہے برباد نہیں ہوئی۔

(۴) دُنیا کے غم والم سے اگر سر اٹھانے کی فرصت ملتی بھی ہے تو آسمان کو دیکھ کر اس کے جور پیشہ ہونے کی وجہ سے تو یاد آجاتا ہے تیرے یاد آنے سے پھر غم والم میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ مختصر یہ کہ کسی حالت میں بھی غم سے نجات نہیں ملتی۔

(۵) قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانے کی۔

اس مصرعہ سے دو مفہوم نکلتے ہیں:

(۱) اس نے یہ قسم کھائی ہے کہ جو بھی میرا خط ہوگا اسے جلادے گا (۲) دوسرا مفہوم یہ ہے کہ بعض خط ایسی روشنائی سے لکھے جاتے ہیں کہ جب کاغذ کو آگ میں جلایا جائے تو حروف نمایاں ہو جاتے ہیں اور آسانی سے پڑھ لیے جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ محبوب نے قسم کھائی ہے کہ وہ میرے خط کو جلائے گا ہی نہیں تاکہ اس کا مضمون پڑھ کر میرے سوزِ غم سے آشنا نہ ہو جائے۔

۹۲

ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا — ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی
لکدکوبِ حوادث کا تحمّل کر نہیں سکتی — مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی
ہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں غالبؔ — بدی کی اُس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی — دل جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی
اُس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے (۵) — میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے — جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے
ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے — پرتوے آفتاب کے ذرّہ میں جان ہے
حالانکہ ہے یہ سیلیِ خارا سے لالہ رنگ — غافل کو میرے شیشہ پہ مے کا گمان ہے
کی اس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا — آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے؟
کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا؟ — بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے
بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں — فرمانروائے کشورِ ہندوستان ہے
ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا (۱۲) — کس سے کہوں کہ "داغ جگر کا نشان ہے"
ہے بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر — غالبؔ ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہربان ہے

(۵) فرماتے ہیں میں اس شمع کی مانند ہوں جسے پوری طرح جلنے سے پیشتر ہی کسی نے بجھا دیا ہو۔ اس لیے میں جلے ہوؤں میں ایک داغِ ناتمامی ہوں اس پر مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں پوری طرح جل بھی نہ سکا ایک شعر اسی مفہوم کا اور فرمایا ہے

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے — اے ناتمامیِ نفسِ شعلہ بار حیف!

(۱۲) کثرتِ غم نے میرے جگر کو بالکل مٹا دیا ہے۔ اب جگر کی جگہ صرف ایک داغ باقی ہے اگر میں کسی سے یہ کہوں کہ یہ داغ میرے جگر کا نشان ہے تو اسے کون تسلیم کرے گا گویا کثرتِ غم نے میری ہستی کے اعتبار کو بھی ختم کر دیا ہے۔

درد سے میرے، ہے تجھ کو بیقراری، ہائے ہائے (۱) کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری؟ ہائے ہائے
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری؟ ہائے ہائے
کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال؟ دشمنی اپنی تھی میری دوستداری؟ ہائے ہائے
عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا؟ عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری، ہائے ہائے
زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری، ہائے ہائے
گلفشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا؟ خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری، ہائے ہائے
شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں ختم ہے اُلفت کی تجھ پر پردہ داری، ہائے ہائے
خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی اُٹھ گئی دُنیا سے راہ و رسمِ یاری، ہائے ہائے
ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری، ہائے ہائے
کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشکال؟ ہے، نظر خو کردۂ اختر شماری، ہائے ہائے
گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال ایک دل تِس پر یہ نااُمیدواری، ہائے ہائے
عشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ ابھی وحشت کا رنگ (۱۲) رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری، ہائے ہائے

سر گشتگی میں، عالمِ ہستی سے یاس ہے تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے
لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے
کیجے بیاں سرورِ تبِ غم کہاں تلک ہر مُو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے

(۱) یہ غزل نہیں بلکہ مرثیہ ہے۔ (۱۲) ابھی میرے عشق نے وحشت کا رنگ نہ پکڑا تھا یعنی چاک دامانی اور دشت نوردی کی نوبت نہ آنے پائی تھی کہ میرا محبوب اس دنیا سے رخصت ہو گیا ہائے ہائے جنونِ عشق کا سارا جذبہ اور ذوقِ رسوائی جو کچھ دل میں تھا وہ دل ہی میں رہ گیا۔

۹۴ ہے وہ غرورِ حُسن سے، بیگانۂ وفا — ہر چند اُس کے پاس دلِ حق شناس ہے
پی جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب — اِس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے
ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ — (۳) مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے — (۴) خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے
کس کو سُناؤں حسرتِ اظہار کا گِلہ؟ — دل، فردِ جمع و خرجِ زباں ہائے لال ہے
کس پردہ میں ہے آئینہ پرداز، اے خدا — رحمت کہ عذر خواہ لبِ بے سوال ہے
ہے ہے! خدا نخواستہ وہ اور دشمنی — اے شوقِ مُنفعِل، یہ تجھے کیا خیال ہے؟
مُشکیں لباسِ کعبہ، علیؓ کے قدم سے جان — (۸) نافِ زمین ہے، نہ کہ نافِ غزال ہے
وحشت پہ میری، عرصۂ آفاق، تنگ تھا — دریا، زمین کو عرقِ انفعال ہے
ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ — عالم تمام، حلقۂ دامِ خیال ہے

(۳) اے اسدؔ ہر ایک مکان کو اپنے مکین سے شرف ہوتا ہے مجنوں کا گھر جنگل تھا جو اسی کے دم قدم سے آباد تھا اب وہ مر گیا ہے تو جنگل سونا پڑا ہے یعنی جنگل کی ساری رونق مجنوں کے مرنے سے ختم ہو گئی۔

(۴) کلام کے عام فہم نہ ہونے کی وجہ سے کہا ہے کہ لوگ میری فہم کو نہیں پہنچتے میری خامشی باعثِ مسرت ہے۔

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے — مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

(۸) مشکیں لباسِ کعبہ۔ کعبہ کا سیاہ خوشبودار غلاف۔ نافِ غزال۔ ایک خاص قسم کا ہرن جس کی ناف سے مشک نکلتا ہے اسے نافۂ غزال کہتے ہیں۔ نافِ زمین۔ زمین کا مرکز۔ حضرت علیؓ پیغمبرِ خدا کے داماد تھے اور اُن کے خلیفہ بھی۔ غالب حضرت علیؓ کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ یہ بات مشہور ہے کہ کعبہ وسطِ زمین ہے یعنی زمین کا مرکز ہے لیکن یہی بات نہیں کہ وہ نافِ غزال بھی ہے۔ حضرت علیؓ کی مہربانی سے کعبہ کے فیض کی خوشبو تمام دُنیا میں پھیل رہی ہے۔

تم اپنے شکوہ کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو — حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے
دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر — نہ گریۂ سحری ہے نہ آہِ نیم شبی ہے

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا سو بھی مٹ گیا — ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے
جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں؟ — ہم نہیں جلتے نفَس ہر چند آتش بار ہے
آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا — ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے
ہے وہی بدمستیِ ہر ذرّہ کا خود عذر خواہ — جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے
مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی" — زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے
آنکھ کی تصویر سرنامے پہ کھینچی ہے کہ تا — تجھ پہ کھل جاوے کہ اس کو حسرتِ دیدار ہے

پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے (۹) کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

مری ہستی فضائے حیرت آبادِ تمنّا ہے — جسے کہتے ہیں نالہ وہ اِسی عالم کا عنقا ہے
خزاں کیا، فصلِ گُل کہتے ہیں کس کو؟ کوئی موسم ہو — وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

(۹) مولانا مفتی صدرالدین آزردہ ایک دفعہ غالب کے مکان کے سامنے سے گزرے اس وقت ذرا عجلت میں تھے اس لیے انھوں نے غالب کے پاس ٹھہرنا نہ چاہا کہاروں سے تاکید کی کہ جلد چلو۔ کہار کاندھا بدلنے لگے مگر آزردہ صاحب نے ان کو کاندھا بھی نہ بدلنے دیا۔ غالب نے دُور سے یہ حالت دیکھ لی اور فوراً یہ شعر لکھ کر ان کے پاس بھیج دیا ؎

پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے — کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

۹۶

وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم! اثر فریادِ دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے؟
نہ لائی شوخیِ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

رحم کر ظالم کہ کیا بُودِ چراغِ کُشتہ ہے نبضِ بیمارِ وفا دودِ چراغِ کشتہ ہے
دل لگی کی آرزو بےچین رکھتی ہے ہمیں ورنہ یاں بےرونقی سُودِ چراغِ کشتہ ہے

چشمِ خُوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے سرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے
پیکرِ عُشاق سازِ طالعِ ناساز ہے نالہ گویا گردشِ سیّارہ کی آواز ہے
دستگاہِ دیدۂ خونبارِ مجنوں دیکھنا (۷) یک بیاباں جلوۂ گل فرشِ پا انداز ہے

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی میری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی؟ اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو (۱۲) آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

(۷) فرشِ پا انداز۔ وہ فرش جو دہلیز پر بچھا دیا جاتا ہے اور اکثر سرخ بانات کا ہوتا ہے۔
مجنوں کی لہو رونے والی آنکھوں کا کمال تو دیکھیے کہ نجد کا تمام بیابان فرشِ پا انداز کی طرح گلزار بن گیا ہے۔

(۱۲) ایک حدیث ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اُس نے خدا کو پہچان لیا۔ یعنی اپنی ہستی ہی سے خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔
حضرت غالب فرماتے ہیں جو کچھ حاصل ہو اپنی ہی ہستی سے ہونا چاہیے۔ اگر اپنی ہستی سے معرفت حاصل نہیں ہو سکتی تو پھر اپنی ہستی سے غفلت ہی حاصل کرنا چاہیے۔ خودی مٹی جب ملی خدائی۔ حاصلِ کلام یہ کہ دوسرے کا احسان نہیں اٹھانا چاہیے۔

۹۷

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام — دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی
ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں — نہ سہی عشق، مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف — آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خُو ڈالیں گے — بے نیازی تری عادت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ — گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے — صبحِ وطن، ہے خندۂ دنداں نما مجھے
ڈھونڈے ہے اس مُغنّیِ آتش نَفَس کو جی — جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے
مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال — تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے
کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں — آنے لگی ہے نکہتِ گُل سے حیا مجھے
کُھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ؟ — شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

اور تو رکھنے کو ہم دہر میں کیا رکھتے تھے — (۱) مگر اک شعر میں اندازِ رَسا رکھتے تھے
اُس کا یہ حال کہ کوئی نہ ادا سنج ملا — آپ لکھتے تھے ہم اور آپ اُٹھا رکھتے تھے
زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

(۱) عرشی صاحب نے اپنے غلط نامے میں اس شعر سے پہلے دو شعر بہم پہنچائے ہیں جو ان کو حال ہی میں جناب حمید الدین نظامی بدایونی کے مملوکہ مخطوطے میں ملے ہیں۔ لہٰذا یہ دو شعر شامل کر دیے ہیں اگر یہ شعر مرزا غالب کے تسلیم کیے جائیں تو مرزا غالب نے ان تین اشعار میں اپنی ساری زندگی کی تلخی پیش کر دی ہے۔ مرزا صاحب کو شدید احساس تھا کہ ان کے سرمایۂ حیات یعنی شعر و ادب کا کوئی صحیح قدر داں نہیں ملا اور کسی نے اس کی حقیقت کو نہیں پہچانا۔ لہٰذا لکھ لکھ کر جمع کرتے رہے اور اسی میں زندگی بسر کر دی قلق اگر رہا تو صرف اسی بات کا کہ ان کی جو قدر ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہوئی۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پہلے دو شعروں نے تیسرے شعر کا صحیح مفہوم سمجھنے میں پوری وضاحت کر دی ہے۔

اُس بزم میں، مجھے نہیں بنتی حیا کیے بیٹھا رہا، اگرچہ اِشارے ہُوا کیے
دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا مَیں، اور جاؤں دَر سے ترے بِن صدا کیے
رکھتا پھروں ہُوں، خرقہ و سجّادہ رہنِ مَے (۳) مُدّت ہوئی ہے، دعوتِ آب و ہَوا کیے
بے صرفہ ہی گزرتی ہے، ہو گرچہ عمرِ خضر (۴) حضرت بھی کل کہیں گے، کہ "ہم کیا کیا کیے؟"
مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ "اے لئیم! تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے؟"
کِس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عَدو؟ کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے؟
صحبت میں غیر کی، نہ پڑی ہو کہیں یہ خُو دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے
ضد کی ہے اور بات، مگر خُو بُری نہیں بھولے سے اُس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے
غالبؔ! تمہیں کہو، کہ ملے گا جواب کیا؟ مانا، کہ تم کہا کیے اور وہ سُنا کیے

رفتارِ عمر، قطعِ رہِ اضطراب ہے اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے
مینائے مَے ہے سروِ نشاطِ بہار سے بالِ تدروِ جلوۂ موجِ شراب ہے
زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا نے بھاگنے کی گوں، نہ اقامت کی تاب ہے
جادادِ بادہ نوشیِ رنداں ہے شش جہت غافل گماں کرے ہے، کہ گیتی خراب ہے

(۳) خرقہ و سجّادہ یعنی گوڈری و مصلّے، دونوں کو رہن رکھتے پھرتے ہیں۔ دوسرے موسمِ بہار بھی پیشِ نظر ہے۔ گو ناداری ہے پھر دونوں چیزوں سے ہی کام لیتے ہیں۔ خوب شوخی دکھلائی ہے۔
(۴) حضرت خضر عمرِ جاوداں رکھتے ہیں طنز کیا گیا کہ وہ بھی قیامت کے روز یہی کہیں گے کہ ہم نے کچھ نہ کیا بے صرفہ ہی عمر گزار دی عمر کے متعلق ایک اور شعر بھی کہا ہے ؎
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

٩٩

نظّارہ کیا حریف ہو اُس برقِ حسن کا! جوشِ بہار جلوے کو جس کے نِقاب ہے
میں نامراد دل کی تسلّی کو کیا کروں؟ مانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہے
گزرا اسدؔ مسرّتِ پیغامِ یار سے قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے (۴) میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے؟
ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے آبگینہ تندیِ صہبا سے، پگھلا جائے ہے
غیر کو یا رب، وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے؟ گر حیا بھی اُس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے
شوق کو یہ لَت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے
دُور چشمِ بد تری بزمِ طرب سے! واہ واہ! نغمہ ہو جاتا ہے، واں گر نالہ میرا جائے ہے
گرچہ ہے طرزِ تغافل، پردہ دارِ رازِ عشق پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے
اُس کی بزم آرائیاں سُن کر، دلِ رنجور، یاں مثلِ نقشِ مدّعائے غیر بیٹھا جائے ہے
ہو کے عاشق، وہ پری رُخ اور نازک بن گیا رنگ کھُلتا جائے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے
نقش کو اُس کے مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں! کھینچتا ہے جس قدر، اُتنا ہی کھنچتا جائے ہے
سایہ میرا مجھ سے مثلِ دُود بھاگے ہے، اسدؔ پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے؟

(۴) حضرت غالبؔ نے یہ ایک نیا مضمون باندھا ہے وہ غیروں کے بجائے اپنے آپ سے بھی رشک کر رہے ہیں۔
فرماتے ہیں کہ جب میں اپنے محبوب کو دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے آپ پر بھی رشک آجاتا ہے۔ لہذا میں اِس رشک کی وجہ سے اس کو اچھی طرح دیکھ نہیں سکتا ہوں
ایک اور شعر اسی مضمون کا ہے ؎

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے مرتے ہیں ولے اُن کی تمنّا نہیں کرتے

۱۰۰ گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے (۱) تب اماں ہجر میں دی بَردِ لیالی نے مجھے
نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے
کثرت آرائیِ وحدت ہے پرستاریِ وہم کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے
ہوسِ گُل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا عجب آرام دیا بے پروبالی نے مجھے

(۱) مرزا صاحب نے نواب کلب علی خاں کو ایک خط اس حادثہ کے سلسلہ میں لکھا تھا جو رام پور سے واپسی پر مرادآباد میں دریا پار کرتے وقت پیش آیا تھا اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک اور شعر بھی کہا تھا ان کو کیا علم کہ... الخ یہ الہامی کیفیت رکھتا ہے۔ اس کا تذکرہ ص۱۶۱ پر آئے گا۔ یہ مرزا صاحب کے خود نوشتہ خط کا عکس ہے۔

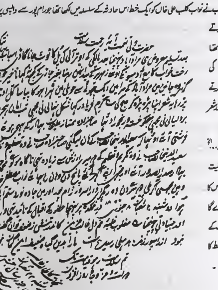

۱۰۱

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے (۱) برقِ خرمنِ راحت خونِ گرمِ دہقاں ہے
غنچہ تا شگفتن ہا برگِ عافیت معلوم! (۲) باوجودِ دلجمعی خوابِ گُل پریشاں ہے
ہم سے رنجِ بیتابی کس طرح اٹھایا جائے داغِ پشتِ دستِ عجز شعلہ خس بدنداں ہے

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالبؔ ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

سادگی پر اُس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے
دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
گرچہ ہے کس کس بُرائی سے ولے با ایں ہمہ ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے
بس ہجومِ نا امیدی خاک میں مل جائے گی یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے
رنجِ رہ کیوں کھینچیے واماندگی کو عشق ہے اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے
جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی فتنۂ شورِ قیامت کس کی آب و گِل میں ہے؟
ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

(۱) خط بنام عبدالرزاق شاکر میں یوں فرماتے ہیں: "مثل انجم انجمن وہ شخص کہ داغ جس کا سرمایہ و سامان ہو موجودیت لالہ کی منحصر بنمایشِ داغ پر ہے ورنہ رنگ تو اور پھولوں کا بھی لال ہوتا ہے۔ بعد اس کے یہ سمجھ لیجیے کہ پھول کے درخت یا غلّہ جو کچھ بویا جاتا ہے دہقان کو جوتنے بونے، پانی دینے میں مشقت کرنی پڑتی ہے اور ریاضت میں لہو گرم ہو جاتا ہے۔ مقصود شاعر کا یہ ہے کہ وجود محض رنج و عنا ہے۔ مزارع کا وہ لہو جو کشت و کار میں گرم ہوا ہے وہی لالہ کی راحت کے خرمن کا برق ہے۔ حاصل موجودیت، داغ اور داغ مخالفِ راحت اور صورتِ رنج۔"

(۲) غنچہ تا شگفتن الخ "کلی جب نئی نکلے بصورت قلب صنوبری نظر آئے اور جب تک پھول نہ بنے برگ عافیت معلوم۔ یہاں معلوم بمعنی معدوم ہے اور برگِ عافیت بمعنی مایۂ آرام۔ مصرعہ، برگِ عیشی بگورِ خویش فرست۔ برگ اور سرو برگ بمعنی ساز و سامان ہے۔ خوابِ گُل تشبیہ گُل باعتبار خموشی و برجا ماندگی، پریشانی ظاہر ہے یعنی شگفتگی وہی پھول کی پنکھڑیوں کا بکھرا ہوا ہونا۔ غنچہ بصورت دل جمع ہے۔ باوصف جمعیت دل گُل کو خوابِ پریشاں نصیب ہے۔"

ہم سے رنج بے تابی الخ پشت دست بصورت عجز اور خس بدنداں و کاہ بدنداں گرفتن بھی اظہار عجز ہے پس جس عالم میں کہ داغ نے پشت دست زمین پر رکھ دی ہو اور شعلہ نے تنکا دانتوں میں لیا ہو۔ ہم سے رنج و اضطراب کا تحمل کس طرح ہو؟ (عودِ ہندی)

۱۰۲ دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی — دونوں کو ایک ادا میں رضامند کر گئی
شق ہو گیا ہے سینہ خوشا، لذّتِ فراغ — تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں — اٹھیے بس اب کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی
اُڑتی پھرے ہے خاک مری کوے یار میں — بارے اب، اے ہوا، ہوسِ بال و پر گئی
دیکھو تو دل فریبیِ اندازِ نقشِ پا — موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی!
ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی — اب آبروے شیوۂ اہلِ نظر گئی
نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا — مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی
فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا — کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی
مارا زمانے نے، اسد اللہ خاں، تمہیں — وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی؟

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے — حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے
اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن، بعدِ قتل — میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے؟
ساقی گری کی شرم کرو آج، ورنہ ہم — ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے
تجھ سے تو کچھ کلام نہیں، لیکن، اے ندیم — (۱۳) میرا سلام کہیو، اگر نامہ بر ملے

(۱۳) قاضی عبدالجمیل جنوں کو اس شعر کی تشریح کے متعلق کیا خوب تحریر فرمایا ہے ملاحظہ ہو۔

سہ تجھ سا تو کچھ ہے بہ مضمون کہہ آغاز جاتا ہی یعنی شاعر کو ایک قاصد کے دوست
ہو سے مگر کہا کہ یہ قاصد کہیں معشوق پر عاشق نہ ہو جای ایک وقت اس عاشق کا
ایک شخص کو لایا اور اس نے عاشق سے کہا کہ یہ آدمی وضعدار اور معتمد علیہ ہے میں
ضامن ہوں کہ یہ ایسی حرکت نہ کریگا خیر اور سے ہے۔ خط بھیجا گیا قضارا عاشق کا گمان
سچ ہوا قاصد مکتوب الیہ کو دیکھ کر والہ و شیفتہ ہو گیا کیا خط کیا جواب
دیوانہ بن کر بہاڑ جنگل کو چل دیا اب عاشق اس ناقعہ کے وقوع کے بعد ندیم سے کہتا ہی کہ
غیب دان تو خدا ہے کسی کے دل میں کیا ہے کسی کو کیا خبر اے ندیم تجھ سے کچھ کلام نہیں لیکن ہاں اگر نامہ بر
کہیں ملجاے تو اوسکو میرا سلام کہیو کہ کیوں صاحب تم کیا دیکھو عاشق نہ ہونیکا کہہ گئے ہی اور انجام
کار کیا ہوا از جواب کلا طالب غالب" سے ام جون سنہ ۶۴

۱۰۳

تم کبھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا — فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے
لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں — جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے
اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا — تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

کوئی دن گر زندگانی اور ہے — (۴) اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں؟ — (۵) سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے
بارہا دیکھی ہیں، اُن کی رنجشیں — پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے
دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر — کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے
قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم — وہ بلائے آسمانی اور ہے
ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام — (۹) ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

کوئی اُمید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن مُعیّن ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد — پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

(۴) جنوں بریلوی کو اس شعر کا مطلب یوں لکھا ہے: "اس میں کوئی اشکال نہیں جو لفظ ہیں وہی معنی ہیں۔ شاعر اپنا قصد کیوں بتائے کہ میں کیا کروں گا۔ مبہم کہتا ہے کہ کچھ کروں گا خدا جانے شہر میں یا نواحِ شہر میں تکیہ بنا کر فقیر ہو کر بیٹھ رہے یا دیس چھوڑ پردیس چلا جائے۔"

(۵) نواب انوار الدولہ بہادر شفق کو لکھتے ہیں: "یہ دن مجھ پر بُرے گزرتے ہیں۔ گرمی میں میرا حال بعینہ وہ ہوتا ہے جیسا زبان سے پانی پینے والے جانوروں کا خصوصاً اس تموز میں کہ غم و ہم کا ہجوم ہے ؎ آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں

(۹) میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں: "وبا کو کیا پوچھتے ہو؟ قدر اندازِ قضا کے ترکش میں یہی ایک تیر باقی تھا۔ قتل ایسا عام۔ لوٹ ایسی سخت۔ کال ایسا بڑا۔ وبا کیوں نہ ہو؟ لسان الغیبؒ نے دس برس پہلے فرمایا ہے ؎ ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام ایک مرگِ ناگہانی اور ہے
میاں! بارہ سو ستتر (۱۲۷۷ھ) کی بات غلط نہ تھی مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی۔ بعد رفع فساد ہوا سمجھ لیا جائے گا

۱۰۴

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی!
کیوں نہ چیخوں؟ کہ یاد کرتے ہیں — میری آواز گر نہیں آتی
داغِ دل گر نظر نہیں آتا — بُو بھی اے چارہ گر نہیں آتی!
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی (۵) — موت آتی ہے پر نہیں آتی
کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ! — شرم تم کو مگر نہیں آتی!

دلِ ناداں! تجھے ہوا کیا ہے؟ — آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے؟
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں (۹) — کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے؟
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود (۱۰) ق — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟

(۵) مرزا صاحب نے لطیف بلگرامی کو لکھا ہے۔ "فخرِ ایجاد و تکوین" مولانا فضل حق ایسا دوست مرجائے۔ غالبؔ نیم مردہ نیم جان رہ جائے ع مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی الخ۔ آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی الخ اگر جوان ہوتا اور بیمار تو آپ سے دعائے خیریت چاہتا۔ اسّی برس کا بڈھا ہونے آیا ہوں۔ دعائے مغفرت کا امیدوار ہوں شراب کمبخت اب بھی چھوٹتی نہیں۔ نماز کا اب بھی عادی ہوتا نہیں "جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد" الخ "کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ الخ)

(۹) میر مہدی کو ایک خط میں لکھتے ہیں: "میر مہدی و میر سرفراز حسین مجھ سے ناخوش اور گلہ مند ہوں گے اور کہتے ہوں گے کہ دیکھو ہمیں خط نہیں لکھا۔ — میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ ماجرا کیا ہے
ماجرا یہ ہے کہ تمہارا ابھی تو کوئی خط نہیں آیا میں جس کا جواب لکھتا۔"

(۱۰) یہاں سے چند اشعار قطعہ بند ہیں: اے خدا عجب کہ ساری دنیا میں تو ہی تو ہے اور تیرے سوا کسی شے میں اور کوئی موجود یعنی پنہاں نہیں ہے تو پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ہنگامہ کیا ہے یعنی بیدیر و حرم ناقوس و اذان مجہود و تار لور کلیسا و بتخانہ اور من و تو کی بحث آرائی کیوں ہے؟

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟ نگہِ چشمِ سُرمہ سا کیا ہے؟
سبزہ وگُل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟
ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے؟
"ہاں بھلا کر، ترا بھلا ہوگا" اور درویش کی صدا کیا ہے؟
جان تم پر نثار کرتا ہوں میں نہیں جانتا دعا کیا ہے؟
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے؟

کہتے تو ہو تم سب کہ بُتِ غالیہ مُو آئے (۹) یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ "وہ آئے"
ہوں کشمکشِ نزع میں، ہاں جذبِ محبت کچھ کہہ نہ سکوں، پر وہ مرے پوچھنے کو آئے
ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے
ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین (۱۰) ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بُو آئے
جلاد سے ڈرتے ہیں، نہ واعظ سے جھگڑتے ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے
ہاں اہلِ طلب! کون سُنے طعنۂ نایافت؟ دیکھا، کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

(۹) یہ غزل مرزا صاحب نے منشی نبی بخش حقیر کو روانہ کی تھی۔ فرماتے ہیں "جب میں حضور میں حاضر ہوتا ہوں تو اکثر بادشاہ مجھ سے ریختہ طلب کرتے ہیں۔ سو وہ کہی ہوئی غزلیں تو کیا پڑھوں۔ نئی غزل کہہ کر لے جاتا ہوں۔ آج میں نے دوپہر کو ایک غزل لکھی ہے کل یا پرسوں جا کر پڑھوں گا۔ تم کو بھی لکھتا ہوں۔ داد دینا کہ اگر ریختہ پایۂ سحر یا اعجاز کو پہنچے تو اس کی یہی صورت ہوگی یا کچھ اور شکل۔

(۱۰) بادۂ دوشینہ سے مراد رات کی پی ہوئی شراب ہے۔ اہلِ اسلام کا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد قبر میں دو فرشتے نکیرین سوال جواب کے لیے آتے ہیں۔ مرزا صاحب شوخی کے انداز میں فرماتے ہیں۔

"نکیرین کے سوال وجواب سے بچنے کی یہی صورت ہے کہ مرنے سے پہلے مجھے شراب پلا دو۔ فرشتے قبر میں شراب کی بُو سے بھاگ جائیں گے اور میں سوال وجواب کی زحمت سے بچ جاؤں گا۔" کیا خوب اندازِ بیان ہے

۱۰۶

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں — اُس در پہ نہیں بار، تو کعبے ہی کو ہو آئے
کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر — اچھے رہے آپ اُس سے، مگر مجھ کو ڈبو آئے
اُس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے، غالبؔ! — ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے — سینہ جویائے زخمِ کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن — آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز — پھر وہی پردۂ عماری ہے
چشم دلّالِ جنسِ رسوائی — دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے
وہ ہی صد رنگ نالہ فرسائی — وہ ہی صد گونہ اشک باری ہے
دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر — محشرستانِ بے قراری ہے
جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے — روز بازارِ جاں سپاری ہے
پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں — پھر وہی زندگی ہماری ہے
پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز ق — گرم بازارِ فوج داری ہے
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر — زُلف کی پھر سرشتہ داری ہے
پھر دیا پارۂ جگر نے سوال — ایک فریاد و آہ و زاری ہے
پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب — اشک باری کا حکم جاری ہے
دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا — آج پھر اُس کی روبکاری ہے
بے خودی بے سبب نہیں، غالبؔ — کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی
نمک پاشِ خراشِ دل ہے لذّت زندگانی کی
کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی؟
ہوئی زنجیرِ موجِ آب کو فرصت روانی کی
پس از مُردن بھی دیوانہ زیارت گاہِ طفلاں ہے
شرارِ سنگ نے تُربت پہ میری گُلفشانی کی

نکوہش ہے سزا فریادیِ بیدادِ دلبر کی
مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی
رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے (۵)
اگر بو دے بجائے دانہ دہقاں نوک نشتر کی
پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیِ مے تھا
ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی
کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی عرض کیا قدرت
کہ طاقت اُڑ گئی اُڑنے سے پہلے میرے شہپر کی
کہاں تک روؤں اُس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے!
مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی؟

بے اعتدالیوں سے سُبک سب میں ہم ہوے
جتنے زیادہ ہو گئے، اُتنے ہی کم ہوے
پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوے
ہستی ہماری، اپنی فنا پر دلیل ہے (۱۱)
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوے

(۵) ریشگی: بمعنی خلش. مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ لیلیٰ کی فصد کھولی گئی جس کا اثر یہ ہوا کہ مجنوں کے رگِ بازو سے خون جاری ہو گیا۔ اس شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں.

(۱۱) اس شعر کے متعلق مرزا صاحب نے مجروح کو یوں لکھا ہے: "پہلے یہ سمجھو کہ قسم کیا چیز ہے. قد اس کا کتنا لمبا ہے. ہاتھ پاؤں کیسے ہیں رنگ کیسا ہے جب یہ نہ بتا سکو گے تو جانو گے کہ قسم جسم و جسمانیات میں سے نہیں یہ ایک اعتبارِ محض ہے. وجود اس کا صرف تعقل میں ہے. سیمرغ کا سا اس کا وجود ہے یعنی کہنے کو ہے دیکھنے کو نہیں. پس شاعر کہتا ہے کہ جب ہم آپ اپنی قسم ہو گئے تو گویا اس صورت میں ہمارا ہونا ہمارے نہ ہونے کی دلیل ہے."

۱۰۸

سختیِ کشانِ عشق کی، پوچھے ہے کیا خبر؟
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

تیری وفا سے کیا ہو تلافی؟ کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اللہ ری تیری تندیِ خُو جس کے بیم سے
اجزائے نالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے

اہلِ ہوس کی فتح ہے، ترکِ نبردِ عشق
جو پانو اُٹھ گئے وہی اُن کے علم ہوئے

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھنچ سکے، سو وہ یاں آکے دم ہوئے

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے، تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی
تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی

مجھے اُس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی؟
کبھی کودکی میں جس نے نہ سُنی مری کہانی

یوں ہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب، ورنہ کہتا
کہ مرے عدو کو، یارب، ملے میری زندگانی

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے (۱)

نے مژدۂ وِصال، نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

مَے نے کیا ہے حُسنِ خود آرا کو بے حجاب
اے شوق! ہاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے

(۱) مرزا صاحب نے شاگرد کو اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے" یہ خبر ہے۔ پہلا مصرع "ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے" یہ مبتدا ہے۔ شبِ غم کا جوش یعنی اندھیرا اندھیرا۔ ظلمت سحر ناپید اگو یا خلق ہی نہیں ہوئی۔ ہاں ایک "دلیل صبح کی بود پر ہے یعنی بجھی ہوئی شمع۔ اس راہ سے کہ شمع و چراغ صبح کو بجھا یا کرتے ہیں۔ لطف اس مضمون کا یہ ہے کہ جس شے کو دلیلِ صبح ٹھہرایا ہے وہ خود ایک سبب ہے منجملہ اسباب تاریکی کے۔ پس دیکھا چاہیے۔ جس گھر میں علامت صبح مؤید ظلمت ہو گی وہ گھر کتنا تاریک ہو گا۔"

گوہر کو عقدِ گردنِ خُوباں میں دیکھنا — کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے
دیدار بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہ مست — بزمِ خیال، میکدۂ بے خروش ہے
اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل! ق — زنہار! اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
ساقی، بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی — مُطرب، بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط — دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
لُطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ — یہ جنّتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں — نے وہ سرور و سُور نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی — اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے
آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں (۱۰) — غالب! صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے — طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے
دیتے ہیں جنّت حیاتِ دہر کے بدلے — نشّہ، بہ اندازۂ خمار نہیں ہے
گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو — ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے
ہم سے عبث ہے گمانِ رنجشِ خاطر — خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے
دل سے اُٹھا لطفِ جلوہ ہائے معانی — غیرِ گُل، آئینۂ بہار نہیں ہے
قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے — وائے! اگر عہد استوار نہیں ہے
تو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے غالب؟ — تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

(۱۰) نوائے سروش: فرشتے کی آواز، فرماتے ہیں: میرے خیال میں جو اچھے اور بلند مضامین آتے ہیں وہ غیب کی طرف سے آتے ہیں اور میرے قلم سے لکھتے وقت جو آواز پیدا ہوتی ہے وہ قلم کی نہیں بلکہ فرشتہ غیبی کی آواز ہوتی ہے ورنہ انسان کو ایسے دقیق اور بلند مضامین نہیں سوجھ سکتے اگر غیبی مدد نہ ہو

۱۱۰

ہجومِ غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے — کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے
رفوئے زخم سے مطلب، ہے لذّت زخمِ سوزن کی — سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے
وہ گُل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالبؔ — چٹکنا غنچۂ گُل کا، صدائے خندۂ دل ہے

پا بہ دامن ہو رہا ہوں، بس کہ میں صحرا نورد — خارِ پا ہیں جوہرِ آئینۂ زانو مجھے
دیکھنا حالت مرے دل کی، ہم آغوشی کے وقت — ہے نگاہِ آشنا، تیرا سرِ ہر مُو، مجھے
ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت، کچھ نہ پوچھ — ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تُو مجھے

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے — جاں، کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے
سائے کی طرح ساتھ پھریں، سرو و صنوبر — تُو اِس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے
تب نازِ گراں مایگیِ اشک بجا ہے — جب لختِ جگر، دیدۂ خونبار میں آوے
دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر! — کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے
اُس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے، اشارہ — طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے
کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب — اِک آبلہ پا وادیِ پُر خار میں آوے
مرجاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تنِ نازک — آغوشِ خمِ حلقۂ زُنّار میں آوے
غارت گرِ ناموس نہ ہو، گر ہوسِ زر — کیوں شاہدِ گُل باغ سے بازار میں آوے؟
تب چاکِ گریباں کا مزہ ہے، دلِ ناداں — جب اک نَفَس اُلجھا ہوا ہر تار میں آوے
آتش کدہ ہے سینہ مرا، رازِ نہاں سے — اے وائے! اگر معرضِ اظہار میں آوے
گنجینۂ معنی کا طلسم اُس کو سمجھیے — جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

111

حُسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے
اُس سے میرا مہِ خُورشید جمال اچھا ہے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ "مفت آئے تو مال اچھا ہے"

اور بازار سے لے آئے، اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

بے طلب دیں، تو مزا اُس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خُوئے سوال اچھا ہے

اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے رونق منہ پر
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

دیکھیے پاتے ہیں عشّاق بُتوں سے کیا فیض!
اک برہمن نے کہا ہے کہ "یہ سال اچھا ہے"

ہم سخن، تیشے نے فرہاد کو، شیریں سے کیا
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

خضرِ سلطاں کو رکھے، خالقِ اکبر سر سبز
شاہ کے باغ میں، یہ تازہ نہال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ! یہ خیال اچھا ہے

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلّی، نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

خار خارِ المِ حسرتِ دیدار تو ہے
شوق، گلچینِ گلستانِ تسلّی نہ سہی

مے پرستاں خُمِ مے منہ سے لگائے ہی بنے
ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی، نہ سہی

نفَسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا (۱۴۰)
گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ، نہ سہی

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

نہ ستائش کی تمنا نہ صِلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی، نہ سہی

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالبؔ! اگر عمرِ طبیعی، نہ سہی

(۱۴۰) لیلیٰ کا رنگ سیاہ تھا اور وہ سیاہ خیمہ میں رہا کرتی تھی۔ اس لیے لیلیٰ کے گھر کو سیاہ خانہ کہا ہے۔ فرماتے ہیں قیس کی روح صحرا کے لیے تو چشم و چراغ ہے اگر وہ سیاہ خانۂ لیلیٰ یعنی لیلیٰ کے سیاہ خیمے کی شمع نہیں تو نہ سہی۔

عجب نشاط سے جلّاد کے، چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سایے سے سر، پانْو سے ہے دو قدم آگے

قضا نے تھا مجھے چاہا، خرابِ بادۂ اُلفت
فقط "خراب" لکھا، بس نہ چل سکا قلم آگے

غمِ زمانہ نے جھاڑی، نشاطِ عشق کی مستی
وگرنہ ہم بھی اُٹھاتے تھے لذّتِ الم آگے

خدا کے واسطے، داد اِس جنونِ شوق کی دینا
کہ اُس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں، ہم نے
تمھارے آئیو، اے طرّہ ہائے خم بہ خم آگے

دل و جگر میں پَر افشاں، جو ایک موجۂ خوں ہے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوے تھے اِس کو دم آگے

قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں، غالبؔ!
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

شکوے کے نام سے، بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ، کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہے

پُر ہوں میں شکوے سے یوں، راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے، پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

گو سمجھتا نہیں، پر حُسنِ تلافی دیکھو
شکوۂ جور سے، سرگرمِ جفا ہوتا ہے

عشق کی راہ میں، ہے چرخِ مکوکب کی وہ چال
سُست رَو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم
آپ اُٹھا لاتے ہیں، اگر تیر خطا ہوتا ہے

خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے

نالہ جاتا تھا، پرے عرش سے میرا، اور اب
لب تک آتا ہے، جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

(ق)

خامہ میرا، کہ وہ ہے باربَدِ بزمِ سخن (۱۵)
شاہ کی مدح میں، یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

اے شہنشاہِ کواکب سپہ، مہر عَلَم
تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے؟

(۱۵) باربد خسرو پرویز کے دربار کا ایک مشہور موسیقار تھا، میرا قلم بادشاہ کی مدح میں باربد کی طرح نغمہ سرائی کرتا ہے۔

سات اِقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے — تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے
ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال — آستاں پر ترے مَہ ناصیہ سا ہوتا ہے
میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں — یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے
رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں مُعاف — آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

(۵) ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تو کیا ہے؟" — تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟
نہ شعلے میں یہ کرشمہ، نہ برق میں یہ ادا — کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تُند خُو کیا ہے؟
یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے — وگرنہ خوفِ بد آموزیِ عدو کیا ہے؟
چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن — ہمارے جیب کو اب حاجتِ رَفو کیا ہے؟
جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا — کُریدتے ہو جو اَب راکھ، جستجو کیا ہے؟
رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل — جب آنکھ سے ہی نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے؟
وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز — سوائے بادۂ گلفام مُشکبُو کیا ہے؟
پیوں شراب اگر خُم بھی دیکھ لوں دو چار — یہ شیشہ و قدح و کُوزہ و سَبُو کیا ہے؟
رہی نہ طاقتِ گفتار، اور اگر ہو بھی — تو کس اُمید پہ کہیے، کہ آرزو کیا ہے؟
ہوا ہے شہ کا مُصاحب، پھرے ہے اِتراتا — وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے؟

۵۔ یہ غزل مہرؔ نے مرزا صاحب سے مانگی انہوں نے غزل بھیج کر مہرؔ کو لکھا "اگر ہم فقیر سچے ہیں اور اس غزل کے طالب کا ذوق سچا ہے تو یہ غزل اس خط سے پہلے پہنچ گئی ہوگی۔ نیز یہ غزل شیو نرائن آرام کو بھیج کر فرمایا۔

"یہ تمہارا اقبال ہے کہ نو شعر یاد آ گئے۔ ایک غزل یہ اور دو غزلیں وہ جو آیا چاہتی ہیں تین ہفتہ کا گودام تمہارے پاس فراہم ہو گیا!" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ منشی شیو نرائن اپنے ہفتہ وار اخبار میں مرزا صاحب کا کلام شائع کرتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک دن حضرت ذوق پالکی میں جا رہے تھے کہ غالب کی نظر ان پر پڑ گئی۔ چونکہ دونوں میں ہمعصرانہ چشمک تھی۔ لہٰذا مرزا نے فی البدیہہ یہ مصرعہ پڑھا۔ ذوق نے سن لیا اور بادشاہ ظفر سے شکایت کی۔ غالب جب دربار میں گئے، بادشاہ نے پوچھا کہ آج آپ نے کونسی غزل کہی ہے۔ مرزا صاحب نے یہ پوری غزل سنا دی اور مقطع کا یہ مصرع بدل دیا "ہوا ہے شہ کا مصاحب . . . ."

۱۱۴

مَیں اُنہیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں — چل نکلتے جو مے پیے ہوتے
قہر ہو یا بلا ہو، جو کچھ ہو — کاش کے تم مرے لیے ہوتے
میری قسمت میں غم گر اتنا تھا — دل بھی یارب کئی دیے ہوتے
آ ہی جاتا وہ راہ پر غالب! — کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے — ہم رہیں یُوں تشنہ لب پیغام کے
خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ — ہتکھنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے
خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو — ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے
رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم — دھوئے دھبّے جامۂ احرام کے
دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر — یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے
شاہ کے ہے غسلِ صحت کی خبر — دیکھیے کب دن پھریں حمّام کے
عشق نے غالب نکمّا کر دیا (۱) — ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

(۱) مرزا تفتہ کو لکھا ہے: "بھائی مجھ میں اب کچھ باقی نہیں ہے۔ برسات کی مصیبت گزر گئی لیکن بڑھاپے کی شدت بڑھ گئی۔ تمام دن پڑا رہتا ہوں۔ بیٹھ نہیں سکتا، ضعف نے غالب نکمّا کر دیا"

اسی طرح دہلی سوسائٹی کے ایک جلسے میں اپنا ایک مضمون پڑھا فرماتے ہیں: "بوڑھا ہوں، ناتواں ہوں، سچ اگر پوچھیے تو نیم جان ہوں۔" "ضعف نے غالب نکما کر دیا۔" ریاض الدین امجد نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "میں نے یہ شعر ان کے سامنے پڑھا "عشق نے غالب نکما کر دیا" تو فرمایا "بھائی، چپ رہو۔ یوں کہو "ضعف نے غالب نکما کر دیا" یا "دہر نے غالب نکما کر دیا"۔ عشق کیسا عاشقی کا وہ زمانہ نہ رہا۔"

مولوی احمد حسن قنوجی کو لکھا: "یہ درویش گوشہ نشین تمہارا دوست اور تمہارا دعا گو ہے۔ عشق نے غالب ... پینسٹھ برس کی عمر ہوئی۔ اضمحلالِ قویٰ، ضعفِ دماغ، فکرِ مرگ، غمِ عقبیٰ جو مجھے آپ دیکھ گئے ہیں۔ میں اب وہ نہیں ہوں۔"

۱۱۵

پھر اِس انداز سے بہار آئی — کہ ہوے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک! — اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر — رُوکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی — بن گیا رُوے آب پر کائی
سبزہ و گُل کے دیکھنے کے لیے — چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہَوا میں شراب کی تاثیر — بادہ نوشی ہے، بادپیمائی
کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی، غالب — شاہِ دیندار نے شفا پائی

تغافل دوست ہوں، میرا دماغِ عجز عالی ہے — اگر پہلو تہی کیجے تو جا میری بھی خالی ہے
رہا آباد عالم، اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے — بھرے ہیں جس قدر جام و سبُو میخانہ خالی ہے

کب وہ سُنتا ہے کہانی میری — اور پھر وہ بھی زبانی میری
خلشِ غمزۂ خونریز نہ پوچھ — دیکھ خونابہ فشانی میری
کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار؟ — مگر آشفتہ بیانی میری

ہوں زِخود رفتۂ بیدای خیال — بھول جانا ہے نشانی میری
متقابل ہے مقابل میرا (۱۴۴) — رُک گیا دیکھ روانی میری
قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں — سخت ارزاں ہے گرانی میری

(۱۴۴) عبدالرزاق شاکر کے ایک خط میں تشریح کی ہے: "تقابل و تضاد کو کون نہ جانے گا۔ نور و ظلمت، شادی و غم راحت و رنج، وجود و عدم۔ لفظ مقابل اس مصرع میں بمعنی مرجع ہے جیسے حریف کہ بمعنی دوست بھی مستعمل ہے مفہوم شعر یہ کہ ہم اور دوست از روے خوے و عادت ضد ہمد گر ہیں وہ میری طبع کی روانی کو دیکھ کر رک گیا۔"

۱۱۶

گردِ بادِ رہِ بے تابی ہوں — صرصرِ شوق، ہے بانی میری
دہَن اُس کا جو نہ معلوم ہوا — کُھل گئی ہیچمدانی میری
کر دیا ضعف نے عاجز غالبؔ — ننگِ پیری ہے، جوانی میری

نقشِ نازِ بُتِ طنّاز بہ آغوشِ رقیب — پائے طاؤس، پئے خامۂ مانی مانگے
تو وہ بدخو کہ تحیّر کو تماشا جانے — غم وہ افسانہ، کہ آشفتہ بیانی مانگے
وہ تبِ عشق تمنّا ہے کہ پھر صورتِ شمع — شعلہ، تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

گُلشن کو تری صحبت، ازبسکہ خوش آئی ہے — ہر غنچے کا گُل ہونا، آغوش کشائی ہے
واں کُنگرِ استغنا، ہر دم ہے بلندی پر — یاں نالہ کو اور اُلٹا، دعوائے رسائی ہے
ازبسکہ سکھاتا ہے غم، ضبط کے اندازے — جو داغ نظر آیا اک چشم نمائی ہے

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی — لکھ دیجیو، یا رب! اُسے قسمت میں عدو کی
اچھا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصوّر (۱) — دل میں نظر آتی تو ہے اک بُوند لہو کی
کیوں ڈرتے ہو عشّاق کی بے حوصلگی سے؟ — یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی
دشنے نے کبھی مُنہ نہ لگایا ہو جگر کو — خنجر نے کبھی بات نہ پُوچھی ہو گلو کی
صد حیف! وہ ناکام کہ اک عُمر سے، غالبؔ — حسرت میں رہے ایک بُتِ عربدہ جو کی

(۱) آنکھوں سے روتے روتے تمام خون خشک ہو گیا۔ دوست کے سرانگشت کی سرخی کو لہو تصور کیا یعنی دل میں ایک بوند لہو کی نظر تو آتی ہے۔ انگلی کے پور کو لہو کی بوند سے جو تشبیہ دی ہے وہ نہایت بلیغ و بدیع ہے۔

۱۱۷

سیماب پُشت گرمیِ آئینہ دے ہے، ہم — حیراں کیے ہوئے ہیں، دلِ بے قرار کے
آغوشِ گُل، کشودہ برائے وداع ہے — اے عندلیب! چل کہ چلے دن بہار کے

ہے وصل ہجر، عالمِ تمکین و ضبط میں — معشوقِ شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیے
اُس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو، ہاں — شوقِ فضول و جُراَتِ رندانہ چاہیے

چاہیے اچھوں کو، جتنا چاہیے — یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے
صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر — جائے مے، اپنے کو کھینچا چاہیے
چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل؟ — بارے اب اِس سے بھی سمجھا چاہیے
چاک مت کر جیب، بے ایامِ گُل — کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیے
دوستی کا پردہ ہے، بیگانگی — مُنہ چُھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے
دشمنی نے میری کھویا غیر کو — کِس قدر دشمن ہے، دیکھا چاہیے
اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی — یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے
منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید (۱۲) — نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیے
غافل، اِن مہ طلعتوں کے واسطے — چاہنے والا بھی اچھا چاہیے
چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ — آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

(۱۲) مرزا صاحب نے منشی نبی بخش حقیر کو ۱۰ر جنوری ۱۸۵۰ء کے خط میں لکھا "کیا کروں؟ مفت غم زدہ اور ملول رہتا ہوں۔ مجھ کو اب اس شہر کی اقامت ناگوار ہے اور موانع و عوائق ایسے فراہم ہوئے ہیں کہ نکل نہیں سکتا۔ خلاصہ میرے رنج والم کا یہ ہے کہ میں صرف مرنے کی توقع پر جیتا ہوں ؂

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید — نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے

یہ شعر یوسف مرزا کو بھی ایک خط میں لکھا ہے۔ علاوہ ازیں چودھری عبدالغفور کے خط میں صاحب عالم مارہروی کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے "حضرت سچ تو یوں ہے کہ غم ہائے روزگار نے مجھ کو گھیر لیا ہے۔ سانس نہیں لے سکتا۔ اتنا تنگ کر دیا ہے۔ ہر بات سو طرح سے خیال میں آئی پر دل نے کسی طرح تسلی نہ پائی۔ اب دو باتیں سوچتا ہوں ایک تو یہ کہ جب تک جیتا ہوں یوں ہی رویا کروں گا، دوسری یہ کہ آخر ایک نہ ایک دن مر رہوں گا۔ یہ صغریٰ و کبریٰ دلنشین ہے نتیجہ اس کا تسکین ہے، ہیہات۔ ؂ منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید ٭ نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے

ہر قدم دُوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے — میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے
درسِ عنوانِ تماشا، بہ تغافل خوشتر — ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے
وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں — صورتِ دُود، رہا سایہ گریزاں مجھ سے
غمِ عشّاق نہ ہو، سادگی آموزِ بتاں — کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے
اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں — صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے
بے خودی بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو! — پُر ہے سایے کی طرح میرا شبستاں مجھ سے
شوقِ دیدار میں گر تُو مجھے گردن مارے — ہو نگہ، مثلِ گُلِ شمع، پریشاں مجھ سے
بے کسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت، ہے ہے! — سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے
گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے — آئینہ داریِ یک دیدۂ حیراں مجھ سے
نگہِ گرم سے ایک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ — ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سُنائے نہ بنے (۱) — کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے!
مَیں بُلاتا تو ہوں اس کو، مگر اے جذبۂ دل! — اُس پہ بَن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
کھیل سمجھا ہے، کہیں چھوڑ نہ دے، بھول نہ جائے — کاش! یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے
غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو، کہ اگر — کوئی پوچھے کہ "یہ کیا ہے؟" تو چھپائے نہ بنے
اس نزاکت کا بُرا ہو، وہ بھلے ہیں تو کیا! — ہاتھ آویں تو اُنہیں ہاتھ لگائے نہ بنے

(۱) وہ شوخ اس قدر نکتہ چیں ہے کہ غمِ دل اس کو سُنایا ہی نہیں جا سکتا کیونکہ وہ بات بات میں لفظ لفظ پر گرفت کرے گا اور کسی صورت بات بنتی نظر نہیں آئے گی۔

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے؟ پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے
موت کی راہ نہ دیکھوں؟ کہ بن آئے نہ رہے (۲) تم کو چاہوں؟ کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے
بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے
عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش، غالبؔ کہ لگائے نہ لگے اور بُجھائے نہ بنے

چاک کی خواہش، اگر وحشت، بہ عریانی کرے صبح کی مانندِ زخمِ دل گریبانی کرے
جلوے کا تیرے وہ عالم ہے کہ گر کیجے خیال دیدۂ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے
ہے شکستن سے بھی دل نومید، یارب! کب تلک آبگینہ، کوہ پر عرضِ گراں جانی کرے؟
میکدہ گر چشمِ مستِ ناز سے پاوے شکست مُوئے شیشہ، دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے
خطِ عارض سے لکھا ہے زُلف کو اُلفت نے عہد یک قلم منظور ہے، جو کچھ پریشانی کرے

(۲) اس شعر کی تشریح مرزا صاحب نے منشی نبی بخش حقیر کو اس طرح لکھی ہے: "بھائی مجھ کو تم سے بڑا تعجب ہے کہ اس بیت کے معنی میں تم کو تامل رہا۔ اس میں دو استفہام آپڑے ہیں کہ وہ بطریقِ طعن و تعریضِ معشوق سے کہے گئے ہیں۔ موت کی راہ نہ دیکھوں کیوں نہ دیکھوں؟ میں تو دیکھوں ہی گا کہ بن آئے نہ رہے کیونکہ موت کی شان میں سے یہ بات ہے۔ ایک دن آئے ہی گی انتظار ضائع نہ جائے گا۔ تم کو چاہوں؟ کیا خوب، کیوں چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے۔ یعنی اگر تم آپ سے آئے تو آئے اور اگر نہ آئے تو پھر کیا مجال کہ کوئی تم کو بلا سکے گویا یہ عاجز معشوق سے کہتا ہے کہ اب میں تم کو چھوڑ کر اپنی موت کا عاشق ہوا ہوں۔ اس میں خوبی یہ ہے کہ بن بلائے بغیر آئے نہیں رہتی تم کو کیوں چاہوں کہ اگر نہ آؤ تو تم کو بلا نہ سکوں"۔
یہ غزل مرزا صاحب نے منشی نبی بخش حقیر کو اس غزل کے ساتھ جس کا مطلع ہے
کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مُو آئے اِک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی "کہ وہ آئے"
ارسال کی تھی۔

۱۲۰ وہ آ کے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے ۔۔۔ ولے مجھے تپشِ دل، مجالِ خواب تو دے
کرے ہے قتل، لگاوٹ میں تیرا رو دینا (۲) ۔۔۔ تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے
دِکھا کے جنبشِ لب ہی، تمام کر ہم کو ۔۔۔ نہ دے جو بوسہ، تو منہ سے کہیں جواب تو دے
پلا دے اوک سے، ساقی! جو ہم سے نفرت ہے ۔۔۔ پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے، شراب تو دے
اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پانو پھول گئے (۵) ۔۔۔ کہا جو اُس نے "ذرا میرے پانو داب تو دے"

تپش سے میری، وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے (۶) ۔۔۔ مرا سر رنجِ بالیں ہے، مرا تن بارِ بستر ہے
سرشکِ سر بہ صحرا دادہ، نورُ العینِ دامن ہے ۔۔۔ دلِ بے دست و پا اُفتادہ، برخوردارِ بستر ہے
خوشا اقبالِ رنجوری! عیادت کو تم آئے ہو ۔۔۔ فُروغِ شمعِ بالیں، طالعِ بیدارِ بستر ہے
بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی ۔۔۔ شُعاعِ آفتابِ صبحِ محشر، تارِ بستر ہے
ابھی آتی ہے بُو، بالش سے، اُسکی زُلفِ مشکیں کی ۔۔۔ ہماری دید کو، خوابِ زُلیخا عارِ بستر ہے
کہوں کیا، دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں، غالبؔ ۔۔۔ کہ بے تابی سے، ہر یک تارِ بستر خارِ بستر ہے

(۲) اس غزل کے بارے میں مرزا علاء الدین کو بڑے قلق کے ساتھ لکھا "پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش خان مرحوم نے ایک زمین نئی نکالی میں نے حسب الحکم غزل لکھی بیت الغزل یہ پلا دے اوک سے ساقی .... الخ ۔ مقطع اسد خوشی ... الخ" اب میں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس مقطع اور اس بیت الغزل کو شامل ان اشعار کے کر کے غزل بنالی ہے اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں ۔ مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی الو کے .... جب شاعر کی زندگی میں گانے والے شاعر کے کلام کو مسخ کر دیں تو کیا بعید ہے کہ دو شاعر متوفی کے کلام میں مطربوں نے خلط کر دیا ہو؟"

(۵) مقطع کے متعلق ایک لطیفہ بھی ہو سکتا ہے " مرزا صاحب ایک مرتبہ پلنگ پر پڑے ہوئے کراہ رہے تھے ۔ میر مہدی پاؤں دابنے لگے ۔ مرزا نے کہا بھئی تو سید زادہ ہے ۔ مجھے کیوں گناہ گار کرتا ہے ۔ انہوں نے نہ مانا اور کہا "آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پیر دابنے کی اجرت دے دیجیے ۔" مرزا نے کہا "ہاں اس کا مضائقہ نہیں" جب وہ پیر داب چکے تو اجرت طلب کی ۔ مرزا نے کہا "بھتیا کیسی اجرت تم نے میرے پانو دابے میں نے تمہارے پیسے دابے ۔"

(۶) میں اس قدر تڑپا ہوں کہ تارِ بستر خارِ بستر ہے گویا بستر کانٹوں کا فرش بنا ہوا ہے ۔ بے قراری میں آسائش و آرام بھی کانٹے بن کر کھٹکتے ہیں ۔

خطر ہے، رشتۂ اُلفت رگِ گردن نہ ہو جاوے غرورِ دوستی آفت ہے، تُو دشمن نہ ہو جاوے ١٢١
سمجھ اس فصل میں کوتاہیِ نَشو و نما غالبؔ اگر گل، سرو کے قامت پہ پیراہن نہ ہو جاوے

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے نالہ، پابندِ نَے نہیں ہے
کیوں بوتے ہیں باغبان تُونبے؟ گر باغ گدائے مَے نہیں ہے
ہر چند ہر ایک شَے میں تُو ہے پر تجھ سی کوئی شَے نہیں ہے
ہاں، کھائیو مت فریبِ ہستی! ہر چند کہیں کہ "ہے" نہیں ہے
شادی سے گزر، کہ غم نہ ہووے اُردی جو نہ ہو تو دَے نہیں ہے
کیوں رَدِّ قدح کرے ہے زاہد؟ مَے ہے یہ مگس کی قَے نہیں ہے
ہستی ہے، نہ کچھ عدم ہے غالبؔ آخر تُو کیا ہے، اَے "نہیں" ہے

نہ پُوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا کہ اُس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے
بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی وہ اک نگہ، کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے مرتے ہیں، وَلے اُن کی تمنا نہیں کرتے
در پردہ اُنہیں غیر سے ہے ربطِ نہانی ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے
یہ باعثِ نومیدیِ اربابِ ہوس ہے غالبؔ کو بُرا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے
کبھی تو اس سرِ شوریدہ کی بھی داد ملے کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے
بجا ہے گر نہ سُنے، نالہائے بلبلِ زار کہ گوشِ گُل، نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے
اسدؔ ہے نزع میں، چل، بیوفا، برائے خدا! مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے

۱۲۲
کیوں نہ ہو چشمِ بُتاں محوِ تغافل، کیوں نہ ہو؟ — یعنی اُس بیمار کو نظارے سے پرہیز ہے
مرتے مرتے، دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی — وائے ناکامی! کہ اُس کافر کا خنجر تیز ہے
عارضِ گُل دیکھ، رُوئے یار یاد آیا، اسدؔ — جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

دیا ہے دل اگر اُس کو، بشر ہے، کیا کہیے؟ (۲۴) — ہوا رقیب، تو ہو، نامہ بر ہے، کیا کہیے؟
یہ ضد، کہ آج نہ آوے اور آئے بِن نہ رہے — قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے، کیا کہیے؟
رہے ہے یوں گہ و بے گہ، کہ کوئے دوست کو اب — اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے، کیا کہیے؟
زہے کرشمہ، کہ یُوں دے رکھا ہے ہم کو فریب — کہ بن کہے ہی اُنھیں سب خبر ہے، کیا کہیے؟
سمجھ کے کرتے ہیں، بازار میں وہ پرسشِ حال — کہ یہ کہے، کہ "سرِ رہگذر ہے، کیا کہیے"؟
تُمھیں نہیں ہے سرِ رشتۂ وفا کا خیال — ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے، مگر ہے کیا؟ کہیے!
اُنھیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے، کیوں لڑیئے؟ — ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے، کیا کہیے؟
حسد سزائے کمالِ سخن ہے، کیا کیجے؟ — ستم، بہائے متاعِ ہنر ہے، کیا کہیے؟
کہا ہے کس نے کہ غالبؔ بُرا نہیں؟ لیکن — سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے، کیا کہیے؟

۲۴، مرزا صاحب نے منشی نبی بخش حقیرؔ کو لکھا کہ بھائی یہاں بادشاہ نے قلعہ میں مشاعرہ مقرر کیا ہے۔ ہر مہینے میں دو بار مشاعرہ ہوتا ہے، پندرھویں کو اور انتیسویں کو حضور فارسی کا ایک مصرع اور ریختے کا ایک مصرع طرح کرتے ہیں۔ اب کے جمادی الثانی کی تیسویں کو جو مشاعرہ ہوا اس میں مصرع فارسی یہ تھا ؎ زیں تماشا گاہ گریاں می رود
ریختے کا مصرع یہ تھا ؎ "خمارِ عشق ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے" نظر ہے کیا کہیے۔ خبر ہے کیا کہیے۔
میں نے ایک غزل فارسی اور ایک ریختہ موافق طرح کے اور دوسرا ریختہ اسی طرح میں سے ایک اور صورت نکال کر لکھا۔ وہ تینوں غزلیں تم کو لکھتا ہوں پڑھ لینا اور میاں تفتہ کو بھی دکھا لینا۔"
یہ غزل اور غزلوں کے ساتھ صفحہ ۱۲۶ - ۲۷ راپریل ۱۸۵۳ء دہلی اردو اخبار میں بھی چھپ چکی ہے۔

دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے
کر گئی وابستۂ تن میری عُریانی، مجھے

بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں
مَرحَبا میں، کیا مبارک ہے گراں جانی مجھے

کیوں نہ ہو بے التفاتی، اُس کی خاطر جمع ہے
جانتا ہے محوِ پرسش ہائے پنہانی مجھے

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

بدگماں ہوتا ہے وہ کافر، نہ ہوتا، کاشکے!
اس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بُستانی مجھے

وائے! واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا
لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی، مجھے

وعدہ آنے کا وفا کیجے، یہ کیا انداز ہے؟
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

ہاں! نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری، واہ واہ!
پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزل خوانی، مجھے

دی مرے بھائی کو حق نے ازسرِ نو زندگی (۹)
میرزا یُوسف ہے، غالبؔ! یُوسفِ ثانی مجھے

یاد ہے شادی میں بھی، ہنگامۂ "یارب"، مجھے
سُبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیرِ لب، مجھے

ہے کُشادِ خاطرِ وابستہ، در رہنِ سخن
تھا طلسمِ قُفلِ ابجد، خانۂ مکتب، مجھے

یارب! اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیے؟
رشکِ آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت کیا کروں؟
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

دل لگا کر آپ بھی غالبؔ مجھی سے ہو گئے
عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

(۹) مرزا یوسف علی خاں غالبؔ کے حقیقی بھائی تھے۔ تیس برس تک دیوانے رہے غالب کو ان سے بہت محبت تھی۔ جب وہ صحت یاب ہوئے تو مرزا صاحب نے اس غزل کے مقطع میں از راہِ محبت اپنی مسرت کا اظہار فرمایا۔ مرزا یوسف نے دوبارہ زندگی پائی تھی اس لیے غالبؔ نے اپنے بھائی کو یوسفِ ثانی کہا۔

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے — چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے
قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے — جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے
کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر (۳) — ابھی اُس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے
نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی؟ — اُسے یُوسف کی بُوئے پیرہن کی آزمائش ہے
وہ آیا بزم میں، دیکھو، نہ کہیو پھر کہ "غافل تھے" — شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے
رہے دل ہی میں تیر، اچھا، جگر کے پار ہو، بہتر — غرض شستِ بُتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے
نہیں کچھ سُبحہ و زُنّار کے پھندے میں گیرائی — وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے
پڑا رہ، اے دلِ وابستہ! بیتابی سے کیا حاصل؟ — مگر پھر تابِ زلفِ پُرشکن کی آزمائش ہے؟
رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم، تب دیکھیے کیا ہو! — ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے
وہ آئیں گے مرے گھر، وعدہ کیسا، دیکھنا، غالبؔ — نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمائش ہے

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں، گر آجائے ہے مُجھ سے — جفائیں کر کے اپنی یاد، شرما جائے ہے مُجھ سے
خدایا! جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے؟ — کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مُجھ سے
وہ بدخُو اور میری داستانِ عشق طُولانی — عبارت مختصر، قاصد بھی گھبرا جائے ہے مُجھ سے
اُدھر وہ بدگمانی ہے، اِدھر یہ ناتوانی ہے — نہ پوچھا جائے ہے اُس سے، نہ بولا جائے ہے مُجھ سے
سنبھلنے دے مجھے، اے ناامیدی! کیا قیامت ہے — کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مُجھ سے

(۳) فرماتے ہیں۔ ابھی تو لوگ بے چارے فرہاد کی طاقتِ جسمانی کا امتحان لے رہے ہیں یعنی اس سے پہاڑ کاٹ کر "جوئے شیر" لانے کی آزمائش کر رہے ہیں۔ ایک دن یہی لوگ فرہاد کے حوصلے کا بھی امتحان لیں گے کہ یہ کہاں تک رنج و الم برداشت کر سکتا ہے۔

۱۲۵

تکلف برطرف، نظارگی میں بھی سہی لیکن (۱) وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مُجھ سے
ہوئے ہیں پانو ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے
قیامت ہے، کہ ہووے مدعی کا ہم سفر، غالب وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

زبسکہ مشقِ تماشا، جنوں علامت ہے گشاد و بستِ مژہ، سیلیِ ندامت ہے
نہ جانوں کیوں کہ مٹے داغِ طعنِ بدعہدی تجھے کہ آئینہ بھی وَرطۂ ملامت ہے
بہ پیچ و تابِ ہوس، سلکِ عافیت مت توڑ نگاہِ عجز، سرِ رشتۂ سلامت ہے
وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد جنونِ ساختہ و فصلِ گُل، قیامت ہے

لاغر اتنا ہوں، کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے (۸) میرا ذمہ، دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے
کیا تعجب ہے جو اُس کو دیکھ کر آجائے رحم؟ واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے
مُنہ نہ دِکھلاوے، نہ دکھلا، پر بہ اندازِ عتاب کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے
یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ مَیں زلف گر بن جاؤں تو شانے میں اُلجھا دے مجھے

(۱) فرماتے ہیں: میں بے شک اس کو دیکھتا ہوں لیکن رشک کی وجہ سے مجھے یہ ظلم بھی گوارا نہیں کہ میں اُسے دیکھوں۔ اسی مفہوم کا اور غزل میں بھی ایک شعر کہا ہے
دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے
(۸) مرزا غالب نے لاغری کے مضمون کو خوب نظم کیا ہے۔ محبوب کے پاس جانے کی رسوائی کو باطل کیا۔ اس کے لیے عذر کی کوئی گنجائش نہ چھوڑی ایسا ہی ایک شعر اور کہا ہے ؎ ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے ؛ یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے
ظفر بادشاہ نے بھی ایک شعر خوب کہا ہے ؎
ناتوانی نے بچالی جان میری ہجر میں کونے کونے ڈھونڈتی پھرتی قضا تھی مَیں نہ تھا

۱۲۶

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک (۲) — اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے
جُز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور — جُز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے — گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے
مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے — تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے
سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں نہ کیوں ہوں؟ — بیٹھا ہے بتِ آئینہ سیما مرے آگے
پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار — رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے
نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا — کیوں کر کہوں "لو نام نہ ان کا مرے آگے"

(۲) اورنگِ سلیماں: حضرت سلیمان علیہ السلام کا تخت۔ حضرت سلیمانؑ ایک پیمبر گزرے ہیں۔ ان کی بادشاہت بنی نوع انسان پر ہی نہ تھی بلکہ چرند پرند اور جنوں پر بھی ان کی حکومت تھی اور جنوں کی مدد سے ان کا تخت ہوا میں اُڑتا تھا

اعجازِ مسیحا: عیسیٰ علیہ السلام کے معجزے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ایک پیغمبر تھے۔ ان کے معجزے اور کمالات بہت مشہور ہیں۔ ان کا ایک معجزہ یہ بھی تھا کہ وہ اپنی پھونک سے مردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے۔

سلیمان کا تخت میرے نزدیک ایک کھیل کی حیثیت رکھتا ہے اور حضرت عیسیٰ کا معجزہ میرے آگے ایک معمولی سی بات ہے یعنی شاہانہ شوکت اور پیغمبرانہ معجزے میری نظر میں کچھ بھی نہیں ہیں۔

اس غزل کے متعلق منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں۔ دریا مرے آگے، صحرا مرے آگے۔ اس پر بھی ایک سال گزر چکا ہے قلعۂ مبارک کے مشاعرے کی غزل ہے یہ دہلی اردو اخبار میں اس تمہید کے ساتھ چھپی ہے۔

منگل کے دن صبح کو شعرائے قلعۂ مبارک اور شہر کے دیوانِ خاص میں مجتمع ہوئے حضورِ اقدسِ اعلیٰ برآمد اور جلوہ فرمائے تخت ہوئے جناب حضرت ولی عہد بہادر زیب افزائے کرسی اور مرزا مغل بہادر اور مرزا خضر سلطان بہادر اور مرزا جواں بخت بہادر اور شہزادگان والا تبار بعد باریابی مجراحسب الحکم قضا توام شرفِ نشست سے حسب مراتب مقام معزز و مکرم ہوئے۔ بارہ پہ ایک بجے تک حضورِ اقدس جلوہ فرما رہے۔"

ایماں مجھے روکے ہے، جو کھینچے ہے مجھے کفر (۱) کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے ۱۲۷
عاشق ہوں، پہ معشوق فریبی ہے مرا کام مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلا مرے آگے
خوش ہوتے ہیں، پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے
ہے موجزن اک قلزمِ خوں، کاش یہی ہو (۲) آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے
گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے
ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا غالب کو بُرا کیوں کہو؟ اچھا مرے آگے!

کہوں جو حال، تو کہتے ہو "مدعا کہیے" تمہیں کہو، کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے
نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ "ہم ستمگر ہیں" مجھے تو خُو ہے کہ جو کچھ کہو "بجا" کہیے
وہ نیشتر سہی، پر دل میں جب اُتر جاوے نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے!
نہیں ذریعۂ راحت، جراحتِ پیکاں وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دل کشا کہیے
جو مدعی بنے، اُس کے نہ مدعی بنیے جو نا سزا کہے، اُس کو نہ نا سزا کہیے
کہیں حقیقتِ جاں کاہیِ مرض لکھیے کہیں مصیبتِ ناسازیِ دوا کہیے
کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے کبھی حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے

(۱) کلیسا: گرجا۔ میں عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گیا ہوں، ایمان اور کفر دونوں مجھے اپنی اپنی طرف بلا رہے ہیں۔ اگر ایک طرف کلیسا مجھے اپنی طرف آنے کی دعوت دیتا ہے تو دوسری طرف کعبہ ادھر جانے سے منع کرتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔

(۲) مجروح کو ایک خط میں مرزا صاحب نے لکھا ہے: "میرا حقیقی بھائی مرزا یوسف خاں دیوانہ بھی مر گیا کیسا پنشن اور کہاں اس کا ملنا، یہاں جان کے لالے پڑے ہیں ؎

ہے موجزن اک قلزمِ خوں، کاش یہی ہو آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

رہے نہ جان، تو قاتل کو خوں بہا دیجے — کٹے زبان، تو خنجر کو مرحبا کہیے
نہیں نگار کو الفت، نہ ہو نگار تو ہے — روانیِ روِش و مستیِ ادا کہیے
نہیں بہار کو فرصت، نہ ہو، بہار تو ہے — طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے
سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالبؔ (۴) — خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے — دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے
صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ مے کشی — تھے یہ ہی دو حساب، سو یوں پاک ہو گئے
رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم — بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے
کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر؟ — پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے
پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا؟ — آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے
کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ہم گِلہ — کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے
اس رنگ سے اٹھائی کل اُس نے اسدؔ کی نعش — دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

نشّہ ہا شادابِ رنگ و ساز ہا مستِ طرب — شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے
ہم نشیں مت کہہ کہ "برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست" — واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

(۴) یہ غزل بھی مرزا صاحب نے منشی نبی بخش حقیرؔ کو اس غزل کے ساتھ ارسال کی تھی جس کا مطلع ہے:

دیا ہے دل اگر اس کو، بشر ہے کیا کہیے

اور قلعہ کے کسی مشاعرے کی ہے جیسا کہ مرزا غالب نے ایک جگہ لکھا ہے "میں نے ایک غزل فارسی اور ایک ریختہ موافق طرح کے اور دوسرا ریختہ اسی طرح میں سے ایک اور صورت نکال کر لکھا" یہ تینوں غزلیں مرزا نے حقیرؔ کو بھیجیں۔

عرضِ نازِ شوخیِ دنداں برائے خندہ ہے — دعویٰ جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے
ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل — یک جہاں زانو تامل، درقفائے خندہ ہے
کلفتِ افسردگی کو عیشِ بیتابی حرام — ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے
شورشِ باطن کے ہیں احباب منکر، ورنہ یاں — بس محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

حُسنِ بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے — آئینہ زانوے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے
تا کجا، اے آگہی! رنگِ تماشا باختن؟ — چشمِ واگر دیدہ، آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی — مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی
عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے، سربسر — کب تک خیالِ طرۂ لیلا کرے کوئی
افسردگی نہیں طرب انشائے التفات — ہاں، درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی
رونے سے، اے ندیم، ملامت نہ کر مجھے — آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی
چاکِ جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی — کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی
لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار، شاخِ گل — تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی
ناکامیِ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز — تُو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
ہر سنگ و خشت، ہے صدفِ گوہرِ شکست — نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی
سربر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر — فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی
ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد، یاس خیز — یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی
بیکاریِ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل — جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی
حُسنِ فروغِ شمعِ سخن دُور ہے اسدؔ — پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

۱۳۰

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی (۱) میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی!
چال، جیسے کڑی کمان کا تیر دل میں ایسے کے جا کرے کوئی
بات پر واں زبان کٹتی ہے وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ کچھ نہ سمجھے، خدا کرے کوئی
نہ سُنو، گر بُرا کہے کوئی (۶) نہ کہو، گر بُرا کرے کوئی
روک لو، گر غلط چلے کوئی (۷) بخش دو، گر خطا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند! کس کی حاجت روا کرے کوئی؟
کیا کیا خضر نے سکندر سے (۹) اب کسے رہنما کرے کوئی؟
جب توقع ہی اُٹھ گئی، غالب کیوں کسی کا گِلا کرے کوئی

(۱) مریم کے بیٹے حضرت عیسٰی جو بیماروں کو اچھا کر دیتے تھے: فرماتے ہیں کوئی ابنِ مریم (مسیحا)، ہے تو ہوا کرے مجھے کیا؟ میں تو تب جانوں کہ میرے دُکھ درد کی کوئی دوا کرے

یعنی میں محبت کا بیمار ہوں مجھے اگر مسیحا اچھا کر دے تب میں سمجھوں کہ کوئی واقعی (ابن مریم) مسیحا ہے۔ مدعا یہ کہ مرضِ عشق لاعلاج ہے۔

(۶ و ۷) کیسے خوبصورت اور سادہ الفاظ میں یہ اخلاقی شعر بہم پہنچائے ہیں مصرعوں کی بندش کتنی حسین ہے۔

(۹) خضر و سکندر کا قصہ مشہور ہے۔ خضر علیہ السلام سکندر بادشاہ کو آبِ حیات کے چشمے پر لے گئے۔ خود تو آبِ حیات پی لیا اور سکندر کو اُن لوگوں کے سامنے لے گئے جو آبِ حیات پی کر بوجہ طول العمری ضعیف و ناتواں ہو کر ڈھانچ بن کر رہ گئے تھے۔ سکندر نے یہ عالم دیکھ کر آبِ حیات پینے سے انکار کر دیا۔ یہی تلمیح اس شعر میں ہے۔

فرماتے ہیں خضر نے سکندر سے کیا کیا؛ یعنی کچھ نہیں کیا۔ گویا خضر کی رہنمائی سے بھی سکندر کو کچھ حاصل نہیں ہوا۔ کوئی اب کسے رہنما بنائے۔

بہت سہی غمِ گیتی، شراب کم کیا ہے (۱)　　غلامِ ساقیِ کوثر ہوں، مجھ کو غم کیا ہے ۱۳۱
رقیب پر ہے اگر لطف، تو ستم کیا ہے　　تمہاری طرز و روش جانتے ہیں ہم کیا ہے
کٹے تو شب کہیں، کاٹے تو سانپ کہلاوے　　کوئی بتاؤ کہ وہ زلفِ خم بہ خم کیا ہے
لکھا کرے کوئی احکامِ طالعِ مولود　　کسے خبر ہے کہ واں جنبشِ قلم کیا ہے
نہ حشر و نشر کا قائل، نہ کیش و ملت کا　　خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے
وہ داد و دیدِ گراں مایہ شرط ہے ہمدم　　وگرنہ مہرِ سلیمان و جامِ جم کیا ہے
سخن میں خامۂ غالبؔ کی آتش افشانی　　یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

باغ، پا کر خفقانی، یہ ڈراتا ہے مجھے　　سایۂ شاخِ گل، افعی نظر آتا ہے مجھے
جوہرِ تیغ بہ سرچشمۂ دیگر معلوم!　　ہوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اُگاتا ہے مجھے
مُدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے　　آئینہ خانے میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے
نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک　　آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے
زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے　　دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

روندی ہوئی ہے کوکبۂ شہریار کی　　اترائے کیوں نہ خاک سرِ رہ گزار کی؟
جب اُس کے دیکھنے کے لیے آئیں بادشاہ　　لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی
بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم، ولے　　کیونکر نہ کھائیے، کہ ہوا ہے بہار کی

(۱) اس غزل کا مطلع اور مقطع مرزا صاحب نے قہر کے خط میں تحریر کیا ہے۔ نیز اس کے بارے میں علائی کو یوں لکھا ہے:۔
"تم نے اشعارِ جدید مانگے۔ خاطر تمہاری عزیز، ایک مطلع، صرف دو مصرعے آگے کے کہے ہوئے، یاد آ گئے کہ وہ داخل دیوان بھی نہیں ان پر فکر کر کے، ایک مطلع اور پانچ شعر لکھ کر، سات بیت کی ایک غزل تم کو بھیجتا ہوں" عرشی صاحب اور لالہ مالک رام نے اپنے مرتبہ نسخوں میں اس غزل کے تین شعر مروجہ دیوان میں اور چار شعر "تتمہ" میں شامل کیے ہیں جبکہ غالب کی تحریر کے بموجب غزل ہذا کا کوئی شعر دیوان میں نہیں ہے اور مولانا عرشی نے غالب کے ایک ہی خط بنام نواب علائی کو دونوں جگہ نقل کیا ہے۔ لہٰذا پوری غزل ایک ہی جگہ درج کر دی گئی ہے۔

۱۳۲

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ڈرے کیوں میرا قاتل؟ کیا رہے گا اُس کی گردن پر
وہ خوں جو چشمِ تر سے عمر بھر یُوں دم بدم نکلے!

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں، لیکن (۳)
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

بھرم کھل جائے ظالم! تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پُرپیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

مگر لکھوائے کوئی اُس کو خط، تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ہوئی اِس دَور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جامِ جم نکلے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ سِتم نکلے

مَحبت میں نہیں ہے فرق، جینے اور مرنے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

کہاں میخانے کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ!
پر اتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

کوہ کے ہوں بارِ خاطر گر صدا ہو جائیے
بے تکلف، اے شرارِ جستہ! کیا ہو جائیے؟

بیضہ آسا تنگ بال و پر ہے یہ کُنجِ قفس
از سرِ نو زندگی ہو، گر رِہا ہو جائیے

(۳) آدم کا خلد سے نکلنا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کر کے جنت میں رہنے کے لیے حکم دیا اور وہاں وہ بڑے آرام سے رہتے تھے۔ ابلیس ان کے اس آرام کو دیکھ کر جل گیا اور سوچنے لگا کہ کسی طرح اس پتلۂ خاکی کو جس کی وجہ سے میں راندۂ درگاہ ہوا تھا جنت سے نکلوا دوں

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ تم جنت میں گیہوں کے دانے مت کھانا۔ شیطان نے آدم کے دل میں یہ وسوسہ پیدا کیا کہ اس دانہ کے کھانے سے تمہاری عزت اور توقیر زیادہ ہو جائے گی اسے کھا لو غرضکہ شیطان کے بہکانے سے آدم علیہ السلام نے دانۂ گندم کھا لیا۔ بس پھر کیا تھا۔ خدا کا حکم پہنچا تم نے ہمارے حکم کی نافرمانی کی۔ اب تم جنت میں نہیں رہ سکتے۔ فرماتے ہیں: "آدم کا جنت سے نکلنا تو سنتے آئے تھے۔ مگر ہم اس سے بھی زیادہ بے آبرو ہو کر (اے محبوب) تیرے کوچے سے نکلے ہیں۔" کوچۂ یار کو کس خوبی سے بہشت کہا ہے

مستی، بہ ذوقِ غفلتِ ساقی، ہلاک ہے — موجِ شراب، یک مژۂ خواب ناک ہے
جز زخمِ تیغِ ناز، نہیں دل میں آرزو — جَیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے
جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں، اسدؔ — صحرا ہماری آنکھ میں یک مُشتِ خاک ہے

لبِ عیسیٰ کی جُنبش کرتی ہے گہوارہ جُنبانی (۴۰) — قیامت کُشتۂ لعلِ بُتاں کا خوابِ سنگیں ہے

آمدِ سیلابِ طوفانِ صدائے آب ہے — نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے اُنگلی جادہ سے
بزمِ مَے وحشت کدہ ہے کس کی چشمِ مست کا؟ — شیشے میں نبضِ پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے

ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنا — مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

سیاہی جیسے گر جاوے دمِ تحریر کاغذ پر — مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

ہجومِ نالہ، حیرت، عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے — خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے
تکلف بر طرف، ہے جانستاں تر لطفِ بدخویاں — نگاہِ بے حجابِ ناز، تیغِ تیزِ عُریاں ہے
ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی — کہ صبحِ عید مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے
دل و دیں نقد لا، ساقی سے گر سودا کیا چاہے (۴۱) — کہ اس بازار میں ساغر، متاعِ دست گرداں ہے
غم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو — چراغِ روشن اپنا، قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

(۴۰) حضرت عیسیٰ کی زبان اور لب میں یہ تاثیر تھی کہ ایک جنبشِ لب ہی مردوں کو زندہ کر دیتی تھی۔ فرماتے ہیں حسینوں کے کشتگانِ لبِ لعلیں پر عیسیٰ کے لبوں کی جنبش کا جادو نہیں چلتا ہے۔ بلکہ لبِ عیسیٰ کی جنبش اُن کے حق میں لوری اور پالنے کی حرکت جیسا کام کرتی ہے یعنی کشتگانِ حُسن کی نیند اور گہری ہو جاتی ہے۔

(۴۱) ساقی سے رضامندی چاہتا ہے تو دل اور دین شراب کی قیمت میں پیش کر۔ ادھار سے کام نہیں چلے گا۔ صرف دل یا دین سے قیمت پوری نہ ہو گی۔ مرزا صاحب نے ایک دیا شعر اور کہا ہے ۔ رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنِ مے ۔ مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے

۱۳۴
خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے — نگاہ دل سے ترے سُرمہ سا نکلتی ہے
فشارِ تنگیِ خلوت سے بنتی ہے شبنم — صبا جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے
نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ — کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

جس جا نسیم، شانہ کشِ زلفِ یار ہے — نافہ، دماغِ آہوے دشتِ تتار ہے
کس کا سُراغِ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا — آئینہ فرشِ شش جہتِ انتظار ہے
ہے ذرہ ذرہ تنگیِ جائے غبارِ شوق — گر دام یہ ہے، وسعتِ صحرا شکار ہے
دل مُدّعی و دیدہ بنا مُدّعا علیہ — نظّارے کا مُقدّمہ پھر روبکار ہے
چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگِ گل پہ آب — اے عندلیب! وقتِ وداعِ بہار ہے
پچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے — وہ آئے یا نہ آئے، پہ یاں انتظار ہے
بے پردہ سوئے وادیِ مجنوں گزر نہ کر — ہر ذرّے کے نقاب میں، دل بیقرار ہے
اے عندلیب، یک کفِ خس بہرِ آشیاں — طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے
دل مت گنوا خبر نہ سہی، سیر ہی سہی — اے بے دماغ! آئینہ تمثال دار ہے
غفلت کفیلِ عمر و اسدؔ ضامنِ نشاط — (۱۳) اے مرگِ ناگہاں، تجھے کیا انتظار ہے؟

(۱۳) اس مقطع کا دوسرا مصرع مرزا صاحب نے مرزا تفتہ کے خط میں یہ کہکر نقل کیا ہے کہ "میرا حال اس فن میں اب یہ ہے کہ شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے اشعار سب بھول گیا مگر ہاں، اپنے ہندی کلام سے ڈیڑھ شعر یعنی ایک مقطع اور ایک مصرع یاد رہ گیا ہے سو گاہ گاہ جب دل الٹنے لگتا ہے تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آجاتا ہے ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرع پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں

اے مرگِ ناگہاں! تجھے کیا انتظار ہے؟

آئینہ کیوں نہ دُوں کہ تماشا کہیں جسے؟ — ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے؟
حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں — گلدستۂ نگاہ، سُوَیدا کہیں جسے
پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں، اے خدا؟ — افسونِ انتظار، تمنّا کہیں جسے
سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے — وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے
ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں — شوقِ عناں گسیختہ دریا کہیں جسے
درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو — صبحِ بہار، پنبۂ مینا کہیں جسے
غالبؔ بُرا نہ مان، جو واعظ بُرا کہے (۱) — ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے؟

شبنم، بہ گُلِ لالہ، نہ خالی ز ادا ہے — داغِ دلِ بے درد، نظرگاہِ حیا ہے
دل خُوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار — آئینہ، بہ دستِ بُتِ بدمست حنا ہے
شعلے سے نہ ہوتی، ہوسِ شعلہ نے جو کی — جی، کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے!
تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق — آئینہ، بہ اندازِ گُل، آغوش کُشا ہے
قُمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ — اے نالہ، نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے؟
خُو نے تری افسردہ کیا، وحشتِ دل کو — معشوقی و بے حوصلگی، طُرفہ بلا ہے

(۱) مرزا صاحب سیف الحق سیّاح کو ایک خط میں اس طرح لکھتے ہیں: "بھائی سیف الحق تمہارا خط پہنچا قاضی صاحب بڑودہ کو معاف رکھو اگر کوئی وجہ اپنے پر اُن کے عتاب کی پاتا تو اُن سے عذر کرتا اور اپنا گناہ معاف کرواتا جب سبب ملال کا ظاہر نہیں تو میں کیا کروں تم بُرا نہ مانو، کس واسطے کہ اگر میں بُرا ہوں تو اس نے سچ کہا اور اگر میں اچھا ہوں اور اُس نے بُرا کہا تو اُس کو خدا کے حوالے کرو۔
غالب بُرا نہ مان جو دشمن بُرا کہیں — ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

۱۲۶

مجبوری و دعوائے گرفتاریِ الفت — دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے
معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ — تیغِ ستم آئینۂ تصویر نُما ہے
اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب! اِدھر بھی — سایے کی طرح، ہم پہ عجب وقت پڑا ہے
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد — یارب! اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
بیگانگیِ خلق سے بے دل نہ ہو غالبؔ — کوئی نہیں تیرا، تو مری جان، خدا ہے

منظور تھی یہ شکل، تجلّی کو نُور کی — قسمت کھُلی ترے قد و رُخ سے ظُہور کی
اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں — پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حُور کی
واعظ! نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو — کیا بات ہے تمہاری شرابِ طَہُور کی (۸)
لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل، کہ کیوں اُٹھا؟ — گویا ابھی سُنی نہیں آوازِ صُور کی
آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج — اُڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیُور کی
گو واں نہیں، پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں — کعبے سے اِن بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی (۱۱)
کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب؟ — آؤ نہ، ہم بھی سَیر کریں کوہِ طُور کی
گرمی سہی کلام میں، لیکن نہ اس قدر — کی جس سے بات، اُس نے شکایت ضرور کی
غالبؔ گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں — حج کا ثواب نذر کروں گا حضُور کی (۱۴)

(۸) شرابِ طہور۔ پاک شراب۔ پینے کی پاک چیز۔ شرابِ طہور۔ یہ نہایت لذیذ اور خنک شربت ہوگا جو جنت میں رہنے والوں کو پلایا جائیگا۔ ازراہِ شوخی فرماتے ہیں: "اے واعظو، تمہاری شرابِ طہور کے کیا کہنے جب کو نہ تم خود پی سکتے ہو اور نہ کسی کو پلا سکتے ہو صرف زبانی اسکی تعریف کرتے ہو۔"

(۱۱) واں سے مراد خانۂ کعبہ۔ اگرچہ اس وقت خانۂ کعبہ میں کوئی بُت موجود نہیں لیکن یہ بُت وہاں سے نکالے ہوئے تو ہیں اس لیے ان کو خانۂ کعبہ سے دور کی نسبت ضرور ہے۔ دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں جو بُت پرستی کرتا ہوں تو یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے یہی بت کسی زمانے میں کعبہ کی زیب و زینت تھے مگر وہاں سے نکالے گئے تو کیا ہوا ان کو خانۂ کعبہ سے کچھ نہ کچھ نسبت ضرور ہے

(۱۴) یہ غزل اُس زمانہ میں لکھی گئی تھی جب شاہ ظفر نے حج کے لیے جانے کا ارادہ کیا تھا جس کی رپورٹ ریذیڈنٹ دہلی نے بھیجی تھی۔ مرزا غالب نے ہمراہ جانے کی خواہش اس مقطع میں ظاہر کی ہے۔ غالب اگر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں ؎ حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

۱۳۷

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے — یہ رنج، کہ کم ہے مےِ گلفام بہت ہے
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے، ورنہ — ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے
نے تیر کماں میں ہے، نہ صیاد کمیں میں — گوشے میں قفس کے، مجھے آرام بہت ہے
کیا زُہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی — پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے
ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں؟ — پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے
زمزم ہی پہ چھوڑو، مجھے کیا طوفِ حرم سے؟ (۶) — آلودہ بہ مے، جامۂ احرام بہت ہے
ہے قہر گر اب بھی نہ بنے بات، کہ اُن کو — انکار نہیں، اور مجھے اِبرام بہت ہے
خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں، اے مرگ! — رہنے دے مجھے یاں، کہ ابھی کام بہت ہے
ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالبؔ کو نہ جانے؟ — شاعر تو وہ اچھا ہے، پہ بدنام بہت ہے

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے — جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر، جگرِ لخت لخت کو — عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے
پھر وضعِ احتیاط سے رُکنے لگا ہے دم — برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے
پھر گرمِ نالہ ہائے شرر بار ہے نفس — مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے

(۶) جامۂ احرام۔ حاجی لوگ عرب کے ایک خاص مقام پر پہنچ کر حج کا ایک خاص لباس پہنتے ہیں۔ یہ ایک سفید کپڑا ہوتا ہے اس کو تہمد کے طور پر باندھتے ہیں اور اسی کا ایک حصہ جسم پر اوڑھ لیتے ہیں۔ حج کے موقع پر دنیا کے تمام حاجی ایک لباس میں ہوگے ہیں۔ اسی لباس کو جامۂ احرام کہا جاتا ہے۔

فرماتے ہیں: میرا جامۂ احرام شراب سے آلودہ ہو کر ناپاک ہو گیا ہے۔ اس لیے اس ناپاک لباس کے ساتھ مجھے حرم کے طواف سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ مجھے تو چاہِ زمزم پر ہی چھوڑ دو تاکہ میں اس مقدس پانی سے شراب کے دھبوں کو دھو ڈالوں اس قسم کا ایک شعر اور بھی کہا ہے ؎ رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

۱۴۸ پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق ۔۔۔ سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے
پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل ۔۔۔ سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے
باہم دِگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب ۔۔۔ نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے
دل پھر طوافِ کوے ملامت کو جاے ہے (۴) ۔۔۔ پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے
پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب ۔۔۔ عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے
دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال ۔۔۔ صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے
پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا ۔۔۔ جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کیے ہوئے
مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس ۔۔۔ زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو ۔۔۔ سُرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے
اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ ۔۔۔ چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے
پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں ۔۔۔ سر زیر بارِ منتِ درباں کیے ہوئے
جی ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن ۔۔۔ بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے
غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے ۔۔۔ بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

نویدِ امن ہے، بیدادِ دوست جاں کے لیے ۔۔۔ رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے
بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے ۔۔۔ رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونفشاں کے لیے
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں رُوشناسِ خلق اے خضر ۔۔۔ نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے
رہا بلا میں بھی، میں مبتلاے آفتِ رشک ۔۔۔ بلاے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لیے

(۴) میرے دل نے خودی و خودداری کی بنی بنائی عمارت کو گرا دیا ہے اور اب پھر کوے ملامت یعنی کوچۂ دوست کی طرف جانے کا ارادہ کر لیا ہے جہاں مجھے ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

۱۳۹

فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
دراز دستیِ قاتل کے امتحاں کے لیے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

(۱۳) گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

(۱۵) دیا ہے خلق کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمّل حسین خاں کے لیے

، زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا!
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

، نصیرِ دولت و دیں اور مُعینِ ملّت و ملک
بنا ہے چرخ بریں جس کے آستاں کے لیے

زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرایش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

(۱۳) اس شعر کے متعلق مولانا حالی لکھتے ہیں: "اردو غزل میں ایسے بلیغ اشعار شاید دو ہی چار اور نکلیں گے مولانا آزردہ جو مرزا کی طرز کو نام رکھتے تھے وہ بھی اس شعر کے انداز بیان پر پروانہ تھے۔ آغاز مقدمہ میں بھی اس شعر پر کچھ ریمارک کیا ہے یہاں اس کی ایک اور خوبی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو واقعہ مرزا نے اس شعر میں بیان کیا ہے اس میں دو باتوں کی تصریح کرنی ضرور تھی۔ ایک یہ کہ پاسبان نے قائل کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ دوسرے یہ کہ قائل پاسبان سے چاہتا کیا تھا سو یہ دونوں باتیں بصراحت بیان نہیں کی گئیں صرف کنایہ میں ادا کی گئی ہیں۔ مگر صراحت سے زیادہ وضوح کے ساتھ فوراً سمجھ میں آجاتی ہیں پہلی بات پر لفظ شامت اور دوسری پر قدم لینا صاف دلالت کرتا ہے۔ اس کے سوا روزمرہ کی نشست اور الفاظ کی بندش اور ایک وسیع خیال کو دو مصرعوں میں ایسی خوبی سے ادا کرنا نثر میں بھی اس طرح ادا کرنا مشکل ہے۔ یہ سب باتیں نہایت تعریف کے قابل ہیں۔"

(۱۵ تا ۱۷) اس غزل کے یہ پانچ شعر نواب تجمّل حسین خانصاحب کی مدح میں لکھے گئے ہیں۔ تجمّل حسین خانصاحب فرخ آباد کے نواب تھے۔ انھوں نے مرزا غالب کے ساحرانہ کمال کی تعریف اور شہرت سن کر انھیں فرخ آباد آنے کی دعوت دی۔ لیکن حضرت غالب فرخ آباد کسی وجہ سے نہ جا سکے۔ یہ ریاست بنگش خاندان نے فرخ سیر کے عہد میں قایم کی تھی جو غدر کے زمانہ میں برباد ہو گئی۔

میرٹھ کے رئیس نواب اصغر علی خاں بہادر نے ایک مشاعرہ دہلی میں منعقد کرایا تھا اور اس زمین میں طرح دی گئی تھی حضرت غالب، ذوق اور مومن تینوں شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے اور تینوں باکمال شاعروں کی غزلوں کا موازنہ کیا ہے۔ یہ غزل اس مشاعرہ کے موقع پر لکھی گئی تھی

قصائد

منقبت میں

ساز یک ذرّہ نہیں، فیضِ چمن سے بیکار — سایۂ لالۂ بے داغ، سُوَیدائے بہار
مستی بادِ صبا سے ہے، بہ عرضِ سبزہ — ریزۂ شیشۂ مے، جوہرِ تیغِ کُہسار
سبز ہے، جامِ زُمرّد کی طرح داغِ پلنگ — تازہ ہے، ریشۂ نارنج صفت رُوئے شرار
مستیِ ابر سے گلچینِ طرب ہے حسرت — کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار
کوہ و صحرا ہمہ معموریِ شوقِ بلبل — راہِ خوابیدہ ہوئی خندۂ گُل سے بیدار
سونپے ہے فیضِ ہوا صورتِ مژگانِ یتیم — سرنوشتِ دو جہاں ابر، بہ یک سطرِ غبار
کاٹ کر پھینکیے، ناخن تو بہ اندازِ ہلال — قوتِ نامیہ اُس کو بھی نہ چھوڑے بیکار
کفِ ہر خاک بہ گردوں شدہ قمری پرواز — دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ، طاؤس شکار
مے کدے میں ہو اگر آرزوئے گل چینی — بھول جا یک قدحِ بادہ بہ طاقِ گلزار
آج گل ڈھونڈ ھ بہ خلوت کدۂ غنچۂ باغ — گُم کرے گوشۂ مے خانہ میں گر تو دستار
کھینچے گر مانیِ اندیشہ چمن کی تصویر — سبز مثلِ خطِ نوخیز، ہو خطِ پرکار
لعل سی، کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ — طوطیِ سبزۂ کُہسار نے پیدا منقار
وہ شہنشاہ، کہ جس کی پئے تعمیرِ سرا — چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار
فَلَکُ العَرش، ہجومِ خمِ دوشِ مزدور — رشتۂ فیضِ ازل، سازِ طنابِ معمار
سبزۂ نُہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام — رفعتِ ہمتِ صد عارف و یک اوجِ حصار
واں کے خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرِ کاہ — وہ رہے مروحۂ بالِ پری سے بیزار

خاکِ صحرائے نجف، جوہرِ سیرِ عُرفا (۱) چشمِ نقشِ قدم آئینۂ بختِ بیدار
ذرّہ اُس گرد کا خورشید کو آئینۂ ناز گردِ اُس دشت کی اُمید کو احرامِ بہار
آفرینش کو ہے واں سے طلبِ مستیِ ناز عرضِ خمیازۂ ایجاد ہے ہر موجِ غبار

مطلعِ ثانی

فیض سے تیرے ہے اے شمعِ شبستانِ بہار دلِ پروانہ چراغاں، پرِ بلبل گلزار
شکلِ طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز ذوق میں جلوے کے تیرے، بہ ہوائے دیدار
تیری اولاد کے غم سے، ہے بروئے گردوں سلکِ اختر میں مہِ نو، مژۂ گوہر بار
ہم عبادت کو، ترا نقشِ قدم مُہرِ نماز (۲) ہم ریاضت کو ترے حوصلے سے استظہار
مدح میں تیری، نہاں زمزمۂ نعتِ نبی جام سے تیرے، عیاں بادۂ جوشِ اسرار
جوہرِ دستِ دعا آئینہ یعنی تاثیر یک طرف نازشِ مژگان و دگر سو غمِ خار
مَردُمک سے ہو عزا خانۂ اقبال نگاہ خاکِ در کی ترے جو چشم نہ ہو آئینہ دار
دشمنِ آلِ نبی کو، بہ طرب خانۂ دہر عرضِ خمیازۂ سیلاب ہو طاقِ دیوار
دیدہ تا دل، اسدؔ! آئینۂ یک پرتوِ شوق (۱۲) فیضِ معنی سے خطِ ساغرِ راقم سرشار

(۱) نجف، عرب کی سرزمین کا ایک مقام ہے: فرماتے ہیں کہ عارف خاکِ نجف کو باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اس خاک پر وہ چلتے وقت اپنے نقشِ قدم میں اپنے جاگے ہوئے نصیب کی صورت دیکھتے ہیں۔
(۲) مُہرِ نماز شیعہ حضرات نماز پڑھتے وقت ایک مُہر، سجدے کی جگہ پر رکھ لیتے ہیں۔ اُسی کے اوپر سجدہ کرتے ہیں۔ اس مہر میں پنجتن پاک (حضرت محمدؐ، حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ) کے نام لکھے ہوتے ہیں۔

منقبت

۱۴۲ دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے، اگر حسن نہ ہوتا خود بیں!

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ شوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

ہرزہ ہے، نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم
لغو ہے، آئینہ فرقِ جنون و تمکیں

نقشِ معنی ہمہ، خمیازۂ عرضِ صورت
سخنِ حق ہمہ، پیمانۂ ذوقِ تحسیں

لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم
دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے، چہ دنیا و چہ دیں

مثلِ مضمونِ وفا، باد بہ دستِ تسلیم
صورتِ نقشِ قدم خاک بہ فرقِ تمکیں

عشق، بے ربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس
وصل، زنگارِ رخِ آئینۂ حُسنِ یقیں

کوہکن، گُرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب
بے ستوں، آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز؟
کس نے پایا اثرِ نالۂ دلہائے حزیں؟

سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں، لیکن
نہ سر و برگِ ستایش، نہ دماغِ نفریں

کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ!
یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکیں

نقشِ "لاحول" لکھ، اے خامۂ ہذیاں تحریر!
"یا علی" عرض کر، اے فطرتِ وسواس قریں

مظہرِ فیضِ خدا، جان و دلِ ختمِ رُسل
قبلۂ آلِ نبی، کعبۂ ایجادِ یقیں

ہو وہ سرمایۂ ایجاد، جہاں گرمِ خرم
ہر کفِ خاک، ہے واں گردۂ تصویرِ زمیں

جلوہ پرداز ہو نقشِ قدم اس کا جس جا
وہ کفِ خاک، ہے ناموسِ دو عالم کی امیں

نسبتِ نام سے اُس کی ہے یہ رُتبہ کہ رہے
اَبَداً پُشتِ فلک خم شدۂ نازِ زمیں

فیضِ خُلق اُس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا
بوئے گُل سے نَفَسِ بادِ صبا عطر آگیں

بُرشِ تیغ کا اُس کی، ہے جہاں میں چرچا
قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں

کفر سوز اُس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے
رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بُتخانۂ چیں

جاں پناہا! دل و جاں فیض رسانا! شاہا! ‏ وصیِ ختمِ رُسل تو ہے بہ فتوائے یقیں
جسمِ اطہر کو ترے دوشِ پیمبر منبر ‏ نامِ نامی کو ترے، ناصیۂ عرش نگیں
کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب؟ ‏ شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں
آستاں پر ہے ترے جوہرِ آئینۂ سنگ ‏ رقمِ بندگیِ حضرتِ جبریلِ امیں
تیرے در کے لیے اسبابِ نثار آمادہ ‏ خاکیوں کو جو خدا نے دیے جان و دل و دیں
تیری مدحت کیلیے ہیں دل و جاں کام و زباں ‏ تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں
کس سے ہوسکتی ہے مداحیِ ممدوحِ خدا! ‏ کس سے ہوسکتی ہے آرایشِ فردوسِ بریں؟
جنسِ بازارِ معاصی اسداللہ اسد ‏ کہ سوا تیرے کوئی اُس کا خریدار نہیں
شوخیِ عرضِ مطالب میں ہے گستاخ طلب ‏ ہے ترے حوصلۂ فضل پر از بسکہ یقیں
دے دعا کو مری، وہ مرتبۂ حسنِ قبول ‏ کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار "آمیں"
غمِ شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز ‏ کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں
طبع کو الفتِ دُلدُل میں یہ سرگرمیِ شوق ‏ کہ جہاں تک چلے اُس سے قدم اور مجھ سے جبیں
دلِ الفت نسب و سینۂ توحید فضا ‏ نگہِ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزیں
صرفِ اعدا، اثرِ شعلہ دودِ دوزخ ‏ وقفِ احباب گل و سنبلِ فردوسِ بریں

ہاں مہِ نو سنیں ہم اُس کا نام ‏ جس کو تُو جھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح ‏ یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب؟ ‏ بندہ عاجز ہے، گردشِ ایام
اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا ‏ آسماں نے بچھا رکھا تھا دام

١٤٤

مَرحبا! اے سُرورِ خاصِ خواص!
حَبّذا! اے نَشاطِ عامِ عوام

عُذر میں تین دن نہ آنے کے
لے کے آیا ہے عید کا پیغام

اُس کو بھولا نہ چاہیے کہنا
صبح جو جاوے اور آوے شام

ایک مَیں کیا کہ سب نے جان لیا
تیرا آغاز اور ترا انجام

رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے؟
مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمّام؟

جانتا ہوں کہ آج دُنیا میں
ایک ہی ہے اُمید گاہِ اَنام

میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش
غالب اُس کا مگر نہیں ہے غلام؟

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو
تب کہا ہے بطرزِ استفہام

مہرِ تاباں کو ہو تو ہو، اے ماہ
قُربِ ہر روزہ بر سبیلِ دوام

تجھ کو کیا پایہ رُوشناسی کا؟
جز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام

جانتا ہوں کہ اُس کے فیض سے تو
پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام

ماہ بن، ماہتاب بن، مَیں کون؟
مجھ کو کیا بانٹ دے گا تُو انعام؟

میرا اپنا جدا معاملہ ہے
اور کے لین دین سے کیا کام؟

ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص
گر تجھے ہے اُمیدِ رحمتِ عام

جو کہ بخشے گا تجھ کو فَرِّ فُروغ
کیا نہ دے گا مجھے مَئے گلفام؟

جب کہ چودہ مَنازلِ فلکی
کر چُکے قطع تیری تیزیِ گام

تیرے پَرتَو سے ہوں فروغ پذیر
کوئے و مُشکوئے و صحن و منظر و بام

دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز
اپنی صورت کا اِک بلوریں جام

پھر غزل کی رَوِش پہ چل نکلا
تَوسَنِ طبع چاہتا تھا لگام

غزل

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام — تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بد نام؟
مَے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں؟ — غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام
بوسہ کیسا؟ یہی غنیمت ہے — کہ نہ سمجھیں وہ لذّتِ دُشنام
کعبہ میں جا بجائیں گے ناقُوس — اب تو باندھا ہے دَیر میں احرام
اُس قدح کا ہے دَور مجھ کو نقد — چرخ نے لی ہے جس سے گردشِ وام
بوسہ دینے میں اُن کو ہے انکار — دل کو لینے میں جن کو تھا اِبرام
چھیڑتا ہوں کہ اُن کو غصّہ آئے — کیوں رکھوں ورنہ غالبؔ اپنا نام؟

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تُو کہہ — اے پَری چہرہ پیکِ تیز خرام
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا — ہیں مہ و مہر و زُہرہ و بہرام
تُو نہیں جانتا تو مجھ سے سُن — نامِ شاہنشہِ بُلند مُقام
قبلۂ چشم و دل، بہادر شاہ — مَظہَرِ ذُوالجَلالِ والاکرام!
شہسوارِ طریقۂ انصاف — نو بہارِ حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز — جس کا ہر قول، معنئِ الہام
بزم میں، میزبانِ قیصر و جم (۱۴۱) — رزم میں اوستادِ رستم و سام

(۱۴۱) قیصر و جم۔ قیصر روم کا جلیل القدر بادشاہ تھا اور جم ایران کے ایک بادشاہ کا نام ہے جو بڑا مہمان نواز تھا۔
بادشاہ ظفر کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ اس کی محفل میں قیصر و جم جیسے جلیل القدر بادشاہ اُس کے دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں اور لڑائی کے میدان میں وہ فنِ سپاہ گری میں ایران کے مشہور پہلوانوں رستم اور سام کو طریقۂ جنگ سکھاتا ہے۔ رستم اور سام دنیا کے بڑے نامور پہلوان تھے۔ سام رستم کے دادا کا نام تھا

۱۴۶

اے ترا لطف زندگی افزا! اے ترا عہد فرخی فرجام!
چشمِ بد دور! خسروانہ شکوہ (۲) لوحش اللہ! عارفانہ کلام
جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ روم جُرعہ خواروں میں تیرے مُرشدِ جام
وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے اِیرج و تور و خسرو و بہرام
زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے گیو و گودرز و بیژن و رُہام
مرحبا! موشگافیِ ناوک ق آفریں! آب داریِ صمصام
تیر کو تیرے تیرِ غیر، ہدف تیغ کو تیری، تیغِ خصم نیام
رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند! ق برق کو دے رہا ہے کیا الزام!
تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا تیرے رخشِ سُبک عناں کا خرام
فنِ صورت گری میں تیرا گرز ق گر نہ رکھتا ہو دستگاہِ تمام
اُس کے مضروب کے سر و تن سے کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام
جب ازل میں رقم پذیر ہوئے صفحہ ہائے لیالی و ایام
اور اُن اوراق میں بہ کلکِ قضا مُجملاً مندرج ہوئے احکام
لکھ دیا شاہدوں کو ”عاشق کُش“ لکھ دیا عاشقوں کو ”دشمن کام“
آسماں کو کہا گیا کہ کہیں گنبدِ تیز گردِ نیلی فام
حکمِ ناطق لکھا گیا کہ لکھیں خال کو ”دانہ“ اور زُلف کو ”دام“
آتش و آب و باد و خاک نے لی وضعِ سوز و نم و رم و آرام

(۲) ایرج ۔ تور ۔ خسرو ۔ بہرام ۔ ایران کے کیانی بادشاہ تھے ۔ گیو رستم کا داماد تھا ۔ بیژن کی داستان شاہنامہ فردوسی میں مشہور ہے ۔
(۳) گیو ۔ گودرز ۔ بیژن ۔ رہام ۔ یہ ایران کے مشہور پہلوان تھے ۔ گیو ۔ گودرز ۔ بیژن ۔ رہام ۔ یہ سب تیرے بازو کی قوت کو تسلیم کرتے ہیں

مہرِ رخشاں کا نام "خسروِ روز" (۱) ماہِ تاباں کا اسم "شحنۂ شام"
تیری توقیعِ سلطنت کو بھی (۲) دی، بدستور صورتِ ارقام
کاتبِ حکم نے بموجبِ حکم اُس رقم کو دیا طرازِ دوام
ہے ازل سے روائیِ آغاز ہو ابد تک رسائیِ انجام!

صبحدم، دروازۂ خاور کُھلا مہرِ عالمتاب کا منظر کُھلا
خسروِ انجم کے آیا صرف میں شب کو تھا گنجینۂ گوہر کُھلا
وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود صبح کو رازِ مہ و اختر کُھلا!
ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کُھلا
سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو موتیوں کا ہر طرف زیور کُھلا
صبح آیا جانبِ مشرق نظر اِک نگارِ آتشیں رُخ، سر کُھلا
تھی نظر بندی، کیا جب ردِّ سحر بادۂ گلرنگ کا ساغر کُھلا
لا کے ساقی نے صَبوحی کے لیے رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کُھلا
بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ کعبۂ امن و اماں کا در کُھلا
تاجِ زرّیں، مہرِ تاباں سے سوا خسروِ آفاق کے مُنہ پر کُھلا
شاہِ روشن دل، بہادر شہ، کہ ہے رازِ ہستی اس پہ سرتاسر کُھلا
وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں مقصدِ نُہ چرخ و ہفت اختر کُھلا
وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے عُقدۂ احکامِ پیغمبر کُھلا

(۱ - ۲) جس طرح آفتاب کا نام "دن کا بادشاہ" اور "چاند کا نام "شام کا کوتوال" تجویز کیا گیا ہے، اسی کے مطابق تیرے نام پر فرمانِ سلطنت خدا کی طرف سے لکھ دی گئی ہے

پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام — اُس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا
رُوشناسوں کی جہاں فہرست ہے — واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھلا
توسنِ شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب — تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھلا
نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب — تو کہے بُت خانۂ آذر کھلا
مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کے — منصبِ مہر و مہ و محور کھلا
لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک — میری حدِ وسع سے باہر کھلا
تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید — کس نے کھولا؟ کب کھلا؟ کیونکر کھلا
باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار — مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھلا
ہو جہاں گرمِ غزلخوانی نفس — لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا
کُنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا — کاشکے ہوتا قفس کا در کھلا!
ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے؟ — یار کا دروازہ پاویں، گر کھلا
ہم کو ہے اس رازداری پر گھمنڈ — دوست کا، ہے راز دشمن پر کھلا
واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ — زخم لیکن، داغ سے بہتر کھلا
ہاتھ سے رکھدی کب ابرو نے کماں؟ — کب کمر سے غمزے کی خنجر کھلا؟
مفت کا کس کو بُرا ہے، بدرقہ؟ — رہروی میں، پردۂ رہبر کھلا
سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک؟ — آگ بھڑکی، مینھ اگر دم بھر کھلا
نامے کے ساتھ آ گیا پیغامِ مرگ — رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا
دیکھیو غالب سے گر الجھا کوئی (۱۸) — ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

(۱۸) مرزا غالب نے اپنے ولی ہونے کے متعلق پہلے بھی ایک غزل کے مقطع میں کہا ہے ۔ یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب الخ۔ دونوں مقامات پر کیا شوخیانہ انداز اختیار کیا ہے ۔ واقعی مرزا صاحب کسی ولی سے کم نہ تھے جیسا کہ ان کے اکثر اشعار الہامی کیفیت رکھتے ہیں

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال — پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا
خامے سے پائی طبیعت نے مدد — بادباں بھی اٹھتے ہی لنگر کھلا
مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ — یاں عرض سے رتبۂ جوہر کھلا
مہر کانپا چرخ چکر کھا گیا — بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا؟
بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب — اب، علوِ پایۂ منبر کھلا؟
سکۂ شہ کا ہوا ہے رو شناس — اب عیارِ آبروے زر کھلا
شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ — اب، مآلِ سعیِ اسکندر کھلا
ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے (۸) — اب فریبِ طغرل و سنجر کھلا
ہو سکے کیا مدح ہاں اک نام ہے — دفترِ مدحِ جہاں داور کھلا
فکر اچھی، پر ستایش ناتمام — عجزِ اعجازِ ستایش گر کھلا
جانتا ہوں، ہے خطِ لوحِ ازل — تم پہ، اے خاقانِ نام آور کھلا
تم کرو صاحبقرانی جب تلک (۱۲) — ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا

درصفت انبہ

ہاں، دلِ دردمندِ زمزمہ ساز — کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز؟
خامے کا صفحے پر رواں ہونا — شاخِ گل کا ہے گلفشاں ہونا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے "کیا لکھیے"؟ — نکتہ ہاے خرد فزا لکھیے

(۸) طغرل اور سنجر، دھوکہ دے کر ملک کے وارث بن گئے تھے۔ جب بادشاہت شاہ ظفر کے قبضہ میں آئی تو معلوم ہوا طغرل و سنجر جو فریب دے کر بادشاہ بن گئے تھے وہ غلط تھے۔ ملک کے صحیح وارث شاہ ظفر ہی ہیں۔

(۱۲) صاحبقران۔ وہ بادشاہ کہلاتا ہے جس کی ولادت کے وقت تین مبارک ستارے ایک برج میں جمع ہوں۔ امیر تیمور اور شاہجہاں صاحبقران بادشاہ تھے۔ یہ شعر دعائیہ ہے اور لفظ 'صاحبقران' بادشاہ کی کامیاب حکومت کے لیے استعمال ہوا ہے۔

١٥٠ بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے — خامۂ نخلِ رُطب فشاں ہو جائے

آم کا کون مردِ میداں ہے؟ — ثمر و شاخ، گوے و چوگاں ہے

تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں؟ — آئے، یہ گوے اور یہ میداں

آم کے آگے پیش جاوے خاک — پھوڑتا ہے جلے پھپولے تاک

نہ چلا جب کسی طرح مقدور — بادۂ ناب بن گیا انگور

یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے — شرم سے پانی پانی ہونا ہے

مجھ سے پوچھو، تمہیں خبر کیا ہے؟ — آم کے آگے نیشکر کیا ہے؟

نہ گُل اس میں، نہ شاخ و برگ نہ بار — جب خزاں آئے تب ہو اس کی بہار

اور دوڑائیے قیاس کہاں؟ — جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں؟

جان میں ہوتی گر یہ شیرینی (١٠) — کوہ کن، باوجودِ غمگینی

جان دینے میں اُس کو یکتا جان (١١) — پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان

نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر (ق) — کہ دواخانۂ ازل میں مگر

آتشِ گُل پہ قند کا ہے قِوام — شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام

یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے — باغبانوں نے باغِ جنت سے

انگبیں کے، بحکمِ رب الناس — بھر کے بھیجے ہیں، سر بمہر گلاس

یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات — مدتوں تک دیا ہے آبِ حیات

١٠ و ١١ اشعار میں فرماتے ہیں جان میں اگر آم جیسی شیرینی ہوتی تو کوہکن باوجود انتہائی غمگین ہونے کے شیریں کے فراق میں اتنی آسانی سے ہرگز جان نہ دیتا۔ اگرچہ جان کے قربان کرنے میں وہ یکتائے زمانہ تھا۔ کوہکن شیریں کے مرنے کی خبر پاتے ہی تیشہ مار کر گیا مطلب یہ ہے کہ جان اتنی شیریں نہیں ہے جتنا کہ آم شیریں ہے۔ شیریں اور کوہکن کی رعایت کس خوبصورت انداز سے آئی ہے۔

تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل (۱) ہم کہاں ورنہ، اور کہاں نخیل!
تھا ترنجِ زر ایک خسرو پاس ق رنگ کا زرد پر کہاں بُو باس
آم کو دیکھتا، اگر ایک بار پھینک دیتا طلائے دست افشار
رونقِ کارگاہِ برگ و نوا نازشِ دودمانِ آب و ہوا
رہروِ راہِ خُلد کا توشہ (۵) طُوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ
صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم ناز پروردۂ بہار ہے آم
خاص وہ آم، جو نہ ارزاں ہو نو برِ نخلِ باغِ سُلطاں ہو
وہ کہ ہے والیِ ولایتِ عہد عدل سے اُس کے ہے حمایتِ عہد
فخرِ دیں، عزِّ شان وجاہِ جلال زینتِ طینت و جمالِ کمال
کارفرمائے دین و دولت و بخت چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت
سایہ اُس کا ہُما کا سایہ ہے خلق پر وہ خُدا کا سایہ ہے
اے مفیضِ وجودِ سایہ و نور جب تلک ہے نمودِ سایہ و نور
اس خداوندِ بندہ پرور کو وارثِ گنج و تخت و افسر کو
شاد و دل شاد و شادماں رکھیو! اور غالب پہ مہرباں رکھیو!

(۱) خسرو ایران کے بادشاہ کے پاس ایک کندن تھا جس کو دبا کر وہ جو چیز چاہے بنا سکتا تھا۔ اس نے ایک لیموں بنایا تھا جو اس کے دستر خوان کی زینت ہوتا تھا اور اس کے بعد کسریٰ نے سونے کا ساگ بنوایا۔ اسی سونے کو مرزا طلائے دست افشار کہتے ہیں اگر خسرو آم دیکھ لیتا تو دست افشار کو فوراً پھینک دیتا کیونکہ اس کا رنگ اگرچہ آم کی طرح زرد تھا مگر یہ خوشبو اور مٹھاس کہاں وہ آم ہی کو دستر خوان کی زینت بناتا۔

(۵) طُوبیٰ بہشت کے ایک درخت کا نام ہے۔ خاص یہ کہ آم بھی بہشت کا میوہ ہے اور خلد کا توشہ ہے۔

قطعات

اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر — اے جہاں دارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل

پانو سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ — فرق سے تیرے کرے کسب سعادت اکلیل

تیرا اندازِ سخن، شانۂ زلفِ الہام — تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل

تجھ سے عالم پہ کھلا، رابطۂ قُربِ کلیم — تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل

بہ سخن اوجِ دہِ مرتبۂ معنے و لفظ — بہ کرم، داغِ ناصیۂ قلزم و نیل

تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر — تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل

ماہ نے چھوڑ دیا، ثور سے جانا باہر — زُہرہ نے ترک کیا، حُوت سے کرنا تحویل

تیری دانش، مری اصلاحِ مفاسد کی رہین — تیری بخشش، مری انجاحِ مقاصد کی کفیل

تیرا اقبالِ ترحّم، مرے جینے کی نوید — تیرا اندازِ تغافل، مرے مُرنے کی دلیل

بختِ ناساز نے چاہا، کہ نہ دے مجھ کو اماں — چرخِ کج باز نے تاکا کہ کرے مجھ کو ذلیل

پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ — پہلے ٹھونکی ہے بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

تپشِ دل، نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم — کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِّ ثقیل

دُرِ معنی سے مرا صفحہ، لقا کی داڑھی ۱۲ — غمِ گیتی سے مرا سینہ، عمرو کی زنبیل

فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر — کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدّق توضیح — میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف — جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل

کعبۂ کون و مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر — کعبۂ امن و اماں عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

(۱۲) لقا مصر کے ایک فرعون کا نام تھا جو اپنی داڑھی کے بالوں میں موتی پرو کر رکھتا تھا۔ شعر گوئی کی قابلیت کے لحاظ سے میری تحریر لقا کی داڑھی کی موتیوں کی لڑی ہے۔ مگر افسوس کہ دنیا بھر کے تمام غم و اندوہ میرے سینے میں اسی طرح بھرے ہوئے ہیں، جیسے عمرو عیار کا چکول جو دنیا بھر کی چیزوں کو اپنے اندر بھر لیتا تھا۔

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری — کیا کرتے تھے تم تقریر، ہم خاموش رہتے تھے ۱۵۲
بس اب بگڑے، پہ کیا شرمندگی جانے دو، مل جاؤ — قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں "کیوں، ہم نہ کہتے تھے"

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں! — اک تیر میرے سینہ میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرّا کہ ہے غضب — وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حف نظر — طاقت رُبا وہ اُن کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ! — وہ بادہ ہائے نابِ گوارا کہ ہائے ہائے

در مدح ڈلی

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی — زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے — ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے
مُہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے — حرزِ بازوئے شگرفانِ خود آرا کہیے
مِسّی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھیے — داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے
خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیے — سرِ پستانِ پری زاد سے مانا کہیے
اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے — خالِ مشکینِ رُخِ دلکشِ لیلا کہیے
حجرُ الاسودِ دیوارِ حرم کیجے فرض — نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہیے
وضع میں اس کو اگر سمجھیے قافِ تریاق — رنگ میں سبزۂ نوخیزِ مسیحا کہیے
صومعے میں اسے ٹھہرائیے گر مُہرِ نماز — میکدے میں اِسے خشتِ خُمِ صہبا کہیے
کیوں اِسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے؟ — کیوں اُسے نقطۂ پرکارِ تمنا کہیے؟
کیوں اسے گوہرِ نایاب تصور کیجیے؟ — کیوں اسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہیے

۱۵۴ کیوں اُسے مُہرِ نگینۂ پیراہنِ لیلیٰ لکھیے؟ کیوں اُسے نقش پیِ ناقۂ سلمیٰ کہیے
بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجے فرض اور اِس چکنی سپاری کو سُویدا کہیے

نہ پُوچھ اس کی حقیقت حضُورِ والا نے مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خُلد سے باہر جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی! اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے
سو پُشت سے ہے پیشۂ آبا سپہگری کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے
آزادرو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کُل ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں؟ مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
اُستادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

(۱) نیر عرشی صاحب نے اس زمین میں مولوی علی بخش شرر کے پیچوان کی رسید لکھی ہے جس کے چند اشعار دیے جاتے ہیں جو پڑھنے کے قابل ہیں۔ فرماتے ہیں۔

پیچواں حقہ عنایت جو کیا حضرت نے جگر و دل میں یہ جھگڑا ہے اسے کیا کہیے
قبلۂ عرشِ معلّیٰ کے مشابہ لکھیے اور لطافت میں مہ و مہر سے مانا کہیے
آبِ حیواں کے یہ بھرنے کی صراحی ہے مگر حضرتِ خضر کی تسبیح کا شمسا کہیے
حقے کو لکھیے اگر ماہ شبِ چاردہم نیچے کو دیکھتے ہی چاند کا ہالا کہیے
سارے نیچے پہ جو ہے کام یہ زردوزی کا کہکشاں سے بھی نہ کیوں تیرے میں اعلیٰ کہیے
آتشِ گُل سے جو اس نے چمکتی ہے چلم ساتھ موسیٰ کے ضیائے یدِ بیضا کہیے
دار کی شکل ہے نے حقہ کہے ہے حق حق مثل منصور نہ کیوں حقہ کا رتبا کہیے
دم میں دم آئے ہے جو شخص ہو اس کا ہمدم دم کو اس کے مگر انفاس مسیحا کہیے
گوشِ غلماں کا تو آویزا یہ حقہ ہے شرر نیچے کو رشکِ وہ گیسوے حورا کہیے

۱۵۵

جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر — سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
میں کون اور ریختہ ہاں اِس سے مُدعا — جُز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے
سہرا لکھا گیا زرہِ امتثالِ امر — دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آپڑی ہے سخن گُسترانہ بات — مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے
رُوئے سخن کسی کی طرف ہو تو رُوسیاہ — سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے
قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں (۱) — ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ — کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

بہ تقریب شادی شہزادہ جواں بخت، بادشاہ بیگم زینت محل کی فرمائش پر مرزا غالب نے جو سہرا لکھا تھا اس کے مقطع میں سخن گسترانہ بات آپڑی تھی وہ شاہ ظفر کو ناگوار گزری۔ خیال ہوا کہ یہ تو استاد ذوق پر چوٹ ہوئی ہے۔ اتفاقاً ذوق بھی آگئے اور اُن سے کہا گیا کہ ایک سہرا آپ بھی لکھیں جس پر معاملہ نے طول پکڑا۔ مگر غالب موقع شناس تھے اور ان کا مسلک صلح کل تھا۔ بقول خود سہ آزادہ رو ہوں... الخ لہٰذا یہ معذرت نامہ پیش کیا۔

(۱) مرزا غالب نے معذرت کا یہ شعر خط بنام نواب کلب علی خاں میں استعمال کیا تھا، یہ مرزا کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط ہے۔ فوٹو ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے توقیع وقیع عز ورود لایا غزل کی پسند آنی میری سخنوری کا رُتبہ بڑھایا فلک نہیں چاہتا ہے میرا کلام مقبول طبایع اہل کمال ہو حضرت کو خالق اکبر نے وہ قوت اور قدرت عطا کی ہے کہ آپ علی الرغم فلک کام کر سکتے ہیں سہ قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے فلک نے مجھ پر بڑی بڑی اور اُلجھا و غم و فکر کے ڈالی مگر میری طبیعت بدل نسکا یعنی بجناب بلری بہت تضرع و زاری کے مگر اپنی قسمت بدل نسکا زیادہ حد ادب سہ تم سلامت رہو قیامت تک دولت و عز و جاہ روزافزوں سہ تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

ہر برس کے ہوں

[۱۵۶] نصرت الملک بہادر مجھے بتلا کہ مجھے ؎ تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے؟
گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے ؎ رونقِ بزمِ مہ و مہر تری ذات سے ہے
اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں ؎ غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے
خستگی کا ہو بھلا جس کے سبب سے سرِ دست ؎ نسبت اک گونہ مرے دل کو ترے ہات سے ہے
ہاتھ میں تیرے رہے توسنِ دولت کی عناں ؎ یہ دعا شام و سحر قاضیِ حاجات سے ہے
تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا ؎ گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے
اِس پہ گزرے نہ گماں ریو و ریا کا زنہار ؎ غالبِ خاک نشیں اہلِ خرابات سے ہے

در مدح شاہ

ہے چار شنبہ آخر ماہِ صفر چلو! (۸) رکھدیں چمن میں بھر کے مئے مشک بو کی ناند
جو آئے جام بھر کے پیے اور ہو کے مست (۹) سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند
غالب یہ کیا بیاں ہے بجز مدحِ بادشاہ (۱۰) بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشت خواند
بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلّے حضور میں (۱۱) ہے جن کے آگے سیم و زرِ مہر و ماہ ماند
یوں سمجھیے کہ بیچ سے خالی کیے ہوئے (۱۲) لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بیشمار چاند

(۸) اس قطعہ میں جس رسم کی طرف اشارہ ہے اُس کی اصل یہ ہے کہ ماہِ صفر کے آخر چہار شنبہ کو رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم مرضِ صحت تھے اس دن خوشی منائی جاتی ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں "آج ماہِ صفر کا آخری چہار شنبہ ہے چلو ہم بھی چمن میں مئے مشکبو کی ناند بھر کر رکھدیں تاکہ اپنے احباب کے ساتھ خوشی منائیں"۔
آج کے دن احباب سبزہ روندنے کے لیے چمن میں آئیں گے گلگشتِ باغ کے ساتھ مے نوشی کا بھی لطف رہے گا۔
(۹) تاکہ جو باغ میں آئے وہ شراب کے جام پیے۔ اور پھر مستی کے عالم میں سبزے کو روندتا پھرے اور پھولوں کے پودوں کو پھاند جائے۔
(۱۰) غالب اب مجھے بادشاہ کی مدح کے سوا اور دوسری بات لکھنی اچھی معلوم نہیں ہوتی۔
(۱۱) آج بادشاہ کے محل میں سونے چاندی کے چھلّے تقسیم ہو رہے ہیں ان چھلوں کی چمک دمک کے سامنے مہر و ماہ کا سیم و زر بھی ماند ہے۔
(۱۲) سونے کے چھلّوں کو آفتاب سے اور چاندی کے چھلّوں کو ماہتاب سے تشبیہ دی ہے

۱۵۷

مدحِ شاہ

اے شاہِ جہانگیرِ جہاں بخشِ جہاں دار (۱) ہے غیب سے ہردم تجھے صد گونہ بشارت
جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو تو وا کرے اُس عقدہ کو سو بھی بہ اشارت
ممکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر (۳) گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت
آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا ہے فخرِ سلیماں جو کرے تیری وزارت
ہے نقشِ مُریدی ترا فرمانِ الٰہی (۵) ہے داغِ غلامی ترا توقیعِ امارت
تو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلان تو آگ سے گر دفع کرے تابِ شرارت
ڈھونڈے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت
ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغل ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت
کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر قاصر ہے ستایش میں تری میری عبارت
نوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں (۱۰) نظارگیِ صنعتِ حق اہلِ بشارت
تجھ کو شرفِ مہرِ جہانتاب مُبارک! غالبؔ کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

(۱) یہ قطعہ نوروز کی مبارک باد پر مشتمل ہے اور نوروز برجِ حمل میں داخلے کے وقت منایا جاتا ہے مرزا صاحب حترور کو لکھتے ہیں:
تحویلِ آفتاب بہ حمل کے باب میں موٹی بات یہ ہے کہ ۲۲ مارچ کو واقع ہوئی اور کبھی ۲۱ اور کبھی ۲۳ بھی آپڑتی ہے اس سے تجاوز نہیں۔
(۳) فرماتے ہیں اس وقت تک حضرت خضر کا سکندر سے تیرا ذکر کرنا ممکن نہیں ہے جب تک آبِ حیات سے دہانِ لب کو پاک نہ کریں۔
(۵) توقیعِ امیری۔ امیری کی سند
فرماتے ہیں تیرا نقشِ مریدی فرمانِ الٰہی ہے یعنی جسے تو نے اپنی مریدی کی سند دیدی اسے گویا فرمانِ الٰہی مل گیا اور جسے تیرا داغِ غلامی میسر ہوا اسے امیری نصیب ہوگئی۔ مطلب یہ کہ تیری غلامی امیری سے بلند ہے۔
(۱۰) نوروز ماہ مارچ میں ہوتا ہے جبکہ آفتاب برجِ حمل میں آجاتا ہے اور یہ مہینہ موسمِ بہار کہلاتا ہے۔ اہلِ مشرق اس دن بڑے بڑے جشن کرتے ہیں۔ آفتاب کا برجِ حمل میں آنا تجھے مبارک ہو اور غالب کو تیرے بلند آستان کی زیارت مبارک ہو۔

۱۵۸

قطعہ

افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو (۱) اُس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ (۲) اے جہاندارِ آفتاب آثار
تھا مَیں اک بے نوائے گوشہ نشین تھا مَیں اک دردمندِ سینہ فگار
تم نے مجھکو جو آبرو بخشی ہوئی میری وہ گرمیِ بازار
کہ ہوا مجھ سا ذرّۂ ناچیز روشناسِ ثوابت و سیّار
گرچہ از رُوئے ننگِ بے ہُنری ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گر اپنے کو مَیں کہوں خاکی جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں بادشہ کا غلامِ کارگزار

(۱) "اگرچہ تاب مجھ میں روزہ رکھنے کی کہاں مگر بدتر روزہ داروں سے ہوں۔ روزہ داروں کو کیا کہوں کیا حال ہے؟ میرے چار خدمت گزار ہیں۔ چاروں روزہ دار آخر مجھ کو یوں نظر آتا ہے کہ چار مردے پھر رہے ہیں۔ یہ پریشانی اور یہ بے سامانی نہ خس نہ خانہ نہ برف آب آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں "افطارِ صوم کی جسے دستگاہ ہو الخ"
رُباعی اور قطعہ کل حضور میں پڑھا تھا بہت ہنسے اور خوش ہوئے۔

(۲) اس قطعہ کے لیے مرزا صاحب نے اپنے ایک خط میں منشی نبی بخش حقیر کو لکھا ہے "یار چھ مہینے پورے ہو چکے ہیں۔ ۲ جولائی سے دسمبر تک، اب میں دیکھوں یہ ششماہی مجھے کب ملتا ہے۔ بعد اس کے ملنے کے اگر آئندہ ماہ بہ ماہ کر دیں گے تو لکھوں گا۔ ورنہ اس خدمت کو میرا سلام ہے۔ ابھی بابر کا حال حضور میں نہیں بھیجا۔ کل مسودہ تمام ہوا ہے صاف ہو رہا ہے۔ اب صاف کر کر دیوں گا اور آئندہ ماہ بہ ماہ کی استدعا کروں گا۔ چھ ماہی آخر ہونے کو تھی اس واسطے متوجہ ہو کر میں نے اس کو تمام کیا"۔
اور جب بابر کا حال شاہ کے حضور میں پیش کیا تو اس کے ساتھ یہ منظوم درخواست بھی گزاری۔ (اور بعد میں مرزا صاحب کی تنخواہ ماہ بہ ماہ قرار پائی)، "اس سبب سے فرصت تم کو خط لکھنے کی نہ ہوئی"۔

159

خانہ زاد اور مرید اور مداح | تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار
بارے نوکر بھی ہوگیا صد شکر | نسبتیں ہو گئیں مشخص چار
نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں؟ [۳] | مدعائے ضروری الاظہار
پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں | ذوقِ آرائشِ سر و دستار
کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر | تا نہ دے بادِ زمہریر آزار

[۳] اس شعر کو مرزا صاحب نے نواب کلب علیخاں کے جس خط میں استعمال کیا ہے ۔ اس کا عکس ملاحظہ فرمائیے :

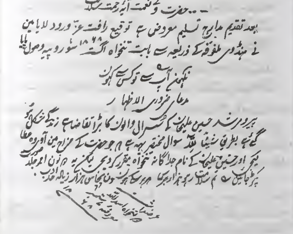
حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت
بعد تقدیم مراسم تسلیم معروض ہے توقیع رافت عز ورود لایا
نے منشی ملفوفہ کے ذریعہ سے بابت تنخواہ اگست ۱۸۶۸ سو روپیہ وصول پایا
نکہوں آپ سے تو کس سے کہوں
مدعای ضروری الاظہار
پیر و مرشد حسین علیخان کے سسرال والوں کا بڑا تقاضا ہے زندگی شکل ہو
گئی ہے بطریق شتابی سوال مختصر یہ ہے جو حضرت کے مزاج میں آوے وہ عطا
کیجئے اور حسین علیخان کے نام جداگانہ تنخواہ مقرر کر دیجئے لیکن یہ دونوں امر جلد صورت
پکڑ جائیں تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار زیادہ حد ادب

۱۶۰ کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش؟ جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار
کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار
رات کو آگ اور دن کو دھوپ بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار
آگ تاپے کہاں تلک انسان؟ دھوپ کھاوے کہاں تلک جاندار؟
دھوپ کی تابش آگ کی گرمی وقنا ربنا عذاب النار
میری تنخواہ جو مقرر ہے اُس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مُردہ کی چھ ماہی ایک خلق کا ہے اِسی چلن پہ مدار

مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات اور چھ ماہی ہو سال میں دوبار
بسکہ لیتا ہُوں ہر مہینے قرض اور رہتی ہے سُود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا ہوگیا ہے شریک ساہوکار
آج مجھ سا نہیں زمانے میں شاعرِ نغز گوے خوش گفتار
رزم کی داستان گر سُنیے ہے زباں میری تیغِ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجے ہے قلم میرا ابرِ گوہر بار

ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا؟ آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار
میری تنخواہ کیجے ماہ بہ ماہ تا نہ ہو مجھ کو زندگی دُشوار
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام شاعری سے مُجھے نہیں سروکار
تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

۱۶۱

قطعات

(۱) سیہ گلیم ہُوں لازم ہے میرا نام نہ لے — جہاں میں جو کوئی فتح وظفر کا طالب ہے
ہُوا نہ غلبہ میسّر کبھی کسی پہ مجھے — کہ جو شریک ہو میرا شریکِ غالب ہے

(۲) سہل تھا مسہل ولے یہ سخت مشکل آپڑی — مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے
تین دِن مسہل سے پہلے تین دِن مسہل کے بعد — تین مسہل تین تبریدیں یہ سب کے دن ہوئے

(۳) خجستہ انجمنِ طُوے میرزا جعفر — کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محظوظ
ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں غالبؔ — نہ کیوں ہو مادّۂ سالِ عیسوی محفوظ
قطعہ تاریخ ۱۸۵۴ء

(۴) ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی — ہُوا بزمِ طرب میں رقصِ ناہید
کہا غالبؔ سے تاریخ اس کی کیا ہے؟ — تو بولا "اِنشراحِ جشنِ جمشید"

(۵) گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں — دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں
کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام — اِس سے ہے یہ مُراد کہ ہم آشنا نہیں

(۱) سیہ گلیم یعنی سیہ پوش؛ مراد سیاہ بخت۔ فرماتے ہیں: اگر دنیا میں کوئی فتح وظفر کا طالب ہے تو مجھ سیاہ بخت کا نام نہ لے۔ اگر میرا نام لے گا تو کامیابی نصیب نہیں ہوگی۔ مَیں وہ ہوں جسے کبھی کسی پر غلبہ حاصل نہیں ہوا جو شخص میرا شریک ہوتا ہے اس کا حصہ ہمیشہ مجھ سے زیادہ ہوتا ہے۔

(۲) مسہل لینا تو آسان ہے لیکن یہ سخت مشکل آپڑی ہے کہ بادشاہ کے دربار میں غیر حاضر رہنے سے میری کیا حالت ہوگی۔ مسہل لینے سے پہلے تین دن منضج پیوں گا اس کے بعد تین دن مسہل ہوں گے پھر تین تبریدیں ہوں گی گویا اس طرح بارہ دن غیر حاضر رہوں گا۔

(۵) بادشاہ کے دربار کے یہ آداب تھے کہ آپس میں جو دربار دار وہاں ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے تو ماتھے پر ہاتھ رکھنے کی جگہ دایاں ہاتھ داہنے کان پر رکھ لیتے تھے کیونکہ اردو محاورے میں کان پر ہاتھ دھرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم آشنا نہیں۔ اس لیے مرزا صاحب نے اس پیرائے میں بیان کیا ہے کہ ایک بادشاہ کے گو سب خانہ زاد غلام ہیں لیکن سلام کرتے ہوئے کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم آشنا نہیں ہیں۔

رُباعیات

بعد از اتمامِ بزمِ عیدِ اطفال — ایامِ جوانی رہے ساغر کشِ حال
آ پہنچے ہیں تا سوادِ اقلیمِ عدم — اے عمرِ گزشتہ ایک قدم استقبال

شب زُلف و رُخِ عرق فشاں کا غم تھا — کیا شرح کروں کہ طُرفہ تر عالم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک — ہر قطرۂ اشک، دیدۂ پُر نم تھا

آتش بازی ہے جیسے شغلِ اطفال — ہے سوزِ جگر کا بھی اِسی طور کا حال
تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی — لڑکوں کے لیے گیا ہے کیا کھیل نکال

دل تھا کہ جو جانِ دردِ تمہید سہی — بے تابیِ رشک و حسرتِ دید سہی
ہم اور فسردن، اے تجلی افسوس! — تکرار روا نہیں تو تجدید سہی

ہے خلقِ حسد قماش لڑنے کے لیے — وحشت کدہ تلاش لڑنے کے لیے
یعنی ہر بار صورتِ کاغذِ باد — ملتے ہیں یہ بد معاش لڑنے کے لیے

دل سخت نژند ہو گیا ہے گویا — اُس سے گلہ مند ہو گیا ہے گویا
پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں — غالب! منہ بند ہو گیا ہے گویا

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالبؔ — دل رُک کر بند ہو گیا ہے غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں — سونا سوگند ہو گیا ہے غالبؔ

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل — سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش — گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

(۱) بھیجی ہے جو مجھ کو شاہِ جَمجاہ نے دال — ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال — ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم — آثارِ جلالی و جمالی باہم
ہو شاد نہ کیوں، سافل و عالی باہم — ہے اب کی شبِ قدر و دوالی باہم

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے — تا شاہ شیوعِ دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ — ہے صِفر کہ افزایشِ اعداد کرے

اس رشتہ میں لاکھ تار ہوں بلکہ سوا — اتنے ہی برس شمار ہوں بلکہ سوا
ہر سیکڑہ کو ایک گرہ فرض کریں — ایسی گرہیں ہزار ہوں بلکہ سوا

کہتے ہیں کہ "اب وہ مردم آزار نہیں" — عشّاق کی پرسش سے اُسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اُٹھایا ہوگا — کیونکر مانوں، کہ اُس میں تلوار نہیں

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے — کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے
کہتے ہیں، کہیں خدا سے، اللہ اللہ — وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

(۳) سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں؟ — آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں؟
روزہ مرا ایمان ہے، غالب! لیکن — خس خانہ و برف آب کہاں سے لاؤں؟

(۵) ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے — بھیجے ہیں جو ارمغاں شہ والا نے
گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار — فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

(۱) بادشاہ کے یہاں مونگ کی دال پکا کرتی تھی جو شاہ پسند کہلاتی تھی۔ یہ رباعی اُس کے شکریہ میں کہی گئی۔
(۳) مرزا نے حقیر کو لکھا: "یہ رباعی اور یہ قطعہ کل حضور میں پڑھا تھا۔ بہت ہنسے اور خوش ہوئے"۔
(۵) بادشاہ نے سیم کے بیجوں کا سالن بھیجا تھا اس کے شکریہ میں یہ رباعی کہی تھی سیم کے بیجوں کو فیروزہ کے دانوں سے تشبیہ دی گئی ہے

تتمّہ

دیکھنے میں ہیں گرچہ دو، پر ہیں یہ دونوں یار ایک
وضع میں گو ہوئی دو سر، تیغ ہے ذوالفقار ایک

ہم سخن اور ہم زباں، حضرتِ قاسم و طپاں
ایک طپش کا جانشیں، درد کا یادگار ایک

نقدِ سخن کے واسطے، ایک عیارِ آگہی
شعر کے فن کے واسطے، مایۂ اعتبار ایک

ایک وفا و مہر میں، تازگیِ بساطِ دہر
لطف و کرم کے باب میں، زینتِ روزگار ایک

گلکدۂ تلاش کو، ایک ہے رنگ، اک ہے بُو
ریختہ کے قماش کو، پود ہے ایک، تار ایک

مملکتِ کمال میں، ایک امیرِ نامور
عرصۂ قیل و قال میں، خسروِ نامدار ایک

گلشنِ اتفاق میں، ایک بہارِ بے خزاں
مے کدۂ وفاق میں، بادۂ بے خمار ایک

زندۂ شوقِ شعر کو، ایک چراغِ انجمن
کشتۂ ذوقِ شعر کو، شمعِ سرِ مزار ایک

دونوں کے دل حق آشنا، دونوں رسول پر فدا
ایک محبِّ چار یار، عاشقِ ہشت و چار ایک

جانِ وفا پرست کو، ایک شمیمِ نو بہار
فرقِ ستیزہ مست کو، ابرِ تگرگ بار ایک

لایا ہے کہہ کے یہ غزل شائبۂ ریا سے دُور
کر کے دل و زبان کو، غالبِ خاکسار ایک

یہ غزل مرزا صاحب کے قیامِ کلکتہ کے زمانے کی ہے اور متفرقاتِ غالب میں شائع ہو چکی ہے۔ طپاں کا نام مرزا احمد خاں بیگ دہلوی ہے اور انھوں نے مارچ ۱۸۳۲ء میں انتقال کیا ہے۔ قاسم کا پورا نام بہادر شاہ کے روزنامچے (شائع کردہ خواجہ حسن نظامی مرحوم) کے اس اندراج سے معلوم ہوتا ہے ۱۲ دسمبر ۱۸۴۵ء کو مصلح الدولہ سید ابوالقاسم خاں مرحوم وقائع نگارِ سلطانی نے بمرضِ وبا (ہیضہ) ایک دن میں انتقال کیا۔ (از نسخۂ عرشی)

اپنا احوالِ دلِ زار کہوں یا نہ کہوں!
ہے حیا مانعِ اظہار کہوں یا نہ کہوں؟

نہیں کرنے کا مَیں تقریر ادب سے باہر
میں بھی ہوں واقفِ اسرار کہوں یا نہ کہوں؟

شکوہ سمجھو اسے یا کوئی شکایت سمجھو
اپنی ہستی سے ہوں بیزار کہوں یا نہ کہوں؟

اپنے دل ہی سے میں احوالِ گرفتاریِ دل
جب نہ پاؤں کوئی غمخوار کہوں یا نہ کہوں؟

دل کے ہاتھوں سے، کہ ہے دشمنِ جانی اپنا
ہوں اک آفت میں گرفتار کہوں یا نہ کہوں؟

میں تو دیوانہ ہوں اور ایک جہاں ہے غمّاز
گوش ہیں درپسِ دیوار کہوں یا نہ کہوں؟

آپ سے وہ مرا احوال نہ پوچھے، تو اسدؔ!
حسبِ حال اپنے پھر اشعار کہوں یا نہ کہوں؟

ممکن نہیں، کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
میں دشتِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں

ہوں دردمند، جبر ہو یا اختیار ہو
گہ نالۂ کشیدہ، گہ اشکِ چکیدہ ہوں

جاں لب پہ آئی تو بھی نہ شیریں ہوا دہن
ازبسکہ تلخیِ غمِ ہجراں چشیدہ ہوں

نے سُبحہ سے علاقہ نہ ساغر سے واسطہ
میں معرضِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں

ہوں خاکسار، پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ
نے دانۂ فتادہ ہوں نے دامِ چیدہ ہوں

جو چاہیے، نہیں وہ مری قدر و منزلت
میں یوسفِ بقیمتِ اوّل خریدہ ہوں

ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
ہوں میں کلامِ نغز، ولے ناشنیدہ ہوں

اہلِ ورع کے حلقہ میں ہر چند ہوں ذلیل
پر عاصیوں کے فرقہ میں، مَیں برگزیدہ ہوں

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینہ سے، کہ مردُم گزیدہ ہوں

مجلسِ شمع عذاراں میں جو آ جاتا ہوں
شمع ساں میں تہِ دامانِ صبا جاتا ہوں

ہو وے ہے جادۂ رہ رشتۂ گوہر ہر گام
جس گزرگاہ میں مَیں آبلہ پا جاتا ہوں

سرگراں مجھ سے سنگ رہ کے نہ رہنے سے ہو
کہ بہ یک جنبشِ لب مثلِ صدا جاتا ہوں

۱۶۶

قطعہ

ہندوستان کی بھی عجب سرزمین ہے (۱) — جس میں وفا و مہر و محبت کا ہے وفور
جیسا کہ آفتاب نکلتا ہے شرق سے — اخلاص کا ہوا ہے اسی مُلک میں ظہور
ہے اصل تخمِ ہند سے، اور اس زمین سے — پھیلا ہے سب جہاں میں یہ میوہ دُور دُور

شبِ وصال میں مونس گیا ہے بن تکیہ — ہوا ہے موجبِ آرامِ جان و تن تکیہ
خراج بادشۂ چیں سے کیوں نہ مانگوں آج — کہ بن گیا ہے خمِ جعدِ پُر شکن تکیہ
بنا ہے تختۂ گُل ہائے یاسمیں بستر — ہوا ہے دستۂ نسرین و نسترن تکیہ
فروغِ حُسن سے روشن ہے خواب گاہ تمام — جو رختِ خواب ہے پرویں تو ہے پرَن تکیہ
مزا ملے کہو کیا خاک ساتھ سونے کا — رکھے جو بیچ میں وہ شوخِ سیمتن تکیہ
اگرچہ تھا یہ ارادہ مگر خدا کا شُکر — اٹھا سکا نہ نزاکت سے گلبدن تکیہ
ہوا ہے کاٹ کے چادر کو ناگہاں غائب — اگرچہ زانوے نَل پر رکھے دَمن تکیہ
بضربِ تیشہ وہ اِس واسطے ہلاک ہوا — کہ ضربِ تیشہ پہ رکھتا تھا کوہکن تکیہ
یہ رات بھر کا ہے ہنگامہ صبح ہونے تک — رکھو نہ شمع پر اے اہلِ انجمن تکیہ
اگرچہ پھینک دیا تم نے دُور سے لیکن — اٹھائے کیونکہ یہ رنجورِ خستہ تن تکیہ
غش آگیا جو پس از قتل میرے قاتل کو — ہوئی ہے اُس کو مری نعشِ بے کفن تکیہ
شبِ فراق میں یہ حال ہے اذیّت کا — کہ سانپ فرش ہے اور سانپ کا ہے مَن تکیہ
روا رکھو نہ رکھو تھا جو لفظ "تکیہ کلام" — اب اُس کو کہتے ہیں اہلِ سُخن "سُخن تکیہ"
ہم اور تم فلکِ پیر جس کو کہتے ہیں — فقیرِ غالبِ مسکیں کا ہے کُہن تکیہ

(۱) "ماسٹر پیارے لال آشوب دہلی سوسائٹی کے سکرٹری تھے۔ انھوں نے ایک مضمون سوسائٹی کے جلسہ میں پڑھا بقول اسد اللہ خاں اس ملک کے آدمی احسان فراموش نہیں ہیں، جو شخص ان سے ذرا سی محبت کرتا ہے یہ اُس سے سر چند محبت کرنے کو تیار ہیں۔ اور مندرجہ بالا قطعہ از مرزا غالب بھی پڑھ کر سنایا۔"

میں ہوں مشتاقِ جفا، مجھ پہ جفا اور سہی (١)
تم ہو بیداد سے خوش، اس سے سوا اور سہی

غیر کی مرگ کا غم کس لیے، اے غیرتِ ماہ!
ہیں ہوس پیشہ بہت، وہ نہ ہوا، اور سہی

تم ہو بُت، پھر تمہیں پندارِ خدائی کیوں ہے؟
تم خداوند ہی کہلاؤ، خُدا اور سہی

حُسن میں حور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی
آپ کا شیوہ و انداز و ادا اور سہی

تیرے کوچے کا ہے مائل دلِ مضطر میرا
کعبہ اک اور سہی، قبلہ نما اور سہی

کوئی دُنیا میں مگر باغ نہیں ہے، واعظ!
خُلد بھی باغ ہے، خیر آب و ہوا اور سہی

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں، یارب!
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

مجھ کو وہ دو، کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں
زہر کچھ اور سہی، آبِ بقا اور سہی

مجھ سے، غالبؔ یہ علائیؔ نے غزل لکھوائی
ایک بیداد گرِ رنج فزا اور سہی

آپ نے مَسَّنِیَ الضُّر کہا ہے تو سہی (٢)
یہ بھی یا حضرتِ ایوب! گلا ہے تو سہی

رنج طاقت سے سوا ہو تو نہ پیٹوں کیونکر
ذہن میں خوبیِ تسلیم و رضا ہے تو سہی

ہے غنیمت کہ بامید گزر جائے گی عمر
نہ ملے داد، مگر روزِ جزا ہے تو سہی

دوست گر کوئی نہیں ہے جو کرے چارہ گری
نہ سہی، ایک تمنائے دوا ہے تو سہی

غیر سے، دیکھیے کیا خوب نبھائی اس نے
نہ سہی ہم سے، پر اس بُت میں وفا ہے تو سہی

(١) یہ غزل مرزا غالبؔ نے نواب علائیؔ کے اصرار پر لکھی تھی اور اُن کے والد ماجد نواب امین الدین احمد خاں والیِ لوہارو کو ارسال کرتے ہوئے تحریر فرمایا: "وکیل حاضر باش دربار اسداللہ یعنی علائی مولائی نے اپنے موکل کی خوشنودی کے واسطے فقیر کی گردن پر سوار ہو کر ایک اُردو کی غزل لکھوائی۔ اگر پسند آئے مطرب کو سکھائی جائے جھنجھوٹی کے اونچے سروں میں راہ رکھوائی جائے۔ اگر جیتا رہا جاڑوں میں آکر میں بھی سُن لوں گا۔"

(٢) حضرت ایوبؑ کا صبر مشہور ہے۔ خدا نے اُن کا امتحان لینے کے لیے سخت بیماریوں میں مبتلا کر دیا مگر اُن کے صبر میں لغزش نہ آئی آخر میں غیبی آواز آئی کہ اے ایوب زمین پر ٹھوکر مار۔ ٹھوکر مارنے سے چشمۂ آب پھوٹ پڑا جس کے غسل سے صحتیاب ہو گئے اور مال و دولت و اولاد سے سرفراز ہوئے۔

۱۶۸

نقل کرتا ہوں اُسے نامۂ اعمال میں مَیں
کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی

کبھی آجائے گی کیوں کرتے ہو جلدی غالبؔ
شہرۂ تیزیِ شمشیرِ قضا ہے تو سہی

لطفِ نظارۂ قاتل دمِ بسمل آئے
جان جائے، تو بلا سے، پہ کہیں دل آئے

اُن کو کیا علم کہ کشتی پہ مری کیا گزری (۹)
دوست جو ساتھ مرے تا لبِ ساحل آئے

وہ نہیں ہم، کہ چلے جائیں حرم کو اے شیخ!
ساتھ حجاج کے اکثر کئی منزل آئے

آئیں جس بزم میں وہ، لوگ پکار اٹھتے ہیں
"لو، وہ برہم زنِ ہنگامۂ محفل آئے"

دیدہ خونبار ہے مدت سے، و لے آج ندیم!
دل کے ٹکڑے بھی کئی خون کے شامل آئے

سامنا حور و پری نے نہ کیا ہے، نہ کریں
عکس تیرا ہی مگر تیرے مقابل آئے

اب ہے دلّی کی طرف کوچ ہمارا غالبؔ
آج ہم حضرتِ نواب سے بھی مل آئے

دیکھ وہ برقِ تبسم بسکہ دل بیتاب ہے
دیدۂ گریاں مرا فوارۂ سیماب ہے

کھول کر دروازۂ میخانہ بولا مے فروش
"اب شکستِ توبہ میخواروں کو فتح الباب ہے"

ایک گرم آہ کی، تو ہزاروں کے گھر جلے
رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر، ہم جگر جلے

پروانہ کا نہ غم ہو، تو پھر کس لیے اسدؔ!
ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

(۹) یہ وہی شعر ہے جو الہامی کیفیت رکھتا ہے اور جس کا ذکر غالب کے خود نوشتہ خط بنام نواب کلب علیخاں میں بسلسلۂ غزل مطلع "گرم فریاد رکھا شکل نہالی نے مجھے" آگے آئیگا۔ جب کہ مرزا غالب رامپور سے واپس آرہے تھے اور مراد آباد میں کشتیوں کا پل ٹوٹ جانے کا حادثہ پیش آیا۔ ملاحظہ ہو صفحہ!

خمسہ بر غزل بہادر شاہ ظفر

گھِستے گھِستے پانوں میں زنجیر آدھی رہ گئی ۔۔۔ مَر گئے پر قبر کی تعمیر آدھی رہ گئی
سب ہی پڑھتا کاش! کیوں تکبیر آدھی رہ گئی ۔۔۔ کھنچ کے قاتل جب تری شمشیر آدھی رہ گئی
"غم سے جانِ عاشقِ دل گیر آدھی رہ گئی"

بیٹھ رہتا لے کے چشمِ پُرنم اُس کے رُوبرو ۔۔۔ کیوں کہا تو نے کہ کہہ دل کا غم اُس کے رُوبرو!
بات کرنے میں نکلتا ہے دم اُس کے رُوبرو ۔۔۔ کہہ سکے ساری حقیقت ہم نہ اس کے رُوبرو
"ہم نشیں! آدھی ہوئی تقریر آدھی رہ گئی"

تو نے دیکھا! مجھ پہ کیسی بن گئی اے رازدار! ۔۔۔ خواب و بیداری پہ کب ہے آدمی کو اختیار!
مثلِ زخم آنکھوں کو سی دیتا جو ہوتا ہوشیار ۔۔۔ کھینچتا تھا رات کو، میں خواب میں تصویرِ یار
"جاگ اُٹھا جو کھینچنی تصویر آدھی رہ گئی"

غم نے جب گھیرا تو چاہا ہم نے یوں اے دلنواز ۔۔۔ مستیٔ چشمِ سیہ سے چل کے ہو ویں چارہ ساز
تو صدائے پا سے جاگا تھا جو محوِ خوابِ ناز! ۔۔۔ دیکھتے ہی اے ستمگر تیری چشمِ نیم باز
"کی تھی پوری ہم نے جو تدبیر آدھی رہ گئی"

اُس بُتِ مغرور کو کیا ہو کسی پر التفات ۔۔۔ جس کے حُسنِ روز افزوں کی یہ ادنیٰ ہی بات
ماہِ نَو نکلے پہ گزری ہوں گی راتیں پان سات ۔۔۔ اُس رُخِ روشن کے آگے ماہِ یک ہفتہ کی رات
"تابشِ خورشیدِ پُرتنویر آدھی رہ گئی"

تا مجھے پہنچائے کاہش، بخت بد ہے گھات میں ۔۔۔ ہاں فراوانی اگر کچھ ہے تو ہے آفات میں
جُز غم و رنج و الم گھاٹا ہے ہر اک بات میں ۔۔۔ کم نصیبی اس کو کہتے ہیں کہ میرے ہات میں
"آتے ہی خاصیتِ اکسیر آدھی رہ گئی"

۱۶۰ سب سے یہ گوشہ کنارے ہے گلے لگ جامے   آدمی کو کیوں پکارے ہے گلے لگ جامے
سر سے گر چادر اُتارے ہے گلے لگ جامے   "مانگ کیا بیٹھا سنوارے ہے گلے لگ جامے
وصل کی شب، اے بُت بے پیر آدھی رہ گئی"

میں یہ کیا جانوں، کہ وہ کس واسطے ہوں پھر گئے   پر نصیب اپنا انھیں جاتا سنا، جوں پھر گئے
دیکھنا قسمت، وہ آئے اور پھر یوں پھر گئے   "آکے آدھی دور میرے گھر سے وہ کیوں پھر گئے
کیا کشش ہیں دل کی اب تاثیر آدھی رہ گئی"

ناگہاں یاد آگئی ہے مجھ کو یارب! کب کی بات   کچھ نہیں کہتا کسی سے سُن رہا ہوں سب کی بات
کس لیے تجھ سے چھپاؤں؟ ہاں وہ پرسوں شب کی بات   "نامہ بر جلدی میں تیری، وہ جو تھی مطلب کی بات
خط میں آدھی ہو سکی تحریر آدھی رہ گئی"

ہو تجلّی برق کی صورت میں، ہے یہ بھی غضب   ہاں چھ گھنٹے کی تو ہوتی، فرصتِ عیش و طرب
شام سے آتے، تو کیا اچھی گزرتی رات سب   "پاس میرے وہ جو آئے بھی تو بعد از نصف شب
نکلی آدھی حسرت، اے تقدیر آدھی رہ گئی"

تم جو فرماتے ہو، دیکھ اے غالبِ آشفتہ سر   ہم نہ تجھ کو منع کرتے تھے گیا کیوں اُس کے گھر؟
جان کی پاؤں اماں، باتیں یہ سب سچ ہیں مگر   "دل نے کی ساری خرابی لے گیا مجھ کو ظفر
واں کے جانے میں مری توقیر آدھی رہ گئی"

یہ خمسہ مرزا غالب نے بر غزل بہادر شاہ ظفر لکھا تھا اور یہ مخمس تتمہ دہلی اردو اخبار مورخہ ۱۰ رجب ۱۲۶۹ھ مطابق ۱۶ اپریل ۱۸۵۳ء میں شائع ہوا تھا اور بقولِ عرشی صاحب "یہ مخمس اسی وقت کا لکھا ہوا ہے"!

۱۷۱

قصیدہ

ملاذِ کشور و لشکر، پناہِ شہر و سپاہ
جنابِ عالیِ ایلن برونِ والا جاہ

بلند رتبہ وہ حاکم، وہ سرفراز امیر
کہ باج تاج سے لیتا ہے جس کا طرفِ کلاہ

وہ محض رحمت و رافت، کہ بہرِ اہلِ جہاں
نیابتِ دمِ عیسیٰ کرے ہے جس کی نگاہ

وہ عینِ عدل، کہ دہشت سے جس کی پرسش کی
بنے ہے شعلۂ آتش، انیسِ پرّہ کاہ

زمیں سے سودہ گوہر اٹھے بجائے غبار
جہاں ہو توسنِ حشمت کا اُسکے جولاں گاہ

وہ مہرباں ہو تو انجم کہیں "الٰہی شکر"
وہ خشمگیں ہو تو گردوں کہے "خدا کی پناہ"

یہ اُس کے عدل سے اضداد کو ہے آمیزش
کہ دشت و کوہ کے اطراف میں بہر سرِ راہ

ہزبر پنجے سے لیتا ہے کام شانے کا
کبھی جو ہوتی ہے اُلجھی ہوئی دُمِ روباہ

نہ آفتاب، ولے آفتاب کا ہم چشم
نہ بادشاہ، ولے مرتبے میں ہمسرِ شاہ

خدا نے اُس کو دیا ایک خوب رُو فرزند
ستارہ جیسے چمکتا ہوا بہ پہلوئے ماہ

زہے ستارۂ روشن، کہ جو اُسے دیکھے
شعاعِ مہرِ درخشاں ہو اُس کا تارِ نگاہ

خدا سے ہے یہ توقع کہ عہدِ طفلی میں
بنے گا شرق سے تا غرب اِس کا بازی گاہ

جوان ہو کے کرے گا یہ وہ جہانبانی
کہ تابع اس کے ہوں روز و شبِ سپید و سیاہ

یہ قصیدہ مرزا صاحب نے منشی شیو نراین کی طرف سے مسٹر ایلن برون کے فرزند تولد ہونے کی مبارکباد پر لکھا تھا چنانچہ منشی جی کو خط میں لکھتے ہیں: "کل آپ کا خط آیا۔ رات بھر میں نے فکرِ شعر میں خونِ جگر کھایا۔ ۲۱ شعر کا قصیدہ کہہ کر تمہارا حکم بجا لایا۔ میرے دوست خصوصاً مرزا تفتہ جانتے ہیں کہ میں فنِ تاریخ کو نہیں جانتا۔ اس قصیدے میں روشِ خاص سے ۱۸۵۸ء کا اظہار کر دیا ہے خدا کرے تمہارے پسند آوے خود قدر دانِ سخن ہو اور تین استاد اس فن کے تمہارے یار ہیں۔ میری محنت کی داد مل جائے گی۔" مرزا غالب کا بھیجا ہوا یہی قصیدہ منشی شیو نراین آرام نے مسٹر ایلن کو پیش کیا۔

۱۶۲

کہے گی خلق اسے "داورِ سپہرِ شکوہ" — لکھیں گے لوگ اسے خسروِ ستارہ سپاہ
عطا کرے گا خداوندِ کارساز اسے — روانِ روشن و خوے خوش و دلِ آگاہ
ملے گی اس کو وہ عقلِ نہفتہ داں کہ اسے — پڑے نہ قطعِ خصومت میں احتیاجِ گواہ
یہ ترکتاز سے برہم کرے گا کشورِ روس — یہ لے گا بادشہ چین سے چھین تخت و کلاہ
سنینِ عیسوی اٹھارہ سو اور اٹھاون — یہ چاہتے ہیں جہاں آفریں سے شام و پگاہ
یہ جتنے سینکڑے ہیں سب ہزار ہو جاویں — دراز اس کی ہو عمر اس قدر سخن کوتاہ
امیدوارِ عنایات "شیو ائن" — کہ آپ کا ہے نمک خوار اور دولت خواہ
یہ چاہتا ہے کہ دنیا میں عز و جاہ کے ساتھ — تمہیں اور اس کو سلامت رکھے سدا اللہ

قصیدہ

گنی ہیں سال کے رشتہ میں بیس بار گرہ — ابھی حساب میں باقی ہیں سو ہزار گرہ
گرہ کی ہے یہی گنتی، کہ تا بروزِ شمار — ہوا کرے گی ہر اک سال، پیشکار گرہ
یقین جان، برس گانٹھ کا جو ہے تاگا — یہ کہکشاں ہے کہ ہیں اس میں بیشمار گرہ
گرہ سے اور گرہ کی امید کیوں نہ پڑے — کہ ہر گرہ کی گرہ میں ہیں تین چار گرہ
دکھا کے رشتہ کسی جوتشی سے پوچھا تھا — کہ دیکھ کتنی اٹھا لائے گا، یہ تار گرہ
کہا، کہ چرخ پہ ہم نے گنی ہیں نو گرہیں — جو یاں گنیں گے تو پاویں گے نو ہزار گرہ
خود آسماں، ہے نہار اور راجہ پہ صدقے — کرے گا سینکڑوں اس تار پر نثار گرہ
وہ راؤ راجہ بہادر، کہ حکم سے جن کے — رواں ہو تار پہ فی الفور دانہ وار گرہ

یہ قصیدہ راجہ شیو دان سنگھ والی الور کی شان میں لکھا گیا ہے۔ مصرعہ اول سے معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت ان کی بیسویں سالگرہ کا جشن منایا گیا تھا چونکہ وہ راجہ بنی سنگھ کے ۱۸۵۷ء میں مرنے پر ۱۲ برس کی عمر میں مسند نشین ہوئے اور ستمبر ۱۸۶۳ء کو بلوغ کو پہنچے تو با اختیار کیے گئے۔ اسی موقع پر یہ قصیدہ لکھا گیا۔

اُنھیں کی سال گرہ کے لیے ہے سال بسال — کہ لائے غیب سے غنچوں کی نو بہار گرہ
اُنھیں کی سال گرہ کے لیے بناتا ہے — ہوائیں بوند کو، ابرِ تگرگ بار گرہ
اُنھیں کی سال گرہ کی یہ شادمانی ہے (۳) — کہ ہو گئے ہیں گہر ہائے شاہوار گرہ
اُنھیں کی سال گرہ کے لیے ہے یہ توقیر — کہ بن گئے ہیں ثمر ہائے شاخسار گرہ
سُن اے ندیم برس گانٹھ کے یہ تاگے نے — تجھے بتاؤں کہ کیوں کی ہے اختیار گرہ
پے دُعائے بقائے جنابِ فیض مآب — لگے گی اس میں ثوابت کی اُستوار گرہ
ہزار دانہ کی تسبیح چاہتا ہے یہی — بلا مبالغہ درکار ہے ہزار گرہ
عطا کیا ہے خدا نے یہ جاذبہ اُس کو — کہ چھوڑتا ہی نہیں رشتہ زینہار گرہ
کشادہ رُخ نہ پھرے کیوں جب اس زمانہ میں — بچے نہ از پے بندِ نقابِ یار گرہ
متاعِ عیش کا ہے قافلہ چلا آتا — کہ جادہ رشتہ ہے اور ہے شتر قطار گرہ
خدا نے دی ہے وہ غالب کو دستگاہِ سخن — کروڑ ڈھونڈ کے لاتا یہ خاکسار گرہ
کہاں مجالِ سخن سانس لے نہیں سکتا — پڑی ہے دل میں مرے غم کی پیچ دار گرہ
گرہ کا نام لیا پر نہ کر سکا کچھ بات — زباں تک آ کے ہوئی اور اُستوار گرہ
کُھلے یہ گانٹھ تو البتہ دم نکل جاوے — بُری طرح سے ہوئی ہے گلے کا ھار گرہ
اِدھر نہ ہو گی توجہ حضور کی جب تک — کبھی کسی سے کُھلے گی نہ زینہار گرہ
دعا ہے یہ کہ مخالف کے دل میں ازرہِ بُغض — پڑی ہے یہ جو بہت سخت نابکار گرہ
دل اُس کا پھوڑ کے نکلے بشکل پھوڑے کے — خدا کرے کہ کرے اس طرح اُبھار گرہ

(۳) یہ شعر مالک رام جی کے مرتبہ دیوان میں پایا نہیں جاتا جبکہ نسخہ عرشی صاحب میں موجود ہے۔

قصیدہ

کرتا ہے چرخ، روز بصد گونہ احترام — فرمانروائے کشورِ پنجاب کو سلام
حق گو و حق پرست و حق اندیش و حق شناس — نواب مستطاب، امیرِ شہ احتشام
جم رتبہ میکلوڈ بہادر کہ وقتِ رزم — تُرکِ فلک کے ہاتھ سے وہ چھین لیں حُسام
جس بزم میں کہ ہو انھیں آہنگِ میکشی — واں آسمان شیشہ بنے آفتاب جام
چاہا تھا میں نے تم کو مہِ چاردہ کہوں — دل نے کہا کہ یہ بھی ہے تیرا خیالِ خام
دورات میں تمام ہے ہنگامہ ماہ کا — حضرت کا عزّ و جاہ رہیگا علی الدوام
سچ ہے، تُم آفتاب ہو جسکے فروغ سے — دریائے نور ہے فلکِ آبگینہ فام
میری سنو! کہ آج تم اس سرزمین پر — حق کے تفضلات سے ہو مرجعِ اَنام
اخبار لودھیانہ میں میری نظر پڑی — تحریر ایک جس سے ہُوا ہے بندہ تلخ کام
ٹکڑے ہوا ہے، دیکھ کے تحریر کو جگر — کاتب کی آستین ہے مگر تیغ کا نیام
وہ فرد جس میں نام ہے میرا غلط لکھا — جب یاد آگئی ہے، کلیجہ لیا ہے تھام
سب صورتیں بدل گئیں ناگاہ یک قلم — نمبر رہا نہ نذر نہ خِلعت کا انتظام
ستر برس کی عمر میں یہ داغِ جاں گداز — جس نے جلا کے راکھ مجھے کر دیا تمام
تھی جنوری مہینے کی تاریخ تیرھویں — استادہ ہو گئے لبِ دریا پہ جب خیام
اُس بزمِ پُر فروغ میں اس تیرہ بخت کو — نمبر ملا نشست میں از روئے اہتمام
سمجھا اُسے گر اب ہوا پاش پاش دل — دربار میں جو مجھ پہ چلی، چشمکِ عوام
عزت پہ اہلِ نام کی ہستی کی ہے بِنا — عزت جہاں گئی تو نہ ہستی رہی نہ نام
تھا ایک گونہ ناز جو اپنے کمال پر — اُس ناز کا فلک نے لیا مجھ سے انتقام

۱۷۵

آیا تھا، وقت ریل کے کھُلنے کا بھی قریب (۱) ، تھا بارگاہِ خاص میں خلقت کا اژدہام

اس کشمکش میں آپ کا مداحِ دردمند — آقائے نامور سے نہ کچھ کر سکا کلام

جو داں نہ کہہ سکا تھا، وہ لکھا حضور کو — دیں آپ میری داد کہ ہُوں فائز المرام

مُلک و سپہ، نہ ہو تو نہ ہو کچھ ضرر نہیں — سلطانِ بر و بحر کے در کا ہوں میں غلام

وکٹوریہ کا دہر میں، جو مدح خوان ہو — شاہانِ عصر چاہیے لیں عزت اُس سے وام

خود ہے تدارک اس کا گورنمنٹ کو ضرور — بیوجہ کیوں ذلیل ہو غالب ہے جس کا نام

امرِ جدید کا تو نہیں ہے مجھے سوال — بارے قدیم قاعدہ کا چاہیے، قیام

ہے بندہ کو اعادۂ عزت کی آرزو — چاہیں اگر حضور، تو مشکل نہیں یہ کام

دستورِ فنِ شعر یہی ہے قدیم سے — یعنی دُعا پہ مدح کا کرتے ہیں اختتام

ہے یہ دُعا کہ زیرِ نگیں آپ کے رہے — اقلیمِ ہند و سندھ سے تا ملکِ روم و شام

قصیدہ

مرحبا سالِ فرخی آئیں — عیدِ شوال و ماہِ فروردیں

شب و روز افتخارِ لیل و نہار — مہ و سال اشرفِ شہور و سنین

گرچہ ہے بعد عید کے نوروز — لیک بیش از سہ ہفتہ بعد نہیں

(۱) مرزا غالب مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ قصیدہ کے عنوان سے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے اخبار الہلال میں ایک مضمون لکھا جسے رسالہ "زمانہ" کانپور جولائی ۱۹۱۴ء میں نقل کیا گیا۔ ان کے انیسویں شعر میں ریل کے کھلنے کا ذکر ہے اور اس کا واقعہ یہ ہے ۱۸۵۷ء میں ایسٹ انڈیا ریلوے کلکتہ سے رانی گنج تک جو ایک سو بیس میل کا فاصلہ ہے جاری ہوئی تھی۔ تعمیر کا کام برابر دلی تک جاری رہا۔ پہلے آگرہ سے جمنا کے غربی کنارے کے ساتھ ساتھ داغ بیل ڈالی گئی۔ غدر کے بعد اس کی جگہ ٹونڈلہ جنکشن سے علی گڑھ ہوتی ہوئی جمنا کے شرقی کنارے جو لائنک کا حصہ ۱۸۶۴ء میں کھولا گیا۔ اس وقت جمنا کا پل بن رہا تھا۔ ۱۸۶۶ء کے اخیر میں یہ پل بن کر تیار ہوا اور یکم جنوری ۱۸۶۷ء کو پہلی بار اس پر سے ریل گزری۔

ہو اس اکیس دن میں ہولی کی — جا بجا مجلس ہوئی رنگیں
شہر میں کو بکو عبیر و گلال — باغ میں سو بسو گل ونسریں
شہر گویا نمونۂ گلزار — باغ گویا نگارخانۂ چیں
تین تہوار اور ایسے خوب — جمع ہرگز ہوئے نہ ہوں گے کہیں
پھر ہوئی ہے اسی مہینے میں — منعقد محفلِ نشاط قریں
محفلِ غسلِ صحتِ نوّاب — رونق افزائے مسندِ تمکیں
بزم گہ میں امیرِ شاہ نشاں — رزم گہ میں حریفِ شیر کمیں
پیشگاہِ حضور شوکت و جاہ — خیر خواہِ جناب دولت و دیں
جن کی مسند کا آسماں گوشہ — جن کی خاتم کا آفتاب نگیں
جن کی دیوارِ قصر کے نیچے — آسماں ہے گدائے سایہ نشیں
دہر میں اس طرح کی بزمِ سرور — نہ ہوئی ہو کبھی بروئے زمیں
انجمن چرخ گوہر آگیں فرش — نور سے ماہِ ساغرِ سیمیں
راجہ اندر کا جو اکھاڑا ہے — ہے وہ بالائے سطحِ چرخِ بریں
وہ نظرگاہِ اہلِ وہم و خیال — یہ ضیا بخشِ چشمِ اہلِ یقیں
واں کہاں یہ عطائے بذل کرم — کہ جہاں گدیہ گر کا نام نہیں
یاں زمیں پر نظر جہاں تک جائے — ژالہ آسا بچھے ہیں دُرِ ثمیں
نغمۂ مطربانِ زہرہ نوا — جلوۂ لولیانِ ماہ جبیں
اس اکھاڑے میں جو کہ ہے مظنون — یاں وہ دیکھا بچشمِ صورت بیں
سر در بہر فخر ہوا جو سوار — بکمالِ تجمّل و تزئیں

سب نے جانا کہ ہے پری توسن اور بالِ پری ہے دامنِ زیں
نقشِ سُمِ سمند سے یکسر بن گیا دشت دامنِ گلچیں
فوج کی گردِ راہ مشک فشاں رہرووں کے مشام عطر آگیں
بسکہ بخشی ہے فوج کو عزت فوج کا ہر پیادہ ہے فرزیں
موکبِ خاص یوں زمیں پر تھا جس طرح ہے سپہر پر پرویں
چھوڑ دیتا تھا گور کو بہرام ران پر داغِ تازہ دے کے وہیں
اور داغ آپ کی غلامی کا خاص بہرام کا ہے زیبِ سُریں
بندہ پرور شناطرازی سے مدعا عرضِ فنِ شعر نہیں
آپ کی مدح اور میرا منہ گر کہوں بھی تو آئے کس کو یقیں
اور پھر اب کہ ضعفِ پیری سے ہو گیا ہوں نزار و زار و حزیں
پیری و نیستی خدا کی پناہ! دستِ خالی و خاطرِ غمگیں
صرف اظہار ہے ارادت کا ہے قلم کی جو سجدہ ریز زمیں
مدح گُستر نہیں دعا گو ہے غالبِ عاجزِ نیاز آگیں
ہے دعا بھی یہی کہ دُنیا میں تم رہو زندہ جاوداں آمیں

کہا جاتا ہے کہ یہ قصیدہ مرزا غالب نے نواب کلب علیخاں کے غسل صحت کی تقریب پر لکھا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مرزا غالب نے اس قصیدہ کو نواب یوسف علیخاں کے غسل صحت کی تقریب پر بھیجا تھا جیسا کہ خط بنام مرزا غالب میں، نواب یوسف علیخاں نے اس قطعہ کی تعریف میں یوں تحریر فرمایا ہے: "ہماری صحت کی تہنیت میں قطعہ مبارکباد کا جو آپ نے بھیجا ہے وہ پہنچا اس کے آنے سے سرور صحت دوبالا ہوگیا۔ ایسی نظم ایسی تاریخیں دوسرے سے کب ہو سکتی ہیں حقا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے مثل اور عدیم النظیر پیدا کیا ہے جس کمال کو دیکھیے اس میں آپ کی ذات فرد کامل ہے۔ آپ کا ہدیہ مرسلہ اکثر نقل محفل رہتا ہے۔ جو سنتا ہے جو دیکھتا ہے وارفتہ ہو جاتا ہے۔ سچ ہے ایسے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ ہزاروں برس فلک چرخ لگاتا ہے تب کہیں ایک شخص کمال کا پیدا ہوتا ہے۔ اللّٰہم بصحت عافیت طول عمر عطا کرے اور تادیر گاہ اہل جہاں آپ کی ذات سے مستفیض ہوا کریں۔ باقی خیریت ہے۔" (بہت خوب)

مثنوی

ایک دن مثلِ پتنگِ کاغذی — لے کے دل سر رشتۂ آزادگی
خود بخود کچھ ہم سے کنیانے لگا — اس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا
میں کہا، اے دل! ہوائے دلبراں — بس کہ تیرے حق میں رکھتی ہے زیاں
پیچ میں ان کے نہ آنا زینہار — یہ نہیں ہیں گے کسو کے یارِ غار
گورے پنڈے پر نہ کر ان کے نظر — کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈال کر
اب تو مل جائیگی تیری ان سے سانٹھ — لیکن آخر کو پڑے گی ایسی گانٹھ
سخت مشکل ہو گا سلجھانا تجھے — قہر ہے دل ان میں اُلجھانا تجھے
یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے — بھول مت اس پر اُڑاتے ہیں تجھے
ایک دن تجھ کو لڑا دیں گے کہیں — مفت میں ناحق کٹا دیں گے کہیں
دل نے سن کر، کانپ کر، کھا پیچ و تاب — غوطے میں جا کر دیا کٹ کر جواب

"رشتہ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست"

اس مثنوی کے بارے میں خواجہ حالیؔ مرحوم نے لکھا ہے

منشی بہاری لال مشتاقؔ کا بیان ہے کہ لالہ کنہیا لال ایک صاحب آگرہ کے رہنے والے جو مرزا صاحب کے ہم عمر تھے ایک بار دلی میں آئے اور مرزا صاحب سے ملے تو اثنائے کلام میں ان کو یاد دلایا کہ جو مثنوی آپ نے پتنگ بازی کے زمانے میں لکھی تھی وہ بھی آپ کو یاد ہے۔ انھوں نے انکار کیا۔ لالہ صاحب نے کہا وہ اردو مثنوی میرے پاس موجود ہے چنانچہ انہوں نے وہ مثنوی مرزا صاحب کو دی اور وہ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اس کے آخر میں یہ فارسی شعر لاحق کر دیا۔

رشتہ در گردنم افگندہ دوست — می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

یہ مثنوی اس وقت لکھی گئی تھی جبکہ مرزا صاحب کی عمر بارہ برس کی تھی۔

قطعات

مقامِ شکر ہے، اے ساکنانِ خطۂ خاک — رہا ہے زور سے ابرِ ستارہ بار، برس
کہاں ہے ساقیِ مہوش؟ کہاں ہے ابرِ مطیر؟ — بیار، لا، مئے گلنار گوں، ببار، برس
خدا نے تجھ کو عطا کی ہے گوہر افشانی — درِ حضور پر، اے ابر، بار بار برس
ہر ایک قطرے کے ساتھ آئے جو مَلَک وہ کہے — "امیرِ کلبِ علی خاں جییں ہزار برس
فقط ہزار برس پر کچھ انحصار نہیں — کئی ہزار برس بلکہ بے شمار برس
جنابِ قبلۂ حاجات! اس بلاکش نے — بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس
شفا ہو آپ کو غالب کو بندِ غم سے نجات — خدا کرے، کہ یہ ایسا ہو سازگار برس

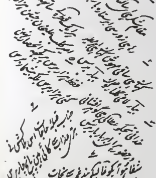

یہ قطعہ مرزا غالب نے نواب کلب علی خاں کو بھیجا تھا لکھتے ہیں،

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت

بعد تسلیم معروض آنکہ منشور عطوفت عز ورود لایا۔ اگرچہ مینہ اس قدر برسا ہے جس کے پانی سے زمیندار حاصل فصل ربیع سے ہاتھ دھولیں۔ مگر چونکہ بفرمان ازلی میرے رزق کی برات آپ پر ہے اور آپ کے ملک میں بارش خوب ہوئی ہے ابر رحمت کے شکریہ میں قطعہ ملفوف اس عرضی کے بھیجتا ہوں۔ بنظر اصلاح تنظم و اصلاح حال ملاحظہ ہو۔ زیادہ حد ادب

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

یہ قطعہ مرزا صاحب کا خود نوشتہ ہے ←

قطعہ

ہند میں اہلِ تسنّن کی ہیں دو سلطنتیں — حیدر آبادِ دکن ، رشکِ گلستانِ اِرم
رام پور اہلِ نظر کی ہے نظر میں وہ شہر — کہ جہاں ہشت بہشت آکے ہوے ہیں باہم
حیدر آباد بہت دور ہے اس ملک کے لوگ — اُس طرف کو نہیں جاتے ہیں جو جاتے ہیں تو کم
رام پور آج ہے وہ بقعہ معمور ، کہ ہے — مرجع و مجمعِ اشرافِ نژادِ آدم
رام پور ایک بڑا باغ ہے از روے مثال — دلکش و تازہ و شاداب و وسیع و خرّم
جس طرح باغ میں ساون کی گھٹائیں برسیں — ہے اسی طور پہ یاں دجلہ فشاں دستِ کرم
ابرِ دستِ کرمِ کلبِ علی خاں سے مدام — دُرِ شہوار ہیں ، جو گرتے ہیں قطرے پیہم
صبحدم باغ میں آجاے جسے ہو نہ یقیں — سبزہ و برگ گل و لالہ پہ دیکھے شبنم
حبّذا باغ ہمایونِ تقدس آثار! — کہ جہاں چرنے کو آتے ہیں غزالانِ حرم
مسلکِ شرع کے ہیں راہ رو و راہ شناس — خضر بھی یہاں اگر آجاے تو لے ان کے قدم
مدح کے بعد دعا چاہیے اور اہلِ سخن — اس کو کرتے ہیں بہت بڑھ کے بہ اغراق رقم
حق سے کیا مانگیے ان کے لیے جب ہو موجود — ملک و گنجینہ و خیل و سپہ و کوس و علم
ہم نہ تبلیغ کے مائل نہ غلو کے قائل — دو دعائیں ہیں کہ وہ دیتے ہیں نواب کو ہم
یا خدا! غالبِ عاصی کے خداوند کو دے — دو وہ چیزیں کہ طلب گار ہے جن کا عالم
اوّلاً عمرِ طبیعی ، بہ دوامِ اقبال — ثانیاً دولتِ دیدارِ شہنشاہِ امم

مرزا صاحب اس قطعہ کے متعلق نواب کلبِ علی خاں والی رامپور کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :
حضرت ولی نعمت آیہ رحمت سلامت! بعد تسلیم معروض ہے کہ ایک قطعہ ۱۵ شعر کا بھیجتا ہوں ، حضور ملاحظہ فرمائیں ، مضامین کی طرز نئی ، مدح کا انداز نیا ، دعا کا اسلوب نیا زیادہ حدِ ادب

تم سلامت رہو ہزار برس — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

181

یہ قطعہ مرزا غالب کا خود نوشتہ ہے جو انھوں نے نواب کلب علی خاں کو روانہ کیا تھا۔

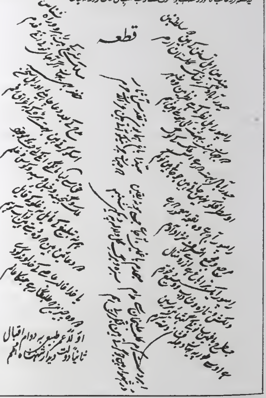

قطعہ

او کہ عمر طبیعی بہ دوام اقبال
تا بیابد دولت دیدار شہنشاہ ہم

۱۸۲

قطعہ تاریخ اختتامِ کتاب تکثیف حکمت

سلیم خاں، کہ وہ ہے نورِ چشمِ واصل خاں — حکیم حاذق و دانا ہے وہ لطیف کلام
تمام دہر میں اس کے مَطَب کا چرچا ہے — کسی کو یاد بھی لقمان کا نہیں ہے نام
اُسے فضائل علم و ہنر کی افزائش — ہوئی ہے مُبدء عالَم سے اس قدر انعام
کہ بحثِ علم میں، اطفالِ ابجدی اسکے — ہزار بار فلاطوں کو دے چکے الزام
عجیب نسخۂ نادر لکھا ہے اک اس نے — کہ جس میں حکمت طب ہی کے مسئلے ہیں تمام
نہیں کتاب، ہے اک منبعِ نکاتِ بدیع — نہیں کتاب، ہے اک معدنِ جواہر کام
کل اس کتاب کے سال تمام میں جو مجھے — کمالِ فکر میں دیکھا خرد نے بے آرام
کہا یہ جلد، کہ تو اس میں سوچتا کیا ہے — "لکھا ہے نسخۂ تحفہ" یہی ہے سالِ تمام
۱۲۷۹ھ

قطعہ

اے جہان آفریں خدائے کریم — صانعِ ہفت چرخ ہفت اقلیم
نام میکلوڈ جن کا ہے مشہور — یہ ہمیشہ بصد نشاط و سرور
عمر و دولت سے شاد مان رہیں — اور غالب پہ مہربان رہیں

قطعہ

گوڑگانویں کی ہے جتنی رعیت وہ یک قلم [۱۲] — عاشق ہے اپنے حاکمِ عادل کے نام کی
سو یہ نظر فروز قلمدان ہے نذر [۱۳] — مسٹر کووان صاحبِ عالی مقام کی

۱۲-۱۳) مولف خمخانۂ جاوید نے لکھا ہے کہ: رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب جو مولف کے چچا تھے، غالب مرحوم کی پہلی ملاقات کا تذکرہ اس طرح فرماتے ہیں کہ: جب ہم گوڑگانوے میں ہیڈ ماسٹر تھے وہاں کے اسسٹنٹ کمشنر کووان صاحب کی تبدیلی کا موقع پیش آیا۔ صاحب موصوف ہمارے حال پر خاص نظرِ عنایت رکھتے تھے ان کی مفارقت کے متعلق جو جلسہ قرار پایا اس میں لوگوں کی رائے ہوئی کہ صاحب ممدوح کو کوئی چیز بطور یادگار نذر دینی چاہیے۔ چنانچہ کمیٹی کی رائے سے چاندی کا قلمدان تجویز ہوا۔ قلمدان پر کوئی شعر بھی کندہ کرنا تھا اور اس سلسلہ میں رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب کا مرزا غالب کے پاس آنا ہوا اور یہ ان کی پہلی ملاقات تھی جس کے بعد دونوں کے باہمی مراسم اتنے بڑھ گئے کہ مرزا غالب ماسٹر پیارے لال کو فرزندِ ارجمند لکھا کرتے تھے۔

سہرا

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا (۱) باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا
کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے! ہے ترے حُسنِ دل افروز کا زیور سہرا
سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ! مجھ کو ڈر ہے، کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا
ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی! ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا
سات دریا کے فراہم کیے ہوں گے موتی تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا
رُخ پہ دولھا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا ہے رگِ ابرِ گُہر بار سراسر سہرا
یہ بھی اک بے ادبی تھی، کہ قبا سے بڑھ جائے رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا
جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز چاہیے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا
جبکہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا
رُخِ روشن کی دمک گوہرِ غلطاں کی چمک کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا
تارِ ریشم کا نہیں، ہے یہ رگِ ابرِ بہار لائے گا تابِ گرانبارئِ گوہر سہرا
ہم سخن فہم ہیں، غالبؔ کے طرفدار نہیں دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

ہمنشیں تارے ہیں، اور چاند شہاب الدین خاں بزمِ شادی ہے فلک کاہکشاں ہے سہرا
ان کو لڑیاں نہ کہو بحر کی موجیں سمجھو ہے تو کشتی میں، ولے بحرِ رواں ہے سہرا

چرخ تک دھوم ہے، کس دھوم سے آیا سہرا چاند کا دائرہ لے، زُہرہ نے گایا سہرا
رشک سے لڑتی ہیں آپس میں اُلجھ کر لڑیاں باندھنے کے لیے میں نے جو اُٹھایا سہرا

(۱) شہزادہ جواں بخت کی تقریب شادی پر سب سے پہلے مرزا غالب نے سہرا کہکر حضور میں گزرانا۔ مگر مقطع میں ایک سخن گسترانہ بات آگئی تھی "ہم سخن فہم ہیں" الخ اس مقطع کو سن کر بادشاہ کے دل میں خیال آیا کہ یہ چشمک ہم پہ ہے لہذا جب ذوق آئے تو بادشاہ نے حکم دیا کہ ایک سہرا تم بھی کہدو مگر مقطع کا خیال رکھنا۔ اسکے بعد ذوق نے بھی حریفانہ سہرا لکھا۔ ان سہروں کا شارحین نے موازنہ کیا ہے مگر غالب کا سہرا نہایت عمدہ و بلیغ ہے غالب سے پہلے کسی نے سہرا نہیں لکھا اور یہی سہرے کے موجد ہیں۔

قطعہ تاریخ

اس کتابِ طرب نصاب نے جب — آب و تاب انطباع کی پائی
فکرِ تاریخِ سال میں مجھ کو — ایک صورت نئی نظر آئی
ہندسے پہلے سات سات کے دو — دیے ناگاہ مجھ کو دکھائی
اور پھر ہندسہ تھا بارہ کا — باہزاراں ہزار زیبائی
سالِ ہجری تو ہو گیا معلوم — بے شمولِ عبارت آرائی
مگر اب ذوقِ بذلہ سنجی کو — ہے جداگانہ کارفرمائی
سات اور سات ہوتے ہیں چودہ — بہ اُمّیدِ سعادت افزائی
غرض اس سے ہیں چاردہ معصوم — جس سے ہے چشمِ جاں کو زیبائی
اور بارہ امام ہیں بارہ — جس سے ایماں کو ہے توانائی
ان کو غالب یہ سال اچھا ہے — جو ائمہ کے ہیں تولائی

خطِ منظوم بنام علائی

بسکہ فعال ما یرید ہے آج — ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہرِ دہلی کا ذرّہ ذرّہ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک — آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا! — وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ — سوزشِ داغہاے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم — ماجرا دیدہ ہاے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب — کیا مٹے داغ دل سے ہجراں کا

خوشی تو ہے آنے کی برسات کے (۱) پیئیں بادۂ ناب اور آم کھائیں
سرِ آغازِ موسم میں اندھے ہیں ہم کہ دِلّی کو چھوڑیں لوہارو کو جائیں
سوا ناج کے جو ہے مطلوبِ جاں نہ واں آم پائیں، نہ انگور پائیں
ہوا حکم باورچیوں کو، کہ ہاں! ابھی جا کے پوچھو، کہ کل کیا پکائیں
وہ کھٹے کہاں پائیں اِملی کے پھول وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں
فقط گوشت، سو بھیڑ کا ریشہ دار کہو اس کو کیا کھا کے ہم حظ اٹھائیں

اے منشیِ خیرہ سر! سخن ساز نہ ہو قطعہ عُصفُور ہے تو، مقابلِ باز نہ ہو
آواز تری نکلی اور آواز کے ساتھ لاٹھی وہ لگی کہ جس میں آواز نہ ہو

کیا ان دنوں بسر ہو ہماری فراغ میں قطعہ کچھ تفرقہ رہا نہ دل و درد و داغ میں
جا ہا بچشمِ شوق، جو موسے نے طور پر یاں دیکھتے ہیں روز وہی ہر چراغ میں
یہ تمکنت و وقار، علائی! بیہ وحشتیں شورش ہے کچھ ضرور تمہارے دماغ میں

(۱) یہ قطعہ مرزا غالب نے نواب علاء الدین احمد خاں کو بھیجا تھا۔ جواب مولانا علائی نے برنگِ غالب ہی خوب لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو۔
خوشی ہے ہمیں آنے کی آپ کے کہ باہم پیئیں بادہ اور آم کھائیں
سرِ آغازِ موسم میں کیا خوب ہے کہ دلی سے حضرت لوہارو کو آئیں
عجب لطف ہے یاں کی برسات میں کہ کیچڑ کہیں نام کو بھی نہ پائیں
سرولی کے وہ ڈال پر سبز آم وہ دلی کے انگور ہر شام آئیں
کریں حکم باورچیوں کو کہ ہاں ابھی جا کے ہر چیز جلدی پکائیں
وہ لیں باغ سے جا کے املی کے پھول وہ جنگل سے کڑوے کریلے منگائیں
وہ بے ریشہ بکری کا لحمِ طری کہ کیا کیا اُسے کھا کے ہم حظ اٹھائیں
کہیں ان کو بے مہر و کاہل اگر لوہارو وہ اس بات پر بھی نہ آئیں

۱۸۶

مرثیہ

ہاں اے نفسِ بادِ سحر! شعلہ فشاں ہو — اے دجلۂ خوں! چشمِ ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قُم! لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو — اے ماتمیانِ شہِ معصوم کہاں ہو
بگڑی ہے بہت، بات بنائے نہیں بنتی — اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

تابِ سخن و طاقتِ غوغا نہیں ہم کو — ماتم میں شہِ دیں کے ہیں، سودا نہیں ہم کو
گھر پھونکنے میں اپنے محابا نہیں ہم کو — گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو
یہ خرگہِ نُہ پایہ جو مدت سے بپا ہے — کیا خیمۂ شبیر سے رتبہ میں سوا ہے

کچھ اور ہی عالم نظر آتا ہے جہاں کا — کچھ اور ہی نقشہ ہے دل و چشم و زباں کا
کیسا فلک اور مہرِ جہانتاب کہاں کا — ہوگا دلِ بیتاب کسی سوختہ جاں کا
اب مہر میں اور برق میں کچھ فرق نہیں ہے — گرتا نہیں، اس رُو سے کہو برق نہیں ہے

سلام

سلام اُسے، کہ اگر بادشاہ کہیں اس کو — تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سوا کہیں اُس کو
نہ بادشاہ نہ سلطاں، یہ کیا ستایش ہے — کہو کہ خامسِ آلِ عبا کہیں اس کو
خدا کی راہ میں شاہی و خسروی کیسی ؟ — کہو کہ رہبرِ راہِ خدا کہیں اس کو
خدا کا بندہ، خداوندگار بندوں کا — اگر کہیں نہ خداوند، کیا کہیں اس کو
فروغِ جوہرِ ایماں، حسین رضؓ ابنِ علیؑ — کہ شمعِ انجمنِ کبریا کہیں اس کو
کفیلِ بخششِ امت ہے، بن نہیں پڑتی — اگر نہ شافعِ روزِ جزا کہیں اس کو
مسیح جس سے کرے اخذ فیضِ جاں بخشی — ستم ہے کشتۂ تیغِ جفا کہیں اس کو

سید محمد صاحب مرحوم نے مرزا سے خواہش ظاہر کی کہ جناب سید الشہدا کا مرثیہ لکھیں۔ مرزا کو اُن کی بہت تعظیم تھی مگر اُس کوچے میں کبھی قدم نہ رکھا تھا جسبِ فرمایش یہ تین بند لکھے اور مجتہد العصر کی خدمت میں لکھ دیا "یہ تین بند امتثالِ امر کے لیے لکھے ہیں۔ مَیں اس میدان کا مرد نہیں اس کے لیے ایک دوسری عمر درکار ہے۔ مجھے اس خدمت سے معاف رکھا جائے" نیز ریاض الدین امجد اپنے سفر نامۂ دہلی میں لکھتے ہیں کہ میں مرزا غالب کی ملاقات سے شرف یاب ہوا۔ مرزا نے تین بند مرثیہ کے سنائے۔ لوگ روئے پیٹے چلائے میں نے بند طلب کیے۔ مرزا نے اپنے دستِ خاص سے لکھ کر دیے۔ ان کا قول تھا: یہ حصہ انیس و دبیر کا ہے۔

۱۸۰

وہ جس کے ماتمیوں پر ہے سلسبیل سبیل
شہیدِ تشنہ لبِ کربلا کہیں اس کو

عدو کی سمعِ رضا میں جگہ نہ پائے وہ بات
کہ جنّ و انس و مَلک سب بجا کہیں اس کو

بہت ہے پایۂ گردِ رہِ حسینؑ بلند
بقدرِ فہم ہے، گر کیمیا کہیں اس کو

نظارہ سوز ہے یاں تک ہر ایک ذرّۂ خاک
کہ نوکِ جوہرِ تیغِ قضا کہیں اس کو

ہمارے درد کی یا رب، کہیں دَوا نہ ملے
اگر نہ درد کی اپنے دَوا کہیں اس کو

ہمارا منہ ہے کہ دیں اُس کے حسنِ صبر کی داد!
مگر نبیؐ و علیؑ مرحبا کہیں اس کو

زمامِ ناقہ کف اُس کے میں ہے کہ اہلِ یقیں
پس از حسینؑ علیؑ پیشوا کہیں اس کو

وہ ریگِ تفتۂ وادی پہ گام فرسا ہے
کہ طالبانِ خدا رہنما کہیں اس کو

امامِ وقت کی یہ قدر ہے کہ اہلِ عناد
پیادہ لے چلیں اور ناسزا کہیں اس کو

یہ اجتہاد عجب ہے کہ ایک دشمنِ دیں
علیؑ سے آ کے لڑے اور خطا کہیں اس کو

یزید کو تو نہ تھا اجتہاد کا پایہ
بُرا نہ مانیے، گر ہم بُرا کہیں اس کو

علیؑ کے بعد حسنؑ اور حسنؑ کے بعد حسینؑ
کرے جو اُن سے بُرائی بھلا کہیں اس کو

نبیؐ کا ہو نہ جسے اعتقاد کافر ہے
رکھے امام سے جو بغض کیا کہیں اس کو

بھرا ہے غالبِ دل خستہ کے کلام میں درد
غلط نہیں ہے کہ خونیں نوا کہیں اس کو

قطعہ

رقعے کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے
ثاقب! حرکت یہ کی ہے بے جا تم نے

حاجی کلو کو دے کے بے وجہ جواب
غالب کا پکا دیا کلیجا تم نے

اے روشنیٔ دیدہ شہاب الدین خاں!
کٹتا ہے بتاؤ کس طرح سے رمضاں؟

ہوتی ہے تراویح سے فرصت کب تک؟
سنتے ہو تراویح میں کتنا قرآں؟

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری

دہری کیونکر ہو، جو کہ ہووے صوفی؟
شیعی کیونکر ہو، ماوراء النہری؟

فردیات

مے کشی کو نہ سمجھ بے حاصل
بادہ غالب! عرقِ بید نہیں

ابر روتا ہے کہ بزمِ طرب آمادہ کرو
برق ہنستی ہے کہ فرصت کوئی دم ہے ہم کو

بہا ہے یاں تک اشکوں میں غبارِ کلفتِ خاطر
کہ چشمِ تر میں ہے ہر یک پارۂ دل پائے درگل ہے

شمشیرِ صافِ یار، جو زہراب دادہ ہو
وہ خطِ سبز ہے کہ بہ رخسارِ سادہ ہو

دیکھتا ہوں اُسے، تھی جس کی تمنا مجھ کو
آج بیداری میں ہے خوابِ زلیخا مجھ کو

ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے
یہ رنگِ زرد ہے چمنِ زعفراں مجھے

جگر سے ٹوٹے ہوئے مُو کی ہے سناں پیدا
دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا

نیازِ عشق، خرمن سوزِ اسبابِ ہوس بہتر
جو ہو جاوے نثارِ برق، مشتِ خار و خس بہتر

یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ غلط
کی تصور نے بہ صحرائے ہوس رہ غلط

ملے دو مرشدوں کو قدرتِ حق سے ہیں دو طالب
(۱۰) نظام الدین کو خسرو، سراج الدین کو غالب

خدا سے میں بھی چاہوں از رہِ مہر
"فروغ مہر" میرزا حاتم علی مہر

ولی عہدی میں شاہی ہو مبارک
(۱۲) عنایاتِ الٰہی ہو مبارک

دل آپ کا کہ دل میں ہے جو کچھ سو آپ کا
دل لیجیے مگر مرے ارماں نکال کے

؎ ملے دو مرشدوں کو قدرت حق سے الخ

(۱۰) کسی موقع پر خواجہ نظام الدین اور امیر خسرو کی خصوصیات پر دربار میں تذکرہ ہو رہا تھا مرزا غالب نے اُسی وقت یہ شعر پڑھا۔

؎ خدا سے میں بھی چاہوں از رہِ مہر الخ

مرزا غالب نے حاتم علی مہر کی مثنوی شعلۂ مہر کو پڑھ کر یوں لکھا "مثنوی کے اشعار جو میں نے دیکھے کیا کہوں کیا حظ اٹھایا۔ اگر اس انداز پر انجام پائے گی تو یہ مثنوی کارنامۂ اردو کہلائے گی۔

(۱۲) ؎ ولی عہدی میں شاہی ہو مبارک الخ یہ شعر مرزا صاحب نے نواب علائی کو ایک خط میں بطور سرنامہ لکھا تھا۔

ماہِ نو ہوں کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے — عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سلاتا ہے مجھے
صبا لگا وہ طمانچے طرف سے بلبل کی — کہ روئے غنچۂ گل سوئے آشیاں پھر جائے
زخمِ دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے — ایسے ہنستے کو رُلایا ہے کہ جی جانے ہے
ذرا کر زور سینے پر کہ تیرِ پرستم نکلے — جو وہ نکلے تو دل نکلے جو دل نکلے تو دم نکلے
گلشنِ دہر بھی ہے کوئی سرائے ماتم — شبنم اس باغ میں جب آئے تو گریاں آئے
دو رنگیاں یہ زمانے کی جیتے جی ہیں سب — کہ مُردوں کو نہ بدلتے ہوئے کفن دیکھا
پھر مرتبہ بڑھایا مرا نفیِ غیر نے — آیا ہر ایک مکاں نظر لامکاں مجھے
پیری میں بھی کمی نہ ہوئی جھانک تاک کی — روزن کی طرح دید کا آزار رہ گیا
وہ مرغ ہے خزاں کی صعوبت سے بیخبر — آئندہ سال تک جو گرفتار رہ گیا

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے (۱۰) عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

ہزار شکر کہ سید غلام بابا نے — فرازِ مسندِ عیش و طرب جگہ پائی
زمیں پہ ایسا تماشا ہوا برات کی رات — کہ آسماں پہ کواکب بنے تماشائی

جب کہ سید غلام بابا نے ق مسندِ عیش پر جگہ پائی
ایسی رونق ہوئی برات کی رات — کہ کواکب ہوئے تماشائی

(۱۰) دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے الخ
یہ شعر انتقال سے قبل اکثر مرزا کے وردِ زبان رہتا تھا۔
ہزار شکر کہ الخ
جبکہ سید غلام بابا نے الخ
ق یہ دونوں قطعات مرزا غالب نے بتقریبِ شادی سید غلام بابا رئیسِ سورت لکھے تھے مگر تاریخ نکاح نہ لکھنے کا عذر کرتے ہوئے لکھا "وہ دوست جو مادہ ڈھونڈھ لیتے تھے وہ جنت کو سدھارے معذور ہوں اور مجبور ہوں۔"

190

درم و دام اپنے پاس کہاں (۱) چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں
پیر و مرشد معاف کیجیے گا (۲) میں نے جمنا کا کچھ نہ لکھا حال
سنین عمر کے ستر ہوئے شمار برس (۳) بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس
سات جلدوں کا پارسل پہنچا (۴) واہ کیا خوب بر محل پہنچا
میں بھولا نہیں تجھ کو اے میری جاں (۵) کروں کیا کہ یاں گر رہے ہیں مکاں
تحریر ہے یہ غالب یزداں پرست کی (۶) تاریخ اس کی آج نویں ہے اگست کی
مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے (۷) یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے
آج یک شنبہ کا دن ہے آو گے (۸) یا فقط رستہ ہمیں بتلاو گے
کھانا نہ اسے کہہ پرائے ہیں آم (۹)

(۱) درم و دام اپنے پاس کہاں الخ ایک دن حسین علی خاں کھیلتا آیا کہ دادا جان مٹھائی منگا دو اور پیسوں کی تلاش میں صندوقچہ کھول کر ادھر ادھر ٹٹولنے لگا تو مرزا غالب نے یہ شعر پڑھا۔
(۲) مرزا غالب نے نواب انوار الدولہ شفق کو جو خط لکھا اس کے متن مطبوعہ عود ہندی میں یہ شعر سر آغاز نامہ ہے۔
(۳) یہ شعر مرزا غالب نے اپنے خط میں صفیر بلگرامی کو لکھا تھا۔ جوابی اشعار یہ ہیں:
سنا صفیر یہ کہتے ہیں حضرت غالب: بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس۔ مگر یہ پہلے سے اعداد غین کی ہے دعا: خدا کرے مرا غالب جیے ہزار برس
(۴) مرزا غالب نے حاتم علی مہر کو خط میں لکھا "بھائی جان کل جو جمعہ روز مبارک و سعید تھا گویا میرے حق میں روز عید تھا۔ چار گھڑی دن چڑھے نامۂ فرحت فرجام اور چار گھڑی کے بعد وقت شام سے سات جلدوں الخ
(۵) یہ شعر غالب نے میر مہدی مجروح کو ایک خط کے شروع میں لکھا تھا "خدا کا قہر ہے قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے۔
(۶) یہ شعر منظوم سوال و جواب کا آخری شعر ہے جو مرزا غالب نے کلکتہ یونیورسٹی کے لئے رائے بہادر پیارے لال کو بھیجا۔
(۷) مسجد کے زیر سایہ ایک گھر بنا لیا ہے الخ یہ شعر مرزا غالب نے اپنی آخری جائے رہائش واقع گلی قاسم جان عقب مسجد متصل دیوان خانہ حکیم محمود خاں کے متعلق کہا تھا
(۸) آج یک شنبہ کا دن الخ ماسٹر پیارے لال آشوب اپنے دوران قیام دلی ہر ہفتہ مرزا صاحب سے ملاقات کے لیے جاتے تھے۔ جب کبھی ان کو دیر ہو جاتی تو مرزا غالب ایک نہ ایک شعر لکھ رکھتے تھے جس کا مقصد حسن طلب ہوتا۔
(۹) صفیر بلگرامی جب مرزا غالب کی ملاقات کو آئے اور نواب ضیاء الدین کے یہاں ٹھیرنے کا بندوبست ہوا تو کھانے کے ساتھ جو آم چنے گئے وہ کھٹے نکلے۔ صفیر جو ٹوکرا اپنے ساتھ لائے تھے نصف مرزا کی خدمت میں بھیج دیا۔ وہاں سے یہ مصرعہ لکھا ہوا آیا۔

191

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا (۱) آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

کیوں نہ میرن کو مغتنم جانوں (۲) دلّی والوں میں ایک بچا ہے یہ

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے (۳) کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

گو نہ ملتے تھے پر اک شہر میں رہتے تھے (۴)

گر مصیبت تھی تو غربت میں اٹھا لیتے اسدؔ میری دلّی ہی میں ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے

گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل (۶) کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

(۱) مرزا غالب میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں: "رئیس دربار والے مہاجن لوگ سب موجود، اہلِ اسلام میں سے صرف تین آدمی باقی ہیں۔ میرٹھ میں مصطفےٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدرالدین خاں، بلیماران میں سگِ دنیا موسوم بہ اسدؔ، تینوں مردود و مطرود و محروم و مغموم۔ تو ڑ بیٹھے الخ

(۲) میر مہدی کو لکھا: "یہ باتیں تمہاری ہم کو پسند نہیں آتیں۔ تم نے میرؔ کا وہ مقطع سنا ہوگا۔ بتغیر الفاظ لکھتا ہوں "کیوں نہ میرن کو الخ میر تقی کا مقطع یوں ہے سے میرؔ کو کیوں نہ مغتنم جانیں ؛ اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ۔ "میرؔ" کی جگہ "میرن" اور "رہا" کی جگہ "بچا" کیا اچھا تصرف ہے۔

(۳) مہدی کو لکھتے ہیں: "میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری

درو کا تھانیدار مونڈھا بچھا کر بیٹھتا ہے جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے

(۴) امیرالدین احمد خاں کو لکھتے ہیں: "تمہارا شہر میں رہنا موجبِ تقویت دل تھا۔ گو نہ ملتے الخ بھائی ایک سیر دیکھ رہا ہوں، کئی آدمی

یو ان گم کردہ کی طرح اُڑے پھرتے ہیں۔ ان میں سے دو چار بھولے بھٹکے کبھی یہاں بھی آجاتے ہیں۔ وصاحب اب کب

دعا کرو گے؟"

بخش حقیر کو ہر گوپال تفتہ کے دیوان کا دیباچہ لکھنے کے عذر میں تحریر فرماتے ہیں: "رہا دیباچہ۔ تم کو میری خبر ہی نہیں۔

میں ۔ ان سے مرتا ہوں۔ گیا ہو جب الخ یقین ہے کہ وہ اور آپ میرا عذر قبول کریں اور مجھے معاف رکھیں۔ خدا نے مجھ پر روزہ نماز

معا یا ہے۔ کیا تم اور تفتہ ایک دیباچہ معاف نہ کرو گے" پھر لکھا ہے: "دیباچہ لکھنا بھائی کیا آسان ہے کلیجہ کھرچنا پڑتا ہے۔"

قادر نامہ

(قادر اللہ) اور (یزداں) ہے خدا — ہے (نبی) مُرسل۔ پیمبر رہنما
پیشوائے دیں کو کہتے ہیں (امام) — وہ رسول اللہ کا قائم مقام
(مہر) سورج، چاند کو کہتے ہیں (ماہ) — ہے محبّت (مہر) لازم ہے نباہ
نیولا (راسو) ہے اور (طاوس) مور — (کبک) کو ہندی میں کہتے ہیں چکور
(خُم) ہے مٹکا اور ٹھلیا ہے (سبو) — (آب) پانی (بحر) دریا۔ نہر (جُو)
دودھ جو پینے کا ہے وہ (شیر) ہے — (طفل) لڑکا اور بوڑھا (پیر) ہے
(ماہ) چاند (اختر) ہیں تارے رات (شب) — دانت (دنداں) ہونٹ کو کہتے ہیں (لب)
(استخواں) ہڈی ہے اور ہے (پوست) کھال — (سگ) ہے کتا اور گیدڑ ہے (شغال)
(چشم) ہے آنکھ اور (مژگاں) ہے پلک — آنکھ کی پتلی کو کہئیے (مردمک)
لومڑی (روباہ) اور (آہو) ہرن — (شمس) سورج اور (شعاع) اُسکی کرن
(پشہ) مچھر اور مکھی ہے (مگس) — (آشیانہ) گھونسلا۔ پنجرہ (قفس)
روئی کو کہتے ہیں (پنبہ) سُن رکھو — آم کو کہتے ہیں (انبہ) سُن رکھو
(کوہ) کو ہندی میں کہتے ہیں پہاڑ — فارسی (گلخن) ہے اور ہندی ہے بھاڑ
پایا قادر نامہ نے آج اختتام — اک غزل تم اور پڑھ لو۔ والسلام
علم ہی سے قدر ہے انسان کی — ہے وہی انسان جو جاہل نہیں
کس طرح پڑھتے ہو رُک رُک کر سبق؟ — ایسے پڑھنے کا تو میں قائل نہیں
جس نے قادر نامہ سارا پڑھ لیا — اُس کو آمد نامہ کچھ مشکل نہیں

یہ مثنوی خالقِ باری کی طرز پر ہے۔ قادر نامہ کے نام سے تحفّظ پریس میں چھپی تھی۔ مرزا صاحب نے یہ باقر علی اور حسین علی نواب عارف کے بچوں کے لیے لکھی تھی۔ مثنوی کافی طویل ہے۔ چند منتخب اشعار ملاحظہ فر

مرقعِ غالب

حصہ دوم

عکس خطوط نوشتہ مرزا غالب

بنام والیانِ رام پور

نواب یوسف علی خاں و نواب کلب علی خاں

شبیہ نواب یوسف علی خاں والیٔ رامپور

مرزا غالبؔ کی ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۵ء تک تا اتصال مرگ
نواب صاحب موصوف سے خط و کتابت جاری رہی ۔ ملاحظہ ہو۔

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلمہ

آداب نیاز بجا لا کر عرض کرتا ہوں ۵ سو روپیہ کے ہنڈوی بابت مصارف
ماہ نومبر ۱۸۵۹ء پہنچی اور روپیہ وصول ہو آیا اور صرف ہوگیا اور میں
بدستور بھوکا اور ننگا رہا تم سے نہ مانگوں تو کس سے کہوں اس مدد مقرری سے
علاوہ ۵ سو روپیہ ماہ اگر مجھکو اور بھیجدیجیگا تو جلد بھیجیگا لیکن اس شرط سے
ہ اس عطیۂ مقرری میں محسوب نہو اور بہت جلد مرحمت ہو زیادہ حد ادب
عرضداشت غالب معروضہ صبح پنجشنبہ ہشتم دسمبر ۱۸۵۹ء مجرد ورود عنایت نامہ
مرقومہ ماہ حال ۱۲

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

تقدیم مراسم تسلیم مقدمہ اس گزارش کا ہے کہ عالم میں ہیں ایک عالم شہادت
ایک عالم غیب جس طرح عالم شہادت میں آپ میری دستگیری کر رہے ہیں عالم غیب میں آپکا
اقبال مجکو مدد پہنچا رہا ہے تفصیل اس اجمال کی یہہ ہے کہ وہ نقشہ پنشن داروں کا جو یہاں سے صدر کو
گیا تھا وہ اب صدر سے بعد صدور حکم آگیا حکم بہ نسبت ہر واحد کے مختلف ہے تقلیل بہت سے
سو روپیہ مہینے والیکو بچھتر ملے ہیں اور کسی کو پچاس ہیں اور دس ملے ہیں اب فرمائیے میرے
واسطے کیا احتمال گزرتا ہے یا میں گمان ہے لیکن واقع یہ ہوا ہے کہ سب سے پہلے میرا نام اور
پوری پنشن کے واگزاشت کا حکم طرفہ یہ ہے کہ میرے نام کے ساتھ ایک انگریزی تحریر ہے کہ جس سے
یہ معلوم ہوتا ہے کہ گورنمنٹ کا حکم منظوری اس تحریر پر متفرع ہے حکام کے عملہ میں اور وکلا
اور اہل شہر میں یہ مشہور ہے کہ وہ تحریر ولایت سے آئی ہے بہر حال دو امر ہنوز مبہم ہیں
ایک اس انگریزی تحریر کا حال اور دوسرے میرے بقایا کے پنشن کی حقیقت سو یہ دونوں امر
چند روز میں معلوم ہو جائینگے اور جو معلوم ہوگا وہ عرض کیا جائیگا غالب ۲۲ اپریل ۱۸۶۰

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

شکر بندہ پروری بجا لا کر عرض کرتا ہوں کہ کل ۱۲ جولائی کو نوازش نامہ مع سو روپیہ کے ہنڈوی کے پہنچا اور روپیہ معرض وصول میں آیا متوقع ہوں کہ یہ عطیہ چوتھے پانچویں انگریزی کو جیسا کہ ہمیشہ پہنچتا تھا پہنچا کرے دسویں بارھویں نہ ہوا کرے تم سلامت رہو قیامت تک

خشنودی کا طالب. غالب
صبح جمعہ ۲۳ ذی الحجہ سنہ ۱۲۷۶
مطابق ۱۳ جولائی سنہ ۱۸۶۰

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے کل ایک شعر ظہوری مغفور کا اور ایک شعر
غالب مرحوم کا ایک ورق پر لکھ کر جبکہ ڈاک میں بھیجا دیا شام کو
توقیع وقیع ہرکارۂ ڈاک نے لا دیا اگست ۱۸۶۲ء کے پرورش کے ہنڈوی بھیجی اور
سو روپیہ وصول ہو گئے فقیر کا شیوہ صدق و سداد کا ہی چند روز سے تفقد و
التفات قدیم میں خدانخواستہ بائشہ کچھ کمی پاتا ہوں اگر غلط ہے میرا گمان تو
بشرف اطلاع مشرف فرمائیے اور اگر میرا دل دیوانہ سچ سمجھا ہے تو متوقع
ہوں کہ عتاب کے سبب سے آگہی پاؤں نہایہ حد ادب ہے تم سلامت رہو ہزار
برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار معروضۂ صبح دوشنبہ ۱۵ استمبر ۱۸۶۲ء

[illegible]

غالب

خداوند نعمت ہیں جو آپ بن مانگی دیں اور تسلی لینی میں مجھے انکار نہیں
اور جب محکوم حاجت آپڑی تو آپ سے مانگنی میں عار نہیں بار گران غم
سے پست ہو گیا ہوں آگے تنگ دست تھا اب تہی دست ہو گیا ہوں
جلد میری خبر لیجیے اور کچھ بھجوا دیجیے عنایت کا طالب۔ غالب ۱۲
چہارشنبہ یازدہم ربیع الثانی ۱۲۸۳ ہجری و ۱۷ نومبر ۱۸۶۶ع

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے نوازش نامہ عزّ ورود لایا از روئے ہنڈوی سو روپیہ بابت تنخواہ ماہ نومبر ۱۸۶۶ معرض وصول میں آیا زیادہ ادب

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

نجات کا طالب غالب
۱۲ دسمبر ۱۸۶۶

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

آج روز جمعہ ۱۷ رجب ۱۲۸۲ اور ۵ نومبر ۱۸۶۵ والا نامہ مع ہنڈوی تنخواہ اکتوبر ۱۸۶۵ آیا سو روپے کل آئینگے ۵۰ شاگرد پیشہ اور ۵۰ قرض متفرقہ میں جا کر ... روپے بچینگے الحمد للہ

پیر و مرشد

رجب کا مہینا چلا حسین علی خاں کی شادی کا تقاضا ہے ادہر سے جز سکوت جواب نہیں ــــ کئی دن ہوئے کہ ۱۵ سطر کا قطعہ ارسال ہوا ہے اور اسکی رسید الخط میں مندرج نہ تھی خاتمہ کے تین شعر دعائیہ یہاں لکھتا ہوں دعا کا نیا طور ہے

[illegible]

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم عرض کیا جاتا ہے کہ آج دو شنبہ کا دن ۱۴ رمضان المبارک کی اور ۱۸ ماہ اپریل کی پانچ بجے وقت ڈاک ہرکارہ آیا اور منشور معروفت دریا میں سر بمہر بہا تھا کہ نہیں نہ لکھا یا تعجب ہے [illegible] کی رسید سے عنایت نامہ میں مرقوم نہیں پایا ہے پہنچا یا نہیں پہنچا اور نہ یہ پایا کہ کچھ معلوم نہیں پہلی خط میں یہ عرض کیا ہے کہ مجموعہ نسخہ دو کی مثل مرتب ہے اور ہنوز حضور کو روانہ نہیں ہوا نواب گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ کی ایک بار نہ کلکتہ سے میرے نسخہ کے کاغذ طلب کئے اور وہ کاغذ فہرست میں سے الگ ہو کر لفٹننٹ گورنر بہادر پنجاب کے خدمت میں ارسال ہوئے وہاں سے کلکتہ کو بھیجے جائینگے پھر وہاں سے حکم منشور پنجاب تک آئے گا پھر یہاں آئیگا اور پھر مجھ کو روپیہ ملیگا آج روپیہ ملا کل ملیگا اب سوائے اور بار برداری کا حال آج سوائے اور بار برداری بھیجی اور کل بھیجی [illegible] کی راہ بلکہ اس نیاز نامہ میں کچھ حسن طلب ہے ہاہا افسوس ہے ایسا خط مفرد [illegible] نہ پہنچے دوسرا خط جناب عالیہ مغفورہ کی تعزیت میں تھا اور اسکا بھی ذکر اس عنایت نامہ میں نہیں لکھا ہے پہلی خط کا مضمون اس ورق میں مکرر لکھدیا اور دوسری خط کے صرف ذکر پر اکتفا کیا حق تعالی آپکو سلامت رکھے اور صبر و ثبات و دولت و اقبال و عمر و جاہ و جلال بصدق اولاد عنایت کرے غزلیں منجملہ ہزار غزلوں کے بعد اصلاح ارسال کر چکا ہوں خدا کرے پہنچ گئی ہوں پرسوں ایک قطعہ جناب [illegible] مرحوم و قبلہ کی تاریخ وفات کا بھیجا ہے یقین ہے کہ پہنچا ہوگا از راہ احتیاط دو قطعے [illegible] یقین ہے کہ پہنچا ہو اور نیز از راہ احتیاط یہ خط بیرنگ روانہ کرتا ہوں زیادہ حد ادب نیاز نامہ اسد اللہ خان معروضہ سہ شنبہ چہارم رمضان ۱۲۷۵ مطابق ہژدہم اپریل ۱۸۵۹ء

[illegible]

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہی نوازش نامہ کے ورود سی عزت اور آپکی
صحت و عافیت مزاج اقدس سی مسرت حاصل ہوئی پرچہ ہنڈوی
اوس توقیع مین ملفوف پایا سو روپیہ بابت تنخواہ دسمبر ۱۸۶۴ء معرفت
وصول مین آیا زیادہ حد ادب

تم سلامت رہو قیامت تک
دولت و عز و جاہ روز افزوں

نجات کا طالب غالب
سہ شنبہ ۱۸۶۵ عیسوی
۱۲ جنوری

ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے آٹھ سات برس سے مصدر خدمت اور شریک دولت ہونا لازم کرلیا ہے
کہ بیہودہ گزارش نکروں اور کبھی کسیکی سپارش نکروں بہائے حسن علیخاں کے بیٹوں
کے باب میں جو علی بخش خاں صاحب کو لکھا اسکو میں نے سپارش نسمجھا تھا مخبر بنا
اور آپکے اہلکاروں کو اوس بات کی خبر دی ہے جسکا تدارک مصاحبان ملک و حاکمان عہد پر لازم ہے
سو بمقتضائے نصفت و عدالت وہ مقدمہ فیصل ہوگیا میر سرفراز حسین اور میرن صاحب کو واللہ
باللہ اگر میں نے بھیجا ہو نوکری کی جستجو کو نکلے تھے میر سرفراز حسین نوکر پیشہ اور میرن
مرثیہ خوان اور یہانکے مرثیہ خوانوں میں ممتاز خانساماں صاحب کو جو میں نے یہ لکھا کہ یہ ایسے ہیں
اور ایسے ہیں غرض اس سے یہ تھی کہ محرم میں جہاں دس پانچ مرثیہ خوان اور مقرر ہوتے ہیں میرن
بھی مقرر ہو جائیں آخر جا بجا تھانہ دار کوتوال تحصیلدار نوکر ہیں میر سرفراز حسین ہوشیار
اور کارگزار آدمی ہیں کسی علاقہ پر یہ بھی مقرر ہو جائیں یہ دونوں امر یا ان دونوں میں
سے ایک ہو جاتا بہتر تھا نہوا بہتر در حقیقت سپارش نتھی صرف معروض ہونا تھا سپارش
کرتا تو کیا میں آپکو نہ لکھ سکتا تھا میری نظر سے خاطر عاطر جمع رہے سوز سینہ تا بلبم سانہا
نیابد راہ ہر آن نفس کہ رضائے تو اندر آن نبود داد کا طالب غالب دوشنبہ ۲۲ جولائی ۱۸۶۱ء

ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم عرض کرتا ہوں اور طلوع ستارۂ اقبال کی مبارکباد دیتا ہوں یقین ہے
کہ اس سفر فیض اثر میں ریل گاڑی کی سواری کی بھی سیر دیکھ لی ہو گی یہ اوس
میمنت و شکوہ و شوکت سے علاوہ ایک تماشا نیا دیکھا حق تعالیٰ حضرت کو سلامت
باکرامت رکھے۔ دعا گو ایک مہینا بھر سے بیمار ہے ابتداء میں تو قولنج دورے
بسبب استعمال ادویۂ حارّہ کہ اس مرض میں اوس سے گزیر نہیں تپ نے آ گھیرا
کئی بار تپیں آ گئیں اب ہم باریاں تل گئی ہیں لیکن قوت بالکل سلب ہو گئی
ہے اور ضعف دماغ نے قریب بہ ہلاکت پہنچا دیا ہے بالفعل آب سیب کا
استعمال ہے۔ طریقۂ دعا گوئی و ثنا خوانی کی رعایت سے نوبت بسبیل
شنوے کہ جس میں حصول عطیۂ سلطانی کے ہجری و عیسوی تاریخ ہے بہرحال
لکھ لیے ہیں کل ورود عنایت نامہ سے معزز ہو کر آج وہ اشعار نذر کرتا ہوں
خدا سے تم سلامت رہو قیامت تک شفقت کا طالب غالب

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم و نیاز معروض ہے جب سے حضرت کی ناسازئ مزاج مبارک کا حال خارج
مسموع ہوا ہے عالم الغیب گواہ ہے کہ مجھ پر اور میرے بھائی برادر میر فرزند حسین علیخان پر
کیا گزر رہی ہے ایکدن رات میرے گھر میں روٹی نہیں پکی ہم سب نے فاقہ کیا بارے وہ خبر
وحشت اثر غلط نکلی تو اس ٹھکانے ہوئے بالکل اطمینان جب ہوگا کہ آپ کے
غسل صحت کی نوید سنونگا اور قطعہ تاریخ غسل صحت لکھکر بھیجونگا فی الحال
التماس یہ ہے کہ اس خط کا جواب پاؤں اور حقیقت مرض سے آگہی حاصل ہو
زیادہ حد ادب

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

[illegible]

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے کس زبان سے کہوں اور کس قلم سے لکھوں کہ یہ ہفتہ عشرہ کس تردد و تشویش سے بسر ہوا ہے ہر روز شام تک جانب در نگران رہتا کہ ڈاک کا ہرکارہ آیا اور حضرت کا نوازش نامہ لایا بارے خدا کی مہربانی ہوئی از سر نو میری زندگانی ہوئی کہ کل چار گھڑی رات گئے ڈاک کے ہرکارے نے وہ ملفوف علامۂ عالی دیا جسکو پڑھ کر روح تازہ رگ و پے میں دوڑ گئی نیند کسکی سونا کسکا روشنی کے سامنے بیٹھا اور اشعار تہنیت کہنے لگا سات شعر مع مادۂ حصول صحت جب لکھ لئے تب سویا اب اسوقت وہ مسودہ صاف کر کے ارسال کرتا ہوں

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

نجات کا طالب غالب
[illegible]

حضرت ولی نعمت آیہ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے جب انبالہ میرا جانا ہوا تو میں نے قصیدہ جو
جو دربار کے نذر کے واسطے لکھا تہا بطریق ڈاک جناب چیف سکرتر بہادر
کو اس غرض سے بھیجا ہے آپ اسکو جناب نواب معلی القاب کے نظر
گزرانیں اور یہہ دستور قدیم تہا ہے جب میں قصیدہ مدحیہ بھیجتا تو
صاحب سکرتر بہادر کا خط بے واسطہ حکام ماتحت مجکو آجاتا اب جو
میں نے موافق معمول قصیدہ بھیجا یقین ہے ہے مارچ یا اپریل کے
مہینے میں وہ لفافہ یہاں سے لشکر کو گیا صد حیف بر نجات نا امید
ہو کر بیٹھہ رہا بلکہ یہہ خیال گزرا ہے جب رسم تحریر خطوط نہیں تو دربار
اور خلعت کہاں ناگاہ کل شام کو صاحب سکرتر بہادر کا خط ڈاک میں
آیا وہی افشاں کا کاغذ وہی القاب جو جاتا تہا ہے اصل خط سرنامہ
بھیجتا ہوں تا ہے حضور ملاحظہ فرمائیں مگر برسات کا اندیشہ مانع آیا
نقل سرنامہ اور خط کے بھیجتا ہوں سے تم سلامت رہو قیامت تک الٰہی
عز و جاہ روز افزون حضور کے خستہ درگاہ غالب ۱۲

نقل خط جناب صاحب سکرتر بہادر

۶۷

سرنامہ

در شہر دہلی

خانصاحب بسیار مہربان دوستان مرزا اسد اللہ خان غالب سلمہ اللہ تعالیٰ

خط بر کاغذ افشان

[illegible]

خانصاحب بسیار مہربان دوستان سلامت

قصیدۂ با آب و تاب در فرحت بندگان نواب مستطاب
معلی القاب ویسرائے و گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ
وصول گردید بمزید ارادت آنہا آبی و بر جبین
عقیدت ایشان تابے افزود و از گرانمایہ گوہرہا
بحر فکر نکتہ سنج سخنور معنی پرور گنج بر گنج نہادہ
بعد از نظر قبول بندگان نواب صاحب ممدوح
بگذشتہ طرب برای خاطر ہمایون ایشان گشتہ
زیادہ چہ نگاشتہ آید دستخط انگریزی

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

میں اس دولت ابد مدت کا ازراہ مودت خیر خواہ ہوں امر ملال انگیز اندوہ آور
میں آرائش گفتار گوارا نہیں کر سکتا نواب مرزا نے دلی آ کر پہلی نوید بزم آرائی
سنائی چاہتا تھا کہ اوسکی تہنیت لکھوں کل اوسنے از روے خط آمد رام پور
حضرت جناب عالیہ کے انتقال کی خبر سنائی کیا کہوں کیا غم و اندوہ کا ہجوم
ہوا حضرت کی غمگین ہونیکا تصور کر کر اور زیادہ مغموم ہوا بیدرد نہیں
ہوں کہ ایسی مقام میں بطریق انشا پردازی عبارت آرائی کروں ناداں
نہیں ہوں کہ آپ جیسی دانا دل دیدہ ور کو تلقین صبر و شکیبائی کروں
سے از دست گدای بے نوا تاید ہیچ جز آن کہ بصدق دل دعائی بکند
حق تعالی ذات ستودہ صفات کو دائما اور ابدا جاہ و جلال و دولت و
اقبال کے ساتھہ مستدام باکرامت رکھے ۱۲
عریضہ نگار اسد اللہ المتخلص بہ غالب ۱۲
مرقومۂ یکشنبہ اول شعبان و ۲۷ مارچ سنہ حال

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے نوازش نامہ مع سَو روپیہ کی ہنڈوی کے
پہنچا اگست ۱۸۶۲ء کے مہینے کی پرورش کا روپیہ وصول ہوا

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

پنجشنبہ ۴ ستمبر ۱۸۶۲

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے کہ روز پنجشنبہ ۱۵ جون کو ایک عرضداشت روانہ کر چکا ہوں یقین ہے
کہ وہ آج پہنچی ہوگی۔ کل ۱۷ جون کو فرح بخش و روح افزا نوازش نامہ پہنچا۔ قصیدہ کا پہنچنا اور
اوسکا مقبول و منظور ہونا دریافت کر کے اپنی بخت و قسمت پر میں نازاں ہوا اب عرض یہ ہے کہ
حسب الحکم حضور کے یہ قصیدہ میرے دیوان فارسی میں جو کتابخانہ میں موجود ہے درج کیا گیا تھا اور سلام خمس
فردوس مکان کا اونکے دیوان اردو میں لکھ دیا جائے حضرت کے خدمتمیں نہ آونگا تو اور کہاں
جاؤنگا وہ آگ برس رہی ہے کہ طیور کے پر جل رہے ہیں بعد آگ کے پانی برسیگا سفر خصوصاً بوڑھے
رنجور آدمیکو ان دنوں صورت میں متعذر آفتاب میزان میں آیا اور ہنگامۂ آتش و آب رفع ہوا اور
میں نے احرام بیت المعمور رامپور باندھا انشاءاللہ العلی العظیم پیر و مرشد از راہ خیر خواہی ایک امر
عرض کرتا ہوں محمد علی خاں ابن وزیر محمد خاں رئیس ٹونک نے بعد مسند نشینی گورنمنٹ کو یمین الدولہ اور
۵ جزو ملک شجنگ لکھ دیئے اور وہاں سے وہ اونکو عطا ہوئے حضور کے اجداد امجاد نے سلاطین
سے ہر تبہ کا خطاب نہ قبول کیا مگر حضرت کے جد امجد کو احمد شاہ درانی نے مخاطب بہ مخلص الدولہ فرمایا
حضرت اگر مناسب جانیں تو اوس خطاب کو مع ۵ جزو شمس الملک و بہرام جنگ صاحب ملکہ معظمہ سے بذریعہ
گورنمنٹ انگلشیہ لیں سلامت رہو قیامت تک دولت و عزت و جاہ روز افزوں ترقی دولت کا طالب غالب

یکشنبہ ۱۸ جون ۱۸۶۶ء

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت

بعد تسلیم کے معروض ہے نوازشنامہ اور اوس کے ساتھ بہنگیاں دو سو آموں کی پہنچیں

شکر نعمت ہای تو چندان کہ نعمت ہای تو زیادہ ادب

تم سلامت رہو قیامت تک

دولت و عز و جاہ روز افزون

نجات کا طالب غالب —

شنبہ نہم ...

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد بجا لانے آداب نیاز کے عرض کرتا ہوں یہ میرا درد دل ہے نامۂ تہنیت میں
اسکا اندراج مناسب نہیں جانا میں انگریزی سرکار میں علاقہ ریاست کا دمانگار کہتا
ہوں معاش اگرچہ قلیل ہے مگر عزت زیادہ پاتا ہوں گورنمنٹ کے دربار میں داہنی صف
میں دسواں نمبر اور سات پارچے اور جیغہ سرپیچ مالائے مروارید خلعت مقرر ہے لارڈ
ہارڈنگ صاحب کے عہد تک پایا لارڈ ڈلہوزی یہاں آئے نہیں ان سے نواب معلی القاب آئے ہی
زمانہ گرد اور کوئی حاکم کوئی سکرتر میرا آشنا نہیں بڑی میری مربی قدرداں جناب
اڈمنسٹن صاحب وہ بھی چیف سکرتر سے لفٹنٹ گورنر ہوگئے وہ سکرتر رہتے
تو مجھے کچھ غم نہ تھا اب تک میں اپنی کو یہ بھی نہیں سمجھا ہوں بیگناہ ہوں یا گناہگار
مقبول ہوں یا مردود ہاں یہ کہ کوئی خیر خواہ نہیں کہ جو نئی انعام کا مستحق ہوں
لیکن کوئی بیوفائی بھی سرزد نہیں ہوئی جو دستور قدیم کو برہم کرے بہر حال اس
تشویش میں ہوں راہ چارہ مسدود اور دکھ موجود عرفی خوب کہتا ہے مرا
زمانہ طناز دست بستہ و تیغ زند بفرق و گوید ہاں سر بخار
مرقومہ صبح یکشنبہ ۷ نومبر سنہ ۱۸۵۹ع

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد آداب بجا لا کے عرض کرتا ہوں کہ منشور رافت لکھا ہوا ۲۰ نومبر کا جمعہ کے دن تیسری
دسمبر کو اس دعاگو حضرت کے پاس پہنچا ڈھائی سو روپیہ کے ہنڈوی معتمد کے حوالہ کر گئی
آج یا کل روپیہ آجائیگا خاطر عاطر اقدس جمع رہے ۱۲ میرے حاضر ہونیکو جوار شاہ ہوتا ہے
میں وہاں نہ آؤنگا تو اور کہاں جاؤنگا مبین کہ وصول کا زمانہ قریب آیا ہے اسکو ملتوی
چھوڑ کر کیونکر چلا آؤں سنا جاتا ہے اور یقین ہے آتا ہے ۳ جنوری آغاز سال ۵۹ عیسوی میں
یہ قصہ انجام پائے جسکو روپیہ ملنا ہے اوسکو روپیہ جسکو جواب ملنا ہے اوسکو جواب مل جائے ۱۲
حضور نے یہ کیا تحریر فرمایا ہے کہ ان بارہ غزلوں کی اصلاح میں کلام خوش مطلوب ہے
اگلی غزلوں کی طرح نہوں مگر اگلی غزلوں کی اصلاح پسند نہ آئے اور اون اشعار
میں کلام خوش نہتا حضرت کا تو اون غزلوں میں بھی وہ کلام ہے کہ شاید اور وں کے
دیوانوں میں ویسا ایک شعر بھی نہ نکلیگا میں بقدر اپنی فہم و استعداد کے کبھی اصلاح میں
قصور نہیں کرتا زیادہ حد ادب عرضداشت غالب معروضۂ جمعہ ۲۶ ربیع الثانی سنہ ۷۵ و ۳ دسمبر ۵۸

جناب عالی تجہہ کم مہنیا ہوا کہ مین نی حضور کے غزلونکو دیکہہ کر فہ مہنین روانہ کیا ہے
اوراوسکی پہنچنی سے اطلاع نہین ہے اب ڈاکین خطا تلف بہی ہوجایا کرتے ہین اس
واسطی مین متردد ہون اور مدعا اس تحریر سے یہہ ہے کہ اگروہ لفافہ نہ پہنچا ہو
تو مین اوس مسودہ کو پہر صاف کرکر روانہ کردون زیادہ حد ادب از غالب نگاشتہ
صبح پنجشنبہ ۲۷ شعبان سنہ ۱۲۷۳ ہجری

حضرت ولی نعمت آیہ رحمت سلامت

ایک خط مشتمل اپنی حال پر اور ایک خط جناب بیگم صاحبہ و قبلہ مغفورہ کے تعزیت میں روانہ کر چکا ہوں اب ایک قطعہ تاریخ بھیجتا ہوں اگرچہ ایک کا تعمیہ ہے لیکن تعمیہ کتنا خوب اور بے تکلف ہے عرضداشت اسد اللہ معروضہ ۱۲ رمضان و ۱۷ اپریل سال حال

جناب عالیہ از بخشش حق
بفردوس برین چون یافت آرام
سخن پیرا از انا سال رحلت
نمود خلد آگیں مادر روح الہام
سنہ ۱۲۷۵ ہجری

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت منشور عطوفت کے دیکھنے سے زندگی کی صورت نظر آئی مخمس اور
غزلوں کے پہنچنے کی اطلاع پائی یہ بھی ایک بخشش کا بہانہ پیدا کرنا ہے ورنہ حضور کے کلام کو اصلاح
کی احتیاج کیا ہے میری کیا سخنوری ہے اور سخن سرائی ہے آپ کی قدردانی بلکہ قدرافزائی ہے تکلف ہے
اگر کہوں کہ تا قیامت رہو بے تکلف دعا یہ ہے کہ خدا کرے ایک سو بیس برس تک سلامت رہو آمین
قرینے سے کہ بسبب کم فرصتی اونکا ملاحظہ نکرنا مرقوم ہوا ریختہ کے دیوان اور اس کتاب کا
پہنچنا معلوم ہوا دیوان کے دیکھنے نہ دیکھنے میں آپکو اختیار ہے مگر یہ چار جزو کا رسالہ جو
اب بھیجا ہے اسکا دیکھنا ضرور درکار ہے فارسی قدیم اور بہر حسن معنے اور صنعت الفاظ با ایں ہمہ
ہر امر کی احتیاط اور ہر بات کا لحاظ جناب عالی طرفہ معاملہ ہے خدا کا شکر ہے اور اپنی قسمت کا گلہ
ہے خدا کا شکر یہ ہے کہ باوجود تعلق قلعہ کسی طرح کے جرم کا بہ نسبت میرے احتمال بھی نہیں قسمت کا
گلہ یہ کہ عطائے پنسن قدیم کا حکام کو خیال بھی نہیں یہ نومبر ۱۸۵۸ء انیسواں مہینا ہے گویا
بن کھائے جیتا ہے کہتے ہیں کہ جنوری شروع سال میں پنسن داروں کو روپیہ ملیگا دیکھیے کیا نیا
گل کھلیگا پہلی نومبر کو یہاں اشتہار عام ہو گیا ہے کہ اب قلمرو ہندوستان عمل ملکۂ معظمہ
عالیمقام ہو گیا ہے میں پہلے سے مداحوں میں اپنا نام لکھوا چکا ہوں اور وزرائے ملکہ دار دور لندن کے
ذریعہ سے قصیدہ بھیج چکا ہوں اگر اس اجمال کی تفصیل معلوم کیا چاہیے تو اس کتاب موسوم
بہ دستنبو میں دیکھا چاہیے خشنودی کا طالب غالب نگاشتۂ روز یکشنبہ ہفتم نومبر ۱۸۵۸ء

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

آداب بجا لاتا ہوں غزلوں کے مسودات کو صاف کر کر حضور میں بھیجتا ہوں مسودات اپنے پاس
رہنے دیتے ہیں اس نظر سے کہ اگر احیاناً ڈاک میں لفافہ تلف ہو جائے تو میں ہر اوراق کو صاف
کر کر بھیجوں ورنہ موقع حک و اصلاح مجھے کیا یاد رہتا ہے میں نہیں چاہتا کہ آپ کا اسم اور
نام اور تخلص رہے ناظم تخلص اور شوکت نشان انھیں سے جو پسند آئے وہ رہنے
دیجئے مگر یہ نہیں چاہتا ہم خواہی نخواہی آپ ایسا ہی کریں اگر وہی تخلص منظور ہو تو بہت مبارک
زیادہ حد ادب تم سلامت رہو قیامت تک عنایت کا طالب غالب روز پنجشنبہ ۱۵ فروری ۱۸۵۷

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

نوازش نامے کے ورود مسعود کی اطلاع دیتا ہوں اور ہنڈوی کے
پہنچنے کا شکر بجا لاتا ہوں ستمبر ۱۸۶۸ء کے مہینے کے سو روپیہ
پہنچے خاطر اقدس جمع رہے ۱۲

حزم و ولدیت کا حال معلوم ہوا حق تعالیٰ آپ کو ہر جگہ مظفر و منصور
کامیاب رکھے خدمتگزار ہوں اور دعا و ثنا میرا کام ہے بڑھاپے نے
کھو دیا جز نفسے چند مجھ میں کچھ باقی نہیں زیادہ حد ادب
عرضداشت غالب معروضہ یکم اکتوبر ۱۸۶۸ء بیہوش

جناب عالی آداب بجا لاتا ہوں اور عرض کرتا ہوں کہ آج وہ دار پہنچا گھر لٹتا ہوا اور بھیگا
ہوا اور بھاگتا ہوا گو چوروں نے اور لوٹ لیا روپیہ کل سب لے لیا خط اور دیگر
بھی گر پڑا بھیگ گیا لفافہ مجھ تک ہو کے خط مع ہنڈوی کے پہنچا خط میں سے القاب
بہ تکلف پڑھے اور یہ جملہ سفتجہ مبلغ دو صد روپیہ پڑھا گیا اور تاریخ فرد عافیت
مکرر آنکہ اس کے بعد جو کچھ لکھا تھا اوس میں سے کوئی یہ لفظ اور بعد ایک نقطے کے
خاتمہ سے یہ پڑھا گیا اور کچھ نہیں مجھ کو غم یہ ہے کہ غزلیں اصلاحی اور دیوان اور منشی کو رسید
میں نمازہ تاریخ ۱ ہنڈوی لفافہ بعینہ وہ حال جو میرے خط کا تھا کچھ پڑھا جاوے کچھ نہ پڑھا جاوے اوسکا
نام اور ڈھائی سو روپیہ یہ پڑھا گیا چونکہ مہاجن مجھ کو جانتا تھا اوس نے اوس بھیگے ہوئے
کاغذ کو اپنے منشی کی کتابت کر را مور اوس مہاجن کے پاس بھیجا ہے جب وہ صحیح
پہنچے گا تب وہ مجھ کو روپیہ دیگا اوس کی تصحیح کر نہیں کیا تامل ہے میں نے حرف بحرف اطلاع
لکھا ہے اور غزلوں نے اور دیوان نے رسید اور جو اس خط میں مکرر آنکہ بعد مطالب
مندرج تھے وہ بہر ایسے ہے بارے کاغذ پر لکھ کر اس ہو کار کر دیکھنا اور اوسکو
تاکید کیجیے گا کہ آپ کو بھیج دے پہنچتا ہو کار نے میری خاطر سے اس رقعہ کو راست

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

آداب نیاز بجا لاتا ہوں اور مزاج اقدس کی خبر پوچھتا ہوں
اور بکمال ناچاری بصد گونہ شرمساری عرض کرتا ہوں کہ آج سہ شنبہ
۷ فروری کے ہے جو لوگ کہ میرے ساتھ ہیں گوش بر آواز ہیں اور جو
وظیفہ خوار دلی میں ہیں وہ چشم براہ ہوںگے زیادہ حد ادب

خشنودی کا طالب غالب
صبح سہ شنبہ ۷ فروری سنہ ۱۸۶۰

سند جانشینی بنام نواب علاء الدین احمد خان علائی

دانشهای بیش و اندیشه‌های بسیار را به فرگاه تنگ [illegible] اندیشه‌گاه [illegible]
جز اینها یه آگهی [illegible] از وست یا همه اوست [illegible] دانشمند
دیده ور نگشاده اند خرد [illegible] دیده [illegible] شده [illegible]
خزانه هرچه پس از [illegible] نساه [illegible] تا بر این توانا سرو شی چگونگی آن
را پدیدار تواند ساخت سخن در [illegible] مهت [illegible] بدر بیش [illegible]
چگونه تواند شناخت چون خرد فرومانده [illegible] ما که [illegible] از خرد [illegible]
در دانستن خرد آفرین چون فرو مانیم [illegible] که خدا [illegible] یادگار
خرد را در آفرینش با سخن که پرتوی از شبستان خرد تواند بود [illegible] هم از دانش گوهر
خرد را به ترازوی سخن سنجیم [illegible] سخن را هنجار خرد آ[illegible] اگر گفتار [illegible] در
[illegible] همه [illegible] قره [illegible] ارزانش [illegible] در [illegible] این کار
آموختن فرهنگ [illegible] آموزگار [illegible] پیمودن راه گفتار [illegible] که
[illegible] زاده نامور [illegible] میرزا علاء الدین [illegible] بهادر به فر تاب خرد خداداد
راه سخن به [illegible] رفت [illegible] خویش [illegible] سخن گستری [illegible]
[illegible] از من گرفت اینک چنانکه در خوشادند و یگانگی مردم چشم [illegible]
[illegible] دانش [illegible] و فرزانگی جانشین [illegible] آیین گفتار [illegible]
اندیشه [illegible] دیگر [illegible] دل [illegible]

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے نوازش نامہ مع ہنڈوی سو روپیہ کے
شرف ورود لایا سو روپیہ مصارف ستمبر سنہ ۱۸۶۲ کا معروض
وصول میں آیا ہے تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں
دن پچاس ہزار معروضۂ دہم اکتوبر سنہ ۱۸۶۲
خشنودی مزاج کا طالب غالب ہے

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے نوازشنامۂ ربوبیت طراز مورخہ ۱۱ مارچ ۱۸۶۳ء ۱۴ ماہ مذکور کو
مینے پایا ۱۵۰ سو روپیہ کی ہنڈوی کا شکر بجا لایا کہانتک شکر بجا لاؤنگا کس کس عنایت کا
سپاس ادا کرونگا سے شکر نعمتہاے تو چندانکہ نعمتہاے تو اب سنیئے اپنی دعاگو کی داستان
منگل ۳ مارچ کو جناب لفٹنٹ گورنر بہادر نے خلعت عطا کیا اور فرمایا ہم تمہیں خوشخبری دیتے
ہیں کہ نواب گورنر جنرل بہادر نے اپنے دفتر میں تمہارے دربار اور خلعت کے بدستور بحال رہنے کا حکم
لکھوا دیا میں نے عرض کیا کہ میں انبالے جاؤں فرمایا البتہ انبالے جانا ہوگا بعد جناب نواب صاحب کے جانے کے
شہر میں شہرت ہوئی کہ دلی کے لوگ انبالے جانے سے ممنوع ہیں گھبرایا اور صاحب کمشنر کے پاس گیا آپ نے
خط انبالے دیا آیا زبانی پرسش کا جواب زبانی پایا پھر خط کے جواب میں خط مورخہ ۱۰ مارچ آیا چنانچہ
لفافہ بلجنسہ گرانی وزن رنج دیتا ہوں اور خط بجنسہ حضرت کو بھیجتا ہوں کل پرسوں ایک
اور خبر اوڑی ہے کہ نصیب اعدا لارڈ صاحب کی طبیعت ناساز ہوگئی ہے انبالے میں دربار نکرینگے اور
شملہ کو چلے جائینگے اب میں ہم وجہہ بین السفر والسکون متردد ہوں پہلے وجہہ خانہ میں دو سرے
وجہہ عام دو سو میں سے سو لیکر ساز و سامان درست کیا ہے اور سو مہاجن کے ہاں ڈال دیا اور
خرچ راہ کے واسطے رہنے دیئے ہیں تار برقی میں جناب نواب صاحب سے حکم منگاؤنگا جو حکم آئیگا

آپ سے عرض کرکے اوس کی تعمیل کرونگا سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار معروضہ ۱۶ مارچ سنہ ۱۸۶۳ء

ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے عنایت نامہ کے ورود سے میں نے عزت
پائی سو روپیہ کی ہنڈوی بابت مصارف مارچ سنہ ۱۸۶۱ء کی
پہنچی زر مندرجہ معرض وصول میں آیا خاطر اقدس قرین جمعیت
رہے کلیات فارسی کے پہنچنے سے اور اس نذر کے مقبول
ہونے سے مجھکو بہت خوشی حاصل ہوئی ہے تم سلامت رہو
قیامت تک عنایت کا طالب غالب ۱۲
صبح یکشنبہ ۷ اپریل سنہ ۱۸۶۱ء

ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم تورہ اور خلعت کے عطیہ کا آداب بجا لاتا ہوں خدا
آپکو سلامت رکھے اور اپنی اولاد کے اولاد کے شادیاں کرنی اور اون
شادیوں میں تورہ و خلعت کے تقسیم نصیب ہو ۱۲

یہ تحریر نہیں مکالمہ ہے گستاخی معاف کروا کے اور آپ سے اجازت لیکے
بطریق انبساط عرض کرتا ہوں کہ یہ سواسو روپیے جو تورہ و خلعت
کے نام سے مرحمت ہوئے ہیں میں کال کا مارا اگر یہ سب روپیہ کہا جاونگا
اور اسمیں لباس نہ بناونگا تو میرا خلعت حضور پر باقی
رہیگا یا نہیں ؟ تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں
دن پچاس ہزار داد کا طالب غالب ۱۲ دوشنبہ بحساب تعزیہ داران
پانچویں اور از روے رویت چھٹی محرم الحرام ۱۲۷۸ھ

حضرت ولی النعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہی حضرت کی قدمونکی قسم چوب چینی کی ارسال کا حکم ڈاک
سے مین نی نہین پایا ۲۲ دسمبر کو ہرکارہ آیا نوازشنامہ شرف افزا لایا
دلّی اب شہر نہین چھاونی ہے نہ قلعہ نہ شہر کے اُمرا نہ اطراف شہر کی رؤسا
بہرحال تین چار دن مین ہر ایک جگہہ سے منگوا کر رنگین و سنگین وہی گرہ یا کم گرہ
خود چُنکر پانچ سیر قطعات چوب چینی ایک تھلیا مین رکھہ کر آتی سے منھہ بند کیا
پھر کپڑا لپیٹا ڈورے سے خوب مضبوط باندہ کر دو جگہہ اپنی مُہر کی اور وہ تھلیا کہار کو سونپی
ہے تم سلامت رہو قیامت تک دولت و عزّ و جاہ روز افزون

روز دوشنبہ ۲۶ دسمبر ۱۸۶۶ء وقت صبح حوالہ کہار سرکار

شبیہ نواب کلب علی خاں والی رامپور

مرزا غالب کی ۱۸۶۵ء تا مرگ ۱۸۶۹ء
مرزا موصوف کی نواب صاحب سے خط وکتابت رہی۔

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے میری عرضداشت کا جواب آچکا ہے بندہ ہنڈوی کی رسید بھیج چکا ہے یہاں خلق کو مینہہ ترسا رکھا ہے اور ہوا شرارہ بار ہے دھوپ کی تیزی سے آدمی کے تیور اور پہاڑ کے پتھر جلے جاتے ہیں پانی جگر گداز ہوا جاتا ہے امراض مختلفہ کا ہجوم جہاں تہاں بجز اعضائے انسان کے کہ وہ پسینے میں تر ہیں طراوت و رطوبت کا کہیں پتا نہیں یا لو چلتی ہے یا مطلق ہوا نہیں ان سطور کی تحریر سے مدعا یہ ہے کہ مجھے ہر وقت یہی خیال رہتا ہے کہ حضرت کا مزاج کیسا ہے اسکا جواب جسقدر جلد عطا ہوگا دعاگو پر احسان آپکا ہوگا زیادہ حد ادب

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

آپکی سلامت ذات اور اپنی نجات کا طالب غالب

۲۳ جون ۱۸۶۶

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض آنکہ منشور عطوفت عز ورود لایا تنخواہ جولائی ۱۸۶۶ء
کا ہنڈوی حال روپیہ از روی ہنڈوی ملفوفہ معرض وصول میں آیا اگرچہ جہان میں
اسقدر برسا ہی کہ جسکی پانی سے زمیندار حاصل فصل ربیع ہاتھ دھو بیٹھے ہیں
مگر چونکہ بفرمان ازلی میر رزق کہ برات آپ پر ہے اور آپکے ملک میں
بارش خوب ہوئی ہے ابر رحمت کی شکریہ میں ایک قطعہ ملفوف اس عرضی
کے بھیجتا ہوں بنظر اصلاح نظم و اصلاح حال ملاحظہ ہو زیادہ حد ادب

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

نجات کا طالب غالب
۱۱ اگست ۱۸۶۶
جمعہ ۵

۱
مقام شکر ہے اے ساکنان خطۂ خاک
رہا ہے زور سے ابر ستادہ بار برس

۲
کہاں ہے ساقیٔ مہوش کہاں ہے ابر مطیر
بہار لائی ہے گلزار گل بہار برس

۳
خدا نے تجھکو عطا کی ہے گوہر افشانی
در حضور سے ابر گہربار برس

۴
ہر ایک قطرہ کے ساتھ آرزو کہ وہ ہی
امیر کلب علی خان جئیں ہزار برس

۵
فقط ہزار برس پر ہے کچھ انحصار نہیں
کئی ہزار برس بلکہ بے شمار برس

۶
[illegible]
[illegible]

غلام [illegible] نجات
[illegible] ہزار برس

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہی تہنیت نامہ ارسال کر چکا ہوں جواب پا چکا ہوں
قصیدہ کا لفافہ ارسال کیا ہی یقین ہی کہ پہنچ گیا ہوگا ۱۲
حضرت فردوس مکان سپہر آستان کا معمول تہا کہ محرم سی دو تین مہینی پہلی
سلام پانچ سات لکھتی تہی اور فردا فردا میری پاس بھیجا کرتی تہی جب وہ فراہم
ہو چکتی تو محرم سے دو چار دن پہلی میں اصلاح دیکر بھیجدیا کرتا تہا ابکی برس
ایک ہی سلام بھیجنے پائی بس آج وہ سلام اس مراد سی حضور میں بھیجتا ہوں کہ
حضور کے حکم سے حضرت کی دیوان میں شامل ہو جاے زیادہ حد ادب
تم سلامت رہو ہزار برس دولت و عز و جاہ روز افزوں ۱۲

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہی حق تعالی جل جلالہ و عم نوالہ جس گروہ پر مہربان ہوتا ہی وہان حاکم
عادل رحیم بھیجتا ہی کہ وہ بقوت عدل دلہ کفر و بدعت کی جڑ اوکھاڑ ڈالی اور بصفت رحم رعایا
کو پالی مصداق اوسکا ذات قدسی صفات جناب عالی ہی ہر چند قمار خانی کی بنا مٹا ڈالی ہے زہی قانون نوکر
سیاست غلہ کا محصول معاف کردیا ہی روپیہ میت پر نثار کیا ہی زہی آئین ریاست

[illegible]

پیر و مرشد حضرت فردوس مکان کا دستور تھا کہ جب مین قصیدہ بھیجتا تھا
اوسکی رسید مین خط تحسین و آفرین کا شرم آتی ہی کہتی ہوئی مگر کہی بغیر بنتی نہین ماہ بماہ
کہ ہندوستان مین اوس خط مین ملفوف عطا ہوا کرتے تھی ہر قصیدہ مدحیہ میرے دیوان فارسی مین کہ توم
اور وہ دیوان حضرت کے کتابخانہ مین موجود ہے خطوط کی تصدیق از روی دفتر ہو سکتی ہے
یہ رسم ترکی نہین ہے اگر جاری رہی تو بہتر ہے زیادہ حد ادب
التفات کا طالب غالب

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم عرض یہ ہے فقیر تکیہ دار روزینہ خوار غالب خاکسار رجز خواں ہے کہ شکر بجا لائے
آپکی عنایت کا یا ذکر کرے آپکی کرامت اور ولایت کا آپ بے شبہہ رونق
مسند علم و یقین ہیں تکلف برطرف امیر المسلمین ہیں یہ نہ فقط از روئے ارادت
ہے بلکہ یہاں مشاہدۂ خرق عادت ہے ان دنوں میں متفرقات کے قرضدار سرگرم تقاضا بلکہ آمادۂ
شور و غوغا تھے دو سو روپیہ کے ہنڈوی صراحی آب حیات ہو گئی دام مرگ سے نجات ہو گئی
لطف یہ کہ آج صبح بروز دوشنبہ ۲۰ اگست کو نو بجے اول روز ایک قصیدہ کا لفافہ بھیجا
گیا اوسی دن بارہ پر تین بجے یہ کرشمۂ کرامت دیکھا گیا قصیدہ کی لفافہ میں ایک
عرضداشت ہے اوس سے قصیدہ کی حقیقت اور خود اوس نظم سے طرز نگارش کی جودت
ظاہر ہو جائیگی حضرت کی انبساط خاطر کیواسطے یہ ایجاد ہے مجھے ہر طرح کی نظم و نثر سے
آپکی خوشی اور خوشنودی مراد ہے انجام قصیدہ میں جو قرض کی گلہ باتیں ہیں اوس مجموعے
میں اہل بازار منہائی کئے جائیں کوٹھی والے ساہوکار مہمل خلیفہ کئے جائیں سو تم سلامت
رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار ترقی عمر و دولت خداوند کا طالب غالب
نگاشتہ دوشنبہ ۲۱ اور روان شدہ سہ شنبہ ۲۲ اگست ۱۸۶۶ء

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے کہ میں طبیب نہیں مگر تجربہ کار ہوں ستر برس کا آدمی ہوشیار ہوں
اور سے یہ کہا نہیں جاتا حضرت پر بہ تغیر ظاہر کئی رہا نہیں جاتا خدا جانے اور طبیب نا سمجھی ہوگی
ہو گیا تھا میرے نزدیک بہ اشتراک معدہ و قلب مرض طاری ہوا تھا اب آپ کو حفظ صحت کیواسطے
گاہ گاہ نارجیل دریائی و جدوار کا استعمال ضروری ہے اور معجون طلائی عنبری تقویت قلب میں
مجوزہ حکیم میر علیخان مغفور ہے ورق طلا عنبر اشہب عرق کیوڑہ قند کثرت اجزا اس ترکیب
خاص میں نا پسند کثیر الاجزا اور معجونیں ہیں مفرح بو علی سینا خمیرہ مروارید خمیرہ گاؤزبان عنبری
ماء اللحم غیر مشتہی جس میں طیور کے گوشت اور ادویہ مفرح و مقوی حرارت و برودت میں معتدل
گاہ گاہ سکنجبین و گلاب پلا لیا کیجے غذا میں گوشت طیور اگر بعضیہ نیم برشت اکثر لیکن یہ خیال
ہے بیضہ مرغ و لحم طیور ایک جلسہ میں تناول نہ فرمائیے گا بکری کے گوشت کے ساتھ بیضۂ مرغ جائز اور
لذیذ اور مرغوب ہو دینہ کا عرق جو نفع الاکبر کا عرق ہمیشہ دوا خانہ میں موجود رہے عطریات کی
استعمال میں مبالغہ بعد غذا مباشرت سے پرہیز شوربا یا یخنی گوسفند مادہ خاص پر ہو بجود
رہے [illegible] طبیعت خوشی فرماتے رہتے ہے تم [illegible] تا قیامت تک دولت فزون عمر دراز
روز افزوں مسلامت و صحت کا طالب غالب نگاشتہ یکشنبہ و روان داشتہ دوشنبہ

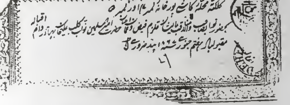

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے ہر چند آبدار خانے کے ساتھ ہونے سے پانی کی طرف سے خاطر جمع ہے اور حضور جو پانی ہمیشہ پیتے تھے وہی پیتے ہونگے مگر ہر جگہ سفر اور اختلاف ہوا کا خیال بھی ہے توقع رکھتا ہوں کہ نوید صحت و اعتدال مزاج اقدس سے عز اطلاع پاؤں بُعد اگرچہ بہت نہیں لیکن طبع پر گراں ہے چشم شوق درود موکب عالی کی نگراں ہے بقول استاد بہ تغیر لفظ جو تم بہر آؤ تو حضرت بہر یہ ہمارے دن زہے ادب

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

نجات کا طالب غالب
راقم نجات کا طالب ... حضرت ...
غالب ... جمعہ ...

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے مراد آباد پہنچا بعد ایک کے اور آفت نئی پیش آئی کا توٹ جانا گاڑی جب بہانے لگی
رخصت خواب کا صبح آدمیوں کو اوسے زہر بہر تک امید نہیں رہنا بغیر جاڑے کے کچھ نہ کہنا نیز جو ہونا ہے
گزرا وہ جاڑے میں مراد آباد کے سرا میں ایک چھوٹے سے حویلی میں تین پہر کا بیٹھا قتل روزہ تر
مر رہا یہ شعر اپنا پڑھ پڑھ کر صبح کی ہے گرم فریاد رکھا شکل نہالی نے مجھے تب اماں ہجر میں دی
برد لیالی نے مجھے جبکہ خستہ و رنجور او تھا صاحبزادہ ممتاز علیخاں بہادر کے بھیجے ہوئے دو
فرشتے آئے اور مجھ کو سعید الدین خاں صاحب کے ہاں لے گئے صاحبزادہ صاحب نے وہ تعظیم و تکریم اور
سعید الدین خاں صاحب نے وہ تکریم و تعظیم کی جو میرے ارزش سے زیادہ تھی ناگاہ مولوی محمد حسن خاں
بہادر صدر الصدور آئے اور مجھ کو اپنے گھر لے گئے پانچ دن وہاں رہا جاتے نواب مصطفیٰ خاں بہادر
وہیں مجھ سے آکر ملے ہم سفر دن وہ رہگرائے دار السرور رام پور اور میں جادہ نورد ستم آباد دہلی
ہوا دوشنبہ ۲۰ شعبان ۸ جنوری کو در غمکدہ پر پہنچا حضور کے اقبال کی تائید تھی ورنہ میں
اور جیتا دلی پہنچتا مغلوب غلبۂ غم دل غالب حزیں کاندر تنش ز ضعف توان گفت جاں نبود
از راہ سوز نغمہ بہ دہلی رسیدہ است ما را بہ دل گماں ضعیفے ایں گماں نبود

تم سلامت رہو قیامت تک
دولت و عز و جاہ روز افزوں

نجات کا طالب غالب
[illegible]

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے عنایت نامۂ والا گشت ہدف مجکو میری حیات پر یقین عنایت
کیا اس سفر کا حال کیا عرض کروں دلی سے رامپور تک بذوق قدمبوس میں جوانانہ گیا
اختلاف آب و ہوا و تفرقہ اوقات غذا کو ہرگز نمانا اور رنج راہ کو ہرگز خیال میں نلایا
وقت معاودت اندوہ فراق نی وہ فشار دیا کہ جوہر روح گداز پاکر ہربن مو سے ٹپک گیا
اگر آپ کے اقبال کی تائید نہوتی تو دلی تک میرا زندہ پہنچنا محال تھا جاڑا مینہ قبض و
انقباض فقدان جوع فاقہ ہای متواتر منزلہای نامانوس ہاپوڑ تک آفتاب کا نظر نہ آنا
شب و روز ہوای زمہریر کا جانگزا رہنا بارے ہاپوڑ سے چلکر نیر اعظم کی صورت دکھائی دی
دھوپ کھاتا ہوا دلی پہنچا ایک ہفتہ کوفتہ و رنجور رہا اب ویسا ہی ناتوان ہوں جیسا
ہی اس سفر سے پہلی تھا خدا وہ دن کرے پھر اس در پر پہنچوں ؎ تم سلامت رہو ہزار
برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

نجات کا طالب
غالب

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے توقیع وقیع مع سو روپیہ ہنڈوی کے عز ورود لایا۔ سو روپیہ تنخواہ کا روپیہ معرض وصول میں آیا۔ آپ کے غلام زادہ نے اپنی تنخواہ کا حال جو یہاں میں نے حضور کا خط اوسے دکھا دیا تا امیدانہ چپ ہو رہا۔ اب جس درویش دل ریش کا حال سنیئے سامعہ مدت سے کھو بیٹھا اب آنکھوں کو بھی رو بیٹھا۔ دو رسطر قد و قامت دور کا دیکھا جاتا ہے۔ چہرہ اچھی طرح نظر نہیں آتا ہے۔ فقدان طاقت، سقوط اشتہا، ضعف بصر، ضعف بخت، میرا حال بعینہ میرے اس شعر کے موافق ہے۔

در کشاکش ضعفم نگسلد روان از تن
اینکہ من نمیرم ہم ز ناتوانیہاست

زیادہ حد ادب

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

نجات کا طالب غالب
۵ فروری

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے اپنا حال اس سے زیادہ کیا لکھوں کہ آگے ناتواں
تھا اور اب نیم جاں ہوں برخوردار نواب مرزا خاں اپنے مشاہدے
کے مطابق جو میری حقیقت عرض کریں وہ مسموع و مقبول ہو حضور اس مطلع کے
لفظ و معنی کی حدت و جدت کی داد چاہتا ہوں ہم در قیام زندہ
نیم کز برائے خویش آنوقت لائے نا قیام از دو پائے خویش ۱۲
ایک غزل نئی طرز کی نئی بحر میں عرض کرتا ہوں یہ جشن حال کی نذر
ہے خدا کرے مقبول ہو زیادہ حد ادب ۱۲

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

نجات کا طالب غالب
۲۹ مارچ ۱۸۶۶ع

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہی کل ایک عرضداشت مع ایک غزل کی ڈاک
مین بھیج گئی۔ شام کو منشور عطوفت مع ہنڈوی تنخواہ مئی سنہ ۱۸۶۶
عز ورود لایا سو روپیہ معرض وصول مین آیا آج صبحدم وقت تحریر اس
عرضی کی حضرت فردوس مکانکا دیوان پیش نظر تھا اوسمین یہ شعر
نظر پڑا اوسکی مضمون حکیمانہ و عارفانہ نی بڑا مزا دیا یقین ہے کہ اوسکو
پڑھ کر حضرت ہی حظ اوٹھا وینگی

وہ جسطرح سے جسے چاہی اوسطرح پالی
کسیکا کچھہ نہین پروردگار پر لینا

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہون دن پچاس ہزار

عرضداشت اسد [illegible]
[illegible]

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہی توقیع وقیع عزّ ورود لایا غزل کی پسند آنی میری سخنوری کا
رتبہ بڑھایا فلک نہین چاہتا ہے میرا کلام مقبول طبایع اہل کمال ہو حضرت کو خالق اکبر
نے وہ قوت اور ہمت عطا کی ہی کہ آپ علی الرغم فلک کام کر سکتے ہین سے قسمت
بری سہی پہ طبیعت بری نہین ہے شکر کی جگہ ہے شکایت نہین مجہی فلک نے مجہ پر
بڑی بڑی اوجہا دغم و فکر کی ڈالی مگر میری طبیعت بدل نسکا مین نی بجناب باری بہت
تضرع و زاری کی مگر اپنی قسمت بدل نسکا زیادہ ادب سے تم سلامت رہو قیامت تک
(ہر برس کا ہون) دولت و عزّ و جاہ روز افزون سے تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کا ہون
دن پچاس ہزار

[illegible]

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے آج شنبہ ۱۰ ماہ اگست ۱۸۶۶ کی ہے فقیر چشم براہ تھا کہ
اب ڈاک کا ہرکارہ آتا ہے اور ہنڈوی ملفوفۂ نوازشنامہ لاتا ہے ناگاہ اسوقت ڈاک
کا آدمی ایک خط برخوردار منشی سیلچند کا لایا اوسمیں مندرج تھا کہ تو نے جون سنہ حال
کی تنخواہ کی رسید کیوں نہ بھیجی اور بعد اسکی یہ لکھا تھا ہے جولائی کے تنخواہ کے چٹھیاں ہوتے جاتے
ہیں اب تک نہیں تیری تنخواہ بھی بھیجی جائیگی متحیر ہوں یا رب میں حسب معمول تنخواہ جون کی
رسید ارسال کر چکا ہوں اب دوبارہ رسید کیوں مانگی جاتی ہے پھر یہ تو گویا پیام مرگ تھا
کہ جولائی کی تنخواہ اب روانہ ہوگی یارب اب کو وعدہ ۱۳ ہم اکو چلیگا بیسوین تک مجھی
پہنچیگی اور میرا حال یہ ہے انگریزی تنخواہ گھر میں اور کچھ قرض کی قسط میں جاتی ہے حضور کا عطیہ
پر میرا اور شاگرد پیشہ کا اور حسین علی کا گزارا ہے عالم الغیب جانتا ہے جس طرح گزرتی ہے
چار سو ساڑھے چار سو کا قرض باقی ہے اب کوئی قرض بھی نہیں دیتا خلاصہ عرض یہ ہے
ہیں ایک تو یہہ ہے میں جون کی تنخواہ کی رسید بھیج چکا ہوں اگر ڈاک میں تلف ہو گئی ہو تو اور
لکھ بھیجوں دوسرا یہ ہے اس مہینے کے یعنی جولائی کے تو تنخواہ خیر ۲۰ ماہ اگست تک پہنچ جائیگی
آئندہ کو حکم ہو جائے ہر مہینے کے پہلے ہفتے کو فقیر کی تنخواہ ہے وہ محض صیغۂ خیرات ہے

بھیجا جایا کرے ۵ تم سلامت رہو قیامت تک دولت و عز و جاہ روزافزون
نجات کا طالب
غالب ۵

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے منشور مکرمت ظہور عز ورود لایا سو روپیہ بابت
تنخواہ ماہ ستمبر ۱۸۶۶ء معرض وصول میں آیا اشعار فارسی و اردو پہنچے خدا
کرے پسند آئیں افسوس ہے برخوردار نواب مرزا خاں نے میرا حال سامعۂ اقدس پر
عرض نہ کیا حضور مالک و مال جس کو جس قدر چاہیں عطا کر سکتے ہیں میں آپ سے صرف
راحت مانگتا ہوں اور راحت منحصر اس میں ہے کہ قرض باقیماندہ ادا ہو جائے اور
آیندہ قرض لینے کی حاجت نہ پڑے الٰہی تم سلامت رہو قیامت تک دولت و
عز و جاہ روز افزوں اسد اللہ بہ بستگاہ ششم اکتوبر ۱۸۶۶ء

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے اردو دیوان کا انتخاب بھیج چکا ہوں یقین ہے
کہ حضرت کے نظر انور سے گزر گیا ہو آج فارسی دیوان کا انتخاب بطریق
پارسل اسی عرضی کے ساتھ بھیجتا ہوں اور بہائی ضیاء الدین خاں بہادر نے
جو اوراق میرے پاس بھیجے ہیں وہ بھی اسی پارسل میں رکھ دیے ہیں حضرت
اس غریب کا مجموعۂ نظم و نثر غدر میں لٹ گیا بعد غدر جو کچھ کہا ہے وہ بھی ہے جو
پہنچتا ہے اسی رو سے صرف غزلیں اور رباعیوں کا انتخاب بھیجا ہے قصائد و قطعات و
مثنویات کا انتخاب ابھی نہیں بھیجا اگر حکم ہو تو وہ بھی بھیجوں زیادہ حد ادب
تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

نجات کا طالب
غالب
[illegible]

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے

اس عنایت نامے میں ایک فقرہ نظر پڑا کہ جس سے میں کانپ اوٹھا مرا از آن مشفق واسطۂ تلمذ کا بودہ است
یہ ذلیل کو عزت دینی اور دکان بے رونق کی خریداری کرنی ہے میں تو حضرت کو اپنا استاد اور اپنا مرشد اور اپنا
آقا جانتا ہوں بدو فطرت سے میری طبیعت کو زبان فارسی سے ایک لگاؤ تھا چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر
کوئی ماخذ مجکو ملے باری مراد بر آئی اور اکابر پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا اور اکبر آباد میں فقیر کے مکان
پر دو برس رہا اور میں نے اوس سے حقایق و دقایق زبان پارسی کے معلوم کئے اب مجھے اس امر خاص میں نفس
مطمئنہ حاصل ہے مگر دعوے اجتہاد نہیں ہے بحث کا طریق یاد نہیں میاں انجو جامع فرہنگ جہانگیری
شیخ رشید راقم فرہنگ رشیدی علماء عجم میں سے نہیں ہند انکا مولد ماخذ انکا اشعار قدما ہادی انکا
انکا قیاس تیکچند اور سیالکوتی مل انکے پیرو سبحان اللہ ہندی ہے اور ہندو بھی نور علی نور فقیر اشعار
قدما کا معتقد اون لوگوں کے کلام کا عاشق مگر جو لغات اونکے کلام میں ہیں اوسکے معنی تو اہل ہند نے اپنے
قیاس سے نکالے ہیں میں انکے قیاس پر کیونکر تکیہ کروں اب جو برادر زادہ نے لکھا کہ ارتنگ وارژنگ مترادف المعنی
اور آشیانہ ساختن و بستن و چیدہ کہونسلا بنانا یعنے مترادف ہیں تو میں نے بے تکلف مان لیا لیکن نہ اون صاحبوں کے
قیاس کے بموجب بلکہ اپنے خداوند نعمت کے حکم کے مطابق ہے تم سلامت رہو ہزار برس قیامت تک
دولت و عزت و جاہ روز افزوں

[illegible]

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے ورود توقیع و نوید عفو نے روان پروری کی سو روپیہ بابت
تنخواہ اکتوبر ۱۸۶۶ء از روی ہنڈوی ملفوفہ توقیع معروض و موصول آئی .....
یا امیر المسلمین حضرت کا عزم رونق افزائی اکبر آباد سنکر جی چاہا کہ آؤں رکاب کے
سوار ہونے کی تاب ہرگز نہ پائی منزل بمنزل جا نہیں سونچا کہ اگرہ ساتھ منزل رامپور جہہ
منزل ہیں جو جاؤں وہیں کیوں نہ جاؤں عزم مصمم کیا ہے اپنے فرزند اور آپکے غلام کو
بھیجونگا وہ بہی خوش خوش آمادہ رہروی ہوا ناگاہ تپ محرق نے اوسے گھیرا اور
شانیکا درد علاوہ عنیمت یہ ہوا کہ نہ تپ اوترتی ہے نہ شانیکا درد جاتا ہے
حکیم احسن اللہ خانکی تجویز سے فصد بہی کہلی مگر کچھہ فائدہ نہوا کہ شبکو کچھہ شعور
رہتا ہے ورنہ ساری رات جاگتا اور ہائے ہائے کرتا ہے اوسکے ساتھہ سب جاگتے ہیں سو
راحتی نیست دراں خانہ ز بیماری ہست مجمل یہ ہے اور مکرمی میر محمد زکریا صاحب
عرض کرینگے زیادہ حد ادب سے تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار
معروضہ دوشنبہ پنجم نومبر ۱۸۶۶ء

نجات کا طالب
غالب

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت مدظلہ العالی

بعد تسلیم معروض ہے توقیع وقیع مع دیباچۂ شرح اشعار بدر چاچ عز ورود لایا کیا عرض کروں ہر کیا عالم نظر آیا واقع افتتاح کلام بطرز میرزا طاہر وحید اور پھر نگارش مطالب بشیوۂ میرزا جلالا طباطبا ہے لیکن دونوں صورتوں میں دیباچۂ اعجاز خسروی کا رنگ جلوہ گر ہے پس ناقد بصیر کے نزدیک یہ نگارش طاہر وحید اور جلالا کی عبارت سے بہتر ہے یہ عرضداشت جلد بھیجتا ہوں تاکہ حضرت پر پہنچنا اوس دیباچہ یا تقریظ کا ظاہر ہو جائے برسات ایسی ہوئی ہے کہ میں باون[۵۲] ترپن[۵۳] برس سے یہاں رہتا ہوں عرش آرامگاہ اکبر شاہ کے عہد میں ایکبار ایسی برسات دیکھی تھی یا امسال نظر آئی ہے اوراق مرسلۂ حضور مومیں جامہ میں لپیٹ کر بسبیل پارسل ارسال کرونگا یا پرسوں دوشنبہ کو یا سہ شنبہ کو ؎ تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

روز شنبہ یکم ستمبر ۱۸۶۶ء

نجات کا طالب
غالب

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے آج شہر میں شہرت ہے کہ حضرت امیر المسلمین نے
مفتی صدر الدین مرحوم کے زوجہ کو پانسو روپئے مفتی جی کے تجہیز و تکفین کیواسطے
رامپور سے بھیجے ہیں فقیر کو بھی توقع پڑی کہ میرا مردہ بے گور و کفن نہ رہیگا جیسا کہ
میرزا جلال اسیر کہتا ہے کہ جرعۂ لطف تو بعد از ما با خواہد رسید میں نے کل ایک خط
نواب مرزا خان کو لکھا ہے خدا جانے وہ حضور تک نظر سے گزرا یا نہ گزرا اوس خط میں
میں نے زوجۂ مفتی جی کا حال یہ لکھا ہے کہ وہ لاولد ہے اور ستہہ روپئے کا کرایہ کے
مکان اوسکے تحت میں ہیں امین الدین اوسکا بھانجا ہے مفتی جی کا کوئی نہیں ہے
اب اپنی حقیقت عرض کرتا ہوں آخر عمر میں تین التماسیں ہیں آپ سے ایک تو
یہہ کہ میں ہزار بارہ سو روپئے کا قرض رکھتا ہوں چاہتا ہوں کہ میری زندگی میں
ادا ہو جائے دوسری التماس یہہ کہ حسین علیخاں کی شادی آپکی بخشش خاص سے ہو جائے
اور یہہ سو روپئے مہینا جو مجھے ملتا ہے اوسکے نام پر اوسکے حین حیات قرار پائے
یہ تینوں خواہشیں خواہ میری زندگی میں خواہ میرے بعد اجرا پائیں ہے تم سلامت رہو
قیامت تک دولت و عز و جاہ روز افزون
روز شنبہ ربیع الثانی ۲۷ جولائی سال حال [illegible]

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے پہلے اپنا حال عرض کروں تب کچھ اور مدعا لکھوں غم نے بشمول بڑھاپے
کی بیت و کم مضمحل کردیا ہے حضرت کے قدموں کی قسم نہ حواس درست نہ رائے صحیح برسوں سے
کم روزی میں مبتلا رہتی ہے اب طاقت تحمل کی نہ رہی خدا جانے کیا ہوتا ہے کیا سمجھتا ہوں
کیا کرنا چاہیے کیا کرتا ہوں کل آخر روز میر منشی حضور کا خط آیا جون کے تنخواہ کی رسید کے
نہ پہنچنے کی اطلاع پائی تہیدستی و قرض کے رنج میں خستہ و آزردہ بیٹھا تھا اور وقت عرض
لکھنے اگرچہ ڈاک کا وقت نہ تھا مگر بھیجدیا آج آخر روز توقیع وقیع مع جون کی تنخواہ کی ہنڈوی
کی پہنچا ہنڈوی مختار کار کو دی اور یہہ عریضہ لکھنے بیٹھا لکھہ کر لفافہ کر رکھتا ہوں کل بھیجدوں
ڈاک میں بھیجدونگا اگر عریضے میں کوئی بات گستاخی و دیوانگی و بیہودگی کی ہو تو فقیر کے قرضخواہ ہو
میر منشی صاحب کے اگر مخالف طبع کوئی لفظ ہو تو وہ بھی درگزر کریں جون کی تنخواہ کی رسید کا
لفافہ ڈاک میں گم ہو گیا ہوگا اگر میں بھی بھول گیا ہوں تو بعید نہیں بلکہ اغلب ہے ۱۲ غالب
کو سہو ہوا ہو ملازمان دولت پر ظاہر ہو کہ جون کی تنخواہ جولائی میں اور جولائی کی اگست میں
ملنی چاہیے آئندہ ہر انگریزی مہینے کے دوسرے تیسرے کو روانگی ہنڈوی کا متوقع ہوں زیادہ
سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار ۱۲ اگست ۱۸۶۶

نجات کا طالب
غالب

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے حضور کے لشکر نصرت اثر کا بسپہ سالاری نواب معلی القاب جناب سید علیخاں بہادر
اکبر آباد پہنچنا اور خیام فلک احتشام کا وہاں نصب ہونا اور رامپور سے اکبر آباد تک گھوڑوں کی
ڈاک کا بیٹھنا اور حضرت کا سنبھل تک بسبیل ڈاک تشریف لیجانا اور وہاں مزاج اقدس کا ناساز
ہونا اور دار السلطنت کو معاودت فرمانا یوماً فیوماً مسموع ہوا غرض اس عرضداشت کے تحریر
یہ ہے کہ حصول جواب سے آبرو اور خیریت و عافیت مزاج مبارک سے عزّ اطلاع پاؤں گا
اخبار میں مسطور اور شہر میں مشہور ہے کہ حضرت اجلاس کونسل کیواسطے حسب الحکم گورنمنٹ کلکتہ کو
تشریف لیجائینگے نمکخوار دعاگوئے و مدح گستر بہن بہانہ طلب ہوتا ہے اس تقریب کا ایک قطعہ
تاریخ سنہ ۱۸۶۶ عیسوی رقم کیا ہے عرض کرتا ہوں اگر پسند آئے تو اجازت دیجے کہ اسکو کسی اخبار
میں چھپوا دوں گا

قطعہ

چو نواب از بہر اجلاس کونسل
بہ کلکتہ از رامپور آورد رخ
عدو را بگو دو بیکی رو دور
بگو سال اجلاس از تخت فرخ
چو گویند کینی ہے دو بیوفا ہی
بگو عدد اعدا ابنت پاسخ

بینت لغت پارسی ہے مرادف نہی و زجر ہے اور قتل کا مشار الیہ لفظ وہی ہے جسکے ۱۶ عدد ہیں اور
دی کا مشار الیہ عدد ہی بخت فرخ کے ۱۸۸۲ جب اسمیں سے ۱۶ کم کیے تو ۱۸۶۶ رہے زیادہ حد ادب

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے توقیع وقیع مع ہنڈوی تنخواہ نومبر ۱۸۶۶ء عیسوی
عز ورود لایا سو روپیہ معرض وصول میں آیا قطعۂ تاریخ کے باب میں التماس
یہ ہے کہ اب قوت ناظمہ پر تصرف اور معنی آفرینی کا زور مطلق باقی نہیں
مگر از راہ فرط ارادت و محبت تمنائے دعا کیواسطے تقریب ڈھونڈھتا ہوں جب
موقع پاتا ہوں کچھ عرض کرتا ہوں تخرجہ لطیف ہاتھ آگیا اوسے پر مدعا کی بنا رکھی
پیر و مرشد اگر غازی آباد سے حضور ریل پر سوار ہوں تو فقیر کو تاریخ ورود غازی آباد
سے آگہی ہو جائے تاکہ میں وہاں حاضر ہو کر قدمبوسی کی سعادت حاصل کروں زیادہ حد ادب

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

نجات کا طالب غالب
یکشنبہ ۲ دسمبر

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے نوازش نامہ مع ہنڈوی صد روپیہ عز ورود لایا دسمبر ۱۸۶۶ء کے تنخواہ کا روپیہ معرض وصول میں آیا اللہ اللہ یہ فرط عنایت یہ ظہور کرامت ہے حضرت ڈاک میں سوار ہونیکو ہیں اور میرے نام خط کا حکم ہو اور پھر وہ خط دستخط سے مزین ہو دسمبر کی تنخواہ دسمبر ہی میں جاری ہو اور جنوری کی تیسری تاریخ میرے پاس پہنچ جاے ظہور آثار ربوبیت بوجہ احسن و اکمل

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

غالب
۳ جنوری ۱۸۶۷ء

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہی حضرت کا رونق افزای کلکتہ ہونا از روے شمار رفتار ریل یقینی ہی مگر وہان کے آب و ہوا کا موافق آنا اور جناب لارڈ صاحب بہادر سے ملاقات کا ہونا اور اجلاس کونسل کا وقوع مین آنا یہ امور جب تک حضرت رقم نفرمائینگی دعاگو کی خیال مین کیونکر آئینگی ناچار جرأت بہم پہنچاکر اس عرضداشت کے جواب مین ان حالات کے انکشاف کا امیدوار ہون۔ پیر و مرشد حضرت تک تصدق سے قرض ادا ہوگیا تنخواہ نے قسط سی اور مین نے رنج سے رہائی پائی ہم بدل و ہم بزبان ثناخوان جود و نوال و دعاگوی دوام دولت و اقبال ہون آدہا قرض عطیۂ سابق مین اور آدہا قرض عطیۂ حال مین ادا ہوگیا کہہ نہین سکتا اور بن کہی بنتی نہین اگر م نوزائد کون کا پچاس روپئی مہینا جنوری ۱۸۶۷ء یعنے ماہ حال و سال حال سے جاری ہو جائیگا اور ماہ بماہ فقیر کے روزینہ کے ساتھ پہنچا کریگا تو آپکا نمکخوار پہر کبہی قرضدار نہوگا زیادہ حد ادب

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہون دن پچاس ہزار

نجات کا طالب غالب
[illegible]

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے کل حضرت کی اقبال سے ایک مسرت تازہ مجکو پہنچی تفصیل اسکے
یہہ کہ اقبال نشان میرزا شہاب الدینخان انگریزی خوان ہے اخبار انگریزی
دیکھا کرتا ہی اوسنے مجھسے بیان کیا کہ مینے انگریزی اخبار مین دیکھا ہے جناب
نواب صاحب قبلہ جو شریک اجلاس کونسل ہوئے نواب گورنر جنرل بہادر مع
اور کونسل نشینونکی نواب صاحب کے حسن صورت و فرط خلق و لطف تقریر سے
بہت راضی و خشنود ہوئے اور انکی رای سبکی پسند آئی ہے این مراتب
ابتدائے جز و بیست کار کلی ہنوز در قدرت روز افزونی دولت و اقبال
کے مدارج ابھی بہت سنونگا اور دیکھونگا انشاء اللہ تعالی العظیم [illegible]
تم سلامت رہو قیامت تک دولت و عز و جاہ روز افزون

[illegible]

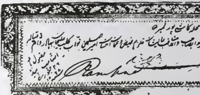

روانگی خط دہلی مورخہ ۲۶ر جنوری ۱۸۶۷ء جو ۲۸ر جنوری ۱۸۶۷ء کو میرٹھ پہنچا اور
پھر ۳ر فروری ۱۸۶۷ء کو کلکتہ پہنچا مگر نواب موصوف وہاں سے روانہ ہو چکے تھے۔
اور خط مذکور ۶ر فروری ۱۸۶۷ء کو کلکتہ سے چلا اور ۹ر فروری ۱۸۶۷ء کو علی گڑھ پہنچا
اور وہاں سے ہوتا ہوا (بموجب قلمی تحریر) رام پور ۱۲ر فروری ۱۸۶۷ء کو پہنچا۔

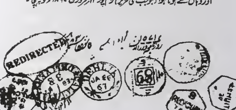

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے خاطر اقدس میں نگزرے کہ غالب بجز تعمیل احکام
میں کاہل ہے بصارت میں فتور رعشہ تھا ہاتھ میں رعشہ حواس مختل ناچار کاتب کی تلاش کی
شہر سر بسر ویران ہے کاتب کہاں بارے ایک دوست نے کاتب نشان دیا اردو کا
دیوان اشعار بر صاد کر کے اوسکو حوالہ کیا کل دہ اجزای منقولہ آسنے آج بطریق پارسل
مع اصل مسودے کے ارسال کئے خط کاتب کا مجکو پسند نہیں آیا حضرت کو کیونکر
پسند آئیگا اغلاط اتنی تہی کہ مجکو تحریر کے برابر محنت پڑی فارسی کی کلیات
کا شیرازہ کہول کر اجزا اوسکی احباب پر تقسیم کردیئے ہیں جا بجا اشعار بر صاد
کردیئے ہیں وہ بہی میری انتخاب کے مطابق نقل ہو رہی ہیں بعد اتمام وہ بہی
پیشکش کرونگا زیادہ حد ادب

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

نجات کا طالب غالب
سہ شنبہ ۱۰ ستمبر ۱۸۶۶

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے بہت دن تک متردد رہا کہ حضور کلکتے میں یا رامپور چنانچہ
ایک عرضداشت اوسی تردد میں بھیجی ہے ہنوز جواب کے آنے کی مدت منقضی نہیں ہوئی
خیر اوسکے جواب پر کیا موقوف ہے یہ تو جان لیا کہ حضرت رونق افزائے رامپور
ہیں مگر یہ کیونکر جانوں کہ اب بہ خیر و خوبی و فرخندگی یہیں رونق افزا رہینگے یا
پھر کلکتے تشریف لیجائینگے خیر اس بعلم کو سہل سمجھ لیا ہے جو کچھ ہوگا معلوم
ہو جائیگا مگر یہ کیونکر جانوں کہ مزاج اقدس کیسا ہے اور جب تک یہ نجانوں
تو آرام کیونکر آئے یہانسے رامپور تک برابر تار برقی بھی نہیں جو خبر منگواؤں
آج ۱۴ فروری کی ہے یہ خط بھیجتا ہوں اگر جواب آئے تو ۹ دن میں مجکو اتنے دن
صبر کیونکر آئیگا الہی آج یا کل کوئی نوازشنامہ خداوند کا آجائے زیادہ حد ادب

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

نجات کا طالب غالب

[illegible] فروری ۱۸۶۶

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے کل صبح کو میں نے خط ڈاک میں بھجوایا دو امر کے تردد کی رفع کے
التماس تھی ایک یہ کہ پھر کلکتے کو تشریف لیجائیگا یا نہیں دوسرے یہ کہ مزاج اقدس کیسا ہے
حسن اتفاق یہ ہے کہ کل سہ پہر کو اخبار میں دیکھا کہ حضور نے بوجہ ناسازی آب و ہوائے کلکتہ
شمول کونسل سے انکار کیا بارے اس سے خاطر جمع ہو گئی رہی مزاج مبارک کی حقیقت اوس سے
بھی فی الجملہ طمانیت ہو گئی یعنی عنایت نامے میں خیر خواہ کے خلاف دعا کوئی بات مندرج
نہ تھی اسی عرضے میں یہ بھی عرض کر دیتا ہوں کہ سو روپئے بابت تنخواہ جنوری ۱۸۶۶ حال میں
نے پائے اور شکر درویش پرور بجا لایا ہے تم سلامت رہو قیامت تک دولت و عز و جاہ
روز افزوں ہو

نجات کا طالب
غالب
۵ فروری

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے کل صبح کو ۹ گھڑی سے دو دن چڑھے نوروز ہے
آج یہ قطعہ ہات تمام کر لکھ کر حضور کے نذر بھیجتا ہوں

نوروز و دم عید از جانب امسال
خوب است کہ روز و وقت فرخندہ بفال

ابتدای این سعید نوروز بود
از بہر دوام عمر و عز و اقبال

تم سلامت رہو قیامت تک
دولت و عزّ و جاہ روز افزوں

نجات کا طالب غالب
پنجشنبہ ۲۰ مارچ
۱۸۶۲

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم و تعظیم معروض ہے ہنڈوی ملفوفۂ نوازشنامہ کے ذریعہ سے سو روپیہ
فصل کی تنخواہ کے وصول ہوئے ——
ایک رباعی بھیجتا ہوں اور یہ چاہتا ہوں کہ دبدبۂ سکندری کے آغاز میں اسکے
جہانبانی کا التزام رہے ——

کی نذر ہمہ کلب علیخانے
آں کیست کہ بخشش بفراواں باشد
آں کیست کہ جز بیزداں باشد
آں کیست کہ در عجم ملک راجاں باشد

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

نجات کا طالب غالب
۶ ماہ اپریل ۱۸۶۶ء

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے نمایشگاہ سراسر سرور رامپور کا ذکر اخبار میں دیکھتا ہوں اور خون جگر کھاتا ہوں ہائے میں وہاں نہیں بالاخانے پر رہتا ہوں اتر نہیں سکتا [illegible] آدمیوں نے گود میں لیکر اتارا اور پالکی میں بٹھا دیا کہار چلا رہے ہیں نہ مرا اور رامپور پہنچ گیا کہاروں نے جا کر بے نظیر میں میری پالکی رکھدی پالکی قفس اور میں طائر اسیر وہ بھی بے پر و بال نہ چل سکوں نہ پھر سکوں جو کچھ اوپر لکھ آیا ہوں یہ سب بطریق فرض محال ہے ورنہ ان امور کے وقوع کہ کہاں مجال ہے یہاں میں ہیبت کا قطعہ تاریخ بھیجتا ہوں اگر پسند آئے تو میں خوشنودی مزاج مبارک سے اطلاع پاؤں

[illegible]

تو ہم عدد گھٹتی اور ۱۲۸۳ رہ گئے فہو المقصود اگر حضرت کی مرضی ہو تو دربار سکندری میں یہ تاریخ چھاپ دی جائے تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

[illegible]

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے آج شنبہ ۱۶ ماہ اکتوبر کے ذکر بارہ بجے کھانا کھا کر بیٹھا تھا کہ توقیع
وقیع آیا پڑھتے ہی کانپ اوٹھا اور عالم نظر میں تیرہ و تار ہو گیا اگر حضور کے
ارشادات کو بحث تعبیر کیا ہو تو مجھے جناب الٰہی اور حضرت رسالت پناہی کی قسم
اگرچہ فاسق و فاجر ہوں مگر وحدانیت خدا اور نبوت خاتم الانبیا کا بدل معتقد اور
بزبان معترف ہوں خدا و رسول کی قسم جھوٹی نکھاؤنگا انکار بحث سے مراد یہ
تھی کہ شعرائے ہند کے کلام میں جو غلطیاں نظر آتے ہیں یا ہندی فرہنگ لکھنے والوں
کے بیان میں ہونا درستی لغت باہم جو اونکی عقول میں اختلاف ہیں اوسمیں میں کلام
نہیں کرتا اپنی تحقیق کو مانی ہوں نہ ہوئے اوروں سے مجھے بحث نہیں باہمہ ضعف حافظہ
آخر میں یہ بھی لکھدیا تھا کہ ان دونوں باتوں میں ہند آتا لیکن نہ فرہنگ لکھنے
والوں کے رائے کو ہو جب بلکہ اپنی خداوند کے حکم کے مطابق یہ کلمہ موجب عتاب نہیں
ہو سکتا اور اگر اسکو گناہ سمجھا جائے تو آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں گناہ
معاف کیجیے اور نوید عفو سے مجھکو تقویت دیجیے تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے
ہوں دن پچاس ہزار عفو کا طالب غالب

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلمکم اللہ تعالیٰ

بعد تسلیم معروض ہے بموجب تحریر

میرزا رحیم الدین بہادر حیا کے فاضل

قطعہ بازکو خرچ دیکر روانہ کیا ہے

تم سلامت رہو قیامت تک

دولت و

عز و جاہ روز افزوں

اسد اللہ [illegible]

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے آپ کے غلام زرخرید یعنی حسین علی خاں کی منگنی ہو گئی اور اپنی کمپنی میں ہو رہی یعنی نواب احمد بخش خاں مرحوم کے حقیقی بھانجے کی پوتی سے اور رجب کا مہینا قرار پایا اب میرے بڑھاپے اور میری مفلسی کی شرم آپ کے ہاتھ ہے ع نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں مدعای ضروری الاظہار تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار مصرعہ

نجات کا طالب غالب
۱۹ اگست ۱۸۶۶ء

آن کیست کہ جسم ملک را جان باشد
آن کیست کہ خسرو سلیمان باشد
آن کیست کہ بخشش الطافش باشد
کو نیست مگر کلب علی خان باشد

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے عنایت نامہ عز ورود لایا اوس میں یہہ حکم مندرج پایا کہ حسین علی خان کی شادی
کے باب میں جو خدمت کہوں خاطر نشان کروں حکم بجا لاتا ہوں اور عرض کرتا ہوں محتاج ہوں ہر چند میں
دولت کا گداے خاک نشین اور وہ آپ کا غلام تفصیل یہہ ہے کہ میرے پاس نقد و جنس اسباب املاک
اور میرے گھر میں زیور زرینہ و سیمینہ کا نام و نشان نہیں بہت ادھار قرض کوئی دیتا نہیں آپ
روپیہ عنایت فرماتے تو یہہ کام سر انجام پاتا اور موجب فقیر کی برادری میں شرم رہ جاتی دوسری
بات یہہ کہ سو روپیہ آپکی سرکار سے بطریق خیرات اور ۔۔۔ مہینا انگریزی سرکار سے
بعوض جاگیر پاتا ہوں عالم الغیب جانتا ہے کہ اسمیں بڑی مشکل سے گزارا ہوتا ہے مجھکو
کہا تھا کہ اللہ دولت حسین علی خان کی کچھہ تنخواہ مقرر ہو جاے لیکن توقیع تنخواہ اوسکے نام جاری
نہو بلکہ اوسکی زوجہ حسن جہان بیگم بنت اکبر علی خان کے نام وہ تنخواہ مقرر ہو اور اوسکی مہری
رسید سے ملا کرے زندہ ۔۔۔ اور تنخواہ کی مقدار جو خداوند کی ہمت اور اس کمال
۔۔۔ کی قسمت زیادہ حد ادب ہے تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار
نجات کا طالب غالب ۱۰ ستمبر ۱۸۶۶ء

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے عنایت نامہ عز ورود لایا اللہ اکبر حضرت نے غمخواری و تفقد
درویش نوازی کو اوس پایہ پر پہنچایا کہ شاہان عجم میں سلاطین سنجر اور
شاہان ہند میں شاہ جہان نے ملازمونکے اتنی پرورش اور نوازش کی ہوگی
باقر علیخان کی شادی کو نواب ضیاء الدین خان کہ ماموں ہوتے اونہوں نے کہا جوڑے
کے ۵ ہزار روپیہ دیئے اور میری زوجہ نے پانسو روپیہ کا زیور لگا کر
پچیس سو روپئے صرف کئے حسین علیخان کا شمار یعنی اکبر علیخان
اپنی خاندان کا لیکن امیر نہیں نوکری پیشہ ہے اب یہ میز
کیونکر عرض کروں کہ مجھے کیا دو سائل ہوں یہ رسم نہیں کہ سائل

مقدار سوال عرض کرے حال معاش شادی خاندان لکھدیا ہے کہ ڈھائی
ہزار میں شادی اچھی ہو جائیگی لیکن یہ بہ سبب تہ عرض کرتا ہے کہ میرا
حق خدمت اتنا نہیں کہ اسقدر مانگ سکوں جو کچھ دو گے اوس میں شادی
کر دونگا زیادہ حد ادب ہے تم سلامت رہو قیامت تک دولت و عز و جاہ روز افزون
نجات کا طالب غالب معروضہ ۲۳ جمادی الاول ۱۲۸۳ مطابق ۳ ستمبر ۱۸۶۶ بے ہمایوں منشور افراد و رود

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے دبدبۂ سکندری میں حضرت کے مزاج کے
ناسازی کا ذکر دیکھکر جو مجھ پہ گزری میرا خدا جانتا ہے
مگر یہ بڑی بات ہے کہ اوسی ذکر کے ساتھ افاقت و رفع مرض کی
بھی نوید مندرج تھی توقع ہے کہ حضرت مفصل حال مرض کے پیدا
ہونیکا اور پھر رفع ہونیکا اور رفع انحلال مزاج اقدس کیا ہے
میر منشی کو حکم ہو جائے کہ حضور کی زبانی خط میں مجھکو لکھ بھیجیں

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

غالب
پنجشنبہ
۱۸ ۶۶ ۱۸

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے ایک قطعہ ۱
شعر کا بھیجتا ہوں حضور ملاحظہ
فرمائیں مضامین کے طرز نئے ہیں کا
انداز نیا دعا کا اسلوب نیا زیادہ
حد ادب ہے تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

نجات کا طالب غالب
[illegible]

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے آج روز شنبہ یکم ماہ رمضان المبارک ۱۲۸۴ھ ہے به اتفاق صبح و نگارش جنتری ۵ روز روزہ ہے و روز ناپیدا ہے غلظت ابر و شدت سرما ہے چونکہ دھوپ تو نظر ہی نہیں آتی ناچار دن رات آگ تاپتا ہوں اور ہر وقت ساپیتا ہوں رکھم

ماہ صیام میں سلاطین و امرا خیرات کرتے ہیں اگر حسین علیخاں یتیم کا ن دسے اسے مہینے میں ہو جاے اور اس توڑے ا یا ہے فقیر کو روپیہ ملجاے تو اس مہینے میں تیاری ہو رہے اور شوال میں رسم نکاح عمل میں آے اور چونکہ اس ماہ مبارک میں در فیض باز اور سال انگریزی کا بھی آغاز ہے وہ پچیس روپیہ مہینا جو زبان مبارک سے نکلا ہے جنوری ۱۸۶۸ء سے بنام حسین علیخاں مقرر ہو کر جاری ہو جاے تو مجھ گویا دونوں جہان مل گئے ۵ تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

لکھا ہوا یکم رمضان اور بھیجا ہوا ۲ رمضان کا

نجات کا طالب غالب

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے شوق قدمبوسی نے تنگ کیا جب دیکھا

کسی طرح جا نہیں سکتا ناچار اپنا نقشا اُتروایا اور خدمتِ عالی

میں روانہ کیا جب تک کہ میں جیتا ہوں یہ نقشا اسی صورت سے حاضر

رہے گا زیادہ حد ادب

تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

نجات کا طالب غالب

[illegible]

حضرت ولی نعمت آیہ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہی آج جو تیسرا دن ہے کہ توقیع وقیع عز ورود لایا ہی ہنڈوی
ملفوفہ کی رو سی تنخواہ مئی سنہ ۶۸ء کا سو روپیہ معرض وصول مین آیا ہی جواب کے
جلد نہ لکھنے کی وجہ یہہ ہی کہ مین گرمی کی شدت کی سبب سے اور احتباس ہوائے
کہ جو لازمہ موسم برسات ہی بیکار محض ہو گیا ہون مطلق کچھ لکھ نہین سکتا
اور کوئی ایسا شخص کہ جس سی کچھ لکھواؤن ان چار روز مین میرے پاس نہین آیا۔
آج اسوقت ایک صاحب آگئی اونسی مینی یہہ عریضہ لکھوا لیا ـــــ پیر و مرشد
سابق کی عریضہ کیساتھ مینی اپنی تصویر حضور مین بھیجی ہی اوسکی رسید اس نوازشنامہ
مین مرقوم نتھی مجکو اندیشہ ہی کہین وہ لفافہ ڈاک مین تلف نہ ہو گیا ہو اگر اوسکی رسید سی شرف اطلاع پاؤن
تو دلجمعی ہو جائے ــ تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہون دن پچاس ہزار ۱۵ جون سنہ ۶۸ء

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے کل منشور عطوفت عز صدور لایا جو ۲ اگست ۱۸۶۸ء کا سو [illegible] نامہ
بذریعۂ ہنڈوی وصول پایا تین التماس سابق پیش ہوئے نہیں سو اب
بھیا برخوردار نواب مرزا خاں کی تحریر سے اور پھر جناب ظفر حسین خاں بہادر کے
خط سے اون خواہشوں کے منظور و مقبول ہونیکی نوید پائی ان شاء اللہ الکریم
حسب ارشاد حضور اسی برس میں آمد زمستان یعنی نومبر دسمبر میں میرا قرض
بھی ادا ہو جائیگا اور حسین علی کی شادی بھی ہو جائیگی اور اوسکی نسل
اوسکی زندگی تک تنخواہ جداگانہ مقرر ہو جائیگی ۔ با کریمان کارہا
دشوار نیست ۵ عرضداشت ہوا خواہ اسد اللہ معروضہ ۱۳ ماہ اگست سنہ ۱۸۶۸ء

تم سلامت رہو قیامت تک
دولت و عزّ و جاہ روز افزوں

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تقدیم مدارج تسلیم معروض ہے توقیع رافت عز ورود لایا میں
نے ہنڈوی ملفوفہ کے ذریعہ سے بابت تنخواہ اگست ۱۸۶۸ سو روپیہ وصول پایا

لکھنے آپ سے تو کس سے کہوں

مدعائے ضروری الاظہار

پیر و مرشد حسین علیخان کے سسرال والوں کا بڑا تقاضا ہے زندگی مشکل ہو
گئی ہے بطریق شیئاً للّٰہ سوال مختصر یہہ ہے کہ جو حضرت کے مزاج میں آوے عطا
ہو میری اور حسین علیخان کے نام جداگانہ تنخواہ مقرر کر دیجے لیکن یہ [illegible] اور جلد صورت
بگڑ جائیں سے تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار زیادہ حد ادب

عرضداشت [illegible] اسد اللہ [illegible] ۱۸ ستمبر ۶۸

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے آج شہر میں شہرت ہے کہ حضرت امیر المسلمین نے
مفتی صدر الدین مرحوم کے زوجہ کو پانسو روپئے مفتی جی کے تجہیز و تکفین کیواسطے
رامپور سے بھیجے ہیں فقیر کو بھی توقع پڑی ہے کہ میرا مُردہ بے گور و کفن نہ رہیگا جیسا کہ
میرزا جلال اسیر کہتا ہے ع تجرعۂ لطف تو بعد از ما بخواہد رسید میں نے کل ایک خط
نواب مرزا خاں کو لکھا ہے خدا جانے وہ حضرت کی نظر سے گزرا یا نگزرا اوس خط میں
میں نے زوجۂ مفتی جی کا حال یہ لکھا ہے کہ وہ لاولد ہے اور ساٹھ روپئے کا کرایہ کے
مکانات اوسکے تحت میں ہیں امین الدین اوسکا بھانجا ہے مفتی جی کا کوئی نہیں ہے
اب اپنی حقیقت عرض کرتا ہوں آخر عمر میں تین التماسیں ہیں آپسے ایک تو
یہہ کہ میں ہزار بارہ سو روپئے کا قرض رکھتا ہوں چاہتا ہوں کہ میری زندگی میں
ادا ہو جائے دوسری التماس یہہ ہے کہ حسین علیخاں کی شادی آپکی بخشش خاص سے ہو جائے
اور یہہ سو روپئے مہینا جو مجھکو ملتا ہے اوسکے نام پر اوسکا میں حیات قرار پائے
یہہ دو خواہشیں خواہ میری زندگی میں خواہ میرے بعد اجرا پائیں سے تم سلامت رہو
قیامت تک دولت و عز و جاہ روز افزون

روز شنبہ ۵ ربیع الثانی و ۲۰ جولائی سال حال عرضہ داشت غالب

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے کل عریضہ مشعر رسید تنخواہ نومبر ارسال کر
چکا ہوں آج ناچار از روی اضطرار و افتقار پھر یہ عرض لکھتا ہوں حال میرا
تباہ ہوتے ہوتے اب یہ نوبت پہنچی کہ آپکی تنخواہ میں سے للعہ روپیہ بچے
سے روپیہ کا چوتھا ماہوار کا سو سے ماہ دینا مجملاً آٹھ سو روپیہ ہوں
تو میری آبرو بچتی ہے ناچار چھ مہینے کاٹ دی اور اوسکا نام کہ تنخواہ سے
قطع نظر کرکے اب اس بابمیں عرض کروں کیا مجال کبھی نہ کہونگا آٹھ سو
روپیہ مجکو اور دیجئے شادی کیجئے میری آبرو بچ جائے تو غنیمت ہے برخوردار
نواب مرزا خان کے خط میں یہ حال مفصل لکھا ہے وہ عرض کریگا مختصر یہ ہے
اب میری جان اور آبرو آپکے ہاتھ ہے مگر حضور جو عطا فرمانا ہے جلد
ارشاد ہو زیادہ حد ادب

تم سلامت رہو قیامت تک
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

[illegible]

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے بہت دن ہوئے ہیں برخوردار نواب مرزا خان نے مجکو
لکھا تھا کہ حضور نے تیرے قرض کے ادا کرنیکا نوید دیا ہے اور مقدار قرض پوچھی ہے سو
مین نے اونکو لکھ بھیجا تھا کہ آٹھ سو روپئے مین میرا قرض تمام ادا ہو جائیگا
اس تحریر سے یاد دہانی منظور ہے زیادہ حد ادب

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

نجات کا طالب غالب
صبح پنجشنبہ ... دسمبر

[illegible]

جنون نے جو کانٹ کیا تو کہتی ہیں
کہا نکو چھوڑ کے جاوگی آستانہ میرا

[illegible]

نفس نفیس برخاست کیا اور برخاستہ کو بجرا دیا ہے صاف
سے پہلی بینے ہی گبھر رات رہی اوٹھتی اور ضرور یا ت کہ
فراغت کرتے وضو کے مراسم بجالاتے جب موذن اذان دیتا ہے
کے نماز پڑھتے رفع حوائج ضروری کو برخاستہ کے بعد مقدر جو
جانا سلامت ہے یعنی اس وقت کے افعال بول و براز ہیں
انکا ذکر مکروہ طبع ہے عموماً اور بہ نسبت بادشاہ موزون ہے
عموماً خصوصاً اور یہ جو فقرہ نفس نفیس کو فلانا کرنا ہے بہ نسبت
ایک قیقہ ہے یعنی بہت کام ایسے ہیں کہ آدمی آپ بھی کر سکتا ہے
اور خادم سے بھی لے سکتا ہے مثلاً چلم حقہ دہرنا یا
پانی بھر لوٹا اٹھا لیجانا اور بہت کام ایسے ہیں کہ بہ شخص
کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں دوسرا نیابتاً نہیں کر سکتا مثلاً
حقہ پینا یا پانی پینا سونا جاگنا اٹھنا بیٹھنا بھی سے
قسم سبب ہیں افعال مشترکہ میں نفس نفیس لکھ سکتے ہیں
اور افعال مخصوصہ میں نفس نفیس کا قید لغو اور بیجا ہے

[illegible]

. مرزا غالب نے چند متفرق خطوط یا جو نواب علاؤالدین علائی، قاضی عبدالجلیل میر مہدی مجروح اور شاگرد رشید منشی ہر گوپال تفتہ کو لکھے اس کے علاوہ بھی ایک دو خط ملاحظہ ہوں۔

[illegible]

سنئیے طرح بسکون رائے قرشت بمعنی فریب ہے لیکن اردو میں یہ لفظ مستعمل نہیں وہ دوسرا لغت ہے طرح بہ حرکت رائے قرشت بوزن فرح اور بسکون رائے مہملہ بمعنا عوام کا منطق ہے معاذ اللہ اگر تقریر میں اسطرح بسکون بولوں تو زبان اپنی کاٹ ڈالوں جہ جائے آنکہ نظم میں لاؤں ... زمین طرح کی بسکون ہی اور بمعنی روش و طرز طرح ہے بہ فتحتین ۱۲

افسانہ نہیں داستان کہ نہیں معنی ... رستم کے باپ کا نام اور وہ تکلم بھی دو معنی ہیں آواز خوش اور یہ جو بلبل کو ہزار داستان کہتے ہیں شوقی اور فرومایہ رنگ کہتے ہیں صحیح ہزار داستان ہے یعنی بہت طرح کی آوازیں بولتا ہی ۱۲

جناب مولوی احمد حسن حبیب مرتضے کو میرا سلام پہنچے یکشنبہ ۲۰ اگست ۱۲

غالب

ببلہور محکمہ منصفی اشاعت بیڈ یکشنبہ ۲۰ اوست

بخدمت قاضی صاحب مخدوم مکرم مظہر لطف و کرم جناب قاضی عبدالجلیل صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ موصول باد

یہ تحریر اس خط کا حصہ ہے جو مرزا غالب نے منشی شیو نرائن کو آگرہ میں روانہ کیا اور
اس دیوان ریختہ کا ذکر ہے جو انھوں نے چھاپنے کے لئے روانہ کیا۔ عبارت ملاحظہ ہو

صاحب میں تمہارا گنہگار ہوں تمہاری کتاب میں نے دبا رکھی ہے
تیری کوشش اور محنت سے اسکو وہاں نہ چھپنے دیا اور منگوا لیا
آج پیر کے دن ۲۵ جون کو پارسل کے ڈاک میں روانا کیا ہے
تو اب میری تقصیر معاف کرو اور مجھ سے راضی ہو جاؤ اور اپنی رضامندی سے
کے مجھے اطلاع دو یہ کتاب یعنی دیوان ریختہ تمکو میں نے دی ڈالا
اب اسکے مالک تم ہو میں نہیں کہتا ہوں چھاپو میں نہیں کہتا کہ نہ چھاپو
جو تمہاری خوشی ہو سو کرو اگر چھاپو تو بیس جلد کا خریدار مجھکو لکھیو
اور اچھا میرا میاں ذرا تصحیح کا بہت خیال رکھیو ۱۲

حضرت ولی نعمت آیہ رحمت سلامت

بعد ادای مراسم تسلیم سوچتا ہون کہ کیا لکہون ہے ہے مین کیون جیتا
رہا جو صاحبزادہ محمد حسن خانکے مرنیکی خبر سنون اور خداوند نعمت کو
تعزیت کے کلمات لکہون مین نیم جان ہوان اور وہ نوجوان مرجاے ۔
سرو چمن سروری افتاد ز پای حضرت کے رنج و اندوہ کا تصور اور مار
ڈالتا ہے دوسری محرم کو علی بخش خان نے مری خبر کو یہ واقعہ ہوش ربا
پیش آیا یہ تو آپکا فرزند دلبند تہا جو اسکا غم ہو وہ بجا ہے پر فقیر جانتا
ہے علی بخش خان کے مرنیکا بہی حضرت کو بڑا رنج ہوا ہوگا ایسے کارگزار
دیانتدار ہوشمند مزاجدان کہان پیدا ہوتے ہین بہر حال رضینا بقضاء اللہ
حضرت کے سامنے صبر و ثبات و تسلیم و رضا مین کلام کرنا اور لقمن کو حکمت
پڑہانا اور خضر کو راہ بتانا ہے ۔ تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہون دن پچاس ہزار

غالب

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے منشور کرامت ظہور عز ورود لایا سو روپیہ
بابت تنخواہ ماہ اگست ۱۸۶۶ء معرض وصول میں آیا خبر خیرہ شمار سے
اوراق ۴ ستمبر ماہ حال کو ارسال ہوئے ہیں نظر انور سے گزرے ہونگے اُردو
کا دیوان ایک شخص کو دیا ہے فارسی دیوان کا شیرازہ کھول کر
چند شخصوں کے حوالے کیا ہے بعد اتمام تحریر نذر کیا جائیگا بھائی ضیاء الدین خان
کا مجموعہ نثر و نظم فارسی اردو سراسر دیکھا ہوا میرا جو اونکی کتابخانہ
میں تھا غدر میں لٹ گیا بعد غدر ذوق شعر باطل اور دل افسردہ ہو گیا اب جو
غزلیں فارسی ہندی جو لکھی ہیں اونکا انتخاب بھی پہنچیگا سوائے تم سلامت رہو ہزار
برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

[illegible]

میری جان خط نہ بھیجو اور میرے خط کا انتظار کرو اسکی وجہہ مین نہین سمجھا
تمہارا خط آئے اور مین جواب نہ لکھون تو گنہگار ہون نواب یوسف علیخان ناظم کا
دیوان میرے پاس کہان نواب صاحب نے بسبیل ارمغان مجھکو ایک ورق بھی نہین بھیجا
یہان چھپ بکنے آ گئے تھے مین نے ایک مجلد لیکر نواب مصطفی خانکو جہانگیر آباد
بھیجا تھا اب محمد بخش اور میر جی سے کہدونگا اگر کہین سے لا دیا تو ایک جلد
میر سرفراز حسین کو بھیجدونگا توقیع نوکری کا حال مجکو مفصل معلوم ہے یہ
بھی بادشاہ تنخواہ ہوئے کہ روپیہ دیکر توسل لین اور کہین ۱۱ مہینے تنخواہ
دیا ہے بشرط نوکر ہو جانیکے برس چھ مہینے تک اسنا دیا ہوا روپیہ مسترد
کرنا ہوگا نوکری مفت ہی [illegible] مقدر رہ گئی اور تقدیر مونث ہے کون کہیگا
فلانے کا مقدر چھوٹا ہے کون کہیگا [illegible] ذہنیکے کا تقدیر برا ہے یہ مسئلہ فقط
ے متذبذب نہین تو نے بہی مقدر کو مونث لکھا ہوگا تمکو تردد ہے

کیسرت تھا جوان مرد جوان بخت جوان دولت جوان عمر جوان سال جوان خرد جوان برگ
یہ الفاظ مقررہ اہل زبان ہیں کبھی مقلوب و معکوس نہین آتے اور اخبار مین بادشاہ کے وہانکی خبر
تھی و بکی مگر ہر کہین سے تصدیق نہین ہوئے نرندر سنگھ راجہ پٹیالہ بے تکلف مر گیا مسجد جامع کے
واگذاشت کی خبر مشہور ہے اگر سچ ہو جائے تو کیا اچھا ہے شاہ اودھ کے املاک کے بھی واگذاشت کی
خبر ہے تو کہو اب میں کیا لکھون سر راہ کے منڈیر کے پاس جو تخت بچھا ہے اوس پر بیٹھا ہوا دھوپ
کہا رہا ہون اور خط لکھ رہا ہون بس اب یہ لکھنا ہے کہ مجتہد العصر کو دعا اور ابو الفضل عباس
کو دعائین صبح پنجشنبہ ۲۴ جمادی الاول ۲۰ نومبر سال حال

[illegible]

کراندن غلط اور کنانیدن صحیح گشتن کو گشتاندن اور رستن کو رستاندن نہ کہینگے بلکہ گردیدن و روئیدن
بنا کر گرداندن اور رویاندن لکھینگے بلغا کے کلام میں کردن کا متعدی شاید کہیں نہ آیا ہو اگر آیا ہوگا تو کنانیدن
آیا ہوگا کراندن ٹکسال باہر ہے ۱۲ تذکیر و تانیث کا دائرہ بہت وسیع ہے دہی
بعض کہتے ہیں دہی اچھی قلم کو مونث کہتا ہے قلم ٹوٹ گیا کوئی کہتا ہے قلم ٹوٹ گئی فقیر دہی کو مذکر بولتا ہے
اور قلم کو بھی مذکر جانتا ہے علی ہذا القیاس شنگرف بھی مذبذب ہے کوئی مذکر اور کوئی مونث کہتا ہے میں تو شنگرف
کو مونث کہونگا خلاصہ یہ ہے کہ اس ہیچمدان کے نزدیک کردن کا متعدی کنانیدن ہے اور شنگرف مونث ہے ۱۲
خداوند نعمت یہ وہ زمانہ ہے کہ بہ عمل نجات گاہ گاہ نامہ و پیام بھیجنے رہ گیا ہے یہ بھی لکھ سکتا ہوں کہ میں ایک عرضی
جو خط بھیجا اور آپ نے ایک کا جواب نہیں لکھا ہاں یہ عرض کرنا ہوں کہ آج مجھ کو آپ کا خط آیا ہے بڑا ہی ہوا حساب
لکھا ہے کہ پہنچا ہے ڈاک میں اکثر خطوط تلف ہوتے ہیں بیرنگ کے ضایع ہونیکا گمان کم ہے اس دستور کا پابند رہتا
ہوں میرا یہ خط بیرنگ بھیجا ہوں آپ بھی اب جب کبھی بغرض کمال خط بھیجیں تو بیرنگ بھیجیں نیاز نامہ
مرقومہ نجات غالب نگاشتہ چہارشنبہ سوم شعبان دہم اپریل سنہ حال ۱۲

جناب قاضی صاحب کو میری بندگی پہنچے مکرمی مولوی غلام غوث خاں بہادر میر منشی

کا قول سچ ہے اب کیا تندرستی میں پھوڑا پھنسی زخم جراحت

کہین نہین مگر ضعف کی وہ شدت ہے خدا کی پناہ ضعف کیونکر

نہو برس دن صاحبفراش رہا ہون ستّر برس کی عمر جتنا خون بدن میں

تھا بے مبالغہ آدہا اُسمین سے پیپ ہو کر نکل گیا سنّ نمو

کہاں جو اب پہر تولید دم صالح ہو بہر حال زندہ ہون

اور ناتوان اور آپکے پرسشہای دوستانہ کا ممنون احسان

والسلام مع الاکرام نجات کا طالب غالبؔ

دوشنبہ ۱۸ جمادی الثانی سنہ ۱۲۸۰ مطابق ۳۰ نومبر سنہ ۱۸۶۳

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے ایک عریضہ پیشتر بھیج چکا ہوں اوسکا جواب نہیں پایا امیدوار ہوں کہ
اس عریضہ کے جواب سے محروم نہ رہوں تفصیل ذکر و تین یہ ہے کہ سنا کہ عالیجناب نواب مہدی علیخاں بہادر
سوار ریل آتے تھے اور دلی کی محلے میں ٹھہرے ہیں کہا گیا کہ فوراً سوار تھا وہاں جا کے سنا کہ نواب صاحب
ریل کا اسٹیشن پر گئے ہیں گھنٹا بھر بیٹھا رہا کہ حضرت نے آگے غازی آباد کے اسٹیشن پر سے
سوار ہوتے تھے اب ولی محمد سوداگر کو تیری کے پاس سے جو بیگم کے باغ کے عقب میں نیا اسٹیشن
قرار پایا ہے سو صاحبزادہ صاحب نے آپکی حضور میں اطلاع کے ہی دیکھنی حضرت غازی آباد سے
سوار ہوتے ہیں یا شہر میں سے وہ شغل مدد کی مجکو اپنی روز و روانگی وقت ورود سے اطلاع
بخشیں اور اس عریضے کا جواب البتہ جلد عنایت ہو وہ فقیر بے سروسامان اپنا ساتھ درست
کر رکھے ...... حضرت کی توجہ الٰہی جو ہمیشہ میری تصلیح حال اور افزائش عزّ و وقار
کی کفیل ہے بعد ادائے شکر الٰہی اوسکا سپاس بجالاتا ہوں پیشتر از غدر گورنمنٹ
سے دربار میں ، پارچہ اور جیغہ سرپیچ مالا مروارید تین رقمیں جواہر کی مجکو
ملتی تہیں بعد غدر اگرچہ پنسن اور دربار بحال رہا لیکن خلعت موقوف ہوگیا نواب

لفٹننٹ گورنر بہادر پنجاب کلی کل ۱۲ بجے پر جاری ہی دربار تھا حکم سب دربار داروں کو پہنچ
گیا تھا میں نواب مہدی علیخاں صاحب کو رخصت کر کے گھر آیا اور گنتی کے بعد دربار میں گیا
خیل جو کہ ملاقات ہو گئے ایک رباعی کاغذ پر تب بر لکھی ہوئی نذر کرونگا کمال
عنایت سنکر چلا آؤنگا نہ مجھے کچھ احتمال نہ صاحب کمشنر بہادر شہر کو علم بادی بروقت
ملاقات تسلیم معمولے اور مصافحہ کر کے مدد و صاحب نے ایٹر کی کہ شرمی جیفنہ سرپیچ سر پر
باندھا اور فرمایا ہم یہ ہمنے آپکی داخل رکھا تھا مالا مروارید میرنش نے گلے میں ڈال دی
یہ پانچ پارچہ خلعت مرحمت ہوئے دوشالہ کمخواب تھان بنارسی تھان سنہری
بنارسی سیلا الوان تھان درکنارہ و کلابتون کنارہ زری کا تھان الوان سادہ چادر بدن کی
میں اس عطیہ کو آپکی بخشش معنوی سمجھا ہوں اور صورت بخشش یعنی استحکام کے جو اسباب
جلد حاصل ہونیکا متوقع ہوں زیادہ حد ادب ۵ تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے
ہوں دن پچاس ہزار

نجات کا طالب
غالب
[illegible]
[illegible]

غدر دہلی کے افسانوں کا

ساتواں حصہ

غالب کا روزنامچہ

از

مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی

شائع کنندہ

کارکن حلقہ مشائخ بک ڈپو دہلی

قیمت ۱۲ ار

۱۹۲۴ء

صرف سرورق

نور فائن آرٹ لیتھو پریس دہلی حویلی اعظم خاں میں طبع ہوا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غالب کا روزنامچۂ غدر
۱۸۵۷ء
غدرِ دہلی کے افسانوں کا ساتواں حصّہ

دیباچہ غدر ۱۸۵۷ء کے حالات چھ حصوں میں شائع کر چکا ہوں ہر حصہ میں ایک مخصوص بات غدر کے متعلق ہے۔ پہلے حصّہ میں وہ قصّے ہیں جنکو میں نے بہادر شاہ کے خاندان کی عورتوں، بچوں اور مردوں کی آپ بیتی کیفیت کو ان سے سنکر یا دوسری جگہ سے معلوم کر کے اپنے طریقہ بیان کے اضافہ سے قلمبند کیا۔ اور کئی بار یہ کتاب چھپی۔ اس حصّہ کا نام **آنسوؤں کی بوندیں** ہے۔

دوسرے حصّہ میں انگریزوں کی خود نوشت کیفیت ہے یعنی غدر میں ان پر جو مصیبتیں پڑیں اُن کو انہوں نے لکھ لیا۔ اِس کا نام **انگریزوں کی بپتا** ہے اور اسکے بھی کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔

تیسرے حصہ میں محاصرۂ دہلی کی وہ خط و کتابت ہے جو انگریزی فوج کے انگریز افسروں نے محاصرۂ دہلی کے مقام پر پنجاب کے انگریز افسروں سے کی اس کا نام **محاصرہ دہلی کے خطوط** ہے۔

چوتھے حصّہ میں بہادر شاہ بادشاہ کے مقدمہ کی مفصل روداد ہے جس کا نام **بہادر شاہ کا مقدمہ** ہے۔

پانچویں میں وہ خفیہ خطوط ہیں جو غدر کے زمانہ میں بادشاہ نے لوگوں کو لکھے اس کا نام **گرفتار شدہ خطوط** ہے۔

چھٹے میں اخبارات کے وہ مضامین ہیں جو زمانہ غدر میں شائع ہوئے اور جنکو . . . غدر میں ایک سبب قرار دیا گیا تھا اسکا نام **غدر دہلی کے اخبار** ہے
اب یہ ساتواں حصہ میرے خیال میں سب حصّوں سے زیادہ دلچسپ، موثر اور دردناک سمجھا جائیگا۔ گو آجکل پہلے حصہ کو جو میرا لکھا ہوا ہے بہت پسند کیا جاتا ہے مگر حق یہ ہے کہ جب غالب کا یہ روزنامچہ شائع ہوگا تو میرا لکھا ہوا پہلا حصہ اسکے سامنے ماند ہو جائیگا۔ کیونکہ میرے لکھے ہوئے حصّے میں قصّہ کا مبالغہ ہے اور بہت سی باتیں درد کا اثر بڑھانے کو محض فرضی لکھی گئی ہیں۔ میں نے یہ مضامین جو پہلے حصہ میں جمع کر کے شائع کئے گئے ہیں تاریخی حیثیت سے نہیں بلکہ ہندوستانیوں کو عبرت دلانے اور دنیا کا انجام اور نتیجہ دکھانے کے لئے مختلف موقعوں پر لکھے اور مختلف رسائل و اخبارات میں شائع کرائے تھے اسلئے ان میں کسی قسم کی تاریخی اہمیت نہیں ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ میں نے ان کا نام "افسانے" رکھا ہے تاکہ ان کو تاریخی واقعات نہ سمجھ لیا جائے
غالب کے روزنامچہ میں ایک حرف بھی فرضی نہیں ہے بلکہ چشم دید اصلی حالات کی تصاویر ہیں۔ اور پھر بیان ایسا صاف ستھرا اور اعلےٰ ہے کہ میری عبارت اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتی۔
غالب کے اس روزنامچہ سے دہلی کی عمارتوں، دہلی کے نامور آدمیوں دہلی کی قدیمی معاشرت، دہلی کے پرانے احساسات کا اتنا بڑا تاریخی ذخیرہ حاصل ہوتا ہے جو کسی غدر دہلی کی تاریخ میں نہیں ملے گا +
ایک بات نہایت ہی اہم اس روزنامچہ سے ظاہر ہوگی اور وہ یہ ہے کہ غدر کی تاریخ لکھنے والے عموماً یا تو انگریز تھے اور یا انگریزوں کے زیر اثر مورخ اس واسطے اس میں واقعات کا ایک ہی رُخ دکھایا گیا ہے۔ مگر غالب کے روزنامچہ سے تصویر کا دوسرا اور بہت ہی پوشیدہ رُخ بھی ظاہر ہو جائیگا اور مورخوں کو اس سے بہت مدد ملے گی +

یہ روزنامچہ کہاں سے آیا

لوگوں کو حیرت ہوگی کہ غالب کا یہ روزنامچہ کہاں سے آگیا پہلے تو کبھی اس کا ذکر بھی نہیں سُنا تھا۔ اس واسطے میں اس حقیقت کو بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ غالب نے غدر کا کوئی خاص روزنامچہ نہیں لکھا تھا نہ غالبؔ اُن کو روزنامچہ لکھنے کی عادت تھی میں نے یہ روزنامچہ خود تصنیف کیا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اس تصنیف میں ایک حرف بھی میرا نہیں ہے اور سب غالب کے قلم سے نکلا ہوا ہے +

اس معمہ اور چیستان کا حل یہ ہے کہ غالب کے خطوط میں جہاں جہاں غدر کا ذکر ضمناً آیا تھا میں نے پوری تلاش و محنت سے اسکو الگ کر لیا۔ اور ایسے طریقہ سے چھانٹا کہ روزنامچہ کی عبارت معلوم ہونے لگی بس میرا کمال اسی قدر ہے کہ میں نے بغیر بیشی الفاظ کے خطوط کو روزنامچہ بنا دیا اور کوئی شخص اس کو پڑھ کر خطوط کا شبہ نہیں کر سکتا +

غالب کے مکتوبات مطبوعہ و غیر مطبوعہ میں غدر کی کیفیت ایسی دبی ہوئی پڑی تھی کہ کوئی شخص اس کی خوبی و اہمیت کو محسوس نہ کر سکتا تھا اور خطوں کے ذیل میں ان عبارتوں کو بھی بے توجہی سے پڑھ لیا جاتا تھا +

میں نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ اردو زبان میں غدر دہلی کی یہ لاثانی تاریخ جو موتیوں سے بھی زیادہ بیش قیمت ہے اس طرح دبی ہوئی نہ پڑی رہے۔ اسلئے اس کو علیحدہ کرنا شروع کیا۔ اور کہیں کہیں اپنے حاشئے بھی لکھے تاکہ آجکل کے لوگوں کو دہلی کی بعض مقامی باتوں سے واقفیت ہو جائے اور جس چیز کا مطلب سمجھ میں نہ آئے حاشیہ کی مدد سے سمجھ لیں +

کوشش کے باوجود غالب کی تحریروں میں بعض باتیں ایسی ہیں جنکا حل میں بھی نہ کر سکا۔ دوسرے ایڈیشن کے موقع پر مزید تحقیق کی توفیق خدا تعالیٰ نے دی تو اس کمی کو پورا کر دیا جائیگا +

ایک نہایت مشکل کام

روزنامچہ کی تیاری میں یہ پیش آیا کہ بعض مکتوبات پر غالب نے تاریخ اور سنہ لکھے ہیں اور بعض پر صرف تاریخ اور دن ہے مگر سنہ نہیں لکھا اور بعض پر نہ سنہ ہے نہ تاریخ

ہے اس واسطے ترتیب کا فرض ادا کرنا مشکل ہو گیا کیونکہ کچھ معلوم نہیں ہو سکتا کہ پہلی عبارت کون سی ہے اور دوسری کون سی۔ ناظرین خود اپنی سمجھ سے اس مشکل کو حل کر سکتے ہیں

دوسری مشکل

اس روزنامچہ میں یہ ہے کہ بعض مضامین اور واقعات مکرر بلکہ کئی کئی بار لکھے گئے ہیں خصوصاً پنشن کے حالات بہت جگہ آئے ہیں۔ ان کو میں نے اسلیئے قایم رکھا اور کم نہیں کیا کہ گو واقعہ ایک ہی ہے مگر طرز ادا میں ہر جگہ نئی قسم کی خوبی ہے اور غالب نے اپنے ہر مخاطب کو ایسے لطف سے کیفیت لکھی ہے کہ نیا مضمون بنا دیا ہے۔ اور پھر کمال یہ ہے کہ واقعات میں کمی بیشی نہیں ہونے دی جس سے غالب کی صدق بیانی پر پوری روشنی پڑتی ہے

حسن نظامی

یہ کتاب دستنبو کا ذکر ہے۔ آگے بھی جگہ جگہ اس کی کیفیت مذکور ہوئی ہے اور غالباً اسی کتاب کو دیکھنے کے بعد انگریزی حکام عملی کو غالب کی قدر ہوئی اور شروع کی بیزاری، نفرت اور حقارت اور شبہ جاتا رہا جسکا ذکر کئی جگہ آیا ہے۔ کیونکہ دستنبو دیکھنے سے پہلے گورنر اور دیگر حکام انگریزی غالب کو معمولی شاعر اور بھاٹ خیال کرتے ہونگے اور بہادر شاہ کا سکہ کہنے کے سبب اور قلعہ میں جانے آنے کی وجہ سے ان پر پورا شبہ باغیان غدر سے میل جول کا ہوگا۔ مگر جب کتاب دستنبو پڑھی گئی ہوگی اور اس سے غالب کی قابلیت اور غدر سے بے تعلقی ظاہر ہوئی ہوگی تب گورنر اور حکام انگریزی نے پنشن جاری کی ہوگی ✦

غالب کا روزنامچہ غدر ۱۸۵۷ء

غالب کا نسب نامہ

میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں۔ دادا میرا ماوراءالنہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان آیا سلطنت ضعیف ہو گئی تھی۔ صرف پچاس گھوڑے نقارہ دار نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ اور رسالے کی تنخواہ میں پایا۔ بعد انتقال اسکے جو طوائف الملوکی کا بازار گرم تھا وہ علاقہ نہ رہا۔ باپ میرا عبداللہ بیگ خان بہادر لکھنؤ جاکر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعد چندروز حیدرآباد جاکر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا۔ نصیر اللہ بیگ خاں میرا چچا حقیقی مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبہ دار تھا اس نے مجھے پالا ۱۸۰۶ء میں جرنیل لیک صاحب کا عمل ہوا صوبہ داری کمشنری ہو گئی اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر ہوا۔ میرے چچا کو جرنیل لیک صاحب نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار سو سواروں کا برگیڈیر ہوا۔ ایک ہزار روپیہ ذات کا اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر عین حیات علاوہ رسالہ بھر مرزبانی کے تھی کہ بمرگ ناگاہ مر گیا۔ رسالہ برطرف ہو گیا۔ ملک کے عوض نقدی مقرر ہو گئی۔ وہ اب تک پاتا ہوں۔ پانچ برس کا تھا جو باپ مر گیا۔ آٹھ برس کا تھا جو چچا مر گیا۔ ۱۸۳۰ء میں کلکتہ گیا۔ نواب گورنر جنرل سے ملنے کی درخواست کی۔ دفتر دیکھا گیا۔ میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا۔ ملازمت ہوئی۔ سات پارچے اور جیغہ۔ سرپیچ۔ مالائے مروارید یہ تین رقم کا خلعت ملا۔ زاں بعد جب دلّی میں دربار ہوا مجھکو بھی خلعت ملتا رہا۔ بعد غدر بجرم مصاحبت بہادر شاہ دربار و خلعت دونوں بند ہو گئے۔ میری بریت کی درخواست گزری تحقیقات ہوتی رہی۔ تین برس بعد پنڈ چھٹا۔ اب خلعت معمولی ملا

یہ خلاصہ ہے غالب کے نسب نامہ اور زندگی کے بڑے بڑے واقعات کا۔ اتنے اختصار سے اتنی بڑی لائف کا ماحصل لکھ دینا معمولی بات نہیں

ہے یہ قدرت خدا نے غالب کے قلم کو دی تھی۔

ترک اہل سیف ہوتے ہیں اہل قلم نہیں ہوتے

برٹش گورنمنٹ کے موجودہ منصب عاقبت کے اندیشہ نے بے بہرہ وزیر اعظم مسٹر لائڈ جارج نے خلافت ڈیپوٹیشن ہندوستان کے اراکین سے کہا تھا کہ ترکوں کو تلوار نچانے کے سوا اور آتا ہی کیا ہے۔ ان میں کوئی قلمی بہادر پیدا نہیں ہوا اس کے جواب میں غالب و خسرو کو پیش کیا جا سکتا ہو جو دونوں دہلی درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء میں دفن ہیں کہ امیر خسرو بھی ترک لاچین تھے۔ اور غالب بھی ترک سلجوقی تھے جیسا کہ اس عبارت میں انہوں نے خود لکھا ہے۔ اب غالب و خسرو کے کمالات علمی و شعری اور فضائل فلسفہ و ادراک حسن انسانی کو دیکھنا چاہئے۔ ان کی لاجواب تصنیفات کو پڑھنا چاہئے انگلش قوم کے علماء و فلاسفر زمین جو بات افرادی تھی وہ ان میں مجموعی تھی یعنی انگریزوں میں ایک خاص فن کا کوئی ماہر ہوتا تھا اور اس فن کے سبب اس کی عزت ہوتی اور غالب و خسرو مجموعہ کمالات تھے کہ متعدد فضائل ان کے اندر تھے۔

تو گیا ہندوستان کے یہ دو مشہور ترک ہندوستانی وفد خلافت کی طرف سے لائڈ جارج کو یہ جواب نہیں دے سکتے کہ ترک صاحب سیف بھی ہوتے ہیں اور صاحب قلم بھی۔ تم کو واقفیت حاصل کئے بغیر زبان سے اتنی بڑی بات کہدینی مناسب نہ تھی کہ تم ساری برطانی قوم کے قائم مقام ہو

غالب کا حلیہ

جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اسکی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھکو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے ◆

جب ڈاڑھی مونچھ میں بال سفید آگئے تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں

پر تقطر آنے لگے۔ اس سے بڑھکر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسی بھی چھوڑ دی۔ اور ڈاڑھی بھی تاکہ اس بھونڈے شہر (دہلی) میں ایک وردی ہے عام۔ ملا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقہ، بھٹیارہ، جولاہہ، کنجڑا منہ پر ڈاڑھی سر پر بال۔ فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی اسی دن سر منڈایا۔

(*)

اس سے معلوم ہوا جوانی میں بہت طرح دار جوان تھے۔ ڈاڑھی منڈاتے تھے اور اس وقت کے دستور کے موافق دانتوں پر مسی بھی ملتے تھے۔

(*)

غالب کی ازلی طبیعت

علم و ہنر سے عاری ہوں لیکن بچپن برس سے محو سخن گزاری ہوں۔ مبدء فیاض کا مجھ پر احسان عظیم ہے۔ ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے۔ فارسی کے ساتھ ایک مناسبت ازلی اور سرمدی لایا ہوں۔ مطابق اہل پارس کے منطق کا بھی مزہ ابدی لایا ہوں۔ مناسبت خداداد۔ تربیت استاد حسن و قبح ترکیب پہچاننے، فارسی کے غوامض جاننے لگا۔

غالب کا مجموعہ کلام

میرا کلام کیا نظم کیا نثر کیا اردو کیا فارسی کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہوا۔ دو چار دوستوں کو اس کا التزام تھا کہ وہ مسودات مجھ سے لیکر جمع کر لیا کرتے تھے۔ سو ان کے لاکھوں روپئے کے گھر لٹ گئے جس میں ہزاروں روپے کے کتب خانے بھی گئے۔ انہی میں وہ مجموعہ ہائے پریشان بھی غارت ہوئے۔

غدر کی نسبت غالب کی تصنیف

میں نے آغاز یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد شہر اور اپنی سرگزشت یعنی ۱۵ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے اور اس کا التزام کیا ہے کہ دساتیر کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے جو نظم اس نثر میں درج ہے۔ وہ بھی بے آمیزش لفظ عربی ہے۔ ہاں اشخاص کے نام نہیں بدلے۔

غالب چشتی نظامی تھے شیعہ نہ تھے

میاں نصیر الدین اولاد میں سے ہیں شاہ محمد اعظم صاحب کی وہ خلیفہ تھے مولوی فخر الدین صاحب کے۔ اور میں مرید ہوں اس خاندان کا +

غالب کی نسبت شہرت ہے کہ وہ اثنا عشری شیعہ تھے۔ اور مکتوبات میں انہوں نے خود بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ میں اثنا عشری ہوں مگر یہاں وہ لکھتے ہیں کہ میں مولوی فخر الدین صاحب کے خاندان کا مرید ہوں۔ جو چشتیہ نظامیہ سلسلہ کے مشہور بزرگ تھے۔ درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین صاحبؒ میں ان کا مزار ہے اور وہ فرزند تھے حضرت مولانا نظام الدینؒ اورنگ آبادی کے اور غالب کے اکثر احباب اور بہادر کا خاندان بھی حضرت مولانا فخر صاحبؒ مذکور کے سلسلہ میں مرید تھا۔ میاں کالے صاحب انہی مولانا فخر صاحب کے پوتے تھے۔ جو بہادر شاہ کے پیر سمجھے جاتے تھے اور اسی وجہ سے ان کی املاک و جائداد کی ضبطی ہوئی جیسا کہ غالب نے اسی روزنامچہ میں لکھا ہے +

پس اگر غالب چشتی نظامی سلسلہ میں مرید تھے تو شیعہ کیونکر ہو سکتے تھے کیونکہ شیعہ مرید نہیں ہوا کرتے۔ مگر انہوں نے خود لکھا ہے کہ میں اثنا عشری ہوں اس مشکل کا حل یہ ہے کہ چشتی نظامی فقرا اور ان کے مرید محبت اہلبیتؑ میں بہت غلو رکھتے ہیں۔ اور بارہ اماموں سے بھی تعلق خاص رکھتے ہیں اس بنا پر غالب نے اپنے آپ کو اثنا عشری یعنی بارہ ائمہ کا ماننے والا لکھا ورنہ وہ شیعہ نہ تھے شیعہ ہوتے تو مرنے کے بعد علی گنج شاہ مرداں کے قبرستان میں دفن ہوتے جو صفدر جنگ کے قریب ہے اور جہاں اس وقت تک تمام شیعہ امرا دفن ہوا کرتے تھے۔ اور اب بھی ہوتے ہیں سنیوں خصوصاً چشتیوں نظامیوں کے قبرستان میں دفن ہونا اور درگاہ حضرت سلطانجی صاحب میں جو نظامیہ سلسلہ کے بانی ہیں ان کی میت کا لایا جانا ظاہر

کرتاہے کہ وہ سنی تھے شیعہ نہ تھے۔ انکی قبر بھی سنی طریقہ کی بنائی گئی ہے یعنی اس پر اونچا اونٹ کے کوہان کی صورت کا خشتی تعویذ بنایا گیا ہے شیعوں کی قبریں زمین کے برابر ہوتی ہیں۔ ابھرا ہوا یا اونٹ کے کوہان کی شکل کا تعویذ ان کے ہاں نہیں بنایا جاتا ٭

غالب کی قبر پہ تاریخ میر مجروح کی کہی ہوئی کندہ ہے۔ جو غالب کے شاگرد اور شیعہ مذہب رکھتے تھے۔ وہ تاریخ یہ ہے ٭

کل میں غم واندوہ میں باخاطر محزوں — تھا تربت استاد پہ بیٹھا ہوا غمناک
دیکھا جو مجھے فکر یہ تاریخ کی مجروح — ہاتف نے کہا گنج معانی ہے تہ خاک

۱۲۸۵ھ

تباہی قلعہ کی پیشین گوئی

مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا قلعہ میں شہزادگان تیمو ریہ جمع ہو کر کچھ غزلخوانی کر لیتے ہیں میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا۔ اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے اسکو دوام کہاں؟ کیا معلوم ہے اب کے نہ ہو اور اب کے ہو تو آیندہ نہ ہو ٭

یہ تحریر غدر سے پہلے کی ہے۔ لال قلعہ اور اس کے باشندوں کی نسبت جس انداز سے لکھتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شہزادوں کے اطوار اور ملک کی سیاست کے رُخ کو دیکھکر غالب نے سمجھ لیا تھا کہ اب یہ رونق چند روز کی مہمان ہے گو غدر کی خبر غالب کو نہ تھی کہ غیب کا علم نہ جانتے تھے۔ پھر بھی آثار و قرائن سے انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ انگریز اب اس بادشاہی کھلونہ کو سامنے سے ہٹا دینا چاہتے ہیں جب ہی تو انہوں نے صاف صاف لکھدیا کہ "یہ صحبت چند روزہ ہے اس کو دوام کہاں؟" اور یہ لکھکر تو انہوں نے پیش گوئی کا کمال ظاہر کر دیا کہ "کیا معلوم اب کے نہ ہو اور اب کے ہو تو آیندہ نہ ہو" گویا غالب کو قلعہ کی تباہی کا اتنا یقین تھا کہ ایک دو سال کی قید بھی انہوں نے لگا دی۔

اب دہلی میں کون رہتا ہے؟

کہتے ہیں دلی بڑا شہر ہے۔ ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ مگر اب یہ وہ دلی نہیں ہے بلکہ ایک کیمپ ہے۔ مسلمان اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ۔ باقی سراسر ہنود۔ معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں۔ وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پاتے ہیں اناث میں سے جو پیر زن ہیں۔ وہ کٹنیاں اور جوانین کسبیاں۔ امرائے اسلام میں سے اموات گنو۔ حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا سو روپے کا پنشن دار سو روپے مہینے کا روزینہ دار۔ بنکر نامراد بن گیا میر ناصر الدین باپ کی طرف سے پیر زادہ نانا اور نانی کی طرف سے امیر زادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان۔ بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے۔ بیمار پڑا۔ نہ دوا نہ غذا۔ انجام کار مر گیا۔ ناظر حسین مرزا جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آگیا ہے اس کے پاس ایک پیسہ نہیں۔ ٹکے کی آمد نہیں مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے۔ مگر دیکھیے چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڈھے صاحب ساری املاک بیچ کر نوش جان کر کے بیک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدین کی پانسو روپے کی املاک واگزاشت ہو کر پھر قرق ہوگئی۔ تباہ خراب پھر لاہور گیا وہاں پڑا ہوا ہے۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڈھ اور بلب گڈھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ روپیہ کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہنر مند آدمی کیوں پایا جائے۔ جو حکما کا حال ہے وہ بیان واقع ہے۔

✻

جو لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اب دہلی میں نہ صاحب اخلاق و مروت ہیں، نہ علم و ہنر والے ہیں، نہ امرا ہیں، نہ شعرا ہیں۔ نہ پہلے سے علما و فقرا نظر آتے ہیں۔ ان کو غالب کی یہ تحریر پڑھنی چاہیے کہ غدر نے ان سب کا خاتمہ کر دیا۔ اور ایسا تباہ کیا کہ آج تک اس شہر میں وہ پہلی سی بات پیدا نہ ہو سکی +

اب دہلی میں دہلی والے کہاں ہیں؟ پردیسی لوگ آباد ہیں۔ دہلی والے یا تو پھانسیوں پر لٹک گئے یا جلا وطن ہو گئے۔ پھر اس غریب

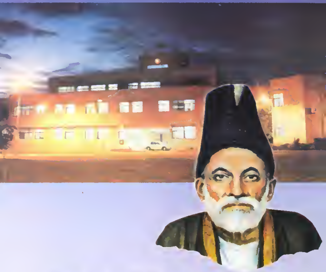

ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

ہائی نون کا مقصد ۔ صحت مند قوم

HIGHNOON for a Healthier Nation

HIGHNOON LABORATORIES LTD.

Web: http://www.highnoon-labs.com

حفیظ تائب

اردو شاعری کا ایک محترم نام

ان کی شاعری کے خوبصورت مجموعے

صلوعلیہ وآلہٖ ✲ وسلموا تسلیما ✲ وہی یٰسٓ وہی طٰہٰ ✲ مناقب ✲ سک متراں دی (پنجابی)

جن کے متعلق **ڈاکٹر سید عبداللہ کہتے ہیں**

حفیظ تائب کی نعت پڑھ کر کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک وصاف ہے جو حضورؐ کے روبرو کھڑا ہے۔
اسکی نگاہیں جھکی ہوئی ہیں اور آواز احترام کی وجہ سے دھیمی ہے

ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق

شاعر کی حیثیت سے حضرت تائب کی عظمت کے لئے یہی کیا کم ہے کہ وہ مجسم نعت ہیں

ڈاکٹر غلام مرتضیٰ ملک

قبلہ حفیظ تائب صاحب مدظلہ، میری نظر میں عالم اسلام کے سب سے بڑے اردو نعت گو شاعر ہیں

عطاء الحق قاسمی

تائب میرے خیال میں نعت نہیں کہتے نعت میں زندہ رہتے ہیں۔

DESIGNED BY: GLOBAL 7121573

القمر انٹرپرائزز غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور۔ فون 7237500

شہر کو بدنام کرنا اور اس کو قدیمی ناموری اور شہرت کی نظر سے دیکھنا بے عقلی نہیں تو کیا ہے!۔

غالبؔ نے یہ تحریر ایسے درد سے لکھی ہے کہ دل پاش پاش ہوا جاتا ہے۔ غم کا نقشہ مجسم ہو کر آنکھوں کے رستہ دل میں گھسا چلا آتا ہے۔

(*)

ہندوستان غدر کے بعد

ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہو گیا لاکھوں مر گئے۔ جو زندہ ہیں ان میں سینکڑوں گرفتارِ بندِ بلا ہیں۔ جو زندہ ہے اس میں مقدورِ زندگی نہیں +

اب دہلی میں ساہوکاروں کے سوا کوئی امیر نہیں ہے۔

مسلمان امیروں میں تین آدمی۔ نواب حسن علی خاں۔ نواب حامد علی خاں حکیم احسن اللہ خاں، سوان کا یہ حال ہے کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں۔ معہذا یہاں کی اقامت میں متذبذب۔ خدا جانے کہاں جائیں۔ سوائے ساہوکاروں کے یہاں کوئی امیر نہیں ہے

(*)

غدر کے بعد غالبؔ نے دہلی کے مسلمان اُمرا کی تباہی کا جو جگہ جگہ نقشہ دکھایا ہے وہ آج تک اپنی خط و خال میں موجود ہے کہ خاندانی مسلمان امیر ایک نہیں، ساہوکار امیر ہزار ہیں۔ خواہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ تجارت کا تموّل نظر آتا ہے حکومت کی موروثی امیری خواب و خیال ہو گئی۔

(*)

نواب فرخ میرزا کا بچپن

پرسوں فرخ میرزا آیا اس کے ساتھ اس کا باپ بھی تھا۔ پوچھا کیوں صاحب میں تمہارا کون ہوں، اور تم میرے کون ہو۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا حضرت آپ میرے دادا اور میں آپ کا پوتا ہوں۔ پھر میں نے پوچھا کہ تمہاری تنخواہ آئی؟ کہاں جناب عالی آکا جان کی تنخواہ آ گئی ہے۔ میری نہیں آئی میں نے کہا لوہارو جائے تو تنخواہ پائے کہا حضرت میں تو آکا جان سے روز کہتا ہوں کہ لوہارو چلو اپنی حکومت چھوڑ کر

دلّی کی رعیت میں کیوں مل گئے۔

سبحان اللہ بالشت بھر کا لڑکا اور یہ فہم درست اور طبع سلیم ہے اسکی خوبی خو اور فرخی سیرت پر نظر کر کے اسکو فرخ سیر کہتا ہوں۔

یہ نواب فرخ مرزا والی لوہارو کا ذکر ہے جن کو برٹش گورنمنٹ سے سر کا خطاب ہے اور توپوں کی سلامی دی جاتی ہے۔ اور اعلیٰ درجہ کے والیانِ ریاست کے برابر اعزاز کیا جاتا ہے۔ درمیانہ قد ہے۔ گورا رنگ کٹورا سی آنکھیں۔ بڑی اور چڑھی ہوئی ڈاڑھی۔ بال سفید ہو گئے ہیں نہایت خلیق و ملنسار رئیس ہیں۔ اردو ایسی بولتے ہیں کہ آدمی بیٹھا حیرت سے منہ دیکھا کرے۔ مولانا شبلی حسرت سے کہا کرتے تھے کہ فرصت ہو تو فرخ میرزا کی باتیں سُنئے کہ اصل اردو ان کی باتوں میں ہے۔

غالب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، فرخ میرزا بچپن سے ہونہار تھے۔ ایک فقرہ تو ایسی غضب کا غالب سے کہا کہ آجکل لوگ سنیں تو متعجب ہوں۔ کیونکہ جنگ یورپ کے زمانہ میں جب نواب فرخ میرزا بصرہ گئے تو عوام نے مشہور کیا کہ وہ انگریزوں کی مدد کرنے گئے ہیں اور انہوں نے اسلامی حکومت کے درد کی پروانہ کی۔ غالب کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ فرخ میرزا طفلی سے ذاتی اور اسلامی حکومت کی خوبی کو محسوس کرتے تھے جب ہی تو انہوں نے کہا "اپنی حکومت چھوڑ کر دلّی کی رعیت میں کیوں مل گئے"

مگر آفرین ہے فرخ میرزا کی بلاغت پر اس وقت بھی پہلو بچا کر بات منہ سے نکالی۔ دلّی کی رعیت کہا انگریزی رعیت نہ کہا۔

اینٹ سے اینٹ بجا دی

کل پنجشنبہ ۵ مئی کو اوّل روز پہلے بڑے زور کی آندھی آئی پھر خوب منہ برسا۔ وہ جاڑا پڑا

کہ تمام کرہ شہر زمہریر ہوگیا۔ بڑے دریبہ کا دروازہ ڈھا گیا۔ قابل عطا کے کوچہ کا بقیہ مٹا یا گیا کشمیری کٹرہ کی مسجد زمین کا پیوند ہوگئی۔ سڑک کی وسعت دوچند ہوگئی اللہ اللہ گنبد مسجدوں کے ڈہاتے جاتے ہیں اور ہنود کی ڈیوڑھیوں کی جھنڈیوں کے پرچم لہراتے ہیں۔ ایک شیر زور آور اور پہلتن بند سے پیدا ہوا ہے۔ مکانات جابجا ڈہاتا پھرتا ہے فیض اللہ خاں بنگش کی حویلی پر جو جو گلدستے ہیں جسکو عوام گمڑی کہتے ہیں۔ انہیں سے بلا بلا کر ایک ایک کی بنا ڈہادی۔ اینٹ سے اینٹ بجادی۔ واہ رے بندریہ زیادتی اور پھر شہر کے اندر۔ گلستان کے ملک سے ایک سردار زادہ کثیر العیال عسیر الحال عربی، فارسی، انگریزی تین زبانوں کا عالم دلّی میں وارد ہوا ہے بلیماروں کے محلّہ میں ٹھیرا ہے۔ بحسب ضرورت حکام شہر سے مل لیا ہے باقی گھر کا دروازہ بند کئے بیٹھا رہتا ہے۔ گاہ گاہ نہ ہر شام و پگاہ غالب علی شاہ کے تکیہ پر آجاتا ہے۔

تم سے گورنمنٹ کو ملاقات کبھی منظور نہیں

غدر کے رفع ہونے اور دلّی کے فتح ہونے کے بعد میرا پنشن کھلا چڑھا ہوا روپیہ دام دام ملا۔ آیندہ کو بدستور بے کم و کاست جاری ہوا مگر لارڈ صاحب کا دربار اور خلعت جو معمولی و مقرری تھا مسدود ہوگیا۔ یہاں تک کہ صاحب سکرٹر بھی مجھ سے نہ ملے اور کہلا بھیجا کہ اب گورنمنٹ کو تم سے ملاقات کبھی منظور نہیں۔ میں فقیر متکبر مایوس دائمی ہوکر اپنے گھر بیٹھ رہا اور حکام شہر سے بھی ملنا موقوف کردیا۔ بڑے لارڈ صاحب کے ورود کے زمانہ میں نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب بھی دلی آئے۔ دربار کیا۔ میں گرد مجھکو کیا ناگاہ دربار کے تیسرے دن بارہ بجے چپراسی آیا۔ اور کہا کہ نواب لفٹنٹ گورنر نے یاد کیا ہے۔ سوار ہوگیا پہلے صاحب سکرٹر بہادر سے ملا۔ پھر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تصور میں کیا بلکہ تمنا میں بھی جو بات نہ تھی وہ حاصل ہوئی یعنی عنایت سے عنایت۔ اخلاق سے اخلاق وقت رخصت خلعت دیا اور فرمایا کہ ہم تجھکو اپنی طرف سے از راہ محبت دیتے ہیں اور مژدہ دیتے ہیں کہ لارڈ صاحب کے دربار میں بھی تیرا نمبر اور خلعت کھل گیا انبالہ دربار میں شریک ہو خلعت پہن۔

باوجود اسکے کہ حکام گورنمنٹ نے کہدیا تھا کہ ملاقات کبھی منظور نہیں پھر پھر غالب کے استقلال اور لگاتار جدوجہد نے اس ... نہیں سکے" قلعہ کو فتح کر لیا اور ملاقاتیں ہونے لگیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ انگریزی آئین میں قطعی فیصلہ طے شدہ امر اور کبھی نہیں بھی بدل جاتے ہیں۔ اگر سامنے والا مسلسل جد وجہد کرتا رہے مسٹر مارلے نے کہا تھا تقسیم بنگال طے شدہ امر ہے۔ اس کی منسوخی محال ہے۔ مگر بنگالیوں کی کوشش نے اس کو منسوخ کرا کے چھوڑا۔

غالب کی چند کتب

پنج آہنگ کے دو چھاپے ہیں ایک، بادشاہی چھاپہ خانہ کا اور ایک منشی نور الدین کے چھاپے خانہ کا پہلا ناقص ہے، دوسرا سراسر غلط ہے۔ ضیاء الدین خاں جاگیردار لوہارو میرے سیبی بھائی اور میرے شاگرد رشید ہیں جو نظم و نثر میں نے کچھ لکھا وہ انہوں نے لیا۔ اور جمع کیا۔ چنانچہ کلیات نظم فارسی چونتن پچپن جزو اور پنج آہنگ اور مہر نیم روز اور دیوان ریختہ سب ملکر سو سوا سو جزو مطلے اور مذہب اور انگریزی ابری کی جلدیں الگ الگ کوئی ڈیڑھ سو دو سو روپے کے صرف میں منوائیں۔ میری خاطر جمع کہ کلام میرا سب ایک جا ہے۔ پھر ایک شاہزادہ نے اس مجموعہ نظم و نثر کی نقل کی۔ اب دو جگہ میرا کلام اکٹھا ہوا۔ کہاں سے یہ فتنہ برپا ہوا اور شہر لٹے وہ دونوں جگہ کا کتاب خانہ خوان یغما ہوگیا۔ ہرچند میں نے آدمی دوڑائے کہیں سے ان میں سے کوئی کتاب ہاتھ نہ آئی۔ وہ سب قلمی ہیں۔ جناب ہنری اسٹورٹ ریڈ صاحب کو ابھی میں خط نہیں لکھ سکتا۔ ان کی فرمایش ہے۔ اردو کی نثر انجام پائے تو اس کے ساتھ ان کو خط لکھوں مگر اردو میں اپنے قلم کا زور کیا صرف کروں گا۔ اور اس عبارت میں معانی نازک کیونکر بھروں گا۔

باوجود اس کسر نفسی کے غالب کی اردو میں وہ زور ہے کہ آج تک باوجود ترقی اردو کے کوئی شخص ان کا ہمسر اردو لکھنے میں پیدا نہیں ہوا۔

مقتولوں اور مہجوروں کی یاد

غم مرگ میں قلعہ نامبارک سے قطع نظر کر کے اہل شہر کو گنتا ہوں۔ مظفر الدولہ۔ میر ناصر الدین۔ مرزا عاشور بیگ میرا بھانجا اس کا بیٹا احمد مرزا۔ انیس برس کا بچہ مصطفےٰ خاں ابن اعظم الدولہ اسکے دو بیٹے ارتضےٰ خان اور مرتضےٰ خاں۔ قاضی فیض اللہ۔ کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کی برابر نہیں جانتا تھا۔ اے لو بھول گیا حکیم رضی الدین خاں۔ میر احمد حسین میکش اللہ اللہ۔ ان کو کہاں سے لاؤں۔ غم فراق حسین مرزا۔ میر مہدی۔ میر سرفراز حسین۔ میرن صاحب خدا ان کو جیتا رکھے کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے وہاں خوش ہوتے۔ گھر ان کے بے چراغ۔ وہ خود آوارہ سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ کہنے کو ہر کوئی ایسا کر سکتا ہے مگر میں علیؑ کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔

فقیر اور ہتھیار نہ آئے

بھائی فضلو عرب سرا میں رہتے ہیں۔ پرسوں سے آئے ہوئے ہیں۔ دوڑتے پھرتے ہیں۔ عرضیاں دیتے پھرتے ہیں۔ کوئی سنتا نہیں۔ آمد و رفت کا ٹکٹ موقوف ہو گیا۔ فقیر اور ہتھیار جس پاس ہوں وہ نہ آئے۔ اور باقی ہندو مسلمان عورت مرد۔ سوار پیادہ جو چاہے چلا جائے چلا آئے۔ مگر رات کو شہر میں رہنے نہ پائے وہ شور و غل تھا کہ سڑکیں نکلیں گی۔ اور گوروں کی چھاؤنی بنے گی۔ کچھ بھی نہ ہوا مرپٹ کر ایک جان نثار خاں کے چھتے کی سڑک نکلی ہے۔ دلی والوں نے لکھنو کا خاکہ اڑا رکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ لاکھوں مکان ڈھا دیئے۔ اور صاف میدان کر دیا۔ میں جانتا ہوں ایسا نہ ہوگا ◆

(*)

امن عام کے بعد بھی فقیر اور ہتھیار روالے کا شہر کے داخلہ سے ممنوع ہونا ظاہر کرتا ہے کہ حکام انتظامی ضرورت سے ایسا کرنے پر مجبور رہتے تھے کیونکہ بغاوت کے وقت اکثر باغیوں نے فقیروں کے لباس میں دورہ کر کے غدر کی آگ بھڑکائی تھی۔

امام باڑہ کا انہدام

آغا باقر کا امام باڑہ اس سے علاوہ کہ خداوند کا عزا خانہ ہے ایک بنائے قدیم۔ رفیع مشہور۔ اس کے انہدام کا غم کس کو نہ ہوگا۔ یہاں دو سڑکیں دوڑتی ہیں۔ ایک ٹھنڈی سڑک اور ایک آہنی سڑک۔ نظل ان کا الگ الگ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ گوروں کا بارگ بھی شہر میں بنے گا اور قلعہ کے آگے جہاں لال ڈگی ہے۔ ایک میدان نکالا جائیگا۔ مجیب کی دکانیں۔ بھیلیوں کے گھر۔ فیل خانہ، بلاقی بیگم کے کوچہ تک سوائے لال ڈگی اور دو چار گنوں کے آثار عمارت باقی نہ رہے گی۔ آج جان نثار خاں کے چھتے کے مکان ڈھنے شروع ہوگئے ہیں۔ کیوں میں دلی کے ویرانہ سے خوش نہ ہوں جب اہل شہر ہی نہ رہے۔ شہر کو کیا چولہے میں ڈالوں۔

پشم نہیں اکھیڑ سکتا

زبان زد خلق ہے کہ قدیم نوکروں سے باز پرس نہیں مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ لو کئی دن ہوتے کہ حمید خاں گرفتار آیا ہے۔ پاؤں میں بیڑیاں۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں۔ حوالات میں ہے دیکھئے کہ حکم اخیر کیا ہو۔ صرف نوندے رائے کی مختارکاری پر قناعت کی گئی جو کچھ ہونا ہے وہ ہو رہیگا۔ ہر شخص کی سرنوشت کے موافق حکم ہو رہے ہیں۔ نہ کوئی قانون ہے نہ قاعدہ ہے۔ نہ نظیر کام آئے نہ تقریر پیش جائے۔ ارتضیٰ خاں ابن مرتضیٰ خاں کی پوری دو سو روپے کی پنشن کی منظوری کی رپورٹ گئی۔ اور انکی دو بہنیں سو سو روپے مہینہ پانے والیوں کو حکم ہوا کہ چونکہ تمہارے بھائی مجرم تھے تمہاری پنشن ضبط۔ بطریق ترحم دس دس روپے مہینہ تم کو ملیگا۔ ترحم یہ ہے تو اتلاف کیا قہر ہوگا میں خود موجود ہوں اور حکام صدر کا روشناس پشم نہیں اکھیڑ سکتا۔ ۵۰ برس کا پنشن۔ تقرر اس کا تجویز لارڈ لیک و بمنظوری گورنمنٹ۔ اور پھر نہ ملا ہے نہ ملیگا • خیر احتمال ہے ملنے کا۔

———✻———

پشم کا لفظ آجکل بے تہذیبی میں داخل سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس زمانہ میں سب لکھتے اور بولتے تھے۔ غالب نے لکھا تو دستور عام کے سبب لکھا

ورنہ ان کی عادت فحش نویسی کی نہ تھی۔

سب کچھ تم اب تو فکر یہ پڑی ہوئی ہے کہ رہیے کہاں۔ اور کھائیے کیا؟ مولانا کا حال معلوم ہوا۔ مرافعہ میں حکم دوامِ حبس بحال رہا۔ بلکہ تاکید ہوئی کہ جلد جزائر شور کی طرف روانہ کرو۔ ان کا بیٹا ولایت میں اپیل چاہتا ہے۔ کیا ہوتا ہے۔ جو ہونا تھا سو ہو لیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ دہلی اردو اخبار کا پرچہ اگر مل جائے تو بہت مفید مطلب ہے۔ ورنہ خیر کچھ محلِ خوف و خطر نہیں ہے۔ حکامِ صدر ایسی باتوں پر نظر نہ کریں گے۔ میں نے سکہ کہا نہیں۔ اگر کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا یہ گناہ نہیں۔ اور اگر گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکہ معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے۔ سبحان اللہ! گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانی اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں؟ ہاں صاحب گولہ انداز کا بہنوئی مددگار ہے اور شاعر کا سالا بھی جانب دار نہیں۔

ایک لطیفہ پرسوں خوب ہوا۔ حافظ مموں بے گناہ ثابت ہو چکے۔ رہائی پا چکے۔ حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں۔ املاک اپنی مانگتے ہیں۔ قبض و تصرف ان کا ثابت ہو چکا ہے۔ صرف حکم کی دیر ہے۔ پرسوں وہ حاضر ہیں۔ مثل پیش ہوئی حاکم نے پوچھا کہ حافظ محمد بخش کون ہے؟ عرض کیا کہ میں۔ پھر پوچھا کہ حافظ مموں کون؟ عرض کیا کہ میں اصل نام میرا محمد بخش ہے۔ مموں مموں مشہور ہوں۔ فرمایا کچھ بات نہیں۔ حافظ محمد بخش بھی تم۔ اور حافظ مموں بھی تم۔ سارا جہان بھی تم۔ جو دنیا میں ہے وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں۔ مثل داخلِ دفتر ہوئی۔ میاں مموں اپنے گھر چلے آئے۔

بات معقول تھی۔ حاکم کو اس کا سمجھنا دشوار نہ تھا کہ حافظ محمد بخش نام تھا اور لوگ مموں مموں کہتے تھے۔ پھر جو جائداد ضبط ہوئی تو غالباً کوئی اور وجہ ہوگی۔ ورنہ اتنی سی بات پر حقدار کو اس کے حق سے محروم کرنا سمجھ میں نہیں آتا۔

احکامِ قضا و قدر

سنا ہے کہ ایک محکمہ نامزد ہوا ہے جو دفعہ نقصان رعایا کے واسطے تجویز ہوا ہے۔ اور حکم یہ ہے کہ جو جمعیت کا مال کالوں نے لوٹا ہے۔ البتہ اس کا معاوضہ بحساب دو آنہ فی روپیہ ہوگا یعنی ہزار روپے کے مانگنے والے کو سو روپے ملیں گے۔ اور جو گوروں کے وقت کی غارتگری ہے وہ مدرآ اور مجمل ہے اس کا معاوضہ نہ ہوگا۔ شاید یہ وہی کمشنر اور مکانات حامد علی خاں تو مدت سے ضبط ہوکر سرکار کا مال ہوگئے۔ باغ کی صورت بدل گئی۔ محلسرا اور کوٹھی میں گورے رہتے تھے۔ اب پھاٹک اور سرتاسر دکانیں گرادی گئیں۔ سنگ خشت کا نیلام کرکے روپیہ داخل خزانہ ہوا جب بادشاہ اودھ کی املاک کا وہ حال ہو تو رعیت کی املاک کون پوچھتا ہے جو احکام کہ دہلی میں صادر ہوئے ہیں وہ احکام قضا و قدر ہیں ان کا مرافعہ کہیں نہیں۔ گویا ہم کبھی کہیں کے رئیس تھے نہ جاہ و حشم[1] رکھتے تھے۔ نہ املاک رکھتے تھے۔

دہلی کی جنگی کے پہلے ملازم

آجکل یہاں پنجاب احاطہ کے بہت حاکم فراہم ہیں۔ پون ٹوٹی کے باب میں کونسل ہوئی۔ پرسوں، ۷ نومبر سے جاری ہوگئی سالگ رام خزانچی چھنامل مہیش داس ان تینوں شخصوں کو یہ کام بطریق امانی سپرد ہوا ہے۔ غلہ اور اُپلے کے سوا کوئی چیز ایسی نہیں کہ جس پر محصول نہ ہو۔ آبادی کا حکم عام ہے۔ خلق کا اژدہام ہے۔ آگے حکم تھا کہ مالکان مکان رہیں کرایہ دار نہ رہیں۔ پرسوں سے حکم ہوگیا کہ کرایہ دار بھی رہیں۔ مگر کرایہ سرکار کو دیں۔ حکام بے پروا مختار کار عدیم الفرصت ہیں پاشکستہ محمد قلی خاں کبھی یہاں کبھی وہاں۔ وقت پر موقوف ہے حکیم احسن اللہ خاں کے مکانات شہر ان کو مل گئے اور یہ حکم ہے کہ شہر سے باہر نہ جاؤ۔ دروازہ سے باہر نہ نکلو اپنے گھر میں بیٹھے رہو۔ نواب حامد علی خان کے مکانات سب ضبط ہوگئے۔ وہ قاضی کے حوض پر کرایہ کے مکانات میں مع ممتوعہ کے رہتے ہیں۔ باہر جانے کا حکم ان کو بھی نہیں۔ مرزا الٰہی بخش کو حکم کرانچی بندر جانے کا ہے۔ انہوں نے زمین پکڑی ہو

---

[1] اس کے معنی معاف اور ناقابل گرفت کے ہیں۔

سلطانجی میں بیٹھے ہیں عذر کر رہے ہیں۔ دیکھئے یہ جبر اٹھ جائے یا یہ خود اٹھ جائیں۔

لالہ سالگرام وچھنا مل صاحب اور مہیش داس صاحب جنکا ذکر یون ٹوٹی کی ابتدائی خدمت میں آیا بعد میں بہت نامور ہوئے۔ مہیش داس کے نام سے ایک محلہ آباد ہے۔ لالہ سالگ رام وچھنا مل کی اولاد نیل کے کٹرہ میں بڑے کر و فر سے رہتی ہے اور دہلی کے اعظم رئیسوں میں اس کا شمار ہے۔ اسکے افراد کی گورنمنٹ میں بڑی عزت ہے خطابات ہیں۔ لاکھوں روپئے سال کی آمدنی ہے بہت صاف ستھرے، گورے چٹے اور قدامت کی شان کے یہ لوگ ہیں۔

تصوف اور نجوم

آرائش مضامین شعر کے واسطے کچھ تصوف کچھ نجوم لگا رکھا ہے۔ ورنہ سوائے موزونی طبع کے یہاں اور کیا رکھا ہے

بھر حال علم نجوم کے قاعدہ کے موافق جب زمانہ کے مزاج میں فساد کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں تب سطح فلک پر یہ شکلیں دکھائی دیتی ہیں جس برج میں یہ نظر آئے اس کا درجہ و دقیقہ دیکھتے ہیں۔ ہزار طرح کی چال ڈالتے ہیں۔ تب ایک حکم نکالتے ہیں۔ شاہجہان آباد میں بعد غروب آفتاب افق غربی شہر پر نظر آتا تھا۔ ادسان دنوں میں آفتاب اول میزان میں تھا۔ تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ صورت عقرب میں ہے۔ درجہ و دقیقہ کی حقیقت نامعلوم رہی۔ بہت دن شہر میں اس ستارہ کی دھوم رہی۔ اب وہ دس بارہ دن سے نظر نہیں آتا بس میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ صورتیں قہر الٰہی کی ہیں۔ اور دلیلیں ملک کی تباہی کی۔ قران النحسین پھر کسوف۔ پھر خسوف پھر یہ صورت پر کدورت۔ عیاذاً باللہ و پناہ بخدا۔ یہاں پہلی نومبر کو بدھ کے دن حسب الحکم حکام کوچہ و بازار میں روشنی ہوئی۔ اور شب کو کمپنی کا ٹھیکہ ٹوٹ جانا اور قلمرو ہند کا بادشاہی عمل لیں آنا سنایا گیا۔

نواب گورنر جنرل لارڈ کیننگ بہادر کو ملکہ معظمہ انگلستان نے فرزند ارجمند

خطاب دیا، اور اپنی طرف سے نائب اور ہندوستان کا حاکم کیا۔ میں قصیدہ پہلے ہی اس تہنیت میں لکھ چکا ہوں۔

میں نے گیارہ مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد غدر نثر بے عبارت فارسی ناآمیختہ بعربی لکھی ہے اور وہ پندرہ سطرے مسطر سے چار جزو ہوا ہے۔ آگرہ کے مفید خلائق مطبع میں چھپنے کو گئی ہے۔ دستنبو اس کا نام رکھا ہے اور اس میں صرف اپنی سرگزشت اور اپنے مشاہدہ کے بیان سے کام رکھا ہے

دلی پر پانچ لشکروں کا حملہ

پانچ لشکر کا حملہ پے در پے اس شہر میں ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر اس میں اہلِ شہر کا اعتبار لٹا۔ دوسرا لشکر خاکیوں کا۔ اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین و آثارِ ہستی سراسر لٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا۔ اس میں ہزارہا آدمی بھوکے مرے۔ چوتھا لشکر ہیضہ کا۔ اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے۔ پانچواں لشکر تپ کا۔ اس میں تاب و طاقت نہ پائی۔ اب تک اس لشکر نے شہر سے کوچ نہیں کیا۔ میرے گھر دو آدمی تپ میں مبتلا ہیں۔ ایک بڑا لڑکا۔ ایک داروغہ۔ خدا ان دونوں کو جلد صحت دے۔

مغل خاں غدر سے کچھ دن پہلے مستسقی ہو کر مر گئے۔ ہے ہے کیونکر لکھوں حکیم رضی الدین خاں کو قتل عام میں ایک خاکی نے گولی ماری۔ اور احمد حسین خان ان کے چھوٹے بھائی اسی دن مارے گئے۔ طالع یار خاں کے دونوں بیٹے ٹونک سے رخصت لیکر آئے تھے۔ غدر کے سبب جا نہ سکے یہیں رہے۔ بعد فتح دہلی دونوں بے گناہوں کو پھانسی ملی۔ طالع یار خان ٹونک میں ہیں۔ زندہ ہیں پر یقین ہے مردہ سے بدتر ہوں گے۔ میر چھوٹم نے بھی پھانسی پائی۔ حال صاحبزادہ میاں نظام الدین کا یہ ہے کہ جہاں سب اکابر شہر کے بھاگ گئے تھے وہاں وہ بھی بھاگ گئے تھے۔ بڑودہ میں رہے اورنگ آباد میں رہے حیدر آباد میں رہے۔ سال گزشتہ یعنی جاڑوں میں یہاں آئے۔ سرکار سے ان کی صفائی ہو گئی لیکن صرف جان بخشی۔

روشن الدولہ کا مدرسہ جو عقب کوتوالی چبوترہ ہے وہ اور خواجہ قاسم کی حویلی جس میں

مغل علی خاں مرحوم رہتے تھے وہ اور خواجہ صاحب کی حویلی یا املاک خاص حضرت کالے صاحب کی اور کالے صاحب کے بعد میاں نظام الدین کی قرار پاکر ضبط ہوئی اور نیلام ہوکر روپیہ سرکار میں داخل ہوگیا۔ ہاں قاسم جان کی حویلی جسکے کاغذ میاں نظام الدین کی والدہ کے نام کے ہیں وہ ان کو یعنی میاں نظام الدین کی والدہ کو مل گئی۔ فی الحال میاں نظام الدین پاک پٹن گئے۔ شاید بھاول پور بھی جائیں گے

غدر کے بعد جب انگریز پنجاب سے فوج لیکر دہلی پر چڑھے تو انکی فوج کی وردی خاکی تھی۔ اس واسطے شہر میں خاکی کا لفظ ایک اصطلاح بن گیا تھا۔ خاکی کا ذکر درحقیقت انگریز کا ذکر سمجھا جاتا تھا۔

میاں نظام الدین صاحب میاں کالے صاحب کے فرزند تھے انکی جائداد اورنگ آباد دکن میں بھی ہے۔ میاں سیف الدین وغیرہ اس پر قابض ہیں۔ چالیس ہزار سالانہ کی آمدنی ہے۔ میاں عبدالصمد صاحب دہلوی نے جو میاں نظام الدین صاحب کے نواسہ ہیں اس جاگیر کا دعوی کیا ہے اور آجکل حیدرآباد میں اس کا مقدمہ چل رہا ہے۔

غدر نہیں خدا کا قہر

غلہ کی گرانی۔ آفت آسمانی۔ امراض دموی بلائے جانی انواع واقسام کے اورام وبثور شائع چارہ ناسودمند وسعی ضائع۔ میں نہیں جانتا کہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو پھر دن چڑھے وہ فوج باغی میرٹھ سے دلی آئی تھی یا خود قہر الٰہی کا پے درپے نزول ہوا تھا۔ بقدر خصوصیت سابق دلی ممتاز ہے ورنہ سرتاسر قلمرو ہند میں فتنہ وبلا کا دروازہ باز ہے۔ انا للہ۔

لوٹ کی کتابیں کھتریوں میں

کتاب کوئی سی ہو اس کا پتہ کیونکر لگے۔ لوٹ کا مال کھتریوں میں بک گیا۔ اور اگر منظر پر بکا تو میں کہاں جو دیکھوں ؎

بروا نفس اندوہ گیتی بسر آرید
گیر ید کہ گیتی ہمہ یکسر بسر آمد

یہاں کا قصہ مختصر یہ ہے کہ قصہ تمام ہوا۔

غدر کے بعد ایک چھوٹا سا فساد

دلی کا حال تو یہ ہے کہ

گھر میں تھا کیا جو ترا غم اُسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

یہاں دھرا کیا ہے جو کوئی لوٹے گا۔ چند روز گوروں نے اہلِ بازار کو ستایا تھا اہلِ قلم اور اہلِ فوج نے باتفاق رائے ہمدگر ایسا بندوبست کیا کہ وہ فساد مٹ گیا۔ اب امن و امان ہے۔

میاں کالے صاحب کی خانہ ویرانیاں

حضرت شیخ کا کلام اور صاحبزادہ شاہ قطب الدین

ابن مولانا فخر الدین کا بھلا حال؟ ایں دفتر راگاؤ خورد وگاؤ را قصاب برد و قصاب در راہ مُرد۔ بادشاہ کے دم تک یہ باتیں تھیں۔ خود میاں کالے صاحب کا گھر اس طرح تباہ ہوا کہ جیسے جھاڑو دی۔ کاغذ کا پرزا سوئے کا تار پشمینہ کا بال باقی نہ رہا۔ شیخ کلیم اللہ جہان آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا مقبرہ اُجڑ گیا۔ کیا ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی ان کی اولاد کے لوگ تمام اس موضع میں سکونت پذیر تھے۔ اب ایک جنگل ہے اور میدان میں قبر۔ اسکے سوا کچھ نہیں وہاں کے رہنے والے اگر گولی سے بچے ہونگے تو خدا ہی جانتا ہوگا کہ کہاں ہیں۔ ان کے پاس شیخ کا کلام بھی تھا۔ کچھ تبرکات بھی تھے اب جب یہ لوگ ہی نہیں تو کس سے پوچھوں کیا کروں کہیں سے یہ مدعا حاصل نہ ہو سکیگا۔

حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادی کا مزار پریڈ کے میدان میں جامع مسجد کے شرق کی طرف دو سو قدم کے فاصلے پر میدان میں واقع ہے۔ پہلے چونہ کا چبوترہ تھا اب سید عبد الغنی کلیمی سجادہ نشین کی سعی سے سنگِ مرمر کی سلیں فرش میں لگائی گئی ہیں۔ یہ علاقہ اب تک فوجی قبضہ میں ہے اور یہاں سایہ کی جگہ بنانے کا حکم نہیں ہے۔ نمازی اور زائر نماز و زیارت کے وقت دھوپ کی تکلیف اٹھاتے ہیں۔ پہلے یہاں بڑی بڑی عمارتیں تھیں۔ حضرت شیخ کلیم اللہ سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے بڑے نامور اور

صاحب تصنیف بزرگ گزرے ہیں۔ تفسیر کلیمی۔ مرقع۔ کشکول کلیمی۔ عشرۂ کاملہ۔ مالا بدفی التصوف، مکتوبات کلیمی وغیرہ ان کی یادگار کتابیں ہیں۔ حضرت شیخ یحییٰ مدنی چشتی کے خلیفہ تھے۔ اور حضرت نظام الدین اورنگ آبادی انہی کے خلیفہ اورنگ آباد میں مدفون ہیں

میاں کالے صاحب کا نام میاں نصیر الدین تھا جو میاں قطب الدین صاحب کے بیٹے اور حضرت مولانا فخر الدین صاحب کے پوتے تھے۔ بہادر شاہ ان کی بہت عزّت کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے والد کے مرید اور دادا کے منظور نظر تھے۔ ملکہ بیگم ایک شہزادی سے انہوں نے نکاح بھی کیا تھا۔ قاسم جان کی گلی میں حکیم اجمل خاں صاحب کے محلہ سے غرب کی طرف کالے صاحب کی حویلی مشہور رہے جس میں آجکل پنجابی تاجر دہلی کے رہتے ہیں۔ یہ انہی کی تھی۔ اور غدر میں ضبط ہوئی۔ کوتوالی اور سنہری مسجد کے قریب بھی ان کی جائداد کا ذکر غالب نے کیا ہے۔ اب ان کے نواسہ میاں عبدالصمد صاحب پنڈت کے کوچہ میں رہتے ہیں اور دہلی کے فقرا میں مشہور درویش ہیں۔

دہلی کے مفتی اعظم کی بیچارگی

جناب مولوی صدر الدین صاحب بہت دن حوالات میں رہے۔ کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔ روبکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبان کورٹ نے جان بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف۔ جائداد ضبط۔ ناچار خستہ وتباہ لاہور گئے۔ فنانشل کمشنر اور لفٹنٹ گورنر نے ازراہ ترحم نصف جائداد واگزاشت کی۔ اب نصف جائداد پر قابض ہیں۔ اپنی حویلی میں رہتے ہیں۔ کرایہ پر معاش کا مدار ہے۔ اگرچہ یہ امداد ان کے گزارے کو کافی ہے کس واسطے کہ ایک آپ اور ایک بی بی تیس ۳۰ چالیس ۴۰ روپیہ کی آمد۔ لیکن چونکہ امام بخش چپراسی کی اولاد ان کی عترت ہے اور وہ دس بارہ آدمی ہیں۔ لہذا فراغ بالی سے نہیں گزرتی۔ ضعف پیری نے بہت گھیر لیا ہے۔ عشرۂ ثامنہ کے اواخر میں ہیں خدا سلامت رکھے بہت

غنیمت ہیں +

مفتی صدر الدین صاحب صدر الصدور دہلی کے اکابر علماء شرفا میں تھے۔ حویلی صدر الصدور کا تختہ اب بھی میونسپل کمیٹی کی طرف سے لکھا ہوا ایک دیوار پر نظر آتا ہے۔ اور جاننے والے کو رلاتا ہے ٹیامحل کے سامنے ان کا مکان تھا جس میں خان بہادر غلام محمد حسن خاں رحمہ اللہ مرحوم کی سکونت تھی اور اب ان کی اولاد رہتی ہے

اللہ اللہ مسلمانوں کی غربا پروری کس شان کی تھی کہ لٹنے اور مٹائے جانے کے بعد بھی جبکہ نوّے برس کے قریب عمر تھی اور صرف چالیس روپے مہینہ گزر اوقات کے لئے باقی بچا تھا۔ مگر اپنے چپراسی کے کنبہ کو پالتے تھے۔

گردش ایام کا قیدی لفافہ بناتا تھا

اللہ اللہ! یہ دن بھی یاد رہیں گے مجھکو اکثر اوقات لفافے بنانے میں گزرتے ہیں۔ اگر خط نہ لکھوں گا تو لفافے بناؤں گا۔ غنیمت ہے کہ محصول آدھ آنہ ہے ورنہ مزہ معلوم ہوتا۔

بقیۃ السیف کا فکر

بعد قتل ہونے دس آدمی کے کہ دو اس میں عزیز بھی تھے۔ یہ سب وہاں سے نکالے گئے۔ مگر صورت نہیں معلوم کہ کیونکہ نکلے پیادہ یا سوار تھے۔ تنگدست یا مالدار مستورات کو تو رتھیں دیدی تھیں۔ ذکور کا حال کیا ہوا۔ اور پھر وہاں سے نکلنے کے بعد کیا ہوا اور کہاں رہے۔ سرکار انگریزی کی طرف سے مورد تفقد و ترحم ہیں یا نہیں۔ رنگ کیا نظر آتا ہے جبر کسر کی توقع ہے یا نہیں۔ یہ سب اللہ کو معلوم ہے +

اب کوئی دوست میرے سامنے نہ مرے

یا اللہ اب ان احباب میں سے کوئی میرے سامنے نہ مرے۔ کیا معنی کہ جو میں مروں کوئی میرا یاد کرنے والا۔ اور مجھ نے والا بھی

تو دنیا میں ہو۔ مصطفیٰ خاں خدا کرے مرافعہ میں چھوٹ جائے ورنہ حبس ہفت سالہ کی تاب اس نازپروردہ میں کہاں۔ احمد حسین میکش مخنوق ہوا یعنی پھانسی پائی، گویا اس نام کا آدمی شہر میں تھا ہی نہیں۔ پنشن کی درخواست دے رکھی ہے بشرط اجرا بھی میرا کیا گزارہ ہوگا ہاں دو باتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ میری صفائی اور بے گناہی کی دلیل ہے، دوسرے یہ کہ موافق قول عوام چوہے ولدر نہ ہوگا

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ بے نظیر شاعر اور خاندانی امیر تھے۔ نواب محمد اسحٰق خان مرحوم سابق سکریٹری علی گڑھ کالج ان کے صاحبزادہ تھے جنہوں نے ان کے کلام کا مجموعہ چھاپا ہے اور جو حلقۂ شبلیؒ دہلیؒ میں بکتا ہے اس مجموعہ میں غدر کے حالات بھی ہیں اور رہائی کا تذکرہ بھی ہے۔ نواب مصطفیٰ خان اور ان کے لڑکے نواب محمد اسحٰق خاں اپنے خاندان سمیت درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ میں دفن ہیں درگاہ کی بڑی مسجد کے گوشہ شمال اور سماع خانہ کے غرب میں یہ قبرستان واقع ہے سب کتبے لگے ہوئے ہیں۔

جب شراب پر پہرہ لگا

یہاں کا حال۔ ع زمین سخت ہے آسماں دور ہے، جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ تونگر غرور سے مفلس سردی سے اکڑ رہا ہے۔ آبکاری کے بندوبست جدید نے مارا۔ عرق کے نہ کھینچنے کی قید شدید نے مارا۔ ادھر انسداد دروازہ آبکاری ہے۔ ادھر ولایتی عرق کی قیمت بھاری ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولوی فضل رسول صاحب حیدرآباد گئے ہیں۔ مولوی غلام امام شہید آگے سے وہاں ہیں۔ محی الدولہ محمد یار خاں سورتی نے ان صورتوں کو وہاں بلایا ہے۔ پر یہ نہ معلوم کہ وہاں ان کو کیا پیش آیا ہے۔

دوستوں سے ملنے میں دشواری تھی

حکیم صاحب پرسے وہ سپاہی جوان پر متعین تھا، اٹھ گیا۔ اور

ان کو حکم ہو گیا کہ اپنی وضع پر رہو۔ مگر شہر میں رہو باہر جانے کا اگر قصد کرو تو پوچھ کر جاؤ۔ اور ہر ہفتہ میں ایک بار کچہری میں حاضر ہوا کرو۔ چنانچہ وہ کچے باغ کے پچھواڑے مرزا جاگن کے مکان میں آ رہے۔ صفدر میرے پاس آیا تھا یہ اس کی زبانی ہے جی ان کے دیکھنے کو چاہتا ہے مگر از راہ احتیاط جا نہیں سکتا۔ مرزا بہادر بیگ نے بھی رہائی پائی۔ اب اس وقت سنا ہے کہ وہ خانصاحب کے پاس آئے ہیں یقین ہے کہ بعد ملاقات باہر چلے جائیں گے۔ یہاں نہ رہیں گے۔

مٹنے والوں کے گھروں میں کون رہتا تھا

قاسم جان کی گلی میر خیراتی کے پھاٹک سے فتح اللہ بیگ خاں کے پھاٹک تک بے چراغ ہے۔ ہاں اگر آباد ہے تو یہ ہے کہ غلام حسن خاں کی حویلی ہسپتال ہے اور ضیاء الدین خاں کے کمرہ میں ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں اور کالے صاحب کے مکانوں میں ایک اور صاحب عالیشان انگلستان تشریف رکھتے ہیں۔ ضیاء الدین خاں اور انکے بھائی مع قبائل اور عشائر لوہارو میں لال کنوئیں کے محلہ میں خاک اڑتی ہے آدمی کا نام نہیں ایسی کی دکان میں کتے لوٹتے ہیں۔

مجھے عوام کے نقشہ میں نہ لکھ

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے۔ اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازہ کا تھانہ دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے جو باہر کے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں پانچ پانچ بید لگتے ہیں۔ یا دو دو روپیہ جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔ اس سے علاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جمعدار میرے پاس بھی آیا۔ میں نے کہا بھائی! تو مجھے نقشے میں نہ رکھ۔ میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ۔ عبارت یہ کہ اسد اللہ خاں پنشن دار ۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیالے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔ نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا اور نہ گوروں کے زمانے میں نکلا۔ اور نکالا گیا کرنیل براؤن صاحب بہادر کے زبانی حکم پر اس کی اقامت کا مدار ہے۔ اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا۔ اب حاکم

وقت کو اختیار ہے۔ پرسوں یہ عبارت جمعدار نے نقشہ کے ساتھ کوتوالی میں بھیجدی ہے۔ کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان دوکان کیوں بناتے ہیں۔ جو مکان بن چکے ہیں انہیں ڈھادو اور آیندہ کو ممانعت کا حکم سُنادو اور یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے بقدر مقدور نذرانہ دے۔ اس کا اندازہ مقرر کرنا حاکم کی رائے پر ہے۔ روپیہ دے اور ٹکٹ لے۔ گھر برباد ہو جائے۔ آپ شہر میں آباد ہو جائیے آج تک یہ صورت ہے۔ دیکھئے شہر کے بسنے کی کون صورت ہے جو رہتے ہیں وہ بھی اخراج کئے جاتے ہیں۔ یا جو باہر پڑے ہوئے ہیں وہ شہر میں آتے ہیں الملک للہ والحکم للہ +

کیسی بیکسی میں وہ لوگ تھے جنہوں نے غدر کے بعد کا م یہ دم گھوٹنے والا تماشہ دیکھا۔ او۔ کیسے نادان ہم لوگ ہیں کہ پھر بے امنی کی تمنا کرتے ہیں۔ انسان متلون مزاج اور جلدی بھول جانے والا واقع ہوا ہے۔ امن کی برابر دنیا میں کوئی چیز اچھی نہیں ہے۔

سوسائٹی کی بربادی کا ماتم

اس چرخ کجرفتار کا برا ہو۔ ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ ملک و مال۔ جاہ جلال کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ایک گوشہ و توشہ تھا۔ چند مفلس و بے نوا ایک جگہ فراہم ہو کر کچھ ہنس بول لیتے تھے ؎

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک
اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

یہ شعر خواجہ میر درد کا ہے۔ کل سے مجھ کو میکش بہت یاد آتا ہے۔ وہ صحبتیں اور تقریریں۔ آنسوؤں سے پیاس نہیں بجھتی۔ یہ تحریر تلافی اس تقریر کا نہیں کر سکتی۔

میکش کے پھانسی پانے کے بعد عالمِ غم حالم میں یہ تحریر لکھی گئی ہے
ہائے کتنا درد حروف کے کلیجہ میں بھرا ہے پڑھکر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

دلی سے انتہائی محبت اسکے اجڑنے کی خاک بھی آنکھوں میں

آنکھوں کے غبار کی وجہ یہ ہے کہ جو مکان ٹوٹ گئے، اجڑ گئے اور جہاں جہاں سرنگیں نکلیں جتنی گرد اٹھی اس سب کو از راہ محبت اپنی آنکھوں میں جگہ دی۔

دہلی سے محبت کرنے کی یہ انتہائی مثال غالب نے لکھی ہے۔ کہ آنکھیں دُکھنے آئیں تو اس کا سبب یہ قرار دیا کہ دہلی کے مکان اجاڑے گئے اور انکے مٹنے سے خاک اڑی تو اس کو آنکھوں میں جگہ دی۔ گویا اسکے اثر سے آنکھیں دُکھنے لگیں۔

اپنے وطن سے محبت اس طرح کیا کرتے ہیں۔ کوئی آجکل کے محبان وطن کو غالب کے یہ چند لفظ سنادے۔

غالب کو کنوؤں کا غم

اب اہل دہلی ہندو ہیں یا اہل حرفہ ہیں۔ یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں۔ یا گورے ہیں۔ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں خس کی ٹٹی، پروا ہوا۔ اب کہاں؟ لطف تو وہ اسی مکان میں تھا۔ اب میر خیراتی کی حویلی میں وہ چھت اور سمت بدلی ہوئی ہے بہر حال میگزرہ مصیبت عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہو گیا۔ لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری ہو گئے۔ خیر کھاری ہی پانی پیتے۔ گرم پانی نکلتا ہے پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا مسجد جامع سے راجگھاٹ دروازہ تک، بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو کا مکان ہو جائے۔ مرزا گوہر کے باغیچہ کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ باغیچہ کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا فصیل کے کنگورے کھلے رہتے ہیں۔ باقی سب اٹ گیا۔ آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازہ سے کابلی دروازہ تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ دھوبی واڑہ، رامجی گنج سعادت خاں کا کٹرہ جرنیل کی بی بی کی حویلی رام جی داس گودام والی

کے مکانات صاحب رام کا باغ حویلی ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ دلی والے ابتک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں واہ رے حسن اعتقاد اردو بازار نہ رہا اردو کہاں۔ دلی کہاں۔ واللہ اب شہر نہیں ہے کیمپ ہے۔ چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ نہ شہر۔ نہ بازار۔ نہ نہر +

اس عبارت میں غالب نے دہلی کی اُن شاندار عمارات کی بربادی کا نقشہ کھینچا ہے جن میں سے اکثر کے نام سے بھی اب دہلی والے واقف نہیں۔ اور میں بھی نہیں بتا سکتا کہ وہ کہاں تھیں۔

معلوم ہوتا ہے غالب کو سب سے زیادہ کنوؤں کے بند کر دینے کا صدمہ ہے۔ وہ یہ سنکر کہ کنوئیں بند کئے جا رہے ہیں خود گھر سے نکلے تاکہ اپنی آنکھ سے دیکھیں۔ حالانکہ ان کا گھر سے نکلنا آجکل کی طرح کوئی معمولی بات نہ تھی۔ مشرق والے خصوصاً ہندوستان اور دہلی والے کنوؤں کے پانی کو بہت پسند کرتے ہیں اور انکو نلوں کے پانی سے کسی قسم کی محبت نہیں ہے۔ حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم بھی ایک جگہ لکھتے ہیں۔

حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا — پانی پینا پڑا ہے پائپ کا۔

پیٹ چلتا ہے۔ آنکھ آئی ہے — شاہ ایڈورڈ کی دہائی ہے

انگریزوں نے حفظِ صحت کے خیال سے کنوئیں بند کئے تھے کہ ان کا پانی جلد خراب ہو جاتا ہے۔ مگر اہل مشرق اپنی پرانی عادات کے خلاف کسی مصلحت کو قبول کرنا نہیں چاہتے۔

تحریر کے شروع میں غالب نے دہلی کی آبادی کے بارہ میں یہ لکھا ہے کہ غدر کے بعد ایسی جماعتیں وہاں آکر آباد ہو گئی تھیں جنکو زبان اور تہذیب و علم سے کچھ سروکار نہ تھا۔ اس لئے آجکل دہلی کی بگڑی ہوئی زبان پر اعتراض کرنا بھی فضول ہے کہ یہ زبان اہل دہلی کی نہیں ہے

دہلی سے انتہائی محبت اسکے اجڑنیکی خاک بھی آنکھوں میں

آنکھوں کے غبار کی وجہ یہ ہے کہ جو مکان دلی میں ڈھائے گئے اور جہاں جہاں سڑکیں نکلیں جتنی گرد اٹھی اس سب کو از راہ محبت اپنی آنکھوں میں جگہ دی۔

دہلی سے محبت کرنے کی یہ انتہائی مثال غالب نے لکھی ہے۔ کہ آنکھیں دُکھنے آئیں تو اس کا سبب یہ قرار دیا کہ دہلی کے مکان اجاڑے گئے اور اسکے مٹنے سے خاک اڑی تو اس کو آنکھوں میں جما لیا۔ گو اسکے اثر سے آنکھیں دکھنے لگیں۔

اپنے وطن سے محبت اس طرح کیا کرتے ہیں۔ کوئی آجکل کے محبان وطن کو غالب کے یہ چند لفظ سنادے۔

غالب کو کنوؤں کا غم

اب اہل دہلی ہندو ہیں یا اہل حرفہ ہیں۔ یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں۔ یا گورے ہیں۔ لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی باقی ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں خس کی ٹٹی۔ پُروا ہوا۔ اب کہاں؟ لطف تو وہ اسی مکان میں تھا۔ اب میر خیراتی کی حویلی میں وہ چھت اور سمت بدلی ہوئی ہے بہرحال بیگذرد۔ مصیبت عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہوگیا۔ لال ڈگی کے کنوئیں یک قلم کھاری ہوگئے۔ خیر کھاری ہی پانی پیتے۔ گرم پانی نکلتا ہے پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا مسجد جامع سے راجگھاٹ دروازہ تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو کا مکان ہو جائے۔ مرزا گوہر کے باغیچہ کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ باغیچہ کے صحن کے برابر ہوگیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہوگیا فصیل کے کنگورے کھلے رہتے ہیں۔ باقی سب اَٹ گیا۔ آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازہ سے کابلی دروازہ تک میدان ہوگیا۔ پنجابی کٹرہ دھوبی واڑہ، رامجی گنج سعادت خاں کا کٹرہ جرنیل کی بی بی کی حویلی رام جی داس گودام والی

کے مکانات صاحب رام کا باغ حویلی ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ اللہ دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں واہ رے حسن اعتقاد ارے و بازار نہ رہا اردو کہاں۔ دلی کہاں۔ واللہ اب شہر نہیں ہے کیمپ ہے۔ چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ نہ شہر۔ نہ بازار۔ نہ نہر +

اس عبارت میں غالب نے دہلی کی اُن شاندار عمارات کی بربادی کا نقشہ کھینچا ہے جن میں سے اکثر کے نام سے بھی اب دہلی والے واقف نہیں۔ اور میں بھی نہیں بتا سکتا کہ وہ کہاں تھیں۔

معلوم ہوتا ہے غالب کو سب سے زیادہ کنوؤں کے بند کر دینے کا صدمہ ہے۔ وہ یہ سن کر کہ کنوئیں بند کئے جا رہے ہیں خود گھر سے نکلے تاکہ اپنی آنکھ سے دیکھیں۔ حالانکہ ان کا گھر سے نکلنا آجکل کی طرح کوئی معمولی بات نہ تھی۔ مشرق والے خصوصاً ہندوستان اور دہلی والے کنوؤں کے پانی کو بہت پسند کرتے ہیں اور نلوں کے پانی سے کسی قسم کی محبت نہیں ہے۔ حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم بھی ایک جگہ لکھتے ہیں۔

حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا — پانی پینا پڑا ہے پائپ کا۔
پیٹ چلتا ہے۔ آنکھ آئی ہے — شاہ ایڈورڈ کی دُہائی ہے

انگریزوں نے حفظِ صحت کے خیال سے کنوئیں بند کئے تھے کہ ان کا پانی جلد خراب ہو جاتا ہے۔ مگر اہل مشرق اپنی پرانی عادات کے خلاف کسی مصلحت کو قبول کرنا نہیں چاہتے۔

تحریر کے شروع میں غالب نے دہلی کی آبادی کے بارے میں سچ لکھا ہے کہ غدر کے بعد ایسی جماعتیں وہاں آکر آباد ہو گئی تھیں جنکو زبان اور تہذیب و علم سے کچھ سروکار نہ تھا۔ اس لئے آجکل دہلی کی بگڑی ہوئی زبان پر اعتراض کرنا بھی فضول ہے کہ یہ زبان اہل دہلی کی نہیں ہے

وہ تو پھانسی پاگئے اور جو لوگ یہ زبان بولتے ہیں وہ دہلی والے نہیں ہیں پردیسی ہیں ۔

—— ✻ ——

دہلی کی بہاروں کا فشار اور غالب کی آہ شرربار

دہلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ چاندنی چوک۔ ہر روز مجمع بازار مسجد جامع کا ہر ہفتہ سیر جمنا کے پل کی ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلی کہاں۔ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔ نواب گورنر جنرل بہادر ۱۵ دسمبر کو یہاں داخل ہوں گے۔ دیکھئے کہاں اترتے ہیں اور کیونکر دربار کرتے ہیں آگے کے درباروں میں سات جاگیردار تھے کہ جن کا الگ الگ دربار ہوتا تھا جھجر بہادر گڈھ۔ بلب گڈھ۔ فرخ نگر۔ دوجانہ۔ پاٹودی۔ لوہارو۔ چار معدوم محض ہیں جو باقی رہے اسمیں سے دوجانہ و لوہارو تحت حکومت ہانسی حصار پاٹودی حاضر۔ اگر ہانسی حصار کے صاحب کمشنر بہادر ان دونوں کو یہاں لے آئے تو تین رئیس ورنہ ایک رئیس۔ دربار عام والے مہاجن لوگ سب موجود۔ اہل اسلام میں سے صرف تین آدمی باقی ہیں میرٹھ میں مصطفٰے خاں سلطان جی میں مولوی صدرالدین خاں۔ بلی ماروں میں سگ دنیا موسوم باسد تینوں مردود و مطرود و محروم و مغموم

توڑ بیٹھے جبکہ ہم جام و سبو پھر ہمکو کیا   آسمان سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

جان نثار خاں کے چھتے کا ڈھنا۔ خان چند کے کوچہ کا سڑک بننا۔ بلاقی بیگم کے کوچہ کا مسمار ہونا۔ جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز میدان نکلنا۔ اور غالب افسردہ دل۔

—— ✻ ——

دہلی کی پانچ بہاروں کا کس درد سے ذکر کرتے ہیں۔ چاندنی چوک کی وہ رونق جاتی رہی۔ قلعہ میں گورے آباد ہو گئے جمنا کے پل کی سیر کا اب کسی کو خیال بھی نہیں آتا۔ پہلے وہاں آٹھویں دن میلہ لگتا تھا جامع مسجد کے سامنے شام کو اب بھی بازار لگتا ہے۔ مگر پہلی سی بہار نہیں پھول والوں کی سیر اب بھی سال بسال ہوتی ہے لیکن اگلی سی آن بان کہاں۔

جھجر والے نواب اور بلب گڑھ کے راجہ نے غدر کے بعد دہلی میں پھانسی پائی جھجر ضلع رہتک میں شامل ہوا۔ اور بہادر گڑھ بھی اور بلب گڑھ ضلع گڑگانوہ کو دیدیا گیا۔

یہ عبارت غالباً ۱۸۵۸ء کے آخر میں لکھی گئی ہے۔ کیونکہ گورنر نے میرٹھ میں دربار دسمبر ۱۸۵۸ء میں کیا تھا جس کا ذکر غالب نے کیا ہے۔

آخر کی عبارت اس قدر دردناک ہے کہ پتھر کا کلیجہ رکھنے والا بھی بے اختیار رو دیگا۔ خبر نہیں غالب کے دل پر کیا کیا اثر یہ انقلابات پیدا کرتے ہونگے جب ہی تو ان کے قلم سے یہ مجروح کرنے والے الفاظ نکلے

برٹش طرز حکومت پر چوٹ

سنتے ہیں کہ نومبر میں مہاراجہ کو اختیار ملیگا مگر وہ اختیار ایسا ہوگا۔ جیسا خدا نے خلق کو دیا ہے۔ سب کچھ اپنے قبضۂ قدرت میں رکھا۔ آدمی کو بدنام کیا ہے۔

یہاں مہاراجہ الور کے اختیار کا ذکر کرتے ہیں۔ مگر برطانی آئین سلطنت پر ایک پرلطف ضرب بھی لگاتے ہیں۔ کہ وہ والیان ریاست کو ایسا اختیار دیتا ہے جیسا خدا نے بندوں کو اختیار دیا ہے۔ کہ مجبور بھی ہیں اور مختار بھی غالب نے اُس وقت یہ عبارت لکھی کہ مشرقی آئین سلطنت لوگوں کے دل و دماغ پر مسلط تھے اور خلقت انہی کو اچھا سمجھتی تھی۔ آج وہ زندہ ہوتے تو مان جاتے کہ پرانا دستور امن کے لئے اتنا مفید نہ تھا جتنا نیا آئین ثابت ہوا۔ والیان ریاست کو مطلق العنان کر دینے کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہ ہمیشہ بغاوتیں کرتے رہتے تھے۔ اور سلطنت کو بھی دشواریاں پیش آتی تھیں اور رعایا بھی تباہ ہوتی تھی۔ انگریزوں کے آئین جدید نے اس خرابی کا قطعی سدباب کر دیا۔ اور اب غدر ۱۸۵۷ء کے بعد سے کسی ریاست کو سرکشی و بغاوت کا حوصلہ نہ ہو سکا

در ملک میں امن قایم ہوگیا اس واسطے ہر شخص برٹش آئین کے اس عاقلانہ حصہ کو امن کے خیال سے پسند کرتا ہے اور یہ برائی کی چیز نہیں سمجھی جاتی۔

تاج محل کی رہائی

چوک میں بیگم کے باغ کے دروازہ کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا اس میں سنگ وخشت وخاک ڈال کر بند کر دیا بلیماروں کے دروازہ کے پاس کئی دوکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر لیا شہر کی آبادی کا حکم خاص وعام کچھ نہیں ہے پنشن داروں سے حاکموں کا کام کچھ نہیں۔ تاج محل۔ مرزا قیصر۔ مرزا جوان بخت کے سالے ولایتعلی بیگ اور جیبو کی زوجہ ان سب کی الٰہ آباد سے رہائی ہوگئی۔ دیکھئے کیمپ میں رہیں یا لندن جائیں۔ خلق نے از روئے قیاس جیسا کہ دلی کے خبر تراشوں کا دستور ہے یہ بات اڑادی ہے۔ سو سارے شہر میں مشہور ہے کہ جنوری شروع سال ۱۸۵۹ء میں عموماً شہر میں آباد کئے جاویں گے۔

یہ عبارت ۱۲ر دسمبر ۱۸۵۸ء کی لکھی ہوئی ہے۔ تاج محل بہادر شاہ کی بیگم تھیں۔ زینت محل کا کمرہ لال کنوئیں اور فراش خانہ کے وسط میں میر بازار واقع ہے۔ اسکے شاندار دروازہ پر بہادر شاہ کی کہی ہوئی اور خاص ان کی ہاتھ کی لکھی ہوئی تاریخ کندہ ہے۔ یہ عالیشان عمارت آجکل مہاراجہ پٹیالہ کے قبضہ میں ہے۔ غدر کے ایام میں جو امداد انہوں نے انگریزی فوج کی کی تھی اس کے انعام میں یہ مکان ان کو دیا گیا تھا۔

تاج محل کا خوبصورت مکان کترہ خوش حال رائے میں تھا کہ جو ہندوؤں کے مشہور محلہ مالی واڑہ کے قریب واقع ہے۔ یہ مکان اب بھی موجود ہے اور اس میں دہلی کے مشہور رسا ہوکار لالہ رام کشن داس

رہتے ہیں جن کے ہاں چاندی سونے کا بیپار ہوتا ہے۔ لالہ صاحب نے اس کی قدامت کی خوبصورتی کو بھی باقی رکھا ہے اور جدید خوشنما اضافے بھی کئے ہیں۔ مگر زینت محل کے کمرہ میں ریاست پٹیالہ نے کوئی ترقی نہیں کی بلکہ سابق کے آثار میں بھی بوسیدگی واقع ہو رہی ہے اور یہ تاریخی مکان چند دن کا مہمان ہے۔

جامع مسجد کی رہائی

مسجد جامع واگزاشت ہوئی چنتی قبر کی طرف سیڑھیوں پر کباہیوں نے دو دکانیں بنالیں۔ انڈا مرغی، کبوتر بکنے لگا۔ دس آدمی مہتمم ٹھہرے مرزا الٰہی بخش۔ مولوی صدر الدین۔ تفضل حسین خان یہ تین یہ۔ سات اور۔ ۔ نومبر ۱۸۶۲ء ۱۲ جمادی الاول سال حال جمعہ کے دن ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ و قید جسم سے رہا ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جامع مسجد دہلی کے واگزاشت کرانے میں خان بہادر شیخ الٰہی بخش جو سی آئی ای مرحوم رئیس میرٹھ نے دو لاکھ روپیہ یا اسی کے قریب سرکار کو دیا تھا جب ان کو رہا کیا گیا تھا۔ فتح دہلی کے بعد جامع مسجد میں گورے سپاہی رہتے تھے۔

جامع مسجد ایام غدر میں باغیوں کا مرکز سمجھی گئی تھی جب انگریزی فوج نے پہلا دھاوا شہر پر کیا تو وہ جامع مسجد تک آگئی تھی۔ مگر جمعہ کی نماز کے لئے جو مسلمان اس وقت وہاں جمع ہوئے تھے انہوں نے باہر نکل کر فوج سے مقابلہ کیا۔ اور ایسے لڑے کہ فوج کو کشمیری دروازہ تک واپس جانا پڑا اور دوسرے دن دوبارہ حملہ کر کے دہلی فتح کرلی۔ جمعہ کی لڑائی میں میرے والد موجود تھے۔ ان سے میں نے یہ قصہ سنا اور یہی وجہ جامع مسجد کے فوجی قبضہ کی تھی۔

میکش پھانسی سے پہلے

میکش چین میں ہے۔ بائین بناتا پھرتا ہی سلطانجی میں تھا اب شہر میں آگیا ہے۔ دو تین بار میرے پاس بھی آیا۔ پانچ سات دن سے نہیں آیا۔ کہتا تھا بی کو لڑکے کو بہرام پور میر وزیر علی کے پاس بھیجدیا ہے۔ خود یہاں لوٹ کی کتابیں خریدتا پھرتا ہے۔

یہ تحریر اس وقت کی ہے جبکہ میکش زندہ تھے۔ اور غدر کی شرکت کا ان پر الزام نہ لگایا گیا تھا۔ درگاہ حضرت سلطان جیؒ میں رہتے تھے۔ مگر بعد میں ان کو بغاوت کے شبہ میں گرفتار کیا گیا۔ اور پھانسی دی گئی۔ اسی روزنامچہ میں غالب نے کہیں اس کا ذکر کیا ہے۔

میکش کے باپ گولی سے قتل ہوئے اور ان کو پھانسی دی گئی۔

کشمیری کٹڑہ کی مسماری

کشمیری کٹڑہ گر گیا ہے، وہ اونچے اونچے در، اور وہ بڑی بڑی کوٹھریاں دو رویہ نظر نہیں آتیں کہ کیا ہوئیں۔

پریڈ کے میدان کو دربار ۱۹۱۱ء کے ایام میں جب ہموار کیا جارہا تھا تو سینکڑوں مکانات کے آثار دبے ہوئے نکلتے تھے۔ یہاں تک کہ چارپائیوں کے پایہ آٹا گوندھنے کے کونڈے اور گھروں کے برتنے کی چیزیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب یہاں کے بازار اور محلّے مسمار کئے گئے تو رہنے والوں کا سامان بھی اسی میں دب گیا۔

خیال یہ تھا کہ گنجان محلوں اور بازاروں کا توڑنا ہوا صاف کرنے کے لئے تھا۔ مگر ۱۹۱۱ء میں یہ نشانیاں دیکھکر کہا جاتا تھا کہ مسماری جوش انتقام سے بھی تعلق رکھتی تھی۔ جب ہی تو اس بے دردی سے خانہ داری کے اسباب کو بھی ملیامیٹ کر دیا گیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ غالب جب اس

تباہی کا ذکر کرتے ہیں تو ان کا قلم آنسو بہاتا جاتا ہے۔

جب دہلی پر ٹیکس لگائے گئے

شہر میں "پون ٹوٹی" کوئی چیز ہے وہ جاری ہو گئی ہے۔ سوائے اناج اور اُپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں جس پر محصول نہ لگا ہو۔ جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فیٹ گول میدان نکلے گا۔ دکانیں۔ حویلیاں ڈھائی جاویں گی۔ دارالبقا فنا ہو جائے گی۔ رہے نام اللہ کا۔ خان چند کا کوچہ شاہ بولا کے بڑ تک ڈھئے گا۔ دونوں طرف پھاوڑہ چل رہا ہے ۔

. پون ٹوٹی (چنگی) کوئی چیز ہے۔ کہکر غالب نے تڑپا دیا۔ طعن کا نہایت پر لطف انداز ہے۔ سوائے اناج اور اپلے کے ہر چیز پر ٹیکس (محصول) لگ جانا غالب جیسے شخص نے یقیناً نہایت حقارت سے محسوس کیا ہو گا چار پانچ فقروں میں نئی حکومت کے طرز حکمرانی کو بیان کر دینا غالب ہی کا کام تھا۔

دہلی کے غارت شدہ بازار

شہر ڈھ رہا ہے۔ بڑے بڑے نامی بازار خاص بازار۔ اردو بازار اور خانم کا بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا اب پتہ بھی نہیں کہ کہاں تھے صاحبان امکنہ و دکاکین نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور دکان کہاں تھی۔ برسات بھر منہ نہیں برسا۔ آب تیشہ اور کلند کی طغیانی سے مکانات گر گئے۔ غلہ گراں ہے۔ موت ارزاں ہے۔ موے کے مول اناج بکتا ہے۔ ماش کی دال آٹھ سیر۔ باجرہ۔ بارہ سیر گیہوں ۱۳ سیر۔ چنے ۱۶ سیر گھی ۱⅟۲ سیر۔

یہ تینوں بازار دریا گنج (فیض بازار) کی سڑک کے خاتمہ سے شروع ہوتے تھے۔ جہاں اب پریڈ باغ۔ ایڈورڈ پارک۔ وکٹوریہ ہسپتال اور

پریڈ کا میدان واقع ہے۔

اس وقت کی گرانی جس کا حال لکھکر غالب حیران ہیں آجکل کی گرانی سے مقابلہ میں ارزانی ہے۔ اب ماش کی دال ۳ سیر گندم ۴ سیر باجرہ ۴ سیر اور گھی آدھ سیر ہے۔ یہ نرخ پہلی اشاعت کے وقت کا ہے۔

بہادر شاہ کے سکہ کہنے کا الزام سکہ کا دار تو مجھ پر ایسا چلا کہ جیسے کوئی چھپا کوئی گراب کس سے کہوں کس کو گواہ لاؤں۔ یہ دونوں سکے ایک وقت میں کہے گئے ہیں۔ یعنی جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے تو ذوق نے یہ دونوں سکے کہکر گزرانے بادشاہ نے پسند کئے۔ مولوی محمد باقر[1] جو ذوق کے معتقدین میں سے تھے۔ انہوں نے اپنے دلی اردو اخبار میں یہ دونوں سکے چھاپے۔ اس سے علاوہ اب وہ لوگ بھی موجود ہیں کہ جنہوں نے اس زمانہ میں مرشد آباد اور کلکتہ میں یہ سکے سُنے ہیں۔ اور ان کو یاد ہیں۔ اب یہ دونوں سکے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوتے اور گزرانے ہوئے ثابت ہوئے۔ ہر چند قلمرو ہند میں دلی اردو اخبار کا پرچہ ڈھونڈھا۔ کہیں ہاتھ نہ آیا۔ یہ دھبہ مجھ پر ستانہ نشں بھی گیا۔ اور وہ ریاست کا نام ونشان، خلعت و دربار بھی مٹا۔

سکہ کی حقیقت لکھتے ہیں جو سادہ پر اثر اور شاعرانہ تلازمہ برتا گیا ہے وہ زبان غالب کا بہترین نمونہ ہے ناظرین غور سے دیکھیں۔

داغ دار دہلی رفع فتنہ وفساد اور بلاد میں مُسلّم یہاں کوئی طرح آسایش کی نہیں نہ ہے۔ اہل دہلی عموماً برے ٹھہر گئے۔ یہ داغ انکی جبین حال سے عموماً مٹ نہیں سکتا۔

دہلی میں مارشل لا رہنا شہر میں بے حصول اجازت حاکم احتمال ضرر رکھتا ہے۔ اگر خبر نہ ہو تو نہ ہو۔ اگر خبر ہو جائے تو البتہ قباحت

[1] مولوی محمد باقر غالباً شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کے والد یا کوئی عزیز ہونگے۔ انکے اردو اخبار کا ذکر غدر کے اکثر حالات میں آتا ہے۔ (حسن نظامی)

ہے۔ دلی کی عملداری میرٹھ و آگرہ اور بلادِ شرقیہ کے شامل نہیں ہے۔ یہ پنجاب احاطہ میں شامل ہے۔ نہ قانون نہ آئین جس حاکم کی جو رائے میں ہو وہ ویسا ہی کرے۔

غالب نے مارشل لا کے چہرہ کو جگہ جگہ جس اختصار اور جس احتیاط مگر جس بیباکی سے لکھا ہے وہ آجکل کے سیاست نگاروں کے لئے قابل تقلید ہے۔

امن کے اشتہار کے بعد حکم عفو تقصیر عام ہو گیا ہے۔ لڑنے والے آتے جاتے ہیں اور آلات حرب و پیکار دیکر توقیع آزادی پاتے ہیں۔

یہ عبارت ۱۰ر نومبر ۱۸۵۸ء کو لکھی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب باغیوں کو امن مل گیا تھا۔ مگر اس کے بعد ۱۸۵۹ء اور ۱۸۶۰ء تک غالب کی بعض تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے اندر مسلمانوں کو بغیر ٹکٹ کے آنے کی اجازت نہ تھی غالباً انتظاماً بعض حکام مقامی نے ایسا کیا ہوگا۔ ورنہ ملکہ وکٹوریہ امن عام کا اشتہار دے چکی تھیں جو ۱۸۵۸ء میں شائع ہو گیا تھا۔

امدادی خرچ چند اشخاص کو اس بائیس مہینے میں سال بھر کا روپیہ بطریق مدد خرچ مل گیا باقی چڑھے ہوئے روپے کے باب میں اور آئندہ ماہ بماہ ملنے کے واسطے ابھی کچھ حکم نہیں ہوا۔ سوال امیر خسروؒ کی املی ہے چیل بسولا لے گئی تو کاہے پھٹکوں راب" علی بخش خاں پچیس روپے مہینا پاتے تھے۔ بائیس مہینے کے گیارہ سو روپے ہوتے ہیں۔ ان کو چھ سو روپے مل گئے۔ باقی روپیہ چڑھا رہا۔ آئندہ ملنے میں کچھ کلام نہیں۔ غلام حسن خاں سو روپے مہینے کا پنشن دار۔ بائیس مہینے کے بائیس سو روپے ہوتے ہیں۔ اس کو بارہ سو ملے۔ دیوان کشن لال کا ڈیڑھ سو روپے مہینا۔ بائیس مہینے کے تین ہزار تین سو ہوتے ہیں۔ اس کو اٹھارہ سو ا

ملے۔ منا جمعدار دس روپے مہینے کا سکھ لبر سال بھر کے ایک سو بیس لے آیا اسی طرح پندرہ سولہ آدمیوں کو ملا ہے۔ آیندہ کے واسطے کسی کو کچھ حکم نہیں۔ مجھکو پھر مدد خرچ نہیں ملا جب کئی خط پر خط لکھے تو اخیر خط پر صاحب کمشنر بہادر نے حکم دیا کہ سائل کو بطریق مدد خرچ سو روپے ملجاویں میں نے وہ سو روپے نہ لئے۔ اور پھر صاحب کمشنر بہادر کو لکھا کہ میں باسٹھ روپے آٹھ آنے مہینا پانیوالا ہوں۔ سال بھر کے ساڑھے سات سو روپے ہوتے ہیں سب پنشن داروں کو سال بھر کا روپیہ مجھکو سو روپے کیسے ملتے ہیں۔ مثل اوروں کے مجھے بھی سال بھر کا روپیہ مل جاوے۔ ابھی اس میں کچھ جواب نہیں ملا۔ آبادی کا یہ رنگ ہے کہ ڈھنڈھورا پٹوا کر ٹکٹ چھپوا کر اجرٹن صاحب بہادر بطریق ڈاک کلکتہ چلے گئے۔ دلی کے حمقا جو باہر پڑے ہوئے ہیں منہ کھول کر رہ گئے۔ اب جب وہ معاودت کرینگے تب شاید آبادی ہوگی۔ یا کوئی اور نئی صورت نکل آئے۔

ــــــ ✻ ــــــ

یہ تحریر فروری ۱۸۵۹ء کی ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۵۸ء میں اشتہار امن کے بعد بھی حکامِ انتظامی نے دہلی کے آباد ہونے میں احتیاط کی تھی۔

ــــــ ✻ ــــــ

دربار میں غالب تھے اور مہاجن

رگِ قلم کی خونابہ فشانی۔ دیکھو، گورنر اعظم نے میرٹھ میں دربار کا حکم دیا صاحب کمشنر بہادر دہلی نے سات جاگیرداروں میں سے جو تین بقیۃ السیف تھے ان کو حکم دیا اور دربارِ عام میں سے سوائے میرے کوئی نہ تھا۔ یا چند مہاجن مجھکو حکم نہ پہنچا جب میں نے استدعا کی تو جواب ملا کہ اب نہیں ہوسکتا۔ میں اپنی عادت قدیم کے موافق خیمہ گاہ میں پہنچا۔ مولوی اظہار حسین خان صاحب بہادر سے ملا چیف سکرٹر بہادر کو اطلاع کی جواب آیا کہ فرصت نہیں۔ میں سمجھا کہ اس وقت فرصت نہیں، دوسرے دن پھر گیا میری اطلاع کے بعد حکم ہوا کہ ایام غدر میں تم

باغیوں سے اختلاط رکھتے تھے۔ اب گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟ اس دن چلا آیا۔ دوسرے دن میں نے انگریزی خط ان کے نام لکھ کر ان کو بھیجا۔ مضمون یہ کہ باغیوں سے میرا اختلاط مظنہ محض ہے۔ امیدوار ہوں کہ اس کی تحقیقات ہو۔ تاکہ میری صفائی اور بیگناہی ثابت ہو۔ یہاں کے مقامات پر جواب نہ ہوا۔ اب ماہ گزشتہ یعنی فروری میں پنجاب کے ملک سے جواب آیا کہ لاٹ صاحب بہادر فرماتے ہیں کہ ہم تحقیقات نہ کریں گے پس یہ مقدمہ طے ہوا۔ دربار و خلعت مسدود و پنشن موقوف وجہ نامعلوم۔ لاموجود الا اللہ ولا موثر فی الوجود الا اللہ ۔ ۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خاں کا یوسف علی خاں بہادر والئے رامپور کہ میرے آشنائے قدیم ہیں، اس سال ۱۸۵۵ء میں میرے شاگرد ہوئے۔ ناظم ان کو تخلص دیا گیا۔ بیس پچیس غزلیں اردو کی بھیجے میں صلاح دیکر بھیج دیتا۔ کچھ روپیہ ادھر سے آتا رہتا۔ قلعہ کی تنخواہ جاری انگریزی پنشن کھلا ہوا۔ ان کے عطایا فتوح گنے جاتے تھے۔ جب یہ دونوں تنخواہیں جاتی رہیں تو زندگی کا مدار ان کے عطیہ پر رہا۔ بعد فتح دہلی وہ ہمیشہ میرے مقدم کے خواہاں ہے تھے میں عذر کرتا تھا جب جنوری ۱۸۶۰ء میں گورنمنٹ سے وہ جواب پایا کہ اوپر لکھ آیا ہوں تو میں آخر جنوری میں رامپور گیا چھ سات ہفتے وہاں رہکر دلی آیا

غالب کے استقلال نے فتح پائی

سنہ ۱۸۶۰ء میں لارڈ صاحب بہادر نے میرٹھ میں دربار کیا۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی کو ساتھ لے گئے۔ میں نے پوچھا کہ میں بھی چلوں۔ فرمایا کہ نہیں۔ جب لشکر میرٹھ سے دلی میں آیا موافق اپنے دستور کے روز ورود لشکر مخیم میں گیا۔ میر منشی صاحب سے ملا۔ ان کے خیمہ سے اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکرٹر بہادر کے پاس بھیجا۔ جواب آیا کہ تم غدر کے زمانہ میں بادشاہی باغی کی خوشامد کیا کرتے تھے اب گورنمنٹ کو تم سے ملنا منظور نہیں میں گدا مبرم اس حکم پر ممنوع نہ ہوا جب لارڈ صاحب بہادر کلکتہ پہنچے۔ میں نے قصیدہ حسب معمولِ قدیم بھیجا مع اس حکم کے واپس آیا کہ آپ یہ چیزیں ہمارے پاس نہ بھیجا کرو۔ میں مایوسِ مطلق ہو کر بیٹھ رہا۔ اور حکامِ شہر سے ملنا ترک کیا۔ واقع اواخر ماہ گزشتہ یعنی فروری ۱۸۶۲ء

نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب دلی آئے۔ اہالیانِ شہر صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر و صاحب کمشنر کے پاس دوڑے اور اپنے نام لکھوائے۔ میں تو بیگانۂ محض اور مطرودِ حکام تھا۔ جگہ سے نہ ہلا، کسی سے نہ ملا۔ دربار ہوا، ہر ایک کا مکرر ہوا۔ شنبہ ۸ فروری کو آزادانہ منشی من پھول سنگھ صاحب کے خیمہ میں چلا گیا۔ اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکرٹر بہادر کے پاس بھیجا، بلایا گیا۔ مہربان پاکر نواب صاحب کی ملازمت کی استدعا کی۔ وہ بھی حاصل ہوئی۔ وہ حاکم جلیل القدر کی وہ عنایتیں دیکھیں جو میرے تصور میں بھی نہ تھیں۔ بقیہ روداد یہ ہے کہ دوشنبہ دہم مارچ کو سوادِ شہر مخیم خیام گورنری ہوا۔ آخر روز میں اپنے شفیقِ قدیم جناب مولوی ظہر حسین خاں بہادر کے پاس گیا۔ اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ تمہارا دربار و خلعت بدستور بحال و برقرار ہے۔ متحیرانہ میں نے پوچھا کہ حضرت کیونکر؟ حضرت نے کہا کہ حاکم حال نے ولایت سے اگر تمہارے علاقہ کے سب کاغذ انگریزی و فارسی دیکھے۔ اور بہ اجلاس کونسل حکم لکھوایا کہ اسد اللہ خاں کا دربار اور نمبر و خلعت بدستور بحال و برقرار رہے۔ میں نے پوچھا کہ حضرت یہ امر کس دن پہ متفرع ہوا؟ فرمایا کہ ہم کو کچھ معلوم نہیں بس اتنا جانتے ہیں کہ یہ حکم دفتر میں لکھوا کر ۱۲ دن یا ۱۵ دن بعد ادھر کو روانہ ہوتے ہیں۔ میں نے کہا سبحان اللہ۔

کارساز ما بفکر کارِ ما   فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

سہ شنبہ ۲۳ مارچ کو ۲ بجے نواب لفٹنٹ گورنر بہادر نے مجھ کو بلایا، خلعت عطا کیا۔ اور فرمایا کہ لارڈ صاحب بہادر کے ہاں کا دربار و خلعت بھی بحال ہے۔ انبالہ جاؤ گے تو دربار و خلعت پاؤ گے۔ عرض کیا گیا حضور کے قدم دیکھے خلعت پایا۔ لارڈ صاحب بہادر کا حکم سن لیا۔ نہال ہو گیا۔ اب انبالہ کہاں جاؤں۔ جیتا رہا تو اور دربار میں کامیاب ہو رہوں گا۔

کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد   ہر چہ گیرید مختصر گیرید

سر ولیم میور اور غالب

پنشن قدیم اکیس مہینہ سے بند اور میں سادہ دل فتوحِ جدید کا آرزومند۔ پنشن کا احاطہ پنجاب کے

حکم پر مدار ہے۔ سوان کا یہ شیوہ نہیں ہے، ان کا یہ شعار ہے کہ روپیہ دیتے ہیں، نہ جواب نہ مہربانی نہ عتاب۔ خیر اس سے قطع نظر کی بشتہ اعے بموجب تحریر وزیر اودھ عطیہ شاہی کا امیدوار ہوں۔ تقاضا کرتے ہوئے شرماؤں، اگر گنہگار ٹھہرتا تو گولی یا پھانسی سے مرتا۔ اس بات پر کہ میں بے گناہ ہوں مقید اور مقتول نہ ہونے سے آپ اپنا گواہ ہوں پیشگاہ گورنمنٹ کلکتہ میں جب کوئی کاغذ بھجوایا ہے۔ بقلم چیف سکرٹر بہادر اس کا جواب پایا ہے۔ اگلی بار دو کتابیں بھیجیں۔ ایک پیشکش گورنمنٹ اور ایک نذر شاہی ہے نہ اسکے قبول کی اطلاع۔ نہ اسکے ارسال سے آگاہی ہے جناب ولیم میور صاحب بہادر نے بھی عنایت نہ فرمائی انکی بھی کوئی تحریر مجھکو نہ آئی یہ سب ایک طرف اب خبریں ہیں مختلف کہتے ہیں کہ چیف سکرٹر بہادر لفٹنٹ گورنر ہو گئے یہ کوئی نہیں کہتا کہ ان کی جگہ کون سے صاحب عالیشان چیف سکرٹر ہوئے۔ مشہور جناب ولیم میور صاحب بہادر صدر بورڈ میں تشریف لے گئے یہ کوئی نہیں کہتا کہ لفٹنٹ گورنری کے سکرٹری کا کام کس کو دے گئے۔

انگریزوں کے احسان کی یاد شریف ہندوستانی کے دل میں

جناب آرنلڈ صاحب بہادر آج تشریف لے گئے سنتا ہوں کہ کلکتہ جائیں گے میم اور بچوں کو ولایت بھیجکر پھر آئیں گے۔ مجھ سے وہ سلوک کر گئے ہیں۔ اور مجھ پر وہ احسان کر گئے ہیں کہ قیامت تک ان کا شکر گزار رہوں گا۔

غدر میں تم کہاں تھے

خدا جب کا بھلا کرے۔ مجھکو ڈپٹی کمشنر نے بلا بھیجا تھا۔ صرف اتنا ہی پوچھا کہ غدر میں تم دل تھے؟ جو مناسب ہوا وہ کہا گیا۔ وہ ایک خط آمدہ ولایت میں نے پڑھا ہے تفصیل لکھ نہیں سکتا اندازا اس سے پنشن کا بحال و برقرار رہنا معلوم ہوتا ہے۔ مگر پندرہ مہینے پچھلے ملتے نظر نہیں آتے۔

غالب کی مفلسی کوتوالی میں

یہ تو آفت دلی ہی پر ٹوٹ پڑی ہے لکھنؤ کے سوا اور شہروں میں عملداری کی وہ

صورت ہے جو غدر سے پہلے تھی۔ اب یہاں ٹکٹ چھاپ گئے ہیں۔ میں نے بھی دیکھے۔ فارسی عبارت یہ ہے۔

"ٹکٹ آبادی درون شہر دہلی بشرط ادخال جرمانہ۔ مقدار روپے کی حاکم کی رائے پر ہے۔ آج پانچ ہزار ٹکٹ چھپ چکا ہے۔ کل اتوار یوم التعطیل ہے۔ پرسوں دوشنبہ سے دیکھئے یہ کاغذ کیونکر تقسیم ہوں۔ یہ تو کیفیت شہر کی ہے۔ میرا حال سنو بائیس مہینے کے بعد پرسوں کوتوال کو حکم آیا ہے کہ اسد اللہ خاں پنشن دار کی کیفیت لکھو۔ کہ وہ بے مقدور اور محتاج ہے کہ نہیں۔ کوتوال نے موافق ضابطہ کے مجھ سے چار گواہ مانگے ہیں۔ سو کل چار گواہ کوتوالی چبوترے جائیں گے۔ اور میری بے مقدوری ظاہر کر آئیں گے کہیں یہ نہ سمجھنا کہ بعد ثبوت مفلسی چڑھا ہوا روپیہ مل جائیگا اور آئندہ کو پنشن جاری ہو جائیگا۔

کوتوالی میں اظہار مفلسی کے واقعہ کو کس رقت خیز انداز سے لکھا ہے کہ مجبوری سب کچھ کراتی ہے۔ اس پر بھی یہ یقین نہیں کہ نتیجہ مفید نکلیگا۔

شرفا کی تصویر افلاس

پنشن کا حال کچھ معلوم نہیں۔ حاکم خط کا جواب نہیں لکھتا۔ عملہ میں ہر چند تفحص کیجیے کہ ہمارے خط پر کیا حکم ہوا۔ کوئی کچھ نہیں بتاتا۔ بہر حال اتنا سُنا ہے اور دلائل اور قرائن سے معلوم ہوا ہے کہ میں بے گناہ قرار پایا ہوں اور ڈپٹی کمشنر بہادر کی رائے میں پنشن پانے کا استحقاق رکھتا ہوں۔ پس اس سے زیادہ نہ مجھے معلوم نہ کسی کو خبر۔ میں کتابیں کہاں سے چھپواتا۔ روٹی کھانے کو نہیں۔ شراب پینے کو نہیں۔ جاڑے آتے ہیں لحاف توشک کی فکر ہے۔ کتابیں کیا چھپواؤنگا۔

یہ غالب نے اپنا ہی حال نہیں لکھا۔ بلکہ غدر کے بعد جو حالت شرفائے دہلی کی ہو گئی تھی اس کی تصویر بھی دکھادی ہے۔
جو لوگ بے امنی کے خواستگار ہیں۔ ان حالات کو ذرا نظر عبرت سے پڑھیں۔

گورنر جنرل نے غالب کی قدردانی کی

صاحب کمشنر بہادر دہلی یعنی جناب سانڈرس صاحب بہادر نے مجھکو بلایا۔ پنجشنبہ ۴ ر فروری کو میں گیا۔ صاحب شکار کو سوار ہو گئے تھے۔ میں الٹا پھر آیا۔ جمعہ ۵ ر فروری کو گیا۔ ملاقات ہوئی۔ کرسی دی۔ بعد پرسش مزاج کے ایک شقہ انگریزی چار ورق کا اٹھا کر پڑھتے رہے جب پڑھ چکے تو مجھ سے کہا کہ یہ خط ہے منٹگمری صاحب حاکم اکبر صدر بورڈ پنجاب کا تمہارے باب میں لکھتے ہیں کہ ان کا حال دریافت کر کے لکھو۔ سو ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تم ملکہ معظمہ سے خلعت کیا مانگتے ہو؟ حقیقت کہی گئی۔ ایک کاغذ آمدہ ولایت سے گیا تھا وہ پڑھوا دیا۔ پھر پوچھا۔ تم نے کتاب کیسی لکھی ہے؟ اس کی حقیقت بیان کی۔ کہا ایک منٹگمری صاحب دیکھنے کو مانگتے ہیں اور ایک ہم کو دو۔ میں نے عرض کیا۔ کل حاضر کروں گا پھر پنشن کا حال پوچھا۔ وہ گزارش کیا۔ اپنے گھر آیا۔ اور خوش آیا۔ حاکم پنجاب کو مقدمہ ولایت کی کیا خبر۔ کتابوں سے کیا اطلاع۔ پنشن کی پرسش سے کیا مدعا۔ یہ استفسار بحکم نواب گورنر جنرل کا ہوا ہے اور یہ صورت مقدمہ فتح و فیروزی ہے۔

کتاب دستنبو نے گورنر جنرل کے خیالات غالب کی طرف متوجہ کئے جیسا کہ میں نے ایک جگہ لکھا ہے۔ اس عبارت سے اس خیال کی مزید تائید ہوتی ہے۔

۱۸۶۰ء میں املاک واگزاشت

دربار لارڈ صاحب کا میرٹھ میں ہوا دلی کے علاقہ کے جاگیردار بموجب حکم کمشنر دہلی میرٹھ گئے موافق دستور قدیم مل آئے غرضکہ پنجشنبہ ۲۹ ر دسمبر کو پہر دن چڑھے لارڈ صاحب یہاں پہنچے۔ کابلی دروازہ کی فصیل کے تلے ڈیرے ہوئے۔ اسی وقت توپوں کی آواز سنتے ہی میں سوار ہو گیا۔ میر منشی سے ملا۔ ان کے خیمہ میں بیٹھ کر صاحب سکرٹر کو خبر کروائی۔ جواب آیا کہ فرصت نہیں۔ یہ جواب سنکر لومیدی کی پوٹ باندھکر لے آیا۔ ہر چند پنشن کے باب میں ہنوز نا ونعم نہیں مگر کچھ نکر رہا ہوں۔ دیکھوں کیا ہوتا

ہے۔ لارڈ صاحب کل یا پرسوں جانے والے ہیں۔ یہاں کچھ کلام و پیام نہیں۔ مگر تحریر ڈاک میں بھیجی جائے گی۔ دیکھیے کیا صورت پیش آئے گی۔ مسلمانوں کی املاک کے واگزاشت کا حکم عام ہوگیا ہے۔ جن کو کرایہ پر ملی ہے ان کو کرایہ معاف ہوگیا ہے۔ آج یکشنبہ یکم جنوری ۱۸۶۰ء ہے پہر دن چڑھا ہے۔

۱۸۵۸ء کے اعلان ملکہ وکٹوریہ سے صرف جان بخشی ہوئی تھی جائداد کی رہائی خصوصاً مسلمانوں کی املاک کی واگزاشت ۱۸۶۰ء میں ہوئی جیسا کہ غالب نے لکھا ہے۔

گورنر غالب کے بسیار مہربان دوستاں | نواب لفٹنٹ گورنر پنجاب

غرب وشمال کو نسخہ دستنبو بسبیل ڈاک بھیجا تھا۔ ان کا خط فارسی مشعر تحسین عبارت و قبول صدق ارادت و مودت بسبیل ڈاک آگیا۔ پھر قصیدہ بہاریہ تہنیت و مدحت میں بھیجا گیا۔ اس کی رسید آگئی وہی خاں صاحب بسیار مہربان دوستاں القاب اور کاغذ افشانی سازاں بعد ایک قصیدہ جناب رابرٹ منٹگمری صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر قلمرو پنجاب کی مدح میں بتوسط صاحب کمشنر بہادر دہلی گیا۔ اس کے جواب میں بھی خوشنودی نامہ بتوسط کمشنر بہادر کل مجھ کو آگیا۔ پنشن ابھی تک مجھ کو نہیں ملی۔

اِس عبارت سے کئی باتیں نئی معلوم ہوئیں۔ ایک تو گورنر کا فارسی میں خط لکھنا۔ دوسرے مشرقی القاب سے مخاطب کرنا تیسرے مشرقی یعنی افشانی کاغذ پر خط لکھا جانا جس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ غدر کے بعد سے انگریزوں نے یہاں کے رسم و رواج کو کتنا زیادہ ترک کر دیا ہے اور یہی وجہ ہے ان کے غیر ہر دل عزیز ہوجانے کی ہے۔

غالب نے ہر جگہ پنشن کو مذکر لکھا ہے۔ مگر یہاں مونث لکھتے ہیں اس سے ظاہر ہوا کہ پنشن کا استعمال دونوں طرح جائز ہے۔

سرجان لارنس اور غالب

عرضی میری سرجان لارنس چیف کمشنر بہادر کو گزاری۔ اس پر دستخط ہوئے کہ یہ عرضی مع کاغذ ضمیمہ سائل بھیجدی جائے اور یہ لکھا جائے کہ معرفت صاحب کمشنر دہلی کے پیش کرد۔ اب سررشتہ دار کو لازم تھا کہ میرے نام موافق دستور کے خط لکھتا۔ یہ نہ ہوا وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی میرے پاس آگئی میں نے خط صاحب کمشنر چارلس سانڈرس کو لکھا اور وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی اس میں ملفوف کرکے بھیجدی۔ صاحب کمشنر نے وہ عرضی کلکٹر کے پاس یہ حکم چڑھا کر بھیجی کہ سائل کے پنشن کی کیفیت لکھو۔ اب وہ مقدمہ صاحب کلکٹر کے ہاں آیا ہے۔ ابھی صاحب کلکٹر نے تعمیل اس حکم کی نہیں کی۔ پرسوں تو انکے ہاں یہ روبکاری آتی ہے۔ دیکھئے کچھ مجھ سے پوچھتے ہیں یا اپنے دفتر سے لکھ بھیجتے ہیں۔ دفتر کہاں رہا جو اس کو دیکھیں گے۔ بہرحال یہ خدا کا شکر ہے کہ بادشاہی دفتر میں سے میرا نام کچھ شمول فساد میں پایا نہیں گیا۔ اور میں حکام کے نزدیک یہانتک پاک ہوں کہ پنشن کی کیفیت طلب ہوئی ہے۔ اور میری کیفیت کا ذکر نہیں ہے یعنی سب جانتے ہیں کہ اس کو لگاؤ نہ تھا۔

افلاس شاعری پر بھی غالب ہے

ہمیشہ نواب گورنر جنرل کی سرکار سے دربار میں مجھ کو سات پارچے اور تین رقم جواہر خلعت ملتا تھا۔ لارڈ کیننگ صاحب میرا دربار و خلعت بند کر گئے ہیں۔ ناامید ہو کر بیٹھ رہا۔ اور مدت العمر کو مایوس ہو رہا اب جو یہاں لفٹنٹ گورنر پنجاب آئے میں میں جانتا تھا کہ یہ بھی مجھ سے نہ ملیں گے۔ کل انہوں نے مجھکو بلا بھیجا۔ بہت ہی عنایت فرمائی اور فرمایا کہ لارڈ صاحب دلی میں دربار نہ کرینگے میرٹھ ہوتے ہوئے اور میرٹھ میں ان اضلاع کے علاقہ داروں اور مالگزاروں کا دربار کرتے ہوئے انبالہ جائیں گے۔ دلی کے لوگوں کا دربار وہاں ہوگا تم بھی انبالہ جاؤ شریک دربار ہو کر خلعت معمولی لے آؤ۔ کیا کہوں کہ کیا میرے دل پر گزری۔ گویا مردہ جی اٹھا مگر ساتھ اس مسرت کے یہ بھی سنتا تاگزرا کہ سامان سفر انبالہ و مصارف بے انتہا کہاں سے لاؤں۔ اور طرہ یہ کہ نذر معمولی میری قصیدہ ہے۔ ادھر قصیدہ کی فکر

اُدھر روپیہ کی تدبیر۔ حواس ٹھکانے نہیں۔ شعر کام دل و دماغ کا ہے۔ وہ روپیہ کی فکر میں پریشان۔ میرا خدا یہ مشکل بھی آسان کرے گا۔

دن کی روٹی رات کی شراب

بہ نسبت حکیم احسن اللہ خاں کے جو بات مشہور ہے۔ وہ محض غلط۔ ہاں مرزا الٰہی بخش جو شاہزادوں میں ہیں۔ ان کو حکم کراچی بندر جانے کا ہے۔ اور وہ انکار کر رہے ہیں۔ دیکھئے کیا حکم ہو۔ حکیم جی کو اُن کی حویلیاں مل گئی ہیں۔ اب وہ مع قبائل ان مکانوں میں جا رہے ہیں اتنا حکم ان کو ہے کہ شہر سے باہر نہ جائیں۔ رہا میں۔ ع

تو بیکسی و غریبی ما کہ می پرسد

نہ جزا۔ نہ سزا۔ نہ نفرین۔ نہ آفرین۔ عدل۔ نہ ظلم۔ نہ لطف۔ نہ قہر۔ ۱۵ دن پہلے تک دن کو روٹی رات کو شراب ملتی تھی۔ اب صرف روٹی ملے جاتی ہے۔ شراب نہیں۔ کپڑا ایام تنعم کا بنا ہوا ابھی ہے۔ اس کی کچھ فکر نہیں۔

حکیم احسن اللہ خاں صاحب کی نسبت دلی میں مشہور ہوا تھا کہ وہ بھی جلاوطن کئے جائیں گے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے۔ میرزا الٰہی بخش کی جلاوطنی منسوخ ہوئی۔ اور وہ مرتے دم تک درگاہ حضرت سلطان جی میں رہے۔ غالب کی قبر کے پاس ان کا خاندانی مکان بنا جواب کھنڈر پڑا ہے۔ جلاوطنی ہی منسوخ نہیں ہوئی بلکہ بارہ سو روپے ماہوار پنشن بھی نسلاً بعد نسل دی گئی۔ جوان کے بیٹوں میرزا سلیمان شکوہ عرف بڑے میرزا فرخ جاہ اور میرزا اقبال شاہ میں تقسیم ہوئی اور اب میرزا فرخ جاہ کے مرنے کے بعد ان کی بیگمات دور شاہ کو ملتی ہے میرزا الٰہی بخش اور ان کے لڑکے درگاہ حضرت سلطان جی کے شرقی رخ سنگ سرخ کی جالیوں کے اندر دفن ہیں۔ میرزا الٰہی بخش آخر میں خیر خواہ سرکار ثابت ہوئے تھے۔ بہادر شاہ کے سمدھی تھے۔

غدر کے دفتر شاہی میں غالب کا نام نہ تھا

دفتر شاہی میں میرا نام نہیں

نہیں نکلا۔ کسی مخبر نے نسبت میرے کوئی خبر بدخواہی کی نہیں دی۔ حکام وقت میرا ہونا شہر میں جانتے ہیں۔ فراری نہیں ہوں۔ روپوش نہیں ہوں۔ بلایا نہیں گیا۔ دار و گیر سے محفوظ ہوں۔ کسی طرح کی بازپرس ہو تو بلایا جاؤں۔ مگر ہاں جیسا کہ بلایا نہیں گیا، خود بھی بروئے کار نہیں آیا۔ کسی حاکم سے نہیں ملا۔ خط کسی کو نہیں لکھا۔ کسی سے درخواست ملاقات نہیں کی۔ مئی سے پنشن نہیں پایا۔ یہ دس مہینے کیونکر گزرے ہونگے۔ انجام کچھ نظر نہیں آتا۔

غالب کی جان پٹیالہ کے سبب بچی

میں حکیم محمد حسن خاں کے مکان میں نو۔ دس برس سے کرایہ کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا بلکہ دیوار بدیوار ہیں۔ گھر حکیموں کے۔ اور وہ نوکر ہیں راجہ نرندر سنگھ بہادر والی پٹیالہ کے۔ راجہ نے صاحبان عالیشان سے عہد لے لیا تھا کہ بروقت غارت دلی یہ لوگ بچ رہیں چنانچہ بعد فتح راجہ کے سپاہی یہاں آبیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا۔ ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں۔ امیر غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے۔ جاگیردار، پنشن دار، دولتمند، اہل حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے۔ اور بازپرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں۔ مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں۔ میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں۔ خواہی اسکو نوکری سمجھو خواہی مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجالاتا رہا۔ اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے۔ مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات پائی نہیں گئی۔ لہذا طلبی نہیں ہوئی ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں۔ میری کیا حقیقت تھی غرضکہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازہ سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا اور کہیں آنا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کوئی میرے پاس آوے۔ شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجکو نہیں معلوم بلکہ ہنوز ایسے امور کی

طرف حکام کو توجہ بھی نہیں ۔ دیکھئے انجام کار کیا ہوتا ہے ۔ یہاں باہر سے اندر تک کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا ابھی دیکھا چاہئے مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں؟

پنشن کی نسبت

میں اجرائے پنشن سرکار انگریزی سے مایوس تھا بارے وہ نقشہ پنشنداروں کا جو یہاں سے بنکر صدر کو گیا تھا اور یہاں کے حاکم نے نسبت میرے صاف لکھدیا تھا کہ یہ شخص پانے کا مستحق نہیں ہے گورنمنٹ نے برخلاف یہاں کے حاکم کی رائے کے میری پنشن کے اجرا کا حکم دیا اور وہ حکم یہاں آیا اور مشہور رہا میں نے بھی سنا ۔ اب کہتے ہیں کہ ماہ آیندہ یعنی مئی کی پہلی کو تنخواہوں کا بٹنا شروع ہو گا ۔ دیکھا چاہئے پچھلے روپے کے باب میں کیا حکم ہوتا ہے ۔

دہلی کا دردناک مرثیہ

بسکہ فعال ما یرید ہے — ہر سلحشور انگلستان کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جسکو کہیں وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک — آدمی واں نہ جاسکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا — وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کئے شکوہ — سوزش داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کئے باہم — ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے غالبؔ — کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

یہ مرثیہ محض شاعری نہیں بلکہ واقعات غدر کی تاریخی تصویر ہے چاندنی چوک میں پھانسیاں کھڑی ہوئی تھیں جن پر روزانہ سینکڑوں آدمیوں کو لٹکایا جاتا تھا ۔ مسلمانوں کے ساتھ خصوصیت سے سختی برتی جاتی تھی ۔ انہی امور کو غالب نے غمناک انداز سے لکھا ہے ۔

انگریز بھی غالب کے شاگرد تھے

جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرعہ پڑھکر چپ ہو جاتا ہوں۔ ع

اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو دکھ مجھ کو ہے اس کا بیان تو معلوم مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریزی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے اس میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز کچھ دوست کچھ شاگرد، کچھ معشوق۔ سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جیتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیونکر نہ دشوار ہو ہائے اتنے یار۔ مرے کہ جواب میں مروں گا تو میرا کوئی رونیوالا بھی نہ ہوگا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۵۸ برس نہیں گیا۔

غالب کی انصاف پسندی دیکھنا۔ غدر کے مصائب کو بلا تعصب بیان کرتے ہیں۔ انگریزوں پر جو مظالم ہوئے ان کو بھی قلم پر لاتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غدر سے پہلے انگریز بھی شعرا کے شاگرد ہوتے تھے اور شرفا سے دوستیاں کرتے تھے اب یہ باتیں کہانیاں ہوگئیں۔

غالب انگریزوں کے خیر خواہ تھے

حکم ہوا ہے کہ دوشنبہ کے دن پہلی تاریخ نومبر کو رات کے وقت سب خیر خواہان انگریز اپنے اپنے گھروں میں روشنی کریں اور بازاروں میں اور صاحب کمشنر بہادر کی کوٹھی پر بھی روشنی ہوگی۔

فقیر بھی اس تہیدستی پر کہ اٹھارہ مہینے سے پنشن مقرری نہیں پاتا۔ اپنے مکان پر روشنی کرے گا۔

اس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے جو کہیں کہیں

انگریزوں کے خلاف الفاظ استعمال کئے ہیں یہ اُس وقت کی عام زبان تھی ورنہ جشن میں شرکت۔ گھر پر روشنی کرنا صاف ظاہر کرتا ہے کہ وہ حکومت سے عناد نہ رکھتے تھے۔

تمام شُد

ناشر تسلیم احمد پرنٹر طاہر حسین نے معراج پرنٹرز اردو بازار لاہور سے چھپوا کر 16- عمر روڈ اسلام پورہ لاہور سے شائع کیا۔